بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

اور ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

تفسیر القرآن الکریم

حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

جلد اوّل

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ التوبۃ

Dar-ul-Andlus

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم

نام کتاب

تفسیر القرآن الکریم

جلد اول

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ التوبۃ

تفسیر

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

Dar-ul-Andlus

ناشر

دار الاندلس

Ph: +92-42-37150891 ہیڈ آفس
Fax: +92-42-37150889
4-لیک روڈ چوبرجی لاہور
92-42-37230549+
6-غزنی سٹریٹ نزد رحمٰن مارکیٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

اور ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت اتاری تا کہ آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دیں جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (النحل: 44)

تفسیر القرآن الکریم

فضیلۃ الاستاذ حافظ عبد السلام بن محمد حفظہ اللہ

جلد اوّل

سورۃ الفاتحۃ تا سورۃ التوبۃ

Dar-ul-Andlus

دار الاندلس

4- لیک روڈ چوبرجی لاہور | 042-37230549

6- غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور | +92-42-37242314

Head Off: +92-42-37150891 Fax: +92-42-37150889

تفسیر القرآن الکریم

فہرست

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ!

قرآن مجید ایک عظیم الشان اور کامل کتاب ہے جو ہر شک وشبہ سے بالا اور ہر نقص سے پاک ہے۔ یہ الہامی کتاب رشد و ہدایت کا منبع، خیر و برکت سے لبریز اور حکمت و دانائی کا خزانہ ہے، جسے انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب حق و باطل میں فرق کرنے والی، کفر وشرک کی تاریکیوں اور گمراہیوں سے نکال کر نورِ توحید سے سینوں کو منور کرنے والی، اپنے ماننے والوں کو کامیابی اور سرفرازی کی خوش خبری سنانے والی اور اعراض برتنے والوں کو زوال اور پستی سے خبردار کرنے والی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَ يَضَعُ بِهِ آخَرِيْنَ » [مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل من يقوم بالقرآن و يعلمه ...... : ۸۱۷]

”یقیناً اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے کئی قوموں کو بلند کرتا ہے اور اس سے (روگردانی کرنے والی) اقوام کو پست کرتا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نزولِ قرآن کے ساتھ ہی اس کی تعلیم اور تفہیم کی ابتدا ہو گئی تھی اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔
قرآن مجید کی سب سے زیادہ صحیح ترین تفسیر اور قابلِ اعتماد تشریح وہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان کی ہے، جسے تفسیر القرآن بالقرآن کہتے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں یہ اسلوب موجود ہے کہ کسی مسئلہ کو ایک جگہ اختصار کے ساتھ اور دوسری جگہ اسی مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور جسے خود صاحبِ قرآن نے بیان کیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ تفسیر ہے، کیونکہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن کی تعلیم و تبیین ہی تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے ان کے سامنے تلاوت قرآن فرماتے تھے اور اللہ کے حکم کے مطابق اس کے معانی و مطالب اور تشریح و تفسیر بھی بیان کرتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ [النحل : ٤٤]

”اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔“

قرآن جن لوگوں کے درمیان نازل ہوا ان کی زبان عربی تھی۔ اہل زبان ہونے کے ناتے وہ عربی زبان کی باریکیوں اور لطافتوں سے خوب واقف تھے اور وہ فصاحت و بلاغت میں عبور، زبان دانی میں کمال اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے،

ان جملہ صفات و کمالات کے باوجود انھیں متعدد مقامات پر قرآن فہمی میں دقت اور مشکل پیش آتی تھی، جس کے حل کے لیے وہ آپ ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٨٢] "وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔" تو اصحابِ رسول پر یہ آیت بہت شاق گزری، انھوں نے عرض کی: "یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا؟" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ بات اس طرح نہیں جیسے تم سمجھ رہے ہو، بلکہ اس سے مراد وہ ہے جس کا ذکر لقمان (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے سے کیا تھا: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان : ١٨] "اے میرے چھوٹے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے (یعنی یہاں ظلم سے مراد شرک ہے)۔" [مسلم، الإيمان، باب صدق الإيمان و إخلاصه : ١٢٤۔ بخاري : ٤٦٢٩]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان ہونے اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے کے باوجود لفظ "ظلم" کے معنی و مفہوم کا تعیّن نہ کر سکے تو انھوں نے آپ ﷺ سے رجوع کیا تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ یہاں ظلم کا معنی عام ظلم نہیں بلکہ اس سے مراد شرک ہے۔ تو اس سے پتا چلا کہ قرآن فہمی کے لیے صرف اہل زبان ہونا یا عربی زبان کا جاننا ہی کافی نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے بیان کردہ معانی اور تفسیر سے راہنمائی لینا بھی ضروری ہے، جس کا بیش قیمت ذخیرہ کتب احادیث اور سیرت طیبہ میں محفوظ ہے۔

آپ ﷺ صرف قرآن پڑھ کر سنانے والے ہی نہ تھے، بلکہ آپ ﷺ منصب نبوت کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے شارح و مفسر بھی تھے، اس لیے قرآن کے اجمال کی جو توضیح رسول اللہ ﷺ نے کی ہے وہ صحابہ کرام اور پوری امت کے لیے دلیلِ قطعی اور حُجّتِ بالغہ کی حیثیت رکھتی ہے اور شرعی امور میں بطورِ دلیل پیش کرنے اور تمام مسائل کے اثبات کے لیے نصِ صریح شمار ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ہمیشہ ان دو چیزوں (قرآن و حدیث) کو فہم قرآن کا اصل ماخذ سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

« أَلَا إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ » [مسند أحمد : ١٣١/٤، ح : ١٧١٧٩۔ أبو داوٗد : ٤٦٠٤]

"(لوگو) سن لو! بے شک مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی۔"

قرآن مجید اور حدیثِ رسول کے درمیان فرق کرنے والوں کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: "میں تم میں سے کسی شخص کو اپنی مسند پر ٹیک لگائے اس حالت میں نہ دیکھوں کہ اس کے پاس میرے احکام میں سے کوئی حکم آئے کہ جس میں کسی کام کے کرنے کا حکم دیا گیا ہو یا کسی کام سے روکا گیا ہو تو وہ کہے گا کہ ہم اسے نہیں جانتے، ہم تو جو حکم قرآن میں پائیں گے صرف اس کی پیروی کریں گے۔" [أبو داوٗد، السنة، باب في لزوم السنة : ٤٦٠٥]

آپ ﷺ کے اقوال و اعمال سے راہنمائی لینے اور اس کی طرف رجوع کرنے کا صریح حکم اس آیت میں بھی موجود ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر : ٧] "اور رسول تمھیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے تمھیں روک دے تو رک جاؤ۔"

اس کے علاوہ قرآن مجید کی بہت سی دیگر آیات بھی اس معنی و مفہوم پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن کی تفسیر کے لیے آپ ﷺ کے بیان کردہ معانی سب سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد ہیں۔ اسی لیے ائمہ سلف نے فہم قرآن کے لیے قرآن و حدیث ہی کو اصل بنیاد قرار دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی اس وضاحت کے باوجود بعض قدیم اور جدید مفسرین نے حدیث اور سنت نبوی کو نا صرف دلیل قطعی اور حجت شرعی تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا ہے بلکہ تفسیر قرآن کے اصل اور معتبر ترین ماخذ احادیث صحیحہ کو ظنی ماخذ قرار دیا ہے اور اس اصل الاصول کے بجائے لغت عرب، معقولات، درایت، کلام شعرائے عرب، قدیم مخطوطات، اسرائیلیات، اقوالِ رجال، فتاویٰ ائمہ اور آرائے فقہاء کو احادیث صحیحہ اور سنت متواترہ کے مقابلے میں زیادہ قابل اعتماد سمجھا ہے اور انھیں بنیاد بنا کر قرآن کے الفاظ کے مطالب کا تعین اور مفاہیم کی تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے عام لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے ہیں اور بہت سے مسلمان اور غیر مسلم بالخصوص مستشرقین کو قرآنی تعلیمات اور شرعی احکامات پر تنقید اور اعتراضات کرنے کا موقع ملا ہے اور ان کے پیدا کردہ اشکالات اور غلط فہمیوں کی وجہ سے بہت سے لوگ قرآنی تعلیمات اور پیغامِ رسالت سے مستفید ہونے سے محروم ہو گئے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ان گمراہ کن خیالات اور فکری کج روی کے بعد اب یہ سوچ پختہ ہوتی جا رہی ہے کہ قرآن کی اصل تعبیر اور صحیح تفسیر صرف قرآن اور حدیث ہی سے ممکن ہے۔ چنانچہ موجودہ ترقی یافتہ دور اور عصری فکر و شعور کا بھی تقاضا ہے کہ قرآن مجید کی مستند اور معیاری تفاسیر کو قرآن فہمی کے لیے عام کیا جائے اور قرآن اور قارئین کے درمیان حائل ہونے والے ان باطل نظریات، وضعی قاعدوں اور خود ساختہ اصولوں کے پردوں کو چاک کر دیا جائے، جو علوم و فنون اور معقولات و درایت کے نام سے روحِ قرآن اور حکمت ربانی کو سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، تاکہ عام مسلمان قرآنی تعلیمات سے براہِ راست استفادہ کر سکیں اور اس عظیم چشمۂ صافی سے اپنی علمی، تحقیقی اور روحانی پیاس بجھا سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے فضیلۃ الاستاذ الشیخ الحافظ عبد السلام بن محمد بھٹوی ﷾ کو اس نہج پر تفسیر لکھنے کی توفیق اور سعادت بخشی، اس تفسیر میں انھوں نے احادیث صحیحہ، آثارِ صحابہ اور منہجِ سلف کی روشنی میں تفسیر بالماثور کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے اور عام مفسرین کے برعکس انبیائے کرام اور سابقہ امتوں کے حالات و واقعات کی تفصیل بیان کرنے میں اسرائیلیات اور غیر مستند روایات سے مکمل اجتناب کیا ہے اور ان کے حالات و واقعات کے بیان میں ثقاہت اور حقائق کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن کے مشکل اور تفصیل طلب اہم مقامات کی بڑی عمدہ اور مفید تشریح کی ہے جو متلاشیانِ حق و صداقت کے لیے متاعِ گمشدہ ہے۔ مزید برآں بعض مقامات پر قرآن کے مشکل الفاظ کے معانی کی لغوی اور نحوی وضاحت بھی کی ہے۔ مذکورہ بالا نمایاں اور امتیازی خصوصیات کی حامل یہ تفسیر محترم حافظ صاحب کی 45 سال سے زائد عرصہ پر محیط تعلیمی خدمات، تدریسی تجربے اور دقیق مطالعہ کا خلاصہ ہے۔ اس تفسیر کی نمایاں اور قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ترجمۂ قرآن بھی محترم حافظ صاحب ہی کا ہے، جو لفظی اور بامحاورہ ترجمے کا حسین امتزاج ہے، جس میں انھوں نے عام فہم اسلوبِ نگارش اختیار کرتے ہوئے الفاظ کے معانی کے لیے اختصار اور جامعیّت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

محترم حافظ صاحب ایک کامیاب مدرس اور اعلیٰ پائے کے کہنہ مشق استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ وعظ ونصیحت اور دعوت و ارشاد کے میدان میں بھی قابل ذکر خدمات رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں علم ومطالعہ کی وسعت، ایک ماہر استاذ کے فنی محاسن اور واعظ فصیح اللسان کی خوبیوں کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے، ان کا اسلوبِ بیان سادہ، رواں اور سلیس ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعیٔ جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے اور اسے ہر قاریٔ تفسیر کے لیے اصلاحِ عقائد، ترغیب اعمال صالحہ، تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب واذہان کا وسیلہ بنا دے۔

ادارہ ''دارُالاندُلس'' کی طرف سے مذکورہ جملہ صفات کی حامل چار جلدوں پر مشتمل ''تفسیر القرآن الکریم'' خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائٹل، نفیس طباعت، اعلیٰ اور معیاری کاغذ، دو رنگوں میں جاذبِ نظر طباعت اور خوبصورت کتابت سے آراستہ محترم قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

زیرِ نظر تفسیر کی تیاری کے طویل اور صبر آزما مراحل کی نگرانی فاضل رفیق مجلس اور ریسرچ سکالر ابو عمر محمد اشتیاق اصغر نے کی، اس تفسیر کے مندرجات میں ان کے مفید اور قابل قدر مشورے بھی شامل ہیں۔ ریسرچ سکالر ابو الوفاء حافظ سعید الرحمٰن نے بڑی محنت اور ذمہ داری کے ساتھ تخریج کا کام کیا، جلد اوّل میں حافظ رضوان عبد اللہ نے ان کی معاونت کی۔ احادیث کی اصل ماخذ کے ساتھ مراجعت کا محنت طلب کام ابو انیس حافظ ثناء اللہ خان اور ابو سعد مطیع الرحمٰن نے کیا۔ ان تمام احباب نے شب و روز بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ مسودے کی بار بار پروف خوانی کی۔ کمپوزنگ اور تزئین صفحات کا تھکا دینے والا کام ابو خزیمہ محمد شفیق نے کیا اور ابو حمزہ حافظ آصف رشید نے اس کام میں ان کی معاونت کی۔ متن قرآن کی سیٹنگ ماہر تقسیم حنظلہ اقبال نے کی اور تفسیری آیات نکالنے کا کام ظہیر الدین بابر نے کیا اور عطاء الرحمٰن طاہر اور محمد عمر نے جزوی طور پر ان کی معاونت کی۔ خوبصورت اور جاذبِ نظر سرورق ابو حمزہ ضیاء الرحمٰن نے تیار کیا۔ ان کے علاوہ بعض بھائیوں نے پروف خوانی، تفسیری آیات نکالنے اور کمپوزنگ کا جزوی طور پر کام کیا، اللہ تعالیٰ ان سب کے کام کو قبول فرمائے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ جس کی خاص توفیق اور بے پناہ فضل و کرم سے اس عالی شان اور قابل ذکر تفسیر کی تکمیل ہوئی اور ''دارُالاندُلس'' کی ٹیم اور تمام رفقاء مجلس التحقیق کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں، جن کی باہمی مشاورت و معاونت اور شب و روز کی محنت کا عمدہ اور نفیس ثمر علم و حکمت کے موتیوں کا خزینہ بن کر تفسیر کے اوراق پر بکھرا ہوا دادِ تحسین حاصل کرنے کے لیے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کو دنیا و آخرت میں خیر کثیر سے نوازے اور محترم حافظ صاحب کے لیے اسے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین !!

محتاجِ دعا

جاوید الحسن صدیقی

مدیر دارُالاندُلس

یکم رمضان 1435ھ، بمطابق 30 جون 2014ء

تقدیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى أَشْرَفِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، أَمَّا بَعْدُ !

حافظ عبدالسلام بن محمد ﷾ نے بحمد اللہ تعالیٰ پہلے قرآن حکیم کا عام فہم ترجمہ کیا اور اب تفسیر قرآن کا کام مکمل کر رہے ہیں۔ ترجمۃ القرآن میں حافظ صاحب نے جہاں سادگی، آسانی اور تسلسل کو مدنظر رکھا ہے وہاں قرآن کے نبر و تنغیم اور اعراب کا بھی لحاظ رکھا ہے، ترجمہ معتبر اور مستند ہے۔ کثیر تعداد میں لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اللہ مزید برکتوں سے نوازے۔ تفسیر القرآن میں بھی حافظ صاحب کا انداز سادہ اور عام فہم ہے۔ ایک طرف اس تفسیر کو تفسیر بالماثور کا شاندار نمونہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی آیات کی تفسیر احادیث اور آثار صحابہ سے کی گئی ہے اور دوسری طرف یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے کہ کوئی پختہ عالم دین ہو یا عام پڑھا لکھا یا کم پڑھا لکھا، سب اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حافظ صاحب تدریس کا طویل تجربہ رکھتے ہیں اور تقریباً اتنے ہی عرصہ سے خطیب بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں گہرا علمی شعور عطا کیا ہے اور نصوص کا وسیع مطالعہ بھی ہے۔ مسائل کے استنباط میں سلف کا منہج پیشِ نظر رہتا ہے اور ہر شخص سے اس کی سطح پر جا کر بات کرتے ہیں اور اس کی ذہنی الجھن کو دور کرتے ہیں، اکثر سوال پوچھنے والے مطمئن ہوتے ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو داعی، مدرس، فقیہ اور خطیب کی خوبیاں عطا کی ہیں۔ پھر طبیعت میں ظرافت بھی ہے اور عاجزی بھی۔ بچے بھی دل کی بات حافظ صاحب سے کہہ لیتے ہیں اور بڑے تو ہر راز کھول دیتے ہیں اور پورا اعتماد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو ایسی جماعت کی نعمت بھی عطا کی ہے جو دعوت و جہاد کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ قدم قدم پر مسائل پیش آتے ہیں تو اکثر ان مسائل کے حل کے لیے حافظ صاحب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ اجتماعی مسائل، جماعتی کیفیات اور حالات انسان کی بہت تربیت کرتے ہیں اور پھر اس زبان اور قلم سے جو جملہ بھی نکلتا ہے اس میں گہرائی، پختگی اور فقہ الواقع کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب شخصیت کے فکر پر قرآن و حدیث اور منہج سلف حاوی ہو اور عمل میں اللہ کا تقویٰ ہو۔ حافظ صاحب کی تفسیر میں بحمد اللہ تعالیٰ ان کے علم، تجربہ اور شخصیت کا اثر موجود ہے، اللہ قبول فرمائے۔ آمین !

غالباً 1988ء کی بات ہے میں نے ایک ماہانہ رسالے میں حافظ عبدالسلام صاحب کا لکھا ہوا تفسیر کے موضوع پر ایک کالم پڑھا، بہت پسند آیا، پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے بہت سے سوالات کا جواب مجھے قرآن سے مل رہا ہے۔ پھر حافظ صاحب سے رابطے بڑھتے گئے اور جماعتی امور میں لمبا عرصہ اکٹھے کام کرنے کا اللہ نے

موقع دیا۔ ہمیشہ سے خواہش رہی کہ حافظ صاحب کو تفسیر کے کام کے لیے آمادہ کیا جائے، گاہے گاہے بات بھی ہوتی رہی۔ مجالس میں بھی یہ موضوع زیرِ بحث آتا رہا۔ بالآخر جماعت کی ایک بڑی مجلس میں فیصلہ ہوا اور حافظ صاحب نے ذمہ داری قبول کر لی۔ کام شروع کیا تو ایک آزمائش آ گئی، حافظ صاحب کی طبیعت کافی علیل ہو گئی۔ ہم نے اللہ سے بار بار دعا کی کہ اللہ صحت و عافیت سے نوازے تاکہ حافظ صاحب تفسیر کا کام مکمل کریں۔ الحمد للہ دعائیں قبول ہوئیں، اللہ نے صحت دی۔ حافظ صاحب مسلسل محنت کے ساتھ تفسیر پر کام کر رہے ہیں۔ اللہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے اور عام لوگوں کے لیے مفید بنائے۔ (آمین)

محمد سعید

(امیر جماعۃ الدعوۃ پاکستان)

یکم رمضان ۱۴۳۲ھ

عرضِ مترجم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ، أَمَّا بَعْدُ !

قرآن مجید کے تراجم مختلف زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، اردو زبان کو بھی یہ سعادت سیکڑوں تراجم کی صورت میں حاصل ہے۔ ہر مترجم نے اس کے لیے اپنی بہترین کوشش کی ہے اور چند گمراہ لوگوں کو چھوڑ کر ہر ترجمہ کسی نہ کسی خصوصیت اور خوبی کا حامل ہے۔ اتنے تراجم کی موجودگی میں ایک نئے ترجمے کی بظاہر کوئی ضرورت نظر نہیں آتی، مگر میں نے جو تراجم میسر ہو سکے بغور پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ نئے ترجمے کی اب بھی ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ برصغیر میں قرآن مجید کے ترجمے کا جو شرف شاہ ولی اللہ اور ان کے نامور بیٹوں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ کے حصے میں آیا وہ کسی سے مخفی نہیں، بعد میں آنے والے سب لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور اب بھی کوئی ترجمہ کرنے والا ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا ترجمہ فارسی میں ہے اور نہایت واضح اور مفید ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کا ترجمہ بامحاورہ اردو میں اور شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کا ترجمہ لفظی ہے اور دونوں بہترین ترجمے ہیں۔ ان کے بعد اکثر حضرات کے تراجم بامحاورہ اور چند ایک کے لفظی ہیں، مگر ان تمام تراجم کے باوجود کام کی گنجائش باقی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں آنے والا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف بے مقصد نہیں ہو سکتا، مگر اکثر تراجم میں کئی الفاظ کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے، الفاظ میں حروف کی کمی بیشی کو ترجمے کے وقت ملحوظ نہیں رکھا گیا، الفاظ کی تقدیم و تاخیر سے معنی میں جو تاکید یا حصر پیدا ہوتا ہے اس کا خیال نہیں کیا گیا اور بعض تراجم میں ایک جگہ ان میں سے کسی چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے تو دوسری جگہ اس کا خیال نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ بعض تراجم میں قرآن کے الفاظ سے زائد الفاظ ترجمے میں داخل کر دیے گئے ہیں، جنھیں تشریح کہا جا سکتا ہے، کلام اللہ کا ترجمہ نہیں۔

اس لیے ایسے ترجمے کی ضرورت باقی ہے جس میں قرآن مجید کے کسی لفظ کا ترجمہ چھوڑا نہ گیا ہو اور اس سے زائد ترجمہ میں داخل نہ کیا گیا ہو۔ میں نے اپنی طاقت کے مطابق یہ کام کیا ہے، مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں حق ادا نہیں کر سکا اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص بھی یہ حق ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ سو فیصد ممکن نہیں، خصوصاً عربی زبان جو نہایت جامع زبان ہے، جس کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہیں، اس کے الفاظ کا تمام مطالب ادا کرنے والا اردو میں متبادل لانا ممکن نہیں، پھر اللہ کا کلام، جس کے ہر حرف میں معانی کا ایک جہان موجود ہے، جس کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثل پوری مخلوق مل کر بھی نہیں بنا سکتی، اس کا ایسا ترجمہ جس میں تمام معانی و مطالب اور فصاحت و بلاغت کے تمام نکات آ سکیں، کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر بھی ہم وسعت کے مطابق مکلف ہیں اور امید ہے میرے ترجمے سے کام کرنے والوں کو راستہ ملے گا اور

نوٹ: قارئین سے گزارش ہے کہ ترجمہ پڑھنے سے پہلے عرض مترجم اچھی طرح پڑھ لیں، تا کہ اس ترجمہ سے صحیح فائدہ اٹھایا جا سکے۔

وہ مزید بہتر کی کوشش کر سکیں گے۔ میں نے لفظی ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ حتی الامکان آیت کے ہر لفظ کا ترجمہ آ جائے اور اسے اردو محاورے کے مطابق بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ترجمہ میں جن باتوں کا خیال رکھا گیا ہے وہ سب اس مختصر تحریر میں نہیں آ سکتیں، ہاں دوسرے تراجم ساتھ رکھ کر پڑھنے سے ان کا اندازہ ہو سکتا ہے، ان میں سے بطور مثال چند ایک یہ ہیں:۔

① صیغۂ مبالغہ کا ترجمہ:

عربی زبان کے کچھ اوزان معنی میں مبالغہ کے لیے وضع کیے گئے ہیں، مثلاً ''قادر'' اور ''قدیر''، ''عالم'' اور ''علیم'' کے معنی میں فرق ہے، مگر اکثر تراجم میں ''قدیر'' کا معنی قادر، یا قدرت رکھنے والا اور ''علیم'' کا معنی جاننے والا، یا واقف کیا گیا ہے، جب کہ ''قدیر'' کا معنی پوری طرح قادر، یا خوب قدرت رکھنے والا اور ''علیم'' کا معنی خوب جاننے والا، یا پوری طرح واقف ہونا چاہیے۔ بعض حضرات نے کچھ الفاظ کے ترجمے میں اس کا خیال رکھا ہے کچھ میں نہیں رکھا، بعض نے ایک لفظ کے ترجمہ میں ایک جگہ یہ بات ملحوظ رکھی ہے اور دوسرے مقامات پر ملحوظ نہیں رکھی۔ میں نے ''رحمان، رحیم، علیم، حکیم، عزیز، عفوّ، غفور، توّاب'' اور دوسرے تمام الفاظ میں، جہاں بھی وہ آئے ہیں، اس بات کا خیال رکھا ہے۔

② حروف تاکید:

عربی زبان میں تاکید کے لیے بہت سے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، مثلاً حروف قسم، اِنَّ، لام تاکید، نون تاکید وغیرہ، بعض اوقات ایک ہی جملہ میں تاکید کے لیے کئی حروف لائے جاتے ہیں، اردو محاورہ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا، اس لیے بعض مترجمین نے تو اردو محاورے کو مقدم رکھتے ہوئے تاکید کے حروف کا ترجمہ ہی نہیں کیا، یا ایک حرف کا ترجمہ کر کے باقی کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یٰس میں ﴿ اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴾ اور ﴿ اِنَّاۤ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴾ کا ایک ہی ترجمہ کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دوسری آیت میں ''لام'' محض بے فائدہ ٹھہرتا ہے، جب کہ ایسا خیال کرنا بھی درست نہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تاکید کے کسی حرف کا مفہوم ترجمے میں آنے سے رہ نہ جائے۔ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ ''لام'' کا ترجمہ ''البتہ'' اور ''اِنَّ'' کا ترجمہ ''تحقیق'' سے کرتے ہیں، مگر یہ دونوں لفظ موجودہ دور میں اردو میں عام مستعمل نہیں، اس لیے میں نے تاکید کے عام مستعمل الفاظ میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ''لام تاکید، نون تاکید ثقیلہ وخفیفہ، اِنَّ اور قد'' کے لیے ''ضرور، بے شک، یقیناً، بلاشبہ، کوئی شک نہیں، ہر صورت، حقیقت یہ ہے، واقعہ یہ ہے، لازماً، فی الواقع، واقعی'' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں اور بعض اوقات لفظ ''تو'' استعمال کیا ہے، مثلاً یوسف علیہ السلام کے قول ﴿ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴾ کا ترجمہ ''یقیناً ہم تو اس وقت ظالم ہوں گے۔'' تاکید کے لیے ''تو'' کا استعمال میں نے بڑے بڑے جلیل القدر علماء کے تراجم سے سیکھا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ تاکید کے تمام الفاظ کا ترجمہ کرنا اور پھر محاورے اور کلام کی روانی بھی ملحوظ رکھنا کتنا مشکل کام ہے، مگر ان شاء اللہ تاکید کے زیادہ سے زیادہ الفاظ کے مفہوم کی ادائیگی کے ساتھ محاورے کی حتی الوسع کوشش سے قارئین محظوظ ہوں گے اور محسوس کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بات کس قدر تاکید کے ساتھ فرمائی ہے۔ اگرچہ تاکید کے ہر لفظ کا ترجمہ پھر بھی نہیں ہو سکا اور حقیقت یہ ہے کہ ہو بھی نہیں سکتا۔

③ تنوین:

عربی میں تنوین بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوتی ہے، مثلاً تنکیر، تعظیم، تحقیر وغیرہ، میں نے کوشش کی ہے کہ ہر

تنوین کا موقع کے مناسب ترجمہ آجائے، مثلاً ﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾ [البقرة : ١٠] ''ان کے دلوں ہی میں ایک بیماری ہے۔'' ﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ ﴾ [التوبة : ٢٨] ''اور اگر تم کسی قسم کے فقر سے ڈرتے ہو تو اللہ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔'' ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ [الطور : ٢١] ''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے۔''

قارئین ہر تنوین پر ٹھہر کر ترجمے پر غور فرمائیں گے تو ان پر ہر مقام میں میری محنت واضح ہو جائے گی۔ تنوین کا مفہوم بھی میں نے اپنے پاس سے نہیں بلکہ کسی نہ کسی تفسیر سے اخذ کر کے لکھا ہے۔

④ مفعول مطلق :

عربی زبان میں تاکید کے لیے فعل کے بعد مصدر لایا جاتا ہے، عام طور پر اس کا ترجمہ محاورہ کی مشکل کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا ہے، میں نے اس کا ترجمہ بھی کیا ہے اور ہر مقام پر مصدر کی تنوین کے مفہوم کو مدنظر رکھا ہے، مثلاً ﴿ وَ كُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴾ [بنی إسرائيل : ١٢] ''اور ہر چیز، ہم نے اسے کھول کر بیان کیا ہے، خوب کھول کر بیان کرنا۔'' ﴿ فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴾ [بنی إسرائيل : ١٦] ''تو اس پر بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر ہم اسے برباد کر دیتے ہیں، بری طرح برباد کرنا۔''

⑤ ''مِنْ'' کا استعمال :

لفظ ''مِنْ'' بھی کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً ''بیان'' کے لیے، ''بعض'' کا معنی دینے کے لیے، ''تاکید'' کے لیے، ''تعلیل'' کے لیے وغیرہ، ہر مقام کے مطابق ترجمے کے لیے بہت محنت درکار ہے، مثلاً ﴿ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ [الجمعة : ١٠] ''اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو۔'' ﴿ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ﴾ [الزمر : ٢٧] ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال بیان کی ہے۔'' ﴿ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ﴾ [الحج : ٢٢] ''جب کبھی ارادہ کریں گے کہ سخت گھٹن کی وجہ سے اس سے نکلیں، اس میں لوٹا دیے جائیں گے۔'' ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴾ [الممتحنة : ١٣] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ غصے ہو گیا، جو آخرت سے اسی طرح ناامید ہو چکے ہیں جس طرح وہ کافر ناامید ہو چکے ہیں جو قبروں والے ہیں۔''

⑥ إِذَا مَا :

عام طور پر چند الفاظ کو زائد کہہ کر ترجمہ میں ان کا خیال نہیں کیا جاتا، حالانکہ کوئی سمجھدار آدمی بھی کوئی لفظ بلا مقصد نہیں بولتا تو رب العالمین کے کلام میں کوئی لفظ بے مقصد کیسے ہو سکتا ہے۔ ان الفاظ میں سے ایک '' مَا '' ہے، مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا ﴾ [الزمر : ٧١] دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا ﴾ [حٰمٓ السجدة : ٢٠] اب

دونوں کا ایک ہی ترجمہ ہو تو ''مَا'' بالکل بے فائدہ ٹھہرتا ہے۔ زمخشری نے فرمایا: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ ﴾ میں ''اِذَا'' کے بعد ''مَا'' اس کی تاکید کے لیے ہے۔ تاکید کا مطلب یہ ہے کہ آگ کے پاس پہنچنے کا وقت ہی ان پر شہادت کا وقت ہوگا، یہ نہیں کہ کچھ وقت شہادت سے خالی ہے۔ تو اس لیے میں نے ''اِذَا'' کا ترجمہ ''جب'' اور ''اِذَا مَا'' کا ترجمہ ''جونہی'' کیا ہے، مثلاً ﴿ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ﴾ [یونس : ٥١] ''کیا پھر جونہی وہ (عذاب) آپڑے گا تو اس پر ایمان لے آؤ گے؟''

⑦ اِمَّا :

یہ لفظ ''إن'' شرطیہ اور ''ما'' سے مرکب ہے، عام طور پر ''إن'' اور ''إمّا'' دونوں کا ترجمہ ''اگر'' کیا جاتا ہے، مگر اس صورت میں ''ما'' بے فائدہ ٹھہرتا ہے، میں نے ترجمہ میں اس کا خیال رکھا ہے، مثلاً ﴿ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ ﴾ [بنی إسرائیل : ٢٣] ''اگر کبھی تیرے پاس دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ ہی جائیں تو ان دونوں کو ''اف'' مت کہہ۔'' شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں فرمایا: ''إن'' شرطیہ اور ''ما'' ابہامیہ ہے۔'' تو میں نے ''إن'' شرطیہ کے ساتھ ''ما'' کے ابہام اور نون تاکید کے مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا ہے۔ دوسری مثال ﴿ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ ﴾ [الأنفال : ٥٧] ''پس اگر کبھی تو انھیں لڑائی میں پا ہی لے۔'' ﴿ وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ ﴾ [یونس : ٤٦] ''اور اگر کبھی ہم تجھے اس کا کچھ حصہ واقعی دکھلا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں۔'' دوسرے تراجم میں اس ''مَا'' اور نون تاکید کا ترجمہ شاید ہی ملے گا۔

⑧ ''اَنْ'' زائدہ:

﴿ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا ﴾ [هود : ٧٧] اور ﴿ وَ لَمَّاۤ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا ﴾ [العنکبوت : ٣٣] دونوں آیات کا ترجمہ ''اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے'' کیا جاتا ہے، میں نے ''اَنْ'' کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر دوسری آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے: ''اور جیسے ہی ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے۔'' ﴿ فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ﴾ [یوسف : ٩٦] ''پھر جیسے ہی خوشخبری دینے والا آیا اس نے اسے اس کے چہرے پر ڈالا تو وہ پھر بینا ہوگیا۔''

⑨ ''باء'' زائدہ:

بعض اوقات نفی کے بعد ''باء'' آتی ہے جو نفی کی تاکید کے لیے ہوتی ہے، عام طور پر ترجمہ میں اس کا خیال نہیں کیا جاتا، میں نے حتی الوسع اس کا لحاظ رکھا ہے، مثلاً ﴿ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [البقرة : ٨] ''حالانکہ وہ ہرگز ایمان والے نہیں۔'' ﴿ وَ مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ [فاطر : ٢٢] ''اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے۔'' اس فرق کی وجہ سے ﴿ لَسْتَ مُؤْمِنًا ﴾ [النساء : ٩٤] کا معنی ''تو مومن نہیں'' اور ﴿ وَ مَاۤ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النور : ٤٧] کا معنی ہوگا ''اور یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہیں۔''

⑩ ''الف لام'' کا مفہوم:

''الف لام'' عربی زبان میں کئی معانی کے لیے آتا ہے، مثلاً ''تعریف، تخصیص، استغراق، جنس، عہد'' وغیرہ، مثلاً ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الفاتحة] ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' ﴿فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴾ [المزمل:١٦] ''سو فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے پکڑ لیا، نہایت سخت پکڑنا۔'' میں نے موقع کے مناسب ہر ''الف لام'' کے مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

⑪ حصر کا مفہوم:

خبر پر ''الف لام'' آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً ﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ﴾ [الملك:٢] ''اور وہ سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے'' کے بجائے ''اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے'' ہوگا۔ اکثر تراجم میں یہ خیال نہیں رکھا گیا، بعض تراجم میں ایک جگہ یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے تو دوسری جگہ اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

⑫ تخصیص:

کوئی اسم یا جار مجرور، جس کا محل بعد میں ہو، جب اسے پہلے لایا جائے تو اس سے تخصیص پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً ﴿قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ ﴾ [الزمر : ١٤] ''کہہ دے میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں۔'' ﴿وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴾ [الذاريات : ٢٢] ''اور آسمان ہی میں تمھارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو۔'' ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ [الملك : ١] اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے ''بہت بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے'' مگر اس سے ''بِيَدِهِ'' کو پہلے لانے کا اور ''الْمُلْكُ'' کے ''الف لام'' کا معنی ادا نہیں ہوتا، اس لیے اس کا ترجمہ یہ ہونا چاہیے ''بہت برکت والا ہے وہ کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔''

⑬ الفاظ کے زائد حروف کا لحاظ:

لفظ میں بعض حروف کے اضافے سے معنی بدل جاتا ہے، مثلاً ''نَزَلَ'' کا معنی ''وہ اترا'' اور ''اَنْزَلَ'' کا معنی ''اس نے اتارا'' اور بعض اوقات طلب یا دوسرے معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر حرف کے اضافے کے باوجود معنی ایک ہی ہو تو معنی میں زیادتی مراد ہوتی ہے، مثلاً ﴿يَسْخَرُوْنَ ﴾ [صافات : ١٢] اور ﴿يَسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ [صافات : ١٤] دونوں کا معنی ''مذاق اڑاتے ہیں'' کیا جائے تو ''سین'' اور ''تاء'' کا اضافہ بے فائدہ ٹھہرتا ہے، اس لیے ﴿يَسْتَسْخِرُوْنَ ﴾ کا معنی ہوگا ''خوب مذاق اڑاتے ہیں۔'' اس فرق کا لحاظ بہت کم مترجمین نے رکھا ہے۔ بطور مثال چند آیات '' يَذْبَحُوْنَ'' کی بجائے ﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ ﴾ [البقرة : ٤٩] ''تمھارے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتے تھے۔'' اور ''حَيَاءٍ'' کے بجائے ﴿فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ﴾ [القصص : ٢٥] ''تو ان دونوں میں سے ایک بہت حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔'' اسی طرح ﴿فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ﴾ [طٰهٰ : ٧١] ''پس یقیناً میں ہر صورت تمھارے ہاتھ اور تمھارے

پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا اور ضرور ہر صورت تمھیں کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا۔" ﴿ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴾ [الأحزاب : ٦١] "جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے، بری طرح ٹکڑے کیا جانا۔" ﴿ فَلَمَّا اسْتَايْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ﴾ [یوسف: ٨٠] "پھر جب وہ اس سے بالکل ناامید ہوگئے تو مشورہ کرتے ہوئے الگ جا بیٹھے۔" ﴿ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف: ١٨٥] "اور کیا انھوں نے نگاہ نہیں کی آسمانوں اور زمین کی عظیم الشان سلطنت میں۔" ﴿ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [الأنعام : ٥٥] "اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے۔" ان آیات کے خط کشیدہ الفاظ اور ان کے ترجمہ پر غور فرمائیں، ہر زائد حروف کا مفہوم ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

⑭ صیغے کے مطابق ترجمہ:

قرآن مجید میں آنے والے ہر لفظ کا ترجمہ میں نے اس کے صیغے کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً فعل ماضی، فعل مضارع، اسم فاعل، اسم مفعول وغیرہ۔ ہاں جملہ شرطیہ ہونے یا سیاق کلام کی وجہ سے ماضی کا معنی مضارع میں یا مضارع کا معنی ماضی میں کرنا ضروری ہو تو اسے بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

⑮ آسان اردو میں ترجمہ:

ترجمہ زیادہ سے زیادہ آسان اردو میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے، فارسی یا عربی الفاظ میں ترجمہ سے مطلب ادا ہو بھی جائے تو عام آدمی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مثلاً بعض اردو ترجمہ کرنے والوں نے "مُرْسَلُوْنَ" کا ترجمہ "فرستادگان الٰہی"، "كَذَّابٌ اَشِرٌ" کا ترجمہ "برخود غلط"، "الْحَمِيْدُ" کا ترجمہ "ستودہ" اور "رَيْبَ الْمَنُوْنِ" کا ترجمہ "حوادث دہر" کیا ہے، اس لیے اس سے احتراز کیا گیا ہے۔

⑯ لام امر کا ترجمہ:

عام طور پر امر غائب کا ترجمہ لفظ "چاہیے" سے شروع کیا جاتا ہے، مثلاً ﴿ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ﴾ [المائدة : ٤٧] "اور چاہیے کہ اہل انجیل اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔" میں نے کوشش کی ہے کہ لفظ "چاہیے" کے بغیر امر کا مفہوم ادا ہو جائے، یا پھر "چاہیے" کے بجائے "لازم ہے" استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت کا ترجمہ ہوگا "اور لازم ہے کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔"

⑰ "كَانَ" کا ترجمہ:

تقریباً تمام مترجمین نے ﴿ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [آل عمران : ٣١] اور ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [الفرقان : ٧٠] کا ایک ہی ترجمہ کیا ہے کہ "اور اللہ غفور رحیم ہے"، اسی طرح ﴿ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة : ٤٠] اور ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ [الفتح : ٧] کا اور دوسری تمام صفات کا جو " كَانَ " کے بغیر آئی ہیں، یا " كَانَ " کے ساتھ آئی ہیں، ایک ہی ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح " كَانَ " محض بے فائدہ ٹھہرتا ہے، جب کہ " كَانَ " ماضی میں خبر کے ثبوت کے لیے

آتا ہے۔ اب اگر ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ کا ترجمہ ''اور اللہ غفور رحیم تھا'' کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب وہ ایسا نہیں، حالانکہ یہ بات غلط ہے اور اگر اس کا ترجمہ ''اور اللہ غفور رحیم ہے'' کریں تو ''کَانَ'' کا کچھ مطلب نہیں رہتا۔

ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ مشکل حل فرمائی ہے، صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ حم السجدۃ میں ہے کہ ایک آدمی نے ان سے چند سوالات کیے، جن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾، ﴿ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾، ﴿ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ تو گویا وہ ماضی میں ان صفات سے موصوف تھا، پھر نہ رہا۔ تو انھوں نے جواب دیا: ''سَمّٰى نَفْسَهُ ذٰلِكَ، وَ ذٰلِكَ قَوْلُهُ، اَیْ لَمْ یَزَلْ كَذٰلِكَ، فَاِنَّ اللّٰهَ لَمْ یُرِدْ شَیْئًا اِلَّا اَصَابَ بِهِ الَّذِیْ اَرَادَ'' خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہ اسماء وصفات ماضی میں بھی تھے اور ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ گویا ''کَانَ'' یہاں دوام کے لیے ہے، جو ہمیشگی پر دلالت کر رہا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق ان آیات کا ترجمہ یوں ہوگا: ''اور اللہ ہمیشہ سے غفور رحیم ہے'' ''عزیز حکیم ہے'' ''سمیع بصیر ہے۔'' اس طرح اردو تراجم میں ''کَانَ'' کے مفہوم کی ادائیگی میں پائی جانے والی کمی ان شاء اللہ پوری ہوگئی۔ بعض عربی مفسرین نے ''کَانَ'' کے اس مفہوم کو مختلف مقامات پر اجاگر کیا ہے، مثلاً ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ﴾ [بنی إسرائیل: ۳۲] کی تفسیر میں ابوحیان نے فرمایا: ''اَلْمَعْنٰى لَمْ یَزَلْ اَیْ لَمْ یَزَلْ فَاحِشَةً'' [البحر المحیط] یعنی ''وہ ہمیشہ سے بے حیائی ہے۔''

اسی طرح ﴿ كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴾ [مریم: ۲۹] کے متعلق فرمایا: '' اَیْ لَمْ یَزَلْ '' [البحر المحیط] یعنی ''ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے۔'' ﴿ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴾ [الأنبیاء: ۱۰۴] بقاعی نے فرمایا: ''اَیْ أَزَلًا وَ أَبَدًا'' [نظم الدرر] ''یہ وعدہ ہمارے ذمے ہے، یقیناً ہم ہمیشہ (پورا) کرنے والے ہیں۔'' اردو تفاسیر میں ایک مفسر نے ایک مقام پر ترجمے میں یہ بات ملحوظ رکھی ہے، چنانچہ انھوں نے ﴿ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴾ [طٰہٰ: ۳۵] کا ترجمہ کیا ہے ''تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران رہا ہے۔''

''کَانَ'' اس کے علاوہ بھی کئی معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن کا لحاظ تقریباً سبھی مترجمین نے رکھا ہے۔ (والحمد للہ) البتہ بعض اوقات ''کَانَ'' نسبت کی تاکید کے لیے آتا ہے، اسے اردو ترجمے میں ادا کرنا بہر حال مشکل ہے۔

⑱ نفی کے ساتھ ''کَانَ'' کا ترجمہ:

نفی والے جملے میں ''کَانَ'' کا مفہوم شاید ہی کسی مترجم نے ادا کیا ہو۔ یہ مفہوم لفظ ''کبھی'' سے ادا ہو جاتا ہے۔ (ان شاء اللہ) مثلاً ﴿ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴾ [بنی إسرائیل: ۲۰] ''اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں۔'' ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بنی إسرائیل: ۱۵] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔'' ''مَا كَانَ'' کے دوسرے معانی، مثلاً ''لائق نہیں، ممکن نہیں'' وغیرہ کا لحاظ تمام مترجمین نے رکھا ہے۔ [والحمد للہ]

یہ چند چیزیں مثال کے طور پر ذکر کی گئی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے علماء ان سے بے خبر تھے، یقیناً وہ ہم سے زیادہ

عالم تھے اور انھوں نے ایک دو چیزیں چھوڑ کر ان سب باتوں کا بلکہ ان سے بھی باریک معانی کا لحاظ رکھا ہے، مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہو سکا، یہ ایک عاجز بندے کی کوشش ہے جو ان شاء اللہ آنے والے بھی کرتے رہیں گے۔

دوران ترجمہ پچیس اردو اور فارسی تراجم میرے زیر نظر رہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ بعض مفاہیم کی تعیین کے لیے مجھے کتنی ہی عربی کتب، یعنی تفسیر، حدیث، لغت، ادب اور بلاغت کی کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد وحساب شکر ہے جس نے اس کام کی توفیق بخشی اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ فَلَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الشُّكْرُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، اَللّٰهُمَّ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ.

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے اس مبارک کام میں تعاون فرمایا، ان میں سب سے پہلے امیر جماعۃ الدعوۃ محترم حافظ محمد سعید ﷾ ہیں جن کے حکم سے اس کام کا آغاز ہوا اور جن کی مسلسل حوصلہ افزائی کے ساتھ یہ کام جاری رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے فضل کے بعد اگر ان کی خصوصی توجہ نہ ہوتی اور وہ مجھے اس کام کے لیے زیادہ سے زیادہ فراغت مہیا نہ کرتے تو یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچنا مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ اپنے دین کا کام لے۔ ان کے ساتھ محترم سیف اللہ خالد مدیر ''دارالاندلس'' ہیں، جو سرمایۂ آخرت سمجھ کر اس کی تکمیل کے لیے میرا پیچھا کرتے رہے اور جنھوں نے نہایت محبت اور ذوق وشوق کے ساتھ اسے طبع کیا۔ ان کے علاوہ وہ تمام بھائی جنھوں نے ترجمے کے متعلق کوئی مشورہ دیا، یا جن کی دعائیں میرے ہمراہ رہیں، میں سب کا شکر گزار ہوں۔

علمائے کرام میں سے محترم مولانا محمد افضل، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مدیر جامعۃ الدراسات الاسلامیہ کراچی اور محترم مولانا حافظ محمد عبداللہ رفیق، شیخ الحدیث دار العلوم المحمدیہ لوکوورکشاپس لاہور نے مکمل ترجمہ پڑھا اور اس کی اصلاح کی۔ ان کے علاوہ محترم مولانا عبداللطیف، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مدیر المعہد العالی مرکز البدر بہاولپور نے آخری پندرہ پارے پڑھے اور ان کی اصلاح کی۔ محترم مولانا مبشر احمد ربانی، مفتی جماعۃ الدعوۃ، محترم مولانا محمد رمضان، شیخ الحدیث جامعہ رحمانیہ لاہور، محترم ابو سیف محمد جمیل، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، استاد جامعۃ الدعوۃ مرید کے، محترم عبدالرحمان عابد، فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، استاذ جامعۃ الدعوۃ اور محترم سعید طیب، استاد جامعہ نے بعض اجزاء پڑھے اور مفید مشورے دیے۔ میں ان سب احباب کا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر جزیل عطا فرمائے۔ (آمین!)

پروف ریڈنگ کا کام محترم مولانا محمد اشتیاق اصغر، حافظ سعید الرحمٰن، حافظ ثناء اللہ خاں اور ابو سعد مطیع الرحمٰن نے کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ یہ کام سرانجام دیا، انھوں نے صرف پروف ریڈنگ ہی نہیں کی بلکہ مجھے بہترین مشورے بھی دیتے رہے اور جس طرح وہ بہتر سمجھتے تھے مجھ سے اجازت لے کر اصلاح بھی کرتے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے اس محنت کو قبول فرمائے اور ہم سب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ (آمین)

عبدالسلام بن محمد

جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ مرکز طیبہ مرید کے

۲۵ شعبان ۱۴۲۷ھ

مقدمہ تفسیر

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُولُهٗ، اَمَّا بَعْدُ !

آج سے چند سال پہلے جماعۃ الدعوۃ کے احباب کی مجلس میں قرآن مجید کے نئے ترجمے اور تفسیر کی ضرورت پر گفتگو ہوئی۔ محترم حافظ محمد سعید امیر جماعۃ الدعوۃ نے یہ کام میرے ذمے لگایا۔ میں نے انتیسویں اور تیسویں پارے کا ترجمہ اور تفسیر لکھی تو احساس ہوا کہ تفسیر کا کام لمبا ہے، زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، اس لیے پہلے اللہ کی توفیق سے قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کرنا چاہیے، اس کے بعد تفسیر کا کام جتنی اللہ تعالیٰ نے فرصت دی ہوتا رہے گا۔ الحمد للہ قرآن مجید کا ترجمہ مکمل ہو کر شائع ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے حُسنِ قبول سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں میری نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین) ترجمے سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ بیماری کی نذر ہو گیا، اس کے بعد اللہ کا نام لے کر تفسیر کا کام شروع کیا جس کی برکت سے طبیعت بھی بہتر ہوتی گئی۔

شروع میں خیال تھا کہ مختصر حواشی لکھے جائیں جو ایک جلد میں پورے آ جائیں، اس لیے آپ دیکھیں گے کہ ابتدائی پاروں کی تفسیر مختصر ہے، مگر آہستہ آہستہ اسے قدرے تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی جس سے بعد کے پارے قدرے مفصل ہوتے گئے۔ قرآن کی تفسیر کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا، یہ ایک عاجز بندے کی کوشش ہے جو اپنے مالک سے قبولیت کا خواستگار اور امیدوار ہے۔ [رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ]

تفسیر کا اسلوب:

اہل علم کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ صحیح تفسیر وہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ اس کے کلام کا معنی و مراد کوئی نہیں جانتا اور وہ قرآن مجید اور حدیث رسول ﷺ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر بات مختصر یا مبہم ہوتی ہے اور دوسری جگہ وہی بات مفصل اور واضح ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر، شیخ امین شنقیطی صاحبِ اضواء البیان اور علامہ قاسمی صاحبِ محاسن التاویل رحمہم اللہ نے قرآن کی تفسیر قرآن کے ساتھ کرنے کا خاص اہتمام فرمایا ہے۔ میں نے اختصار کے لیے ہر جگہ پوری آیات اور ان کا ترجمہ نقل کرنے کے بجائے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے ہیں۔ صاحبِ ذوق حضرات تھوڑی سی محنت سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

احادیث رسول ﷺ سے متعلق میں نے پوری کوشش کی ہے کہ صرف ثابت شدہ احادیث نقل کروں، اس کے لیے شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی کتب، مسند احمد اور دوسری کتب حدیث کی جدید طبعات کے محققین کی تحقیق سے راہنمائی لی ہے اور اکثر ان کی تصحیح یا تحسین کا حوالہ بھی دیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کی صحت پر امت کا اتفاق ہے، ان کے رخ روشن کو مزید کسی غازہ کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول تفسیر کا مقام ہے، کیونکہ وہ صاحبِ زبان تھے اور انھوں نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے قرآن مجید سنا اور سمجھا تھا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان کی تفسیر صحیح سند سے ثابت ہو اور اسرائیلیات سے نہ ہو۔ صحابہ جب کسی تفسیر پر متفق ہوں تو ان سے اختلاف جائز نہیں۔

تابعین کے اقوال بھی قرآن مجید سمجھنے کے لیے بہت مفید ہیں، بشرطیکہ صحیح سند کے ساتھ ان سے ثابت ہوں اور اسرائیلیات میں سے نہ ہوں۔ تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر حدیث رسول ﷺ اور اقوال صحابہ و تابعین کے ساتھ تفسیر کا بہترین ذخیرہ ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے دکتور حکمت بن بشیر کی تحقیق و تخریج کے ساتھ تفسیر ابن کثیر چھپی ہے جس میں انھوں نے مرفوع احادیث کے علاوہ صحابہ اور تابعین کے اقوال کی تخریج بھی کر دی ہے اور ہر ایک کی صحت وضُعف کا حکم بھی بیان کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ تفسیر طبری اور ابن کثیر سے فائدہ اٹھانا آسان ہو گیا ہے۔ اس کے بعد مفسرین کرام کی تفاسیر قرآن فہمی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، بشرطیکہ ان میں قرآن وسنت سے گریز اختیار نہ کیا گیا ہو اور وہ لغت عرب کے مطابق ہوں۔ قرآن مجید کے صرف ونحو اور بلاغت کے نکات کے لیے شیخ المفسرین امام طبری، زمخشری، رازی، ابوحیان، بقاعی، ابن عادل، ابن عاشور، آلوسی اور قاسمی رحمہم اللہ کی تفاسیر بہت شاندار ہیں۔ ان میں سے بعض نے ربطِ آیات کے ذکر کا اہتمام بھی فرمایا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ ان کا اجتہاد ہے، سوائے اس ربط کے جو بالکل واضح ہو، کسی ربط کو یقین سے اللہ تعالیٰ کی مراد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ''الحاوی فی تفسیر القرآن'' میں ہر آیت سے متعلق بہت سی تفاسیر پوری پوری نقل کر دی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کے فوائد و نکات کی کوئی انتہا نہیں نہ اس کے عجائب کبھی ختم ہو سکتے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ نے اس کے فہم کا دروازہ کبھی بند فرمایا ہے، ہر زمانے میں اس کے نئے سے نئے فوائد و نکات ظاہر ہوتے رہتے ہیں، اگرچہ لوگوں کے فہم اور استعداد میں بہت ہی تفاوت ہے، تاہم قرآن مجید میں غور وفکر کرنے والا کوئی شخص بقدر استعداد و محنت اللہ تعالیٰ کی اس عطا سے محروم نہیں رہتا۔ ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی کتاب ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''نہیں، ہاں اللہ کی کتاب ہے، یا وہ فہم ہے جو کسی مسلم آدمی کو دیا گیا ہو یا جو اس صحیفے میں ہے۔'' ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اس صحیفے میں کیا ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''دیت کے مسائل، قیدی کو چھڑانا اور یہ کہ کوئی مسلم کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔'' [بخاري، العلم، باب كتابة العلم : ١١١]

ضعیف اور موضوع روایات:

اکثر کتبِ تفسیر کے حسن کو داغ دار کرنے والی سب سے بڑی چیز ضعیف (کمزور) اور موضوع (من گھڑت) روایات ہیں۔ ان روایات نے یہود و نصاریٰ، مستشرقین اور دوسرے غیر مسلم لوگوں کو اور خصوصاً اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ملحدوں اور منکرین حدیث کو اسلام پر طعن کا موقع فراہم کیا ہے، حالانکہ ان روایات کا اسلام اور رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ کی تفسیر کہ "نٓ" سے مراد وہ مچھلی ہے جس کی پشت پر زمین رکھی ہوئی ہے اور ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ کی تفسیر کہ "قٓ" سے مراد ایک پہاڑ ہے جس نے پوری زمین کو گھیر رکھا ہے وغیرہ۔

کسی بھی مفسر کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ صرف وہ روایت نقل کرے جو صحیح یا حسن سند کے ساتھ ثابت ہو، اگر کوئی دوسری روایت بیان کرے تو اس کا باطل یا ضعیف ہونا بھی بیان کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ » "جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔" [بخاری، العلم، باب إثم من كذب على النبي ﷺ : ١١٠، عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما] بلکہ جس کے ثابت ہونے میں شک ہو وہ بیان کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ حَدِيْثًا يُرٰى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ » "جو شخص مجھ سے کوئی بات بیان کرے جس کے متعلق وہ گمان کرتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹ بولنے والوں میں سے ایک ہے۔"

[مسلم، المقدمة، باب وجوب الرواية عن الثقات......، عن المغيرة بن شعبة و سمرة بن جندب رضی اللہ عنہما]

حقیقت یہ ہے کہ تحقیق اور یقین کے بغیر کسی کے ذمے کوئی بات لگانا جھوٹ ہی کی ایک قسم ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ » "آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے اسے بیان کر دے۔" [مسلم، المقدمة : ٥، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] قدیم مفسرین اور محدثین روایت کی سند بیان کر کے اپنے آپ کو صحت یا ضُعف بیان کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش سمجھتے ہیں کہ لوگ سند دیکھ کر خود تحقیق کر لیں گے۔ ممکن ہے اس وقت کے اکثر علماء راویوں کے حالات سے عام طور پر آگاہ ہوں اور سند دیکھ کر صحیح اور ضعیف کی پہچان کر لیتے ہوں، مگر اس وقت بھی خالص صحیح احادیث علیحدہ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی، جس کے لیے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے صحیحین تصنیف کر کے امت کی راہنمائی کا عظیم فریضہ سرانجام دیا۔ ان کے بعد اور ائمہ نے بھی یہ فریضہ سرانجام دیا، مگر شیخین کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکے۔

کتب تفسیر میں عام طور پر اس بات کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ خصوصاً بدعتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات مثلاً باطنی، معتزلی، خارجی، رافضی، جہمیہ اور قدریہ سے تعلق رکھنے والے مفسرین کے ہاں اس کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح ہمارے زمانے کے متجدّد اور عقل پرست مصنفین کا بھی یہی حال ہے، ان میں سے بعض مفسرین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ تفسیر کرتے ہوئے کسی مسئلہ میں بہت سی روایات ذکر کر دیں گے، جن میں بخاری اور مسلم کی صحیح احادیث بھی ہوں گی اور

تیسرے طبقے کی کتابوں کی ضعیف روایات بھی، مثلاً بیہقی، طبرانی وغیرہ۔ پھر صحیح بخاری اور مسلم کی صحیح ثابت احادیث کے بجائے کسی کمزور روایت کو یہ کہہ کر ترجیح دے دیں گے کہ یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے اور اپنے اس طرزِ عمل کے لیے انھوں نے اصولِ حدیث کے مسلمہ قواعد کو پس پشت ڈالتے ہوئے ذوق، وجدان اور مزاج شناسیٔ رسول اللہ ﷺ کو حدیث کی صحت و ضُعف کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ یہی حال فقہی فرقوں کے ان متعصب حضرات کا ہے جن کے ہاں صحت وضعف کا فیصلہ ان کے فرقے کے ائمہ کے فقہی اقوال کو مدِنظر رکھ کر ہوتا ہے۔ مقصد سب کا اپنی مرضی کی ضعیف اور موضوع روایات کو رائج کرنا اور صحیح ثابت احادیث سے جان چھڑانا ہے۔ باطنی فرقوں کے پیروکار لوگوں نے تصوف کے پردے میں وحدۃ الوجود کے نام پر خالق و مخلوق کو ایک قرار دے کر اصولِ حدیث ایک طرف، مکمل قرآن و حدیث اور اسلام ہی کو بے معنی قرار دینے کی کوشش کا نام تفسیرِ قرآن رکھا ہے، جو دراصل تحریفِ قرآن ہے۔ بعض صوفی حضرات براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور آپ ﷺ سے سننے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان کے مریدوں کے لیے وہ جو بھی کہہ دیں حدیث ہے، خواہ وہ واضح طور پر رسول اللہ ﷺ پر بہتان ہو۔ بعض " حَدَّثَنِیْ قَلْبِیْ عَنْ رَبِّیْ " (میرے دل نے مجھے میرے رب سے بیان کیا) کہہ کر قرآن و حدیث سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

الحمد للہ علمائے حدیث کی محنت سے اب یہ ذوق عام ہو رہا ہے کہ حدیث کی صحت وضُعف کو دیکھا جائے اور صرف صحیح احادیث قبول کی جائیں۔ کتبِ احادیث کی جدید طبعات تحقیق کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ اس کام میں شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ، ان کے شاگردوں اور سعودی عرب اور مصر و شام کے محقق علماء کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اردو میں ہمارے عزیز بھائی سیف اللہ خالد نے اپنی تفسیر ''دعوۃ القرآن'' میں ہر آیت سے متعلق صحیح احادیث کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ اللہ کے فضل سے میں نے بھی اس تفسیر میں صرف صحیح وحسن احادیث کا التزام کیا ہے۔ اگر کوئی خطا ہوئی ہے تو جان بوجھ کر نہیں اور آگاہ ہونے پر ہر وقت اصلاح کا عزم موجود ہے۔ (الحمد للہ)

اسرائیلیات:

کتبِ تفسیر کے اعتبار کو مجروح کرنے والی دوسری چیز اسرائیلی روایات کی بھر مار ہے۔ محقق علماء مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ نے تصریح کی ہے کہ اسرائیلی روایات کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ جن کی قرآن یا حدیث نے تصدیق کی ہے، انھیں بیان کرنا بالاتفاق جائز ہے، دوسری وہ جن کی قرآن یا حدیث نے تکذیب کی ہے، انھیں ان کے باطل ہونے کی صراحت کیے بغیر بیان کرنا حرام ہے، تیسری وہ جن کی قرآن وحدیث سے نہ تصدیق ہوتی ہے نہ تکذیب، انھیں بیان کرنا جائز ہے مگر ان پر یقین کرنا یا انھیں صحیح سمجھنا جائز نہیں۔

ایسی روایات کا عام گفتگو میں بیان کرنا جائز بھی ہو تو تفسیر قرآن کے شایانِ شان ہر گز نہیں۔ ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ! كَيْفَ تَسْأَلُوْنَ أَهْلَ الْكِتَابِ؟ وَ كِتَابُكُمُ الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلٰى نَبِيِّهِ ﷺ

أَحْدَثُ الْأَخْبَارِ بِاللّٰهِ تَقْرَءُوْنَهُ لَمْ يُشَبْ، وَ قَدْ حَدَّثَكُمُ اللّٰهُ أَنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ بَدَّلُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ وَ غَيَّرُوْا بِأَيْدِيْهِمُ الْكِتَابَ فَقَالُوْا: ﴿هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ [البقرة : ۷۹] أَفَلَا يَنْهَاكُمْ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مُسَاءَلَتِهِمْ ؟ وَلَا وَاللّٰهِ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا مِّنْهُمْ قَطُّ يَسْأَلُكُمْ عَنِ الَّذِیْ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ» ''اے مسلمانو کی جماعت! تم اہلِ کتاب سے کس طرح سوال کرتے ہو، جب کہ تمھاری کتاب جو نبی ﷺ پر نازل کی گئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی خبروں میں سب سے تازہ ہے۔ تم اسے اس حال میں پڑھتے ہو کہ اس میں کوئی ملاوٹ نہیں کی گئی اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھا تھا اہلِ کتاب نے اسے بدل دیا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اللہ کی کتاب میں تبدیلی کر دی اور کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ بہت تھوڑی قیمت حاصل کریں، تو کیا تمھارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمھیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا۔ نہیں! قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی آدمی کو کبھی تم سے اس کے متعلق سوال کرتے ہوئے نہیں دیکھا جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔'' [بخاري، الشهادات، باب لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة وغيرها : ۲٦۸۵]

صحیح ابن حبان کے محقق نے « حَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ » کے حاشیہ میں اسرائیلی روایات کی تین معروف اقسام ذکر کرتے ہوئے تیسری قسم کے متعلق لکھا ہے: ''تیسری قسم وہ ہے جس کے متعلق قرآن و حدیث خاموش ہیں، نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں نہ تکذیب، سو ہم نہ ان کا یقین کرتے ہیں اور نہ انھیں جھوٹا سمجھتے ہیں، البتہ انھیں بیان کرنا جائز ہے۔ لیکن جیسا کہ علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ جائز نہیں کہ انھیں قرآن کی تفسیر میں ذکر کیا جائے اور انھیں آیات کے معنی کے بیان کے لیے یا آیات میں غیر معین کی تعیین کے لیے یا آیات میں مجمل کی تفصیل کے لیے ایک قول یا روایت قرار دیا جائے، کیونکہ کلام اللہ کی تفسیر ان روایات کے ساتھ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایات، جن کے صدق و کذب کو ہم جانتے ہی نہیں، اللہ سبحانہ کے کلام کا معنی بیان کر رہی ہیں اور جو کچھ اس میں مجمل بیان کیا گیا اس کی تفصیل کر رہی ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب اس سے کہیں بلند ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے جب ہمیں بنی اسرائیل سے بیان کرنے کی اجازت دی تو ہمیں یہ حکم بھی دیا کہ ہم انھیں نہ سچا کہیں نہ جھوٹا، تو اس سے زیادہ تصدیق کیا ہو گی کہ ہم انھیں اللہ کی کتاب کے ساتھ ملا دیں اور انھیں اس کی تفسیر اور وضاحت کا مقام دے دیں۔ اللہ معاف فرمائے۔''

شاید بعض حضرات « حَدِّثُوْا عَنْ بَنِیْ إِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ » (بنی اسرائیل سے بیان کرو اور کوئی حرج نہیں) سے استدلال کرتے ہوئے ایسی روایات بیان کرنا جائز قرار دیتے ہوں، مگر اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ روایات بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں جن کے درست ہونے کا یقین ہو، کیونکہ جس بات کے غلط ہونے کا گمان بھی ہوا سے بیان کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ چند احادیث ملاحظہ فرمائیں، جن میں سے بعض پہلے بھی بیان ہو چکی ہیں، سمرہ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَنْ حَدَّثَ عَنِّیْ حَدِيْثًا يُرٰی أَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ » ''جو شخص مجھ سے کوئی حدیث بیان کرے جس کے متعلق وہ گمان کرتا ہو کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں میں

سے ایک ہے۔'' [مسلم، المقدمة، باب وجوب الرواية عن الثقات ......]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ » ''آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر بات جو سنے اسے بیان کر دے۔'' [مسلم، المقدمة : ٥] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور اہل اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی زبان میں کرتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا تُصَدِّقُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ وَ ﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا ﴾ » [البقرة : ١٣٦] ''اہل کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انھیں جھوٹا کہو اور یہ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا۔'' [بخاری، التفسير، باب : ﴿ قولوا آمنا بالله وما أنزل إلينا ﴾ : ٤٤٨٥]

خلاصہ یہ کہ تیسری قسم کی اسرائیلی روایات کو عام گفتگو میں ذکر کرنا جائز بھی ہو تو ان کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی تفسیر میں انھیں ذکر کرنا ہرگز جائز نہیں۔

قدیم تفاسیر میں اسرائیلیات:

قدیم مفسرین جن میں بعض تابعین بھی شامل ہیں، اسرائیلی روایات سے قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہیں، مگر یہ ذکر نہیں کرتے کہ یہ اسرائیلی روایات ہیں، بلکہ وہ ان حضرات کی اپنی تفسیر دکھائی دیتی ہے۔ بعض غیر ثقہ اور غیر محتاط راوی انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی منسوب کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے جنھوں نے اکثر مقامات پر ایسے اقوال اور روایات کا اسرائیلی ہونا اور ناقابل اعتبار ہونا واضح فرما دیا ہے۔ ایسی روایات پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے، مثلاً کوئی مفسر تابعی ہو یا غیر تابعی اور وہ پہلے زمانے کی بات اپنے پاس سے ذکر کرے، مثلاً یہ کہ عزیز مصر یا اس کی بیوی کا نام فلاں تھا، یا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے نام یہ تھے وغیرہ، تو بات خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب یہ بات قرآن و حدیث میں مذکور نہیں تو ظاہر ہے کہ ان حضرات نے یہ باتیں بنی اسرائیل سے لی ہیں اور ان پر یقین کسی صورت نہیں کیا جا سکتا۔

بعض جدید مفسرین:

بعض جدید مفسرین نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ تفسیر کرتے ہوئے قرآن کی آیات کے معنی کی وضاحت کے لیے یا ان میں غیر معین کی تعیین کے لیے یا ان میں مجمل بات کی تفصیل کے لیے تورات، انجیل اور دوسری سابقہ کتب سے صفحوں کے صفحے نقل کر دیتے ہیں اور عام لوگ ان کی وسعت علم سے مرعوب ہوتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ کتب وہ ہیں ہی نہیں جو انبیاء پر اتری تھیں، کیونکہ ان میں لوط، داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے انبیاء پر نہایت شرم ناک بہتان درج ہیں۔ اہلِ کتاب نے ان میں تبدیلی کر دی ہے اور ان کا اکثر حصہ اہلِ کتاب کا تصنیف کردہ ہے، جس میں موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور عیسیٰ علیہ السلام کی صلیب اور اس کے بعد کا تذکرہ ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں۔ اس لیے ان کی کسی بھی بات پر یقین

کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ان کتابوں سے صرف قرآن وحدیث کی تصدیق کرنے والی روایات بطورِ شاہد یا دوسری روایات بطور الزام پیش کی جاسکتی ہیں، قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ [البقرۃ : ۱] یعنی اس کتاب میں کوئی شک نہیں۔ اب کسی بھی قسم کے شک وشبہ سے پاک کتاب کی تفسیر ان روایات سے کرنا جن کی حیثیت وہم وگمان سے زیادہ کچھ نہیں، تفسیر کے نام سے قرآن مجید پر ظلم ہے۔ چونکہ میرے پیش نظر سلف صالحین کا منہج ہے، اس لیے میں نے ایسے کسی مفسر کا نام ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا، اللہ نے بھی اکثر مقامات پر یہی اسلوب اختیار کیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ ﴾ [البقرۃ : ۸] اور ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ [الحج : ۱۱] یعنی بعض لوگ یہ کہتے ہیں، بعض لوگ اللہ کی عبادت کنارے پر رہ کر کرتے ہیں وغیرہ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا طریقہ بھی یہ تھا کہ کسی شخص کا کوئی کام نادرست ہوتا تو یہ کہہ کر خطاب عام فرماتے: « مَا بَالُ أَقْوَامٍ » یعنی کیا حال ہے کچھ لوگوں کا جو اس طرح کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کئی لوگوں پر قرآن مجید یا صحیح احادیث کی مخالفت کی وجہ سے رد فرمایا، مگر کسی کا نام نہیں لیا، بلکہ ہر جگہ یہی فرمایا: ” وَ قَالَ بَعْضُ النَّاسِ “ اور بعض لوگوں نے کہا۔ الحمد للہ میں نے پوری تفسیر میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ کسی کا نام لیے بغیر غلط بات کا رد کروں۔

آثارِ قدیمہ:

کچھ مفسرین نے قرآن کی تفسیر قدیم اقوام کے کھنڈرات سے برآمد ہونے والے کتبوں سے کی ہے، جن کی زبانیں ناپید ہو چکی ہیں اور کفار نے اپنے ظن وتخمین سے انھیں پڑھا ہے، چنانچہ یہ حضرات ذوالقرنین، اس کی بنائی ہوئی دیوار، اصحابِ کہف اور اصحابِ سبت کی بستی، فراعنۂ مصر اور کشتی نوح وغیرہ سے متعلق ایسے ہی ذرائع سے تفسیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اول تو ان کتبوں کی کچھ حیثیت نہیں، پھر کفار کی ظن وتخمین پر مبنی باتوں کو تحقیق قرار دے کر ان سے قرآن کی تفسیر وہی شخص کر سکتا ہے جو وہم وگمان اور یقین واطمینان کے درمیان فرق سے ناآشنا ہو۔ اکثر لوگ ایسے مفسرین کے مغربی زبانوں یا بعض مغربی علوم سے واقفیت یا ان کی سیاسی یا مذہبی حیثیت سے مرعوب ہو کر ان کی رطب ویابس تحقیقات مانتے چلے جاتے ہیں اور ان کی تفاسیر کو عصر حاضر کا عجوبہ خیال کرتے ہیں، حالانکہ ان کی ایسی باتوں کی حیثیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اللہ کے فضل سے آپ میری اس تفسیر کو وہم وگمان پر مبنی ایسی باتوں سے پاک پائیں گے۔ (ان شاء اللہ)

تفسیر کے ماخذ:

جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ مریدکے، کے مکتبہ میں تفسیر کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، مگر کمپیوٹر میں مکتبہ شاملہ، مکتبہ ذہبیہ اور دوسرے مکتبہ جات آنے کے بعد تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، بلاغت اور دوسرے بے شمار علوم کی ہزاروں کتابیں ایسی دسترس میں آئیں کہ ایک لیپ ٹاپ نے سمندر کو قطرے میں سمو رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اجرِ جمیل عطا فرمائے جنھوں نے یہ کام سرانجام دیا

اور بے دریغ سرمایہ خرچ کر کے اتنا عظیم ذخیرہ امتِ مسلمہ کو مفت مہیا کر دیا، اگر کوئی شخص اتنی کتابیں خریدنا چاہے تو کروڑوں روپے پاس ہونے کے باوجود بھی نہیں خرید سکتا، کیونکہ بہت سی کتابیں بازار میں دستیاب ہی نہیں۔[جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ] مکتبہ کا تفسیر کا خانہ کھولیں تو بیک وقت ایک آیت سے متعلق بہت سی تفاسیر دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں یہاں ان کتابوں کی فہرست دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ مکتبہ شاملہ عام مل جاتا ہے، میری ہر صاحب علم سے درخواست ہے کہ اس سے ضرور فائدہ اٹھائے۔

اردو تفاسیر میں سے سب سے زیادہ فائدہ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ کے مرتب کردہ ''اشرف الحواشی'' سے اٹھایا ہے۔ یہ حواشی مختصر اور علمی زبان میں ہیں اور بے حد مفید ہیں۔ میں نے ہر جگہ اس کا حوالہ نہیں دیا، کیونکہ میں نے اکثر مقامات پر انھیں آسان زبان میں کچھ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے، یا بعض کمزور باتوں اور ضعیف احادیث کو حذف کیا ہے اور بعض باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ دوسری بہت سی اردو تفاسیر اور حواشی بھی برابر میرے زیرِ نظر رہے ہیں اور میں نے بقدرِ ضرورت ان سے استفادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام محسن مفسرین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ آسان پیرائے میں تفسیر لکھوں، تاکہ ہر شخص سمجھ سکے، البتہ بعض باتیں جو ادب یا بلاغت سے تعلق رکھتی ہیں، ممکن ہے بعض حضرات کی سمجھ میں پوری طرح نہ آئیں۔ شوق رکھنے والے احباب کسی پختہ عالم سے ایسے مقامات سمجھنے کے لیے رجوع کر سکتے ہیں، صرف آسانی کی غرض سے کتاب کو ایسے فوائد سے خالی رکھنا مجھے گوارا نہیں ہوا۔ اس ترجمہ و تفسیر سے عام قاری کو قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر سمجھنے میں آسانی ہوگی، ترجمہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کو اس سے مدد ملے گی اور خطبہ اور درس دینے والے حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (ان شاء اللہ) یاد رہے کہ اس ترجمہ و تفسیر سے پوری طرح فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو اس مقدمۂ تفسیر کے علاوہ عرضِ مترجم کو پوری توجہ سے پڑھے۔

اختصار کے پیشِ نظر میں نے احادیث کے ایک یا دو حوالوں پر اکتفا کیا ہے، حالانکہ وہ حدیث کئی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے اور اس اختصار ہی کی وجہ سے اکثر جگہ احادیث کا صرف ترجمہ دیا گیا ہے متن نہیں۔

قرآن مجید کے ترجمے کے بعض مقامات پر میں نے پہلے سے بہتر الفاظ کے ساتھ ترمیم کی ہے، اگر اس تفسیر میں شامل ترجمے کا پہلی اشاعتوں کے ترجمے اور ترجمے کی سی ڈی یا تفسیر دعوۃ القرآن اور اس کی سی ڈی سے کہیں فرق ہو تو اس کا باعث یہ ترمیم ہوگی۔ آئندہ بھی اصلاح و ترمیم کا یہ عمل جاری رہے گا۔ (ان شاء اللہ)

یہ تفسیر کئی شیوخ الحدیث نے پڑھی اور اس کی اصلاح فرمائی ہے۔ خصوصاً مولانا عبدالعزیز علوی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے اس جلد کے آخری پانچ پارے پڑھے، مولانا گلزار احمد شیخ الحدیث دار القرآن فیصل آباد، مولانا حافظ محمد عبداللہ رفیق شیخ الحدیث دار العلوم المحمدیہ لوکو ورکشاپس لاہور اور الشیخ مولانا عبدالعزیز کوئٹہ نے تمام پارے پڑھے۔ ان کے علاوہ دار الاندلس کے مجلس التحقیق الاسلامی کے رفقاء محمد اشتیاق اصغر، حافظ سعید الرحمٰن، حافظ ثناء اللہ اور حافظ رضوان عبداللہ نے اس تفسیر

کے حوالہ جات کی مراجعت کی، جہاں ضرورت تھی حوالے درج کیے، پوری کتاب کی بار بار پروف خوانی کی اور مجھے اصلاح کے لیے مشورے دیے۔

دار الاندلس کے مدیر محترم جاوید الحسن صدیقی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر نہایت شوق اور محبت سے اسے طبع کرنے کے لیے مسلسل محنت کی، میں ان سب حضرات کا شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ سب کو ان کی محنت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ ان کے علاوہ محترم حافظ محمد سعید ﷾ کا شکریہ ادا کرنا بھی مجھ پر لازم ہے جن کی خصوصی دلچسپی، ہمت افزائی اور اس کام کے لیے فراغت مہیا کرنے سے میرے لیے یہ کام آسان ہوا۔ اس کے بعد سب سے پہلے بھی اللہ کی حمد اور اس کا شکر ہے اور آخر میں بھی اس کی حمد اور اس کا شکر ہے جس نے مجھے یہ تفسیر لکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اسے طبع کرنے کے اسباب مہیا فرمائے۔ اب تک شروع سے سورۂ طٰہٰ تک تفسیر لکھی جا چکی ہے اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر پہلے ہی طبع ہو چکی ہے۔ اپنے رحمان و رحیم رب سے میری دعا ہے کہ وہ مجھے اس کے باقی اجزا لکھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اسے دنیا اور آخرت میں حسن قبول سے نوازے اور آخرت میں اسے میرے گناہوں کی مغفرت، جنت اور رب تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

عبد السلام بن محمد

جامعۃ الدعوۃ الاسلامیہ مرکز طیبہ مرید کے

۱۴ شعبان ۱۴۳۲ھ

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ ١ مكية ٥ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ٧ رُكُوْعَاتُهَا ١

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ۝

صحیح احادیث میں اس کا نام "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، اَلصَّلَاةُ، سُوْرَةُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، سُوْرَةُ الْحَمْدِ، اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ، اَلْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ، اُمُّ الْقُرْآنِ" اور "اُمُّ الْكِتَابِ" آیا ہے، جیسا کہ فاتحہ کے فضائل کی احادیث میں آ رہا ہے۔ اسماء کی کثرت سورت کے معانی و مطالب کی کثرت کی دلیل ہے۔

سورۂ فاتحہ کے فضائل: ① ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "ایک دفعہ جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے اوپر زور سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو سر اٹھایا اور فرمایا: "یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، آج سے پہلے یہ کبھی نہیں کھولا گیا۔" تو اس سے ایک فرشتہ اترا، پھر فرمایا: "یہ فرشتہ زمین پر اترا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں اترا۔" اس فرشتے نے سلام کہا اور کہا: "آپ کو دو نوروں کی خوش خبری ہو، جو آپ کو دیے گئے ہیں، آپ سے پہلے وہ کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے، فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان دونوں میں سے جو حرف بھی پڑھیں گے وہ چیز آپ کو ضرور عطا کر دی جائے گی۔" [مسلم، صلاة المسافرین، باب فضل الفاتحة…… ٨٠٦]

② ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس سے گزرے، میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے مجھے بلایا، میں نہ آیا، یہاں تک کہ میں نے نماز پڑھی، پھر آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمھارے آنے میں کیا رکاوٹ بنی؟" میں نے عرض کیا: "میں نماز پڑھ رہا تھا۔" فرمایا: "کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں کہ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو۔" پھر فرمایا: "کیا میں تمھیں مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن مجید کی سب سے عظیم سورت نہ سکھاؤں؟" پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے آپ کو یاد دلایا تو آپ نے فرمایا: "الحمد للہ رب العالمین ہی "سبع مثانی" ہے، (یعنی وہ سات آیتیں ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں) اور یہی القرآن العظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔" [بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ ولقد آتيناك سبعا…… ﴾ : ٤٧٠٣]

③ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے ایک سفر میں تھے، راستے میں اترے تو ایک لڑکی آئی اور کہنے لگی: "قبیلے کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا ہے اور ہمارے لوگ غائب ہیں تو کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟" چنانچہ اس کے ساتھ ایک آدمی گیا جس کے متعلق ہمیں دم کرنے کا گمان نہیں تھا، اس نے اسے دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔ سردار نے اسے تیس بکریاں دینے کو کہا اور ہمیں دودھ پلایا۔ جب وہ واپس آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: "کیا تم اچھی طرح دم کر لیا کرتے تھے؟" اس نے کہا: "نہیں، میں نے صرف اُم الکتاب کے ساتھ دم کیا ہے۔" ہم نے کہا: "جب تک ہم

رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ پہنچیں کچھ نہ کرو۔'' جب ہم مدینہ میں آئے تو ہم نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے کیسے معلوم ہوا کہ یہ دم ہے؟ (بکریاں) تقسیم کرلو اور میرا حصہ بھی رکھو۔'' [بخاری، فضائل القرآن، باب فضل فاتحۃ الکتاب : ۵۰۰۷] بخاری کی ایک روایت (۵۷۳۶) میں ہے کہ ان لوگوں نے ابوسعید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی مہمان نوازی سے انکار کر دیا تھا، جب انھوں نے دم کی درخواست کی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ کہہ کر کہ تم نے ہماری ضیافت نہیں کی تیس بکریوں کی شرط طے کی تھی۔ مسلم (۲۲۰۱) میں ہے کہ یہ دم کرنے والے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی تھے۔

④ خارجہ بن صلت کے چچا (علاقہ بن صحار تمیمی رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر اسلام لے آئے، پھر واپس گئے تو ان کا گزر کچھ لوگوں کے پاس سے ہوا جن کے پاس ایک پاگل آدمی لوہے کی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا۔ اس کے گھر والے کہنے لگے: ''تمھارا یہ ساتھی (یعنی رسول اللہ ﷺ) خیر لے کر آیا ہے تو تمھارے پاس کوئی چیز ہے جس سے تم اس کا علاج کرو؟'' تو میں نے اسے فاتحۃ الکتاب کے ساتھ دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا، انھوں نے مجھے ایک سو بکریاں دیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو (سارا واقعہ) بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس کے علاوہ بھی کچھ پڑھا؟'' میں نے کہا: ''نہیں!'' آپ نے فرمایا: ''بکریاں لے لو! مجھے اپنی عمر کی قسم! جس نے باطل دم کے ساتھ کھایا (وہ جانے) تم نے تو حق دم کے ساتھ کھایا ہے۔'' [أبو داؤد، الطب، باب کیف الرقی : ۳۸۹۶]

⑤ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں: ''جس نے کوئی نماز پڑھی جس میں اُم القرآن نہ پڑھی، وہ ناقص ہے۔'' تین دفعہ فرمایا تو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ''ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں۔'' تو فرمایا: ''اسے اپنے دل میں پڑھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں نے ''صلاۃ'' (نماز) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو نصف حصوں میں تقسیم کر لیا ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا۔ تو جب بندہ ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری حمد کی'' اور جب وہ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری ثنا کی'' اور جب وہ ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کہتا ہے تو وہ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری تمجید کی (بزرگی بیان کی)'' اور کبھی فرماتا ہے: ''میرے بندے نے (اپنا آپ) میرے سپرد کر دیا۔'' پھر جب وہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ کہتا ہے تو وہ فرماتا ہے: ''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا۔'' پھر جب وہ ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہتا ہے تو وہ فرماتا ہے: ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو اس نے سوال کیا۔'' [مسلم، الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی ...... : ۳۹۵]

چند فوائد:

① جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مراتب میں فرق ہے، ان میں سے بعض بعض سے افضل ہیں، ہمارے نبی کریم ﷺ پوری اولاد آدم کے سردار ہیں، اسی طرح سورۂ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے، اگرچہ بہت سی سورتیں آیات کے اعتبار سے اس سے لمبی ہیں، مگر عظمت میں یہ سب سے بڑھ کر ہے، جیسا کہ آیات میں آیت الکرسی سب سے عظیم آیت ہے، گو اس سے لمبی آیات بہت سی ہیں۔

② اس سورت کا نام ''فاتحہ'' اس لیے ہے کہ اس سے کتاب اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔نماز میں قراءت کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے۔قاموس میں ہے: '' فَاتِحَةُ كُلِّ شَيْءٍ اَوَّلُهٗ '' ''ہر چیز کا فاتحہ اس کے اول کو کہتے ہیں۔''

③ اس سورت کا نام ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' یا ''سُوْرَةُ الْحَمْدِ'' اس لیے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی جامع حمد آئی ہے۔

④ اس کا نام ''اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ'' اس لیے ہے کہ یہ سات آیات ہیں جو ہر نماز (فرض ہو یا نفل) کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں، نماز کے علاوہ بھی کثرت سے پڑھی جاتی ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجر (۸۷)۔

⑤ اس کے نام ''اُم القرآن، اُم الکتاب، القرآن العظیم'' اس لیے ہیں کہ اس میں مختصر طور پر قرآن مجید کے تمام بنیادی مضامین آگئے ہیں، باقی قرآن ان کی تفصیل ہے، چنانچہ ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کمال، اس کی حمد، ثنا اور تمجید آگئی ہیں، جیسا کہ اوپر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزرا اور آگے آیات کی تفسیر میں بیان ہوگا۔ ''يَوْمِ الدِّيْنِ'' میں آخرت، ثواب و عذاب اور وعدے اور وعید کا ذکر ہے۔ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' میں بندوں کو ایک اللہ سے مانگنے، اسی کے سامنے عاجزی کرنے، اپنی تمام عبادات زبانی ہوں یا بدنی یا مالی اسی کے لیے خاص کرنے اور اسے ہر شریک سے پاک قرار دینے کی تعلیم ہے۔ اسے ''توحید الوہیت'' کہتے ہیں، تمام پیغمبر اسی کی دعوت لے کر آئے۔ ''وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' میں اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنے، اسی پر توکل کرنے اور عبادت اور دوسرے تمام معاملات میں اسی سے مدد مانگنے کی تعلیم ہے کہ اگر اس کی مدد نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اسے ''استعانت'' کہتے ہیں۔ ''الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں شریعت کے تمام احکام، پورا اسلام اور پورا قرآن شامل ہے۔ ''اِهْدِنَا'' میں زندگی کے ایک ایک لمحہ میں راہِ راست پر چلنے اور آخری دم تک بلکہ جنت میں پہنچنے تک اس پر قائم رہنے کی دعا کی تعلیم ہے۔ ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی تاریخ اور ان کے واقعات کی طرف اشارہ ہے اور ان جیسے اعمال صالحہ اختیار کرنے کی ترغیب ہے، تاکہ ان کے ساتھ جنت میں جا سکیں۔ ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' میں یہود اور ان تمام اقوام کی تاریخ کا ذکر ہے جو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت پر اڑ گئے اور ''الضَّآلِّيْنَ'' میں نصاریٰ اور ان تمام لوگوں کے واقعات کی طرف اشارہ ہے جو راہِ راست سے بھٹک گئے اور ان دونوں قسم کے لوگوں کے اعمال بد سے اجتناب کی تلقین

ہے، تاکہ ان کے ساتھ جہنم میں جانے سے بچے رہیں۔ (القاسمی) ان سات آیات میں قرآن مجید کے مزید مضامین کا ذکر ہر آیت کی الگ تفسیر میں بھی آئے گا۔ (ان شاء اللہ العزیز)

⑥ اس سورت کا نام ''صلاۃ'' اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے صلاۃ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو نصف حصوں میں تقسیم کر لیا ہے، اس کی وضاحت سورۃ الفاتحہ کے ساتھ فرمائی۔ معلوم ہوا جو ''صلاۃ'' (نماز) اس ''صلاۃ'' (فاتحہ) کے بغیر ہو وہ ''صلاۃ'' (نماز) ہی نہیں، جیسا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا: ((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ)) ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔'' [بخاری، الأذان، باب وجوب القراءۃ للإمام...... : ۷۵٦۔ مسلم : ۳۹٤]

⑦ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ پورے قرآن کے اسرار سورۂ فاتحہ میں، فاتحہ کے اسرار '' بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' میں '' بِسْمِ اللّٰهِ '' کے اسرار اس کی باء میں اور باء کے اسرار اس کے نقطے میں آ گئے ہیں۔ مگر سورۂ فاتحہ میں پورے قرآن کے مضامین آ جانے کا یہ مطلب درست نہیں، دراصل یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو نہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں نہ اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اپنے ایجاد کردہ طریقوں کو قرآن کا نام دے کر مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ (المنار)

⑧ سورۂ فاتحہ کا دوسری سورتوں سے تعلق: ① کائنات کی تمام چیزوں کی تخلیق، پرورش اور حفاظت '' رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ '' اور '' الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' کے تحت ہیں۔ ② توحید کے متعلق تمام قرآنی آیات '' اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ '' کے تحت ہیں۔ ③ داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں اور دوسرے تمام مقامات میں عدل و انصاف کا ذکر '' مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ '' کے تحت ہے۔ ④ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی '' اِيَّاكَ نَعْبُدُ '' کے تحت اور ان کی اور تمام انبیاء کی دعائیں '' اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ '' کے تحت ہیں۔ ⑤ ایوب علیہ السلام کی شفا، یونس علیہ السلام کی نجات، ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں محفوظ رہنا، زکریا علیہ السلام کو بڑھاپے میں اولاد ملنا وغیرہ سب '' الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ '' کے تحت ہیں۔ ⑥ ایمان دار اور متقی لوگوں کے احوال و واقعات اور ان کا نیک انجام آخری آیت کے تحت ہیں۔ اسی طرح بدکار اور سرکش لوگوں کے احوال و واقعات اور ان کا انجام بد بھی اسی آیت کے تحت ہیں۔ اسی کے مطابق دوسری تمام آیات و واقعات سمجھ لیں۔ ⑦ شیطان کا تکبر کے باعث دھتکارا ہوا ہونا '' الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ '' کی مثال ہے۔ (بدیع التفاسیر)

⑨ یہ سورت اگرچہ اللہ کا کلام ہے مگر یہ بندوں کو سکھانے کے لیے نازل ہوئی ہے کہ وہ یوں کہیں۔ دلیل اس کی گزشتہ حدیث ہے کہ بندہ یوں کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے۔ اس میں بندے کو اللہ تعالیٰ سے مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کہ پہلے اس کی حمد و ثنا اور تمجید کی جائے، پھر اللہ تعالیٰ سے اس کا بندہ ہونے کے تعلق کا ذکر کیا جائے اور اپنی بندگی کا وسیلہ پیش کیا جائے، اس کے بعد اللہ سے مدد مانگتے ہوئے اصل مقصد کا سوال کیا جائے جو صراط مستقیم کی ہدایت کا سوال ہے، جس سے اہم کوئی سوال نہیں۔ اس لیے بعض اہل علم نے اس کا نام ''تعلیم المسئلہ'' بھی رکھا ہے، یعنی مانگنے کا طریقہ سکھانے والی سورت۔

⑩ بعض لوگ زندہ یا فوت شدہ لوگوں کے نام کے وسیلے سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! فلاں کے وسیلے سے یا واسطے سے یا بحرمت فلاں میری دعا قبول فرما، یہ بدعت ہے اور قرآن وسنت سے کہیں ثابت نہیں اور اگر یہ عقیدہ رکھے کہ ان بزرگوں کا نام لیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے منوا لیتے ہیں تو یہ شرک ہے جس میں مشرکین عرب مبتلا تھے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۸) اور سورۂ زمر (۳)۔ صحیح وسیلہ جو ثابت ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے وسیلے سے دعا کرنا ہے، یا اپنے کسی صالح عمل کے وسیلے سے دعا کرنا، جیسا کہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' میں ہے اور جیسا کہ آل عمران (۱۹۳) میں ایمان لانے کے وسیلے سے دعا کی گئی ہے اور غار والے تین اصحاب نے اپنے اپنے خالص عمل کے وسیلے سے دعا کی تھی۔ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب حدیث الغار : ۳٤٦٥، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] یا کسی زندہ آدمی سے دعا کروانا، جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کروایا کرتے تھے اور عمر رضی اللہ عنہ عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کی دعا کروایا کرتے تھے۔ [بخاری، فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب ذکر العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ : ۳۷۱۰، عن أنس رضی اللہ عنہ] ان تین صورتوں کے سوا وسیلے کی جتنی صورتیں ہیں، کچھ بدعت ہیں اور کچھ شرک کے زمرے میں آتی ہیں، اس لیے ان سے اجتناب لازم ہے۔

⑪ یہ سورت بہترین دم ہے، سانپ کے زہر جیسی خطرناک بیماری اور دیوانگی جیسی مشکل سے درست ہونے والی بیماری کا دور ہونا اس کی بے انتہا شفائی تاثیر کی دلیل ہے۔ میری ہمشیرہ ایک ٹانگ سے معذور تھی اور بیساکھی کے سہارے سے چلتی تھی، اس کی تندرست ٹانگ بھی بے کار ہوگئی، سارے گھر والے سخت مصیبت میں پھنس گئے، میرے والد صاحب کو ایک عالم نے سورۂ فاتحہ کا دم کرنے کی تاکید کی۔ تیرھویں دن ہمشیرہ دیوار کے سہارے سے ٹانگ پر کھڑی ہوگئی اور پھر اس کی ٹانگ بالکل تندرست ہوگئی۔ تقریباً چالیس برس ہو گئے آج تک وہ بیساکھی کے ساتھ اس ٹانگ پر چلتی پھرتی ہے۔ مجھے زندگی میں دو تین دفعہ نہایت سخت بیماری پیش آئی، علاج کے ساتھ ساتھ گھر والے سورۂ فاتحہ کا دم کرتے رہے، اگرچہ کچھ مدت لگی مگر اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی۔ (الحمد للہ)

⑫ ان احادیث سے قرآن کے ساتھ دم پر اجرت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ: ((اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ)) (سب سے زیادہ حق چیز جس پر تم اجرت لو، اللہ کی کتاب ہے) [بخاری، الطب، باب الشروط فی الرقیۃ بفاتحۃ الکتاب : ۵۷۳۷] اس کی دلیل ہیں۔ کتاب اللہ کی کتابت، طباعت، جلد بندی، خرید و فروخت اور تعلیم وغیرہ پر اجرت نہایت پاکیزہ اجرت ہے۔ اہلِ کتاب کو جو اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت لینے پر ملامت کی گئی اس کی وجہ ان کا حق کو چھپانا اور دنیاوی مفاد کے لیے غلط فتوے دینا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۱، ۷۹، ۱۷۴) اور آل عمران (۱۸۷)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ : شیخ المفسرین طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ادب سکھایا کہ اپنے تمام کاموں اور اہم مواقع سے پہلے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ عالیہ کا ذکر کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے ○

سے اپنی تمام مخلوق کو طریقہ سکھایا کہ اپنی گفتگو کا آغاز اور اپنے خطوط، کتابوں اور تمام ضروری کاموں کی ابتدا اسی کے ساتھ کریں، یہاں تک کہ " بِسْمِ اللّٰهِ " (اللہ کے نام کے ساتھ) کہتے ہوئے یہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اللہ کے نام کے ساتھ کیا کرنا ہے، حذف شدہ لفظ خود ہی واضح ہوتا ہے کہ میں اللہ کے نام کے ساتھ پڑھتا ہوں یا کھاتا ہوں یا فلاں کام کرتا ہوں۔ یہاں " اسم " (نام)"تَسْمِيَةٌ" (نام لینے) کے معنی میں ہے، جیسا کہ "كَلَامٌ" "تَكْلِيْمٌ" (کلام کرنے) کے معنی میں اور "عَطَاءٌ" "اِعْطَاءٌ" (دینے) کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ میں اللہ کا نام لینے اور اسے یاد کرنے کے ساتھ پڑھتا ہوں (یا کوئی بھی کام کرتا ہوں) اور اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کا نام لینے کے ساتھ قراءت (یا کسی بھی کام) کا آغاز کرتا ہوں۔'' مختصراً لفظ "اللّٰهِ" اس ہستی کا علم (ذاتی نام) ہے جو سب سے بلند و برتر اور سب کا خالق و مالک ہے۔ اس لفظ کا اصل "اِلٰهٌ" ہے۔ الف لام لگایا تو "اَلْاِلٰهُ" بن گیا۔ کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لیے " اِلٰهٌ " کا ہمزہ حذف کر دیا گیا اور الف لام والے لام کو "اِلٰهٌ" کے لام میں مدغم کر دیا، "اِلٰهٌ" کے لام کے بعد والا الف بھی کثرت استعمال کی وجہ سے لکھنے میں ترک کر دیا گیا، تو لفظ "اللّٰهِ" ہو گیا۔ یہ "فِعَالٌ" بمعنی ''مفعول'' ہے، یعنی "اِلٰهٌ" بمعنی "مَأْلُوْهٌ" ہے، یعنی وہ ذات جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ " کی تفسیر اگلی آیت میں آ رہی ہے۔

" بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ " سورۂ نمل میں بالاتفاق آیت کا جزو ہے۔ صحابہ کے اجماع کے ساتھ اسے فاتحہ اور دوسری سورتوں کے شروع میں لکھا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورۂ توبہ کے سوا ہر سورت کا جزو ہے۔ ہر سورت کے ساتھ اس کا نازل ہونا صحیح حدیث سے بھی ثابت ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک سورت کا دوسری سے الگ ہونا اس وقت تک نہیں پہچانتے تھے جب تک آپ پر " بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ " نازل نہیں ہوتی تھی۔ [أبو داوٗد، الصلاۃ، باب من جهر بها : ۷۸۸]

■ ❶ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ : حمد کا معنی کسی خوبی کی وجہ سے تعریف ہے۔ اس پر الف لام استغراق کا ہے جس سے مراد حمد کے تمام افراد ہیں، یعنی جو تعریف بھی ہے اللہ ہی کی ہے، نہ کسی دوسرے خود ساختہ معبود کی نہ کسی مخلوق کی، کیونکہ مخلوق میں اگر تعریف کے لائق کوئی خوبی ہے تو وہ اسی کی پیدا کردہ ہے۔

❷ لفظ ''اللہ'' چونکہ ذاتی نام ہے، اس لیے اس میں اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء و صفات آ جاتے ہیں، وہ ننانوے اسماء و صفات بھی جن کا ذکر حدیث میں ہے اور وہ بھی جو ان کے علاوہ ہیں، خواہ وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھائے ہیں یا ان کا علم صرف اپنے پاس رکھا ہے۔ جس طرح محمد ﷺ سے مراد وہ ذات گرامی ہے جو نبی بھی ہے رسول بھی، شاہد، مبشر اور نذیر بھی، داعی الی اللہ اور سراج منیر بھی، ماحی اور عاقب بھی، خاتم النّبیین اور سید ولد آدم بھی، غرض اسم محمد ﷺ

(ذاتی نام) میں آپ کے تمام نام اور تمام صفات آ جاتی ہیں، اسی طرح لفظ ''اللہ'' علم (ذاتی نام) ہونے کی وجہ سے تمام اسماء وصفات کا جامع ہے، اس لیے اہل علم فرماتے ہیں کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی، یعنی سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ وہ تمام صفاتِ کمال کا جامع ہے اور ہر صفت پر اس کی حمد لازم ہے۔

3 ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' میں کئی عموم ہیں اور ایک خصوص ہے۔ ''اَلْحَمْدُ'' میں الف لام استغراق کا ہونے کی وجہ سے کئی قسم کا عموم ہے اور ''لِلّٰهِ'' میں ایک خصوص ہے، وہ یہ کہ اس میں لام اختصاص کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر حمد اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔ حمد کے عموم میں فاعل کا بھی عموم ہے کہ ہر حمد کرنے والا درحقیقت اللہ ہی کی تعریف کرتا ہے، خواہ وہ خود رب العالمین ہو یا انسان یا جن یا فرشتہ یا کوئی بھی مخلوق ہو۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ [بنی إسرائیل : ٤٤] ''جو بھی شے ہے اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔'' اسی طرح حمد کے عموم میں مکان (جگہ) کا بھی عموم ہے، یعنی وہ کسی بھی جگہ میں ہو، زمین میں ہو یا آسمان میں، یا ان کے درمیان ہو یا عرش پر، فرمایا: ﴿وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [الروم : ١٨] یعنی آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہے۔ اسی طرح زمان کا بھی عموم ہے، یعنی وہ حمد دن میں ہو یا رات میں، ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں، دنیا میں ہو یا آخرت میں، سب کی سب اللہ کے لیے خاص ہے، فرمایا: ﴿وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ﴾ [القصص : ٧٠] ''اور وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے لیے دنیا اور آخرت میں سب تعریف ہے۔'' اس طرح ''اَلْحَمْدُ'' میں خود حمد کا بھی عموم ہے، یعنی وہ حمد کسی بھی لفظ کے ساتھ ہو یا کسی بھی زبان میں، بلند آواز سے ہو یا آہستہ، دل سے ہو یا زبان سے یا دوسرے اعضاء کے ساتھ، غرض تعریف کوئی بھی ہو صرف اکیلے اللہ کے لیے خاص ہے، کسی دوسرے میں کوئی خوبی یا قابلِ تعریف بات ہے تو وہ اس کی اپنی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے، اس لیے اس کی وجہ سے اس کی تعریف بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے۔

4 بعض اہلِ علم نے قرآن مجید کے چار حصے کیے ہیں، ہر حصہ ''اَلْحَمْدُ'' سے شروع ہوتا ہے۔ پہلا حصہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''سورۂ فاتحہ'' سے شروع ہوتا ہے، دوسرا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ سورۂ انعام سے، تیسرا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ سورۂ کہف سے اور چوتھا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ﴾ سورۂ سبا سے۔

5 ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ایسا مبارک کلمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا آغاز اس سے ہوتا ہے، نبی ﷺ ہر خطبہ کی ابتدا اس سے کرتے تھے۔ (مسلم : ۸۶۸/۴۵) کھانا کھانے کے بعد اور چھینک آنے پر اللہ کی حمد کرتے تھے۔ (بخاری : ۵۴۵۸، ۶۲۲۴) سوتے وقت بستر پر آ کر یہ دعا پڑھتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ كَفَانَا وَ آوَانَا، فَكَمْ مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهُ وَ لَا مُؤْوِيَ» ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور ہمیں پلایا اور ہمیں کافی ہو گیا اور ہمیں ٹھکانا دیا، کیونکہ کتنے ہی لوگ ہیں جنھیں نہ کوئی کفایت کرنے والا ہے اور نہ کوئی ٹھکانا دینے والا۔'' [مسلم، الذکر والدعاء، باب

الدعاء عند النوم : ۲۷۱۵، عن أنس رضی اللہ عنہ] صبح اٹھتے وقت یہ دعا پڑھتے :((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ)) ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف اٹھ کر جانا ہے۔''

[بخاری، الدعوات، باب وضع الید تحت الخد الیمنٰی : ٦٣١٤، عن حذیفة رضی اللہ عنہ]

قیامت کے دن لوگ قبروں سے اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے نکلیں گے، فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ ﴾ [بنی إسرائيل : ٥٢] ''جس دن وہ تمھیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے چلے آؤ گے۔'' اور جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ کی حمد کریں گے، فرمایا: ﴿ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ﴾ [الأعراف : ٤٤] ''اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی۔'' اور جنت میں ان کی گفتگو کا اختتام بھی اسی پر ہوا کرے گا، فرمایا: ﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [یونس : ١٠] ''ان کی دعا ان (جنتوں) میں یہ ہوگی ''پاک ہے تو اے اللہ!'' اور ان کی آپس کی دعا ان میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔ (آمین)

6 کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' ایک عظیم الشان حقیقت کا اظہار بھی ہے، کلمۂ شکر بھی اور بہترین مکمل دعا بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پاکیزگی نصف ایمان ہے اور ''الحمد للہ'' میزان کو بھر دیتا ہے۔'' [مسلم، الطهارة، باب فضل الوضوء : ۲۲۳، عن أبي مالك الأشعري رضی اللہ عنہ] تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت کا اصل مقصود اسے پکارنا اور اس سے مانگنا ہے، جیسا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ''پکارنا ہی عبادت ہے۔'' [ترمذی، الدعوات، باب منه ...... : ۳۳۷۲، و صححه الألبانی] انسان کی ہر عبادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، غرض زندگی کا ہر لحہ اس کے حکم کے مطابق غلام بن کر گزارنا اس سے مانگنے ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سے بہترین صورت اس کی تعریف کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا ہے، اس پر وہ مزید نعمتوں سے نوازتا ہے، فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ [إبراهيم : ٧] ''بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمھیں زیادہ دوں گا۔'' اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ)) ''سب سے بہتر ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا الحمد للہ ہے۔'' [ترمذی، الدعوات، باب ما جاء أن دعوة المسلم مستجابة : ۳۳۸۳، عن جابر رضی اللہ عنہ ـ السلسلة الصحيحة : ١٤٩٧] ایک عرب شاعر نے اپنے ممدوح کے متعلق کہا ہے ؎

اِذَا اَثْنٰى عَلَيْكَ الْمَرْأُ يَوْمًا ۔۔۔ كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

''جب کوئی شخص کسی دن تمھاری تعریف کرتا ہے تو اسے اس کے سوال کرنے سے تعریف ہی کافی ہو جاتی ہے۔''

جب ایک سخی شخص جو مخلوق ہے، صرف تعریف سن کر نواز دیتا ہے، صاف لفظوں میں سوال کا انتظار نہیں کرتا تو رب العالمین جو جواد بھی ہے، ماجد بھی، اپنی حمد پر کیوں نہیں نوازے گا۔ خصوصاً جب اس سے بڑھ کر اپنی تعریف سن کر خوش ہونے والا کوئی

نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا کوئی نہیں جسے اللہ سے زیادہ (اپنی) تعریف پسند ہو، اس لیے اس نے خود اپنی تعریف کی ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ قل إنما حرم ربي الفواحش...... ﴾ : ٤٦٣٧، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ]

7 **رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ:** "رَبّ" کا معنی ہے سردار جس کی اطاعت ہوتی ہو اور مالک اور پرورش کرنے والا۔ یہ "رَبَّ يَرُبُّ (ن) " (پرورش کرنا) میں سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے، یا مصدر ہے جو مبالغہ کے لیے اسم فاعل کی جگہ استعمال ہوا ہے، جیسے ''زَيْدٌ عَدْلٌ'' ''زَيْدٌ عَادِلٌ'' کی جگہ استعمال ہوتا ہے، یعنی زید اتنا عادل ہے کہ اس کا وجود ہی عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ میں یہ تینوں صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں، اس سے بڑا سید کوئی نہیں، وہی سب کا مالک ہے اور ہر ایک کو پیدائش سے کمال تک پہنچانے والا اور اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا بھی وہی ہے، گویا وہ ذات پاک سراپا پرورش ہے۔

8 **"الْعٰلَمِيْنَ"** "اَلْعَالَمُ" کی جمع ہے، جہان۔ "اَلْعَالَمُ" جمع ہے جس کا واحد نہیں، جیسے ''قَوْمٌ، رَهْطٌ، نَاسٌ'' وغیرہ۔ معنی اس کا ہے: " مَا يُعْلَمُ بِهِ الشَّيْءُ" جس کے ذریعے سے کسی چیز کا علم حاصل ہو، جیسا کہ "خَاتَمٌ" کا معنی ہے: "مَا يُخْتَمُ بِهِ" جس کے ساتھ مہر لگائی جائے۔ عرب یہ وزن آلہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جہان کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ کوئی بھی مخلوق ہو، اس کے ذریعے سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہے کہ اسے پیدا کرنے والا موجود ہے۔ **"الْعٰلَمِيْنَ"** کو جمع اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے، مثلاً عالم انس، عالم جن، عالم نبات، عالم جماد، عالم ارض اور عالم سماء وغیرہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے کئی عالم ہیں، مثلاً انسانوں میں ہر جنس، ہر زبان اور ہر علاقے والوں کا الگ جہان ہے۔ غرض اتنے بے حساب جہاں ہیں جنھیں رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، فرمایا: ﴿ **وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ** ﴾ [المدثر : ۳۱] ''اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' ایک چیونٹی ہی کی ہزاروں قسمیں ہیں، پرندوں کے بے شمار جہان ہیں، سمندر کی مخلوقات کا شمار ہی نہیں، بے شمار کہکشائیں اور ان کے سیارے جن کے مقابلے میں سورج چاند وغیرہ ایک انگوٹھی کی طرح ہیں، ہر ایک الگ جہان ہے۔ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے وحدہ لا شریک لہ ہونے کے علم کا ذریعہ ہے۔ رب العالمین ان میں سے ہر ایک کو پیدا کرنے والا، پھر ہر لمحہ اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا اور اسے کمال تک پہنچانے والا ہے۔ غرض سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ وہ **"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"** ہے۔

9 **"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ"** کے بعد اللہ تعالیٰ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں، پہلی صفت **"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"** میں قرآن کے بنیادی مضامین میں سے توحید کے علاوہ وعدہ اور وعید دونوں موجود ہیں کہ پرورش کرنے والا خوش ہو کر نوازتا ہے تو ناراض ہو کر محروم بھی کر دیا کرتا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ

بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ○

① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ : یہ دوسری اور تیسری صفت ہے۔ جب سارے جہانوں کی ربوبیت کا ذکر ہوا تو ساتھ ہی اللہ کی بے حد و حساب رحمت کا ذکر ہوا، کیونکہ رحمت کے بغیر ربوبیت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ دونوں رحم میں سے مبالغے کے صیغے ہیں۔ معنی دونوں کا بہت زیادہ رحم والا ہے، مگر اس پر اتفاق ہے کہ "الرَّحْمٰنِ" میں مبالغہ زیادہ ہے، کیونکہ اس کے حروف "الرَّحِيْمِ" سے زیادہ ہیں (اور حروف کی زیادتی سے معنی میں زیادتی ظاہر ہوتی ہے) اور اس لیے بھی کہ لفظ ''اللہ'' کی طرح ''رحمان'' بھی صرف باری تعالیٰ کے لیے بولا جاتا ہے، جب کہ ''رحیم'' بعض اوقات مخلوق پر بھی آ جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق فرمایا: ﴿ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبۃ : ۱۲۸] ''مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے یہاں رحم میں مبالغے کا اظہار کرنے کے لیے دو لفظ کیوں ذکر فرمائے؟ بعض اہل علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، مگر اکثر علماء ایک مادے (رحم) سے مشتق ہونے کے باوجود ان دونوں کے درمیان فرق مانتے ہیں۔ اکثر مفسرین نے فرمایا کہ "الرَّحْمٰنِ" کا معنی بڑی بڑی نعمتیں عطا کرنے والا اور "الرَّحِيْمِ" کا معنی دقیق اور باریک نعمتوں سے نوازنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ رحمان وہ ہے جس کی رحمت سب کے لیے عام ہے، مسلم ہوں یا کافر، جب کہ رحیم وہ ہے جو خاص طور پر مومنوں کو رحمت سے نوازنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ رحمان وہ ہے جس کی رحمت دنیا میں مسلم و کافر سب کے لیے اور آخرت میں صرف مسلمانوں کے لیے ہے اور رحیم وہ جو آخرت میں خاص مسلمانوں پر رحم کرنے والا ہے۔ مگر ان تینوں اقوال کی پختہ دلیل، جس پر اعتراض نہ ہو، مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔ مفسر قاسمی نے شیخ محمد عبدہ مصری رحمہ اللہ سے ایک مدلل و مضبوط فرق نقل کیا ہے، میں اسے تھوڑی سی وضاحت اور اضافے سے نقل کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رحمان " فَعْلَانُ" کے وزن پر ہے، جو معنی کی کثرت پر دلالت کرتا ہے، مثلاً "عَطْشَانُ" بہت زیادہ پیاسا، "غَرْثَانُ" بہت زیادہ بھوکا اور " غَضْبَانُ" غصے سے بھرا ہوا۔ اس وزن میں معنی کی کثرت تو ہوتی ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے، بلکہ وہ ختم بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام طور سے لوٹے تو "غَضْبَانُ" (غصے سے بھرے ہوئے) تھے، مگر ہارون علیہ السلام کا عذر سن کر غصہ ختم ہو گیا، بلکہ ان کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔ گویا رحمان کا معنی وہ ذات ہے جس میں بہت ہی زیادہ رحمت ہے، جو بے حد و بے حساب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق پیدا فرمائی تو اس کتاب میں لکھ دیا جو اس کے پاس عرش پر ہے کہ بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔'' [بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالٰى : ﴿ ويحذركم الله نفسه ﴾ : ٧٤٠٤، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] " فَعِيْلٌ" کا وزن کسی چیز میں مفہوم کے لزوم، دوام اور ہمیشگی کے لیے آتا ہے، وہ صفت اس

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝

بدلے کے دن کا مالک ہے ○

سے جدا نہیں ہو سکتی، مثلاً علیم، حلیم، عظیم، خبیر، بصیر، سمیع، رؤف اور رحیم۔ یعنی وہ ذات جس کی رحمت دائمی ہے، کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ دونوں صفتوں کے ملنے سے صفت رحمت کی وسعت بھی ثابت ہوئی اور اس کا دوام بھی۔ اگر اس کی رحمت میں وسعت و کثرت نہ ہوتو بعض مخلوق محروم رہ جائے اور اگر اس میں دوام نہ ہوتو کوئی چیز نہ پایۂ تکمیل تک پہنچے، نہ باقی رہ سکے۔

❷ قرآن مجید میں ثنائے الٰہی پر مشتمل تمام آیات "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی تفصیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان نماز کی تقسیم والی حدیث قدسی کے مطابق بندہ جب "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری ثنا کی۔'' [مسلم، الصلوۃ، وجوب قراءۃ الفاتحۃ ...... : ۳۹۵]

❶ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: "الدِّيْنِ" "دَانَ يَدِيْنُ" کا مصدر ہے، بدلہ دینا، جزا دینا۔ رحمٰن و رحیم کے بعد جزا کے دن کا مالک ہونے کی صفت بیان فرمائی۔ ایک قراءت ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ ہے یعنی روزِ جزا کا مالک اور دوسری "مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" ہے، یعنی روز جزا کا بادشاہ۔ قرآن مجید کے رسم الخط میں "مٰلِكِ" لکھا ہے، اسے "مَالِكِ" اور "مَلِكِ" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے اور دونوں قراءتیں متواتر طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا مالک بھی ہے اور بادشاہ بھی۔ "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے ساتھ قیامت کے دن کے مالک اور بادشاہ ہونے کی مناسبت یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی بہت رحم کرنے والا ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا، اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی رحم نہیں کر سکتا، پھر کوئی شخص بہت سی ملکیت کا مالک ہوتا ہے مگر اس کا بادشاہ کوئی اور ہوتا ہے، وہ مالک ہوتے ہوئے بھی پورا اختیار نہیں رکھتا۔ "يَوْمِ الدِّيْنِ" کے معنی یوم جزا کے ہیں۔ اس دنیا میں بھی مکافات، یعنی اعمال کی جزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے، مگر اس جزا کا مکمل ظہور چونکہ قیامت کے دن ہوگا اس لیے قیامت کے دن کو خاص طور پر "يَوْمِ الدِّيْنِ" (بدلے کا دن) کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس دن کے "مَالِكِ" اور "مَلِكِ" (بادشاہ) ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس روز ظاہری طور پر بھی مالکیت اور ملوکیت کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴾ [الانفطار : ۱۹] ''جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کی مالک نہیں ہوگی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔'' اور فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن : ۱٦] ''آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، دبدبے والا ہے۔'' اس دن مالک بھی اللہ تعالیٰ ہوگا، بادشاہ بھی وہی ہوگا، صرف اسی کا حکم چلے گا۔ صفت رحمت اور

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

هم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں ۝

بدلے کے دن کی ملکیت میں مناسبت اس حدیث سے واضح ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں، جن میں سے اس نے ایک رحمت جن وانس، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے درمیان نازل فرمائی ہے، اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ننانویں رحمتیں مؤخر کر رکھی ہیں، جن کے ساتھ وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔'' [مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى...... : ۲۷۵۲/۱۹۔ بخاری : ۶۰۰۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

❷ تقسیم صلاۃ والی حدیث قدسی کے مطابق بندہ جب ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ)) ''میرے بندے نے میری تمجید (بزرگی بیان) کی۔'' ایک روایت کے مطابق فرماتا ہے: ((فَوَّضَ اِلَيَّ عَبْدِيْ)) ''میرے بندے نے اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا۔'' [مسلم، الصلوة، باب وجوب قراءة الفاتحة...... : ۳۹۵] قرآن مجید میں تمجید الٰہی اور تفویض و توکل پر مشتمل تمام آیات ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کی تفصیل ہیں۔

❶ **اِيَّاكَ نَعْبُدُ**: سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد غائب کے صیغے کے ساتھ کی گئی ہے، ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' اور اس کے بعد کی آیات میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر لیا گیا ہے، اسے التفات کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اسے اس کا قرب اور اس کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہو جاتا ہے، اب وہ براہِ راست خطاب کے صیغے سے اپنی درخواست پیش کرتا ہے۔

❷ عربی زبان میں جملہ فعلیہ کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے فعل، پھر فاعل اور اس کے بعد مفعول ہوتا ہے۔ اگر بعد والے لفظ کو پہلے لایا جائے تو اس سے کلام میں تخصیص یا حصر پیدا ہو جاتا ہے۔ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' اصل میں ''نَعْبُدُكَ'' (ہم تیری عبادت کرتے ہیں) تھا۔ مفعول ''کاف ضمیر'' کو ''نَعْبُدُ'' سے پہلے لایا گیا تو ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' ہو گیا، جس سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں، کسی اور کی نہیں کرتے۔ اس مفہوم کو ''ہم صرف تیری عبادت'' یا ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بعینہٖ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا مفہوم ہے، یعنی عبادت کے لائق اللہ تعالیٰ ہی ہے، دوسرا کوئی نہیں۔

❸ عبادت کا معنی کسی کو غیبی طاقتوں کا مالک سمجھ کر اس سے انتہائی درجے کی محبت کے ساتھ اس کے سامنے انتہائی درجے کی عاجزی، ذلت اور خوف ہے۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اسلام نے بندوں کو ایسی ہر غلامی سے آزادی دلا کر صرف

ایک ذات پاک کا بندہ اور عبد بنا دیا جو انھیں پیدا کرنے والی اور ان کی پرورش کرنے والی ہے۔ عبادت صرف اس کی ہے، اس کے ساتھ کسی کو نہ شریک کرنا جائز ہے نہ اس کی محبت جیسی محبت یا اس کے خوف جیسا خوف کسی سے جائز ہے۔ افسوس کہ بعض مسلمان اللہ کے گھر میں داخل ہوتے یا نکلتے وقت اتنے خوف زدہ اور لرزہ براندام نہیں ہوتے جتنے وہ کسی قبر پر یا کسی پیر کے پاس جاتے یا واپس آتے وقت ہوتے ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت میں "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کے عہد و اقرار کے بعد کسی دوسرے کی بندگی اللہ تعالیٰ سے سب سے بڑی غداری ہے، جسے وہ کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۶) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تین جگہ فرمایا کہ ان لوگوں نے اللہ کی قدر اس طرح نہیں کی جیسے اس کی قدر کا حق ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۹۱)، حج (۷۴) اور زمر (۶۷)۔

❹ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: "نَسْتَعِيْنُ" "عَوْنٌ" میں سے باب استفعال فعل مضارع جمع متکلم کا صیغہ ہے، جو اصل میں "نَسْتَعْوِنُ" تھا۔ اس میں بھی "اِيَّاكَ" پہلے آنے کی وجہ سے حصر ہے، یعنی ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، کسی دوسرے سے نہیں۔ یہاں سے بندے کی درخواست شروع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق قبول ہو چکی۔

❺ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کو پہلے اور "اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کو بعد میں ذکر کر کے دعا کا سلیقہ سکھایا گیا ہے کہ درخواست سے پہلے اللہ کی حمد و ثنا اور تمجید کے بعد اپنی بندگی اور اپنے تعلق کا حوالہ پیش کرو، یعنی اپنے عمل کے وسیلے سے درخواست کرو۔ یہ وسیلہ حق ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴾ [آل عمران: ۱۹۳] "اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ فوت کر۔" صحیح بخاری (۳۴۶۵) میں غار میں پھنسنے والے تین آدمیوں کا قصہ بھی اس کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص سے کیے ہوئے اعمال کے وسیلے سے دعا قبول ہوتی ہے۔ البتہ کسی شخص کا نام لے کر اس کی ذات یا اس کی حرمت وغیرہ کے وسیلے سے دعا کرنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں، مثلاً یہ کہنا کہ یا اللہ! فلاں کے وسیلے یا طفیل یا واسطے سے یا بحرمت فلاں میری دعا قبول کر۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۷) ﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ ﴾ کی تفسیر۔

❻ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کے بعد "وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" لانے میں یہ سبق بھی ہے کہ آدمی یقین رکھے کہ وہ کوئی بھی نیکی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا اور مکمل طور پر اللہ کے سامنے بے بس اور بے اختیار ہونے کا عقیدہ رکھے اور اس کا اظہار و اقرار بھی کرے۔ یعنی ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں اور اپنے تمام کاموں میں تیری ہی مدد مانگتے ہیں، تیری مدد کے بغیر نہ ہم تیری عبادت کر سکتے ہیں نہ کچھ اور۔ اس لفظ میں اللہ پر توکل اور اپنے تمام کام اس کے سپرد کرنے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی گئی ہے۔ بعض سلف نے فرمایا، فاتحہ قرآن کا خلاصہ ہے اور ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾

فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ کیونکہ " اِيَّاكَ نَعْبُدُ" کہنے سے انسان شرک سے بری ہو جاتا ہے اور " اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کہنے سے وہ اپنی قوت و طاقت اور اختیار سے خالی ہو کر صرف اللہ پر توکل و اعتماد کا اقرار و اظہار کرتا ہے۔

7 اس استعانت سے مراد ان کاموں میں مدد طلب کرنا ہے جن کا اختیار اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے پاس رکھا ہے، کسی مخلوق کو ان کا اختیار نہیں دیا، مثلاً معالج دوا دے سکتا ہے مگر شفا صرف اللہ کے پاس ہے۔ کوئی صاحب خیر کچھ روپے پیسے دے سکتا ہے مگر غنی یا فقیر کر دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ طبیب علاج کر سکتا ہے مگر اولاد سے نوازنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فوج، آدمیوں اور اسلحے سے ایک دوسرے کی مدد ہو سکتی ہے مگر فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ غرض دنیا کے ظاہری اسباب و وسائل جو انسانوں کو عطا کیے گئے ہیں، ان میں ایک دوسرے سے مدد مانگنا بھی جائز ہے اور ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی لازم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾ [المائدۃ : ۲] ''نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔'' افسوس کہ بعض لوگ ان ہستیوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو سنتے ہی نہیں، نہ پاس موجود ہوتے ہیں اور ایسی چیزوں کی مدد مانگتے ہیں جو اگر وہ زندہ ہوں یا سن رہے ہوں تب بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ کتنا ظلم ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں " اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں) کا اقرار کرتے ہیں، پھر غیر اللہ سے مدد مانگتے ہیں، مثلاً ''يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِيْ'' (اے اللہ کے رسول! میری مدد کیجیے) یا اے مولا علی، اے شیر خدا! میری کشتی پار لگا دینا، یا المدد یا غوث اعظم، یا مدد کن یا معین الدین چشتی۔ غرض صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کے عہد و اقرار کے بعد غیروں کو رب تعالیٰ کا شریک بنا کر انھیں رب کے اختیارات کا مالک سمجھتے ہیں اور ان سے استغاثہ و استعانت کرتے ہیں۔

8 یہاں ایک سوال ہے کہ " اِيَّاكَ نَعْبُدُ" سے آخر فاتحہ تک دعا کرنے والا جمع کے صیغے سے دعا کرتا ہے، جب کہ دعا کرنے والا ایک ہے، اس لیے واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا، اگر جمع کا لفظ تعظیم کے لیے مانا جائے تو یہ دعا کے مناسب نہیں ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بندہ اپنی انتہائی تواضع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عالی بارگاہ میں اپنی درخواست اکیلا پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتا، بلکہ تمام عبادت کرنے والے جن و انس اور فرشتوں کے ساتھ مل کر پیش کرتا ہے کہ ہم سب (جن میں تیرا یہ عاجز بندہ بھی ہے) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

بعض اہل علم نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ جمع کے صیغے میں ایک لطیف تواضع پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ واحد کے صیغے میں اپنی کچھ بڑائی کا اظہار ہوتا ہے جو جمع کے صیغے میں نہیں ہے۔ (ابن کثیر) بعض مفسرین نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی کہ ہر مومن دوسرے مومنوں کے ساتھ ایک جسم کی مانند ہے اور ہر مومن تمام مومنوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس لیے وہ اکیلا ہی تمام مسلمانوں کی طرف سے عرض کرتا ہے کہ ہم سب صرف تیری تعریف کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُؤْمِنُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُ هُمْ وَ يَسْعٰى بِذِمَّتِهِمْ اَدْنَاهُمْ وَ هُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ)) ''ایمان والے لوگ، ان کے خون آپس میں برابر ہوتے ہیں، ان کا سب سے معمولی آدمی بھی ان کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ

ہمیں سیدھے راستے پر چلا ○

وہ اپنے سوا سب کے مقابلے میں ایک ہاتھ ہوتے ہیں۔‘‘ [أبو داوٗد، الدیات، باب أیقاد المسلم من الکافر؟ : ٤٥٣٠، وقال الألبانی حسن صحیح]

9 ’’ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ‘‘ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبادت و استعانت کی بہترین صورت اجتماعی عبادت و استعانت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی جامع صورت نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا: ﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴾ [البقرة : ٤٣] ’’اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔‘‘

10 ’’ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ‘‘ میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس کام کے لیے مدد مانگتے ہیں، تاکہ وہ عام رہے، مقصد یہ ہے کہ ہر کام میں تیری مدد مانگتے ہیں۔

1 اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ : ہدایت کا ایک معنی نرمی اور مہربانی کے ساتھ راستہ بتانا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ : ٥٢] ’’اور بے شک تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔‘‘ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دوسرے لوگ سبھی کر سکتے ہیں۔ ہدایت کا دوسرا معنی راستے پر چلنے کی توفیق دینا ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص : ٥٦] ’’بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔‘‘ ’’ الصِّرَاطَ ‘‘ اس کا اصل ’’سِرَاطٌ‘‘ ہے، جو ’’سَرَطَ يَسْرُطُ سَرْطًا، سَرَطَانًا (ن، ع)‘‘ سے مشتق ہے، سین کو صاد سے بدل دیا گیا، اس کا معنی نگلنا ہے۔ ’’سِرَاطٌ‘‘ کا معنی واضح راستہ ہے، کیونکہ اس پر چلنے والا اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے نگلا ہوا کھانا غائب ہو جاتا ہے۔ (القاموس) ’’ الْمُسْتَقِيْمَ ‘‘ ’’قَامَ يَقُوْمُ‘‘ میں سے باب استفعال سے اسم فاعل ہے، جو اصل میں ’’مُسْتَقْوِمٌ‘‘ ہے، معنی اس کا وہی ہے جو ’’قَامَ يَقُوْمُ‘‘ کا ہے۔ حروف کی زیادتی سے معنی میں تاکید پیدا ہوگئی، بالکل سیدھا راستہ۔

2 پچھلی آیت میں ’’ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ‘‘ سے سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا مدد چاہتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے جواب یہ سکھایا کہ کہو پروردگارا! ہمیں زندگی کے ہر لمحے میں اور اپنے ہر کام میں تیری ہدایت کی ضرورت ہے، کیونکہ اگر تو نہ بتائے تو ہم ظلوم و جہول کسی چیز کے متعلق جان ہی نہیں سکتے کہ اس میں صحیح راستہ کیا ہے۔ اگر جان بھی لیں تو اپنے نفس کی کمزوریوں، شہوت، غضب، حسد، طمع، بخل اور کبر وغیرہ کی وجہ سے اور شیطان اور دوسرے دشمنوں کی وجہ سے اس صحیح راستے پر چلنا اور قائم رہنا تیری توفیق کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے ہماری درخواست ہے کہ ہر کام اور ہر لمحے میں ہمیں سیدھے راستے کو

جاننے کی اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔

3 بعض لوگ یہاں ایک سوال ذکر کرتے ہیں کہ جب ہم پہلے ہی ہدایت پر ہیں تو پھر ہدایت کی درخواست کا کیا مطلب؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہدایت پر قائم رکھ۔ یہ مطلب بھی درست ہے، مگر آپ خود سوچ لیں کہ انسان کو ہر لمحے کسی نہ کسی کام کے متعلق فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ مجھے اس میں کیا کرنا ہے، تھوڑی سی لغزش اسے بہت دور پہنچا سکتی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہم ہر وقت اور ہر کام میں ہدایت پر ہیں، بہت بڑی دلیری کی بات ہے۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے بغیر ہم کسی بھی قدم پر گمراہی کا شکار ہو سکتے ہیں، ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگتے رہنا لازم ہے۔

4 "الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" سے مراد دین اسلام ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تک اور جنت تک پہنچانے والا یہی واضح، صاف اور سیدھا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی صراحت فرمائی: ﴿ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ۬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [الأنعام : ۱۶۱ تا ۱۶۳] "کہہ دے بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر دی ہے جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت، جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا۔ کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمین (حکم ماننے والوں) میں سب سے پہلا ہوں۔" نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم (سیدھے راستے) کی مثال بیان فرمائی۔ اس راستے کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں جن میں کھلے ہوئے دروازے ہیں۔ ان دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں اور اس راستے کے دروازے پر ایک بلانے والا ہے جو کہتا ہے: "اے لوگو! تم سب اس راستے میں داخل ہو جاؤ اور ٹیڑھے مت ہونا۔" اور ایک بلانے والا اس راستے کے اوپر کنارے سے آواز دے رہا ہے۔ جب کوئی انسان ان دروازوں میں سے کسی کو کھولنا چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے: "افسوس تجھ پر! اسے مت کھول، کیونکہ اگر تو اسے کھولے گا تو اس میں داخل ہو جائے گا۔" سو "الصِّرَاطَ" (وہ راستہ) اسلام ہے اور دونوں دیواریں اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں اور کھلے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور راستے کے شروع میں بلانے والی چیز اللہ کی کتاب ہے اور راستے کے اوپر کنارے والا اللہ تعالیٰ کا نصیحت کرنے والا ہے جو ہر مسلم کے دل میں ہے۔" [مسند أحمد : ۱۸۲/۴، ۱۸۳، ح : ۱۷۶۵۲۔ ترمذی : ۲۸۵۹، قال ابن کثیر حسن صحیح و صححه الألباني والسیوطی] معلوم ہوا صراط مستقیم اسلام ہے جو ہمارے پاس کتاب و سنت کی صورت میں موجود ہے، اس لیے جب کوئی کتاب و سنت سے ہٹ کر کسی شخصیت یا گروہ کے پیچھے لگتا ہے تو وہ صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے، پھر

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ ع

ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں ○

اس کے لیے منزل مقصود جنت تک پہنچنا کسی صورت ممکن نہیں، جب تک ان تمام ٹیڑھی راہوں سے ہٹ کر کتاب و سنت کی واضح، کشادہ، روشن اور سیدھی راہ پر نہیں آتا۔

5 ”الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ“ میں پورا اسلام اور اس کے احکام آ گئے، باقی قرآن و سنت اس کی تفصیل ہے۔

1 صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: یعنی جن لوگوں پر تو نے دوسرے بے شمار انعامات کے ساتھ اپنی اطاعت کی توفیق کا خاص انعام کیا، ان سے مراد چار قسم کے لوگ ہیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ [النساء : ٦٩] ”اور جو کوئی اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے۔“ قرآن مجید میں مذکور انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے تمام واقعات اس مختصر جملے کی تفصیل ہیں۔

2 غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ: قرآن مجید میں ”الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ“ یہود کو کہا گیا ہے، چنانچہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [البقرة : ٦١] ”اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کی طرف سے بھاری غضب لے کر لوٹے۔“ اور فرمایا: ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ [البقرة : ٩٠] ”پس وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے۔“ اور فرمایا: ﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [المائدة : ٦٠] ”کہہ دے کیا میں تمھیں اللہ کے نزدیک جزا کے اعتبار سے اس سے زیادہ برے لوگ بتاؤں؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر وہ غصے ہوا اور جن میں سے اس نے بندر اور خنزیر بنا دیے اور جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔ یہ لوگ درجے میں سب سے برے اور سیدھے راستے سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔“

اور ”الضَّآلِّيْنَ“ نصاریٰ کو کہا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [المائدة : ٧٧] ”اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔“ اس آیت سے پہلے مسلسل نصاریٰ کا ذکر آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ”الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ“ اور ”الضَّآلِّيْنَ“ کی یہی تفسیر فرمائی۔ چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْيَهُوْدُ مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ وَ النَّصَارٰى ضُلَّالٌ)) ”یہود ”مَغْضُوْبٌ عَلَيْهِمْ“ ہیں اور نصاریٰ گمراہ ہیں۔“

[ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة فاتحة الكتاب : ٢٩٥٤، و صححه الألباني]

3 رسول اللہ ﷺ کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" یہود ہیں اور "الضَّآلِّيْنَ" نصاریٰ، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جن میں وہ عادات و خصائل پائے جاتے ہیں جو یہود کے "الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" بننے کا باعث ٹھہرے، یا جن کی وجہ سے نصاریٰ "الضَّآلِّيْنَ" (گمراہ) ٹھہرے۔ مثلاً یہود پر غضب نازل ہونے کے اسباب جو اللہ تعالیٰ نے شمار فرمائے ہیں اختصار کے ساتھ یہ ہیں، اللہ کی کتاب میں تحریف، اللہ کی آیات کو چھپانا، اللہ کی حدود مثلاً رجم اور ہاتھ کاٹنے کو معطل کرنا، اللہ پر جھوٹ باندھنا، اپنے پاس سے مسائل بیان کر کے انھیں اللہ کا حکم قرار دینا، نبی ﷺ پر حسد کی وجہ سے ایمان نہ لانا اور باہمی ضد کی وجہ سے بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ جانا۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: " وَ بِالْجُمْلَةِ فَإِنْ شِئْتَ أَنْ تَرٰى نَمُوْذَجَ الْيَهُوْدِ فَانْظُرْ إِلٰى عُلَمَاءِ السُّوْءِ مِنَ الَّذِيْنَ يَطْلُبُوْنَ الدُّنْيَا وَ قَدِ اعْتَادُوْا تَقْلِيْدَ السَّلَفِ وَ اَعْرَضُوْا عَنْ نُصُوْصِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَ تَمَسَّكُوْا بِتَعَمُّقِ عَالِمٍ وَ تَشَدُّدِهِ وَ اسْتِحْسَانِهِ فَاَعْرَضُوْا عَنْ كَلَامِ الشَّارِعِ الْمَعْصُوْمِ وَ تَمَسَّكُوْا بِأَحَادِيْثَ مَوْضُوْعَةٍ وَ تَأْوِيْلَاتٍ فَاسِدَةٍ كَانَتْ سَبَبَ هَلَاكِهِمْ " "قصہ مختصر اگر تم چاہو کہ یہود کا نمونہ دیکھو تو ان علمائے سوء کو دیکھ لو جو دنیا طلب کر رہے ہیں اور پہلے لوگوں کی تقلید کے عادی ہو چکے ہیں، جنھوں نے کتاب و سنت کی صریح آیات و احادیث سے منہ موڑ لیا اور کسی عالم کے تکلف، اس کے تشدد اور اس کے استحسان کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے معصوم پیغمبر ﷺ کے کلام سے منہ موڑ لیا اور من گھڑت احادیث اور فاسد تاویلات سے چمٹ گئے، جو ان کی ہلاکت کا باعث بن گئیں۔" (الفوز الکبیر)

اور نصاریٰ کی گمراہی کے اسباب یہ تھے، مسیح علیہ السلام کے بارے میں غلو، ان کو عین خدا یا تین میں سے ایک خدا کہنا، مریم علیہا السلام کو تین میں سے ایک خدا کہنا، مسیح علیہ السلام، مریم علیہا السلام اور صلیب کی پوجا کرنا، قبروں کو مسجدیں بنانا، احبار و رہبان کو رب بنانا وغیرہ۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وَاِنْ شِئْتَ أَنْ تَرٰى نَمُوْذَجًا لِهٰذَا الْفَرِيْقِ فَانْظُرِ الْيَوْمَ إِلٰى أَوْلَادِ الْمَشَائِخِ الْأَوْلِيَاءِ مَاذَا يَظُنُّوْنَ بِآبَائِهِمْ؟ فَتَجِدُهُمْ قَدْ أَفْرَطُوْا فِيْ إِجْلَالِهِمْ كُلَّ الْإِفْرَاطِ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ " "اگر چاہو کہ اس گروہ کا نمونہ دیکھو تو بزرگ اولیاء کی آج کل کی اولاد کو دیکھ لو کہ وہ اپنے باپ دادا کے متعلق کیا گمان رکھتے ہیں، چنانچہ تم انھیں پاؤ گے کہ وہ ان کی بزرگی بیان کرتے ہیں، جتنا مبالغہ ہو سکے کرتے ہیں اور عنقریب وہ لوگ جان لیں گے جنھوں نے ظلم کیا کہ وہ لوٹنے کی کون سی جگہ لوٹ کر جائیں گے۔" (الفوز الکبیر)

4 "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے: "نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا" مگر حقیقت یہ ہے کہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" میں لفظ "غَيْرِ" پچھلی آیت میں "الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" سے بدل یا اس کی صفت ہے، یعنی "الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" اور "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" دونوں ایک ہی لوگ ہیں، اس لیے ترجمہ یہ ہو گا: "ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔"

5 یہاں ایک سوال ہے کہ کیا "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کافی نہ تھا، پھر اس کے بعد "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا

الضَّآلِّیْنَ ‘‘ لانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انعام تو اس کی ہر مخلوق پر بے شمار ہے، کم از کم اسے پیدا کرنا اور اس کی زندگی کی ہر ضرورت پوری کرنا ہی بہت بڑی نعمت ہے، اس لیے یہ تعلیم دی کہ ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی دعا کرو جن پر اللہ نے انعام کیا، مگر وہ غضب کا نشانہ نہیں بنے، نہ ہی وہ گمراہ ہیں، ایسے لوگ وہ چار گروہ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

6 ’’ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ‘‘ میں انعام کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے، جب کہ غضب اور ضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے ادب کی تعلیم ہے کہ اگرچہ خیر و شر دونوں کا خالق وہ ہے مگر شر کی نسبت اس کی طرف نہیں کی جاتی، کیونکہ اس کا ہر فعل خیر ہی خیر ہے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ﴿ عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب سب لوگ ایک میدان میں کھڑے ہوں گے تو رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کو پکاریں گے: « لَبَّیْكَ وَ سَعْدَیْكَ وَالْخَیْرُ فِیْ یَدَیْكَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْكَ » [مستدرك حاكم، تفسير سورة بنى إسرائيل : ۲/۳۶۳، ح : ۳۳۸۴] ’’بار بار حاضر ہوں اور بار بار حاضر ہوں، خیر تیرے ہاتھوں میں ہے اور شر تیری طرف نہیں ہے۔‘‘ اسے حاکم نے شیخین کی شرط پر صحیح کہا ہے اور ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ سورۂ کہف میں خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو کشتی توڑنے اور دوسرے دو واقعات کی اصل حقیقت بیان کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے اس ادب کا خاص خیال رکھا ہے، ملاحظہ فرمائیں سورۂ کہف (۷۹ تا ۸۲) کی تفسیر۔

7 سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد ’’آمین‘‘ کہنا چاہیے، اس کا معنی اے اللہ! قبول فرما، یا ایسے ہی کر دے ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید کا حصہ نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اسے قرآن مجید کے ساتھ نہیں لکھا گیا۔ امام کے ’’ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ‘‘ کہنے پر امام اور مقتدی دونوں کو آمین کہنا چاہیے۔ مقتدی کو امام کی آمین کے ساتھ آمین کہنا چاہیے۔ اس کے متعلق چند احادیث درج کی جاتی ہیں، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب امام ﴿ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴾ کہے تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا (آمین) کہنا فرشتوں کے کہنے کے موافق ہو گیا، اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘ [بخاری، الأذان، باب جهر المأموم بالتأمين : ۷۸۲] ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب امام آمین کہے تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہو گیا، اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘ [بخاری، الأذان، باب جهر الإمام بالتأمين : ۷۸۰۔ مسلم : ۴۱۰]

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب امام ’’ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ‘‘ کہے تو تم آمین کہو، اللہ تعالیٰ تمھاری دعا قبول کر لے گا۔‘‘ [مسلم، الصلاة، باب التشهد فى الصلاة : ۴۰۴] وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے بلند آواز سے آمین کہی اور دائیں اور بائیں سلام پھیرا، یہاں تک کہ میں نے آپ کے رخسار کی سفیدی دیکھ لی۔ [أبو داؤد، الصلوة، باب التأمين وراء الإمام : ۹۳۴، وقال الألبانی حسن صحیح]

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب "وَلَا الضَّآلِّيْنَ" پڑھتے تو "آمین" کہتے اور اس کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتے۔ [أبو داؤد، باب التأمين وراء الإمام : ۹۳۳، وقال الألباني صحيح]

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ پڑھا اور اس کے ساتھ اپنی آواز کو لمبا کیا۔ [ترمذی، الصلاة، باب ما جاء في التأمين : ۲۴۸، وقال الألباني صحيح] عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہودیوں نے تم پر کسی چیز میں وہ حسد نہیں کیا جو انھوں نے آمین کہنے اور سلام میں تم پر حسد کیا ہے۔" [ابن ماجه، إقامة الصلوات، باب الجهر بآمين : ۸۵۶۔ مسند أحمد : ۱۳۴/۶، ۱۳۵، ح : ۲۵۰۸۲، و قال الألباني صحيح]

سورۃ البقرۃ ۲ — آیاتھا ۲۸۶ — رکوعاتھا ۴۰ — مدنیۃ ۸۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ۝

الٓمّٓ ۝

یہ قرآن مجید کی سات سب سے لمبی سورتوں میں سے ہے، جن کی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ اَخَذَ السَّبْعَ الْأُوَلَ فَهُوَ حَبْرٌ)) ''جس نے یہ پہلی سات سورتیں حاصل کر لیں وہ بہت بڑا عالم دین بن گیا۔'' [مسند أحمد: ۸۲/۶، ح: ۲٤۵۸۵، عن عائشة رضی اللہ عنہا، و إسناده حسن] یہ سورت بہت سے مواعظ واحکام اور قصص پر مشتمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے '' سَنَامُ الْقُرْآنِ'' (قرآن کی کوہان) قرار دیا ہے۔ [مسند أبي يعلى : ۷۵۱٦۔ الصحيحة: ۵۸۸، عن سهل ابن سعد رضی اللہ عنہ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھروں کو مقبرے نہ بناؤ، یقیناً شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوتا جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت ہوتی رہے۔'' [ترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في سورة البقرة ...... : ۲۸۷۷، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ و صححه الألباني] ایک روایت میں ہے: ''شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے۔'' [مسلم، صلوة المسافرين، باب استحباب صلوة النافلة: ۷۸۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دو نہایت روشن سورتیں بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو، کیونکہ قیامت کے دن یہ اس طرح آئیں گی جیسے دو بادل یا دو سائبان یا پرندوں کے دو جھنڈ ہوں، یہ اپنے ساتھیوں کی طرف سے جھگڑیں گی۔ سورۂ بقرہ پڑھا کرو، کیونکہ اس کا حاصل کرنا باعث برکت ہے اور اسے چھوڑ دینا موجب حسرت ہے اور اہل باطل اس کی طاقت نہیں رکھتے۔'' [مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل قراءة القرآن و سورة البقرة : ۸۰٤] عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء اس زمانے میں اتریں جب میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی۔ [بخاري، فضائل القرآن، باب تأليف القرآن : ٤۹۹۳]

آیت 1 الٓمّٓ : کچھ سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں انھیں مقطعات کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ الگ الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں، ان کا معنی تو صاف ظاہر ہے کہ یہ حروف تہجی کے نام ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کا کوئی معنی ہی نہیں، مگر یہ حروف سورتوں کے شروع میں کیوں لائے گئے ہیں، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند کے ساتھ کوئی بات منقول نہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ نے خلفائے اربعہ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حروف سرِ الٰہی ہیں جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، مگر اس کی سند نہ قرطبی نے ذکر کی ہے نہ کہیں اور مل سکی ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض تابعین سے اس کی تاویل میں مختلف اقوال مروی ہیں، مگر صحتِ سند کے ساتھ ثابت نہیں۔ بعض علماء نے ان کی تفسیر میں اپنی طرف سے کچھ نکات بیان کیے ہیں، مگر وہ محض فنی کاوش ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

سب سے قریب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حروف کے ذکر سے تمام دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾

یہ کامل کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے ﴿۲﴾ وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں ﴿۳﴾

انھی حروف تہجی میں اتارا ہے، اگر تمھیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو حروف تہجی تمھارے بھی علم اور استعمال میں ہیں، تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر لے آؤ۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ عموماً یہ حروف جہاں بھی آئے ہیں ان کے بعد قرآن مجید، کتاب یا وحی کا ذکر آیا ہے، ابن کثیر نے فراء، مبرد، زمخشری اور دوسرے علماء کے علاوہ ابن تیمیہ کا یہی قول ذکر کیا ہے، مگر یہ بات پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ کسی سورت کے شروع میں جو حروف آئے ہیں اس کے ساتھ ان کا خاص تعلق ہے، مثلاً کچھ سورتوں کے شروع میں "الٓمّٓ" ہے تو دوسری سورتوں کے شروع میں "الٓرٰ" یا "طٰسٓ" وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکمت تک رسائی ہمارے بس سے باہر ہے اور یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ یہ ان متشابہات سے ہیں جن کی حقیقی مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

آیت 2 ① **لَا رَيْبَ فِيْهِ**: یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں شک والی کوئی بات ہی نہیں، اس کی ہر بات یقینی ہے، انسان کا علم چونکہ ناقص ہے، اس لیے اس کی ہر بات یقینی نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں اس کتاب کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں بھی کوئی شک نہیں، فرمایا: ﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [السجدۃ : ۲] "اس کتاب کا نازل کرنا جس میں کوئی شک نہیں، جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔" اگر کسی کو اس کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے میں شک ہو تو اس کا علاج اسی سورۂ بقرہ کی آیت (۲۳) میں بیان فرمایا گیا ہے۔

② **هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ**: ہدایت کا ایک معنی راستہ دکھانا ہے، اس لحاظ سے تو قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے، فرمایا: ﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [آل عمران : ٤] "(یہ) تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔" دوسرا معنی منزل تک پہنچا دینا ہے۔ (دیکھیے القصص : ۵۶) اس لحاظ سے یہ صرف متقین کے لیے ہدایت ہے، کیونکہ منزل پر وہی پہنچتا ہے جو رہبر کے کہنے پر چلتا ہے، شفا اسی مریض کو ہوتی ہے جو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ متقی کا لفظ "وِقَايَةٌ" سے مشتق ہے، جس کا معنی بچاؤ اور حفاظت ہے۔ شرع میں متقی وہ ہے جو ہر ایسی چیز سے اپنے آپ کو باز رکھے جس کے کرنے یا چھوڑنے سے خطرہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ہوسکتا ہے۔ (کشاف) متقین کی کچھ صفات آئندہ آیات میں آ رہی ہیں، مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۷۷)۔

آیت 3 ① **يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ**: "بِالْغَيْبِ" سے مراد وہ حقائق ہیں جو انسان کے حواس اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ حدیث جبریل، جس کے راوی امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ ہیں، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تعریف یہ بیان فرمائی کہ آدمی اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت اور اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لائے۔ [مسلم : ۸] یہ سب چیزیں غیب میں شامل ہیں، کیونکہ انھیں دیکھے بغیر ان پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ قرآن کی ہدایت سے فیض یاب

وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾

اور وہ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں ﴿۴﴾

ہونے والے وہی متقی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے غیب پر ایمان رکھتے ہیں، اپنے مشاہدے یا اپنی عقل سے معلوم ہونے کا مطالبہ نہیں کرتے، غیب کے منکروں کو قرآن سے کچھ حاصل نہیں، جیسے اندھے کو چراغ کا کوئی فائدہ نہیں۔

② **وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ :** قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے غیب پر ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت بھی ضروری ہے، اس کی پہلی اور دائمی علامت بلاناغہ نماز ہے، پانچ وقت اذان سن کر نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، پھر جو شخص اطاعت پر تیار ہی نہ ہو اسے ہدایت کیسے ہو؟ نماز قائم کرنے سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نماز کی طرح نماز ادا کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نماز اس طرح پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔'' [بخاری، الأذان، باب من قال لیؤذن فی السفر...... : ۶۲۸، عن مالك بن الحویرث رضی اللہ عنہ]

ارکان نماز کو اعتدال اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اطمینان سے ارکان نماز ادا نہ کرنے والے آدمی سے فرمایا تھا: ''نماز دوبارہ پڑھو، کیونکہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔'' [بخاری، الأذان، باب وجوب القراءة للإمام...... : ۷۵۷، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ]

جماعت کا اہتمام بھی نماز قائم کرنے میں شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی تین آدمی نہیں جو کسی بستی میں ہوں یا بادیہ میں، جن میں نماز قائم نہ کی جاتی ہو مگر شیطان ان پر غالب آ چکا ہوتا ہے۔'' [أبو داوٗد، الصلوۃ، باب التشدید فی ترك الجماعة : ۵۴۷، عن أبی الدرداء رضی اللہ عنہ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی صفیں درست کرو، بلاشبہ صفیں درست کرنا بھی اقامتِ صلاۃ کا حصہ ہے۔'' [بخاری، الأذان، باب إقامة الصف...... : ۷۲۳، عن أنس رضی اللہ عنہ] اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز میں کندھے سے کندھا اور قدم سے قدم خوب اچھی طرح ملاتے تھے، انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب نبی ﷺ ہمیں صفیں درست کرنے کا حکم دیتے تو ہم اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ ہر نمازی اپنا پاؤں اور کندھا ساتھ والے کے پاؤں اور کندھے کے ساتھ چپکا دیتا تھا۔'' [بخاری، الأذان، باب إلزاق المنکب...... : ۷۲۵]

③ **وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ :** ''جو کچھ ہم نے انھیں دیا'' اس سے مراد ہر نعمت ہے، مثلاً مال و اولاد، علم و عقل، قوت و صحت، عزت و وقار وغیرہ۔ ''ہر نعمت میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں'' ساری نعمت خرچ کرنے کا مطالبہ ہی نہیں۔ دیکھیے سورۂ محمد (۳۶ تا ۳۸) اس میں ذاتی ملکیت کے منکروں (کمیونسٹوں) کا رد ہے، کیونکہ ملکیت نہ ہو گی تو خرچ کس سے کرے گا۔ خرچ میں فرض و نفل ہر قسم کا خرچ ہے اور جو شخص اللہ کے لیے اس کی عطا کردہ نعمت خرچ کرنے پر تیار ہی نہیں وہ قرآن سے رہنمائی حاصل نہیں کر سکتا۔

آیت 4 ① **بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ :** خواہ قرآن ہو یا سنت، فرمایا: ﴿ وَ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ﴾ [النساء : ۱۱۳] ''اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی۔''

أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے بڑی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں ۝۵ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انھیں ڈرایا ہو یا انھیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے ۝۶

② وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ : یعنی وہ وحی الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ کسی پیغمبر پر اتری ہو۔ جو لوگ کسی پیغمبر پر وحی کا اترنا ہی نہیں مانتے ان کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں۔ البتہ اب عمل اسی پر ہوگا جو آخری نبی ﷺ لے کر آئے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ (دیکھیے حجر : ۹) جبکہ پہلی کتابیں اصل حالت میں موجود ہی نہیں۔

③ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ : آخرت کا لفظ ''اول'' کے مقابلے میں ''آخر'' کے ساتھ تاء لگانے سے بنا ہے، دنیا کی زندگی کے بعد والی زندگی۔ اس کا یقین ہی انسان کو نیک اعمال کرنے اور برے اعمال سے بچنے پر آمادہ کر سکتا ہے، اس لیے یہ ایمان کا بنیادی جزو ہے۔ ''هُمْ'' ضمیر کے ساتھ حصر پیدا ہوتا ہے، یعنی آخرت پر صحیح یقین رکھنے والے اہل اسلام ہی ہیں۔ دوسرے لوگوں کے عقائد درحقیقت اوہام و خرافات پر مبنی ہیں، مثلاً یہود و نصاریٰ کا دعویٰ کہ جنت میں ہم ہی جائیں گے اور آگ میں گئے بھی تو چند دن رہیں گے۔ اسی طرح ہندوؤں کا تناسخ کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد نیکوں کی روح کسی بہتر جان دار میں منتقل ہوتی ہے اور بروں کی روح کسی برے جانور، مثلاً کتے یا چوہے وغیرہ کی شکل میں منتقل ہوتی ہے۔

آیت 5 هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ : الف لام کی وجہ سے ''پورے کامیاب'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی وہی متقی جن میں یہ اوصاف ہوں گے رب تعالیٰ کی طرف سے سیدھے راستے پر قائم رہیں گے اور وہی مکمل کامیابی سے سرفراز ہوں گے۔ ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں ہدایت دے گا اور جنت بھی۔ دیکھیے سورۂ یونس (۹)۔

آیت 6 لَا يُؤْمِنُوْنَ : اس سے مراد تمام کفار تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ بے شمار کافر دعوت کے نتیجے میں ایمان لائے اور لا رہے ہیں۔ اس لیے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو پچھلی آیات میں مذکور چھ چیزوں کا یا ان میں سے بعض کا انکار کر دیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ اگر یہ حق بھی ہو تو ہم اسے نہیں مانیں گے، جیسے بعض یہودِ مدینہ (بقرہ : ۱۴۶) اور ابوجہل اور اس کے ساتھی وغیرہ۔ (انفال : ۳۲) جب کوئی طے کر لے کہ میں نے ماننا ہی نہیں تو اسے ایمان کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟ سوئے ہوئے کو جگایا جاتا ہے، جاگتے ہوئے مدہوش کو کون جگا سکتا ہے؟ اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈرانا بالکل فضول ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہر شخص تک پہنچانا فرض ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کے علم میں کون ایمان لانے والا ہے اور کس کی قسمت میں کفر پر اصرار ہے، ہمیں ہر حال میں ڈرانے پر ثواب ملے گا اور نہ ڈرانے پر باز پرس ہوگی۔ اس لیے فرمایا کہ ڈرانا نہ ڈرانا ان پر برابر ہے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ پر برابر ہے۔ یہاں ہمزہ کا معنی ''کیا'' نہیں ہوگا، بلکہ یہ برابری کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اسے ''ہمزہ تسویہ'' کہتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ٝ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ؑ وَ مِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ؕ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ
مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی نگاہوں پر بھاری پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے (۷) اور لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ہرگز مومن نہیں (۸) اللہ سے دھوکا بازی کرتے ہیں اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے، حالانکہ وہ اپنی جانوں کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے رہے اور وہ شعور نہیں رکھتے (۹) ان کے دلوں ہی میں ایک بیماری ہے تو اللہ نے انھیں بیماری میں اور بڑھا دیا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے (۱۰)

آیت 7 ان کے کفر اور اعمال بد کے نتیجے میں ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور قبولِ حق کی استعداد جو فطرتاً ہر شخص میں رکھی گئی ہے، ان سے چھن چکی ہے۔ یہ مہر اگرچہ اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے، مگر اس کا باعث ان کا عمل ہے، فرمایا: ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ [النساء : ١٥٥] ”بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر کر دی۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے، پھر جب وہ باز آ جائے، استغفار کرے اور توبہ کرے تو اس کا دل چمک جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کرے تو نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دل پر چھا جاتا ہے، یہی وہ زنگ ہے جو اللہ نے ذکر فرمایا ہے: ﴿ كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [المطففين : ١٤] ”ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے ہیں۔“ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة ويل للمطففين ...... : ٣٣٣٤، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ و حسنه الألبانی] ” غِشَاوَةٌ “ پر تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ ”بھاری پردہ“ کیا گیا ہے۔

آیت 8 ① اس سے پہلے پانچ آیات میں اہلِ ایمان اور دو آیات میں کھلے کافروں کے ذکر کے بعد منافقین کی خصلتوں کا ذکر تیرہ آیات میں فرمایا ہے، کیونکہ چھپا ہوا کفر زیادہ خطرناک اور اس کی پہچان بہت مشکل ہے۔
② ”مَا“ نافیہ کی تاکید باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ”ہرگز“ کے ساتھ کیا گیا ہے۔

آیت 9 ” يُخٰدِعُوْنَ “ باب مفاعلہ سے ہے جس میں مشارکت پائی جاتی ہے، اس لیے ترجمہ ”دھوکا بازی“ کیا گیا ہے، یعنی وہ دل میں کفر چھپاتے اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہیں، حالانکہ دھوکا ان کے ساتھ ہو رہا ہے کہ دنیا میں انھیں مسلمان قرار دیا گیا اور انھیں مسلمانوں والے حقوق اور فوائد حاصل رہے، مگر آخرت میں وہ آگ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ﴾ [النساء : ١٤٢] ”بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے۔“ اور انھیں اس خود فریبی کا شعور بھی نہیں۔

آیت 10 ① فِيْ قُلُوْبِهِمْ : خبر مقدم ہے، جس سے حصر پیدا ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ ”ان کے دلوں ہی میں“ کیا گیا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں ⑪ سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے ⑫

② یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اللہ کو دھوکا دے جو عالم الغیب ہے اور مومنوں کو دھوکا دے جن سے زیادہ فراست والا کوئی ہو نہیں سکتا اور سمجھے کہ میں دھوکا دینے میں کامیاب ہوں۔ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل ہی ایک ایسے مرض میں مبتلا ہیں جس نے انھیں خود فریبی کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ وہ مرض نفاق ہے جو کفر کو چھپانے کی کوشش کا نام ہے۔ اس بیماری سے بے شمار نفسیاتی بیماریاں مزید پیدا ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں، مثلاً جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، بدعہدی، بدزبانی جنھیں رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ اسی طرح فساد، خود پسندی، بے وقوفی، دو رخی جن کا ذکر آئندہ آیات میں ہے اور بہت سی دیگر بیماریاں مثلاً بزدلی، طمع، بخل، جہاد سے فرار وغیرہ جن کا ذکر سورۂ توبہ اور دیگر سورتوں میں ہے۔

③ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ : منافقین باطن میں کافر ہونے کی وجہ سے عذاب عظیم کے مستحق تھے، اب اسلام کے جھوٹے دعوے کی وجہ سے عذابِ الیم یعنی دوہرے عذاب کے حق دار ٹھہرے۔

آیت 12،11 ① یہاں منافقین کے دو اوصاف بیان ہوئے ہیں، فساد یعنی زمین میں بگاڑ پیدا کرنا، اس میں اللہ کی ہر نافرمانی شامل ہے، کیونکہ اس سے زمین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، فرمایا: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ﴾ [الروم : ۴۱] ''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔'' دوسرا وصف بگاڑ پیدا کرنے کو عین اصلاح قرار دینا۔ یہ لوگ دل میں کفر رکھنے کی وجہ سے کفار سے دوستی رکھتے تھے، مسلمانوں کے راز انھیں بتاتے اور اسلام کے عقائد و احکام پر اعتراض کرتے تھے اور منع کرنے پر اپنے اس عمل بد کو اصلاح کا نام دیتے تھے۔

اب بھی مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ شرک کو اولیاء کا ادب، بدعات کو قربِ الٰہی کا ذریعہ، کفار سے دوستی اور ان کے غلبے کے لیے کوشش کو حالات کا تقاضا قرار دیتے ہیں، مسلمانوں کی نسل کشی کو خاندانی منصوبہ بندی کہتے ہیں، بدکاری و بے حیائی پھیلاتے ہیں اور اسے عورتوں کے حقوق کا تحفظ قرار دیتے ہیں۔ ہر برے سے برا کام نام بدل کر خوش نما بنا لیتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے زنا کو متعہ اور حلالے کا، باجوں گاجوں اور موسیقی کو قوالی اور روح کی غذا کا اور نشہ آور مشروبات کو نبیذ وغیرہ کا نام دے کر حلال کر رکھا ہے۔ یہ سب نفاق کے مختلف مظاہر ہیں۔

② لَا يَشْعُرُوْنَ : دل بیمار ہو تو اچھے برے کا شعور بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر آدمی اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ﴾ [فاطر : ۸] ''تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اس کو اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں)؟''

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ
وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰى شَيٰطِيۡنِهِمۡ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا
مَعَكُمۡ ۙ اِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَ يَمُدُّهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓـئِكَ
الَّذِيۡنَ اشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰى ۖ فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۶﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں، تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ سن لو! بے شک وہ خود ہی بے وقوف ہیں اور لیکن وہ نہیں جانتے ﴿۱۳﴾ اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں کی طرف اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں بے شک ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق اڑانے والے ہیں ﴿۱۴﴾ اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے اور انھیں ڈھیل دے رہا ہے، اپنی سرکشی ہی میں حیران پھرتے ہیں ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، تو نہ ان کی تجارت نے نفع دیا اور نہ وہ ہدایت پانے والے بنے ﴿۱۶﴾

آیت 13 ① "اَلنَّاسُ" سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو خلوص دل سے ایمان لائے اور ایک ہی طرف کے ہو گئے اور اپنے کسی دنیوی نقصان کی پروا نہ کی، منافقین نے انھیں بے وقوف کہا اور اپنے آپ کو عقل مند، کیونکہ اپنے خیال میں انھوں نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھایا اور اپنی دنیا کا نقصان نہ ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین ہی کو بے وقوف قرار دیا، کیونکہ ان کا نہ مسلمانوں کے ہاں کچھ اعتبار رہا نہ کفار کے ہاں اور وہ چند روزہ زندگی کے فائدے کے لیے ہمیشہ کی زندگی کا نقصان کر بیٹھے۔ فرمایا یہ ایسے بے وقوف ہیں جنھیں اپنی بے وقوفی کا بھی علم نہیں۔

② اس آیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ منافقین کو ان کے ایمان جیسا ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

آیت 14 ① شیاطین سے مراد کفر کے سردار ہیں، خواہ مشرکین و یہود سے ہوں یا خود ان منافقین سے۔ شیطان ہر سرکش اور فسادی شخص کو کہتے ہیں۔ شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں سے ہوتے ہیں، فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ غُرُوۡرًا ﴾ [الأنعام : ۱۱۲] "اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔" لفظ شیطان "شَطَنَ" سے مشتق ہے جس کے معنی "بُعد" کے ہیں، یعنی وہ جو ہر خیر سے دور ہو۔

② وَاِذَا لَقُوا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا: اس سے ظاہر ہے کہ اہل ایمان سے ان کی ملاقات سرسری ہوتی ہے، کبھی کسی مجلس میں، کبھی سر راہ، مگر اپنے شیطانوں کے ساتھ اہتمام کے ساتھ خلوت ہوتی ہے۔ پھر اہل ایمان کو تاکید کے کسی لفظ کے بغیر صرف "اٰمَنَّا" کہتے ہیں اور اپنے شیاطین کو "اِنَّا" اور "اِنَّمَا" کی تاکید کے ساتھ اپنے کفر کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ ہم عقیدے میں بلاشک و شبہ تمھارے ساتھی ہیں، رہا ہمارا ایمان کا اقرار و اظہار تو وہ محض مذاق ہے۔

آیت 16،15 منافقین دل میں کفر رکھنے اور کفار کا ساتھ دینے کے باوجود مسلمانوں سے ملتے تو "اٰمَنَّا" کہتے اور اسے اہل ایمان

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ أَضَاۤءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ
فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

ان کی مثال اس شخص کی مثال کی سی ہے جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، تو جب اس نے اس کے ارد گرد کی چیزوں کو روشن کر دیا تو اللہ ان کے نور کو لے گیا اور انھیں کئی طرح کے اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ نہیں دیکھتے﴿۱۷﴾ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ نہیں لوٹتے﴿۱۸﴾

کے ساتھ مذاق قرار دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی جواباً ان کے ساتھ یہی معاملہ فرمایا کہ ان کے متعلق یہ طے کر دیا کہ وہ جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے، اس کے باوجود دنیا میں انھیں مسلمان قرار دیا اور ان کی رسی دراز کر دی، تاکہ وہ سرکشی میں زیادہ سے زیادہ بڑھ جائیں، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ﴾ [آل عمران : ۱۷۸] ''ہم انھیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔'' وہ ان کا مذاق تھا یہ اللہ تعالیٰ کا مذاق ہے۔ قرآن مجید میں ایسے الفاظ مقابلے میں استعمال ہوئے ہیں جو ابتداءً کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مذاق کرنے میں وہ معاملہ بھی شامل ہے جو قیامت میں منافقین کو پیش آئے گا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جاتے ہوئے ان کے نور سے راستہ دیکھتے ہوئے جا رہے ہوں گے کہ یکایک ایک دیوار کے ذریعے سے جہنم کی طرف دھکیل دیے جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ حدید (۱۲ تا ۱۵)۔

آیت 17 ❶ **اسْتَوْقَدَ نَارًا** : '' اَوْقَدَ نَارًا '' کے معنی ہیں اس نے آگ جلائی۔ '' **اسْتَوْقَدَ** '' میں سین اور تاء زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، اس لیے اس کا ترجمہ ''خوب بھڑکائی'' کیا ہے۔

❷ منافقین کی تشبیہ اس شخص سے کس طرح دی گئی جس نے ایک آگ خوب بھڑکائی، پھر اس کی آگ بجھ گئی اور اللہ ان کا نور لے گیا؟ جواب یہ ہے کہ دو وجہ سے، پہلی یہ کہ یہ لوگ پہلے ایمان لائے تو نور ایمان سے ان کے لیے ہر چیز روشن ہو گئی، پھر نفاق میں مبتلا ہو گئے تو وہ نور بجھ گیا اور وہ کفر و نفاق اور شکوک و شبہات کے کئی اندھیروں میں بھٹکتے رہ گئے۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ [المنافقون : ۳] ''یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔''

تشبیہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمان لانے کی وجہ سے دنیا میں انھیں مسلمانوں والی عزت حاصل ہوئی، مسلمانوں کے ساتھ ان کے رشتے ناتے رہے، وہ ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے، مال غنیمت اور دوسرے بے شمار فوائد حاصل کرتے رہے، مگر جب فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عزت چھین لی، جیسے اس آگ والے سے اس کی روشنی چھین لی اور انھیں بہت سے اندھیروں (یعنی قبر، یوم محشر اور جہنم کے عذاب) میں چھوڑ دیا۔ (طبری عن ابن عباس بسند حسن)

آیت 18 ❶ **صُمٌّۢ** (بہرے) ''اَصَمُّ'' کی جمع ہے، **بُكْمٌ** (گونگے) ''اَبْکَمُ'' کی جمع ہے اور **عُمْيٌ** (اندھے) ''اَعْمٰی'' کی جمع ہے۔ ان کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کان، زبانیں یا آنکھیں ہیں ہی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع ۲

یا جیسے آسمان سے اترنے والی بارش، جس میں کئی اندھیرے ہیں اور گرج اور چمک ہے، وہ کڑکنے والی بجلیوں کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾ بجلی قریب ہے کہ ان کی نگاہیں اچک کر لے جائے، جب کبھی وہ ان کے لیے روشنی کرتی ہے اس میں چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کر دیتی ہے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور ان کی سماعت اور ان کی نگاہیں لے جاتا، بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۰﴾

کہ انھوں نے یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ﴾ [الأحقاف : ۲۶] ”اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔“

❷ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ: یعنی وہ اس گمراہی سے جو خرید بیٹھے اور اس ہدایت کی طرف جسے فروخت کر بیٹھے واپس نہیں لوٹتے۔ ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے مومن اور دل میں پکے کافر تھے۔

آیت 20،19 ❶ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے منافقین کے دوسرے گروہ کی بیان فرمائی ہے، یعنی وہ لوگ جو بظاہر مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ضعفِ ایمان کی وجہ سے ہمیشہ شک اور تذبذب میں مبتلا رہتے تھے، راحت و آرام کی صورت میں مطمئن نظر آتے، جب تکالیف کا سامنا ہوتا تو شک و شبہ میں پڑ جاتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴾ [الحج : ۱۱] ”اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے، پھر اگر اسے کوئی بھلائی پہنچ جائے تو اس کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش آ پہنچے تو اپنے منہ پر الٹا پھر جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا، یہی تو صریح خسارہ ہے۔“ ان آیات میں ان کے اسی تذبذب کو بیان فرمایا ہے کہ جب کبھی ان کے لیے روشنی ہوتی ہے چل پڑتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ (ابن کثیر)

❷ بارش سے مراد اسلام ہے، اندھیروں اور گرج سے مراد وہ تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں جو اسلام کی راہ میں پیش آتی ہیں، چمک سے مراد مسلمانوں کو حاصل ہونے والی کامیابیاں اور کڑکنے والی بجلیوں سے مراد جہاد کے احکام ہیں، جن میں منافقین کو موت

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۲۱﴾ جس نے تمھارے لیے زمین کو ایک بچھونا اور آسمان کو ایک چھت بنایا اور آسمان سے کچھ پانی اتارا، پھر اس کے ساتھ کئی طرح کے پھل تمھاری روزی کے لیے پیدا کیے، پس اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، جب کہ تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾

دکھائی دیتی ہے۔

③ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، دین اسلام میں آخر سب نعمت ہے، مگر اول کچھ محنت ہے، جیسے بارش کہ آخر اسی سے آبادی ہے اور اول کڑک ہے اور بجلی ہے۔ منافق لوگ اول سختی سے ڈر جاتے ہیں اور ان کو آفت سامنے نظر آتی ہے اور جیسے بادل کی چمک میں کچھ اجالا ہوتا ہے اور کبھی اندھیرا، اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار ہے کبھی انکار۔ (موضح)

④ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ ...... : اور اگر اللہ چاہتا تو پہلے گروہ کی طرح ان کی سماعت اور ان کی نگاہیں لے جاتا، مگر اللہ کا دستور ہے کہ جو شخص جس حد تک سننا اور دیکھنا چاہے وہ اسے سننے اور دیکھنے کا موقع دیتا ہے۔

⑤ "قَدِيْرٌ" مبالغے کا صیغہ ہے، اس لیے "پوری طرح قادر" ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیت 21 ① اس سے پہلی آیت تک تو تمہید تھی کہ قرآن جو ہدایت کا اصلی سرچشمہ ہے، اسے ماننے اور نہ ماننے کے اعتبار سے لوگ تین قسم کے ہیں، اب آگے براہِ راست خطاب کے ساتھ تمام لوگوں کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جا رہی ہے جو اس کتاب کی دعوت کا حقیقی مقصد ہے، جس کے لیے کتابیں اتاری گئیں اور انبیاء بھیجے گئے، وہ ہے دعوتِ توحید، یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کی عبادت اور دعا میں کسی کو شریک نہ کرنا۔

② طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "اُعْبُدُوْا" کا معنی بیان کیا ہے: "اَیْ وَحِّدُوْا رَبَّكُمْ" یعنی اپنے رب کو ایک مانو۔

③ توحید کے لیے پہلی دلیل یہ بیان فرمائی کہ میں تمھارا رب ہوں جو تمھاری پرورش کر رہا ہے اور تمھاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔ دوسری دلیل اس کی وہ نعمت ہے جو رب ہونے سے بھی پہلے کی ہے اور وہ ہے تمھیں پیدا کرنا۔ باقی تمام نعمتیں اس کے بعد ہیں، اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، قرآن مجید اس دلیل پر بہت زور دیتا ہے اور اسے بار بار دہراتا ہے۔ اس لیے کہ کفار بھی مانتے تھے کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، فرمایا: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ [الزخرف : ۸۷] "اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔"

④ "لَعَلَّ" یہاں "كَیْ" یعنی "تاکہ" کے معنی میں ہے۔

⑤ تَتَّقُوْنَ : بچ جاؤ یعنی اللہ کی گرفت اور جہنم سے بچ جاؤ۔

آیت 22 ① یعنی تمھیں اور تمھارے باپ دادا کو پیدا کرنے کے بعد تمھاری ضروریات کے لیے تمھیں کسی دوسری ہستی

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ١۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۲۳ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ
وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ١ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۝۲۴

اور اگر تم اس کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو اس کی مثل ایک سورت لے آؤ
اور اللہ کے سوا اپنے حمایتی بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور نہ کبھی کرو گے تو اس آگ سے بچ جاؤ
جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۲۴﴾

کے سپرد نہیں کر دیا، بلکہ ہر چیز کا بندوبست خود فرمایا، زمین کو تمھارے لیے بچھونا بنایا، آسمان کو چھت بنایا، پھر آسمان سے پانی اتار کر تمھاری روزی کے لیے مختلف انواع کے پھل پیدا کیے۔ جب تم یہ سب کچھ جانتے ہو تو لازم ہے کہ اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، یا پھر اس کی زمین سے نکل جاؤ اور اپنے کسی داتا یا دستگیر کی بنائی ہوئی زمین کے اوپر اور اس کے بنائے ہوئے آسمان کے نیچے رہو اور اسی کا پیدا کیا ہوا رزق کھاؤ۔

❷ "مَآءً" کا ترجمہ "کچھ پانی" تنوین کی وجہ سے اور "اَنْدَادًا" کا ترجمہ "کسی قسم کے شریک" جمع اور نکرہ کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے، یعنی نہ ذات میں شریک بناؤ، نہ صفات میں اور نہ افعال میں۔

آیت 23 ❶ سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ قرار دیا، اب فرمایا کہ (اس کتاب میں کوئی شک تو نہیں لیکن) اگر تم اس کے بارے میں کسی ادنیٰ سے شک میں بھی مبتلا ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ یہ چیلنج پہلے اس کتاب جیسی ایک کتاب لانے کا کیا گیا۔ [بنی إسرائیل : ۸۸] پھر اس جیسی دس سورتیں لانے کا۔ [ھود : ۱۳] پھر مکہ میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا۔ [یونس : ۳۸] اب مدینہ میں یہ چیلنج دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ مدنی ہے۔

❷ پچھلی دو آیات میں شرک کی تردید اور توحید کی دعوت ہے۔ ان آیات میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔

❸ عَبْدِنَا : اگرچہ تمام بندے اللہ تعالیٰ ہی کے بندے ہیں مگر "ہمارے بندے" سے مراد ہمارا خاص بندہ ہے، جیسے "بیت اللہ" اور "ناقۃ اللہ" اسے اضافت تشریفی کہتے ہیں۔

❹ ہر زمانے میں جو چیز کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس زمانے کے پیغمبر کو ایسا معجزہ دیا گیا جس کے سامنے انسانی کمال عاجز اور بے بس ہو، جیسے فرعون کے جادوگر اور عصائے موسیٰ، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے با کمال طبیب اور عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال سیکڑوں برس گزرنے کے باوجود نہ کوئی پیش کر سکا نہ کر سکے گا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۷ تا ۵۱)۔

آیت 24 ❶ عام آگ انسانی جسم اور پتھروں سے بجھ جاتی ہے یا مدہم ہو جاتی ہے، مگر جہنم کی آگ کی حرارت اس قدر

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان لوگوں کو خوش خبری دے دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے کہ بے شک ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، جب کبھی ان میں سے کوئی پھل انھیں کھانے کے لیے دیا جائے گا، کہیں گے یہ تو وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں دیا گیا تھا اور وہ انھیں ایک دوسرے سے ملتا جلتا دیا جائے گا، اور ان کے لیے ان میں نہایت پاک صاف بیویاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۵﴾

ہے کہ انسان اور پتھر اس کا ایندھن بن کر اسے مزید بھڑکائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔'' [بخاری، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲۶۵، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ] عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا: ''یہ پتھر گندھک کے ہوں گے۔'' (طبری) وہ بت بھی مراد ہیں جنھیں کفار پوجتے تھے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۹۸)۔

❷ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ : اس سے معلوم ہوا کہ جہنم اصل میں کافروں کے لیے بنائی گئی ہے، کوئی مومن اس میں جائے گا تو کفر کے کسی کام کے ارتکاب کی وجہ ہی سے جائے گا، اگرچہ ہمیشہ اس میں نہیں رہے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنم اس وقت بھی موجود ہے، یہی تمام سلف کا عقیدہ ہے، اس کا انکار صریح آیات و احادیث کا انکار ہے۔

آیت 25 ❶ کفار کو آگ سے ڈرانے کے بعد اب ایمان لانے پر جنت کی بشارت دی جا رہی ہے۔ قرآن مجید میں عموماً یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''﴿ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ [الزمر : ۲۳] میں صحیح ترین قول کے مطابق ''مَثَانِيَ'' سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ اس کا مقابل بھی مذکور ہو، مثلاً ایمان کے ساتھ کفر، جنت کے ساتھ جہنم کا ذکر ہو۔''

❷ ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اس کے مطابق عمل کا نام ہے، یہاں ایمان پر عمل صالح کے عطف کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، بلکہ ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ عموماً اس میں کوتاہی کی جاتی ہے، حالانکہ عمل سے خالی ایمان کافی نہیں۔ اگر عطف ہی کی وجہ سے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ سمجھا جائے تو سورۂ عصر کی آیت: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ میں مذکور چاروں چیزیں ایک دوسرے سے الگ ماننا پڑیں گی۔ تفصیل کے لیے سورۂ عصر کی تفسیر دیکھیں۔

❸ عمل صالح کی پہلی شرط یہ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ دیکھیے سورۂ کہف کی آخری آیت اور سورۂ بینہ کی آیت (۵)۔ دوسری یہ کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔ آپ کا فرمان ہے: ((مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

بے شک اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی بھی مثال بیان کرے، مچھر کی ہو پھر اس کی جو اس سے اوپر ہے، پس لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے سو جانتے ہیں کہ بے شک وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے سے کیا ارادہ کیا؟ وہ اس کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ اس کے ساتھ فاسقوں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا ﴿۲۶﴾

فَهُوَ رَدٌّ ﴾ ''جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہے۔'' [مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة...... : ۱۸/ ۱۷۱۸]

❹ انسان کی لذت و آسائش کی بنیادی چیزیں رہائش، کھانا پینا اور نکاح ہیں۔ ایمان اور عمل صالح والوں کی رہائش کے لیے ﴿ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾، کھانے پینے کے لیے ﴿ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ﴾ اور نکاح کے لیے ﴿ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ ہیں، پھر یہ نعمتیں حاصل ہونے کے ساتھ اگر ان کے زوال کا خوف ہو تو لذت مکدر ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس خوف کو یہ کہہ کر دور کر دیا: ﴿ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [اللباب] جنت کی نہروں کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ محمد (۱۵)۔

❺ مُطَهَّرَةٌ : باب تفعیل سے اسم مفعول ہے۔ ایک حرف کے اضافے کی وجہ سے ''نہایت پاک صاف'' ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی وہ ہر قسم کی ظاہری آلائشوں، مثلاً پیشاب، پاخانہ، تھوک، حیض وغیرہ سے اور باطنی آلائشوں، مثلاً جھوٹ، حسد، کینہ وغیرہ سے پاک ہوں گی۔

❻ مُتَشَابِهًا : یعنی دنیا کے پھلوں کے ہم صورت ہوں گے، یا آپس میں ہم شکل ہوں گے، مگر یہ مشابہت صرف نام یا شکل میں ہوگی، ورنہ جنت کی نعمتوں کو دنیا کی نعمتوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ دیکھیے سورۂ سجدہ (۱۷)۔

آیت 26 اس سے پہلے منافقین کی دو مثالیں بیان ہوئی ہیں، اس کے علاوہ قرآن مجید میں مکھی (حج: ۷۳) مکڑے (عنکبوت: ۴۱) کتے (اعراف: ۱۷۶) اور گدھے (جمعہ: ۵) کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ کفار اور منافقین جب قرآن کے چیلنج کا جواب نہ دے سکے تو اعتراض جڑ دیا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسی مثالوں کی کیا ضرورت تھی؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کو بطور مثال بیان کر سکتا ہے، یہ کوئی عیب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے حیا کرے، وہ مثال مچھر کی ہو یا پھر اس کی جو اس سے بھی بڑھ کر حقیر ہو، مثلاً مچھر کا پر یا ایک ذرہ۔ مچھر سے بڑھ کر ہونے سے مراد اس سے بڑی چیزیں مثلاً مکھی، مکڑا وغیرہ بھی ہو سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بڑی سے بڑی مخلوق اللہ کی قدرت پر اور غیر اللہ کی بے بسی پر دلالت کرتی ہے، اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی مخلوق بھی اللہ کی قدرت کا شاہکار ہے۔ پھر بات سمجھانے کے لیے اگر چھوٹی مخلوق کی مثال زیادہ موزوں ہو تو اس میں حیا کی کیا بات ہے؟ '' اَنَّهُ الْحَقُّ '' میں ''اَنَّهُ'' کی خبر ''الْحَقُّ'' معرفہ آنے کی وجہ سے ترجمہ ''وہی'' کیا گیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ
وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝٢٧ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا
فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝٢٨ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ
ع جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝٢٩

وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿٢٧﴾ تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمھیں زندگی بخشی، پھر وہ تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿٢٨﴾ وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا، پس انھیں درست کر کے سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿٢٩﴾

آیت 27 اللہ کی کتاب سے ہدایت پانے کے بجائے گمراہ ہونے والے فاسقوں کی تین صفات ذکر کی گئی ہیں، اللہ کے عہد کو توڑنا، رشتہ داری اور دوسرے باہمی تعلقات قطع کرنا اور زمین میں فساد کرنا، جیسا کہ مشرکین نے اس عہد کو توڑا جو ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ کے ساتھ ان سے لیا گیا تھا۔ [الأعراف : ١٧٢] یہود و نصاریٰ نے وہ عہد توڑا جو ان سے نبی ﷺ پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا، کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے رشتہ داری کو قطع کیا اور منافقین نے زمین میں فساد پھیلایا اور یہ تینوں صفات کفار کے تمام گروہوں میں پائی جاتی ہیں۔

آیت 28 " يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا " کے ساتھ توحید کی جو بات شروع ہوئی تھی وہی بات آگے بڑھائی جا رہی ہے کہ اللہ کے ساتھ تمھارے کفر پر تعجب ہے، جس نے تمھیں اس وقت زندگی بخشی جب تم بے جان تھے، یعنی موجود ہی نہ تھے، پھر وہ تمھیں موت دے گا۔ زندگی اور موت کا یہ سلسلہ جو تمھارے سامنے ہے یہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید کی بھی دلیل ہے اور تمھیں دوبارہ زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کرنے کی بھی۔

آیت 28 ① یہ انسان کے کفر پر تعجب کے لیے اللہ کے مزید احسانات کا ذکر ہے کہ زمین میں جو کچھ ہے سب اس اکیلے نے پیدا کیا اور تمھارے لیے پیدا کیا، پھر اس نے آسمانوں کو درست کر کے سات آسمان بنائے، ایسے محسن سے تم کس طرح کفر کرتے ہو؟ وہ تو ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے، تمھارا کفر بھی اس سے مخفی نہیں، اپنا انجام خود سوچ لو۔

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی، یہی بات سورۂ حم سجدہ کی آیات (٩ تا ١٢) سے ثابت ہوتی ہے، مگر سورۂ نازعات میں: ﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴾ بظاہر اس کے خلاف ہے، تطبیق کے لیے دیکھیے سورۂ نازعات (٣٠)۔

③ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، یہاں " اسْتَوٰٓى " کے ضمن میں ارادہ کرنے اور متوجہ ہونے کا معنی رکھا گیا ہے، کیونکہ اسے " اِلٰى " کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓىِٕكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور بہت سے خون بہائے گا اور ہم تیری تعریف کے ساتھ ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۳۰﴾ اور آدم کو سب کے سب نام سکھلا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا، پھر فرمایا مجھے ان کے نام بتاؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ انھوں نے کہا تو پاک ہے، ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ فرمایا اے آدم! انھیں ان کے نام بتا،

④ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین میں جو کچھ ہے مجموعی طور پر انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کی ہر چیز ہر انسان کے لیے حلال ہے، بلکہ اسے یہ فائدہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے تحت اٹھانا ہوگا۔

آیت 31 ① ان آیات سے معلوم ہوا کہ فرشتے ایک الگ مخلوق ہیں اور وہ انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی تعریف میں اللہ پر ایمان کے بعد فرشتوں پر ایمان کا ذکر فرمایا۔ [بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ ...... : ۵۰] نیک انسانوں یا نیکی کی قوتوں کو فرشتے قرار دینا درحقیقت ان کے وجود سے انکار ہے، جو ایمان کے منافی ہے۔

② خلیفہ وہ ہے جو کسی کی موت کے بعد یا اس کے غائب ہونے کی صورت میں اس کا جانشین بنے، یا تمام امور خود سرانجام نہ دے سکنے کی صورت میں بعض معاملات میں اس کا نائب ہو۔ یہاں خلیفہ سے اللہ کا خلیفہ مراد لینا درست نہیں، کیونکہ نہ اللہ تعالیٰ پر موت آئے گی، نہ وہ غائب ہے اور نہ وہ اپنے کاموں میں کسی کا محتاج ہے، بلکہ بقول ابن کثیر رحمہ اللہ " قَوْمًا يَخْلُفُ بَعْضُهُمْ بَعْضًا قَرْنًا بَعْدَ قَرْنٍ جِيْلًا بَعْدَ جِيْلٍ " یعنی خلیفہ سے ایسے لوگ مراد ہیں جو نسلاً بعد نسل ایک دوسرے کے جانشین بنیں گے۔ اسی طرح خلیفہ سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں بلکہ پوری نوع انسان ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ زمین میں فساد اور خون بہانا آدم علیہ السلام کا نہیں بلکہ اولاد آدم کا کام تھا۔ (ابن کثیر)

③ فرشتوں کو انسان کا زمین میں فساد کرنا کیسے معلوم ہوا؟ جواب یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے انھیں بتا دیا تھا۔ دلیل ان کا یہ کہنا ہے کہ "ہمیں کچھ علم نہیں مگر جو تو نے ہمیں سکھایا۔" فرشتوں کا سوال اعتراض کے لیے نہیں بلکہ انسان کی پیدائش کی حکمت معلوم کرنے کے لیے تھا۔

آیت 33،31 ① کسی ورکشاپ کی ذمہ داری سپرد کرتے وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اوزاروں کا علم کون رکھتا ہے،

أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّىٓ أَعْلَمُ غَيْبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٣٣﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَٱسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٣٤﴾

تو جب اس نے انھیں ان کے نام بتا دیے، فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں ہی آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں جانتا ہوں اور جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے تھے ﴿٣٣﴾ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں سے ہو گیا ﴿٣٤﴾

ظاہر ہے کہ انھیں وہی استعمال کر سکتا ہے جو کم از کم ان کا نام جانتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی اشیاء کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے اور فرشتوں پر واضح کیا کہ زمین کی خلافت کے لیے صرف تسبیح و تقدیس کافی نہیں بلکہ علم اسماء بھی ضروری ہے جو آدم کو عطا کیا گیا ہے، فرشتوں کو نہیں۔ رہی یہ بات کہ فرشتوں کو یہ علم کیوں نہیں دیا گیا اور انھیں زمین کی خلافت کیوں نہیں سونپی گئی تو اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، فرمایا: ﴿ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ ''بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

❷ اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کا علم جزوی ہے اور وہ مقرب ہونے کے باوجود علم غیب نہیں رکھتے۔ غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دیکھیے سورۂ نمل (۶۵) عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''جو شخص تمھیں کہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے تو بلاشبہ اس نے جھوٹ کہا، اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔'' [بخاري، التوحيد، باب : ﴿ عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحدا ...... ﴾ : ۷۳۸۰]

آیت 34 ❶ آدم علیہ السلام کی پہلی فضیلت علم ظاہر فرمائی، اب یہ دوسرا شرف ہے کہ فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ صرف آداب بجا لانا یا تابع ہونا نہیں تھا، بلکہ زمین پر پیشانی رکھنا تھا، کیونکہ سجدے کا حقیقی معنی یہی ہے۔

یہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت تو شرک ہے، جس کی اجازت کسی بھی امت میں نہیں تھی، پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کو شرک کا حکم کیسے دے سکتا تھا، بلکہ یہ تعظیم کا سجدہ تھا، جو پہلی امتوں میں جائز تھا، ہماری امت میں حرام ہے، جیسا کہ بعض پہلی امتوں میں بہن سے نکاح جائز تھا، اب حرام ہے۔

عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ معاذ رضی اللہ عنہ جب شام سے واپس آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معاذ! یہ کیا ہے؟'' کہا، میں شام گیا تو میں نے انھیں دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، میں نے دل میں چاہا کہ ہم آپ کے ساتھ اس طرح کریں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم یہ کام نہ کرو، کیونکہ اگر میں کسی کو حکم دینے والا ہوتا کہ وہ غیر اللہ کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔'' [ابن ماجه، النكاح، باب حق الزوج على المرأة : ۱۸۵۳] مگر افسوس کہ جاہل صوفی اور عوام جب پیروں کے پاس حاضری دیتے

وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے کہا اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور دونوں اس میں سے کھلا کھاؤ جہاں چاہو اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں سے ہو جاؤ گے ﴿۳۵﴾

ہیں تو انھیں سجدہ کرتے ہیں اور وہ بھی اس پر خاموش رہ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

③ ابلیس فرشتہ نہیں تھا بلکہ جنوں سے تھا۔ (دیکھیے کہف : ۵۰) یہاں فرشتوں کو سجدے کا حکم دینے کا یہ مطلب نہیں کہ ابلیس فرشتہ تھا، یا یہ کہ اسے حکم ہی نہ تھا، بلکہ یہاں بات مختصر بیان ہوئی ہے۔ سورۂ اعراف میں تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو خاص طور پر سجدے کا حکم دیا تھا، فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ﴾ [الأعراف : ۱۲] ''تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا، جب میں نے تجھے حکم دیا؟''

ابلیس کے انکار کا باعث اس کا کبر تھا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہوگا۔'' [مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانه : ۹۱]

آیت 35 ① اس آیت میں آدم علیہ السلام کی تیسری فضیلت کا بیان ہے، کہ فرشتوں سے سجدہ کروانے کے بعد انھیں جنت کی سکونت عطا فرمائی۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ حوا علیہا السلام اس وقت پیدا ہو چکی تھیں، ان کی پیدائش کے متعلق تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱) اور سورۂ اعراف (۱۸۹)۔

② یہ کون سا درخت تھا؟ اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں فرمایا، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، اگر اس کی ضرورت ہوتی یا اس سے کوئی فائدہ ہوتا تو ضرور بتا دیا جاتا۔ بعض مفسرین نے گندم یا انگور یا انجیر وغیرہ کا نام لیا ہے، مگر یہ سب اقوال بلا دلیل ہیں۔

③ ﴿ وَلَا تَقْرَبَا ﴾ ...... : اس درخت کے کھانے سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا۔ اس سے شریعت کا قاعدہ سد ذرائع ثابت ہوتا ہے، یعنی جو چیز حرام کا ذریعہ بنتی ہے اس سے بچنا بھی ضروری ہے، مثلاً زنا سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا، فرمایا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى ﴾ [بنی إسرائیل : ۳۲] ''اور زنا کے قریب مت جاؤ'' حرام سے بچنے کے لیے مشتبہات یعنی شبہے والی چیزوں سے بچنے کا حکم دیا۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: ''بے شک حلال بالکل ظاہر ہے اور بے شک حرام بالکل ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ (شبہے والی) چیزیں ہیں جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، تو جو شخص شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت کو پوری طرح بچا لے گا اور جو شبہات میں پڑ جائے گا، وہ حرام میں پڑ جائے گا، جیسے وہ چرواہا جو ممنوعہ چراگاہ کے گرد جانور چراتا ہے، قریب ہے کہ وہ اس کے اندر چرنے لگیں۔ یاد رکھو! ہر بادشاہ کی ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔'' [مسلم، المساقاة والمزارعة، باب أخذ الحلال و ترك الشبهات : ۱۵۹۹] اسی طرح

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

تو شیطان نے دونوں کو اس سے پھسلا دیا، پس انھیں اس سے نکال دیا جس میں وہ دونوں تھے اور ہم نے کہا اتر جاؤ، تمھارا بعض بعض کا دشمن ہے اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ﴿۳۶﴾ پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، تو اس نے اس کی توبہ قبول کر لی، یقیناً وہی ہے جو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۳۷﴾

اللہ تعالیٰ کو گالی سے بچانے کے لیے معبودانِ باطل کو گالی دینے سے منع فرمایا: ﴿ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ [الأنعام : ۱۰۸] ''اور انھیں گالی نہ دو جنھیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، پس وہ زیادتی کرتے ہوئے کچھ جانے بغیر اللہ کو گالی دیں گے۔''

آیت 36 ① شیطان کے اس پھسلانے کی تفصیل سورۂ اعراف (۲۰) میں ہے۔

② بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : یعنی آدم علیہ السلام اور ابلیس اور ان کی اولاد ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ [الکہف : ۵۰۔ یٰس : ۶۰] یہ مطلب بھی درست ہے کہ اولادِ آدم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ ہے۔ [المائدۃ : ۲۷] فرشتوں نے بھی ﴿ وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ﴾ میں اسی عداوت کا ذکر کیا تھا۔

③ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ : یہ الفاظ دلیل ہیں کہ آدم علیہ السلام جس جنت میں رکھے گئے تھے وہ آسمان پر تھی، زمین پر جنت سے نکلنے کے بعد آئے۔ ''اهْبِطُوْا'' سے بھی یہی بات نکلتی ہے۔ یہ جمعہ کا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے جمعہ کا دن ہے، اسی میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے، اسی میں جنت میں داخل کیے گئے اور اسی میں اس سے نکالے گئے۔'' [مسلم، الجمعة، باب فضل یوم الجمعة : ۸۵۴، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ]

④ اِلٰى حِيْنٍ : یعنی موت تک کے لیے، کیونکہ انسان کے لیے مرنے کے بعد زمین سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ ''ایک وقت تک'' سے معلوم ہوا کہ زمین پر رہائش عارضی ہے، دائمی نہیں۔

آیت 37 ① کلمات یہ تھے: ﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [الأعراف : ۲۳] ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔'' مستدرک حاکم (۲/۶۷۲، ح : ۴۲۲۸) میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرش پر ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا دیکھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا مانگی تو ان کی توبہ قبول ہوئی، مگر ذہبی نے اسے موضوع، یعنی من گھڑت کہا ہے۔ اس روایت کے راوی عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم کے متعلق خود امام حاکم نے '' اَلْمَدْخَلُ اِلَى الصَّحِيْحِ ''

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع۴

ہم نے کہا سب کے سب اس سے اتر جاؤ، پھر اگر کبھی تمھارے پاس میری طرف سے واقعی کوئی ہدایت آ جائے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، سوان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۳۸﴾ اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۳۹﴾

میں فرمایا کہ وہ اپنے باپ سے موضوع روایات بیان کرتا ہے، جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی گھڑی ہوئی ہیں، یہ روایت بھی اس نے اپنے باپ سے بیان کی ہے۔ قرآن وحدیث میں بہت سی دعائیں آئی ہیں، سب میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگنا سکھایا گیا ہے، کسی نبی یا ولی کا واسطہ ووسیلہ نہیں بتایا گیا۔ مزید دیکھیے سورۂ مائدہ (۳۵) اور بنی اسرائیل (۵۷)۔

② **فَتَابَ عَلَيْهِ** : خالص توبہ کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں، اپنے گناہ کے نقصان کا احساس، اس پر ندامت اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم۔ "**فَتَابَ عَلَيْهِ**" سے معلوم ہوا کہ گناہ کے اثرات لازمی اور طبعی نہیں کہ لامحالہ ان کے نتیجے میں سزا مل کر ہی رہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، چاہے تو گناہ کی سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے، انسان توبہ کر لے تو گناہ کا اثر ختم کر دیا جاتا ہے۔

③ **التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** : اس سے بڑھ کر کیا مہربانی ہوگی کہ خود دعا سکھائی اور پھر قبول بھی فرمائی۔

آیت 38، 39 ① **قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا** : توبہ کی قبولیت کے بعد پھر پہلا حکم دہرایا، مقصد یہ کہ گناہ کی معافی کے باوجود اب تمھیں اور تمھاری اولاد سب کو زمین ہی پر رہنا ہوگا، جس کی خلافت کے لیے تمھیں پیدا کیا گیا ہے۔ جنت میں واپسی کے لیے تمھیں اس ہدایت اور راستے پر چلنا ہوگا جو میری طرف سے تمھارے پاس آئے گی۔

② **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى** : مخاطب آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی ہیں، مگر مراد ان کی اولاد ہے، یعنی تمھارے پاس میری طرف سے انبیاء و رسل بذریعہ وحی ہدایت لے کر آتے رہیں گے۔ ہدایت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، قرآن مجید اور حدیث نبوی آخری وحی الٰہی ہے، اس دوران میں کتنے نبی اور رسول آئے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء کی آیت (۱۶۴) کا حاشیہ۔ آج ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ دو ہی چیزیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم انھیں مضبوطی سے پکڑے رکھو گے، کبھی گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔'' [الموطأ، القدر، باب النهي عن القول بالقدر : ۳۔ مستدرك حاكم : ۱۷۱/۱، ح : ۳۱۸۔ الصحيحة : ۱۷۶۱]

③ **فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ** : پہلے "**فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى**" میں اپنی طرف سے ہدایت آنے کی بات کی پھر "**فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ**" میں "**هُدَايَ**" کو یائے متکلم کی طرف مضاف کیا، یعنی ''پھر جو میری ہدایت کی پیروی کرے۔'' معلوم ہوا ہدایت صرف وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے، لوگوں کی رائے کبھی ہدایت قرار نہیں پا سکتی، خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم ہوں۔

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمھارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھی سے پس ڈرو ﴿۴۰﴾

④ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ ...... : خوف آنے والی کسی چیز سے ڈر کو اور حزن ہاتھ سے نکل جانے والی کسی چیز پر غم کو کہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کی پیروی کریں گے وہ آخرت میں نہ دنیا کی زندگی پر افسوس کریں گے، جیسا کہ کفار کو افسوس ہوگا۔[الأنعام : ۲۷] اور نہ قیامت کے دن کی بڑی گھبراہٹ سے انھیں کوئی غم ہوگا۔[الأنبیاء : ۱۰۳] فرمایا: ﴿ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴾[النمل : ۸۹] ''اور وہ اس دن بڑی گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔''

آیت 40 ① اس سے پہلے ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ'' کے ساتھ تمام لوگوں کو دعوت تھی، اب بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب ہے، کیونکہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کا زیادہ حق ہے کہ وہ نبی ﷺ پر ایمان لائیں۔ یہ خطاب کبھی انعامات یاد دلا کر ہے جو ان پر کیے گئے، کبھی ان کی بداعمالیوں پر ڈانٹ کے ساتھ ہے اور کبھی ان سزاؤں کے ذکر کے ساتھ ہے جو ان کی نافرمانیوں پر انھیں دی گئیں۔ یہاں سے لے کر آیت ایک سو سینتالیس (۱۴۷) تک ان پر دس انعامات، ان کی دس بداعمالیوں اور انھیں دی جانے والی دس سزاؤں کا ذکر ہے۔ (التسہیل)

② اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام یا لقب ہے، جس کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔ اس لیے ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل میں پہلے پیغمبر یوسف علیہ السلام اور آخری پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ (قرطبی)

③ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل کو یہ چیزیں یاد دلائی گئیں، حالانکہ یہ سب کچھ پہلے بنی اسرائیل پر گزرا تھا، کیونکہ ان کے بزرگوں پر انعام ان پر بھی انعام تھا اور وہ اب بھی اپنے بزرگوں کی بدعادتوں میں ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ گزشتہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ آپ کے زمانے میں موجود بنی اسرائیل کے اعمال بد کا بھی ذکر فرمایا، مثلاً رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود کفر، کتاب اللہ میں تحریف، جبریل علیہ السلام سے عداوت، جادو کرنا، ایک دوسرے کو قتل کرنا وغیرہ۔ بنی اسرائیل کے احوال اتنی تفصیل سے ذکر فرمانے سے یہ بھی مقصود ہے کہ امت محمد (ﷺ) ان بداعمالیوں سے بچے اور ان کے نتائج سے ڈرتی رہے۔

④ نِعْمَتِیَ : اگرچہ یہ لفظ واحد ہے، مگر جنس مراد ہے، جس میں تمام نعمتیں شامل ہیں۔

⑤ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ ...... : یہاں اس عہد کی تفصیل بیان نہیں فرمائی، سورۂ مائدہ (۱۲) میں اس عہد کی تفصیل موجود ہے۔ اس کے مطابق ان کا اللہ تعالیٰ سے عہد یہ تھا کہ تم نماز قائم کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میرے رسولوں پر (جن میں محمد ﷺ بھی شامل ہیں) ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے اور اللہ کا ان سے عہد یہ تھا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں گا اور تم سے تمھارے گناہ دور کروں گا اور تمھیں جنتوں میں داخل کروں گا۔

وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ١۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا١ٞ وَّ اِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۝۴۱ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۴۲

اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمھارے پاس ہے اور تم سب سے پہلے اس سے کفر کرنے والے نہ بنو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت مت لو اور صرف مجھی سے پس ڈرو ﴿۴۱﴾ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، جب کہ تم جانتے ہو ﴿۴۲﴾

⑥ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ : ''اِيَّايَ'' کا معنی ''خاص مجھ سے'' ہے۔ '' فَارْهَبُوْنِ''اصل میں '' فَارْهَبُوْنِيْ '' تھا، یاء حذف ہوگئی، اس کا معنی بھی مجھ سے ڈرو ہے۔ ''خاص مجھ سے'' کے بعد دوبارہ ''مجھ سے ڈرو'' کی وجہ سے ''خاص مجھی سے ڈرو'' ترجمہ کیا گیا ہے، ورنہ خاص کے بعد ''مجھ'' کا لفظ کافی تھا، ''مجھی'' کی ضرورت نہ تھی۔

آیت 42،41 ① سب سے پہلے کافر بننے سے مراد یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں، تمھیں تو سب سے پہلے ایمان لانا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اگر تم ان کے ساتھ کفر کرتے ہو تو تم پہلے کافر ہوئے جو جانتے بوجھتے ہوئے کفر کر رہے ہو، اپنے آپ پر یہ ظلم نہ کرو۔ اس سے پہلے مشرکین مکہ نے جو کفر کیا تھا وہ جہالت کی وجہ سے تھا۔ اس لیے اشکال لازم نہیں آتا کہ کفارِ مکہ نے ان سے پہلے کفر کیا تھا۔ (بیضاوی)

② وَلَا تَشْتَرُوْا...... : اس سے مراد دنیاوی مفاد کے لیے آیاتِ الٰہی کو چھپانا ہے۔ یہ مسلّم قاعدہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے کم قیمت لینے کا ذکر جہاں آیا ہے اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ اس سے کیا مراد ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا١ۙ اُولٰٓىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ١ۖۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ١ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ [البقرة : ۱۷۴، ۱۷۵] ''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب میں سے اتارا ہے اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھا رہے اور نہ اللہ ان سے قیامت کے دن بات کرے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے بدلے خریدا، سو وہ آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں؟'' اور سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ١ٞ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا١ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴾ [آل عمران : ۱۸۷] ''اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی کہ تم ہر صورت اسے لوگوں کے لیے صاف صاف بیان کرو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے تو انھوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی۔ سو برا ہے جو وہ خرید رہے ہیں۔'' دنیا کی خاطر احکامِ الٰہی کو بدلنا بھی اس میں شامل ہے۔ وہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو رشوت لے کر غلط فتویٰ دیتے ہیں۔ اس آیت کا تعلیم کتاب کی اجرت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ اجرت کسی غلط کام پر نہیں،

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو﴿۴۳﴾ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟﴿۴۴﴾

بلکہ ایک نہایت پاکیزہ محنت پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ » ”سب سے زیادہ حق چیز جس پر تم اجرت لو اللہ کی کتاب ہے۔“ [بخاری، کتاب الطب، باب الشروط فی الرقیة ...... : ۵۷۳۷] بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف دم کی اجرت ہے مگر رسول اللہ ﷺ نے چند سورتوں کی تعلیم کے بدلے ایک صحابی سے ایک خاتون کا نکاح کر دیا تھا۔ [بخاری، النکاح، باب التزویج علی القرآن ...... : ۵۱۴۹، عن سہل بن سعد رضی اللہ عنہ] وہاں دم کی تاویل کیسے ہو گی؟ جن حضرات نے قرآن و حدیث کی تعلیم پر اجرت منع کی تھی ان کے نام لیواؤں نے یہ کہہ کر تنخواہ لینا شروع کر دی ہے کہ آج کل قرآن و حدیث کی تعلیم پر اجرت لینا جائز ہے، ورنہ مدارس اور مساجد ویران ہو جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل ہی نہیں ہمیشہ سے یہ اجرت حلال تھی، بلکہ بہترین محنت اور بہترین اجرت تھی اور ہے، اس کا قرآن بیچنے سے کوئی تعلق نہیں۔

تھوڑی قیمت کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لے لو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کے بدلے میں پوری دنیا بھی ملے تو متاعِ قلیل ہے، فرمایا: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ [النساء : ۷۷] ”کہہ دو، دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔“

آیت 43 اپنے عہد کے مطابق نبی کریم ﷺ پر ایمان لا کر یہ تینوں کام اہتمام سے کرو۔ اس آیت سے باجماعت نماز کی تاکید ظاہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے ارادہ کیا کہ ایندھن کا حکم دوں، وہ اکٹھا کیا جائے، پھر نماز کا حکم دوں، اس کے لیے اذان کہی جائے، پھر کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو امامت کروائے، پھر ان آدمیوں کی طرف جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے اور ان سمیت ان کے گھروں کو جلا دوں۔“ [بخاری، الأذان، باب وجوب صلٰوۃ الجماعة : ۶۴۴۔ مسلم : ۶۵۱، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اذان سنے اور سن کر (نماز کے لیے مسجد میں) نہ آئے تو اس کی نماز نہیں مگر کسی عذر سے۔“ [ابن ماجہ، المساجد والجماعات، باب التغليظ فی التخلف : ۷۹۳، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ صحیح ابن حبان : ۲۰۶۴۔ مستدرك : ۳۷۳/۱، ح : ۸۹۴، ۸۹۵، و صححه الألبانی]

آیت 44 یعنی لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہو اور خود بھول جاتے ہو کہ اس میں نبی ﷺ پر ایمان لانے کا حکم بھی موجود ہے۔ [ابن أبی حاتم عن ابن عباس : ۱۲۲/۱، ح : ۴۷۴، ۴۷۵] قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: ”بنی اسرائیل لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کا حکم دیتے اور خود عمل نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عار دلائی۔“ (عبد الرزاق)

اب مسلمانوں کا حال بھی بنی اسرائیل جیسا ہو گیا، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو شخص خود عمل نہ

وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو اور بلاشبہ وہ یقیناً بہت بڑی ہے مگر ان عاجزی کرنے والوں پر ﴿۴۵﴾ جو یقین رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ بے شک وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۴۶﴾ اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور یہ کہ بلاشبہ میں نے ہی تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ﴿۴۷﴾

کرے وہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم نہ دے، کیونکہ یہود کو اس بات پر عار دلائی ہے کہ وہ عمل نہیں کرتے، اس پر نہیں کہ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ جو شخص دعوت دے کر خود عمل نہ کرے اسے دوسروں سے زیادہ سزا ملے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا، اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اس کی انتڑیاں آگ میں نکل کر ڈھیر ہو جائیں گی، وہ ان کے گرد ایسے گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد گھومتا ہے۔ آگ والے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے، اے فلاں! تیرا کیا معاملہ ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور ہمیں برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا، میں تمھیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود وہ کام نہیں کرتا تھا اور تمھیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔'' [بخاری، بدء الخلق، باب صفۃ النار و أنہا مخلوقۃ : ۳۲۶۷، عن أسامۃ رضی اللہ عنہ]

آیت 45 یعنی کسی بھی مصیبت کے برداشت کرنے میں ان دو چیزوں کا سہارا لو۔ نبی ﷺ کو جب اچانک کوئی حادثہ پیش آتا تو آپ ﷺ نماز پڑھتے۔ [أبو داوٗد، التطوع، باب وقت قیام النبی ﷺ من اللیل : ۱۳۱۹، عن حذیفۃ رضی اللہ عنہ و حسنہ الألبانی] اہل علم نے فرمایا: ''صبر تین قسم پر ہے، مصیبت پر صبر، اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر اور نافرمانی سے بچنے پر صبر۔''

آیت 46 نماز کی پابندی ویسے تو ایک نہایت مشکل ذمہ داری ہے، مگر جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کا یقین ہے ان پر یہ بھاری نہیں ہے۔ یہاں ظن سے مراد یقین ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾ [البقرۃ : ۴] ''اور آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں۔'' [أضواء البیان]

آیت 47 ① اوپر آیت (۴۰) میں اختصار کے ساتھ بنی اسرائیل کو اپنے احسانات یاد دلائے تھے، اب تفصیل کے ساتھ ان کا بیان شروع کرنے کے لیے دوبارہ خطاب کیا ہے اور وعظ کا یہ انداز نہایت بلیغ اور مؤثر ہوتا ہے۔ (المنار) نیز ان کو توجہ دلائی ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی مخالفت اور دوسری بے ہودگیوں سے باز آ جاؤ۔

② جہانوں پر فضیلت بخشی، اس سے مراد رسول اللہ ﷺ سے پہلے زمانوں کے لوگ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کے تشریف لانے پر یہ فضیلت ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ﴾ [آل عمران : ۱۱۰] فرما کر اس امت کو عطا کر دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ)) ''سب سے بہتر میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

اور اس دن سے بچو جب نہ کوئی جان کسی جان کے کچھ کام آئے گی اور نہ اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۴۸﴾ اور جب ہم نے تمھیں فرعون کی قوم سے نجات دی، جو تمھیں برا عذاب دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو بری طرح ذبح کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ﴿۴۹﴾

ملیں گے، پھر وہ جوان سے ملیں گے۔'' [بخاری، الشہادات، باب لا يشهد على شهادة جور إذا أشهد : ۲۶۵۲، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ]

آیت 48 ❶ نعمت یاد دلانے کے بعد انھیں قیامت کے عذاب سے ڈرایا۔ بنی اسرائیل میں فساد کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے انبیاء اور علماء پر ناز کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کتنے ہی گناہ کر لیں ہمارے بزرگ اور آباء واجداد ہمیں بخشوا لیں گے، ان کے اسی باطل گمان کی تردید کی گئی ہے۔

❷ کسی گرفتار شخص کو چھڑانے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں، کسی کی سفارش کام آ جائے، یا فدیہ دے کر چھڑا لیا جائے، یا زبردستی حملہ کر کے چھڑا لیا جائے، قیامت کے دن ان میں سے کوئی بھی ممکن نہیں۔

❸ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کوئی سفارش قبول نہیں ہو گی، مگر دوسرے مقامات پر وضاحت فرمائی ہے کہ جس شفاعت کی نفی کی گئی ہے وہ کفار کے لیے شفاعت ہے: ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴾ [المدثر : ۴۸] ''پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی۔'' اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر بھی شفاعت ممکن نہیں ہوگی، فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [البقرۃ : ۲۵۵] ''کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔'' ہاں! جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اس کے لیے سفارش ہو گی اور اسے نفع بھی دے گی۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۰۹) اور قیامت کے دن اہلِ ایمان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی احادیث متواتر ہیں۔

آیت 49 ❶ یہاں سے بنی اسرائیل پر کیے جانے والے انعامات اور انھیں دی جانے والی فضیلت کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔

❷ طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے باہمی مشورہ کیا کہ بنی اسرائیل کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد میں انبیاء اور بادشاہ پیدا فرمائے گا (سو ان کا بندوبست ہونا چاہیے)، تو انھوں نے مشورے سے متفقہ فیصلہ یہ کیا کہ ایسے آدمی مقرر کیے جائیں جن کے پاس چھریاں ہوں، وہ بنی اسرائیل میں چکر لگاتے رہیں، جہاں کوئی نومولود لڑکا ملے اسے ذبح کر دیں، انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جب دیکھا کہ بنی اسرائیل کے

وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰ وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱

اور جب ہم نے تمھاری وجہ سے سمندر کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمھیں نجات دی اور ہم نے فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے ۝۵۰ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کی میعاد مقرر کی، پھر اس کے بعد تم نے بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ۝۵۱

بڑی عمر کے لوگ تو طبعی موت سے مر رہے ہیں اور بچے ذبح ہو رہے ہیں، تو انھوں نے کہا اس طرح تو تم بنی اسرائیل کو فنا کر دو گے، پھر جو خدمت اور مشقت تمھاری جگہ وہ کرتے ہیں وہ تمھیں خود کرنا پڑے گی۔ اس لیے ایک سال ان کے بچے ذبح کرو اور ایک سال انھیں رہنے دو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہارون علیہ السلام کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئیں جس میں لڑکے ذبح نہیں کیے جاتے تھے، اس لیے انھوں نے انھیں بلا خوف جنم دیا اور آئندہ سال ہوا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ امید سے ہوئیں۔ (طبری)

ابن عباس رضی اللہ عنہما تک اس کی سند ٹھیک ہے۔ عام طور پر یہاں فرعون کے خواب کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اس نے دیکھا کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص اس کی سلطنت ختم کرنے کا باعث ہوگا، اس لیے اس نے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، مگر اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کی کثرتِ تعداد کی صورت میں ان کے غلبے سے خائف ہو کر یہ ظلم اختیار کیا تھا۔ آج کل بھی دنیا بھر کے کفار مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے سخت خائف ہیں اور لالچ اور دھمکی، ہر طریقے سے ان کی آبادی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

❸ یہ واقعہ عاشورا (دس محرم) کے دن پیش آیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں، آپ نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' انھوں نے کہا، یہ ایک عظیم دن ہے، اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس دن کا روزہ رکھا۔ آپ نے فرمایا: ''میں تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھتا ہوں۔'' چنانچہ آپ نے اس دن کا روزہ رکھا اور اس کے روزے کا حکم دیا۔ [بخاری، الصوم، باب صوم یوم عاشوراء: ۲۰۰۴] پھر رمضان کے روزے فرض ہونے پر عاشورا کا روزہ نفل قرار دے دیا گیا۔ وفات سے پہلے آپ نے فرمایا: ''آئندہ سال میں زندہ رہا تو نو (محرم) کا روزہ رکھوں گا۔'' مگر آپ اس سے پہلے فوت ہو گئے۔ [مسلم، الصیام، باب أی یوم یصام فی عاشوراء: ۱۱۳۴]

❹ ''يُذَبِّحُوْنَ'' باب تفعیل کی وجہ سے ''بری طرح ذبح کرتے تھے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

❺ '' بَلَآءٌ '' امتحان اور آزمائش، خواہ مصیبت کے ساتھ ہو یا انعام کے ساتھ۔ ''وَ فِيْ ذٰلِكُمْ'' میں یہ اشارہ ذبح کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور نجات کی طرف بھی۔ ذبح کیا جانا مصیبت تھی اور نجات انعام۔

آیت 50 اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ یونس (۹۰) اور سورۂ شعراء (۵۲ تا ۶۷)۔

آیت 51 فرعون سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل صحرائے سینا میں پہنچے تو ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، اس

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

پھر ہم نے اس کے بعد تمھیں معاف کر دیا، تاکہ تم شکر کرو ﴿۵۲﴾ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور (حق و باطل میں) فرق کرنے والی چیز عطا کی، تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۵۳﴾ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! بے شک تم نے اپنے بچھڑا بنانے کے ساتھ اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، پس تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو، پس اپنے آپ کو قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے، تو اس نے تمھاری توبہ قبول کر لی، بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۴﴾

وقت تک وہ موسیٰ علیہ السلام کی اس وحی پر عمل کرتے آ رہے تھے جو تورات سے پہلے موسیٰ علیہ السلام پر اتری تھی۔ گویا حدیث پر عمل تھا، اب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن رات کے لیے طور پر بلایا، تاکہ انھیں تورات عطا فرمائی جائے، لیکن ان کے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی، اسی بنا پر یہاں ان کو ظالم قرار دیا گیا ہے کہ وہ صریح طور پر شرک کے مرتکب ہوئے تھے اور شرک سے بڑھ کر اور کون سا ظلم ہو سکتا ہے۔ بچھڑے کے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۷ تا ۹۷)۔

آیت 52 تا 53 "الْكِتٰبَ" سے مراد بالاتفاق تورات ہے اور "الْفُرْقَانَ" (حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز) سے مراد معجزے بھی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کو عطا کردہ قوتِ فیصلہ بھی جو حق و باطل میں فرق کرتی تھی، اگر "واؤ" کو تفسیری مانیں تو خود تورات بھی حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی۔

آیت 54 بنی اسرائیل میں جس طرح شادی شدہ زانی کی سزا رجم تھی اسی طرح شرک کے ارتکاب پر بھی انھیں قتل کی سزا سنائی گئی اور اس پر عمل بھی ہوا۔ ہماری امت میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ» "جو شخص مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو۔" [أبو داوٗد، الحدود، باب الحكم فيمن ارتد: ۴۳۵۱، و صححه الألباني] مگر اتنی تخفیف کر دی گئی کہ مرتد توبہ کر لے تو اسے معاف کر دیا جائے گا، البتہ رجم کی حد توبہ کے باوجود جاری کی جائے گی۔

طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنی قوم کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو قتل کرو، تو وہ لوگ جو بچھڑے کے مجاور بنے تھے گوٹھ مار کر بیٹھ گئے اور جو لوگ مجاور نہیں بنے تھے وہ اٹھے اور انھوں نے ہاتھوں میں خنجر لیے، ان پر ایک سخت تاریکی چھا گئی اور وہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے، پھر اندھیرا دور ہو گیا، روشنی ہوئی تو ستر ہزار قتل ہو چکے

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۵ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۶ وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز تیرا یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں، تو تمھیں کڑک نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے ۝۵۵ پھر ہم نے تمھیں تمھارے مرنے کے بعد زندہ کیا، تاکہ تم شکر کرو ۝۵۶ اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اتارا، کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کیا کرتے تھے ۝۵۷

تھے۔ جو قتل ہو گیا اس کی بھی توبہ قبول ہو گئی اور جو بچ گیا اس کی بھی۔ صاحب "التفسیر الصحیح" فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما تک اس روایت کی سند صحیح ہے۔ اوپر آیت (۵۲) میں جس معافی کا ذکر ہے وہ اس قتل کے بعد کی ہے۔

آیت 55 تا 56 اکثر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ بات کہنے والے وہ ستر آدمی تھے جن کا سورۂ اعراف (۱۵۵) میں ذکر ہے، جنھیں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت کے لیے چنا تھا، جب موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم تمھارے کہنے پر ہرگز یقین نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ تم سے ہم کلام ہوئے ہیں، جب تک ہم خود اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں، اس پر وہ رجفہ (زلزلہ) اور صاعقہ (بجلی کی کڑک) سے بے ہوش ہو کر مر گئے، پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے۔ یہاں موت سے بے ہوشی مراد لینا درست نہیں، کیونکہ یہاں واضح طور پر ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ آیا ہے اور سورۂ اعراف (۱۵۵) میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں: ﴿ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ﴾ (اگر تو چاہتا تو انھیں اس سے پہلے ہلاک کر دیتا اور مجھے بھی) آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا مطالبہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۵۳) اور فرقان (۲۱)۔

آیت 57 صحرائے سینا میں ان کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ تھا اور صحرا کی دھوپ انھیں جلائے دیتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص قسم کے بادل کا سایہ کر دیا اور کھانے کے لیے من و سلویٰ کا انتظام فرما دیا۔ "الْمَنَّ" کی تفسیر میں سب سے صحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ» [بخاری، الطب، باب المن شفاء للعین: ۵۷۰۸۔ مسلم: ۲۰۴۹، عن سعید بن زید رضی اللہ عنہ] "کھنبی "مَنّ" میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ "مَنّ" متعدد چیزیں تھیں جو صحرا میں خود بخود پیدا ہوتی تھیں، ان میں سے ایک

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ
الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

اور جب ہم نے کہا اس بستی میں داخل ہو جاؤ، پس اس میں سے کھلا کھاؤ جہاں چاہو اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو بخش دے، تو ہم تمھیں تمھاری خطائیں بخش دیں گے اور ہم نیکی کرنے والوں کو جلد ہی زیادہ دیں گے ﴿۵۸﴾ پھر ان لوگوں نے جنھوں نے ظلم کیا، بات کو اس کے خلاف بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی، تو ہم نے ان لوگوں پر جنھوں نے ظلم کیا تھا، آسمان سے ایک عذاب نازل کیا، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

کھنبی بھی تھی۔ اسی طرح وہ میٹھی گوند بھی ''مَنّ'' کی ایک قسم تھی جو ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ سے ''مَنّ'' کی تفسیر میں آئی ہے۔ ''السَّلْوٰی'' اسم جنس ہے، اس کا واحد ''سَلْوَاۃٌ'' آتا ہے، بٹیر یا بٹیر سے ملتا جلتا پرندہ ہے۔ صحرا میں اللہ کے حکم سے بے شمار پرندے آجاتے اور وہ انھیں پکڑ کر کھا لیتے تھے۔

آیت 58 ❶ اس شہر سے مراد کون سا شہر ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے اریحا شہر مراد ہے، مگر یہ بعید ہے، کیونکہ اس وقت بنی اسرائیل بیت المقدس کی طرف جا رہے تھے اور یہ اس راستے پر نہیں ہے اور بعض نے فرعون والا مصر مراد لیا ہے، یہ قول اس سے بھی زیادہ بعید ہے۔ زیادہ صحیح قول جسے اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ اس سے بیت المقدس کا شہر ہی مراد ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ (۲۱) میں ہے: ﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ ''اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے۔'' (ابن کثیر)

یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بیت المقدس تو موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں فتح ہی نہیں ہو سکا، حالانکہ ''فَبَدَّلَ'' کی فاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے بعد وہ فوراً شہر میں چلے گئے۔ رازی نے اس اشکال کا حل پیش کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کی زبانی دیا گیا ہو، بلکہ عین ممکن ہے کہ یوشع بن نون علیہ السلام کے عہد نبوت میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو انھیں حکم دیا گیا ہو کہ اس فتح کی شکر گزاری میں اللہ تعالیٰ کے عاجز بندوں کی طرح سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہوئے شہر میں داخل ہوں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یہ حکم ویسا ہی تھا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ نصر میں فتح کے موقع پر تسبیح و استغفار کا حکم دیا گیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں داخل ہونے کے بعد نمازِ فتح (آٹھ رکعات) ادا کی ہے۔

❷ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ: یعنی گناہوں کی بخشش کے علاوہ مزید درجات حاصل ہوں گے۔ احسان کا معنی خالص اللہ کے لیے عمل کرنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کی حقیقت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ)) ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، سو اگر تم اسے نہیں دیکھتے ہو تو یقیناً وہ تمھیں دیکھتا ہے۔'' [بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبي ﷺ ...... : ۵۰، عن عمر رضی اللہ عنہ]

آیت 59 مگر ان ظالموں نے اللہ کے اس حکم کا مذاق اڑایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنی اسرائیل سے کہا گیا: ﴿ وَادْخُلُوا

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنی لاٹھی اس پتھر پر مار، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بلاشبہ سب لوگوں نے اپنی پینے کی جگہ معلوم کر لی، کھاؤ اور پیو اللہ کے دیے ہوئے میں سے اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ﴿۶۰﴾

﴿ اَلْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ ﴾ ’’اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور کہو بخش دے۔‘‘ تو انھوں نے اسے بدل دیا اور اپنے سرینوں پر گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انھوں نے کہا: « حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ » ’’دانہ بالی میں۔‘‘ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، بابٌ : ۳۴۰۳۔ مسلم : ۳۰۱۵] بتائیے کہ اس سے بڑھ کر عناد اور حکم الٰہی کی مخالفت اور کیا ہو سکتی تھی۔ اس عظیم نافرمانی کو قرآن نے ’’فسق‘‘ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی حدود اللہ سے کلیتاً نکل جانے کے ہیں، اس بنا پر انھیں ظالم قرار دیا اور ان کے اس ظلم کی سزا میں ان پر طاعون کا عذاب نازل فرمایا۔ ”رِجْزًا“ کے معنی گو مطلق عذاب کے ہیں، مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد طاعون ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلطَّاعُوْنُ رِجْسٌ اُرْسِلَ عَلٰى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ اَوْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ » [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب : ۳۴۷۳، عن أسامة بن زید رضی اللہ عنہما] ’’طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر یا ان لوگوں پر بھیجا گیا جو تم سے پہلے تھے۔‘‘ مسلم میں ”رِجْسٌ“ کی جگہ ”رِجْزٌ“ ہے۔ [مسلم، السلام، باب الطاعون والطیرۃ ...... : ۲۲۱۸] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ قصہ سورۂ اعراف میں بھی مذکور ہے، مگر وہ سورت چونکہ مکی ہے، اس لیے ضمیر غائب سے اس کو ذکر کیا ہے اور یہ سورت مدنی ہے اور مدینہ میں یہود سامنے تھے، اس لیے ضمیر مخاطب لائی گئی ہے۔ الغرض ان دونوں قصوں (بقرہ اور اعراف) کے درمیان سیاق کے اعتبار سے دس وجوہ سے فرق پایا گیا ہے، جن میں سے بعض کا تعلق الفاظ سے ہے اور بعض کا معنی سے۔ امام رازی اور امام زمخشری رحمہما اللہ نے وہ دس فرق خوب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

آیت 60 ”اَلْحَجَرَ“ کا ترجمہ ’’اس پتھر پر‘‘ اس لیے کیا ہے کہ ’’الف لام‘‘ عہد کا ہے، ’’الف لام‘‘ جنس کا مانیں تو کوئی بھی پتھر مراد ہو سکتا ہے۔ تفہیم القرآن میں ہے: ’’وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے، سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ بارہ چشموں میں یہ مصلحت تھی کہ بنی اسرائیلی قبیلے بھی بارہ ہی تھے، اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے کے لیے ایک چشمہ نکال دیا، تاکہ ان کے درمیان پانی پر جھگڑا نہ ہو۔‘‘ مگر ہزاروں سال کے بعد یہ بات یقین کے ساتھ کس طرح کہی جا سکتی ہے کہ یہ وہی چٹان ہے اور بعد میں نہیں بنی، جب کہ اس کی کوئی سند بھی نہیں۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ کریں گے، سو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے کچھ ایسی چیزیں نکالے جو زمین اپنی ترکاری اور اپنی ککڑی اور اپنی گندم اور اپنے مسور اور اپنے پیاز میں سے اگاتی ہے۔ فرمایا کیا تم وہ چیز جو کمتر ہے، اس چیز کے بدلے مانگ رہے ہو جو بہتر ہے، کسی شہر میں جا اترو تو یقیناً تمھارے لیے وہ کچھ ہوگا جو تم نے مانگا، اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کی طرف سے بھاری غضب کے ساتھ لوٹے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے اور نبیوں کو حق کے بغیر قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿۶۱﴾

آیت 61 ❶ من اور سلویٰ کو ایک کھانا اس لیے قرار دیا کہ روزانہ یہی کھانے کو ملتا تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ پرندوں کا گوشت اور صحرا کی فطری خودرو چیزیں اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت اور صحت کے لیے بہترین غذا تھیں، پھر انھیں آزادی اور فراغت حاصل تھی، جس میں وہ علم حاصل کر سکتے تھے اور جہاد کی تیاری کر کے عزت و اقتدار حاصل کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ان نعمتوں کی قدر نہ کی اور ان چیزوں کا تقاضا کرنے لگے جن کے وہ زمانۂ غلامی میں عادی تھے اور جو آزاد فضا میں ملنے والے من و سلویٰ کے مقابلے میں بالکل ہیچ تھیں۔ پھر اس کے لیے کھیتی باڑی میں مشغول ہونا پڑتا تھا، جو ہمیشہ فاتح قومیں مفتوح قوموں سے کرواتی ہیں اور جس میں مکمل مشغولیت کا نتیجہ ذلت و مسکنت ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرۃ : ۱۹۵] ''اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو۔'' اس آیت کی تفسیر صحیح بخاری میں ہے کہ ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے ہل اور کھیتی باڑی کا کوئی اوزار دیکھا تو فرمایا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: ((لَا يَدْخُلُ هٰذَا بَيْتَ قَوْمٍ إِلَّا أُدْخِلَهُ اللّٰهُ الذُّلَّ)) ''یہ چیزیں کسی گھر میں داخل نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالیٰ اس میں ذلت داخل کر دیتا ہے۔'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھیتی باڑی حرام ہے، بلکہ مراد اس کام میں کھو جانا اور جہاد ترک کرنا ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر باب باندھا ہے: '' بَابُ مَا يُحْذَرُ مِنْ عَوَاقِبِ الْاِشْتِغَالِ بِآلَةِ الزَّرْعِ أَوْ مُجَاوَزَةِ الْحَدِّ الَّذِيْ أُمِرَ بِهِ '' یعنی کھیتی باڑی کے اوزاروں میں زیادہ مشغول ہونے کے نتیجے میں یا اس حد سے تجاوز میں جس کا حکم دیا گیا ہے، جو خطرات ہیں ان کا باب۔'' [بخاری، الحرث و المزارعۃ، قبل ح : ۲۳۲۱]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا اور

بنی اسرائیل پر بھی ان کے اس مطالبے کے نتیجے میں ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۱۲)۔

② یہاں ''مِصْرًا'' نکرہ اور منصرف ہے، کیونکہ مصاحف عثمانیہ کے رسم الخط میں الف موجود ہے، اس لیے اس سے مراد کوئی ایک شہر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی یہی تفسیر کی ہے، بعض نے فرعون والا مصر مراد لیا ہے۔ (ابن کثیر)

③ ''بِغَضَبٍ'' اس میں تنوین تہویل یعنی خوف ناکی کے اظہار کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بھاری غضب'' کیا گیا ہے۔

④ ''فُوْمِهَا'' اکثر مفسرین نے اس سے مراد گندم لی ہے، بعض نے لہسن مراد لیا ہے۔

⑤ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کوئی نبی قتل نہیں ہوا، کیونکہ یہ اس وعدے کے خلاف ہے جو سورۂ ابراہیم (۱۳، ۱۴) میں مذکور ہے۔ یہ لوگ قتل کا معنی ارادۂ قتل یا سخت تکلیف دینا لیتے ہیں، مگر قرآن مجید میں کئی جگہ صریحاً لفظ ''قتل'' آیا ہے، مثلاً: ﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ ﴾ [البقرة : ۹۱] ''کہہ دے پھر اس سے پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا کرتے تھے۔'' رہا وعدۂ الٰہی تو وہ عام مومنوں سے بھی ہے، دیکھیے سورۂ نور (۵۵)۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی مومن قتل نہیں ہوا، یقیناً کئی مومن قتل ہوئے اور کئی انبیاء بھی، خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بیماری میں جس میں فوت ہوئے فرماتے تھے: ((يَا عَائِشَةُ ! مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِيْ أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ فَهٰذَا أَوَانُ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِيْ مِنْ ذٰلِكَ السُّمِّ)) ''میں ہمیشہ اس کھانے کی تکلیف محسوس کرتا رہا اور یہ وقت ہے کہ میں نے اس زہر سے اپنی دل کی رگ کا کٹ جانا محسوس کیا ہے۔'' [بخاري، المغازي، باب مرض النبي صلی اللہ علیہ وسلم ووفاته : ٤٤٢٨] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ قَتَلَهُ نَبِيٌّ أَوْ قَتَلَ نَبِيًّا وَ إِمَامُ ضَلَالَةٍ وَ مُمَثِّلٌ مِّنَ الْمُمَثِّلِيْنَ)) ''قیامت کے دن سب سے سخت عذاب والا وہ آدمی ہے جسے کسی نبی نے قتل کیا یا اس نے کسی نبی کو قتل کیا اور گمراہی کا امام اور مصوروں میں سے کوئی مصور۔'' [مسند أحمد : ۱/۴۰۷، ح : ۳۸٦۷، عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ، صححه أحمد شاكر و حسنه الشيخ مقبل الوادعي] اگر کوئی نبی قتل ہو ہی نہیں سکتا تو اس حدیث کا کیا مطلب ہو گا؟ خود بائبل میں زکریا علیہ السلام کا قتل (تواریخ، باب: ۲۴، فقرہ: ۲۱) اور یحییٰ علیہ السلام کا قتل (مرقس، باب: ٦، فقرہ: ۱۷۔۲۹) مذکور ہے۔

آیت 62 ① اس آیت سے پہلی آیات اور اس کے بعد والی آیات میں بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کے مقابلے میں ان کے اعمالِ بد کا تذکرہ ہے۔ یہ آیت درمیان میں ایک خاص مناسبت کی بنا پر آئی ہے، وہ یہ کہ جب بات ان پر ذلت و مسکنت مسلط ہونے اور اللہ کے غضب کا نشانہ بننے تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت کے مطابق ان کے لیے اپنی رحمت کا تذکرہ بھی فرمایا کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد اس ذلت و مسکنت اور غضبِ الٰہی کا نشانہ نہیں، پہلے بھی اللہ تعالیٰ بے حد مہربان تھا اور

عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

نیک عمل کرے گا تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۶۲﴾

توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایمان اور عمل صالح سے متصف ہو گا، خواہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہو، جیسے آپ سے پہلے اپنے اپنے انبیاء پر ایمان لا کر عمل صالح کرنے والے لوگ ہوں، یا آپ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ میں سے ایمان لانے والے ہوں، مثلاً عبداللہ بن سلام، صہیب اور سلمان رضی اللہ عنہم، سب کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ یہود و نصاریٰ کو مزید مانوس کرنے کے لیے مسلمانوں اور صابئین کا بھی ساتھ ذکر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی خاص نسل کے ساتھ مخصوص نہیں، شرط صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ [التحریر والتنویر]

❷ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اب بھی اگر عیسائی، یہودی اور صابی اپنے اپنے مذہب پر رہ کر عمل صالح کریں، تو مسلمانوں کی طرح ان کی بھی نجات ہو جائے گی، یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ تورات و انجیل میں بنی اسرائیل کو صاف الفاظ میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم موجود ہے۔ حوالہ جات کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ صف (۶) کے حواشی۔ اب اگر ان میں سے کوئی شخص رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتا تو اس کا تورات وانجیل پر بھی ایمان نہیں، وہ کیسے نجات پا سکتا ہے؟ ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ [آل عمران : ۸۵] ''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔'' اس آیت میں یہی بات بیان ہوئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِيْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ يَهُوْدِيٌّ وَلَا نَصْرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوْتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِيْ أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ)) [مسلم، الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالۃ ...... : ۱۵۳] ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت کا کوئی بھی یہودی یا نصرانی جو میرے بارے میں سن لے، پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے مگر وہ آگ میں داخل ہو گا۔''

❸ الصّٰبِـِٕيْنَ: یہ '' صَابِئٌ '' کی جمع ہے، اس کا مادہ (ص، ب، ء) ہے، جو شخص ایک دین سے دوسرے دین کی طرف نکل جائے، گویا یہ ''صَبَأَ نَابُ الْبَعِيْرِ '' سے ہے، جس کا معنی ہے اونٹ کی کچلی نکل آئی۔ ایک قراءت میں ''اَلصَّابِيْنَ'' ہے، وہ اسی ''الصّٰبِـِٕيْنَ'' میں سے ہمزہ کی تخفیف سے ہے اور بعض نے کہا بلکہ وہ ''صَبَا يَصْبُوْ '' سے ہے، جس کے معنی مائل ہونا ہیں، یعنی وہ ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہو گیا۔ (راغب)

اسی لیے جو شخص مسلمان ہوتا کفار قریش اسے صابی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے، یہود و نصاریٰ کی طرح یہ لوگ بھی آسمانی دین پر تھے، اس لیے اس آیت میں ان کے ساتھ ان کا ذکر ہوا، بعد میں ان کے اندر بگاڑ پیدا ہو گیا اور وہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے۔ یہ لوگ اپنے مذہب کو حد درجہ چھپاتے تھے، شیعہ اسماعیلیہ نے مذہب کو چھپانا انھی سے لیا ہے۔ ان کے اہل کتاب ہونے

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۶۳ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ
مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۶۴ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً
خٰسِـِٕيْنَ ۝۶۵ۚ

اور جب ہم نے تمھارا پختہ عہد لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا۔ پکڑو قوت کے ساتھ جو ہم نے تمھیں دیا ہے اور جو اس میں ہے اسے یاد کرو، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے ﴿۶۴﴾ اور بلاشبہ یقیناً تم ان لوگوں کو جان چکے ہو جو تم میں سے ہفتے (کے دن) میں حد سے گزر گئے تو ہم نے ان سے کہا ذلیل بندر بن جاؤ ﴿۶۵﴾

کے بارے میں صحابہ و تابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے: جصاص، الفہرست لابن ندیم، الملل والنحل]

آیت 63 ① اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کا عہد لیتے ہوئے ایک ہیبت ناک منظر پیدا فرما دیا، تاکہ وہ دل سے یہ عہد کریں۔ اس وقت وہ پہاڑ کے دامن میں تھے کہ زلزلے کے ساتھ پہاڑ اکھڑ کر (وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ) ان پر جھک گیا اور سائبان کی طرح ان پر سایہ فگن ہو گیا، حتیٰ کہ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ان پر گرنے ہی والا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۱) یہ دسویں نعمت ہے، کیونکہ یہ عہد و میثاق ان کے فائدے ہی کے لیے تھا۔

② "مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ" کی وضاحت یہاں اگرچہ نہیں آئی، مگر کئی مقامات پر مذکور ہے کہ اس سے مراد کتاب ہے، مثلاً: ﴿ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ [المؤمنون : ۴۹] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، تاکہ وہ (لوگ) ہدایت پائیں۔"
③ "بِقُوَّةٍ" (قوت کے ساتھ پکڑنے) سے مراد یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ (مسند عبد بن حمید، عن مجاہد)

آیت 64 ① اس سارے عہد و پیمان کے بعد انھوں نے بہت سی باتوں میں تورات سے کنارہ کشی اختیار کی، چنانچہ انھوں نے تورات میں تحریف کی، اس کی آیات کو چھپایا، انبیاء کے احکام کی نافرمانی کی، بعض کو جھٹلایا، بعض کو قتل کیا، میدان تیہ میں عجیب و غریب نعمتوں کے مشاہدے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر بار بار اعتراض کیے، ان کی حکم عدولی کی، انھیں سخت ایذا پہنچائی۔ ارض مقدس میں داخلے کا حکم ہوا تو صاف انکار کر دیا، حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام نے خود کو ان نافرمانوں سے الگ کر دینے کی دعا کی۔ یہ تو پہلوں کا حال تھا، بعد والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔

② لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ: یعنی ان تمام نافرمانیوں کے باوجود فوراً عذاب کے ساتھ ہلاک کرنے کے بجائے تمھیں توبہ و استغفار کی مہلت دی گئی۔

آیت 65 اس آیت سے ظاہر ہے کہ ہفتے کے دن میں زیادتی کا یہ واقعہ بنی اسرائیل میں معروف تھا۔ اس کی تفصیل سورۂ اعراف (۱۶۳ تا ۱۶۶) کے حواشی میں ملاحظہ فرمائیں۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا
مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ
يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا
الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ۸

تو ہم نے اسے ان لوگوں کے لیے جو اس کے سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے، ایک عبرت اور ڈرنے والوں کے لیے ایک نصیحت بنا دیا ﴿٦٦﴾ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، انھوں نے کہا کیا تو ہمیں مذاق بناتا ہے؟ کہا میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں ﴿٦٧﴾ انھوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے واضح کرے وہ (گائے) کیا ہے؟ کہا بے شک وہ فرماتا ہے بے شک وہ ایسی گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے اور نہ بچھڑی، اس کے درمیان جوان عمر کی ہے، تو کرو جو تمھیں حکم دیا جاتا ہے ﴿٦٨﴾ انھوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے واضح کرے اس کا رنگ کیا ہے؟ کہا بے شک وہ فرماتا ہے کہ بلاشبہ وہ گائے زرد رنگ کی ہے، اس کا رنگ خوب گہرا ہے، دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ﴿٦٩﴾ انھوں نے کہا ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمارے لیے واضح کرے وہ (گائے) کیا ہے؟ بے شک گائیں ہم پر ایک دوسری کے مشابہ ہوگئی ہیں اور یقیناً ہم اگر اللہ نے چاہا تو مقصد کو پہنچنے ہی والے ہیں ﴿٧٠﴾ کہا بے شک وہ فرماتا ہے کہ بے شک وہ ایسی گائے ہے جو نہ جوتی ہوئی ہے کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے، صحیح سالم ہے، اس میں کسی اور رنگ کا نشان نہیں۔ انھوں نے کہا اب تو صحیح بات لایا ہے۔ پس انھوں نے اسے ذبح کیا اور وہ قریب نہ تھے کہ کرتے ﴿٧١﴾

آیت 66 اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اس وقت کے لوگوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا۔ ڈرنے والوں کے لیے نصیحت میں یہ بھی شامل ہے کہ امت محمد ﷺ بنی اسرائیل کی ان نافرمانیوں اور ان پر ملنے والی سزاؤں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

آیت 67 تا 71 ① مصر میں غلامی کے زمانے میں غالب قوم کے اثر سے بنی اسرائیل میں گائے کی تقدیس کا عقیدہ سرایت

وَ اِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر تم نے اس کے بارے میں جھگڑا کیا اور اللہ اس بات کو نکالنے والا تھا جو تم

کر گیا تھا، اس کا ظہور اس وقت بھی ہوا جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لیے طور پر گئے، تو انھوں نے بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ اب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس عقیدے کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے کوئی گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، اس پر انھوں نے مذاق سمجھا کہ بھلا گائے بھی ذبح کی جا سکتی ہے۔ کہنے لگے، کیا تو ہم سے مذاق کرتا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتوں کی پرستش پر صاف کہا کہ یقیناً تم اور تمھارے آباء و اجداد کھلی گمراہی میں تھے، تو اس پر انھیں اعتبار نہ آیا کہ کوئی شخص بت پرستی کو بھی گمراہی کہہ سکتا ہے، کہنے لگے: ﴿ اَجِئۡتَنَا بِالۡحَقِّ اَمۡ اَنۡتَ مِنَ اللّٰعِبِیۡنَ ﴾ [الأنبياء : ٥٥] ''کیا تو ہمارے پاس حق لایا ہے، یا تو کھیلنے والوں سے ہے۔'' الغرض! موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: ''میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں۔'' معلوم ہوا مذاق اور ٹھٹھا جاہلوں کا کام ہے، البتہ مزاح اور خوش طبعی الگ چیز ہے، اس میں کوئی بات حقیقت کے خلاف نہیں ہوتی، نہ اس میں کسی کی تحقیر و تنقیص ہوتی ہے، بلکہ جس سے خوش طبعی کی جائے وہ خود بھی خوشی محسوس کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مزاح فرما لیتے تھے۔

2 بَقَرَةً : اس کی تنوین سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو کافی تھا، مگر وہ تو گائے ذبح کرنے پر آمادہ ہی نہ تھے، ادھر موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے پے در پے سوال کیے، جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کسی طرح جان چھوٹ جائے، مگر وہ جتنے سوال کرتے گئے پھنستے گئے، آخر اس شوخ زرد رنگ کی گائے پر بات آ پہنچی جو عبادت کے لیے مثالی سمجھی جاتی تھی۔ آج کل بعض مسلمان گائے کی تو نہیں، البتہ مخصوص قسم کے گھوڑے کی حد سے بڑھ کر تعظیم کرتے ہیں۔

3 عکرمہ نے فرمایا کہ وہ ''ان شاء اللہ'' نہ کہتے تو کبھی وہ گائے نہ پاتے۔ (طبری بسند حسن) معلوم ہوا کہ انھیں گاؤ پرستی کی نجاست سے نجات بھی اللہ تعالیٰ کے پاک نام کی برکت سے حاصل ہوئی۔

4 '' بَقَرَةٌ '' میں تاء وحدت کی ہے، ''بَقَرٌ'' جنس ہے، جیسے ''تَمْرٌ'' اور ''نَمْلٌ'' جنس ہے اور '' تَمْرَةٌ '' اور '' نَمْلَةٌ '' سے مراد ایک کھجور اور ایک چیونٹی ہے، اس کا تذکیر و تانیث سے تعلق نہیں، وہ گائے بھی ہو سکتی ہے اور بیل بھی، جیسا کہ ہل چلانا اور پانی کھینچنا بیل کی صفات ہیں۔ عین ممکن ہے کہ انھیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصر میں کھیتی باڑی کا کام بیل کے ساتھ ساتھ گائے سے بھی لیا جاتا ہو۔

5 اس واقعہ سے بے جا سوالات کی قباحت بھی ظاہر ہے، عمل پر آمادہ انسان زیادہ سوالات کرتا ہی نہیں، فرمایا: ﴿ لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡیَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ ﴾ [المائدة : ١٠١] ''ان چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔''

آیت 73،72 1 ''فَادّٰرَءۡتُمۡ'' اصل میں '' فَتَدَارَأْتُمْ '' تھا، باب تفاعل کی تاء کو دال میں بدل کر دال میں ادغام کر دیا،

بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

چھپا رہے تھے ﴿۷۲﴾ تو ہم نے کہا اس پر اس کا کوئی ٹکڑا مارو، اس طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا اور تمھیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۷۳﴾

ادغام کرنے سے شروع والا حرف مدغم ساکن ہوا تو ساکن کو پڑھنے کے لیے شروع میں ہمزہ لائے، پھر شروع میں فاء آنے سے ہمزہ تلفظ سے ساقط ہو گیا، لکھنے میں موجود ہے۔ بنی اسرائیل کے کسی شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا اور جو لوگ قاتل کو جانتے تھے انھوں نے اس پر پردہ ڈال دیا۔ اب وہ ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے اور جھگڑا شروع ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے ذبح شدہ گائے کا کوئی حصہ مقتول پر مارنے کا حکم دیا، جس سے اس نے زندہ ہو کر قاتل کی نشان دہی کر دی۔ اتنی بات ان آیات سے صاف ظاہر ہے۔ تفاسیر میں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مال دار شخص کو اس کے بھتیجے نے قتل کر دیا، تاکہ اس کا وارث بن جائے، پھر رات کو لاش اٹھا کر دوسرے شخص کے دروازے پر ڈال دی اور صبح کے وقت ان پر قتل کا دعویٰ کر دیا۔ اس پر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے، لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ بعض لوگوں نے کہا، اللہ کے رسول موسیٰ علیہ السلام سے پوچھ لو۔ بالآخر موسیٰ علیہ السلام نے انھیں یہ حکم دیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی تفصیلات اسرائیلیات سے لی گئی ہیں، ان پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

❷ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ قصہ بنی اسرائیل کے ایک آدمی کے قتل سے شروع ہوتا ہے، اس لیے اس کا مقام پہلے تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم پہلے ذکر فرمایا، تاکہ بنی اسرائیل کی نافرمانی کے متعدد مناظر سامنے آ سکیں، مثلاً گائے ذبح کرنے سے پہلوتہی، بار بار سوال کرنا، ناحق قتل کرنا، پھر اسے چھپانے کی کوشش کرنا۔ اگر آیات کی ابتدا قتل نفس سے ہوتی تو یہ ایک ہی واقعہ معلوم ہوتا اور بنی اسرائیل کی نافرمانی کے متعدد پہلو نمایاں نہ ہوتے۔ (زمخشری) مگر ابوحیان نے فرمایا، ظاہر بات یہ ہے کہ واقعات کی ترتیب بھی اس طرح ہے جس طرح آیات کی ترتیب ہے، چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے انھیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا، انھیں اس کا راز معلوم نہ تھا، پھر ان میں قتل کا واقعہ ہو گیا، تو ان کے لیے گائے ذبح کرنے کی (ایک اور) حکمت بھی ظاہر کر دی گئی۔ ہمیں کوئی مجبوری نہیں کہ ہم بعد والے واقعہ کو پہلے اور پہلے کو بعد والا قرار دیں۔ رہی تاریخ میں مذکور کہانیاں تو ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ [البحر المحیط] ابوحیان کی بات واقعتاً وزن رکھتی ہے۔ اس سے گائے ذبح کرنے کے حکم کی اہمیت و حکمت زیادہ واضح ہوتی ہے، جو گاؤ پرستی کی جڑ پر کلہاڑا مارنا ہے۔

❸ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى : اس سے صاف ظاہر ہے کہ گائے کا ٹکڑا مارنے سے وہ مقتول زندہ ہو گیا۔ فرمایا: ''اس طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے'' یعنی یہ واقعہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے کی بھی ایک دلیل اور نشانی ہے، کیونکہ جو ایک مردے کو زندہ کر سکتا ہے وہ تمام مردوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے، فرمایا: ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾ [لقمان : ۲۸] ''نہیں ہے تمھارا پیدا کرنا اور نہ تمھارا اٹھانا مگر ایک جان کی طرح۔''

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ

پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں اور بے شک پتھروں میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور بے شک ان میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں، پس ان سے پانی نکلتا ہے اور بے شک ان میں سے کچھ یقیناً وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ مقامات پر دنیا میں مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے: ① ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ [البقرة : ٥٦] ② اس مقتول کا قصہ جو یہاں ذکر ہوا ہے۔ ③ ان لوگوں کا قصہ جو موت سے ڈر کر ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل پڑے تھے۔ [البقرة : ٢٤٣] ④ اس شخص کا قصہ جو ایک برباد شہر سے گزرا۔ [البقرة : ٢٥٩] ⑤ ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کا قصہ۔ [البقرة : ٢٦٠] اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے ذریعے سے زمین کو زندہ کرنے سے جسموں کو دوبارہ زندہ کرنے پر استدلال کیا ہے۔ [یٰس : ٣٣]

آیت 74 ① **قَسَتْ** : " قَسَا يَقْسُوْ (ن) " ناقص واوی سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے، جب ایک شے میں دوسری شے سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہو اور پھر کسی عارضے کے سبب وہ صلاحیت باقی نہ رہے تو عربی زبان میں اس پر "اَلْقَاسِیْ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہی حال انسان کے دل کا ہے کہ اس میں دلائل و آیات سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، مگر جب مختلف اسباب کی بنا پر وہ صلاحیت باقی نہیں رہتی تو اثر قبول نہ کرنے میں اسے پتھر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی سرزنش فرمائی کہ عجیب کم بخت قوم ہو کہ مردے کا جی اٹھنا تک تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، مگر پھر بھی تم اپنے کفر اور سرکشی پر ڈٹے رہے اور تمھارے دل نرم ہونے کے بجائے اور سخت ہو گئے، جیسے پتھر، بلکہ اس سے بھی سخت۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہل کتاب کا سا رویہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [الحدید : ١٦] "اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔" (ابن کثیر)

② **اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً** : یہاں " اَوْ " شک کے لیے نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کیا شک ہو سکتا ہے، بلکہ " بَلْ " کے معنی میں ہے، یعنی وہ پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ " قَسْوَةٌ " سے اسم تفضیل " اَقْسٰی " آتا ہے، مگر مزید سختی کے اظہار کے لیے " اَشَدُّ قَسْوَةً " فرمایا، ترجمہ میں اس کا خیال رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے نافرمان لوگوں کے دلوں کی سختی کو پتھروں کی سختی سے تشبیہ دینے کے بعد پتھروں کا شکوہ دور فرمایا کہ پروردگارا! ہم سخت ہی سہی، مگر اتنے بھی سخت نہیں کہ ان ظالموں کو ہم سے تشبیہ دی جائے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پتھروں کی نرمی کے بیان کے لیے ان کی تین قسمیں بیان فرمائیں۔

خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کر رہے ہو ﴿۷۴﴾

3 ''اللہ کے ڈر سے'' اس کا تعلق پتھروں کی تینوں قسموں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ پتھروں سے نہروں کا پھوٹ نکلنا، ان کا پھٹ جانا اور ان سے پانی کا نکلنا اور ان کا گر پڑنا اللہ کے خوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ پتھر تو بے جان چیز ہیں، وہ کیسے ڈرتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل والی مخلوقات کے علاوہ ان میں بھی ایک شعور اور فہم رکھا ہے، جس کی حقیقت وہی جانتا ہے، اگر فلسفے کا مارا ہوا کوئی شخص انکار کرے تو کرے، اہل السنہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ﴾ [بنی إسرائیل : ٤٤] ''اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔'' اور فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ﴾ [النور : ٤١] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اس کی تسبیح کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک نے یقیناً اپنی نماز اور اپنی تسبیح جان لی ہے اور اللہ اسے خوب جاننے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ﴾ [الحج : ١٨] ''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ، اسی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے لوگ۔ اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا اور جسے اللہ ذلیل کر دے پھر اسے کوئی عزت دینے والا نہیں۔ بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ﴾ [الأحزاب : ٧٢] ''بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔'' اور فرمایا: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ﴾ [الحشر : ٢١] ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا دیکھتا۔'' ﴿ اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴾ [النحل : ٤٨] ''اور کیا انھوں نے اس کو نہیں دیکھا جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، جو بھی چیز ہو کہ اس کے سائے دائیں طرف سے اور بائیں طرفوں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں، اس حال میں کہ وہ عاجز ہیں۔'' ﴿ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ [حٰمٓ السجدة : ٢١] ''اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔'' اسی طرح صحیح

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ تمھارے لیے ایمان لے آئیں گے، حالانکہ یقیناً ان میں سے کچھ لوگ ہمیشہ ایسے چلے آئے ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں، پھر اسے بدل ڈالتے ہیں، اس کے بعد کہ اسے سمجھ چکے ہوتے ہیں اور وہ جانتے ہیں ﴿۷۵﴾ اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب ان میں سے بعض بعض کی طرف اکیلا ہوتا ہے تو کہتے ہیں کیا تم انھیں وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ وہ ان کے ساتھ تمھارے رب کے پاس تم سے جھگڑا کریں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۷۶﴾

احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''احد ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔'' [بخاری، : ۷۳۳۳] اور آپ نے فرمایا: ''میں مکہ میں ایک پتھر کو پہچانتا ہوں، جو مجھے بعثت سے قبل سلام کہا کرتا تھا۔'' [أحمد : ۸۹/۵، ح : ۲۰۸۶۹۔ مسلم : ۲۲۷۷] اسی طرح کھجور کے تنے کا باآواز بلند رونے کا واقعہ ہے۔ [صحیح ابن حبان : ۶۵۰۷] اتنے واضح دلائل کے بعد انکار صاف گمراہی ہے، ہم پر قرآن کے الفاظ حجت ہیں اور ان کے ظاہر معنی کی پیروی فرض ہے۔

4 ''بِغَافِلٍ'' میں بائے نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''ہرگز'' کے ساتھ کیا گیا ہے۔

آیت 75 یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ یہود سے ایمان کی توقع بے سود ہے، ان کے پہلے بزرگ یہ ہیں کہ وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے کلام یعنی تورات میں تحریف کر ڈالتے تھے۔ اس جگہ لفظ تحریف لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریف کو شامل ہے۔ انھوں نے تورات کے الفاظ بھی بدل ڈالے تھے، مگر زیادہ تر غلط تاویلوں سے معانی تبدیل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ موجودہ یہود نے تورات کی ان آیات کو بدل ڈالا جن میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کا ذکر تھا اور اپنے دل سے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا لیا۔ (ابن کثیر، قرطبی) آج کل کے باطل پرست علماء بھی اپنے خود ساختہ مسائل کو درست ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے حوالہ جات قرآن و حدیث سے تراش رہے ہیں اور شریعت میں تحریف کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

آیت 76 یہود کی اخلاقی پستی اور اللہ تعالیٰ سے بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض لوگ جب مسلمانوں سے ملتے تو اپنے ایمان کا دعویٰ کرتے اور از راہ نفاق و خوشامد ان سے ان علامتوں اور پیشین گوئیوں کا تذکرہ بھی کرتے جو تورات اور ان کی دوسری کتابوں میں نبی آخر الزماں کے متعلق موجود تھیں، لیکن جب وہ آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے کہ تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں کیوں بتاتے ہو جو اللہ نے صرف تمھی کو بتائی ہیں؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ یہ مسلمان آخرت میں اللہ کے پاس تمھاری اپنی دی ہوئی معلومات کی بنا پر تم پر حجت قائم کریں گے اور جھگڑیں گے کہ تم نبی آخر الزماں کو جاننے

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ق
ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ
وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

اور کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں؟ ﴿۷۷﴾ اور ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں، جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے چند آرزوؤں کے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ گمان کرتے ہیں ﴿۷۸﴾ پس ان لوگوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے، تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی قیمت حاصل کریں، پس ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ان کے لیے بڑی ہلاکت اس کی وجہ سے ہے جو وہ کماتے ہیں ﴿۷۹﴾

اور پہچان لینے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لائے۔

آیت 78،77 بنی اسرائیل کے عناد اور سرکشی کو بیان کرنے کے بعد اب ان کے مختلف طبقوں کا بیان ہو رہا ہے، اس آیت میں عوام کی حالت بیان کی گئی ہے۔ (رازی) اُمّی وہ ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو اور "اَمَانِيَّ" "اُمْنِيَّةٌ" کی جمع ہے، جس کے معنی آرزوؤں یا من گھڑت روایات کے ہیں، یعنی یہود میں ایک طبقہ جو عوام کا ہے اور ان پڑھ ہے، انھیں "الْكِتٰبَ" یعنی تورات کا تو کچھ علم نہیں، مگر وہ اپنے سینوں میں بعض بے بنیاد قسم کی آرزوئیں پالے ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ ان کے بزرگوں کی وجہ سے اللہ انھیں ضرور بخش دے گا، یا یہ کہ جنت میں یہود کے سوا کوئی نہیں جائے گا وغیرہ، مختلف قسم کی خرافات کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی غلط آرزوئیں ہیں یا من گھڑت قصے ہیں جو انھوں نے سن رکھے ہیں۔ (ترجمان)

"اُمْنِيَّةٌ" کا ایک معنی تلاوت بھی آتا ہے، جیسا کہ: ﴿اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ﴾ [الحج : ٥٢] کا ایک ترجمہ تلاوت بھی کیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ خالی تلاوت کر سکتے ہیں مگر انھیں اس کے مطلب کی کچھ خبر نہیں، جیسا کہ آج کل اکثر مسلمان، خواہ حافظِ قرآن ہوں، محض تلاوت کر سکتے ہیں، مگر مفہوم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ایسا پڑھنا نہ پڑھنے ہی کے برابر ہے، اس لیے ان کے اُمّی ہونے کے خلاف نہیں۔

آیت 79 ① یہ تعلیم یافتہ طبقے کی حالت ہے کہ وہ خود گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے رہتے ہیں۔ وہ محض دنیا کمانے کے لیے عوام کو ان کی خواہشات کے مطابق باتیں جوڑ کر لکھ دیتے ہیں اور انھیں بڑی جرأت اور ڈھٹائی سے اللہ اور رسول کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ اللہ اور اس کے رسول کا فرمان

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

اور انھوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہیں چھوئے گی مگر گنے ہوئے چند دن۔ کہہ دے کیا تم نے اللہ کے پاس کوئی عہد لے رکھا ہے تو اللہ کبھی اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ۝۸۰

بتانے کے بجائے اپنا یا اپنے کسی بزرگ کا قول پیش کر کے باور یہ کرواتے ہیں کہ یہ عین شریعت ہے۔ افسوس اکثر مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو گیا ہے کہ انھوں نے امتیوں کے اقوال کو شریعت قرار دے دیا اور قرآن و حدیث پر چلنے والوں کو لا مذہب قرار دے دیا۔

2 ”وَيْلٌ“ کا معنی ہلاکت اور تباہی ہے، اس پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی ہلاکت“ کیا گیا ہے۔ سنن ترمذی کی جس مرفوع روایت میں ہے: ”ویل جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، کافر ستر سال تک اس کی گہرائی میں گرتا جائے گا مگر اس کی گہرائی تک نہ پہنچے گا“ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف ترمذی (۳۱۶۴) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

3 اس آیت پر ان حضرات کو خاص طور پر غور کرنا چاہیے جو قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے صحیح احادیث کو چھوڑ کر تورات، انجیل اور تلمود کے ساتھ شوق فرماتے ہیں، جن میں تحریف کی اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور جن میں انبیاء پر تہمتیں، بے سرو پا باتیں اور آیات کا باہمی تضاد لفظی تحریف کا واضح ثبوت ہیں۔ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”تم اہل کتاب سے کسی بھی خبر کے متعلق کیوں پوچھتے ہو، جب کہ تمھاری کتاب جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی، سب سے نئی ہے؟ تم اسے خالص اور ہر طرح کی ملاوٹ سے پاک پڑھتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں بتایا ہے کہ اہل کتاب نے اپنی کتاب کو بدل دیا اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے ذریعے سے دنیا کا تھوڑا سا مال کما لیں۔ کیا تمھارے پاس جو علم آیا ہے وہ تمھیں ان سے دریافت کرنے سے روکتا نہیں؟ قسم ہے اللہ کی! ہم نے ان میں سے کسی شخص کو نہیں دیکھا کہ وہ تم سے اس چیز کے بارے میں دریافت کرتا ہو جو تم پر نازل کی گئی۔“ [بخاری، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبي ﷺ :لا تسألوا...... : ۷۳۶۳]

4 بعض لوگوں نے قرآن مجید کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے، مگر اس آیت کا یہ مطلب نہیں، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیوی مفاد کے لیے اپنے پاس سے غلط باتیں لکھ کر اسے اللہ کا کلام باور کرواتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۱)۔

آیت 80 اس آیت میں یہود کی ہمہ گیر گمراہی کا بیان ہے، جس میں عوام اور علماء سبھی مبتلا تھے، یعنی ہم اللہ کے محبوب اور پیارے ہیں، ہم چاہے کتنے بھی گناہ کریں جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن وہاں رکھ کر نکال لیے جائیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے کئی سوال کیے، ان میں سے ایک یہ تھا: ((مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟)) ”آگ میں جانے والے کون لوگ ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر اس میں تم ہماری جگہ لے لو گے۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَ اللّٰهِ لَا نَخْلُفُكُمْ فِيْهَا أَبَدًا)) ”تم ہی اس میں دفع دور رہو، اللہ کی قسم! ہم اس میں کبھی تمھاری جگہ نہیں لیں گے۔“ [بخاری، الجزية والموادعة، باب إذا غدر المشركون ...... : ۳۱۶۹]

﴿ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٨١ ﴾

کیوں نہیں! جس نے بڑی برائی کمائی اور اسے اس کے گناہ نے گھیر لیا تو وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿٨١﴾

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو یہودی کہا کرتے تھے کہ دنیا کی مدت صرف سات ہزار سال ہے اور لوگوں کو دنیا کے ایک ہزار سال کے بدلے میں آخرت کے صرف ایک دن کا عذاب ہوگا، تو یہ صرف سات دن ہیں، پھر عذاب ختم ہو جائے گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ [ابن أبی حاتم بسند حسن : ۱/ ۲۱۰] کچھ یہ کہتے تھے کہ جتنے دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی بس اتنے دن جہنم میں رہیں گے۔[مصنف عبد الرزاق عن قتادة]

آیت 81 ﴿ سَيِّئَةً ﴾ : تنوین تنکیر کے لیے نہیں بلکہ تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی برائی'' کیا گیا ہے، مراد اس سے کفر و شرک ہے۔ اس سے ملتا جلتا وہ واقعہ ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [الأنعام : ۸۲] تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ''بِظُلْمٍ'' کی تنوین کو تنکیر کے لیے سمجھ کر کہا: ''ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے ایمان میں کسی ظلم کی آمیزش نہیں کی؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آیت میں ظلم سے یہ مراد نہیں ہے، کیا تم نے لقمان کی وہ نصیحت نہیں سنی جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان : ۱۳] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب ﴿ لا تشرك بالله ...... ﴾ : ۴۷۷۶] تفصیل سورۂ انعام (۸۲) میں دیکھیں۔ اسی طرح یہاں بھی ''سَيِّئَةً'' سے مراد کفر و شرک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس سے مراد ایسا کفر لیا ہے جو ہر نیکی کو ختم کر دے۔

[ابن أبی حاتم بسند حسن : ۱/ ۲۱۴، ح : ۸۱۲]

ان آیات میں یہود کے اس نظریے کی تردید ہے کہ ہم ہر حال میں آخر کار جنت میں جائیں گے، خواہ نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لائیں۔ چنانچہ بتایا گیا کہ جس نے بڑی برائی کا ارتکاب کیا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور اسے اس کے گناہوں نے گھیر لیا کہ اس کی کوئی نیکی باقی نہ رہی تو یہ ابدی جہنمی ہے۔ مراد اس سے یہود اور دوسرے کفار ہیں، کیوں کہ کفر ہی ایسا گناہ ہے جو تمام نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے۔ آیت: ﴿ وَقَدِمْنَاۤ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان : ۲۳] ''اور ہم اس کی طرف آئیں گے جو انھوں نے کوئی بھی عمل کیا ہوگا تو اسے بکھرا ہوا غبار بنا دیں گے۔'' اس آیت سے گناہ گار مومن مراد نہیں۔ اہل السنہ والجماعہ کا اتفاق ہے کہ آگ میں ہمیشہ کفار و مشرکین ہی رہیں گے، کیونکہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ گناہ گار کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، وہ چاہے گا تو اپنے فضل و کرم سے ان کے گناہ معاف فرما دے گا اور چاہے گا تو شفاعت سے یا اپنی خاص رحمت سے جہنم سے نکال دے گا۔ اس لیے اس آیت میں ''سَيِّئَةً'' اور ''خَطِيْٓـَٔتُهٗ'' سے مراد کفر و شرک ہی ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾ وَ اِذۡ اَخَذۡنَا
مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی
وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا
مِّنۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۸۳﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے وہی جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۸۲﴾
اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور ماں باپ اور قرابت
والے اور یتیموں اور مسکینوں سے احسان کرو گے اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، پھر تم پھر
گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم منہ پھیرنے والے تھے ﴿۸۳﴾

نے فرمایا: ﴿بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً ......﴾ (یہود کو خطاب ہے) کہ جس نے تمھارے اعمال جیسے عمل کیے اور تمھاری طرح کفر کیا، حتیٰ کہ اس کے کفر نے اس کی تمام نیکیوں کو گھیر لیا۔" [ابن أبی حاتم بسند حسن : ۲۱۳/۱، ح : ۸۲۱]

آیت 82 ﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ......: کفر پر وعید کے بعد ایمان اور عمل صالح پر بشارت ہے اور یہ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ بشارت و نذارت دونوں اکٹھی ذکر ہوتی ہیں۔

آیت 83 ① گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو وہ تاریخی احسانات یاد دلائے گئے ہیں جو ان کے بزرگوں پر کیے گئے اور انھوں نے شکر گزاری کے بجائے کفر کیا، جس کے نتیجہ میں ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی بار عتاب نازل ہوا۔ اب یہاں ان کو وہ عہد یاد دلایا جا رہا ہے جو بنیادی احکام (عبادات و معاملات) دیتے وقت ان سے لیا گیا تھا اور بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس عہد کی پابندی نہ کی اور اس سے سراسر بے پروائی اختیار کی۔ اسی قسم کا حکم سورۂ نساء (۳۶) میں امت مسلمہ کو بھی دیا گیا ہے۔ (ابن کثیر)

② ﴿لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ﴾: عبادت کی چار قسمیں ہیں: ① بدنی عبادت، جیسے طواف، رکوع، سجدہ وغیرہ۔ ② مالی عبادت، جیسے صدقہ و خیرات کرنا اور نذر و نیاز ماننا۔ ③ لسانی عبادت (یعنی زبان سے) جیسے کسی کے نام کا وظیفہ جپنا، یا اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی کا نام لینا۔ ④ قلبی عبادت (یعنی دل سے) جیسے کسی پر بھروسا رکھنا، کسی سے خوف کھانا یا امید رکھنا۔ یہ سب عبادتیں اللہ کے لیے ہیں، ان میں جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا وہ شرک کا مرتکب ہو گیا۔

③ ﴿وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا﴾ ......: ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش آنے کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے علاوہ متعدد دوسری آیات میں عبادتِ الٰہی کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حقوق العباد میں سب سے افضل عمل یہی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "سب سے افضل عمل کون سا ہے؟" فرمایا: «اَلصَّلَاۃُ عَلٰی وَقْتِہَا» "نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا۔" پوچھا: "پھر کون سا؟" فرمایا: «بِرُّ الْوَالِدَیْنِ» "ماں باپ کے

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ

اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ تم اپنے خون نہیں بہاؤ گے اور نہ اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم خود شہادت دیتے ہو ﴿۸۴﴾ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے آپ کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد گناہ اور زیادتی کے ساتھ کرتے ہو، اور اگر وہ قیدی ہو کر تمھارے پاس آئیں تو ان کا فدیہ دیتے ہو، حالانکہ اصل یہ ہے کہ ان کا نکالنا تم پر حرام ہے،

ساتھ نیک سلوک کرنا۔'' پوچھا: ''پھر کون سا؟'' فرمایا: ''جہاد فی سبیل اللہ۔'' [بخاری، مواقیت الصلاۃ، باب فضل الصلوۃ لوقتها : ۵۲۷] اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اسے جنم دیا، پھر اس کی پرورش کی۔ ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ [بنی إسرائيل : ۲۴] ''اے میرے رب! دونوں پر رحم کر جیسے انھوں نے چھوٹا ہونے کی حالت میں مجھے پالا۔''

❹ وَالْيَتٰمٰى: یتیم وہ ہے جس کا والد بچپن میں فوت ہو جائے۔ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں۔'' [أبو داوٗد، الوصايا، باب ما جاء متى ينقطع اليتم : ۲۸۷۳ و صححه الألبانی]

❺ وَالْمَسٰكِيْنِ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ آیت (۶۰) کا حاشیہ۔

❻ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا: ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''قولِ حسن یہ ہے کہ نیکی کا حکم دے، برائی سے منع کرے، بردباری اور عفو و درگزر سے کام لے اور جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں سے اچھی بات کرے اور ہر وہ اچھی عادت ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، اگر تم کچھ اور نہ کر سکو تو کم از کم اپنے بھائی سے کھلے چہرے کے ساتھ مل لو۔'' [مسلم، البر والصلة، باب استحباب طلاقة ...... : ۲۶۲۶]

بنی اسرائیل کو قول حسن (اچھی بات) کا حکم تھا، ہماری امت کو اس سے بڑھ کر ''احسن'' (سب سے اچھی بات) کا حکم ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [بنی إسرائيل : ۵۳] ''اور میرے بندوں سے کہہ دے وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو۔''

❼ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: اس سے مراد وہ نماز اور زکوٰۃ ہے جو بنی اسرائیل ادا کرتے تھے۔

❽ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ: اس سے مراد بنی اسرائیل کے وہ تھوڑے سے لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اس عہد پر قائم رہے، یا آپ کے تشریف لانے کے بعد آپ پر ایمان لے آئے۔ باقی سب نے اس عہد و پیمان کو پس پشت پھینک دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حد درجے کا انصاف ہے کہ ان کی عہد شکنی کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی سب کو مجرم قرار نہیں دیا، بلکہ عہد پر قائم رہنے والوں کو، خواہ وہ تھوڑے تھے، عہد توڑنے والوں سے الگ ذکر فرمایا۔

آیت 84، 85 ❶ ''ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے'' کے بجائے فرمایا کہ

اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع ۱۰

پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تو اس شخص کی جزا جو تم میں سے یہ کرے اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ ہرگز اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۸۵﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے خریدی، سو نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۸۶﴾

''تم اپنے خون نہیں بہاؤ گے اور نہ اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نکالو گے'' کیونکہ امتِ مسلمہ کے افراد ایک جسم کی طرح ہیں، کسی بھی مسلم کا خون بہانا اپنا خون بہانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى » ''تمام مومن اپنی باہمی دوستی، ایک دوسرے پر رحم اور ایک دوسرے پر شفقت میں ایک جسم کی مانند ہیں، جب اس کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو اس کی خاطر سارا جسم بیدار رہتا ہے اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' [مسلم، البر والصلة، باب تراحم المؤمنين …… : ۲۵۸۶، عن النعمان بن بشير رضی اللہ عنہما۔ بخاري : ۶۰۱۱] ''وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ'' میں ''هُوَ'' ضمیر شان ہے جس کا ترجمہ ''اصل یہ ہے'' کیا گیا ہے۔

② دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سے چار عہد لیے گئے تھے: ① ایک دوسرے کا خون نہ بہانا۔ ② ایک دوسرے کو گھروں سے نہ نکالنا۔ ③ ایک دوسرے کے خلاف مدد نہ کرنا۔ ④ قیدی کو فدیہ دے کر چھڑا لینا، مگر وہ صرف فدیہ پر عمل کرتے اور باقی تین کی مخالفت کرتے اور بلا جھجک ان کا ارتکاب کرتے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں یہود کے تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، یہ اہل کتاب تھے۔ مدینہ کے عرب قبائل اوس اور خزرج بت پرست مشرک تھے، انھیں کسی آسمانی دین سے سروکار نہ تھا، یہود کے ان قبائل سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے حلیف تھے۔ اوس اور خزرج کی آپس میں جنگ رہا کرتی تھی اور یہودی قبائل اس میں اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور مقابلے میں آنے والے مشرک قبیلے کے آدمیوں کے علاوہ ان کا ساتھ دینے والے اپنے یہودی بھائیوں کو بھی قتل کرتے، ان کے گھر بھی لوٹ لیتے، پھر جب لڑائی ختم ہوتی اور کچھ یہودی قید ہو کر غالب قبیلے کے پاس آتے تو غالب قبیلے کے حلیف یہودی خود ہی ان کا فدیہ دے کر انھیں چھڑوا دیتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ کی کتاب کا حکم ہے کہ اپنے قیدی بھائیوں کو چھڑواؤ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں فدیہ دے کر چھڑوانے کا حکم تو یاد رہا، مگر اپنے بھائیوں کے خلاف دوسرے کی مدد نہ کرنے، ان کا خون نہ بہانے اور انھیں گھروں سے نہ نکالنے کا حکم یاد نہ رہا، جس پر تم عمل کرتے تو فدیے کی نوبت ہی نہ

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ؗ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ؗ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو واضح نشانیاں دیں اور اسے پاک روح کے ساتھ قوت بخشی۔ پھر کیا جب کبھی کوئی رسول تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا جسے تمھارے دل نہ چاہتے تھے، تم نے تکبر کیا تو ایک گروہ کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے ﴿۸۷﴾

آتی۔ گویا تم اللہ کی کتاب کے جس حکم کو اپنی مرضی کے مطابق پاتے ہو مان لیتے ہو اور جو اپنی مرضی کے مطابق نہ ہو اس کی پروا نہیں کرتے، اگر تم واقعی اللہ کی کتاب پر چلتے ہو تو چاروں حکم مانو۔

③ اِلْاٰخِرَةِ: یہودیوں کو دنیا کی زندگی میں جلد ہی رسوائی دیکھنا پڑی کہ بنونضیر اور بنوقینقاع جلا وطن ہوئے اور بنوقریظہ کے بالغ مرد قتل ہوئے، بچے اور عورتیں لونڈی و غلام بنے، پھر آخرت کے عذاب کا تو دنیاوی عذاب سے کچھ موازنہ ہی نہیں۔

④ افسوس! اس وقت اکثر مسلمانوں کا حال بعینہٖ وہی ہو گیا ہے جو اہل کتاب کا تھا کہ انھوں نے اسلام کے اپنی مرضی کے چند احکام پر عمل کیا اور باقی کو بھلا دیا، مثلاً مسلمان خنزیر کا گوشت کھانا تو درکنار اس کا نام لینے سے بھی اجتناب کرتے ہیں، جب کہ سود اور جوئے (انشورنس وغیرہ) سے انھیں کچھ پرہیز نہیں، بلکہ ان کے کاروبار کی بنیاد ہی ان کاموں پر ہے۔ وہ قبلے کی طرف منہ کر کے پیشاب نہیں کرتے، مگر انھیں نماز سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ جھٹکے والی مرغی (جسے شرعی طریقے سے حلال نہ کیا گیا ہو) کھانے سے یورپ اور امریکہ میں جا کر بھی اجتناب کرتے ہیں، مگر شراب اور حرام شباب سے انھیں پرہیز نہیں۔ وہ اپنے آپ کو امت مسلمہ کا فرد کہتے ہیں، پھر کفار کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں کو قتل اور ان کے گھروں اور شہروں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ دنیا میں ذلت کی صورت میں تو صاف ظاہر ہے، رہا آخرت کا معاملہ تو کتاب کے بعض پر ایمان (یعنی اس پر عمل) اور بعض کے ساتھ کفر (یعنی اس کی مخالفت کرنا) اہل کتاب کو "اَشَدِّ الْعَذَابِ" سے نہیں بچا سکا تو موجودہ مسلمانوں کو اس سے کیسے بچائے گا؟

آیت 87 ① یعنی موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے جن انبیاء و رسل کا نام قرآن مجید میں آیا ہے وہ ہارون، ذوالکفل، الیاس، الیسع، داؤد، سلیمان، عزیر، یونس، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ حدیث میں یوشع بن نون علیہ السلام کا ذکر بھی آیا ہے، لقمان علیہ السلام کے نبی ہونے میں اختلاف ہے۔ بہت سے رسولوں کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا، دیکھیے سورۂ مومن (۷۸)۔

② اَلْبَيِّنٰتِ: اس سے مراد معجزے ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے، جیسے مردوں کو زندہ کرنا، مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارنے سے پرندہ بن جانا، اندھے اور برص کے مریض کو تندرست کرنا وغیرہ، جن کا ذکر سورۂ آل عمران (۴۹) اور مائدہ (۱۱۰) میں آیا ہے۔

③ بِرُوْحِ الْقُدُسِ: اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا: " بِالرُّوْحِ الْمُقَدَّسَةِ كَمَا تَقُوْلُ حَاتِمُ الْجُوْدِ

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور انھوں نے کہا ہمارے دل غلاف میں (محفوظ) ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی، پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾

وَ رَجُلُ صِدْقٍ " گویا "روح" موصوف ہے جو اپنی صفت کی طرف مضاف ہے اور "قدس" مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے، یعنی پاک روح، جیسا کہ "حَاتِمٌ" کو اس کی صفت " اَلْجُوْدُ " کی طرف مضاف کیا گیا، جبکہ "اَلْجُوْدُ" مصدر بمعنی " اَلْجَوَادُ " ہے، یعنی سخی اور "رَجُلٌ" کو اس کی صفت " صِدْقٌ " کی طرف مضاف کیا گیا، جو "صَادِقٌ" کے معنی میں ہے، یعنی سچا آدمی۔ (الکشاف) بعض اہل علم نے فرمایا: "اَلْقُدُسِ" اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ وہ سراسر پاک ہے، روح اس کی طرف مضاف ہے، گویا روح القدس کا معنی ہوا روح اللہ، اگرچہ تمام روحوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر جبریل علیہ السلام کی خصوصی عزت افزائی کے لیے انھیں "روح اللہ" کہا گیا، جیسا کہ "بیت اللہ" اور "ناقۃ اللہ" کہا جاتا ہے کہ اگرچہ سب گھروں کا مالک اللہ ہی ہے اور سب اونٹنیاں اللہ ہی کی ہیں، مگر کعبہ کو اور صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ان الفاظ کے ساتھ خاص شرف عطا ہوا۔

اس بات کی دلیل کہ روح القدس سے مراد جبریل علیہ السلام ہی ہیں، یہ ہے کہ سورۂ شعراء (۱۹۳) میں جبریل علیہ السلام کو "اَلرُّوْحُ الْاَمِيْنُ" فرمایا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے حسان رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: « اَللّٰهُمَّ أَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ » "اے اللہ! اسے روح القدس کے ساتھ قوت بخش۔" [بخاري، الصلوة، باب الشعر في المسجد : ٤٥٣]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے بنو قریظہ سے جنگ والے دن حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا: « اُهْجُ الْمُشْرِكِيْنَ فَإِنَّ جِبْرِيْلَ مَعَكَ » "مشرکین کی ہجو کر کیونکہ یقیناً جبریل تیرے ساتھ ہے۔" [بخاري، المغازي، باب مرجع النبي ﷺ من الأحزاب : ٤١٢٤] معلوم ہوا کہ روح القدس جبریل علیہ السلام ہی ہیں۔

4 اگرچہ تمام انبیاء کو بینات عطا ہوئے اور جبریل علیہ السلام کے ذریعے سے وحی ہوئی، مگر عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معجزوں اور روح القدس کی تائید کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا کہ یہود نے اتنے برگزیدہ پیغمبر کو بھی جھٹلا دیا، بلکہ انھیں اپنے خیال میں سولی پر چڑھا دیا، پھر اسے اپنا فخریہ کارنامہ قرار دیا: ﴿ وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴾ [النساء : ١٥٧] "اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے (ہم نے ان پر لعنت کی) کہ بلاشبہ ہم نے ہی مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، جو اللہ کا رسول تھا، حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی پر چڑھایا اور لیکن ان کے لیے (کسی کو مسیح کا) شبیہ بنا دیا گیا اور بے شک وہ لوگ جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، یقیناً اس کے متعلق بڑے شک میں ہیں، انھیں اس کے متعلق گمان کی پیروی کے سوا کچھ علم نہیں اور انھوں نے اسے یقیناً قتل نہیں کیا۔"

5 وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ آیت (۶۱) کی تفسیر۔

آیت 88 1 غُلْفٌ : یہ " أَغْلَفُ " کی جمع ہے، جیسے "اَحْمَرُ" کی جمع "حُمْرٌ" ہے، یعنی جو چیز غلاف (پردے) میں

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے، حالانکہ وہ اس سے پہلے ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کے ساتھ کفر کیا، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۸۹﴾

ہو، جیسے " رَجُلٌ اَغْلَفُ "" وہ آدمی جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔" اور " سَيْفٌ اَغْلَفُ " "وہ تلوار جو غلاف میں ہو۔" یہود کہا کرتے تھے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، ان پر تمھاری باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ ﴾ [حٰمٓ السجدۃ : ۵] "اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔" بعض علمائے تفسیر نے "غُلْفٌ" کے یہ معنی کیے ہیں کہ ہمارے دل علم و حکمت سے پُر ہیں، کسی دوسرے علم کی ان میں گنجائش نہیں ہے۔ اس پر قرآن نے فرمایا کہ حق سے متاثر نہ ہونا فخر کی بات نہیں ہے، یہ تو اللہ کی لعنت کی نشانی ہے۔ (ابن کثیر)

2 فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ : " مَا " تاکید کے لیے ہے، اس لیے "بہت کم" ترجمہ کیا گیا۔ "بہت کم ایمان لاتے ہیں" کا ایک معنی یہ ہے کہ ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ اس صورت میں یہ "يُؤْمِنُوْنَ" کی ضمیر سے حال ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں، پورا ایمان نہیں لاتے، بعض آیات اور بعض انبیاء پر ایمان لاتے ہیں اور بعض سے کفر کرتے ہیں، اس صورت میں یہ "اِيْمَانًا" محذوف کی صفت ہے۔ "قَلِيْلًا" بعض اوقات عدم کے لیے بھی آتا ہے کہ وہ ایمان لاتے ہی نہیں۔

آیت 89 يَسْتَفْتِحُوْنَ : فتح و نصرت طلب کرتے تھے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جب یہودی عرب کے مشرکین سے مغلوب ہوتے تو وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! نبی آخر الزماں جلد ظاہر ہوں، تاکہ ہم ان کے ساتھ مل کر ان کافروں پر غلبہ حاصل کریں۔ (طبری) "يَسْتَفْتِحُوْنَ" کا دوسرا معنی ہے: " يَفْتَحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا " (فَتَحَ عَلَيْهِ کا معنی ہے خبر دینا) سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی کافروں کو خوب کھول کر بتاتے تھے۔ (زمخشری)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ مل کر اوس اور خزرج پر فتح و غلبہ کی دعا کیا کرتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرب میں سے مبعوث فرمایا تو انھوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا اور ان سب باتوں کا انکار کر دیا جو وہ آپ کے بارے میں کہا کرتے تھے، تو معاذ بن جبل، بشر بن معرور اور داؤد بن سلمہ رضی اللہ عنہم نے ان سے کہا: "اے یہود کی جماعت! اللہ سے ڈرو اور مسلمان ہو جاؤ! تم تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مل کر ہم پر فتح و غلبہ کی دعا کیا کرتے تھے، جب ہم شرک میں گرفتار تھے اور تم ہمیں بتایا کرتے تھے کہ اللہ کے آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں اور آپ کی نشانیاں بیان کیا کرتے تھے۔" تو سلام بن مشکم جو بنو نضیر میں سے تھا، اس نے کہا: "وہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں لائے جسے ہم پہچانتے ہوں اور

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰ وَ اِذَا قِيْلَ
لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ وَ هُوَ الْحَقُّ

بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا کہ اس چیز کا انکار کر دیں جو اللہ نے نازل فرمائی، اس ضد سے کہ اللہ اپنا کچھ فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔ پس وہ غضب پر غضب لے کر لوٹے اور کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۹۰ اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو اس کے علاوہ ہے اسے وہ نہیں مانتے،

یہ وہ نہیں جو ہم تمھیں بتایا کرتے تھے۔'' اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ [طبری۔ ابن أبی حاتم بسند حسن : ۲۳۸/۱، ح : ۹۰۸]

قرطبی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ''يَسْتَفْتِحُوْنَ'' کے یہ معنی بھی نقل کیے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے جب یہودیوں کا عرب کے مشرکین سے مقابلہ ہوتا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا کرتے اور کہتے: « اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ وَعَدْتَنَا أَنْ تُخْرِجَهُ لَنَا فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ إِلَّا نَصَرْتَنَا عَلَيْهِمْ » ''اے اللہ! ہم تجھ سے بحق نبی امی سوال کرتے ہیں، جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ اسے ہمارے لیے آخر زمانے میں ظاہر کرے گا کہ ہمیں ان پر فتح عطا فرما۔'' چنانچہ جب وہ دشمن سے ملتے یہ دعا کرتے تو انھیں شکست دیتے۔ (قرطبی)

یہ روایت مستدرک حاکم (۲۶۳/۲، ح: ۳۰۴۲) میں ہے، امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ روایت تفسیر کی مجبوری کی بنا پر لائی گئی ہے اور اس کی حدیث سے یہ غریب ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی تلخیص میں فرمایا کہ اس کی کوئی مجبوری نہیں، کیونکہ راوی عبد الملک متروک ہے، ہلاک ہونے والا ہے، اس کے علاوہ اس مفہوم کی روایات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

آیت 90 یعنی انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لینے کے باوجود کہ یہ وہی نجات دلانے والا ہے جس کے آنے کی وہ دعائیں کرتے تھے، آپ کا انکار کیا، تو اس کی وجہ صرف ان کی یہ ضد، نسلی تعصب اور حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی ان میں کیوں نہیں بھیجا اور اپنے فضل سے ایک ان پڑھ قوم عرب کو کیوں نوازا۔ یہ نہ سوچا کہ اللہ اپنے فضل کا خود مالک ہے، وہ جسے چاہے نواز دے۔ ان کے اس حسد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غضب پر غضب لے کر پلٹے۔ پہلے جرائم، جن کا گزشتہ آیات میں ذکر ہے، ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث تھا، مثلاً بچھڑے کی عبادت، تورات میں تحریف، رسولوں کا قتل، عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب وغیرہ، اب آخر الزماں نبی کو جھٹلایا تو مزید غضب کا نشانہ بنے، چنانچہ ''بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ'' کا معنی پہلا اور دوسرا غضب نہیں، بلکہ بار بار اور بڑا غضب ہے، جس کی وجہ سے انھیں ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' فرمایا گیا ہے۔

آیت 91 اس آیت میں یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ اور اس کا رد ذکر فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَ لَقَدْ
جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا
مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ٭
وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

حالانکہ وہی حق ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔ کہہ دے پھر اس سے پہلے تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا کرتے تھے، اگر تم مومن تھے؟ ﴿۹۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً موسیٰ تمھارے پاس واضح نشانیاں لے کر آیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑا بنا لیا اور تم ظالم تھے ﴿۹۲﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور تمھارے اوپر پہاڑ کو بلند کیا، پکڑو قوت کے ساتھ جو ہم نے تمھیں دیا ہے اور سنو۔ انھوں نے کہا ہم نے سنا اور نہیں مانا، اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں اس بچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔ کہہ دے بری ہے وہ چیز جس کا حکم تمھیں تمھارا ایمان دیتا ہے، اگر تم مومن ہو ﴿۹۳﴾

جب انھیں قرآن پر ایمان لانے کے لیے کہا جاتا تو وہ کہتے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، یعنی ہم تورات کو مانتے ہیں اور اسی کے مکلف ہیں، اس کے سوا ہم کوئی چیز نہیں مانتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اول تو تمھارا قرآن کو نہ ماننا بے معنی بات ہے، کیونکہ وہ تورات کی تصدیق کرنے والا ہے اور جیسا کہ پچھلی آیت میں ذکر ہے کہ تم پہچان بھی چکے ہو کہ یہ وہی رسول ہے جس کی آمد کا تم شدت سے انتظار کر رہے تھے، پھر اگر تمھارا یہی دعویٰ ہے کہ تم صرف تورات کو مانتے ہو تو تم پہلے انبیاء کو کیوں قتل کرتے تھے؟ حالانکہ وہ سب انبیاء تمھیں تورات کی طرف دعوت دینے آئے تھے اور تورات میں تمھیں انبیاء کے قتل سے منع کیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ تمھارا جھٹلانا محض حسد، بغض اور تکبر کی وجہ سے ہے۔

آیت 92 ① یہ ایک اور وجہ سے ان کے تورات پر ایمان کے دعوے کا رد ہے کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کیا سلوک کیا جو اپنی نبوت کی واضح نشانیاں اور ناقابل تردید دلائل لے کر تمھارے پاس آئے، جیسے عصا، ید بیضاء، طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک، خون، سمندر کا پھٹنا، من و سلویٰ، پتھر سے بارہ چشموں کا نکلنا، بادل کا سایہ وغیرہ، پھر ان نشانیوں کے آنے کے بعد تم نے بچھڑا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، تو کیا یہ تورات پر ایمان تھا؟

② مِنْۢ بَعْدِهٖ: اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے "طور" پر جانے کے بعد بھی ہو سکتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے نشانیاں لانے کے بعد بھی۔

آیت 93 ① "سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا" یہ دونوں لفظ انھوں نے زبان سے کہہ دیے ہوں تو کچھ تعجب نہیں، جو قوم ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ ﴾ کہہ سکتی ہے ان سے یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ رفع طور کے وقت "سَمِعْنَا" کہہ دیا ہو اور بعد میں صاف "ہم نہیں مانتے" کہہ دیا ہو۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ ان کے زبان سے اقرار کو "سَمِعْنَا" اور عمل نہ کرنے کو

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

کہہ دے اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں سب لوگوں کو چھوڑ کر خاص تمھارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کرو، اگر تم سچے ہو ﴿۹۴﴾ اور وہ ہرگز اس کی آرزو کبھی نہیں کریں گے، اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۹۵﴾

''عَصَيْنَا'' سے بیان فرمایا ہے، گویا انھوں نے زبانِ حال سے یہ کہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین سے کہا: ﴿ اِئْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ﴾ [حمٓ السجدۃ : ۱۱] ''تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے، دونوں نے کہا ہم خوشی سے آ گئے۔'' اس تفسیر کی بھی گنجائش ہے، مگر جب ان کا منہ میں موجود زبان سے کہنا ممکن ہے، بلکہ صاف ظاہر ہے تو زبانِ حال کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ گزشتہ آیت: ﴿ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ﴾ [البقرۃ: ٦٤] میں بھی ان کا عہد و میثاق کے بعد اس سے پھر جانا گزر چکا ہے۔

❷ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ : جس طرح پانی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے اسی طرح اس بچھڑے کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی۔ ''الْعِجْلَ'' سے پہلے '' حُبٌّ '' کا لفظ مقدر ہے۔ ''الْعِجْلَ'' میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ''اس بچھڑے'' ترجمہ کیا گیا۔ ''اُشْرِبُوْا'' کے لفظ سے اشارہ ہے کہ اس بچھڑے کی محبت اس حد تک پہنچ گئی کہ اس میں ان کا کچھ اختیار نہ رہا، بلکہ یہ معاملہ ہو گیا جیسے کسی اور نے ان کے دلوں میں اس کی محبت انڈیل دی ہو۔

❸ بِكُفْرِهِمْ : ان کی بچھڑے سے اس حد تک محبت اور عبادت بھی کفر تھی، مگر اس کا باعث ان کا سابقہ کفر تھا جس کا ذکر شروع سورت سے آ رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ کفر مزید کفر کا اور ایمان مزید ایمان کا باعث ہوتا ہے۔

❹ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ : یہ ان کے اس دعویٰ پر مزید چوٹ ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، یعنی حقیقت میں تم تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے، ورنہ تورات پر ایمان تمھیں ''سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا'' کہنے کا اور بچھڑے کی عبادت جیسے صریح شرک کا حکم کیسے دے سکتا ہے اور اگر دیتا ہے تو تمھارا ایمان تمھیں بہت بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔

آیت 95،94 ❶ اس آیت سے ملتا جلتا مضمون سورۂ جمعہ (٦ تا ٨) میں بیان ہوا ہے، یہاں '' وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا '' اور وہاں ''وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا'' ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہاں دعویٰ اللہ کی دوستی کا ہے، جس کی نفی صرف ''لَا'' کے ساتھ کی گئی، یہاں دارِ آخرت کا یہودیوں کے لیے خاص ہونے کا ہے جو اس سے بڑا دعویٰ ہے، کیونکہ اللہ کی دوستی ذریعہ ہے اور جنت کا حصول نتیجہ ہے، اس لیے یہاں نفی حرف ''لَنْ'' کے ساتھ کی گئی، جو تاکید کے لیے ہے۔ (رازی) واللہ اعلم !

❷ اس آیت کی دو تفسیریں کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت میں تمھارے سوا کوئی نہیں جائے گا تو موت کی تمنا کرو، کیونکہ جس شخص کو یقین ہو کہ وہ مرنے کے بعد جنت میں جائے گا وہ تو ضرور موت کی تمنا کرے گا، تاکہ جلد از جلد جنت میں پہنچ جائے۔ ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین نے یہی معنی کیے ہیں، مگر اس پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ یہود ہی موت کی تمنا کیوں کریں، مسلمانوں کو بھی موت کی تمنا کرنی چاہیے، جب کہ موت کی تمنا تو مسلمان بھی کم ہی کرتے ہیں۔

وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۱

اور بلاشبہ یقیناً تو انھیں سب لوگوں سے زیادہ کسی بھی طرح زندہ رہنے پر حریص پائے گا اور ان سے بھی جنھوں نے شرک کیا۔ ان کا (ہر) ایک چاہتا ہے کاش! اسے ہزار سال عمر دی جائے، حالانکہ یہ اسے عذاب سے بچانے والا نہیں کہ اسے لمبی عمر دی جائے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ﴿۹۶﴾

بلکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا سے منع فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نسلی تفاخر میں مبتلا تھے، وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور محبوب ہونے کے دعوے دار تھے اور جنت کے واحد ٹھیکے دار بنے ہوئے تھے، جب کہ مسلمانوں کا ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے، وہ اتنے بے خوف ہوتے ہی نہیں کہ اتنا بڑا دعویٰ کریں۔ (دیکھیے مومنون: ۵۷ تا ۶۱) اس کے باوجود مسلمانوں میں شہادت کا شوق اور میدانِ جنگ میں موت کو موت کی جگہوں سے تلاش کرنا عام تھا، جب کہ یہودی اتنے بلند و بالا دعووں کے باوجود آخرت سے سراسر ناامید تھے۔ (دیکھیے سورۂ ممتحنہ: ۱۳) اس لیے وہ کبھی مرنا نہیں چاہتے تھے اور بزدلی کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہاں بھی فرمایا کہ وہ اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ اس آیت میں یہود کے زبانی دعوے اور دل کی چوری کی حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے کہ وہ پیغمبر آخر الزماں ﷺ کو اتنے یقین سے پہچانتے تھے کہ آپ کے کہنے پر کبھی موت کی تمنا کرنے پر تیار نہ تھے۔

دوسری تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ "فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ" کا معنی ہے کہ دونوں گروہوں (یہودیوں اور مسلمانوں) میں سے جو جھوٹا ہے اس کے لیے موت کی بددعا کرو، تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس بات کا انکار کر دیا۔ [ابن أبي حاتم: ۱/ ۲۴۷، ح: ۹۳۷، بسند حسن] یعنی اس آیت میں یہود کو دعوتِ مباہلہ دی گئی کہ اگر تم اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہو تو فریقین میں سے جو جھوٹا ہے اس کے لیے موت کی دعا کرو، مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سورۂ جمعہ (۶ تا ۸) میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے، ان میں بھی یہود کو مباہلہ کی دعوت دی گئی ہے، جیسا کہ سورۂ آل عمران (۶۱) میں نجران کے نصرانیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی اور جس طرح نصرانی مباہلہ سے ڈر گئے تھے یہود بھی بددعا سے ڈر گئے اور جھوٹے گروہ کی موت کی تمنا نہ کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اگر یہودی اس دن جب آپ ﷺ نے ان سے یہ بات کہی، موت کی تمنا کرتے تو زمین پر جو یہودی بھی تھا مر جاتا۔ [ابن أبي حاتم: ۱/ ۲۴۷، ح: ۹۳۸، بسند حسن]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی معنی کو صحیح لکھا ہے، حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی مدارج السالکین میں اس معنی کو ترجیح دی ہے اور ہمارے استاذ مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ اس تفسیر پر یہ اعتراض آتا ہی نہیں کہ یہود ہی موت کی تمنا کیوں کریں، مسلمان کیوں نہ کریں، نہ اس کے جواب کی زحمت اٹھانا پڑتی ہے، کیونکہ جھوٹے کی موت کی تمنا اور بددعا صرف یہود نے نہیں بلکہ مسلمانوں اور یہود دونوں نے کرنی ہے۔ جس کے لیے مسلمان تو آج بھی اللہ کے فضل سے تیار ہیں، مگر یہود و نصاریٰ آج بھی اس کی جرأت نہیں کرتے اور نہ کبھی کر سکیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

آیت 96 عَلٰى حَيٰوةٍ: اس پر تنوین تنکیر کی ہے، اس لیے ترجمہ "کسی بھی طرح زندہ رہنے پر" کیا گیا ہے، یعنی آپ یہود

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ
هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ
فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

کہہ دے جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو بے شک اس نے اسے تیرے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے ہے اور مومنوں کے لیے سراسر ہدایت اور خوشخبری ہے ﴿۹۷﴾ جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ سب کافروں کا دشمن ہے ﴿۹۸﴾

کو زندہ رہنے پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پائیں گے، خواہ انھیں کسی بھی طرح زندہ رہنا پڑے، غلام بن کر یا عزت و آبرو کی بربادی کے ساتھ۔ مشرکین بھی زندہ رہنے کے بہت خواہش مند ہیں، کیونکہ ان کے سامنے صرف دنیا ہی کی لذتیں ہیں، آخرت پر ان کا یقین نہیں، آخرت سے متعلق انھیں نہ کچھ خوف ہے نہ امید، مگر یہودی زندہ رہنے پر ان سے بھی زیادہ حریص ہیں، کیونکہ مشرکین مرنے کے بعد زندہ ہونے کا عقیدہ ہی نہیں رکھتے، اس لیے وہ موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا یہودی ڈرتے ہیں، جنھیں خوب علم ہے کہ نبی آخر الزماں کو جاننے پہچاننے کے باوجود ان کے ساتھ کفر کے نتیجے میں انھیں کیا رسوائی اٹھانا پڑے گی۔ اس لیے ان کا ہر شخص ہزار برس زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے، خواہ کیسی ہی ذلیل زندگی ہو، کیونکہ آخرت کے عذاب سے تو بہر حال وہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے کسی شخص کو لمبی عمر مل بھی جائے تو وہ اسے عذاب سے بچانے والی ہرگز نہیں۔

آیت 98،97 ① یہودی رسول اللہ ﷺ کی عداوت میں یہاں تک چلے گئے کہ انھوں نے جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن قرار دے دیا، کیونکہ وہی آپ پر وحی لے کر آتے تھے۔ جب کہ ان کے خیال میں انھیں بنی اسرائیل کے کسی شخص پر وحی لے کر آنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک بہانا بنایا، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے ابا القاسم! ہم آپ سے چند سوال کرتے ہیں، اگر آپ نے ان کے جواب دے دیے تو ہم پہچان جائیں گے کہ آپ واقعی نبی ہیں اور آپ کے پیروکار بن جائیں گے۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ نے ان سے عہد لیا جیسا کہ اسرائیل علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے لیا تھا، آپ ﷺ نے ان سے یہاں تک کہا کہ اللہ اس پر جو ہم کہہ رہے ہیں وکیل ہے۔ (سوالات کے صحیح صحیح جوابات پانے کے بعد) یہود کہنے لگے: ''اچھا یہ بتایئے کہ فرشتوں میں سے آپ کے پاس آنے والا کون ہے؟ کیونکہ ہر نبی کے پاس کوئی نہ کوئی فرشتہ خبر لے کر آتا ہے۔ یہی آخری بات ہے، اگر آپ بتا دیں گے تو ہم آپ کے پیروکار بن جائیں گے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جبریل ہے۔'' انھوں نے کہا: ''وہ تو لڑائی اور جنگ لے کر اترتا ہے، وہ ہمارا دشمن ہے۔ اگر تم میکائیل بتاتے تو ہم ایمان لے آتے، کیونکہ وہ نباتات، بارش اور رحمت لے کر آتا ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ......﴾ [تفسیر ابن أبي حاتم : ۱/۲۵۲، ح : ۹۵۳، بسند حسن]
اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ سے تین سوال پوچھے، آپ نے فرمایا: ''مجھے ابھی ابھی جبریل علیہ السلام

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تیری طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور ان سے کفر نہیں کرتے مگر جو فاسق ہیں ﴿۹۹﴾ اور کیا جب کبھی انھوں نے کوئی عہد کیا تو اسے ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا، بلکہ ان کے اکثر ایمان نہیں رکھتے ﴿۱۰۰﴾

نے ان کے جواب بتائے ہیں۔'' تو وہ کہنے لگے: ''وہ تو فرشتوں میں سے یہود کا دشمن ہے۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿من كان عدوا لجبريل﴾ : ٤٤٨٠]

❷ اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس بہانے کے کئی جواب دیے، پہلا یہ کہ جبریل علیہ السلام کا اس میں کیا قصور ہے، اس نے تو اللہ کے حکم سے اسے آپ ﷺ کے دل پر نازل کیا ہے، تمھاری عداوت تو پھر اللہ تعالیٰ سے ہوئی۔ دوسرا یہ کہ اگر جبریل نے تمھاری کتاب کے خلاف یا گمراہی اور عذاب والی کوئی بات کی ہوتی تو بے شک تم اس سے عداوت رکھتے، مگر جب اس کی لائی ہوئی وحی تمھاری کتاب کی تصدیق کر رہی ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے تو پھر تمھیں دشمنی رکھنے کا کیا حق ہے؟ تیسرا یہ کہ تمھارا کہنا کہ میکائیل سے تمھاری دوستی ہے، یہ کیسے درست ہوسکتا ہے، جب کہ تم جبریل سے دشمنی رکھتے ہو۔ دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے۔ لہٰذا تمھاری دشمنی صرف جبریل سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے، اس کے فرشتوں سے، اس کے رسولوں سے اور جبرئیل و میکائیل سبھی سے ہے، کیونکہ یہ سب جبریل کے دوست ہیں اور سن لو کہ جو ان سب کا دشمن ہے تو ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) [بخاری، الرقاق، باب التواضع : ٦٥٠٢] ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی دوست سے دشمنی رکھی تو میں اس کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔''

❸ فرقہ غرابیہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جبریل علیہ السلام علی رضی اللہ عنہ پر وحی لے کر آئے تھے، مگر محمد ﷺ اور علی رضی اللہ عنہ کی شکل آپس میں ملتی جلتی تھی، تو جبریل نے علی رضی اللہ عنہ کے بجائے محمد ﷺ پر وحی نازل کر دی۔ (تحفہ اثنا عشریہ) جبریل سے عداوت اور ان کی گستاخی میں یہ فرقہ بھی یہود سے ملتا جلتا ہے۔

آیت 99 اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ: یعنی کھلی نشانیاں، جن میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت موجود ہے، قرآن کریم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے تمام معجزات اس کے تحت آ جاتے ہیں۔ (ابن کثیر، رازی)

آیت 100 یہاں سے یہود کی ایک اور قبیح عادت کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ یہودیوں سے نبی آخر الزماں کی مدد کرنے اور اس پر ایمان لانے کا بھی عہد لیا گیا تھا، مگر وہ اس عہد سے پھر گئے اور کہنے لگے، ہم سے اس قسم کا کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ عہد شکنی تو ان لوگوں کا پرانا شیوہ ہے۔ جب بھی ان سے کوئی عہد لیا گیا ان میں سے ایک گروہ نے اسے پس پشت ڈال دیا، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ تو تورات پر سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ اگر اب عہد شکنی کرتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ (رازی)

وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙۗ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَاۤ

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول اس کی تصدیق کرنے والا آیا جو ان کے پاس ہے تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے، جنھیں کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، جیسے وہ نہیں جانتے ﴿۱۰۱﴾ اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور (وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور

آیت 101 یعنی رسول اللہ ﷺ میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو تورات اور دوسری آسمانی کتب ''لِمَا مَعَهُمْ'' میں نبی آخر الزماں کے مذکور تھے۔ اس اعتبار سے آپ ﷺ تورات اور ان کے پاس موجود دوسری آسمانی کتب ''لِمَا مَعَهُمْ'' کے پوری طرح مصداق تھے، مگر یہود کی بدنصیبی کہ جب آپ ان کے پاس آئے تو انھوں نے آپ ﷺ کو جھٹلا کر تورات کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا، گویا انھیں اپنی کتاب کا بھی پتا نہیں۔ (ابن کثیر)

آیت 102 ① رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری پر یہودیوں نے جاننے پہچاننے کے باوجود حسد اور عناد کی بنا پر آپ کی پیروی سے انکار کر دیا۔ میدان میں وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ حق پر ہونے کا عقیدہ و عمل ہی قوت کی بنیاد ہوتا ہے، جس سے ان کے ہاتھ خالی تھے۔ چنانچہ وہ ہر اس قوم کی طرح جو عقیدے اور عمل کی قوت سے خالی ہوتی ہے، جادو ٹونے اور عملیات کے پیچھے پڑ گئے اور ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت اور جدو جہد کے بغیر سارے کام بن جایا کریں۔ جب اور بس نہ چلا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کر دیا۔ یہ جادو کرنے والا لبید بن اعصم یہودی تھا، جس نے رسول اللہ ﷺ کی کنگھی اور اس سے نکلنے والے بالوں پر، جو اس نے ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف میں رکھے تھے، جادو کیا اور اسے ''ذی اروان'' نامی کنویں کی تہ میں ایک بڑے پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس کا اثر آپ پر یہ ہوا کہ آپ کو خیال ہوتا کہ آپ اپنے اہل کے پاس جاتے ہیں، مگر جا نہیں سکتے تھے۔ (گویا یہ '' مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ '' کی ایک صورت تھی) آپ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعے سے مطلع فرمایا اور آپ نے وہ سب کچھ نکال کر ختم کروا دیا اور کنواں بھی دفن کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا عطا فرما دی۔ [بخاری، الأدب، باب قول اللہ تعالٰی: ﴿ إن اللہ یأمر بالعدل ...... ﴾ : ۶۰۶۳، ۵۷۶۳۔ مسلم : ۲۱۸۹، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا] افسوس مسلمان بھی شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جب ذلت و پستی کے گڑھے میں گرے تو ان کی اکثریت بھی جادو ٹونے اور سفلی علوم کے پیچھے پڑ گئی۔

② **وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ** ...... : یہودیوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ سلیمان علیہ السلام (نعوذ باللہ) جادوگر تھے اور ان کی حکومت کا دار و مدار جادو پر تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی اور بتایا کہ جادو تو کفر ہے، سلیمان علیہ السلام صاحب معجزہ پیغمبر تھے، انھوں نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین نے ان کے عہد میں کفر کا یہ کام کیا کہ وہ خود بھی جادو کرتے اور لوگوں کو بھی جادو سکھاتے۔ یہود ایک تو اس علم

أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

ماروت پر اتاری گئی، حالانکہ وہ دونوں کسی ایک کو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ کہتے ہم تو محض ایک آزمائش ہیں، سو تو کفر نہ کر۔ پھر وہ ان دونوں سے وہ چیز سیکھتے جس کے ساتھ وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے اور وہ اس کے ساتھ ہرگز کسی کو نقصان پہنچانے والے نہ تھے مگر اللہ کے اذن کے ساتھ۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتی اور انھیں فائدہ نہ دیتی تھی۔ حالانکہ بلاشبہ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ جس نے اسے خریدا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور بے شک بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۱۰۲﴾

سحر کے پیچھے لگ گئے اور ایک اس علم کے پیچھے لگ گئے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا، جو سحر سے الگ ایک علم تھا اور جسے عمل میں لانا بعض اوقات کفر تھا۔ وہ فرشتے کسی کو بھی وہ علم نہیں سکھاتے تھے جب تک اسے اچھی طرح آگاہ نہ کر دیتے کہ ہم تو محض ایک آزمائش ہیں، لہٰذا تم اس عمل کو کفر کے لیے استعمال نہ کرنا، مگر یہود کی اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ وہ ان سے وہ علم ضرور سیکھتے اور اس میں سے بھی وہ باتیں سیکھتے جو سراسر نقصان پہنچانے والی ہیں اور جنھیں عمل میں لانا کفر ہے اور جن پر شیطان سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے، یعنی ایسے عملیات جن سے وہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔ فرشتوں کا آزمائش کے لیے بھیجا جانا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ افسوس کہ مسلمان بھی جب پستی کا شکار ہوئے تو جادو کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے قرآن کی آیات مثلاً: ﴿ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ ﴾ وغیرہ کو بھائیوں کے درمیان اور میاں بیوی کے درمیان عداوت ڈالنے کے لیے عمل میں لانا شروع کر دیا، حالانکہ یہودی جانتے تھے اور یہ مسلمان بھی جانتے ہیں کہ یہ فعل کفر ہے اور ایسا کرنے والے کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

3 استاذ محمد عبدہ الفلاح رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس مقام پر بعض مفسرین نے ہاروت و ماروت سے متعلق عجیب و غریب داستانیں نقل کر دی ہیں، جن میں زہرہ نامی ایک عورت سے ان کا معاشقہ اور پھر زہرہ کے ستارہ بن جانے کا واقعہ بھی داخل ہے۔ علمائے محققین نے ان قصوں کو یہود کی افسانہ طرازی قرار دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ اور تابعین سے اس قسم کی روایات منقول ہیں، مگر زیادہ سے زیادہ ہم ان کو نو مسلم یہودی عالم کعب الاحبار کا قول قرار دے سکتے ہیں۔ ابن کثیر (البدایہ: ۱/۳۷، ۳۸) حافظ منذری (الترغیب والترہیب: ۲/۱۰۲) اور علامہ احمد شاکر مصری (تعلیق مسند احمد: ۹/۳۵ تا ۴۱) نے بھی اسی کی تائید کی ہے کہ یہ کعب احبار کا قول ہے۔

4 احسن البیان میں ہے کہ بعض مفسرین نے "وَمَآ اُنْزِلَ" میں "مَآ" نافیہ مراد لیا ہے اور ہاروت و ماروت پر کسی چیز کے اترنے کی نفی کی ہے، لیکن قرآن مجید کا سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اسی لیے ابن جریر وغیرہ نے اس کی تردید کی ہے۔ (ابن کثیر)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

اور اگر واقعی وہ ایمان لاتے اور بچتے تو یقیناً اللہ کے پاس سے تھوڑا ثواب بھی بہت بہتر تھا، کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۱۰۳﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم "رَاعِنَا" (ہماری رعایت کر) مت کہو اور "اُنْظُرْنَا" (ہماری طرف دیکھ) کہو اور سنو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا، نہ وہ پسند کرتے ہیں اور نہ مشرکین کہ تم پر تمھارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۱۰۵﴾

آیت 103 ① لَمَثُوْبَةٌ: اس میں تنوین تقلیل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''تھوڑا ثواب'' کیا گیا ہے۔
② پچھلی آیت میں ہے: ﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا﴾ یعنی یہود جانتے تھے، یہاں فرمایا: ﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''کاش وہ جانتے ہوتے'' اس سے معلوم ہوا کہ علم پر عمل نہ کرنے والا درحقیقت عالم ہی نہیں۔

آیت 104 ① رَاعِنَا: "رَاعِ" یہ باب مفاعلہ (مراعاۃ) سے فعل امر ہے، یعنی ہماری رعایت کیجیے۔ مسلمان رسول اللہ ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے، یہودی بھی اس لفظ کے ساتھ آپ کو مخاطب کرتے، مگر زبان کو پیچ دے کر لفظ بدل دیتے، جیسا کہ سورۂ نساء (۴۶) میں ہے، جس سے وہ لفظ گالی بن جاتا۔ مفسرین نے اس کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ "رَاعِنَا" کے بجائے "رَاعِيْنَا" کہتے، جس کا معنی ''ہمارا چرواہا'' ہے۔ دوسری یہ کہ وہ اسے ''رعونت'' سے اسم فاعل قرار دے کر "رَاعِنًا" کہتے جس کا معنی احمق ہے اور منادیٰ غیر معین کو خطاب کی وجہ سے منصوب ہے، پھر آپس میں جا کر خوش ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آپ کے لیے یہ لفظ استعمال کرنے ہی سے منع فرما دیا اور "اُنْظُرْنَا" کہنے کا حکم دیا، ساتھ ہی فرمایا کہ غور سے سنو، تاکہ رسول اللہ ﷺ کو متوجہ کروانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس سے یہودیوں کی دشمنی، ان کی طبیعت کی خست اور شرارت صاف واضح ہے۔ مسلمانوں کو ان کے اعمال کے علاوہ ان کے الفاظ و اقوال کی مشابہت سے بھی منع فرمایا گیا، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انھی میں سے ہے۔'' [أبوداوٗد، اللباس، باب في لبس الشهرة: ۴۰۳۱، و حسنه الألباني]

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے الفاظ جن میں بے ادبی یا گستاخی کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہو، وہ استعمال کرنا درست نہیں۔ یہودیوں کی اسی طرح کی ایک اور کمینگی کا ذکر حدیث میں آیا ہے کہ وہ ''السلام علیکم'' کے بجائے "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" کہتے، جس کا معنی ہے تم پر موت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے جواب میں صرف "عَلَيْكَ" کہنے کا حکم دیا کہ وہ تمھی پر ہو۔
[مسلم، السلام، باب النهي عن ابتداء ...... : ۲۱۶۴]

آیت 105 وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ ......: مشرکین عرب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ ایک عام آدمی تھے اور وہ اپنے کسی عظیم

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾

جو بھی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں، یا اسے بھلا دیتے ہیں، اس سے بہتر، یا اس جیسی (اور) لے آتے ہیں، کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿١٠٦﴾ کیا تو نے نہیں جانا کہ اللہ ہی ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ کے سوا تمھارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿١٠٧﴾

سردار کے بجائے ایک عام آدمی پر وحی کا نزول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۳۱) اور اہل کتاب اللہ کی اس رحمت کو اپنی نسل سے باہر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ فرمایا کہ اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے خاص کرے۔ یہاں رحمت سے مراد نبوت ہے، جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، وہ نہ کسی کی عظمت کی بنیاد پر ملتی ہے، نہ نسل پر اور نہ کسی کے کسب، محنت اور چلہ کشی پر، جیسا کہ قادیانی دجال کا کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ﴾ ''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں میں سے بھی۔'' [الحج : ٧٥]

آیت 107،106 ❶ نسخ کا معنی ہے بعد میں آنے والے حکم کے ساتھ پہلے کسی حکم کو ختم کر دینا، جیسے پہلے بیت المقدس قبلہ مقرر ہوا، پھر بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا اور جیسے ہماری شریعت میں پہلی شریعتوں کے بہت سے احکام منسوخ کر دیے گئے۔ یہودی نسخ کے منکر تھے، اسی لیے انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا کہ انھوں نے تورات کے بعض احکام کیوں منسوخ کیے۔ قرآن پر بھی انھوں نے اعتراض کیا کہ جب پہلا حکم اللہ تعالیٰ کا تھا اور درست تھا تو وہ منسوخ کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے کئی جواب دیے، پہلے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ پہلا حکم درحقیقت ہوتا ہی اتنی مدت کے لیے ہے، نسخ اس مدت کے ختم ہونے کا اعلان ہے۔ اس وقت تک وہ پہلا حکم عین حکمت تھا، بعد میں اس جیسے یا اس سے بہتر دوسرے حکم کی ضرورت تھی تو وہ جاری کر دیا گیا۔ کائنات میں ہر وقت اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ نطفہ سے علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں، پھر جنین، پھر بچپن، جوانی، بڑھاپا، موت اور قیامت سب نسخ ہی کی صورتیں ہیں۔ مختلف موسم مثلاً سردی، پھر بہار، پھر گرمی، پھر برسات، اسی طرح رات دن کا چکر اس کی مثالیں ہیں۔ طبیب کا مریض کے لیے ایک نسخہ تجویز کرنا، پھر نئی صورت حال کے لیے دوسرا نسخہ تجویز کرنا بھی اس کی مثال ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلا نسخہ غلط تھا۔ ایک جواب اس اعتراض کا یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنا حکم منسوخ نہ کر سکتا ہو تو وہ عاجز ٹھہرا، چنانچہ فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔'' مزید فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کے لیے ہے۔'' وہ بادشاہ ہی کیا ہوا جو پہلے حکم کی جگہ نیا حکم نافذ نہ کر سکے۔

❷ قرآن کے ساتھ قرآن منسوخ ہو سکتا ہے اور سنت بھی، اسی طرح سنت کے ساتھ سنت منسوخ ہو سکتی ہے اور قرآن بھی، کیونکہ دونوں وحی الٰہی ہیں اور وحی الٰہی کے ساتھ وحی الٰہی منسوخ ہو سکتی ہے۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

یا تم ارادہ رکھتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو، جس طرح اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر کو لے لے تو بے شک وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ﴿۱۰۸﴾

❀ قرآن سے قرآن کے نسخ کی مثال: سورۂ نساء (۱۵) میں اللہ تعالیٰ نے زنا کرنے والی عورتوں کی سزا مقرر فرمائی کہ انھیں گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے، یا اللہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے، پھر سورۂ نور کے شروع میں زانی مرد اور زانیہ عورت کو سو سو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا۔ مزید دیکھیے سورۂ انفال (۶۵، ۶۶) اور مجادلہ (۱۲، ۱۳)۔

❀ قرآن کے ساتھ سنت کے نسخ کی مثال: جیسے شروع شروع میں روزے کی حالت میں مغرب کے بعد سو جانے کے بعد کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا منع تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا ...... ﴾ [البقرۃ : ۱۸۷] قبلہ کی تبدیلی بھی قرآن کے ساتھ سنت کے نسخ کی مثال ہے۔

❀ سنت کے ساتھ سنت منسوخ ہونے کی مثال: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا وَ نَهَيْتُكُمْ عَنْ لُحُوْمِ الْأَضَاحِيْ فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَأَمْسِكُوْا مَا بَدَا لَكُمْ » ''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا سو ان کی زیارت کرو اور میں نے تمھیں تین راتوں سے زیادہ قربانیوں کے گوشت (ذخیرہ کرنے) سے منع کیا تھا، سو انھیں رکھ لو، جب تک تمھاری مرضی ہو۔'' [مسلم، الأضاحی، باب بیان ما کان من النھی ...... : ۹۷۷، قبل ح : ۱۹۷٦، عن بریدۃ رضی اللہ عنہ]

❀ سنت صحیحہ کے ساتھ قرآن کے نسخ کی مثال خواہ وہ متواتر نہ ہو: جیسا کہ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کا ذکر فرمایا جن سے نکاح حرام ہے، ان میں دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، پھر فرمایا: ﴿ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ ﴾ [النساء : ۲۴] ''ان کے سوا سب عورتوں سے نکاح تمھارے لیے حلال ہے۔'' اس آیت کی رو سے خالہ اور اس کی بھانجی، پھوپھی اور اس کی بھتیجی کو ایک نکاح میں جمع کرنا جائز ہے، مگر رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا تو حرام ہو گیا اور اس پر امت متفق ہے۔

تنبیہ! درحقیقت یہ سنت کے ساتھ کتاب اللہ سے زائد حکم کی مثال ہے، بعض لوگ کتاب اللہ پر زیادتی کو نسخ کہتے ہیں، ان کے قول کے مطابق یہ نسخ کی مثال ہے، ورنہ شیخ محمد بن صالح عثیمین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سنت کے ساتھ قرآن کے نسخ کی کوئی قابل اطمینان مثال مجھے نہیں ملی۔

③ نسخ احکام میں ہوتا ہے خبر میں نہیں، ورنہ ہر جھوٹا شخص، جب اس کی پیشین گوئی یا گزشتہ یا موجودہ واقعے کی کوئی خبر غلط نکلے، کہہ دے گا وہ منسوخ ہو گئی، جیسے مرزا قادیانی کے مریدوں کا حال ہے۔

④ بعض آیات واحکام جنھیں باقی رکھنا مقصود نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے بھلا دیے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ﴾ [الأعلی : ٦، ۷] ''ہم ضرور تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے۔''

آیت 108 ① یہاں اگرچہ بیان نہیں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کیا سوال کیا گیا، مگر پیچھے گزر چکا ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کو

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ
اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ
خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کاش! وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں، اپنے دلوں کے حسد کی وجہ سے، اس کے بعد کہ ان کے لیے حق خوب واضح ہو چکا۔ سو تم معاف کرو اور درگزر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۰۹﴾ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو بھی نیکی تم اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے پاس پا لو گے۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۱۰﴾

کھلم کھلا دیکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ (دیکھیے بقرہ: ۵۵) اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے بھی ایسی ہی گستاخی کا رویہ اختیار کیا، چنانچہ سورۂ نساء (۱۵۳) میں ہے: ''اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارے، سو وہ تو موسیٰ سے اس سے بڑی بات کا مطالبہ کر چکے ہیں، چنانچہ انھوں نے کہا ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھلا۔'' اللہ تعالیٰ نے گستاخی پر مشتمل سوالات کے علاوہ وحی اترنے کے زمانہ میں ایسی چیزوں کے متعلق سوال سے بھی منع فرما دیا جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو ناگوار ہوں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ کی آیت (۱۰۱) اور اس کا حاشیہ۔

② گستاخانہ سوالات کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرنا قرار دیا ہے۔

آیت 109 ① كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ......: اس میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اہل کتاب شامل ہیں اور بعد میں آنے والے تمام زمانوں کے یہود و نصاریٰ بھی، جیسا کہ ہمارے دور میں ان کی طرف سے علم و تحقیق کے نام پر اسلام کے عقائد و احکام کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا ہے اور ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ مسلمان اگر یہودی یا نصرانی نہ بنیں تو کم از کم اپنے دین سے ضرور بدگمان ہو جائیں۔

② حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ......: حق کو پہچاننے کے باوجود ان کی یہ خواہش محض حسد کی وجہ سے ہے اور حسد بھی کسی دینی جذبے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے دلوں کے بغض و عناد کی وجہ سے ہے۔ اس سے حسد کی قباحت ظاہر ہوئی کہ خود بھی ایمان سے محروم رہے اور دوسروں کے پاس یہ نعمت دیکھنا بھی برداشت نہیں۔ ابلیس کا سجدے سے انکار، آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا اپنے بھائی کو قتل کرنا، برادران یوسف کا اپنے بھائی پر ظلم اور اہل کتاب کا رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود انکار اور دشمنی کا باعث یہی حسد تھا۔

③ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا ......: یعنی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ لڑائی کا حکم نہ آ جائے اس وقت تک عفو و درگزر سے کام لو، ان کے اوچھے حملوں اور حسد و بغض کی وجہ سے بے قابو نہ ہونا۔ پھر لڑائی کا حکم آنے پر بنو نضیر اور بنو قینقاع کو جلاوطن ہونا پڑا اور بنو قریظہ قتل ہوئے۔

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١١١﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪
وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّ قَالَتِ
النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١١٣﴾

اور انھوں نے کہا جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں گے یا نصاریٰ۔ یہ ان کی آرزوئیں ہی ہیں، کہہ دے لاؤ اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو ﴿١١١﴾ کیوں نہیں، جس نے اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دیا اور وہ نیکی کرنے والا ہو تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿١١٢﴾ اور یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں اور نصاریٰ نے کہا یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں، حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں نے بھی جو کچھ علم نہیں رکھتے، ان کی بات جیسی بات کہی، اب اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿١١٣﴾

آیت 111 ① آیت میں ایک لمبی بات مختصر کر دی گئی ہے، یعنی یہودیوں نے کہا جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں گے اور نصاریٰ نے کہا کہ جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو نصاریٰ ہوں گے، کیونکہ ان میں سے کوئی فریق بھی دوسرے کے جنت میں جانے کا عقیدہ نہیں رکھتا تھا۔ فرمایا، یہ ان کی آرزوئیں ہی ہیں، حقیقت سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو اپنی دلیل پیش کریں۔ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا، اس آیت سے ثابت ہوا کہ کوئی بھی دعویٰ کرنے والا، خواہ نفی کا دعویٰ کرے یا اثبات کا، اس پر دلیل اور برہان پیش کرنا لازم ہے اور یہ تقلیداً کہی ہوئی بات کے باطل ہونے کی سب سے سچی اور پکی دلیل ہے (کیونکہ تقلید نام ہی کسی بات کو بلا دلیل قبول کرنے کا ہے)۔

② اَمَانِيُّهُمْ : خبر معرفہ ہونے کی وجہ سے ترجمے میں ''ہی'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ آج کل مسلمان بھی محض آرزوؤں اور خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں، حالانکہ نام کا اسلام نہ دنیا میں عزت کا ضامن ہے نہ آخرت میں۔

آیت 112 یعنی جنت میں جانے کے لیے کسی گروہ کا فرد ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دے، چہرہ تابع ہو گیا تو پورا جسم تابع ہو گیا، پھر جو عمل کرے اسی کے لیے کرے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ عمل حسن (یعنی نیک) ہو، اس کی طرف اشارہ ''وَهُوَ مُحْسِنٌ'' کے ساتھ ہے۔ نیک عمل وہی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ پہلی شرط نہ ہو گی تو منافقت اور ریاکاری ہے، دوسری نہ ہو گی تو بدعت اور گمراہی ہے۔

آیت 113 ① تورات میں مسیح علیہ السلام کی نبوت کا ذکر موجود تھا اور یہودی اسے پڑھتے اور جانتے تھے، اسی طرح انجیل میں موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ذکر اور تورات پر عمل کا حکم موجود تھا اور نصاریٰ اسے پڑھتے اور جانتے تھے، مگر تعصب اور ضد میں

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟ یہ لوگ، ان کا حق نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۱۴﴾ اور اللہ ہی کے لیے مشرق و مغرب ہے، تو تم جس طرف رخ کرو، سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔ بے شک اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾

آ کر ہر ایک نے دوسرے کے بارے میں کہا کہ وہ سرے سے کسی بھی چیز پر نہیں۔ افسوس! مسلمان بھی جب فرقوں میں تقسیم ہوئے تو ہر ایک نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسرے فرقے کی بات قرآن و سنت کے مطابق ہے، اسے غلط اور اپنے فرقے کی بات کو غلط جانتے ہوئے بھی درست قرار دیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

② لَا يَعْلَمُوْنَ: علم سے مراد وحی کا علم ہے اور اس سے مراد مشرکین عرب ہیں جو وحی الٰہی کا کچھ علم نہیں رکھتے تھے، ان کے علاوہ وہ تمام لوگ جو آسمانی ہدایت سے بے بہرہ ہیں، اس میں شامل ہیں، مثلاً دہریے اور بت پرست وغیرہ، ان سب نے بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنے سوا سب کو سرے ہی سے غلط قرار دیا۔ فرمایا، اب ان کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔

آیت 114 ① اپنے گروہ کو حق پر اور اپنے سوا سب کو غلط قرار دینے والے یہ سب لوگ غور کریں کہ ظلم کے ناجائز ہونے پر تو سب کا اتفاق ہے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کام مشرکین مکہ نے کیا کہ مسلمانوں کو پہلے مکہ سے نکالا، پھر ان کا مکہ میں داخلہ حتیٰ کہ حج و عمرہ کے لیے آنا بند کر دیا۔ ان سے پہلے نصاریٰ کا ٹائٹس کے زمانے میں بیت المقدس پر قبضہ ہوا تو انھوں نے یہودیوں کا داخلہ بیت المقدس میں بند کر دیا، یہ کیسی حق پرستی ہے؟

② اِلَّا خَآئِفِيْنَ: یعنی ایسے ظالم لوگوں کا اللہ کی مساجد کا متولی ہونا تو درکنار، ان کا تو داخلہ بھی ڈرتے ہوئے ہونا چاہیے کہ انھوں نے کوئی شرارت کی تو سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ ان کے لیے دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچ ثابت ہوا، یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں نے اپنے کیے کی سزا پائی، کعبہ اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔ چونکہ مسجدیں اللہ کی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان میں صرف اللہ کا نام لیا جائے، اس لیے تمام مشرکین کو مسجد حرام کے قریب آنے سے روک دیا گیا، خواہ وہ بت پرست ہوں یا عزیر و مسیح پرست، کیونکہ وہ اکیلے اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ اب مسلمانوں میں وہی پہلی قوموں والے مشرکانہ عقائد و اعمال پھیل گئے اور وہ بدعمل ہو کر جہاد چھوڑ بیٹھے، تو بیت المقدس پھر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ توحید و سنت اور جہاد فی سبیل اللہ پر گامزن فرمائے اور بیت المقدس کی تولیت کا شرف عطا فرمائے۔

آیت 115 اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، بلکہ مراد خاص صورتوں میں قبلہ کی پابندی ختم کرنا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ان ظالموں کا ذکر ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتے ہیں، یعنی ان ظالموں کی اللہ کی

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾
بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور انھوں نے کہا اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۱۱۶﴾ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے ﴿۱۱۷﴾

مسجدوں سے روکنے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش اللہ تعالیٰ کی عبادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے، سو انسان کو قبلہ کی طرف رخ کرنے میں اگر کوئی دشواری ہو، دشمن کا خوف ہو یا قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جس طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے درست ہے۔ سنن ابی داوٗد " كِتَابُ صَلٰوةِ السَّفَرِ (۱۲۴۹)" میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ خالد بن سفیان کو قتل کر دیں، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مقابلے کے لیے فوج جمع کر رہا تھا۔ وہ انھیں عرنہ یا عرفات میں نظر آ گیا (جہاں عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا چہرہ کعبہ کی مخالف سمت تھا)، ادھر عصر کا وقت ہوگیا تو انھوں نے نماز فوت ہونے کے خدشے کے پیش نظر دشمن کی طرف چلتے چلتے نماز پڑھ لی، پھر جا کر اسے قتل کر دیا۔ سفر کی حالت میں نفل نماز کے متعلق اجازت ہے کہ وہ سواری پر پڑھ لی جائے، خواہ رخ کسی بھی جانب ہو۔ چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مکہ سے مدینہ کی طرف آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر (نفل) نماز پڑھتے رہتے تھے، اس کا رخ جدھر بھی ہوتا۔ فرماتے ہیں، اسی کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ [مسلم، صلوۃ المسافرین، باب جواز النافلۃ : ۷۰۰/۳۳] ﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ کا ایک معنی "حَيْثُمَا تُوَلُّوْا" (جہاں بھی تم رخ کر لو) بھی کیا گیا ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔ (طبری) اس صورت میں بھی اس کا تعلق پہلی آیت سے ہے، یعنی اگر تمھیں اللہ کی مسجدوں سے روک دیا جائے تو تم جس جگہ بھی ہو نماز پڑھ لو۔ (التسہیل)

آیت 116 اللہ کی مسجدوں سے روکنے والوں کا یہ ایک اور ظلم بیان فرمایا کہ انھوں نے کہا، اللہ نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے۔ چنانچہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، اسی طرح مشرکین عرب نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے اس کا رد فرمایا، پہلے "سُبْحٰنَهٗ" کے ساتھ کہ اولاد تو محتاجی کی دلیل ہے اور اللہ اس سے پاک ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل : ۱۱۱) دوسرے یہ کہ اللہ آسمان و زمین کا مالک ہے، جس میں عزیر، مسیح علیہما السلام اور فرشتے سب شامل ہیں۔ مالک اور مملوک باپ بیٹا کیسے ہو سکتے ہیں! بیٹا تو باپ کا مملوک بن بھی جائے تو خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بیٹا سرکشی بھی کر سکتا ہے، جب کہ آسمان و زمین میں رہنے والے سب اللہ کے فرمان کے تابع ہیں، ان کا سانس بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں چلتا۔

آیت 117 "بَدِيْعُ" بمعنی "مُبْدِعٌ" یعنی آسمان و زمین کو بغیر کسی مادے یا کسی نمونے کے پیدا کرنے والا، یہ چوتھی دلیل ہے، کیونکہ بیٹا باپ کا نمونہ ہوتا ہے، جب کہ اللہ نے ہر چیز کو نمونے کے بغیر پیدا کیا ہے۔ پانچویں دلیل کہ جس کے "كُنْ" کہنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے اسے اولاد کی کیا محتاجی ہے؟

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۱۱۸ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا
وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝۱۱۹ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى
تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝۱۲۰

اور ان لوگوں نے کہا جو نہیں جانتے ہم سے اللہ کلام کیوں نہیں کرتا؟ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ ایسے ہی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، ان کی بات جیسی بات کہی، ان کے دل ایک دوسرے جیسے ہو گئے ہیں۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو یقین کرتے ہیں ۝۱۱۸ بے شک ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور تجھ سے جہنم والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا ۝۱۱۹ اور تجھ سے یہودی ہرگز راضی نہ ہوں گے اور نہ نصاریٰ، یہاں تک کہ تو ان کی ملت کی پیروی کرے۔ کہہ دے بے شک اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تو نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آیا ہے، تو تیرے لیے اللہ سے (چھڑانے میں) نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار ۝۱۲۰

تنبیہ: بعض لوگوں نے آپ ﷺ کو اور کچھ اور لوگوں کو اللہ کے نور کا ٹکڑا قرار دیا، یہ اولاد قرار دینے سے بھی بڑا ظلم ہے، دیکھیے سورۂ اخلاص

آیت 118 اس سے مراد کفارِ عرب ہیں، جنھوں نے اپنے سے پہلے لوگوں یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح یہ مطالبہ کیا۔ مزید دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳)، فرقان (۲۱) اور سورۂ مدثر (۵۲) "تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ" یعنی ان سب کی سوچ ایک جیسی ہے اور فرمایا کہ قرآنِ کریم سے رسول اللہ ﷺ کا صدق واضح ہے، اگر یہ لوگ اہلِ یقین ہوتے تو یہی دلائل کافی تھے۔ (المنار)

آیت 118 یعنی آپ کا کام حق پہنچاتے ہوئے خوش خبری دینا اور ڈرانا ہے، آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ مسلمان کیوں نہیں ہوئے۔

آیت 120 اس آیت میں سخت وعید ہے کہ یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے بالفرض اگر رسول اللہ ﷺ بھی ان کی خواہش کے پیچھے لگ جائیں تو ان کے بچنے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ اس آیت کے مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر سمجھایا امت کو گیا ہے۔ "أَهْوَاءُ" "هَوًى" کی جمع ہے، بمعنی خواہش، یعنی اصل ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے اور وہ قرآن و سنت ہے، ان لوگوں کے پاس اصل ہدایت نہیں، صرف حسبِ خواہش بنایا ہوا دین ہے۔ بدعت کو بھی "هَوًى" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی دین میں اپنی خواہش کے مطابق بنا کر داخل کی جاتی ہے۔ جس طرح یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے

اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَ مَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ يٰبَنِىۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ ع
عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔـا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، اسے پڑھتے ہیں جیسے اسے پڑھنے کا حق ہے، یہ لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے تو وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾ اے بنی اسرائیل! میری نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر کی اور یہ کہ بلاشبہ میں نے ہی تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ﴿۱۲۲﴾ اور اس دن سے بچو جب نہ کوئی جان کسی جان کے کچھ کام آئے گی اور نہ اس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۱۲۳﴾ اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں کے ساتھ آزمایا

ان کی اہواء و بدعات کی پیروی باعث ہلاکت ہے، اسی طرح کسی بھی بدعتی طبقے کو خوش کرنے کے لیے ان کی اہواء و بدعات کی پیروی بھی باعث ہلاکت ہے۔

آیت 121 اہل کتاب کے اعمالِ بد کا ذکر کرنے کے بعد اب ان میں سے نیک اور اللہ سے ڈرنے والے لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ وہ کتاب کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اسے پڑھنے کا حق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اس کی ہم معنی آیات دیکھیے سورۂ قصص (۵۲ تا ۵۴) میں۔ مراد اس سے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حقِ تلاوت یہ ہے کہ اس میں تحریف نہ کی جائے، اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ قرآن کی تلاوت کا حق بھی یہی ہے۔ بعض لوگ حق سے مراد حروف کو ان کے مخارج سے ادا کرنا لیتے ہیں، مگر یہ کافی نہیں۔

آیت 123،122 بنی اسرائیل سے خطاب کی ابتدا اللہ کی نعمتیں یاد دلانے اور قیامت اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرانے سے ہوئی۔ مسلسل چوراسی (۸۴) آیات میں ان پر اللہ کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ ان کی نافرمانیوں کا ذکر بھی فرمایا گیا۔ آخر میں دوبارہ انھیں اللہ کی نعمتیں یاد دلائی گئیں اور آخرت کے دن سے ڈرایا گیا اور متنبہ کیا گیا کہ اوپر بیان کی ہوئی بدکرداریوں کی وجہ سے تم ظالم ٹھہرے، سو اب امامت و قیادت بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل ہو رہی ہے، جن میں ایک پیغمبر مبعوث کرنے کی دعا ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے وقت کی تھی۔ ان آیات اور پچھلی تمام آیات کا مقصود اہل کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کرنے پر ابھارنا ہے۔

آیت 124 ① بِكَلِمٰتٍ : بعض مفسرین نے ان باتوں سے مراد والد، قوم اور بادشاہ کو توحید کی دعوت، بت پرستی، ستارہ پرستی اور شاہ پرستی کی تردید، آگ میں پھینکے جانے پر صبر، پھر ہجرت، مصر کے جبار بادشاہ کی دست درازی کے باوجود استقامت، بیوی بچے

لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۲۴ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵

تو اس نے انھیں پورا کر دیا۔ فرمایا بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ کہا اور میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا ۝۱۲۴ اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے لوٹ کر آنے کی جگہ اور سراسر امن بنایا، اور تم ابراہیم کی جائے قیام کو نماز کی جگہ بناؤ۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکیدی حکم دیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو ۝۱۲۵

کو وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑنا اور اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے پر مکمل آمادگی کو لیا ہے۔ بعض نے آگے آنے والی آیات میں مذکور بیت اللہ کی تعمیر و تطہیر اور حج کے مناسک اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ''اَسْلِمْ '' (فرماں بردار ہو جا) پر فرماں بردار ہونے کے اقرار، پھر اس کے عملی ثبوت کو مراد لیا ہے۔ [ابن أبی شیبة عن مجاھد] تفسیر عبد الرزاق میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش طہارت کے احکام کے ساتھ کی، جن میں سے پانچ سر سے متعلق اور پانچ باقی جسم سے متعلق تھے۔ سر سے متعلق مونچھیں کترنا، کلی کرنا، ناک کی پانی سے صفائی کرنا، مسواک کرنا، سر کی مانگ نکالنا تھا اور جسم سے متعلق ناخن کاٹنا، زیر ناف بال مونڈنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال اکھیڑنا اور پیشاب و پاخانے کے نشان کو پانی سے دھونا تھا۔ صحیح بخاری (۵۸۸۹)، مسلم (۲۵۷) اور ابوداؤد (۴۱۹۸) وغیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان امور کو فطرت میں سے شمار فرمایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش میں یہ سب چیزیں شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں جو بھی حکم دیا انھوں نے وہ پورا کر دکھایا، بڑھاپے میں بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تو پورا کر دیا، اسّی (۸۰) سال کی عمر میں اپنا ختنہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ بھی کر دیا۔

[بخاری، الاستئذان، باب الختان بعد الکبر ...... : ۶۲۹۷]

② قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ...... : جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو تمام لوگوں کا امام بنا دیا تو انھوں نے اپنی بعض اولاد کے حق میں امامت کی دعا کی، سب کے حق میں نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، تو یہ دعا کیوں کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، مگر اس کے ساتھ ہی انھیں بتا دیا کہ تمھاری اولاد میں سے ظالم لوگ اس نعمت سے سرفراز نہیں ہوں گے۔ اس سے بنی اسرائیل کے گمراہ لوگوں اور بنی اسماعیل کے مشرکین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ان کے عقائد و اعمال خراب ہو چکے ہیں، محض ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونا کافی نہیں۔

آیت 125 ① مَثَابَةً : یہ '' ثَابَ یَثُوْبُ '' (لوٹنا) سے ظرف ہے، یعنی ''لوٹ کر آنے کی جگہ'' لوگ بار بار اللہ کے گھر کی طرف لوٹ کر آتے ہیں، کبھی ان کا دل نہیں بھرتا۔ دیکھیے سورۂ حج (۲۷) اور سورۂ ابراہیم (۳۷) دوسری خصوصیت یہ کہ اسے سراسر امن والی جگہ بنا دیا، جاہلیت میں بھی آدمی اپنے دشمن کو دیکھتا مگر اسے کچھ نہ کہتا۔ اسلام نے اس احترام کو باقی رکھا، بلکہ

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! اس (جگہ) کو ایک امن والا شہر بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے، جو ان میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔ فرمایا اور جس نے کفر کیا تو میں اسے بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے آگ کے عذاب کی طرف بے بس کروں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۱۲۶﴾

اس میں تاکید اور اضافہ کیا۔

② مقامِ ابراہیم علیہ السلام کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا۔ صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کے واقعہ میں جابر رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم طواف سے فارغ ہوئے تو مقامِ ابراہیم کی طرف آئے اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى﴾ [البقرۃ : ۱۲۵] پھر مقامِ ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کر کے دو رکعتیں پڑھیں۔ [مسلم، الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ۱۲۱۸] جیسا کہ حاجی لوگ پڑھتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ مقامِ ابراہیم کے پاس نماز پڑھنے کا مشورہ عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا جس کی موافقت اللہ تعالیٰ نے فرمائی۔ [بخاری، الصلوۃ، باب ما جاء فی القبلۃ ...... : ۴۰۲] عمر رضی اللہ عنہ کی موافقات کی تعداد اٹھارہ ہے۔

دوسرا قول تفسیر عبد الرزاق میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد مقامِ حج ہے، یعنی حرم اور عرفات جہاں ابراہیم علیہ السلام نے حج میں قیام کیا۔ چنانچہ اہلِ علم فرماتے ہیں کہ طواف کی دو رکعتیں حرم میں جہاں بھی پڑھ لے درست ہے۔

③ طَهِّرَا بَيْتِيَ ...... : طہارت سے مراد کوڑا کرکٹ سے صفائی ہی نہیں، بلکہ بت پرستی اور شرک کی تمام نجاستوں سے بھی صفائی ہے، کیونکہ طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ اللہ کے سوا کسی کا حق نہیں۔ مشرکینِ مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تمھارے باپ کو کیا حکم دیا گیا تھا اور تم نے عین کعبہ میں بت لا کر کیسی فرماں برداری کی۔

آیت 126 ① اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی قبول فرمائی اور مکہ معظمہ کو امن والا شہر بنا دیا۔ اب حرم کی حدود میں کسی کا خون بہانا، اس کے درختوں کو کاٹنا، شکار کو بھگانا وغیرہ جائز نہیں اور رزق کی وہ فراوانی فرمائی کہ مکہ میں کھیتی باڑی نہ ہونے کے باوجود وہاں سارا سال دنیا بھر کے تازہ پھل اور ہر قسم کا غلہ اتنی فراوانی سے ملتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت آنکھوں سے نظر آتی ہے۔

② اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لیے امامت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا، اب ابراہیم علیہ السلام نے رزق کی دعا ظالموں کو نکال کر صرف ایمان والوں کے لیے کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا، میں دنیاوی رزق کفار

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

اور جب ابراہیم اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہا تھا اور اسماعیل بھی۔ اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما، بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے دکھا اور ہماری توبہ قبول فرما، بے شک تو ہی نہایت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اے ہمارے رب! اور ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انھیں کتاب و حکمت سکھائے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

کو بھی دوں گا، البتہ آخرت میں ان کے لیے عذاب ہے۔ معلوم ہوا دنیا میں کسی کے پاس رزق کی کثرت اس پر اللہ تعالیٰ کے خوش اور راضی ہونے کی دلیل نہیں۔

آیت 127 "اَلْقَوَاعِدَ" بنیادیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یعنی بیت اللہ کی وہ بنیادیں جو اس سے پہلے موجود تھیں۔ [تفسیر عبد الرزاق بسند صحیح] اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ پہلے تعمیر ہو چکا تھا، اب از سر نو اس کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ سورۂ حج (۲۶) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین فرمائی۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۶) اس کے بعد بیت اللہ کئی دفعہ تعمیر ہوا۔ جاہلیت میں جب سیلاب سے کعبہ منہدم ہوگیا تو قریش نے دوبارہ اس کی تعمیر کی، مگر مال کی کمی کی وجہ سے اس کا کچھ حصہ باہر چھوڑ دیا، جسے حطیم کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے لیے پتھر اٹھا کر لاتے رہے۔ ابن اسحاق کے مطابق آپ کی عمر اس وقت ۳۵ سال تھی، پھر آپ ہی نے قریش کے جھگڑے میں حجر اسود کا فیصلہ فرمایا اور اسے اس کے مقام پر اپنے دست مبارک سے رکھا۔ دور اسلام میں پہلی مرتبہ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اسے ابراہیم علیہ السلام والی بنیادوں پر تعمیر کیا، اس کے بعد عبد الملک کے دورِ خلافت میں حجاج بن یوسف نے اسے گرا کر دوبارہ اسی طرح بنا دیا جس طرح جاہلیت میں بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد مختلف بادشاہ اسی عمارت کی مرمت و تزئین کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کعبہ کو حبشیوں میں سے ایک پتلی پنڈلیوں والا برباد کرے گا۔" [بخاری، الحج، باب قول الله تعالی : ﴿ جعل الله الكعبة …… ﴾ : ۱۵۹۱۔ مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة …… : ۲۹۰۹/۵۸]

آیت 129 یہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا خاتمہ ہے۔ "رَسُوْلًا" سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کیونکہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا نبی نہیں ہوا۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عرض کیا کہ آپ ہمیں اپنے متعلق بتائیں،

وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

اور کون ہے جو ابراہیم کی ملت سے بے رغبتی کرے گا، سوائے اس کے جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا لیا، اور بے شک ہم نے اسے دنیا میں چن لیا اور بلاشبہ وہ آخرت میں یقیناً صالح لوگوں سے ہے ﴿۱۳۰﴾ جب اس سے اس کے رب نے کہا فرماں بردار ہو جا، اس نے کہا میں جہانوں کے رب کے لیے فرماں بردار ہو گیا ﴿۱۳۱﴾

تو آپ نے فرمایا: ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور میری والدہ کو جب میرا حمل ٹھہرا تو انھوں نے دیکھا کہ ان (کے بدن) سے ایک نور نکلا جس سے بصریٰ روشن ہو گیا اور بصریٰ شام کی سرزمین سے ہے۔'' (مستدرک: ۲/۶۰۱، ح: ۴۱۷۶) اسے امام حاکم نے روایت کیا اور امام ذہبی نے صحیح کہنے میں ان کی موافقت کی۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا۔ (سلسلہ صحیحہ: ۱۵۴۵) شام کی تخصیص اس لیے ہے کہ آخر زمانہ میں شام ہی اسلام کا مرکز بنے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی شام میں ہو گا اور حدیث میں جس گروہ کے قیامت تک حق پر رہنے کی خبر دی گئی ہے وہ بھی شام میں ہو گا۔ ابن کثیر میں صحیح بخاری کے حوالے سے ہے: « وَهُمْ بِالشَّامِ » ''وہ شام میں ہوں گے۔'' (بخاری: ۳۶۴۱، ۷۴۶۰) '' الْكِتٰبَ '' سے مراد قرآن مجید اور '' الْحِكْمَةَ '' سے مراد حدیث پاک ہے اور اسلام کے بنیادی اصول یہی دو ہیں۔ پاک کرنے سے مراد شرک اور گناہوں سے پاک کرے اور اطاعت و اخلاص کی تعلیم دے۔ '' اِنَّكَ اَنْتَ '' ضمیر مکرر لانے کے علاوہ '' الْعَزِیْزُ '' پر الف لام سے دوہرا حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ''تو ہی'' ترجمہ کیا گیا۔

آیت 130 ① '' رَغِبَ یَرْغَبُ '' کے بعد اگر '' فِیْ '' آئے تو اس کا معنی کسی چیز میں رغبت رکھنا اور اگر '' عَنْ '' آئے تو اس کا معنی بے رغبتی ہوتا ہے۔

② '' مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ '' کی وضاحت اگلی آیات میں آ رہی ہے، یعنی ایک اللہ کی عبادت اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے تابع فرمان کر دینا۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید ہے کہ وہ تینوں ملت ابراہیم کے دعوے دار تھے، مگر عملاً اس سے بالکل بے رغبت، بلکہ شدید مخالف تھے، انھوں نے اس میں شرک و بدعت کو شامل کر کے اپنا الگ الگ طریقہ بنا لیا تھا۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا رکھا تھا، نصرانی تین خدا مانتے تھے، صلیب کی پرستش اس پر مزید تھی اور مشرکین عرب نے بت پرستی اختیار کر لی تھی۔ یہود و نصاریٰ کی کچھ بدعات و خرافات کا آئندہ آیات میں ذکر آ رہا ہے۔

③ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ : بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چن لیا اور جو آخرت میں صالحین میں شامل ہوں گے، وہی شخص بے رغبتی کرے گا جو عقل کو جواب دے کر اپنے آپ کو بے وقوف بنا لے۔

آیت 131 '' اَسْلَمَ یُسْلِمُ '' کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا اور وہی کرنا جو وہ کہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لیے اپنے مسلم ہونے کا اقرار کیا اور وجہ بھی ذکر فرمائی کہ رب العالمین ہونے کی وجہ سے یہ حق اسی کا ہے۔

وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ
مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ
وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ
عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور اسی کی وصیت ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو کی اور یعقوب نے بھی۔ اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ دین چن لیا ہے، تو تم ہرگز فوت نہ ہونا مگر اس حال میں کہ تم فرماں بردار ہو ﴿۱۳۲﴾ یا تم موجود تھے جب یعقوب کو موت پیش آئی، جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا میرے بعد کس چیز کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے، جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے لیے فرماں بردار ہیں ﴿۱۳۳﴾ یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۳۴﴾

آیت 132 "الدِّیْنَ" سے مراد یہاں اسلام ہے، کیونکہ پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے اسی دین کو اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ مسلم ہونے کی حالت میں فوت ہونا اسی وقت ممکن ہے جب بندہ ہر وقت مسلم، یعنی تابع فرمان رہے، کبھی کوتاہی ہو تو فوراً توبہ کرے، کیونکہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو اپنے اور اپنی اولاد سے متعلق آخری وقت مسلم ہونے کی بہت فکر رہتی تھی، کیونکہ اعمال کا دارو مدار خاتمہ پر ہے، حدیث ہے: ((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ)) [بخاری، القدر، باب العمل بالخواتیم : ۶۶۰۷] یوسف علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴾ [یوسف : ۱۰۱] "مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔" اگرچہ آخر وقت مسلمان ہونا بندے کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو آدمی دلی لگاؤ کے ساتھ نیک و بد جو بھی راستہ اختیار کرتا ہے اور اس پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اسی کی توفیق دے دی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ لیل (۵ تا ۱۰)۔

آیت 132 ان آیات میں بھی یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ مکہ کی تردید ہے جو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ان کا دین بھی یہودیت، نصرانیت یا بت پرستی تھا۔ قرآن مجید نے بتایا کہ تم ان بزرگوں پر بہتان باندھ رہے ہو، ان کا دین بھی یہی اسلام تھا جس میں توحید اور اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے۔

آیت 134 یہود کو تنبیہ ہے کہ وہ انبیاء اور صلحاء کی طرف اپنی نسبت پر مغرور نہ ہوں، یہ نسبت تمھارے کچھ کام نہ آ سکے گی، بلکہ نجات کا دارو مدار انسان کے اپنے اعمال پر ہے، ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے اور تمھارے اعمال تمھارے ساتھ ہوں گے۔

وَ قَالُوۡا كُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۳۵﴾

اور انھوں نے کہا یہودی ہو جاؤ، یا نصرانی ہدایت پا جاؤ گے، کہہ دے بلکہ (ہم) ابراہیم کی ملت (کی پیروی کریں گے) جو ایک اللہ کا ہونے والا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۳۵﴾

آیت 135 ① اہلِ کتاب مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دیتے اور ہدایت کو اپنے دین میں منحصر مانتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن صوریا (یہودی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، ہدایت صرف وہ ہے جس پر ہم ہیں، اس لیے آپ ہماری پیروی کریں تو ہدایت پا جائیں گے اور نصرانیوں نے بھی ایسے ہی کہا، اس پر یہ آیت اتری۔ (ابن کثیر بسند حسن) یعنی آپ کہہ دیں ہم تو ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کریں گے، جو حنیف اور مسلم تھے، یعنی تمام گروہوں اور آباء و اجداد کے طریقوں سے ہٹ کر ایک اللہ کی طرف ہو کر پوری طرح اس کے تابع فرمان تھے اور مشرک نہ تھے۔ ان کا دین حق پر ہونا تم بھی مانتے ہو۔ تمھارا حال یہ ہے کہ تم ایک طرف شرک میں گرفتار ہو کہ عزیر اور مسیح علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کے بیٹے مانتے ہو، کبھی تین خدا مانتے ہو، کبھی صلیب کی پوجا کرتے ہو۔ دوسری طرف تم وحی الٰہی کی پیروی کے بجائے احبار و رہبان کی تقلید میں گرفتار ہو کر فرقوں میں بٹے ہوئے ہو۔ تم ہدایت پر ہونے کا دعویٰ کس منہ سے کرتے ہو؟ افسوس! اب مسلمانوں کی اکثریت کا بھی یہی حال ہے کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے ملت حنفی کو ترک کر کے چند رسوم و بدعات، خرافات اور شرکیہ اعمال کی پابندی کو دینِ ہدایت سمجھ رکھا تھا، اسی طرح انھوں نے بھی قرآن و سنت کو ترک کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مدتوں بعد آنے والے بزرگوں کی تقلید کو، جو نبی بھی نہیں تھے، واجب قرار دیا۔ اللہ کے بجائے غیر اللہ سے مانگنے کو، حج کے بجائے بزرگوں کے مقبروں پر جانے کو اور نماز، روزہ، زکوٰۃ ترک کر کے خود ساختہ اوراد و وظائف اور چلہ کشی کو اللہ کے قرب کا ذریعہ قرار دیا، اگر کوئی توحید اور قرآن و سنت کی دعوت دے تو اسے بے دین اور گمراہ قرار دیا۔

② اسلام دراصل عقائد اور اصول کے مجموعے کا نام ہے، یعنی توحید کا عقیدہ اور وحیٔ الٰہی کا اتباع۔ دین اور ملت سے بھی یہی مراد ہے۔ تمام انبیاء ایک ہی دین و ملت یعنی اسلام کے پیروکار تھے، اگر کچھ اختلاف ہے تو بعض احکام میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَ دِيْنُهُمْ وَاحِدٌ » ''تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں، ان کی مائیں (یعنی شریعتیں) مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔'' [بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول اللہ تعالٰی ﴿ واذكر ...... ﴾ : ۳۴۴۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] اس لحاظ سے دین محمدی بھی ملت ابراہیم ہی ہے، یہودیت اور نصرانیت ملتِ ابراہیم سے خارج ہیں، کیونکہ وہ توحید الٰہی کے بجائے شرک میں اور وحیٔ الٰہی کی پیروی کے بجائے تقلید یعنی احبار و رہبان کی پیروی میں گرفتار ہو گئے اور تورات و انجیل پر عمل چھوڑ بیٹھے، اگر وہ واقعی مسلم ہوتے تو تورات اور انجیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات موجود ہونے کی وجہ سے آپ پر ایمان لے آتے۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۶۴ تا ۶۸)۔

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَ مَاۤ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ٘ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۳۷﴾ؕ

کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو تمام نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۱۳۶﴾ پھر اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے اور اگر پھر جائیں تو وہ محض ایک مخالفت میں (پڑے ہوئے) ہیں، پس عنقریب اللہ تجھے ان سے کافی ہو جائے گا اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۳۷﴾

آیت 136 ① وَالْاَسْبَاطِ: یہ ”سِبْطٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی آسانی سے پھیلنا ہے۔ اولاد کی اولاد کو بھی اسی پھیلاؤ کی وجہ سے ”سِبْطٌ“ کہتے ہیں۔ (مفردات) یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، ان کی اولاد کے بارہ قبائل ”اَلْاَسْبَاطِ“ کہلاتے ہیں۔ ”اَلْاَسْبَاطِ“ پر الف لام کی وجہ سے ”اس کی اولاد“ اور ”وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ“ میں ”لَهٗ“ پہلے آنے کی وجہ سے ”ہم اسی کے فرماں بردار ہیں“ ترجمہ کیا گیا ہے۔

② اس آیت میں مسلمانوں کو اصل ہدایت اور ایمان کی تعلیم دی گئی ہے، یعنی قرآن پاک سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں اور جتنے انبیاء و رسل آئے، جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض کے نہیں آئے، سب پر مجملاً ایمان لایا جائے کہ وہ سب حق ہیں۔ ان کے درمیان فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جیسے یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور نصرانیوں نے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ تفصیلی ایمان صرف قرآن پر ضروری ہے، یعنی اس کے ہر حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا، کیونکہ ① قرآن پاک آنے سے پہلی تمام کتابیں منسوخ ہو گئیں۔ ② پہلے تمام پیغمبر خصوصاً اپنی قوم کی طرف آتے تھے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)۔ ③ پھر پہلی کوئی آسمانی کتاب محفوظ نہیں رہی، بلکہ ان میں تحریف ہو گئی، جب کہ قرآن مجید ہر طرح سے محفوظ ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب تورات عبرانی میں پڑھتے، پھر اہلِ اسلام کے لیے عربی میں اس کی تفسیر کرتے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اہلِ کتاب کو نہ سچا کہو اور نہ انھیں جھوٹا کہو، بلکہ یوں کہو: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا ﴾ [البقرة : ۱۳۶]“ [بخاری، التفسیر، باب ﴿ قولوا آمنا باللہ ...... ﴾ : ۴۴۸۵]

آیت 137 ① شِقَاقٍ: یہ ”شِقٌّ“ میں سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، یعنی بعض کا ایک شق میں اور بعض کا دوسری شق میں ہو کر مقابلے میں آ جانا۔

② یعنی یہ لوگ ان چیزوں پر ایمان لائیں جن پر تم ایمان لائے ہو، جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہے، تو واقعی وہ ہدایت یافتہ

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ
وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ
تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ
نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا

اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور رنگ میں اللہ سے بہتر کون ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں ﴿۱۳۸﴾ کہہ دے کیا
تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ وہی ہمارا رب اور تمھارا رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال
ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال اور ہم اسی کے لیے خالص کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ یا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور
اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی تھے یا عیسائی؟ کہہ دے کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ؟ اور
اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے وہ شہادت چھپالی جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے تھی اور اللہ ہرگز اس سے

ہوں گے اور اگر وہ منہ موڑیں تو محض مخالفت اور ضد کی وجہ سے ایسا کریں گے۔

③ اس وعدے کے مطابق واقعی اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے کافی ہو گیا، بنونضیر اور بنو قینقاع مدینہ سے نکالے گئے، بنو قریظہ قتل ہوئے اور بالآخر تمام یہود و نصاریٰ پورے جزیرۂ عرب سے جلا وطن کر دیے گئے۔

آیت 138 ① "صِبْغَةَ اللّٰهِ" اس پر نصب فعل امر "اِلْزَمُوْا" کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے، یعنی اللہ کا رنگ اختیار کرو اور مضارع "نَلْتَزِمُ" کے ساتھ بھی، یعنی ہم اللہ کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔

② اس آیت میں ''اللہ کے رنگ'' سے مراد دین اسلام یا وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کو "صِبْغَةَ اللّٰهِ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نصاریٰ نے نصرانیت کے لیے ایک زرد رنگ کا پانی مقرر کر رکھا تھا، جب کوئی بچہ پیدا ہوتا یا کوئی شخص ان کے دین میں داخل ہوتا تو اس کو اس پانی سے غسل دیتے اور کہتے کہ یہ اب پاک اور صحیح معنوں میں نصرانی ہوا ہے۔ اس رسم کا نام ان کے ہاں معمودیہ یا بپتسما دینا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ سب سے بہتر رنگ ''اللہ کا رنگ'' یعنی دین اسلام ہے، جسے نوح علیہ السلام سے لے کر تمام انبیاء علیہم السلام لے کر مبعوث ہوئے ہیں، تمھیں چاہیے کہ اس کی پابندی کرو۔

آیت 139 یہود مسلمانوں سے جھگڑتے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہوئے ہیں، پھر یہ آخری نبی عرب سے کیسے مبعوث ہو گئے؟ ہمارا دین سب سے بہتر اور تمام انبیاء کا دین ہے، تو اس آیت میں ان کی تردید فرمائی گئی ہے کہ ہمارا تمھارا سب کا رب ایک ہے اور ہم عبادت میں مخلص بھی ہیں، پھر تمھارا یہ کہنا کہ ہم بہتر ہیں، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

آیت 140 یہودیت اپنے موجودہ نظریات و عقائد کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد اور نصرانیت اپنے مخصوص نظریات و

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ
وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے وہ جو تم نے کمایا اور تم سے اس کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴۱﴾

عقائد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد وجود میں آئی۔ یہود و نصاریٰ کے عالم لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد اس یہودیت و نصرانیت سے، بلکہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے بھی بہت پہلے ہو گزرے ہیں، مگر یہود و نصاریٰ کے ان علماء نے عوام کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی تھی کہ یہ تمام انبیاء یہود کے قول کے مطابق یہودی تھے اور نصاریٰ کے قول کے مطابق نصرانی تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے علمائے یہود و نصاریٰ کی اس بددیانتی کو ظاہر فرمایا ہے اور شہادت چھپانے کے مجرم قرار دے کر سب سے بڑے ظالم قرار دیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے اس فعل کی مثال امتِ مسلمہ میں ایسے ہے جیسے کوئی مسلم عالم عوام کو یہ باور کروائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقہ حنفی یا فقہ شافعی کے مطابق فیصلے فرماتے تھے، حالانکہ اسے خوب معلوم ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت بعد پیدا ہوئے اور وہ نبی بھی نہیں تھے کہ ان کی بات حجت ہو۔

آیت 141 اس آیت میں دوبارہ تنبیہ فرمائی کہ نجات کا تعلق تو اپنی کمائی اور اپنے عمل پر ہے، اگر نجات چاہتے ہو تو ان انبیاء و صالحین کی طرح خود عمل کرو، ورنہ محض ان کی طرف نسبت اور ان کی کرامتیں بیان کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ » [مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل الاجتماع ...... : ۲۶۹۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ''جس کے عمل نے اسے پیچھے رکھا اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔''

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ

عنقریب لوگوں میں سے بے وقوف کہیں گے کس چیز نے انھیں ان کے اس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ کہہ دے اللہ ہی کے لیے مشرق و مغرب ہے، وہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے﴿۱۴۲﴾ اور اسی طرح ہم نے تمھیں سب سے بہتر امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر شہادت دینے والا بنے اور ہم نے وہ قبلہ جس پر تو تھا، مقرر نہیں کیا تھا مگر اس لیے کہ ہم جان لیں کون اس رسول کی پیروی کرتا ہے، اس سے

آیت 142 ① براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر آپ کو بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا۔ [بخاري، أخبار الآحاد، باب ما جاء في إجازة ...... : ۷۲۵۲]

② اس پر یہود، منافقین اور مشرکین سبھی نے اعتراضات شروع کر دیے کہ اگر وہ پہلا قبلہ درست تھا تو اسے بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر یہ درست ہے تو اتنی دیر بیت المقدس قبلہ کیوں رہا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ لوگ بے وقوفی کی وجہ سے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں، مشرق یا مغرب کی اپنی کچھ حیثیت نہیں کہ ان کی طرف منہ کرنا باعث ثواب ہو، بلکہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرماں برداری ہے، کیونکہ مشرق و مغرب دونوں کا مالک وہی ہے۔ وہ جب چاہے، جدھر چاہے منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے سکتا ہے۔ تمھارا کام حکم ماننا ہے، کیونکہ صراط مستقیم وہی ہے جس کا وہ حکم دے، مگر اس پر چلنے کی توفیق وہ جسے چاہے دیتا ہے، جو توفیق سے محروم ہیں وہ بے وقوفی سے بے کار باتیں بناتے رہتے ہیں، اس آیت: ﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ...... ﴾ [البقرة : ۱۷۷] میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔

آیت 143 ① وسط کا معنی درمیان ہے، افضل چیز کو بھی وسط کہہ لیتے ہیں، کیونکہ درمیانی چیز سب سے بہتر ہوتی ہے۔ یہاں مراد سب سے بہتر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ [آل عمران : ۱۱۰] ''تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی۔'' کیونکہ دو نقطوں کے درمیان سب سے مختصر اور صحیح خط مستقیم ہی ہوتا ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا معنی یہاں ''عدل'' روایت کیا ہے۔ [بخاري، التفسير : ٤٤٨٧] عدل کا معنی ثقہ اور قابل اعتماد بھی ہے، اعتقاد و اخلاق اور اعمال میں معتدل اور پہلی امتوں کی افراط و تفریط سے پاک بھی۔ نہ یہاں یہود کی سختی ہے نہ نصاریٰ کی نرمی۔ (کبیر، قرطبی)

② وَكَذٰلِكَ ...... : یعنی جس طرح یہ دو باتیں تمھارے پاس پوری ہیں اور تمھارے مخالفوں کے پاس ناقص، ایک یہ کہ تم تمام انبیاء کو مانتے ہو اور یہود و نصاریٰ کسی کو مانتے ہیں کسی کو نہیں، دوسری یہ کہ تمھارا قبلہ کعبہ ہے، جو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے مقرر

اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡہِ ؕ وَ اِنۡ کَانَتۡ لَکَبِیۡرَۃً اِلَّا عَلَی الَّذِیۡنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۴۳﴾

(جدا کر کے) جو اپنی دونوں ایڑیوں پر پھر جاتا ہے اور بلاشبہ یہ بات یقیناً بہت بڑی تھی مگر ان لوگوں پر جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر یقیناً بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴۳﴾

ہے اور ابراہیم علیہ السلام سب کے پیشوا ہیں، یہود و نصاریٰ اور ان کے قبلے بعد کی بات ہیں۔ اسی طرح ہم نے تمھیں ہر کام میں افضل امت بنا دیا ہے۔ اس لیے اب تمھارا کام ہے کہ تم دوسروں کی راہنمائی کرو، ان کا کام نہیں کہ تمھاری راہنمائی کریں۔ (موضح)

③ لِتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ...... : اس سے تین طرح کی شہادت مراد ہے، پہلی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہادت دیں گے کہ انھوں نے صحابہ تک پیغام حق پہنچا دیا، صحابہ تابعین پر اور اسی طرح امت کا ہر طبقہ آنے والوں پر یہ شہادت دے گا۔ اس امت کے افضل ہونے کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ آل عمران (۱۱۰) میں فرمایا: ﴿ کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ ﴾، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا: ''اے لوگو! تم اللہ کے سامنے ننگے پاؤں، ننگے جسم اور بغیر ختنہ کے اکٹھے کیے جانے والے ہو۔'' پھر فرمایا: ''اور میری امت کے کچھ لوگوں کو بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا، پروردگارا! یہ تو میرے ساتھی ہیں، تو کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے انھوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا۔ تو میں کہوں گا جیسے صالح بندے (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا تھا: ﴿ وَ کُنۡتُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَ اَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ﴾ [المائدۃ : ۱۱۷] ''اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و کنت علیهم شهیدًا ...... ﴾ : ٤٦٢٥] یہی بات جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھی: ''کیا میں نے (اللہ تعالیٰ کا) پیغام (آپ لوگوں تک) پہنچا دیا؟'' تو سب نے کہا: ''بے شک آپ نے پہنچا دیا۔'' [بخاری، الحج، باب الخطبة أیام منی : ۱۷٤۱]

اب ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ یہ پیغام آنے والوں تک پہنچائے، تبھی وہ ان پر شہادت دے سکے گا اور تبھی وہ امت وسط کہلانے کا حق دار ہو گا اور جو امت مسلمہ کی تمام گمراہی دیکھ کر بھی خاموش رہے گا وہ نہ گواہی دے سکے گا اور نہ امت وسط کا مصداق ہو گا۔ دوسری وہ شہادت ہے جو امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے خبر دینے کی بنا پر پہلی تمام امتوں پر دے گی کہ ان کے انبیاء نے اللہ کے احکام ان تک پہنچا دیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نوح علیہ السلام اور ان کی امت آئے گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تم نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ عرض کریں گے، ہاں اے میرے رب! پھر ان کی امت کو فرمائے گا، کیا انھوں نے تمھیں پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ کہیں گے، نہیں! ہمارے پاس تو کوئی نبی آیا ہی نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نوح (علیہ السلام) سے فرمائے گا،

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

یقیناً ہم تیرے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، تو یقیناً ہم تجھے اس قبلے کی طرف ضرور پھیر دیں گے جسے تو پسند کرتا ہے، سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور تم جہاں بھی ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو

تمھاری شہادت کون دے گا؟ وہ عرض کریں گے، محمد (ﷺ) اور ان کی امت، پھر ہم شہادت دیں گے کہ یقیناً انھوں نے پیغام پہنچا دیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ ولقد أرسلنا ...... ﴾ : ۳۳۳۹، ۴۴۸۷، عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ]

تیسری شہادت دنیا ہی میں مسلمانوں کی کسی کے حق میں نیک یا بد ہونے کی شہادت ہے، جس کی بنا پر نبی ﷺ نے ایک جنازے کے لیے جنت اور دوسرے کے لیے جہنم واجب ہونے کا اعلان فرمایا اور فرمایا: « أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ » ”تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔“ [بخاری، الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت : ۱۳۶۷]

④ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ ...... : یہ تحویلِ قبلہ کی ایک حکمت بیان فرمائی ہے۔ قریش کو بطور قبلہ بیت اللہ عزیز تھا اور اہلِ کتاب کو بیت المقدس۔ پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کر کے قریش اور ان کے ساتھیوں کی آزمائش ہوئی، پھر بیت اللہ کو مقرر کر کے اہل کتاب کی۔ اپنے محبوب قبلہ کو نبی ﷺ کی فرماں برداری میں ترک کرنا ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا دوسروں کے لیے نہایت مشکل تھا، اس لیے جنھیں یہ ہدایت نصیب نہ تھی وہ ڈگمگا گئے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے جس قبلے کی طرف آپ رخ کرتے تھے وہ بھی اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا تھا، اگرچہ قرآنِ مجید میں اس حکم کا ذکر نہیں ہے۔ یہ دلیل ہے کہ آپ ﷺ پر قرآن مجید کے علاوہ بھی احکام نازل ہوتے تھے، جنھیں وحیٔ خفی یا حدیث کہا جاتا ہے اور انھیں ماننا بھی قرآن کی طرح فرض ہے۔

⑤ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ : براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تحویل قبلہ سے قبل کئی آدمی پہلے قبلے کے زمانے میں قتل ہو کر فوت ہو چکے تھے، ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ ہم ان کے متعلق کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ ”اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔“ یعنی تمھاری پہلی نمازیں اللہ کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ [بخاری، الإیمان، باب الصلاۃ من الإیمان : ۴۰] اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو ایمان قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ صرف دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کو ایمان قرار دیتے ہیں ان کی بات درست نہیں، بلکہ اعمال بھی ایمان کا جزو ہیں اور نماز اور زکوٰۃ تو ایسا جزو ہیں جن کے بغیر بندہ اسلامی برادری ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ کا حصہ ہی نہیں بنتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ﴾ [التوبۃ : ۱۱] ”پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔“ اور جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ » [مسلم، الإیمان، باب بیان إطلاق اسم ...... : ۸۲] ”آدمی کے درمیان اور شرک و کفر کے درمیان (فرق) نماز کا چھوڑنا ہے۔“

آیت 144 ① فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : یہ قبلہ بدلنے کا اصل حکم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی ہے یقیناً جانتے ہیں کہ بے شک ان کے رب کی طرف سے یہی حق ہے اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو وہ کر رہے ہیں ﴿۱۴۴﴾

قرآن میں پہلا نسخ قبلے کا ہے۔ [ابن أبي حاتم عن ابن أبي طلحة، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما] براء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے سولہ یا سترہ ماہ نماز پڑھی اور آپ کو پسند یہ تھا کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ ہو اور آپ نے پہلی نماز (بیت اللہ کی طرف) عصر کی نماز پڑھی۔ [بخاري، التفسير، باب قوله تعالى : ﴿ سيقول السفهاء …… ﴾ : ٤٤٨٦]
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کا قبلہ ہونا اس قدر پسند تھا کہ قبلہ بدلنے کی امید میں بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ واضح رہے کہ بیت المقدس شام میں ہے اور یہ مدینہ سے شمال کی طرف ہے اور بیت اللہ اس کے بالکل مخالف جنوب کی طرف ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ان کے پاس ایک صاحب آئے، انھوں نے کہا، آج رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اترا ہے اور آپ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا تم بھی اس کی طرف منہ کر لو۔ ان کا رخ شام کی طرف تھا تو انھوں نے گھوم کر کعبہ کی طرف منہ کر لیا۔ [بخاري، التفسير، باب ﴿ ولئن أتيت الذين …… ﴾ : ٤٤٩٠] اس سے صحابہ کا حدیث رسول بلکہ قرآن کریم کے ثبوت کے لیے ایک معتبر آدمی کی خبر (یعنی خبر واحد) پر اعتماد اور اس پر فوری عمل ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ بعض احادیث کو خبر واحد کہہ کر رد کر دیتے ہیں انھیں غور کرنا چاہیے۔

❷ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ: سفر میں نفل نماز، کشتی میں نماز، حالتِ جنگ میں نماز یا جسے قبلہ معلوم نہ ہو سکے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، وہ جدھر منہ کر کے نماز پڑھ سکیں پڑھ سکتے ہیں، فرمایا: ﴿ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾ [البقرة : ١١٥] ''تو تم جس طرف رخ کرو، سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔'' البتہ سفر میں اگر ممکن تو سواری کا رخ قبلہ کی طرف کر کے نفل نماز شروع کر لی جائے، اس کے بعد سواری کا رخ جدھر بھی ہو، مضائقہ نہیں۔ انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کرتے اور نفل پڑھنے کا ارادہ کرتے تو اپنی اونٹنی کا رخ قبلہ کی طرف کر کے تکبیر کہتے، پھر سواری آپ کا رخ جدھر کو بھی کرتی نماز پڑھتے رہتے۔
[أبو داوٗد، صلاة السفر، باب التطوع على الراحلة : ١٢٢٥، و حسنه الألباني]

❸ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ: یعنی یہود کو اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کی بنا پر خوب علم ہے کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ مسجد حرام ہوگا، مگر وہ کفر و عناد اور حسد کی بنا پر چھپا رہے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ لوگ (اہل کتاب) ہم پر کسی چیز پر اتنا حسد نہیں کرتے جتنا جمعہ کے دن پر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے اور اس قبلہ پر جس کی اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے اور امام کے پیچھے ہمارے آمین کہنے پر۔''
[أحمد : ١٣٥/٦، ح : ٢٥٠٨٢، إسناده صحيح]

وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۵

اور یقیناً اگر تو ان لوگوں کے پاس جنھیں کتاب دی گئی ہے، ہر نشانی بھی لے آئے وہ تیرے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تو کسی صورت ان کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے اور نہ ان کا بعض کسی صورت بعض کے قبلے کی پیروی کرنے والا ہے اور یقیناً اگر تو نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو تیرے پاس آیا ہے، تو بے شک تو اس وقت ضرور ظالموں سے ہوگا ۝۱۴۵

آیت 145 ① **مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ** : یعنی وہ کعبہ کے قبلہ ہونے کو خوب جانتے ہیں، مگران کا عناد اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ آپ اس کی حقانیت پر خواہ دنیا بھر کے دلائل پیش کر دیں وہ آپ کے قبلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔

② **وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ** : اور آپ بھی وحیِ الٰہی کے پابند ہونے کی وجہ سے ان کے قبلہ کو اختیار نہیں کر سکتے۔ ”**بِتَابِعٍ**“ میں باء کے ساتھ نفی کی تاکید ہوگئی، اس لیے ترجمہ ”اور نہ تو کسی صورت ......“ کیا گیا ہے۔

③ **وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ** ......: اور ان کے باہمی عناد کا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو پسند نہیں کرتے۔ یہود صخرۂ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں اور نصاریٰ بیت المقدس کی مشرقی جانب۔ (قرطبی)

④ **وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ** ......: ” اَهْوَاءٌ “ کی واحد ” هَوًى “ ہے جس کا معنی خواہش نفس ہے۔ قرآن وسنت کی پیروی تو ﴿ **مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ** ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے علم کی پیروی ہے، اس کے سوا دین میں جو بھی شامل کیا جائے وہ انسانی خواہش کی پیروی ہے، خواہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرف سے آئے، یا ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے، یا مسلمان اپنے پاس سے ایجاد کر لیں، سب خواہش کی پیروی ہے۔ اس لیے علمائے اسلام اہل بدعت کو عام طور پر ”اہل اہواء“ کہتے ہیں۔ صاحب کشاف نے ذکر فرمایا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے منع کرنے کی تاکید کئی وجوہ کی بنا پر کی گئی ہے۔ صاحب کشاف نے دس وجوہ سے اس تاکید کی تفصیل بیان کی ہے۔ مزید دیکھیے تفسیر ابن عاشور۔

اس آیت میں اگرچہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے مگر مراد امت ہے، علماء اور عوام سب اس میں شامل ہیں، کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ ایسا کریں تو آپ سے کہا جائے: ﴿ **اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ** ﴾ تو امتی تو ایسا کرنے سے بالاولیٰ ظالموں میں سے ہوں گے۔ پھر کیا حال ہوگا ان عالموں کا جو منع کرنے کے بجائے تیجے، ساتے، چالیسویں، میلاد، تعزیے، عرس اور قوالی وغیرہ میں شرکت کرتے، خود ساختہ وظیفے کرتے، بعض وظیفوں میں قطب کی طرف رخ کرتے اور قبلے کی طرح اس کی تعظیم کرتے اور ان کاموں کو باعث ثواب قرار دیتے ہیں!

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی، اسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بے شک ان میں سے کچھ لوگ یقیناً حق کو چھپاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں﴿۱۴۶﴾ یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے، پس تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو﴿۱۴۷﴾ اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، جس کی طرف وہ منہ پھیرنے والا ہے، سو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، تم جہاں کہیں ہو گے اللہ تمھیں اکٹھا کر کے لے آئے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے﴿۱۴۸﴾

آیت 146 اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب کعبہ کے قبلہ برحق ہونے کو خوب جانتے تھے، مگر ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ قبلہ کی طرح اہل کتاب کو رسول اللہ ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے، مگر پھر بھی ان میں سے اہل علم کا ایک گروہ حق کو چھپا رہا ہے۔ ایک گروہ اس لیے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے بعض علماء جیسے (یہود میں سے) عبد اللہ بن سلام (اور نصاریٰ میں سے) تمیم داری اور صہیب رضی اللہ عنہم وغیرہ وہ بھی تھے جو آپ ﷺ کے نبی صادق ہونے کو پہچاننے کے بعد مسلمان ہو گئے تھے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

آیت 147 ① "اَلْحَقُّ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "یہ حق" کیا گیا ہے، یعنی یہ حق جسے یہود و نصاریٰ چھپا رہے ہیں آپ کے رب کی طرف سے ہے، اس لیے آپ کسی شک وشبہ کا شکار نہ ہوں۔

② اَلْمُمْتَرِيْنَ : یہ "اِمْتِرَاءٌ" یعنی باب افتعال سے اسم فاعل کی جمع ہے، مصدر "مِرْيَةٌ" (بمعنی شک) سے فعل مجرد نہیں آتا، بلکہ ہمیشہ باب افتعال سے آتا ہے۔ (ابن عاشور)

آیت 146 ① وِجْهَةٌ : وہ جگہ جس طرف منہ کیا جائے۔ اس کا وزن "فِعْلَةٌ" ہے، جو اس "فِعْلٌ" کا مؤنث ہے جو بمعنی مفعول ہے، جیسے "ذِبْحٌ" بمعنی "مَذْبُوْحٌ" (ابن عاشور)

② اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ اگرچہ کعبہ تھا، مگر بعد میں ہر ایک نے اپنی اپنی مرضی سے کسی نہ کسی سمت کو اپنا قبلہ مقرر کر لیا۔ چنانچہ یہود نے بیت المقدس کے صخرہ کو قبلہ قرار دے لیا اور نصاریٰ نے بیت المقدس کی مشرقی جانب کو۔ اب تمھارے لیے کعبہ کو قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے، اس لیے ان لوگوں سے اس بحث کا کوئی خاص فائدہ نہیں کہ کون سی سمت افضل ہے۔ اصل چیز نیکیوں میں سبقت ہے، اس کا اہتمام کرو، کیونکہ تم جہاں بھی ہو گے تمھیں اللہ کے حضور پیش ہونا پڑے گا، جیسا کہ فرمایا: "نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا
تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۚ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

اور تو جہاں سے نکلے سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور بلاشبہ یقیناً یہی تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ ہرگز اس سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۹﴾ اور تو جہاں سے نکلے سو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے اور تم جہاں کہیں ہو سو اپنے چہرے اس کی طرف پھیر لو، تا کہ لوگوں کے پاس تمھارے خلاف کوئی حجت نہ رہے، سوائے ان کے جنھوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے، سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور تا کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ ﴿۱۵۰﴾

مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں۔" [البقرۃ : ۱۷۷] نیکیوں میں سبقت میں نماز کو وقت پر ادا کرنا، پہلی صف میں پہلی تکبیر کے ساتھ شامل ہونا، اسی طرح جہاد کی اولین صفوں میں پہنچنا بھی شامل ہے۔

آیت 149 یعنی فرض نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ایسا حکم ہے کہ سفر میں بھی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ سفر کی مشقت کی بنا پر یہاں تخفیف ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ اس حکم کی تاکید کے لیے ہے اور ﴿ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ اس کی مخالفت سے ڈرانے کے لیے ہے، تا کہ اسے معمولی سمجھ کر کوئی نظر انداز نہ کرے۔ (ابن عاشور)

آیت 150 ① اس آیت میں پچھلا حکم دہرایا گیا ہے، پہلے جملے "فَوَلِّ وَجْهَكَ" میں مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں اور دوسرے جملے "فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ" میں تمام مسلمان مخاطب ہیں، تا کہ یہ حکم نبی ﷺ کے ساتھ خاص نہ سمجھا جائے۔ دہرانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں بیت اللہ کو قبلہ مقرر کرنے کی مزید حکمتیں بیان کرنا مقصود ہے۔ جن میں سے پہلی حکمت یہ ہے کہ لوگوں میں سے کسی کے پاس تمھارے خلاف کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ اہل کتاب یہ نہ کہہ سکیں کہ پہلی کتابوں میں تو آخری نبی کا قبلہ مسجد حرام ہے، انھوں نے بیت المقدس کو قبلہ کیوں بنا رکھا ہے؟ اور کفار عرب یہ نہ کہہ سکیں کہ ملتِ ابراہیم کا قبلہ تو بیت اللہ ہے، یہ اسے کیوں اختیار نہیں کر رہے؟ دلیل تو ان میں سے کسی کے پاس نہیں رہے گی، البتہ ان میں سے بے انصاف لوگ خاموش نہیں ہوں گے، سو ان سے مت ڈرو، بس مجھی سے ڈرتے رہو۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ جس طرح اس آخری امت

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع ۱۸

جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول تمھی سے بھیجا ہے، جو تم پر ہماری آیات پڑھتا اور تمھیں پاک کرتا اور تمھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور تمھیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ سو تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری مت کرو ﴿۱۵۲﴾

کے احکام قیامت تک مکمل اور غیر منسوخ کر کے تم پر اپنی نعمت تمام کی ہے، قبلہ کے بارے میں بھی یہ نعمت تمام ہو اور تیسری حکمت دوسرے احکام کی طرح قبلہ میں بھی تمھیں راہِ حق کی ہدایت عطا کرنا ہے۔

② شروع آیات سے یہاں تک نبی ﷺ کو کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم تین مرتبہ، مسلمانوں کو یہ حکم دو مرتبہ، اس کے حق ہونے کا ذکر تین مرتبہ اور ہر جگہ اس کی طرف رخ کرنے کا حکم تین مرتبہ آیا ہے، اس سے اس حکم کی تاکید اور اس کی شان واضح ہو رہی ہے۔ درمیان میں دوسرے جملے مثلاً اہل کتاب کا اس کے حق ہونے کو جاننا اور اللہ کا تمھارے عمل سے بے خبر نہ ہونا وغیرہ تاکید مزید کا کام دے رہے ہیں۔ (ابن عاشور)

آیت 151 كَمَآ: یعنی کعبہ کو قبلہ قرار دے کر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو، جو انھوں نے کعبہ کے بارے میں کی تھی، اسی طرح قبول کیا ہے جیسے ہم نے ان کی اس دعا کو شرف قبولیت بخشا جو انھوں نے مکہ کے رہنے والوں کے لیے انھی میں سے ایک نبی مبعوث کرنے کے لیے کی تھی۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۲۹) قرآن میں ﴿ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ سے مراد کتاب و سنت اور ﴿ مَا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ سے مراد وہ مسائل ہیں جو انسان اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا، مثلاً تخلیق کی ابتدا، حشر نشر، نبوت اور ملائکہ وغیرہ۔

آیت 152 ① فَاذْكُرُوْنِيْۤ: اس میں ''فاء'' کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے رسول اور قرآن کے ذریعے سے نعمت پوری کرنے کا انعام تم پر کیا ہے، سو تم پر بھی لازم ہے کہ تم مجھے یاد کرو اور یاد رکھو۔ ذکر کا معنی زبان سے یاد کرنا بھی ہے اور دل اور عمل سے بھی۔ یہ نسیان (بھولنے) کی ضد ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ﴾ [آل عمران: ۱۳۵] ''اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔'' جب کوئی شخص اللہ کے کسی حکم پر عمل کرتا ہے، نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے تو وہ بھی اللہ کو یاد کرتا ہے، یاد کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ روزانہ لاکھ مرتبہ زبان سے ذکر کیا جائے اور اللہ کے احکام کو اور اس کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کو بھلا ہی دیا جائے۔ کفار خواہ تمام بلاد اسلام پر قابض ہو جائیں ہمیں اپنی روزانہ کی ہزار رکعت پوری کرنے ہی سے فرصت نہ ہو۔ ﴿ اَذْكُرْكُمْ ﴾ ''میں تمھیں یاد کروں گا'' یہ اللہ کو یاد کرنے کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھے اپنے نفس میں یاد کرے، میں اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے کسی جماعت میں یاد کرے، میں اس سے بہتر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۵۳﴾

جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔'' [بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ و یحذرکم اللہ …… ﴾ : ۷۴۰۵۔ مسلم، الذکر والدعاء والاستغفار، باب الحث علی ذکر اللہ تعالیٰ : ۲۶۷۵]

② وَاشْكُرُوْا لِيْ : شکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ﴾ [سبا : ۱۳] ''اے داوٗد کے گھر والو! شکر ادا کرنے کے لیے عمل کرو۔'' عمل نعمت کے مطابق نہ ہو تو شکر بھی نہیں۔

③ وَلَا تَكْفُرُوْنِ : اس میں ہر ناشکری اور کفر شامل ہے، وہ زبان سے ہو یا عمل سے۔ زبان سے تو الحمد للہ کہنا، لیکن بیٹوں کا نام پیراں دتہ رکھنا، غیر اللہ کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ سن کر بھی سود کھائے جانا، گھر میں بے حیائی کو فروغ دیتے جانا، رشوت لے کر اسے فضل ربی قرار دینا، صدقے یا رسول اللہ کہنا اور ڈاڑھی منڈوا کر آپ ﷺ کی حسین صورت سے بے زاری کا اظہار شکر نہیں، بلکہ کفر اور ناشکری کی بدترین صورتیں ہیں۔

آیت 153 ① ذکر و شکر کے ساتھ صبر اور نماز کی تعلیم دی ہے۔ احکام شریعت پر عمل کرنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں صبر اور نماز پر ہمیشگی ان مشکلات کا مقابلہ کرنے میں معاون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب ہے، کیونکہ اس کا سارا کام ہی خیر ہے اور یہ چیز کسی اور کو حاصل نہیں۔ (خیر اس طرح کہ) اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہے اور وہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔''
[مسلم، الزھد، باب المؤمن أمرہ کلہ خیر : ۲۹۹۹، عن صھیب رضی اللہ عنہ]

② اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے تذکرہ کے بعد (جن میں بیت اللہ کو قبلہ قرار دے کر اپنی نعمت تمام کرنا اور اپنے آخری رسول کو بھیجنا شامل ہے) اپنے ذکر و شکر کا حکم دیا اور اس آیت میں مصیبتوں کے آنے پر صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا حکم ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۴۵) اگرچہ اس میں ایمان والوں پر آنے والی ہر مصیبت کا علاج بتایا گیا ہے، مگر آیات کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کو جہاد کے لیے تیار کرنے کی تمہید ہے، کیونکہ قبلہ کی تبدیلی رجب یا شعبان ۲ ہجری میں ہوئی اور غزوۂ بدر رمضان ۲ ہجری میں ہوا۔ دونوں کے درمیان تقریباً دو ماہ کا وقفہ ہے۔

③ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ : اس سے معیت خاصہ (خصوصی ساتھ) مراد ہے اور جسے اللہ کا ساتھ مل جائے اسے کیا غم ہے؟ جیسے نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ [التوبۃ : ۴۰] ''غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' [بخاری، المناقب، باب علامات النبوۃ فی الإسلام : ۳۶۱۵] مقصد یہ ہے کہ صبر کرو، تاکہ تمھیں اللہ تعالیٰ کا ساتھ نصیب ہو جائے۔

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اور ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کیے جائیں، مت کہو کہ مُردے ہیں، بلکہ زندہ ہیں اور لیکن تم نہیں سمجھتے ﴿۱۵۴﴾ اور یقیناً ہم تمھیں خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی میں سے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دے ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے کئی مہربانیاں اور بڑی رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں ﴿۱۵۷﴾

آیت 154 ① جہاد میں سب سے بڑی مصیبت جان کا جانا ہے، اس پر صبر کی تلقین اس طرح فرمائی کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کو مت کہو کہ مُردے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تم اس زندگی کو نہیں سمجھتے۔ آل عمران (۱۶۹) میں شہداء کی اس زندگی کے عیش و آرام کا ذکر ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ زندگی دنیاوی زندگی نہیں، نہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ مرنے کے بعد برزخ (قبر) میں ہر شخص کو زندگی حاصل ہے۔ (دیکھیے مومن: ۱۱، ۴۶۔ نوح: ۲۵۔ ابراہیم: ۲۷) مگر مومن کی روح راحت میں ہے اور کافر کی روح کو عذاب ہو رہا ہے۔ احادیث کے مطابق قبر ہی میں ان کے لیے جنت یا دوزخ کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ یہ زندگی انبیاء کو سب سے بڑھ کر کامل حالت میں حاصل ہے، مگر شہداء کی عزت افزائی کے لیے قرآن نے انھیں خاص طور پر "اَحْيَآءٌ" کہا ہے، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ فلاں قتل ہو گیا، اس سے زندگی کا عیش و آرام چھن گیا۔
② اَمْوَاتٌ: اس پر رفع اس لیے آیا ہے کہ اس کا مبتدا "هُمْ" محذوف ہے، اسی طرح "اَحْيَآءٌ" کا مبتدا بھی محذوف ہے۔ سورۂ آل عمران (۱۶۹) میں "اَمْوَاتًا" پر "لَا تَحْسَبَنَّ" کا مفعول ہونے کی وجہ سے نصب آیا ہے۔

آیت 155تا157 ① مصیبت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان کو اذیت پہنچے، وہ خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ (قرطبی، شوکانی) ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ یہ ایک ایسا کلمہ ہے کہ دل کی حاضری سے کہا جائے تو اس میں اس بات کا اظہار بھی ہے کہ ہم اللہ کی ملکیت اور اس کے بندے ہیں اور اس کا بھی کہ ہمیں ہر حال میں اس کے پاس واپس جانا ہے۔ وہ جب چاہے، جسے چاہے واپس بلائے، اس پر شکوہ و شکایت کا کیا موقع ہے؟ اس سے انسان کو صبر کی توفیق ملتی ہے اور صبر کرنے والوں کو تین نعمتیں ملتی ہیں: ① رب کی مہربانیاں۔ ② اس کی بہت بڑی رحمت (رَحْمَةٌ میں تنوین تعظیم کے لیے ہے)۔ ③ اور ہدایت یافتہ ہونے کی سند۔ قرآن مجید میں صبر کا ذکر ستر (۷۰) دفعہ آیا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی اس گھر کا حج کرے، یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں کا خوب طواف کرے اور جو کوئی خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر دان ہے، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

② اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ: اس میں لفظ "اِذَآ" میں اشارہ ہے کہ مصیبت پہنچتے ہی صبر کرنا اور "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ" کہنا چاہیے، بعد میں رو دھو کر تو ہر شخص ہی صبر کر لیتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولٰى ﴾ [بخاری، الجنائز، باب زيارة القبور : ۱۲۸۳] "صبر صرف وہ ہے جو پہلی چوٹ کے وقت ہو۔"

③ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: "کوئی مسلمان جسے کوئی مصیبت پہنچے اور وہ وہی کلمہ کہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے (یعنی یہ دعا پڑھے): ﴿ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَ أَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِّنْهَا ﴾ (یقیناً ہم اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اے اللہ! مجھے میری مصیبت میں اجر عطا فرما اور مجھے اس کی جگہ اس سے بہتر عطا فرما) تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے بہتر عطا فرماتا ہے۔" ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر جب (میرے خاوند) ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو میں نے کہا مسلمانوں میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر کون ہو گا؟ پہلا گھرانہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ پھر میں نے یہ (مذکورہ بالا) کلمہ کہہ لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرما دیے۔[مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند المصيبة ؟ : ۹۱۸]

آیت 158 ① يَطَّوَّفَ : یہ باب تفعل سے ہے، "طَافَ يَطُوْفُ" کا معنی طواف کرنا، چکر لگانا ہے، جب باب تفعل میں حروف زیادہ ہوئے تو اس کا معنی "خوب طواف کرے" ہو گیا۔ "شَعَآىِٕرِ" یہ "شَعِيْرَةٌ" کی جمع ہے جس کا معنی نشانی ہے۔ بعض لوگوں نے صفا اور مروہ کو جاہلیت کے بتوں کی نشانی سمجھ کر ان کے طواف کو گناہ سمجھا، تو اس پر فرمایا کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

② صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو چھوٹی پہاڑیوں کے نام ہیں۔ ان کے درمیان سعی کرنا (دوڑنا) ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج اور عمرہ کے مناسک (یعنی احکام) میں شامل تھا، مگر زمانۂ جاہلیت میں مشرکین نے حج اور عمرہ کے مناسک میں کئی شرکیہ رسوم شامل کر لی تھیں، حتیٰ کہ انھوں نے صفا اور مروہ پر دو بت نصب کر رکھے تھے۔ ایک کا نام "اساف" اور دوسرے کا "نائلہ" تھا۔ ان مشرکین میں سے بعض وہ تھے جو جاہلیت میں ان کے درمیان سعی کرتے اور ان بتوں کا استلام بھی کرتے، یعنی انھیں بوسہ بھی دیتے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم صفا و مروہ (کی سعی) کو جاہلیت کا کام سمجھتے تھے، جب اسلام آیا تو ہم ان کی

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾

بے شک وہ لوگ جو اس کو چھپاتے ہیں جو ہم نے واضح دلیلوں اور ہدایت میں سے اتارا ہے، اس کے بعد کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے، ایسے لوگ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾

سعی سے رک گئے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [بخاری، التفسیر، باب قولہ تعالی : ﴿ إن الصفا والمروۃ ...... ﴾ : ۴۴۹۶] اور ان مشرکین میں سے بعض وہ تھے جو جاہلیت ہی میں صفا و مروہ کی سعی کے بجائے ''منات'' نامی بت کا طواف کرتے تھے اور مکہ پہنچ کر صفا و مروہ کے طواف کو گناہ سمجھتے تھے، ان کے رد میں بھی یہ آیت نازل ہوئی۔ سعی کے ضروری ہونے پر تو مسلمان متفق تھے، تاہم آیت کے ظاہری الفاظ سے بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ سعی نہ بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں، چنانچہ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے اپنی خالہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس شبہ کا اظہار کیا، تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر آیت کا مفہوم یہی ہوتا تو قرآن میں یوں ہوتا: " اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا " یعنی طواف نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں۔ پھر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے مزید وضاحت کے لیے فرمایا کہ عرب کے بعض قبائل (ازد، غسان) " مناۃ الطاغیۃ " بت کی پوجا کرتے تھے۔ یہ بت انھوں نے مُشَلَّل پہاڑی پر نصب کر رکھا تھا۔ یہ لوگ حج کے لیے جاتے تو اس بت کا نام لے کر لبیک کہتے اور اس کا طواف کرتے۔ مکہ میں پہنچ کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو گناہ سمجھتے، مسلمان ہونے کے بعد اس بارے میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بخاری، الحج، باب وجوب الصفا والمروۃ : ۱۶۴۳۔ مسلم : ۱۲۷۷] یعنی ان لوگوں نے صفا اور مروہ کے درمیان طواف کو گناہ خیال کیا تھا، اس بنا پر قرآن نے ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ کے الفاظ استعمال کیے ہیں، ورنہ جہاں تک خود سعی کا تعلق ہے، تو اس کے متعلق عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ سعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرما دی ہے، اب کسی کو اس کے ترک کرنے کا اختیار نہیں، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِسْعَوْا اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ)) [أحمد : ۶/ ۴۲۱، ۴۲۲، ح : ۲۷۴۳۵] ''سعی کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی فرض کر دی ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا: ((لِتَاْخُذُوْا مَنَاسِكَكُمْ)) [مسلم، الحج، باب استحباب رمی : ۱۲۹۷] ''مجھ سے حج کے مناسک (یعنی احکام) سیکھ لو۔'' ان میں سعی بھی داخل ہے۔

آیت 159 : ❶ " اَللَّعْنَةُ " کا اصل معنی " الطَّرْدُ " یعنی دور دفع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت سے مراد ملعون شخص کو اپنے پاس سے اور اپنی رحمت سے دور کرنا ہے اور دوسرے تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت سے مراد اللہ تعالیٰ سے اسے دور کرنے کی دعا کرنا ہے۔ لعنت کرنے والوں سے مراد تمام مومن جن وانس اور فرشتے ہیں۔ (طبری)

❷ " اَلْكِتٰبِ " سے مراد یہاں تورات ہے اور " لِلنَّاسِ " سے مراد خاص لوگ یعنی یہود کے علماء ہیں، یعنی علمائے یہود کے

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىِٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور کھول کر بیان کر دیا تو یہ لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہوں ﴿۱۶۰﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے، ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی، سب کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ﴿۱۶۲﴾

لیے تورات و انجیل میں رسول اللہ ﷺ کی واضح خوش خبری اور صفات بیان ہونے کے بعد ان میں سے جو لوگ اسے چھپاتے اور اس کا انکار کرتے ہیں ان پر لعنت ہے۔ اگرچہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس میں وہ مسلم علماء بھی شامل ہیں جو قرآن و حدیث کی بات جانتے ہوئے اسے چھپا جاتے ہیں اور اپنے فرقے کی بات کو دین ظاہر کر کے بیان کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ)) ”جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی، جسے وہ جانتا ہے، پھر اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔“ [ترمذی، العلم، باب ما جاء فی کتمان العلم : ۲۶۴۹۔ أحمد : ۲۶۳/۲، ح : ۷۵۸۸۔ أبو داوٗد : ۳۶۵۸، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ و صححه الألبانی]

③ اگر کسی مسئلہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہو اور عوام میں فتنہ و فساد کا خوف ہو تو اسے عوام کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہاں مقصود حق کا چھپانا نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ” لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ “ پر جنت کی بشارت عام لوگوں کو بیان کرنے سے منع کر دیا تھا۔ [مسلم، الإیمان، باب الدلیل علی أن من ...... : ۳۱] اور علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”لوگوں سے وہ بات بیان کرو جسے وہ سمجھ سکیں، کیا تم پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھوٹا کہا جائے؟“ [بخاری، العلم، باب من خص بالعلم قومًا ......، قبل ح : ۱۲۷] اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”تم کسی قوم کو ایسی بات بیان کرو گے جس تک ان کی عقلیں نہ پہنچتی ہوں تو ضرور ان میں سے کسی کے لیے وہ فتنہ بنے گی۔“ [مسلم، المقدمة، باب النهی عن الحدیث بکل ما سمع : ۱۴/۵]

آیت 160 تا 162 ① اس دائرۂ لعنت سے نکلنے کی صرف ایک صورت ہے کہ یہ لوگ اپنی سابقہ کوتاہیوں سے تائب ہوں اور آئندہ لوگوں کے سامنے حق کو صاف طور پر بیان کریں (جیسا کہ عبد اللہ بن سلام اور صہیب رضی اللہ عنہما نے کیا تھا)، ورنہ جو لوگ اس حالتِ کفر میں مر گئے وہ ہمیشہ کے لیے لعنت میں گرفتار رہیں گے۔

② اس آیت کی رو سے علماء کا اتفاق ہے کہ کفار پر نام لیے بغیر عام لعنت جائز ہے۔ اسی طرح جن کا کفر پر مرنا ثابت ہو ان پر بھی لعنت جائز ہے، البتہ کسی زندہ مسلم یا کافر پر نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں، کیونکہ کیا خبر اللہ تعالیٰ موت سے پہلے اسے

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ
وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ

اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۶۳﴾ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیا ہوا ہے، ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۱۶۴﴾ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو غیر اللہ میں سے کچھ شریک بنا لیتے ہیں، وہ ان سے اللہ کی محبت جیسی محبت کرتے ہیں، اور وہ

توبہ کی توفیق دے دے، جیسا کہ ابوسفیان اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ کو ایمان لانے کی توفیق عطا ہو گئی تھی۔

آیت 163 اوپر کی آیت میں حق چھپانے پر وعید فرمائی، اب اس آیت میں بیان فرمایا کہ سب سے پہلے جس چیز کا اظہار ضروری ہے وہ مسئلہ توحید ہے۔ (قرطبی)

آیت 164 ❶ اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ کے الٰہ واحد (ایک معبود) ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں اس کے ایک ہونے کے دلائل کا بیان ہے۔ قرآن نے ان آٹھ چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے ایک ہونے کے ثبوت میں کئی جگہ الگ الگ ذکر فرمایا ہے، مگر یہاں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ کائنات کی ان چیزوں کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے متعلق خود مشرکین بھی مانتے تھے کہ ان کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ (کبیر)

❷ مفسر قرآن امین شنقیطی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہاں آسمان و زمین کی پیدائش میں توحید کی نشانی ہونے کی تفصیل بیان نہیں ہوئی، دوسرے مقامات پر تفصیل موجود ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ ق (۶ تا ۸) سورۂ ملک (۳ تا ۵، ۱۵) اور سورۂ لقمان (۱۱، ۱۲) اسی طرح دن رات کے بدلنے میں توحید کی نشانی ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قصص (۷۱ تا ۷۳) اور اعراف (۵۴) آسمان و زمین کے درمیان بادل کے مسخر ہونے کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۵۷) اور سورۂ نور (۴۳)۔

آیت 165 ❶ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں بتایا کہ اس قدر ظاہر اور واضح دلائل دیکھنے کے باوجود دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو انداد (برابر اور شریک) بناتے ہیں۔

حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

لوگ جو ایمان لائے، اللہ سے محبت میں کہیں زیادہ ہیں اور کاش! وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا اس وقت کو دیکھ لیں جب وہ عذاب کو دیکھیں گے (تو جان لیں) کہ بے شک قوت سب کی سب اللہ کے لیے ہے اور یہ کہ بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۱۶۵﴾

کائنات کی حکمرانی، مخلوق کی حاجت روائی، مشکل کشائی، دعائیں سننا، تمام غائب و حاضر چیزوں سے واقف ہونا، جو اللہ کی خاص صفات ہیں، یہ لوگ یہ صفات ان بناوٹی معبودوں میں سمجھتے ہیں، بلکہ ان سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں جو صرف اللہ سے ہونی چاہیے، جبکہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان سے کہیں زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ انداد سے مراد وہ فوت شدہ بزرگ ہیں جن کے بت بنا کر وہ انھیں پکارتے اور پوجتے تھے، جیسا کہ سورۂ نوح میں مذکور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ ان کی قوم کے نیک لوگ تھے، جن کے فوت ہونے پر انھوں نے ان کے بت بنائے۔ بعد میں یہی بت عرب میں بھی بن گئے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ودا ولا سواعا ولا یغوث و یعوق ﴾ : ٤٩٢٠] گویا بت پرستی بھی دراصل بزرگ پرستی ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مکہ فتح ہونے کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کعبہ سے بت نکالے تو ان میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں فال کے تیر تھے۔ [بخاری، المغازی، باب أین رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...... : ٤٢٨٨]

"اَنْدَادًا" میں ہر وہ چیز شامل ہے جو انسان کے دل پر مسلط ہو کر وہ مقام بنا لے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ بت پرست ان ہستیوں کی مورتیاں بنا کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ قبر پرست ان ہستیوں کی قبروں پر عمارتیں بنا کر ان کی پوجا کرتے ہیں، انھیں نفع و نقصان کا مالک سمجھتے ہیں، مصیبت کے وقت ان سے فریاد کرتے ہیں۔ خصوصاً یہود و نصاریٰ میں یہ چیز عام تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ بنانے سے منع کر دیا اور علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ہر اونچی قبر کو برابر کر دیں۔ [مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسویة القبر : ٩٦٩، ٩٧٠] کچھ وہ ہیں جو تصورِ شیخ کے ذریعے سے دل میں ایک فانی انسان کا نقشہ جما کر اس سے وہ محبت کرتے ہیں جو محض اللہ کا حق ہے، پھر ان پر وہ محبت ایسی غالب ہوتی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے بجائے شیخ کے حکم کو اللہ کے حکم کا درجہ دیتے ہیں، جب کہ مخلوق کا یہ حق ہی نہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر کیا جائے۔ انداد کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲۲)۔

❷ مسلمانوں میں کئی ایسے بدنصیب بھی ہیں جو اس آیت کا، جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ جیسی محبت کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس مقصد کے لیے وظیفہ کرتے اور اس کا تعویذ لکھتے ہیں کہ کسی لڑکی یا لڑکے کو اپنی محبت کے دام میں گرفتار کریں۔ یہ وہی یہودیانہ خصلت ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ (۱۰۲،۷۸) میں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیطان انھیں اس راستے پر

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾
وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ
اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے بالکل بے تعلق ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات بالکل منقطع ہو جائیں گے ﴿۱۶۶﴾ اور جن لوگوں نے پیروی کی تھی کہیں گے کاش! ہمارے لیے ایک بار دوبارہ جانا ہوتو ہم ان سے بالکل بے تعلق ہو جائیں، جیسے یہ ہم سے بالکل بے تعلق ہو گئے۔ اس طرح اللہ انھیں ان کے اعمال ان پر حسرتیں بنا کر دکھائے گا اور وہ کسی صورت آگ سے نکلنے والے نہیں ﴿۱۶۷﴾

لگانے والا ہے اور قرآن جس بات سے منع کر رہا ہے اسی کے لیے قرآن کو پڑھا یا لکھا جائے تو لعنت کے سوا کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

③ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ: یعنی ایمان والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کو دوسروں کی محبت اور رضا سے مقدم رکھتے ہیں۔ کسی کی محبت بھی ان کے دل میں یہ مقام حاصل نہیں کر سکتی کہ وہ اسے اللہ کی محبت اور رضا پر قربان نہ کر سکیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۲۴)۔

④ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا: اس سے مراد شرک کرنے والے اور کافر لوگ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان : ۱۳] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔'' دلیل اس کی یہ ہے کہ وہ آگ سے کسی صورت نکلنے والے نہیں اور آگ سے کبھی نہ نکلنے والے یا مشرک ہیں یا کافر۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۸، ۱۱۶) اور سورۂ اعراف (۵۰) جب کہ اہل السنہ کا اتفاق ہے کہ اہل ایمان آخر کار جہنم سے نکل آئیں گے۔

⑤ وَلَوْ يَرَى: ''اس وقت کو دیکھ لیں'' یعنی دنیا میں وہ منظر دیکھ لیں۔

آیت 167,166 تَبَرَّاَ: یہ ''بَرِئَ'' سے باب تفعل ہے۔ حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''بالکل بے تعلق ہو جائیں گے'' کیا گیا ہے اور ''بِخٰرِجِيْنَ'' میں باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''وہ کسی صورت آگ سے نکلنے والے نہیں'' کیا گیا ہے۔ ان آیات میں قیامت کے دن ان مشرکوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کاش! وہ دنیا میں اللہ کی بات پر یقین کر کے اس انجام سے بچ جائیں۔ مزید دیکھیے سورۂ قصص (۶۳، ۶۴) اور سورۂ احقاف (۵، ۶) ان آیات سے قدیم اور جدید علماء کی جماعت نے حرمتِ تقلید پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اہل شرک جن کے پیچھے لگے، وہ اپنے پیچھے لگنے والوں سے بے زاری ظاہر کریں گے، اسی طرح ائمۂ مجتہدین بھی اپنے مقلدوں سے بے زار ہوں گے، اس لیے کہ چاروں امام رحمہم اللہ اپنی تقلید اور غیر کی تقلید سے منع کر گئے ہیں۔ سو جس کام سے دنیا میں انھوں نے امت کو منع کیا تھا وہ اس کام پر آخرت میں ضرور ہی خفا ہوں گے۔ اس سرکشی اور حکم عدولی کو اپنے مقلدوں سے ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ (ترجمان)

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اے لوگو! ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں حلال، پاکیزہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ وہ تو تمھیں برائی اور بے حیائی ہی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ پر وہ بات کہو جو تم نہیں جانتے ﴿۱۶۹﴾

آیت 168 سورۂ بقرہ میں '' يَاَيُّهَا النَّاسُ '' کے ساتھ خطاب دوسری مرتبہ کیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو ''انداد'' (شریک) بنانے کا برا انجام ذکر کیا گیا ہے۔ مشرکین ان ''انداد'' کی تعظیم و تکریم میں اتنی زیادتی کرتے کہ عبادت اور دعا میں بھی ان کو پکارتے اور ان کے نام پر بہت سے مویشی مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ وغیرہ حرام قرار دے دیتے، ان پر نہ سواری کرتے اور نہ ان کا گوشت کھاتے اور ان کو اللہ کے قریب ہونے کا ذریعہ سمجھتے (دیکھیے انعام: ۱۳۸، ۱۳۹) اور دوسری طرف انھوں نے اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا تھا، مثلاً مردار، خون، خنزیر اور غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز۔ چنانچہ اس آیت میں اس طرح کے حرام ٹھہرا لینے سے منع فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم دیا، یعنی اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے بچو اور اس کی حلال کردہ طیب چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ، کیونکہ اسلام تب معتبر ہو گا جب کوئی شخص مسلمانوں کی حلال اشیاء کو حرام نہیں ٹھہرائے گا، جیسا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے وہ نماز پڑھی جو ہم پڑھتے ہیں اور اس قبلے کی طرف رخ کیا جس کی طرف ہم رخ کرتے ہیں اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے۔'' [بخاری، الصلوۃ، باب فضل استقبال القبلۃ : ۳۹۱] چنانچہ یہاں بھی فرمایا کہ شیطان کے پیچھے لگ کر ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی ہر نافرمانی اور دین میں شامل کی ہوئی ہر وہ بات جو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں بتائی، یعنی ہر بدعت شیطان کے قدموں کی پیروی ہے۔

آیت 169 ❶ '' اَلسُّوْءُ '' سے مراد کوئی بھی برائی ہے اور '' اَلْفَحْشَاءُ '' وہ برائی ہے جو حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے، مثلاً حد سے بڑھا ہوا بخل (بقرہ: ۲۶۸)، زنا (نور: ۱۹، ۲۱)، چوری، شراب اور قتل وغیرہ۔

❷ یعنی شیاطین ایک طرف تو معاشرے میں اخلاقی خرابیوں '' اَلسُّوْءُ وَالْفَحْشَاءُ '' کو فروغ دیتے ہیں اور دوسری طرف دین میں بدعات پیدا کر کے لوگوں کے عقائد و اعمال خراب کرتے ہیں۔ بغیر علم کے اللہ کے ذمے کوئی بات لگانے میں ہر وہ بات شامل ہے جو کتاب و سنت سے ثابت نہ ہو۔ مزید دیکھیے اعراف (۲۸، ۳۳) پچھلی آیات کے لحاظ سے یہاں '' اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ '' سے مراد اللہ کے لیے شریک بنانا، شیطان کے کہنے پر اللہ کے حلال کردہ کو حرام قرار دینا، مثلاً بحیرہ و سائبہ وغیرہ اور اس کے حرام کو حلال سمجھنا، مثلاً مردار، خون، خنزیر اور غیر اللہ کے لیے نذر و نیاز دینا، غرض اپنے پاس سے دین کی کوئی بھی بات بنا کر اللہ کے ذمے لگا دینا ہے۔

وَ اِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـــًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡـىٌ فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں﴿۱۷۰﴾ اور ان لوگوں کی مثال جنھوں نے کفر کیا، اس شخص کی مثال جیسی ہے جو ان جانوروں کو آواز دیتا ہے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے، بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو وہ نہیں سمجھتے﴿۱۷۱﴾

آیت 170 مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے پاس اپنے شرکیہ افعال کے لیے نہ کوئی عقلی دلیل تھی اور نہ ہی اللہ کی طرف سے آنے والی کوئی نقلی دلیل، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف (۴) میں انھیں چیلنج فرمایا کہ اللہ کی کسی کتاب میں سے کوئی نقلی دلیل تمھارے پاس ہے تو پیش کرو۔ چنانچہ جب انھیں کہا جاتا کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو جواب میں ان کے پاس ایک ہی دلیل تھی کہ ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے، وہ ہم سے زیادہ عقل مند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر کسی کے آباء و اجداد کو کسی بات کی عقل نہ ہو، مثلاً انھوں نے خسارے کی تجارت کی ہو، یا غلط راستے پر چلتے رہے ہوں تو کیا تم اندھے بن کر انھی کے پیچھے چلتے رہو گے؟ نہیں! بلکہ خود عقل سے کام لو اور سیدھے راستے پر چلو، جو صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے۔

ان آیات میں روئے سخن اگرچہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی طرف ہے، لیکن اگر مسلمان بھی یہی روش اختیار کریں کہ قرآن و حدیث کے مقابلے میں رسم و رواج پر عمل کرنے میں اپنے آباء و اجداد کی پیروی کریں، یا اپنے امام، پیشوا یا عالم دین کے قول، رائے یا فتویٰ پر عمل پیرا ہوں جس کی دلیل قرآن و حدیث میں موجود نہ ہو تو وہ بھی اس آیت میں بیان کردہ مذمت اور وعید کے زمرے میں آئیں گے اور اسی کا نام تقلید ہے، کیونکہ علماء کے نزدیک تقلید کی تعریف یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے بجائے کسی غیر (امام، پیشوا یا عالم دین) کا قول دلیل کے بغیر لے لینا تقلید ہے۔ ایسی باتوں پر عمل کرنا حرام ہے، خواہ ایسا عمل مشرکین اور یہود و نصاریٰ کریں یا مسلمان، لیکن اگر کسی امام، پیشوا یا عالم کی رائے قرآن و حدیث کی نصوص کے خلاف نہ ہو تو ایسی رائے یا فتویٰ پر عمل کرنا تقلید کے زمرے میں نہیں آتا اور نہ ہی اسے ناجائز کہا جائے گا۔

آیت 171 " نَعَقَ بِغَنَمِه " (ف، ض) اپنی بھیڑ بکریوں کو آواز دینا اور ڈانٹنا۔ (قاموس) کفار کی یہ مثال دو طرح سے ہے، ایک تو یہ کہ ان کفار کو سمجھانے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ان جانوروں کو سمجھاتا ہے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ یہ کفار کان، زبان اور آنکھیں رکھنے کے باوجود ضد اور عناد کی وجہ سے حق سننے، دیکھنے اور اس کا اقرار کرنے سے بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ سورۂ اعراف (۱۷۹) میں ایسے لوگوں کو جانوروں کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَ اشۡكُرُوۡا لِلّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ اِیَّاهُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡكُمُ الۡمَیۡتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیۡرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۷۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو﴿۱۷۲﴾ اس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور ہر وہ چیز حرام کی ہے جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے﴿۱۷۳﴾

اور سرے سے بے خبر قرار دیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ زخرف (۴۰) اور یونس (۴۲، ۴۳)۔

دوسری اس طرح کہ ان کی مثال ان بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلے (ریوڑ) اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے ان کی آواز پر حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ اپنے اپنے پیشواؤں کے پیچھے بغیر سوچے سمجھے چلے جاتے ہیں، گویا یہ تقلیدِ آباء کی تمثیل ہے۔ آیت میں دونوں مفہوم موجود ہیں۔

آیت 172 اس سے پہلے سب لوگوں کو حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم دیا تھا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اہل ایمان کو حلال اور پاکیزہ روزی کھانے اور کمانے کا حکم دیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! بے شک اللہ طیب (پاک) ہے، طیب کے سوا کچھ قبول نہیں فرماتا، اس نے ایمان والوں کو اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے اپنے رسولوں کو حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعۡمَلُوۡا صَالِحًا ؕ اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِیۡمٌ﴾ [المؤمنون : ۵۱] ''اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو، یقیناً میں اسے جو تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہوں۔'' اور فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ﴾ [البقرۃ : ۱۷۲] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں۔'' پھر آپ ﷺ نے ایک ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کرتا ہے، بکھرے بالوں والا ہے، گرد و غبار سے اٹا ہوا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے: ''اے میرے رب! اے میرے رب!'' (اور صورت حال یہ ہے کہ) اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور اسے جو غذا دی گئی ہے وہ بھی حرام تو بھلا اس کی دعا کیسے قبول کی جائے گی؟ [مسلم، الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب و تربیتھا : ۱۰۱۵، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ]

آیت 173 ① ''اِنَّمَا'' کا لفظ حصر کے لیے آتا ہے، اس لیے آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ چار چیزیں حرام کی ہیں، ان کے سوا کچھ حرام نہیں اور دوسری آیت میں اس سے بھی صریح الفاظ میں یہ بات ذکر ہوئی ہے، فرمایا: ﴿قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّكُوۡنَ مَیۡتَةً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّهٗ

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْہِمْ ۚۖ وَلَہُمْ عَذَابٌ

بے شک جولوگ چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب میں سے اتارا ہے اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت حاصل کرتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھا رہے اور نہ اللہ ان سے قیامت کے دن بات کرے گا اور نہ

رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُہِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ بِہٖ﴾ [الأنعام : ١٤٥] ”کہہ دے میں اس وحی میں جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کہ بے شک وہ گندگی ہے، یا نافرمانی (کا باعث) ہو، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔“ یعنی آپ اعلان کر دیں کہ میری وحی میں ان چیزوں کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں، مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیات و احادیث سے ان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے، مثلاً خمر یعنی ہر نشہ آور چیز اور درندے وغیرہ، تو یہاں صرف انھی چیزوں کو کیسے حرام کہا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تمام حلال و حرام کا ذکر نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی بات ہو رہی ہے جنھیں مشرکین مکہ نے حرام کر رکھا تھا، جب کہ آیت میں مذکور چاروں حرام چیزوں سے وہ اجتناب نہیں برتتے تھے، اس لیے ان کے اس فعل کے بالمقابل انھیں بتایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں چیزیں حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے تم پرہیز کرتے ہو، گویا یہاں صرف ان مشرکین کی نسبت سے اور ان کے بالمقابل بات کی گئی ہے۔ اسے عربی میں حصرِ اضافی کہتے ہیں۔ یہ حصرِ مطلق یعنی عام قاعدہ نہیں۔

② حرام و حلال سے متعلق قرآن و حدیث میں ان چار چیزوں کے علاوہ جو بنیادی احکام بیان ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: ① سمندر کا ہر جانور خواہ زندہ پکڑا جائے یا مردہ، نام اس کا کچھ بھی ہو، حلال ہے۔ دیکھیے حاشیہ سورۂ مائدہ (٩٦) مراد اس سے پانی میں رہنے والے وہ جانور ہیں جو پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، خواہ سمندر میں ہوں یا دوسری جگہ پانی میں، یعنی دریا وغیرہ میں۔ ② خشکی کے جانوروں میں سے ہر کچلی والا درندہ اور پنجے سے شکار کرنے والا پرندہ حرام ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ كُلِّ ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَ عَنْ كُلِّ ذِیْ مِخْلَبٍ مِنَ الطَّيْرِ)) [مسلم، الصید والذبائح، باب تحریم أکل کل ذی ...... : ١٩٣٤] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلی والے جانور اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندوں (کے گوشت) کو حرام قرار دیا ہے۔“ اس کے علاوہ حدیث میں جن جانوروں کو نام لے کر حرام کہا گیا ہے، مثلاً گھریلو گدھا، یا وہ جانور جنھیں جہاں ملیں مار دینے کا حکم ہے، یعنی سانپ، بچھو، چھپکلی، کوا، چیل وغیرہ۔ قرآن و حدیث میں حرام کردہ چیزوں کے علاوہ باقی سب چیزیں حلال ہیں۔

③ آیت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۳) اور انعام (۱۴۵)۔

آیت 174 تا 176 ① یہ آیات گو علمائے یہود کے حق میں نازل ہوئی ہیں، جو دنیا کے مال و جاہ کے حصول کی خاطر تورات

اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى
النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ
شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱

انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے﴿۱۷۴﴾ یہی لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو بخشش کے بدلے خریدا، سو وہ آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں﴿۱۷۵﴾ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا ہے یقیناً وہ بہت دور کی مخالفت میں (پڑے) ہیں﴿۱۷۶﴾

میں مذکور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کو چھپا رہے تھے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۵۹) مگر اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جو دنیا کے مفاد کی خاطر دین کو فروخت کرے۔

❷ ثَمَنًا قَلِيْلًا : اس کا معنی یہ نہیں کہ زیادہ قیمت لے سکتے ہیں، بلکہ ساری دنیا بھی مل جائے تو وہ آخرت کے مقابلے میں قلیل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ﴾ [النساء : ۷۷] ''کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔''

❸ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ : ''مَا'' بمعنی ''اَیُّ شَیْءٍ'' اسم تعجب مبتدا، ''اَصْبَرَهُمْ'' فعل ماضی مع فاعل، ''هُمْ'' مفعول بہ، جملہ ''مَا'' مبتدا کی خبر۔

❹ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ : یعنی اللہ محبت و رحمت کے ساتھ ان سے بات نہیں کرے گا، ورنہ ناراضی اور ڈانٹ کے طور پر تو اللہ تعالیٰ ان سے خطاب فرمائے گا۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۱۰۸)۔

❺ ذٰلِكَ : اس میں یہود و نصاریٰ کا حق چھپانا، اس کے بدلے ثمن قلیل، یعنی تھوڑی قیمت لینا، اس پر آگ کا عذاب، اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام نہ کرنا، انھیں پاک نہ کرنا اور آگ پر یہود کی جرأت و صبر تمام چیزیں شامل ہیں۔ ﴿ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ﴾ اس میں اور ﴿ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ ﴾ دونوں جگہ ''الْكِتٰبِ'' سے تورات اور قرآن دونوں مراد ہو سکتے ہیں، اگر تورات مراد ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تورات حق کے ساتھ نازل کی تھی، مگر جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا، یعنی اس میں تحریف کی یا اس کے بعض کو مانا اور بعض کو نہ مانا، وہ حق سے بہت دور کی مخالفت میں جا پڑے۔ اگر قرآن مراد ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب یعنی قرآن حق کے ساتھ نازل کیا، مگر جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا، کسی نے کہا یہ وہ نہیں جس کی تورات میں پیشین گوئی ہے، کسی نے کہا یہ صرف اُمّی (یعنی ان پڑھ عرب) لوگوں کے لیے ہے، جیسا کہ ابن صیاد نے نبی ﷺ سے کہا تھا۔ [بخاری، الجنائز، باب إذا أسلم الصبی ..... : ۱۳۵۴] تو یہ سب لوگ بہت دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں، ان کا قرآن کو نہ ماننا صرف اس مخالفت کی وجہ سے ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یوم آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگی اور تکالیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھوں نے سچ کہا اور یہی بچنے والے ہیں ﴿۱۷۷﴾

آیت 177 ① مسلمانوں کو جب پہلے بیت المقدس اور پھر کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ بعض اہل کتاب اور بعض مسلمانوں پر شاق گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی حکمت بیان فرمائی کہ اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے احکام کی فرماں برداری، جدھر وہ کہے ادھر رخ کرنا اور جو حکم وہ دے اس پر عمل کرنا ہے۔ یہ ہے اصل نیکی، تقویٰ اور کامل ایمان۔ رہا مشرق یا مغرب میں سے کسی طرف رخ کرنے کی پابندی، تو اس میں کوئی نیکی نہیں، اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے نہ ہو۔ (ابن کثیر)

② وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ : اس میں ''مَنْ'' سے پہلے ''بِرُّ'' محذوف ہے، یعنی اصل نیکی اس شخص کی نیکی ہے۔

③ یہ آیت نیکی کی تمام اقسام پر مشتمل ہے اور اس میں تمام بنیادی عقائد، اعمال اور اخلاق آ گئے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کو '' كِتَابُ الْاِيْمَانِ '' کے تحت '' بَابُ أُمُوْرِ الْإِيْمَانِ '' (قبل ح: ۹)'' میں ذکر فرمایا ہے کہ ایمان صرف عقائد کا نام نہیں، بلکہ اعمال بھی ایمان کا جز ہیں۔

④ پہلے مال کی محبت کے باوجود اسے ذوی القربیٰ اور دوسرے مستحقین کو دینے کا ذکر فرمایا، بعد میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا ذکر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے مال میں صرف زکوٰۃ ہی واجب نہیں کہ زکوٰۃ دینے کے بعد سارا سال بندہ فارغ ہو گیا، بلکہ ضرورت کے وقت مستحقین پر مال خرچ کرنا بھی واجب ہے، مثلاً ماں باپ اور دوسرے ضرورت مند رشتہ داروں کا نفقہ، مہمان پر خرچ، ضرورت مند ہمسائے، مجاہدین اور آیت میں مذکور دوسرے حضرات پر خرچ کرنا۔ ان کا ذکر زکوٰۃ سے پہلے اس لیے کیا کہ عام طور پر اس سے غفلت برتی جاتی ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَ الۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَ الۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی ؕ فَمَنۡ عُفِیَ لَهٗ مِنۡ اَخِیۡهِ شَیۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخۡفِیۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ رَحۡمَةٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰی بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر مقتولوں میں بدلہ لینا لکھ دیا گیا ہے، آزاد (قاتل) کے بدلے وہی آزاد (قاتل) اور غلام (قاتل) کے بدلے وہی غلام (قاتل) اور (قاتلہ) عورت کے بدلے وہی (قاتلہ) عورت (قتل) ہوگی، پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے پیچھا کرنا اور اچھے طریقے سے اس کے پاس پہنچا دینا (لازم) ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے ایک قسم کی آسانی اور ایک مہربانی ہے، پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۸﴾

⑤ یتیم وہ ہے جس کا والد فوت ہو جائے اور وہ ابھی بالغ نہ ہوا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا یُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ)) [أبوداوٗد، الوصایا، باب ما جاء متی ینقطع الیتم : ۲۸۷۳، عن علی رضی اللہ عنہ] ''بلوغت کے بعد یتیمی نہیں۔'' باقی مستحقین کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۶۰)۔

⑥ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ ...... : یہ اور اس سے پہلے مذکور نیکی کرنے والوں سے متعلق سب صیغے ترکیب کی رو سے مرفوع ہیں، جب کہ ''الصّٰبِرِیۡنَ'' کی حالت نصبی ہے، اس کی حکمت مفسرین نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ مدح اور اختصاص کی بنا پر منصوب ہے، یعنی یہ '' اَمۡدَحُ '' یا '' اَخُصُّ '' کا مفعول ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''اور خصوصاً جو تنگی میں۔'' ''الۡبَاۡسَآءِ'' سے مراد فقر، بھوک، تنگ دستی، ''الضَّرَّآءِ'' سے مراد تکلیف، خصوصاً بیماری اور '' الۡبَاۡسِ'' سے مراد جنگ ہے۔ ان تینوں حالتوں میں صبر نہایت مشکل ہوتا ہے، اس لیے ان کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

آیت 178 ① الۡقَتۡلٰی : یہ '' قَتِیۡلٌ '' کی جمع ہے، جو بمعنی مقتول ہے۔ اس آیت سے بظاہر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مرد، مرد ہی کو قتل کرنے کی صورت میں قتل کیا جائے گا، عورت کو قتل کر دے تو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عورت، عورت ہی کو قتل کرنے کی صورت میں قتل کی جائے گی، مرد کو قتل کرنے کی صورت میں نہیں، مگر یہ معنی مراد نہیں، بلکہ یہاں اہل جاہلیت کے ایک ظلم کا خاتمہ مقصود ہے کہ اگر ان کے کمزور قبیلے کی کوئی عورت کسی طاقت ور قبیلے کے کسی مرد کو قتل کر دیتی تو وہ قتل کرنے والی عورت کے بجائے اس قبیلے کے کسی بے گناہ مرد یا متعدد مردوں کو قتل کر دیتے۔ اسی طرح کسی کمزور قبیلے کا کوئی غلام کسی زور آور قبیلے کے کسی آزاد آدمی کو قتل کر دیتا تو وہ اس قاتل غلام کی جگہ اس قبیلے کے کسی بے گناہ آزاد ہی کو قتل کرنے پر اصرار کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قتل کرنے والے کے بدلے میں اسی قاتل ہی کو قتل کیا جائے، کسی دوسرے کو نہیں، قاتل خواہ آزاد ہے یا غلام، مرد ہے یا عورت۔ (خلاصہ از طبری)

② اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو قتل کر دے تو قصاص میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا، بعض لوگوں نے کہا کہ کافر کو قتل کرنے

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ

اور تمھارے لیے بدلہ لینے میں ایک طرح کی زندگی ہے اے عقلوں والو! تاکہ تم بچ جاؤ﴿۱۷۹﴾ تم پر لکھ دیا گیا ہے، جب

کی صورت میں مسلمان کو قتل کر دیا جائے گا، مگر یہ رسول اللہ ﷺ کے صریح فرمان کے خلاف ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَ اَنْ لَّا يُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ)) ''اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا۔'' [بخاری، الدیات، باب لا یقتل المسلم بکافر : ٦٩١٥] مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو چوپاؤں کی مانند بلکہ ان سے بھی گمراہ تر قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹)۔

③ "مِنْ اَخِيْهِ" یہاں مقتول کے وارث کو قاتل کا بھائی قرار دینے میں ایک طرح کی سفارش ہے کہ بے شک قاتل نے تمھارے آدمی کو قتل کیا ہے مگر مسلمان ہونے کے ناتے تم اس کے بھائی ہو، تمھیں اسے کچھ نہ کچھ معافی دینی چاہیے۔ معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ صدقہ کرتے ہوئے دیت لیے بغیر معاف کر دیں۔ دوسری یہ کہ دیت لے لیں، پھر خواہ پوری لے لیں یا اس میں سے کچھ معاف کر دیں۔ اگر وہ معاف کرتے ہوئے قصاص کی جگہ دیت قبول کر لیں تو ان پر لازم ہے کہ دیت کا تقاضا اچھے طریقے سے کریں اور قاتل کے قبیلے والوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اچھے طریقے سے دیت ادا کر دیں۔ استطاعت ہوتے ہوئے دیت ادا نہ کرنا ظلم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ)) ''غنی کا دیر کرنا ظلم ہے۔'' [بخاری، الحوالات، باب الحوالة وهل یرجع فی الحوالة : ٢٢٨٧]

④ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں صرف قصاص تھا دیت نہیں تھی، اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرما کر دیت لینے کی بھی اجازت دے دی ہے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ یأیها الذین آمنوا ..... ﴾ : ٤٤٩٨]

⑤ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ : دیت لے کر بھی کوئی آدمی اگر قاتل کو قتل کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

آیت 179 ''قصاص میں زندگی'' کے معنی یہ ہیں کہ اس سزا کے خوف سے لوگ قتل کرنے سے رک جائیں گے اور کوئی شخص دوسرے کے قتل پر جرأت نہیں کرے گا۔ پس "تَتَّقُوْنَ" کے معنی یہ ہیں ''تاکہ تم دوسرے کو قتل کرنے سے بچ جاؤ'' مگر اس کے معنی عام لینا بہتر ہے ''تاکہ تم گناہ سے کنارہ کر کے آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤ'' علماء نے لکھا ہے کہ یہ آیت اختصار اور جامعیت میں بے نظیر ہے۔ سعودی عرب میں بے مثال امن اسی آیت پر عمل کی برکت سے ہے۔

آیت 180 ① ''لکھ دیا گیا ہے'' یعنی فرض کر دیا گیا ہے۔ (راغب) ''کسی کو موت آ پہنچے'' یعنی اس کے اسباب و قرائن آ پہنچیں، کیونکہ موت آنے کے بعد وصیت تو کیا، کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

② چونکہ موت کسی بھی وقت آ سکتی ہے، اس لیے اگر وصیت نہ کرنے کی صورت میں کسی کی حق تلفی کا خطرہ ہو، مثلاً کسی کا قرض ادا کرنا ہو تو وصیت میں بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا حق نہیں جس کے پاس کوئی چیز ہو جس میں اسے وصیت کرنا ہو کہ وہ دو راتیں اس کے بغیر گزارے کہ اس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔'' [بخاری، الوصایا، باب الوصایا : ٢٧٣٨، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سننے کے بعد ایک رات بھی نہ گزری تھی کہ میں نے اپنی وصیت لکھ کر اپنے پاس رکھ لی۔ [مسلم، الوصية، باب وصية الرجل مكتوبة عنده : ١٦٢٧/٤]

الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۸۰

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۸۱

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۸۲ ع ۲۲

تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے، اگر اس نے کوئی خیر چھوڑی ہو، اچھے طریقے کے ساتھ وصیت کرنا ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے، متقی لوگوں پر یہ لازم ہے ۝۱۸۰ پھر جو شخص اسے بدل دے، اس کے بعد کہ اسے سن چکا ہو تو اس کا گناہ انھی لوگوں پر ہے جو اسے بدلیں، یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ۝۱۸۱ پھر جو شخص کسی وصیت کرنے والے سے کسی قسم کی طرف داری یا گناہ سے ڈرے، پس ان کے درمیان اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۱۸۲

③ اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود وصیت کرتے ہوئے ان کا حصہ مقرر فرما دیا ہے، فرمایا: ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ...... وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [النساء : ۱۱ تا ۱۴] اب اللہ تعالیٰ کی وصیت کے بعد کسی اور کی وصیت کی کیا گنجائش ہے اور عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ((إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ)) ''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے، چنانچہ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔'' [نسائی، الوصایا، باب إبطال الوصیۃ للوارث : ۳۶۷۱۔ ترمذی : ۲۱۲۱۔ ابن ماجہ : ۲۷۱۳، وقال الترمذی حسن صحیح]

④ جب وارثوں کے حق میں وصیت جائز ہی نہیں تو اس آیت میں والدین اور اقربین یعنی قریبی رشتہ داروں کے حق میں وصیت کس طرح فرض کی گئی؟ اس سوال کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ یہ آیت: ﴿ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ﴾ [النساء : ۱۱] کے ساتھ منسوخ ہے، چنانچہ اب والدین اور اقربین کے حق میں وصیت فرض تو دور، جائز بھی نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے شک والدین اور اقربین کے حصے کی خود اللہ تعالیٰ نے وصیت فرما دی ہے، لہٰذا ان کے حق میں وصیت نہیں ہے، مگر کچھ والدین اور قریبی رشتہ دار ایسے بھی ہیں جن کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں فرمایا، ان کے بارے میں وصیت کرنا فرض کر دیا تاکہ وہ محروم نہ رہ جائیں، مثلاً وہ والدین جو کافر ہیں یا غلام ہیں، وہ مسلمان کے وارث نہیں ہو سکتے، ان کے حق میں وصیت فرض ہے۔ یا کسی شخص کے دادا، دادی یا نانا، نانی کا اگر کوئی پرسان حال نہیں تو والدین ہونے کے ناتے ان کے حق میں بھی وصیت لازم ہے، جب کہ قریبی والد کی موجودگی میں وہ وارث نہیں ہیں۔ اسی طرح کسی شخص کے بیٹوں کی موجودگی میں پوتے پوتیاں وارث نہیں ہو سکتے (اگرچہ پاکستان کے قانون میں اللہ کے حکم سے بغاوت کرتے ہوئے انھیں وارث بنایا گیا ہے)، ایسے پوتوں کے حق میں وصیت فرض ہے، تاکہ وہ یتیمی کے داغ کے ساتھ ساتھ دادے کے ورثے سے بھی بالکل محروم نہ رہ جائیں۔

⑤ کل مال میں سے ایک تہائی سے زیادہ وصیت جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو زیادہ سے زیادہ تہائی مال وصیت کی اجازت دی اور اسے بھی بہت قرار دیا۔ [بخاری، الفرائض، باب میراث البنات : ۶۷۳۳]

آیت 182،181 وصیت کا بدلنا بڑا گناہ ہے، اس میں وصیت کا چھپانا بھی داخل ہے۔ ''جَنَفًا'' ''مائل ہونا'' یعنی اگر کسی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَى

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا لکھ دیا گیا ہے، جیسے ان لوگوں پر لکھا گیا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۱۸۳﴾ گنے ہوئے چند دنوں میں، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے اور جو لوگ

کی طرف دلی میلان کی وجہ سے وصیت میں اس کی نامناسب طرف داری ہو۔ " اَوْ اِثْمًا " یا ناجائز کام کی وصیت ہو، مثلاً شراب پلانے کی، ناچ کرانے کی، کسی قبر پر چراغاں کرنے یا میلہ اور عرس کرانے کی تو ایسی وصیت کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ "جَنَفًا" سے مراد دلی میلان کی بنا پر غلطی یا بھول چوک سے طرف داری ہو جائے اور "اِثْمًا" سے مراد جان بوجھ کر کسی کی حق تلفی ہو۔ "فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ" یعنی وارثوں کو سمجھا بجھا کر ان میں صلح کرا دے۔

آیت 184،183 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ ...... : روزہ ان پانچ فرائض میں داخل ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔ [بخاری، الإیمان، باب دعاؤکم إیمانکم : ۸]

② **الصِّيَامُ** : یہ مصدر ہے، یہ " صَوْمٌ " کی جمع نہیں، بلکہ "صَوْمٌ" بھی مصدر ہے، اصل میں یہ کسی بھی کام سے رک جانے کو کہتے ہیں، کھانا پینا ہو یا کلام ہو یا چلنا پھرنا، اسی لیے گھوڑا چلنے سے یا چارا کھانے سے رکا ہوا ہو تو اسے " فَرَسٌ صَائِمٌ " کہتے ہیں، رکی ہوئی ہوا کو بھی " صَوْمٌ " کہتے ہیں۔ (راغب) شریعت میں روزہ کی نیت سے صبح صادق سے سورج غروب ہونے تک کھانے پینے اور جماع سے رکے رہنے کا نام صوم ہے۔

③ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** : یہ روزے کی حکمت بیان فرمائی ہے کہ اسلامی روزے کا مقصد نفس کو عذاب دینا نہیں بلکہ دل میں تقویٰ یعنی بچنے کی عادت پیدا کرنا ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے صبح سے شام تک ان حلال چیزوں سے بچے گا تو وہ ان چیزوں سے جو ہمیشہ کے لیے حرام ہیں، ان سے روزہ کی حالت میں بدرجۂ اولیٰ بچے گا۔ اس طرح روزہ گناہوں سے بچنے کا اور بچنے کی عادت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ » "روزہ (گناہوں اور آگ سے) ڈھال ہے۔" [بخاری، الصیام، باب فضل الصوم : ۱۸۹٤] اور فرمایا: "جو شخص جھوٹی بات اور اس پر عمل نہ چھوڑے اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" [بخاری، الصیام، باب من لم یدع قول الزور : ۱۹۰۳، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ] روزہ رکھ کر نماز نہ پڑھنے والے، جھوٹ بولنے والے، دھوکا دینے والے، سارا دن ٹی وی پر کان اور آنکھ کے زنا میں مصروف رہنے والے، غرض کسی بھی نافرمانی کا ارتکاب کرنے والے سوچ لیں کہ انھیں روزہ رکھنے سے کیا ملا؟

④ پہلے لوگوں سے مراد یہود و نصاریٰ اور پہلی امتیں ہیں۔ روزے کی یہ فرضیت ۲ ہجری میں نازل ہوئی اور روزے نے موجودہ شکل بتدریج اختیار کی۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ قریش (عاشورا) دس محرم کا روزہ رکھتے تھے اور نبی ﷺ بھی رکھتے تھے، جب مدینہ میں آئے تو اس دن کا روزہ رکھا اور اس کے رکھنے کا حکم دیا، پھر جب رمضان (کے روزوں کا حکم) نازل ہوا تو رمضان (کے روزے) فرض ہو گئے اور عاشورا ترک ہو گیا، پھر جو چاہتا اسے رکھتا اور جو چاہتا نہ رکھتا۔ [بخاری، التفسیر،

الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ایک مسکین کا کھانا ہے، پھر جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو﴿۱۸۴﴾

باب : ﴿ یأیها الذین آمنوا کتب ...... ﴾ : ۴۵۰۴]

⑤ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ : صحیح سند کے ساتھ اس کی دو تفسیریں آئی ہیں۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ تو جو چاہتا کہ روزہ نہ رکھے اور فدیہ دے دے تو ایسا کر لیتا، یہاں تک کہ وہ آیت اتری جو اس کے بعد ہے، تو اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا۔ [بخاري، کتاب التفسير، باب : ﴿ فمن شهد منكم الشهر ﴾ : ۴۵۰۷] ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا۔ [بخاري، الصوم، باب : ﴿ و علی الذين يطيقونه ...... ﴾ : ۱۹۴۹] یعنی چونکہ شروع میں لوگوں کو روزے کی عادت نہ تھی، اس لیے انھیں یہ رعایت دی گئی کہ جو چاہے روزہ رکھ لے جو چاہے نہ رکھے اور فدیہ دے دے، بعد میں دوسری آیت سے یہ رعایت منسوخ ہو گئی۔ اکثر علماء نے یہی تفسیر کی ہے۔

دوسری تفسیر صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آئی ہے، انھوں نے ''يُطِيْقُوْنَهٗ'' کی جگہ " يُطَوَّقُوْنَهٗ " پڑھا، جس کا معنی ہے: " يَتَجَشَّمُوْنَهٗ " یعنی اس سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ (ابن عاشور رحمہ اللہ نے "التحرير والتنوير" میں فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "يُطَوَّقُوْنَهٗ" کو بطور قراءت نہیں بلکہ "يُطِيْقُوْنَهٗ" کی تفسیر کے طور پر پڑھا ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، یہ منسوخ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت ہیں جو روزہ نہیں رکھ سکتے، وہ ہر دن (یعنی ہر روزے) کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ [بخاري، التفسير، باب : ﴿ أيامًا معدودات ...... ﴾ : ۴۵۰۵] بخاری ہی میں مذکور ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے بوڑھے ہونے کے بعد ایک یا دو سال ہر دن ایک مسکین کو گوشت کے ساتھ روٹی کھلا دی اور روزہ نہ رکھا۔ [بخاري التفسير، باب : ﴿ أيامًا معدودات ...... ﴾، قبل ح : ۴۵۰۵]

⑥ يُطِيْقُوْنَهٗ : اس کا معنی ''جو اس (روزے) کی طاقت رکھتے ہوں'' بھی ہو سکتا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو معنی کیا ہے کہ ''طاقت نہ رکھتے ہوں'' وہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں باب افعال ازالۂ ماخذ کے لیے ہوگا، جیسے کہا جاتا ہے: " شَكَا اِلَيَّ فَاَشْكَيْتُهٗ" اس نے میرے پاس شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت دور کر دی۔ دونوں کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت روزے کی طاقت رکھنے والے کے حق میں منسوخ ہے اور طاقت نہ رکھنے والے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے حق میں منسوخ نہیں اور جس بیمار کے تندرست ہونے کی امید نہ ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

⑦ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا: یعنی ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھلا دے۔ [طبری عن ابن عباس رضی اللہ عنہما بسند صحیح] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہر دن کی جگہ نصف صاع فدیہ دے دے۔ [ابن ابی حاتم بسند حسن، التفسیر الصحیح] ایک روزے کی جگہ ایک کلو اناج فدیہ دے دے یا ایک مسکین کو بلا کر کھانا کھلا دے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا، جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ہدایت کی اور (حق و باطل میں) فرق کرنے کی واضح دلیلیں ہیں، تو تم میں سے جو اس مہینے میں حاضر ہو وہ اس کا روزہ رکھے اور جو بیمار ہو یا کسی سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنا ہے اللہ تمھارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمھارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، اس پر جو اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۸۵﴾

آیت 185 ① یعنی وہ ”اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ“ ماہ رمضان ہیں۔

② **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ :** یعنی اس ماہ لیلۃ القدر میں قرآن کا نزول شروع ہوا، پھر تیئیس برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ماہِ رمضان کو قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق ہے، اس میں کثرت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت اور قیام ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں ہر رات جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے۔ [بخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي : ٦] صحابہ کرام اور دوسرے سلف صالحین کے عمل سے بھی رمضان میں قرآن سے خصوصی شغف ثابت ہے۔ بہت سی احادیث میں ماہِ رمضان کی راتوں میں قیام کی فضیلت آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان کا قیام کیا، اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔“ [بخاري، الصوم، باب فضل من قام رمضان : ٢٠٠٩] ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی ۲۳ ویں، ۲۵ ویں اور ۲۷ ویں رات جماعت کے ساتھ قیام کروایا۔ [أبو داوٗد، تفريع أبواب شهر رمضان، باب في قيام شهر رمضان : ١٣٧٥، بسند صحيح] ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کس طرح تھی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ آپ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ [بخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان : ٢٠١٣] عمر رضی اللہ عنہ نے تمام لوگوں کو ایک امام پر جمع کر دیا، چنانچہ ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت قیام کروائیں۔ [الموطأ، باب قيام شهر رمضان : ٢٤١ بسند صحيح] بیس رکعت پڑھنا یا اس کا حکم دینا صحیح سند کے ساتھ نہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے نہ عمر رضی اللہ عنہ سے۔ بعض روایات میں عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعض لوگوں سے بیس رکعت پڑھنے کا ذکر آیا ہے، موطا کی صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کو خاص طور پر گیارہ رکعت کا حکم انھی لوگوں کے اس عمل کو ختم

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں ﴿۱۸۶﴾

کرنے کے لیے دیا تھا۔

3 هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ: یعنی قرآن لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس کے ساتھ اس میں ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے والے دلائل بھی ہیں۔ ہدایت ایک عام ہوتی ہے اور ایک وہ ہدایت جس کے ساتھ دلیل بھی ہو، سو اس میں صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ اس کے دلائل بھی ہیں۔ (التسہیل)

4 فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ: یعنی اس ماہ کا چاند طلوع ہونے کے بعد جو گھر میں موجود ہو وہ ضرور روزہ رکھے۔

5 وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: اس آیت سے علمائے کرام نے روزوں کی تکمیل پر اس کا شکر ادا کرنے کے لیے عید الفطر کا اہتمام اور اس کے لیے جاتے اور واپس آتے ہوئے تکبیرات کا اہتمام اخذ کیا ہے۔ جس کی عملی تفسیر احادیث رسول ﷺ سے ملتی ہے۔

آیت 186 1 اس آیت سے پہلے اور بعد میں ماہِ رمضان کا ذکر ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہِ رمضان، خصوصاً روزے کی حالت دعا کی قبولیت کا خاص سبب ہے اور پھر افطار کا وقت قبولیتِ دعا کا وقت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”روزے دار کے لیے افطار کے وقت ایک قبول کی جانے والی دعا ہے (یعنی رد نہیں ہوتی)۔“ [ابن ماجه، الصیام، باب في الصائم لا ترد دعوته : ۱۷۵۳] چنانچہ حدیث کے راوی عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما جب روزہ افطار کرتے تو اپنے اہل و اعیال کو بلاتے اور دعا کرتے۔ [مسند أبي داؤد الطیالسی : ۲۲۶۲] یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ [ھدایة المستنیر]

2 اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ”عِبَادِيْ“ کہہ کر اپنے بندوں پر اپنی خاص رحمت ظاہر کی ہے اور پھر اپنے قریب ہونے کا ذکر کر کے دعا کرنے کی ترغیب دی ہے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے جس میں نہ کوئی گناہ ہو اور نہ قطع رحمی، مگر اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے ایک عطا فرما دیتا ہے، یا تو اس کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے، یا آخرت میں اس کا ذخیرہ کر لیتا ہے، یا اس سے اتنی برائی ٹال دیتا ہے۔“ صحابہ نے کہا: ”پھر تو ہم بہت دعا کریں گے۔“ فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے کہیں زیادہ ہے۔“ [مسند أحمد : ۱۸/۳، ح : ۱۱۳۹ – صحیح]

3 فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ: دعا کی قبولیت کے سلسلے میں دو حکم دیے، ایک تو یہ کہ ان پر بھی لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں۔ اگر کوئی شخص اللہ کے احکام پر عمل نہیں کرتا تو خواہ وہ دعویٰ کرتا رہے مگر (توبہ کے بغیر) اس کے دل میں اللہ کی رحمت کی

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

تمھارے لیے روزے کی رات اپنی عورتوں سے صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنی جانوں کی خیانت کرتے تھے تو اس نے تم پر مہربانی فرمائی اور تمھیں معاف کر دیا، تو اب ان سے مباشرت کرو اور طلب کرو جو اللہ نے تمھارے لیے لکھا ہے اور کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ تمھارے لیے سیاہ دھاگے سے سفید دھاگا فجر کا خوب ظاہر ہو جائے، پھر روزے کو رات تک

امید کا چراغ روشن نہیں ہوتا۔ (دیکھیے بقرہ : ۲۱۸) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا، جو طویل سفر کرتا ہے، بکھرے ہوئے بالوں والا ہے، غبار سے بھرا ہوا ہے، وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلاتا ہے (اور کہتا ہے) ''یا رب ! یا رب !'' حالانکہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام اور وہ حرام غذا کے ساتھ پلا بڑھا ہے تو اس کی دعا کیسے قبول کی جائے؟ [مسلم، الزکوۃ، باب قبول الصدقۃ ...... : ۱۰۱۵] دوسرا حکم یہ کہ مجھ پر ایمان لائیں اور یقین رکھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول کی جاتی ہے، جب تک کہ کوئی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے، بشرطیکہ جلدی بھی نہ کرے۔'' پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ ! وہ جلدی کیا ہے؟'' فرمایا: ''یہ کہ کوئی کہے کہ میں نے دعا کی اور میں نے (دوبارہ) دعا کی تو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ میری دعا قبول کرتا ہو، سو اس وقت وہ تھک ہار کر رہ جائے اور دعا کرنا چھوڑ دے۔'' [مسلم، الذکر والدعاء، باب بیان أنه یستجاب ...... : ۲۷۳۵/۹۲]

آیت 187 ① ابن کثیر میں ہے کہ ابتدا میں جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو روزہ کھولنے سے لے کر صرف نماز عشاء تک کھانا پینا اور عورت سے صحبت جائز تھی، اگر کسی شخص نے عشاء کی نماز پڑھ لی، یا وہ اس سے پہلے سو گیا تو اس کا روزہ شروع ہو جاتا تھا، پھر اگلے روز افطار یعنی سورج غروب ہونے تک کھانا پینا اور جماع اس پر حرام ہوتا تھا، بعض لوگ ضبط نہ کر سکے اور رات کو بیویوں سے صحبت کر بیٹھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں لوگ جب عشاء کی نماز پڑھ لیتے تو ان پر کھانا پینا اور بیویاں حرام ہو جاتی تھیں اور وہ اگلی شام تک کے لیے روزے دار ہو جاتے تھے...... تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔ [أبو داؤد، الصیام، باب مبدأ فرض الصیام : ۲۳۱۳] ایک انصاری صحابی قیس بن صرمہ رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت ہے کہ وہ روزے کی حالت میں دن بھر کھیت میں کام کرتے رہے، افطار کے وقت گھر آئے اور بیوی سے پوچھا، کوئی چیز کھانے کے لیے ہے؟ بیوی نے جواب دیا نہیں، آپ ٹھہریے، میں جا کر پڑوسیوں سے کچھ لاتی ہوں۔ بیوی کے چلے جانے کے بعد ان کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گئے۔ بیوی کو یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا، پھر اگلے دن انھیں (بغیر کھائے پیے ہی) روزہ رکھنا پڑا۔ ابھی

الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

پورا کرو اور ان سے مباشرت مت کرو جب کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنی آیات لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۱۸۷﴾

آدھا دن نہیں گزرا تھا کہ کمزوری کی وجہ سے غش کھا گئے۔ اس کا علم رسول اللہ ﷺ کو ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ [بخاری، الصوم، باب قول اللہ جل ذکرہ : ﴿ أحل لكم ...... ﴾ : ۱۹۱۵۔ أبو داوٗد : ۲۳۱۴]

❷ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ...... : یعنی میاں بیوی ایک دوسرے سے لباس کی طرح مل جاتے ہیں، انھیں جدا رکھنا یقیناً ان پر شاق ہوگا، اس لیے انھیں رمضان کی راتوں میں مباشرت کی اجازت دے دی گئی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کا آپس میں کوئی پردہ نہیں، بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ''وہ ایک دوسرے کی شرم گاہ کو نہیں دیکھ سکتے'' ان کے ایک دوسرے کا لباس ہونے کے منافی ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کر لیتے، جو میرے اور آپ کے درمیان ہوتا، جبکہ ہم دونوں جنبی ہوتے۔'' [بخاری، الحیض، باب مباشرۃ الحائض : ۲۹۹] عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی روایت کہ میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شرم گاہ نہیں دیکھی، صحیح نہیں۔ [دیکھیے ضعیف ابن ماجہ للألبانی : ٦٦٨]

❸ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ : اس سے صحبت کی لذت کے ساتھ ساتھ پاک دامنی کا حصول اور اولاد کی طلب مراد ہے۔ کفار کی خواہش کے مطابق مسلمانوں کا اولاد کی کثرت سے اجتناب جائز نہیں۔

❹ فجر کے سفید دھاگے سے مراد صبح صادق ہے۔ اس ''سفید دھاگے'' اور ''سیاہ دھاگے'' کے سمجھنے میں بعض صحابہ کو غلط فہمی ہوگئی۔ انھوں نے سرہانے کے ساتھ سفید دھاگا اور سیاہ دھاگا رکھ لیا اور اس کے واضح ہونے کا انتظار کرتے رہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس سے مراد رات کی سیاہی سے صبح کی سفیدی واضح ہونا ہے۔'' [بخاری، الصوم، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ و كلوا واشربوا ...... ﴾ : ۱۹۱٦، عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ] معلوم ہوا کہ قرآن سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ حدیث بھی ضروری ہے۔

❺ فجر تک کھانے پینے اور جماع کی اجازت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جنابت کی حالت میں روزہ رکھ سکتا ہے، غسل اذان کے بعد کر لے، رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ ثابت ہے۔ [بخاری، الصوم، باب الصائم یصبح جنبا : ۱۹۲۵، ۱۹۲٦، ۱۹۳۰]

❻ اِلَى الَّيْلِ : یعنی سورج غروب ہونے تک۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دین اس وقت تک غالب رہے گا جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے، کیونکہ یہود و نصاریٰ دیر سے افطار کرتے ہیں۔'' [أبو داوٗد، الصیام، باب ما یستحب من تعجیل الفطر : ۲۳۵۳]

❼ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ : رمضان سے چونکہ اعتکاف کا خاص تعلق ہے، اس لیے یہاں اعتکاف کے احکام کی طرف اشارہ فرما دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء محدثین روزے کے عنوان کے بعد اعتکاف کا عنوان باندھتے ہیں۔ اعتکاف کا معنی اپنے

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳

اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ اور نہ انھیں حاکموں کی طرف لے جاؤ، تاکہ لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۱۸۸﴾

آپ کو کسی کے ساتھ یا کسی جگہ روک کر رکھنا ہے۔ (راغب) اعتکاف میں بیوی سے مباشرت جائز نہیں، نہ مسجد سے نکلنا ہی جائز ہے، سوائے ایسی ضرورت کے جس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ اگر مباشرت کرے گا یا مجبوری والی ضرورت کے بغیر نکلے گا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ ہاں مسجد میں جا کر عورت اپنے خاوند سے ملاقات کر سکتی ہے، جیسا کہ بعض ازواجِ مطہرات نے مسجد میں رسول اللہ ﷺ سے جا کر ملاقات کی اور بیوی خاوند کی خدمت بھی کر سکتی ہے۔ [بخاري، الاعتكاف، باب هل يخرج المعتكف ...... : ۲۰۳۵، ۲۰۳۰، ۲۰۳۱]

❽ فِي الْمَسٰجِدِ: اس لفظ سے معلوم ہوا کہ اعتکاف گھر میں نہیں ہوتا، مسجد میں ہوتا ہے، عورت ہو یا مرد۔ نبی ﷺ کی بیویاں مسجد میں اعتکاف کرتی تھیں۔ [بخاري، الصوم، باب اعتكاف النساء : ۲۰۳۳، ۲۰۳٤] اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے۔ وہ روایت کہ ''تین مسجدوں کے سوا اعتکاف نہیں'' منکر ہے۔ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے غیر ثابت ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے لیے باب قائم کیا ہے: '' اَلْاِعْتِكَافُ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا '' ''تمام مسجدوں میں اعتکاف (کے جائز) ہونے کا بیان۔'' مسئلہ: احادیث میں سحری کے وقت کھانا کھا کر روزہ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سحری کھاؤ، کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔'' [بخاري، الصوم، باب بركة السحور من غير إيجاب : ۱۹۲۳۔ مسلم : ۱۰۹۵] اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان فرق سحری کھانے کا ہے۔'' [مسلم، الصيام، باب فضل السحور ...... : ۱۰۹٦] لہٰذا سحری کے وقت کچھ کھا پی کر روزہ رکھنا چاہیے۔

❾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا: یہ احکام یعنی صبح صادق تک مباشرت اور کھانے پینے کا جائز ہونا، فجر سے سورج غروب ہونے تک ان چیزوں کی ممانعت اور اعتکاف کی حالت میں عورتوں سے مباشرت کی ممانعت، یہ کام اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، ان کی سختی سے پابندی کرو۔ (ابن کثیر)

آیت 188 ❶ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ ...... : روزے کی حالت میں اللہ کے حکم سے آدمی تین نہایت مرغوب اور حلال چیزیں ترک کر دیتا ہے، اس مناسبت سے اب حرام سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ جو مال بھی ناجائز طریقے سے حاصل کیا جائے، خواہ اس میں مالک کی رضامندی بھی شامل ہو، وہ باطل (یعنی ناحق) طریقے سے کھانا ہے، مثلاً سود، زنا کی اجرت، نجومی کی فیس، شراب کی فروخت، لاٹری یا جوئے کے ذریعے سے کمائی یا گانے بجانے کی اجرت، الغرض تمام ناجائز وسائل باطل کے ساتھ کمانے میں آ جاتے ہیں۔

❷ تُدْلُوْا: یہ باب افعال کے مصدر '' اِدْلَاءٌ '' سے جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے، جو '' دَلْوٌ '' سے بنا ہے، جس کا معنی ڈول ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

وہ تجھ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کے ذریعے ہیں اور نیکی ہرگز یہ نہیں کہ گھروں میں ان کی پچھلی طرفوں سے آؤ، اور بلکہ نیکی اس کی ہے جو بچے۔ اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۱۸۹﴾

" اِدْلَاءٌ " کا اصل معنی ڈول ڈالنا ہے، جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے: ﴿ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ﴾ [یوسف : ۱۹] ''تو اس نے اپنا ڈول ڈالا۔'' پھر کوئی چیز کسی کی طرف لے جانے یا بھیجنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ حکام کی طرف لے جانے کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مراد ہیں، ایک یہ کہ آدمی کو معلوم ہے کہ فلاں زمین یا مال فلاں شخص کا ہے، مگر اس کے پاس ثبوت نہیں، اگر میں مقدمہ کر دوں تو عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ کروانے میں کامیاب ہو جاؤں گا، چنانچہ وہ حاکم کے پاس مقدمہ لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ﴿ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ یعنی جانتے ہوئے ایسا کرنا تو نہایت برا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یاد رکھو! میں ایک بشر ہی ہوں اور میرے پاس جھگڑنے والے آتے ہیں، تو شاید ان میں سے ایک اپنی دلیل بیان کرنے میں دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو تو میں اسے سچا سمجھتے ہوئے اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، سو میں جس کے لیے کسی مسلمان کے حق کا فیصلہ کر دوں تو وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، خواہ وہ اسے لے لے یا اسے چھوڑ دے۔'' [بخاری، المظالم، باب إثم من خاصم فی باطل و هو یعلمه : ۲۴۵۸]

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قاضی جس کے حق میں کسی چیز کا فیصلہ کر دے وہ اس کے لیے حلال ہو جاتی ہے، لیکن اس آیت اور حدیث سے ان کی بات کا باطل ہونا ظاہر ہے۔ دوسرا معنی اس آیت کا یہ ہے کہ حکام کو بطور رشوت مال دے کر دوسرے کا حق باطل طریقے سے نہ کھاؤ۔ " رِشَاءٌ " ڈول کی رسی کو کہتے ہیں، جس کے ذریعے سے پانی نکالا جاتا ہے، اسی طرح راشی رشوت کے ذریعے سے اپنا مطلب حاصل کرتا ہے۔ " رَاشِيْ " رشوت دینے والا اور " مُرْتَشِيْ " رشوت لینے والا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی۔ [ترمذی، الأحکام، باب ما جاء فی الراشی ...... : ۱۳۳۷، و صححه الألبانی] اگر اپنا حق لینے کے لیے تاوان دینا پڑے تو یہ رشوت نہیں، اگرچہ جہاں تک ہو سکے اس سے بھی بچنا لازم ہے، کیونکہ یہ گناہ میں اور بری عادت ڈالنے میں مدد ہے، ہاں کوئی بے بس ہو جائے تو الگ بات ہے۔

آیت 189 ① الْاَهِلَّةِ : یہ " هِلَالٌ " کی جمع ہے۔ پہلی اور دوسری رات کے چاند کو ہلال کہا جاتا ہے، پھر اسے ''قمر'' کہا جاتا ہے۔ (راغب) لوگوں نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت دریافت کی تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ چاند ہر ماہ ہلال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، پھر وہ چودھویں کو پورا (بدر) ہو جاتا ہے۔ آخری رات بالکل غائب ہو جاتا ہے، پھر دوبارہ نئے چاند کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے، جس سے شہروں اور بستیوں کے علاوہ صحراؤں اور سمندروں میں رہنے والوں کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نیا مہینا شروع ہو گیا ہے اور وہ اس کی مختلف حالتوں سے تاریخ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ جب کہ سورج

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

اور اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۱۹۰﴾

ہمیشہ مکمل رہتا ہے، اس کے حساب سے وقت اور تاریخ معلوم کرنا دنیا کے ہر حصے میں رہنے والوں کے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بدلنے والے چاندوں کو بطور کیلنڈر مقرر فرمایا، حج، کفارات اور معاملات، مثلاً طلاق اور وفات کی عدت چاند کے لحاظ ہی سے مقرر فرمائی۔ ہر ماہ طلوع ہونے والے چاندوں کے لحاظ سے ''الْاَهِلَّةِ'' جمع ذکر فرمایا۔

② وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا...... : حج کا ذکر آیا تو ایام حج میں جاہلیت کی ایک رسم کا رد فرمایا۔ براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی، انصار جب حج کرتے، پھر (واپس) آتے تو اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل نہیں ہوتے تھے، اب انصار کا ایک آدمی (حج سے) آیا اور اپنے دروازے کی طرف سے داخل ہو گیا تو گویا اسے اس کی عار دلائی گئی تو یہ آیت اتری: ﴿ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ﴾ [بخاری، العمرة، باب قول الله تعالٰی : ﴿ و أتوا البیوت من أبوابها ﴾ : ۱۸۰۳]

دوسری روایت میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جاہلیت میں جب لوگ احرام باندھ لیتے تو گھروں کی پچھلی طرف سے گھر آتے، تو اس پر یہ آیت اتری۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولیس البر بأن تأتوا البیوت ...... ﴾ : ۴۵۱۲] آیت میں دونوں کا رد ہے۔

③ ''وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ'' اس میں ''لَیْسَ'' کی تاکید ''باء'' کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے ''نیکی ہرگز یہ نہیں۔''

آیت 190 ① مسلمان عمرہ کے لیے آئے تو کفار لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ حج کے بیان کے ساتھ لڑائی کے حکم کی مناسبت یہ ہے۔

② بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس آیت میں صرف ان کفار سے لڑنے کا حکم ہے جو خود لڑنے میں پہل کریں ''لَا تَعْتَدُوْا'' (زیادتی نہ کرو) کا معنی انھوں نے یہ کیا کہ تم لڑائی میں پہل نہ کرو، پھر ان مفسرین نے اسے ان آیات کے ساتھ منسوخ قرار دیا جن میں تمام کفار سے لڑنے کا حکم ہے، وہ پہل کریں یا نہ کریں، مثلاً : ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً ﴾ [التوبة : ۳٦] ''اور مشرکوں سے ہر حال میں لڑو۔'' اور فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ ﴾ [التوبة : ۱۲۳] ''ان لوگوں سے لڑو جو کافروں میں سے تمھارے قریب ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [التوبة : ۲۹] ''لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر۔'' مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت نہ دوسری آیات کے خلاف ہے، نہ منسوخ ہے اور نہ ''لَا تَعْتَدُوْا'' کا معنی یہ ہے کہ لڑنے میں پہل نہ کرو، بلکہ اس میں مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے کہ جب وہ لڑنے سے دریغ نہیں کرتے تو تم بھی ان سے لڑو اور جن جن جگہوں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم بھی انھیں وہاں سے نکالو۔ (ابن کثیر) اور ''لَا تَعْتَدُوْا'' کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ بچوں اور

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور انھیں وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو انھیں قتل کرو، ایسے ہی کافروں کی جزا ہے ﴿۱۹۱﴾ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۹۲﴾

عورتوں کو قتل نہ کرو، نہ بوڑھوں کو اور نہ اس کو جو صلح کی پیش کش کرتا ہے اور لڑنے سے ہاتھ روک لیتا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو زیادتی کرو گے۔ (ابن کثیر) بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی شخص کو کسی لشکر کا امیر مقرر فرماتے تو اسے اور باقی مومنوں کو نصیحت فرماتے: ''اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جو اللہ کا منکر ہے اس سے لڑو۔ جنگ کرو، خیانت نہ کرو، نہ عہد شکنی کرو، نہ مثلہ کرو، نہ بچوں کو قتل کرو اور نہ درویشوں، راہبوں کو۔'' [مسلم، الجهاد، باب تأمير الإمام الأمراء على البعوث...... : ۱۷۳۱] امام طبری نے فرمایا: ''یہی معنی درست ہے، کیونکہ نسخ کا دعویٰ کرنے والوں کے پاس کوئی دلیل نہیں اور دلیل کے بغیر دعویٰ تو ہر شخص کر سکتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس پیشکش کے بعد کہ ''مسلمان ہو جاؤ یا جزیہ دو یا لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ'' اگر کوئی شخص نہیں لڑتا، بلکہ مسلمان ہو جاتا ہے، یا جزیہ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اس سے لڑنا زیادتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں۔

آیت 192،191 ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور ۹ ہجری میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا اور انھیں سورۂ توبہ میں مذکور اعلان کرنے کا حکم دیا جس کے مطابق مشرکین کو چار ماہ تک مکہ میں اور سرزمین عرب میں چلنے پھرنے کی اجازت دی گئی، اس کے بعد مسلمان نہ ہونے کی صورت میں وہ جہاں ملیں انھیں قتل کرنے کا حکم دے کر جزیرۂ عرب سے نکال دیا گیا۔ دیکھیے سورۂ توبہ کی پہلی پانچ آیات۔ پھر یہود کو بھی پہلے مدینہ سے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرزمین عرب سے نکال دیا گیا۔ یہ سب اسی " اَخْرِجُوْهُمْ " کے حکم کی تعمیل تھی۔

② **اَلْفِتْنَةُ** : اس کا اصل معنی آزمائش میں ڈالنا ہے، مفسرین سلف نے اس کا معنی شرک کیا ہے اور ﴿ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک تو یہ کہ بے شک مشرکین کو قتل کرنے کا حکم بڑی سخت بات ہے، مگر وہ جس طرح شرک پر اڑے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے انھیں دوبارہ مشرک بنانے کے لیے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہیں، ان کا یہ شرک کرنا اور مسلمانوں کو اس پر مجبور کرنا اس سے بھی سخت جرم ہے۔ لہٰذا اس جرم کی پاداش میں کسی اندیشے اور سوچ بچار کے بغیر انھیں بے دریغ قتل کرو، یہاں تک کہ اللہ کا دین اتنا غالب ہو جائے کہ کسی کو مسلمان ہونے والے شخص پر ظلم و ستم کر کے اسے دین سے برگشتہ کرنے کی جرأت باقی نہ رہے۔ دوسرا معنی امام طبری رحمہ اللہ نے یہ کیا ہے کہ کسی مومن کو اسلام قبول

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر کوئی زیادتی نہیں ﴿۱۹۳﴾

کرنے پر آزمائش میں ڈالنا، یہاں تک کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو کر دوبارہ مشرک بن جائے، اس مومن کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ اور نقصان دہ ہے کہ وہ اسلام پر قائم رہتا اور اسی پر قتل ہو جاتا (کیونکہ قتل تو ایک ہی دفعہ ہو جاتا ہے، جب کہ کفار کی طرف سے سزا اور عذاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے)۔ (طبری) مجاہد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ مومن کا بت پرستی کی طرف لوٹ جانا اس پر قتل ہونے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ بے شک ان کفار کو قتل کرنا بڑی سخت بات ہے، مگر جو معاملہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں وہ ان کے لیے قتل ہو جانے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے، تو مسلمانوں کو قتل ہو جانے سے بھی بڑی تکلیف اور آزمائش میں مبتلا کرنے کے مقابلے میں مسلمانوں کا انھیں قتل کرنا کم سخت ہے۔ ﴿ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ کے الفاظ میں دونوں معنی موجود ہیں اور یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔

③ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ: یعنی سرزمین مکہ حرم ہے، اس میں قتل و قتال منع ہے، مگر کفار اس میں لڑنے کی ابتدا کریں تو تمھارے لیے بھی لڑنا جائز ہے، پھر اگر وہ لڑائی کریں تو پھر تم صرف قتال (لڑائی) ہی نہیں بلکہ انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی جزا ہے۔ ''الْكٰفِرِيْنَ'' میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ''ایسے کافروں'' کیا گیا ہے۔

آیت 193 ① یعنی ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ (شرک اور اس پر مجبور کرنے کے لیے ظلم و ستم) کا ہر طرح سے قلع قمع نہیں ہوتا اور اللہ کا دین ہر طرح سے غالب نہیں آ جاتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ یہ کام کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے اموال مجھ سے محفوظ کر لیے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔'' [بخاري، الإيمان، باب : ﴿ فإن تابوا وأقاموا...... ﴾ : ٢٥]

② اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ: یعنی اگر یہ شرک سے یا مسلمانوں کے ساتھ لڑائی سے باز آ جائیں تو اس کے بعد جو شخص ان سے جنگ کرے گا وہ ظالم ہے اور اسے اس زیادتی کی سزا ملے گی۔ یہاں ''عُدْوَانَ'' کا لفظ ایسی ہی سزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (ابن کثیر) دوسرا معنی یہ ہے کہ اگر وہ ظلم یعنی شرک سے باز آ جائیں تو اب ان پر زیادتی جائز نہیں، کیونکہ اب وہ ظالم نہیں۔ عدوان سے مراد وہ زیادتی ہے جو مقابلے میں ہوتی ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے: ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرة : ١٩٤] ''پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔'' (ابن کثیر)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۖۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور سب حرمتیں ایک دوسری کا بدلہ ہیں۔ پس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

آیت 194 رسول اللہ ﷺ جب ذوالقعدہ ۶ ھ میں عمرہ کے لیے تشریف لے گئے، تو کفار نے مزاحمت کی اور عمرہ سے روک دیا، مگر آخر کار صلح ہو گئی اور قرار پایا کہ مسلمان آئندہ سال عمرہ کر لیں۔ یہ معاہدہ صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے، پھر جب دوسرے سال ۷ھ میں مسلمان عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تو انھیں اندیشہ ہوا کہ ماہ حرام اور حرم مکہ میں تو لڑائی منع ہے، لیکن اگر کفار نے بدعہدی کی اور ہمیں عمرہ سے روک دیا تو ہم کیا کریں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر) یعنی (حرمت والے مہینوں کی حرمت کی پاس داری کفار کی طرف سے ان کی حرمت کی پاس داری کے مقابلے میں ہے) اگر وہ حرام مہینوں کا لحاظ نہ کریں تو تم بھی نہ کرو اور اگر وہ بدعہدی کریں تو تم بھی حرم کا لحاظ مت کرو۔ (قرطبی، ابن کثیر) واضح رہے کہ حرمت والے مہینے چار ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ اگرچہ زیادتی کے جواب کو زیادتی نہیں کہا جاتا، بلکہ وہ عین حق ہے، مگر یہ صرف لفظ کی حد تک مشابہت ہے کہ ”فَمَنِ اعْتَدٰى“ کے مقابلے میں لفظ ”فَاعْتَدُوْا“ آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: ۴۰] ”اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے۔“

آیت 195 اس سے پہلی آیت میں قتال فی سبیل اللہ کا حکم ہے، یہ آیت بھی اسی حکم کی تکمیل ہے، یعنی جہاد میں اور اس کی تیاری میں خرچ کرتے رہو اور اس میں کوتاہی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، کیونکہ اس صورت میں کفار تم پر غالب آ جائیں گے، جو سراسر ہلاکت ہے۔ اسلم تُجیبی کہتے ہیں کہ ہم مدینۂ روم (قسطنطنیہ) میں تھے، انھوں نے ہمارے مقابلے کے لیے رومیوں کی ایک بہت بڑی جماعت نکالی، ان کے مقابلے میں اتنے ہی یا ان سے زیادہ مسلمان نکلے، اہل مصر پر عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور جماعت پر فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ (امیر) تھے۔ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے رومیوں کی صف پر حملہ کر دیا، یہاں تک کہ ان میں داخل ہو گیا، لوگ چیخ اٹھے اور کہنے لگے، سبحان اللہ! یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے، تو ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، انھوں نے فرمایا، تم آیت کا یہ مطلب سمجھتے ہو؟ حالانکہ یہ تو ہم انصار کی جماعت کے بارے میں نازل ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی اور اس کے مددگار بہت ہو گئے تو ہم میں سے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے چھپا کر دوسروں سے کہا کہ ہمارے اموال (یعنی کھیت اور باغات وغیرہ) ضائع ہو گئے، اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخشی ہے اور اس کے مددگار بہت ہو گئے ہیں، چنانچہ ہم اگر اپنے اموال میں ٹھہر جائیں اور جو ضائع ہو گئے ہیں انھیں درست کر

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ

اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو قربانی میں سے جو میسر ہو (کرو) اور اپنے سروں کو نہ مونڈو،

لیں (تو بہتر ہے)، تو اللہ تعالیٰ نے ہماری بات کی تردید کرتے ہوئے یہ آیت اتار دی: ''اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف مت ڈالو۔'' [البقرۃ : ۱۹۵] تو ''ہلاکت'' ہمارا اپنے اموال میں ٹھہر جانا، انھیں درست کرنا اور جنگ کو چھوڑ دینا تھا۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ اللہ کے راستے ہی میں نکلے رہے یہاں تک کہ روم کی سرزمین میں دفن ہوئے۔ [ترمذی، التفسیر، باب و من سورۃ البقرۃ : ۲۹۷۲، و صححہ الألبانی] حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت نفقہ کے بارے میں تری۔ [بخاری، قبل ح : ۴۵۱۶] ابو اسحاق سبیعی کہتے ہیں کہ میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اگر آدمی مشرکین پر حملہ کر دے تو کیا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا ہوگا؟ انھوں نے فرمایا، نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا: ﴿ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ ﴾ [النساء : ۸۴] ''پس اللہ کے راستے میں جنگ کر، تجھے تیری ذات کے سوا کسی کی تکلیف نہیں دی جاتی۔'' [أحمد : ۲۸۱/۴، ح : ۱۸۴۷۷، وھو حسن]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اس آیت کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ جب کسی اکیلے فدائی مسلم کے حملے سے دشمن کو نقصان پہنچنے کی امید ہو، یا اہل اسلام کی شجاعت سے کفار کے حوصلے پست کرنا مقصود ہو، یا شہادت پیش کیے بغیر دشمن کو نقصان پہنچانا ممکن نہ ہو تو فدائی حملے بالکل درست ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ جہاد چھوڑ کر کاروبار میں مصروف ہو جانا اصل ہلاکت ہے۔ تاریخ اسلام میں غزوۂ بدر میں ابو جہل کے قاتل معوذ اور معاذ، غزوۂ خیبر میں ابو رافع یہودی کے قاتل عبد اللہ بن عتیک، مدینہ میں کعب بن اشرف کے قاتل محمد بن مسلمہ، خالد بن سفیان کے قاتل عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہم کی کارروائیاں، حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرام کی موت پر بیعت، جنگ جسر میں ابو عبید ثقفی کی ہاتھی پر حملہ کرتے ہوئے شہادت، جنگ یمامہ میں براء بن مالک رضی اللہ عنہ کا ساتھیوں سے کہنا کہ مجھے ڈھال پر بٹھا کر ڈھال کو نیزوں کے ساتھ بلند کر کے باغ کے اندر پھینک دو اور وہاں جا کر اسی (۸۰) زخم کھا کر بھی دروازہ کھول کر مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کرنا، (بیہقی : ۱۸۳۷۹) سلطان صلاح الدین ایوبی کے تیار کردہ فدائی جنھوں نے صلیبیوں کی کمر توڑ دی، الغرض! بے شمار واقعات اس کے لیے شاہد ہیں۔ اس وقت مسلمانوں کی ہلاکت اور ذلت کا باعث یہی ہے کہ انھوں نے جہاد کی تیاری میں خرچ کرنے اور کفار سے لڑنے کے بجائے عیش و عشرت اور جان بچانے کو ترجیح دی تو کفار کے ہاتھوں نہ ان کی جانیں محفوظ رہیں نہ مال اور نہ عزتیں۔ اب بھی اگر اسلام کی آبرو کچھ باقی ہے تو جان قربان کرنے والے ان مجاہدین کے ذریعے سے، جن سے دنیائے کفر کے دل دہلتے ہیں۔

آیت 196 ① وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ : طبری نے اپنی حسن سند کے ساتھ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے: ''جو شخص حج یا عمرے کا احرام باندھ لے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اسے پورا کرنے سے پہلے حلال ہو۔ حج کا پورا کرنا یہ ہے کہ یوم النحر (دس ذوالحجہ) کو جمرہ عقبہ کو کنکر مارے اور طواف زیارت کرے، تو وہ اپنے احرام سے پوری طرح حلال ہو گیا اور عمرے کا پورا کرنا یہ ہے کہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر لے تو حلال ہو گیا۔'' [طبری : ۲۱۳/۲، ح :

حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ

یہاں تک کہ قربانی اپنے حلال ہونے کی جگہ پر پہنچ جائے، پھر تم میں سے جو بیمار ہو، یا اسے اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو روزے یا صدقے یا قربانی میں سے کوئی ایک فدیہ ہے۔ پھر جب تم امن میں ہو جاؤ تو تم میں سے جو حج تک عمرے سے فائدہ اٹھائے تو قربانی میں سے جو میسر ہو (کرے) پھر جو نہ پائے تو تین دن کے روزے حج کے دوران اور سات دن کے اس وقت رکھے جب تم واپس جاؤ، یہ پورے دس ہیں۔ یہ اس کے

۳۱۹۴] یعنی حج یا عمرہ فرض ہو یا نفل، احرام باندھ لینے کے بعد پورا کرنا ضروری ہے۔ آیت کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ کی خاطر حج اور عمرہ کے تمام ارکان پوری طرح ادا کرو۔ الفاظ میں دونوں معنی موجود ہیں۔

❷ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ ...... : یعنی کسی دشمن یا مرض کی وجہ سے کعبہ تک نہ پہنچ سکو تو جہاں رکاوٹ پیدا ہو وہیں بکری یا اونٹ اور گائے کا حصہ، جو بھی میسر ہو، قربانی کر کے احرام کھول دو، جیسا کہ ۶ ھ میں مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تو آپ ﷺ نے حدود حرم سے باہر حدیبیہ ہی میں قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

❸ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ ...... : اس کا عطف "اَتِمُّوا الْحَجَّ" پر ہے اور یہ حکم حالتِ امن کے ساتھ مخصوص ہے، یعنی حالتِ امن میں اس وقت تک سر نہ منڈواؤ (یعنی احرام نہ کھولو) جب تک کہ حج و عمرہ کے اعمال پوری طرح ادا نہ کر لو۔ بخاری (۵۰۸۹) اور مسلم (۱۲۰۷) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ضباعہ بنت زبیر بن عبدالمطلب کے پاس گئے تو انھوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں اور میں بیمار ہوں!" تو آپ نے فرمایا: "حج کرو اور شرط کر لو کہ میرے حلال ہونے کی جگہ وہ ہوگی جہاں (اے اللہ!) تو مجھے روک لے گا۔" معلوم ہوا کہ احرام کے وقت اگر شرط کر لے تو رکاوٹ کی صورت میں اسی جگہ احرام کھول دے اور اس پر کوئی قربانی وغیرہ لازم نہیں۔

❹ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ ...... : یعنی احرام باندھنے کے بعد تمھیں کسی بیماری یا عذر کی بنا پر سر منڈوانے کی ضرورت پیش آ جائے تو سر منڈوا کر تین چیزوں میں سے ایک بطور فدیہ انجام دو۔ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حال میں لایا گیا کہ جوئیں میرے چہرے پر گر رہی تھیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمھیں اتنی زیادہ تکلیف ہوگئی ہے، کیا تمھارے پاس کوئی بکری (وغیرہ) ہے؟" میں نے کہا نہیں، تو آپ نے فرمایا: "تو تم تین روزے رکھ لو، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، ہر مسکین کو نصف صاع (یعنی ایک کلو) اور سر منڈوا دو۔" [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ فمن كان منكم مريضًا ...... ﴾ : ۴۵۱۷] علماء کا اتفاق ہے کہ تینوں چیزوں میں سے جو چاہے کر لے، قرآن کے الفاظ بھی یہی ہیں۔

❺ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ...... : کوئی شخص صرف عمرہ ادا کرے یا صرف حج تو اس پر قربانی واجب نہیں، اگر قربانی

كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ؁ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ

لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۱۹۶﴾ حج چند مہینے ہے، جو معلوم ہیں، پھر جو ان میں حج فرض کر لے تو حج کے دوران نہ کوئی شہوانی فعل ہو

کرے تو ثواب ہے۔ البتہ اگر حج کے مہینوں میں عمرہ اور حج دونوں کرنے کا فائدہ اٹھائے، خواہ میقات سے دونوں کا احرام اکٹھا باندھے جسے حجِ قران کہتے ہیں، یا پہلے صرف عمرے کا احرام باندھے اور عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھے، جسے حج تمتع کہتے ہیں، دونوں صورتوں میں قربانی واجب ہے، جو کم از کم ایک بکری ہے۔ اگر کسی کے پاس طاقت نہ ہو تو اسے دس روزے رکھنا ہوں گے، تین روزے ایام حج یعنی قربانی کے دن سے پہلے اور سات روزے جب اپنے گھر واپس جائے۔ اگر قربانی کے دن سے پہلے نہ رکھ سکے تو ایام تشریق (گیارہ، بارہ اور تیرہ ذوالحجہ) میں رکھ لے۔

❻ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ : یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب فرما دیا کہ تین روزے حج میں اور سات جب تم واپس جاؤ تو ظاہر ہے کہ یہ دس ہی ہوتے ہیں، پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ یہ پورے دس ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ''واؤ'' سے مراد ''أَوْ'' بھی ہو سکتا تھا کہ حج کے ایام میں تین روزے رکھو، یا پھر واپس جا کر سات روزے رکھو۔ اس لیے وضاحت فرما دی کہ دونوں کام کرنے ہیں اور دس روزے پورے رکھنے ہیں، یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ کوئی ابہام نہیں رہنے دیا۔

❼ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : یعنی جو لوگ مسجد حرام کے رہنے والے نہیں، بلکہ دور سے آنے والے ہیں، چونکہ انھوں نے عمرہ اور حج کے لیے الگ الگ دو سفر کرنے کے بجائے ایک ہی سفر میں دونوں سرانجام دے دیے ہیں، لہٰذا یہ فائدہ اٹھانے پر انھیں قربانی دینا ہوگی، ورنہ دس روزے رکھیں۔ رہے مکہ کے لوگ تو انھیں حج کے مہینوں میں عمرہ و حج کرنے سے چونکہ ایسا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا، اس لیے وہ حج قران کریں یا حج تمتع، ان پر نہ قربانی ہے نہ روزے، وہ ان کے بغیر ہی دونوں عبادتیں سرانجام دے سکتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور کا یہی قول ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ تمتع اور قران صرف باہر سے آنے والوں کے لیے ہے، اہل مکہ کے لیے جائز نہیں۔ (ابن عاشور) مسجد حرام کے رہنے والوں سے مراد مکہ میں رہنے والے اور مکہ سے اتنی مسافت کے اندر رہنے والے ہیں جس پر قصر ہوتا ہے (جو تقریباً اکیس کلومیٹر ہے)۔ بعض نے اس سے صرف حرم مکہ کے اندر رہنے والے مراد لیے ہیں۔ (ابن کثیر، ابن جریر)

آیت 197 ❶ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ : عمرہ سال میں کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے، مگر حج مقررہ وقت ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''حج کے مہینے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائے ہیں شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔'' [بخاری، الحج، باب قول الله تعالى : ﴿ ذلك لمن لم يكن أهله ...... ﴾: ۱۵۷۲] اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اس سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔'' [بخاری، قبل ح : ۱۵٦۰۔ طبری : ۲/۲٦۷، ح : ۳۵۲۲۔ مستدرك حاكم : ۲/۳۰۳،

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَ اتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

اور نہ کوئی نافرمانی اور نہ کوئی جھگڑا، اور تم نیکی میں سے جو بھی کرو گے اللہ اسے جان لے گا اور زادِ راہ لے لو کہ بے شک زادِ راہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) بچنا ہے اور مجھ سے ڈرو اے عقلوں والو! ﴿۱۹۷﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے رب

ح : ۳۰۹۲ و صححه ووافقه الذهبی]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں کے سوا دوسرے مہینوں میں نہ باندھا جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''سنت یہ ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں ہی میں باندھا جائے۔'' [ابن خزیمة، باب النهی عن الإحرام ...... : ۱۶۲/۴، ح : ۲۵۹۶] ابن کثیر نے اسے صحیح کہا ہے اور یہ مرفوع کے حکم میں ہے۔

② **فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ** : حج کو اپنے آپ پر فرض کرنا یہ ہے کہ حج کی نیت کے ساتھ احرام باندھ لے اور زبان سے ''لَبَّيْكَ بِالْحَجِّ'' اور ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ ...... ''مکمل تلبیہ کہے۔ (ابن کثیر)

③ **فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ** : یعنی حج میں یہ سب باتیں حرام ہیں۔ ''رَفَثَ'' (شہوانی فعل) سے جماع اور تمام وہ چیزیں مراد ہیں جو جماع کی طرف مائل کرنے والی ہوں۔ ''فُسُوْقَ'' (نافرمانی) کا لفظ ہر گناہ کو شامل ہے اور ''جِدَالَ'' سے لڑائی جھگڑا مراد ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس گھر کا حج کیا اور (دورانِ حج میں) رفث و فسوق نہیں کیا وہ اس دن کی طرح (گناہوں سے پاک) لوٹے گا جس دن اس کی ماں نے اسے جنا تھا۔'' [بخاری، المحصر و جزاء الصید، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ فلا رفث ﴾ : ۱۸۱۹]

④ **وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى** : تقویٰ کا لغوی معنی بچنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اہل یمن حج کرتے تو زادِ راہ نہیں لاتے تھے اور کہتے تھے، ہم توکل والے ہیں، پھر جب مکہ میں آتے تو لوگوں سے مانگتے، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔'' [بخاری، الحج، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ و تزودوا فإن ...... ﴾ : ۱۵۲۳] ایسا توکل اللہ پر نہیں بلکہ درحقیقت لوگوں کی جیبوں پر ہے۔ (تلبیس ابلیس) فرمایا زادِ راہ لو، اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوال سے بچ جاؤ گے۔ ظاہری زاد کے ساتھ دلی زاد بھی ضروری ہے، جس کی بہترین صورت تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، آیت سے دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں اور دونوں مراد ہیں۔

آیت 198 ① ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت میں بازار تھے، اب مسلمانوں نے حج کے دنوں میں وہاں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا، تو اس پر یہ آیت اتری۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لیس علیکم جناح ...... ﴾ : ۴۵۱۹] یعنی حج کے دوران میں خرید و فروخت ممنوع نہیں، بلکہ یہ مال و دولت اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اس لیے روزی کمانا منع نہیں ہے۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

کا کوئی فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور اس کو اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تمھیں ہدایت دی ہے اور بلاشبہ اس سے پہلے تم یقیناً گمراہوں سے تھے ﴿۱۹۸﴾ پھر اس جگہ سے واپس آؤ جہاں سے سب لوگ واپس آئیں اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۹۹﴾

② کعبہ سے چلیں تو پہلے منیٰ، پھر مزدلفہ، پھر عرفات آتا ہے۔ حاجی آٹھ ذوالحجہ (یوم ترویہ) کو منیٰ میں ظہر سے پہلے پہنچتے ہیں، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر منیٰ میں ادا کرتے ہیں۔ احرام کے بعد حج یہاں سے شروع ہوتا ہے، نو ذوالحجہ کو عرفات جاتے ہیں۔ سورج ڈھلنے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک عرفات میں وقوف (ٹھہرنا) حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ عبدالرحمٰن ابن یعمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حج عرفات (میں وقوف) ہی ہے، جس نے مزدلفہ والی رات میں عرفات (کا وقوف) فجر طلوع ہونے سے پہلے پالیا تو اس نے حج کو پالیا۔'' [ترمذی : ۲۹۷۵۔ أبو داوٗد : ۱۹۵۰، و صححہ الألبانی]

مشعر حرام ایک پہاڑ ہے، اس کے پاس سے مراد مزدلفہ ہے اور حرم کے اندر ہونے کی وجہ سے اسے ''**اَلْحَرَامِ**'' کہہ دیا گیا ہے، عرفات سے واپس آ کر حاجی حضرات رات یہاں بسر کرتے ہیں اور صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھ کر سورج طلوع ہونے کے قریب تک ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

③ **وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ** : یعنی مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے، یہ بھی ''لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ'' یعنی تیرا کوئی شریک نہیں کہتے تھے، مگر پھر ساتھ شریک ملاتے تھے، کہتے تھے: ((اِلَّا شَرِيْكًا لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ)) [مسلم، الحج، باب التلبیۃ : ۱۱۸۵] ''ہاں ایک شریک جو تیرا ہے، جس کا تو مالک ہے، وہ خود مالک نہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اس کو اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تمھیں ہدایت دی ہے'' یعنی اس کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو، فرمایا: ﴿ **فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ** ﴾ [الشعراء : ۲۱۳۔ القصص : ۸۸] ''اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔'' پھر کیا حال ہے ان مسلمانوں کا جو وہاں جا کر بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر اللہ کو پکارتے ہیں۔

آیت 199 عرفات کا میدان حرم کی حدود سے باہر ہے، دوران حج میں تمام لوگ وہاں جاتے، مگر قریش مزدلفہ سے آگے نہ جاتے کہ ہم حرم کے رہنے والے ہیں، اس آیت میں حکم ہوا کہ سب لوگوں کے ساتھ عرفات جانا اور ان کے ساتھ وہاں سے واپس لوٹنا ضروری ہے۔ (ابن کثیر)

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

پھر جب تم اپنے حج کے احکام پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو، اپنے باپ دادا کو تمھارے یاد کرنے کی طرح، بلکہ اس سے بڑھ کر یاد کرنا، پھر لوگوں میں سے کوئی تو وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ﴿٢٠٠﴾ اور ان میں سے کوئی وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ﴿٢٠١﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو انھوں نے کمایا اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿٢٠٢﴾

آیت 200 تا 202 ① اسلام سے پہلے عرب حج سے فارغ ہوتے تو منیٰ میں میلہ لگاتے اور اپنے آباء و اجداد کا خوب تذکرہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسی طرح ذکر الٰہی کیا کرو، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ (فتح القدیر)

② ذکر الٰہی کا حکم دینے کے بعد دعا کی کیفیت بیان فرمائی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو صرف دنیا کے طالب ہوتے ہیں، ایسے لوگ آخرت کی نعمتوں سے یکسر محروم رہیں گے (دیکھیے الشوریٰ: ۲۰) اور دوسرے وہ جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرتے ہیں، اصل کامیابی انھی لوگوں کی ہے۔ (رازی، شوکانی) دنیا کی بھلائی (حسنہ) میں نیک بیوی، دنیا میں غلبہ، خلافتِ اسلامی کا قیام، وسعتِ رزق، دین و دنیا کا علم اور اللہ کے احکام کے مطابق چلنے کی توفیق، الغرض سب نیک اعمال شامل ہیں اور آخرت کی بھلائی میں دوزخ سے نجات، جنت، رضائے الٰہی کا حصول، حساب میں آسانی اور اللہ تعالیٰ کا دیدار وغیرہ شامل ہیں۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ تھی: «اَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ» ''اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' [بخاري، الدعوات، باب قول النبي صلی اللہ علیہ وسلم : ربنا آتنا...... : ٦٣٨٩۔ مسلم : ٢٦٩٠] صحیح مسلم میں ہے: ''انس رضی اللہ عنہ جب بھی کوئی دعا کرنا چاہتے تو یہ (مذکورہ بالا) دعا کرتے اور جب کوئی اور دعا کرنا چاہتے تو اس میں یہ دعا بھی کرتے۔'' خلاصہ یہ کہ یہ ایک نہایت جامع دعا ہے، کئی ایک احادیث میں اس کی ترغیب آئی ہے۔ طواف کے وقت رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان بھی یہ دعا مسنون ہے۔ [أبو داوٗد، المناسك، باب الدعاء في الطواف : ١٨٩٢ و قال الألباني حسن]

اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کے لوگ ذکر فرمائے ہیں، صرف دنیا کی بھلائی طلب کرنے والے اور دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنے والے، تیسری قسم کے لوگ یعنی صرف آخرت کی بھلائی طلب کرنے والے، جو دنیا کی بھلائی نہ مانگتے

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اور اللہ کو چند گنے ہوئے دنوں میں یاد کرو، پھر جو دو دنوں میں جلد چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اس شخص کے لیے جو ڈرے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿۲۰۳﴾

ہوں، وہ ذکر نہیں فرمائے، کیونکہ اسلام ایسا دین ہے جو اپنے ماننے والوں کے لیے دنیا ترک کرنا پسند نہیں کرتا، نہ دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کشی کی اجازت دیتا ہے۔ جب سے مسلمانوں میں ہندو سادھوؤں اور نصرانی راہبوں کی تقلید میں دنیا کے ترک کا رجحان پیدا ہوا تو انھوں نے جہاد چھوڑا، دنیاوی علوم سے کنارہ کش ہوئے اور ہر چیز میں غیروں کے غلام بن گئے۔ کفار کو ان کے تصوف کے سلسلوں سے کوئی تکلیف ہے، نہ تصور شیخ سے اور نہ خانقاہی نظام سے، کیونکہ اس سے غلامی کی خو مزید پختہ ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ انھیں اپنے ملکوں میں آمد و رفت کی ہر سہولت مہیا کرتے ہیں، مگر اسلام اور مسلمانوں کی عزت کے ضامن جہاد یا خلافت کا نام لینے والوں پر آخری حد تک دنیا تنگ کر دینے میں کمی نہیں کرتے۔ پھر کیا حال ہوگا جب کہا جائے ؎

دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے؟

اگر کہا جائے شاعر کی مراد فقط رضائے الٰہی کا حصول ہے تو اللہ کی رضا تو دنیا اور آخرت دونوں کی طلب اور ان کے لیے محنت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی ان دونوں کی طلب بلکہ ان کا ہر عمل ہی رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔ ﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ یہ اس لیے فرمایا کہ آخرت میں بھلائی آگ کے کچھ عذاب کے بعد بھی ہو سکتی ہے، اس لیے اس سے بچنے کی الگ دعا مانگی۔ (ابن عاشور)

آیت 203 ① **وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ**: عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''ایام معدودات ایام تشریق (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) ہیں۔'' [بخاری، العیدین، باب فضل العمل ...... قبل، ح : ۹۶۹] پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے باب باندھا ہے: ''منیٰ میں ٹھہرنے کے دنوں میں تکبیر کہنا اور جب عرفات کو جائے۔'' عمر رضی اللہ عنہ منیٰ میں اپنے خیمے کے اندر تکبیر کہتے، مسجد والے اسے سنتے تو وہ بھی تکبیر کہتے اور بازاروں والے بھی تکبیر کہتے، یہاں تک کہ منیٰ تکبیرات سے گونج اٹھتا۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان دنوں میں منیٰ میں تکبیر کہتے، نمازوں کے بعد تکبیر کہتے اور اپنے بستر پر، اپنے خیمے میں، اپنی مجلس میں اور چلتے پھرتے ان تمام دنوں میں تکبیر کہتے اور ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا قربانی کے دن تکبیر کہتیں اور عورتیں ابان بن عثمان اور عمر بن عبد العزیز کے پیچھے مسجد میں مردوں کے ساتھ تشریق کی راتوں میں تکبیر کہتیں۔ [بخاری، العیدین، باب التکبیر أیام منیٰ ......، قبل ح: ۹۷۰] معلوم ہوا ان ایام سے مراد عرفہ کی صبح سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ کے سورج غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ قربانی کے دن

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جس کی بات دنیا کی زندگی کے بارے میں تجھے اچھی لگتی ہے اور وہ اللہ کو اس پر گواہ بناتا ہے جو اس کے دل میں ہے، حالانکہ وہ جھگڑے میں سخت جھگڑالو ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جب واپس جاتا ہے تو زمین میں دوڑ دھوپ کرتا ہے، تاکہ اس میں فساد پھیلائے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۰۵﴾ اور جب اس سے کہا جاتا ہے اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے، سو اسے جہنم ہی کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۲۰۶﴾

اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا منع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔'' [مسلم، الصیام، باب تحریم صوم أیام التشریق ...... : ۱۱۴۱] اللہ کے ذکر سے مراد وہ تمام تکبیرات ہیں جو جمرات کو کنکر مارتے وقت، جانور ذبح کرتے وقت یا دوسرے اوقات میں کہی جاتی ہیں اور تکبیر کے علاوہ کوئی بھی ذکر ہو، وہ بھی اس حکم میں شامل ہے۔ یعنی ان ایام میں ذکر الٰہی میں مصروف رہو۔

② لِمَنِ اتَّقٰى : یعنی گیارہ اور بارہ کو دو دن جمرات کو کنکر مار کر چلا آئے، تب بھی جائز ہے اور اگر کوئی تاخیر کرے یعنی پورے تین دن منیٰ میں ٹھہرا رہے تو بھی جائز ہے، بشرطیکہ دل میں تقویٰ ہو اور حج کے احکام خلوص سے ادا کرے۔ (ابن کثیر)

③ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ : حج کے موقع پر لوگ حشر کی طرح جمع ہوتے ہیں، اس لیے حج کے ذکر کے ساتھ حشر کا دن یاد دلا کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا۔

آیت 204 تا 206 ① اوپر کی آیات میں ''فَمِنَ النَّاسِ'' سے لے کر یہاں تک دو قسم کے لوگ ذکر کیے، یعنی طالب دنیا اور طالب دنیا و آخرت۔ اب یہاں سے منافقین کے اوصاف کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چند ایسے چال باز لوگ تھے (اور ہمیشہ رہے ہیں)، ان آیات میں ان کی صفات بیان فرما کر ان سے چوکس رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ (قرطبی، فتح القدیر) تفاسیر میں گو ان آیات کا سبب نزول اخنس بن شریق ثقفی کو بیان کیا گیا ہے، مگر الفاظ کے اعتبار سے یہ ہر اس شخص کو شامل ہیں جس میں یہ پانچوں صفات پائی جائیں۔ (کبیر) علاوہ ازیں وہ تمام روایات جن میں اس آیت کے اخنس کے بارے میں اترنے کا ذکر ہے، ضعیف ہیں۔ (دیکھیے الاستیعاب فی بیان الاسباب) اس لیے یہ آیت عام ہے۔

② ایسے منافق کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی سے متعلق بہت سی معلومات رکھتا ہے، اس موضوع پر بات کرے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ آخرت پر نہ وہ بات کرتا ہے نہ اسے اس کا علم ہے۔ (دیکھیے الروم : ۶، ۷) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَہُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو اللہ کی رضا مندی تلاش کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے اور اللہ ان بندوں پر بے حد نرمی کرنے والا ہے﴿۲۰۷﴾

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر سخت دل متکبر، بخیل پیٹو سے بغض رکھتا ہے جو بازاروں میں شور کرنے والا ہے، رات کو مردار اور دن کو گدھا ہے، دنیا کے معاملات کا عالم ہے، آخرت کے معاملات سے جاہل ہے۔'' [صحیح ابن حبان : ۱۹۵۷۔ السلسلة الصحيحة : ۱۹۵]

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان و اخلاص کا یقین دلاتا ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کے ہاں اپنے بے اعتبار ہونے کو خوب سمجھتا ہے۔ (دیکھیے سورۂ منافقون کی ابتدائی آیات)

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ "اَلَدُّ الْخِصَامِ" ہے۔ "اَلَدُّ" کا معنی سخت جھگڑالو ہے۔ "اَلْخِصَامِ" یا تو باب مفاعلہ کا مصدر ہے، اس صورت میں معنی ہو گا جھگڑے میں سخت جھگڑالو ہے، یا "خَصْمٌ" (جھگڑنے والا) کی جمع ہے، معنی ہو گا جھگڑنے والوں میں سے بہت سخت جھگڑالو ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ہاں سب آدمیوں سے زیادہ مبغوض " اَلْاَلَدُّ الْخَصِمُ " (سخت جھگڑالو) ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ وهو ألد الخصام ﴾ : ۴۵۲۳۔ مسلم : ۲۶۶۸] اور رسول اللہ ﷺ نے منافق کی چار نشانیوں میں سے ایک یہ بیان فرمائی: ''وہ جب جھگڑتا ہے تو بدزبانی کرتا ہے۔'' [بخاری، الإيمان، باب علامة المنافق : ۳۴۔ مسلم : ۵۸] چوتھی صفت یہ ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے پاس اپنے اخلاص کی قسمیں کھا کر واپس جاتا ہے تو تخریبی کارروائیوں کے ذریعے سے زمین میں فساد اور کھیتوں اور جان و مال کو برباد کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ "تَوَلّٰى" کا ایک معنی ہے ''وہ واپس جاتا ہے'' اور دوسرا معنی ہے ''جب وہ والی یعنی حاکم یا صاحبِ اقتدار بنتا ہے۔'' پانچویں صفت یہ ہے کہ جب اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے لیے کہا جائے تو اس کی (جھوٹی) عزت اور غرورِ نفس اسے گناہ میں پھنسائے رکھتا ہے۔

آیت 207 اوپر اس شخص کا بیان ہوا ہے جو طلب دنیا کی خاطر دین و ایمان کو بیچ ڈالتا ہے، اب اس آیت میں اس شخص کا بیان ہے جو اللہ کی رضا کے حصول کے لیے مال ہی نہیں جان تک قربان کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ ﴾ [التوبة : ۱۱۱] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں۔'' اس آیت کے اولین مصداق مہاجر صحابہ ہیں، جنھوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں اور اپنی جائدادیں مکہ میں چھوڑ کر مدینہ چلے گئے اور انصار صحابہ، جنھوں نے اپنے جان و مال سے ان کی مدد کی۔ "بِالْعِبَادِ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ''ان بندوں'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ بعض روایات میں اس آیت کا سبب نزول صہیب رضی اللہ عنہ کو قرار دیا گیا ہے، جو قریش کے روکنے پر سارا مال ان کے حوالے کر کے ہجرت کر گئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سب صحابہ کا یہی حال تھا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پھر اگر اس کے بعد پھسل جاؤ کہ تمھارے پاس واضح دلیلیں آ چکیں تو جان لو کہ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾

آیت 208 مخلص مومن کی مدح و ستائش کے بعد تمام مومنوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم بھی پورے اسلام اور ساری شریعت پر چلو، یہ نہیں کہ اسلام کے کچھ احکام پر عمل کر لیا، باقی چھوڑ دیے۔ نماز روزہ کی پابندی کر لی اور عقیدے میں شرک، تجارت میں سود، عدالتوں میں غیر اللہ کا قانون، معاشرت میں ہندو، نصرانی، یہودی تہذیب اختیار کیے رکھی اور اسے زمانے کا تقاضا اور ترقی پسندی قرار دے لیا۔ یہود کی رسوائی کا باعث بھی یہی طرز عمل تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ [البقرۃ : ۸۵] ''پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو۔'' اس میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جو کسی دوسرے دین سے نکل کر اسلام میں آئے، مگر انھوں نے اپنے سابقہ دین کی رسوم کو باقی رکھا، جیسے غیر مسلموں کی شادی و مرگ کی رسمیں اور بدعات و رسوم جو سراسر اسلام کے منافی ہیں، یا مسلمان ہو کر بھی انھوں نے اپنے روزمرہ کے پہلے طور طریقوں کو نہ چھوڑا۔

آیت 209، 210 ① اسلام کا بنیادی عقیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول مانتے ہوئے ان کے بتائے ہوئے غیب یعنی بن دیکھی حقیقتوں پر ایمان ہے۔ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، یوم آخرت اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان رکھنے کو ایمان کہا گیا ہے۔ [مسلم، الإیمان : ۸] دنیا میں آزمائش اسی بات کی ہے کہ بغیر دیکھے کون ان پر ایمان لاتا ہے اور کسی جبر کے بغیر اللہ تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ﴾ [المائدۃ : ۹۴] ''تاکہ اللہ جان لے کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔'' مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۹)، فاطر (۱۸)، سورۂ یٰس (۱۱)، سورۂ ق (۳۳) اور حدید (۲۵)۔

کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ حقیقتیں ان کی آنکھوں کے سامنے آئیں گی تو وہ ایمان لائیں گے، ورنہ نہیں۔ کبھی وہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے دیکھنے کا مطالبہ کرتے کہ ''ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے، یا ہم اپنے رب کو دیکھتے۔'' [الفرقان : ۲۱] کبھی ایمان لانے کی شرط یہ رکھتے کہ ''تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔'' [بنی إسرائیل : ۹۲] کبھی قیامت برپا کرنے کی فرمائش کرتے۔ بنی اسرائیل نے بھی یہی کام کیا، فرمایا: ﴿ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ [البقرۃ : ۵۵] ''اور جب تم نے کہا، اے موسیٰ! ہم ہرگز تیرا یقین نہ کریں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنی

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع ۲۵/۱۴

وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی اور کام تمام کر دیا جائے اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ﴿۲۱۰﴾

کتابوں اور رسولوں کے ذریعے سے اسلام کے حق ہونے کی دلیلیں پیش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اب اگر کوئی شخص حق واضح ہونے کے بعد اس پر ایمان نہیں لاتا، بس معجزات کا مطالبہ ہی کرتا چلا جاتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ غیبی حقیقتیں ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ پھر کسی کو ایمان لائے بغیر چارہ ہی نہیں ہوگا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ﴾ [الأنعام : ١٥٨] ''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی، کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا۔'' زیر تفسیر آیات میں یہی بات فرمائی کہ اتنے واضح دلائل کے بعد اب یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ خود بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی، مگر پھر تو کام تمام ہو چکا ہوگا اور دنیا میں تو بظاہر کچھ اور لوگوں کے پاس بھی معاملات لے جائے جاتے ہیں، اس وقت سارے معاملات اکیلے اللہ کے سامنے پیش ہوں گے۔

② قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے زمین پر اترنے کا ذکر قرآن میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ [الفجر : ٢٢] ''اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔'' اور فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ﴾ [الأنعام : ١٥٨] ''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا تیرا رب آئے۔'' تمام صحابہ اور تابعین اللہ تعالیٰ کے نزول پر ایمان رکھتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ جس طرح اللہ کی شان کے لائق ہے کہ وہ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، قیامت کے دن بھی زمین پر اترے گا۔ دوسری تمام صفات پر بھی وہ ان کے ظاہر الفاظ کے مطابق ایمان رکھتے تھے، وہ نہ ان کا کچھ اور مطلب نکالتے (جسے تاویل کہتے ہیں)، نہ یہ کہتے کہ کس طرح اترے گا؟ یا وہ عرش پر کس طرح ہے؟ (جسے تکییف کہتے ہیں)، نہ وہ اس کے عرش پر ہونے کو یا اس کے اترنے کو اپنی طرح یا کسی مخلوق کی طرح قرار دیتے (جسے تشبیہ کہتے ہیں)، نہ یہ کہتے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ان الفاظ کا معنی کیا ہے، بس یہ اللہ ہی جانتا ہے (جسے تفویض کہتے ہیں)، بعد میں آنے والے لوگوں نے غیر مسلموں سے متاثر ہو کر کسی نے سرے سے ان صفات کا انکار ہی کر دیا، کسی نے تاویل کی، کسی نے اپنے پاس سے کیفیت متعین کی اور کسی نے مخلوق کے ساتھ مشابہ کر دیا۔ یہ تمام صورتیں درحقیقت انکار ہی کی صورتیں ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حاقہ (١٦ تا ١٨) اور سورۂ فجر (٢٢) کے حواشی۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

بنی اسرائیل سے پوچھ! ہم نے انھیں کتنی واضح نشانیاں دیں اور جو شخص اللہ کی نعمت کو بدل دے، اس کے بعد کہ اس کے پاس آ چکی ہو تو یقیناً اللہ بہت سخت سزا والا ہے ﴿۲۱۱﴾ ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، دنیا کی زندگی خوشنما بنا دی گئی ہے اور وہ ان لوگوں سے مذاق کرتے ہیں جو ایمان لے آئے، حالانکہ جو لوگ ڈر گئے وہ قیامت کے دن ان سے اوپر ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے ﴿۲۱۲﴾ سب لوگ ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ہمراہ حق کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان

آیت 211 اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کے مطالبے پر یا مطالبے کے بغیر انبیاء کو کئی معجزے عطا فرمائے، مگر جب وہ معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تو ان پر مختلف عذاب آئے، جیسے قوم ثمود و قوم فرعون اور بنی اسرائیل، اب جب اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے اترنے کا مطالبہ حد سے زیادہ ہونے لگا تو کفارِ عرب سے کہا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ہم نے انھیں کتنے واضح معجزات دکھائے، یعنی عصائے موسیٰ، ید بیضا، طوفان، ٹڈیاں، سمندر کا پھٹنا، صحرا میں بادل کا سایہ، بارہ چشموں کا پھوٹنا، من و سلویٰ کا نزول وغیرہ، تو انھوں نے ان نعمتوں سے کوئی فائدہ اٹھایا جو تم اٹھاؤ گے؟ پھر نعمتوں کی ناشکری کا نتیجہ تو عذاب ہی ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ﴾ [بنی إسرائیل : ۵۹] ”اور ہمیں کسی چیز نے نہیں روکا کہ ہم نشانیاں دے کر بھیجیں مگر اس بات نے کہ پہلے لوگوں نے انھیں جھٹلا دیا۔“

آیت 212 یعنی کفار کے ایمان نہ لانے کا باعث ان کی نگاہ میں دنیا کا بہت مزین ہونا ہے۔ مومن جو آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی زیب و زینت کو کچھ نہیں سمجھتے، کفار کے خیال میں بھولے بھالے اور دیوانے ہیں، اس لیے انھوں نے ان کا مذاق اڑانے اور انھیں ذلیل کرنے کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے، مگر قیامت کے دن اہل تقویٰ ہر اعتبار سے ان سے بلند درجہ ہوں گے، کیونکہ مومنوں کا نام علیین میں ہو گا اور کفار اسفل السافلین ہوں گے۔ یہاں ” بِغَیْرِ حِسَابٍ “ فرمایا، سورۂ نبا میں ”عَطَآءً حِسَابًا“ فرمایا، تطبیق کے لیے دیکھیے سورۂ نبا کی آیت (۳۶) کے حواشی۔

آیت 213 ① اس آیت میں اس تاریخی حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے کہ انسانیت کی ابتدا کفر و شرک اور عظیم الشان مخلوقات، مثلاً سورج، چاند، آگ، ہوا، پانی، فرشتوں اور نیک انسانوں وغیرہ کی پرستش سے نہیں ہوئی، بلکہ خالص توحید سے ہوئی ہے۔ ابتدا میں تمام انسان ایک ہی دین توحید رکھتے تھے اور ان کی ایک ہی ملت تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”آدم اور

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾

باتوں کا فیصلہ کرے جن میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جنھیں وہ دی گئی تھی، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں، آپس کی ضد کی وجہ سے، پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انھیں اپنے حکم سے حق میں سے اس بات کی ہدایت دی جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿٢١٣﴾

نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن (ایک ہزار سال) تھے۔ یہ سب شریعت حقہ (توحید) پر تھے، پھر (شیطان کے بہکانے سے ان میں شرک آیا اور) ان میں اختلافات پیدا ہوئے، تب اللہ تعالیٰ نے (نوح علیہ السلام اور دوسرے) انبیاء بھیجے۔'' [طبری و حاکم ۲/ ٤٤٢، ح : ٣٦٥٤، بسند صحیح] پھر مسلسل انبیاء آتے رہے اور ان پر کتابیں نازل ہوتی رہیں، تاکہ ان کو اختلافات سے نکال کر ہدایت الٰہی کی طرف لایا جائے۔ اس آیت میں '' فَبَعَثَ اللّٰهُ '' کا عطف محذوف پر ہے یعنی '' فَاخْتَلَفُوا فَبَعَثَ اللّٰهُ '' ''پس انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے نبی بھیجے۔'' (کبیر، ابن جریر) مزید دیکھیے سورۂ یونس (۲۱)۔

❷ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ: یعنی پہلی امتوں میں اختلافات لاعلمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ باہمی حسد، ضد اور سرکشی کی وجہ سے پیدا ہوئے، جس سے وہ فرقوں میں بٹ گئیں اور اس وجہ سے گمراہ ہو گئیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی بھیج کر اور اس پر اپنی آخری کتاب نازل فرما کر تمام اختلافات کا فیصلہ فرما دیا اور اپنی توفیق خاص '' بِاِذْنِهٖ '' سے مومنوں کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کر دی ہے۔ (بیضاوی، فتح البیان) واضح رہے کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی شروع میں دین میں کوئی اختلاف نہیں تھا، سلف صالحین سب کے سب کسی شخص کی تقلید کے بجائے براہ راست قرآن و حدیث پر عمل کرتے تھے۔ ان میں نہ شیعہ سنی کی تفریق تھی، نہ ان میں کوئی حنفی تھا، نہ مالکی، نہ شافعی، نہ حنبلی، نہ نقشبندی، نہ قادری، نہ سہروردی، نہ چشتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''تم ضرور ہی اپنے سے پہلے لوگوں کے پیچھے چل پڑو گے، جس طرح بالشت بالشت کے برابر اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی ضب (سانڈے) کے بل میں جا گھسے ہوں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤ گے۔'' پوچھا گیا: ''یا رسول اللہ! اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟'' فرمایا: ''پھر اور کون ہیں؟'' [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل : ٣٤٥٦۔ مسلم : ٢٦٦٩] آپ کے اس فرمان کے مطابق جب اس امت میں بھی اہل کتاب کی طرح شخصی رائے کی تقلید اور اپنے دھڑے کی بے جا حمایت پر جمود پیدا ہو گیا، لوگوں نے قرآن و حدیث کے بجائے اقوالِ رجال کو دین سمجھنا شروع کر دیا تو امت مختلف فرقوں میں بٹ کر تباہ ہو گئی۔ اس سے صرف وہ لوگ محفوظ

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تم پر ان لوگوں جیسی حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگی اور تکلیف پہنچی اور وہ سخت ہلائے گئے، یہاں تک کہ وہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہوگی؟ سن لو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾

رہے جو قرآن و سنت پر براہ راست کار بند رہے اور کسی نئے گروہ کا حصہ نہ بنے۔ [وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ]

③ رسول اللہ ﷺ جب رات کو اٹھتے تو اپنی رات کی نماز کا افتتاح اس دعا سے کرتے: ((اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ اِسْرَافِيْلَ، فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ)) [مسلم، صلٰوة المسافرين، باب صلوة النبى ﷺ ودعاء ه بالليل : ۷۷۰]

آیت 214 ① ''الْبَاْسَآءُ'' سے مراد فقر و فاقہ اور ''الضَّرَّآءُ'' سے مراد بیماری اور جسمانی تکالیف اور ''زُلْزِلُوْا'' کا مطلب ہے سخت ہلائے گئے۔

② مدینہ میں ہجرت کے بعد مسلمانوں کو جب مشرکین، منافقین اور یہود سے سخت تکالیف پہنچیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ دین کی راہ میں یہ مصیبتیں اور تکلیفیں صرف تم پر نہیں آ رہیں، بلکہ تم سے پہلے لوگ تو فقر و فاقہ، جانی و مالی نقصان اور سخت قسم کے خوف و ہراس میں مبتلا کیے گئے، یہاں تک کہ اس زمانے کا رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے ''اللہ کی مدد کب ہوگی'' پکار اٹھے۔ پھر جس طرح ان پر اللہ کی طرف سے مدد نازل ہوئی تمھاری بھی مدد کی جائے گی۔ چنانچہ جب غزوۂ احزاب میں یہ مرحلہ پیش آیا، جس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب (۱۰، ۱۲) میں کھینچا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ یاد رہے کہ ان کا ''اللہ کی مدد کب ہوگی'' کہنا اعتراض اور شکوہ کے طور پر نہ تھا، بلکہ بے بسی کے عالم میں اپنی عاجزی اور زاری کی حالت کا اظہار تھا۔ (رازی، ابن کثیر) خباب بن ارت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ ہمارے لیے نصرت کی درخواست نہیں کرتے، آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا نہیں کرتے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پہلے لوگوں میں سے ایک کے سر کی مانگ پر آرا رکھ دیا جاتا اور وہ اس کے قدموں تک پہنچ جاتا، مگر یہ چیز اسے اس کے دین سے نہیں پھیرتی تھی اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کے گوشت اور ہڈی کو الگ کر دیا جاتا، یہ چیز اسے اس کے دین سے نہیں پھیرتی تھی۔'' پھر آپ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ کام ضرور مکمل ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ سوار صنعاء سے حضرموت تک چلے گا

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ فَلِلۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ؕ وَ مَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۲۱۵﴾

وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دے تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو سو وہ ماں باپ اور زیادہ قرابت والوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے اور تم نیکی میں سے جو کچھ بھی کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۲۱۵﴾

اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوگا یا اسے اپنی بکریوں سے متعلق بھیڑیے کا (خوف ہوگا)، لیکن تم ایسے لوگ ہو کہ بہت جلدی کرتے ہو۔" [شعب الإیمان للبیهقی : ۲/ ۲۴۰، ح : ۱۶۳۳۔ بخاری : ۳۶۱۲۔ ابن کثیر : ۱/ ۲۵۱]

آیت 215 ❶ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے حیات دنیا کے مزین کیے جانے کا ذکر فرمایا، بنی اسرائیل کے باہمی اختلاف کا باعث بھی حسد، ضد اور سرکشی بیان فرمایا، جو عموماً مال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کا ذکر فرمایا کہ وہ (اس فتنے سے بچنے کے لیے) کیا خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ کہاں خرچ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ خرچ کرنے کی جگہیں بھی بتائی جائیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ صفراء (گرمی) کا کوئی مریض کسی مہربان طبیب سے پوچھے کہ میں شہد پی لوں تو وہ جواب میں کہے، پی لو، مگر سرکہ ملا کر، کیونکہ سرکہ اس کی گرمی کو کم کر دے گا۔ ان کے سوال کا جواب یہ ہے کہ "تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو" یعنی جو چاہو خرچ کرو، مگر وہ مال حلال طریقے سے حاصل ہوا ہو، کیونکہ حرام کو خیر نہیں کہہ سکتے۔ (طنطاوی)

❷ خرچ کرنے کی جگہوں میں سے سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا، تاکہ ان کے جنم دینے اور پرورش کرنے کا کچھ حق ادا ہو جائے، پھر زیادہ قرابت والے، تاکہ قرابت اور رشتہ داری کا حق ادا ہو، پھر یتامیٰ، کیونکہ وہ مہربان باپ کے سائے سے محروم ہو چکے ہیں، پھر مساکین، ان کے فقر و احتیاج کی وجہ سے، پھر مسافر، کیونکہ وہ اپنے شہر سے دور ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے محتاج ہیں۔ رازی نے فرمایا، خرچ کرنے کی جگہوں میں یہ ترتیب ہی صحیح ترتیب ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے بعد خلاصہ بیان فرمایا کہ تم خیر میں سے جو عمل بھی کرو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔ اس میں وہ کام اور وہ جگہیں بھی آ گئیں جن کا یہاں ذکر نہیں ہوا، مثلاً سائلین اور غارمین وغیرہ، بشرطیکہ وہ کام اور وہ جگہیں خیر ہوں، کیونکہ غلط جگہ خرچ کرنا فعل خیر نہیں۔ میمون بن مہران اس آیت کو پڑھ کر کہنے لگے کہ یہ ہیں مسلمان کے خرچ کرنے کی جگہیں، ان میں طبلہ، سارنگی، لکڑی کی تصویروں اور گھر کی آرائش کا ذکر نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

❸ اس آیت میں زکوٰۃ کے علاوہ خرچ کا ذکر ہے جو نفل ہو، یا بعض اوقات فرض، کیونکہ ماں باپ کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۶۰)۔

❹ ایک روایت میں یہ سوال کرنے والا عمرو بن جموح کو بتایا گیا ہے، مگر وہ روایت موضوع ہے، اس میں کلبی اور ابو صالح

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع ۲۶

تم پر لڑنا لکھ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں سراسر ناپسند ہے اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۱۶﴾

متہم بالکذب ہیں۔ (الاستیعاب فی بیان الاسباب)

آیت 216 ❶ "کُرْهٌ" یہ مصدر بمعنی "كَرَاهِيَةٌ" ہے۔ مصدر کو اسم مفعول "مَكْرُوْهٌ" کی جگہ مبالغہ کے لیے لایا گیا ہے، جیسا کہ "زَيْدٌ عَدْلٌ" "زید سراپا عدل ہے۔" تو یہاں "کُرْهٌ" کا معنی ہوگا "سراسر ناپسند ہے۔" "کُتِبَ" یہ وہی "کُتِبَ" ہے جو اس سے پہلے قصاص، وصیت اور صیام کے لیے آیا ہے۔

❷ پچھلی آیت میں مال خرچ کرنے کی ترغیب کے بعد اب جان خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ "الْقِتَالُ" سے ہر لڑائی مراد نہیں، بلکہ عہد کا الف لام ہونے کی وجہ سے خاص یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑائی ہے۔

❸ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ جہاد کریں اور دشمنوں سے اسلام کا دفاع کریں۔ امام زہری نے فرمایا، جہاد ہر ایک پر واجب ہے، خواہ لڑائی میں نکلے یا بیٹھا رہے، بیٹھنے والوں پر لازم ہے کہ جب ان سے مدد طلب کی جائے تو وہ امداد کریں، جب ان سے فریاد کی جائے، فریاد کو پہنچیں، جب انھیں میدان میں بلایا جائے نکل کھڑے ہوں۔ (ابن کثیر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس نے نہ جنگ کی اور نہ اپنے نفس کے ساتھ جنگ کی بات کی، تو وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا۔" [مسلم، الإمارة، باب ذم من مات ...... : ۱۹۱۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

❹ جہاد یعنی اللہ کا دین غالب کرنے کے لیے اپنی آخری کوشش کرتے رہنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن نفیر یعنی لڑائی کے لیے نکلنا ہر وقت ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ (دیکھیے توبہ (۱۲۲)) البتہ تمام علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ تین مواقع پر قتال آدمی پر فرض عین ہو جاتا ہے: ① جب امام کسی خاص شخص کو یا تمام مسلمانوں کو نکلنے کا حکم دے دے، الا یہ کہ امام کسی کو مستثنیٰ کر دے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک میں سب کو نکلنے کا حکم دیا مگر علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے رہنے کا حکم دیا۔ (مسلم: ۳۱/۲۴۰۴) اس کی دلیل سورۂ توبہ کی آیات (۳۸، ۳۹) ہیں۔ ② جب کفار مسلمانوں کی کسی آبادی پر حملہ کر دیں تو اس کے رہنے والوں پر اس کا دفاع واجب ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۹۱) اس حد تک کہ اگر ان کے پاس کافی اسلحہ نہ بھی ہو تو پتھروں، اینٹوں، لکڑیوں غرض جو کچھ بھی ملے اس کے ذریعے سے لڑنا فرض ہے۔ اگر دانتوں سے کاٹ کھانے کے سوا کچھ نہ ملے تو دانتوں سے کاٹ کر اپنا دفاع واجب ہے۔ اگر اس آبادی والے دفاع نہ کر سکیں یا سستی کریں تو قریب والی آبادی، پھر اس کے بعد والی پر، حتیٰ کہ تمام دنیا کے اہل اسلام پر لڑنا فرض ہو جاتا ہے، کیونکہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ ③ جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو تو ثابت قدم رہنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴾

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ

وہ تجھ سے حرمت والے مہینے کے متعلق اس میں لڑنے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے اس میں لڑنا بہت بڑا ہے اور اللہ کے راستے سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بڑا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔ اور وہ تم سے ہمیشہ لڑتے

[الأنفال : ۱۵] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا، ایک لشکر کی صورت میں ملو تو ان سے پیٹھیں نہ پھیرو۔“ حافظ ابن حجر نے فرمایا: ”جب کسی شخص پر لڑائی فرض عین ہو جائے تو ”فَلاَ إِذْنَ“ یعنی اس وقت والدین یا کسی اور سے اجازت کی کوئی ضرورت نہیں۔“ [فتح الباری، الجهاد والسیر، باب الجهاد بإذن الأبوین] اس بات پر بھی علماء کا اتفاق ہے کہ اپنے دفاع کی خاطر لڑنے کے لیے کوئی بھی شرط لازم نہیں، نہ امیر کا حکم، نہ والدین کی اجازت اور نہ کوئی اور شرط، جیسا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اس کی واضح دلیل ہے۔

5 وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ : یعنی وہ تمھیں سراسر ناپسند ہے، کیونکہ اس میں زخمی ہونے، اعضاء کٹنے اور جان جانے کا سامنا ہوتا ہے، جب کہ ہر آدمی فطری طور پر زندہ رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مال کا خرچ، اہل و عیال اور وطن سے جدائی، سفری صعوبتیں، کھانے پینے اور نیند کی بے ترتیبی، غرض بے شمار مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

6 وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ : قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا: ”معنی یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تم جہاد میں جو مشقت ہے اسے ناپسند کرو، حالانکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، اس لیے کہ تم غالب رہو گے، فتح یاب ہو گے، غنیمت حاصل کرو گے اور اجر پاؤ گے اور تم میں سے جو فوت ہوگا وہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ تم آرام طلبی اور لڑائی ترک کرنے کو پسند کرو، حالانکہ یہ چیز تمھارے لیے بہت بری ہے، کیونکہ تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تمھاری حکومت ختم ہو جائے گی۔“ قرطبی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: ”اللہ کا یہ فرمان بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں، جیسا کہ اندلس میں پیش آیا، انھوں نے جہاد ترک کیا، لڑائی سے بزدلی اختیار کی اور کثرت سے فرار اختیار کیا تو دشمن تمام شہروں پر قابض ہو گیا۔ شہر بھی کیسے کیسے اور کیا کیا اسیری؟ قتل و غارت، بچوں اور عورتوں کی غلامی اور عزتوں کی بربادی۔ (إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ) یہ سب ہمارے اپنے ہاتھوں کا کیا کمایا ہے۔“ (قرطبی)

قرطبی کے کئی سو سال پہلے لکھے ہوئے یہ الفاظ آج بھی حقیقت ہیں، جن سے دل درد و غم سے بھر جاتا ہے، اس وقت اندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا تھا، اب مسلمانوں کی آرام طلبی اور ترک جہاد نے کفار کو عراق، افغانستان پر قبضے کا اور باقی تمام مسلمان ممالک میں اپنے احکام چلانے کا موقع دیا ہے اور ہندو بھی اندلس کی طرح مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اب آرام طلبی اور ترک جہاد کا کون سا موقع ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قتال کی کڑوی دوا کے سوا مسلمانوں کی شفا کی کوئی صورت نہیں۔

آیت 217 - 1 قِتَالٍ فِيْهِ : یہ ”الشَّهْرِ الْحَرَامِ“ سے بدل اشتمال ہے۔ ”قِتَالٌ“ مبتدا اور ”كَبِيْرٌ“ خبر ہے۔

الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

رہیں گے، یہاں تک کہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں، اگر کر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے، پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۱۷﴾

"صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" مبتدا ہے، "كُفْرٌۢ بِهٖ" اور "اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ" کا اس پر عطف ہے اور ان سب کی خبر "اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ" ہے اور "وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کا عطف "سَبِيْلِ اللّٰهِ" پر ہے اور "كُفْرٌۢ بِهٖ" میں "بِهٖ" کی ضمیر "سَبِيْلِ اللّٰهِ" میں مذکور لفظ "اللّٰهِ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور "الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" کو پہلے لانے کے بجائے "كُفْرٌۢ بِهٖ" کو پہلے لانے میں یہ حکمت ہے کہ سبیل اللہ (اسلام) سے روکنے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر مسجد حرام سے روکنے سے بڑا جرم ہے، اس لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔

2 ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب یہ چار مہینے حرمت والے ہیں، عہد جاہلیت ہی سے ان میں لوٹ مار اور خون ریزی حرام سمجھی جاتی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ ۲ھ میں رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فوج کا ایک دستہ جہاد کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے کافروں کے ایک قافلے پر حملہ کیا، جس سے ان کا ایک آدمی مارا گیا اور بعض کو مال سمیت گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ رجب ۲ھ میں پیش آیا۔ کفار نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم نے رجب میں جنگ کر کے اس حرمت کو توڑا ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ماہ حرام میں جنگ کرنا اگرچہ واقعی بہت بڑا ہے، مگر تم تو اس سے بھی بڑے گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہو (جو یہ ہیں، اللہ کے راستے یعنی اسلام سے روکنا، اللہ کے ساتھ کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا، مسجد حرام یعنی حرم مکہ میں رہنے والے صحابہ اور رسول اللہ ﷺ کو اس سے نکالنا، اس کے علاوہ فتنہ یعنی کفر و شرک پر مسلمانوں کو مجبور کرنے کے لیے عذاب میں مبتلا کرنا قتل سے بھی بڑا جرم ہے)۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے تلوار اٹھالی ہے تو قابل مؤاخذہ نہیں۔ (ابن کثیر، شوکانی)

3 حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی حرمت اکثر فقہاء کے نزدیک سورۂ توبہ کی آیت: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة : ٥] کے ساتھ منسوخ ہو چکی ہے (الجصاص) مگر سورۂ توبہ ہی کی آیت: ﴿ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا ﴾ [التوبة : ٣٦] اس آیت میں ہے: ﴿ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ﴾ "ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔" پھر فرمایا: ﴿ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ﴾ [التوبة : ٣٦] "سو ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور کافروں سے ہر حال میں لڑو، جیسے وہ ہر حال میں تم سے لڑتے ہیں۔" اور ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ ﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۱۸﴾

[البقرة : ۱۹۴] ''حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمت والے مہینوں میں لڑنے کی اجازت کا سبب یہ ہے کہ کفار چونکہ ان مہینوں میں بھی مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں، اس لیے مسلمانوں پر بھی ان مہینوں میں نہ لڑنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اگر فی الواقع کفار ان مہینوں کی حرمت کی پاس داری کریں تو مسلمانوں کو بھی کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے آخری حج کے خطبہ میں بھی ان مہینوں کی حرمت کا ذکر فرمایا۔ عطاء اور بہت سے اہل علم کا یہ قول ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔

④ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے آیت: ﴿ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ﴾ [البقرة : ۱۹۱]

⑤ اِنِ اسْتَطَاعُوْا : یہ اس بات کی بشارت ہے کہ کفار بے شمار لڑائیوں کے باوجود کبھی اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے کہ تمام مسلمانوں کو دین سے مرتد کر دیں۔ اسلام کو سربلند رکھنے والے کچھ لوگ ہمیشہ ان کا مقابلہ کرتے رہیں گے۔ دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیات اور سورۂ صف کی آیت (۸، ۹)۔

⑥ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ : اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ) مرتد ہو جائے اور اسی حالت میں مر جائے تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، لیکن اگر پھر سچے دل سے تائب ہو کر اسلام قبول کرے تو مرتد ہونے سے پہلے کے اعمال ضائع نہیں جاتے بلکہ ان کا بھی ثواب مل جاتا ہے۔ (فتح البیان)

اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے اور توبہ نہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے، جو ﴿ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا ﴾ دنیا میں ان کے اعمال ضائع ہونے کا نتیجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ)) [بخاری، الجھاد، والسیر، باب لا یعذب بعذاب اللہ : ۳۰۱۷] ''جو اپنا دین (اسلام) بدل لے اسے قتل کر دو۔'' اسلام کی وجہ سے دنیا میں حاصل جان و مال اور عزت کی حرمت، مرنے کے بعد جنازہ اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن، مسلمان بیوی کی زوجیت، وراثت غرض مسلمانوں والے تمام حقوق ارتداد کی وجہ سے ختم ہو جائیں گے۔

آیت 218 ① هَاجَرُوْا : ''هَجَرَ يَهْجُرُ (ن)'' کا معنی کسی سے دل یا زبان یا بدن کے ساتھ جدا ہو جانا ہے اور ''هَاجَرُوْا'' اس میں سے باب مفاعلہ ہے، جس میں مبالغہ مقصود ہے، یعنی ''کسی سے قطع تعلق کر کے الگ ہو جانا'' مراد دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں آ جانا ہے۔ (مفردات)

② وَجَاهَدُوْا: ''جَهَدَ يَجْهَدُ (ف)'' کا مطلب ہے ''کسی کام میں کوشش کرنا۔'' '' جَاهَدَ مُجَاهَدَةً وَجِهَادًا '' کا معنی ہے ''دشمن سے لڑنا۔'' (القاموس) ''جَهَدَ'' سے باب مفاعلہ کی وجہ سے اس کا معنی اپنی ساری کوشش صرف کرنا ہے۔ اس لیے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾

تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔ اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں، کہہ دے جو بہترین ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور وفکر کرو ﴿۲۱۹﴾

اصحاب لغت نے اس کا معنی ''لڑنا'' کیا ہے کیونکہ کوشش کی انتہا یہی ہے۔

❸ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ : یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد ایسے اعمال ہیں جن کے نتیجے میں دل کے اندر اللہ کی رحمت کی امید پیدا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا دامن ان سے خالی ہے وہ لاکھ اللہ کی رحمت کی امید کا دعویٰ کریں، حقیقت میں ان کے دل کے اندر رحمت کی امید پیدا نہیں ہوتی ؎

جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا ۔۔۔ تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس میں ان مجاہدوں کے لیے بشارت ہے جن کا ذکر حرمت والے مہینوں میں حملہ کرنے کے ضمن میں آیا ہے۔

آیت 219 ❶ الْخَمْرِ : شراب، اس کی تفسیر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ » [مسلم، الأشربة، باب بيان أن كل مسكر...... : ۲۰۰۳/۷۴] ''ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے۔'' بعض لوگوں نے صرف انگور کی شراب کو ''خمر'' قرار دے کر باقی سب کے دوسرے نام رکھ کر انھیں حلال کر لیا۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے عین مصداق ہیں کہ میری امت میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو عورتوں کی شرم گاہوں کو اور ریشم اور خمر (شراب) کو اور باجوں کو حلال کر لیں گے۔ [بخاري، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر ...... : ۵۵۹۰، عن أبي مالك الأشعري رضی اللہ عنہ] ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے کچھ لوگ خمر (شراب) پییں گے اور اس کا نام کچھ اور رکھ لیں گے۔'' [أبو داؤد، الأشربة، باب في الداذي : ۳۶۸۸]

❷ الْمَيْسِرِ : جوا، یہ ''يُسْرٌ'' بمعنی سہولت سے ہے، کیونکہ جوئے میں بغیر مشقت کے دوسرے کا مال آسانی سے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ آج کل پانسے، لاٹری، بیمے اور سٹے وغیرہ کے نام سے جو کاروبار ہو رہا ہے سب جوئے کی صورتیں ہیں، حتیٰ کہ اخروٹوں کے ساتھ کھیل میں شرط ہو تو وہ بھی جوا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے سورۂ مائدہ کی آیت (۳) اور (۹۰) کے حواشی دیکھ لیں۔

❸ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا : اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کے کچھ فوائد بتلائے، مگر ساتھ ہی فرمایا کہ کچھ فوائد کے ساتھ ان میں بہت بڑا گناہ ہے، پھر مقابلہ نفع اور نقصان کا نہیں کیا کہ ان کے نقصانات ان کے فوائد سے زیادہ ہیں، بلکہ فرمایا

فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ

دنیا اور آخرت کے بارے میں۔ اور وہ تجھ سے یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے ان کے لیے کچھ نہ کچھ سنوارتے

ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی چیز دنیا میں کتنی بھی نفع بخش کیوں نہ ہو، اگر اس میں گناہ ہے تو مومن کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس آیت میں شراب اور جوئے کی حرمت کی طرف اشارہ موجود ہے، کیونکہ ان میں " اِثْمٌ كَبِيْرٌ " بتایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے " اِثْمٌ " کو حرام قرار دیا ہے۔ (دیکھیے الاعراف : ۳۳) اس سے فوٹو کے فوائد اور گناہ کا، گھر میں ٹی وی، وی سی آر وغیرہ رکھنے کے فوائد اور گناہ کا اور کفار کے ملکوں میں جا کر رہنے کے فوائد اور گناہ کا مقابلہ بھی کر لینا چاہیے۔

④ قُلِ الْعَفْوَ : "اَلْعَفْوَ" کا معنی صاحب قاموس نے کیا ہے۔ " خِيَارُ الشَّيْءِ وَ اَجْوَدُهٗ " یعنی کسی چیز کا بہترین اور عمدہ ترین حصہ۔ طبری نے بھی کئی مفسرین سے یہ معنی نقل فرمایا ہے۔ اس صورت میں یہ آیت سورۂ آل عمران کی آیت (۹۲) اور سورۂ بقرہ کی آیت (۲۶۷) کی ہم معنی ہے، یعنی اپنی بہترین اور محبوب ترین چیز خرچ کرو۔ ترجمہ اسی معنی کے مطابق کیا گیا ہے۔

دوسرا معنی ہے ''زائد چیز'' اگرچہ زائد کا معنی بھی یہ ہو سکتا ہے کہ جو عمدگی میں بڑھیا ہو، مگر بہت سے علماء نے اس کا معنی اپنی اور گھر کی ضرورتوں سے زائد چیز کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں "اَلْعَفْوَ" سے مراد وہ مال ہے جو اہل و عیال اور لازمی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد بچ رہے اور جس کے خرچ کرنے کے بعد انسان خود اتنا محتاج نہ ہو جائے کہ دوسروں سے سوال کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہتر صدقہ وہ ہے جو خوش حالی کے ساتھ ہو اور تم پہلے اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔'' [بخاري، الزكوة، باب لا صدقة ...... : ١٤٢٦، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] یہ حکم زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقے کا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ (اشرف الحواشی) دونوں معنی مراد لینے میں بھی کوئی چیز مانع نہیں۔ بعض مسلمان کہلانے والے کمیونسٹوں نے اس آیت سے ضرورت سے زائد چیزوں کی ذاتی ملکیت کے انکار پر استدلال کیا ہے، حالانکہ اس کے معنی اوّل تو یہ ہیں کہ اپنی بہترین چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس سے اشتراکی نظریے کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اگر زائد خرچ کرنے کے معنی مراد لیے جائیں تو وہ بھی اگر لوگوں کی ملکیت میں کچھ ہو گا تو خرچ کریں گے اور یہ اختیار بھی ان کے پاس ہو گا کہ وہ کس چیز کو ضرورت سے زائد سمجھتے ہیں۔ اگر ملکیت ہی حکومت کی ہے تو لوگ کیا خرچ کریں گے۔ جبراً سب کچھ چھین لینے کو قرآن کا منشا قرار دینا، لوگوں کی طرح قرآن پر بھی جبر ہے۔

آیت 220 ① فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ : اس کا تعلق اس سے پہلی آیت "لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ" کے ساتھ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمھارے لیے شراب اور جوئے میں دنیا کے فائدے اور دنیا اور آخرت میں ان کے نقصانات اور ان کا کبیرہ گناہ ہونا اور شراب اور جوئے کے بجائے اللہ کے راستے میں اپنی بہترین چیزیں خرچ کرنا کھول کر بیان کر رہا ہے، تاکہ تم چند روزہ دنیا اور ہمیشہ رہنے والی آخرت دونوں میں خود ہی غور و فکر کر لو کہ عقل سے کام لے کر تم کس کو ترجیح دیتے ہو۔

② "اَلْيَتٰمٰى" جس کا باپ فوت ہو گیا ہو وہ بالغ ہونے تک یتیم ہے۔ " لَاَعْنَتَكُمْ " " عَنَتٌ " کا معنی مشقت ہے، جیسے سورۂ توبہ (۱۲۸) میں ہے: ﴿ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ ''اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو۔'' " اَعْنَتَ "

فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ

رہنا بہتر ہے اور اگر تم انھیں ساتھ ملا لو تو تمھارے بھائی ہیں اور اللہ بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ضرور مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۲۰﴾ اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن لونڈی کسی بھی مشرک عورت سے بہتر

باب افعال سے ماضی معروف ہے اور " اِعْنَاتٌ " اس سے مصدر ہے، جس کے معنی ہیں، آدمی کو ایسی مشقت میں ڈالنا جس میں ہلاکت کا خطرہ ہو۔ (راغب)

③ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ : " اِصْلَاحٌ " کی تنوین کی وجہ سے ''کچھ نہ کچھ سنوارتے رہنا'' ترجمہ کیا ہے، یعنی ان کے مال کی حفاظت کے ساتھ ان کی تعلیم، اخلاق، صحت اور تمام معاملات کی کچھ نہ کچھ اصلاح جو تمھارے بس میں ہو، کرتے رہنا، انھیں یتیم سمجھ کر باز پرس نہ کرنے سے بہت بہتر ہے۔

④ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جب یہ آیت اتری: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [بنی إسرائیل : ۳٤] ''اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہے'' تو لوگوں نے یتیموں کے اموال الگ کر دیے، چنانچہ یتیموں کا کھانا خراب اور گوشت بدبودار ہونے لگا۔'' یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی گئی اور اس پر یہ آیت اتری تو لوگوں نے انھیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ [مسند أحمد : ۱/ ۳۲۵، ح : ۳۰۰٤۔ مستدرك حاكم : ۲/ ۳۰٦، ح : ۳۱۰۳، صححه الحاكم و وافقه الذهبي و حسنه الألباني]

⑤ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ : مگر اللہ تعالیٰ نے تم پر مشقت نہیں ڈالی، بلکہ آسانی اور وسعت پیدا فرمائی۔ چنانچہ اصلاح کی نیت سے انھیں اپنے ساتھ ملا سکتے ہو اور اگر محتاج ہو تو بقدر خدمت و ضرورت ان کے مال سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [النساء : ٦] ''اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھا لے۔''

آیت 221 ① وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ : پہلے مسلمان اور کافر میں رشتہ ناتا جاری تھا، اس آیت سے حرام ٹھہرا۔ اگر مرد یا عورت نے شرک کیا، اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔ شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے، مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے، یا وہ جو چاہے سو کر سکتا ہے، یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے، مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس کو مختار جان کر اس سے حاجت طلب کرے۔ باقی یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح درست ہے، ان کو مشرک نہیں فرمایا۔ (موضح)

شاہ صاحب کے آخری جملہ میں کچھ تفصیل کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اہل کتاب کو مشرکین

اَعۡجَبَتۡكُمۡ ؕ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَ لَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾ ع ۲۷

ہے، خواہ وہ تمھیں اچھی لگے اور نہ (اپنی عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور یقیناً ایک مومن غلام کسی بھی مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں اچھا معلوم ہو۔ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور لوگوں کے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۱﴾

کے مقابلے میں ذکر فرمایا ہے، وہاں مشرکین سے مراد بت پرست ہیں، یہود و نصاریٰ نہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ مُنۡفَكِّيۡنَ ﴾ [البينة : ۱] ''وہ لوگ جنھوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا، باز آنے والے نہ تھے۔'' یہ اور دوسری وہ آیات جن میں اہل کتاب اور مشرکین کو الگ الگ بیان کیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ (۱۰۵) اور حج (۱۷) اور بعض مقامات پر یہود و نصاریٰ کو بھی شرک کرنے والے قرار دیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ قَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ۨ ابۡنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ ...... سُبۡحٰنَهٗ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴾ [التوبة : ۳۰، ۳۱] ''اور یہودیوں نے کہا، عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے ...... وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔'' (مزید دیکھیے مائدہ: ۷۲) چنانچہ بعض صحابہ اہل کتاب میں سے شرک کرنے والی عورتوں سے نکاح کو درست نہیں سمجھتے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''میں اس سے بڑا شرک نہیں جانتا کہ کوئی عورت کہتی ہو میرا رب عیسیٰ ہے، حالانکہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے۔'' [بخاري، الطلاق، باب قوله : ﴿ ولا تنكحوا المشركات ...... ﴾ : ۵۲۸۵] امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف یہی قول ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق اہل کتاب کی صرف موحد عورتوں سے نکاح درست ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا شرک خود ذکر کرنے کے باوجود ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے، تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں۔ امیر المومنین عمر بن خطاب، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما اور دوسرے کبار صحابہ کا یہی فتویٰ ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ﴾ [المائدة : ۵] ''تم سے پہلے جنھیں کتاب دی گئی ان کی پاک دامن عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں۔'' خلاصہ یہ کہ مسلمان کے لیے کسی ہندو یا بت پرست، کمیونسٹ یا آتش پرست مشرکہ عورت سے نکاح کرنا حرام ہے، البتہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح میں اگرچہ ایمان کا خطرہ ہے، اس لیے کراہت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۵) اس میں حکمت یہ ہے کہ بت پرست، دہریے اور آتش پرست کسی آسمانی تعلیم کو نہ مانتے ہیں نہ اس کے پابند ہیں، جب کہ اہل کتاب عورتوں کو ان کی کتاب کے حوالے سے توحید و رسالت کی دعوت دی جا سکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَ بَيۡنَكُمۡ ﴾ [آل عمران : ٦٤] ''کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى لا فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ لا وَ لَا

اور وہ تجھ سے حیض کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دے وہ ایک طرح کی گندگی ہے، سو حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور

ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے۔" اور مرد کے غالب ہونے کی وجہ سے ان کے توحید قبول کرنے کی بھی قوی امید ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اہل کتاب کی عورتوں سے جو شرک کی مرتکب ہوں، نکاح جائز ہے تو مسلمان عورتیں، جو شرک کرتی ہوں، ان سے بھی نکاح جائز ہے۔ کیونکہ وہ قرآن و حدیث کو مانتی ہیں اور انھیں اس کے حوالے سے توحید و سنت کا قائل کیا جا سکتا ہے۔

❷ **وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا:** اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان عورت آزاد ہو یا غلام، اسے مشرک کے نکاح میں دینا جائز نہیں، پھر مشرک خواہ بت پرست ہو یا یہودی یا عیسائی یا مجوسی یا دہریہ، کسی بھی غیر مسلم سے مسلم عورت کا نکاح جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں سے نکاح حرام کرنے کے بعد سورۂ مائدہ (۵) میں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی، مگر مشرک مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دینے سے منع کرنے کے بعد کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں دی۔ قرطبی نے اس بات پر امت کا اجماع نقل فرمایا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی غیر مسلم سے نہیں ہو سکتا (کیونکہ یہ اسلام کی سربلندی کے خلاف ہے)۔

تنبیہ: جس طرح کسی بھی مشرک سے مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں، خواہ یہودی ہو یا عیسائی، اسی طرح اگر کوئی کلمہ گو مسلمان بھی شرک کا مرتکب ہو، جیسا کہ اس حاشیے کے شروع میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے وضاحت فرمائی ہے تو اس سے کسی مسلمان موحدہ عورت کا نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ مرد کے غالب ہونے کی وجہ سے اس موحدہ عورت کو شرک پر مجبور کیے جانے کا خطرہ ہے۔

❸ **وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ:** یہ جملہ واضح دلیل ہے کہ عورت اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی، بلکہ اس کا ولی اس کا نکاح کر کے دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے واضح الفاظ میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح سے منع فرمایا، دیکھیے صحیح بخاری جس میں امام بخاری رحمہ اللہ نے زیر تفسیر آیت اور دو مزید آیات اور احادیث سے یہ مسئلہ ثابت فرمایا ہے۔

آیت 222 ❶ "**الْمَحِيْضِ**" "حَاضَ يَحِيْضُ (ض)" سے اسم مصدر ہے، اس کا اصل معنی "بہنا" ہے۔ مراد عورت کا وہ خون ہے جو ہر ماہ عادت کے مطابق آتا ہے۔ عادت کے خلاف جو خون آئے وہ استحاضہ (بیماری) ہے۔

"**اَذًى**" کا لفظ تکلیف، بیماری اور گندگی تینوں معنوں میں آتا ہے۔ نکرہ ہونے کی وجہ سے "ایک طرح کی گندگی" ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کا گندگی ہونا تو ظاہر ہے، طبی حیثیت سے بھی عورت ان دنوں صحت کی نسبت بیماری کے زیادہ قریب ہوتی ہے اور اس حالت میں اس سے جماع خاوند اور بیوی دونوں کے لیے بیماری کا باعث ہو سکتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہود میں جب کسی عورت کو حیض آتا تو وہ نہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے اور نہ گھر میں ان کے ساتھ اکٹھے رہتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے (اس بارے میں) پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ [البقرۃ : ۲۲۲] تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جماع کے علاوہ سب کچھ کرو۔" [مسلم، الحیض،

تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲

ان کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے۔ بے شک اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو بہت توبہ کرنے والے ہیں اور ان سے محبت کرتا ہے جو بہت پاک رہنے والے ہیں ۝۲۲۲

باب جواز غسل الحائض ...... : ۳۰۲] احادیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ اس حالت میں خاوند کے لیے عورت کا بوسہ لینا، اس سے چمٹنا، الغرض سب کچھ سوائے جماع کے جائز ہے۔ وہ اس حالت میں گھر میں رہ کر کھانا پکانا، بچے کو دودھ پلانا، غرض گھر کا ہر کام کر سکتی ہے، البتہ مسجد میں جانا اور نماز، روزہ اس کے لیے جائز نہیں۔

❷ حَتّٰى يَطْهُرْنَ : یہ باب " نَصَرَ " اور " كَرُمَ " سے ہے، بمعنی پاک ہو جائیں ''تَطَهَّرْنَ'' باب تفعل ہے، جس میں مبالغہ ہے، یعنی ''خوب پاک ہو جائیں''، غسل کر لیں۔ '' حَتّٰى يَطْهُرْنَ '' سے معلوم ہوا کہ حیض سے پاک ہونے تک جماع منع ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے جماع کی اجازت ''تَطَهَّرْنَ'' (یعنی غسل کرنے) کے بعد دی ہے۔ اکثر اہل علم یہی فرماتے ہیں کہ غسل سے پہلے جماع جائز نہیں۔ طبری نے اس پر علماء کا اجماع ذکر کیا ہے، البتہ بعض علماء پاک ہونے کے بعد عورت کے شرم گاہ کو دھو لینے کے بعد جماع جائز سمجھتے ہیں، مگر پہلی بات میں زیادہ احتیاط ہے۔

❸ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ : ''فَاْتُوْهُنَّ'' کا مطلب یہ نہیں کہ ضرور ہی ان سے صحبت کرو، بلکہ منع کرنے کے بعد امر آئے تو اجازت مراد ہوتی ہے، جیسے: ﴿ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ﴾ [المائدۃ : ۲] ''جب احرام کھول دو تو شکار کرو۔'' ''جہاں سے تمھیں اللہ نے حکم دیا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ سے (یعنی شرم گاہ میں جماع سے) تمھیں منع کیا تھا، اب اس جگہ سے عورت کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ دبر کی اجازت نہ پہلے تھی نہ اب ہے، یہ تو سراسر گندگی ہے اور ''الْمُتَطَهِّرِيْنَ'' (بہت پاک رہنے والوں) سے اس کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ اسی طرح حیض کی حالت میں جانا بھی ''الْمُتَطَهِّرِيْنَ'' کے لائق نہیں۔ اگر کوئی اس حالت میں چلا گیا تو بہت توبہ کرنے سے اللہ کی محبت کا پھر حق دار بن سکتا ہے۔ ''التَّوَّابِيْنَ'' اور ''الْمُتَطَهِّرِيْنَ'' کی یہ تفسیر آیت کی مناسبت سے ہے، ورنہ لفظ عام ہیں، جن میں ہر گناہ سے بہت توبہ اور ہر نجاست سے بہت اجتناب اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

❹ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص حیض کی حالت میں بیوی کے پاس جائے وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے۔'' [أبو داوٗد، النكاح، باب في كفارة من أتى حائضا : ۲۱۶۸۔ نسائی : ۲۹۰۔ ترمذی : ۱۳۶۔ ابن ماجہ : ٦٤٠] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرنے کا اختیار ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

تمھاری عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں، سو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لیے آگے (سامان) بھیجو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ یقیناً تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دے ﴿۲۲۳﴾ اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ، (اس سے بچنے کے لیے) کہ تم نیکی کرو اور (گناہ سے) بچو اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرو، اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾

آیت 223 ① فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ : جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہود کہتے تھے کہ جب عورت سے اس کی پچھلی جانب سے ہو کر جماع کیا جائے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے، اس پر یہ آیت اتری۔ [بخاری، التفسیر، باب ﴿ نساء کم حرث لکم ﴾ : ٤٥٢٨] عورتیں کھیتی ہیں، جماع کے لیے کوئی آسن مقرر نہیں، ہر آسن پر کر سکتے ہو، مگر اولاد پیدا کرنے کی جگہ میں ہو۔ دبر موضع حرث (کھیتی کی جگہ) نہیں، موضع فرث (پاخانے کی جگہ) ہے۔ احادیث میں دبر میں جانا حرام قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص ملعون ہے جو عورت کے پاس اس کی دبر میں جائے۔'' [أبو داوٗد، النکاح، باب فی جامع النکاح : ۲۱٦۲، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ و صححہ الألبانی]

② وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ : یعنی اپنے لیے نیک اعمال آگے بھیجو۔ نیک اولاد انسان کا بہترین سرمایہ ہے۔ بیوی سے صحبت کے وقت نیک اولاد کے حصول کی نیت بھی اس میں شامل ہے۔

③ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ : میاں بیوی کے باہمی معاملات میں اگر کوئی زیادتی ہو تو نہ کوئی گواہ ہوتا ہے نہ دخیل، مگر اللہ سے ملاقات تو یقیناً ہونی ہے، اس لیے اس سے ڈرتے رہو۔

آیت 224 بعض لوگ غصے میں آ کر کسی نیک کام کے نہ کرنے کی قسم کھا لیتے اور پھر اس قسم کو نیکی سے باز رہنے کے لیے آڑ بنا لیتے۔ اس آیت میں اس قسم کے لوگوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں اس لیے نہ کھاؤ کہ نیکی، پرہیز گاری اور لوگوں میں صلح کرانے جیسے نیک کاموں سے باز رہنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے، کیونکہ غلط قسم پر اڑے رہنا گناہ ہے۔ دیکھیے سورۂ نور (۲۲)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمان بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جب تم کسی بات پر قسم کھا لو، پھر دیکھو کہ دوسرا کام اس سے بہتر ہے تو اپنی قسم کا کفارہ دے دو اور وہ کام کرو جو بہتر ہے۔'' [بخاری، الأیمان والنذور، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ لا یؤاخذکم اللہ ...... ﴾ : ٦٦٢٢] قسم کے کفارے کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۸۹)۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اللہ تمھیں تمھاری قسموں میں لغو پر نہیں پکڑتا، بلکہ تمھیں اس پر پکڑتا ہے جو تمھارے دلوں نے کمایا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۲۲۵﴾ ان لوگوں کے لیے جو اپنی عورتوں سے قسم کھا لیتے ہیں، چار مہینے انتظار کرنا ہے، پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۲۶﴾ اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۲۷﴾

آیت 225 لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو نیت کے بغیر عادت کے طور پر یوں ہی زبان سے نکل جاتی ہیں۔ ایسی قسموں پر کسی قسم کا کفارہ یا سزا نہیں ہے، ہاں جو قسمیں دل کے ارادے کے ساتھ کھائی جائیں کہ اللہ کی قسم میں یہ کام ضرور کروں گا، یا نہیں کروں گا اور پھر ان کی خلاف ورزی کی جائے تو ان پر کفارہ ہے، مگر کوئی شخص جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے کہ میں نے یا فلاں نے یہ کام کیا ہے یا نہیں کیا تو یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس کا کفارہ نہیں صرف ندامت، آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد اور استغفار ہی اس کا علاج ہے۔ اسے ''یمین غموس'' کہتے ہیں۔

آیت 226، 227 **يُؤْلُوْنَ**: صیغہ جمع مذکر غائب، باب افعال، مہموز الفاء اور ناقص یائی، '' آلٰی یُؤْلِیْ اِیْلَاءً '' '' أ ل ی '' اس کا مادہ ہے۔ ان دو آیتوں میں ''ایلاء'' کے معنی یہ ہیں کہ مرد قسم کھا لے کہ وہ اپنی بیوی سے جماع نہیں کرے گا، پھر اگر یہ قسم چار ماہ یا اس سے کم مدت کے لیے کھائی ہو تو اسے اپنی قسم پوری کرنے کا اختیار ہے، اگر وہ مدت پوری کر کے اپنی بیوی سے تعلق قائم کر لے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا اور اگر اس مدت سے پہلے ہی تعلق بحال کر لے تو قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی بیویوں سے ایک ماہ کے لیے قریب نہ جانے کی قسم کھائی تھی، مدت پوری ہونے پر آپ نے ان سے تعلق قائم فرما لیا۔ [بخاری، النکاح، باب هجرة النبی ﷺ نساء ه...... : ۵۲۰۲] اور آپ ﷺ نے کوئی کفارہ ادا نہیں کیا۔ (شوکانی) جاہلیت میں نکاح کرنے کے بعد بعض لوگ لمبی مدت تک بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم اٹھا لیتے، یا مدت کی تعیین کیے بغیر ہمیشہ کے لیے قسم کھا لیتے، وہ بیچاری لٹکی رہتی، نہ خاوند والی نہ بغیر خاوند کے کہ کہیں اور نکاح کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس ظلم کا خاتمہ فرمایا۔ اب اگر کوئی چار ماہ سے زائد مدت کے لیے، یا مدت مقرر کیے بغیر قسم کھا لے تو ایسے شخص کے لیے اس آیت میں چار ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی ہے کہ یا تو اس مدت کے پورا ہوتے ہی اپنی بیوی سے تعلقات قائم کرے، یا پھر سیدھی طرح سے طلاق دے دے۔ پہلی صورت اختیار کرے گا تو اسے کفارہ دینا ہوگا اور اگر وہ دونوں میں سے کوئی صورت

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع ۲۸ ۱۲

اور وہ عورتیں جنھیں طلاق دی گئی ہے اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں اور ان کے لیے حلال نہیں کہ وہ چیز چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے، اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ (معاملہ) درست کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور معروف کے مطابق ان (عورتوں) کے لیے اسی طرح حق ہے جیسے ان کے اوپر حق ہے اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۲۸﴾

طلاق واقع نہیں ہو گی۔ آیت کے الفاظ سے یہی ظاہر ہوتا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ''كِتَابُ الطَّلَاقِ (۵۲۹۱)'' میں ابن عمر، عثمان، علی، ابو درداء، عائشہ رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ بارہ صحابہ سے یہ قول ذکر فرمایا ہے۔ اکثر ائمہ کا بھی یہی فتویٰ ہے۔

آیت 228 ❶ اگر خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ فوراً اس سے جدا نہیں ہوتی، بلکہ اسے کچھ مدت انتظار میں گزارنا ہو گی جس کے اندر خاوند اس سے رجوع کر سکتا ہے اور اس مدت کے گزرنے کے بعد عورت آزاد ہے، جس سے چاہے نکاح کر لے۔ اس مدت کو عدت کہتے ہیں۔

❷ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی خاوند جماع کے بعد اپنی عورت کو طلاق دے اور اسے حیض نہ آتا ہو تو اس کے لیے عدت تین ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو حمل سے فارغ ہونا۔ (دیکھیے طلاق: ۴) اور اگر جماع سے پہلے ہی طلاق ہو جائے تو اس پر کوئی عدت نہیں۔ (دیکھیے احزاب: ۴۹) پس اس آیت میں لفظ ''الْمُطَلَّقٰتُ'' (وہ عورتیں جنھیں طلاق دی جائے) سے ان عورتوں کی عدت بیان کرنا مقصود ہے جن سے خاوند صحبت کر چکے ہوں اور وہ حاملہ نہ ہوں، نہ ہی ایسی ہوں جنھیں حیض نہیں آتا، نہ لونڈیاں ہوں۔ تو ان کی عدت تین ''قروء'' ہے۔ ''قُرُوْٓءٍ'' کا لفظ جمع ہے اس کا واحد ''قُرْءٌ'' ہے اور یہ حیض کے ایام پر بھی بولا جاتا ہے اور طہر (یعنی حیض سے پاک ہونے) کے ایام پر بھی۔ بندہ کی تحقیق میں حیض والا معنی راجح ہے۔ مگر فتویٰ دونوں پر صحیح ہے۔ مزید مسائل کے لیے دیکھیے سورۂ طلاق کی ابتدائی آیات۔

❸ اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ پہلے مطلقہ عورت کے لیے کوئی عدت نہیں تھی (خاوند جب چاہتا رجوع کر لیتا) تو جب مجھے طلاق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر طلاق کی عدت کا حکم نازل فرمایا۔ [أبو داؤد، الطلاق، باب فی عدۃ المطلقۃ : ۲۲۸۱، وسندہ حسن]

❹ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ...... : یعنی عورتوں کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے رحم میں جو کچھ ہے یعنی حمل یا حیض یا طہر،

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

یہ طلاق (رجعی) دوبار ہے، پھر یا تو اچھے طریقے سے رکھ لینا ہے، یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے اور تمھارے لیے حلال نہیں کہ اس میں سے جو تم نے انھیں دیا ہے کچھ بھی لو، مگر یہ کہ وہ دونوں ڈریں کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے۔ پھر اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہیں رکھیں گے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو عورت اپنی جان چھڑانے کے بدلے میں دے دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا تو یہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾

اسے چھپائیں اور غلط بیانی کریں، کیونکہ عدت اس پر موقوف ہے۔ حمل چھپانے کی صورت میں کسی کا بچہ دوسرے کے نام لگ جائے گا اور حیض چھپانے کی صورت میں اصل عدت سے پہلے یا بعد فارغ ہوگی، اس میں حرام کے ارتکاب کا امکان ہے۔

⑤ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ: یعنی عدت کے اندر اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو عورت کو لازماً ماننا ہوگا۔ (ابن کثیر)

⑥ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی عورتوں کا بھی معروف طریقے کے مطابق مردوں پر ویسا ہی حق ہے جیسا کہ مردوں کا عورتوں پر ہے، جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھارا ان (عورتوں) پر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے بستر پر اس کو نہ بیٹھنے دیں جسے تم ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ ایسا کریں تو انھیں مارو، ایسا مارنا جو شدید نہ ہو اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ انھیں دستور کے مطابق کھانا اور لباس دو۔'' [مسلم، الحج، باب حجة النبی ﷺ : ۱۲۱۸]

⑦ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ: یعنی مرتبہ میں، اطاعت کا حق رکھنے میں، خرچ کرنے میں، فطری قوتوں میں، میراث میں، خصوصاً ان آیات میں مذکور طلاق و رجوع کا حق رکھتے ہیں، الغرض دین و دنیا کے بہت سے شرف عورت پر ان کی برتری کا باعث ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ [النساء : ۳٤] ''مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا۔''

آیت 229 ① ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابہ کی روایات کے مطابق ابتدائے ہجرت میں جاہلی دستور کے مطابق مرد عورت کو کئی کئی بار طلاق دیتے اور رجوع کرتے رہتے تھے، مقصد بیوی کو تنگ کرنا ہوتا تھا۔ اس صورت حال کو روکنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾

پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو (پہلے) دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ دونوں آپس میں رجوع کر لیں، اگر سمجھیں کہ اللہ کی حدیں قائم رکھیں گے، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے جو جانتے ہیں ﴿۲۳۰﴾

② "اَلطَّلَاقُ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "یہ طلاق" کیا ہے، یعنی وہ طلاق جو اوپر کی آیت میں ذکر ہوئی ہے، جس کے بعد عدت میں خاوند رجوع کر سکتا ہے، وہ دو مرتبہ ہے۔

③ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ: یعنی پہلی یا دوسری طلاق دینے کے بعد خاوند دوبارہ بسانے کا ارادہ رکھتا ہے تو عدت کے اندر رجوع کرے، یہ "اچھے طریقے سے رکھ لینا" ہے۔ اگر یہ ارادہ نہیں تو رجوع نہ کرے، بلکہ عدت گزرنے دے، بیوی خود بخود جدا ہو جائے گی، یہ "نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا" ہے۔ فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ عدت گزرنے کے بعد اگرچہ عورت آزاد ہے کہ جس مرد سے چاہے شادی کر لے، مگر اسے پہلے خاوند کے ساتھ شادی کا بھی اختیار ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد خاوند نہ عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے نہ عدت کے بعد نکاح، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

④ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا ...... : خاوند کے لیے بیوی کو تنگ کر کے اس سے حق مہر واپس لینا جائز نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۲۰) مگر خلع کی صورت میں خاوند معاوضہ لے کر طلاق پر راضی ہو جائے تو یہ واپسی جائز ہے۔

⑤ فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ: اس میں خلع کا بیان ہے، یعنی عورت خاوند سے علیحدگی حاصل کرنا چاہے اور خاوند طلاق دینے پر تیار نہ ہو تو عورت جان چھڑانے کے لیے اپنا مہر یا خاوند اور بیوی کے درمیان جو بھی آپس میں یا حاکم کی عدالت میں طے پا جائے، وہ چیز بطور فدیہ دے کر اپنی جان چھڑا لے۔ پھر خواہ خاوند خود ہی فدیہ لے کر اسے چھوڑ دے، یا اگر وہ اس پر تیار نہ ہو تو حاکم اسے فدیہ لے کر چھوڑنے کا حکم دے، اگر وہ نہ مانے تو عدالت نکاح فسخ کر دے۔ چونکہ یہ درحقیقت طلاق نہیں بلکہ عورت کی طرف سے علیحدگی کا مطالبہ ہے، اس لیے اسے خلع کہتے ہیں، اس کی عدت ایک حیض ہے۔ [ترمذی: ۱۱۸۵، عن الربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا] تاکہ معلوم ہو جائے کہ عورت کو حمل تو نہیں اور عدت کے دوران میں خاوند رجوع بھی نہیں کر سکتا۔

آیت 230 ① یعنی تیسری طلاق کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر لے اور وہ خاوند اس سے جماع نہ کر لے اور پھر وہ اسے از خود طلاق نہ دے، یا فوت نہ ہو جائے تو پہلے خاوند کے لیے اس سے نکاح حلال نہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ دوسرے خاوند سے اس غرض سے نکاح کرے کہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے، کیونکہ ایسا نکاح کرنے اور کروانے والے پر تو احادیث میں لعنت آئی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلالہ کرنے والے

وَ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِکُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِکُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ الۡکِتٰبِ وَالۡحِکۡمَةِ یَعِظُکُمۡ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۳۱﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اچھے طریقے سے رکھ لو، یا انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دو اور انھیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکے رکھو، تاکہ ان پر زیادتی کرو اور جو ایسا کرے سو بلاشبہ اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے آپ پر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کو بھی جو اس نے کتاب و حکمت میں سے تم پر نازل کیا ہے، وہ تمھیں اس کے ساتھ نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۲۳۱﴾

اور حلالہ کروانے والے پر لعنت فرمائی۔'' [نسائي، الطلاق، باب إحلال المطلقة ...... : ۳۴۴۵، و حسنه الألباني۔ ترمذی : ۱۱۱۹، مختصرًا] بلکہ آپ ﷺ نے حلالہ کرنے والے کو '' اَلتَّیْسُ الْمُسْتَعَارُ '' (کرائے کا سانڈ) کہا ہے۔
[ابن ماجه، النكاح، باب المحلل والمحلل له : ۱۹۳۶، عن عقبة بن عامر و حسنه الألباني]

❷ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینا منع ہے، لیکن اگر کوئی دے دے تو ایک ہی طلاق واقع ہو گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں، پھر لوگوں نے اس کام میں جلدی شروع کر دی تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لوگوں نے ایسے کام میں جلدی کرنا شروع کر دی ہے جس میں ان کے لیے مہلت تھی، تو اب ہم ان پر کیوں نہ تینوں طلاقیں ہی نافذ کر دیں۔'' چنانچہ انھوں نے اسے نافذ کر دیا۔ [مسلم، الطلاق، باب الطلاق الثلاث : ۱۴۷۲] نیز دیکھیے فتاویٰ ابن تیمیہ (۳۳/۱۳، ۲۵، ۸۵ تا ۸۷)۔

آیت 231 ❶ **فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ**: اس کا مطلب عدت ختم ہونا نہیں، بلکہ عدت ختم ہونے کے قریب ہونا ہے۔ اس کی دلیل پیچھے گزرا ہوا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَ بُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ ﴾ [البقرة : ۲۲۸] ''اور ان کے خاوند اس مدت میں انھیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

❷ یعنی اگر تم اپنی بیویوں کو طلاق رجعی دو تو ان کی عدت پوری ہونے سے پہلے پہلے تمھیں رجوع کا حق پہنچتا ہے، مگر یہ رجوع محض انھیں ستانے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے نہ ہو، کیونکہ ایسا کرنا ظلم و زیادتی اور احکامِ الٰہی سے مذاق کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین چیزیں ایسی ہیں کہ جنھیں کوئی سنجیدگی سے کہے تو وہ سنجیدہ ہیں اور ہنسی مذاق میں کہے تب بھی وہ سنجیدہ ہیں، نکاح، طلاق اور رجوع۔'' [أبو داؤد، الطلاق، باب في الطلاق على الهزل : ۲۱۹۴۔ ابن ماجه : ۲۰۳۹] ترمذی، ابن حجر، سیوطی اور البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کرلیں، جب وہ آپس میں اچھے طریقے سے راضی ہو جائیں۔ یہ بات ہے جس کی نصیحت تم میں سے اس کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ تمھارے لیے زیادہ ستھرا اور زیادہ پاکیزہ ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۳۲﴾

3 مِنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ : یہاں "الْحِكْمَةِ" سے مراد سنت ہے، یعنی کتاب و سنت کی جو نعمت تم پر نازل کی ہے اسے مت بھولو۔ یہ دونوں وحی الٰہی ہیں اور دلیل ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا منکر حدیث کا بھی وہی حکم ہے جو منکر قرآن کا ہے، مطلب یہ کہ ان آیات میں بیان کردہ گھریلو مسائل کو حدیث پاک کی روشنی میں زیر عمل لانا ضروری ہے۔

آیت 232 1 اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ : معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بہن کا نکاح ایک شخص سے کیا، اس نے اسے طلاق دے دی، جب عدت گزر گئی تو وہ (دوبارہ) نکاح کا پیغام لے کر آیا۔ میں نے اس سے کہا، میں نے تمھارا نکاح کیا، اسے تمھاری بیوی بنایا اور تمھاری عزت افزائی کی، مگر تم نے اسے طلاق دے دی، اب تم پھر اس سے نکاح کا پیغام لے کر آ گئے ہو، اللہ کی قسم! وہ تمھارے پاس کبھی نہیں آ سکتی۔ اس شخص میں کوئی برائی نہیں تھی اور میری بہن بھی اس کے پاس جانا چاہتی تھی (لیکن میں مانع تھا) تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ "تو انھیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں۔" تو میں نے کہا، اے اللہ کے رسول! اب میں نکاح کر دوں گا۔ غرض! انھوں نے اپنی بہن کا نکاح اس شخص سے کر دیا۔ [بخاری، النکاح، باب من قال لا نکاح إلا بولی ...... : ۵۱۳۰]

2 اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورت خود بخود اپنا نکاح نہیں کر سکتی، بلکہ ولی کی اجازت ضروری ہے۔ امام بخاری نے بھی اس آیت سے یہ استدلال فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی عورت کسی عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ کوئی عورت اپنا نکاح خود کرے، کیونکہ وہ عورت زانیہ ہے جو اپنا نکاح خود کرتی ہے۔" [ابن ماجه، النکاح، باب لا نکاح إلا بولی : ۱۸۸۲، عن عائشة رضی اللہ عنہا، وصححه الألبانی] اگر عورت خود اپنا نکاح کر سکتی ہوتی تو عورت کے اولیاء کو قرآن مخاطب نہ کرتا کہ "تم ان کو مت روکو۔"

3 اَزْوَاجَهُنَّ : اس لفظ سے جس طرح وہ خاوند مراد ہیں جن سے پہلے نکاح ہوا تھا، اسی طرح عدت گزرنے کے بعد اگر وہ کسی اور شخص سے نکاح کرنا چاہیں تو اس ہونے والے خاوند سے نکاح کرنے سے روکنا بھی منع ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یہ حکم ہے عورتوں کے ولیوں کو کہ اس کے نکاح میں اس کی خوشی (کا خیال) رکھیں، جہاں وہ راضی ہوں وہاں کر دیں، اگرچہ اپنی نظر میں اور جگہ بہتر معلوم ہو۔" (موضح)

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَي الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے اور وہ مرد جس کا بچہ ہے، اس کے ذمے معروف طریقے کے مطابق ان (عورتوں) کا کھانا اور ان کا کپڑا ہے۔ کسی شخص کو تکلیف نہیں دی جاتی مگر جو اس کی گنجائش ہے، نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ اس مرد کو جس کا بچہ ہے، اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے، پھر اگر وہ دونوں آپس کی رضا مندی اور باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں، جب معروف طریقے کے مطابق پورا ادا کر دو جو تم نے دیا تھا اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ اس کو جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۳۳﴾

آیت 233 ① **حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ** : نکاح وطلاق کے بعد اس آیت میں رضاعت (بچے کو دودھ پلانے کے مسائل) کا بیان ہے، کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک عورت کو طلاق ہو جائے، یا اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے اور اس کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہو۔ اس سلسلے میں ماؤں کو حکم ہو رہا ہے کہ وہ بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچے کو دودھ پلانا ماں پر فرض ہے، خصوصاً جب بچہ اس کے علاوہ کسی دوسری عورت کا دودھ پینے کے لیے تیار نہ ہو۔ (دیکھیے سورۂ طلاق: ٦) نیز اس سے دو باتیں اور بھی معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے، لہٰذا اس دو سال کی عمر کے بعد اگر کوئی بچہ کسی عورت کا دودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت نہیں ہو گی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''صرف اسی رضاعت سے حرمت ثابت ہو گی جو پستان سے پینے کے زمانے میں انتڑیوں کو پھاڑے اور دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو۔'' [ترمذی، الرضاع، باب ما جاء ما ذکر أن الرضاعة ...... : ۱۱۵۲، و قال حسن صحیح] ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس کی ہم معنی حدیث ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَاِنَّمَا الرَّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ)) [بخاری، الشہادات، باب الشہادۃ علی الأنساب ...... : ۲٦٤٧] ''یقیناً رضاعت وہی معتبر ہے جو (کم سنی میں) بھوک کی بنا پر ہو۔'' بعض لوگ دودھ چھڑانے کی مدت اڑھائی سال بتاتے ہیں، مگر وہ اس آیت اور دوسری آیت: ﴿ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ [لقمان : ١٤] (اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے) کے صریح خلاف ہے۔ مزید دیکھیے

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ (بیویاں) اپنے آپ کو چار مہینے اور دس راتیں انتظار میں رکھیں، پھر جب اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو وہ اپنی جانوں کے بارے میں معروف طریقے سے کریں اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو پوری طرح باخبر ہے ﴿۲۳۴﴾

سورۂ احقاف (۱۵) کی تفسیر۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم کو، جسے انھوں نے بیٹوں کی طرح پالا تھا، جوان ہونے پر ابو حذیفہ کی بیوی کا دودھ پی کر ان کا رضاعی بیٹا بننے کی اجازت دی تھی۔ [مسلم : ۱۴۵۳/۲۷] اس لیے عائشہ رضی اللہ عنہا رضاعتِ کبیر کی قائل تھیں، مگر دوسری امہات المومنین نے اسے ان سے خاص ہونے کے امکان کی وجہ سے تسلیم نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ سالم رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرح شدید ضرورت میں اس کی اجازت ممکن ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ دو سال کی مدت پوری کرنا ضروری نہیں، اس سے پہلے بھی بچے کا دودھ چھڑایا جا سکتا ہے۔

● رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ : اس سے معلوم ہوا کہ دودھ پلانے والی ماں کو، جب کہ اسے طلاق ہو چکی ہو، عام معروف طریقے کے مطابق کھانا اور لباس مہیا کرنا والد پر فرض ہے۔ عام حالات میں جب کہ طلاق نہ ہوئی ہو، بیوی کا کھانا اور لباس اس کے شوہر پر ویسے ہی فرض ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ طلاق (۶)۔

● لَا تُضَآرَّ : یہ ”ضَرَرَ“ سے باب مفاعلہ کا واحد مؤنث نہی حاضر مجہول کا صیغہ ہے، ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ نہی حاضر معلوم بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ماں کو تکلیف دینا یہ ہے کہ وہ مثلاً اپنے بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہے مگر باپ زبردستی چھین لے، یا یہ کہ اسے دودھ پلانے پر مجبور کرے اور خرچہ نہ دے اور باپ کو تکلیف دینا یہ ہے کہ ماں بچے کا سارا بوجھ اس پر ڈال دے، یا دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا بھاری اخراجات کا مطالبہ کرے جو باپ کی وسعت سے باہر ہوں۔“ آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: ”نہ ماں بچے کی وجہ سے ضرر پہنچا کر باپ کو تکلیف دے اور نہ باپ بچے کی وجہ سے ماں کو ضرر پہنچائے۔“ پہلی صورت میں ”لَا تُضَآرَّ“ صیغہ فعل مجہول کا ہوگا۔ دوسرے ترجمہ کے اعتبار سے صیغہ معروف، نتیجہ ایک ہی ہے۔

● وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ : یعنی اگر باپ مر جائے تو جو بھی اس کا وارث ہو اس پر فرض ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے والی کے یہ حقوق ادا کرے۔

● یعنی اگر تم بچے کو اس کی ماں کے سوا کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو، اس لیے کہ ماں کے ساتھ سمجھوتہ نہ ہو سکے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ﴾ [الطلاق : ۶] ”اور اگر تم آپس میں تنگی کرو تو اسے کوئی اور عورت دودھ پلا دے گی“ تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ جو معاوضہ تم دینا چاہتے ہو وہ معروف طریقے سے پورا پورا ادا کر دو۔

ت 234 ① خاوند کی وفات کی یہ عدت تمام عورتوں کے لیے یکساں ہے۔ شوہر نے اس سے صحبت کی ہو، یا اس سے پہلے

وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ۬ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع

اور تم پر اس بات میں کچھ گناہ نہیں جس کے ساتھ تم ان عورتوں کے پیغام نکاح کا اشارہ کرو، یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم انھیں ضرور یاد کرو گے، اور لیکن ان سے پوشیدہ عہد و پیمان مت کرو، مگر یہ کہ کوئی معروف بات کرو اور نکاح کی گرہ پختہ نہ کرو، یہاں تک کہ لکھا ہوا حکم اپنی مدت کو پہنچ جائے اور جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ پس اس سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۲۳۵﴾

ہی فوت ہو گیا ہو، اسی طرح خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھی، جیسا کہ آیت کے الفاظ میں سب بیویاں شامل ہیں۔ بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے خاوند صحبت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ اسے پورا مہر ملے گا، اسے عدت گزارنا ہوگی اور اسے میراث میں سے بھی حصہ ملے گا۔ [ترمذی، النکاح، باب ما جاء فی الرجل ...... : ۱۱۴۵۔ أبو داوٗد : ۲۱۱۴]

اس عدت میں ایک حکمت یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ عورت کو حمل تو نہیں، اگر حمل ہو تو اس کی عدت حمل سے فارغ ہونا ہے، خواہ تھوڑی دیر میں فارغ ہو جائے، خواہ آٹھ نو ماہ بعد، کیونکہ حکم ہے: ﴿ وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق : ٤] ”اور جو حمل والیاں ہیں ان کی عدت (طلاق سے ہو یا خاوند فوت ہونے سے) یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں۔“

اس عدت کے دوران عورت کے لیے نکاح کرنا ہی حرام نہیں، بلکہ سوگ منانا بھی ضروری ہے، یعنی ہر قسم کی زینت سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے، مثلاً شوخ کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی ہی ایک عورت کو آنکھ میں تکلیف کے باوجود سرمہ ڈالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ [بخاری، الطلاق، باب الکحل للحادۃ : ۵۳۳۸] عدت کے دوران اسے خاوند والے مکان سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی بھی اجازت نہیں۔ [أبو داوٗد، الطلاق، باب فی المتوفی عنها تنتقل : ۲۳۰۰۔ ترمذی : ۱۲۰٤، و صححه الألبانی]

② فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ : یعنی عدت گزرنے کے بعد وہ زیب و زینت اختیار کریں، یا اولیاء کی اجازت سے دوسرا نکاح کریں، تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ ہندوؤں کے اثرات سے بیوہ کے لیے دوسرے نکاح کو جو برا سمجھا جاتا ہے اور اس میں رکاوٹ ڈالی جاتی ہے، یہ شریعت اسلام کے سراسر خلاف ہے۔

آیت 235 ① وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ...... : یعنی عدت کے دوران میں عورت کو صاف الفاظ کے ساتھ پیغام نکاح دینا جائز نہیں، البتہ مناسب طریقے سے یعنی اشارہ کنایہ سے کوئی بات کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ ...... ﴾ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میرا شادی کرنے کا پروگرام ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ
مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٢٣٦﴾
وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ
وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٧﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو، جب تک تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو، یا ان کے لیے کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو اور انھیں سامان دو، وسعت والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگی والے پر اس کی طاقت کے مطابق ہے، سامان معروف طریقے کے مطابق دینا ہے، نیکی کرنے والوں پر یہ حق ہے ﴿٢٣٦﴾ اور اگر تم انھیں اس سے پہلے طلاق دے دو کہ انھیں ہاتھ لگاؤ، اس حال میں کہ تم ان کے لیے کوئی مہر مقرر کر چکے ہو تو تم نے جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف (لازم) ہے، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں، یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اور یہ (بات) کہ تم معاف کر دو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو، بے شک اللہ اس کو جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿٢٣٧﴾

کوئی نیک بیوی عطا فرمائے۔‘‘ [بخاری، النکاح، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ ولا جناح علیکم فیما ...... ﴾ : ٥١٢٤] لیکن یہ حکم اس عورت کا ہے جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو یا اسے تینوں طلاقیں ہو چکی ہوں، جیسا کہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو تینوں طلاقیں ہو گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: ’’جب تمھاری عدت گزر جائے تو مجھے اطلاع دینا۔‘‘ جب انھوں نے عدت گزرنے کی اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اسامہ بن زید سے نکاح کر لو۔‘‘ [مسلم، الطلاق، باب المطلقۃ البائن لا نفقۃ لھا : ١٤٨٠] مگر وہ عورت جسے رجعی طلاق دی گئی ہو تو اس سے دوران عدت میں کسی شخص کا نکاح کے لیے اشارہ کنایہ سے بات کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ ابھی تک اس پر اس کے شوہر کا حق ہے۔

● یعنی جب تک عدت پوری نہ ہو جائے نکاح کی گرہ مت باندھو۔ اس پر تمام ائمہ کا اجماع ہے کہ عدت کے اندر نکاح صحیح نہیں۔ (ابن کثیر، شوکانی)

● وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ : اس میں نکاح کے سلسلے میں شرعی احکام کے خلاف حیلے نکالنے پر وعید اور توبہ کی ترغیب ہے۔

آیت 236 یعنی جس عورت کا عقدِ نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہ ہوا ہو، اگر شوہر اسے ہاتھ لگانے (یعنی جماع یا خلوت صحیحہ) سے پہلے طلاق دے دے تو شوہر پر مہر وغیرہ کی صورت میں کسی قسم کا مالی تاوان نہیں۔ آیت میں ’’لَا جُنَاحَ‘‘ فرما کر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شوہر اپنی مالی حالت کے مطابق اسے کچھ دے کر رخصت کرے، اس اعانت کو ’’متعۂ طلاق‘‘ کہا جاتا ہے، سورۂ احزاب (٤٩) میں مزید بتایا کہ ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی صورت میں عورت پر عدت بھی نہیں، بلکہ وہ شوہر سے رخصت ہو کر فوراً نکاح کر سکتی ہے۔

آیت 237 یہ دوسری صورت ہے کہ مہر مقرر کیا جا چکا ہو اور شوہر نے ہاتھ لگانے (جماع یا خلوت صحیحہ) سے پہلے طلاق

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو ﴿۲۳۸﴾

دے دی تو اس صورت میں عورت نصف مہر کی حق دار ہوگی۔ ہاں اگر وہ عورت خود معاف کر دے تو دوسری بات ہے، یا خاوند جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے، معاف کر دے، یعنی وہ پورا مہر دے چکا ہے تو نصف واپس نہ لے، یا اپنی خوشی سے پورا مہر دے دے۔ پھر ﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ فرما کر شوہر کو ترغیب دی ہے کہ پورا مہر دے دینا ہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ اس میں مخاطب مرد ہیں۔

مسئلہ: اگر شوہر ہاتھ لگانے سے قبل وفات پا جائے تو بیوی پورے مہر کی حق دار ہوگی، اسے ورثہ بھی ملے گا اور اس پر عدت بھی واجب ہوگی، جیسا کہ بروع بنت واشق کی حدیث میں اوپر گزر چکا ہے۔ واضح رہے کہ مطلقہ عورت کی دو قسمیں ہیں: ① مہر مقرر ہو چکا تھا اور خاوند نے صحبت کے بعد طلاق دے دی۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۲۹) ② عقد کے وقت مہر مقرر نہ تھا، مگر صحبت کے بعد طلاق دے دی۔ اس صورت میں عورت مہر مثل کی حق دار ہوگی، یعنی جتنا مہر عموماً اس کے خاندان کی عورتوں کا مقرر ہوتا ہے، اس کے مطابق اسے مہر دلوایا جائے گا، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت (۲۴) میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (شوکانی)

آیت 238 ① حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى: شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''درمیانی نماز عصر ہے کہ دن اور رات کے درمیان میں ہے اور اس کی پابندی پر زیادہ زور دیا اور طلاق کے حکموں میں نماز کا ذکر فرما دیا کہ دنیا کے معاملات میں غرق ہو کر عبادت کو نہ بھول جاؤ۔ عصر کی پابندی کا حکم اس لیے زیادہ ہے کہ اس وقت دنیا کا شغل زیادہ ہوتا ہے۔'' (موضح)

② حفاظت سے مراد وقت کا خیال رکھنا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''تمام اعمال میں سے اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل محبوب ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''نماز اپنے وقت پر ادا کرنا۔'' [بخاری، الصلاۃ، باب فضل الصلوۃ لوقتها: ۵۲۷]

③ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى: اس کے متعلق گو اختلاف ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ یہی صحیح اور راجح ہے، متعدد احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری، مسلم اور سنن کی کتابوں میں متعدد صحابہ سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب کے موقع پر فرمایا: « شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَ قُبُوْرَهُمْ نَارًا »[مسلم، المساجد، باب الدلیل لمن ...... : ۲۰۵/ ۶۲۷۔ بخاری: ۶۳۹۶] ''انھوں نے ہمیں صلاۃ الوسطیٰ یعنی عصر کی نماز سے روک دیا، اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھرے۔'' بہت سے صحابہ کے آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا اس کا اہل و عیال اور مال لوٹ لیا گیا۔'' [بخاری، مواقیت الصلوۃ، باب إثم من فاتته العصر: ۵۵۲۔ مسلم: ۶۲۶]

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

پھر اگر تم ڈرو تو پیدل پڑھ لو یا سوار، پھر جب امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جیسے اس نے تمھیں سکھایا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۲۳۹﴾ اور جو لوگ تم میں سے فوت کیے جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نکالے بغیر سامان دینے کی وصیت کریں، پھر اگر وہ نکل جائیں تو تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ معروف طریقے میں سے اپنی جانوں کے بارے میں کریں اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۴۰﴾

4 قٰنِتِيْنَ : فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو، یعنی نماز میں کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے معلوم ہو کہ آدمی نماز کی حالت میں نہیں ہے، جیسے کھانا پینا اور کسی سے بات کرنا۔ عربی زبان میں قنوت کے کئی معانی آتے ہیں، مگر یہاں مراد سکوت (خاموشی) ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم نماز میں ایک دوسرے سے بات کر لیا کرتے تھے، کوئی بھی شخص اپنے دوسرے بھائی سے (جو نماز میں ہوتا) اپنی کسی ضرورت کے لیے بات کر لیا کرتا تھا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ تو ہمیں (نماز میں) خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا اور باتیں کرنے سے منع کر دیا گیا۔'' [بخاری، التفسیر، باب ﴿ و قوموا لله ...... ﴾ : ۴۵۳۴۔ مسلم، المساجد، باب تحریم الکلام ...... : ۵۳۹]

آیت 239 اس آیت میں نماز کی حفاظت کی مزید تاکید ہے کہ خوف اور ہنگامی حالت میں بھی نماز معاف نہیں ہے، بلکہ پیدل یا سوار، جس حالت میں بھی ممکن ہو، خوف کے وقت نماز ادا کر لو۔ ہاں خوف ختم ہونے کے بعد نماز کو ان پورے شرائط و ارکان اور آداب کے ساتھ ادا کرو جن کی تمھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے تعلیم دی ہے۔ صلاۃ خوف کے احکام کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۰۲) کی تفسیر۔

آیت 240 وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ...... : بہت سے علماء نے اس آیت کو اس آیت سے منسوخ قرار دیا ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہے، جس میں فوت شدہ خاوند کی بیوی کی عدت چار مہینے دس دن بیان کی گئی ہے۔ اس صورت میں یہ آیت تلاوت کی ترتیب کے لحاظ سے بعد میں آنے کے باوجود ترتیب میں پہلے آنے والی آیت کے ساتھ منسوخ ٹھہرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زیر تفسیر آیت کی رو سے پہلے اس عورت کی عدت ایک سال تھی، پھر اسی سورت کی آیت (۲۳۴) سے چار ماہ دس دن قرار دی گئی۔ چنانچہ عدت ایک سال ہونا منسوخ ہو گیا اور چار ماہ دس دن کے بعد رہائش اور کھانے وغیرہ کا خرچہ آیت میراث (نساء: ۱۱، ۱۲) کے ساتھ منسوخ ہو گیا، کیونکہ اس میں تمام وارثوں کے حصے مقرر کر دیے گئے۔ اب وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ حالانکہ دونوں آیات کے الفاظ پر غور کریں تو پہلی آیت میں واضح حکم ہے کہ ایسی عورت چار ماہ

ع وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ
اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

اور ان عورتوں کے لیے جنھیں طلاق دی گئی ہے، کچھ نہ کچھ سامان دینا معروف طریقے سے (لازم) ہے، پرہیز گاروں پر یہ حق ہے ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۲۴۲﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے، جب کہ وہ کئی ہزار تھے، تو اللہ نے ان سے کہا مر جاؤ، پھر انھیں زندہ کر دیا۔ بے شک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾

دس دن نکاح نہیں کر سکتی، بلکہ اپنے آپ کو انتظار میں رکھے گی۔ اسے عدت کہتے ہیں، جب کہ دوسری آیت میں ایک سال اپنے آپ کو انتظار میں رکھنے اور نکاح نہ کرنے کا ذکر ہی نہیں، تو اس آیت کی رو سے عدت ایک سال کیسے بن گئی؟ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ پہلی آیت سے منسوخ نہیں، نہ ہی ترتیب تلاوت میں کوئی خلل ہے۔

رہ گیا نان و نفقہ اور رہائش کا منسوخ ہونا تو جو علماء منسوخ بتاتے ہیں وہ سورۂ نساء کی آیتِ میراث سے منسوخ بتاتے ہیں، جو سورۂ بقرہ کے بعد اتری ہے۔ اس لیے زیر تفسیر آیت کسی طرح بھی پہلی آیت کے ساتھ منسوخ نہیں۔ اگر اس کا کچھ حصہ منسوخ ہے بھی تو سورۂ نساء کے ساتھ منسوخ ہے۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں، اس میں عدت بیان ہی نہیں ہوئی، بلکہ میت کے اولیاء کو وصیت کا ذکر ہے کہ وہ عورت کی دل جوئی کی خاطر اور مرنے والے سے اظہار محبت و اخلاص کے طور پر چار ماہ دس دن کے بعد مزید سات ماہ بیس دن اسے اپنے شوہر کے گھر میں رہنے دیں۔ ہاں اگر عورت چار ماہ دس دن یا وضع حمل کے بعد اپنی مرضی سے اس گھر سے منتقل ہونا چاہے تو اس کی مرضی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آیتِ میراث کے باوجود چار ماہ دس دن اس گھر میں رہنے کا لازمی حکم دے سکتا ہے تو سال کے باقی ماندہ دن اختیاری طور پر وہاں رہنے کی اجازت کا حکم بھی دے سکتا ہے اور یہ آیتِ میراث کے خلاف نہیں۔ یہ رائے امام مجاہد بن جبر، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دوسرے کئی اہل علم کی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسے قوی قرار دیا ہے اور اس سے قرآن کی آیات کی ترتیب کا حسن بھی باقی رہتا ہے۔

آیت 241 سورۂ بقرہ کی آیت (۲۳۶) میں ان مطلقہ عورتوں کو سامان دینے کا حکم تھا جنھیں نہ خاوند نے ہاتھ لگایا ہو اور نہ مہر مقرر ہوا ہو، جبکہ اس آیت میں تمام مطلقہ عورتوں کو اچھے طریقے سے کچھ سامان، کپڑوں کا جوڑا وغیرہ دے کر رخصت کرنے کا حکم ہے، تاکہ عورت کی کچھ دل جوئی ہو جائے۔ یہ احسان کا تقاضا ہے۔

آیت 242 یہاں نکاح و طلاق کے مسائل ختم ہوئے اب جہاد کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

آیت 242 ① یہ واقعہ سابقہ کسی امت کا ہے، جس کی تفصیل کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں کی گئی۔ یہ لوگ دشمن کے حملے کے وقت قتل ہونے کے خوف سے ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مقابلہ کرنے کے بجائے شہر چھوڑ کر بھاگ

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو کہ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۴۴﴾ کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، پس وہ اسے اس کے لیے بہت زیادہ گنا بڑھا دے اور اللہ بند کرتا اور کھولتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾

پڑے، یا وبا واقع ہونے پر تقدیر پر صابر رہنے کے بجائے موت سے بچنے کے لیے گھر بار چھوڑ کر نکل گئے، لیکن وہ بھاگ کر موت سے نہ بچ سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب پر موت طاری کر دی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا اور انھیں زندہ کر دیا۔ اس سے اگلی آیت (۲۴۴) میں اللہ کی راہ میں قتال یعنی لڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس حکم سے پہلے اس واقعہ کے بیان میں یہی حکمت ہے کہ جہاد سے جی مت چراؤ، موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے تم جہاد سے گریز اور فرار اختیار کر کے ٹال نہیں سکتے، نہ تقدیر سے بچ کر کہیں جا سکتے ہو۔

2 یہ قصہ قیامت کے دن جسموں کے دوبارہ زندہ ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

3 **اَلَمْ تَرَ**: اس کا لفظی معنی ہے "کیا تو نے نہیں دیکھا" مگر مجاہد رحمہ اللہ نے اس کا معنی کیا ہے: " اَلَمْ تَعْلَمْ " "کیا تجھے معلوم نہیں" [بخاری، التفسیر، سورۃ ﴿ ألم تر ﴾، قبل ح : ٤٩٦٤] مزید دیکھیے سورۂ فیل کے حواشی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اترنے کے وقت ان لوگوں کا قصہ عام طور پر معروف و مشہور تھا۔ بعض اوقات کسی بات کو سننے کا شوق دلانے کے لیے بھی "**اَلَمْ تَرَ**" سے بات شروع کی جاتی ہے۔

4 عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "جب تم سنو کہ کسی زمین میں وبا پھیلی ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی زمین میں وبا پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اس سے فرار اختیار کر کے وہاں سے مت نکلو۔" [بخاری، الطب، باب ما یذکر فی الطاعون : ۵۷۲۹]

آیت 244 **وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ**: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، جس طرح جان بچانا تقدیر سے نہیں بچاتا، اسی طرح جہاد سے فرار اور اجتناب سے نہ موت قریب ہوتی ہے نہ دور، بلکہ اجل اور رزق کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ **اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ** ...... ﴾ [آل عمران : ۱۶۸] اور فرمایا: ﴿ **اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ** ﴾ [النساء : ۷۸] "تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔"

آیت 245 **مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا**: اس سے پہلی آیت میں اللہ کے راستے میں لڑنے کا حکم تھا، اب جہاد میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

کیا تو نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا، جب انھوں نے اپنے ایک نبی سے کہا ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر کہ ہم اللہ کے راستے میں لڑیں۔ اس نے کہا یقیناً تم قریب ہو کہ اگر تم پر لڑنا فرض کر دیا جائے تو تم نہ لڑو۔ انھوں نے کہا اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ کے راستے میں نہ لڑیں، حالانکہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے۔ پھر جب ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تو ان میں سے بہت تھوڑے لوگوں کے سوا سب پھر گئے اور اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۲۴۶﴾

لیے مال خرچ کرے اور اس میں ریا کاری یا کسی کو ستانے اور اس پر احسان رکھنے کی نیت نہ ہو۔ اللہ کا کرم دیکھیے کہ خود ہی سب کچھ عطا کر کے بندوں سے مانگ رہا ہے اور اسے اپنے ذمے قرض قرار دے رہا ہے۔ سورۂ توبہ میں مال کے ساتھ جان کا بھی ذکر ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ﴾ [التوبة : ۱۱۱] ”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے۔“ سورۂ بقرہ (۲۶۱) ہی میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قرض حسن کو کئی گنا بڑھا کر واپس کریں گے۔

آیت 246 ① **الْمَلَاِ** : یہ ”مَلَأَ یَمْلَأُ (ف)“ یعنی ”پُر کرنا، بھرنا“ سے ہے۔ قوم کے سردار بھی اپنی ہیبت اور رعب سے آنکھیں بھر دیتے ہیں، اس لیے ان کو ”مَلَأٌ“ کہا جاتا ہے۔

② ”اَلَمْ تَرَ“ سے ابتدا کر کے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا ایک عجیب قصہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ جب ان کی بزدلی اور ترک جہاد کی وجہ سے انھیں ان کے وطن سے نکال دیا گیا، ان کے بچوں اور عورتوں کو لونڈیاں اور غلام بنا لیا گیا تو ان کے سرداروں نے وقت کے نبی سے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی کو ان کے مزاج اور عادات کا اندازہ تھا، انھوں نے کہا، اچھی طرح دیکھ لو! جب تم پر قتال فرض ہو گیا تو تم نہیں لڑو گے۔ انھوں نے کہا، ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑیں گے، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں اور بیٹوں سے نکال دیا گیا۔ آخر نبی کا اندازہ درست نکلا، لڑنے کے لیے چند لوگ ہی رہ گئے، مگر اللہ تعالیٰ نے جہاد میں استقامت کی بدولت ان کو بھی فتح عطا فرما دی۔ اس سے ترک جہاد کا نقصان یعنی وطن اور سلطنت سے محرومی اور اہل و عیال کا دشمن کی غلامی میں چلا جانا بیان کرنا مقصود ہے اور اس کا علاج بھی کہ یہ کھوئی ہوئی عزت جہاد کے بغیر کسی صورت دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور ان سے ان کے نبی نے کہا بے شک اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا اس کی حکومت ہم پر کیسے ہو سکتی ہے، جبکہ ہم حکومت کے اس سے زیادہ حق دار ہیں اور اسے مال کی کوئی وسعت بھی نہیں دی گئی؟ فرمایا بے شک اللہ نے اسے تم پر چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ فراخی عطا فرمائی ہے اور اللہ اپنی حکومت جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۴۷﴾

مسلمان اگر اپنا وطن حاصل کرنے کے لیے لڑیں تو یہ بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ زمین پر کفار کے قبضے سے اللہ کا کلمہ نیچا اور مسلمانوں کے قبضے سے اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے۔ کچھ نادان بھارت کے زیر تسلط کشمیر میں لڑائی کو وطن کے لیے لڑائی قرار دے کر اس کے فی سبیل اللہ قتال ہونے سے انکار کرتے ہیں، انھیں ان آیات پر غور کرنا چاہیے۔

③ جب ان پر قتال فرض ہوا تو نبی کے اندیشے کے مطابق اکثر لوگ لڑائی سے پیچھے ہٹ گئے، یہ ان کا اپنی جانوں پر ظلم تھا۔ "الظّٰلِمِيْنَ" میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ "ان ظالموں کو" کیا گیا ہے۔

آیت 247 ① اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا: ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ یہاں غور کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں طالوت کا نام بتا دیا، آگے چل کر داؤد علیہ السلام کا نام اور دشمنوں کے سردار جالوت کا نام بھی بتا دیا، مگر اس نبی کا نام نہیں بتایا۔ یقیناً اس میں کوئی حکمت ہے، جو بظاہر یہ ہے کہ نبی کوئی بھی ہو واجب الاطاعت ہوتا ہے، اس کا نام مشہور ہو یا نہ ہو۔ اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ ہم اس نبی کے نام کی تعیین کا تکلف نہ کریں۔

② قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا: طالوت کو بادشاہ مقرر کرنے پر سرداروں نے دو اعتراض کیے، ایک تو یہ کہ بادشاہ بننے کا حق ہم اس سے زیادہ رکھتے ہیں، کیونکہ خاندانی طور پر سرداری ہم میں چلی آ رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ طالوت کوئی سرمایہ دار شخص نہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اب بھی دنیا میں سربراہ بننے کے لیے یہی دو پیمانے جاری ہیں، یا تو وہ کسی سربراہ خاندان سے ہو، یا سرمایہ دار ہو۔ نبی نے دونوں چیزوں کی نفی کر کے انھیں بتایا کہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تم پر برتری عطا فرما کر چن لیا ہے، اب اللہ کے انتخاب پر اعتراض کا تمھیں کوئی حق نہیں۔ دوسری یہ کہ حکومت کے لیے خاندان یا سرمایہ کے بجائے علم اور جسمانی قوت کا ہونا ضروری ہے اور یہ دونوں چیزیں طالوت میں تم سب سے زیادہ ہیں۔ تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو بادشاہت عطا کرنے میں کسی کی مرضی کا پابند نہیں، وہ جسے چاہتا ہے سلطنت عطا کر دیتا ہے۔

③ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ملوکیت فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں، اگر کوئی بادشاہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر چلے تو صرف بادشاہ ہونے کی بنا پر قابل رد نہیں۔ آپ اسے خلیفہ بھی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے متعلق خلیفہ کا لفظ بھی آیا ہے، فرمایا:

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا
ع تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ
مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا
جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

اور ان کے نبی نے ان سے کہا بے شک اس کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آ جائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے ایک تسلی ہے اور اس میں سے چند باقی ماندہ چیزیں ہیں جو موسیٰ کی آل اور ہارون کی آل نے چھوڑا تھا، فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے، بے شک اس میں تمھارے لیے یقیناً ایک نشانی ہے، اگر تم مومن ہو ﴿۲۴۸﴾
پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر جدا ہوا تو کہا بے شک اللہ ایک نہر کے ساتھ تمھاری آزمائش کرنے والا ہے، پس جس نے اس میں سے پیا تو وہ مجھ سے نہیں اور جس نے اسے نہ چکھا تو بے شک وہ مجھ سے ہے، مگر جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پانی لے لے۔ تو ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے اس سے پی لیا۔ تو جب وہ اور اس کے ساتھ وہ لوگ نہر سے پار ہو گئے جو ایمان لائے تھے، تو انھوں نے کہا آج ہمارے پاس جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں۔ جو لوگ سمجھتے تھے کہ یقیناً وہ اللہ سے ملنے والے ہیں انھوں نے کہا کتنی ہی تھوڑی جماعتیں زیادہ جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۲۴۹﴾

﴿ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ ﴾ [صٓ: ۲۶] ''بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔'' اور یہ بھی کہ ﴿ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۱] ''اور اللہ نے اسے بادشاہی عطا کی۔'' اس لحاظ سے وہ طالوت کے بعد مَلِک (بادشاہ) بھی تھے۔

آیت 248 اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ...... : بنی اسرائیل کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اور طالوت کی بادشاہت پر یقین میں اضافے کے لیے نبی نے طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے کی ایک نشانی بیان فرمائی کہ وہ تابوت (جو دشمن تم سے چھین کر لے گیا تھا) جس کے ہوتے ہوئے تمھیں (دشمن کے مقابلے کے وقت) سکون و اطمینان حاصل رہتا تھا اور جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چند باقی ماندہ چیزیں تھیں، وہ تابوت تمھارے پاس آ جائے گا، جسے فرشتے اٹھا لائیں گے۔ چنانچہ اس تابوت (صندوق) کے آ جانے سے بنی اسرائیل کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

آیت 248 ① فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ : '' بِالْجُنُوْدِ '' (لشکروں) کے لفظ سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی بہت بڑی تعداد لڑنے کے لیے نکلی تھی۔ طالوت نے ان کی اطاعت، جفاکشی، بھوک پیاس اور میدانِ جنگ میں صبر کا امتحان لینا

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۫ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور ان کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما﴿۲۵۰﴾ تو انھوں نے اللہ کے حکم سے انھیں شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے بادشاہی اور دانائی عطا کی اور جتنا کچھ چاہتا تھا سکھا دیا۔ اور اگر اللہ کا لوگوں کو ان کے بعض کو بعض کے ساتھ ہٹانا نہ ہوتا تو یقیناً زمین برباد ہو جاتی اور لیکن اللہ جہانوں پر بڑے فضل والا ہے﴿۲۵۱﴾

ضروری سمجھا، تاکہ صرف وہ شخص ساتھ جائے جس میں یہ صفات موجود ہوں، مگر اس امتحان میں تھوڑے سے لوگ کامیاب ہوئے، باقی ناکام ہو گئے۔ کامیاب ہونے والے نہر سے پار ہوئے تو دشمن کی تعداد دیکھ کر ان میں سے کچھ کمزور ایمان والے کہہ اٹھے کہ ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے کی طاقت نہیں، مگر پختہ ایمان والوں نے، جنھیں اللہ سے ملاقات کا یقین تھا، ان کی ہمت بندھائی کہ لڑائی میں قلت و کثرت فیصلہ کن نہیں ہوتی، اللہ کا حکم فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو تھوڑی جماعتیں صبر و استقامت کی وجہ سے بڑی جماعتوں پر غالب آ جاتی ہیں، کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ امت محمدیہ ﷺ میں اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ بدر، احد، خندق کو دیکھ لیجیے۔ جنگ موتہ میں مسلمان تین ہزار اور دشمن دو لاکھ تھا۔ (الرحیق المختوم، معرکہ موتہ)

❷ براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، مجھے اصحاب محمد ﷺ نے بتایا، جو بدر میں شریک تھے کہ ان کی تعداد طالوت کے ساتھیوں کے برابر تھی جو نہر سے پار ہوئے تھے، تین سو دس سے کچھ زیادہ۔ براء کہتے ہیں، اللہ کی قسم! اس کے ساتھ کسی مومن کے سوا کوئی پار نہیں ہوا۔ [بخاری، المغازی، باب عدۃ أصحاب بدر : ۳۹۵۷]

آیت 250 **اَفْرِغْ عَلَيْنَا** : یہ باب افعال سے امر کا صیغہ ہے، جس کا معنی برتن انڈیل کر خالی کرنا ہے، یعنی انھوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! ہم پر پورا صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں پر ہماری مدد فرما۔ یہ بڑی جامع اور حسن ترتیب سے آراستہ دعا ہے، کیونکہ صبر آتا ہے، تو ثابت قدمی ملتی ہے، ثابت قدمی ہو تو نصرتِ الٰہی ملتی ہے۔ معلوم ہوا مومن کے لیے میدان جنگ میں بھی تیاری کے باوجود سب سے بڑا ہتھیار اللہ پر اعتماد اور اس سے دعا ہے۔

آیت 251 ❶ **فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ** : چنانچہ ان تھوڑے سے مسلمانوں نے جالوت کے لشکروں کو اللہ کے حکم سے

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انھیں حق کے ساتھ تجھ پر پڑھتے ہیں اور بلاشبہ تو یقیناً رسولوں میں سے ہے﴿۲۵۲﴾

شکست دی اور داؤد علیہ السلام نے، جو اس وقت ایک سپاہی تھے، کفار کے بادشاہ جالوت کو قتل کر دیا، جس کے نتیجے میں طالوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں سلطنت اور حکمت یعنی نبوت عطا فرمائی اور جو چاہا سکھایا، ان کو سکھائے گئے علوم میں سے قرآن مجید میں ان کے اسلحہ سازی کے علم، پرندوں کی بولی کے علم اور حکم یعنی قوتِ فیصلہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان کی خوش الحانی اور پرندوں اور پہاڑوں کے ان کے ساتھ تسبیح کرنے کا بھی ذکر ہے۔

② نادان لوگ کہتے ہیں کہ لڑائی کرنا نبیوں کا کام نہیں، اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جہاد ہمیشہ سے رہا ہے اور اگر جہاد نہ ہو تو مفسد لوگ شہروں کو ویران کر ڈالیں۔ (موضح)

③ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ...... : اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی گروہ قوت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر انسانی حد سے آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کسی دوسرے گروہ کو اٹھا کر اس کی سرکوبی کروا دیتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین میں امن قائم نہ ہو سکتا۔ مزید دیکھیے سورۂ حج (۴۰)۔

آیت 252 یعنی پچھلی امتوں کے یہ واقعات جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں، یہ آپ کے نبی صادق ہونے کی واضح دلیل ہیں، کیونکہ آپ نے انھیں نہ کسی کتاب میں پڑھا اور نہ کسی سے سنا، پھر بھی انھیں اس طرح ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل بھی ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ کافروں کی طرف سے آپ کی رسالت کے انکار پر انتہائی تاکیدی الفاظ ”اِنَّ“ اور ”لام تاکید“ کے ساتھ آپ کی رسالت کا اثبات ہے۔ کافر آپ کی رسالت کے انکاری تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ﴾ [الرعد : ۴۳] ”اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں، تو کسی طرح رسول نہیں ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ ”بلاشبہ تو یقیناً رسولوں میں سے ہے۔“

الجزء الثالث

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ع ۵ / ۳۳

یہ رسول، ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان کے بعض کو اس نے درجوں میں بلند کیا اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور اسے پاک روح کے ساتھ قوت بخشی۔ اور اگر اللہ چاہتا تو جو لوگ ان کے بعد تھے آپس میں نہ لڑتے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکیں اور لیکن انھوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے کوئی تو وہ تھا جو ایمان لایا اور ان سے کوئی وہ تھا جس نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے اور لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ﴿۲۵۳﴾

آیت 253 ① تِلْكَ الرُّسُلُ ...... : اس سے وہ رسول مراد ہیں جن کا اس سورت میں ذکر آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء درجات میں مختلف ہیں اور فضیلت میں ایک دوسرے سے زیادہ ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [بنی إسرائیل : ۵۵] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی۔“

② مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ : جیسے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے: ﴿ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ [النساء : ۱۶۴] ”اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔“

③ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ : یہ بات اسی آیت میں پہلے بھی گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی، اب پھر فرمایا: ”ان میں سے بعض کو درجات میں بلند کیا“ اس سے ایک خاص شخصیت کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے، جسے سب جانتے ہیں، اس لیے نام لینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جیسا کہ یہ آیت ہے: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ [بنی إسرائیل : ۱] اس میں بھی اس بندے کا نام بتانے کی ضرورت نہیں پڑی اور وہ ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ فضیلت دو طرح کی ہے، ایک مجموعی اور کلی فضیلت اور دوسری جزوی فضیلت، یعنی کسی ایک چیز میں دوسروں سے بڑھ کر ہونا، مثلاً یوسف علیہ السلام کہ وہ خود، ان کے والد، دادا اور پردادا نبی تھے، یہ فضیلت کسی اور رسول کو حاصل نہیں، چنانچہ اس لحاظ سے رسول اللہ ﷺ نے انھیں ” أَكْرَمُ النَّاسِ “ یعنی سب لوگوں سے زیادہ معزز فرمایا۔ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالی : ﴿ واتخذ اللہ ...... ﴾ : ۳۳۵۳] آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ (۶۰) ہاتھ قد عطا کیا اور انھیں اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، یہ آدم علیہ السلام کی جزوی فضیلت ہے، کلی اور مجموعی طور پر ہمارے رسول ﷺ تمام انبیاء سے افضل ہیں، یہی صحیح عقیدہ ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ خود آپ ﷺ نے فرمایا: « أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ » ”میں آدم علیہ السلام کی اولاد کا قیامت کے دن سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں۔“ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة بنی إسرائیل : ۳۱۴۸، و صححہ الألبانی]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھیں دیا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ کوئی سفارش اور کافر لوگ ہی ظالم ہیں ﴿۲۵۴﴾

آپ ﷺ کی افضلیت کے لیے قرآن مجید ہی کافی ہے۔ دوسرے تمام انبیاء کے معجزات ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئے جبکہ قرآن قیامت تک باقی ہے۔ مفسرین بالخصوص رازی نے آپ ﷺ کی افضلیت کو دلائل سے ثابت کیا ہے اور اس سلسلے میں شبہات کے جواب دیے ہیں، لیکن ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی رسول اللہ ﷺ کا فرمان بظاہر اس کے خلاف ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے موسیٰ (علیہ السلام) سے بہتر نہ کہو۔“ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب وفاة موسى...... : ۳۴۰۸] اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ)) ”اللہ کے انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت مت دو۔“ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول الله تعالى ...... : ۳۴۱۴] علماء نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں، جن میں سے واضح ترین جواب دو ہیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ کی مراد ہے کہ میری فضیلت ایسے انداز سے بیان نہ کرو جس سے دوسرے انبیاء کی کسر شان کا پہلو نکلتا ہو، کیونکہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ مسلمان اور یہودی کے جھگڑے کے موقع پر فرمائے تھے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی نبی کو ایک ایک چیز میں دوسرے انبیاء سے افضل نہ بتاؤ، کیونکہ جزوی فضیلت کسی بھی نبی کی ہو سکتی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت حاصل ہے، لیکن حدیث میں فضیلت دینے سے جو منع فرمایا ہے اس سے مراد مقابلہ کی صورت میں ہے، یا جزوی فضیلت مراد ہے، لہٰذا کتاب و سنت میں کوئی تعارض نہیں۔“ (ابن کثیر، فتح القدیر)

④ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ......: یہاں ”الْبَيِّنٰتِ“ سے مراد واضح دلائل اور معجزات ہیں، دیکھیے سورۂ آل عمران (۴۹) اور روح القدس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۷)۔

⑤ یعنی انبیاء کے متبعین میں یہ سب دلائل دیکھنے کے بعد ضد و عناد کی وجہ سے اختلاف اور پھر اس اختلاف کی بنا پر آپس کی لڑائی اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت سے ہے۔ یہاں ”ایسا کیوں ہوا“ نہیں کہا سکتا کیونکہ اس کا جواب ہمارے فہم سے بالا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک اختیار دیا ہے، پھر اسے بھی اپنے اختیار کے تحت رکھا ہے، اس کی حکمت وہی جانتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا ایک بھید ہے جو ہم سے مخفی رکھا گیا ہے، لہٰذا اسے معلوم کرنے کی کوشش کا کچھ فائدہ نہیں، بلکہ مان لینا چاہیے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۲۳)۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ کفر و ایمان میں لوگوں کا اختلاف تو پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے، کوئی نبی ایسا نہیں کہ جس کی ساری امت ایمان لے آئی ہو، لہٰذا آپ ان کے انکار سے رنجیدہ نہ ہوں۔

آیت 254 ① انسان پر سب سے زیادہ مشکل جان و مال کی قربانی ہے اور عموماً شریعت کے احکام کا تعلق ان دونوں

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی

اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے، نہ اسے کچھ اونگھ پکڑتی ہے اور نہ کوئی نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی

سے ہے۔ اس سورت میں پہلے ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ : ۲۴۴] فرما کر جہاد کا حکم دیا اور آیت: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ ......﴾ [البقرۃ : ۲۴۵] سے جہاد کے لیے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی، اس کے بعد طالوت کے قصے کے ساتھ پہلے حکم کی تاکید کی اور اس آیت کے ساتھ دوسرے حکم کی تاکید کے لیے دوبارہ مال خرچ کرنے کا حکم دیا۔ (رازی)

2 مقصد یہ کہ انسان دنیاوی اسباب و وسائل کو چھوڑ کر اکیلا ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگا۔ لہٰذا آخرت میں نجات کے لیے صدقہ و خیرات اور اس جیسے نیک اعمال کو وسیلہ بناؤ۔ قیامت کے دن دنیاوی دوستی، رشتہ داری کا تعلق اور سفارش وغیرہ کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ (ابن کثیر)

3 اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا منکر کافر ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ سے جہاد کیا، جیسا کہ کفار سے کیا جاتا ہے۔ (قرطبی)

آیت 255 1 یہ آیت الکرسی ہے جو قرآن مجید کی تمام آیات سے عظیم آیت ہے۔

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو منذر! کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے پاس اللہ کی کتاب میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' فرماتے ہیں، میں نے کہا، اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو منذر! کیا تم جانتے ہو کہ تمھارے پاس اللہ کی کتاب میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟'' کہتے ہیں، میں نے عرض کیا: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (ابی بن کعب رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اللہ کی قسم! (تم نے درست کہا) اے ابو منذر! تمھیں یہ علم مبارک ہو۔'' [مسلم، صلوۃ المسافرین، باب فضل سورۃ الکهف و آیة الکرسی : ۸۱۰] ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث ہے، اس میں ان کا زکوٰۃ الفطر کی حفاظت پر مامور ہونا اور ایک شخص کا تین دن آ کر چوری کی کوشش کرنا، روزانہ گرفتار ہو کر منتیں کر کے چھوٹنا اور تیسری دفعہ گرفتار ہونے پر انھیں یہ بتانا مذکور ہے کہ جب تم بستر پر آؤ تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، تو لازماً اللہ کی طرف سے تم پر ایک حفاظت کرنے والا مقرر ہوگا اور تمھارے صبح کرنے تک کوئی شیطان تمھارے قریب نہیں آئے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی اسے چھوڑ دیا، صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''تمھارے قیدی کا کیا بنا؟'' میں نے سارا قصہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یاد رکھو! اس نے تمھیں سچ بتایا، حالانکہ وہ بہت جھوٹا تھا۔'' پھر آپ ﷺ نے بتایا: ''وہ شیطان تھا۔'' [بخاری، الوکالة، باب إذا وکل رجلا فترك شیئا ...... : ۲۳۱۱، ۵۰۱۰]

اس حدیث سے آیت الکرسی کی فضیلت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کا نام آیت الکرسی ہونے کی تصدیق بھی معلوم ہوئی۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے اسے

الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ

اجازت کے بغیر سفارش کرے، جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا

جنت میں داخلے سے سوائے موت کے کوئی اور چیز نہیں روکے گی۔“ [الیوم واللیلة للنسائی، ص : ۱۸۳۔ سلسلة الأحادیث الصحیحة : ۹۷۲۔ ابن کثیر اور البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے]

② قرآن مجید کی سب سے لمبی آیت : ﴿ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ ﴾ [البقرة : ۲۸۲] ہے، مگر سب سے زیادہ عظمت والی آیت، آیت الکرسی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کا موضوع توحید ہے، جو اس میں کئی دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ موضوع اور دلیلوں کی وجہ سے یہ سب سے بڑی آیت ہے۔ سورۂ اخلاص چھوٹی سی سورت ہونے کے باوجود قرآن کے ثلث (تہائی حصے) کے برابر ہے۔ [بخاری، فضائل القرآن، باب فضل : ﴿ قل هو الله أحد ﴾ : ۵۰۱۳] اس کی وجہ بھی موضوعِ توحید کی عظمت ہے۔

نکتہ : آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے اسماء اور ضمائر کی صورت میں انیس دفعہ آیا ہے۔ ”یَعْلَمُ“ اور ”شَآءَ“ میں بھی ضمیریں موجود ہیں۔

③ آیت الکرسی ایک دعویٰ اور اس کی گیارہ دلیلوں پر مشتمل آیت ہے۔ دعویٰ یہ ہے: ﴿ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔

پہلی دلیل : وہ ”اَلْحَیُّ“ ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ قَبْلَهُ)) ”اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔“ [بخاری، التوحید، باب ﴿ و کان عرشه علی الماء ﴾ : ۷۴۱۸] اس کے سوا کسی ہستی میں یہ خوبی نہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ [المؤمن : ۶۵] ”وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ اس کے سوا جس چیز کی عبادت بھی کی جاتی ہے وہ نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گی، ہر چیز موت کی آغوش سے نکلی ہے اور اسی کی آغوش میں جانے والی ہے، فرمایا: ﴿ كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا ﴾ [البقرة : ۲۸] ”تم کیسے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ؕ۰ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ ﴾ [النحل : ۲۰، ۲۱] ”اور وہ لوگ جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں۔“

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے ۔۔۔ جہاں کی وراثت اسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے ۔۔۔ نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے
مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب ۔۔۔ غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب (حالی)

دوسری دلیل : ”اَلْقَیُّوْمُ“ یہ ”قَامَ یَقُوْمُ“ سے ”فَیْعُوْلٌ“ کے وزن پر ہے، اصل میں ”قَیْوُوْمٌ“ تھا، پہلی واؤ کو یاء سے بدل دیا، پھر پہلی یاء کو دوسری میں ادغام کر دیا، یاء کے اضافے سے مزید مبالغہ پیدا ہو گیا، یعنی وہ کسی سہارے کے بغیر خود قائم ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا، تھامنے والا ہے۔ انسان جو ”اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی“ کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے، ایک لحہ بھی اللہ تعالیٰ

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ

احاطہ نہیں کرتے مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اور اسے ان دونوں کی

کے تھامنے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خود اس کے دل کی دھڑکن، سانس کی آمد و رفت، پیشاب و پاخانے کا نظام، خون کی گردش، نیند اور بیداری حتیٰ کہ زندگی اور موت کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہیں، تو دوسروں کو کیا تھامے گا۔ ہمارے رسول ﷺ کی زندگی، آپ پر آنے والی تکلیفیں، یعنی آپ کا زخمی ہونا، گھوڑے سے گر کر موچ آنا، بیمار ہونا، بھوک، پیاس، غرض پوری زندگی اس کی شاہد ہے، پھر اتنی وسیع کائنات اور لاتعداد مخلوقات کو اللہ کے سوا کون ہے جو تھامے ہوئے ہے کہ اسے مشکل کشا، داتا یا دستگیر یا جھولی بھرنے والا سمجھا جائے۔ آسمان و زمین سے متعلق فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ﴾ [فاطر : ٤١] ''بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے، اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں۔'' اڑتے پرندوں کے متعلق فرمایا: ﴿ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ﴾ [الملك : ١٩] ''رحمان کے سوا انھیں کوئی تھام نہیں رہا ہوتا۔''

تیسری دلیل: ''لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ'' ''سِنَةٌ'' اصل میں ''وَسَنٌ'' تھا، جیسے: ''وَعْدٌ'' سے ''عِدَةٌ'' ہے، شروع سے ''واؤ'' حذف کر کے آخر میں ''تاء'' لے آئے۔ معنی ہے نیند سے پہلے آنے والی اونگھ، جب آدمی سونے اور جاگنے کے درمیان ہوتا ہے۔ ''سِنَةٌ'' اور ''نَوْمٌ'' کی تنوین کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے: ''اسے نہ کچھ اونگھ پکڑتی ہے نہ کوئی نیند'' یعنی اللہ تعالیٰ کو ذرا برابر اونگھ یا نیند اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اونگھ اور نیند اتنی زبردست چیزیں ہیں کہ جس پر آتی ہیں اسے پکڑ لیتی ہیں، انسان ان کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ ہمارے رسول ﷺ ایک دفعہ صبح کی نماز کے لیے طلوعِ آفتاب کے بعد بیدار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اونگھ اور نیند دونوں سے پاک ہے، کیونکہ اگر اسے اونگھ یا نیند آ جائے تو کائنات آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جائے، اگر تجربہ کرنا ہو تو ہوشیار سے ہوشیار شخص کے دونوں ہاتھوں میں شیشے کا ایک ایک گلاس دے کر اسے ایک دو راتیں جگا کر تجربہ کر لیں۔

چوتھی دلیل: ''لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ'' یعنی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا ہے۔ (مزید دیکھیے مریم: ۹۳ تا ۹۵) جب مالک وہ ہے تو عبادت بھی اسی کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یحییٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو یہ بات سمجھائی کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شریک نہ بناؤ۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص نے اپنے خالص مال سونے یا چاندی کے ساتھ ایک غلام خریدا اور غلام سے کہا کہ یہ میرا گھر ہے اور یہ میرا کام ہے، اس میں کام کرو اور اس کی آمدنی مجھے دیا کرو۔ غلام سارا دن کام کرتا اور شام کو آمدنی مالک کے سوا کسی اور کو دے دیتا، تو تم میں سے کون ہے جو ایسے غلام کو پسند کرے؟'' [ترمذی، الأدب، باب ما جاء فی مثل الصلوۃ ...... : ۲۸٦۳، و صححه الألبانی]

پانچویں دلیل: ''مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ'' یعنی کون ہے وہ جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔ آیت الکرسی سے پہلی آیت میں قیامت کے دن کسی بھی قسم کی سفارش کی نفی فرمائی ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش ممکن بتائی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان یا جن یا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے

وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

حفاظت نہیں تھکاتی اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑا ہے ﴿۲۵۵﴾

بغیر کسی کی سفارش کی جرأت کرے۔ ہمارے نبی ﷺ بھی جب سفارش کے لیے جائیں گے تو عرش کے نیچے سجدے میں گر کر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں کریں گے، جو اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو سکھائے گا، پھر اللہ تعالیٰ سر اٹھانے کا حکم دے گا اور ایک حد مقرر کر کے فرمائے گا کہ ان لوگوں کو جہنم سے نکال لو۔ [بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ لما خلقت بیدی ﴾ : ۷۴۱۰]

قیامت کے دن سفارش تو کجا اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات کرنے کی جرأت بھی نہیں کرے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبا : ۳۸] ”جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے، وہ کلام نہیں کریں گے، مگر وہی جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا۔“

یہ عقیدہ کہ کوئی زبردستی اللہ تعالیٰ سے بات منوا سکتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کسی کی محبت کے ہاتھوں اس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو گا، خالص جاہلانہ عقیدہ ہے اور مکہ کے مشرکوں کا بھی یہی عقیدہ تھا، اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۳) اور سورۂ یونس (۱۸) وہاں عجز و نیاز کے سوا اور خود اس کی مہربانی سے اجازت کے بغیر کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ شفاعت کا مضمون اچھی طرح سمجھنے کے لیے شاہ اسماعیل دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب ”تقویۃ الایمان“ کی تیسری فصل کا مطالعہ کریں۔

چھٹی دلیل: ”يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ“ یعنی وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ سامنے سے مراد حاضر چیزیں اور پیچھے سے مراد غائب چیزیں ہیں۔ اس میں ماضی، حال اور استقبال سب کا علم آ گیا۔ اس کے سوا کسی ہستی میں یہ صفت موجود نہیں، فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [النمل : ۶۵] ”کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔“ جب اللہ تعالیٰ ہمارے اور پوری کائنات کے تمام گزشتہ، موجودہ اور آئندہ حالات سے واقف ہے تو عبادت بھی اسی کا حق ہے۔

ساتویں دلیل: ”وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ“ یعنی کوئی شخص اللہ کے علم یعنی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتا مگر جتنا وہ چاہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ [الجن : ۲۶، ۲۷] ”(وہ) غیب کو جاننے والا ہے، پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ مگر کوئی رسول، جسے وہ پسند کر لے“ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک اور معنی کا احتمال بھی ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی ہے وہ اللہ کی ذات و صفات کے علم میں سے کسی بات پر مطلع نہیں ہو سکتا مگر جتنا وہ خود چاہے اور بتا دے، گویا یہ اس آیت کی ہم معنی ہے: ﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴾ [طٰہٰ : ۱۱۰] ”اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔“

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں مذکور ہے کہ ایک چڑیا نے سمندر میں ایک یا دو ٹھونگے مارے تو خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: ”میرے اور آپ کے علم نے اللہ کے علم سے کم نہیں کیا مگر جتنا اس چڑیا کے ٹھونگے نے سمندر سے کم کیا ہے۔“ [بخاری،

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙۗ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ

دین میں کوئی زبردستی نہیں، بلاشبہ ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی، پھر جو کوئی باطل معبود کا انکار کرے اور اللہ پر

العلم، باب ما یستحب للعالم...... : ۱۲۲] اب خود سوچ لو کہ عبادت کے لائق اللہ تعالیٰ ہے یا یہ بے بس مخلوق۔

آٹھویں دلیل : ''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ'' کرسی کا معنی سب لوگوں کے ہاں معروف ہے، یعنی وہ چیز جس پر بیٹھا جاتا ہے۔ سلف صالحین کے نزدیک اس کا معنی کرسی ہی ہے۔ ان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کرسی موجود ہے اور ہمارا اس کے وجود پر ایمان ہے، اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسی ہے، کیونکہ یہ انسان کے بس کی بات نہیں، البتہ قرآن مجید میں جو آیا ہے اس کے مطابق اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسیع ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے۔

بعد میں آنے والے مفسرین میں سے بعض نے سلف کا مسلک ہی اختیار کیا ہے، البتہ بعض نے کہا کہ کرسی سے مراد اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہے اور بعض نے کہا، اس سے مراد علم ہے۔ عموماً یہ وہ لوگ ہیں جو عرش کے بھی منکر ہیں، چنانچہ وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ نہ کوئی عرش ہے نہ کرسی، بلکہ مراد اللہ تعالیٰ کی سلطنت اور حکومت ہے۔ مگر کرسی کا یہ معنی حقیقی نہیں مجازی ہے، جو اس وقت کیا جاتا ہے جب حقیقت ناممکن ہو، حالانکہ اللہ کے عرش اور کرسی کو حقیقی معنوں میں لینے سے کچھ خرابی لازم نہیں آتی۔ رہا یہ خیال کہ پھر تو اللہ تعالیٰ آدمیوں کے مشابہ ہو گیا جبکہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں تو سلف کے فرمان کے مطابق ہم یہ کہتے ہی نہیں کہ وہ کرسی ہماری کرسیوں جیسی ہے، نہیں بلکہ وہ اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ انسان علیم ہے جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ [الذاریات : ۲۸] ''اور انھوں نے اسے ایک بہت علیم بیٹے کی خوش خبری دی'' اور اللہ تعالیٰ بھی علیم ہے، تو کیا ہم اللہ تعالیٰ کے علیم ہونے کا انکار کر دیں کہ اس سے مشابہت لازم آتی ہے، نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ علیم ہے اپنی شان کے مطابق۔ اس سے بھی بڑھ کر مثال لے لیں، انسان موجود ہے تو کیا ہم اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا انکار کر دیں گے کہ اس سے انسان کے ساتھ مشابہت لازم آتی ہے۔ نہیں، ہر گز نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح آئی ہیں اسی طرح ماننا پڑیں گی۔ ہاں، وہ صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ نہیں۔ آیت میں یہ جملہ بھی توحید کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کرسی کی وسعت اس کے ایک معبود ہونے کی دلیل ہے۔

نویں دلیل : ''وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا'' ''آدَ يَؤُوْدُ'' کا معنی کسی چیز کا بھاری بوجھ بننا، مشقت میں ڈال دینا ہے۔ مخلوق کتنی بھی بڑی ہو خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی جب کہ اللہ تعالیٰ کے لیے زمین و آسمان کی حفاظت کچھ بوجھ نہیں۔

دسویں اور گیارھویں دلیل : ''وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ'' بلندی اور عظمت اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، مخلوق اللہ تعالیٰ کی بلندی اور عظمت کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، اس لیے عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ آخر میں اس آیت میں موجود ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ آیت باری تعالیٰ کے نام ''اللہ'' سے شروع ہوئی ہے، یہ نام تمام صفات کا جامع ہے، مخلوق میں سے کسی پر یہ نام نہیں بولا جا سکتا ہے۔ تمام مذاہب میں مذکور خداؤں کی تثنیہ و جمع بن سکتی ہے، مثلاً دیویوں، دیوتاؤں اور Gods وغیرہ مگر لفظ ''اللہ'' واحد ہی رہے گا، اس کی نہ جمع بن سکتی ہے نہ تثنیہ۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کی زبردست دلیل ہے، اگر اس نکتہ کو بھی شامل کر لیں تو آیت میں توحید کی بارہ دلیلیں موجود ہیں۔

آیت 256 ① لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ : ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''(جاہلیت میں) اگر کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے

بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ
ع يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾

ایمان لائے تو یقیناً اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جسے کسی صورت ٹوٹنا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۵۶﴾ اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے دوست باطل معبود ہیں، وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لاتے ہیں۔ یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۵۷﴾

تو وہ یہ نذر مان لیتی تھی کہ اگر بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنا دے گی، پھر جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان میں انصار کے کئی لڑکے تھے، انصار نے کہا: ''ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے'' تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔'' [أبوداؤد، الجهاد، باب فی الأسير يكره على الإسلام : ۲٦۸۲، وصححه الألبانی]

یعنی زبردستی کسی کو مسلمان بنانا جائز نہیں، جو مسلمان ہونا چاہے سوچ سمجھ کر مسلمان ہو۔ زبردستی ہوگی تو دل میں ایمان نہیں آئے گا، اس کا کیا فائدہ؟ البتہ اسلام مسلمانوں کو کفر کا محکوم بننے کے بجائے جہاد کے ذریعے سے تمام کفار کو اسلام کا محکوم بنانے کا حکم دیتا ہے، جس میں کفار پر مسلمان ہونے کے لیے زبردستی نہیں کی جاتی، وہ امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں مگر غلبۂ اسلام کی علامت کے طور پر ان سے معمولی رقم بطور جزیہ لی جاتی ہے۔ اگر زبردستی مسلمان بنانا جائز ہوتا تو آج ہندوستان میں غیر مسلموں کا نام و نشان بھی نہ ہوتا، جیسا کہ اندلس میں نصرانیوں نے مسلمانوں پر زبردستی کر کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔

② بِالطَّاغُوْتِ : یہ '' طَغٰى يَطْغٰى طُغْيَانًا '' سے صیغہ مبالغہ ''فَعَلُوْتٌ'' کے وزن پر ہے، جیسے جبروت اور ملکوت ہے۔ ''فَعَلُوْتٌ'' کے وزن پر ''طَغَيُوْتٌ'' تھا، پھر تخفیف کے لیے اس میں قلب کیا گیا، یاء کو پہلے اور غین کو بعد میں کر دیا گیا ''طَيَغُوْتٌ'' ہو گیا، پھر یائے متحرکہ کا ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے یاء کو الف سے بدل دیا گیا تو ''طَاغُوْتٌ'' بن گیا، جس کا وزن ''فَلَعُوْتٌ'' ہے۔ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، جس کا معنی ہے کسی چیز کا اپنی حد سے آگے بڑھ جانا۔ طاغوت میں ''واؤ'' اور ''تاء'' مبالغہ کے لیے ہیں، یعنی جو اپنی حد سے بہت زیادہ آگے بڑھ جائے۔ تمام باطل معبود طاغوت ہیں، کیونکہ انھیں حد سے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کے برابر کر دیا گیا ہے۔ شیطان کو بھی اسی لیے طاغوت کہتے ہیں۔ جو شخص لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی بندگی اور اطاعت کرواتا ہے وہ بھی طاغوت ہے۔

آیت 257 ① قرآن پاک میں جہاں بھی ''الظُّلُمٰتِ'' اور ''النُّوْرَ'' کے الفاظ آئے ہیں ان سے مراد کفر و ایمان ہی ہے، ماسوائے سورۂ انعام (۱) ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ کہ وہاں رات اور دن مراد ہیں۔ (رازی) اس آیت میں ''النُّوْرَ'' کا لفظ بصیغہ واحد اور ''الظُّلُمٰتِ'' کا لفظ بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حق ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی ہے اور کفر

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ

کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، اس لیے کہ اللہ نے اسے حکومت دی تھی، جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، اس نے کہا میں

وشرک اور جہالت کی قسموں کا شمار نہیں، وہ سب باطل ہیں۔ (ابن کثیر) آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان پہلے کافر ہوتا ہے اور ایمان لانے کے بعد کفر کی تاریکی سے نکل کر ایمان کی روشنی میں داخل ہوتا ہے، مگر یہ معنی مراد نہیں بلکہ جو شخص ابتدا ہی سے مسلمان ہے اس کے حق میں بھی توفیق و رحمت کے اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لے لیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے: ﴿ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ﴾ [یونس : ۹۸] ''جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگی میں ہٹا دیا۔'' حالانکہ ان پر تاحال عذاب نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ ﴾ [النحل : ۷۰] ''اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو سب سے نکمی عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔'' حالانکہ وہ پہلے کبھی نکمی عمر میں نہ تھے جس کی طرف دوبارہ لوٹائے گئے ہوں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے سنا کہ اس نے کہا: " أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ " تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((خَرَجَ مِنَ النَّارِ)) ''یہ شخص آگ سے نکل آیا۔'' [مجمع الزوائد : ۳۳۴/۱] حالانکہ وہ پہلے آگ میں نہیں تھا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا: ﴿ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ [یوسف : ۳۷] ''میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے'' حالانکہ یوسف علیہ السلام کبھی ان کی ملت میں داخل نہیں تھے۔ الغرض! قرآن و حدیث میں اس قسم کے محاورات بکثرت مذکور ہیں، خوب سمجھ لو۔ (رازی)

② اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ : یعنی یہ کافر اور ان کے باطل معبود سب جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۴) اور سورۂ انبیاء (۹۸)۔

آیت 258 ① اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ : یعنی اس بادشاہ کے رب تعالیٰ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑے کی وجہ یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت عطا فرمائی، اس کا شکر اس نے یہ ادا کیا کہ خود رب بن بیٹھا اور جس نے اسے حکومت عطا فرمائی تھی اس کا انکار کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے فقیر بنا دیتا تو کبھی یہ جسارت نہ کرتا۔

② ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے، ان کے زمانے میں عراق کے اندر شرک تقریباً اپنی ساری صورتوں کے ساتھ موجود تھا، بتوں کو وہ پوجتے تھے، سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش وہ کرتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ بادشاہ وقت کو بھی رب مانتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کے ذمے ان سب صورتوں کی تردید کر کے لوگوں کو اکیلے رب کی عبادت کی دعوت دینا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے والد اور قوم کو بت پرستی چھوڑ کر ایک رب کی عبادت کی دعوت دی، نتیجے میں گھر سے نکلنا پڑا، پھر نہایت حکیمانہ طریقے سے سورج، چاند اور ستاروں کا رب نہ ہونا ایسا واضح کیا کہ قوم لاجواب ہو گئی۔ (دیکھیے انعام: ۷۶ تا ۸۲) نتیجے میں قوم کے جھگڑے اور سورج، چاند اور ستاروں کے غضب کا نشانہ بننے کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ محض نصیحت

يُحْيِ وَيُمِيتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا پھر اللہ تو سورج کو مشرق سے لاتا ہے، پس تو اسے مغرب سے لے آ تو وہ جس نے کفر کیا تھا حیرت زدہ رہ گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۲۵۸﴾

سے بتوں کی بے بسی ماننے پر یہ لوگ تیار نہیں تو میلے والے دن ان کے بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سارے بت توڑ دیے۔ تفتیش ہوئی، ابراہیم علیہ السلام مجرم قرار پائے، اس موقع پر ساری قوم کے سامنے بتوں کی بے بسی ایسی واضح فرمائی کہ وہ اپنے دلوں میں مان گئے کہ ظالم وہ خود ہی ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) کا کچھ قصور نہیں۔ اب حق کو قبول کرنے کے بجائے الٹا کہنے لگے کہ اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ (دیکھیے انبیاء: ۵۱ تا ۷۰) اب ظاہر ہے کہ عوام جتنے بھی ہوں کسی کو سزا دینا تو حکومت کا کام ہے، اس لیے انھیں وقت کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، وہ اپنی سلطنت میں بت پرستی، ستارہ پرستی کو برداشت کرتا تھا، بلکہ اس کی پشت پناہی کرتا تھا، کیونکہ وہ خود بھی مشرک تھا اور اپنے رب ہونے کا بھی دعویدار تھا۔ اس موقع پر بادشاہ کے ساتھ یہ مناظرہ ہوا، جس میں لاجواب ہو کر اس نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھنکوا دیا۔

❸ یہ واقعہ اور بعد والے دونوں واقعات اس بات کی مثال اور دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو کس طرح اندھیرے سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور طاغوت اپنے دوستوں کو کس طرح روشنی سے اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔

❹ ابراہیم علیہ السلام نے جب اس بادشاہ کے رب ہونے سے انکار کیا تو اس نے پوچھا: ''تمھارا رب کون ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔'' اس نے کہا: ''میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔'' بعض تابعین سے منقول ہے کہ اس نے دو قیدی منگوائے، ایک کو قتل کر دیا، ایک کو چھوڑ دیا اور کہا: ''دیکھو! انھیں زندہ رکھنا یا مارنا میرے ہاتھ میں ہے۔'' تابعین کی بات اسرائیلی روایت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ خود تو اس وقت موجود نہیں تھے اور اس کی ضرورت اس وقت ہے جب وہ بادشاہ متقی اور ہمیشہ سچ بولنے والا ہو۔ ایک جھوٹا شخص کوئی غلط بات کہے تو اسے تاویل کے ساتھ صحیح ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں رب ہوں، اسے یہ دعویٰ کرنے میں کیا چیز مانع ہے کہ میں ہی سب کو زندہ کرتا ہوں اور میں ہی مارتا ہوں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ کج بحثی پر اترا ہوا ہے تو پہلی دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل سورج والی دی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے پہلی دلیل چھوڑی نہیں، بلکہ اس کے ذریعے سے اس کے منہ سے اس دعویٰ کا اقرار کروا لیا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اب اس دعویٰ پر دوسری دلیل کی بنیاد رکھی کہ جب تم میں اتنی قوت ہے کہ تمھی سب کو پیدا کرتے ہو اور تمھی مارتے ہو تو اس کے مقابلے میں ایک معمولی سا کام کر کے دکھاؤ، یہ کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، جب سارا اختیار تمھارے پاس ہے تو سورج کو مغرب سے طلوع کر کے دکھا دو، اس پر وہ بے ایمان حیرت زدہ ہو کر بالکل لاجواب ہو گیا اور ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ بھی راہِ راست پر آنے کی توفیق نہیں دیتا۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی پر گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی، اس نے کہا اللہ اس کو اس کے مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے سو (۱۰۰) سال تک موت دے دی، پھر اسے زندہ کیا، فرمایا تو کتنی دیر رہا ہے؟ اس نے کہا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں۔ فرمایا بلکہ تو سو (۱۰۰) سال رہا ہے، سو اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزیں دیکھ کہ بگڑی نہیں اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کو دیکھ ہم انھیں کیسے اٹھا کر جوڑتے ہیں، پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں۔ پھر جب اس کے لیے خوب واضح ہو گیا تو اس نے کہا میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۵۹﴾

⑤ نمرود کی ناک میں مچھر کے گھسنے اور چار سو سال تک ہتھوڑوں سے اپنے آپ کو پٹوانے کے واقعات نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں نہ کسی صحابی سے۔

آیت 259 ① اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ : اس "اَوْ" کا عطف اس سے پہلی آیت ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ ﴾ میں مذکور "الَّذِيْ" پر ہے، یعنی کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ......، یا کیا تو نے اس جیسے شخص کو نہیں دیکھا......۔ "اَلَمْ تَرَ" کا معنی "اَلَمْ تَعْلَمْ" ہوتا ہے۔ (دیکھیے سورۂ فیل کے حواشی) اور "اَلَمْ تَرَ" سے مقصود کوئی عجیب واقعہ بیان کرنے سے پہلے اس کے سننے کا شوق دلانا ہوتا ہے۔

② خَاوِيَةٌ : یہ باب "ضَرَبَ" سے اسم فاعل ہے، مادہ "خ و ی" ہے، جس کا معنی کھوکھلا ہونا ہے۔ چونکہ کھوکھلا ہونے کا نتیجہ گر پڑنا ہے، اس لیے اس کا معنی گر پڑنا بھی آتا ہے، عموماً پہلے چھت گرتی ہے پھر دیواریں اس پر گر پڑتی ہیں، اس لیے فرمایا: "چھتوں پر گری ہوئی تھی۔"

③ لَمْ يَتَسَنَّهْ: اس لفظ کا مادہ یا تو "س ن ن" ہے، جس کا معنی بدبودار ہونا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴾ [الحجر : ٢٦] "جو بدبودار، سیاہ کیچڑ سے تھی۔" باب تفعل میں "لَمْ يَتَسَنَّنْ" ہو گیا، پھر آخری نون کو "ہاء" سے بدل دیا، جیسے: "لَمْ يَتَقَضَّضِ الْبَازِيْ" (باز تیزی سے نہیں جھپٹا) کو "لَمْ يَتَقَضَّ" کر دیتے ہیں۔ یا پھر اس کا مادہ "س ن ہ" ہے، اس سے باب تفعل "تَسَنَّهَ" کا معنی روٹی کا بدبودار ہونا ہے، اس صورت میں "ہاء" اصل ہے، تو "لَمْ يَتَسَنَّهْ" کا معنی ہے، بدبودار نہیں ہوا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا اور کیا تو نے یقین نہیں کیا؟ کہا کیوں نہیں اور لیکن اس لیے کہ میرا دل پوری تسلی حاصل کر لے۔ فرمایا پھر چار پرندے پکڑ اور انھیں اپنے ساتھ مانوس کر لے، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک حصہ رکھ دے، پھر انھیں بلا، دوڑتے ہوئے تیرے پاس آ جائیں گے اور جان لے کہ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۶۰﴾

④ پہلے قصے سے کائنات کو بنانے والے کا ایک ہونا (یعنی توحید) بیان کرنا مقصود تھا، جبکہ اس قصے اور اس کے بعد والے قصے سے حشر و نشر ثابت کرنا مقصود ہے۔ اس آیت میں مذکور شخص سے متعلق رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح سند کے ساتھ کوئی ذکر نہیں ملتا کہ وہ کون تھا۔ بعض تابعین نے اس کا نام عزیر علیہ السلام بتایا ہے اور بعض نے ارمیا اور ظاہر ہے کہ اس کا ماخذ وہ اسرائیلی روایات ہیں جنھیں نہ سچا کہا جا سکتا ہے نہ ہی جھوٹا۔ واللہ اعلم!

البتہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ان سے پوچھنا اور پھر اصل مدت بتانا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ اللہ کے نبی تھے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا اس بستی کو دوبارہ زندہ کرنا بعید کیوں سمجھا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ انھوں نے بعید سمجھ کر یہ سوال نہیں کیا تھا اور نہ انھیں قیامت اور دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ اس سے اطمینان حاصل کرنا مقصود تھا اور وہ دوبارہ زندہ ہونے کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو بعض حقیقتوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کروا دیتا ہے۔ ان دونوں واقعات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس شخص کا دوست اور کارساز اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اسے کس طرح اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ (رازی)

معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نبی نے وفات پائی تھی تو اس وقت کچھ دن چڑھا ہوا تھا اور جب دوبارہ زندہ ہوئے تو سورج غروب ہونے کو تھا، اس لیے انھوں نے سو سال گزرنے کے باوجود یہ سمجھا کہ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ گزرا ہے۔

آیت 260 ① ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، اللہ تعالیٰ کے فرشتے اور احکام ان کے پاس آتے رہتے تھے، ان کو مردوں کے جی اٹھنے میں کوئی شک نہ تھا مگر انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لینا چاہا، انسانی عادت ہے کہ وہ علم کے بعد آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے علم الیقین کے بعد عین الیقین کا مرتبہ حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ (ابن کثیر)

② فَصُرْهُنَّ: یہ "صَارَ يَصُوْرُ" یا "يَصِيْرُ" (اجوف واوی یا یائی) سے ہے۔ اس لفظ کے معنی عموماً "اَمِلْهُنَّ" کیے گئے ہیں، یعنی "ان کو ہلا لے۔" شاہ عبد القادر رحمہ اللہ اپنے فائدے میں لکھتے ہیں: "ابراہیم علیہ السلام کو ہلانے کو اس لیے فرمایا گیا تا کہ وہ زندہ ہونے کے بعد خوب پہچانے جا سکیں کہ واقعی وہی ہیں جو ذبح کر کے پہاڑ پر رکھے گئے ہیں اور کوئی شبہ نہ رہے۔ اس صورت

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانے کی مثال کی طرح ہے جس نے سات خوشے اگائے، ہر خوشے میں سو دانے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۱﴾

میں "ثُمَّ اجْعَلْ" سے پہلے "ثُمَّ قَطِّعْهُنَّ" محذوف ماننا پڑے گا اور کہا جائے گا کہ بعد کا جملہ چونکہ اس پر دلالت کر رہا ہے، اس لیے اسے حذف کر دیا گیا۔ (بیضاوی) صحابہ و تابعین اور اہل لغت کی ایک جماعت نے "فَصُرْهُنَّ" کے معنی "قَطِّعْهُنَّ" بھی بتائے ہیں، یعنی "ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔" چنانچہ ابن جریر اور طبری نے اس معنی پر بہت سے شواہد پیش کیے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ "صَارَ يَصُوْرُ" یا "يَصِيْرُ" سے امر کا صیغہ ہے، جس کے معنی قطع کرنا بھی آئے ہیں اور مائل کرنا بھی اور اس میں قراءت کے اختلاف نے اور زیادہ اشتباہ اور وسعت پیدا کر دی اور علمائے لغت نے اسے اضداد میں ذکر کیا ہے۔ (أضداد أبي الطيب، مجاز أبي عبيدة) ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس جگہ سوال و جواب کے انداز اور سیاق کلام سے "قطع" کے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں اور اس پر سلف مفسرین بھی تقریباً متفق نظر آتے ہیں۔" (واللہ اعلم)

بندۂ عاجز نے ترجمہ "اَمِلْهُنَّ" کیا ہے، یعنی ان کو اپنی طرف ہلا لے، مانوس کر لے۔ اس کی وجہ ایک تو استاذ مرحوم کا قاعدے کے شروع میں فرمانا ہے کہ عموماً اس کا معنی یہی کیا جاتا ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں فرزندان ارجمند اور بہت سے علماء نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ "فَصُرْهُنَّ" کے بعد "اِلَيْكَ" (اپنی طرف) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ البتہ ذبح کر کے ان کے ٹکڑے پہاڑوں پر رکھنے میں کوئی شک نہیں۔

3 ان چار جانوروں کی تعیین میں علمائے تفسیر کا اختلاف ہے، بعض نے مرغ، مور، کوا اور کبوتر بتائے ہیں اور بعض نے دوسرے نام ذکر کیے ہیں اور پھر چار پہاڑوں پر ان کو الگ الگ رکھنے اور ان کے درمیان کھڑے ہو کر ہر ایک کا نام لے کر پکارنے کی کیفیت بھی بعض تابعین سے منقول ہے، مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جانوروں کی یہ تعیین بے فائدہ ہے، اس کی کچھ اہمیت ہوتی تو قرآن خاموش نہ رہتا۔

4 عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل الفاظ ساری آیت کا خلاصہ ہوتے ہیں، یہ قرآنی اعجاز ہے۔ اس آیت میں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے مردوں کو زندہ کرنے پر اسے کامل غلبہ وقدرت حاصل ہے "حَكِيْمٌ" کمال حکمت والا ہے، جس کے مطابق اس نے زندوں کی موت کے لیے اور مردوں کو زندہ کرنے کے لیے ایک وقت مقرر رکھا ہے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ تین قصے بیان فرمائے ہیں اس پر کہ اللہ خود ہدایت کرنے والا ہے جس کو چاہے، اگر شبہ لاوے تو ساتھ ہی جواب سمجھا دیتا ہے۔ اب آگے پھر جہاد کا ذکر ہے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا۔ (موضح)

آیت 261 فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: قرآن مجید میں "سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا لفظ عام یعنی اسلام کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر انھوں نے جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ کسی طرح کا احسان جتلانا لگاتے ہیں اور نہ کوئی تکلیف پہنچانا، ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۶۲﴾ اچھی بات اور معاف کر دینا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے کسی طرح کا تکلیف پہنچانا ہو اور اللہ بہت بے پروا، بے حد بردبار ہے ﴿۲۶۳﴾

﴿ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [التوبۃ: ۳۴] ''بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔'' اس صورت میں اسلام کے ہر کام میں خرچ کرنا فی سبیل اللہ خرچ کرنا ہے اور خاص معنوں میں بھی آیا ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ (۶۰) میں صدقات خرچ کرنے کی جگہوں میں ایک '' فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ '' ہے۔ وہاں '' فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ '' سے خاص جہاد مراد ہے، نیز صحیح بخاری میں حج کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔ یہاں اگرچہ عام معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے مگر جیسا کہ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جہاد مراد لینا گزشتہ اور آئندہ آیات کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔''

آیت 262 اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ...... : یعنی یہ ثواب صرف ان لوگوں کو حاصل ہو گا جو رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرنے کے بعد نہ کسی پر احسان جتلاتے ہیں اور نہ زبان و عمل سے کوئی تکلیف دیتے ہیں، کسی کو کچھ دے کر احسان جتلانا کبیرہ گناہ ہے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ یہ فرمایا۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''وہ تو ناکام و نامراد ہو گئے، یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''کپڑا لٹکانے والا، احسان جتلانے والا اور جھوٹی قسم کے ساتھ اپنا مال فروخت کرنے والا۔'' [مسلم، الإیمان، باب بیان غلظ تحریم إسبال ...... : ۱۰۶]

آیت 263 ① قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ...... : یعنی اگر کوئی صدقہ نہیں کر سکتا تو اچھے الفاظ کے ساتھ معذرت کر لے اور سائل کے اصرار اور بدتمیزی پر غصے ہونے کے بجائے مغفرت یعنی معافی اور درگزر سے کام لے اور سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کتنا غنی ہے، پھر بھی کتنا بردبار ہے جو ہماری خطاؤں کے باوجود حلم سے کام لیتا ہے۔ ہمیں بھی اس طرح حلم سے کام لینا چاہیے۔

② جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نیکی صدقہ ہے اور نیکی میں سے یہ بھی ہے کہ تو اپنے بھائی کو کھلے چہرے کے ساتھ ملے اور یہ کہ اپنے ڈول میں سے اس کے ڈول میں (پانی) انڈیل دے۔'' [ترمذی،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ
وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ
صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا
وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقے احسان رکھنے اور تکلیف پہنچانے سے برباد مت کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، تو اس کی مثال ایک صاف چٹان کی مثال جیسی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو، پھر اس پر ایک زوردار بارش برسے، پس اسے ایک سخت چٹان کی صورت چھوڑ جائے۔ وہ اس میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں پائیں گے جو انھوں نے کمایا اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۲۶۴﴾ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی رضا چاہتے ہوئے اور اپنے دلوں کو ثابت رکھتے ہوئے خرچ کرتے ہیں، اس باغ کی مثال جیسی ہے جو کسی اونچی جگہ پر ہو، جس پر ایک زوردار بارش برسے تو وہ اپنا پھل دوگنا دے، پس اگر اس پر زور کی بارش نہ برسے تو کچھ شبنم۔ اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۶۵﴾

البر والصلة، باب ما جاء في طلاقة ...... : ۱۹۷۰، و صححه الألباني]

آیت 264 ❶ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ...... : یعنی کسی کو صدقہ دینے کے بعد اس پر احسان جتلا کر یا اسے تکلیف دے کر اس منافق کی طرح اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو جو صرف ریا کاری کے جذبے کے تحت اپنا مال خرچ کرتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

❷ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ : یعنی یہ ریا کار بظاہر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی جمی ہوئی ہو ("تُرَابٌ" کی تنوین تقلیل کے لیے ہے) اور دیکھنے والا اسے قابل کاشت زمین خیال کرے، لیکن جونہی بارش ہو اس کی تمام مٹی ڈھل جائے اور وہ صاف چٹان کی چٹان رہ جائے، اسی طرح ریا کاروں کے عمل ان کے صحیفۂ اعمال سے مٹ جائیں گے اور وہ ان سے نہ کوئی فائدہ اٹھا سکیں گے اور نہ انھیں ان کا کوئی اجر ملے گا۔ اوپر کی آیت میں مثال تھی مخلص مومن کے صدقہ و خیرات کی، جو محض رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے اور یہ مثال ہے ریا کار کے خرچ کرنے کی، جس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 265 ❶ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ : یہ ریا کاروں کے مقابلے میں مخلص مومنوں کی مثال ہے، یعنی جو لوگ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور دل کے اس اطمینان کے ساتھ خرچ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس کا وافر اجر عطا

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع

کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، جس کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں، اس کے لیے اس میں ہر قسم کے کچھ نہ کچھ پھل ہوں اور اسے بڑھاپا آ پہنچے اور اس کے کمزور بچے ہوں، پھر اسے ایک بگولا آ پہنچے، جس میں ایک آگ ہو تو وہ بالکل جل جائے۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے کھول کر آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم سوچو ﴿۲۶۶﴾

فرمائے گا اور ان کا عمل ضائع نہیں ہوگا۔ دل کو ثابت رکھتے ہوئے خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ انھیں خرچ کرتے ہوئے کوئی تردد یا پریشانی ہوتی ہے نہ بعد میں کوئی پشیمانی۔ ان کے خرچ کرنے کی مثال اس باغ کی سی ہے جو کسی پر فضا اور بلند مقام پر ہو، اگر اس پر زور کی بارش ہو تو دوسرے باغوں سے دگنا پھل دے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ہلکی بارش ہی کافی رہے۔ یہی حالت مومن کے عمل کی ہے، وہ کسی صورت میں ضائع نہیں ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔ (ابن کثیر) شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''زور کے مینہ سے مراد زیادہ مال خرچ کرنا ہے اور ''طَلٌّ'' (کچھ شبنم) سے مراد تھوڑا مال۔ (''طَلٌّ'' پر تنوین تقلیل کی وجہ سے کچھ شبنم ترجمہ کیا ہے) سو اگر نیت درست ہے تو زیادہ خرچ کرنا زیادہ ثواب کا باعث ہے اور تھوڑا بھی کام آتا ہے، جیسے خالص زمین پر باغ ہے، جتنا مینہ برسے گا اس کا فائدہ ہے، بلکہ اوس بھی کافی ہے اور نیت درست نہیں تو جس قدر زیادہ خرچ کرے ضائع ہے، کیونکہ زیادہ مال دینے میں دکھاوا بھی زیادہ ہے، جیسے پتھر پر دانہ کہ جتنا زور کا مینہ برسے زیادہ نقصان پہنچائے کہ مٹی دھوئی جائے۔'' (موضح)

آیت 266 ① اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ ......: یعنی بڑھاپے میں باغ جلنے پر نہ خود اس میں اتنی طاقت ہے کہ باغ دوبارہ لگا سکے اور نہ اس کی اولاد اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے، اسی طرح منافق صدقہ و خیرات کرتا ہے مگر ریاکاری سے کام لیتا ہے تو قیامت کے دن، جو نہایت احتیاج کا وقت ہوگا، اس کا ثواب ضائع ہو جائے گا اور اس وقت ثواب حاصل کرنے کے لیے دوبارہ نیکی کا وقت بھی نہیں ہوگا۔ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی ایک دوسری تفسیر آئی ہے، جس کی تائید عمر رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مثال اس شخص کی ہے جو عمر بھر نیک عمل کرتا رہتا ہے، لیکن آخر عمر میں اس کی سیرت بدل جاتی ہے اور نیک عمل کے بجائے برے عمل کرنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی پہلی نیکیاں بھی برباد کر لیتا ہے اور قیامت کے دن، جو بہت تنگی کا وقت ہوگا، وہ نیکی اس کے کچھ کام نہ آئے گی اور اس نازک وقت میں اس کا عمل اس سے خیانت کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ لوگوں کی نگاہ میں جنتیوں کے سے عمل کرتا ہے، حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے اور بعض دفعہ بندہ لوگوں کی نگاہ میں دوزخیوں کے سے عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے اور اعمال کا دارومدار تو آخری وقت کے اعمال پر ہے۔'' [بخاري، الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم ...... : ٦٤٩٣، عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں اور اس میں سے گندی چیز کا ارادہ نہ کرو، جسے تم خرچ کرتے ہو، حالانکہ تم اسے کسی صورت لینے والے نہیں، مگر یہ کہ اس کے بارے میں آنکھیں بند کر لو اور جان لو کہ بے شک اللہ بڑا بے پروا، بے حد خوبیوں والا ہے ﴿۲۶۷﴾

❷ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ : میں "مِنْ" تبعیضیہ اور "كُلِّ الثَّمَرٰتِ" کی وجہ سے "ہر قسم کے کچھ نہ کچھ پھل" ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیت 267 ❶ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ ...... : اوپر کی آیات میں بتایا ہے کہ صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت کے لیے شرط یہ ہے کہ اخلاص و ایمان ہو اور یہ بھی بتایا ہے کہ ریا کاری، احسان جتلانے اور تکلیف دینے سے صدقہ ضائع ہو جاتا ہے اور پھر مثالوں سے وضاحت کر کے سمجھایا ہے۔ اب اس آیت میں قبولیت صدقہ کے لیے ایک اور شرط بیان کی ہے کہ صدقہ میں دی جانے والی چیز کا عمدہ اور طیب ہونا ضروری ہے، اگر کوئی شخص ردی چیز دے گا تو وہ اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوگی۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں اتری، ہم کھجوروں والے تھے تو ہر آدمی اپنے درختوں میں سے زیادہ یا کم درختوں کے مطابق لے کر آتا تھا، کوئی آدمی ایک خوشہ اور کوئی دو خوشے لا کر مسجد میں لٹکا دیتا۔ اہل صفہ کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہوتا تھا تو ان میں سے جب کسی کو بھوک لگتی تو وہ خوشے کے پاس آ کر اپنے عصا سے ضرب لگاتا تو اس میں سے نیم پختہ اور پختہ کھجوریں گر پڑتیں اور وہ کھا لیتا۔ کچھ لوگ جنھیں نیکی میں رغبت نہ تھی، وہ نکمے اور ردی خوشے لے آتے اور ایسے خوشے بھی جو ٹوٹے ہوئے ہوتے اور انھیں لٹکا دیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ...... ﴾ مطلب یہ کہ اگر تم میں سے کسی کو اس جیسا تحفہ دیا جائے جو اس نے دیا ہے تو وہ اسے کسی صورت نہ لے، مگر چشم پوشی اور حیا کی وجہ سے۔ براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، اس کے بعد ہم میں سے ہر ایک اپنی سب سے عمدہ چیز لے کر آتا۔ [ترمذی، التفسیر، باب ومن سورۃ البقرۃ : ۲۹۸۷ و صححہ الألبانی]

گو شان نزول میں نفل صدقے کا ذکر ہے مگر یہ حکم فرض زکوٰۃ اور نفل صدقے دونوں کو شامل ہے۔ سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے میں "جُعْرُوْر" اور "لَوْنَ الْحُبَيْق" (دو ردی قسم کی کھجوریں) وصول کرنے سے منع فرمایا۔" [أبوداؤد، الزکوۃ، باب ما لا یجوز من الثمرۃ ...... : ۱۶۰۷، و صححہ الألبانی]

❷ "لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ" میں "لَسْتُمْ" نفی کی تاکید "بِاٰخِذِيْهِ" کی باء کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ترجمہ "تم اسے کسی صورت لینے والے نہیں" کیا گیا ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

شیطان تمھیں فقر کا ڈراوا دیتا ہے اور تمھیں شرمناک بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمھیں اپنی طرف سے بڑی بخشش اور فضل کا وعدہ دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۸﴾

③ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ ...... : لفظ طیب جس طرح عمدہ مال کے معنی میں آتا ہے اسی طرح اس میں وہ مال بھی آ جاتا ہے جو حلال طریقے سے کمایا ہوا ہو، پس معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کی راہ میں پاکیزہ اور حلال طریقے سے کمایا ہوا مال خرچ کرو، خبیث یعنی حرام مال سے صدقہ قبول نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے، وہ قبول نہیں کرتا مگر پاک کو۔'' [مسلم، الزکوۃ، باب قبول الصدقة ...... : ۱۰۱۵، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ]

④ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: انسانی کمائی کے بڑے ذرائع چار ہیں، زراعت، صنعت، تجارت اور ملازمت۔ کمائی جس طریقے سے بھی ہو اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ بعض لوگ کہتے ہیں مالِ تجارت میں زکوٰۃ نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت سے استدلال کر کے ان کا رد فرمایا ہے۔ [بخاری، الزکوۃ، باب صدقة الکسب والتجارۃ، قبل ح : ۱٤٤٥] البتہ زمین سے حاصل ہونے والی فصل کا عشر فصل اٹھاتے ہی ادا کرنا ہوگا، اگر نصاب کو پہنچ جائے، جو 600 کلوگرام ہے۔ اس آیت میں ﴿ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ﴾ سے مراد فصل پر عشر یا نصف عشر ہے۔ اگر پانی زمین سے کھینچ کر لگایا جائے تو 5 فیصد، اگر بارانی یا نہری ہو تو 10 فیصد۔ تفصیل کے لیے دیکھیے میرا رسالہ ''احکامِ زکوٰۃ و عشر۔''

⑤ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ: یعنی اللہ تعالیٰ کو تمھارے مال کی ضرورت نہیں، وہ تو سب سے زیادہ بے پروا اور ہر تعریف کے لائق ہے، یہ سب تمھارے ہی فائدے کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔

آیت 268 ① اَلْفَحْشَآءِ : کوئی بھی قول یا فعل جس میں بہت بڑی قباحت ہو (راغب) مثلاً زنا، قوم لوط کا عمل وغیرہ، یہاں بہت قبیح درجے کا بخل مراد ہے۔

② اوپر کی آیت میں عمدہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی تھی، اب یہاں شیطان کے وسوسے سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ (رازی)

③ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ : یعنی انسان کے دل میں وہم اور وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے کہ اگر نیک کاموں میں خرچ کرو گے تو فقیر ہو جاؤ گے اور '' فَحْشَاءُ '' یعنی شرمناک بخل کی ترغیب دیتا اور اس پر اکساتا رہتا ہے۔ '' فَحْشَاءُ '' سے بے حیائی اور بدکاری کے کام بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ شیطان ان میں مال صرف کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ ہے کہ صدقہ و خیرات تمھارے گناہوں کا کفارہ بھی ہوگا اور اس پر تمھیں کئی گنا زیادہ اجر بھی ملے گا اور مال میں

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

دانائی عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے دانائی عطا کی جائے تو بلاشبہ اسے بہت زیادہ بھلائی دے دی گئی اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلوں والے ہیں ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو بھی خرچ کرو، کوئی خرچ، یا نذر مانو، کوئی نذر تو بے شک اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۲۷۰﴾

برکت بھی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر روز جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک دعا کرتا ہے، اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کی جگہ اور دے اور دوسرا بد دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! (ہاتھ) روکنے والے کے مال کو تلف کر دے۔'' [بخاري، الزكاة، باب قول الله تعالى : ﴿ فأما من أعطى...... ﴾ : ١٤٤٢، عن أبي هريرة رضي الله عنه] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ)) ''صدقہ مال کو کچھ بھی کم نہیں کرتا۔'' [مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع : ٢٥٨٨، عن أبي هريرة رضي الله عنه]

آیت 269 ① يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ : یہاں ''الْحِكْمَةَ'' سے مراد دین کا صحیح فہم اور علم وفقہ میں صحیح بصیرت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رشک دو خوبیوں کے سوا کسی پر جائز نہیں، ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا، پھر اسے (راہ) حق میں خرچ کرنے کی مکمل قدرت (توفیق) دی اور ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی، تو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔'' [بخاري، العلم، باب الاغتباط في ...... : ٧٣، عن ابن مسعود رضي الله عنه]

② اُولُوا الْاَلْبَابِ : '' اَلْبَابٌ '' جمع ہے '' لُبٌّ '' کی، جس کے معنی صاف ستھری اور پاکیزہ عقل کے ہیں، ہر عقل کو '' لُبٌّ '' نہیں کہتے۔ (راغب) '' اُولُوا الْاَلْبَابِ '' کا ترجمہ جمع ہونے کی وجہ سے ''جو عقلوں والے ہیں'' کیا گیا ہے۔ جبکہ عام تراجم میں ''عقل والے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔

آیت 270 ① وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ ...... : نذر کا معنی ہے، اپنے آپ پر وہ چیز فرض کر لینا جو فرض نہیں تھی، مثلاً کوئی نفل نماز یا نفل روزہ یا صدقہ یا نفل حج وغیرہ۔ اس کی دو قسمیں ہیں : ایک نذر مطلق اور دوسری نذر معلق۔ نذر مطلق یہ ہے کہ کوئی شرط لگائے بغیر صرف اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ پر کوئی نیکی لازم کر لے، مثلاً یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہمیشہ یا اتنے دن تہجد پڑھوں گا، یا عمرہ کروں گا۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے اور اسے پورا کرنا ضروری ہے۔ نذر معلق یہ ہے کہ کسی شرط کے ساتھ نذر مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں فلاں نیکی کروں گا، مثلاً صدقہ یا نوافل وغیرہ۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آدمی کی شرط سے مستغنی ہے، وہ اس کی وجہ سے اس کی مراد نہیں لائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نذر نہ مانا کرو، اس لیے کہ نذر تقدیر میں طے شدہ کاموں میں کچھ فائدہ نہیں دیتی،

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَ يُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

اگر تم صدقے ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر انھیں چھپاؤ اور انھیں محتاجوں کو دے دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اور یہ تم سے تمھارے کچھ گناہ دور کرے گا اور اللہ اس سے جو تم کر رہے ہو، پوری طرح باخبر ہے ﴿۲۷۱﴾

صرف اتنا ہوتا ہے کہ بخیل سے مال نکل آتا ہے۔'' [مسلم، النذر، باب النھی عن النذر …… : ۱٦٤٠، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ] البتہ اگر وہ کام ہو جائے تو نذر پوری کرنا پڑے گی۔ گناہ کے کام کی نذر پوری کرنا جائز نہیں۔ اگر نذر پوری نہ کر سکے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا جو وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۸۹)۔

❷ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ …… : یعنی اللہ تعالیٰ ہر حال میں تمھاری نیت اور عمل سے واقف ہے۔ اس میں ایک طرف مخلصین کے لیے وعدہ ہے اور دوسری طرف ریا کار اور غیر اللہ کی نذریں ماننے والوں کے لیے وعید بھی ہے کہ ایسے لوگ ظالم ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کسی صورت رہائی نہیں ہو سکے گی۔

آیت 271 ❶ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ: ''صَدَقَةٌ'' کا لفظ ''صِدۡقٌ'' سے نکلا ہے، یعنی وہ مال جو آدمی صدقِ دل سے خرچ کرتا ہے، عموماً یہ فقط نفل صدقے پر بولا جاتا ہے لیکن بعض اوقات فرض صدقے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ …… ﴾ [التوبۃ : ٦٠] ''صدقات تو صرف فقیروں اور مسکینوں اور ان پر مقرر عاملوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں الفت ڈالنی مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور تاوان بھرنے والوں میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافروں میں (خرچ کرنے کے لیے ہیں)۔''

❷ فَنِعِمَّا هِيَ : یہ اصل میں '' نِعۡمَ مَا '' ہے جس میں '' مَا '' بمعنی '' شَيۡءٌ '' ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ''تو یہ اچھی بات ہے'' اس میں علانیہ صدقہ کی تعریف کی گئی ہے، بشرطیکہ خالص نیت سے ہو اور ریا سے خالی ہو، کیونکہ اس سے آدمی بخل اور حقوق ادا نہ کرنے کی تہمت سے بچتا ہے اور اس سے دوسرے اہل خیر کو صدقہ کرنے کی ترغیب ہوتی ہے، جیسا کہ جنگ تبوک کے موقع پر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال لا کر پیش کر دیا، اسی طرح دوسرے صحابہ نے بڑھ چڑھ کر صدقہ کیا۔

❸ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا : یعنی صدقہ علانیہ دینا بھی گو اچھا ہے مگر پوشیدہ طور پر دینا زیادہ فضیلت رکھتا ہے، کیونکہ یہ ریا سے بعید ہوتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے نفل صدقات مراد ہیں۔ (شوکانی) اس کے برعکس فرض زکوٰۃ کو پوشیدہ طور پر دینا جائز ہے، مگر اسے لوگوں کے سامنے دینا افضل ہے، ورنہ زکوٰۃ نہ دینے کی تہمت لگے گی، جب کہ نماز اور زکوٰۃ ایمان کے بنیادی ارکان ہیں۔ نیز طبری نے اس پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔ (فتح الباری: ۲۲/٦)

متعدد احادیث میں نفل صدقات کو پوشیدہ طور پر دینے کی فضیلت آئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سات آدمیوں میں، جن کو عرش کا سایہ نصیب ہوگا، ایک وہ شخص شمار کیا جس نے دائیں ہاتھ سے صدقہ کیا اور اسے چھپا کر کیا، حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے سو تمھارے اپنے ہی لیے ہے اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے اور تم خیر میں سے جو بھی خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۷۲﴾

معلوم نہیں کہ دائیں نے کیا خرچ کیا۔ [بخاري، الزكاة، باب الصدقة باليمين : ۱۴۲۳، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] اس شخص کے واقعہ سے بھی خفیہ صدقے کی فضیلت اور برکت معلوم ہوتی ہے جس نے ایک رات خفیہ صدقہ ایک چور، ایک رات ایک زانیہ اور ایک رات ایک غنی کو دے دیا۔ [بخاري، الزكوٰة، باب إذا تصدق على ...... : ۱۴۲۱، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

④ وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ : چھپا کر فقراء کو دینے میں ان کی پردہ پوشی ہوتی ہے اور ان کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔

⑤ مِنْ سَيِّاٰتِكُمْ : "مِنْ" تبعیض کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "کچھ گناہ" کیا ہے، یعنی کم یا زیادہ جتنا مال خرچ کرے گا، اس کے لحاظ سے گناہ معاف ہوں گے۔ علاوہ ازیں کچھ گناہ ایسے ہیں جو مال خرچ کرنے سے معاف نہیں ہوتے، بلکہ ان کے لیے توبہ ضروری ہے۔

آیت 272 ① لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ...... : اس آیت سے پہلے اور بعد میں صدقے کے مسائل و فضائل بیان ہو رہے ہیں، درمیان میں یہ کہنا کہ "تیرے ذمے ان کی ہدایت نہیں" کیا مناسبت رکھتا ہے؟ اکثر مفسرین نے تو " هُدٰىهُمْ " سے مراد کفار کی ہدایت لی ہے اور اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ رشتے دار یا ضرورت مند اگر کافر ہے تو اس پر بھی صدقہ کرو، کافر ہونے کی وجہ سے صدقے سے ہاتھ نہ روکو، کیونکہ ان (کفار) کی ہدایت تمھارے ذمے نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ اپنے مشرک رشتہ داروں کو تھوڑی سی چیز دینا بھی ناپسند کرتے تھے، پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور یہ آیت اتری: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [السنن الكبرى للنسائي، التفسير، باب قوله : ﴿ ليس عليك هداهم ﴾ : ۱۰/۳۷، ح : ۱۰۹۸۶]

صلح حدیبیہ کی مدت میں اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی والدہ، جو مشرکہ تھی، ان کے پاس آئی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "میری والدہ آئی ہے، کیا میں ان سے صلہ رحمی کروں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں، اپنی والدہ سے صلہ رحمی کرو۔" [بخاري، الأدب، باب صلة المرأة أمها...... : ۵۹۷۹]

اسلام کی رحمت عام کو دیکھیے کہ مشرک پر خرچ کرنا بھی باعث ثواب ہے، بشرطیکہ وہ حالت جنگ میں نہ ہو، بلکہ کسی جانور پر خرچ کرنا بھی باعث ثواب ہے، جیسا کہ پیاسے کتے کو پانی پلانے والے شخص کی اس عمل کی وجہ سے بخشش ہو گئی۔ صحابہ نے پوچھا: "کیا جانوروں کے بارے میں بھی ہمیں اجر ملتا ہے؟" فرمایا: "جو بھی تر جگر والا (جاندار) ہے اس میں اجر ہے۔" [بخاري، الأدب، باب رحمة الناس و البهائم : ۶۰۰۹] لیکن یاد رہے کہ کفار پر صرف نفل صدقہ جائز ہے، فرض زکوٰۃ نہیں، اس پر امت

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ٞ يَحْسَبُهُمُ

(یہ صدقات) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں روکے گئے ہیں، زمین میں سفر نہیں کر سکتے، ناواقف

کا اجماع ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ مسلمانوں کے اغنیاء سے لی جاتی ہے اور انھی کے فقراء پر لوٹائی جاتی ہے۔" [بخاری، الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ : ۱۳۹۵] صدقہ فطر چونکہ فرض ہے، اس لیے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض مفسرین نے "هُدٰىهُمْ" سے مراد وہ مسلمان لیے ہیں جن کی ہدایت میں خامی ہے اور جن کا تذکرہ پچھلی آیات میں آیا ہے، یعنی ریا سے صدقہ کرنے والے، صدقہ کر کے تکلیف دینے والے، یا احسان رکھنے والے، یا نکمّی چیز خرچ کرنے والے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کا رویہ دیکھ کر تنگ دل نہ ہوں، انھیں ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

2 وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ : یعنی مسلمانوں پر خرچ کرو یا کفار پر، جس مال یا وقت یا اثر و رسوخ یا علم سے کسی کو فائدہ پہنچاؤ اس کا فائدہ تمھی کو ہے، یعنی دنیا میں سعادت و برکت اور آخرت میں ثواب اور دخول جنت۔

3 وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ : عام طور پر اس کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کی رضا کیا جاتا ہے، مگر جو لطف "اللہ کا چہرہ طلب کرنے کے لیے" میں ہے، وہ دوسرے لفظ میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "وَجْهِ" کا اصل معنی چہرہ ہے اور حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی خرابی بھی نہیں، کیونکہ مومن کی سب سے بڑی طلب اور تمنا اللہ تعالیٰ کے چہرے کا دیدار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ (آمین) یہاں لفظ اگرچہ نفی کے ہیں مگر مراد نہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے چہرے کی طلب کے سوا خرچ مت کرو۔

آیت 273 اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب کے بعد اب خاص طور پر کچھ لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے، جو سب سے زیادہ مدد اور مالی تعاون کے حق دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی چھ صفات بیان فرمائی ہیں اور یہ ساری صفات اصحاب صفہ میں پائی جاتی تھیں، اس لیے اس آیت کے سب سے پہلے مصداق وہی ہیں، پھر قیامت تک جو لوگ بھی ان صفات کے حامل ہوں گے وہ سب سے زیادہ مالی تعاون کے حق دار ہوں گے، اب آپ وہ صفات ملاحظہ فرمائیں:

① "لِلْفُقَرَآءِ" یہاں ان کے فقر کا سبب بیان نہیں فرمایا، سورۂ حشر میں بیان فرمایا ہے: ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ ﴾ [الحشر : ۸] "(یہ مال) ان محتاج گھر بار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔" اب وہ خالی ہاتھ تھے، نہ ان کے پاس مال تھا نہ گھر۔ ان کے لیے مسجد نبوی میں ایک صفہ بنا دیا گیا۔ ان کی تعداد چار سو تھی جو غزوات اور مہموں پر بھیجنے کی وجہ سے کم زیادہ ہوتی رہتی تھی۔

② "الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" احصار لغت میں یہ ہے کہ آدمی جو کام کرنا چاہتا ہے اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش آ جائے، مثلاً کوئی بیماری، بڑھاپا، خرچ نہ ہونا، یا کوئی دشمن وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں، یعنی جہاد اور طلب علم نے انھیں کمائی کرنے سے روک دیا ہے، وہ منتظر بیٹھے ہیں کہ کب حکم ہو اور وہ جہاد کے لیے نکلیں۔ یہ لوگ اللہ کی خاطر گھر سے نکلے، اللہ کی خاطر مال مویشی چھوڑ کر فقر اختیار کیا اور اب اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت بھی جو مجاہد یا دین کے طالب علم کاروبار یا ملازمت کے بجائے اپنے آپ کو جہاد اور دینی علوم کے حصول کے

الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع ۳۷

انھیں سوال سے بچنے کی وجہ سے مال دار سمجھتا ہے، تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، اور تم خیر میں سے جو خرچ کرو گے سو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾

لیے روکے ہوئے ہیں ان پر خرچ کرنا اولین فریضہ ہے۔

③ ”لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ“ یعنی جہاد اور طلب علم کی وجہ سے وہ سفر نہیں کر سکتے۔

④ ”يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ“ یعنی ان کی بے نیازی، عزتِ نفس اور سوال سے بچنے کی وجہ سے ناواقف آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غنی ہیں۔ بندہ (عبد السلام) عرض کرتا ہے کہ میرے والد حافظ محمد ابو القاسم رحمہ اللہ نے مجھے اپنے طالب علمی کے زمانے کا واقعہ سنایا کہ وہ ان دنوں فیروز پور کے ایک گاؤں ”لکھوکی“ میں پڑھتے تھے، والد فوت ہو چکے تھے، گھر میں غربت تھی اور سردی کے موسم میں قمیص بھی نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ میں نے وہ چھ ماہ قمیص کے بغیر دوہر (دوہرا کھیس) لپیٹ کر گزار دیے، کسی کو پتا تک نہیں چلنے دیا کہ میرے پاس قمیص نہیں، پھر والدہ نے روئی وغیرہ کی چنائی سے حاصل ہونے والی کچھ رقم بھیجی تو انھوں نے قمیص بنائی۔ [اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْفَعْ دَرَجَتَهٗ فِي الْمَهْدِيِّيْنَ]

⑤ ”تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ“ تو انھیں ان کی علامت سے پہچان لے گا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ بھوک کی وجہ سے کمزوری اور چہرے کی زردی سے تم ان کا فقر پہچان لو گے، مگر یہ معنی ہو تو یہ تو ناواقف بھی پہچان لیتا ہے، اس لیے اس کا مطلب چہرے کا نور اور وہ رونق ہے جو ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ان کے چہرے پر نمایاں تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ﴾ [الفتح: ۲۹] ”ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، سجدے کرنے کے اثر سے۔“ اصحابِ رسول ﷺ اپنے چہرے کی ایک خاص رونق سے پہچانے جاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیت کی تفسیر۔

⑥ ”لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا“ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ بظاہر اس کا معنی یہ ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر لوگوں سے لپٹ کر نہیں، مگر یہ معنی درست نہیں، کیونکہ اگر یہ معنی ہو تو پچھلے دونوں جملے بے مقصد ٹھہرتے ہیں، کیونکہ جب سوال کر لیا تو تعفف (سوال سے بچنا) کہاں رہا اور پھر پہچان کے لیے چہرے کی علامت پر غور کی کیا ضرورت ہے، فقر کا اظہار تو ان کے سوال ہی سے ہو گیا، اس لیے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ نہ وہ لوگوں سے سوال کرتے ہیں نہ لپٹتے ہیں۔ یہاں ”لَا“ صرف ”يَسْـَٔلُوْنَ“ پر نہیں بلکہ ”اِلْحَافًا“ پر بھی ہے۔ دراصل یہ بھکاریوں کی عادت کی مذمت ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں، مگر ہمارے یہ فقراء ایسا نہیں کرتے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو کہے میرا باپ نامی گرامی چور نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ چور تو تھا مگر نامی گرامی نہیں، بلکہ وہ دوسرے آدمی کو تعریض کر رہا ہے کہ تمھارا باپ ایسا تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا اللَّعَّانِ » ”مومن بہت طعن کرنے والا اور بہت لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔“ [ترمذی، البر والصلۃ، باب ما جاء فی اللعنۃ: ۱۹۷۷، عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ و صححہ الألبانی] اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

وہ لوگ جو اپنے اموال رات اور دن، چھپے اور کھلے خرچ کرتے ہیں، سو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۴﴾

تھوڑا طعن اور تھوڑی لعنت کر لیتا ہے، نہیں بلکہ تعریض ہے کہ کافر ایسا ہوتا ہے مومن نہیں۔ اس کی دلیل ایک اور حدیث سے ملاحظہ فرمائیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں جو لوگوں پر چکر لگاتا رہتا ہے، اسے ایک لقمہ یا دو لقمے اور ایک کھجور یا دو کھجوریں دے دی جاتی ہیں تو آگے چل پڑتا ہے، لیکن مسکین وہ ہے جو نہ تو اتنا مال رکھتا ہے جو اسے غنی کر دے اور نہ اس کا پتا چلتا ہے کہ اس پر صدقہ کیا جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے سوال کرتا ہے۔'' [بخاری، الزکاۃ، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ للفقراء الذین احصروا ...... ﴾ : ۱۴۷۹، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ]

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے　　کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

رسول اللہ ﷺ نے سوال کی بہت مذمت فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہو گی۔'' [بخاری، الزکوۃ، باب من سأل الناس تکثرًا : ۱۴۷۴، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ سے خاص طور پر اس بات کی بیعت لی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے اور پانچ نمازیں پڑھیں گے اور اطاعت کریں گے اور ایک خفیہ بات چھپا کر کہی کہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال مت کرنا۔ عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر میں نے ان آدمیوں میں سے بعض کو دیکھا کہ اس کا کوڑا گر پڑتا تو وہ کسی سے سوال نہ کرتا کہ اسے پکڑا دے۔'' [مسلم، الزکوۃ، باب کراھۃ مسئلۃ الناس : ۱۰۴۳] البتہ مجبوری کی بات الگ ہے کہ مجبوری میں تو خنزیر کھانے کی بھی اجازت ہے۔ نبی ﷺ نے تین آدمیوں کے لیے سوال کی اجازت دی ہے، ایک وہ جس نے (کسی دیت کی ادائیگی یا کسی کا تاوان اٹھانے کی) کوئی ضمانت اٹھائی ہو، دوسرا وہ آدمی جسے فاقہ پہنچے اور اس کی قوم کے تین عقل مند آدمی اسے فاقہ پہنچنے کی شہادت دیں، تیسرا وہ آدمی جسے کوئی آفت پہنچے جو اس کا سارا مال برباد کر دے۔ ان تینوں کو ضرورت پوری ہونے تک سوال کی اجازت ہے، ضرورت پوری ہو جائے تو مانگنا چھوڑ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے قبیصہ! ان کے سوا جو سوال بھی ہے حرام ہے، سوال کرنے والا حرام کھاتا ہے۔'' [مسلم، الزکاۃ، باب من تحل لہ المسئلۃ : ۱۰۴۴، عن قبیصۃ بن مخارق رضی اللہ عنہ]

آیت 274 یہاں تک چودہ آیات میں صدقے کا بیان تھا، اس کے بعد سود کو حرام قرار دیا۔ جب صدقے کی تاکید فرمائی تو قرض دینا تو بالا ولی ضروری ٹھہرا اور قرض پر سود کیوں لیا جائے۔ (موضح)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، کھڑے نہیں ہوں گے مگر جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا بیع تو سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا، پھر جس کے پاس

آیت 275 ① اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا...... : یعنی سود خور قیامت کے دن مخبوط الحواس اور پاگل ہو کر اٹھیں گے۔ دنیا میں بھی بے پناہ حرص کی وجہ سے ان کی یہی حالت ہوتی ہے۔

"الرِّبٰوا" کا لفظی معنی بڑھنا، زیادہ ہونا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ ﴾ [الحج : ٥] ''پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور ابھرتی ہے۔'' شریعت کی اصطلاح میں قرض دے کر اصل مال سے جو زیادہ لیا جاتا ہے اسے ربا کہتے ہیں۔ (راغب) یعنی کسی قرض پر بغیر کسی مالی معاوضہ کے محض مہلت بڑھا دینے کی بنا پر زیادہ حاصل کیا جائے۔ (ابن العربی: ۱/۲۹۰)

موجودہ بینکنگ کا نظام بھی واضح سود پر مبنی ہے۔ سیونگ اکاؤنٹ اور پی ایل ایس تو واضح سود ہیں، کرنٹ اکاؤنٹ میں اگرچہ سود نہیں دیا جاتا مگر بنک وہ رقم آگے سود پر چلاتا ہے، آج کل اسلامی بینکنگ کا بہت شور ہے مگر علماء نے، جن میں حنفی علماء بھی شامل ہیں، اسے سودی حیلہ پر مبنی قرار دیا ہے۔ بیمہ (انشورنس) بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔ اسی طرح انعامی بانڈ بھی سود اور جوئے کا مرکب ہے۔ سود کی ایک صورت نقد اور ادھار کی قیمتوں کا فرق ہے، قسطوں کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے، حالانکہ یہ رقم سود ہے، مثلاً ایک شخص کہے کہ میں تمھیں ایک ہزار روپے ادھار قرض دیتا ہوں مگر میں تم سے گیارہ سو روپے لوں گا، اس کے سود ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اسی طرح ایک چیز جس کی قیمت سب جانتے ہیں کہ ایک ہزار ہے، بیچنے والے اور لینے والے کو بھی علم ہے، پھر وہ اسے قسطوں پر گیارہ سو میں دیتا ہے، تو یہ کیوں سود نہیں؟ سود خواہ کوئی ذاتی ضرورت کے لیے لے یا تجارت کے لیے جب اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا تو ہر طرح کا سود حرام ہے۔ اگر کوئی بچنا چاہے تو اسے واضح سود کے ساتھ سود کے حیلے اور سود کے شک والے معاملات سے بھی بچنا ہوگا۔ مزید دیکھیے آل عمران (۱۳۰)۔

② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا : یعنی ان کی یہ حالت اس لیے ہوگی کہ انھوں نے بیع، یعنی فروخت کو بھی سود جیسا قرار دیا اور سود کو اتنا حلال قرار دیا کہ بیع کی حلت کا سبب بھی سود کے ساتھ مشابہت کو قرار دیا، بقول زمخشری: ''انھوں نے بیع کو سود کے مشابہ سود کی حلت میں مبالغہ کے لیے قرار دیا۔'' ان ظالموں کے نزدیک بیع اور سود میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ دونوں میں نفع آتا ہے۔ آج کل کفار کی تہذیب سے متاثر نیا روشن خیال تاریک دل طبقہ بھی سود کو ایک کاروبار سمجھتا ہے، حالانکہ دونوں میں واضح کئی فرق ہیں جن میں سے بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے، دونوں برابر کیسے ہو گئے؟ علاوہ ازیں ایک فرق یہ ہے کہ تجارت میں نفع بھی ہوتا ہے نقصان بھی ہوتا ہے جب کہ سودی قرض لینے والے کو نفع

مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت آئے پس وہ باز آ جائے تو جو پہلے ہو چکا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو دوبارہ ایسا کرے تو وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۷۵﴾

ہو یا نقصان سود خور نے (خواہ ایک شخص ہو یا بنک) ہر حال میں پوری رقم مع سود وصول کرنی ہے جو آئندہ بڑھتی ہی جائے گی۔ اس لیے سود ظلم اور مفت خوری کی بدترین شکل ہے۔

③ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ : شیطان کا آدمی کو نقصان پہنچانا، خصوصاً اس کے دماغ پر حملہ آور ہونا کئی آیات واحادیث سے ثابت ہے، مثلاً چوکے مارنا اور غصہ دلانا، فرمایا: ﴿مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ﴾ [المؤمنون : ۹۷] ''شیطانوں کی اکساہٹوں سے۔'' بہکا کر حیران چھوڑ دینا، فرمایا: ﴿كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ﴾ [الأنعام : ۷۱] ''اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا، اس حال میں کہ حیران ہے۔'' تکلیف یا بیماری میں مبتلا کر دینا، فرمایا: ﴿اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ﴾ [ص : ۴۱] ''بے شک شیطان نے مجھے بڑا دکھ اور تکلیف پہنچائی ہے۔'' بھلا دینا، فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ﴾ [الكهف : ۶۳] ''اور مجھے وہ (بات) نہیں بھلائی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شیطان انسان میں خون کی گردش کی طرح گردش کرتا ہے۔'' [بخاری، الاعتکاف، باب زيارة المرأة ...... : ۲۰۳۸] الغرض! شیطان کے انسان کو چھو کر خبطی بنا دینے سے انکار قرآن و حدیث سے انکار ہے۔ البتہ مجھے آج تک کوئی ایسی حدیث یا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کا کوئی واقعہ نہیں ملا جس میں ذکر ہو کہ شیطان یا جن نے کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو کر اس کی زبان پر گفتگو کی ہو، صرف مشاہدہ اس کی ناکافی دلیل ہے، کیونکہ " اَلْجُنُوْنُ فُنُوْنٌ " یعنی جنون کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ واللہ اعلم!

④ فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ : یعنی سود کی حرمت کا حکم آنے کے بعد جو سود سے باز آ جائے وہ پہلے جو سود لے چکا ہے اس کا مطالبہ اس سے نہیں کیا جائے گا، البتہ معاملہ اس کا اللہ کے سپرد ہے وہ اس کے آئندہ طرز عمل، ندامت، توبہ کو دیکھ کر فیصلہ فرمائے گا۔ یاد رہے یہ اس وقت کی بات ہے جب سود کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اب سود کی حرمت کو جانتے ہوئے کوئی شخص ساری عمر سود کھا کر آخر میں چھوڑ دے تو وہ مال اس کا نہیں ہو جائے گا بلکہ اسے حتی الامکان اس کے مالکوں کو لوٹانا ہوگا اور جو نہ لوٹا سکے اس پر توبہ اور استغفار کرنا ہوگا۔

⑤ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ : یہ سود خوروں کے لیے سخت وعید ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی سود کھانے والے پر، سود دینے والے پر، سود لکھنے والے پر اور سودی لین دین کے گواہوں پر اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔'' [مسلم، المساقاة، باب لعن أكل الربا و موكله : ۱۵۹۸] بعض نے "وَمَنْ عَادَ"

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو سخت ناشکرا، سخت گنہگار ہو ﴿۲۷۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۷﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سود میں سے جو باقی ہے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو ﴿۲۷۸﴾

کے یہ معنی کیے ہیں کہ حرام قرار دیے جانے کے بعد بھی اگر کوئی بیع اور سود کو برابر قرار دے گا اور سود کو حلال سمجھ کر کھائے گا تو ایسا شخص چونکہ کافر ہے، اس لیے اسے ہمیشہ کے لیے دوزخی قرار دیا ہے۔ (شوکانی)

آیت 276 ① **يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا:** یعنی سود کا مال بظاہر جتنا بھی بڑھ جائے حقیقت میں نہیں بڑھتا، فرمایا: ﴿وَمَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۠ فِيْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الروم: ۳۹] ''اور جو کوئی سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ لوگوں کے اموال میں بڑھ جائے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سود خواہ کتنا ہی بڑھ جائے انجام اس کا قلت ہی ہوگا۔'' [أحمد : ۱/ ۴۲۴، ح : ۴۰۲۵، عن ابن مسعود و صححه محققه و وافقه الألباني في صحيح ابن ماجه]

وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سودی مال میں خیر و برکت عطا نہیں فرماتا، چنانچہ سود خور پر دنیا بھی لعنت بھیجتی ہے اور آخرت میں بھی اسے وہ سزا ملے گی جو کسی دوسرے مجرم کو نہیں ملے گی۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا ہے اور ان میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص پاک کمائی میں سے ایک کھجور بھی صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ پاک مال ہی کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتا ہے، پھر اسے صدقہ کرنے والے کے لیے اس طرح پالتا پوستا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے گھوڑی کے بچے کی پرورش کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ صدقہ (بڑھ کر) پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔'' [بخاري، الزكاة، باب الصدقة من كسب طيب : ۱۴۱۰۔ مسلم : ۱۰۱۴، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

② **كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ:** یعنی مال دار ہو کر محتاج کو قرض بھی مفت نہ دے جب تک سود نہ رکھ لے، یہ نعمت کی سخت ناشکری ہے۔ (موضح)

آیت 277 **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......:** اللہ تعالیٰ کفر و ایمان دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر فرماتا ہے، تاکہ دونوں پہلو سامنے رہیں۔ ربا کی آیتوں کے درمیان ایمان والوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایمان، عملِ صالح، نماز اور زکوٰۃ سودی کاروبار سے بچنے کا اہم ذریعہ ہیں۔

آیت 276 **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ......:** اس آیت میں واضح حکم دیا گیا کہ اگر تم مومن ہو تو تمھارا جو سود لوگوں

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨٠﴾

پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑی جنگ کے اعلان سے آگاہ ہو جاؤ اور اگر توبہ کر لو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہیں، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا ﴿٢٧٩﴾ اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو آسانی تک مہلت دینا لازم ہے اور یہ بات کہ صدقہ کر دو تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿٢٨٠﴾

کے ذمے ہے چھوڑ دو۔ معلوم ہوا کہ سود اور ایمان دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے وہ تمام سود باطل قرار دے دیے جو قریش، ثقیف اور دوسرے عرب قبائل میں سے بعض تاجروں کے اپنے قرض داروں کے ذمے باقی تھے، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے اعلان فرمایا: ''جاہلیت کے زمانے کے تمام سود میرے قدموں کے نیچے پامال کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلا سود جو میں باطل قرار دیتا ہوں وہ ہمارے سودوں میں سے عباس بن عبد المطلب کا سود ہے، وہ پورے کا پورا چھوڑ دیا گیا ہے۔'' [مسلم، الحج، باب حجۃ النبی ﷺ : ۱۲۱۸، عن جابر رضی اللہ عنہ]

آیت 279 ① فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ: '' بِحَرْبٍ '' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ''بڑی جنگ'' ترجمہ کیا ہے۔ '' أَذِنَ يَأْذَنُ (س) '' کا صلہ اگر لام ہو، مثلاً ''أَذِنَ لَهٗ'' تو اس کا معنی ''اِسْتَمَعَ'' ہوتا ہے یعنی کان لگانا، سننا اور اگر ''أَذِنَ بِهٖ'' ہو تو اس کا معنی ''عَلِمَ بِهٖ'' ہوتا ہے یعنی جاننا، آگاہ ہونا۔ خبر دار ہونا۔ (قاموس) یعنی اگر تم نے سود نہ چھوڑا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سے آگاہ اور خبر دار ہو جاؤ۔ اور یہ وہ وعید ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دوسرے کسی جرم کے بارے میں اتنے واضح الفاظ میں نہیں دی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابن سیرین، حسن بصری اور بعض دیگر ائمہ رحمہم اللہ کے نزدیک سود خور کو توبہ پر مجبور کیا جائے گا، اگر پھر بھی روش نہ بدلے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (ابن کثیر)

② لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ: یعنی اصل مال سے زائد وصول کرو تو یہ تمھارا لوگوں پر ظلم ہو گا اور اگر تمھیں اصل مال بھی نہ ملے تو یہ لوگوں کا تم پر ظلم ہو گا اور یہ دونوں چیزیں ہی انصاف کے خلاف ہیں۔ (ابن کثیر)

آیت 280 وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ ...... : جاہلیت میں قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں سود در سود سے اصل رقم میں اضافہ ہوتا جاتا، جس سے تھوڑی سی رقم ایک پہاڑ بن جاتی اور اس کی ادائیگی ناممکن ہو جاتی، آج کل بھی یہی حال ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ کوئی تنگدست ہو تو (سود تو درکنار) آسانی تک اسے مہلت دو اور اگر قرض بالکل معاف کر دو تو زیادہ اچھا ہے۔ احادیث میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے، بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرضے کے برابر ثواب ملے گا۔'' پھر میں نے آپ کو یہ

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۳۸/۸
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ
بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ

اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۸۱﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب آپس میں ایک مقرر مدت تک قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور ایک لکھنے والا تمھارے درمیان انصاف کے ساتھ لکھے اور کوئی لکھنے والا اس سے انکار نہ کرے کہ لکھے جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے، سو اسے لازم ہے کہ لکھ دے اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے حق (قرض) ہو، اور اللہ سے ڈرے جو

فرماتے ہوئے بھی سنا: ”جس نے کسی تنگدست شخص کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرض سے دگنا صدقے کے برابر ثواب ملے گا۔“ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرض کے برابر صدقے کا ثواب ملے گا اور پھر میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے بھی سنا کہ جس شخص نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اسے ہر دن اس قرض سے دگنا صدقے کے برابر ثواب ملے گا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”قرض چکانے کی مدت تک اسے قرض کے برابر صدقے کا ثواب ملے گا اور اگر قرض چکانے کی مدت کے آنے پر مہلت دے تو اسے قرض سے دگنا صدقے کے برابر ثواب ملے گا۔“ [مسند أحمد : ۳۶۰/۵، ح : ۲۳۱۱۰۔ الصحيحة : ۸۶]

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اپنے قرض دار کو مہلت دی، یا قرض معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ اسے (قیامت کے دن) اپنا سایہ عطا فرمائے گا۔“ [مسلم، الزهد، باب حديث جابر الطويل ...... : ۳۰۰۶، عن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ]

آیت 281 اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا کے زوال پذیر ہونے اور اس کے اموال وغیرہ کے فانی ہونے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور ہر عمل کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا ہونے کے ساتھ نصیحت فرمائی ہے۔ (ابن کثیر)
ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”قرآن میں سب سے آخر میں جو آیت اتری وہ یہ ہے۔“ [السنن الكبرى للنسائي : ۳۹/۱۰، ۴۰، ح : ۱۰۹۹۱، ۱۰۹۹۲، صحيح۔ هداية المستنير : ۸۷۰]

آیت 282 ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ: اس آیت کو ” آيَةُ الدَّيْنِ “ یا ” آيَةُ الْمُدَايَنَةِ “ کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن کی سب سے لمبی آیت ہے، جب سود حرام کیا گیا تو قرض کا صحیح طریقہ بیان کرنا ضروری تھا، چنانچہ وہ اس آیت میں بیان فرمایا ہے اور اصولی طور پر تین باتیں ضروری قرار دی ہیں، ایک اسے لکھ لینا، دوسری مدت مقرر کر لینا، تیسری گواہ بنا لینا۔ عموماً لوگ ادھار یا قرض کے معاملے میں تحریر کو معیوب اور باہمی بے اعتمادی کی علامت سمجھتے ہیں، آیت کے آخر میں اس کی حکمت بیان فرما دی گئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف والی، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی اور ہر قسم کے

وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اس کا رب ہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس کے ذمے حق (قرض) ہے، بے سمجھ یا کمزور ہے، یا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ خود لکھوائے تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور اپنے مردوں میں سے دو گواہوں کو گواہ بنا لو، پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جنھیں تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو، (اس لیے) کہ دونوں میں سے ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ اور گواہ جب بھی بلائے جائیں انکار نہ کریں۔ اور اس سے مت اکتاؤ وہ چھوٹا (معاملہ) ہو یا بڑا کہ اسے اس کی مدت تک لکھو۔ یہ کام اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والا اور شہادت کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، مگر یہ کہ نقد سودا ہو، جسے تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اسے نہ لکھو۔ اور جب آپس میں خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لو، اور نہ کسی لکھنے والے کو تکلیف دی جائے اور نہ کسی گواہ کو اور اگر ایسا کرو گے تو بلاشبہ یہ تم میں (پائی جانے والی بہت) بڑی نافرمانی ہے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمھیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۲۸۲﴾

شک و شبہ سے بچانے والی چیز ہے۔ اس بنا پر ایسے معاملات میں اس قسم کی احتیاط مناسب ہے، تاکہ آئندہ جھگڑا پیدا نہ ہو سکے۔ (ابن کثیر)

② اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى : اس سے ادھار کی ادائیگی کی مدت مقرر کرنا ضروری ثابت ہوا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اس آیت سے بیع سلم کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔'' (شوکانی) بیع سلم یا سلف یہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے اور وہ چیز مقرر کردہ وقت پر بعد میں وصول کر لی جائے۔ اس بیع کی شرائط بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیں، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو دیکھا کہ اہل مدینہ دو سال یا تین سال

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٣﴾ ع

اور اگر تم کسی سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ تو ایسی گروی لازم ہے جو قبضے میں لے لی گئی ہو، پھر اگر تم میں سے کوئی کسی پر اعتبار کرے تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے وہ اپنی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور شہادت مت چھپاؤ اور جو اسے چھپائے تو بے شک وہ، اس کا دل گناہ گار ہے اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے خوب جاننے والا ہے ﴿٢٨٣﴾

کے لیے کھجور میں بیع سلف کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی چیز میں بیع سلف کرے وہ مقررہ ماپ تول میں اور مقررہ مدت تک کرے۔'' [بخاري، المساقاة، باب السلم : ١٦٠٤] نیز ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مقررہ قیمت کا بھی ذکر ہے۔

③ اس آیت کریمہ سے بظاہر قرض کا لکھنا واجب معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے اگلی آیت میں ﴿ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ سے معلوم ہوا کہ یہ حکم واجب نہیں مستحب ہے۔

④ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ : یعنی جو دیانت، امانت اور اخلاق کے اعتبار سے تم میں قابل اعتماد سمجھے جاتے ہوں، نیز وہ مسلمان ہوں، عاقل، بالغ، فرائض کے پابند اور کبیرہ گناہوں سے بچنے والے بھی ہوں، کیونکہ اہل اسلام کے ہاں یہی لوگ پسندیدہ ہیں۔ غیر مسلم کی شہادت قبول نہیں ہو گی۔

⑤ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً : یعنی اگر تجارت میں لین دین نقد ہو، ادھار نہ ہو تو گواہ بنا لینے ہی کافی ہیں، لکھنا ضروری نہیں، کیونکہ اس میں تکلیف ہے اور گواہ بنا لینا بھی واجب نہیں، مستحب ہے۔ (شوکانی)

⑥ وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ : ''اور نہ کسی لکھنے والے کو تکلیف دی جائے اور نہ کسی گواہ کو۔'' یہ ترجمہ '' لَا يُضَآرَّ '' فعل مجہول کی صورت میں ہے۔ یہ فعل معروف بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ترجمہ ہو گا ''نہ لکھنے والا نقصان پہنچائے اور نہ گواہ'' مثلاً لکھنے والا غلط بات لکھ دے، جس سے صاحب حق یا مقروض کو نقصان پہنچے، یا گواہ شہادت میں ہیر پھیر کر کے غلط گواہی دے اور کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچایا جانا یہ ہے کہ انھیں ان کی مشغولیت کے وقت تنگ کر کے بلایا جائے یا غلط شہادت پر مجبور کرنے کے لیے خوف زدہ کیا جائے وغیرہ۔

آیت 283 ① وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا...... : یہ بیع اور قرض کی ایک دوسری شکل ہے، یعنی اگر تم سفر میں قرض کا معاملہ کرو اور تمھیں لکھنے والا نہ مل سکے، یا لکھنے کے لیے قلم دوات وغیرہ میسر نہ ہوں تو مقروض کو چاہیے کہ قرض دینے والے کے پاس کوئی چیز رہن (گروی) رکھ دے۔ سفر کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ معاملہ زیادہ تر سفر میں پیش آتا ہے، ورنہ رہن (گروی) رکھنا حضر میں بھی جائز ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھ کر عملاً اس کی

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور اگر تم اسے ظاہر کرو جو تمھارے دلوں میں ہے، یا اسے چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۸۴﴾ یہ رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی جانب سے اس کی طرف

وضاحت کر دی۔ [بخاري، البيوع، باب شراء الإمام الحوائج بنفسه : ۲۰۹۶۔ مسلم : ۱۶۰۳] چنانچہ سفر میں رہن نص قرآنی سے ثابت ہے اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کے فعل سے۔ (شوکانی)

❷ جو چیز رہن رکھی جائے اگر دودھ والا جانور ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے چارا ڈالنے کے بدلے اس کا دودھ پینے کی اجازت دی، اسی طرح گھوڑے، اونٹ، گدھے یا خچر وغیرہ پر اس کے چارے کے بدلے سواری کی اجازت دی۔ [بخاري، في الرهن في الحضر، باب الرهن مركوب : ۲۵۱۱ عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ان کے علاوہ گروی رکھی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانا منع ہے، یہ سود کے زمرے میں آتا ہے، مثلاً قرض پر رقم لے کر زمین رہن رکھ دی جائے تو گروی لینے والا اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا بلکہ اگر کاشت کرے تو اس کا ٹھیکہ وغیرہ قرض میں وضع کرنا ہوگا۔

❸ فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ : مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص قرض لینے والے کا اعتبار کرے اور اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر اسے قرض دے دے تو اسے بھی چاہیے کہ اللہ سے ڈرتے ہوئے اس کا قرض ادا کر دے۔

❹ فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ : اس میں "اٰثِمٌ" (گناہ) کی نسبت دل کی طرف کی ہے، اس لیے کہ چھپانا دل کا فعل ہے اور سب سے پہلے اس کا خیال دل ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ وعید ہے کہ شہادت چھپانا اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس سے دل گناہ گار ہو جاتا ہے۔ [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَكْبَرُ الْكَبَائِرِ ، اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَ قَتْلُ النَّفْسِ وَ عُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ وَ قَوْلُ الزُّوْرِ أَوْ قَالَ وَ شَهَادَةُ الزُّوْرِ)) ''کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ اللہ کے ساتھ شریک بنانا، کسی شخص کو قتل کرنا، والدین کی نافرمانی اور جھوٹی بات، یا فرمایا، جھوٹی گواہی ہیں۔'' [بخاري، الديات، باب : ﴿ و من أحياها ﴾ : ۶۸۷۱، عن أنس رضی اللہ عنہ] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''گواہی چھپانا بھی اکبر الکبائر میں سے ہے۔'' (طبری)

آیت 285،284 ❶ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ : یہ پچھلی آیت میں موجود ﴿ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ کی علت ہے، یعنی جب آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔

❷ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ : اس سے معلوم ہوا کہ دل کے فعل پر بھی محاسبہ ہوگا، مگر اس سے مراد دل کے وہ اعمال ہیں جن پر انسان کو اختیار ہو اور جن کا وہ پختہ ارادہ کر لے، مثلاً ایمان، کفر، کسی نیکی یا بدی کا عزم اور پختہ ارادہ، مثلاً ایک شخص دل میں کفر رکھتا

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

نازل کیا گیا اور سب مومن بھی، ہر ایک اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور انھوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، تیری بخشش مانگتے ہیں اے ہمارے رب! اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸۵﴾

ہے، یا چوری اور زنا کا عزم رکھتا ہے، مگر اسے کفر کے اظہار کا یا چوری اور زنا پر عمل کا موقع نہیں ملتا تو اس پر محاسبہ ضرور ہوگا۔ رہے وہ خیالات جو انسان کی طاقت اور اختیار سے باہر ہیں، خود بخود آتے جاتے رہتے ہیں، اگر آدمی ان کو اپنے دل میں جگہ نہ دے تو ان پر محاسبہ نہیں ہوگا، جیسا کہ اس سورت کی آخری آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ میں ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ......﴾ نازل ہوئی تو صحابہ پر گراں گزری، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم نماز، روزہ وغیرہ اعمال تو بجا لا رہے ہیں، مگر اس آیت (دل کی باتوں پر محاسبہ) کے مطابق تو بڑی مشکل پڑے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم بھی اہل کتاب کی طرح '' سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا '' کہنا چاہتے ہو، بلکہ تم یوں کہو: ((سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ)) ''ہم نے سن لیا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا اقرار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ نازل فرمائی اور آیت ﴿اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ کو منسوخ کر دیا اور جب اگلی آیت: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ نازل فرمائی تو اس کے ہر دعائیہ جملہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ((قَدْ فَعَلْتُ)) ''میں نے ایسا کر دیا۔'' [مسند أحمد : ۲/ ۴۱۳، ح : ۹۳۶۳۔ مسلم، الإیمان، باب بیان تجاوز اللہ ...... : ۱۲۵]

واضح رہے کہ یہاں دوسری آیت سے پہلی کے منسوخ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ پہلی آیت میں جو ابہام تھا اس کی وضاحت فرما دی۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نسخ کا لفظ وضاحت کے معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔''

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے لیے میری امت کے لوگوں کے وہ خیالات اور وساوس معاف کر دیے گئے ہیں جو ان کے دلوں میں آئیں، تاوقتیکہ ان کو زبان پر نہ لائیں، یا ان پر عمل نہ کریں۔''

[مسلم، الإیمان، باب تجاوز اللہ عن ...... : ۱۲۷۔ بخاری : ۵۲۶۹] (ابن کثیر، شوکانی)

3 لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ: یعنی ایسا نہیں کہ ہم بعض انبیاء کو مانتے ہوں اور بعض کا انکار کرتے ہوں، بلکہ ہم تمام انبیاء کو مانتے ہیں۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ
نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا
وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۸۶ ع ۸

اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق، اسی کے لیے ہے جو اس نے (نیکی) کمائی اور اسی پر ہے جو اس نے (گناہ) کمایا، اے ہمارے رب! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر جائیں، اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی بھاری بوجھ نہ ڈال، جیسے تو نے اسے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے، اے ہمارے رب! اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، تو ہی ہمارا مالک ہے، سو کافر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ۝۲۸۶

آیت 286 ❶ یہ اور اس سے پہلی آیت رسول اللہ ﷺ کو معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہیٰ کے پاس عطا فرمائی گئیں۔ [مسلم، الإیمان، باب في ذکر سدرة المنتهى : ۱۷۳] ان آیات کی فضیلت میں کئی احادیث آئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص رات کو سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لے تو وہ اس کے لیے کافی ہوں گی۔“ [بخاري، فضائل القرآن، باب فضل سورة البقرة : ۵۰۰۹، عن أبي مسعود رضی اللہ عنہ]

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے اوپر سے ایک زور دار آواز سنی، انھوں نے سر اٹھایا، پھر فرمایا: ”یہ آسمان کا دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔“ پھر اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ”یہ ایک فرشتہ ہے جو آج زمین کی طرف نازل ہوا ہے اور آج سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا۔“ پھر اس فرشتے نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا اور کہا: ”دو نوروں کی خوش خبری سنیے، یہ دونوں صرف آپ کو عطا کیے گئے ہیں، آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے۔ ایک نور سورۂ فاتحہ ہے اور دوسرا نور سورۂ بقرہ کی آخری آیات ہیں، آپ جب کبھی ان دونوں میں سے کوئی کلمہ تلاوت کریں گے تو آپ کو مانگی ہوئی چیز مل جائے گی۔“ [مسلم، صلاة المسافرین، باب فضل الفاتحة و خواتیم سورة البقرة : ۸۰۶] نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی، اس میں سے اس نے دو آیتیں نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۂ بقرہ کا اختتام کیا، وہ کسی گھر میں تین راتیں نہیں پڑھی جائیں کہ پھر شیطان اس کے قریب آ سکے۔“ [ترمذي، فضائل القرآن، باب ما جاء في آخر سورة البقرة، ۲۸۸۲، وصححه الألباني]

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ ۳ مدنية ۸۹ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۲۰۰ رُكُوْعَاتُهَا ۲۰

الٓمّٓ ۚ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓ ① اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے ② اس نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری، اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے اور اس نے تورات اور انجیل اتاری ③

سورۂ آل عمران کی فضیلت سورۂ بقرہ کی فضیلت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔ اس سورت کے مدنی ہونے پر مفسرین کا اتفاق ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی ۸۳ آیتیں وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ۹ ھ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ (فتح القدیر) مگر ابن عاشور کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وفد تقریباً ۳ ھ میں آیا ہے، کیونکہ اس پر اتفاق ہے کہ یہ سورت مدنی سورتوں کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ نزول کے اعتبار سے کل سورتوں میں اس کا نمبر ۴۸ واں ہے۔ ۹ ھ میں نازل ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی غلطی کا باعث یہ ہے کہ وفود اس سال آئے تھے، جبکہ وفد نجران پہلے آ چکا تھا۔ [التحریر والتنویر] یہ وفد ساٹھ سواروں پر مشتمل تھا، جن میں چودہ ان کے معزز افراد بھی شامل تھے۔ تین آدمی ان سب میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا امیر عاقب تھا جس کا نام عبد المسیح تھا۔ دوسرا ''سید'' تھا اس کا نام الایہم تھا، یہ اس کا مشیر اور بہت سمجھدار تھا۔ تیسرا ابو حارثہ بن علقمہ الکبریٰ تھا، یہ ان کا لاٹ پادری تھا۔ ان سے دوسری باتوں کے علاوہ مسیح علیہ السلام کے خدا ہونے پر بھی رسول اللہ ﷺ کا مناظرہ ہوا۔ آپ نے فرمایا: ''مسیح فنا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ ہی ''حی'' یعنی ہمیشہ زندہ ہے اور رہے گا۔'' آپ نے یہ اور دوسرے دلائل پیش کیے جس پر وہ خاموش ہو گئے، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ بقیہ تفصیل کے لیے دیکھیے آیت مباہلہ ''۶۱''۔ (معالم، ابن کثیر)

آیت 1 الٓمّٓ ۔ حروف مقطعات کی تشریح سورۂ بقرہ کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔

آیت 2 ❶ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: یہ اس سورت کا دعویٰ ہے اور وفد نجران کو دعوت کی مناسبت سے اس کے اثبات پر زور دیا گیا ہے۔ ❷ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ : یہ اسمائے حسنیٰ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ حیات اور قیومیت اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ میں سے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اسے موت اور فنا نہیں۔ '' الْقَيُّوْمُ '' کا مطلب ہے ساری کائنات قائم رکھنے والا، محافظ اور نگران، ساری کائنات اس کی محتاج وہ کسی کا محتاج نہیں۔ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ یا اللہ کا بیٹا یا تین میں سے ایک مانتے تھے۔ گویا ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی مخلوق ہیں، وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی پیدائش کا زمانہ بھی کائنات کے پیدا ہونے سے بہت بعد کا ہے، پھر ان پر موت بھی آئے گی اور عیسائیوں کے بقول تو ان پر موت آ چکی، تو جب نہ ان کی حیات ہمیشہ، نہ انھیں قیومیت حاصل تو وہ اللہ یا اللہ کا بیٹا کیسے بن گئے؟

آیت 3 ❶ یہاں ''الْكِتٰبَ'' سے مراد قرآن مجید ہے، گویا کتاب کامل یہی ہے۔ الف لام عہد کا ہونے کی مناسبت سے

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي
السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

اس سے پہلے، لوگوں کی ہدایت کے لیے۔ اور اس نے (حق و باطل میں) فرق کرنے والی (کتاب) اتاری، بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور اللہ سب پر غالب، بدلہ لینے والا ہے ④ بے شک اللہ وہ ہے جس پر کوئی چیز نہ زمین میں چھپی رہتی ہے اور نہ آسمان میں ⑤ وہی ہے جو رحموں میں تمھاری صورت بناتا ہے، جس طرح چاہتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ⑥

''یہ کتاب'' ترجمہ کیا ہے۔ ''نَزَّلَ'' کا معنی آہستہ آہستہ اتارنا ہے۔ دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس قرآن تئیس (۲۳) برس میں مکمل نازل ہوا۔ اس کی حکمتوں کے لیے دیکھیے سورۂ فرقان (۳۲)۔ ''بِالْحَقِّ'' سے اس کا سچا اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونا مراد ہے۔

② مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: اس کے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو خبریں اور بشارتیں مذکور ہیں اس میں بھی وہی خبریں اور بشارتیں ہیں، اگر یہ اللہ کی طرف سے نہ ہوتیں تو ان میں بہت اختلاف ہوتا۔ ایک خبر یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجے گا اور بشارت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان پر قرآن نازل فرمائے گا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ صف (۶) تو جب تم ان کتابوں کو مانتے ہو جن کی تصدیق ہو رہی ہے تو تصدیق کرنے والی کتاب کو بھی مانو۔ (ابن کثیر، رازی)

③ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: تورات سے مراد وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور انجیل سے مراد وہ کتاب ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ اس وقت یہ دونوں کتابیں اصل شکل میں موجود نہیں ہیں۔ تورات بائبل کے عہد قدیم کی پہلی پانچ کتابوں کا نام ہے اور انجیل بائبل کے عہد جدید کی پہلی چار کتابوں میں متفرق طور پر درج ہے۔ یہود و نصاریٰ نے انھیں بڑی حد تک بدل ڈالا ہے اور ان میں اپنی طرف سے تشریحات ملا کر خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ کتابیں پہلے زمانے میں لوگوں کے لیے ہدایت کا کام کرتی تھیں، مگر جب ان کے اندر باطل شامل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے صحیح اور غلط میں فرق کرنے والی کتاب قرآن مجید اتاری اور اسی لحاظ سے اس کا نام ''الْفُرْقَانَ'' رکھا۔ اب اسے سچا مانے بغیر ہدایت حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ اس میں نازل شدہ آیات کا انکار کرنے والوں کے لیے بہت سخت عذاب ہے اور اللہ پر یہ کچھ مشکل نہیں، وہ سب پر غالب بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی ہے۔

آیت 5، 6 ① یہ دونوں آیات اللہ تعالیٰ کے ﴿عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ﴾ ہونے کے لیے بھی دلیل ہیں اور سورت کے دعویٰ

هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ؕۚ

وہی ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری، جس میں سے کچھ آیات محکم ہیں، وہی کتاب کی اصل ہیں اور کچھ دوسری کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، پھر جن لوگوں کے دلوں میں تو کجی ہے وہ اس میں سے ان کی پیروی کرتے ہیں جو کئی معنوں میں ملتی جلتی ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور ان کی اصل مراد کی تلاش کے لیے، حالانکہ ان کی اصل مراد نہیں جانتا

﴿اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ کے لیے بھی۔ یہاں پہلے بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کی ہر بڑی اور چھوٹی، ظاہر اور پوشیدہ چیز کا علم ہے، حالانکہ وہ عرش معلیٰ پر ہے اور پھر اس طرف اشارہ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ایک بندے ہیں۔ جس طرح دوسرے انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ میں پیدا کیا اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو ماں کے پیٹ میں جیسے چاہا پیدا کیا، پھر وہ خدا یا خدا کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، جیسا کہ نصرانیوں کا غلط عقیدہ ہے۔

❷ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ : یعنی مذکر و مؤنث، سرخ یا سیاہ، کامل یا ناقص اور خوش قسمت یا بدقسمت، حتیٰ کہ عمر اور رزق بھی اسی وقت لکھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ متعدد احادیث میں مذکور ہے۔ [دیکھیے بخاری، بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ : ۳۲۰۸] آخر میں پھر وہی دعویٰ ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' والا دہرا دیا اور اس کی مزید دلیلیں بھی دیں کہ کائنات کا یہ سارا سلسلہ اس اکیلے کے غلبہ و قوت اور حکمت و دانائی کے ساتھ چل رہا ہے، اس کے سوا کسی میں یہ صفات نہیں، سو عبادت بھی صرف اسی کا حق ہے، وہ نہ مسیح کا حق ہے، نہ ان کی والدہ کا اور نہ کسی اور کا۔

آیت 7 ❶ ایک جگہ قرآن مجید کی تمام آیات کو محکم کہا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ [ہود : ۱] ''الٓرٰ، ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں۔'' اور دوسری جگہ تمام آیات کو متشابہ، چنانچہ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ [الزمر : ۲۳] ''اللہ نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے۔'' اور یہاں بعض آیات کو متشابہ قرار دیا ہے، بعض کو محکم، مگر اس میں کوئی تعارض نہیں۔ تمام آیات کے محکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پورے قرآن میں کوئی کمی یا خرابی نہیں، نہایت مضبوط اور محکم ہے اور متشابہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام آیات فصاحت و بلاغت اور مضامین و معانی میں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ اس جگہ جو فرمایا کہ بعض محکم ہیں اور بعض متشابہ، تو محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح اور صریح ہے، ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش نہیں ان کو ''اُمُّ الْكِتٰبِ'' قرار دیا ہے، یعنی اصل اور بنیاد۔ انھی آیات میں لوگوں کو دین کی طرف دعوت دی گئی ہے اور انھی میں دین کے بنیادی عقائد، عبادات اور احکام بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں مذکور نصیحتیں اور عبرتیں بھی ان میں شامل ہیں، انسانی گمراہیوں کی نشاندہی بھی ان آیات میں کی گئی ہے۔ جبکہ متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جو ملتے جلتے کئی معانی کا احتمال رکھتی ہیں، اس لیے ان کا اصل مرادی معنی سمجھنے میں لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے، یا ان میں تاویل کی گنجائش نکل سکتی ہے، یا جن میں

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

مگر اللہ اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر جو عقلوں والے ہیں ۝

ایسے حقائق کا بیان ہے جن پر مجمل طور پر ایمان لانا تو ضروری ہے لیکن ان کی تفصیلات کو جاننا نہ انسان کے لیے ضروری ہے اور نہ عقلی استعداد کے ساتھ ممکن ہے۔ تفسیر وحیدی میں لکھا ہے: ''صفاتِ الٰہیہ کے منکرین تو اللہ تعالیٰ کے استواء (عرش پر ہونے کو) اور اس کے ید (ہاتھ) اور اس کے نزول (ہر رات آسمان دنیا پر اور قیامت کے دن زمین پر اترنے) کو متشابہات قرار دے کر ان کے معنی سمجھنے ہی کو ناممکن قرار دیتے ہیں، مگر اہل حدیث انھیں محکم مانتے ہیں، ان کے معانی کو واضح سمجھتے ہیں، البتہ کیفیت کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔''

2 اس آیت میں نصاریٰ کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ''كَلِمَتُهٗ'' اور ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' وغیرہ آیات سے عیسیٰ علیہ السلام کے الٰہ ہونے اور اللہ کا بیٹا ہونے پر تو استدلال کرتے ہیں مگر دوسری آیات: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾ [الزخرف : ٥٩] ''نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا'' اور ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ﴾ [آل عمران : ٥٩] ''بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے'' ان پر اور ان جیسی دیگر آیات پر دھیان نہیں دیتے۔ (ابن کثیر)

3 فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ: یعنی وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے اور جن کا مشغلہ ہی محض فتنہ جوئی ہوتا ہے، وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں اور چونکہ وہ کئی معانی کا احتمال رکھتی ہیں، اس لیے وہ ان سے وہ معنی نکالتے ہیں جو قرآن کی صریح اور محکم آیات کے خلاف ہوتے ہیں، فتنے کی تلاش کے لیے اور اپنے خیال میں اس کی اصل مراد تلاش کرنے کے لیے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو ''اُولُوا الْاَلْبَابِ'' تک پڑھا اور پھر فرمایا: ''جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے، سو تم ان سے بچو۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ منه آيات محكمات ﴾ : ٤٥٤٧]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔'' [أبو داوٗد، السنة، باب النهي عن الجدال : ٤٦٠٣، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ ، صحيح] پس ضروری ہے کہ قرآن کا جو حصہ محکم ہے اس پر عمل کیا جائے اور جو متشابہ ہے اس پر جوں کا توں ایمان رکھا جائے اور تفصیلات سے بحث نہ کی جائے۔ (فتح البیان، ابن کثیر)

4 وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ: اکثر ائمہ لفظ ''اللّٰهُ'' پر وقف کر کے ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ'' سے نیا کلام شروع سمجھتے ہیں، یعنی متشابہات کی اصل مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخ فی العلم لوگ کہتے ہیں کہ محکم و متشابہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں، ہم متشابہات کی اصل مراد نہ جانتے ہوئے بھی ان کے من عند اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۸

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۹ ع ۹

اے ہمارے رب! ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر، اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی بے حد عطا کرنے والا ہے ۸ اے ہمارے رب! بے شک تو سب لوگوں کو اس دن کے لیے جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ۹

اور کچھ ائمہ کا کہنا ہے: " وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ " کا لفظ " اللّٰهُ " پر عطف ہے، یعنی اہل زیغ متشابہ آیات کا پیچھا فتنے کی تلاش کے لیے اور ان سے فاسد معنی مراد لینے کے لیے کرتے ہیں اور ایسے معنی نکالتے ہیں جو قرآن وحدیث کی نصوص کے خلاف ہوتے ہیں، حالانکہ ان کا اصل معنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے، یا پختہ علم والے جو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے، اس لیے ان کا ایسا معنی مراد ہو ہی نہیں سکتا جو دوسری آیات واحادیث کے خلاف ہو۔

❺ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ: اَلْاَلْبَابِ " لُبٌّ " کی جمع ہے، جس کا معنی خالص عقل ہے۔ (راغب) جس عقل میں خواہش پرستی، بدعت یا شرک کی آمیزش ہو وہ " لُبٌّ " نہیں کہلاتی۔ مقصد یہ ہے کہ متشابہ کے اصل معنی تک رسائی کی توفیق اہل علم کو بھی ہوتی ہے مگر صرف ان اہل علم کو جن کی عقل ہر قسم کی خواہش پرستی، بدعت اور شرک سے پاک ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا فرمائی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ)) "اے اللہ! اسے دین میں سمجھ عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما۔" [مستدرك حاكم : ۵۳۴/۳، ح : ۶۲۸۰۔ مسند أحمد : ۲۶۶/۱، ح: ۲۴۰۱، صحيح] معلوم ہوا تاویل کا علم راسخ فی العلم لوگوں کو بھی ہوتا ہے۔

❻ تفسیر احسن البیان میں ہے، تاویل کے ایک معنی تو ہیں کسی چیز کی اصل حقیقت، اس معنی کے لحاظ سے " اِلَّا اللّٰهُ " پر وقف ضروری ہے، کیونکہ ہر چیز کی اصل حقیقت واضح طور پر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ تاویل کے دوسرے معنی ہیں، کسی چیز کی تفسیر اور بیان وتوضیح، اس اعتبار سے " اِلَّا اللّٰهُ " پر وقف کے بجائے " وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ " پر بھی وقف کیا جا سکتا ہے، کیونکہ مضبوط علم والے بھی صحیح تفسیر وتوضیح کا علم رکھتے ہیں۔ تاویل کے یہ دونوں معنی قرآن کریم کے استعمال سے ثابت ہیں۔ (ملخص از ابن کثیر)

آیت 9، 8 یہ وہ دعا ہے جو راسخ فی العلم حضرات اللہ تعالیٰ کے حضور کرتے رہتے ہیں، ہدایت پر ثابت قدمی کی دعا کے ساتھ قیامت کے دن اللہ کے سامنے پیش ہونے کا یقین بھی ہر وقت ان کے پیش نگاہ رہتا ہے، ان کی اصل کوشش اور دعا دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے ہوتی ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے: ((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ! ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ)) "اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" [ترمذی، الدعوات،

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ
وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ
بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾ قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ
جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿١٣﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد انھیں اللہ (کی پکڑ) سے ہرگز کچھ کام نہ آئیں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہیں ﴿١٠﴾ (ان کا حال) فرعون کی قوم اور ان لوگوں کے حال کی طرح ہے جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿١١﴾ ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا کہ تم جلد ہی مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿١٢﴾ یقیناً تمھارے لیے ان دو جماعتوں میں عظیم نشانی تھی جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں، ایک جماعت اللہ کے راستے میں لڑتی تھی اور دوسری کافر تھی، یہ ان کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی مدد کے ساتھ قوت بخشتا ہے، بلاشبہ اس میں آنکھوں والوں کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے ﴿١٣﴾

باب دعاء یا مقلب القلوب ! ...... : ٣٥٢٢، وصححه الألبانی]

آیت 11،10 ''كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ'' اس کی ترکیب کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (٥٢، ٥٤) یعنی جس طرح کا عذاب قوم فرعون اور پہلی امتوں کو رسولوں کو جھٹلانے کی وجہ سے دیا گیا، اسی طرح کا عذاب ان اموال و اولاد والے کفار کو دیا جائے گا۔ یہاں ان کفار سے مراد وفد نجران، یہود، مشرکین عرب اور دوسرے تمام کفار بھی ہو سکتے ہیں۔ (شوکانی)

آیت 12 قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ...... : یہاں کافروں سے مراد یہودی ہیں، اس آیت کے نزول کے بعد بنو قریظہ کے قتل، بنو نضیر کے جلاوطن اور خیبر کے فتح ہو جانے سے قرآن کی یہ پیشین گوئی بحمد اللہ حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ (شوکانی)

آیت 13 ❶ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ...... : یعنی اوپر جو پیشین گوئی (یہودی) کافروں کے مغلوب اور جہنم واصل ہونے کی ذکر ہوئی ہے اس کے سچ ہونے کے لیے معرکۂ بدر میں بہت بڑی آیت (دلیل) موجود تھی۔

❷ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمان کفار کو اپنے سے صرف دو گنا دیکھ رہے تھے، حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، تاکہ مسلمان ثابت قدم رہیں، چنانچہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ دوسرا یہ کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دو گنا دیکھ رہے تھے، حالانکہ ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی اور مسلمان کل ٣١٣ تھے، مگر مسلمان دو گنا اس لیے نظر آتے تھے کہ

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

لوگوں کے لیے نفسانی خواہشوں کی محبت مزین کی گئی ہے، جو عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں۔ یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے ﴿۱۴﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت کے لیے فرشتے بھیج دیے تھے اور اللہ اپنی نصرت کے ساتھ جسے چاہے قوت بخشتا ہے۔ اکثر مفسرین نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور بعض نے دوسرے کو۔ (ابن کثیر، شوکانی) واضح رہے کہ دوگنا دکھلانا لڑائی سے پہلے تھا ورنہ لڑائی کے وقت تو ہر گروہ دوسروں کو اپنے سے کم خیال کر رہا تھا۔ دیکھیے سورۂ انفال (۴۳، ۴۴)۔

آیت 14 ① ''الشَّهَوٰتِ'' یہ '' شَهْوَةٌ '' کی جمع ہے جس کا معنی ہے ''کسی مرغوب چیز کی طرف نفس کا کھنچ جانا'' یہاں '' الشَّهَوٰتِ'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو طبیعت کو مرغوب ہیں، یعنی مصدر بمعنی اسم مفعول '' مُشْتَهَيَاتٌ '' ہے اور '' مِنَ النِّسَآءِ'' میں ''مِنْ'' بیانیہ ہے، یعنی وہ چیزیں یہ ہیں۔ '' الْقَنَاطِيْرِ '' کا واحد '' قِنْطَارٌ '' ہے، اس کی مقدار میں مختلف اقوال ہیں، مگر سب کا حاصل یہ ہے کہ مال کثیر کو '' قِنْطَارٌ'' کہا جاتا ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی) ہماری زبان میں اس کا ترجمہ ''خزانے'' ہوسکتا ہے۔ ''مَتَاعُ'' اس سامان کو کہا جاتا ہے جس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔ حاصل یہ کہ انسان ان چیزوں کی محبت میں پھنس کر اللہ اور اس کے دین سے غافل ہو جائے اور انھیں تفاخر و زینت کا ذریعہ سمجھے اور غرور و تکبر پر اتر آئے تو یہ تمام چیزیں مذموم ہیں، ورنہ اگر ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت خیال کرتے ہوئے ذریعۂ آخرت بنایا جائے اور شریعت کی حدود میں رہ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو یہ مذموم و مبغوض نہیں بلکہ نہایت مرغوب و محمود ہیں۔ اصل چیز نیت اور عمل ہے، اس لیے حدیث میں ایک طرف تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد یہ ہے: ''میرے بعد مردوں کے لیے کوئی فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نقصان دہ نہیں۔'' [بخاری، النکاح، باب ما يتقى من شؤم المرأة ...... : ۵۰۹۶، عن أسامة رضی اللہ عنہ] اور دوسری طرف آپ ﷺ نے یہ فرمایا: ''دنیا متاع (فائدہ اٹھانے کا سامان) ہے اور اس کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔'' [مسلم، النكاح، باب خير متاع الدنيا ...... ۱۴۶۹، عن ابن عمرو رضی اللہ عنہما] اور یہ بھی فرمایا: ''دنیا میں سے عورت اور خوشبو میرے لیے پسندیدہ بنا دی گئی ہیں۔'' [نسائی، عشرة النساء، باب حب النساء : ۳۳۹۱، عن أنس رضی اللہ عنہ قال الألبانی حسن صحیح] آیت کے آخر میں ان کو دنیاوی زندگی کا سامان قرار دے کر دنیاوی زندگی سے بے رغبتی اور آخرت میں رغبت پر زور دیا ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

② '' الْخَيْلِ '' یہ اسم جمع ہے، '' خُيَلَاءُ '' سے مشتق ہے، جس کا معنی تکبر ہے۔ گھوڑے کی چال میں ایک طرح کا تکبر پایا جاتا ہے۔ '' الْمُسَوَّمَةِ '' یہ '' سِيْمَا '' یا '' سِيْمِيَاءُ '' سے مشتق ہو تو نشان لگائے ہوئے اور '' سَوْمٌ '' سے مشتق ہو تو چرنے کے لیے چھوڑے ہوئے گھوڑے۔ '' الْاَنْعَامِ '' یہ '' نَعَمٌ '' کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بکریاں وغیرہ اور اکثر اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ
وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

کہہ دے کیا میں تمھیں اس سے بہتر چیز بتاؤں، جو لوگ متقی بنے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور نہایت پاک صاف بیویاں اور اللہ کی جانب سے عظیم خوشنودی ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۵﴾ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! بے شک ہم ایمان لے آئے، سو ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ﴿۱۶﴾ جو صبر کرنے والے اور سچ کہنے والے اور حکم ماننے والے اور خرچ کرنے والے اور رات کی آخری گھڑیوں میں بخشش مانگنے والے ہیں ﴿۱۷﴾

آیت 15 دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵) کی تفسیر۔ اس آیت میں مذکور لفظ "رِضْوَانٌ" "رَضِیَ یَرْضٰی (س)" ناقص واوی سے مصدر ہے، اس کا مصدر "رِضًا" بھی آتا ہے، مگر "رِضْوَانٌ" میں حروف زیادہ ہونے اور تنوین برائے تعظیم ہونے کی وجہ سے ترجمہ "عظیم خوشنودی" کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت جنت کی تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے، اللہ نے فرمایا: ﴿ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبة : ۷۲] "اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے۔"

آیت 16 ① اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کے متقی بندے، جنھیں آخرت میں مذکورہ نعمتیں حاصل ہوں گی، وہ ہیں جو یہ دعا کرتے ہیں اور جن میں وہ صفات پائی جاتی ہیں جن کا اگلی آیت میں ذکر آ رہا ہے۔

② اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا: اس دعا میں اپنے ایمان لانے کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی گئی ہے، اس سے دعا کے لیے عمل کا وسیلہ پیش کرنا ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ میں ہے۔

آیت 17 ① "اَلصّٰبِرِيْنَ" نیکی کرنے پر، گناہ سے بچنے پر، مصیبتیں آنے پر صبر کرنے والے۔ صبر کی یہ تین قسمیں ہیں۔ "وَالصّٰدِقِيْنَ" نیت، قول اور فعل میں سچے، حکم ماننے والے، اپنا مال و جان، اپنی اولاد اور اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت خرچ کرنے والے اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود سحریوں (رات کی آخری گھڑیوں) میں اپنی عبادت پر مغرور ہونے کی بجائے اپنی کوتاہیوں کے لیے استغفار کرنے والے۔

② اس آیت سے خاص طور پر سحر (پچھلی رات) کے وقت استغفار کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھیے ذاریات : ۱۵ تا ۱۸) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا، آپس میں ضد کی وجہ سے اور جو اللہ کی آیات کا انکار کرے تو بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۹﴾

ہے، فرماتا ہے: ''کون ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے تو میں اسے بخشوں؟'' [بخاري، التهجد، باب الدعاء …… : ۱۱۴۵، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

آیت 18 ❶ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر دین اسلام ہے، جیسا کہ آئندہ آیت میں آ رہا ہے اور اسلام کی بنیاد توحید الٰہی پر ہے۔ اس حقیقت سے وفد نجران اور تمام دنیا کو آگاہ کیا جا رہا ہے۔ ''شَهِدَ'' کا معنی ''بَيَّنَ وَ اَعْلَمَ'' یعنی بیان کیا اور آگاہ کیا ہے۔ (فتح القدیر) شاہد وہ ہے جو اپنے یقینی علم کے ساتھ آگاہ کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق اور ساری کائنات میں موجود بے شمار دلائل اور نشانیوں کے ساتھ اور اپنے رسولوں کے ذریعے سے پیغام بھیج کر شہادت دی اور آگاہ کیا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس حال میں کہ وہ اپنی مخلوق کے تمام معاملات و احوال میں عدل پر قائم ہے اور اس سے بڑھ کر کس کی شہادت ہو سکتی ہے اور اس کے پاک فرشتوں اور اہل علم نے بھی یہ شہادت دی ہے۔ آیت کے آخر میں پھر وہی دعویٰ ''لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' دہرایا اور اس کی دو مزید دلیلیں پیش فرمائیں کہ وہ سب پر غالب اور کمال حکمت والا ہے، کوئی اس پر غالب نہیں اور کمال حکمت والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ کوئی ہے تو لاؤ پیش کرو۔

❷ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ : یہ لفظ ''اللّٰهُ'' سے حال ہے۔

آیت 19 ❶ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ کے احکام کے تابع کر دینا، جو اس کے رسول مختلف اوقات میں لے کر آتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کے آخر میں خاتم الانبیاء کو مبعوث فرمایا اور محمد ﷺ کے راستے کے سوا اپنے تک پہنچنے والے تمام راستوں کو بند کر دیا۔ اب اگر آپ ﷺ کی شریعت کے سوا کوئی اور دین لے کر اللہ کے پاس جائے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ﴾ [آل عمران : ۸۵] ''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔''

اب جو شخص رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا قائل نہیں اور نہ آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اپنا عمل اور عقیدہ ہی درست کرتا ہے تو اس کا دین اللہ کے ہاں معتبر نہیں، خواہ وہ توحید کا قائل اور دوسرے ایمانیات کا اقرار کرتا ہو۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع ۱۰/۲

پھر اگر وہ تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے میں نے اپنا چہرہ اللہ کے تابع کر دیا اور اس نے بھی جس نے میری پیروی کی، اور ان لوگوں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دے کیا تم تابع ہو گئے؟ پس اگر وہ تابع ہو جائیں تو بے شک ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو تیرے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾

② وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ......: یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء بھیجے ان سب کا دین یہی اسلام تھا۔ اہل کتاب نے یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ دین حق اسلام ہی ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول اور آخری نبی ہیں، محض باہمی بغض و عناد کی بنا پر اسلام سے انحراف کیا ہے۔ آج بھی ان کے لیے صحیح روش یہی ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں اور دین اسلام کو اختیار کریں۔

③ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد محاسبہ ہونے والا ہے اور آیاتِ الٰہی سے کفر کی سزا مل کر رہے گی۔

آیت 20 ① فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ: اسلام کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کا صدق ثابت ہو جانے کے باوجود بھی اگر اہل کتاب کفر و عناد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ میں نے تو اپنا ظاہر و باطن اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور یہی حال میرا اتباع کرنے والے مسلمانوں کا بھی ہے اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ اور اُمی لوگوں، یعنی مشرکین عرب، سب سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو صراط مستقیم پر گامزن ہو جاؤ گے اور اگر روگردانی کرو گے تو میرا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب تو تمھیں اللہ ہی کو دینا ہو گا۔

② اس آیت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے عرب و عجم کے تمام ملوک و امراء کو دعوتی خطوط لکھے اور اپنی عمومی رسالت کا اعلان کیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اس امت میں سے اگر کوئی بھی یہودی ہو یا نصرانی، وہ میرے بارے میں سنے اور اس پر ایمان نہ لائے جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تو وہ اصحاب النار میں سے ہو گا۔'' [مسلم، الإیمان، باب وجوب الإیمان برسالة ...... : ۱۵۳] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے سرخ و سیاہ (یعنی عرب و عجم) کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' [مسند أحمد : ۱۴۵/۵، ح : ۲۱۳۵۷، عن أبی ذر رضی اللہ عنہ]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نبی کو خاص اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' [بخاری، التیمم، باب : ۳۳۵] آپ ﷺ کے قیامت تک اور تمام لوگوں کی طرف رسول ہونے پر کتاب و سنت میں بکثرت دلائل موجود ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۸) اور سبا (۲۸) حتیٰ کہ جنوں کی طرف بھی۔ دیکھیے احقاف (۳۱)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ
اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا
لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرتے ہیں اور لوگوں میں سے جو انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں انھیں قتل کرتے ہیں، سو انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دے ﴿۲۱﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوگئے اور ان کی مدد کرنے والے کوئی نہیں ﴿۲۲﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب میں سے ایک حصہ دیا گیا، انھیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے، اس حال میں کہ وہ منہ موڑنے والے ہوتے ہیں ﴿۲۳﴾ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے کہا ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی، مگر چند گنے ہوئے دن اور انھیں ان کے دین میں ان باتوں نے دھوکا دیا جو وہ گھڑا کرتے تھے ﴿۲۴﴾

آیت 22،21 اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ …… : اس میں اہل کتاب کی مذمت ہے، جن کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے نہ صرف احکام الٰہی پر عمل کرنے سے انکار کیا بلکہ انبیاء اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے جنھوں نے کبھی ان کے سامنے دعوت حق پیش کی اور یہ تکبر کی آخری حد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کے دل میں ذرہ برابر کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔'' ایک آدمی نے عرض کیا: ''ایک آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا خوبصورت ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔'' [مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ۹۱، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ]

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جسے کسی نبی نے قتل کیا، یا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو۔'' [مسند أحمد : ۱/ ۴۰۷، ح : ۳۸۶۷، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ـ الصحيحة ۲۸۱]

آیت 23 اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا …… : اس آیت میں ''كِتٰبِ اللّٰهِ'' سے مراد تورات اور انجیل ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب انھیں خود ان کی کتابوں کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ چلو انھی کو حکم مان لو اور بتاؤ کہ ان میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے یا نہیں تو یہ اس سے بھی پہلو تہی کر جاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں جیسے انھیں کسی چیز کا علم ہی نہیں۔

آیت 24 ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ …… : یعنی جس چیز نے انھیں حق سے کھلم کھلا انحراف اور بڑے سے

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ
وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾

پھر کیا حال ہو گا جب ہم انھیں اس دن کے لیے جمع کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر جان کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿٢٥﴾ کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿٢٦﴾

بڑے گناہ کا بے شرمی سے ارتکاب کر لینے پر دلیر و جری بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور سزا کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ ان کے آباء و اجداد انھیں طرح طرح کی خام خیالیوں اور جھوٹی تمناؤں میں مبتلا کر گئے ہیں، کبھی وہ اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں (مائدہ: ۱۸) کبھی کہتے ہیں کہ جنت بنی ہی ہمارے لیے ہے (بقرہ: ۱۱۱) اور کبھی کہتے ہیں کہ اگر ہمیں تھوڑی بہت سزا ہوئی بھی تو چند دن سے زیادہ نہیں ہو گی، ہمارے بزرگوں کا، جن کے ہم نام لیوا ہیں اور جن کا ہم دامن پکڑے ہوئے ہیں ان کا اللہ پر اتنا زور ہے کہ وہ چاہے بھی تو ہمیں سزا نہیں دے سکے گا۔ (مزید دیکھیے بقرہ: ۷۸ تا ۸۰) اور نصاریٰ نے تو مسئلۂ کفارہ گھڑ کے گناہوں پر سزا کا سارا معاملہ ہی ختم کر دیا ہے۔ یعنی مسیح علیہ السلام اپنی امت کے گناہوں کی پاداش میں صلیب پر چڑھ گئے جس سے امت کے تمام گناہ معاف ہو گئے۔ اب اتنا ہی کافی ہے کہ عیسائی ہو جاؤ پھر جو مرضی کرتے رہو، مسیح علیہ السلام سب گناہوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔

یہی حال اب بہت سے مسلمانوں کا ہو گیا، کوئی شیخ جیلانی کو زبردستی موت کے فرشتے سے روحیں چھین لینے والا بنا بیٹھا ہے اور کوئی حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کو اپنے نام لیواؤں کے گناہوں کا کفارہ سمجھ بیٹھا ہے۔ [فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى]

آیت 25 یعنی انھیں جان لینا چاہیے کہ قیامت کے روز جب ہمارے حضور جمع ہوں گے تو ان کا بہت برا حال ہو گا، ان کے یہ من گھڑت عقیدے ان کے کسی کام نہیں آ سکیں گے اور نہ انھیں اپنے بزرگوں سے جھوٹی محبت اور دامن گیری اللہ کے عذاب سے بچا سکے گی۔ کوئی نبی یا ولی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر سفارش بھی نہیں کر سکے گا۔ (ترجمان)

آیت 25 ❶ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ: سیبویہ اور خلیل نے کہا "اَللّٰهُمَّ" اصل میں "يَا اَللّٰهُ" تھا، شروع سے "یا" کو حذف کیا تو آخر میں میم مشدد لگا دی۔ "مٰلِكَ الْمُلْكِ" سے پہلے بھی "یا" پوشیدہ ہے، اس لیے لفظ "مٰلِكَ" منصوب ہے۔ (شوکانی) گویا اس دعا میں اللہ کے ذاتی اور صفاتی دونوں ناموں سے دعا کرنا سکھایا گیا ہے۔

❷ یہودی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حکم و نبوت کا یہ سلسلہ ہمیشہ ان میں رہے گا، دوسری قوم اس کا حق نہیں رکھتی، مگر جب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی قوم بنی اسماعیل سے مبعوث ہو گئے تو ان کے غیظ و غضب اور حسد کی انتہا نہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ان

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور تو مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور تو جسے چاہے کسی حساب کے بغیر رزق دیتا ہے ﴿۲۷﴾ ایمان والے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچو، کسی طرح بچنا اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸﴾

کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی والا اور ساری بادشاہی کا مالک ہے۔ وہ جس قوم کو چاہتا ہے دنیا میں عزت و سلطنت سے نواز دیتا ہے۔ لہٰذا نبوت جو بہت بڑی عزت ہے، اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے جسے چاہا پسند فرما لیا۔ اللہ تعالیٰ پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔ یہاں دعا کے انداز میں مسلمانوں کو بشارت بھی دے دی کہ تمھیں اس دنیا میں غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا اور خاتم النبیین ﷺ کی بعثت اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، لہٰذا تمھیں چاہیے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ۔

③ "اَلْخَيْرُ" میں الف لام استغراق کا ہے اور "بِيَدِكَ" خبر پہلے آنے سے تخصیص پیدا ہو گئی ہے، اس لیے ترجمہ "تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے" کیا گیا ہے۔

آیت 27 ① تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ : اس سے موسموں کے اعتبار سے رات اور دن کے بڑھنے اور گھٹنے کی طرف اشارہ ہے، ایک ہی وقت کبھی رات کا حصہ بن جاتا ہے اور کبھی دن کا۔ اس طرح رات دن میں داخل ہو جاتی ہے اور دن رات میں۔

② وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ...... : مردہ سے زندہ، یعنی کافر سے مسلمان، جیسے آزر سے ابراہیم علیہ السلام، نطفہ سے حیوان، انڈے سے پرندہ اور زندہ سے مردہ جیسے نوح علیہ السلام سے کنعان اور حیوان اور پرندے سے نطفہ اور انڈا۔

③ طبرانی کی ایک روایت میں اس آیت کے اندر اسم اعظم ہونے کا ذکر ہے۔ "هداية المستنير" میں اس روایت کو ایک راوی محمد بن زکریا غلابی کی وجہ سے موضوع کہا گیا ہے اور "الضعيفه (۲۷۷۲)" سے "ضَعِيْفٌ جِدًّا" کا حکم نقل کیا گیا ہے۔

آیت 28 ① لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ...... : جب اکیلا اللہ تعالیٰ ہی بادشاہی کا مالک، عزت و ذلت دینے والا اور ہر خیر والا ہے تو ایمان والوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اس کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی رکھیں، کسی فائدے کی امید پر اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ رکھیں اور جو شخص ایسا کرے گا اس کے لیے اللہ کی دوستی میں سے ذرہ برابر حصہ بھی نہیں ہوگا۔ ہاں، ان کے شر سے کسی طرح بچنے کے لیے ظاہری طور پر دوستی کا اظہار جائز ہے، جب کہ دل میں ان کے کفر

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّ مَا عَمِلَتْ
مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع
قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

کہہ دے اگر تم اسے چھپاؤ جو تمھارے سینوں میں ہے، یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جان لے گا اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۹﴾ جس دن ہر شخص حاضر کیا ہوا پائے گا جو اس نے نیکی میں سے کیا اور وہ بھی جو اس نے برائی میں سے کیا، چاہے گا کاش! اس کے درمیان اور اس کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں سے بے حد نرمی کرنے والا ہے ﴿۳۰﴾ کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۱﴾

کی وجہ سے نفرت ہو۔ اسی طرح جو کافر مسلمانوں کے خلاف نہ لڑتے ہوں اور نہ کسی لڑنے والے کی مدد کرتے ہوں تو ان سے حسن سلوک اور مدارات جائز ہے۔ دیکھیے سورۂ ممتحنہ (۸، ۹)۔

② اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً: لفظ "تُقٰىةً" "وَقٰى يَقِيْ" سے مصدر ہے، تنوین کی وجہ سے "کسی طرح بچنا" ترجمہ کیا ہے۔ "تقیہ" بھی اس کا ہم معنی ہے۔ طبری اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مومنوں کو منع کیا ہے کہ وہ کافروں سے دلی دوستی رکھیں، الا یہ کہ کافر ان پر غالب ہوں تو ان کے لیے نرمی کا اظہار کریں، مگر دین میں ان کی مخالفت کریں۔ مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۵۱، ۵۶) اور تقیہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نحل (۱۰۶)۔

ان آیات سے کسی مسلمان کے لیے مسلمانوں کے ملک کو چھوڑ کر کفار کے ملک میں رہنے کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ وہاں مسلمان کے لیے کفار سے دوستی کے عملی ثبوت کے بغیر رہنا اور اپنے اور اہل و عیال کے دین کو بچانا مشکل ہے، اس لیے اگر کوئی مسلمان کہیں مغلوب ہے تو اسے جان بچانے کے لیے دوستی کا اظہار تو جائز ہے، مگر وہاں سے ہجرت کرکے مسلمانوں کے علاقے میں آنا لازم ہے۔ ہاں، بے بس ہو تو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ یہ اور اس مفہوم کی دوسری آیات مسلم حکومتوں کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کرتی ہیں اور انفرادی معاملات میں مدارات کی بھی، جیسا کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ہم بعض لوگوں کے سامنے مسکراتے ہیں، جب کہ ہمارے دل ان پر لعنت کر رہے ہوتے ہیں۔" [بخاری، الأدب، باب المداراۃ مع الناس ......، قبل ح : ۶۱۳۱]

آیت 31 قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ......: یہود و نصاریٰ اور مشرکین سبھی اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ رکھتے تھے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو اب اس دعویٰ کے

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ دے اللہ اور رسول کا حکم مانو، پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو بے شک اللہ کافروں سے محبت نہیں رکھتا ﴿۳۲﴾ بے شک اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم کے گھرانے اور عمران کے گھرانے کو جہانوں پر چن لیا ﴿۳۳﴾

سچا ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ مجھے نبی مان کر میری پیروی اختیار کرو، اس سے نہ صرف تمھاری اللہ سے محبت قبول ہو گی بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے اور وہ تمھارے گناہ بھی بخش دے گا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جو کوئی کسی کی محبت کا دعویٰ کرے تو اس طرح محبت کرے جس طرح محبوب چاہے، نہ کہ جس طرح اپنا جی چاہے اور اسی طرح چاہے تو محبوب اس کو چاہے۔'' (موضح) اس خطاب کا تعلق مسلمانوں سے بھی ہے کہ اگر تم کو اللہ کی محبت کا دعویٰ ہے تو اس کے لیے زبانی اظہار محبت کافی نہیں ہے، بلکہ اپنے تمام اقوال و افعال میں میری پیروی اختیار کرو۔ اپنے پاس سے گھڑے ہوئے طریقوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی، اسی لیے حدیث میں بدعت کی شدید مذمت آئی ہے۔

آیت 32 ① **قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ** : پچھلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کے اتباع کا حکم تھا جس کا معنی آپ کے نقش قدم پر چلنا، آپ کی پیروی کرنا ہے، اگرچہ اتباع میں حکم ماننا بھی آ جاتا ہے مگر اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا خاص طور پر الگ ذکر فرمایا، جس کا معنی حکم ماننا ہے۔ آگے فرمایا کہ اگر وہ منہ پھیر لیں تو اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔ یہاں بات صاف سمجھ میں آ رہی ہے کہ بات مختصر کر دی گئی ہے، جو اس طرح تھی کہ اگر وہ منہ پھیر لیں تو وہ کافر ہیں اور اللہ ایسے کافروں سے محبت نہیں کرتا۔ ''الْكٰفِرِيْنَ'' میں الف لام عہد کا ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''ایسے کافروں'' کیا گیا ہے۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ''الرَّسُوْلَ'' یعنی محمد ﷺ کی اطاعت کا مستقل حیثیت سے حکم دیا گیا ہے اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد ''الرَّسُوْلَ'' کی اطاعت سنت کی پیروی ہی سے ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی کی بنا پر کہہ دیتے ہیں کہ حدیث وہی حجت ہو گی جو قرآن کے مطابق ہو، حالانکہ قرآن نے متعدد مواقع پر حدیث کو مستقل دلیل اور شریعت کے مآخذ کی حیثیت دی ہے، لہٰذا قانون کا ماخذ قرآن و حدیث دونوں قرار پائیں گے۔ حدیث میں قرآن سے زائد حکم تو ہو سکتے ہیں مگر کوئی صحیح حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے، اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی عقل و فہم کا قصور ہے، یا اس کی نیت کا فتور۔ مزید دیکھیے سورۂ نجم (۴)۔

③ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے تکیے پر ٹیک لگائے ہوئے ہو اور اس کے پاس میرے حکم میں سے کوئی حکم آئے، ان چیزوں میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے، یا میں نے منع کیا تو وہ کہے، ہم نہیں جانتے، ہم اللہ کی کتاب میں جو پائیں گے اسی کی پیروی کریں گے۔'' [أبو داؤد، السنة، باب في لزوم السنة : ٤٦٠٥، عن أبي الدرداء رضي الله عنه]

آیت 33 **اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى** ...... : اوپر کی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و اطاعت کا حکم دیا ہے، اب اس آیت

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى ۚ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾

ایسی نسل جس کا بعض بعض سے ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿٣٤﴾ جب عمران کی بیوی نے کہا اے میرے رب! بے شک میں نے تیرے لیے اس کی نذر مانی ہے جو میرے پیٹ میں ہے کہ آزاد چھوڑا ہوا ہو گا، سو مجھ سے قبول فرما، بے شک تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿٣٥﴾ پھر جب اس نے اسے جنا تو کہا اے میرے رب! یہ تو میں نے لڑکی جنی ہے اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو اس نے جنا اور لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں، اور بے شک میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور بے شک میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ﴿٣٦﴾

میں آپ کی رسالت کے اثبات کے سلسلہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ کا تعلق بھی اس خاندان نبوت سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے (کیونکہ آپ آل ابراہیم سے ہیں)۔ (شوکانی) عمران نام کی دو شخصیتیں گزری ہیں، ایک موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد اور دوسرے مریم علیہا السلام کے والد۔ اکثر مفسرین نے یہاں دوسرے عمران مراد لیے ہیں، کیونکہ انھی کی آل (مریم و عیسیٰ علیہما السلام) کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے۔ (ابن کثیر، رازی) غالباً اس سورت کا نام بھی اسی قصہ کی بنا پر رکھا گیا ہے۔

آیت 34 ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ: گویا سب انبیا آدم علیہ السلام، پھر نوح علیہ السلام، پھر ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام اور پھر آل عمران سے تھے، لہٰذا وہ بھی انسان تھے، اللہ یا اللہ کے بیٹے نہیں تھے۔ یہاں سے اہل نجران اور دوسرے نصرانیوں کے عقیدے کے ابطال کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ شروع ہوتا ہے۔

آیت 35 تفاسیر میں عمران کی بیوی کا نام "حَنَّہ" مذکور ہے اور یہ کہ دمشق کے بیرونی حصے میں ان کی قبر ہے، مگر ان دونوں باتوں کی کوئی پختہ دلیل نہیں۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ بعض لڑکوں کو ماں باپ اپنے حق سے آزاد کر کے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیتے اور عبادت خانے کے سپرد کر دیتے۔ عمران کی بیوی حاملہ تھیں، انھوں نے بھی یہی نذر مانی۔ "مُحَرَّرًا" کے معنی ہیں کہ وہ صرف مسجد کی خدمت ہی کے لیے وقف رہے گا۔ (قرطبی)

آیت 36 ① وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى: بظاہر تو کہنا چاہیے تھا کہ لڑکی لڑکے جیسی نہیں، مگر الٹ فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ لڑکا جو عمران کی بیوی کے ذہن میں تھا، اس لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا جو انھیں عطا کی گئی۔ "الذَّكَرُ" اور "كَالْأُنْثٰى" میں الف لام عہد ذہنی کا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

تو اس کے رب نے اسے اچھی قبولیت کے ساتھ قبول کیا اور اچھی نشو ونما کے ساتھ اس کی پرورش کی اور اس کا کفیل زکریا کو بنا دیا۔ جب کبھی زکریا اس کے پاس عبادت خانے میں داخل ہوتا، اس کے پاس کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز پاتا، کہا اے مریم! یہ تیرے لیے کہاں سے ہے؟ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے کسی حساب کے بغیر رزق دیتا ہے ﴿۳۷﴾

وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ: اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش کے ساتھ ہی نام رکھا جا سکتا ہے، ساتویں دن کا انتظار ضروری نہیں، بلکہ ساتواں دن نام رکھنے کی آخری حد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات میرے گھر بچہ پیدا ہوا ہے اور میں نے اپنے باپ (ابراہیم علیہ السلام) کے نام پر اس کا نام رکھا ہے۔'' [مسلم، الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبیان ...... : ۲۳۱۵، عن أنس رضی اللہ عنہ]

وَاِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ: چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے چھوتا ہے، شیطان کے اسے چھونے کی وجہ سے وہ چیخ کر رونے لگتا ہے، مگر مریم اور اس کا بیٹا۔'' [بخاری، التفسیر، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ واذكر فی الكتاب مریم ...... ﴾ : ۳۴۳۱، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ]

آیت 37 ① وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا: عام قول کے مطابق زکریا علیہ السلام ان کے خالو تھے، مگر صحیح بات یہ ہے کہ وہ مریم علیہا السلام کے بہنوئی تھے۔ اس کی دلیل حدیث معراج ہے جس میں دوسرے آسمان پر رسول اللہ ﷺ کی یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام سے ملاقات کا ذکر ہے اور صراحت ہے کہ وہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ [بخاری، الأنبیاء، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ ذكر رحمة ربك...... ﴾ : ۳۴۳۰]

② الْمِحْرَابَ: اس سے مراد معروف محراب نہیں ہے جو مسجدوں میں امام کے لیے بنایا جاتا ہے، بلکہ اس کا معنی اس کمرہ کے ہیں جو تنہائی کے لیے بنایا جاتا ہے۔ (دیکھیے سبا: ۱۳) یہود و نصاریٰ عبادت خانے سے الگ کچھ بلندی پر یہ محراب بناتے تھے، جس میں مسجد کے عبادت گزار رہتے تھے۔

③ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا: اسلوب کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ رزق بطور کرامت مریم علیہا السلام کے پاس پہنچ رہا تھا۔ اکثر تابعین سے منقول ہے کہ زکریا علیہ السلام جب بھی مریم علیہا السلام کے حجرے میں جاتے تو ان کے ہاں بے موسم کے تازہ پھل پاتے۔ (ابن جریر، ابن کثیر) تابعین کا یہ فرمان آیت کے الفاظ کی تشریح ہو، جیسا کہ ظاہر ہے تو اس رزق کے بطور کرامت ملنے کی تائید ہے اور اگر اسرائیلی روایت سے ہو تو اسے سچا یا جھوٹا کہنے کی اجازت نہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اسباب کے بغیر رزق عطا ہونا کچھ بعید نہیں اور امت محمد ﷺ کے اولیاء و شہداء کو یہ کرامت اور عزت افزائی ملنا صحیح سند سے ثابت ہے۔

صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے خبیب رضی اللہ عنہ کی سولی کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، مکہ کے جس گھر میں انھیں قید رکھا گیا،

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾
فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا
بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿٣٩﴾

وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، کہا اے میرے رب! مجھے اپنے پاس سے ایک پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو ہی دعا کو بہت سننے والا ہے ﴿۳۸﴾ تو فرشتوں نے اسے آواز دی، جب کہ وہ عبادت خانے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ بے شک اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کے ایک کلمے (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا اور سردار اور اپنے آپ پر بہت ضبط رکھنے والا اور نبی ہوگا نیک لوگوں میں سے ﴿۳۹﴾ ۔

اس گھر والی بنت الحارث کا بیان ہے کہ اللہ کی قسم! میں نے خبیب سے بہتر قیدی کبھی نہیں دیکھا، اللہ کی قسم! میں نے ایک دن انھیں انگور کا گچھا کھاتے ہوئے دیکھا، جو ان کے ہاتھ میں تھا، جب کہ وہ لوہے کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے، حالانکہ مکہ میں کوئی پھل نہیں تھا۔ (بنت الحارث) کہتی تھیں کہ یقیناً وہ اللہ کی طرف سے رزق تھا جو اس نے خبیب کو دیا تھا۔ [بخاري، الجهاد والسير، باب هل يستأسر الرجل …… : ۳۰۴۵] مگر کرامت ولی کے اختیار میں نہیں ہوتی کہ وہ جو چاہے کرے، ورنہ خبیب زنجیریں توڑ کر آزاد ہو جاتے، حتیٰ کہ نبی بھی اپنی مرضی سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے، فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ [إبراهيم : ۱۱]

آیت 38 هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ …… : زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو چکے تھے اور ابھی تک بے اولاد تھے، بیوی بانجھ تھی، بظاہر انھیں اولاد کی کوئی امید نہ تھی، لیکن یہ دیکھ کر کہ کس طرح مریم علیہا السلام کو خرق عادت کے طور پر بے موسم کا رزق پہنچ رہا ہے، ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ بے موسم کا رزق پہنچانے والا مایوسی کے عالم میں اولاد بھی عطا فرما سکتا ہے، چنانچہ اسی جگہ اور اسی وقت اللہ تعالیٰ کے حضور نیک اولاد کی دعا کی۔ بعض علماء نے مریم علیہا السلام کو خرق عادت میوے پہنچنے کا انکار کیا اور کہا ہے کہ یہ محاورہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ ہر نعمت کو (من عند اللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، مگر زکریا علیہ السلام کا اس حالت کو دیکھ کر اظہار تعجب اور دعا کرنا بتا رہا ہے کہ رزق خرق عادت (بطور کرامت) ہی مل رہا تھا۔ پچھلی آیت کے حاشیہ میں خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں اور زکریا علیہ السلام کا واقعہ سورۂ مریم کے شروع میں ملاحظہ کریں۔

آیت 39 ① فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ …… : عبادت خانے میں نماز پڑھنے کے دوران ہی فرشتوں نے انھیں یحییٰ نامی بیٹے کی خوش خبری دی۔ معلوم ہوا پیدائش سے پہلے بھی اولاد کا نام رکھا جا سکتا ہے۔

② بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ : یہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے، اگرچہ ہر شخص ہی اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُن" سے پیدا ہوا ہے، مگر عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے پر انھیں بطور شرف یہ لقب دیا گیا، جیسے بیت اللہ، ناقۃ اللہ، اگرچہ ہر مسجد اور ہر اونٹنی اللہ ہی کی ہے۔ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، تبھی انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ
مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ
اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، جب کہ مجھے تو بڑھاپا آ پہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے؟ فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے﴿۴۰﴾ کہا اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی بنا دے؟ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہیں کرے گا مگر اشارے سے اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر﴿۴۱﴾ اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے چن لیا اور تجھے پاک کر دیا اور سب جہانوں کی عورتوں پر تجھے چن لیا ہے﴿۴۲﴾

③ ”حَصُوْرًا“ سے مراد ایسا شخص ہے جسے اپنی جنسی خواہشوں پر پوری طرح قابو حاصل ہو۔ (فتح البیان) بعض لوگوں نے معنی کیا ہے جو عورت کے پاس نہ جا سکتا ہو، مگر یہ نہ کوئی خوبی ہے نہ یہاں مراد ہے۔

آیت 40 قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ ...... : دعا کی فوری قبولیت اور بظاہر ناممکن کام کی بشارت پر انھیں تعجب ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ خود ہی دعا کر رہے ہیں اور پھر خود ہی انھیں اتنا تعجب ہو رہا ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ جواب ملا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔

آیت 41 قَالَ رَبِّ اجْعَلْ ...... : زکریا علیہ السلام کا تعجب اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نشانی کی درخواست کر دی، فرمایا کہ تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک صحیح سالم ہونے کے باوجود (ہاتھ یا ابرو وغیرہ کے) اشارے کے سوا لوگوں سے بات چیت نہ کر سکو گے، لہٰذا اس دوران تم اپنا سارا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر و شکر اور تسبیح میں صرف کرو۔

آیت 42 ① اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے مریم علیہا السلام کو چننے کا ذکر دو مرتبہ آیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محض تاکید کے لیے ہو، یا پہلے چننے سے مراد بچپن میں مریم علیہا السلام کو شرف قبولیت بخشنا ہو، جو آیت: ﴿ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ ﴾ میں مذکور ہے اور دوسرے چننے سے مراد اللہ تعالیٰ کا انھیں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے لیے منتخب فرمانا اور خصوصی فضیلت عطا کرنا ہو۔

② عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ: سب جہانوں کی عورتوں سے مراد صرف اس زمانے کی عورتیں ہیں، کیونکہ احادیث میں مریم علیہا السلام کی طرح خدیجہ، فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہن کی فضیلت میں بھی اسی قسم کے الفاظ مذکور ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مردوں میں سے بہت سے لوگ کامل ہوئے ہیں لیکن عورتوں میں سے آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران ہی کامل ہوئی ہیں اور عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو باقی کھانوں پر فضیلت حاصل ہے۔“ [بخاری، أحادیث الأنبیاء،

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اے مریم! اپنے رب کی فرماں بردار بن اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر ﴿۴۳﴾ یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، ہم اسے تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے اور نہ تو اس وقت ان کے پاس تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے ﴿۴۴﴾

باب قول الله تعالى : ﴿ و ضرب الله مثلاً...... ﴾ : ٣٤١١، عن أبي موسى الأشعري رضی اللہ عنہ]

انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمام جہانوں کی عورتوں میں تمھارے لیے مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد اور آسیہ زوجۂ فرعون کافی ہیں۔'' [ترمذی، المناقب، باب فضل خدیجة : ٣٨٧٨]

آیت 43 **وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ** : مریم علیہا السلام چونکہ بیت المقدس کے ساتھ محراب میں رہتی تھیں اور بیت المقدس کی خادمہ تھیں، اس لیے انھیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم ہوا۔

آیت 44 ❶ **ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ**...... : اس آیت سے پانچ مسئلے واضح طور پر ثابت ہوئے، پہلا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے تھے، ورنہ انھیں غیب کی یہ خبریں وحی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر نہیں ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ تو اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھا۔ تیسرا یہ کہ اولیاء اور دوسرے انبیاء بھی غیب دان نہیں، ورنہ بیت المقدس کے خدام اور وقت کے پیغمبر زکریا علیہ السلام کو قرعہ ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔ چوتھا یہ کہ جب چیز ایک ہو اور اس کے حق دار کئی ہوں تو اس وقت قرعہ کے ذریعے سے فیصلہ شریعت کا فیصلہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''كِتَابُ الشَّهَادَاتِ'' میں باب باندھا ہے: '' بَابُ الْقُرْعَةِ فِي الْمُشْكِلَاتِ '' ''مشکل معاملات میں قرعہ اندازی کا بیان'' اور اس میں کئی احادیث لائے ہیں۔ بعض لوگوں نے قرعہ کو جوا قرار دیا ہے، یہ ان کی غلطی ہے۔ ہاں، اگر اس مقصد کے لیے قرعہ ڈالا جائے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں، تو یہ قرعہ نہیں بلکہ فال نکالنا ہے جو حرام ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۹۰)۔

پانچواں یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس واقعہ کے وقت نہ موجود تھے، نہ اسے جانتے تھے، آپ کا وحی الٰہی سے اس واقعہ کو بیان کرنا آپ کے رسول برحق ہونے کی دلیل ہے۔

❷ **اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ** : اس قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مریم علیہا السلام یہودیوں کے بہت بڑے عالم عمران کی بیٹی تھیں، جب ان کی والدہ نے انھیں اپنی عبادت گاہ کی نذر کیا تو عبادت گاہ کے خدام میں جھگڑا ہوا کہ ان کی سرپرستی اور نگرانی کا شرف کون حاصل کرے، آخر کار انھوں نے قرعہ اندازی کی اور قرعہ زکریا علیہ السلام کے نام نکلا۔ (ابن کثیر، قرطبی)

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿٤٦﴾
قَالَتْ رَبِّ أَنّٰى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ إِذَا
قَضٰىٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٧﴾

جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے، دنیا اور آخرت میں بہت مرتبے والا اور مقرب لوگوں سے ہوگا ﴿۴۵﴾ اور لوگوں سے گھوارے میں بات کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی اور نیک لوگوں سے ہوگا ﴿۴۶﴾ اس نے کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، حالانکہ کسی بشر نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا؟ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے یہی کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے ﴿۴۷﴾

آیت 46،45 ① **إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ**......: اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کلمہ قرار دیا گیا ہے، اس کی وضاحت آیت (۳۸) کے حواشی میں گزر چکی ہے۔ فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے بالمشافہہ یہ بات کی، جیسا کہ سورۂ مریم (۱۷) میں ہے کہ جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں ان سے ہم کلام ہوئے۔

"**الْمَسِيحُ**" لفظ " مَسَحَ " سے مشتق ہے، جس کے معنی ہاتھ پھیرنے یا زمین کی مساحت کے ہیں۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح یا تو اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ بیماروں اور کوڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے تھے اور وہ تندرست ہو جاتے تھے، یا اس بنا پر کہ آپ ہر وقت زمین میں سفر کرتے رہتے تھے۔ (ابن کثیر)

② یہاں مسیح علیہ السلام کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں: ① "**وَجِيهًا**" یعنی بہت وجاہت والا ہوگا۔ چہرہ آدمی کی ذات کا آئینہ ہوتا ہے، اس لیے اونچے مرتبے کو وجاہت کہتے ہیں۔ ② مقرب لوگوں میں سے ہوگا۔ ③ گھوارے اور ادھیڑ عمر میں یکساں حکیمانہ کلام کرے گا۔ گھوارے میں ان کا کلام سورۂ مریم (۳۰ تا ۳۳) میں نقل ہوا ہے اور ادھیڑ عمر میں کلام کرنے میں ان کے دوبارہ اترنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ ④ صالحین سے ہوگا۔ صالح وہ ہے جس کے سارے کام درست ہوں، اس لیے یوسف اور سلیمان علیہما السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے صالح بندوں میں داخل کیے جانے کی دعا کی۔ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۱) اور سورۂ نمل (۱۹)

آیت 47 **أَنّٰى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ**: مریم علیہا السلام کو جب لڑکے کی خوشخبری دی گئی تو انھوں نے تعجب کا اظہار کیا، تعجب کا اظہار اس کے ناممکن ہونے پر نہیں بلکہ کس طرح ہونے پر کیا، کیونکہ ظاہری اسباب موجود نہیں۔ کہنے لگیں، مجھے تو آج تک کسی بشر نے ہاتھ نہیں لگایا، پھر میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا!؟ فرمایا: ''اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔'' زکریا علیہ السلام کے قصے میں "**يَفْعَلُ**" اور یہاں "**يَخْلُقُ**" فرمایا۔ پہلا لفظ عام ہے، کیونکہ وہاں میاں بیوی دونوں موجود تھے، گو بوڑھے تھے۔ "**يَخْلُقُ**" خاص ہے، کیونکہ مرد کے بغیر اسباب ہی مکمل نہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ مریم (۲۰، ۲۱)۔

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور وہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا ﴿۴۸﴾ اور بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا کہ بے شک میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے عظیم نشانی لے کر آیا ہوں کہ بے شک میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل کی مانند بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور برص والے کو تندرست کرتا ہوں اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تمھیں بتا دیتا ہوں جو کچھ تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو ذخیرہ کرتے ہو، بے شک اس میں تمھارے لیے ایک نشانی ہے، اگر تم مومن ہو ﴿۴۹﴾

آیت 48 وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ: عیسیٰ علیہ السلام کو تورات اور ہر کتاب بغیر پڑھے آتی تھی اور یہ سب معجزے تھے۔ (موضح) بعض مفسرین نے "الْكِتٰبَ" کا معنی لکھنا کیا ہے۔

آیت 48 ① اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: یعنی جب وہ رسول بن کر آئیں گے تو ان کی دعوت یہ ہوگی جو آگے بیان ہوئی ہے۔

② اَنِّيْۤ اَخْلُقُ : یہاں " خَلَقَ " کا لفظ ظاہری شکل وصورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تصویر بنانے والوں سے فرمائے گا: ((اَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ)) "تم نے جو خلق کیا اسے زندہ کرو۔" [بخاری، البیوع، باب التجارۃ فیما یکرہ...... ۲۱۰۵] پیدا کرنے اور زندگی دینے کے معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

③ بِاِذْنِ اللّٰهِ: یہاں "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا لفظ بار بار لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزات نہ دکھا سکتے اور یہی ہر نبی کے معجزات کا حال ہے کہ وہ اللہ ہی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔

④ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو اس کے زمانے کے مناسب حال معجزات عطا فرمائے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو اور جادوگروں کا زور تھا، سو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ معجزات دے کر بھیجا جن سے تمام جادوگر دنگ رہ گئے اور ان کی عقل چکرا گئی، بالآخر وہ جادوگر از خود مسلمان ہوئے اور اسلام کی راہ میں سولی چڑھنے تک کے لیے تیار ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب اور علوم طبعیہ (سائنس) کا چرچا تھا، سو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ معجزات عطا فرمائے جن کے سامنے تمام اطباء اور سائنسدان اپنے عاجز اور درماندہ ہونے کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فصاحت و بلاغت اور شعر و ادب کا ڈنکا بجتا تھا، سو اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ کتاب نازل فرمائی جس نے تمام فصحاء و بلغاء کی گردنیں خم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں

وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ لِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اس کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے تورات سے ہے اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کی گئی تھیں اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے عظیم نشانی لے کر آیا ہوں، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو﴿۵۰﴾ بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۵۱﴾ پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو اس نے کہا کون ہیں جو اللہ کی طرف میرے مددگار ہیں؟ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ ہو جا کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿۵۲﴾

تین طرح کا چیلنج دیا، پہلے پورے قرآن کی مثل لانے کا (بنی اسرائیل : ۸۸) پھر دس سورتیں اس جیسی لانے کا (ہود: ۱۳) پھر اس جیسی کوئی ایک سورت لانے کا (یونس : ۳۸) مگر وہ بار بار چیلنج سننے کے باوجود اس جیسی دس سورتیں تو کجا، اس جیسی ایک سورت بھی پیش نہ کر سکے۔ کیوں؟ اس لیے کہ پروردگار کا کلام مخلوق کے کلام سے مماثلت نہیں رکھتا۔ (ابن کثیر، رازی)

آیت 50 وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ...... : عیسیٰ علیہ السلام کے وقت تورات میں سے کئی حکم جو مشکل تھے، موقوف ہوئے، باقی وہی تورات کا حکم تھا۔ (موضح) عیسیٰ علیہ السلام اپنی کوئی الگ مستقل شریعت لے کر مبعوث نہیں ہوئے تھے، بلکہ موسوی شریعت کی تائید و تصدیق کرنے اور بنی اسرائیل کو تورات پر عمل کی دعوت دینے کے لیے آئے تھے، البتہ تورات میں بعض چیزیں جو بطور تشدید ان پر حرام کر دی گئی تھیں، ان کو اللہ کے حکم سے حلال قرار دینا بھی ان کے مقصد بعثت میں شامل تھا، جیسے اونٹ کا گوشت اور حلال جانوروں کی چربی وغیرہ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے صرف ان چیزوں کو حلال قرار دیا جنھیں یہود نے آپس کے اختلافات اور موشگافیوں کی وجہ سے حرام قرار دے لیا تھا۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ انھوں نے بعض چیزوں کی حرمت کو منسوخ بھی کیا ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 51 اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ...... : عیسیٰ علیہ السلام نے معجزات پیش کرنے کے ساتھ ضروری سمجھا کہ اصل دین کی تاکید فرما دیں کہ میرا اور تمھارا داتا (رب) اللہ ہے، سو اسی کی عبادت کرو۔ مگر افسوس کہ نصرانیوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ یا اللہ کا بیٹا قرار دے کر رب اور نفع و نقصان کا مالک سمجھ لیا اور ان سے فریادیں کرنے لگے۔

آیت 52 ① فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ...... : یعنی صرف عقل سے نہیں سمجھا بلکہ حواس سے معلوم کر لیا، آنکھوں اور کانوں سے یہ حقیقت جان لی کہ یہود اور ان کے علماء اللہ کی دی ہوئی نشانیوں اور دلائل و معجزات کے سامنے بے بس ہو چکے

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنۡزَلۡتَ وَ اتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۵۳﴾ وَ مَكَرُوۡا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ﴿۵۴﴾ ع

اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے نازل فرمایا اور ہم رسول کے پیرو کار بن گئے، سو تو ہمیں شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے ﴿۵۳﴾ اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۵۴﴾

ہیں، مگر ماننے کے لیے کسی صورت آمادہ نہیں، بلکہ ان کی زندگی کے درپے ہیں اور اس مقصد کے لیے سازشیں کر رہے ہیں تو انھیں اپنے دنیا سے رخصت ہونے میں کچھ شبہ نہ رہا۔ اب انھیں فکر تھی تو یہ کہ دین کی اشاعت و تبلیغ کا کام رکنا نہیں چاہیے، چنانچہ انھوں نے اپنے پیروکاروں سے پوچھا کہ کون ہے جو اللہ کی طرف دعوت دینے اور اس کے راستے پر چلنے اور چلانے میں میرا مددگار ہو؟ اللہ تعالیٰ نے چند لوگوں کو توفیق عطا فرمائی، وہ ایمان لائے اور پوری تن دہی کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کرتے رہے اور یہی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کہلائے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں سے مدد مانگ رہے ہیں، اگر وہ مختار کل ہوتے تو مدد مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے دور کے قبر پرست بھی عجیب ہیں، اس آیت سے استدلال کر کے فوت شدہ بزرگوں سے وہ چیزیں مانگتے ہیں جو ان کے اختیار میں نہیں اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بزرگوں نے چھوٹوں سے وہ مدد مانگی ہے جو ان کے اختیار میں تھی۔

❷ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ویسا ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے پہلے زمانۂ حج میں مختلف قبائل عرب سے فرمایا کرتے تھے کہ کون ہے جو مجھے پناہ دے تاکہ میں لوگوں تک اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں، اس لیے کہ قریش نے مجھے یہ پیغام پہنچانے سے روک رکھا ہے؟ تا آنکہ آپ کو انصار مل گئے، جنھوں نے آپ کو پناہ دی اور اپنی جان و مال سے آپ کی مدد کی۔ مگر آپ کے حواری (خاص جاں نثار و مددگار) صرف انصار ہی نہ تھے، مہاجر بھی تھے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خندق کے دوران میں تین دفعہ پوچھا: ''کون ہے جو بنو قریظہ کی خبر لائے گا؟'' تینوں دفعہ زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں، میرا حواری زبیر ہے۔'' [مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل طلحة ...... : ۲٤۱۵، عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما]

آیت 54 ﴿ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ...... ﴾ : شیخ شنقیطی نے فرمایا: ''یہاں نہ یہود کی خفیہ تدبیر کا ذکر فرمایا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کا، مگر دوسری جگہ ان کی تدبیر کا ذکر کیا ہے کہ انھوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﴾ [النساء : ۱۵۷] ''اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ بلاشبہ ہم نے ہی مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، جو اللہ کا رسول تھا۔'' اور اللہ کی خفیہ تدبیر کا ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ [النساء : ۱۵۷] ''اور لیکن ان کے لیے (کسی کو اس مسیح کا) شبیہ بنا دیا گیا۔'' وہ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کو سولی دے کر سمجھ بیٹھے کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۱۵۷)۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا
وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے قبض کرنے والا ہوں اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تجھے ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جنھوں نے کفر کیا اور ان لوگوں کو جنھوں نے تیری پیروی کی، قیامت کے دن تک ان لوگوں کے اوپر کرنے والا ہوں جنھوں نے کفر کیا، پھر میری ہی طرف تمھارا لوٹ کر آنا ہے تو میں تمھارے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ کروں گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۵۵﴾ پھر جن لوگوں نے تو کفر کیا سو میں انھیں دنیا اور آخرت میں عذاب دوں گا، بہت سخت عذاب اور کوئی ان کی مدد کرنے والے نہیں ﴿۵۶﴾ اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ﴿۵۷﴾ یہ ہے جسے ہم آیات اور پر حکمت نصیحت میں سے تجھ پر پڑھتے ہیں ﴿۵۸﴾

آیت 55 ① مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ: " وَفٰى يَفِيْ " کا معنی پورا ہونا یا پورا کرنا ہے۔ "اِسْتَوْفٰى" اور " تَوَفّٰى " کا معنی پورا لے لینا ہے۔ '' اِسْتَوْفَيْتُ مِنْهُ وَ تَوَفَّيْتُ '' کا معنی ہے ''میں نے اس سے پورا حق لے لیا۔'' اس بنا پر "مُتَوَفِّيْكَ" کا معنی ہے ''میں تمھیں پورا لینے والا ہوں'' اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو روح و بدن دونوں کے ساتھ اٹھا لیا جاتا۔ بعض نے اس کا معنی '' (وقت پر) فوت کرنے والا ہوں'' کیا ہے اور میں نے ترجمہ کیا ہے ''قبض کرنے والا ہوں۔'' اس میں دونوں معنی آ جاتے ہیں۔ یوں تو قرآن میں " تَوَفّٰى " کا معنی سلا دینا بھی آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ [الأنعام : ٦٠] ''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا (سلا دیتا) ہے'' اور فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ﴾ [الزمر : ٤٢] ''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے اور ان کو بھی جو نہیں مریں ان کی نیند میں۔''

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے " اَلْجَوَابُ الصَّحِيْحُ " میں لکھا ہے کہ لغت عرب میں "تَوَفّٰى" کے معنی "اِسْتِيْفَاءٌ" اور قبض کے آئے ہیں اور یہ نیند کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے اور موت کی صورت میں بھی اور یہ " تَوَفِّي الرُّوْحِ مَعَ الْبَدَنِ جَمِيْعًا " (روح اور بدن دونوں کو لے لینے) کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے کہ اسے تھوڑی سی مٹی سے بنایا، پھر اسے فرمایا ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے ﴿۵۹﴾ یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے، سو تو شک کرنے والوں سے نہ ہو ﴿۶۰﴾

آیت میں ﴿ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ سے عیسیٰ علیہ السلام کا مع جسم آسمان کی طرف اٹھایا جانا مراد ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ ﴾ ''اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔'' دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور سولی کی نفی فرمائی اور ''تَوَفِّیْ'' کا لفظ استعمال کیے بغیر فرمایا: ﴿ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ﴾ [النساء : ۱۵۸] ''بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔''

② وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا : عیسیٰ علیہ السلام کے اول تابع نصاریٰ تھے، ان کے بعد مسلمان ہیں، سو یہ ہمیشہ غالب رہے۔ (موضح) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ان سے مراد صرف نصاریٰ بھی ہو سکتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ یہود جو مسیح علیہ السلام کے منکر ہیں ان پر نصاریٰ ہمیشہ غالب رہیں گے۔ (ابن کثیر)

اس سے مراد یہ بھی ہے کہ قیامت کے قریب جب مسیح علیہ السلام تشریف لائیں گے تو ان کے پیروکار مسلمان سب کفار پر غالب ہوں گے۔

آیت 59 ① اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى ...... : یہ سورت شروع سے لے کر یہاں تک (یعنی پہلی آیت سے ۵۹ تک) وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس وفد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث کے دوران عیسیٰ علیہ السلام کی '' بُنُوَّة '' (اللہ کا بیٹا ہونے) پر اس سے استدلال کیا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی کہ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا اللہ کا بیٹا ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے تو آدم علیہ السلام جو ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے وہ بالاولیٰ اللہ کا بیٹا کہلانے کے حق دار ہیں، مگر یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی طرح مسیح علیہ السلام کو بھی '' كُنْ '' سے پیدا کر کے اپنی قدرتِ کاملہ کو ظاہر فرمایا ہے۔ (ابن کثیر)

② '' مِنْ تُرَابٍ '' میں تنوین تقلیل یا تحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا ہے ''تھوڑی سی مٹی۔''

آیت 60 اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ...... : یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تمھارے سامنے جو حق بیان ہوا ہے یہ تیرے رب کی طرف سے ہے۔ '' اَلْحَقُّ '' میں الف لام عہد کا ہے جس کا اشارہ گزشتہ بیان کی طرف ہے اس لیے ترجمہ ''یہ حق تیرے رب کی طرف سے ہے'' کیا گیا ہے۔ اور اس میں شک وشبہ کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔ (ابن کثیر) یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر مقصود تمام مسلمانوں کو تنبیہ کرنا ہے۔ (رازی)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا
وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا
لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع

پھر جو شخص تجھ سے اس کے بارے میں جھگڑا کرے، اس کے بعد کہ تیرے پاس علم آ چکا تو کہہ دے آؤ! ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے بیٹوں کو بلا لیں اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمھیں بھی، پھر گڑ گڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں ﴿۶۱﴾ بلاشبہ یہ، یقیناً یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں اور بلاشبہ اللہ، یقیناً وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۲﴾ پھر اگر وہ پھر جائیں تو بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۶۳﴾

آیت 61 ① فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ : سورت کے شروع سے لے کر یہاں تک اللہ تعالیٰ کی توحید، مسیح علیہ السلام کی ولادت کا بیان اور ان کا اللہ یا اللہ کا بیٹا نہ ہونا زبردست علمی دلائل کے ساتھ بیان ہوا۔ اب حکم ہوا کہ جو شخص اتنے واضح دلائل کے بعد بھی نہ مانے تو وہ عناد پر آمادہ ہے، اس سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں، پھر انھیں مباہلہ کی دعوت دو۔

② مباہلہ کی صورت یہ بیان فرمائی کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمھارے بیٹوں کو بلا لیں اور اپنی عورتوں اور تمھاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو اور تمھیں بھی، پھر گڑ گڑا کر دعا کریں، پس جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

" بَهَلَ يَبْهَلُ (ف) " کا معنی لعنت کرنا ہے اور " بَاهَلَ مُبَاهَلَةً " اور " اِبْتَهَلَ يَبْتَهِلُ " کا معنی ایک دوسرے پر لعنت کی دعا کرنا ہے، چونکہ یہ دعا نہایت خلوص اور عاجزی سے ہوتی ہے، اس لیے "اِبْتَهَلَ" کا لفظ عاجزی سے دعا کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

③ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ ...... ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلِيْ)) "اے اللہ! یہ میرے اہل ہیں۔" [مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل علي بن أبي طالب رضي الله عنه: ۳۲/ ۲٤۰٤]

مگر اہل نجران مباہلہ سے ڈر گئے اور انھوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا، جیسا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عاقب اور السید نجران والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، وہ آپ سے مباہلہ کا ارادہ رکھتے تھے تو ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: "ایسا مت کرو، کیونکہ اللہ کی قسم! اگر یہ نبی ہوئے اور ہم نے مباہلہ کر لیا تو نہ ہم کبھی فلاح پائیں گے اور نہ ہمارے بعد ہماری نسل۔" تو دونوں نے کہا: "آپ نے ہم سے جو مطالبہ کیا ہے ہم آپ کو دیں گے اور آپ ہمارے ساتھ کوئی امین آدمی بھیج دیں اور کسی اور کو نہیں صرف امانت دار کو بھیجیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً میں تمھارے ساتھ ایک سچے پکے امانت دار کو

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾

کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے پھر اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں ﴿۶۴﴾

بھیجوں گا۔'' تو اصحاب رسول ﷺ نے اس کے لیے گردنیں اٹھائیں (کہ کس پر آپ کی نظر پڑتی ہے) تو آپ نے فرمایا: ''اے ابوعبیدہ بن جراح! اٹھو۔'' جب وہ کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اس امت کا امین ہے۔'' [بخاري، المغازي، باب قصة أهل نجران : ۴۳۸۰] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اگر وہ لوگ نبی ﷺ سے مباہلہ کرتے تو اس حال میں واپس جاتے کہ نہ اپنے اہل کو پاتے اور نہ مال کو۔'' (طبری بسند حسن)

④ اس آیت سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ ضد میں آ کر حق سے انکار کرنے والے سے مباہلہ ہو سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو لعان بھی مباہلہ کی ایک صورت ہے۔

⑤ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ : آیت مباہلہ میں اپنے بیٹوں اور اپنی عورتوں کو بلانے کا ذکر ہے۔ ''نِسَآء'' (عورتوں) کا لفظ بیویوں پر استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں بار بار نبی ﷺ کی بیویوں کو ''يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِىِّ'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اور انھیں اہل بیت کہہ کر خطاب کیا ہے۔ (دیکھیے احزاب: ۳۰ تا ۳۴) اولاد پر بیٹیوں کا لفظ آتا ہے نہ کہ عورتوں کا، ہاں، دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر ان پر بھی یہ لفظ آ سکتا ہے۔ یہاں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ نے فاطمہ، علی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، آپ کے اہل بیت یہی تھے، بیویوں کو نہیں بلایا۔ حالانکہ کسی حدیث میں بیویوں کو نہ بلانے کا ذکر نہیں ہے اور یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ کسی چیز کا ذکر نہ ہونے سے اس کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ احادیث میں تو دوسرے صحابہ کو بلانے کا یا ان کے آنے کا بھی ذکر نہیں، تو کیا وہاں اور کوئی بھی موجود نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والے تو آپ کی بیویاں ہی تھیں، بیٹا کوئی زندہ نہ تھا، اس لیے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے آل علی کو اپنے اہل میں شامل کروایا، دلیل اس کی لفظ '' اَللّٰهُمَّ '' ہے اور یہ تو معروف ہے کہ بیٹی کی اولاد کی نسبت اس کے خاوند اور خاوند کے آباء و اجداد کی طرف ہوتی ہے، نہ کہ نانا کی طرف۔ ہاں، یہ علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم کی خصوصیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا سے وہ بھی اہل بیت ہیں، مگر بیویوں کو جو اصل گھر والی ہیں، انھیں گھر والوں ہی سے نکال دینا محض تعصب ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ انھیں گھر والیاں فرما رہا ہے، فرمایا: ﴿ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ ﴾ [الأحزاب : ۳۳] ''اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کر دے اے اہل بیت!'' اور جبریل علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ علیہا السلام کو ﴿ رَحْمَتُ ٱللَّهِ وَبَرَكَٰتُهُۥ عَلَيْكُمْ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ ﴾ کے الفاظ سے مخاطب کر رہے ہیں، یعنی ''اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر اے اہل بیت!'' [هود : ۷۳]

آیت 64 ① قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ ...... : اس آیت میں اہل کتاب کو تین مشترکہ باتوں کی دعوت دینے کا حکم دیا گیا ہے:

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَ الۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ جب کہ تورات اور انجیل تو نازل ہی اس کے بعد کی گئی ہیں، تو کیا تم سمجھتے نہیں ﴿۶۵﴾

① اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں۔ ② اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ ③ اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ تورات و انجیل میں تحریف کے باوجود تورات تو اب بھی توحید سے اور شرک کی ممانعت سے لبریز ہے، انجیل میں بھی یہی تعلیم متفرق طور پر موجود ہے، جیسے: ''تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔'' [متی : ٤ : ١٠] بلکہ یہ بھی ہے: ''زمین پر اللہ کے احکام پر عمل ہونا چاہیے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔'' [متی : ٦ : ١٠]

● اہل کتاب تینوں باتوں کی مخالفت کر رہے تھے، یہود نے عزیر کو اور نصاریٰ نے مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی اور دونوں نے اپنے اپنے احبار و رہبان کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ کو حرام ٹھہرا کر انھیں رب ہونے کا درجہ دے دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۳۰، ۳۱) اور ان کے حواشی۔

● رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اہل کتاب کو اس مشترکہ عقیدہ کی دعوت دی، جو قریب تھے انھیں براہِ راست دعوت دی اور جو دور تھے انھیں خط لکھے، چنانچہ شاہ روم ہرقل کو خط لکھا تو اسلام کی دعوت دینے کے ساتھ زیر تفسیر آیت بھی لکھی، جیسا کہ صحیح بخاری ''کتاب التفسیر (۴۵۵۳)'' میں مذکور ہے۔

● فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ : یعنی اگر اہل کتاب اس عقیدہ کے ماننے سے انحراف کریں تو تم اپنی طرف سے اس عقیدہ پر قائم رہنے کا اعلان کر دو۔ اس میں متنبہ کیا ہے کہ اہل کتاب اس عقیدہ سے منحرف ہو چکے ہیں، کیونکہ انھوں نے عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کے بیٹے قرار دے دیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنا لیا تھا۔

آیت 65 يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ ...... : یہود ابراہیم علیہ السلام کے یہودی ہونے کے دعوے دار تھے اور نصاریٰ ان کے نصرانی ہونے کے اور یہ بات ایسی تھی جو واضح طور پر غلط تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، یہ تورات و انجیل ان کے بہت بعد نازل ہوئیں تو وہ یہودی یا نصرانی کیسے ہوئے؟ بھلا یہ کوئی ایسی بات ہے جس پر عقلمند لوگ باہمی جھگڑے میں مشغول ہوں۔ ہماری امت میں سے بھی اگر بعد میں بننے والا کوئی گروہ جو: ((مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِيْ)) پر قائم نہ ہو اور دعویٰ کرے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گروہ سے تھے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ تمھاری تو بنیاد ہی بعد میں رکھی گئی، جب کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے تو آپ ﷺ تمھارے گروہ میں کیسے شامل ہو گئے؟

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

دیکھو تم وہ لوگ ہو کہ تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کے متعلق تمھیں کچھ علم تھا، تو اس بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کچھ علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۶۶﴾ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، بلکہ ایک طرف والا فرماں بردار تھا اور مشرکوں سے نہ تھا ﴿۶۷﴾ بے شک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ قریب یقیناً وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے، اور اللہ ہی ایمان والوں کا دوست ہے ﴿۶۸﴾

آیت 66 لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ : یعنی اس دین ابراہیمی سے متعلق۔ مراد یہ ہے کہ جب تم تورات و انجیل ہی کے مسائل میں بھٹکے اور کیسے بھٹکے، حالانکہ وہاں کچھ علم تمھیں حاصل تھا، تو اب دینِ ابراہیمی کے بارے میں کیوں کٹ حجتی پر تلے ہو، جس کے بارے میں تو تمھیں علم کا شائبہ بھی حاصل نہیں؟ (ماجدی) اس آیت میں نہ صرف غلط طور پر جھگڑا کرنے سے منع کیا گیا ہے، بلکہ مطلقاً جھگڑے سے گریز کی نصیحت بھی کی ہے۔ (ابن کثیر، فتح القدیر)

آیت 67 مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا...... : اس آیت میں اشارہ ہے کہ یہود و نصاریٰ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اپنے گروہ میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ یہ مشرک ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے مشائخ اور علماء کو رب اور ان کے اقوال کو شریعت بنا رکھا ہے اور عزیر و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا بیٹا اور نبیوں اور ولیوں کی قبروں کو مسجدیں بنائے ہوئے ہیں، جب کہ ابراہیم علیہ السلام ایک اللہ کی پرستش کرنے والے مسلم تھے، وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ کچھ ایسا ہی حال اس امت کا بھی ہے کہ ہر فرقے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اپنے گروہ میں شامل کرتے ہیں، حالانکہ وہ سب گروہ بہت بعد میں بنے، اور انھوں نے اپنے اپنے سربراہوں کے اقوال کو شریعت قرار دے کر ان سربراہوں کو اللہ کا درجہ دے دیا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف " مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ " (اللہ کے نازل کردہ دین) پر چلنے والے مسلم تھے اور ہرگز مشرک نہ تھے۔

آیت 66 اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ...... : مطلب یہ کہ اگر تم اس معنی میں ابراہیم علیہ السلام کو یہودی یا نصرانی کہتے ہو کہ ان کی شریعت تمھاری شریعت سے ملتی جلتی ہے تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کے پیروکاروں کے بعد ان کے سب سے زیادہ قریب یہ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کو یہ کہنے کا حق تم سے زیادہ پہنچتا ہے کہ ہم اس طریق پر ہیں جس پر ابراہیم علیہ السلام تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُلَاةً مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَ اِنَّ وَلِيِّيْ اَبِيْ

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ
بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸ / ۱۵

اہل کتاب کی ایک جماعت نے چاہا کاش! وہ تمھیں گمراہ کر دیں۔ حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہ نہیں کر رہے اور وہ شعور نہیں رکھتے ﴿۶۹﴾ اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود گواہی دیتے ہو ﴿۷۰﴾ اے اہل کتاب! تم کیوں حق کو باطل سے خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۷۱﴾

خَلِيْلُ رَبِّيْ ›› ’’ہر نبی کے لیے نبیوں میں سے کچھ دوست ہیں۔ جن سے اس کا خصوصی تعلق ہوتا ہے اور میرا (خاص تعلق والا) دوست میرا باپ اور میرے رب کا خلیل ہے۔‘‘ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة آل عمران : ۲۹۹۵۔ صحیح]

آیت 69 وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ ...... : اس گروہ کی سازشوں کا ذکر اسی سورت (۷۲، ۷۳) میں آ رہا ہے۔ فرمایا یہ لوگ مسلمانوں کو یہودی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، مسلمان ان کے بہکاوے میں کیا آئیں گے، وہ تو ایمان میں پختہ ہیں، یہ خود ہی مارے جائیں گے، مگر انھیں اس کا شعور ہی نہیں۔

آیت 70 لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ...... : اللہ کی آیات سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی وہ بشارتیں ہیں جو پہلے انبیاء سے منقول تھیں۔ یہود ان کو صحیح سمجھتے تھے مگر مانتے نہیں تھے۔ اللہ کی آیات سے رسول اللہ ﷺ کی بشارتوں پر مشتمل آیات کے ساتھ ساتھ عقائد و احکام وغیرہ پر مشتمل دوسری آیات بھی مراد ہو سکتی ہیں، یعنی وہ لوگ صرف آپ ﷺ سے متعلق ہی نہیں، بلکہ دوسری آیات کو بھی اللہ کا کلام سمجھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لاتے تھے۔

آیت 71 لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ ...... : اہل کتاب کی مذہبی بدبختیوں کی طرف اشارہ ہے، اس سے پہلی آیت میں علمائے یہود کی یہ بدبختی بیان کی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سچا پیغمبر ہونے کے دلائل جان لینے کے باوجود کفر کر رہے ہیں، اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا ان کا عام شیوہ بن چکا ہے۔ پہلی آیت میں ان کی اپنی گمراہی کا بیان تھا، اس آیت میں دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذکر ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۲)۔ (رازی) یہ مقام عبرت ہے کہ ہمارے دور کے فرقہ پرست علماء اور تجدد زدہ حضرات بھی دنیوی اور مادی اغراض و مصالح کے پیش نظر قرآن مجید سے وہی سلوک کر رہے ہیں جو ان کے پیش رو تورات و انجیل کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بالکل صحیح فرمایا: « لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ » [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بني إسرائیل : ۳۴۵۶] ’’تم لازماً پہلی امتوں کے نقش قدم پر چلو گے۔‘‘

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا تم دن کے شروع میں اس چیز پر ایمان لاؤ جو ان لوگوں پر نازل کی گئی ہے جو ایمان لائے ہیں اور اس کے آخر میں انکار کر دو، تاکہ وہ واپس لوٹ آئیں ﴿۷۲﴾ اور کسی کے لیے مت مانو، سوائے اس کے جو تمھارے دین کی پیروی کرے۔ کہہ دے اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے، (یہ مت مانو) کہ جو کچھ تمھیں دیا گیا ہے اس جیسا کسی اور کو بھی دیا جائے گا، یا وہ تم سے تمھارے رب کے پاس جھگڑا کریں گے۔ کہہ دے بے شک سب فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اسے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۷۳﴾ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۷۴﴾

آیت 72 وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ ......: کمزور ایمان والے مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لیے یہود مختلف سازشیں کرتے رہتے تھے، یہ بھی اس سلسلہ کی ان کی ایک سازش کا بیان ہے کہ صبح کے وقت قرآن اور پیغمبر پر ایمان کا اظہار کرو اور شام کو کفر و انحراف کا اعلان کر دو، ممکن ہے یہ طریقہ اختیار کرنے سے بعض مسلمان بھی سوچنے لگیں کہ یہ پڑھے لکھے لوگ مسلمان ہونے کے بعد اس تحریک سے الگ ہو گئے ہیں تو آخر انھوں نے کوئی خرابی یا کمزور پہلو ضرور دیکھا ہو گا۔ (ابن کثیر، شوکانی)

آیت 74،73 وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ......: یہ بھی ان گروہوں کا کلام ہے جن کا ذکر چلا آ رہا ہے اور اس سے ان کا مذہبی تعصب اور حسد ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ اپنے متبعین کو تاکید کرتے رہتے ہیں: ﴿ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ﴾ امام طبری نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ اپنے ہم مشرب کے سوا کسی کی بات پر یقین نہ کرو، نہ یہ تسلیم کرو کہ تمھاری طرح کسی اور کو بھی نبوت دی جا سکتی ہے اور نہ یہ مانو کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے حضور جا کر تم پر کوئی حجت قائم کر سکیں گے۔ اس صورت میں ﴿ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ﴾ جملہ معترضہ ہو گا اور اس کا ربط ﴿ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ﴾ کے ساتھ ہو گا۔ (ابن کثیر، ابن جریر) یہاں تک ان کی دینی خیانت اور مذہبی تعصب کا بیان تھا، اب اگلی آیت میں ان کی مالی خیانت اور مسلمانوں سے بغض کا بیان ہے۔ (رازی)

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اہل کتاب میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک خزانہ امانت رکھ دے وہ اسے تیری طرف ادا کر دے اور ان میں سے بعض وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک دینار امانت رکھے وہ اسے تیری طرف ادا نہیں کرے گا مگر جب تک تو اس کے اوپر کھڑا رہے، یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا ہم پر اَن پڑھوں کے بارے میں (گرفت کا) کوئی راستہ نہیں اور وہ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۷۵﴾

تفسیر آیت 75 ① اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ : اللہ تعالیٰ کا انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اہل کتاب کی مذمت کے دوران بھی اگر ان کے کچھ لوگوں میں کوئی خوبی تھی تو اس کا اعتراف فرمایا ہے، مذمت صرف ان کی فرمائی ہے جو اس کے حق دار تھے۔ ایک خزانہ امانت ادا کر دینے والوں کی بہترین مثال صحیح بخاری میں مذکور وہ تفصیلی واقعہ ہے جس میں بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے اسرائیلی سے ایک ہزار دینار قرض مانگا، پھر پہنچانے کے لیے کشتی نہ ملنے پر لکڑی میں ڈال کر سمندر کے حوالے کر دیا، پھر بعد میں خود بھی لے کر حاضر ہوا۔ مگر دوسرے نے بھی امانت کا مظاہرہ کیا اور بتایا کہ مجھے تمھاری طرف سے لکڑی میں بھیجی ہوئی رقم مل گئی تھی۔ [بخاری، الکفالۃ، باب الکفالۃ فی القرض ..... : ۲۲۹۱]

② لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ : سر پر کھڑا رہنے کے بغیر ایک دینار بھی ادا نہ کرنے کی وجہ ان کے کہنے کے مطابق یہ ہے کہ امّی (عرب) لوگوں کا مال کھا جانے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کبھی امانت میں خیانت کا حکم نہیں دیا، خواہ وہ اسرائیلی ہو یا عرب، بلکہ اسلام نے تو کسی ذمی کے مال کو بھی بلا اجازت لینا جائز قرار نہیں دیا اور کسی حربی کافر کے مال کو بھی خیانت سے کھانے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ [النساء : ۵۸] ”بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو۔“ افسوس کہ یہود کی طرح بعض مسلمان بھی کفار کے ممالک میں سود کے لین دین کے لیے کہتے ہیں کہ دارالحرب میں سود جائز ہے اور دارالحرب بھی اپنی مرضی کا بنایا ہوا ہے، خواہ ان سے جنگ ہو رہی ہو یا نہ۔

③ ہمارے ایک تاجر دوست نے اس آیت سے استدلال کیا کہ کوئی شخص کتنا بھی قرض واپس نہ کرنے والا ہو، اگر آپ بار بار اس سے تقاضا کرتے رہیں گے تو آخر کار آپ کے پیسے نکل آئیں گے، بشرطیکہ آپ نہ اس سے لڑیں، نہ اسے لڑنے کا موقع دیں، کیونکہ پھر بار بار تقاضا ممکن نہیں رہتا۔ اس نے کہا یہ میرا تجربہ ہے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

کیوں نہیں! جو شخص اپنا عہد پورا کرے اور ڈرے تو یقیناً اللہ ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۷۶﴾ بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت لیتے ہیں، وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اللہ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے دردناک عذاب ہے ﴿۷۷﴾

آیت 76 "بَلٰى" (کیوں نہیں) یعنی اس بدعہدی اور خیانت پر ضرور مؤاخذہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور محبوب شخص وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندوں سے کیا ہوا عہد پورا کرتا ہے (اس میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد بھی داخل ہے) پھر ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس شریعت کا اتباع کرتا ہے جو آپ ﷺ لے کر مبعوث ہوئے۔

آیت 77 اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ ...... : عبد اللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بازار میں کچھ سامان تجارت لا کر رکھا، پھر اس پر قسم کھا کر کہا کہ میں نے اس سامان کے اتنے روپے دیے، حالانکہ اس نے اتنے روپے نہیں دیے (یا کہا کہ مجھے اس سامان کے اتنے روپے مل رہے تھے، حالانکہ اسے اتنے روپے نہیں مل رہے تھے) قسم کا مقصد یہ تھا کہ کسی مسلمان اس میں پھنسا لے تو اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [بخاري، البيوع، باب ما يكره من الحلف في البيع : ٢٠٨٨، ٤٥٥١] یعنی جو لوگ بدعہدی، خیانت اور جھوٹی قسمیں کھا کر لوگوں کا مال کھاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر ایسا ناراض ہوگا کہ نہ آخرت میں ان کا کچھ حصہ ہوگا، نہ اللہ ان سے کلام کرے گا، نہ انھیں (نظر رحمت سے) دیکھے گا، نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے پکی قسم کھائی، تا کہ اس کے ساتھ کسی مسلمان کا مال ہڑپ کر لے تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر سخت غصے ہوگا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں (زیر تفسیر) یہ آیت اتاری۔ [بخاري، التفسير، باب ﴿ إن الذين يشترون بعهد الله ...... : ٤٥٤٩]

ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تین شخص ایسے ہیں جن سے نہ تو اللہ تعالیٰ کلام کرے گا، نہ قیامت کے دن ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ (وہ یہ ہیں) اپنے کپڑے کو لٹکانے والا، احسان کر کے جتلانے والا اپنے سودے کو جھوٹی قسم کے ساتھ بیچنے والا۔'' [مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم الإسبال ...... : ١٠٦، عن أبي ذر رضی اللہ عنہ]

وَ اِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَ مَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحُكۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّيۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ۙ﴿۷۹﴾

اور بے شک ان میں سے یقیناً کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب (پڑھنے) کے ساتھ اپنی زبانیں مروڑتے ہیں، تاکہ تم اسے کتاب میں سے سمجھو، حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۷۸﴾ کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ اور لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے ﴿۷۹﴾

آیت 78 وَ اِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ ...... : اس کا عطف پہلی آیت پر ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اوپر کی آیت بھی یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے (اگرچہ لفظ عام ہونے کی وجہ سے ایسے تمام لوگ اس میں داخل ہیں)۔ (رازی) اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ تورات و انجیل میں تحریف کرتے ہیں اور اس میں (خصوصاً ان آیات میں جن میں رسول اللہ ﷺ کی صفت مذکور ہے) کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھا کر اس انداز اور لہجہ سے پڑھتے ہیں کہ سننے والا ان کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ سمجھ لیتا ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں، پھر یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی بے خوفی اور ڈھٹائی کی حد یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے اللہ کی طرف سے ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ افسوس، امت محمد ﷺ میں بھی بہت سے لوگ اسی راہ پر چل رہے ہیں اور وہ اپنی دنیاوی اغراض یا مذہبی فرقہ پرستی کی وجہ سے قرآن کریم کے ساتھ یہ معاملہ کبھی لفظی اور کبھی معنوی تحریف کے ساتھ کرتے ہیں، عوام بے چارے اسے اللہ کا حکم سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ مولوی صاحب یا ان کے کسی پیشوا کی بات ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سچ فرمایا: ''یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے نقش قدم پر چل پڑو گے۔'' [بخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب قول النبي ﷺ : لتتبعن سنن ...... : ۷۳۲۰]

آیت 79 ❶ مَا كَانَ لِبَشَرٍ ...... : تورات و انجیل میں اہل کتاب کی تحریف بیان کرنے کے بعد اشارہ فرمایا ہے کہ انجیل میں عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کے دعویٰ کی خاطر بھی تحریف کی گئی ہے، ورنہ نبی تو بشر ہوتے ہیں اور وحی و نبوت ایسی صفات سے مشرف ہونے کے بعد ان کی طرف سے اپنے الٰہ (خدا) ہونے کا دعویٰ محال ہے۔ (رازی)

❷ پھر جب نبی کا یہ حق نہیں کہ لوگ اس کی عبادت کریں تو دوسرے مشائخ اور ائمہ اس مرتبے پر کیسے فائز ہو سکتے ہیں اور

ع ۹ ۱۶ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو (۸۰)

انھیں یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ اپنے مریدوں کو چوبیس گھنٹے اپنی صورت آنکھوں اور ذہن کے سامنے رکھنے کا حکم دیں اور ان سے یہ عہد لیں کہ میری ہر بات تمھیں ماننا ہو گی، صحیح معلوم ہو یا غلط اور جب مصیبت پیش آئے تو ہمیں یاد کرو گے۔ بتائیے خدائی اور کیا ہوتی ہے؟ نبی ہونے کی حیثیت سے انبیاء کی پیروی اور ان کا ہر حکم ماننا واجب ہوتا ہے، مشائخ اور ائمہ تو واجب الاتباع بھی نہیں ہوتے۔

③ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ: اس سے معلوم ہوا کہ عبد المسیح یا عبد الرسول یا عبد المصطفی نام رکھنا جائز نہیں۔

④ ''اَلرَّبَّانِيُّ'' لفظ ''رب'' پر الف نون بڑھا کر یائے نسبت کی لگا دی گئی ہے اور اس کے معنی عالم باعمل کے ہیں۔ مبرّد فرماتے ہیں کہ یہ ''رَبَّهُ يَرُبُّهُ فَهُوَ رَبَّانٌ'' ہے، یعنی صیغہ صفت۔ ''رَبَّانٌ'' کے ساتھ ''یاء'' ملائی گئی ہے۔ (فتح البیان) صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، آیت: ﴿ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ﴾ کا معنی ہے حکماء، فقہاء بنو اور کہا: ''کہا جاتا ہے ''الربانی'' وہ ہے جو علم کی بڑی باتوں سے پہلے اس کی چھوٹی باتوں کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرے۔ [بخاري، العلم، باب العلم قبل القول والعمل ......، بعد ح : ٦٧]

⑤ بِمَا كُنْتُمْ: اس میں ''باء'' برائے سببیت ہے، چونکہ تم تعلیم و دراست کا مشغلہ رکھتے ہو، اس لیے تمھیں عالم باعمل اور اللہ کے عبادت گزار بندے بننا چاہیے۔ (بیضاوی)

⑥ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ہاں، تم کو (اے اہل کتاب!) یہ کہنا ہے کہ تم میں جو آگے دین داری تھی، یعنی کتاب کا پڑھنا اور سکھانا، وہ اب نہیں رہی۔ اب میری صحبت میں پھر وہی کمال حاصل کرو۔'' (موضح) اور یہ بات اب قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

⑦ کسی شخص میں اگر علم اور کتب الٰہیہ کے پڑھنے پڑھانے سے اللہ تعالیٰ کی بندگی کی خصلت پیدا نہیں ہوتی تو یہ مشغلہ وقت ضائع کرنا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے علم سے پناہ مانگی ہے، آپ دعا کیا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ)) [مسلم، الذکر والدعاء، باب في الأدعية : ٢٧٢٢] ''اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔'' (فتح البیان)

آیت 80 ① وَلَا يَاْمُرَكُمْ ......: اور نہ نبی کا یہ حق ہے کہ تمھیں اس بات کا حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو۔ یہ کام تو صریح کفر ہے، پھر ایک پیغمبر تمھارے مسلمان ہونے کے بعد تمھیں کفر کا حکم کیسے دے سکتا ہے؟

② اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے طرز عمل پر چوٹ ہے، جنھوں نے انبیاء اور فرشتوں کی تعظیم میں اس قدر غلو کیا کہ ان کو رب تعالیٰ کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ انبیاء اور صالحین کی قبروں پر عمارتیں بنا کر ان میں ان کی تصویریں بنا ڈالیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

اور جب اللہ نے سب نبیوں سے پختہ عہد لیا کہ میں کتاب و حکمت میں سے جو کچھ تمھیں دوں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری عہد قبول کیا؟ انھوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو گواہ رہو اور تمھارے ساتھ میں بھی گواہوں سے ہوں ﴿۸۱﴾

سے روایت ہے کہ ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے ایک کنیسہ (گرجے) کا ذکر کیا، جو انھوں نے حبشہ میں دیکھا تھا، جس میں تصویریں تھیں۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی ہوتا اور وہ فوت ہو جاتا تو وہ لوگ اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے اور اس میں یہ تصویریں بنا دیتے، یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے ہاں ساری مخلوق سے بدتر ہوں گے۔'' [بخاری، مناقب الأنصار، باب هجرة الحبشة : ۳۸۷۳] اب آپ کو مسلمانوں کے ہر شہر اور تقریباً ہر محلے میں یہی نقشہ نظر آئے گا۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو چونا گچ کرنے، اس پر عمارت بنانے یا اس پر (مجاور بن کر) بیٹھنے سے منع فرمایا۔ [مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر والبناء عليه : ۹۷۰، عن جابر رضی اللہ عنہ] بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ہر تصویر کو مٹا دو اور ہر اونچی قبر کو برابر کر دو۔ [مسلم، الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر : ۹۶۹]

استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس آیت: ﴿ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ ﴾ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نبی یا فرشتے کی پرستش صریح کفر ہے اور کوئی ایک تعلیم یا فلسفہ، جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی بندگی سکھائے یا اللہ کے کسی نبی یا بزرگ کو رب تعالیٰ کے مقام پر بٹھائے، وہ ہرگز اللہ تعالیٰ یا اس کے نبی کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ "اَيَاْمُرُكُمْ" میں استفہام انکاری ہے، یعنی یہ ممکن ہی نہیں، کیونکہ انبیاء تو لوگوں کو عبادتِ الٰہی کی تعلیم دینے اور مسلمان بنانے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں نہ کہ الٹا کافر بنانے کے لیے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

آیت 81 ① وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ ...... : ان آیات سے مقصود ایسے دلائل کی وضاحت ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ثابت ہوتی ہے۔ (رازی) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کے بعد ہر نبی سے عہد لیا کہ وہ اپنے بعد آنے والے نبی کی تصدیق اور اس کی مدد کرے گا اور اس بارے میں کسی قسم کی گروہ بندی اور عصبیت اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اگر وہ نبی اس کی زندگی میں آ جائے تو بذات خود اس پر ایمان لائے گا اور اگر اس کی وفات کے بعد آئے تو وہ اپنی امت کو بعد میں آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرنے کا حکم دے کر جائے گا۔ اس اعتبار سے گویا موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پر اور عیسیٰ علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا ہے۔ طبری اور ابن ابی حاتم میں حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے عہد لیا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمھاری زندگی میں آ جائیں تو تم ان پر ایمان لاؤ گے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

پھر جو اس کے بعد پھر جائے تو یہی لوگ نافرمان ہیں ﴿۸۲﴾ تو کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کچھ اور تلاش کرتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے خوشی اور ناخوشی سے اسی کا فرماں بردار ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۸۳﴾ کہہ دے ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر نازل کیا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿۸۴﴾

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تفسیر کوئی الگ نہیں بلکہ پہلی تفسیر ہی میں شامل ہے۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور واجب الاتباع ہیں، اب آپ کے سوا کسی اور نبی کی اتباع جائز نہیں۔

❷ "اِصْرٌ" کسی چیز کے باندھنے اور زبردستی بند کرنے کو کہتے ہیں، یعنی بھاری بوجھ۔ اسی طرح مؤکد عہد کو بھی "اِصْرٌ" کہتے ہیں، کیونکہ وہ انسان کو باندھ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب انبیاء سے یہ عہد اور اقرار لیا، انھیں اس کی شہادت کا حکم دیا اور خود بھی شہادت دی۔

آیت 82 فَمَنْ تَوَلّٰى ...... : اس آیت میں اہل کتاب کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لا کر دراصل اس عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمھارے انبیاء سے اور ان کے ذریعے تم سے لیا گیا ہے، اب بتاؤ تمھارے فاسق ہونے میں کوئی شک وشبہ ہو سکتا ہے؟ (رازی)

آیت 82 ❶ طَوْعًا وَّ كَرْهًا : اگر کوئی کہے کہ بہت سے انسان اللہ کے فرماں بردار ہیں ہی نہیں تو جواب یہ ہے کہ وہ بھی فرماں بردار ہونے میں بے بس ہیں، ورنہ اپنا سانس یا دل کی دھڑکن یا بھوک و پیاس یا پیشاب و پاخانہ روک کر دکھائیں، ہاں اعمال سے متعلق انسان کو ایک حد تک اختیار دیا گیا ہے اور اسی سے متعلق باز پرس ہو گی۔

❷ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ : یعنی جب آسمان و زمین کی ہر چیز، فرشتے، جن و انس وغیرہ اللہ کے قانون فطرت کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور اختیاری و غیر اختیاری طور پر اس کے حکم کے تابع ہیں تو یہ لوگ اس کے قانون شریعت ''دِيْنِ اللّٰهِ'' کو چھوڑ کر دوسرا راستہ کیوں اختیار کرتے ہیں، انھیں چاہیے کہ اگر آخرت میں نجات چاہتے ہیں تو اللہ کا دین، جو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے ہیں، اسے اختیار کر لیں۔ نیز دیکھیے سورۂ آل عمران (۸۵)۔

آیت 84 قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ...... : اس آیت کی تشریح کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۳۶) دیکھیے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ
يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ
وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾

اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ
اٹھانے والوں سے ہوگا ﴿٨٥﴾ اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور (اس کے
بعد کہ) انھوں نے شہادت دی کہ یقیناً یہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو
ہدایت نہیں دیتا ﴿٨٦﴾ یہ لوگ! ان کی جزا یہ ہے کہ بے شک ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے ﴿٨٧﴾
ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے ﴿٨٨﴾

آیت 85 وَمَنْ يَّبْتَغِ...... : یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہو جانے کے بعد جو شخص آپ کی فرماں برداری اور اطاعت کا راستہ چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا، یا کسی پہلے راستے پر چلتا رہے گا، وہ چاہے کتنا توحید پرست کیوں نہ ہو اور پچھلے انبیاء پر ایمان رکھنے والا ہو، اگر وہ محمد ﷺ پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی دین داری اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگی اور وہ آخرت میں نامراد و ناکام ہوگا۔ واضح رہے کہ اگرچہ تمام انبیاء کا دین اسلام تھا، مگر آخری پیغمبر ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اسلام صرف آپ کی پیروی کا نام ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں بھی اب اسلام سے یہی مراد ہوتا ہے، اس معنی میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)) [مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ...... : ١٧١٨/١٨، عن عائشة رضی اللہ عنہا] ''جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔''

آیت 86 تا 88 ① یعنی جو لوگ حق کے پوری طرح واضح ہو جانے اور رسول اللہ ﷺ کے سچا نبی ہونے کے روشن دلائل دیکھنے کے باوجود محض کبر و حسد اور مال و جاہ کی محبت کی بنا پر کفر کی روش پر قائم رہے، یا ایک مرتبہ اسلام قبول کر لینے کے بعد پھر مرتد ہو گئے تو وہ سراسر ظالم و بدبخت ہیں، ایسے لوگوں کو راہِ ہدایت دکھانا اللہ تعالیٰ کا قانون نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرتد شخص کافر سے زیادہ مجرم ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

② حسن بصری رحمہ اللہ نے ایک اور آیت کے ساتھ اس کی بہترین تفسیر فرمائی کہ اس سے مراد اہل کتاب ہیں، وہ اپنی کتابوں میں محمد ﷺ کو موجود پاتے تھے، ان کی آمد پر ان کے ذریعے سے فتح کی دعائیں کیا کرتے تھے (گویا آپ پر ایمان رکھتے تھے) جب آپ تشریف لائے تو انھوں نے آپ کے ساتھ کفر اختیار کیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة : ٨٩] ''حالانکہ وہ اس سے پہلے

اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا
بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُهُمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افۡتَدٰى

مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۸۹﴾
بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا، پھر کفر میں بڑھ گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے
گی اور وہی لوگ سراسر گمراہ ہیں ﴿۹۰﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے
سو ان کے کسی ایک سے زمین بھرنے کے برابر سونا ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، خواہ وہ اسے فدیے میں دے

ان لوگوں پر فتح طلب کیا کرتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کے ساتھ کفر کیا، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (طبری بسند حسن)

آیت 89 ❶ اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا ......: اس سے معلوم ہوا کہ اگر مشرک صدقِ دل سے توبہ کر لے اور دوبارہ اسلام لے آئے تو اللہ تعالیٰ اس کی پچھلی غلطی کو معاف کر دیتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''انصار میں سے ایک آدمی اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جا ملا، پھر وہ پشیمان ہوا اور اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے کہلا بھیجا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرو کہ آیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (اس کے بھائی نے) اسے یہ آیت بھیج دی اور وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا۔ [نسائی، تحریم الدم، باب توبة المرتد ...... : ۴۰۷۳، وقال الالبانی صحیح] اس شخص کا نام حارث بن سوید تھا۔ (طبری)

❷ کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائے گا، فرمایا: ﴿لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ﴾ [البقرة: ۲۵۶] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' مگر کوئی مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو، پھر ارتداد سے توبہ نہ کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ)) ''جو اپنا دین (یعنی اسلام) بدل لے اسے قتل کر دو۔'' [بخاری، استتابة المرتدين و المعاندين وقتالهم، باب إثم من أشرك ...... : ۶۹۱۸]

آیت 90 یعنی یہود پہلے اقرار کرتے تھے کہ یہ یقیناً نبی ہے لیکن جب ان سے معاملہ ہوا تو وہ منکر ہو گئے۔ (موضح) اور ایسے لوگ بھی اس کا مصداق ہیں جو اسلام سے مرتد ہونے کے بعد موت کے وقت تک کفر پر قائم رہتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ حالت نزع میں اگر یہ لوگ توبہ کریں گے بھی تو ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ)) [ترمذی، الدعوات، باب إن الله يقبل التوبة ...... : ۳۵۳۷، حسنه الألبانی] ''یقیناً اللہ تبارک و تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک روح حلق تک نہ پہنچے۔'' نیز دیکھیے سورۂ نساء (۱۸) اور ''الضَّآلُّوۡنَ'' سے مراد ''کامل درجہ کے گمراہ ہیں۔'' (رازی)

بِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۹۱

ع ۹ ۱۱ ۱۷

یہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں (۹۱)

آیت 91 اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں اور کفر ہی کی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب سے ہلکے عذاب والے جہنمی سے پوچھے گا: ''اگر دنیا میں جو بھی چیز ہے تمھاری ہو جائے تو کیا تم اسے (اپنی جان بچانے کے لیے) فدیہ میں دے دو گے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں نے تم سے اس وقت جب تم آدم کی پشت میں تھے، اس سے بہت زیادہ آسان بات کا تقاضا کیا تھا کہ شرک نہ کرنا تو میں تمھیں دوزخ میں داخل نہیں کروں گا، لیکن تم نہ مانے اور شرک کرتے رہے۔'' [مسلم، صفات المنافقین، باب طلب الكافر الفداء ...... : ۲۸۰۵، عن أنس رضی اللہ عنہ]

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

تم پوری نیکی ہرگز حاصل نہیں کرو گے، یہاں تک کہ اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو اور تم جو چیز بھی خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۹۲﴾

آیت 92 ❶ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ …… : "الْبِرَّ" "کامل نیکی"، "مِمَّا تُحِبُّوْنَ" (اس میں سے کچھ خرچ کرو جس سے تم محبت رکھتے ہو) عام ہے، یعنی جان و مال، اولاد و اقارب، جاہ و عزت، غرض ہر چیز کو شامل ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو بھی ہے اور یہود کو بھی۔ مسلمانوں سے خطاب کی مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ پچھلی آیت میں بیان فرمایا ہے کہ کافر کو خرچ کرنے سے کچھ بھی نفع نہیں ہوگا، اب اس آیت میں مومنوں کو خرچ کرنے کی کیفیت بتلائی، جس سے آخرت میں انھیں نفع ہوگا۔

❷ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ …… : مقصد یہ کہ انسان جو کچھ بھی فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ، وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور انسان کو (بشرطیکہ مسلمان ہو اور اخلاص سے خرچ کرے) اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس لیے معمولی چیز خرچ کرنے کو بھی عار نہ سمجھے۔ مگر نیکی میں کامل درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عزیز ترین چیز صرف کی جائے۔ یہ آیت سن کر اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "یا رسول اللہ! میری جائداد میں سے مجھے سب سے محبوب "بَیْرُحَاء" باغ ہے (جو عین مسجد نبوی کے سامنے تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جایا کرتے اور اس کا نفیس پانی پیا کرتے تھے) اور اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ سو میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں، آپ اس کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ فرما دیں۔" [بخاری، الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الأقارب …… : ۱۴۶۱، مختصرًا] عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! مجھے خیبر میں سے جو حصہ ملا ہے اس سے بڑھ کر نفیس مال مجھے آج تک حاصل نہیں ہوا، میں نے ارادہ کیا ہے کہ اسے صدقہ کر دوں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اصل اپنے پاس رکھو اور اس کے پھل کو اللہ کے راستے میں تقسیم کر دو۔" چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے اسے وقف کر دیا۔ [بخاری، الشروط، باب الشروط فی الوقف : ۲۷۳۷۔ ابن ماجہ : ۲۳۹۶، ۲۳۹۷]

❸ یہود سے خطاب کی صورت میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "شاید یہود کے ذکر میں یہ آیت اس واسطے ذکر فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی، جس کے تھامنے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع نہ ہوتے تھے، تو جب وہی نہ چھوڑیں تو اللہ کی راہ میں درجۂ ایمان نہ پائیں۔" (موضح)

❹ مِمَّا تُحِبُّوْنَ: اللہ کا کرم دیکھیے، بندوں سے ان کی محبوب چیزیں ساری نہیں مانگیں، بلکہ اس میں سے کچھ خرچ کرنے ہی کو کامل نیکی قرار دے دیا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

کھانے کی ہر چیز بنی اسرائیل کے لیے حلال تھی مگر جو اسرائیل نے اپنے آپ پر حرام کر لی، اس سے پہلے کہ تورات اتاری جائے، کہہ دے تو لاؤ تورات، پھر اسے پڑھو، اگر تم سچے ہو ﴿۹۳﴾ پھر جس نے اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھا تو وہی ظالم ہیں ﴿۹۴﴾

آیت 94،93 كُلُّ الطَّعَامِ ......: اوپر کی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے اثبات میں دلائل پیش کیے اور اہل کتاب پر الزامات قائم کیے ہیں۔ اب یہاں سے ان کے شبہات کا جواب ہے، جو وہ آپ ﷺ کی نبوت پر پیش کرتے تھے۔ (رازی) جب قرآن نے بیان کیا کہ یہود کے ظلم اور سرکشی کی وجہ سے بہت سی چیزیں ان پر حرام کر دی گئیں (النساء: ۱۶۰۔ الانعام: ۱۴۶) ورنہ یہ چیزیں ابراہیم علیہ السلام کے عہدِ نبوت میں حلال تھیں، تو یہود نے ان آیات کو جھٹلایا اور کہنے لگے کہ یہ چیزیں تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حرام چلی آئی ہیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (شوکانی) بعض مفسرین نے ان آیات (۹۴،۹۳) کی شانِ نزول میں لکھا ہے کہ یہود تورات میں نسخ کے قائل نہیں تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہود نے اسی لیے جھٹلا دیا تھا کہ وہ تورات میں بعض حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے اور اسی لیے انھوں نے قرآن کے ناسخ و منسوخ پر بھی اعتراض کیا تو ان کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں کہ یہ نسخ تو خود تمھاری شریعت میں بھی موجود ہے کہ جب تک تورات نازل نہیں ہوئی تھی تو کھانے کی تمام چیزیں تمھارے لیے حلال تھیں، جن میں اونٹ کا گوشت اور دودھ بھی شامل ہے، پھر جب یعقوب علیہ السلام عرق النساء کے مرض میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے صحت یاب ہونے پر بطور نذر اونٹ کا گوشت حرام قرار دے لیا۔ پھر جب تورات نازل ہوئی تو اس میں اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام قرار دے دیا گیا۔ (ابن کثیر، الکشاف) حلال کو حرام قرار دے لینے کی یہ نذر ان کی شریعت میں جائز تھی۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک واقعہ میں شہد پینے کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تھا، گو یہ نذر نہ تھی مگر قرآن نے اس قسم کی نذر سے اور حلال کو حرام کرنے سے منع فرما دیا اور کفارہ مقرر فرما دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ تحریم۔

بعض نے لکھا ہے کہ یہود رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے سلسلہ میں یہ اعتراض بھی کرتے تھے کہ یہ پیغمبر خود کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا دعوے دار بتاتا ہے اور اونٹ کا گوشت کھاتا ہے، حالانکہ یہ گوشت ملتِ ابراہیمی میں حرام ہے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ تورات کے اترنے سے پہلے تو یہ سب چیزیں حلال تھیں، پھر ملتِ ابراہیمی میں یہ کیسے حرام ہو سکتی ہیں، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تورات میں دکھاؤ، ورنہ اللہ تعالیٰ پر اس قسم کے بہتان گھڑنے سے باز رہو۔ (ابن کثیر)

مسند احمد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہود کے رسول اللہ ﷺ سے چار سوال اور ان کے جواب مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾

کہہ دے اللہ نے سچ فرمایا، سو تم ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، جو ایک طرف کا تھا اور وہ شرک کرنے والوں سے نہ تھا ﴿۹۵﴾ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا، یقیناً وہی ہے جو بکہ میں ہے، بہت بابرکت اور جہانوں کے لیے ہدایت ہے ﴿۹۶﴾

یہ تھا کہ کھانے کی وہ کون سی چیزیں تھیں جنھیں یعقوب علیہ السلام نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے لیے حرام قرار دے لیا تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یہ دیا کہ اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام جب سخت بیمار ہو گئے تھے، ان کی بیماری بہت طول اختیار کر گئی تو انھوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ انھیں شفا عطا فرما دے تو وہ اپنے پسندیدہ کھانے اور پسندیدہ مشروب کو ترک کر دیں گے اور ان کا پسندیدہ کھانا اونٹ کا گوشت اور پسندیدہ مشروب اونٹ کا دودھ تھا۔ یہ بات سن کر یہود نے آپ کی تصدیق کی، آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! تو ان پر گواہ ہو جا۔'' [أحمد : ۱/ ۲۷۸، ح : ۲۵۱۸، و حسنه و صححه أحمد شاكر والحاكم و وافقه الذهبي۔ المعجم الكبير للطبراني : ۱۲/ ۱۹۰، ۱۹۱، ح : ۱۳۰۱۲] اس واقعہ کی ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ سے مناسبت بھی ظاہر ہے۔

آیت 95 **قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ......** : یعنی اللہ تعالیٰ کا بیان صدق پر مبنی ہے کہ کھانے کی یہ قسم پہلے حلال تھی، اس کے بعد اسرائیل اور ان کی اولاد پر حرام کر دی گئی، لہٰذا ''نسخ'' صحیح ہے اور تمھارا شبہ باطل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے، یہ عین ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے مطابق ہے۔ لہٰذا تم بھی دینِ اسلام میں داخل ہو جاؤ، جو اصول و فروع کے اعتبار سے عین دینِ ابراہیم کے مطابق ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 96 **اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ ......** : یہ یہود کے دوسرے شبہ کا جواب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے شام کی طرف ہجرت کی اور ان کی اولاد میں سے تمام انبیاء شام میں ہوئے، ان کا قبلہ بیت المقدس تھا اور مسلمانوں نے اس قدیم قبلہ کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنا لیا ہے، پھر یہ ملتِ ابراہیم کے متبع کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآن نے بتایا کہ دنیا میں سب سے پہلا عبادت خانہ تو کعبہ ہے، جو ''بکہ'' میں ہے۔ بکہ مکہ ہی کا نام ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت بخشا۔ اس پر بہت سے واضح دلائل موجود ہیں۔ جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ دورِ جاہلیت سے یہ محترم چلا آ رہا ہے کہ اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی اس میں داخل ہو جائے تو وہ اس سے تعرض نہیں کرتا، نیز اس میں مقامِ ابراہیم، یعنی وہ پتھر ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بانی ابراہیم علیہ السلام ہیں اور یہ کہ یہی ابراہیمی قبلہ ہے، کیونکہ بیت المقدس کی تعمیر کعبۃ اللہ سے چالیس برس بعد ہوئی۔

ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی؟'' آپ نے فرمایا: ''مسجد حرام۔'' پوچھا: ''پھر کون سی؟'' آپ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ۔'' پوچھا: ''ان

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

اس میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو کوئی اس میں داخل ہوا امن والا ہو گیا اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج (فرض) ہے، جو اس کی طرف راستے کی طاقت رکھے اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ تمام جہانوں سے بہت بے پروا ہے ﴿۹۷﴾

دونوں کے درمیان کتنی مدت ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''چالیس سال۔'' [بخاري، أحاديث الأنبياء، بابٌ : ۳۳۶۶]

آیت 97 ① وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کی (شہادت) کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا اور حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔'' [بخاري، الإيمان، باب دعاؤكم إيمانكم : ۸، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] ہر عاقل و بالغ مسلمان پر جو کعبہ تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے، اس پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج فرض ہے۔ [مسلم، الحج، باب فرض الحج مرة في العمر : ۱۳۳۷]

② مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا: استطاعت کی تفسیر حدیث میں زادِ راہ اور سواری سے کی گئی ہے۔ [ترمذي، الحج، باب ما جاء من التغليظ...... : ۸۱۲، عن علي رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ] شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الترغیب میں اسے حسن قرار دیا ہے اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ [هداية المستنير]

استطاعت کے مفہوم میں راستے کا پُر امن ہونا، جان و مال کے تلف ہونے کا اندیشہ نہ ہونا بھی شامل ہے اور عورت کے لیے محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مالی استطاعت ہو مگر جسمانی نہ ہو تو کوئی دوسرا اس کی جگہ حج کر لے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ خثعم قبیلے کی ایک عورت آئی، اس نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اللہ کا اپنے بندوں پر جو فریضۂ حج ہے، وہ میرے والد پر اس حال میں آیا ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہے، سواری پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا، تو کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟'' فرمایا: ''ہاں!'' اور یہ حجۃ الوداع کی بات ہے۔ [بخاري، جزاء الصيد، باب حج المرأة عن الرجل : ۱۸۵۵]

اسی طرح اگر کسی صاحب پر حج فرض تھا، جو سستی سے رہ گیا اور وہ فوت ہو گیا تو اس کی میراث میں سے حج ادا کیا جائے گا، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَاقْضِ اللّٰهَ فَهُوَ أَحَقُّ بِالْقَضَاءِ)) ''اللہ کا قرض ادا کرو، کیونکہ وہ پورا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے۔'' [بخاري، الأيمان والنذور، باب من مات و عليه نذر : ۶۶۹۹۔ مسلم : ۱۱۴۸]

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

کہہ دے اے اہل کتاب! تم کیوں اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے ہو، جب کہ اللہ اس پر پوری طرح شاہد ہے جو تم کرتے ہو﴿۹۸﴾ کہہ دے اے اہل کتاب! تم اللہ کے راستے سے اس شخص کو کیوں روکتے ہو جو ایمان لے آیا، تم اس (راستے) میں کوئی نہ کوئی کجی تلاش کرتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو اور اللہ اس سے ہرگز غافل نہیں جو تم کر رہے ہو﴿۹۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان میں سے کچھ لوگوں کا کہنا مانو گے، جنھیں کتاب دی گئی ہے، تو وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں گے﴿۱۰۰﴾

ایک صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کی طرف سے وہ شخص حج کرے جو پہلے اپنا حج کر چکا ہو۔ [أبو داوٗد، المناسك، باب الرجل يحج عن غيره : ۱۸۱۱، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما]

❸ وَ مَنْ كَفَرَ : اس سے معلوم ہوا کہ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا کفر ہے اور جو کفر کرے تو اس بے چارے کی کیا اوقات ہے، اللہ تعالیٰ تو سارے جہانوں سے بے پروا ہے۔ اسلام کی پانچ بنیادوں کے ترک اور دوسری چیزوں کے ترک کا یہی فرق ہے کہ ان پانچوں میں سے کسی کے ترک سے اسلام کی بنیاد ڈھے جاتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابو بکر اسماعیلی الحافظ رحمہ اللہ کی سند سے امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''جو شخص حج کی طاقت رکھے اور پھر حج نہ کرے تو اس پر برابر ہے کہ یہودی ہونے کی حالت میں مرے یا نصرانی ہونے کی حالت میں۔'' امام ابن کثیر نے فرمایا: ''یہ سند عمر رضی اللہ عنہ تک صحیح ہے۔''

آیت 99،98 قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ ...... : اہل کتاب کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد اب انھیں ڈانٹ پلائی جا رہی ہے کہ تم نہ صرف یہ کہ حق پر خود ایمان نہیں لاتے، بلکہ جو لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں ان میں طرح طرح کے فتنے اور شوشے چھوڑ کر حق کی راہ میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ ''تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا'' کا مطلب ہے: ''تَبْغُوْنَ فِيْهَا عِوَجًا'' (تم اس دین میں کوئی نہ کوئی کجی تلاش کرتے ہو) اور پھر یہ سب کچھ جان بوجھ کر کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تمھارے یہ کرتوت خوب معلوم ہیں، تمھیں اپنے اس جرم کی سزا بھگتنا پڑے گی۔ ''سَبِيْلِ اللّٰهِ'' سے مراد یہاں اسلام ہے۔

آیت 100 ❶ اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا ...... : اوپر کی دو آیتوں میں اہل کتاب کو وعید سنائی گئی جو لوگوں کو گمراہ کر رہے تھے، اب یہاں سے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی جا رہی ہے کہ ان سے ہوشیار رہیں اور گمراہی میں نہ پڑ جائیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۠﴿۱۰۱﴾ ع ۱۰

اور تم کیسے کفر کرتے ہو، حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا رسول (موجود) ہے اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی گئی۔﴿۱۰۱﴾

لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے شبہات کا جواب دے کر مسلمانوں سے فرمایا کہ ان کی بات مت سنو، یہی علاج ہے، ورنہ شبہات سنتے سنتے اپنی راہ سے پھسل جاؤ گے۔ اب بھی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ شک پیدا کرنے والوں کی بات نہ سنیں، اس میں دین کی سلامتی ہے اور بحث سے جھگڑے بڑھتے ہیں۔'' (موضح)

❷ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ...... : ایمان کے بعد پھر کافر بنا دینے میں یہ بھی شامل ہے کہ ان کا کام آپس میں لڑانا ہے۔ اگر ان کی بات مانو گے تو آپس کے اتفاق اور محبت سے محروم ہو جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے بعد پھر کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔'' [بخاری، المغازی، باب حجۃ الوداع : ۴۴۰۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] یاد رہے کہ اس کفر سے مراد اسلام میں رہ کر کفر ہے، مرتد ہونا نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دو لڑنے والے گروہوں میں سے دونوں کو مومن قرار دے کر ان کے درمیان صلح کروانے کا حکم دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجرات (۹، ۱۰)۔

آیت 101 ❶ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ ...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''جاہلیت میں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی رہی تھی، اب ایک دفعہ وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے آپس میں جو کچھ ہوا تھا اس کا ذکر کیا تو دونوں غصے میں آ گئے اور ایک دوسرے کے مقابلے کے لیے اسلحہ لینے کے لیے اٹھے، تو اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ﴾ [ابن أبی حاتم : ۳/ ۱۱۰، ح : ۳۹۴۸۔ طبری]

❷ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ : یعنی تمھاری طرف سے کفر کا ارتکاب بہت بعید ہے، کیونکہ اللہ کی آیات تم پر پڑھی جا رہی ہیں، اس کا رسول بنفس نفیس تم میں موجود ہے اور جو شخص اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لے تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی گئی۔ اس کے مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن نصیحت کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔ آج گو ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس موجود نہیں ہیں، مگر اللہ کی کتاب، یعنی قرآن کریم اور آپ ﷺ کی سنت موجود ہے، جن پر عمل پیرا ہو کر موجودہ دور کے فتنوں اور ہر قسم کی بدعت و ضلالت سے مسلمان محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اب بغیر دیکھے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اور کتاب و سنت پر عمل کرنا بہت بڑے اجر کا باعث ہے۔ ابن محیریز کہتے ہیں کہ میں نے ابو جمعہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ہمیں کوئی حدیث سناؤ جو تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو انھوں نے کہا: ''ہاں، میں تمھیں ایک جید حدیث سناؤں گا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ناشتہ کیا اور ہمارے ساتھ ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی تھے، انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم سے بھی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ اعْتَصِمُوْا
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ
مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلم
ہو﴿۱۰۲﴾ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب
دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی تو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ
کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تمھیں اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر
بیان کرتا ہے، تاکہ تم ہدایت پاؤ﴿۱۰۳﴾

کوئی بہتر ہے؟ ہم آپ کے ساتھ اسلام لائے اور آپ کے ساتھ جہاد کیا؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، وہ لوگ جو تمھارے بعد ہوں گے، وہ مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انھوں نے مجھے دیکھا نہیں۔'' [أحمد : ۴/ ۱۰۶، ح : ۱۶۹۷۸، ۱۶۹۷۹، و سنده صحيح]

امام احمد کے علاوہ ابونعیم، حاکم اور ابویعلی الموصلی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی شروع کی آیات ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ کی تفسیر میں اس مفہوم کی کئی احادیث حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لائے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ ہم میں موجود نہیں، بلکہ اب ہم ایمان بالغیب لا کر قرآن و سنت پر عمل کریں گے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ حجرات (۷)۔

آیت 102 ❶ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ...... : عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر یوں مروی ہے: ''اس کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے بھلایا نہ جائے، اس کا شکر ادا کیا جائے ناشکری نہ کی جائے۔'' [ابن أبي حاتم ۳/ ۱۱۲۔ مستدرك حاكم : ۲/ ۳۲۳، ح : ۳۱۵۹] ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قول کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، مراد حسب استطاعت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن : ۱۶] ''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

❷ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ: چونکہ موت کا علم ہی نہیں کب آ جائے، اس لیے موت آنے تک ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اسی طرح ڈرتے رہو۔

آیت 103 ❶ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ...... : مومنوں کو اہل کتاب کی اطاعت سے دور رہنے کی نصیحت فرما کر اب یہاں سے چند اصولی باتوں کا حکم دیا جا رہا ہے، جن کی پابندی سے انسان ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا جیسے ڈرنے کا حق ہے، سب کا مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا اور جدا جدا نہ ہونا اور اللہ کی نعمت، یعنی دلوں

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور لازم ہے کہ تمھاری صورت میں ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں﴿۱۰۴﴾

میں الفت ڈالنے کو یاد رکھنا۔

❷ اللہ کی رسی سے مراد قرآن ہے، درحقیقت یہ ایک استعارہ ہے کہ اگر کچھ لوگ پہاڑ کی بلندی سے کسی گہری کھائی میں گر پڑیں تو انھیں نکالنے کے لیے اوپر سے رسی پھینکی جاتی ہے۔ اب جو لوگ مل کر اس رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں وہ اس رسی کے ساتھ اوپر نکل آئیں گے اور دوسرے گڑھے ہی میں رہ جائیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے گمراہی کے گڑھے سے نکالنے کے لیے آسمان سے قرآن اتارا ہے، جس کے ساتھ وحی الٰہی، یعنی سنت رسول بھی اتاری ہے۔ مسلمان موجودہ فرقہ بندیوں سے بھی اسی صورت میں نجات پا سکتے ہیں کہ قرآن مجید کو لائحہ عمل قرار دیں اور ذاتی خیالات و آراء کو ترک کر کے سنت کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں اور مشائخ و ائمہ کے اقوال و فتاویٰ کو قرآن و سنت کا درجہ دے کر گروہ بندی اختیار نہ کریں۔

❸ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً ...... : اسلام سے پہلے اوس اور خزرج ہی نہیں بلکہ تمام عرب کفر و شرک اور باہمی عداوتوں میں مبتلا تھے۔ اسی کو یہاں آگ کے گڑھے کے کنارے پر ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں آگ میں گرنے سے بچا لیا اور عداوت کے بجائے اخوت پیدا کر دی۔ اگر اس عداوت کا اندازہ کرنا ہو تو سورۂ انفال (۶۲، ۶۳) کا مطالعہ کریں۔

آیت 104 وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ ......: یعنی اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوط پکڑنے اور اختلاف و ضلالت سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ تم میں سے ایک جماعت نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کا فریضہ سرانجام دیتی رہے۔ جب تک اس قسم کی جماعت قائم رہے گی، لوگ ہدایت پر رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، پھر اگر طاقت نہ رکھے تو اپنی زبان سے، پھر اگر طاقت نہ رکھے تو اپنے دل سے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' [مسلم، الإیمان، باب بیان کون النہی عن المنکر...... : ۴۹، عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کے لیے اور دین کا تقید کرنے (پابندی کرنے اور کروانے) کے لیے، تا کہ کوئی دین کے خلاف نہ کرے اور جو اس کام پر قائم ہوں وہی کامیاب ہیں اور یہ کہ کوئی کسی سے واسطہ نہ رکھے ''موسیٰ بدین خود، عیسیٰ بدین خود'' (موسیٰ اپنے دین پر اور عیسیٰ اپنے دین پر) یہ راہ مسلمان کی نہیں ہے۔'' (موضح)

یہ تفسیر ''مِنْكُمْ'' کے ''مِنْ'' کو بعض کے معنی میں لینے کی صورت میں ہے، جیسا کہ عام طور پر ''وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ''

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو الگ الگ ہو گئے اور ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۰۵﴾

میں "مِنْ" کو تبعیض کے لیے سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر کی رو سے مسلمانوں کی ایک جماعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے کافی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے فرمان "وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کے ہر فرد پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، کیونکہ آخر میں فرمایا کہ کامیاب صرف وہ ہیں جو یہ فریضہ سرانجام دیں اور ظاہر ہے کہ کامیابی کی ضرورت ہر مسلمان کو ہے۔ اس لیے یہاں "مِنْكُمْ" کے "مِنْ" کو بیانیہ ماننا پڑے گا اور معنی یہ ہو گا کہ اے مسلمانو! تمھاری صورت میں ایک ایسی جماعت ہونا لازم ہے جو نیکی کا حکم دیں۔ ابن جزی نے فرمایا: " وَ قَوْلُهُ "مِنْكُمْ" دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهٗ فَرْضُ كَفَايَةٍ لِاَنَّ مِنْ لِلتَّبْعِيْضِ وَ قِيْلَ اِنَّهَا لِبَيَانِ الْجِنْسِ وَالْمَعْنَى كُوْنُوْا اُمَّةً " "یعنی ایک قول یہ ہے کہ "مِنْ" جنس کے بیان کے لیے ہے اور معنی یہ ہے کہ تم سب ایسی امت بن جاؤ جو ......۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ [الحج : ۳۰] "پس گندگی سے بچ جاؤ جو بت ہیں۔" ابن جزی کہتے ہیں: "مِنْ" لِبَيَانِ الْجِنْسِ كَاَنَّهٗ قَالَ الرِّجْسُ هُوَ الْاَوْثَانُ " یعنی "مِنْ" جنس کے لیے ہے اور "رجس" سے مراد بت ہیں۔ [التسهيل لابن جزی]

آیت 105 وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا ......: اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلاف اور فرقہ بندی کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں حق کا پتا نہ تھا اور وہ اس کے دلائل سے بے خبر تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے سب کچھ جانتے ہوئے محض اپنے دنیاوی مفاد اور نفسانی اغراض کے لیے اختلاف اور فرقہ بندی کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس پر جمے ہوئے تھے۔ قرآن مجید نے مختلف طریقوں سے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی اور اس سے دور رہنے کی تاکید فرمائی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہود اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) فرقوں میں جدا جدا ہو گئے، اسی طرح نصاریٰ بھی اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں جدا جدا ہو جائے گی۔" [ترمذی، الإيمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الأمة : ۲٦٤٠، و قال حسن صحيح] دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ آپ نے فرمایا: "سب آگ میں جائیں گے مگر ایک۔" پوچھنے پر بتایا: ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ)) "جس طریقے پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔" [ترمذی، الإيمان، باب ما جاء فی افتراق هذه الأمة : ۲٦٤١، و حسنه الألبانی]

افسوس! امت مسلمہ کے تفرقہ بازوں نے بھی وہی روش اختیار کی کہ حق اور اس کے روشن دلائل قرآن کریم اور سنت صحیحہ کی صورت میں انھیں خوب اچھی طرح معلوم ہیں، مگر وہ اپنی فرقہ بندیوں پر جمے ہوئے ہیں اور اپنی عقل و ذہانت کا سارا زور پہلی امتوں کی طرح تاویل و تحریف کے مکروہ شغل میں ضائع کر رہے ہیں۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ
بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ
فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ
يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
ع ۱۱ / ۸ / ۲ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے، تو وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے، کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا؟ تو عذاب چکھو، اس وجہ سے کہ تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۱۰۶﴾ اور رہے وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہوں گے، سو اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۰۷﴾ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اللہ جہانوں پر کوئی ظلم نہیں چاہتا ﴿۱۰۸﴾ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں ﴿۱۰۹﴾

آیت 106 اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ : اس سے بظاہر تو مرتدین مراد ہیں، مگر درحقیقت یہ تمام کفار کو شامل ہے، کیونکہ جب ثابت ہے کہ روز اول کے وقت سب نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کا اقرار کیا تھا اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ ہر شخص دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لہٰذا جو بھی کفر اختیار کرے گا وہ ایمان لانے کے بعد ہی کافر ہوگا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اصلی کافر، مرتدین، منافقین اور پھر اہل بدعت بھی آ جاتے ہیں، کیونکہ یہ سب ایمان لانے کے بعد کفر کر رہے ہیں۔ (رازی، شوکانی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''معلوم ہوا کہ سیاہ منہ ان کے ہیں جو مسلمانی میں کفر کرتے ہیں، منہ سے کلمۂ اسلام کہتے ہیں اور عقیدہ خلاف رکھتے ہیں، سب گمراہ فرقوں کا یہی حکم ہے۔'' (موضح)

آیت 107 وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ : چہروں کی یہ سیاہی اور سفیدی قیامت کے دن ہوگی۔ جو لوگ ایمان پر قائم رہے، پھر بدعات اور گروہ بندی سے بچ کر اصل کتاب و سنت « مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ » پر قائم رہے، ان کے چہرے سفید ہوں گے۔

آیت 108 وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ : یعنی جہاد اور امر بالمعروف کا جو حکم فرمایا یہ مخلوق پر ظلم نہیں، اس میں ان کی تربیت ہے۔ (موضح) جب اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم اور ہر چیز پر قدرت حاصل ہے تو اسے کسی پر ظلم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 109 وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ...... : یعنی جہاد میں خلق کی جان و مال تلف ہو تو مالک کے حکم سے ہے، ہر چیز اللہ کا مال ہے۔ (موضح)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا، ان میں سے کچھ مومن ہیں اور ان کے اکثر نافرمان ہیں ﴿۱۱۰﴾

آیت 110 ❶ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ ...... : یعنی یہ امت ہر امت سے بہتر ہے انھی دو صفات میں، امر بالمعروف یعنی جہاد اور ایمان یعنی توحید کا تقید (پابندی) اس قدر کسی اور دین میں نہیں۔ (موضح) ان دو صفتوں سے پہلے ایک اور صفت بھی ذکر فرمائی ہے اور وہ ہے "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" یعنی یہ امت پیدا ہی لوگوں کی خیر خواہی اور اصلاح کے لیے کی گئی ہے۔ یاد رہے! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد جہاد ہے، وہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے یا دل سے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی یہ تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: ((خَيْرَ النَّاسِ لِلنَّاسِ تَأْتُوْنَ بِهِمْ فِي السَّلَاسِلِ فِيْ أَعْنَاقِهِمْ حَتّٰى يَدْخُلُوْا فِي الْإِسْلَامِ)) [بخاري، التفسير، باب : ﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس﴾ : ٤٥٥٧] "تم لوگوں کے حق میں تمام لوگوں سے بہتر ہو کہ ان کی گردنوں میں زنجیریں ڈال کر لاتے ہو، حتیٰ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔" معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم ستر (۷۰) امتوں کو پورا کر رہے ہو، جن میں سے تم اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بہتر اور سب سے معزز ہو۔" [أحمد : ٤٤٧/٤، ح : ٢٠٠٣٧۔ ترمذي، التفسير، باب ومن سورة آل عمران : ٣٠٠١، و حسنه الألباني]

❷ کچھ لوگ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے لوگ خود بخود برائی چھوڑ دیں گے، اگر ایسا ہوتا تو برائی سے منع کرنے کا حکم نہ ہوتا اور سب سے بڑی برائی شرک و کفر کو زبان سے روکنے کے ساتھ قتال (لڑنا) فرض نہ ہوتا۔

❸ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ : یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں دنیا کے کاروبار کا جو نقصان ہوتا ہے تم اس کی پروا نہیں کرتے، بلکہ اللہ پر یقین رکھتے ہو کہ وہ اپنا کام سرانجام دینے والوں کے لیے کوئی کمی نہیں رہنے دے گا۔

❹ خَيْرَ اُمَّةٍ : اس کا ایک معنی پہلے گزر چکا کہ یہ امت تمام امتوں سے بہتر ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہے کہ تم پوری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر ہو، کیونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر (جہاد) اور ایمان باللہ (توحید خالص کا عقیدہ) تم میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس سے صحابہ کی فضیلت معلوم ہوتی ہے اور ان پر کفر کا فتویٰ لگانے والوں کے منہ میں خاک پڑتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ الفاظ کے لحاظ سے دونوں معنی درست ہیں اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے۔

❺ بہترین امت ہونے کا وصف چند شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، یعنی لوگوں کی خیر خواہی و اصلاح، امر بالمعروف و نہی عن المنکر (جہاد) اور ایمان باللہ (توحید خالص)، جب اس امت میں یہ چیزیں نہیں رہیں گی تو وہ بہترین امت ہونے کے وصف

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ۙ

وہ تمھیں ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے مگر معمولی تکلیف اور اگر تم سے لڑیں گے تو تم سے پیٹھیں پھیر جائیں گے، پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے ﴿۱۱۱﴾ ان پر ذلت مسلط کر دی گئی جہاں کہیں وہ پائے جائیں مگر اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ کے ساتھ اور وہ اللہ کے بھاری غضب کے ساتھ لوٹے اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی، یہ اس لیے کہ بے شک وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرتے تھے، یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿۱۱۲﴾

سے محروم ہو جائے گی، جیسا کہ یہود کے بارے میں آتا ہے: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾ [المائدة : ۷۹] ''وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے۔'' جیسا کہ اب اس امت کا حال ہو رہا ہے۔

6 وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ...... : اس آیت میں اہل کتاب کو اسلام لانے کی ترغیب ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان میں سے کچھ مومن ہیں، مگر اکثر فاسق ہیں اور یہ اللہ کی مشیت ہے جس کی حکمت وہی جانتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [يوسف : ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ خواہ تو حرص کرے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں۔'' اس سے جمہوریت کا بھی رد ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی قسم کی ہو۔

آیت 111 اِلَّاۤ اَذًى: "اَذًى" میں تنوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''معمولی تکلیف'' کیا ہے، مراد زبانی بہتان تراشی اور سازشیں ہیں، مگر میدان میں تمھارے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہود کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہر جگہ شکست ہوئی اور رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا، بالآخر نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے انھیں جزیرۂ عرب سے جلاوطن کر دیا۔ یہ آیت اخبار بالغیب اور پیشین گوئی پر مشتمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس میں فتح و کامیابی اور نصرت کی بشارت دی ہے۔ اب اگرچہ یہود نصرانیوں کے بل بوتے پر فلسطین کے کچھ حصے اور بیت المقدس پر قابض ہیں، مگر وہ وقت قریب آ رہا ہے کہ جب مسلمانوں کے ساتھ یہود کی جنگ میں پتھر اور درخت بھی مسلمان کو بلا کر کہیں گے: ''اے مسلم! یہ میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اسے قتل کر دے۔'' [مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعة حتی...... : ۲۹۲۱، ۲۹۲۲]

آیت 112 1 ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ...... : یعنی مغلوب ہونے کے ساتھ ہی ان پر ذلت بھی مسلط کر دی گئی۔ سورۂ بقرہ (۶۱) یہود کی اس ذلت سے بچاؤ کی دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ کی پناہ میں آ جائیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

وہ سب برابر نہیں۔ اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم ہے، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدے کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین سے ہیں ﴿۱۱۴﴾

وہ اسلام قبول کر لیں، یا اسلامی مملکت میں جزیہ دے کر ذمی کی حیثیت سے رہنا قبول کر لیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگوں کی پناہ ان کو حاصل ہو جائے۔ اس کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ اسلامی مملکت کے بجائے عام مسلمان ان کو پناہ دے دیں، جیسا کہ ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے اور اسلامی مملکت کے حکمرانوں اور تمام مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ معمولی درجے کے مسلمان حتیٰ کہ کسی عورت کی دی ہوئی پناہ کو بھی رد نہ کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ کسی بڑی غیر مسلم طاقت کی پشت پناہی انھیں حاصل ہو جائے، کیونکہ ''النَّاسِ'' عام ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔

❷ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : یعنی نافرمانی اور حد سے گزرنے کا اثر یہ ہوا کہ وہ کفر کرنے لگے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگے، پھر کفر اور قتل انبیاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا غضب اترا، ذلیل و محتاج ہو گئے، حکومت اور ریاست چھن گئی۔ حاصل یہ کہ ذلت و غضب اور مسکنت کی وجہ کفر اور قتلِ انبیاء ہے اور کفر اور قتلِ انبیاء کی وجہ ان کی نافرمانی اور زیادتی ہے، پس ''ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا'' سے سبب کے سبب کی طرف اشارہ ہے۔

آیت 113 ❶ لَيْسُوْا سَوَآءً ...... : یعنی گو اہل کتاب کی اکثریت فاسق ہے مگر سب ایک جیسے نہیں، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ایمان لے آتے ہیں۔ طبری اور ابن ابی حاتم نے حسن سندوں کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعید، اسید بن سعید، اسد بن عبید رضی اللہ عنہم اور ان کے دوسرے ساتھی مسلمان ہوئے اور اسلام میں رغبت رکھ کر پکے ہو گئے تو یہودی مولوی اور ان کے بے ایمان لوگ کہنے لگے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے صرف ہمارے برے لوگ ہی لگے ہیں، اگر وہ ہمارے اچھے لوگ ہوتے تو اپنے آباء کا دین چھوڑ کر غیر کی طرف نہ جاتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات (۱۱۳، ۱۱۴) نازل فرمائیں۔ یہ الفاظ طبری کے ہیں۔ اہل کتاب کے ان اچھے لوگوں کا ذکر سورۂ آل عمران (۱۹۹)، بنی اسرائیل (۱۰۷ تا ۱۰۹) اور سورۂ بقرہ (۱۲۱) میں بھی ہے۔

❷ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ ...... : یعنی رات کو قیام کرتے ہیں اور تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ ''قَآئِمَةٌ'' کا ایک معنی ''مُسْتَقِيْمَةٌ'' ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماں بردار ہیں اور ان کی شریعت پر قائم ہیں۔

آیت 114 يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ...... : یہ یہود پر طنز ہے کہ جن لوگوں کو تم برا کہتے ہو ان میں تو یہ نیک اوصاف ہیں، وہ برے

وَ مَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

اور وہ جو نیکی بھی کریں اس میں ان کی بے قدری ہرگز نہیں کی جائے گی اور اللہ متقی لوگوں کو خوب جاننے والا ہے﴿۱۱۵﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا نہ کبھی ان کے اموال انھیں اللہ سے (بچانے میں) کچھ کام آئیں گے اور نہ ان کی اولاد اور وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں﴿۱۱۶﴾ اس کی مثال جو وہ اس دنیا کی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس ہوا کی مثال جیسی ہے جس میں سخت سردی ہے، جو ایسے لوگوں کی کھیتی کو آ پہنچی جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو اس نے اسے برباد کر دیا اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ (خود) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں﴿۱۱۷﴾

کیسے ہو گئے، وہ تو صالحین میں سے ہیں۔

آیت 115 وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ ...... : یعنی اہل کتاب میں سے جو لوگ بھی صفاتِ مذکورہ سے متصف ہو جائیں گے انھیں صرف ان کے بعد کے نیک اعمال کا ثواب ہی نہیں ملے گا بلکہ اسلام میں داخل ہونے سے قبل کی نیکیوں کا اجر بھی حاصل ہوگا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''تین آدمیوں کو دوہرا اجر ملے گا، ان میں سے ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص ہے جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر مجھ پر بھی، تو اسے دو اجر ملیں گے، دوسرا وہ غلام جو کسی کی ملکیت میں ہے، اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور اپنے مالکوں کا بھی، اس کے لیے بھی دو اجر ہیں اور تیسرا وہ آدمی جس نے اپنی لونڈی کو ادب سکھایا اور اچھا ادب سکھایا، پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا تو اس کے لیے بھی دو اجر ہیں۔'' [بخاری، العلم، باب تعلیم الرجل أمته و أهله : ۹۷۔ مسلم : ۱۵٤] اور دیکھیے سورۂ حدید (۲۸)۔

آیت 117,116 ❶ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ ...... : یعنی جو مال خرچ کیا اور اللہ کی رضا پر نہ دیا، آخرت میں دیا نہ دیا برابر ہے۔ (موضح)

عام طور پر مصیبت کے وقت اولاد انسان کے کام آتی ہے، مگر اس وقت کفار کی اولاد ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔ اوپر کی آیات میں مومن اور متقی کے نیک اعمال کا انجام ذکر فرمایا کہ ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی بھی ضائع نہیں ہوگی، بلکہ اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اب اس آیت میں کافر کے صدقہ و خیرات اور رفاہی کاموں کو آخرت میں بے فائدہ اور ضائع ہونے کے اعتبار سے ان لوگوں کی کھیتی سے تشبیہ دی ہے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، جو کھیتی دیکھنے میں سرسبز و شاداب نظر آئے لیکن یکایک سخت سرد ہوا چلے اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ یہی حال کفار کے صدقہ و خیرات کا ہے، وہ چونکہ ایمان و اخلاص کی

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے، وہ ہر ایسی چیز کو پسند کرتے ہیں جس سے تم مصیبت میں پڑو۔ ان کی شدید دشمنی تو ان کے مونھوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپا رہے ہیں وہ زیادہ بڑا ہے۔ بے شک ہم نے تمھارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، اگر تم سمجھتے ہو۔ ﴿۱۱۸﴾

دولت سے محروم ہیں، اس لیے آخرت میں ان کے اعمال تباہ و برباد ہو جائیں گے اور انھیں ان اعمال کا کچھ بھی اجر نہیں ملے گا۔ مزید دیکھیے سورۂ فرقان (۲۳) اور سورۂ نور (۳۹، ۴۰) ہاں کفار کو دنیا ہی میں ان کے اچھے اعمال کا بدلہ مل جائے گا۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۲۰) ”صِرٌّ“ شدید ٹھنڈی ہوا جو کھیتوں کو جلا دے۔ واضح رہے کہ قرآن میں عموماً ”رِيْحٌ“ کا لفظ عذاب کے لیے استعمال ہوا ہے اور ”رِيَاحٌ“ جمع کا لفظ رحمت کے لیے۔ (مفردات) سورۂ یونس (۲۲) میں ”رِيْحٌ“ کا لفظ موافق ہوا کے لیے آیا ہے: ﴿ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ ﴾ دوسرے مقامات پر عذاب کی ہوا کے لیے آیا ہے۔

② وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ ...... : یعنی ان کے اعمال جو ضائع اور برباد ہوئے یہ اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم کیا ہے، بلکہ خود ان کے اپنے اوپر ظلم کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ انھوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں اور کتابوں کی تصدیق کی اور نہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کیے، بلکہ ریاکاری کرتے رہے۔

آیت 118 ① ”بِطَانَةً“ پوشیدہ چیز اور وہ کپڑا جو اوپر والے کپڑے کے نیچے جسم کے ساتھ ملا ہوتا ہے، مراد دلی دوست خاص راز دار۔ یہ باب ”نَصَرَ“ سے مصدر ہے، واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ ”مِنْ دُوْنِكُمْ“ (اپنے مخلص مسلمانوں کے سوا) اس کا تعلق ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴾ [آل عمران : ۱۰۰] سے ہے اور اس میں کفار کی طرف میلان اور ان کی دوستی سے منع فرمایا گیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے: ”مسلمانوں میں سے کچھ آدمی یہودیوں سے میل جول اور تعلقات رکھتے تھے۔ کیونکہ اسلام سے پہلے وہ آپس میں ہمسائے اور حلیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کر کے انھیں اپنے اندرونی راز داں اور دلی دوست بنانے سے منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں (راز افشا ہونے اور) ان کی طرف سے فتنے کا شدید خطرہ تھا۔“

ابن ابی حاتم ہی نے صحیح سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ اہل حیرہ سے ایک نوجوان محفوظ رکھنے والا کاتب ہے، آپ اسے کاتب (سیکرٹری) رکھ لیں۔ فرمایا: ”پھر تو میں مومنوں کے سوا ”بِطَانَةً“ (راز دار) بنانے والا ہوں گا۔“ [ابن أبي حاتم : ۱۴۷/۳، ح : ۴۰۸۷] ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

دیکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تم ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو تم پر غصے سے انگلیوں کی پوریں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ کہہ دے اپنے غصے میں مر جاؤ، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۹﴾

اس ایک نصرانی کاتب ہے۔'' انھوں نے فرمایا: ''اللہ تجھے مارے، یہ تم نے کیا کیا؟ کیا تم نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ؕۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ﴾ [المائدۃ : ٥١] تم نے کسی مسلمان کو کیوں نہیں رکھا؟'' میں نے عرض کی: ''اے امیر المومنین! مجھے اس کی کتابت سے غرض ہے، اس کا دین اس کے لیے ہے۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب اللہ نے انھیں رسوا کر دیا ہے تو میں ان کی تکریم نہیں کر سکتا، جب اللہ نے انھیں ذلیل کیا ہے تو میں انھیں عزت نہیں دے سکتا، جب اللہ نے انھیں دور کر دیا ہے تو میں انھیں قریب نہیں کر سکتا۔'' [السنن الکبرٰی للبیھقی : ١٠/ ١٢٧، ح : ٢٠٩١١، وھو حسن]

''مِنْ دُوْنِكُمْ'' (اپنے سوا) کے الفاظ عام ہیں، یہود و نصاریٰ، منافقین اور مشرکین سبھی ''مِنْ دُوْنِكُمْ'' میں داخل ہیں، اس لیے انتظامی امور میں کسی منافق یا غیر مسلم (ذمی) کو متعین کرنا ممنوع ہے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے راز فاش ہونے کا خطرہ ہے۔ بلکہ مسلمان کے لیے مشرکین کے ملک میں رہنا بھی درست نہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (٩٧، ٩٨)۔

افسوس کہ اس وقت مسلمان ملکوں کے حکمرانوں نے اللہ کے اس حکم کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور غیر مسلم ان کے کلیدی عہدوں پر فائز اور تقریباً تمام اہم رازوں سے آگاہ ہیں، نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

2 لَا يَاْلُوْنَكُمْ: '' اَلَا يَأْلُوْ (ن) '' کمی کرنا، کوتاہی کرنا۔ ''خَبَالًا'' خرابی ڈالنا، نقصان پہنچانا۔ ''مَا عَنِتُّمْ'' ''عَنَتٌ'' مشقت، تکلیف، یعنی ''جس سے تم تکلیف میں پڑو۔'' دلی دوست نہ بنانے کے حکم کی وجہ کی طرف اشارہ ہے، یعنی اگرچہ یہ لوگ اپنی منافقت کی بنا پر تم سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہتے جن سے تمھیں ان کی اسلام دشمنی کا پتا چل سکے، مگر شدید عداوت کی وجہ سے ان کی زبان پر ایسے الفاظ آ ہی جاتے ہیں، جن سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ یہ تمھارے خیر خواہ نہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں اور تمھارے خلاف جو جذبات اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

3 قَدْ بَيَّنَّا...... : یعنی کفار سے دوستی نہ کرنے کے سلسلہ میں یہودیوں اور منافقین کے بغض و عناد اور ان کے دلی حسد سے متعلق ہم نے پتے کی باتیں خوب کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اب غور و فکر کرنا تمھارا کام ہے۔

آیت 119 ''اَلْاَنَامِلَ'' یہ ''اَنْمِلَةٌ'' کی جمع ہے، جس کا معنی ہے انگلیوں کے پورے۔ ''عَضَّ يَعَضُّ (ف)'' کا معنی

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا
لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ
الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾

اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو تو ان کی خفیہ تدبیر تمھیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی۔ بے شک اللہ، وہ جو کچھ کرتے ہیں، اس کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۲۰﴾ اور جب تو صبح سویرے اپنے گھر والوں کے پاس سے نکلا، مومنوں کو لڑائی کے لیے مختلف ٹھکانوں پر مقرر کرتا تھا اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۲۱﴾

ہے دانتوں سے کاٹنا۔ ''الکتاب'' سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں، یعنی تم تو سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور وہ کسی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے، پھر بھی بجائے اس کے کہ تم ان سے نفرت کرو، الٹا ان سے دوستی کرتے ہو اور وہ بجائے دوستی کے سے دشمنی رکھتے ہیں اور دشمنی بھی اتنی سخت کہ اکیلے ہوتے ہیں تو غصے کی وجہ سے دانتوں سے انگلیوں کے پورے کاٹتے ہیں، مگر جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ منافقین کی مسلم دشمنی کو واضح فرمایا ہے۔

آیت 120 اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ...... : اس آیت میں مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ دشمنوں کے مکر وفریب اور ان کی چالوں سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ تم صبر و استقلال اور تقویٰ سے کام لو، اگر یہ اصول اپنا لو گے تو وہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اکثر منافق بھی یہود میں سے تھے، اس واسطے ان کے ذکر کے ساتھ یہود کا ذکر بھی فرمایا۔ اب آگے غزوۂ احد کی باتیں مذکور ہیں، کیونکہ اس میں بھی مسلمانوں نے بعض کافروں کا کہنا مان لیا تھا اور لڑائی سے پھر چلے تھے اور منافقوں نے اپنے نفاق کی باتیں ظاہر کی تھیں۔'' (موضح)

آیت 121 وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ ...... : یہاں سے غزوۂ احد کا بیان ہے۔ غزوۂ بدر میں ذلت آمیز شکست، ستر آدمی قتل اور ستر قید ہونے کے بعد مشرکین نے جوش انتقام میں مدینہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا اور ارد گرد سے مختلف قبائل جمع کر کے تین ہزار کا مسلح لشکر لیا اور جبل احد کے قریب آ کر ٹھہر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ بعض نے مدینہ میں رہ کر لڑنے کا مشورہ دیا، جب کہ بعض پرجوش نوجوانوں نے، جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، میدان میں نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ آپ ان کی رائے کے مطابق ایک ہزار کی جمعیت لے کر باہر نکلے۔ مقام ''شوط'' پر عبد اللہ بن ابی نے مسلمانوں کو دھوکا دیا اور اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ لوٹ آیا۔ اس سے بعض مسلمانوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو ثابت قدمی بخشی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سات سو صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ جمعیت لے کر آگے بڑھے اور احد کے قریب وادی میں فوج کو آراستہ کیا، جس کی طرف قرآن نے ﴿ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ﴾ میں اشارہ کیا ہے۔ اسلامی فوج کی پشت پر جبلِ احد تھا اور ایک جانب ٹیلے پر عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں پچاس تیر اندازوں کو

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ؕ
بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ

اور جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا کہ ہمت ہار دیں، حالانکہ اللہ ان دونوں کا دوست تھا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں﴿۱۲۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی، جب کہ تم نہایت کمزور تھے، پس اللہ سے ڈرو، تاکہ تم شکر کرو﴿۱۲۳﴾ جب تو ایمان والوں سے کہہ رہا تھا کیا تمھیں کسی طرح کافی نہ ہوگا کہ تمھارا رب تین ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے، جو اتارے ہوئے ہوں﴿۱۲۴﴾ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور ڈرتے رہو اور وہ اپنے اسی جوش میں تم پر آپڑیں تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرے گا، جو خاص نشان والے ہوں

دستہ متعین تھا، نیز آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا تھا کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمارے جسموں کو نوچ رہے ہیں، تو پھر بھی اس جگہ کو نہ چھوڑنا، یہاں تک کہ میں تمھیں پیغام بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے کفار کو شکست دے دی ہے اور انھیں پامال کر دیا ہے، پھر بھی اس جگہ کو نہ چھوڑنا، یہاں تک کہ میں پیغام بھیجوں۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ کفار کو پسپا ہوتے دیکھ کر نیچے اتر آئے اور اس گھاٹی کو چھوڑ دیا جس سے مشرکین کو عقب سے حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ثابت قدم رہے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کا دانت مبارک شہید ہو گیا، سر اور پیشانی مبارک بھی زخمی ہو گئے۔ آخر کار صحابہ آپ ﷺ کے گرد دوبارہ جمع ہوئے، جس سے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا اور دشمن کو ناکام ہو کر لوٹ جانا پڑا۔ یہ شوال ۳ھ کا واقعہ ہے۔ ان آیات میں جنگ کے بعض واقعات کی طرف اشارے آ رہے ہیں۔ (ابن کثیر)

آیت 122 اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ ...... : ان دو جماعتوں سے مراد انصار کے دو قبیلے بنو سلمہ اور بنو حارثہ ہیں (جو منافق عبداللہ بن ابی کی واپسی دیکھ کر دل شکستہ ہو گئے اور انھوں نے واپس آنے کا ارادہ کر لیا تھا)۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ إذ همت طآئفتان ...... ﴾ : ۴۵۵۸]

آیت 123 وَ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ : اس لفظ سے مسلمانوں کی قلت تعداد اور ضعفِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ مقام بدر مدینہ سے قریباً بیس میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ غزوۂ بدر بروز جمعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ (۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کو پیش آیا۔ اس آیت میں جنگ احد میں شکست کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معرکۂ بدر کے واقعات پر غور و فکر کی دعوت اور آئندہ ثابت قدم رہنے کے لیے تقویٰ کی تعلیم دی ہے۔ جنگِ بدر کی تفصیل کے لیے سورۂ انفال (۴۱) ملاحظہ کیجیے۔ (شوکانی، ابن کثیر)

آیت 124تا127 اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ...... : اس کا تعلق یا تو جنگ بدر سے ہے یا جنگ احد سے۔ امام طبری نے پہلی

مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا
النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ يَكْبِتَهُمْ
فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ
ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ
وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۳

گے ﴿۱۲۵﴾ اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر تمھارے لیے ایک خوشخبری اور تاکہ تمھارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے، جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۲۶﴾ تاکہ وہ ان لوگوں کا ایک حصہ کاٹ دے جنھوں نے کفر کیا، یا انھیں ذلیل کر دے، پس وہ ناکام واپس لوٹ جائیں ﴿۱۲۷﴾ تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں، یا وہ ان پر مہربانی فرمائے، یا انھیں عذاب دے، کیوں کہ بلاشبہ وہ ظالم ہیں ﴿۱۲۸﴾ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا نہایت رحم والا ہے ﴿۱۲۹﴾

بات کو ترجیح دی ہے، یعنی جب کفار کی تیاری اور کثرتِ تعداد کو دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں تشویش پیدا ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرشتوں کی مدد کا ذکر کر کے انھیں تسلی دی۔ چنانچہ بدر میں فرشتے نازل ہوئے۔ بدر میں فرشتوں کے نزول کی کیفیت کے لیے دیکھیے سورۂ انفال (۹)۔ (ابن کثیر، شوکانی) بدر کے دن فرشتوں کی تعداد سورۂ انفال میں ایک ہزار ذکر ہوئی ہے، جبکہ یہاں تین ہزار اور پانچ ہزار کا ذکر ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ پہلے ایک ہزار کا وعدہ ہوا، پھر تین ہزار اور پھر پانچ ہزار کی بشارت ہوئی، ان کا آپس میں کوئی تعارض نہیں۔ (ابن کثیر)

بعض کے نزدیک اس وعدے کا تعلق جنگ احد سے ہے اور انھوں نے کہا ہے، چونکہ مسلمانوں نے جنگِ احد میں توکل اور صبر سے کام نہ لیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مدد کو روک لیا، ورنہ ظاہر ہے کہ اگر فرشتے نازل ہوتے تو مسلمان شکست نہ کھاتے۔ (ابن جریر)

آیت 129،128 ① لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ...... : اس آیت میں پیغمبر ﷺ سے فرمایا کہ بندے کو اختیار نہیں، ہر قسم کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ (موضح)

بئر معونہ پر جن قبائل نے آپ ﷺ کے ستر صحابہ کو دھوکے سے قتل کیا تھا، ان کے خلاف اور جنگِ احد میں مشرکین کی طرف سے جو لوگ پیش پیش تھے، ان کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے نام لے لے کر دعائے قنوت شروع کی۔ بئر معونہ والا واقعہ بخاری میں موجود ہے۔ [بخاری، المغازی، باب غزوۃ الرجیع...... : ۴۰۸۶]

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مت کھاؤ سود کئی گنا، جو دگنے کیے ہوئے ہوں اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۱۳۰﴾

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد سر اٹھاتے تو " سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ " کے بعد یہ دعا کیا کرتے: ''اے اللہ! فلاں، فلاں اور فلاں پر لعنت فرما۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ ''تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ليس لك من الأمر شيء ﴾ : ۴۰۶۹]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام لوگوں کو جن کا نام لے کر آپ لعنت فرماتے تھے، توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مختار کل اور عالم الغیب ذات صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ہی ہے، ورنہ آپ اپنے عزیز چچا کو ضرور مسلمان کر لیتے اور احد اور بئر معونہ میں ظلم کرنے والوں کو ضرور ملعون کروا لیتے۔

● ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوا کہ قنوت نازلہ میں کسی کافر کا نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں، کیا خبر اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق بخش دے۔ ہاں، عام کفار پر لعنت درست ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔

آیت 130 ① یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا: شاید سود کا ذکر یہاں (جنگِ احد کے تذکرے میں) اس لیے فرمایا کہ اوپر (آیت ۱۲۲ میں) ذکر ہوا جہاد میں نامردی کا اور سود کھانے سے نامردی آتی ہے دو سبب سے، ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق اطاعت کم ہوتی ہے اور بڑی اطاعت جہاد ہے اور دوسرے یہ کہ سود لینا کمال بخل ہے۔ چاہیے تھا کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لیتا، درمیان میں کسی کا کام نکل جاتا، یہ بھی مفت نہ چھوڑے، اس کا جدا بدلہ چاہے، تو جس کو مال پر اتنا بخل ہو وہ جان کب دینا چاہے گا۔ (موضح)

پھر انصار کے یہود کے ساتھ سودی لین دین کے تعلقات تھے اور احد میں منافقینِ یہود کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا، گویا اس کو حرام قرار دے کر ان تعلقات کو ختم کر دیا۔

● اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً: اس سے بعض لوگوں نے سود مرکب کو حرام اور سود مفرد کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہاں اس زمانے کے سود خوروں کی سنگ دلی بیان ہو رہی ہے، جو آج بھی موجود ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بہت سے لوگ دوسروں کو سودی قرض دیا کرتے، جب قرض کی میعاد ختم ہو جاتی تو مقروض سے کہتے، قرض ادا کرو ورنہ سود میں اضافہ کرو۔ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں میعاد میں توسیع کر دی جاتی اور سود کی مقدار میں اضافہ کر دیا جاتا۔ اس طرح کچھ عرصے کے بعد سود کی مقدار اصل زر سے بھی کئی گنا زیادہ ہو جاتی اور یہ سود تجارتی اور غیر تجارتی دونوں طرح کا ہوتا تھا، جیسا کہ اس آیت کی تفسیر کے تحت تابعین نے تصریح کی ہے۔ سودی کاروبار کی اس بھیانک صورت کی طرف قرآن نے "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے، ورنہ یہ مطلب نہیں کہ مرکب سود حرام اور سادہ جائز ہے۔ اسلام میں ہر قسم کا سود حرام ہے،

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ سَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۳۳﴾

اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ اور رسول کا حکم مانو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۳۲﴾ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے رب کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے، ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۳﴾

صرف قرض کی ایک صورت جائز ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴾ [البقرۃ : ۲۷۹] ''اور اگر تم توبہ کر لو تو تمھیں اپنے اصل مال لینے کی اجازت ہے، نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

آیت 131 وَاتَّقُوا النَّارَ ...... : اس آیت میں سود خوروں کو اس آگ سے ڈرایا گیا ہے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا سود لینا اور دینا مسلمان کا کام نہیں۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے اور باز نہیں آتا اسے اس آگ کے لیے تیار رہنا چاہیے جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا اعلان کان کھول کر سنانے کا حکم ہے۔ (قرطبی)

آیت 132 وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار تو وہ شخص ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا فرماں بردار ہو۔ سود کھانا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھنا دو متضاد چیزیں ہیں۔ آیت کے الفاظ عام ہونے کی وجہ سے اس میں ہر نافرمان کے لیے بھی عتاب موجود ہے۔ (رازی)

آیت 132 ① وَ سَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ : اہل ایمان کو ان اعمال صالحہ کی طرف جلدی کرنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا سبب بنتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نیک اعمال سرانجام دینے میں جلدی کر لو، ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے جو اندھیری رات کے مختلف ٹکڑوں کی طرح (یکے بعد دیگرے) رونما ہوں گے۔ صبح کو آدمی مومن ہو گا اور شام کو کافر ہو گا اور شام کو مومن ہو گا اور صبح کو کافر، وہ اپنے دین کو دنیا کے معمولی سامان کے عوض بیچ دے گا۔'' [مسلم، الإیمان، باب الحث علی المبادرۃ...... : ۱۱۸، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ]

② وَ جَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ ...... : یعنی جس طرح سود خور کافر کے لیے دوزخ تیار کی گئی ہے اسی طرح فرماں بردار متقی کے لیے جنت تیار کی گئی ہے اور پھر جنت کے متعلق ﴿ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ﴾ فرما کر اس کی وسعت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے محمد! یہ بتائیں کہ جنت

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

جو خوشی اور تکلیف میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۳۴﴾

عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو آگ کہاں ہے؟'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ بتاؤ کہ پہلے رات تھی، پھر نہیں رہی تو کہاں چلی گئی؟'' اس نے کہا: ''اللہ بہتر جانتا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔'' [صحیح ابن حبان : ۱۰۳۔ مستدرك حاکم : ۹۲/۱، ح : ۱۰۳، وصححه و وافقه الذهبی]

حقیقت یہ ہے کہ جنت اور جہنم کے جو اوصاف قرآن و حدیث میں جس طرح مذکور ہیں اسی طرح ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے، خواہ ہماری عقل و ذہن کی رسائی ان تک نہ ہو، اور یہی نہیں، آخرت کے تمام معاملات کا یہی حال ہے۔

آیت 134 ① اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ...... : ان آیات میں اہل جنت کی صفات کا ذکر ہے، چنانچہ ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ خوش حالی اور تنگ دستی ہر حالت میں وہ اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں اور نیک کاموں اور رضائے الٰہی کے لیے مال صرف کرنے سے انھیں کوئی چیز غافل نہیں کرتی۔ (ابن کثیر)

② وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ : ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ غصہ سے مغلوب ہونے کے بجائے اس پر قابو پا لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پہلوان وہ نہیں جو پچھاڑ دینے والا ہو، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔'' [بخاری، الأدب، باب الحذر من الغضب: ۶۱۱۴، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: ''مجھے وصیت فرمائیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا تَغْضَبْ » ''غصہ مت کر۔'' اس نے کئی دفعہ درخواست دہرائی، آپ نے یہی فرمایا: « لَا تَغْضَبْ » ''غصہ مت کر۔'' [بخاری، الأدب، باب الحذر من الغضب : ۶۱۱۶۔ ترمذی : ۲۰۲۰]

③ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ : یہ دراصل غصہ پی جانے کا لازمی تقاضا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزوں پر میں قسم کھاتا ہوں، صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ معاف کر دینے سے بندے کی عزت میں اضافہ ہی کرتا ہے اور جو اللہ کے لیے نیچا ہوتا ہے اللہ اسے اونچا کر دیتا ہے۔'' [مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو : ۲۵۸۸۔ عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ] اور یہ احسان کا مقام ہے اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور وہ لوگ کہ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشتا ہے؟ اور انھوں نے جو کیا اس پر اصرار نہیں کرتے جب کہ وہ جانتے ہوں ﴿۱۳۵﴾ یہ لوگ ہیں جن کی جزا ان کے رب کی طرف سے بڑی بخشش اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں اور (یہ) عمل کرنے والوں کا اچھا اجر ہے ﴿۱۳۶﴾

آیت 135 ❶ **وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ......:** یعنی اگر بشری تقاضے کے تحت ان سے کسی گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی نے گناہ کیا تو کہا: ''اے میرے رب! میں نے ایک گناہ کیا ہے، تو مجھے وہ بخش دے۔'' تو اللہ عزوجل نے فرمایا: ''میرے بندے نے ایک گناہ کیا تو اس نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے، سو میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔'' پھر اس نے ایک اور گناہ کیا اور کہا: ''اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، تو اسے بخش دے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے، (فرشتو! گواہ رہو کہ) میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، پھر بندہ رکا رہا جتنا اللہ نے چاہا پھر اس نے ایک اور گناہ کیا تو کہا: ''اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، تو اسے بخش دے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑتا ہے (فرشتو! گواہ رہو کہ) میں نے اپنے بندے کو بخش دیا، سو وہ جو چاہے کرے۔'' [بخاري، التوحيد، باب قول الله تعالى : ﴿يريدون أن يبدلوا كلام الله﴾ : ۷۵۰۷۔ مسلم، التوبة، باب قبول التوبة.... : ۲۷۵۸]

❷ **وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا ......:** اصرار کے معنی ہیں اڑ جانا اور بے پروائی سے گناہ کرتے جانا۔ نہ ان پر ندامت کا اظہار کرنا اور نہ توبہ کرنا۔ ورنہ اگر کسی شخص سے سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد گناہ سرزد بھی ہو جاتا ہے تو اسے اصرار نہیں کہتے، جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا ہے۔ '' **وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ** '' یعنی کسی کام کے گناہ ہونے کا علم ہونے پر اس پر اصرار نہیں کرتے۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء: (۱۷، ۱۸)۔

آیت 136 اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵)۔

قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ ۙ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوۡعِظَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ لَا تَهِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾ اِنۡ يَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَ تِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ يَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۴۰﴾ ۙ وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ يَمۡحَقَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۴۱﴾

بلاشبہ تم سے پہلے بہت سے طریقے گزر چکے، سو زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟﴿۱۳۷﴾ یہ لوگوں کے لیے ایک وضاحت ہے اور بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت ہے﴿۱۳۸﴾ اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو﴿۱۳۹﴾ اگر تمھیں کوئی زخم پہنچے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی اس جیسا زخم پہنچا ہے اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں، اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے بعض کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا﴿۱۴۰﴾ اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو خالص کر دے جو ایمان لائے اور کافروں کو مٹا دے﴿۱۴۱﴾

آیت 137 قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ...... : اوپر کی آیات میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر اور ان کی نافرمانی سے توبہ پر بخشش اور جنت کا وعدہ فرمایا، اب یہاں اطاعت اور توبہ کی ترغیب کے لیے پہلی امتوں کی تاریخ پر غور و فکر کا حکم دیا ہے، تاکہ ان میں سے مطیع اور نافرمان کے احوال پر غور کر کے انسان اپنے لیے سامانِ عبرت حاصل کرے۔ ''سُنَنٌ'' کا مفرد ''سُنَّةٌ'' ہے، اس کے معنی طریق مستقیم اور اس نمونے کے ہیں جس کا اتباع کیا جاتا ہے۔ یہ '' فُعْلَةٌ '' بمعنی '' مَفْعُوْلَةٌ '' ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فعل چونکہ مسلمان کے لیے نمونہ اور طریق مستقیم ہوتا ہے، اس لیے اسے سنت کہتے ہیں۔

جنگ احد میں جب ستر مسلمان شہید اور کچھ زخمی ہوئے تو اس شکست سے مسلمانوں کو قدرتی طور پر بہت تکلیف ہوئی۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ اس شکست سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بات تو پہلی امتوں اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہوتی چلی آئی ہے کہ ابتدا میں ان کو تکالیف سے دوچار ہونا پڑا اور بالآخر جھٹلانے والے ذلیل و خوار ہوئے۔ (ابن کثیر)

آیت 138 هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ ...... : یعنی قرآن میں اس کا واضح ثبوت موجود ہے کہ پہلی امتوں کا ان کے دشمنوں کے ساتھ مقابلے میں کیا حال ہوا۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا متقین کے نیک انجام اور جھٹلانے والوں کی ہلاکت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

آیت 139 وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا ...... : اوپر کی آیت ''قَدۡ خَلَتۡ'' اس بشارت کی تمہید تھی اور ''وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ'' کے لیے ایک طرح کی دلیل کہ پہلی امتوں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اہل باطل کو اگرچہ غلبہ حاصل ہوا مگر عارضی، آخر کار وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ یہی حال تمھارا ہے، اس لیے کسی قسم کے '' وَهْنٌ '' (کمزوری) سے کام نہ لو، غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ چنانچہ اس کے بعد ہر لڑائی میں مسلمان غالب ہوتے رہے۔

آیت 141،140 ① اِنۡ يَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ ...... : یعنی اگر ''احد'' کے دن تمھیں مشرکین کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے تو

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

یا تم نے گمان کر لیا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور تاکہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے ﴿۱۴۲﴾

تم بھی بدر کے دن انھیں اسی قسم کا نقصان پہنچا چکے ہو، اس لیے یہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ " اَلْحَرْبُ سِجَالٌ " (لڑائی میں باریاں ہوتی ہیں) جب بھی دو گروہوں میں جنگ ہوئی ہے تو کبھی ایک کا پلڑا بھاری رہا ہے، کبھی دوسرے کا۔

❷ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ ...... : جنگ احد میں مسلمانوں کو سخت جانی نقصان پہنچا۔ یہود اور منافقین کے طعنے مزید دل دکھانے کا باعث بنے۔ منافق کہتے تھے کہ اگر آپ (ﷺ) سچے نبی ہوتے تو مسلمان یہ نقصان اور ہزیمت کی ذلت کیوں اٹھاتے وغیرہ۔ ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ فتح وشکست تو ادلتی بدلتی چیز ہے، یہ حق اور ناحق کا معیار نہیں، آج اگر تم نے زخم کھایا ہے تو کل وہ جنگ بدر میں تمھارے ہاتھوں اسی قسم کا زخم کھا چکے ہیں اور خود اس جنگ کے شروع میں ان کے بہت سے آدمی مارے جا چکے ہیں، جیسا کہ اس آیت: ﴿ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ﴾ [آل عمران : ۱۵۲] (جب تم انھیں اس کے حکم سے کاٹ رہے تھے) سے معلوم ہوتا ہے۔ تمھاری اس شکست میں بھی کئی حکمتیں پوشیدہ ہیں، ایک یہ کہ ایمان واخلاص اور کفر ونفاق میں تمیز ہو گئی، مومن اور منافق الگ الگ ہو گئے، اگر ہمیشہ مسلمانوں کو فتح ہوتی تو منافقین کا نفاق ظاہر نہ ہوتا۔ دوسری مومنوں کو شہادت نصیب ہوئی، فرمایا: ﴿ وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ﴾ جو اللہ کے ہاں بہت بڑا شرف ہے۔ کفار کی اس عارضی فتح کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ ظالموں اور مشرکوں کو پسند کرتا ہے، فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ ''اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔'' تیسری یہ کہ مومنوں کو خالص کرے، اگر ان میں کچھ کمی ہے تو دور کر دے، فرمایا: ﴿ وَ لِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ''اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو خالص کر دے جو ایمان لائے'' اور چوتھی یہ کہ کفار کی طاقت کو ختم کرنا مقصود ہے، ﴿ وَ يَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ اس طرح کہ وہ اپنی عارضی فتح پر مغرور ہو کر پھر لڑنے آئیں گے اور اس وقت ان کی وہ سرکوبی ہو گی کہ دوبارہ اس طرف رخ کرنے کا نام نہیں لیں گے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ایسا ہی ہوا کہ اس کے بعد کفار نے دفاعی جنگیں تو لڑیں مگر خود حملے کی جرأت نہ کر سکے۔ (رازی، شوکانی)

آیت 142 وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا ...... : بعض سلف نے اس کا معنی کیا ہے ''ابھی تک اللہ نے ظاہر نہیں کیا'' ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ماضی، حال اور مستقبل ہر بات کا علم ہے، اس لیے یہ ترجمہ کہ ''ابھی تک اللہ نے نہیں جانا'' درست نہیں، مگر " عَلِمَ يَعْلَمُ " کا معنی تو جاننا ہی ہوتا ہے، ظاہر کرنے کے لیے تو " لَمَّا يُظْهِرِ اللّٰهُ " یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہونے چاہییں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نوع ازلی ہے مگر ان کے افراد حادث ہوتے رہتے ہیں، مثلاً پیدا کرنا، سننا اور جاننا وغیرہ، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴾ [الرحمٰن : ۲۹] ''ہر دن وہ ایک نئی شان میں ہے۔'' خالق تو وہ ازل سے

وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۪ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ مَا ع ۱۴ ۵
مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ
وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

اور بے شک تم تو موت کی تمنا کیا کرتے تھے، اس سے پہلے کہ اسے ملو، تو بلاشبہ تم نے اسے اس حال میں دیکھ لیا کہ تم (آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے ﴿۱۴۳﴾ اور نہیں ہے محمد مگر ایک رسول، بے شک اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے تو کیا اگر وہ فوت ہو جائے، یا قتل کر دیا جائے تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا ﴿۱۴۴﴾

ہے، مگر جب وہ کوئی چیز پیدا کرے گا تو اس چیز کی خلق اس وقت وجود میں آئے گی۔ اسی طرح آیت: ﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ [المجادلة : ۱] ''یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی'' اس عورت کے جھگڑے کے بعد ہی واقعاتی سماع وجود میں آیا، اسی طرح جہاد کرنے کا واقعاتی علم تو جہاد کے واقع ہونے کے بعد ہی ہوگا۔ مقصد یہ کہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا وقوع میں آنا نہیں جانا کہ تم میں سے کس نے جہاد کیا ہے۔ ''وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ'' میں میم ''لامِ کَیْ'' کی وجہ سے منصوب ہے، جو یہاں محذوف ہے اس لیے ترجمہ کیا ہے ''اور تاکہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے۔'' خلاصہ یہ ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسی آزمائش کے بغیر ہی تم کو جنت میں اعلیٰ مراتب مل جائیں گے؟ مطلب یہ کہ جب تک اس قسم کی آزمائشوں میں پورے نہیں اترو گے جنت میں اعلیٰ مراتب حاصل نہیں ہو سکتے۔

آیت 143 وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ : یہاں موت کا معنی جنگ یا شہادت ہے۔ (بغوی) جن لوگوں کو جنگ بدر میں حاضری کا موقع نہیں ملا تھا وہ تمنا کیا کرتے تھے کہ دشمن سے مقابلے کا موقع ملے تو ہم بھی شہدائے بدر کا درجہ حاصل کر لیں، مگر جب جنگ احد میں موقع ملا تو دشمن کے اچانک حملے کی وجہ سے ثابت قدم نہ رہ سکے اور بعض بھاگ نکلے۔ اس آیت میں صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمھاری تمنا کے مطابق اب یہ موقع آیا تو تمھیں چاہیے تھا کہ پوری جواں مردی سے دشمن کا مقابلہ کرتے اور پامردی کا ثبوت دیتے۔ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کیا کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے رہا کرو، ہاں، اگر دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر صبر کرو اور خوب جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' [بخاری، الجهاد والسير، باب لا تمنوا لقاء العدو : ۳۰۲۵]

آیت 144 ① وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ : جنگ احد میں بعض صحابہ نے تو مرتبۂ شہادت حاصل کر لیا اور بعض میدان چھوڑ کر فرار ہونے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہو گئے اور کسی شیطان نے آپ کی شہادت کی افواہ پھیلا دی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل اس افواہ سے ٹوٹ گئے اور وہ ہمت ہار بیٹھے اور منافقین نے طعن و تشنیع کے نشتر چبھونے شروع کر دیے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور کسی جان کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، لکھے ہوئے کے مطابق جس کا وقت مقرر ہے، جو شخص دنیا کا بدلہ چاہے ہم اسے اس میں سے دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے اسے اس میں سے دیں گے اور ہم شکر کرنے والوں کو جلد جزا دیں گے ﴿۱۴۵﴾

اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہوتے تو قتل کیوں ہوتے؟! اس پر یہ آیات اتریں: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ﴾ ''نہیں ہے محمد مگر ایک رسول۔'' اس میں قصرِ قلب ہے کہ محمد ﷺ کے متعلق تم نے جو سمجھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہیں، یا اللہ تعالیٰ کے اختیارات کے مالک ہیں، ایسا نہیں، وہ محض اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔ وہ قتل بھی ہو سکتے ہیں، فوت بھی ہو سکتے ہیں اور ان سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں۔ کیا محمد رسول اللہ ﷺ کے قتل ہونے یا طبعی موت مر جانے سے تم اللہ کا دین چھوڑ بیٹھو گے؟ تمھیں چاہیے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہو۔ (ابن کثیر، قرطبی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اور اشارتاً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی وفات پر بعض لوگ پھر جائیں گے۔ اسی طرح ہوا کہ بہت سے لوگ آپ ﷺ کے بعد مرتد ہوئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو پھر مسلمان کیا اور بعضوں کو مارا۔'' (موضح)

❷ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے جو ''اَلسُّنُح'' میں تھا، گھوڑے پر تشریف لائے، وہ گھوڑے سے اتر کر مسجد میں آ گئے، لوگوں سے انھوں نے کوئی بات نہ کی، بلکہ سیدہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے ہاں چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ کا قصد کیا، اس وقت آپ یمنی دھاری دار چادر سے ڈھانپے ہوئے تھے، انھوں نے آپ ﷺ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا، پھر آپ پر جھک کر آپ کو بوسہ دیا، پھر رو پڑے اور کہنے لگے: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! اے اللہ کے نبی! اللہ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا، جو موت آپ پر لکھی گئی تھی، وہ آپ فوت ہو چکے۔'' ابوسلمہ کہتے ہیں، مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نکلے، عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، تو فرمایا: ''بیٹھ جاؤ۔'' انھوں نے نہ مانا، پھر فرمایا: ''بیٹھ جاؤ۔'' وہ پھر بھی نہ مانے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا، اب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اما بعد! تم میں سے جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ زندہ ہے، کبھی فوت نہیں ہو گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ یہ مکمل آیت تلاوت کی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لوگ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، یہاں تک کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آیت پڑھی تو لوگوں نے اسے ان سے لے لیا تو جسے سنو یہی آیت پڑھ رہا تھا۔'' سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جب اس آیت کی تلاوت سنی تو میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا، میرے پاؤں مجھے اٹھا نہیں رہے تھے، یہاں تک کہ میں گر گیا۔'' [بخاري، المغازي، باب مرض النبي ﷺ ووفاته : ۴۴۵۲، ۴۴۵۳، ۴۴۵۴]

آیت 145 وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ...... : اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ابھارنا اور ان کے

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا
ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
ع ۱۵/۵/۶ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اور کتنے ہی نبی ہیں جن کے ہمراہ بہت سے رب والوں نے جنگ کی، تو نہ انھوں نے اس مصیبت کی وجہ سے ہمت ہاری جو انھیں اللہ کی راہ میں پہنچی اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ انھوں نے عاجزی دکھائی اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۴۶﴾ اور ان کی بات اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہماری زیادتی کو بھی اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافر لوگوں پر ہماری مدد فرما ﴿۱۴۷﴾ تو اللہ نے انھیں دنیا کا بدلہ عطا فرمایا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۴۸﴾

ذہن میں یہ بات بٹھانا ہے کہ موت سے فرار کی راہ اختیار کرنے سے انسان موت کے پنجے سے نجات نہیں پا سکتا، اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر فرمایا ہے، جو آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ "اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" میں "اِذْنٌ" بمعنی علم ہے، یعنی ہر شخص کی موت کا وقت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اِذْنٌ" بمعنی قضا و قدر ہو۔ الغرض! تمھیں چاہیے کہ موت سے بھاگنے کی فکر چھوڑ کر بے جگری سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو اور اس جہاد سے تمھارا مقصود آخرت کا ثواب ہونا چاہیے، ورنہ اگر تم صرف دنیا کا ثواب، شہرت اور مال غنیمت وغیرہ ہی چاہو گے تو تمھیں صرف وہی ملے گا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت پر اور آخرت سے محروم رہو گے۔ یہاں "كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا" سے مراد وہ کتاب ہے جو "آجَالٌ" (مقررہ اوقات) پر مشتمل ہے۔ بعض نے اس سے مراد لوح محفوظ لیا ہے۔ احادیث میں ہے: "اللہ تعالیٰ نے قلم سے فرمایا: ((اُكْتُبْ فَكَتَبَ مَا هُوَ كَائِنٌ)) "لکھ دے، تو قلم نے جو کچھ ہونے والا تھا، سب لکھ دیا۔" [أحمد : ۳۱۷/۵، ح : ۲۲۷۷۳، و ابن أبي عاصم عن عبادة بن الصامت ﷺ و سنده حسن]

اس آیت میں اشارہ ہے کہ جنگ احد میں حاضر ہونے والے اپنی نیتوں کے اعتبار سے دو قسم کے تھے، بعض غنیمت کے طالب تھے اور بعض آخرت کے۔ یہ آیت گو خاص جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر حکم کے اعتبار سے عام ہے اور تمام اعمال کا مدار انسان کے ارادے اور نیت پر ہے۔ معلوم ہوا مقتول بھی موت کے مقررہ وقت پر مرتا ہے اور مقررہ وقت میں تبدیلی ناممکن ہے۔

آیت 146 تا 148 "رِبِّيُّوْنَ" یہ "رِبِّيٌّ" کی جمع ہے، جو "رَبَّانِيٌّ" کا ہم معنی ہے۔ (کشاف) ایک معنی اور بھی اہل علم نے کیا ہے کہ یہ "رِبَّةٌ" کی طرف منسوب ہے، جس کا معنی کثیر جماعت ہے، یعنی ان کے ہمراہ بہت سی جماعتیں تھیں۔ (قرطبی)
"وَهْنٌ، ضُعْفٌ، اِسْتِكَانَةٌ" یہ تینوں لفظ قریب المعنی ہیں، کمزوری کے معنی میں یہ بالترتیب واقع ہوتے ہیں۔ "وَهْنٌ" دل سے ہمت ہارنا، "ضُعْفٌ" عام کمزوری اور "اِسْتِكَانَةٌ" دشمن کے سامنے عاجزی کا اظہار۔ ان تینوں آیتوں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿149﴾
بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿150﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ
اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿151﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان لوگوں کا کہنا مانو گے جنھوں نے کفر کیا تو وہ تمھیں تمھاری ایڑیوں پر پھیر دیں گے، پھر تم خسارہ اٹھانے والے ہو کر پلٹو گے ﴿149﴾ بلکہ اللہ ہی تمھارا مالک ہے اور وہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿150﴾ ہم عنقریب ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک بنایا جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا آگ ہے اور وہ ظالموں کا برا ٹھکانا ہے ﴿151﴾

سے مقصود ان لوگوں پر عتاب اور تنبیہ ہے جو احد کے دن شکست کے آثار دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر بالکل ہی پست ہو گئے، پس فرمایا کہ تم سے پہلے انبیاء کے متبعین گزر چکے ہیں، ان کی اتباع کرو اور اس قسم کی کمزوری نہ دکھاؤ۔ (قرطبی۔ ابن کثیر)

یعنی ان لوگوں میں سے بہت سے ”رِبِّيُّوْنَ“ اپنے انبیاء کے ساتھ مل کر جہاد کرتے رہے، لیکن انھوں نے اپنی تعداد کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ کبھی اپنے انبیاء کے وفات پا جانے یا شہید ہو جانے کی صورت میں وسوسوں میں مبتلا ہوئے، بلکہ ہمیشہ اور ہر حال میں صبر و استقلال سے کام لیتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں پر عفو درگزر کی درخواست کرتے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیا و آخرت دونوں کے ثواب سے نواز دیا، بلکہ آخرت کے حسن ثواب سے اور احسان کا مرتبہ پا لینے کی وجہ سے اپنی محبت بھی عطا فرمائی، فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

آیت 149 يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا : احد کی عارضی سی شکست کے بعد کفار نے، جن میں منافقین، یہود و نصاریٰ اور مشرکین سبھی شامل تھے، مسلمانوں کے دلوں میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کر کے انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ کفار کے فریب میں مت آنا، ورنہ تم خسارے میں پڑ جاؤ گے۔ یہ آیت بھی پچھلی آیت کے مضمون کو مکمل کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ دنیا میں سب سے بڑا خسارا یہ ہے کہ کوئی انسان اپنے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور آخرت کا خسارا ثواب سے محرومی اور عذاب میں گرفتاری ہے۔ پس خسارہ عام ہے۔

آیت 150 بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ...... : مولیٰ کا معنی مالک، مددگار اور دوست وغیرہ ہے، یعنی تم کفار کی اطاعت تو اس لیے کرو گے کہ وہ تمھاری کچھ مدد کریں، مگر یہ سراسر جہالت ہے، تمھارا مالک، حامی و ناصر تو اللہ تعالیٰ ہے، اس پر بھروسا رکھو گے تو دنیا کی کوئی طاقت تمھارا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ”خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ“ محاورۂ کلام کے اعتبار سے ہے، ورنہ یہ معنی نہیں ہیں کہ کچھ اور ناصرین بھی ہیں جن میں سے اللہ تعالیٰ سب سے بہتر ہے۔ (کبیر)

آیت 151 ① سَنُلْقِيْ ...... : یہ آیت اپنے سیاق کے اعتبار سے اوپر کے بیان کو مکمل کر رہی ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾

اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دیا، جب تم انھیں اس کے حکم سے کاٹ رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے ہمت ہار دی اور تم نے حکم کے بارے میں آپس میں جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی، اس کے بعد کہ اس نے تمھیں وہ چیز دکھا دی جسے تم پسند کرتے تھے۔ تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے، پھر اس نے تمھیں ان سے پھیر دیا، تاکہ تمھیں آزمائے اور بلاشبہ یقیناً اس نے تمھیں معاف کر دیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے ﴿١٥٢﴾

نے مختلف وجوہ سے جہاد کی ترغیب دی ہے اور کفار کے خوف کو دلوں سے نکالا ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھو گے اور اسی سے مدد مانگو گے تو اللہ تعالیٰ کفار کے دلوں میں تمھارا خوف ڈال دے گا، اس طرح تمھیں ان پر غلبہ حاصل ہو جائے گا، کیونکہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، لہٰذا "بِمَآ اَشْرَكُوْا" میں باء برائے سببیت ہے۔ (قرطبی)

2 شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "مشرک اللہ تعالیٰ کے چور ہیں اور چور کے دل میں ڈر ہوتا ہے۔" (موضح) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ سچا ہوا اور کافر احد میں باوجود غالب ہونے کے چپکے سے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ واپسی کے وقت راستے میں انھوں نے دوبارہ مدینہ پر حملے کا ارادہ کیا مگر مرعوب ہو گئے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پانچ چیزوں میں مجھے پہلے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ماہ کی مسافت پر دشمن کے دل میں میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے۔" [بخاری، التیمم، بابٌ : ۳۳۵۔ مسلم : ۵۲۱، عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کفار کے دل میں رعب ڈالنے کا وعدہ احد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے۔

3 اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کے ساتھ آپ کی امت، یعنی مسلمانوں کا رعب بھی مشرکوں پر ڈال دیا گیا ہے اور اس کی وجہ ان کا شرک ہے، گویا شرک کرنے والوں کا دل دوسروں کی ہیبت سے ڈرتا اور لرزتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کی بڑی تعداد مشرکانہ عقائد و اعمال میں گرفتار ہوئی، تقریباً ہر شہر اور محلّہ میں پختہ قبریں اور غیر اللہ کے آستانے بن گئے اور غیر اللہ سے استغاثہ اور مدد مانگنا شروع ہو گئے، تو وہی رعب جو شرک کی وجہ سے کفار کے دل میں تھا، ڈیڑھ ارب کے قریب تعداد ہونے کے باوجود مسلمانوں کے دلوں میں پڑ گیا۔ ہاں، توحید والے اس رعب سے محفوظ ہیں اور قیامت تک کفار سے جہاد جاری رکھیں گے اور ان کا رعب کفار کے دلوں میں کفار کے مشرکانہ عقائد و اعمال کی وجہ سے رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ)) [مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۲، عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ] "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس پر لڑتی رہے گی، حتیٰ کہ قیامت قائم ہو۔"

آیت 152 1 وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ ...... : جنگ احد میں پہلے پہل اللہ تعالیٰ کی مدد مسلمانوں کے شامل حال

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ فَاَثَابَكُمۡ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

جب تم دور چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتے تھے اور رسول تمھاری پچھلی جماعت میں تمھیں بلا رہا تھا تو اس نے بدلے میں تمھیں غم کے ساتھ اور غم دیا، تا کہ تم نہ اس پر غمزدہ ہو جو تمھارے ہاتھ سے نکل گیا اور نہ اس پر جو تمھیں مصیبت پہنچی اور اللہ اس کی پوری خبر رکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۱۵۳﴾

رہی اور وہ مشرکین کو اللہ کے حکم سے خوب کاٹتے رہے، حتیٰ کہ جب فتح کے آثار نظر آنے لگے اور مشرکین اور ان کی عورتوں نے بھاگنا شروع کر دیا تو پچاس تیر انداز، جنھیں آپ ﷺ نے عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک پہاڑی پر متعین کیا تھا، تا کہ ادھر سے مشرک حملہ آور نہ ہوں، انھوں نے مال غنیمت دیکھ کر باہم جھگڑنا شروع کر دیا۔ پچاس آدمیوں میں سے اکثر آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی کر کے اپنی جگہ چھوڑ کر مال غنیمت کی طرف دوڑ پڑے، اس سبب سے مشرکین کو عقب سے حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ (ابن کثیر)

جنگ کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ واپس آئے تو بعض لوگ کہنے لگے کہ یہ مصیبت ہم پر کیسے آ گئی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نصرت کا وعدہ فرمایا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا، پھر جو کچھ ہوا یہ تمھارے ہمت ہارنے اور آپس میں جھگڑنے اور تمھاری نافرمانی کا نتیجہ تھا۔ (قرطبی)

② ثُمَّ صَرَفَكُمۡ ...... : یعنی غلبہ کے بعد ان کے مقابلہ میں تمھیں پسپائی دلائی، تا کہ تمھاری آزمائش ہو کہ کون سچا مسلمان ہے اور کون کمزور ایمان والا اور جھوٹا۔ (قرطبی)

③ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ : یعنی گو تم نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور جنگ سے فرار کی راہ اختیار کر کے نہایت سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا، جس کی تمھیں سخت سزا دی جا سکتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھارا سارا قصور معاف فرما دیا۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس شرف کا اظہار ہے جو ان کی کوتاہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمایا، یعنی ان کی غلطیوں کی وضاحت کر کے، تا کہ آئندہ ان کا اعادہ نہ کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے معافی کا عام اعلان فرما دیا تو اب کسی کے لیے ان پر طعن و تشنیع کی کیا گنجائش رہ گئی۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس عثمان رضی اللہ عنہ پر بعض اعتراضات کیے، ایک ان میں سے یہ تھا کہ وہ احد کے دن فرار ہو گئے تھے، تو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرما دیا۔'' [بخاری، المغازی، باب قول الله تعالٰی : ﴿ إن الذين تولوا منكم...... ﴾ : ٤٠٦٦]

آیت 153 ① اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ...... : یہ بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی کیفیت کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمھاری پچھلی جماعت میں، جو ثابت قدم رہی تھی، تمھیں پکار رہے تھے کہ اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، میں یہاں ہوں، مگر تم دور دوڑے جا رہے تھے اور کسی کو نہ مڑ کر دیکھتے تھے، نہ کسی کی سنتے تھے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ

پھر اس غم کے بعد اس نے تم پر ایک امن نازل فرمایا، جو ایک اونگھ تھی، جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی اور کچھ لوگ وہ تھے جنھیں ان کی جانوں نے فکر میں ڈال رکھا تھا، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلیت کا گمان کر رہے تھے، کہتے تھے کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دے بے شک معاملہ سب کا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے تھے جو تیرے لیے ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے اگر اس معاملے میں ہمارا کچھ اختیار

② فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ : یعنی تمھاری کوتاہی کے بدلے میں تمھیں غم پر غم پہنچایا، ایک شکست کا غم اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ کا صدمہ، جو پہلے غم سے زیادہ سخت تھا، پس "بِغَمٍّ" کے معنی "عَلٰی غَمٍّ" ہیں اور بعض نے باء کو سببیت کے لیے مانا ہے، یعنی آپ ﷺ کو مغموم کرنے کی وجہ سے تمھیں غم پہنچایا، مگر پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

③ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا ...... : یعنی تمھیں دوہرے غم میں مبتلا کر دیا، تاکہ نہ تو تمھیں مال غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم ہو اور نہ زخمی و شہید ہونے اور شکست کا غم ہو، کیونکہ متواتر غم خصوصاً بڑے غم کے آنے کے ساتھ پہلے غم ہلکے ہو جاتے ہیں اور انسان سختیاں برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

آیت 154 ① ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ ...... : ان پے در پے صدموں کے بعد اللہ تعالیٰ نے میدان جنگ میں موجود مسلمانوں پر اپنا خاص فضل فرمایا کہ ان پر اونگھ مسلط کر دی، جس سے انھیں امن و اطمینان حاصل ہو گیا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ہم پر اونگھ چھا گئی، جب کہ ہم احد کے دن اپنی صفوں میں کھڑے تھے، حالت یہ تھی کہ میری تلوار میرے ہاتھ سے گری جاتی تھی، میں اسے اٹھا لیتا تھا، وہ پھر گر جاتی تھی اور میں اسے پھر اٹھا لیتا تھا۔'' [بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ أمنة نعاسا ﴾ : ٤٥٦٢] ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ہی بیان فرماتے ہیں: ''میں نے احد کے دن اپنا سر بلند کیا اور لوگوں کو دیکھنے لگا تو (کیا دیکھتا ہوں کہ) ہر شخص اونگھ کی وجہ سے اپنے سر کو ڈھال کے نیچے جھکائے ہوئے ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب ہے: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا ﴾ [ترمذی، التفسیر، باب ومن سورة آل عمران : ۳۰۰۷]

② وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ : کہ ظاہر ہے اس سے مراد منافقین اور ضعیف ایمان والے مسلمان ہیں۔ ایسے حالات میں انھیں تو اپنی جانوں ہی کی فکر تھی۔

③ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ......: "ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ" یہ "غَيْرَ الْحَقِّ" سے بدل ہے، یعنی وہ یہ گمان کر رہے تھے کہ دین اسلام اور اس کے حاملین بس اب ہلاک ہو گئے، مسلمانوں کی کبھی مدد نہیں ہو گی اور یہ دعوت حق پروان نہیں چڑھے گی۔

شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے، کہہ دے اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن لوگوں پر قتل ہونا لکھا جا چکا تھا اپنے لیٹنے کی جگہوں کی طرف ضرور نکل آتے اور تاکہ اللہ اسے آزمالے جو تمھارے سینوں میں ہے اور تاکہ اسے خالص کر دے جو تمھارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۵۴﴾

④ **یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ**: یہ جملہ "**یَظُنُّوْنَ**" سے بدل ہے اور "**مِنَ الْاَمْرِ**" سے مراد فتح و نصرت ہے، یعنی بالکل مایوسی کا اظہار کرنے لگے اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں کبھی فتح بھی نصیب ہو گی اور کچھ ملے گا بھی؟ یا "**مِنَ الْاَمْرِ**" سے مراد معاملے کا فیصلہ ہے کہ اس معاملے میں ہماری بات تو مانی ہی نہیں گئی، ہمیں مجبوراً ساتھ دینا پڑا، ورنہ ہم تو شہر سے باہر نکل کر لڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم تو مجبور محض ہیں، ہمارا تو کچھ بھی اختیار نہیں۔ (فتح القدیر)

⑤ **مَا قُتِلْنَا ھٰهُنَا** : مطلب یہ کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی کہ شہر کے اندر رہ کر ہی جنگ لڑی جائے تو آج ہمارا یہ جانی نقصان نہ ہوتا، مگر ہماری کسی نے نہ سنی۔ یہ بات یا تو ان منافقین نے کہی جو جنگ میں شریک تھے، جیسا کہ زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! میں معتب بن بشیر، جو بنو عمرو بن عوف سے تھا، اس کی بات سن رہا تھا، جب کہ اونگھ مجھے ڈھانپ رہی تھی، میں خواب کی طرح اس کی بات سن رہا تھا، جب وہ کہہ رہا تھا، اگر اس معاملے میں ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کیے جاتے۔'' [المختارة، ح : ٨٦٤، ٨٦٥] اسے ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں بھی حسن سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بات ان منافقین نے کہی ہو جو عبد اللہ بن ابی کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے تھے، اس صورت میں "**ھٰهُنَا**" (یہاں) کا اشارہ مدینہ کے قریب احد کی طرف ہو گا۔ (قرطبی، شوکانی)

⑥ **قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ** ......: اس سے ان کے خیال کی تردید مقصود ہے، یعنی اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے تب بھی جن لوگوں کی قسمت میں قتل ہونا لکھا جا چکا تھا وہ ضرور اپنے گھروں سے نکلتے اور جہاں اب مارے گئے ہیں، وہیں مارے جاتے، کیونکہ اللہ کی تقدیر سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

⑦ **وَ لِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ** ...... : یہ جملہ محذوف کی علت ہے، یعنی جنگ احد میں جو کچھ ہوا اور جن حالات سے مسلمان دوچار ہوئے، اس سے کئی اور حکمتوں کے ساتھ مقصود یہ بھی تھا کہ تمھارے دلوں کی حالت ظاہر ہو جائے اور تمھارے دل وساوس سے پاک ہو جائیں، یا یہ کہ منافقین کے دلوں کا نفاق باہر نکل آئے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور احد کی لڑائی بگڑنے سے سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ
وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ ع
كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا
وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

بے شک وہ لوگ جو تم میں سے اس دن پیٹھ پھیر گئے جب دو جماعتیں بھڑیں، شیطان نے انھیں ان بعض اعمال ہی کی وجہ سے پھسلایا جو انھوں نے کیے تھے اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۱۵۵﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا جب انھوں نے زمین میں سفر کیا، یا وہ لڑنے والے تھے، اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، تاکہ اللہ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنا دے اور اللہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور اللہ اس کو جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۵۶﴾

آیت 155 ① اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا...... : یعنی احد کے دن جو مسلمان میدان جنگ سے ہٹ گئے، وہ شیطان کے پھسلانے کے سبب ہٹے، مگر شیطان کو انھیں پھسلانے کا موقع انھی کے کچھ گزشتہ گناہوں کی وجہ سے ملا۔ جن میں سے بعض کا ایک گناہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کی تھی۔ سلف سے مروی ہے کہ ایک نیک کام کرنے سے دوسرے نیک کام کی توفیق ملتی ہے اور ایک گناہ دوسرے گناہ کے ارتکاب کا سبب بنتا ہے۔ (ابن کثیر) مقصد یہ کہ بعض مخلص مسلمان جو اس دن بھاگ کھڑے ہوئے وہ اس وجہ سے نہیں بھاگے کہ وہ اسلام سے پھر گئے تھے، یا منافق تھے، بلکہ شامتِ نفس اور سیئات اعمال کی وجہ سے شیطان کو انھیں بہکانے کا موقع ملا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں فرمایا کرتے تھے: «وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا» ''ہم اپنے نفس کے شر اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔'' [ابن ماجه، النكاح، باب خطبة النكاح : ۱۸۹۲، وصححه الألبانی] یہ بھی معلوم ہوا کہ نفس کا شر ہو یا اعمال کی شامت، ان کے ساتھ شیطان کا گمراہ کرنا بھی شامل ہوتا ہے۔

② وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ : اس سے تین آیات پہلے بھی '' وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ '' کہہ کر ان کی معافی کی نوید سنائی گئی ہے۔ اب پھر مزید اطمینان اور تسلی کے لیے دوبارہ خوش خبری سنائی جا رہی ہے کہ بلاشبہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا ہے، یعنی جو واقعی دل میں اخلاص رکھتے تھے ان کی توبہ اور معذرت کے سبب اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا، اب نہ ان پر کوئی گناہ ہے اور نہ کسی کو طعن کا حق ہے۔ مزید تفصیل دیکھیے آل عمران (۱۵۲) کے فوائد۔

آیت 156 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا...... : '' غُزًّى '' یہ '' غَازٍ '' کی جمع ہے، جو '' غَزَا يَغْزُوْ '' سے اسم فاعل ہے،

وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۱۵۸

اور بلاشبہ یقیناً اگر تم اللہ کے راستے میں قتل کر دیے جاؤ، یا فوت ہو جاؤ تو یقیناً اللہ کی طرف سے تھوڑی سی بخشش اور رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جو لوگ جمع کرتے ہیں ۝۱۵۷ اور بلاشبہ اگر تم مر جاؤ، یا قتل کیے جاؤ تو یقیناً تم اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۝۱۵۸

بمعنی لڑنے والے، جیسے " رَاكِعٌ "کی جمع " رُكَّعٌ " آتی ہے۔ مسلمانوں کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے نفاق کی وجہ سے کافر ہیں اور یہ گندہ عقیدہ صرف دل ہی میں نہیں رکھتے بلکہ برملا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ہمارے جو بھائی جہاد کے سفر میں فوت ہو گئے یا لڑتے ہوئے مارے گئے، اگر ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے۔ ان کا یہ عقیدہ اور قول اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے ان کے دلوں میں حسرت و افسوس کا باعث بنائے رکھے گا۔ مسلمانوں کو اس عقیدہ سے اس لیے روکا کہ غلط ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بزدلی کا باعث بنتا ہے، جب کہ موت و حیات تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وقت مقرر ہے۔ یہی عقیدہ مسلمان کی قوت کا باعث ہے، اس لیے حکم دیا کہ دل مضبوط رکھو، موت اپنے وقت سے ایک لمحہ بھی پہلے نہیں آ سکتی۔ اگر مگر کے الفاظ شیطان کو دخل اندازی کا موقع دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قوی مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ضعیف سے بہتر اور زیادہ محبوب ہے اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بھلائی ہے، اس چیز کی حرص کرو جو تمھیں نفع دے اور اللہ سے مدد مانگو اور عاجز مت ہو جاؤ اور اگر تمھیں کوئی مصیبت پہنچے تو یہ مت کہو، اگر میں ایسا اور ایسا کرتا (تو مجھے یہ مصیبت نہ پہنچتی) بلکہ یوں کہو کہ اللہ نے جو مقدر کیا اور جو چاہا کر دیا، اس لیے کہ "لَوْ" (اگر کا لفظ) شیطان کے کام (کا راستہ) کھول دیتا ہے۔'' [مسلم، القدر، باب الإيمان بالقدر والاذعان له : ۲٦٦٤، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

آیت 157 یعنی اگر تمھارا مرنا یا قتل ہونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے تو یہ یقیناً تمھارے لیے مغفرت اور رحمت کا سبب بنے گا اور یہ مغفرت و رحمت اس مال و متاع سے بہتر ہے جس کے جمع کرنے کی فکر میں یہ کفار اور منافقین ہر آن لگے رہتے ہیں، یہ ان کے شبہ کا دوسرا جواب ہے۔ ''لَمَغْفِرَةٌ'' اور ''رَحْمَةٌ'' میں تنوین تقلیل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ''تھوڑی سی بخشش اور رحمت'' کیا گیا ہے۔

آیت 158 وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ ...... : اوپر کی آیت میں خاص قسم کے قتل اور موت، یعنی فی سبیل اللہ کا ذکر تھا، جس پر رحمت و مغفرت کی خوش خبری تھی، اب یہاں عمومی موت اور قتل کا ذکر ہے (جس طرح بھی واقع ہو) مطلب یہ کہ تمھیں مر کر بہر حال ہمارے پاس آنا اور اپنے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ پانا ہے، اگر تمھاری زندگی اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی خاطر ہو اور اسی کی راہ میں موت ہو تو تم اپنے اعمال کا خوش کن بدلہ پاؤ گے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

پس اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہی کی وجہ سے تو ان کے لیے نرم ہو گیا ہے اور اگر تو بدخلق، سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کر اور ان کے لیے بخشش کی دعا کر اور کام میں ان سے مشورہ کر، پھر جب تو پختہ ارادہ کر لے تو اللہ پر بھروسا کر، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں سے محبت کرتا

آیت 159، 160 ① فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ : یہاں جار مجرور " بِرَحْمَةٍ " پہلے آنے ہی سے تاکید پیدا ہو گئی تھی، پھر "مَا" لا کر "فَبِمَا رَحْمَةٍ" میں تاکید مزید ہو گئی۔ "رَحْمَةٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ ''بڑی رحمت'' کیا ہے۔

② وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ ...... : احد کے دن مسلمانوں نے خوف ناک غلطی کی اور میدان چھوڑ کر فرار اختیار کیا، پھر جب رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے دوبارہ جمع ہوئے تو آپ نے ان کو کسی قسم کی سرزنش نہیں کی، بلکہ حسن اخلاق سے پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کا یہ حسن خلق اور طبیعت کی نرمی اللہ تعالیٰ کے خاص فضل واحسان اور رحمت کا نتیجہ ہے، ورنہ مسلمانوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا۔ (قرطبی) معلوم ہوا دعوت دین کے لیے نرمی اور حسن اخلاق نہایت ضروری چیزیں ہیں، بدخلقی، درشتی اور سخت دلی سے لوگ کبھی قریب نہیں آ سکتے۔

③ فَاعْفُ عَنْهُمْ ...... : یعنی جنگ میں ان سے جو غلطیاں ہوئیں وہ انھیں معاف کر دیں، اللہ سے بھی ان کے لیے استغفار کریں اور مشورے سے محروم نہ کریں بلکہ برابر مشورہ کرتے رہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''شاید رسول اللہ ﷺ کا دل مسلمانوں سے خفا ہوا ہوگا اور چاہا ہوگا کہ اب ان سے مشورہ نہ پوچھیے، سو حق تعالیٰ نے تلقین فرمائی کہ اول مشورہ کر لینا بہتر ہے، جب ایک بات طے ہو جائے پھر پس و پیش نہ کرے۔'' (موضح) اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب کبھی جنگ یا انتظامی قسم کا کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو، جس میں ہماری طرف سے بذریعۂ وحی کوئی متعین حکم نہ دیا جائے تو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لیا کرو، تاکہ ان کی دل جوئی ہو اور انھیں بعد میں باہمی مشورہ سے مل کر کام کرنے کی تربیت بھی حاصل ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اکثر اہم امور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورے فرمائے اور ان پر عمل بھی ہوا۔ (دیکھیے ابن کثیر زیر بحث آیت) اس کے بعد خلفائے راشدین بھی اس سنت پر پوری طرح کاربند رہے۔ پھر اگر مشورے کے بعد کسی چیز کا فیصلہ کر لیا جائے تو اسے پوری دل جمعی سے کر گزرنے اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینے کا نام توکل ہے۔ چنانچہ مذکور ہے کہ جنگ اُحد کے موقع پر کھلے میدان میں لڑائی کرنے کے فیصلے کے بعد جب آپ مسلح ہو کر تشریف لے آئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے آپ کی رائے کے مطابق شہر ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے پر رضا مندی ظاہر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ لِنَبِيٍّ إِذَا لَبِسَ لَأْمَتَهُ أَنْ يَّضَعَهَا حَتّٰى يُقَاتِلَ)) [مسند أحمد : ۳/۳۵۱، ح : ۱۴۷۹۹] ''کسی نبی کے لائق نہیں کہ جب اپنا اسلحہ پہن لے تو لڑنے سے پہلے اسے اتار دے۔'' یہ آیت اور آیت: ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾

يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ
يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

ہے ﴿۱۵۹﴾ اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو
اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ﴿۱۶۰﴾

[الشوریٰ : ۳۸] اسلامی طرزِ حکومت کے لیے بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ اپنی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت سے معاملات میں مشورہ کرتے تھے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''(جنگ بدر کے موقع پر) نبی ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر ملی تو آپ نے مشورہ کیا۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بات کی تو آپ نے ان سے اعراض کیا۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: ''شاید آپ ہم (انصار) سے پوچھنا چاہتے ہیں، اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ ہم گھوڑوں کو سمندر میں ڈال دیں تو ہم ضرور ڈال دیں گے اور اگر آپ حکم دیں کہ گھوڑوں کو برک الغماد (مدینہ سے بہت دور ایک جگہ) تک لے جائیں تو ہم ضرور لے جائیں گے۔'' [مسلم، الجہاد والسیر، باب غزوۃ بدر : ۱۷۷۹] جنگ خندق میں رسول اللہ ﷺ کے مشورہ کرنے پر سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خندق کھودنے کی رائے دی جس پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس مشورے میں بہت برکت پیدا فرمائی۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء برابر دیانت دار اہل علم سے مشورہ لیتے رہے۔'' (قرطبی)

آج کل بہت سے لوگ مشورے اور ووٹ کو ایک چیز سمجھتے ہیں اور جمہوریت کو اسلامی شوریٰ قرار دیتے ہیں، حالانکہ موجودہ جمہوریت اور اسلامی شوریٰ الگ الگ چیزیں ہیں، کیونکہ جمہوریت ایک مستقل دین ہے۔ اس میں: ① ہر اہل اور نا اہل کا ووٹ برابر ہے۔ ② اس میں عوام کی اکثریت فیصلہ کن ہے، فیصلوں میں انھی کو اللہ اور رسول کا مقام حاصل ہے، خواہ وہ سود کو حلال کر دیں، یا زنا اور قوم لوط کے عمل کو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی کوئی شرط نہیں، اگر کہیں ہے بھی تو دھوکا دینے کے لیے۔ ③ اس میں فیصلہ اکثریت کے نمائندوں کی اکثریت کا ہوتا ہے، صدر اس فیصلے کا پابند ہے، خواہ اسے غلط سمجھتا ہو یا صحیح۔ ④ ان کے ہاں مشورے کا معنی اکثریت ہے۔ جب کہ اسلام میں: ① امیر مشورہ لینے کا پابند ہے، مگر صرف ان امور میں جو قرآن و سنت میں مذکور نہ ہوں، بلکہ تدبیری اور انتظامی قسم کے ہوں۔ ② امیر مشورہ ان لوگوں سے لے گا جو اس معاملے میں رائے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''حکمرانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ علماء سے ایسے معاملات میں مشورہ کریں جن کا انھیں علم نہیں ہے، یا ان کے بارے میں انھیں اشکال ہے، فوج کے سربراہوں سے فوجی معاملات میں، سربرآوردہ لوگوں سے عوام کے مصالح کے بارے میں اور ماتحت حکام و والیان سے ان کے علاقوں کی ضروریات و ترجیحات کے متعلق مشورہ کریں۔'' ③ مشورے کے بعد آخری فیصلہ امیر کا ہو گا، فرمایا: ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [آل عمران : ۱۵۹] اگر وہ مناسب سمجھے تو اکثریت کے فیصلے پر عمل کرے اور اگر کم لوگوں میں زیادہ اہلیت والے لوگ ہونے کی وجہ سے ان

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ
مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ
وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾
لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

اور کسی نبی کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ وہ خیانت کرے، اور جو خیانت کرے گا قیامت کے دن لے کر آئے گا جو اس نے خیانت کی، پھر ہر شخص کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا (۱۶۱) تو کیا وہ شخص جو اللہ کی رضا کے پیچھے چلا اس شخص جیسا ہے جو اللہ کی طرف سے سخت ناراضی لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے (۱۶۲) یہ لوگ اللہ کے نزدیک مختلف طبقے ہیں اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں (۱۶۳) بلاشبہ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس نے ان میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے (۱۶۴)

کی رائے کو بہتر سمجھے تو اس پر فیصلہ کرے، کیونکہ فیصلوں کے نتائج کا آخری ذمہ دار امیر ہوگا، اکثریت نہیں اور وہ بھی اللہ پر توکل کرتے ہوئے فیصلے پر عمل کرے گا، نہ کہ مشورہ دینے والوں کی یا اپنی عقل وفہم پر۔ اگلی آیت میں پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کی تاکید ہے۔

آیت 161 ① **وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ......**: اوپر کی آیات میں جہاد کی ترغیب ہے اور اس آیت میں جہاد کے احکام کا بیان ہے۔

② جنگ احد کے دوران جو لوگ مورچہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے دوڑ پڑے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ہم نہ پہنچے تو سارا مال غنیمت دوسرے لوگ سمیٹ کر لے جائیں گے، اس پر تنبیہ کی جا رہی ہے کہ آخر تم نے یہ تصور کیسے کر لیا کہ اس مال میں سے تمھارا حصہ تمھیں نہیں دیا جائے گا۔ کیا تمھیں نبی ﷺ کی امانت پر اطمینان نہیں؟ یاد رکھو! ایک پیغمبر سے کسی قسم کی خیانت کا صدور ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ خیانت نبوت کے منافی ہے۔ معلوم ہوا غلول (خیانت) کے معنی ”تقسیم میں ناانصافی“ کے بھی آتے ہیں اور یہ بھی غلول ہے کہ تقسیم سے پہلے مال غنیمت سے کوئی چیز بلا اجازت اٹھا لی جائے۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”طمع کے کام تو ادنیٰ نبیوں سے بھی سرزد نہیں ہو سکتے (چہ جائیکہ سید الانبیاء سے)۔“ (موضح)

آیت 164 ① **لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ ......**: اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے بشر ہونے اور انسانوں ہی میں سے ہونے کو ایک احسان کے

اَوَ لَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ مُّصِيۡبَةٌ قَدۡ اَصَبۡتُمۡ مِّثۡلَيۡهَا ۙ قُلۡتُمۡ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۶۵﴾

اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی کہ یقیناً اس سے دگنی تم پہنچا چکے تھے تو تم نے کہا یہ کیسے ہوا؟ کہہ دے یہ تمھاری اپنی طرف سے ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۶۵﴾

طور پر بیان کر رہا ہے اور فی الواقع یہ احسان عظیم ہے کہ اس طرح ایک تو وہ اپنی قوم کی زبان اور لہجے ہی میں اللہ کا پیغام پہنچائے گا، جسے سمجھنا ہر شخص کے لیے آسان ہوگا، دوسرے لوگ ہم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مانوس اور اس سے قریب ہوں گے اور تیسرے انسان کے لیے انسان، یعنی بشر کی پیروی تو ممکن ہے، لیکن فرشتوں کی پیروی اس کے بس کی بات نہیں، نہ فرشتوں میں وہ کمزوریاں اور ضرورتیں پائی جاتی ہیں جو انسان میں ہیں اور نہ فرشتہ انسان کے وجدان و شعور کی گہرائیوں اور باریکیوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس لیے اگر پیغمبر فرشتوں میں سے ہوتے تو وہ ان ساری ضروریات سے محروم ہوتے جو تبلیغ و دعوت کے لیے لازمی ہیں، اس لیے جتنے انبیاء بھی آئے سب کے سب بشر ہی تھے۔ قرآن مجید نے ان کی بشریت کو خوب کھول کر بیان کیا ہے، مثلاً دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۹)، سورۂ فرقان (۲۰)، سورۂ حم السجدہ (۶) اور سورۂ کہف کی آخری آیت۔

❷ اوپر کی آیت میں جب یہ بیان فرما دیا کہ غلول اور خیانت ایک نبی کی شان سے بعید ہے، نبوت و خیانت جمع نہیں ہو سکتے تو اب اس آیت میں اسی کی مزید تاکید فرمائی کہ آپ ﷺ کو ایک پاکیزہ اور اعلیٰ نصب العین دے کر مبعوث کیا گیا ہے، جو یہ ہے کہ تم پر اس کی آیات پڑھے، تمھیں کتاب و حکمت (سنت) کی تعلیم دے اور رذائل سے پاک کرے، پھر ایسی پاکیزہ ہستی کی طرف، جو اتنے عظیم مقصد کے حصول کی خاطر مبعوث ہوئی ہو، کوئی عقل مند آدمی غلول کی نسبت کیسے کر سکتا ہے، یا کسی کے دل میں یہ خیال کیسے آ سکتا ہے کہ آپ خیانت جیسے کبیرہ اور مذموم فعل کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بہت سی احادیث میں اس گناہ کو کبیرہ قرار دیا ہے، حتیٰ کہ ابن لتبیہ والی حدیث میں حکام کے ہدیوں (تحائف) کو بھی غلول شمار کیا۔ [بخاری، الحیل، باب احتیال العامل...... : ۶۹۷۹] "وَ اِنۡ كَانُوۡا" یہ اصل میں " وَ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا " تھا، دلیل اس کی "لَفِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ" پر لام تاکید کا آنا ہے۔

آیت 165 ❶ اَوَ لَمَّاۤ اَصَابَتۡكُمۡ ...... : یعنی احد میں تمھارے ستر آدمی شہید ہو گئے تو بدر میں تم نے ان کے ستر آدمی قتل اور ستر قید کیے تھے اور قیدی بھی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے کہ جب گرفتار کرنے والے کی مرضی ہوا سے قتل کر ڈالے۔

❷ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ : یعنی تمھارے گناہوں کی وجہ سے، یا خود تمھارے پسند کرنے کی وجہ سے۔ (فتح القدیر) پہلی صورت سے مراد یہ ہے کہ تمھاری اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے، جس کا ارتکاب تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ کر کیا۔ (قرطبی) دوسری صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تمھارے فدیہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے۔ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں صحابہ کو اختیار دیا تھا کہ اگر تم فدیہ لینا چاہتے ہو تو اس کے

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ۚ

اور جو مصیبت تمھیں اس دن پہنچی جب دو جماعتیں بھڑیں تو وہ اللہ کے حکم سے تھی اور تا کہ وہ ایمان والوں کو جان لے ﴿۱۶۶﴾ اور تا کہ وہ ان لوگوں کو جان لے جنھوں نے منافقت کی اور جن سے کہا گیا آؤ اللہ کے راستے میں لڑو، یا مدافعت کرو تو انھوں نے کہا اگر ہم کوئی لڑائی معلوم کرتے تو ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس دن اپنے ایمان (کے قریب ہونے) کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے، اپنے مونہوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ چھپاتے ہیں ﴿۱۶۷﴾

بدلے میں آئندہ تمھارے ستر آدمی شہید ہوں گے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے منظور کر لیا تھا، قرآن نے یہاں ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[ابن کثیر۔ طبری۔ أحمد : ۳۰/۱، ۳۱، ح : ۲۰۹]

آیت 166 وَمَاۤ اَصَابَكُمْ ...... : یعنی جنگ احد میں تمھیں جس نقصان کا سامنا کرنا پڑا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیت سے تھا اور اس میں حکمت یہ تھی کہ اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان تمیز ہو جائے۔

آیت 167 ① اَوِ ادْفَعُوْا : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ احد میں ایک ہزار کی جمعیت لے کر احد کی طرف چلے، مقام شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں سمیت وہاں سے لوٹ آیا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اگر اللہ کی راہ میں جہاد نہیں کر سکتے تو کم از کم مسلمانوں کے ساتھ رہو، تا کہ کثرت تعداد کا دشمنوں پر اثر پڑے اور وہ آگے بڑھنے کی جرأت نہ کریں۔ اکثر مفسرین نے "اَوِ ادْفَعُوْا" کے یہی معنی کیے ہیں، مگر بعض نے یہ معنی بھی کیے ہیں کہ حمیت قومی اور حفاظت وطن کی خاطر ہی لڑائی میں شامل رہو۔ (یہ معنی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے) الغرض! لوگوں نے ہر طرح سے انھیں واپس لانے کی کوشش کی مگر وہ تیار نہ ہوئے اور وہ جواب دیا جو آگے آ رہا ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

② قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا ...... : وہ کہنے لگے، کوئی لڑائی وڑائی نہیں ہوگی، اگر ہمیں واقعی لڑائی کی توقع ہوتی تو ہم ضرور تمھارا ساتھ دیتے، یا مطلب یہ ہے کہ کوئی ڈھب کی جنگ ہوتی اور فریقین میں کچھ تناسب ہوتا تو ہم ضرور شرکت کرتے، مگر اُدھر تین ہزار کا مسلح لشکر ہے اور اِدھر ایک ہزار بے سروسامان آدمی ہیں، یہ کوئی جنگ ہے!؟ یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اس بنا پر ہم ساتھ نہیں دے سکتے۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یہ کلمہ انھوں نے طعن کے طور پر کہا تھا اور مطلب یہ تھا کہ مسلمان فنون حرب سے بالکل ناآشنا ہیں، ورنہ ہماری رائے مان لی جاتی تو مدینہ کے اندر رہ کر مدافعت کی جاتی۔" (موضح)

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

جنھوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا اور خود بیٹھے رہے، اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ کہہ دے پھر اپنے آپ سے موت کو ہٹا دینا، اگر تم سچے ہو ﴿۱۶۸﴾ اور تو ان لوگوں کو جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے، ہرگز مردہ گمان نہ کر، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیے جاتے ہیں ﴿۱۶۹﴾

③ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ : یعنی اس سے قبل تو وہ بظاہر مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے، گو ان کے باطن میں کفر تھا، مگر اعلانیہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، لیکن اس روز انھوں نے ایمان کو چھوڑ کر علانیہ کفر اختیار کر لیا، یا مطلب یہ ہے کہ اس دن انھیں ایمان کی بہ نسبت کفر کا مفاد زیادہ عزیز تھا اور انھوں نے واپس ہو کر مسلمانوں کو کمزور کیا اور کفر کو تقویت بخشی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یہ کلمہ انھوں نے طعن کے طور پر کہا تھا، پس اس لفظ کی وجہ سے وہ کفر کے قریب اور ایمان سے دور ہو گئے۔'' (موضح)

④ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ ...... : یعنی بظاہر یہ کلمہ کہہ کر عذر لنگ اور بہانہ بناتے ہیں، مگر جو جذبات ان کے دلوں میں چھپے ہوئے ہیں ان کا صاف طور پر اظہار نہیں کرتے، دراصل یہ مسلمانوں کی ہلاکت کے متمنی ہیں، لیکن انھیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کی باتوں سے خوب واقف ہے۔

آیت 168 جو مسلمان جنگ احد میں شہید ہوئے ان کے بارے میں منافقین نے اس قسم کا اظہار کیا، تاکہ لوگوں کو جہاد میں شمولیت سے متنفر کیا جا سکے۔ قرآن نے ان کے اس شبہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر واقعی گھروں میں بیٹھے رہنا تمھیں موت سے بچا سکتا ہے تو ذرا اپنے اوپر واقع ہونے والی موت کو ٹال کر دکھاؤ۔

آیت 168 اس آیت میں منافقین کے اس شبہ کی کہ ''جہاد میں شامل ہونا خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے'' ایک دوسرے طریقے سے تردید کی ہے۔ فرمایا، نہیں بلکہ اس سے دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے، شہداء کو اللہ کے ہاں بلند درجے ملتے ہیں، پروردگار کے ہاں انھیں ہر قسم کی نعمت اور لذت حاصل ہوتی ہے، یہ زندگی حقیقی زندگی ہے مگر دنیا والی زندگی نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جو تمھاری نگاہ سے اوجھل ہے، جسے ''برزخ'' کہتے ہیں اور جو تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکتی، فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۵٤] ''اور لیکن تم (اس زندگی کو) نہیں سمجھتے۔''

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کریمہ ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا﴾ سے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان (شہداء) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہوتی ہیں اور ان کے لیے عرش الٰہی کے ساتھ قندیلیں معلق ہوتی ہیں، وہ جنت میں جہاں سے چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں، پھر عرش کے

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ
اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ
اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ
الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

اس پر بہت خوش ہیں جو انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے اور ان کے بارے میں بھی بہت خوش ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ ان کے پیچھے سے نہیں ملے کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۷۰﴾ وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل پر بہت خوش ہوتے ہیں اور (اس بات پر) کہ بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۷۱﴾ وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کا حکم مانا، اس کے بعد کہ انھیں زخم پہنچا، ان میں سے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیکی کی اور متقی بنے بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۷۲﴾

نیچے لٹکی ہوئی انھی قندیلوں میں آ کر رہتی ہیں۔" [مسلم، الإمارة، باب بيان أن أرواح الشهداء في الجنة...... : ۱۸۸۷]

آیت 170 وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ ...... : یعنی اپنے جن مسلمان بھائیوں کو جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول چھوڑ آئے ہیں ان کا تصور کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ان کو بھی ہماری طرح پر لطف اور بے خوف و خطر زندگی حاصل ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تمھارے بھائی احد میں شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں کے قالبوں میں ڈال دیا، جو جنت کی نہروں پر آتی ہیں، جنت کے پھل کھاتی ہیں اور عرش کے سائے میں سونے کی قندیلوں کے پاس ٹھہر جاتی ہیں، جب انھوں نے اپنے پاکیزہ کھانے اور پینے کو دیکھا اور اپنے حسن انجام کو ملاحظہ کیا تو کہنے لگے: "اے کاش! ہمارے بھائیوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ کیا اچھا سلوک فرمایا ہے، تاکہ وہ جہاد سے غافل ہو کر جنگ سے منہ نہ موڑیں۔" تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تمھارا یہ پیغام میں پہنچا دیتا ہوں۔" تو یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ ﴾ [أحمد : ۲۶۵/۱، ۲۶۶، ح : ۲۳۸۸، عن عبد الله بن عباس رضی اللہ عنہما و صححه أحمد شاكر في المسند : ۲۳۸۹] "يَسْتَبْشِرُوْنَ" میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ "بہت خوش ہوتے ہیں" کیا ہے۔

آیت 172 یہ حمراء الاسد، یعنی جنگ احد سے اگلے روز کا واقعہ ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ احد سے پلٹ کر جب مشرکین چند منزل دور چلے گئے تو آپس میں کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی کہ مسلمانوں کا پوری طرح خاتمہ کیے بغیر واپس چلے آئے۔ چنانچہ وہ مدینے پر دوبارہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگے، ادھر جب رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ نے مسلمانوں کو مشرکین کے تعاقب میں نکلنے کا حکم دیا، تاکہ وہ واقعی پلٹ کر مدینہ پر حملہ نہ کر دیں۔ اس وقت اگرچہ شرکائے احد میں سے اکثر لوگ سخت زخمی اور تھکے تھے لیکن اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل میں فوراً نکل کھڑے ہوئے۔ جب مدینہ سے

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

وہ لوگ کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سوان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا اور انھوں نے کہا ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے ﴿۱۷۳﴾

تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر حمراء الاسد (نامی جگہ) پہنچے تو مشرکین کو ان کے آنے کی اطلاع مل گئی اور انھوں نے آپس میں کہا کہ اس مرتبہ تو واپس چلتے ہیں، اگلے سال پھر آئیں گے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نبی ﷺ بھی مدینہ واپس تشریف لے آئے، چنانچہ آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے اور مسلمانوں کو بشارت ہے۔ (ابن کثیر)

عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے عروہ سے کہا: ''اے میرے بھانجے! تیرے دونوں باپ زبیر (والد) اور ابوبکر (نانا) بھی ان میں شامل تھے، جب رسول اللہ ﷺ کو احد میں وہ تکالیف پہنچیں جو پہنچیں اور مشرکین واپس چلے گئے تو آپ نے خوف محسوس کیا کہ وہ پلٹ نہ آئیں تو فرمایا: ''ان کے پیچھے کون جائے گا؟'' تو ان میں سے ستر آدمیوں نے لبیک کہا، ان میں ابوبکر اور زبیر بھی تھے۔'' [بخاری، المغازی، باب : ﴿ الذین استجابوا لله والرسول ﴾ : ۴۰۷۷، عن عائشة رضی اللہ عنہا]

آیت 173 ① **اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ......** : یہ آیت بھی واقعہ حمراء الاسد ہی سے متعلق ہے اور وہ اس طرح کہ جب ابوسفیان کو جو اس وقت مشرکین کی قیادت کر رہا تھا، مسلمانوں کے تعاقب کی اطلاع ملی تو اس نے ایک تجارتی قافلے کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو یہ چیلنج بھیجا کہ میں نے بڑا لاؤ لشکر جمع کر لیا ہے اور میں مدینہ پر پھر سے حملہ کرنے والا ہوں، یہ سن کر مسلمانوں میں خوف اور کمزوری کے بجائے مزید ایمانی قوت پیدا ہوئی اور آپ ﷺ اور صحابہ نے کہا: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ ''ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔'' (ابن کثیر)

② عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ کا کلمہ ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا جب انھیں آگ میں ڈالا گیا اور محمد ﷺ نے اس وقت کہا جب لوگوں نے کہا: ﴿ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ﴾ ''بے شک لوگوں نے تمھارے لیے (فوج) جمع کر لی ہے، سو ان سے ڈرو، تو اس بات نے انھیں ایمان میں زیادہ کر دیا'' اور انھوں نے کہا: ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ ''ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ الذین قال لهم الناس...... ﴾ : ۴۵۶۳]

③ **فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا** : اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کا ایمان مشرکین کے چیلنج کرنے سے بڑھ گیا، ظاہر ہے وہ پہلے نسبتاً کم تھا، تب ہی بڑھا۔ اس سے ایمان کی کمی بیشی ثابت ہوتی ہے اور ان لوگوں کی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ ہمارا ایمان جبریل علیہ السلام اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان جیسا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان جس قدر بڑھتا ہے جذبۂ جہاد بھی بڑھتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نہ جنگ کی نہ اپنے دل سے جنگ کی بات کی، وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا۔'' [مسلم، الإمارة، باب ذم من مات و لم يغز ...... ۱۹۱۰۔ أبو داوٗد، الجهاد، باب كراهية ترك الغزو : ۲۵۰۲، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

تو وہ اللہ کی طرف سے عظیم نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی برائی نہیں پہنچی اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۱۷۴﴾ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو ﴿۱۷۵﴾ اور وہ لوگ تجھے غمزدہ نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، بے شک وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ﴿۱۷۶﴾ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کو ایمان کے بدلے خریدا، وہ ہرگز اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۷﴾

آیت 174 اس آیت سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے کلمہ ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ کس طرح ابراہیم علیہ السلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر قسم کی برائی سے محفوظ رہ کر اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس پلٹے اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی۔ اس لیے ہر مصیبت کے وقت اس وظیفہ کے معنی کا خیال کرتے ہوئے دل اور زبان کو ایک کر کے اسے کثرت سے پڑھنا چاہیے۔

آیت 175 وہ شخص جو یہ افواہیں پھیلا رہا تھا اسے شیطان فرمایا اور بتایا کہ یہ اپنے کافر اور منافق دوستوں سے ڈرا رہا ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر دل میں نہ لائیں۔ حقیقی شیطان بھی اپنے انسانی دوست شیطانوں کے دلوں میں مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کے نئے سے نئے طریقے ڈالتا رہتا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۱۲) آج کل اخبار، ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ جھوٹ پھیلانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے شیطان کے آلات ہیں۔ مومن کو ان کی خبروں سے ڈرنے کے بجائے اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے اور " اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ " کے تحت ان کا علاج بھی کرنا چاہیے۔

آیت 176 کافر اور منافق مختلف طریقوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے رہتے، جس سے آپ طبعی طور پر رنجیدہ خاطر بھی ہو جاتے، خصوصاً غزوۂ احد کے واقعہ کو منافقین نے بہت ہوا دی اور مسلمانوں کو اللہ کی نصرت سے مایوس کرنے کی کوشش کی اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ اس قسم کی مخالفتوں سے کفار اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اس قسم کا رویہ اختیار کر کے خود ہی آخرت کے حصے سے محروم ہو رہے ہیں۔

آیت 177 یعنی یہ لوگ ایمان کے بجائے کفر اختیار کر کے خود اپنا برا کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں دردناک عذاب سے

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہرگز گمان نہ کریں کہ بے شک جو مہلت ہم انھیں دے رہے ہیں وہ ان کی جانوں کے لیے بہتر ہے، ہم تو انھیں صرف اس لیے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے﴿۱۷۸﴾ اللہ کبھی ایسا نہیں کہ ایمان والوں کو اس حال پر چھوڑ دے جس پر تم ہو، یہاں تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ تمھیں غیب پر مطلع کرے اور لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے، پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور متقی بنو تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے﴿۱۷۹﴾

دو چار ہوں گے۔

آیت 178 فرمایا، ہم جو کافروں کی عمریں لمبی کرتے چلے جا رہے ہیں اور انھیں ان کے حال پر چھوٹ دے رہے ہیں، مال، اولاد اور دنیا کی نعمتیں وافر دے رہے ہیں، تو کیا یہ سب کچھ ان کے لیے بہتر ہے؟ نہیں، بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے، کیونکہ اس سے ان کے گناہوں میں اضافہ ہوگا، ان کے خلاف حجت مضبوط ہو گی، بلکہ دنیا میں بھی یہ سب کچھ ان کے لیے عذاب کا باعث بنے گا، دیکھیے سورۂ مومنون (۵۵، ۵۶)، سورۂ قلم (۴۴) اور سورۂ توبہ (۵۵)۔

آیت 179 ① مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ...... : چنانچہ جنگ احد میں کفر و نفاق اور ایمان و اخلاص الگ ہو کر سامنے آ گئے۔ رازی لکھتے ہیں: ''اس آیت کا تعلق بھی قصۂ احد سے ہے۔ چنانچہ اس حادثہ میں قتل و ہزیمت اور پھر اس کے بعد ابوسفیان کے چیلنج کے جواب میں مسلمانوں کا نکلنا وغیرہ، سب ایسے واقعات تھے جن سے کفر ونفاق اور ایمان و اخلاص الگ الگ ہو کر سامنے آ گئے اور مومن اور منافق میں امتیاز ہو گیا۔ چونکہ منافقین کا مومنوں کے ساتھ ملا جلا رہنا حکمتِ الٰہی کے خلاف تھا، اس لیے یہ تمام واقعات پیش آئے۔

② وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ: یعنی اگر اللہ تعالیٰ اس طرح آزمائش کے ذریعے سے مخلص مومنوں اور منافقین کے حالات اور ان کے ظاہر و باطن کو نمایاں نہ کرے تو تمھارے پاس کوئی غیب کا علم تو ہے نہیں کہ جس سے تم پر یہ چیزیں ظاہر ہو جائیں اور تم جان سکو کہ کون مومن ہے اور کون منافق؟ اور نہ تم میں سے ہر ایک کو غیب کی بات پر اطلاع دی جا سکتی ہے اور نہ تم میں سے کسی کو بھی پورے غیب کی اطلاع دی جا سکتی ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع ۱۸ / ۹

اور وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ وہ ان کے لیے برا ہے، عنقریب قیامت کے دن انھیں اس چیز کا طوق پہنایا جائے گا جس میں انھوں نے بخل کیا اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی میراث ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پورا باخبر ہے ﴿۱۸۰﴾

③ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ...... ہاں، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب کی جتنی بات چاہتا ہے اس کی اطلاع دے دیتا ہے، جو نہیں چاہتا نہیں بتاتا۔ اب منافقین میں سے بعض کا بتا دیا اور بعض کا نہیں بتایا، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۚ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۚ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۚ لَا تَعْلَمُهُمْ ۚ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ﴾ [التوبة : ۱۰۱] ”اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے ارد گرد بدویوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہل مدینہ میں سے بھی جو نفاق پر اڑ گئے ہیں، تو انھیں نہیں جانتا، ہم ہی انھیں جانتے ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے چنے ہوئے رسولوں کو غیب کی کچھ باتوں کی اطلاع دیتا ہے، جن کی انھیں نبوت کی دلیل کے طور پر ضرورت ہوتی ہے، مگر وہ اس سے عالم الغیب نہیں بنتے، عالم الغیب ایک اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۵۹)، سورۂ نمل (۶۵) اور سورۂ جن (۲۶ تا ۲۸)۔

④ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ : مسلمانوں کا یہ کام نہیں کہ رسول سے اپنی مرضی کی غیب کی باتیں بتانے کا مطالبہ کریں۔ ان کا کام اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا ہے اور اگر وہ ایمان لا کر تقویٰ اختیار کریں گے تو ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

آیت 180 ① وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ...... : اوپر ترغیب جہاد کے سلسلے میں جانی قربانی پر زور دیا ہے اور جو جان بچانے کی خاطر اس سے فرار اختیار کرتے ہیں ان کے حق میں وعید سنائی ہے۔ اب یہاں جہاد میں مالی قربانی پر زور دیا جا رہا ہے اور بخل کرنے والوں کی مذمت کی جا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح ان منافقین کو اپنی جان پیاری ہے اسی طرح ان کو اپنا مال بھی پیارا ہے اور جو لوگ مال کے حقوق ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے ہیں، قیامت کے دن یہی مال ان کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ مال دیا ہے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے مال کو ایک گنجے سانپ کی شکل دے دی جائے گی اور وہ طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں سے پکڑے گا اور اس سے کہے گا: ”میں ہوں تمھارا مال، میں ہوں تمھارا خزانہ۔“ پھر نبی ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [بخاري، التفسير، باب : ﴿ولا يحسبن الذين يبخلون...... ﴾ : ۴۵۶۵، عن أبي هريرة رضي الله عنه]

② بخل ان حقوق کو ادا نہ کرنے کا نام ہے جو انسان پر واجب ہوں، مثلاً گھر والوں کا نان و نفقہ، مہمان نوازی، جہاد کی تیاری، زکوٰۃ و عشر وغیرہ۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ((وَ اَيُّ دَاءٍ اَدْوَأُ مِنَ الْبُخْلِ)) ”بخل سے بڑی بیماری کیا ہو سکتی ہے؟“

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

بلاشبہ یقیناً اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا بے شک اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں، ہم ضرور لکھیں گے جو انھوں نے کہا اور ان کا نبیوں کو کسی حق کے بغیر قتل کرنا بھی اور ہم کہیں گے جلنے کا عذاب چکھو ﴿۱۸۱﴾ یہ اس کی وجہ سے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اس لیے کہ بے شک اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ﴿۱۸۲﴾

[بخاری، المغازی، باب قصۃ عمان والبحرین : ۴۳۸۳]

③ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ...... : یعنی جب زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی میراث اور ملکیت ہے تو جس مال کے بظاہر تم وارث بنائے گئے ہو، اس میں بخل کیوں کرتے ہو؟ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اللہ وارث ہے، آخر تم مر جاؤ گے اور مال اسی کا ہو رہے گا، تم اپنے ہاتھ سے دو تو ثواب پاؤ۔'' (موضح)

آیت 181 ① لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ...... : اوپر کی آیات میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر زور دیا، اب ان آیات میں یہود کے اعتراضات کا بیان اور ان کا جواب دینا مقصود ہے۔ دراصل یہود یہ اعتراضات نبوت پر طعن کی غرض سے کرتے تھے۔ کتب تفسیر میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ [البقرۃ : ۲۴۵] ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض'' تو بعض یہود نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ''لو جی، اللہ میاں بھی فقیر ہو گئے ہیں اور بندوں سے قرض مانگنے پر اتر آئے ہیں۔'' تو ان کے جواب میں یہ آیت اتری۔ (ابن کثیر) دراصل اس قسم کے اعتراضات وہ عوام کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے متنفر کرنے کی غرض سے کرتے تھے، ورنہ وہ بھی خوب جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے الفاظ کہنا کتنی بڑی گستاخی اور کفر ہے۔ (قرطبی)

② سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا: یعنی ان کی اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ گستاخی اور رسولوں کو ناحق قتل کرنا، سب ان کے نامۂ اعمال میں درج کیا جا رہا ہے۔ قیامت کے دن ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا اور وہ عذاب حریق کی سزا میں گرفتار ہوں گے۔

آیت 182 وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ: اس پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ '' ظَلَّامٌ '' مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا معنی بہت ظلم کرنے والا ہے۔ بظاہر معنی یہ ہوا کہ ''اللہ بندوں پر بہت ظلم کرنے والا نہیں'' گویا کم ظلم کر سکتا ہے۔ اس کا ایک جواب استاذ مرحوم مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ نے دیا ہے: ''اس مبالغے کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کے یہ معنی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے (نعوذ باللہ) رتی برابر بھی ظلم صادر ہو تو وہ '' ظَلَّامٌ '' ٹھہرے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات ظلم سے منزہ ہے۔'' یہ جواب بھی اچھا ہے، مگر اس سے قوی جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مبالغے کے صیغے پر نفی آئے تو اس سے مراد مبالغہ کی نفی نہیں ہوتی بلکہ نفی میں مبالغہ ہوتا ہے۔ اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں۔'' جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے ؎

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُهُ النَّارُ ؕ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ جَآءُوۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۱۸۴﴾

جنھوں نے کہا بے شک اللہ نے ہمیں تاکیدی حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کی بات کا یقین نہ کریں، یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لائے جسے آگ کھا جائے، کہہ دے بے شک مجھ سے پہلے کئی رسول تمھارے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے اور وہ چیز لے کر بھی جو تم نے کہی ہے، پھر تم نے انھیں کیوں قتل کیا، اگر تم سچے تھے ﴿۱۸۳﴾ پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو بے شک کئی رسول تجھ سے پہلے جھٹلائے گئے، جو واضح دلیلیں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے ﴿۱۸۴﴾

وَلَسۡتُ بِحَلَّالِ التِّلَاعِ مَخَافَةً وَلٰكِنۡ مَتٰى يَسۡتَرۡفِدِ الۡقَوۡمُ أَرۡفِدِ

ظاہر الفاظ کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا ''اور میں خوف کی وجہ سے ٹیلوں پر بہت زیادہ چڑھنے والا نہیں، بلکہ قوم جب مجھ سے عطیہ مانگے تو میں عطیہ دیتا ہوں۔'' مگر یہاں یہ معنی نہیں کہ میں بہت زیادہ چڑھنے والا نہیں، بلکہ معنی ہے کہ میں بالکل ٹیلوں پر نہیں چڑھتا۔ دلیل یہ ہے کہ میں عطیہ مانگنے پر دیتا ہوں۔ دیکھیے " البحر المحیط " اور " اللباب " وغیرہ۔

آیت 183 ❶ اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیۡنَاۤ ...... : یہ ان کا دوسرا اعتراض ہے جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہ لانے کے سلسلے میں پیش کیا کہ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا ہے کہ اگر کوئی نبی یہ معجزہ پیش نہ کرے تو اس پر ایمان نہ لائیں۔ (رازی) حالانکہ ان کی کسی کتاب میں یہ حکم نہیں اور ان کے تمام انبیاء کو یہ معجزہ عطا بھی نہیں ہوا تھا، جیسا کہ اسی آیت میں اشارہ ہے: ﴿ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ ﴾ یہاں "رُسُلٌ" نکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تمام انبیاء کو نہیں، بلکہ بعض کو یہ معجزہ عطا ہوا کہ جب کوئی سوختنی (جلائی جانے والی) قربانی (نذر) پیش کی جاتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے، اس قربانی (نذر) کی قبولیت کی علامت کے طور پر آسمان سے آگ اترتی، جو اسے جلا ڈالتی، جیسا کہ ایلیاء اور سلیمان علیہما السلام کے متعلق مذکور ہے۔ (ابن کثیر)

❷ قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ ...... : یہ ان کے اس اعتراض کا جواب ہے، جو اوپر ذکر ہوا کہ اگر واقعی تم اس دعویٰ میں سچے ہو تو پھر تمھارے آباء و اجداد نے ان بہت سے انبیاء کو قتل کیوں کر ڈالا جو اپنی نبوت کے صدق پر دوسری واضح دلیلوں کے ساتھ یہ معجزہ بھی لے کر آئے جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو؟

آیت 184 یہود کے تمسخر اور اعتراضات کا جواب دینے کے بعد آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اس قسم کے شبہات پیدا کر کے اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو یہ غم کی بات نہیں، کیونکہ آپ سے پہلے بہت سے انبیاء کے ساتھ وہ یہ سلوک کر چکے ہیں۔ "بِالۡبَیِّنٰتِ" سے دلائل عقلیہ اور معجزات دونوں مراد ہیں۔ " الزُّبُرِ" یہ زبور کی جمع ہے، اس سے وہ چھوٹے چھوٹے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ
وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ
وَ اَنْفُسِكُمْ ۟ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى
كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

ہر جان موت کو چکھنے والی ہے اور تمھیں تمھارے اجر قیامت کے دن ہی پورے دیے جائیں گے، پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہوگیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۸۵﴾ یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے ﴿۱۸۶﴾

صحیفے مراد ہیں جن میں نیکی کی نصیحت، برائی سے روکنے اور حکمت و دانائی کی باتیں ہوتی تھیں۔ داؤد علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی تھی، قرآن نے اسے بھی ''زبور'' کہا ہے، کیونکہ اس میں بھی انھی چیزوں کا پہلو نمایاں ہے اور قرآن کی اصطلاح میں ''الْكِتٰبِ'' سے مراد وہ بڑی کتاب ہے جس میں مسائل و احکام اور دوسری سب چیزیں ہوں، مگر ان کتابوں میں قرآن مجید کے سوا کسی کتاب کو اعجازی حیثیت حاصل نہیں ہوئی (کہ اس کی کسی سورت کے مقابلے میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج ہو)۔

آیت 185 بخیلوں کا حال اور ان کا کفر بیان کرنے کے بعد یہاں بتایا کہ دنیا کے جس مال و متاع کے جمع کرنے کے لیے انسان بخل کرتا ہے، یہ سب کچھ فانی ہے اور باقی نہ رہنے والا ہے اور آخرت کی زندگی ہی باقی اور ابدی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ آخرت کی فکر کرے اور اس میں کامیابی کی کوشش کرتا رہے۔ اور یہ جو فرمایا: ''تمھیں تمھارے اجر قیامت کے دن ہی پورے دیے جائیں گے'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو دنیا یا برزخ میں بھی کچھ نہ کچھ اعمال کا بدلہ ملتا ہے، مگر پورا بدلہ یعنی پورا ثواب و عقاب قیامت کے دن ہی ملے گا، اس سے پہلے ممکن نہیں۔ اور دنیا کی زندگی محض ''مَتَاعُ الْغُرُوْرِ'' (دھوکے کا سامان) ہے، اس کی ظاہری زیب و زینت سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ [لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ]

آیت 186 یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مسلمانوں سے ہے کہ آئندہ بھی جان و مال میں تمھاری آزمائش ہوگی اور تمھیں ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنا ہوں گی، جیسے اموال کا تلف ہو جانا اور بیمار پڑ جانا وغیرہ۔ اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے تمھیں انتہائی دل آزار اور جگر خراش طعن و تشنیع، بے ہودہ گفتگو اور جھوٹے الزامات سننا پڑیں گے، جیسا کہ منافقین نے ہر طرح ستایا۔ سورۂ منافقون اور سورۂ توبہ میں تفصیل دیکھ لیں، نیز کعب بن اشرف یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ٞ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

اور جب اللہ نے ان لوگوں سے پختہ عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی کہ تم ہر صورت اسے لوگوں کے لیے صاف صاف بیان کرو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے تو انھوں نے اسے اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لے لی، سو برا ہے جو وہ خرید رہے ہیں ﴿۱۸۷﴾ ان لوگوں کو ہرگز خیال نہ کر جو ان (کاموں) پر خوش ہوتے ہیں جو انھوں نے کیے اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان (کاموں) پر کی جائے جو انھوں نے نہیں کیے، پس تو انھیں عذاب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہرگز خیال نہ کر اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۸۸﴾

ہجو کی اور اپنے قصائد میں مسلمان خواتین کا نام لے کر تشبیب کہی۔ مگر ان کا علاج یہ ہے کہ تم صبر، یعنی ثابت قدمی اور استقلال سے کام لو اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اپنے دلوں میں رکھو۔ اگر صبر اور تقویٰ سے ان آزمائشوں کا مقابلہ کرو گے تو یہ نہایت ہمت، حوصلے اور اولو العزمی کا کام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمیشہ صبر اور تقویٰ سے کام لیتے رہے، حتیٰ کہ حالتِ جنگ میں بھی نہ ان کی طرح بدزبانی سے کام لیا اور نہ عملاً اس طرح زیادتی کی جس طرح انھوں نے کی تھی۔

آیت 187 یعنی اہل کتاب سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ ان کی کتابوں میں جو احکام دیے گئے ہیں اور نبی آخر الزماں ﷺ سے متعلق جو بشارتیں اور علامتیں بیان کی گئی ہیں، ان کا اعلانیہ اظہار کریں گے اور ان کو چھپانے کے جرم کا ارتکاب نہیں کریں گے، مگر انھوں نے دنیا طلبی میں پڑ کر اس عہد کی کوئی پروا نہ کی اور ان احکام کی بھی لفظی اور معنوی تحریف کی اور ان بشارتوں اور علامتوں کو چھپایا، ﴿فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ﴾ "سو برا ہے جو وہ خرید رہے ہیں۔" اس آیت میں ضمناً مسلمان علماء کو بھی یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ حق بات کو جانتے بوجھتے ہوئے چھپانے کے جرم کا ارتکاب نہ کریں۔ حدیث میں متعدد سندوں سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: «مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ» [ترمذی، العلم، باب ما جاء في كتمان العلم : ۲٦٤٩، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] "جس سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اور اس نے اسے چھپایا تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔"

آیت 188 یعنی جو کام انھوں نے کیے ہیں ان پر اتراتے چلے جاتے ہیں اور جو کام انھوں نے نہیں کیے ان کے متعلق بھی چاہتے ہیں کہ انھیں ان کے کارناموں میں شمار کیا جائے، ایسے لوگوں کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے چھوٹ جائیں گے۔ یہ آیت دراصل یہود اور منافقین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہود سے کوئی بات دریافت کی تو انھوں نے اس کا غلط جواب دیا، پھر خوش ہوئے کہ ہم نے

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۸۹﴾ بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۱۹۰﴾

آپ ﷺ کو مطمئن کر دیا، اب انھیں ہماری تعریف کرنی چاہیے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا تحسبن الذین یفرحون بما أتوا﴾ : ۴۵۶۸]

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب کبھی رسول اللہ ﷺ جنگ کے لیے تشریف لے جاتے تو بعض منافقین آپ کے ساتھ نہ جاتے اور آپ کے جانے کے بعد (اپنے گھروں میں) بیٹھے رہنے سے بہت خوش ہوا کرتے، پھر جب رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لاتے تو عذر اور بہانے پیش کرتے اور (ان عذر بہانوں پر) قسم کھاتے اور چاہتے کہ اس کام پر ان کی تعریف کی جائے جو انھوں نے نہیں کیا، چنانچہ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا ﴾ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولا تحسبن الذین یفرحون بما أتوا﴾ : ۴۵۶۷] مگر یہ حکم اہل کتاب اور مسلمانوں کے لیے عام ہے، جو بھی خوشامد پسند ہوگا اور اس قسم کا ذہن رکھے گا کہ اس کے ناکردہ کارناموں پر اس کی تعریف کی جائے اس کے لیے وہ وعید ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ (شوکانی)

آیت 189 وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... : جب حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے تو یہ حقیقت اگر تم ہر وقت اپنے سامنے رکھو تو شاید ایک نافرمانی کی جرأت بھی نہ کر سکو۔

آیت 190 ① اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ...... اس آیت سے آخر سورت تک آیات کی بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ ﷺ رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو ان آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ربنا إنك من تدخل النار ﴾ : ۴۵۷۰، ۴۵۷۱، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما]

② لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ: "الْاَلْبَابِ" یہ " لُبٌّ "کی جمع ہے، جس کا معنی خالص عقل ہے، اس لیے ترجمہ " عقلوں والوں" کیا ہے۔ یعنی جو لوگ زمین و آسمان کی تخلیق اور کائنات کے دیگر اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں، انھیں کائنات کے خالق اور اس کے اصل فرماں روا کی پہچان ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اتنی طویل و عریض کائنات کا یہ لگا بندھا نظام، جس میں ذرا خلل واقع نہیں ہوتا، یقیناً اس کے پیچھے ایک ذات ہے جو اسے چلا رہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ اس میں عقلوں والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اکیلے مالک ہونے کی، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کاریگری کی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حاکمیت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

نظام فلکی اور اس کی تفصیلات، چاند سورج، ستاروں کی تعداد، ان کے درمیانی فاصلے، ان کے باہمی تعلقات و تاثرات، ان کی گردشوں کی پیمائش، گرہن کے اسباب و اوقات، ان کے طلوع و غروب اور نور و حرارت وغیرہ کے قاعدے و ضابطے، غرض

الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں، اے ہمارے رب! تو نے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا ﴿۱۹۱﴾

اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں۔ رہی زمین تو اس کی شکل وصورت، اس کی پیمائش، اس کے پہاڑ اور سمندر، اس کی معدنیات، اس کی کشش، اس کی ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لیے تو کوئی ایک فن بھی پوری طرح کافی نہ ہوا، بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، فزیالوجی، میٹرالوجی اور آرکیالوجی، اللہ جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی کاریگری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔ اب "اُولُوا الْاَلْبَابِ" کے بجائے غیر مسلم قومیں ان چیزوں پر غور میں مصروف ہیں اور چونکہ ان کا ہدف ہی دنیا ہے، اس لیے دنیا کے بے شمار فائدے حاصل کر رہے ہیں، بلکہ انھی فنون کے ذریعے سے انھوں نے مسلمانوں کو مغلوب کر رکھا ہے، ہدف کی غلطی کی وجہ سے انھیں ذات باری تعالیٰ کی وحدانیت کو سمجھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ کاش! مسلمان ان فنون میں پوری طرح حصہ لیتے تو یہ سارے علوم دین کی سربلندی اور توحید کی دعوت کا زبردست ذریعہ بنتے اور دنیا پر غلبے کے کام آتے، کیونکہ مسلمان تو ﴿رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ کا ہدف سامنے رکھتا ہے۔

آیت 191 ① الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ ......: پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز کے خالق اور رب ہونے کا ذکر تھا، اب اس اکیلے کی عبادت کا ذکر ہے، یعنی وہ "اُولُوا الْاَلْبَابِ" دل، زبان اور دوسرے سب اعضاء سے کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہوئے ہر حالت میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ روزی کماتے وقت اللہ کے حکم کا خیال رکھنا بھی اس کی یاد ہے، عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر اسے نہ بھولنا بھی یاد ہے، نظر کو بے لگام نہ ہونے دینا بھی اس کا ذکر ہے، اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کی تیاری میں مصروف ہونا بھی اس کی یاد ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں نے صرف نماز اور تسبیح وتحمید کو ذکر سمجھ لیا اور اللہ کی جس یاد اور ملاقات کے شوق سے صحابہ وتابعین کے سینے روشن تھے اور وہ موت کو موت کی جگہوں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے، اس کو اپنے شب و روز سے نکال دیا، حالانکہ یہ ذکر اسلام کے بنیادی ارکان کے بعد تمام اذکار سے کہیں افضل ہے۔ فرمایا: ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۭ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [التوبة : ۱۹] "کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں۔" اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَوْقِفُ سَاعَةٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنْ قِیَامِ لَیْلَةِ الْقَدْرِ عِنْدَ الْحَجَرِ الْاَسْوَدِ)) "ایک گھڑی اللہ کے راستے (جہاد) میں رہنا حجر اسود کے پاس لیلۃ القدر کے قیام سے افضل ہے۔" [ابن حبان : ٤٦٠٣، و صححه الألباني، الصحيحة : ٤٥٨٤]

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

اے ہمارے رب! بلاشبہ تو جسے آگ میں ڈالے سو یقیناً تو نے اسے رسوا کر دیا اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۱۹۲﴾ اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ فوت کر ﴿۱۹۳﴾ اے ہمارے رب! اور ہمیں عطا فرما جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر، بے شک تو وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ﴿۱۹۴﴾

② وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یعنی زمین و آسمان کو پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے جو حکمت رکھی ہے وہ اس پر غور وفکر کرتے ہیں۔ علوم ہیئت فلکیات اور ریاضی کو اگر دینی نقطۂ نظر سے پڑھا جائے تو فی الجملہ عبادت میں داخل ہے۔

③ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا: یعنی بے مقصد نہیں بنایا، بلکہ اس عالم کی انتہا دوسرے عالم میں ہو رہی ہے، جس میں حساب کتاب ہوگا۔ (موضح) اس میں مادہ پرستوں اور دہریوں کا رد ہے جو کائنات کو محض اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، یعنی غور وفکر سے ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام یونہی پیدا نہیں کیا، بلکہ اس کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہے کہ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے تو اجر وثواب پائے اور نافرمانی کرے تو آخرت میں عذاب بھگتے، اس لیے وہ آگ سے محفوظ رہنے کی دعا کرتے رہتے ہیں۔

آیت 193 ① رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا...... : ''مُنَادِيًا'' سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں یا قرآن یا پھر ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جو دعوتِ حق پیش کرے۔

② رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا: اس میں اپنے ایمان لانے کے عمل کے وسیلے سے گناہوں کی مغفرت کی دعا ہے اور یہ مسنون ہے۔

آیت 194 ① رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا : یعنی تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے سے ان کی تصدیق اور اتباع کرنے پر دنیا اور آخرت میں جس نصرت اور اجر وثواب کا وعدہ فرمایا ہے، وہ ہمیں عطا فرما۔

② اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ: یعنی ہمیں یہ ڈر تو نہیں کہ تو وعدہ خلافی کرے گا، بلکہ ہمیں ڈر اپنے ہی اعمال سے ہے کہ یہ اچھے نہیں ہیں، کہیں ہماری رسوائی کا باعث نہ بنیں، اگر تو اپنی رحیمی و کریمی اور غفاری سے ہماری کوتاہیوں کو معاف فرما دے اور ہمیں رسوائی سے بچالے تو ہماری عین سرفرازی اور تیری بندہ نوازی ہے۔ پس کلمہ ﴿ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ سے مقصد

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

تو ان کے رب نے ان کی دعا قبول کر لی کہ بے شک میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، تمھارا بعض بعض سے ہے۔ تو وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنھیں میرے راستے میں ایذا دی گئی اور وہ لڑے اور قتل کیے گئے، یقیناً میں ان سے ان کی برائیاں ضرور دور کروں گا اور ہر صورت انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، اللہ کے ہاں سے بدلے کے لیے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا بدلہ ہے ﴿۱۹۵﴾

عاجزی، خشوع اور بندگی کا اظہار ہے نہ کہ اس کا مطالبہ، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی تو محال ہے، پھر مومن اس کا تصور کیسے کر سکتے ہیں۔ (رازی) دعا اور اس کی قبولیت کا یہ وعدہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، دعا میں اس کا وسیلہ بھی پیش کر سکتے ہیں، جیسا کہ غار میں پھنس جانے والے تین آدمیوں نے کیا تھا، البتہ دعا کی قبولیت کے لیے کسی نیک ہستی کو وسیلہ بنانا کہ یا اللہ! فلاں کے طفیل میری یہ مشکل حل فرما دے، قرآن و حدیث میں مذکور دعاؤں کے خلاف ہے۔ ہاں، کسی زندہ آدمی سے دعا کروائی جا سکتی ہے اور یہ سنت سے ثابت ہے۔

آیت 195 ① فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ ......: یعنی انھوں نے اس طرح دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما لی۔ پھر ان کی دعا کی قبولیت کی صورت اور کیفیت کا بھی ذکر فرما دیا کہ باری تعالیٰ کسی عامل کے عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ اس میں مرد و عورت کا بھی کوئی فرق نہیں، کیونکہ ان کا بعض بعض سے ہے، وہ کوئی الگ الگ مخلوق نہیں ہیں۔ اخروی نجات اور اللہ کے ہاں درجات حاصل کرنے میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں، ہاں، مرد و عورت کی جداگانہ ذمہ داریوں کے اعتبار سے فطرتاً ان کی صلاحیتوں میں فرق ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۳۲، ۳۴)۔

② فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا ......: یعنی جنھوں نے دین کی خاطر اپنی خوشی سے ہجرت کی، اپنے وطن اور مال و منال کو خیر باد کہہ کر مرکز اسلامی میں پہنچ گئے اور وہ لوگ جن پر کفار نے ظلم و ستم ڈھائے، انھیں سخت اذیتیں دے کر گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا، انھیں کسی طرح چین سے نہ بیٹھنے دیا اور انھیں محض اس لیے تکالیف کا نشانہ بنایا کہ انھوں نے دین اسلام کی راہ اختیار کی، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ [الممتحنة : ۱] ''یہ کافر پیغمبر (ﷺ) کو اور تمھیں گھروں سے محض اس جرم کی پاداش میں نکالتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا

لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ
وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

تجھے ان لوگوں کا شہروں میں چلنا پھرنا ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے جنھوں نے کفر کیا﴿۱۹۶﴾ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا بچھونا ہے﴿۱۹۷﴾ لیکن وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈر گئے، ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں، اللہ کے پاس سے مہمانی کے طور پر اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے﴿۱۹۸﴾

﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ﴾ [البروج : ۸] ’’اور انھوں نے ان سے اس کے سوا کسی چیز کا بدلہ نہیں لیا کہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو سب پر غالب ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔‘‘

آیت 196 تا 198 لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ...... : اوپر کی آیات میں مومنوں کے گناہ بخشنے اور ثواب عظیم کا وعدہ فرمایا، حالانکہ وہ فقر و فاقہ کی حالت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے بالمقابل کفار نہایت عیش و نعمت میں تھے، انھیں دیکھ کر بعض اوقات مسلمان غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے اور مختلف خیالات کی دنیا میں چلے جاتے، لہٰذا ان آیات میں مسلمانوں کا ذہن صاف کرنے کے لیے کفار کا انجام بیان فرمایا اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ نیکی کے معاملہ میں مومن کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا، اسے اس نیکی کا بدلہ دنیا میں بھی دیتا ہے اور آخرت میں بھی اور کافر جو نیکیاں اللہ کے لیے کرتا ہے اس کا بدلہ اسے دنیا ہی میں پورا دے دیا جاتا ہے، پھر جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں ہوگی کہ اس کا بدلہ اسے دیا جائے۔‘‘ [مسلم، صفات المنافقین، باب جزاء المؤمن ...... : ۲۸۰۸] مقصد یہ ہے کہ شہروں میں کفار کے تجارتی کاروبار، ان کی خوش حالی اور مال و دولت کی فراوانی کو دیکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں کسی قسم کا حزن و غم نہیں آنا چاہیے، نہ ان کو ناامیدی کا شکار ہونا چاہیے، نہ منافقین کا سا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، جو سختی اور خوف کے وقت پکار اٹھتے ہیں: ﴿ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴾ [الأحزاب : ۱۲] ’’اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے محض دھوکا دینے کے لیے وعدہ کیا تھا۔‘‘ کفار کی دنیوی خوشحالی سے کفر کے حق ہونے پر استدلال نہیں کرنا چاہیے، یہ چند روزہ زندگی کا قلیل سا سامان اور عارضی بہار ہے، مرنے کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس کے مخاطب بظاہر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر مراد امت ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں مومنین کی جزا کا ذکر فرمایا، تاکہ مزید تشفی حاصل ہو اور یہ چونکہ کفار کے مقابلے میں بیان کی جا رہی ہے، اس لیے ’’ لٰكِنِ ‘‘ کا لفظ بطور استدراک ذکر فرمایا۔ (المنار)

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع ۲۰ ۱۱

اور بلاشبہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ یقیناً ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی جو تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو ان کی طرف نازل کیا گیا، اللہ کے لیے عاجزی کرنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۹۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور مقابلے میں جمے رہو اور مورچوں میں ڈٹے رہو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۲۰۰﴾

آیت 199 وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ ...... : اس آیت میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اس گروہ کا ذکر ہے جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے، ان کے ایمان اور ایمانی صفات کا ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے انھیں دوسرے اہل کتاب سے ممتاز فرما دیا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، پہلی کتابوں اور قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں، اللہ سے ڈرنے والے ہیں، اللہ کی آیات کے بدلے دنیاوی مفاد حاصل نہیں کرتے، ان کے لیے اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے، بلکہ دوہرا اجر ہے، جیسا کہ سورۂ حدید (۲۸) میں ہے۔ یہ صفات یہود میں بہت کم تھیں۔ علمائے یہود میں سے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے ان صفات کے حامل چند لوگ ہی تھے، جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ تھی، البتہ نصرانیوں میں سے بہت سے لوگوں نے ایمان قبول کیا، جن میں حبشہ کے بادشاہ اصحمہ نجاشی بھی شامل تھے، ان کی موت کی خبر آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں ان پر غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ [بخاری، مناقب الأنصار، باب موت النجاشی : ۳۸۷۷، عن جابر رضی اللہ عنہ]

آیت 200 "اصْبِرُوْا" یعنی دین اسلام پر ثابت قدمی سے جمے رہو۔ "صَابِرُوْا" یہ باب مفاعلہ سے ہے جس میں مقابلہ کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی کافروں کے مقابلے میں ان سے بڑھ کر پامردی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو۔ "وَرَابِطُوْا" یعنی دشمنوں سے جہاد کے مورچوں پر ڈٹے رہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں ایک دن (سرحدوں پر) پہرا دینا دنیا اور دنیا میں جو کچھ موجود ہے، اس سب سے بہتر ہے۔'' [بخاری، الجهاد والسیر، باب فضل رباط یوم فی سبیل الله : ۲۸۹۲، عن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات کا پہرا دینا ایک مہینے کے قیام اور صیام سے بہتر ہے اور اگر اس حالت میں مجاہد فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کیا کرتا تھا اور اس کے مطابق اس کا رزق بھی جاری رہے گا، نیز وہ آزمائش سے بھی محفوظ رہے گا۔'' [مسلم، الإمارة، باب فضل الرباط فی سبیل الله عز و جل : ۱۹۱۳، عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ]

سُورَةُ النِّسَآءِ ۴ مدنیۃ ۹۲ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — اٰیاتھا ۱۷۶ رکوعاتھا ۲۴

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیۡكُمۡ رَقِیۡبًا ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتوں سے بھی، بے شک اللہ ہمیشہ تم پر پورا نگہبان ہے ①

احادیث میں سختی اور تکلیف کے اوقات میں پوری طرح وضو کرنے، مسجد کی طرف چل کر آنے اور پھر ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کو بھی آپ ﷺ نے "رِبَاطٌ" فرمایا ہے۔ [مسلم، الطهارة، باب فضل إسباغ الوضوء على المكاره: ۲۵۱] ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس مقام پر اللہ کی راہ میں مورچہ بند ہونے اور پہرا دینے کی بہت سی احادیث جمع فرمائی ہیں۔ [فَجَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرًا]

سورۃ النساء

سورۂ نساء مدنی ہے، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء ایسے زمانے میں نازل ہوئیں جب میں (رخصتی کے بعد) رسول اللہ ﷺ کے گھر آ چکی تھی۔ [بخاری، فضائل القرآن، باب تأليف القرآن : ۴۹۹۳] اس سورت میں عورتوں سے متعلقہ مسائل کی وجہ سے اس کا نام سورۂ نساء ہے۔

آیت 1 ① خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ: یعنی پوری نوع انسانی آدم علیہ السلام کی نسل سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "(قیامت کے دن) لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے، اے آدم! آپ انسانوں کے باپ ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔" [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى : ﴿ و لقد أرسلنا ...... ﴾ : ۳۳۴۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ایک جان سے پیدا کرنے سے یہ توجہ دلانا بھی مقصود ہے کہ تم تمام انسان ایک شخص کی اولاد ہو، کوئی اور رشتہ داری نہ ہو تو یہ رشتہ داری کیا کم ہے، اس کا خیال ہی رکھو اور اپنے کمزوروں کی مدد کرتے رہو۔

② وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہوتا ہے، سو اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ بیٹھو گے اور اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہو تو اس طرح فائدہ اٹھاؤ گے کہ اس میں برابر ٹیڑھا پن ہو گا۔" [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته : ۳۳۳۱، ۵۱۸۴، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو اور گندی چیز کو اچھی چیز کے عوض بدل کر نہ لو اور نہ ان کے اموال اپنے مالوں سے ملا کر کھاؤ، یقیناً یہ ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے ②

بعض روایات میں ہے: ((وَ كَسْرُهَا طَلَاقُهَا)) ''اور اس کا توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔'' [مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء : ۵۹/۷۱۵، بعد ح : ۱۴۶۶۔ بخاری : ۵۱۸۴]

قرآن کی آیت سے معلوم ہوا کہ حواء علیہا السلام آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئیں۔ حدیث سے ثابت ہوا کہ پسلی سے پیدا ہوئیں، اس کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں کی۔ بعض لوگ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ عورت میں کچھ ٹیڑھا پن رہتا ہی ہے، اس لیے اسے پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے، مگر قرآن کے صریح الفاظ کہ آدم سے اس کی بیوی کو پیدا کیا، ان کے ساتھ حدیث ملائیں تو اس کا پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ہاں، اس کی کجی بھی اپنی جگہ درست ہے۔

③ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ : یعنی جس اللہ کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اس اللہ سے ڈرو۔ ''وَ الْاَرْحَامَ'' اس کا عطف لفظ ''اللّٰهَ'' پر ہے، یعنی ''وَاتَّقُوا الْأَرْحَامَ'' کہ قطع رحمی اور رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی سے بچو۔ ''الْاَرْحَامَ'' کو میم کے کسرہ سے پڑھنا غلط ہے اور قواعد نحویہ کی رو سے بھی ٹھیک نہیں، ہاں معنی کے اعتبار سے صحیح ہے، یعنی جس رشتہ داری کے نام پر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو۔ (قرطبی) شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام علمائے شریعت و لغت کا اتفاق ہے کہ ''الْاَرْحَامَ'' سے محرم اور غیر محرم تمام رشتے مراد ہیں۔ قرآن و حدیث میں قطع رحمی کی بہت مذمت آئی ہے۔ دیکھیے سورۂ محمد (۲۲، ۲۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رشتے داری کو توڑنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔'' [بخاری، الأدب، باب إثم القاطع : ۵۹۸۴، عن جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ] اور فرمایا: ''جو شخص چاہے کہ اس کے رزق میں فراخی ہو اور اس کے نشانِ (قدم) دیر تک رکھے جائیں وہ اپنی رشتے داری کو ملائے۔'' [بخاری، الأدب، باب فضل صلة الرحم...... : ۵۹۸۳، عن أبی أیوب الأنصاری رضی اللہ عنہ]

④ رَقِيْبًا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، سو اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔'' [بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ۵۰۔ مسلم : ۸، عن أبی هریرة و عمر رضی اللہ عنہما]

آیت 2 وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ ...... : یعنی جب یتیم بالغ ہو جائیں تو ان کے اموال ان کے سپرد کر دو اور یہ نہ کرو کہ یتیم کے مال سے اچھی چیز (طیب) لے کر اس کی جگہ ردی چیز (خبیث) رکھ دو۔ طیب اور خبیث حلال اور حرام کے معنی میں بھی آتے ہیں، اس لیے بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ اپنا حلال مال چھوڑ کر دوسرے کا مال مت کھاؤ جو تمھارے لیے حرام ہے۔'' آیت میں ''اِلٰى'' بمعنی ''مَعَ'' ہے، یعنی ان کے اموال کو ناجائز طریقے سے کھانے کے لیے اپنے مالوں کے ساتھ مت ملاؤ،

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ﴿۳﴾

اور اگر تم ڈرو کہ یتیموں کے حق میں انصاف نہیں کرو گے تو (اور) عورتوں میں سے جو تمھیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو دو سے اور تین تین سے اور چار چار سے، پھر اگر تم ڈرو کہ عدل نہیں کرو گے تو ایک بیوی سے، یا جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں (یعنی لونڈیاں)۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو ﴿۳﴾

ایسا کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ ہاں، اصلاح کی نیت سے ملانا جائز ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲۰)۔

آیت 3 ① وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا...... : اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''بعض یتیم لڑکیاں کچھ لوگوں کی پرورش میں ہوتیں، وہ ان لڑکیوں کے مال اور جمال کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیتے، لیکن انھیں اپنے گھر کی لڑکیاں سمجھ کر پرائے گھر کی لڑکیوں جیسا نہ تو مہر دیتے اور نہ ان کے دوسرے حقوق ویسے ادا کرتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انھیں ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ اگر تم یتیم لڑکیوں سے ان کے مہر اور نفقات میں انصاف نہیں کر سکتے تو ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے، جو تمھیں پسند ہوں، نکاح کر لو۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و إن خفتم ألا تقسطوا فی الیتمی ﴾ : ٤٥٧٤]

② مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ : اس آیت سے دلیل لیتے ہوئے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علماء نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لیے بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں اپنے حرم میں رکھنا جائز نہیں، یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنت سے بصراحت یہ مسئلہ ثابت ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شافعی رحمہ اللہ نے جو فرمایا اس پر علماء کا اجماع ہے۔ غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں سے چار کا انتخاب کر لو۔'' [أحمد : ۲/ ۱٤، ح : ٤٦٣٠۔ ابن ماجه، النکاح، باب الرجل یسلم و عنده ...... : ۱۹۵۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما و قال الألبانی صحیح] مزید صحابہ کے واقعات ابن کثیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''رافضی (شیعہ) اور بعض دوسرے لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ شادیاں چار سے زائد بھی جائز ہیں، مگر یہ لغت اور سنت سے جہالت کا نتیجہ ہے۔''

③ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا...... : اس سے بعض لوگوں نے ایک سے زیادہ شادیوں کے ناجائز ہونے پر استدلال کیا ہے کہ اگر تمھیں خوف ہو کہ عدل نہیں کرو گے تو ایک بیوی پر اکتفا کرو یا لونڈی پر۔ اس کے ساتھ وہ دوسری آیت بھی ملاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْۤا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ﴾ [النساء : ۱۲۹] ''اور تم ہرگز نہ کر سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری (عدل) کرو، خواہ تم حرص بھی کرو۔'' خلاصہ دونوں کا یہ نکالا کہ جب عدل ہو ہی نہیں سکتا تو مرد ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ ان حضرات نے وہی کام کیا ہے جو ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ ﴾ والے حضرات کرتے ہیں کہ آگے ﴿ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ [النساء : ٤٣] پڑھتے ہی نہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا پورا فرمان یوں ہے: ''اور تم ہرگز نہ کر

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴ وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو، پھر اگر وہ اس میں سے کوئی چیز تمھارے لیے چھوڑنے پر دل سے خوش ہو جائیں تو اسے کھالو، اس حال میں کہ مزے دار، خوشگوار ہے۴ اور بے سمجھوں کو اپنے مال نہ دو، جو اللہ نے تمھارے قائم رہنے کا ذریعہ بنائے ہیں اور انھیں ان میں سے کھانے کے لیے دو اور انھیں پہننے کے لیے دو اور ان سے اچھی بات کہو۵

سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری کرو، خواہ تم حرص بھی کرو، پس مت جھک جاؤ (ایک کی طرف) مکمل جھک جانا کہ اس (دوسری) کو لٹکائی ہوئی کی طرح چھوڑ دو، اور اگر تم اصلاح کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، بے حد مہربان ہے۔'' [النساء : ۱۲۹] معلوم ہوا وہ عدل جو انسان کر ہی نہیں سکتا، یعنی دلی میلان، وہ واجب ہی نہیں۔ زیادہ بیویاں ہمارے نبی اور اصحاب کی سنت ہے۔

4 ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا: یعنی اگر کسی کو خوف ہے کہ وہ اتنا عدل بھی نہیں کر سکتا جتنا واجب ہے کہ رات رہنے اور نان و نفقہ میں بھی برابری نہیں کر سکتا، کیونکہ دلی محبت اور میلان و صحبت میں تو برابری ممکن ہی نہیں، تو ایک بیوی رکھے یا لونڈیاں، یہ زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''یہ زیادہ قریب ہے کہ تمھارے عیال زیادہ نہ ہو جائیں اور تم فقیر نہ ہو جاؤ'' اور پھر اس پر برتھ کنٹرول کی بنیاد رکھ دی ہے کہ بچے کم پیدا کرو۔ حالانکہ بچے تو لونڈیوں سے بھی پیدا ہوتے ہیں اور لونڈیوں کی تعداد بھی مقرر نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے زیادہ بچے پیدا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ''ان عورتوں سے نکاح کرو جو بہت بچے جننے والی اور بہت محبت کرنے والی ہوں، کیونکہ میں (قیامت کے دن) تمھاری کثرت پر فخر کروں گا۔'' [أبو داوٗد، النکاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء : ۲۰۵۰، عن معقل بن يسار رضي الله عنه قال الألباني حسن صحيح]

پھر ''اَلَّا تَعُوْلُوْا'' کا معنی خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: ''یہ زیادہ قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، انصاف سے نہ ہٹو۔'' [ابن حبان : ۴۰۲۹، عن عائشة رضي الله عنها، و صححه الألباني، الصحيحة : ۳۲۲۲]

آیت 4 جاہلیت میں عورتوں کا مہر لوگ خود لے لیتے اور انھیں کچھ بھی نہیں دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی سے دو، پھر اگر کوئی عورت خوش دلی سے مہر کا کچھ حصہ یا سارا شوہر کو دے دے تو وہ خاوند کے لیے جائز ہے اور خوش دلی سے کھا سکتا ہے، لیکن اگر عورت شوہر کی بد اخلاقی یا برے برتاؤ کی وجہ سے معاف کرے اور شوہر قبول کرے تو یہ اس آیت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر دھوکا دے کر مہر معاف کروا لے، پھر طلاق دے دے تو وہ بھی جائز نہیں ہوگا، بلکہ مہر دینا پڑے گا، کیونکہ وہ خوش دلی کے خلاف ہے۔

آیت 5 یہاں بے سمجھوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مال کے انتظام کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ اس میں چھوٹے بچے اور

وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۞

اور یتیموں کو آزماتے رہو، یہاں تک کہ جب وہ بلوغت کو پہنچ جائیں، پھر اگر تم ان سے کچھ سمجھداری معلوم کرو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو اور فضول خرچی کرتے ہوئے اور اس سے جلدی کرتے ہوئے انھیں مت کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔ اور جو غنی ہو تو وہ بہت بچے اور جو محتاج ہو تو وہ جانے پہچانے طریقے سے کھا لے، پھر جب ان کے مال ان کے سپرد کرو تو ان پر گواہ بنا لو اور اللہ پورا حساب لینے والا کافی ہے ⑥

نا تجربہ کار بیوی بھی آ جاتی ہے اور نادان یتیم بھی، یعنی اگر یتیم نا تجربہ کار اور کم عقل ہوں تو وصی یا متولی کو چاہیے کہ یتیم کے مال سے اس کے کھانے پینے اور لباس کا انتظام کرتا رہے، مگر وہ مال اس کے سپرد نہ کرے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ تین آدمی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں مگر ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، ایک وہ آدمی جس کی بیوی بد خلق تھی پھر اس نے اسے طلاق نہیں دی اور ایک وہ آدمی جس کا کسی شخص کے ذمے مال تھا مگر اس نے اس پر کوئی گواہ نہیں بنایا اور ایک وہ آدمی جس نے کسی سفیہ (بے وقوف) کو اپنا مال دے دیا جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تم بے وقوفوں کو اپنے مال مت دو۔'' [صحیح الجامع : ۳۰۷۵] اس آیت سے علماء نے سفیہ (کم عقل) پر ''حجر'' (پابندی) کا حکم اخذ کیا ہے کہ حاکم وقت اس کے لین دین پر پابندی لگا سکتا ہے۔ (قرطبی)

آیت 6 ① **وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى** ...... : بلوغت کے لیے مرد کی علامت احتلام اور عورت کی حیض ہے، علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے (بلوغت کے سلسلے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یہ یاد رکھا ہے کہ احتلام کے بعد یتیمی نہیں اور دن سے لے کر رات تک خاموشی نہیں۔'' [أبو داوٗد، الوصایا، باب ما جاء متی ینقطع الیتم : ۲۸۷۳، و قال الألبانی صحیح]

عطیہ قرظی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''قریظہ کے دن ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو جس کے (زیر ناف) بال اگے تھے اسے قتل کر دیا گیا اور جس کے بال نہیں اگے تھے اسے قتل نہیں کیا گیا، میں ان میں سے تھا جن کے بال ابھی نہیں اگے تھے، لہٰذا مجھے چھوڑ دیا گیا۔'' [أبو داوٗد، الحدود، باب فی الغلام یصیب الحد : ۴۴۰۴، و قال الألبانی صحیح]

جنگ میں شرکت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو چودہ سال کی عمر میں احد میں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ خندق میں جائزہ لیا گیا تو پندرہ سال کے تھے، آپ نے اجازت دے دی۔ نافع نے عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو یہ حدیث پہنچائی تو انھوں نے کہا: ''بچے اور بڑے کا یہی فرق ہے۔'' [بخاری، الشہادات، باب بلوغ الصبیان ...... : ۲۶۶۴] مگر ظاہر ہے کہ یہ فرق بچے اور اس بڑے کا ہے جسے جنگ میں شرکت کی اجازت ہے۔ محض بلوغت کی علامت احتلام ہے، اگر اس کا علم نہ ہو سکے تو زیر ناف بال اگنا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸

مردوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی اس میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں، اس میں سے جو اس (مال) سے تھوڑا ہو یا بہت، اس حال میں کہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے ۝۷ اور جب تقسیم کے وقت قرابت والے اور یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو انھیں اس میں سے کچھ دو اور ان سے اچھی بات کہو ۝۸

---

2 فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا: یعنی یتیموں کا امتحان اور ان کی تربیت کرتے رہو، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پہلے تھوڑا سا مال دے کر ان کو کسی کام پر لگا کر دیکھو کہ آیا وہ مال کو بڑھاتے ہیں یا نہیں، پھر جب وہ بالغ ہو جائیں اور ان میں رشد ہو تو بلاتوقف مال ان کے حوالے کر دو۔ " رُشْدًا " سے مراد عقلی اور دینی صلاحیت ہے، پس بالغ ہونے کے علاوہ مال کی سپرد داری کے لیے رشد بھی شرط ہے، اگر کسی شخص میں رشد نہیں ہے تو خواہ وہ بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جائے متولی یا وصی کو چاہیے کہ وہ مال اس کے حوالے نہ کرے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

3 "فَلْيَسْتَعْفِفْ" "عَفَّ يَعِفُّ (ض)" کا معنی بچنا ہے، "فَلْيَسْتَعْفِفْ" کا باب استفعال میں حروف کی زیادتی کی وجہ سے ترجمہ "بہت بچے" کیا گیا ہے۔

4 وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا ...... : جانا پہچانا طریقہ یہی ہے کہ اس کے اموال کی نگرانی کی اجرت جو معروف ہے، لے لے۔ دوسرا یہ کہ زیادہ سے زیادہ اتنا لے لے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے۔

5 فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ : یتیم کے متولی یا وصی کو حکم ہے کہ گواہوں کے رو برو مال واپس کرے، تاکہ کل کو اس پر کوئی الزام نہ آئے۔ "وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا" کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو تو مطمئن کر لو گے، مگر اصل حساب تو اللہ تعالیٰ نے لینا ہے، اس کا خاص خیال رکھو۔

آیت 7 لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ ...... : اس آیت میں ایک اصولی حکم دیا ہے کہ ماں باپ اور رشتے داروں کی چھوڑی ہوئی جائداد میں، چاہے وہ کسی نوعیت کی ہو، جس طرح مردوں کا حق ہے اسی طرح عورتوں اور چھوٹے بچوں، حتیٰ کہ جنین کا بھی حق ہے۔ اس سے عرب کے جاہلی دستور کی تردید مقصود ہے۔ جس کے مطابق عورتوں اور بچوں کو میت کے متروکہ مال اور جائداد سے محروم کر دیا جاتا اور صرف بالغ لڑکے ہی جائداد پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس آیت کی شان نزول اور مردوں اور عورتوں کے حصوں کی تعیین بعد کی آیات میں آ رہی ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 8 یعنی وارثوں کو چاہیے کہ متروکہ مال میں سے کچھ حصہ بطور صدقہ و خیرات ان رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں کو

وَ لۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا مِنۡ خَلۡفِهِمۡ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوۡا عَلَيۡهِمۡ ۖ فَلۡيَتَّقُوا اللّٰهَ
وَلۡيَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا سَدِيۡدًا ۝٩ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا اِنَّمَا يَاۡكُلُوۡنَ فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ
نَارًا ؕ وَسَيَصۡلَوۡنَ سَعِيۡرًا ۝١٠ ع ۱۲

اور لازم ہے کہ وہ لوگ ڈریں جو اپنے پیچھے اگر کمزور اولاد چھوڑتے تو ان کے متعلق ڈرتے، پس لازم ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی بات کہیں ⑨ بے شک جو لوگ یتیموں کے اموال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں کھاتے اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے ⑩

بھی دیں جو خاندان میں موجود ہوں اور تقسیم کے وقت موقع پر پہنچ جائیں اور اگر وہ لوگ زیادہ حرص کریں تو ''ان سے اچھی بات کہو'' یعنی معذرت کرو کہ یہ وارثوں کا مال ہے، تمھارا حق نہیں ہے۔ بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ حکم ''فرائض'' یعنی وارثوں کے حصے مقرر ہونے سے پہلے تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے، اس لیے اب یہ بخشش نہیں ہے، اب صدقہ و خیرات میت کی وصیت ہی سے ہوسکتا ہے، لیکن بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں اور وارثوں کو حکم ہے کہ تقسیم ترکہ کے وقت ان رشتہ داروں سے صلہ رحمی کریں جن کا میراث میں حصہ نہیں جب وہ تقسیم کے وقت آ جائیں۔ [بخاري، التفسير، باب قول الله عزوجل : ﴿ و إذا حضر القسمة ...... ﴾ ۲۷۵۹]

آیت 9 وَلۡيَخۡشَ الَّذِيۡنَ لَوۡ تَرَكُوۡا ...... : یہ حکم میت کی وصیت سن کر نافذ کرنے والوں کو ہے اور ان لوگوں کو بھی جو یتیموں کے سرپرست اور وصی مقرر ہوں۔ ان سب کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے میت کی اولاد اور یتیموں کے مفاد کا اسی طرح خیال رکھیں جس طرح وہ چاہتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی چھوٹی اور بے بس اولاد کے مفاد کا خیال رکھا جائے، لہٰذا انھیں یتیموں سے بہتر سلوک کرنا چاہیے اور ان کی عمدہ سے عمدہ تعلیم و تربیت کرنی چاہیے۔ یتیموں کے اولیاء سے اس آیت کا تعلق زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بعد میں یتامیٰ کی حق تلفی کرنے والوں کے متعلق جو وعید آ رہی ہے اولیاء کی اس کے ساتھ زیادہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ ویسے عام مسلمانوں کو بھی یتیموں کے ساتھ خاص احسان اور سلوک کرنے کا حکم ہے۔

آیت 10 اس آیت میں یتیموں کے مال کی حفاظت اور اس سے اجتناب کی مزید تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات تباہ کن چیزوں سے اجتناب کرو۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! وہ کیا ہیں؟'' فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، اس جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیرنا اور پاک دامن، بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا۔'' [بخاري، الحدود، باب رمي المحصنات : ٦٨٥٧، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ‌ ۖ لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ‌ ۚ فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ‌ ۚ وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ‌ ؕ وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ‌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ‌ ۚ

اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں تاکیدی حکم دیتا ہے، مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر حصہ ہے، پھر اگر وہ دو سے زیادہ عورتیں (ہی) ہوں، تو ان کے لیے اس کا دو تہائی ہے جو اس نے چھوڑا اور اگر ایک عورت ہو تو اس کے لیے نصف ہے۔ اور اس کے ماں باپ کے لیے، ان میں سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے، جو اس نے چھوڑا، اگر اس کی کوئی اولاد ہو۔ پھر اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے، پھر اگر اس کے (ایک سے زیادہ) بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لیے چھٹا حصہ ہے، اس

آیت 11 ① **يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ**: اب یہاں سے وارثوں کے تفصیلی حصوں کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ دونوں آیات اور اس سورت کی آخری آیت علم وراثت میں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وراثت کے تفصیلی حصے ان تین آیات سے مستنبط ہیں اور وراثت کے حصوں سے متعلقہ احادیث بھی ان آیات ہی کی تفسیر ہیں۔ (ابن کثیر) ایک حدیث میں ہے کہ جب جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیمار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ جابر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مال کے بارے میں دریافت کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يُوۡصِيۡكُمُ اللّٰهُ فِىۡۤ اَوۡلَادِكُمۡ ﴾ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ یوصیکم اللہ فی أولادکم ﴾ : ٤٥٧٧] ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور ان کی بیٹیوں کے چچا نے سارا ورثہ سنبھال لیا۔ سعد رضی اللہ عنہ کی دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی بیوی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثے کا سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے چچا کو پیغام بھیجا کہ سعد کی دو بیٹیوں کو دو تہائی اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو اور جو بچ جائے وہ تمھارے لیے ہے۔ [أبو داوٗد، الفرائض، باب ما جاء فی میراث الصلب : ۲۸۹۱۔ عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما ترمذی : ۲۰۹۲۔ أحمد : ۳۵۲/۳، ح : ۱٤۸۱۰، و قال الألبانی حسن]

② **لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ**: مطلب یہ ہے کہ جب اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں موجود ہوں تو لڑکے کو لڑکی سے دگنا ملے گا۔ اسے دو حصے دینے کی وجہ یہ ہے کہ مرد پر عورت کی نسبت معاشی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ (مہر ہی کو لے لیجیے کہ مرد دیتا ہے، عورت لیتی ہے، اسی طرح عورت کا نان و نفقہ بھی خاوند کے ذمے ہوتا ہے) اس بنا پر مرد کے لیے عورت سے دگنا حصہ دینا عین قرین انصاف ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

③ **فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَيۡنِ**...... دو سے زیادہ ہی کا نہیں دو عورتوں کا بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ اس آیت کے پہلے فائدے میں سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی دو بیٹیوں کو دو تہائی دینے کا ذکر ہوا ہے، پھر اس سورت کی آخری آیت میں جب دو بہنوں کو دو تہائی حصہ دیا گیا ہے تو دو بیٹیوں کو بدرجۂ اولیٰ دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ بیٹی بہن کے مقابلہ میں آدمی کے زیادہ قریب ہے، لہٰذا

فَإِنْ كَانَ لَهٗۤ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ أَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ
لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

وصیت کے بعد جو وہ کر جائے، یا قرض (کے بعد)۔ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے تم نہیں جانتے ان میں سے کون فائدہ پہنچانے میں تم سے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کی طرف سے مقرر شدہ حصے ہیں، بے شک اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۱﴾

ہم کہہ سکتے ہیں کہ دو لڑکیوں کا دو تہائی حصہ قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے۔ (ابن کثیر)

④ اس حکم سے چند صورتیں مستثنیٰ ہیں: ① رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ)) [بخاری، فرض الخمس، باب فرض الخمس: ۳۰۹۳] ''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔'' لہٰذا آپ ﷺ کی میراث تقسیم نہیں ہوئی۔ دیکھیے سورۂ مریم آیت (۶) کی تفسیر۔ ② جان بوجھ کر قتل کرنے والا اپنے مقتول کا وارث نہیں ہوگا۔ یہ حکم سنت سے ثابت ہے اور اس پر اجماع ہے۔ [ابن ماجه، الفرائض، باب میراث القاتل: ۲۷۳۵، و قال الألبانی صحیح] ③ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا اور نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا ہے۔'' [بخاری، الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر...: ۶۷۶۴] لہٰذا کافر مسلمان کی وراثت سے محروم ہوگا بیٹا ہو یا بیٹی، باپ ہو یا ماں، بھائی ہو یا بہن، خاوند ہو یا بیوی، یا کوئی اور رشتہ دار، اسی طرح مسلمان کافر کی وراثت سے محروم ہوگا۔

⑤ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ : اس سے بھی معلوم ہوا کہ جب ایک بیٹی کا نصف ہے تو دو یا دو سے زیادہ بیٹیوں کا دو تہائی ہونا چاہیے۔

⑥ وَ لِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ...... : یعنی میت کی اولاد ہونے کی صورت میں ماں باپ دونوں میں سے ہر ایک کو کل ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، مثلاً میت کی ایک بیٹی اور ماں باپ ہیں تو ترکہ کے چھ مساوی حصے کر لیے جائیں۔ بیٹی کو تین حصے (نصف) ماں کو ایک حصہ (سدس) باپ کو ایک حصہ (سدس) مقرر شدہ اور ایک حصہ (سدس) عصبہ ہونے کی وجہ سے ملے گا اور اگر میت کی دو یا زیادہ بیٹیاں ہیں تو ترکے کے چھ حصوں میں سے چار حصے (دو ثلث) بیٹیوں کے اور ایک ایک حصہ (سدس) ماں باپ کا ہوگا اور اگر ماں باپ کے ساتھ لڑکے لڑکیاں دونوں ہیں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے اس میں سے لڑکے کے دو حصے اور لڑکی کا ایک حصہ ہوگا۔

⑦ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ...... : یہ ماں باپ کی دوسری حالت ہے، یعنی اگر میت کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ زندہ ہوں تو ماں کو ایک تہائی ملے گا اور بقیہ دو تہائی حصہ باپ کو مل جائے گا اور اگر ماں باپ کے ساتھ میت کے مرد ہونے کی صورت میں بیوی اور عورت ہونے کی صورت میں اس کا شوہر بھی زندہ ہو تو شوہر یا بیوی کا حصہ، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، پہلے نکالنے کے بعد باقی ماندہ سے ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی ملے گا۔ والدین کی مذکورہ دونوں صورتیں قرآن مجید ہی سے واضح ہو رہی ہیں، کیونکہ پہلی صورت میں ساتھ یہ ہے ''وَّ وَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ'' یعنی اس کے وارث صرف ماں باپ ہوں، بیوی یا خاوند موجود ہونے کی صورت دوسری ہے۔ اس میں والدہ کو باقی کا ثلث اس لیے دیا جائے گا کہ عورت (ماں) کا حصہ، مرد

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ

اور تمھارے لیے اس کا نصف ہے جو تمھاری بیویاں چھوڑ جائیں، اگر ان کی کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر ان کی کوئی اولاد ہو تو تمھارے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے، جو انھوں نے چھوڑا، اس وصیت کے بعد جو وہ کر جائیں، یا قرض (کے بعد)۔ اور ان کے لیے اس میں سے چوتھا حصہ ہے جو تم چھوڑ جاؤ، اگر تمھاری کوئی اولاد نہ ہو، پھر اگر تمھاری کوئی اولاد ہو تو ان کے لیے اس میں سے آٹھواں حصہ ہے جو تم نے چھوڑا، اس وصیت کے بعد جو تم کر جاؤ، یا قرض (کے بعد)

(باپ) کے نصف سے زیادہ نہ ہو جائے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہی قول فقہائے سبعہ، ائمہ اربعہ اور جمہور اہل علم کا ہے۔

⑧ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ ...... : یہ ماں باپ کی تیسری حالت کا بیان ہے، یعنی اگر میت کی کوئی اولاد نہ ہو، ماں باپ کے علاوہ بھائی بھی ہوں (خواہ ماں باپ دونوں سے یا صرف ماں سے یا صرف باپ سے) تو باپ کی موجودگی میں انھیں حصہ تو نہیں ملے گا، البتہ وہ ماں کا حصہ تہائی سے چھٹا کر دیں گے اور اگر ماں کے ساتھ سوائے باپ کے کوئی دوسرا وارث نہ ہو تو بقیہ سارا ۵/۶ حصہ باپ کو مل جائے گا۔ یاد رہے کہ ''اِخْوَةٌ'' کا لفظ جمع ہے اور یہ جمہور علماء کے نزدیک دو کو بھی شامل ہے، لہٰذا اگر صرف ایک بھائی ہو تو وہ ماں کا تہائی سے چھٹا حصہ نہیں کر سکتا۔ (ابن کثیر)

⑨ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ ...... : میت کے مال میں سے اول کفن دفن پر صرف کیا جائے، پھر باقی ماندہ سے حسب مراتب قرض ادا کیا جائے، سب سے زیادہ ادا کیے جانے کا حق دار اللہ تعالیٰ کا قرض ہے، مثلاً اگر زکاۃ یا حج اس کے ذمے ہے تو وہ ادا کیا جائے، پھر دوسرے قرض ادا کیے جائیں، پھر مال کے تہائی حصے سے وصیت پوری کی جائے، اس کے بعد وارثوں کے درمیان باقی ترکے کے حصے کیے جائیں۔ (قرطبی) قرآن میں گو قرض کا ذکر وصیت کے بعد ہے، مگر سلف و خلف کا اس پر اجماع ہے کہ ادائے قرض وصیت پر مقدم ہے، لہٰذا پہلے قرض ادا کیا جائے، پھر وصیت کا نفاذ ہونا چاہیے۔ غور سے دیکھیں تو آیت کے معنی و مفہوم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں وصیت کو قرض سے پہلے ذکر کرنے کی اہل علم نے کئی حکمتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ عام طور پر وصیت پر عمل میں کوتاہی کی جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید کے لیے اسے پہلے ذکر فرمایا۔

⑩ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے علیم و حکیم ہے، اس نے خود میراث کا یہ قانون اس لیے مقرر فرمایا کہ تم اپنے نفع و نقصان کو نہیں سمجھتے، اگر تم اپنے اجتہاد سے ورثہ تقسیم کرتے تو حصوں کا ضبط میں لانا مشکل تھا۔ (قرطبی، ابن کثیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی ان حصوں میں عقل کا دخل نہیں، اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں، وہ سب سے دانا ہے۔'' (موضح)

آیت 12 ① وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ ...... : اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تمھاری بیویاں مال چھوڑ کر مریں اور ان کی کوئی اولاد نہ ہو تو تمھیں آدھا مال ملے گا اور اگر ان کی اولاد ہے، ایک یا زائد بیٹے بیٹیاں یا

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ﴿۱۲﴾

اور اگر کوئی مرد، جس کا ورثہ لیا جا رہا ہے، ایسا ہے جس کا نہ باپ ہو نہ اولاد، یا ایسی عورت ہے اور اس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے، پھر اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو سب ایک تہائی میں حصے دار ہیں، اس وصیت کے بعد جو کی جائے، یا قرض (کے بعد)، اس طرح کہ کسی کا نقصان نہ کیا گیا ہو۔ اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۱۲﴾

پوتے یا پڑپوتے، خواہ تم سے یا کسی اور خاوند سے تو تمھیں چوتھا حصہ ملے گا اور اگر تمھاری اولاد نہ ہو تو تمھاری بیویوں کو چوتھا حصہ ملے گا اور تمھارے فوت ہونے کی صورت میں اگر تمھاری اولاد یا اولاد کی اولاد ہے، پھر وہ خواہ ان بیویوں سے ہے یا کسی اور سے، بہر حال بیویوں کو آٹھواں حصہ ملے گا، قرض اور وصیت کی ادائیگی کے بعد، پھر بیوی ایک ہو یا زیادہ سب چوتھائی یا آٹھویں حصے میں شریک ہوں گی، اس پر اجماع ہے۔

② يُّوْرَثُ كَلٰلَةً: اگر کوئی مرد یا عورت مر جائے، اس کا نہ والد ہو نہ اولاد تو اسے ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ بعض ایسی میت کے وارثوں کو ''کلالہ'' کہتے ہیں۔ بہر حال دونوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

③ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ: بھائی بہن تین طرح کے ہوتے ہیں: ① عینی یعنی جن کے ماں باپ ایک ہوں۔ ② علاتی، یعنی جن کا باپ ایک ہو، مائیں مختلف ہوں۔ ③ اخیافی، جن کی ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں۔ یہاں بالاتفاق اخیافی بھائی بہن مراد ہیں، جیسا کہ ایک قراءت میں بھی ہے۔

④ اخیافی بھائی چار احکام میں دوسرے وارثوں سے مختلف ہیں: ① یہ صرف ماں کی جہت سے ورثہ لیتے ہیں۔ ② ان میں سے مرد اور عورت کو مساوی حصہ دیا جاتا ہے۔ ③ ان کو صرف میت کے کلالہ ہونے کی صورت میں حصہ ملتا ہے۔ ④ خواہ کتنے ہی ہوں ان کا حصہ ثلث سے زیادہ نہیں ہوتا، مثلاً ایک میت کا شوہر، ماں، دو اخیافی اور دو عینی بھائی موجود ہوں تو جمہور اہل علم کے نزدیک شوہر کو نصف (۱/۲) ملے گا، ماں کو سدس (۱/۶) ملے گا اور بقیہ تہائی حصے میں اخیافی بھائیوں کے ساتھ عینی بھائی بھی شریک ہوں گے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مقدمہ میں یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ صحابہ میں سے عثمان، ابن مسعود، ابن عباس اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور ائمہ میں سے امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے، البتہ علی رضی اللہ عنہ اخیافی بھائیوں کو دیگر سگے بھائیوں کے عصبہ ہونے کی وجہ سے محروم قرار دیتے ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس دوسرے مسلک کو ترجیح دی ہے۔ (ابن کثیر، فتح القدیر)

⑤ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ: اخیافی بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو مرد ہو یا عورتیں، یا مرد اور عورتیں ملے ہوئے ہوں، سب میں تیسرا حصہ برابر تقسیم کر دیا جائے گا، یعنی یہاں مرد کو عورت پر فضیلت نہیں ہو گی، جیسا کہ آیت میں ''شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ''

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ
يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾ وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ

یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۳﴾ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اس کی حدوں سے تجاوز کرے وہ اسے آگ میں داخل کرے گا، ہمیشہ اس میں رہنے والا ہے اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ﴿۱۴﴾ اور تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں ان پر اپنے میں سے چار

سے معلوم ہوتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا اور ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ محض اجتہاد سے نہیں کیا جا سکتا۔ (ابن کثیر)

⑥ غَيْرَ مُضَآرٍّ: یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور اس کا تعلق وصیت اور قرض دونوں سے ہے۔ وصیت میں نقصان پہنچانا ایک تو یہ ہے کہ تہائی مال سے زیادہ وصیت کرے، اس صورت میں تہائی سے زائد وصیت کا نفاذ نہیں ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی وارث کو مزید رعایت سے زائد مال دلوایا جائے، اس کا بھی اعتبار نہیں ہوگا، الا یہ کہ تمام وارث برضا و رغبت اسے قبول کر لیں۔ قرض میں نقصان پہنچانا یہ ہے کہ محض وارثوں کا حق تلف کرنے کے لیے مرنے والا اپنے ذمے کسی ایسے قرض کا اقرار کرے جو حقیقت میں اس کے ذمے نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''وصیت میں نقصان پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔''
[السنن الکبری للنسائی : ۱۰/ ۶۰، ح : ۱۱۰۲۶، و سندہ صحیح]

آیت 14،13 تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ...... : اللہ تعالیٰ نے وراثت کو حدود اللہ قرار دیا اور اس حکم کی اطاعت پر جنت اور فوز عظیم کا وعدہ فرمایا ہے اور نافرمانی اور حدود اللہ کی پامالی کی صورت میں ہمیشہ کی آگ اور عذاب مہین کی سزا سنائی ہے۔ افسوس کہ بڑے بڑے بظاہر متقی لوگ بھی بہنوں کو ان کا حصہ نہیں دیتے، اکثر لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جائداد بیٹوں کو دے دیں اور بیٹیوں کو محروم کر دیں۔ اسی طرح اگر کوئی وارث کمزور ہو تو اسے بھی وراثت سے حصہ نہیں دیتے، ان سب کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اس کے رسوا کن عذاب اور ہمیشہ کی آگ سے ڈرنا چاہیے۔

آیت 16،15 ① وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ ...... : اوپر کی آیات میں عورتوں کے ساتھ احسان اور ان کے مہر ادا کرنے اور مردوں کے ساتھ ان کو وراثت میں شریک قرار دے کر ان کے حقوق کی حفاظت کا بیان تھا، اب یہاں سے عورتوں کی تادیب اور ان پر سختی کا بیان ہے، تاکہ عورت اپنے آپ کو بالکل ہی آزاد نہ سمجھے۔ (قرطبی) پہلی آیت میں زنا کار عورتوں کی سزا بیان کی کہ زنا شہادت سے ثابت ہو جائے تو انھیں تاعمر گھر میں محبوس رکھا جائے، یہاں تک کہ وہ مر جائیں، یا اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کوئی دوسری سزا نازل فرما دے۔ اسلام میں زنا کار عورتوں کے لیے یہ پہلی سزا ہے جو بعد میں حد زنا نازل ہونے سے منسوخ ہوگئی۔ سورۂ نور میں جو سو کوڑوں کی سزا نازل ہوئی ہے، یہاں ''سَبِيْلًا'' سے اسی طرف اشارہ ہے۔ دوسری

فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ
الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

مرد گواہ طلب کرو، پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو انھیں گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے ﴿۱۵﴾ اور وہ دونوں جو تم میں سے اس کا ارتکاب کریں سو ان دونوں کو ایذا دو، پھر اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان سے خیال ہٹا لو، بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۶﴾

آیت میں زانی مرد اور زنا کار عورت کے متعلق یہ حکم دیا گیا کہ ان کو اذیت دی جائے اور ذلیل کیا جائے، حتیٰ کہ تائب ہو جائیں، یہ سزا پہلی سزا کے ساتھ ہی ہے، بعد میں یہ دونوں سزائیں منسوخ ہو گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے (احکام دین) لو، اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لیے سبیل پیدا فرما دی ہے کہ کنوارا کنواری کے ساتھ (زنا کرے) تو اس کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلا وطنی اور شادی شدہ شادی شدہ کے ساتھ (زنا کرے) تو ان کے لیے سو کوڑے اور سنگسار ہے۔'' [مسلم، الحدود، باب حد الزنی : ۱۶۹۰، عن عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ] مزید دیکھیے سورۂ نور (۲)۔ (ابن کثیر، قرطبی)

❷ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ : چونکہ زنا کی سزا نہایت سخت ہے، اس لیے اس پر گواہی بھی زیادہ مضبوط رکھی۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جو چیز شمار کی جا رہی ہے، وہ مذکر ہو تو عدد مؤنث ہوتا ہے، اس لیے " اَرْبَعَةً" کی وجہ سے ترجمہ ''چار مرد'' کیا ہے۔

❸ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا ...... : بعض علماء نے اس سے مراد قوم لوط کا عمل کرنے والے دو مرد لیے ہیں، اگرچہ " وَالَّذٰنِ" کے لفظ میں، جو تثنیہ مذکر کے لیے آتا ہے، اس کی گنجائش ہے، مگر یہ مطلب نہ رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، نہ کسی صحابی سے، بلکہ طبری اور ابن ابی حاتم نے اپنی حسن سند کے ساتھ علی بن ابی طلحہ سے، انھوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ عورت جب زنا کرتی تو گھر میں بیٹھی رہتی یہاں تک کہ فوت ہو جاتی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ﴾ کے متعلق فرمایا کہ مرد جب زنا کرتا تو اسے تعزیر اور جوتے مارنے کے ساتھ ایذا دی جاتی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ﴾ [النور : ۲] یعنی زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کو سو سو کوڑے مارو۔ پھر اگر وہ شادی شدہ ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق انھیں رجم کر دیا جائے گا۔ یہ ہے وہ ''سبیل'' جو اللہ نے فرمایا: ﴿ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴾ (یہاں تک کہ انھیں موت اٹھا لے جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ بنا دے) اسی طرح طبری نے صحیح سند کے ساتھ مجاہد سے نقل کیا ہے کہ ﴿ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ ﴾ سے مراد زنا کرنے والے مرد و عورت ہیں۔ علاوہ ازیں " يَاْتِيٰنِهَا" میں "ھا" کی ضمیر پچھلی آیت میں مذکور '' الْفَاحِشَةَ '' کی طرف جا رہی ہے جس سے اس مقام پر مراد زنا ہے۔ اس فاحشہ سے مراد قوم لوط کا عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ رہا " الَّذٰنِ" تثنیہ مذکر کا لفظ تو دو افراد اگر

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓىِٕكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

توبہ (جس کا قبول کرنا) اللہ کے ذمے (ہے) صرف ان لوگوں کی ہے جو جہالت سے برائی کرتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، تو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ پھر مہربان ہو جاتا ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۷﴾ اور توبہ ان لوگوں کی نہیں جو برے کام کیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے پاس موت آ جاتی ہے تو وہ کہتا ہے بے شک میں نے اب توبہ کر لی اور نہ ان کی ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہوتے ہیں، یہ لوگ ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے ﴿۱۸﴾

مذکر و مؤنث ہوں تو ان کے لیے تثنیہ مذکر کی ضمیر عام استعمال ہوتی ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

آیت 17 ① اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ: یہاں ''عَلَى اللّٰهِ'' کے معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے ذمے لے لیا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز لازم نہیں ہے۔ (قرطبی)

② "بِجَهَالَةٍ" یعنی اگر کبھی نادانی اور جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ کر بھی لیتے ہیں تو "مِنْ قَرِيْبٍ" یعنی جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو جہالت سے گناہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی جہالت سے گناہ نہ کرے بلکہ دیدہ و دانستہ علم رکھتے ہوئے گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہی نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں "بِجَهَالَةٍ" کی قید احتراز کے لیے نہیں ہے، بلکہ بیان واقعہ کے لیے ہے، یعنی ہر گناہ ہوتا ہی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ہے۔ گناہ کرنے والا اس کے انجام سے بے خبر ہو کر ہی گناہ کی جرأت کرتا ہے، اگر اس کا انجام پوری طرح اس کی آنکھوں کے سامنے ہو تو وہ کبھی گناہ کا ارتکاب نہ کر سکے۔ ''مِنْ قَرِيْبٍ'' کا مفہوم یہ ہے کہ موت کے آثار مشاہدہ کرنے سے پہلے پہلے تائب ہو جاتے ہیں۔ ان دو شرطوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

آیت 19 ① وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ...... : یعنی ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ کو اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک کہ موت کے وقت اس کی روح حلق تک نہ پہنچ جائے۔'' [ترمذی، الدعوات، باب إن الله يقبل ...... : ۳۵۳۷، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما وقال الألباني حسن] آخری وقت میں تو فرعون نے بھی توبہ کر لی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [یونس: ۹۱] ''کیا اب؟ حالانکہ بے شک تو نے اس سے پہلے نافرمانی کی اور تو فساد کرنے والوں سے تھا۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَاۤ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھارے لیے حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور نہ انھیں اس لیے روک رکھو کہ

❷ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ: یعنی جو لوگ مرتے دم تک کفر و شرک میں مبتلا رہتے ہیں اور موت کے آثار دیکھ کر توبہ کرنا چاہتے ہیں، ان کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [المؤمن : ۸۴، ۸۵] ”پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم اس اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کا انکار کیا جنھیں ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے تھے۔ پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے۔“ نیز دیکھیے سورۂ انعام (۱۵۸)۔

آیت 19 ❶ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا: زنا وغیرہ کے سلسلہ میں ضمناً توبہ کے احکام بیان فرمانے کے بعد یہاں سے پھر عورتوں کے حقوق کا بیان ہو رہا ہے اور اس سے مقصد عورتوں کو اس ظلم و زیادتی سے نجات دلانا ہے جو جاہلیت میں ان پر روا رکھی جاتی تھی۔ اس کے مخاطب یا تو شوہر کے اولیاء ہیں، جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ اور دوسرے محدثین نے اس آیت کی شانِ نزول میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں میت کے اولیاء دوسری چیزوں کی طرح اس کی بیوی کے بھی مالک ہوتے تھے، ان میں سے اگر کوئی چاہتا تو خود اس سے شادی کر لیتا، یا کسی دوسرے سے شادی کر دیتے (اور مہر خود لے لیتے) اور اگر چاہتے تو عورت کو کلیتاً شادی ہی سے روک دیتے (حتیٰ کہ وہ مر جاتی اور اس کے مال کے وارث خود بن جاتے) عورت کے اولیاء کو اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہ ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور عورت پر ان کے تسلط کو ختم کر دیا۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا يحل لكم ...... ﴾ : ۴۵۷۹] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے مخاطب شوہر ہوں، چنانچہ بعض علماء نے اس کی شان نزول میں لکھا ہے کہ وہ عورتوں کو طلاق نہ دیتے بلکہ تنگ کرتے رہتے، تاکہ اگر مر جائیں تو ان کے وارث بن جائیں اور اگر طلاق لینا چاہیں تو جو کچھ انھیں دیا ہے اس میں سے کچھ واپس کریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پہلی صورت میں اس کا حاصل یہ ہے کہ خاوند کے مرنے کے بعد اسے نکاح سے روکنا جائز نہیں، بلکہ وہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے اور خاوند کے اولیاء اس طرح زبردستی اس کے وارث نہیں بن سکتے۔ دوسری صورت میں، یعنی جب شوہر مخاطب ہوں، تو خلاصہ یہ ہوگا کہ شوہر کے لیے جائز نہیں کہ عورت سے مہر واپس لینے کی غرض سے اسے تنگ کرتا رہے اور طلاق نہ دے، حتیٰ کہ وہ خلع پر مجبور ہو جائے۔ یہ دوسری صورت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور ابن عطیہ وغیرہ نے اسی کو پسند کیا ہے، اس لیے کہ آیت کے بقیہ حصے کا تعلق بلا شک و شبہ شوہروں ہی کے ساتھ ہے، کیونکہ واضح بے حیائی کے ارتکاب کی

اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

تم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو مگر اس صورت میں کہ وہ کھلم کھلا بے حیائی کا ارتکاب کریں اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو، پھر اگر تم انھیں ناپسند کرو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھ دے ﴿۱۹﴾

صورت میں خاوند ہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اسے روک رکھے، تاکہ اسے مہر وغیرہ، جو کچھ دیا ہے، واپس لے کر طلاق دے، شوہر کے اولیاء کو یہ اختیار نہیں ہے۔ (فتح القدیر، قرطبی) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب عام مسلمانوں سے ہو، جس میں شوہر، میت کے اولیاء اور دوسرے مسلمان سبھی آ جاتے ہوں۔ (فتح القدیر)

❷ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ : ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے "بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" سے مراد سرکشی اور نافرمانی لی ہے، مگر ابن جریر رحمہ اللہ نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اسے عام رکھا جائے اور یہ فحش کلامی، بدخلقی، ایذا رسانی، زنا اور اس قسم کے جملہ رذائل کو شامل ہو اور مطلب یہ ہو گا کہ اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو تو تم اسے خلع لینے پر مجبور کر سکتے ہو، تاکہ وہ لیا ہوا مال واپس کر دے۔

❸ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ : یہ عورتوں سے متعلق تیسرا حکم ہے کہ ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيْ ﴾ [ابن ماجه، النكاح، باب حسن معاشرة النساء : ۱۹۷۷، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ ترمذی : ۳۸۹۵۔ الصحیحة : ۲۸۵] "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے اور میں تم میں سے اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔"

❹ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰۤى ...... : یہ بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہنے کی بات کی تکمیل ہے، یعنی اگر کسی اخلاقی کمزوری یا بدصورت ہونے کی وجہ سے تمھیں ان سے نفرت ہو جائے اور ان کو طلاق دینا چاہو تو بھی فوراً طلاق نہ دو، بلکہ بہتر طریقے سے انھیں اپنے پاس رکھو، ہو سکتا ہے کہ ان کی صحبت سے خیر کثیر، یعنی صالح اولاد حاصل ہو جائے یا مال میں برکت ہو جائے اور تمھاری نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی مومن اپنی مومنہ بیوی سے بغض نہ رکھے، اگر اسے اس کی کوئی ایک عادت ناپسند ہو گی تو دوسری پسند بھی ہو گی۔" [مسلم، الرضاع، باب الوصية بالنساء : ۱۴۶۷، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر نفرت کے سبب تم ان سے علیحدگی اختیار کرنا چاہو تو ہو سکتا ہے کہ اس علیحدگی میں ان کے لیے خیر کثیر مضمر ہو، مثلاً ان کو بہتر خاوند مل جائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۰)۔

وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝

اور اگر تم کسی بیوی کی جگہ اور بیوی بدل کر لانے کا ارادہ کرو اور تم ان میں سے کسی کو ایک خزانہ دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کر کے لو گے ⑳ اور تم اسے کیسے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں ㉑

آیت 21،20 ① وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ ...... یہ عورتوں سے متعلق چوتھا حکم ہے۔ جب پہلی آیات میں بیان فرمایا کہ اگر صحیح طریقے سے ساتھ نہ رہنے کی وجہ عورت کی جانب سے ہو تو مہر واپس لینے کے لیے اسے تنگ کرنا جائز ہے، یہاں بتایا کہ جب زیادتی شوہر کی جانب سے ہو تو پھر عورت سے فدیۂ طلاق لینا ممنوع اور حرام ہے۔ یعنی بلاوجہ تنگ کر کے ان سے مہر واپس لو گے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بہتان باندھ کر مہر واپس لے رہا ہے اور اس صورت میں تم ان پر دوہرا ظلم کرو گے، ایک بلاوجہ تنگ کرنا اور دوسرا مہر واپس لینا، اس لیے اسے "اِثْمًا مُّبِيْنًا" فرمایا۔

② وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا : اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ مہر کی کوئی حد معین نہیں ہے، خاوند اپنی حیثیت کے مطابق جتنا مہر دینا چاہے دے سکتا ہے۔ اس مقام پر امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مہر زیادہ رکھنے سے منع کرنے پر ایک عورت کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس نے زیادہ مہر کے جواز کے لیے یہ آیت پڑھی تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمر سے ہر شخص زیادہ سمجھ دار ہے اور اس سے کئی دشمنان صحابہ عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرتے ہیں۔ عورت کا واقعہ کسی صحیح سند سے ثابت نہیں، تفصیل کے لیے دیکھیں ارواء الغلیل (۱۹۲۷)۔

③ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى ...... : اس سے معلوم ہوا کہ جماع کے بعد دیا ہوا مہر واپس نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آپ نے لعان کرنے والے مرد کے مہر واپس لینے کے مطالبے پر فرمایا تھا: ''اگر تم نے اپنی بیوی پر زنا کی بات سچ کہی ہے تو مہر اس کے عوض ہے جو تم نے اس کی شرم گاہ اپنے لیے حلال کی اور اگر اس پر جھوٹ کہا ہے تو پھر تو (مہر کی واپسی) زیادہ ہی بعید ہے۔''

[بخاري، الطلاق، باب قول الإمام للمتلاعنين ..... : ۵۳۱۲۔ مسلم : ۱۴۹۳/۵، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما]

④ وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا : ''پختہ عہد'' سے مراد عقد نکاح ہے، یعنی تمھارا یہ کہنا کہ میں نے فلاں عورت سے نکاح قبول کیا۔ اب طلاق کی صورت میں دو ہی راستے ہیں: ﴿ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ [البقرة : ۲۲۹] اور ظاہر ہے کہ طلاق دے کر مہر نہ دینا ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا وَ سَآءَ
سَبِيْلًا ۲۲ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَ عَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ
الْاُخْتِ وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَ رَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ

اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ نکاح کر چکے ہوں، مگر جو پہلے گزر چکا، بے شک یہ ہمیشہ سے بڑی بے حیائی اور سخت غصے کی بات ہے اور برا راستہ ہے ۲۲ حرام کی گئیں تم پر تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں اور تمھاری پھوپھیاں اور تمھاری خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو اور تمھاری دودھ شریک بہنیں اور تمھاری بیویوں کی مائیں اور تمھاری پالی ہوئی لڑکیاں جو تمھاری

آیت 22 وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ …… : جاہلیت کے دستور میں بیٹے کے لیے اپنے باپ کی منکوحہ (سوتیلی ماں) سے شادی کر لینا جائز تھا، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اہل جاہلیت ان رشتوں کو حرام سمجھتے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے حرام کیا، سوائے باپ کی بیوی اور دو بہنوں کو جمع کرنے کے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں: ﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [النساء: ۲۲] اور ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ [النساء: ۲۳]'' [ابن جریر: ۳۶۹/۴، صحیح] اللہ تعالیٰ نے اسے سخت حرام قرار دیا، حتیٰ کہ اگر باپ نے صرف عقد ہی کیا ہو تو بھی بیٹے کا اس سے نکاح حرام ہے۔ یہ سخت بے حیائی اور اللہ کی سخت ناراضگی کا باعث اور برا راستہ ہے کہ آج تم نے اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح کیا ہے، کل تمھاری منکوحہ سے تمھارا بیٹا نکاح کرے گا، اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ ہی بند کر دیا۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ اپنے ماموں ابو بردہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی طرف بھیجا جس نے اپنے باپ کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا کہ اسے قتل کر دیں اور اس کا مال لے لیں۔ [أبو داؤد، الحدود، باب فی الرجل یزنی بحریمه: ۴۴۵۷۔ ترمذی: ۱۳۶۲۔ نسائی: ۳۳۳۴۔ ابن ماجه: ۲۶۰۷، و قال الألبانی صحیح] معلوم ہوا ایسا شخص واجب القتل ہے۔

آیت 23 ① حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ …… : جن عورتوں سے نکاح کرنا حرام ہے ان کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے، ایک تو پچھلی آیت میں بیان ہوا کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اب یہاں نسب کے سات حرام رشتوں کا ذکر ہے: ① ماں: اس کے حکم میں نانی اور دادی اوپر تک، مثلاً پڑدادی، پڑنانی شامل ہیں۔ ② بیٹی: اس کے حکم میں پوتی اور نواسی نیچے تک آ جاتی ہیں۔ ③ بہن: سگی ہو یا علاتی یا اخیافی، بہر حال حرام ہے۔ ④ پھوپھی: اس میں دادا کی بہن اور نانا کی بہن بھی شامل ہے۔ ⑤ خالہ: یہ لفظ ماں، نانی اور دادی سب کی بہنوں کو شامل ہے۔ ⑥ ⑦ بھتیجی اور بھانجی کے حکم میں ان کی بیٹیاں نیچے تک آ جاتی ہیں۔ (قرطبی)

فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ١ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ١
وَ حَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ١ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ١
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

گود میں تمھاری ان عورتوں سے ہیں جن سے تم صحبت کر چکے ہو، پھر اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور تمھارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمھاری پشتوں سے ہیں اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو، مگر جو گزر چکا۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۳﴾

② وَ اُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ ...... : یعنی نسبی ماں اور بہن کی طرح دودھ کی ماں اور بہن بھی حرام ہیں۔ یہاں دو رشتوں کا ذکر ہے، مگر حدیث کی رو سے وہ ساتوں رشتے جو نسب سے حرام ہیں، دودھ سے بھی حرام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہیں۔'' [بخاری، النکاح، باب : ﴿ و أمهاتکم التی أرضعنکم ﴾ : ۵۰۹۹، عن عائشۃ رضی اللہ عنہا]

قرآن مجید نے دودھ پینے کو حرمت کا سبب قرار دیا ہے، یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ کم از کم کتنی دفعہ دودھ پیا ہو، مگر مسلم میں ام الفضل اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک یا دو دفعہ دودھ پینا حرمت کا باعث نہیں ہوتا۔'' [مسلم، الرضاع، باب فی المصۃ والمصتان : ۱۴۵۰، ۱۴۵۱] عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن میں اترنے والے حکم میں تھا کہ دس دفعہ دودھ پینا جو معلوم ہو، حرام کرتا ہے، پھر وہ پانچ کے ساتھ منسوخ ہو گیا، تو نبی ﷺ فوت ہوئے اور وہ قرآن میں پڑھے جاتے تھے۔ [مسلم، الرضاع، باب التحریم بخمس رضعات : ۱۴۵۲] یاد رہے کہ یہ دودھ پلانا اسی وقت معتبر ہوگا، جب دودھ پلانے کی مدت، یعنی دو سال کے اندر ہو۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳۳)۔

③ اُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ : اس میں بیویوں کی نانیاں اور دادیاں بھی اوپر تک شامل ہیں۔ بیوی کی ماں (ساس) حرام ہے، خواہ بیوی کو جماع سے پہلے طلاق دے دی ہو، یا اس کا انتقال ہو گیا ہو۔

④ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ : ''رَبَائِبُ'' یہ ''رَبِيْبَةٌ'' کی جمع ہے، یعنی بیوی کی دوسرے خاوند سے جو لڑکی ہو وہ بھی حرام ہے، بشرطیکہ اپنی بیوی (اس لڑکی کی ماں) سے جماع کر لیا ہو، اگر قبل از جماع طلاق دے دی تو عورت کی لڑکی سے نکاح جائز ہے، اس پر علماء کا اتفاق ہے۔ (قرطبی، ابن کثیر)

''فِيْ حُجُوْرِكُمْ'' (تمھاری گود میں) کی قید شرط کے طور پر نہیں، بلکہ اتفاقی ہے یعنی عام حالات میں ایسا ہوتا ہے، ورنہ اگر اس کی پرورش کسی اور جگہ ہوئی ہو تو بھی وہ حرام ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ

اور خاوند والی عورتیں (بھی حرام کی گئی ہیں) مگر وہ (لونڈیاں) جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا ہے اور تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں جو ان کے سوا ہیں کہ اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو، اس حال میں کہ نکاح میں لانے والے ہو، نہ کہ بدکاری کرنے والے۔ پھر وہ جن سے تم ان عورتوں میں سے فائدہ اٹھاؤ

---

❹ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمْ: "حَلَآئِلُ" یہ "حَلِيْلَةٌ" کی جمع ہے، یعنی صلبی بیٹوں کی بیویاں نہ کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۳۷)۔

❺ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ......: یہ محل رفع میں ہے، یعنی "حُرِّمَ عَلَيْكُمُ الْجَمْعُ بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ" کہ دو بہنوں کو، صلبی ہوں یا رضاعی، ایک وقت میں نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنا منع ہے، مگر حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔" [بخاری، النکاح، باب لا تنكح المرأة على عمتها : ۵۱۰۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے علاوہ سنت بھی شریعت کا مستقل ماخذ ہے، قرآن میں صرف دو بہنوں کو جمع کرنا منع آیا ہے اور حدیث میں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی منع آیا ہے، یہ بھی ماننا پڑے گا۔

❻ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: یعنی پہلے جو رشتے ایسے ہو چکے ان کا کچھ گناہ نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کو برقرار رکھا جائے گا۔

آیت 24 ❶ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ......: اوپر کی آیت میں حرام رشتوں کا ذکر تھا، وہ تو بہر صورت حرام ہیں، خواہ ان میں سے کوئی عورت کسی کی لونڈی بن کر آ جائے۔ اس بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ دو بہنوں کو جمع کرنا صرف نکاح ہی میں نہیں بلکہ ایک مالک کی لونڈیاں ہوں تب بھی اسے دونوں سے صحبت حرام ہے۔ (ابن کثیر) اب یہاں فرمایا کہ جن عورتوں کے شوہر موجود ہوں ان سے نکاح بھی حرام ہے، ہاں جنگ کی صورت میں دار الحرب سے جو عورتیں قیدی بن کر آئیں تو اموال غنیمت کی تقسیم کے بعد جن کے حصہ میں آئیں گی ان کے لیے "استبراء" کے بعد ان سے صحبت جائز ہے، خواہ پیچھے ان کے خاوند موجود ہی کیوں نہ ہوں۔ "استبراء" یہ ہے کہ وہ عورت ایک حیض سے پاک ہو جائے، یا اگر حاملہ ہے تو وضع حمل ہو جائے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (۸ھ میں) حنین کے دن اوطاس کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا، ان کا مقابلہ دشمن سے ہوا تو انھوں نے مقابلہ کیا اور فتح پائی، بہت سے قیدی ان کے ہاتھ آئے، (تقسیم کے بعد جو لونڈیاں حصے میں آئیں) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان قیدی عورتوں سے صحبت کو گناہ سمجھا، اس لیے کہ ان کے مشرک شوہر موجود تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ یعنی عدت کے بعد وہ تمھارے

اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

پس انھیں ان کے مہر دو، جو مقرر شدہ ہوں اور تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم مقرر کر لینے کے بعد آپس میں راضی ہو جاؤ، بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۴﴾

لیے حلال کر دی گئی ہیں۔ [مسلم، الرضاع، باب جواز وطیء المسبیة...... : ۱۴۵۶]

2 احصان کا لفظی معنی محفوظ کرنا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ چند معانی میں آیا ہے: ① شادی شدہ عورتوں کے معنی میں، جیسے اس آیت کے شروع میں "اَلْمُحْصَنٰتُ" (صاد کے فتحہ کے ساتھ) اسم مفعول کا صیغہ ہے۔ ② آزاد عورتوں کے معنی میں، جیسے اگلی آیت میں ہے۔ ③ پاک دامن عورتوں کے معنی میں، جیسے اس سے اگلی آیت میں اور سورۂ مائدہ (۵) میں ہے۔

3 كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ : یعنی جن حرام رشتوں کا اوپر ذکر ہوا ہے، ان سے نکاح نہ کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کا ماننا تم پر لازم ہے۔ (ابن کثیر)

4 وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ : اور ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں، بشرطیکہ حدیث میں ان کی حرمت نہ آئی ہو، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے کسی عورت کے ساتھ اس کی خالہ یا پھوپھی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے سے منع فرمایا۔ ایسی ہی چند اور صورتیں بھی ہیں، مثلاً چار سے زیادہ عورتیں بیک وقت نکاح میں رکھنا، یا نکاح متعہ کرنا یا حلالہ کرنا، یا بنت رسول ﷺ اور بنت عدو اللہ (ابوجہل) کو ایک نکاح میں جمع کرنا یا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرنا، یا نکاح شغار یعنی وٹہ سٹہ کا نکاح جس میں یہ شرط ہو کہ اگر تم رشتہ دو گے تو میں رشتہ دوں گا، اس شرط کے بعد مہر مقرر ہو تب بھی نکاح حرام ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد میں ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے عبدالرحمان بن حکم سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور عبدالرحمان بن حکم نے اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے مروان کی طرف خط لکھا اور اسے حکم دیا کہ ان دونوں کے درمیان علیحدگی کروا دیں اور دونوں نے مہر بھی مقرر کیا تھا۔ [أبو داوٗد، النکاح، باب فی الشغار : ۲۰۷۵۔ و صححه الألبانی]

5 اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ ...... : موضح میں ہے کہ ان مذکورہ محارم کے سوا سب حلال ہیں، مگر چار شرطوں کے ساتھ، اول یہ کہ طلب کرو، یعنی دونوں طرف سے زبانی ایجاب و قبول ہو، دوسرے یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو، تیسرے یہ کہ ان عورتوں کو قید (دائمی قبضہ) میں لانا غرض ہو، (صرف) مستی نکالنے کی غرض نہ ہو (جیسے زنا میں ہوتا ہے) یعنی وہ عورت اس مرد کی بندی ہو جائے، چھوڑے بغیر نہ چھوٹے، یعنی کسی مہینے یا برس (مدت) کا ذکر نہ آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متعہ حرام ہے (اور حلالہ بھی، کیونکہ اس میں بھی جماع کے بعد طلاق کی نیت ہوتی ہے۔) چوتھی یہ کہ چھپی یاری نہ ہو، مراد لوگ نکاح کے شاہد ہوں، کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں، یہی چار شرطیں اس آیت سے سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اس چوتھی شرط میں یہ بھی شامل

وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ

اور تم میں سے جو مالی لحاظ سے طاقت نہ رکھے کہ آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرے تو ان میں سے جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ ہوں، تمھاری مومن لونڈیوں سے (نکاح کر لے) اور اللہ تمھارے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے، تمھارا بعض بعض سے ہے۔ تو ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کر لو اور انھیں ان کے مہر اچھے

ہے کہ نکاح ولی کر کے دے، کیونکہ ولی کے بغیر نکاح چھپی یاری میں داخل ہے۔ اسلام نے ولی کے بغیر نکاح کو باطل قرار دیا قرآن و حدیث کے دلائل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری میں " کتاب،النکاح، باب من قال لا نکاح إلا بولی:۵۱۲۷"

❻ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ: یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے فائدہ اٹھاؤ، یعنی صحبت کرو ان کے پورے مہر ان کے حوالے کرو۔ اکثر پہلے اور پچھلے مفسرین نے یہی معنی کیے ہیں کہ استمتاع سے مراد نکاحِ شرعی (جس کی چار شرطوں کا اوپر ذکر آیا ہے) کے بعد صحبت ہے۔ رافضیوں نے اس سے متعہ کا جواز ثابت کیا ہے، مگر علمائے اہلِ سنت بالاجماع اس کی حرمت کے قائل ہیں۔ ہجرت کے ابتدائی برسوں میں بے شک رسول اللہ ﷺ نے (اس آیت کی رو سے نہیں بلکہ) اس رواج کی بنیاد پر جو اسلام سے پہلے چلا آ رہا تھا (جسے استصحابِ حال کہتے ہیں) بعض مواقع پر حسبِ ضرورت متعہ کی اجازت دی، مگر بعد میں نبی ﷺ نے نہایت واضح الفاظ میں اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا۔ سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! میں نے تمھیں عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی مگر اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت کے دن تک کے لیے حرام قرار دے دیا ہے، سو اب جن کے پاس متعہ والی عورتیں ہیں وہ انھیں چھوڑ دیں اور جو مال تم نے انھیں دیا ہے وہ ان سے واپس نہ لو۔'' [مسلم، النکاح، باب نکاح المتعة...... : ۲۱/۱۴۰۶] نیز متعہ والی عورتیں نہ لونڈیاں ہیں نہ بیویاں تو ان سے متعہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۵ تا ۷)۔

❼ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ......: یعنی اگر خاوند اور بیوی باہمی رضامندی سے طے شدہ مہر میں کمی بیشی کر لیں تو کچھ حرج نہیں ہے۔

آیت 25 ❶ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ...... : یعنی اگر کسی شخص کی مالی حالت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو کسی دوسرے مسلمان کی لونڈی سے نکاح کر لے، بشرطیکہ وہ لونڈی مسلمان ہو۔ یہاں کسی شخص کو اپنی لونڈی سے نکاح کرنے کی اجازت کا بیان نہیں، کیونکہ اس کا لونڈی ہونا ہی مالک کے لیے اس سے صحبت کے جواز کا باعث ہے، اس کے علاوہ کوئی اور اس سے صحبت نہیں کر سکتا اور اس کی اولاد جائز اولاد سمجھی جائے گی، ہاں اگر نکاح ہی کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے آزاد کر دے اور آزاد کر کے نکاح کر لے۔ (فتح القدیر)

اَهۡلِهِنَّ وَ اٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ
فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ
ع ۱ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ؕ وَ اَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۵﴾

طریقے سے دو، جب کہ وہ نکاح میں لائی گئی ہوں، بدکاری کرنے والی نہ ہوں اور نہ چھپے یار بنانے والی، پھر جب وہ نکاح میں لائی جا چکیں تو اگر کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں پر ہے۔ یہ اس کے لیے ہے جو تم میں سے گناہ میں پڑنے سے ڈرے اور یہ کہ تم صبر کرو تمھارے لیے بہتر ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۵﴾

② بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ: یعنی تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور تمھاری ملت بھی ایک ہے، پھر محض لونڈی ہونے کی وجہ سے اس سے نکاح میں تردد نہ کرو۔ (شوکانی)

③ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ: یعنی جیسے آزاد مسلمان عورت سے نکاح کے لیے ولی (سرپرست) کی اجازت ضروری ہے، اسی طرح لونڈی سے نکاح کے لیے بھی اس کے مالک کی اجازت ضروری ہے۔ اسی طرح غلام بھی اپنے مالک کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا۔

④ وَ اٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ: ان الفاظ سے بعض نے سمجھا ہے کہ مہر لونڈی کا حق ہے، لیکن اکثر علمائے سلف کے نزدیک یہ مہر لونڈی کے مالک کا ہوگا، لونڈی کی طرف مہر کی اضافت مجازی ہے۔ (فتح القدیر)

⑤ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ: "اَخۡدَانٍ" "خِدۡنٌ" کی جمع ہے "خفیہ آشنا" چھپی یاری سے منع فرمایا تو نکاح میں گواہ لازم ہوئے۔

⑥ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ: "الۡمُحۡصَنٰتُ" میں الف لام عہد کا ہے، اس سے مخصوص محصنات یعنی کنواری آزاد عورتیں مراد ہیں، کیونکہ ان کی سزا سو کوڑے ہے جس کا نصف ہو سکتا ہے، شادی شدہ آزاد عورتوں کی سزا رجم ہے، اس کا نہ نصف ہو سکتا ہے نہ یہاں "الۡمُحۡصَنٰتُ" سے وہ مراد ہیں، یعنی لونڈیاں اگر شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کریں تو انھیں کنواری آزاد عورتوں کی سزا سے نصف سزا دی جائے گی جو پچاس کوڑے ہے۔ جن لوگوں نے اس آیت کو رجم کے انکار کی دلیل بنایا ہے کہ چونکہ رجم کا نصف ہو نہیں سکتا ہے، اس لیے رجم شریعت میں ہے ہی نہیں، انھوں نے اپنی کم علمی سے الف لام کا مفہوم سمجھا ہی نہیں، نہ "الۡمُحۡصَنٰتُ" کی صحیح مراد سمجھی ہے۔ عبد اللہ بن عیاش مخزومی فرماتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے اور قریش کے چند نوجوانوں کو حکم دیا تو ہم نے حکومتی لونڈیوں میں سے کچھ لونڈیوں کو زنا کرنے کی وجہ سے پچاس پچاس کوڑے لگائے۔ [الموطأ، الحدود، باب ما جاء في حد الزنا : ١٦]

⑦ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ: یعنی مذکورہ شرطوں کے ساتھ لونڈی سے نکاح صرف اسی صورت میں جائز ہے جب بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔ (قرطبی)

⑧ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ: اس سے اکثر علمائے سلف نے استدلال کیا ہے کہ لونڈی سے نکاح نہ کرنا ہی بہتر ہے، کیونکہ

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۟ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۶﴾ اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی فرمائے اور جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم (سیدھے راستے سے) ہٹ جاؤ، بہت بڑا ہٹ جانا ﴿۲۷﴾ اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کرے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے ﴿۲۸﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو!

ایسی منکوحہ لونڈی کی اولاد بھی اس کے مالک کی غلام ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 26 يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ اپنے احکام اس لیے بیان فرما رہا ہے کہ تم کو حلال و حرام کا پتا چل جائے اور پہلے لوگوں کے عمدہ طریق کی ہدایت ہو جائے، پہلے لوگوں سے مراد انبیاء اور ان کی امتوں کے نیک لوگ ہیں۔ (ابن کثیر، شوکانی)

آیت 27 وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم فسق و فجور کے بجائے پاکیزگی اپناؤ، مگر خواہشات کا اتباع کرنے والے بدکار چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی ان کی طرح ہر حد سے آزاد ہو کر حق سے بہت دور ہٹ جائیں، لہٰذا تم شہوت پرستوں کے کہنے میں نہ آؤ۔ مراد یہود و نصاریٰ، مجوسی اور کمیونسٹ ہیں، جو حرام رشتوں سے بھی نکاح جائز سمجھتے ہیں، بلکہ بعض تو نکاح کا طریقہ ہی ختم کر کے جانور بن چکے ہیں، حتیٰ کہ قوم لوط کے عمل کو قانوناً جائز کر چکے ہیں۔

آیت 28 يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ کو انسان کی کمزوری کا خوب علم ہے کہ عورتوں کے معاملے میں یہ کس قدر کمزور ہے، اس لیے احکام شریعت میں اس کی سہولت کا خیال رکھا گیا ہے اور دین میں سختی نہیں برتی گئی، فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج : ۷۸] ''اور اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک دین آسان ہے۔'' [بخاری، الإیمان، باب الدین یسر : ۳۹، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ] اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھارے پاس نہایت آسان حنفی شریعت لے کر آیا ہوں۔'' [مسند أحمد، ۲۶۶/۵، ح : ۲۲۳۵۴۔ بخاری، الإیمان، باب الدین یسر، قبل ح : ۳۹]

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''دین اسلام میں کوئی تنگی نہیں کہ کوئی حلال کو چھوڑے اور حرام کو دوڑے۔'' (موضح)

آیت 29 ① لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ : کمائی کے جتنے بھی ناجائز طریقے ہیں سب کے سب ''بِالْبَاطِلِ'' میں آجاتے ہیں، حتیٰ کہ حیلہ سازی کے ساتھ کسی کا مال کھانا بھی حرام ہے اور اپنے مال کو غلط طریقے سے اڑانا بھی اسی میں

لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹

اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضا مندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے ۲۹

داخل ہے۔ (رازی، ابن کثیر)

❷ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ : یعنی وہ تجارت اور لین دین (صنعت و حرفت وغیرہ) جس میں حقیقی باہمی رضا مندی ہو، اس کے ذریعے سے کماؤ اور کھاؤ۔ آپس کی رضا مندی میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شرع کے خلاف نہ ہو، کیونکہ وہ حقیقی رضا مندی ہوتی ہی نہیں، مجبوری کی رضا مندی ہوتی ہے، مثلاً رشوت اور سود میں بظاہر رضا مندی ہے مگر حقیقی نہیں، کیونکہ ایک فریق دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح جوئے اور لاٹری وغیرہ کا معاملہ ہے کہ یہ دونوں فریق نفع کی موہوم امید کے فریب میں آ کر یہ کام کر رہے ہیں، اس فریب کو حقیقی رضا مندی نہیں کہا جا سکتا۔ پورے طور پر باہمی رضا مندی میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ جب تک بیچنے والا اور خریدنے والا مجلس بیع سے الگ نہ ہوں اس وقت تک دونوں کو ایک دوسرے کی بیع رد کرنے کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خرید و فروخت کرنے والوں میں سے ہر ایک کو (بیع فسخ کرنے کا) اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں، سوائے اس تجارت کے جس میں یہ اختیار باقی رکھا جائے۔'' [بخاري، البيوع، باب البيعان بالخيار ما لم يتفرقا : ۲۱۱۱، عن ابن عمر رضي الله عنهما]

❸ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ : اس کے تین معانی ہو سکتے ہیں اور تینوں مراد ہیں، پہلا یہ کہ شریعت کی مخالفت کرتے ہوئے حقیقی باہمی رضا مندی کے بغیر اگر لین دین کرو گے تو اس کا نتیجہ آپس میں قتل و غارت ہو گا، جیسا کہ جوئے کے نتیجے میں ہارنے والے کے ہاتھوں کئی جیتنے والے قتل ہو جاتے ہیں، لہٰذا یہ کام مت کرو۔ دوسرا یہ کہ ایک دوسرے کو قتل مت کرو، کیونکہ یہ اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے اور تیسرا یہ کہ خودکشی مت کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے چھری کے ساتھ اپنے آپ کو قتل کیا تو جہنم میں چھری اس کے ہاتھ میں ہو گی اور وہ اس کے ساتھ اپنے پیٹ کو پھاڑے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا اور جس نے اپنے آپ کو زہر سے قتل کیا تو جہنم میں اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہو گا، جسے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی میں رہے گا اور جس نے پہاڑ سے گرا کر اپنے آپ کو قتل کیا تو وہ جہنم کی آگ میں گرتا رہے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہے گا۔'' [مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم...... : ۱۰۹۔ بخاري : ۵۷۷۸، عن أبي هريرة رضي الله عنه]

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾
اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا
كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا
اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اور جو زیادتی اور ظلم سے ایسا کرے گا تو عنقریب ہم اسے سخت ہولناک آگ میں جھونکیں گے اور یہ اللہ پر ہمیشہ سے بہت آسان ہے ﴿۳۰﴾ اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تم سے تمھاری چھوٹی برائیاں دور کر دیں گے اور تمھیں باعزت داخلے کی جگہ میں داخل کریں گے ﴿۳۱﴾ اور اس چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، مردوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے، جو انھوں نے محنت سے کمایا اور عورتوں کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہے، جو انھوں نے محنت سے کمایا اور اللہ سے اس کے فضل میں سے حصہ مانگو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۳۲﴾

آیت 30 ① وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ...... : ”ذٰلِكَ“ کا اشارہ قتل نفس کی طرف بھی ہو سکتا ہے، دوسروں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی طرف بھی اور سورت کی ابتدا سے یہاں تک جتنی چیزیں منع کی گئی ہیں ان سب کی طرف بھی۔

② وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا: یہ انداز بیان ڈانٹنے میں مبالغے پر دلالت کر رہا ہے۔ (رازی) موضح میں ہے: ”یعنی مغرور نہ ہوں کہ ہم مسلمان دوزخ میں کیوں کر جائیں گے؟ اللہ تعالیٰ پر یہ آسان ہے۔“

آیت 31 ① اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ...... : کبیرہ گناہ وہ ہیں جن کے متعلق قرآن یا حدیث میں صاف طور پر دوزخ کی وعید آئی ہو، یا اللہ کے غصے کا اظہار ہوتا ہو، یا شریعت میں ان پر حد مقرر کی گئی ہو اور ” سَيِّئَاتٌ “ وہ گناہ ہیں جن سے صرف منع کیا گیا ہو اور ان پر وعید وارد نہ ہوئی ہو۔ (رازی، ابن کثیر)

② نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ: یعنی اگر تم کبائر سے اجتناب کرتے رہو گے تو ہم تمھارے صغیرہ گناہ تمھارے نیک اعمال کی وجہ سے معاف فرما دیں گے۔ بعض روایات میں کبائر کا شمار بھی آیا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا، جوا، شراب نوشی اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا وغیرہ، مگر ان کی کوئی تحدید نہیں ہے، یہ سات سے ستر بلکہ سات سو تک بھی ہو سکتے ہیں اور بعض علماء نے اپنی کتابوں میں کبیرہ گناہوں کو جمع بھی کیا ہے، جن کا ذکر قرآن یا حدیث میں آیا ہے، جیسے امام ذہبی رحمہ اللہ کی ” اَلْكَبَائِرُ “ اور امام ہیثمی رحمہ اللہ کی ”اَلزَّوَاجِرُ عَنِ اقْتِرَافِ الْكَبَائِرِ“ مزید دیکھیے سورۂ نجم (۳۲)۔

آیت 32 وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ...... : یعنی یہ نہ کہو کہ کاش! یہ درجہ یا مال مجھے مل جائے، یہ تقدیر پر راضی نہ ہونے کی دلیل ہے اور اگر یہ بھی ہو کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے تو حسد ہے، جس کی بہت مذمت آئی ہے، ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مرد لوگ جہاد کرتے ہیں، ہم اس سے محروم ہیں، میراث میں بھی ہمارا نصف حصہ ہے تو اس

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ
نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ
اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

اور ہم نے اس (ترکے) میں جو والدین اور زیادہ قرابت والے چھوڑ جائیں، ہر ایک کے وارث مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں کو تمھارے عہد و پیمان نے باندھ رکھا ہے انھیں ان کا حصہ دو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر حاضر ہے۔ مرد عورتوں پر نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا۔ پس نیک عورتیں فرماں بردار ہیں، غیر حاضری میں حفاظت کرنے والی ہیں، اس لیے کہ اللہ

پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [أحمد : ٦/ ٣٢٢ ح : ٢٦٧٩٢] یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں تقرب نیک اعمال سے ہے، مرد کو محض مرد ہونے کی وجہ سے عورت پر عمل میں فضیلت نہیں ہے اور عورت محض عورت ہونے کی وجہ سے نیک عمل کے ثواب سے محروم نہیں ہے، لہٰذا تم بجائے حسد کے اللہ تعالیٰ کا فضل چاہا کرو۔ (ابن کثیر، بغوی)

آیت 33 وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ...... : اس آیت کریمہ کے پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کے ورثا اور رشتے دار ہوتے ہیں، جو اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث بنتے ہیں۔ آیت کے دوسرے حصے ﴿ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے جو حلف یا معاہدہ کسی کے ساتھ کیا ہوا ہے تو اس کا حصہ اسے دو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب مہاجرین مدینہ آئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کر دیا تھا، انصاری کا وارث اس کے رشتے داروں کے بجائے مہاجر ہوتا تھا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ ﴾ تو وہ (وراثت جو مہاجرین اور انصار کے درمیان قائم کی گئی تھی) منسوخ ہو گئی، پھر فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ نصرت، اعانت اور نصیحت کی صورت میں انھیں ان کا حصہ دو، کیونکہ میراث سے ان کا تعلق ختم ہو گیا ہے، ہاں! البتہ ان کے لیے وصیت کی جا سکتی ہے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولکل جعلنا موالی ...... ﴾ : ٤٥٨٠] نیز دیکھیے سورۂ انفال کی آخری آیت۔

مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ آیت میں "مَوَالِيَ" سے مراد عصبہ ہیں اور عصبہ کی وراثت میں "اَلْأَقْرَبُ فَالْأَقْرَبُ" کا اصول مقرر ہے، یعنی اول سب سے قریبی، پھر دوسرا اور ایک حدیث میں بھی « فَلِأَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ » کے الفاظ ہیں، یعنی اصحاب فروض سے جو کچھ بچ جائے گا وہ عصبہ میں سے اس شخص کو ملے گا جو میت کے مردوں میں سب سے زیادہ قریب ہو گا اور اس پر علماء کا اجماع بھی ہو چکا ہے۔ [دیکھیے فتح الباری : ٦/ ٢٩٤۔ المحلی : ٩/ ٢٧١۔ أحکام القرآن للجصاص : ٢/ ٢٢٤]

آیت 34 ① اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ...... : شریعت نے گھر کے بندوبست اور انتظام کے لیے مرد کو گھر کا قوام (نگران، ذمہ دار) قرار دیا ہے اور عورت کو اس کے ماتحت رکھا ہے۔ قرآن نے اس کی دو وجہیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ مرد کو طبعی طور پر

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۴﴾

نے (انھیں) محفوظ رکھا اور وہ عورتیں جن کی نافرمانی سے تم ڈرتے ہو، سو انھیں نصیحت کرو اور بستروں میں ان سے الگ ہو جاؤ اور انھیں مارو، پھر اگر وہ تمھاری فرماں برداری کریں تو ان پر (زیادتی کا) کوئی راستہ تلاش نہ کرو، بے شک اللہ ہمیشہ سے بہت بلند، بہت بڑا ہے ﴿۳۴﴾

امتیاز حاصل ہے کہ وہ منتظم بنے اور دوسرے یہ کہ گھر کے سارے اخراجات بیوی کے نفقہ سمیت مرد کے ذمے ہیں۔ اس بنا پر گھر کا نگران بننے کا حق مرد کو ہے عورت کو نہیں۔ یہی حال حکومتی امور کا ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ یا امیر عورت نہیں ہو سکتی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً » ''وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حاکم عورت کو بنا لیا۔'' [بخاری، المغازی، باب كتاب النبی ﷺ إلی كسرىٰ و قيصر : ٤٤٢٥]

❷ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ ......: اس آیت کی تشریح وہ حدیث کرتی ہے جس میں نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''بہترین بیوی وہ ہے جسے اگر تم دیکھو تو تمھیں خوش کرے، اگر تم اسے کسی بات کا حکم دو تو وہ تمھاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو تمھارے پیچھے وہ تمھارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾ [مسند أبی داؤد الطيالسی : ٢٤٤٤۔ ابن جرير : ٤/ ٦٢، و صححه صاحب هداية المستنير]

❸ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ : یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ نے خاوندوں کو عورتوں کے ساتھ حسن معاشرت کا حکم دے کر ان کے حقوق محفوظ کر دیے ہیں، اس کے بدلے میں وہ خاوندوں کی غیر موجودگی میں ان کے مال اور عزت و آبرو کی حفاظت رکھتی ہیں۔ [دیکھیے نسائی، النکاح، باب أی النساء خير : ٣٢٣٣] یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ان کے مال و عزت اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں اور خیانت سے کام نہیں لیتیں۔ (شوکانی)

❹ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ ......: نشوز کا لفظی معنی ''اونچا ہونا، چڑھائی کرنا ہے'' اور عورت کے نشوز کا معنی ''خاوند سے بغض رکھنا اور اس کی اطاعت سے اپنے آپ کو اونچا سمجھنا ہے۔'' (مفردات) عورت پر مرد کا بہت بڑا حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ (اللہ کے سوا) کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔'' [ترمذی، الرضاع، باب ما جاء فی حق...... : ١١٥٩، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ۔ أبو داؤد : ٢١٤٠]

عورت نافرمانی کا رویہ اختیار کرے تو خاوند کو حالات کے مطابق تین چیزوں کا اختیار دیا گیا ہے، تینوں یکے بعد دیگرے اور اکٹھی بھی ہو سکتی ہیں، نصیحت کرنا، ایک ہی بستر میں رہ کر انھیں چھوڑنا اور انھیں مارنا۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض ناگزیر حالات میں مارنے کی اجازت دی، مگر فرمایا: ''چہرے پر مت مارو، اسے بدصورت نہ کہو اور اسے مت چھوڑو مگر گھر میں۔'' [أبو داؤد، النکاح، باب فی حق المرأة على زوجها : ٢١٤٢، عن حكيم بن معاوية رضی اللہ عنہ] اسی طرح ایسی مار سے بھی منع کیا جس سے سخت چوٹ

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَاۤ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾ وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا

اور اگر ان دونوں کے درمیان مخالفت سے ڈرو تو ایک منصف مرد کے گھر والوں سے اور ایک منصف عورت کے گھر والوں سے مقرر کرو، اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۳۵﴾ اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ

آ ئے۔ [مسلم، الحج، باب حجة النبی ﷺ : ۱۲۱۸، عن جابر رضی اللہ عنہ] اور فرمایا: ''تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو اس طرح نہ مارے جس طرح غلام کو مارتے ہیں، پھر دن کے آخر حصے میں اس سے جماع کرے گا۔'' [بخاری، النکاح، باب ما یکرہ من ضرب النساء : ۵۲۰۴]

⑤ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا : یعنی اگر وہ تمھاری مطیع ہو جائیں تو ان پر زیادتی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو، مثلاً طلاق دینا، تنگ کر کے خلع پر مجبور کرنا وغیرہ۔

آیت 35 وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا ...... : پہلے صرف عورت کی طرف سے نشوز کا ذکر تھا اب اگر دونوں کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا سلسلہ چل نکلے اور جدائی کا اندیشہ ہو تو حاکم کو چاہیے کہ میاں بیوی دونوں کی طرف ان کے خاندان کا ایک ایک سمجھدار آدمی بطور حکم (پنچ یا منصف) مقرر کر دیں، اگر وہ دونوں اصلاح کرانے میں مخلص ہوں گے تو اللہ تعالیٰ دونوں میں موافقت پیدا کر دے گا۔ اگر اصلاح کی کوئی صورت نہ بنے تو کیا انھیں علیحدگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے فرمایا کہ اگر میاں بیوی دونوں اسے صلح یا جدائی کا اختیار دیں کہ تم جو فیصلہ کرو ہمیں منظور ہو گا تو اسے علیحدگی کے فیصلے کا بھی اختیار ہے اور بعض نے فرمایا کہ اگر وہ حاکم جس نے اسے حکم مقرر کیا ہے اسے صلح یا جدائی دونوں کے فیصلے کا اختیار دیتا ہے تو اسے علیحدگی کے فیصلے کا اختیار ہے ورنہ نہیں۔ مگر جمہور علماء کا کہنا ہے کہ حکم مقرر کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حکم دونوں فریقوں کے معاملات کا جائزہ لے کر صلح یا تفریق کا جو فیصلہ کر دیں نافذ ہو گا۔ اس کے لیے میاں بیوی یا حاکم کے اسے الگ اختیار دینے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم میں زیادہ زور موافقت کرانے کی کوشش پر دیا گیا ہے۔

آیت 35 ① وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ : میاں بیوی کے معاملات کے بعد دوسرے حقوق والوں کے ساتھ احسان کا ذکر ہے، مگر ابتدا اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم اور شرک سے منع کرنے سے کی ہے، کیونکہ ہر کام کی ابتدا اس سے ہوتی ہے، جیسا کہ اس سورت کا موضوع عموماً عورتوں کے مسائل ہیں، مگر سورت کی ابتدا ﴿ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾ سے کی ہے۔ (ابن عاشور)

② وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا : یعنی کسی چیز کو کسی صورت میں اس کا شریک نہ بنانا۔ اس کا شریک نہ بنانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک و مختار تسلیم کیا جائے اور اس کی کسی صفت میں کسی زندہ یا مردہ مخلوق کو شریک قرار نہ دیا جائے، تمام مرادیں اور حاجات اسی سے مانگی جائیں کہ وہی عالم میں متصرف ہے، کوئی اور نہیں۔

③ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا : توحید کا حکم دینے کے بعد درجہ بدرجہ رشتہ داروں اور دوسرے لوگوں کے حقوق بیان فرمائے۔

وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّ بِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ﴿ۙ۳۶﴾

اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور قرابت والے کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت والے ہمسائے اور اجنبی ہمسائے اور پہلو کے ساتھی اور مسافر (کے ساتھ) اور (ان کے ساتھ بھی) جن کے مالک تمھارے دائیں ہاتھ بنے ہیں، یقیناً اللہ ایسے شخص سے محبت نہیں کرتا جو اکڑنے والا، شیخی مارنے والا ہو ﴿۳۶﴾

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اوّل حق اللہ تعالیٰ کا، پھر ماں باپ کا اور پھر ان سب کا درجہ بدرجہ۔'' (موضح) انسان کے عدم سے وجود میں آنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بعد ماں باپ بنتے ہیں، اس لیے ان کا حق پہلے رکھا۔

❶ وَ بِذِی الۡقُرۡبٰی: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور رشتے دار پر صدقہ، صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔'' [ترمذی، الزکاۃ، باب ما جاء فی الصدقة...... : ٦٥٨] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص پسند کرے کہ اس کے لیے اس کا رزق فراخ کیا جائے اور اس کے نشان قدم میں تاخیر کی جائے تو چاہیے کہ وہ اپنی رشتے داری کو ملائے۔'' [مسلم، البر والصلة، باب صلة الرحم...... : ٢٥٥٧/٢١]

❷ وَ الۡیَتٰمٰی: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔'' آپ نے اپنی شہادت کی اور درمیانی انگلی کو ملا کر بتایا۔ [بخاری، الأدب، باب فضل من یعول یتیمًا : ٦٠٠٥، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ]

❸ مسکین کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ کی آیت (۶۰)۔

❹ وَ الۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ: قرابت والے ہمسائے سے مراد رشتے دار ہمسایہ ہے اور اجنبی ہمسائے سے مراد غیر رشتے دار ہمسایہ ہے۔ ہمسائیگی کے حقوق کی نگہداشت میں متعدد احادیث وارد ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جبریل علیہ السلام مجھے ہمیشہ پڑوسی کے متعلق وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ پڑوسی کو وارث قرار دے دیں گے۔'' [بخاری، الأدب، باب الوصاة بالجار : ٦٠١٥، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] اور رسول اللہ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: ''اللہ کی قسم! وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا۔'' صحابہ نے پوچھا: ''کون شخص؟'' فرمایا: ''وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ بے خوف نہ ہو۔'' [بخاری، الأدب، باب إثم من لا یأمن جارہ بوائقه : ٦٠١٦، عن أبی شریح رضی اللہ عنہ]

❺ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ: پہلو کے ساتھی سے ہم نشین دوست، سفر کا ساتھی، بیوی، علم سیکھنے کے لیے آنے والے یا کاروباری سلسلے میں پاس آ بیٹھنے والے سب مراد ہیں۔

❻ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ: مسافر سے مراد اکثر سلف کے نزدیک مہمان بھی ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام (عزت افزائی) کرے۔'' [بخاری، الأدب، باب من کان یؤمن...... : ٦٠١٩، عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ]

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور اسے چھپاتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۳۷﴾ اور وہ لوگ جو اپنے اموال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نہ یوم آخرت پر، اور وہ شخص کہ شیطان اس کا ساتھی ہو تو وہ برا ساتھی ہے ﴿۳۸﴾

(۱۰) وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ : اس سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں، کیونکہ وہ ملکیت میں ہونے کی وجہ سے بالکل ہی بے بس ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت کرتے ہوئے فرمایا: ''نماز اور تمھارے غلام (ان دونوں کا خاص خیال رکھنا)۔'' [أبو داوٗد، الأدب، باب في حق المملوك : ٥١٥٦، عن علي رضی اللہ عنہ] آج کل اگرچہ کفار نے زنا پھیلانے اور دوسرے مذموم مقاصد کے لیے غلامی کو ختم کر دیا ہے اور جنگوں میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو غلامی کی صورت میں ایک ایک آدمی کی ملکیت میں دینے کے بجائے کیمپوں میں رکھ کر ان پر فوجیوں کے ظلم و جبر اور آبروریزی کا دروازہ کھولا ہے، پھر نہ ان بیچاریوں کا کوئی غم خوار یا ذمہ دار ہوتا ہے نہ ان کی اولاد کا کوئی باپ، جب کہ غلامی کی صورت میں وہ ایک مالک کی غلامی میں رہ کر اس کی اولاد کی ماں بن کر عزت حاصل کرتی ہیں۔ مگر اس آیت پر عمل کرنے کے لیے آدمی کے ماتحت افراد جو اگرچہ غلام نہیں، حسن سلوک کے حق دار ہیں، مثلاً گھر، دکان اور کارخانوں کے ملازم اور نوکر چاکر وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کو اتنا ہی گناہ کافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو ضائع کرے جن کی خوراک کا وہ ذمے دار ہے۔'' [مسلم، الزکوٰۃ، باب فضل النفقة...... : ٩٩٦، عن ابن عمرو رضی اللہ عنہما]

(۱۱) مُخْتَالًا فَخُوْرًا: ''مُخْتَالًا'' جو خرچ کرنے سے پہلے متکبر ہو اور ''فَخُوْرًا'' جو خرچ کرنے کے بعد فخر کرے۔ معلوم ہوا متکبر اور فخر کرنے والا نام و نمود کے لیے خرچ کرے گا، مگر اللہ کی خاطر خرچ نہیں کر سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت نہیں رکھتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اکڑنے والے، شیخی باز بخیل ہوتے ہیں، کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے کہ اس پر خرچ کریں۔ حقیقی سخی متواضع ہوتے ہیں۔ جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔'' تو آپ نے (چند اہم امور کا تذکرہ کرنے کے بعد) فرمایا: ''تہ بند کو نیچے نہ لٹکاؤ، کیونکہ تہ بند کا (ٹخنوں سے نیچے) لٹکانا تکبر کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔'' [أحمد : ٥/ ٦٤، ح : ٢٠٦٦٣]

آیت 37 اس آیت میں بخل کی مذمت کی گئی ہے اور بخیل کے لیے کافر کا لفظ استعمال کیا ہے، کیونکہ کافر کا معنی چھپانے والا ہے اور بخیل بھی اللہ کی نعمت کو چھپانے والا ہوتا ہے۔ بعض سلف نے اس آیت میں بخل کے لفظ کو یہود یوں کے بخل پر محمول کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی صفات اور علامات کو لوگوں سے چھپاتے تھے۔ غرض بخل مال کا ہو یا علم کا شدید مذموم ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 38 بخیلوں کی مذمت کے بعد اب ریا کاری سے خرچ کرنے والوں کی مذمت کی جا رہی ہے اور انھیں شیطان کا

وَ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ
عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ
اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

اور ان پر کیا آفت آ جاتی اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لے آتے اور اس میں سے خرچ کرتے جو انھیں اللہ نے دیا ہے اور اللہ ہمیشہ سے انھیں خوب جاننے والا ہے ﴿۳۹﴾ بے شک اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دوگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا ﴿۴۰﴾ پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور تجھے ان لوگوں پر گواہ لائیں گے ﴿۴۱﴾

ساتھی قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین آدمیوں کو سب سے پہلے آگ میں جھونکا جائے گا اور وہ ہیں: ① ریا کار عالم ② ریا کار مجاہد ③ اور ریا کار سخی۔“ [مسلم، الإمارة، باب من قاتل للرياء...... : ۱۹۰۵] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”مال دینے میں بخل کرنا جیسا اللہ کے نزدیک برا ہے ویسا ہی خلق کے دکھانے کو دینا۔ قبول وہ ہے جو ان حق داروں کو دے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور پھر اللہ کے یقین اور آخرت کی توقع سے دے۔“ (موضح)

آیت 40،39 بخل اور ریا کاری کی مذمت کے بعد ایمان و طاعت اور صدقہ و خیرات کی ترغیب دلائی، پھر مزید ترغیب کے لیے فرمایا کہ جب ذرا ذرا سی چیز کا اللہ تعالیٰ کئی گنا اجر دیتے ہیں، پھر لوگ کیوں نیک کاموں میں سستی کرتے اور ریا کاری سے کام لے کر اپنے اجر کو ضائع کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بندوں کو خبر دی ہے کہ وہ کسی پر ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرے گا، بلکہ ایک نیکی ہوگی تو اسے بھی بڑھا چڑھا کر اپنے پاس سے اجر عظیم دے کر نجات کا باعث بنا دے گا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک طویل حدیث) میں فرمایا: ”اللہ تعالیٰ (فرشتوں سے) فرمائے گا، تم جاؤ اور جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی خیر (یعنی ایمان) کو پاؤ اسے بھی جہنم سے نکال لاؤ، چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکال لائیں گے۔“ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد ابو سعید رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”اگر تم مجھے اس حدیث میں سچا نہ جانو تو یہ آیت پڑھو: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا﴾ [مسلم، الإيمان، باب معرفة طريق الرؤية : ۱۸۳] بے شک اللہ ایک ذرے کے برابر ظلم نہیں کرتا اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسے دگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا، یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے قسم کھائی ہے۔

آیت 41 اوپر کی آیتوں میں قیامت کے دن ظلم کی نفی اور کئی گنا اجر کا وعدہ فرمایا، اب یہاں بیان فرمایا جا رہا ہے کہ اچھا یا برا بدلہ پیغمبروں یا ان لوگوں کی گواہی سے ملے گا جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام اپنی مخلوق تک پہنچایا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۳) اور رسول اللہ ﷺ اپنی امت پر اور پہلی امتوں پر دین پہنچانے کی گواہی دیں گے۔

يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَ لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ
حَدِيْثًا ۟ع (۴۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ

اس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، چاہیں گے کاش! ان پر زمین برابر کر دی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے (۴۲) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو، یہاں تک کہ تم جانو جو کچھ کہتے ہو اور نہ اس حال میں کہ جنبی ہو، مگر راستہ عبور کرنے والے، یہاں تک کہ غسل کر

آیت 42 ❶ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ......: اس سے مقصود کفار کو وعید سنانا ہے جو اس موقع پر آرزو کریں گے کہ کاش! ہم انسان نہ ہوتے بلکہ زمین میں مل کر خاک ہو جاتے۔ دیکھیے سورۂ نبا کی آخری آیت۔ (ابن کثیر)

❷ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: کفار کے متعلق قرآن میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شرک سے انکار کر دیں گے کہ ہم نے شرک کیا ہی نہیں۔ (انعام: ۲۳) مگر یہ آیت اس کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ وہ پہلے واقعی شرک کرنے سے انکار کریں گے مگر جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے (حٰمٓ السجدۃ: ۲۱ تا ۲۳) تو پھر وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپا نہ سکیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''قیامت کا دن بہت لمبا دن ہے، کسی موقع پر وہ انکار کریں گے اور دوسرے موقع پر اپنے شرک اور بد اعمالی پر افسوس کریں گے۔'' (رازی، ابن کثیر)

آیت 43 ❶ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى......: شراب کی مذمت اور قباحت کے سلسلے میں سب سے پہلے سورۂ بقرہ کی آیت (۲۱۹) نازل ہوئی، جس میں شراب اور جوئے کے گناہ کو ان کے نفع سے بڑا قرار دیا، اس پر بہت سے مسلمانوں نے شراب چھوڑ دی، تاہم بعض بدستور پیتے رہے کہ ہم اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا پکایا، پھر ہمیں بلایا اور ہمیں شراب پلائی، شراب نے ہمیں مدہوش کر دیا، اتنے میں نماز کا وقت آ گیا اور انھوں نے مجھے امام بنا دیا، میں نے پڑھا: ''قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ، وَ نَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' ''کہہ دے اے کافرو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو اور ہم اس کی عبادت کرتے ہیں جس کی تم عبادت کرتے ہو'' (ظاہر ہے اس سے آیت کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورۃ النساء: ۳۰۲۶، وقال حسن صحیح غریب] اس پر لوگوں نے نماز کے اوقات میں شراب ترک کر دی، یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کی آیات (۹۰، ۹۱) نازل ہوئیں، جس سے شراب قطعی طور پر حرام کر دی گئی۔ (ابن کثیر) بعض علماء نے یہاں ''وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى'' (جمع سکران) سے نیند کا غلبہ مراد لیا ہے اور اس کے مناسب صحیح بخاری کی وہ حدیث ذکر کی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کی حالت میں نماز سے منع فرمایا کہ معلوم نہیں کیا پڑھے اور کیا نہ پڑھے، مگر صحیح یہ ہے کہ اس سے شراب کا نشہ مراد ہے اور یہی جمہور صحابہ و تابعین کا قول ہے،

مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر کوئی پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر ملو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا، بے حد بخشنے والا ہے ﴿۴۳﴾

تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت شراب نوشی سے متعلق نازل ہوئی۔

2 وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ : بعض مفسرین نے اس سے مراد سفر لیا ہے مگر سفر کا ذکر (اَوْ عَلٰى سَفَرٍ) آگے آ رہا ہے اس تفسیر کی بنا پر سفر کے ذکر میں تکرار لازم آتا ہے، اس لیے اکثر سلف نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ "الصَّلٰوةَ" سے مراد نماز کی جگہ یعنی مسجد ہے، مطلب یہ ہے کہ جنابت کی حالت میں "الصَّلٰوةَ" یعنی نماز کی جگہوں (مسجدوں) میں نہ جاؤ۔ ہاں، اگر مسجد سے گزرنا پڑے تو مجبوری کی صورت میں گزر سکتے ہو (ٹھہر نہیں سکتے)۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسے راجح قرار دیا ہے، پس یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی " لَا تَقْرَبُوْا مَوَاضِعَ الصَّلَاةِ " (طبری) اور یہی جمہور علماء کا مسلک ہے کہ جنبی یا حائضہ کے لیے مسجد سے گزرنا جائز ہے، ٹھہرنا جائز نہیں، کیونکہ بہت سے صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، ان کے لیے غسل کر کے گزرنا مشکل تھا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مگر آخر میں رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دریچے کے سوا مسجد میں کھلنے والے تمام دریچے بند کروا دیے۔ [بخاری، الصلاۃ، باب الخوخۃ ...... : ٤٦٧، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما] بعض لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کا دروازہ کھلا رکھنے کی روایت بھی بیان کی ہے، مگر اہل علم نے اسے ضعیف کہا ہے۔ (ابن کثیر) خلاصہ یہ کہ مراد اس سے یہ ہے کہ جنبی مسجد سے گزر سکتا ہے، ٹھہر نہیں سکتا۔ گویا آیت کے دو حصے ہیں، پہلے حصے: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ اس میں "الصَّلٰوةَ" سے مراد نماز ہی ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ اور دوسرے حصے: ﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا﴾ میں "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ" سے مراد نماز کی جگہ ہے، یعنی اس جنبی ہونے کی حالت میں مسجد کے قریب نہ جاؤ، الا یہ کہ راستہ عبور کر کے گزر جانے والے ہو۔ (طنطاوی)

3 وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ ...... : سفر سے مراد مطلق سفر ہے، اکثر علماء کے نزدیک تیمم کے جواز کے لیے اتنے سفر کی کوئی شرط نہیں جس میں نماز قصر پڑھی جا سکتی ہے۔ "یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو" کے تحت ہر وہ چیز آ جاتی ہے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ عورتوں کو چھونے یا مباشرت سے مراد (راجح مسلک کی بنا پر) جماع ہے، ورنہ صرف چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں گھر میں لیٹی ہوتی، آپ ﷺ نفل نماز پڑھتے تو سجدہ کے وقت آپ ﷺ اپنے ہاتھ سے میرے پاؤں سامنے سے ہٹا دیتے۔ [بخاری، الصلوۃ، باب التطوع خلف المرأۃ : ٥١٣، ٥١٤۔ مسلم : ٥١٢] "اَوْ عَلٰى سَفَرٍ" کا مقصد ہے کہ سفر میں پینے کے لیے تو پانی ہے مگر وضو یا غسل کے لیے نہیں۔ بیماری کا مطلب یہ ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿٤٤﴾ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ٝ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿٤٥﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ گمراہی کو خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم راستے سے بھٹک جاؤ ﴿۴۴﴾ اور اللہ تمھارے دشمنوں کو زیادہ جاننے والا ہے اور اللہ کافی دوست ہے اور اللہ کافی مددگار ہے ﴿۴۵﴾

پانی کے استعمال سے بیمار ہونے یا بیماری بڑھنے کا خطرہ ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ایک سرد رات میں احتلام ہوگیا، انھوں نے تیمم کر لیا اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴾ [النساء : ۲۹] ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ [بخاری، التیمم، باب إذا خاف الجنب علی نفسه المرض...... قبل ح : ۳۴۵، تعلیقاً]

④ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً: پانی نہ پانے میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ پانی میسر ہی نہ ہو اور یہ بھی کہ بیماری یا عذر کی بنا پر پانی استعمال نہ کیا جا سکے۔

⑤ فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا...... : تیمم کا معنی ہے قصد کرنا۔ ''صَعِيْدًا طَيِّبًا'' سے مراد پاک مٹی ہے، خواہ کپڑے، کاغذ یا کسی جگہ کی گرد سے حاصل ہو جائے۔ اس کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمیں تین باتوں میں لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے، جن میں سے ایک یہ ہے: ((وَ جُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ)) ''جب ہمیں پانی نہ ملے تو زمین کی مٹی ہمارے لیے پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے۔'' [مسلم، المساجد، باب المساجد ومواضع الصلوة : ۵۲۲] تیمم خواہ وضو کے لیے ہو یا غسل کے لیے، دونوں کا ایک ہی طریقہ ہے، صرف نیت مختلف ہوگی۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک جہادی سفر میں انھیں احتلام ہوگیا تو انھوں نے زمین پر لوٹ پوٹ ہو کر نماز پڑھ لی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمھیں اتنا ہی کافی تھا۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا، پھر ان میں پھونک مار کر انھیں اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں پر مل لیا۔ [بخاری، التیمم، باب المتیمم هل ینفخ فیهما ؟ : ۳۳۸]

اس سے معلوم ہوا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا تیمم کا طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک دفعہ زمین پر ہاتھ مار کر اس میں پھونک مار کر چہرے اور ہتھیلیوں پر مل لیا جائے۔ بعض احادیث میں دو دفعہ زمین پر ہاتھ مارنے کا اور کہنیوں تک ملنے کا ذکر ہے، مگر وہ احادیث یا تو صحابہ کا اجتہاد ہیں یا کمزور ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ترین حدیث وہی ہے جو عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے آئی ہے۔

آیت 45،44 ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا: اس سے پہلے ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ﴾ میں مشرکین کے طرزِ عمل سے متنبہ کرنے کے بعد درمیان میں ضرورت کے کچھ مسائل، مثلاً شراب، نماز اور تیمم وغیرہ ذکر کرنے کے بعد یہود کے فریب اور ان کی دشمنی کا ذکر تفصیل سے شروع ہوگیا ہے۔ یہود کو تیمم میں بھی مسلمانوں سے حسد تھا۔ اسی حسد

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

وہ لوگ جو یہودی بن گئے، ان میں سے کچھ لوگ بات کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور کہتے ہیں **سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا** (ہم نے سنا اور نہیں مانا) اور **اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ** (سن اس حال میں کہ تجھے نہ سنایا جائے) اور **رَاعِنَا** (ہماری رعایت کر) (یہ الفاظ) اپنی زبانوں کو پیچ دیتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے (کہتے ہیں) اور اگر بے شک وہ **سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا** (ہم نے سنا اور مانا) اور **اسْمَعْ وَانْظُرْنَا** (سن اور ہماری طرف دیکھ) کہتے تو یقیناً ان کے لیے بہتر اور زیادہ درست ہوتا اور لیکن اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی، پس وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم ﴿۴۶﴾

کی بنا پر وہ خود مسلمان ہونے کے بجائے چاہتے تھے کہ مسلمان بھی کافر ہو جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ﴾ [البقرۃ : ۱۰۹] ''بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں کہ کاش! وہ تمھیں تمھارے ایمان کے بعد پھر کافر بنا دیں، اپنے دلوں کے حسد کی وجہ سے۔''

❷ **نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ**: یعنی انھیں کتاب کا کچھ حصہ ہی ملا ہے، باقی ضائع کر بیٹھے ہیں اور یہ بھی مراد ہے کہ جو حصہ ملا ہے اس کے الفاظ ملے ہیں، عمل کا حصہ عطا نہیں ہوا اور یہ بھی کہ تورات میں انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی نبوت تو معلوم کر لی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت معلوم نہ کر سکے۔

آیت 46 ❶ **مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ**......: اوپر کی آیت میں فرمایا کہ وہ گمراہی مول لیتے ہیں، اب اس آیت میں چند امور کے ساتھ اس گمراہی کی تشریح فرمائی۔ یعنی وہ تورات کے احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۳، ۱۴)۔ سورۂ مائدہ میں ''**عَنْ مَّوَاضِعِهٖ**'' کے علاوہ ''**مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ**'' بھی ہے، جس کا معنی تحریفِ لفظی ہے، یہاں ''**عَنْ مَّوَاضِعِهٖ**'' ہے، اس سے مراد تحریفِ معنوی ہے، یعنی تاویلاتِ فاسدہ سے کام لیتے ہیں، مثلاً قصۂ ذبیح کا تعلق اسماعیل علیہ السلام کے بجائے اسحاق علیہ السلام کے ساتھ جوڑنا۔ (رازی، شوکانی) ہمارے زمانے میں بھی تمام بدعتیوں کا شیوہ ہو گیا ہے کہ جو آیت یا حدیث امام، مجتہد یا پیر و مرشد کے قول کے خلاف نظر آتی ہے، اس کی تاویل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے حیا نہیں کرتے کہ پیر و مرشد اور امام و مجتہد تو معصوم نہ تھے، بخلاف پیغمبر کے کہ خطا سے ان کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ فرماتا تھا۔ (وحیدی)

❷ **لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ**: ''**لَيًّا**'' یہ ''لَوَى يَلْوِيْ لَيًّا'' سے ہے، بمعنی توڑنا مروڑنا، یعنی زبان کو توڑ مروڑ کر ''رَاعِنَا'' کہتے، جو توہین کا کلمہ ہے۔ دیکھیے بقرہ (۱۰۴) ان کی ایک گمراہی یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم سنتے ہیں تو ظاہر میں ''**سَمِعْنَا**'' کہتے ہیں (یعنی ہم نے سنا) مگر ساتھ ہی بے حد عداوت کی وجہ سے ''**عَصَيْنَا**'' (نہیں مانا) بھی کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات کرتے تو کہتے ''**اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ**'' (سنو، تمھیں کوئی نہ سنائے) ظاہر میں یہ نیک دعا ہے کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

اے لوگو جنھیں کتاب دی گئی ہے! اس پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا ہے، اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمھارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں، پھر انھیں ان کی پیٹھوں پر پھیر دیں، یا ان پر لعنت کریں، جس طرح ہم نے ہفتے کے دن والوں پر لعنت کی تھی اور اللہ کا حکم ہمیشہ (پورا) کیا ہوا ہے ﴿۴۷﴾

تم ہمیشہ غالب رہو، کوئی تمھیں بری بات نہ سنا سکے اور دل میں نیت رکھتے کہ تو بہرا ہو جائے، سن نہ سکے، ایسی شرارت کرتے۔ (رازی، ابن کثیر)

③ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ: یعنی یہ سب حرکتیں کر رہے ہیں اور پھر دین میں طعن کی غرض سے کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب معلوم کر لیتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے خبث باطن کو ظاہر فرما دیا اور وہی طعن الٹا رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی پختہ دلیل بن گیا۔ (رازی)

④ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ...... : یعنی یہ اگر اس قسم کی حرکات اور طعن کے بجائے ایسے کلمات استعمال کرتے جن میں شرارت کی آمیزش نہیں ہو سکتی اور اخلاص سے پیش آتے، مثلاً "عَصَيْنَا" کے بجائے "اَطَعْنَا" اور "غَيْرَ مُسْمَعٍ" کے بجائے صرف "اسْمَعْ" اور "رَاعِنَا" کے بجائے "انْظُرْنَا" تو ان کے حق میں بہتر ہوتا، مگر افسوس کہ یہ بہت ہی تھوڑے احکام پر ایمان رکھتے ہیں۔ پس "قَلِيْلًا" یہاں مصدر محذوف "إِيْمَانًا" کی صفت ہے اور یہ معنی بھی ہے کہ ان میں سے بہت ہی کم لوگ ایمان لاتے ہیں، حتیٰ کہ یہودیوں میں سے دس بھی بمشکل ایمان لائے ہوں گے۔

آیت 47 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : یہود کی شرارتوں کو بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں انھیں ایمان کی دعوت دی اور ہٹ دھرمی سے احکام خداوندی بجا نہ لانے پر وعید سنائی، کیونکہ یہود عالم تھے اور علم و معرفت کے باوجود ہٹ دھرمی سے کام لے رہے تھے۔ (رازی) اس وعید کا تعلق یا تو قیامت کے دن سے ہے، یا دنیا میں چہروں کو مسخ کر دینا مراد ہے اور اصحاب سبت جیسی لعنت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ان کو بندر اور خنزیر بنا دیا تھا، تمھیں بھی ویسا ہی بنا دیا جائے۔ اصحاب سبت کے قصہ کے لیے دیکھیے سورۂ اعراف (۱۶۳)۔ اس وقت یہودی ہوں یا نصرانی یا مسلمان سب رسول اللہ ﷺ کی امت ہیں، کلمہ پڑھنے والے امت اجابت، یعنی قبول کر لینے والے ہیں اور دوسرے امت دعوت، یعنی جو آپ کی دعوت کے مخاطب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ((بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَسْخٌ وَ خَسْفٌ وَ قَذْفٌ)) [ابن ماجه، الفتن، باب الخسوف : ۴۰۵۹، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ۔ صحیح الجامع للألبانی : ۲۸۵۶] "قیامت سے پہلے شکلوں کے بدل جانے، زمین میں دھنس جانے اور پتھروں کی بارش کے واقعات رونما ہوں گے۔" اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((سَيَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ خَسْفٌ وَ قَذْفٌ وَ مَسْخٌ، قِيْلَ وَ مَتٰى ذٰلِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !؟ قَالَ إِذَا ظَهَرَتِ الْمَعَازِفُ وَ الْقَيْنَاتُ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے اور جو اللہ کا شریک بنائے تو یقیناً اس نے بہت بڑا گناہ گھڑا ﴿۴۸﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک کہتے ہیں، بلکہ اللہ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ان پر ایک دھاگے کے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۴۹﴾

اسْتُحِلَّتِ الْخَمْرُ)) [المعجم الكبير : ۶/ ۱۵۰، ح : ۵۸۱۰۔ صحيح الجامع للألباني : ۳۶۶۵] ''آخر زمانے میں زمین میں دھنسنا، پتھروں کی بارش اور شکلوں کا بدل جانا واقع ہوگا۔'' پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول! یہ کب ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب باجے گاجے اور گانے والیاں عام ہو جائیں گی اور شراب حلال کر لی جائے گی۔'' اب بھی اہل کتاب اور ان کی روش پر چلنے والے مسلمانوں کو ان عذابوں سے ڈر کر توبہ کرنی چاہیے۔

آیت 48 ① اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ ...... : یہود کو وعید اور ڈانٹ سنانے کے بعد اب اس آیت میں اشارہ فرمایا کہ یہ وعید ایمان نہ لانے اور کفر و شرک کی وجہ سے ہے، ورنہ دوسرے گناہ تو قابل معافی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت ہیں، جسے اللہ چاہے گا معاف فرما دے گا، جسے چاہے گا سزا دے کر چھوڑ دے گا، مگر شرک کی معافی نہیں، کیونکہ مشرک پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۷۲) یہود و نصاریٰ کی طرح نام کے مسلمان، جو ایسے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے انسان ملتِ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، جو مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارتے، اٹھتے بیٹھتے ان کے نام کا وظیفہ کرتے ہیں، ان کے نام کا روزہ رکھتے، ان کی قبروں کو پوجتے، ان کے نام پر جانور ذبح کرتے اور ان کی منتیں مانتے ہیں، وہ بھی اس وعید کے مصداق ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ حج (۳۱)، سورۂ لقمان (۱۳)، سورۂ انعام (۸۸)، سورۂ زمر (۶۵) اور سورۂ نساء (۱۱۶)۔

② فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا: اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا بھی کوئی شریک ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔''

آیت 49 ''فَتِيْلًا'' اس پتلے دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے کٹاؤ میں نظر آتا ہے۔ یہ محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ (طبری) یہود اپنے آپ کو پاک باز اور مقدس کہتے، کبھی کہتے جنت میں ہم ہی جائیں گے: ﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ [البقرة : ۱۱۱] ''جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی ہوں یا نصاریٰ۔'' کبھی اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب بتاتے۔ (دیکھیے مائدہ: ۱۸) اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ کسی کو پاک باز قرار دینا تو اللہ کا کام ہے، اپنی تعریف آپ کرنا انسان کے لیے مہلک ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ
اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ
اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

دیکھ وہ اللہ پر کس طرح جھوٹ باندھتے ہیں اور صریح گناہ گار ہونے کے لیے یہی کافی ہے ﴿۵۰﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں ﴿۵۱﴾ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے پھر تو کوئی اس کی مدد کرنے والا ہرگز نہ پائے گا ﴿۵۲﴾

﴿ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ [النجم : ۳۲] ''اپنے آپ کو پاک مت قرار دو، وہ زیادہ جانتا ہے کون متقی ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ایک دوسرے کی تعریف سے بھی، خصوصاً جب کوئی سامنے ہو یا مبالغہ کے ساتھ ہو منع فرمایا۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا: ((أَنْ نَحْثِيَ فِيْ وُجُوْهِ الْمَدَّاحِيْنَ التُّرَابَ)) [مسلم، الزهد، باب النهي عن المدح...... : ۳۰۰۲] ''ہم زیادہ تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دیں۔'' اور فرمایا: ((إِيَّاكُمْ وَالتَّمَادُحَ فَإِنَّهُ ذَبْحٌ)) [ابن ماجه، الأدب، باب المدح : ۳۷۴۳] ''باہمی مدح گوئی سے بچو کیونکہ یہ ذبح کرنا ہے۔'' ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دوسرے کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَيْحَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ)) ''تجھ پر افسوس! تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی۔'' پھر فرمایا: ''اگر تم میں سے کسی کو کسی کی لامحالہ تعریف کرنی ہے تو اس طرح کہا کرے کہ میں اسے اس طرح گمان کرتا ہوں، اللہ کے سامنے کسی کا تزکیہ نہ کرے (پاک قرار نہ دے)۔'' [بخاري، الأدب، باب ما يكره من التمادح : ۶۰۶۱]

آیت 50 وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا: یعنی ان کے یہ جھوٹے دعوے اور اللہ تعالیٰ پر افترا ہی ان کے سخت گناہ گار ہونے کے لیے کافی ہے۔

آیت 52،51 ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ...... : عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جبت سے مراد جادو اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔'' [بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿و إن كنتم مرضى أو على سفر﴾ قبل ح : ۴۵۸۳، معلقاً] جوہری نے الصحاح میں فرمایا: ''جبت کا لفظ بت، کاہن، جادوگر اور اس قسم کی دوسری چیزوں پر استعمال ہوتا ہے۔'' اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ پرندوں کو اڑا کر شگون لینا اور زمین پر لکیریں کھینچ کر فال گیری کرنا جبت میں شامل ہے۔ [أبو داود، الطب،

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

یا ان کے پاس سلطنت کا کچھ حصہ ہے؟ تو اس وقت تو وہ لوگوں کو کھجور کی گٹھلی کے نقطہ کے برابر نہ دیں گے ﴿۵۳﴾ یا وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، تو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور ہم نے انھیں بہت بڑی سلطنت عطا فرمائی ﴿۵۴﴾

باب في الخط وزجر الطير : ۳۹۰۷] اور طاغوت سے مراد شیطان ہے اور ہر وہ شخص جو گناہ کی دعوت دے اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ عرب میں بتوں کے ترجمان ہوتے تھے، جو ان کی زبان سے جھوٹ نقل کرتے اور لوگوں کو گمراہ کرتے، ان کو طاغوت کہا جاتا تھا۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۲)۔

2 یہودیوں کی رسول اللہ ﷺ سے مخالفت ہوئی تو انھوں نے مشرکین مکہ سے رابطہ قائم کر لیا اور ان سے کہنے لگے کہ تمھارا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے۔ یہ سب کچھ اس حسد کی وجہ سے تھا کہ نبوت اور ریاستِ دینی ہمارے سوا دوسروں کو کیوں مل گئی، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کو الزام دیا۔

آیت 53 اوپر کی آیت میں یہود کی جہالت بیان کی کہ وہ بتوں کی پوجا کو اللہ واحد کی عبادت پر ترجیح دیتے ہیں، اس آیت میں ان کے بخل اور حسد کو بیان فرمایا۔ بخل تو یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے کسی کو دی ہو دوسروں سے اسے روک لینا اور حسد یہ ہے کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو دی ہے، اس پر جلے بھنے اور آرزو کرے کہ اس سے چھن جائے، پھر خواہ مجھے ملے یا نہ ملے۔ پس حسد اور بخل دونوں میں یہ بات قدرے مشترک ہے کہ دوسروں سے نعمت کو روکنا اور یہ گوارا نہ کرنا کہ اپنی ذات کے سوا دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ (کبیر، قرطبی) یہود میں یہ دونوں صفتیں اتم اور اکمل طور پر پائی جاتی تھیں، قرآن نے بتایا کہ یہ مسلمانوں سے حسد کرتے ہیں اور ان کے بخل کا یہ حال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ملک و سلطنت میں ان کو کچھ اختیار ہوتا تو کسی کو "تل برابر" بھی نہ دیتے۔ "نَقِيْرًا" دراصل اس نقطے کو کہتے ہیں جو گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے اور یہ قلت میں ضرب المثل ہے۔

آیت 54 مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں مدت دراز تک نبوت اور بادشاہت رہی ہے اور داؤد و سلیمان علیہما السلام اور دوسرے اولوا العزم پیغمبر ہو گزرے ہیں، اب بنو اسماعیل میں سے رسول اللہ ﷺ کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرما دیا گیا ہے تو یہ کیوں حسد کر رہے ہیں؟! یہاں "مِنْ فَضْلِهٖ" سے مراد نبوت اور دین و دنیا کی وہ عزت ہے جو نبوت کی برکت سے حاصل ہوئی۔ "الْكِتٰبَ" سے مراد کتاب الٰہی اور "وَالْحِكْمَةَ" سے اس کا فہم اور اس پر عمل کرنا مراد ہے اور "مُلْكًا عَظِيْمًا" سے مراد سلطنت اور غلبہ و اقتدار ہے۔ (رازی، ابن کثیر)

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا
الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّ نُدْخِلُهُمْ
ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

پھر ان میں سے کوئی وہ ہے جو اس پر ایمان لے آیا اور کوئی وہ ہے جو اس سے منہ موڑ گیا اور جلانے کے لیے جہنم کافی ہے ﴿۵۵﴾ بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ہم انھیں عنقریب ایک سخت آگ میں جھونکیں گے، جب بھی ان کی کھالیں گل سڑ جائیں گی ہم انھیں ان کے علاوہ اور کھالیں بدل دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۵۶﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ہم انھیں عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہیں ہمیشہ ان کے لیے ان میں نہایت پاک صاف بیویاں ہوں گی اور ہم انھیں بہت گھنے سائے میں داخل کریں گے ﴿۵۷﴾

آیت 55 "اٰمَنَ بِهٖ" میں "بِهٖ" کی ضمیر "اِيْتَاءٌ" کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے جو "اٰتَيْنَاۤ" سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی بعض تو اس ایتائے انعام (انعام دینے) پر ایمان لے آئے اور بعض اس سے منہ موڑ گئے اور لوگوں کو بھی روکنے کی کوشش کی (صَدَّ عَنْهُ کے دونوں معنی ہیں، منہ موڑنا اور روکنا) لہٰذا آپ ان کے کفر سے دل گیر نہ ہوں۔ (ابن کثیر) اگر اس ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ کو مانا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب کچھ دیکھ لینے کے باوجود یہود میں سے کچھ لوگ تو آپ ﷺ پر ایمان لے آئے، لیکن اکثر نہ صرف خود ایمان نہیں لائے بلکہ جو ایمان لانا چاہتے ہیں انھیں بھی روکنا چاہتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا کے لیے جہنم کافی ہے۔ (فتح القدیر، کبیر)

آیت 56 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا...... : یہاں بتایا کہ یہ سزا اہل کتاب کے ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ سب کفار کو ملے گی۔ (رازی) ﴿بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ سے اہل جہنم کے عذاب کی سختی بیان کرنا مقصود ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اتنی تیز آگ میں ان کے چمڑے ایک ایک لمحے میں کتنی کتنی بار جل کر دوبارہ تبدیل ہوں گے، البتہ یہ تو صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جہنمیوں کا جسم بہت بڑھا دیا جائے گا، حدیث میں ہے: "کافر کے کان کی کونپل اور کندھے کے درمیان ستر سال کا فاصلہ ہو گا۔" [أحمد : ۲/۱۱۶، ۱۱۷، ح : ۲٤۹۰۹ و سنده صحيح۔ هداية المستنير] اور اسی طرح فرمایا: "کافر کی داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہو گی اور اس کی جلد کی موٹائی تین دن کے فاصلے کے برابر ہو گی۔" [مسلم، الجنة و صفة نعيمها و أهلها : ۲۸۵۱] اس طرح انھیں دائمی عذاب ہوتا رہے گا۔

آیت 57 ① وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ...... : قرآن پاک میں عموماً وعدہ اور وعید کو ایک ساتھ بیان فرمایا گیا ہے

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو، یقیناً اللہ تمھیں یہ بہت ہی اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۵۸﴾

اور اس اسلوب کی وجہ سے قرآن کو "كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا" فرمایا ہے اور وعظ و تذکیر کا یہ مؤثر ترین انداز ہے۔ بعض نے اس آیت سے سمجھا ہے کہ عمل صالح ایمان سے الگ چیز ہے، کیونکہ یہ دونوں عطف کے ساتھ آئے ہیں، مگر قرآن نے متعدد آیات میں عمل صالح پر زور دینے کے لیے عمل صالح کو الگ عطف کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ورنہ یہ بھی ایمان میں داخل ہے۔ (دیکھیے سورۂ عصر کی تفسیر) جنت کی نہروں کا بیان سورۂ محمد کی آیت (۱۵) میں دیکھیے "اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ" کے لیے سورۂ رحمٰن کا آخری حصہ اور سورۂ بقرہ کی آیت (۲۵) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

❷ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا: اسی سائے کو دوسری آیت میں "ظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ" فرمایا ہے۔ (دیکھیے سورۂ واقعہ : ۲۷ تا ۳۰) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں ایک درخت ایسا ہے جس کے سائے میں سوار سو برس تک چلے گا پھر بھی اسے طے نہ کر پائے گا۔" [بخاری، بدء الخلق، باب ما جاء فی صفة الجنة...... : ۳۲۵۱، عن أبی ھریرة رضی اللہ عنہ] ایک حدیث میں اس درخت کا نام "شجرة الخلد" آیا ہے۔[أحمد : ۲/ ۴۵۵، ح : ۹۸۸۳]

آیت 58 ❶ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا...... : درمیان میں کفار کے احوال اور ان کے حق میں وعید کا ذکر آ گیا تھا، اب دوبارہ سلسلۂ احکام شروع ہو رہا ہے۔ یہود امانت میں خیانت کرتے اور فیصلہ میں رشوت لے کر ظلم و جور کرتے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باتوں سے دور رہنے کا حکم دیا۔ یہاں امانت سے مراد گو ہر قسم کی امانت ہے، اس کا تعلق مذہب و دیانت سے ہو یا دنیاوی معاملات سے، لیکن یہود حق کو چھپا کر علمی امانت میں خیانت کے مرتکب بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ امانت میں خیانت اتنا [illegible] ہے کہ شہادت سے بھی معاف نہیں ہوتا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خیبر سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ وادیٔ القریٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو آپ ﷺ کا غلام "مدعم" آپ ﷺ کی اونٹنی سے پالان اتار رہا تھا کہ اسے ایک اندھا تیر لگا جس نے اسے قتل کر دیا، لوگوں نے کہا، اسے جنت مبارک ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ چادر جو اس نے خیبر کے دن غنیمتوں میں سے لی تھی، جو ابھی تقسیم نہیں ہوئی تھیں، اس پر آگ بن کر شعلے مار رہی ہے۔" [بخاری، المغازی، باب غزوة خیبر : ۴۲۳۴]

شہادت سے اس گناہ کے معاف نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگوں کے حقوق ہیں۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ
شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ
وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ ع ۵

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے ﴿۵۹﴾

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شہید کے لیے ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے سوائے قرض کے۔'' [مسلم، الإمارة، باب من قتل في سبيل الله...... ۱۸۸۵] البتہ ایک حدیث میں ایک بشارت ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص لوگوں کے اموال لے اور ان کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا اور جو شخص لوگوں کے اموال لے اور انھیں تلف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تلف کرے گا۔'' [بخاري، الاستقراض، باب من أخذ أموال الناس......: ۲۳۸۷] اس سے معلوم ہوا کہ اگر شہید ہونے والے کا ارادہ ادائیگی کا تھا تو اگر وارث ادا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے ادا کر دے گا، لیکن ظاہر ہے کہ خیانت والے کا تو یہ ارادہ ہوتا ہی نہیں۔ امانت میں لوگوں سے لی ہوئی امانتیں بھی شامل ہیں اور عہدوں اور مناصب کی تقسیم بھی، جب ذمہ دار شخص کو معلوم ہو کہ فلاں صاحب اس منصب کا اہل نہیں تو پھر اپنے ذاتی تعلق یا خاندانی یا کسی دنیوی مقصد کے لیے یا کوٹہ سسٹم کی وجہ سے اہل کو چھوڑ کر نااہل شخص کو وہ منصب دیا جائے تو یہ بہت بڑی خیانت ہے۔ سورۂ احزاب (۷۲)، سورۂ مومنون (۸) اور سورۂ بقرہ (۲۸۳) میں بھی امانت داری کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

② **وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ:** قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر عدل کی تاکید فرمائی، خواہ وہ اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۵) اور کسی دشمنی کی بنا پر عدل نہ کرنے سے بھی منع فرمایا۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۸)، سورۂ نحل (۹۰) اور سورۂ حجرات (۹) وہ سات خوش قسمت لوگ جنھیں روزِ قیامت عرش کا سایہ ملے گا، ان میں پہلا شخص عادل حکمران ہوگا۔ [بخاري، الأذان، باب من جلس في المسجد...... : ٦٦٠]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک انصاف کرنے والے جو اپنے فیصلے میں، اپنے اہل و عیال میں اور رعایا میں انصاف کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر ہوں گے، رحمان عزوجل کے دائیں طرف ہوں گے اور رحمان کے دونوں ہاتھ ہی دائیں ہیں۔'' [مسلم، الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل...... : ۱۸۲۷، عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً اللہ تعالیٰ قاضی اور حاکم کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کرے اور جب وہ ظلم کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔'' [ابن ماجه، الأحكام، باب التغليظ في الحيف والرشوة : ۲۳۱۲، عن عبد الله بن أوفى رضي الله عنهما وصححه الألباني]

آیت 59 ① **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ......:** اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رعایا کو، چاہے فوج کے افراد ہوں یا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَ يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا۔ چاہتے یہ ہیں کہ آپس کے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جائیں، حالانکہ انھیں حکم دیا گیا

تمام لوگ، انھیں اپنی، اپنے رسول ﷺ کی اور حکام و امراء کی اطاعت کا حکم دیا ہے، الا یہ کہ حکام اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اختیار والے بادشاہ، قاضی اور جو کسی کام پر مقرر ہو اس کے حکم پر چلنا ضروری ہے، جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف حکم نہ کرے، اگر صریح خلاف کرے تو وہ حکم نہ مانیے۔'' (موضح) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ)) ''اطاعت صرف نیکی کے امور میں ہے۔'' [بخاری، الأحکام، باب السمع والطاعة للإمام ...... : ۷۱٤٥، عن علی رضی اللہ عنہ]

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر مسلمان کو لازم ہے کہ وہ ہر کام میں، خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند، سمع و طاعت بجا لائے، بشرطیکہ اسے کسی معصیت کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اگر اسے کسی معصیت کے کام کا حکم دیا گیا ہو تو اس میں سمع و طاعت نہیں۔'' [بخاری، الأحکام، باب السمع والطاعة للإمام ...... : ۷۱٤٤]

❸ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ ...... : اس آیت میں ایک نہایت اہم حکم دیا ہے کہ باہمی نزاع اور جھگڑے کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع شرط ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو قرآن کی اطاعت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت آپ ﷺ کی زندگی کے بعد آپ کی سنت کی اطاعت ہے اور یہ اطاعتیں اصل اور مستقل ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی طرح رسول اللہ ﷺ کی حدیث بھی اسلامی قانون کا مستقل ماخذ ہے۔ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس آیت سے مقلدین تقلید کے واجب ہونے پر دلیل لیتے ہیں لیکن یہ دلیل نہیں ہو سکتی، کیونکہ ''اولی الامر'' سے بادشاہ اور حکام مراد ہیں۔ (دیکھیے فوائد موضح) اگر بعض اہل علم کے مطابق اس سے علمائے دین مراد ہیں تو اس میں اول تو کسی عالم کی تخصیص نہیں ہے، دوسرے بہ فرض تسلیم عالم کی تقلید کا حکم ہے تو وہ اسی وقت تک ہے کہ اس کا حکم قرآن و حدیث کے موافق ہو (اگرچہ یہ تقلید نہیں بلکہ قرآن و حدیث پر عمل ہے) پھر خود چاروں اماموں نے اپنی تقلید سے منع فرمایا ہے اور قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ ائمہ کی اتباع میں جھگڑا ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔'' (ترجمان) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ، تابعین یا ائمہ میں اگر کسی مسئلے پر نزاع ہو تو کسی کا قول بھی حجت نہیں، بلکہ وہاں صرف قرآن و حدیث پر عمل ہوگا۔

❹ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا: اگر دو مسلمان جھگڑتے ہیں اور ایک نے کہا، چل شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا، میں شرع کو (کچھ) نہیں سمجھتا یا مجھے شرع سے کام نہیں وہ بے شک کافر ہوا۔ (موضح)

آیت 61،60 اوپر کی آیات میں مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، یہاں فرمایا کہ

ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ
يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّ تَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ
قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ عِظْهُمْ وَ قُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴿۶۳﴾

ہے کہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں گمراہ کر دے، بہت دور گمراہ کرنا ﴿۶۰﴾ اور جب ان سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو تو منافقوں کو دیکھے گا کہ تجھ سے منہ موڑ لیتے ہیں، صاف منہ موڑنا ﴿۶۱﴾ پھر کیسے گزرتی ہے اس وقت جب انھیں کوئی مصیبت اس کی وجہ سے پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا، پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں کہ ہم نے تو بھلائی اور آپس میں ملانے کے سوا کچھ نہیں چاہا تھا ﴿۶۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، سو تو ان سے دھیان ہٹا لے اور انھیں نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں بہت اثر کرنے والی ہو ﴿۶۳﴾

منافق ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرتے ہیں اور کبھی آپ ﷺ کے فیصلے اور حکم پر راضی نہیں ہوتے، بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی مشرک سردار یا یہودی یا نصرانی عدالت یا کسی کاہن سے فیصلہ کروایا جائے، حالانکہ اسلام ان سب کے انکار کا حکم دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل نہ کرنے والی ہر عدالت کو طاغوت قرار دیتا ہے۔ مومن کا کام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ سننا اور ماننا ہے۔ (دیکھیے نور: ۵۱) اور منافقوں کا حال اس کے برعکس ہے (دیکھیے نور: ۴۸۔ لقمان: ۲۱) افسوس کہ اس وقت اکثر مسلمان ملکوں کی عدالتوں میں قرآن وسنت کا نظام عدل نافذ ہی نہیں، بلکہ کفار کے بنائے ہوئے قانون نافذ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک قرآن وسنت کا کوئی متبع حکمران کفار کے اس نظام کو بزور بازو نکال باہر نہیں کرتا اس وقت تک عدالتوں میں قرآن وسنت کی رسائی مشکل ہے۔

آیت 63،62 یعنی جب اپنے کرتوتوں کے سبب عتابِ الٰہی کا شکار ہو کر مصیبتوں میں پھنستے ہیں تو پھر آ کر کہتے ہیں کہ کسی دوسری جگہ جانے سے مقصد یہ نہیں تھا کہ وہاں سے ہم فیصلہ کروائیں گے، یا آپ سے زیادہ ہمیں وہاں سے انصاف ملے گا، بلکہ مقصد صلح اور ملاپ کرانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم ان کے دلوں کے بھیدوں سے واقف ہیں، جس پر ہم انھیں جزا دیں گے، لیکن اے پیغمبر! آپ ان کے ظاہر کو سامنے رکھتے ہوئے درگزر ہی فرمائیے اور وعظ ونصیحت اور قول بلیغ کے ذریعے سے ان کے باطن کی اصلاح کی کوشش جاری رکھیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے دشمنوں کی سازش کو عفو و درگزر، وعظ ونصیحت اور قول بلیغ ہی کے ذریعے سے ناکام بنانے کی سعی کی جانی چاہیے۔ یاد رہے! یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب منافق مغلوب تھے اور اسلام

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے اور اگر واقعی یہ لوگ، جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تیرے پاس آتے، پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول ان کے لیے بخشش مانگتا تو اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے ﴿۶۴﴾ پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں

اور اس کے احکام اور عدالتیں غالب تھیں اور منافق دوسرے لوگوں سے فیصلہ کرانے پر پشیمان ہو کر عذر معذرتیں کرتے تھے۔

آیت 64 ❶ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ...... : اطاعت رسول کی دوبارہ ترغیب دی ہے، یعنی اللہ کے رسول دنیا میں اس لیے آتے ہیں کہ تمام معاملات میں اللہ کے حکم کے مطابق ان کی اطاعت کی جائے۔ "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا معنی اللہ کی توفیق و اعانت بھی کیا گیا ہے، وہ بھی درست ہے، معلوم ہوا ہر رسول واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

❷ وَلَوْاَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا......: اپنی جان پر ظلم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس آنا اور آپ سے استغفار کروانا آپ کی زندگی کے ساتھ خاص تھا، آپ کی وفات کے بعد کسی صحابی سے ثابت نہیں کہ وہ آپ کی قبر مبارک پر آیا ہو اور آپ سے دعا کرنے کی درخواست کی ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں ایک بدوی کی حکایت نقل کی ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کے پاس آ کر یہ آیت پڑھتے ہوئے کچھ شعر پڑھے اور کہا کہ میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور آپ کو سفارشی بناتا ہوں، اس قبر انور کے پاس بیٹھنے والے ایک شخص نے کہا، خواب میں آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ہے: ''اس بدوی کو بخش دیا گیا ہے۔'' لیکن یہ ایک حکایت ہے جو آیت کی مناسبت سے ذکر کر دی گئی ہے، یہ نہ آیت کی تفسیر ہے نہ حدیث ہے۔ "الصارم المنکی (ص: ۲۳)" میں لکھا ہے کہ اس حکایت کی سند نہایت کمزور ہے اور نبی کے خواب کے علاوہ کسی کا خواب دین میں دلیل بھی نہیں بنتا۔ آیت سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں آپ سے دعائے مغفرت کروائی جا سکتی تھی، مگر آپ کی وفات کے بعد اس آیت کی رو سے قبر پر جا کر سفارش اور دعا کی درخواست کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

❸ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ : اللہ تعالیٰ کی بخشش حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ و استغفار ضروری اور کافی ہے، لیکن یہاں جو کہا گیا ہے کہ اے پیغمبر! وہ تیرے پاس آتے اور اللہ سے بخشش مانگتے اور تو بھی ان کے لیے مغفرت طلب کرتا، تو یہ اس لیے کہ چونکہ انھوں نے جھگڑے کے فیصلے کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کر کے آپ کی شان کے نامناسب حرکت کی تھی، اس لیے اس کے ازالے کے لیے انھیں آپ ﷺ کے پاس آنے کی تاکید فرمائی۔

آیت 65 ❶ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ......: اس آیت کی شان نزول میں ایک مسلمان اور یہودی کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے فیصلہ کروانے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ کروانے گیا تھا، جس پر عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسلمان کی گردن

يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی تنگی محسوس نہ کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کرلیں، پوری طرح تسلیم کرنا ﴿۶۵﴾

اڑا دی تھی۔ مگر یہ واقعہ سنداً صحیح نہیں ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی وضاحت کی ہے، رسول اللہ ﷺ صحابہ کے اصرار کے باوجود منافقوں کی بڑی بڑی گستاخیوں پر نہ انھیں قتل کرتے، نہ قتل کی اجازت دیتے اور وجہ یہ بتاتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ [مسلم، الزکوۃ، باب ذکر الخوارج : ۱۰۶۳]

❷ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری کے درمیان حرہ کی نالیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی زمین اوپر کی جانب تھی، جہاں سے پانی آتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ سے انصاری کے حق میں رعایت کی سفارش کی اور فرمایا: ''اپنے باغ کو پانی دے کر اپنے پڑوسی کے لیے چھوڑ دو۔'' اس پر انصاری نے کہا: ''یہ اس لیے کہ زبیر (رضی اللہ عنہ) آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ آپ نے اس رشتے کی رعایت کی ہے، اس پر آپ ﷺ کو تکلیف محسوس ہوئی اور فرمایا: ''زبیر! اپنے باغ کو اتنا پانی دو کہ منڈیروں تک چڑھ جائے، پھر اس کے لیے چھوڑ دو۔'' پہلے آپ نے انصاری کی سفارش کی تھی، اب جب اس نے آپ کو غصہ دلایا تو آپ نے سفارش کے بجائے فیصلہ کیا اور زبیر رضی اللہ عنہ کو ان کا پورا حق دلوایا۔ زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ آیت: ﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ اس بارے میں نازل ہوئی۔ [مسلم، الفضائل، باب وجوب اتباعه ﷺ : ۲۳۵۷۔ بخاری : ۴۵۸۵]

❸ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر مومن ہونے کی تین شرطیں بیان کی ہیں، پہلی یہ کہ کسی بھی جھگڑے کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کے پاس نہ لے جایا جائے۔ (دیکھیے نور : ۵۱۔ احزاب : ۳۶) دوسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر دل میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کی جائے اور تیسری یہ کہ صاف اعلان کر کے اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے۔ اب آپ ﷺ کی وفات کے بعد قرآن و سنت سے فیصلہ طلب کیا جائے گا۔ اس سے منکرین حدیث کے ایمان کی حقیقت پوری طرح کھل جاتی ہے۔ یہ آیت منکرین حدیث کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جن کے امام یا پیر کے خلاف کوئی آیت یا حدیث آ جائے تو وہ صرف دل میں تنگی ہی محسوس نہیں کرتے بلکہ ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ کیا ہمارے امام کو اس آیت و حدیث کا علم نہ تھا، یا پھر اس کی تاویل کرنے یا اسے منسوخ قرار دینے کے لیے اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت کے صریح الفاظ کے مطابق نبی ﷺ کے فیصلے کے خلاف دل میں ذرہ بھر تنگی یا ناپسندیدگی محسوس کی جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ
مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۙ﴿۶۶﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ
مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۶۷﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ

ور اگر ہم واقعی ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو، یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو وہ ایسا نہ کرتے مگر
ن میں سے تھوڑے اور اگر وہ واقعی اس پر عمل کرتے جو انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لیے بہتر اور زیادہ ثابت
م رکھنے والا ہوتا ﴿۶۶﴾ اور اس وقت ہم یقیناً انھیں اپنے پاس سے بہت بڑا اجر دیتے ﴿۶۷﴾ اور یقیناً ہم انھیں
یدھے راستے پر چلاتے ﴿۶۸﴾ اور جو اللہ اور رسول کی فرماں برداری کرے تو یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے

ت 66تا68 ① ان آیات کا تعلق بھی منافقین سے ہے، ان میں انھیں اخلاص اور ترک نفاق کی ترغیب دی گئی ہے۔ نی چاہیے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کیا جائے، (مگر یہ ایسے ہیں کہ) اگر کہیں ان کو اللہ عالیٰ اپنی جانیں ہلاک کر ڈالنے یا اپنے گھر چھوڑ دینے کا حکم دے دیتا تو یہ اسے کب بجا لانے والے تھے، جو حکم ہم نے انھیں یے ہیں وہ نہایت آسان اور محض ان کی خیر خواہی کے لیے ہیں، نصیحت مانیں اور ان احکام پر چلیں، نفاق جاتا رہے گا، ایمان ل نصیب ہوگا، اس کو غنیمت سمجھیں۔ (موضح)

ابن عاشور فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ تمہید ہے جہاد کے ان احکام کی جو ساتھ ہی شروع ہو رہے ہیں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ مَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا﴾ [النساء : ۷۱] اور ان آیات کے ساتھ مناسبت یہ بھی ہے کہ اگر ہم ن پر ہجرت یا قتال یعنی ﴿اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ فرض کر دیتے تو بہت کم لوگ اس پر عمل کرتے، کن اگر وہ ایسا کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور بے شمار اجر کا باعث ہوتا۔ یعنی ابھی تو ایمان کے اعلیٰ مدارج جو اسلام کی وہاں کی چوٹی ہیں، ان کا حکم بھی آنے والا ہے، کجا یہ کہ یہ لوگ فیصلے بھی کہیں اور سے کروانا چاہتے ہیں۔ [التحریر و التنویر]

ت 70،69 ① ” وَالصِّدِّيْقِيْنَ “ یہ صدق سے مبالغہ ہے، یعنی جو بہت سچا ہو۔ بعض نے کہا، جو کبھی جھوٹ نہ لے۔ بعض نے کہا، صدیق وہ ہے کہ صدق کی عادت کی وجہ سے اس سے جھوٹ ناممکن ہو اور بعض نے کہا کہ جو اپنے اعتقاد ر قول میں سچا ہو اور اپنے فعل کے ساتھ اپنے صدق کو ثابت کرے۔ (مفردات) استاد محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ صدیق دق سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی جو جملہ امور دین کی تصدیق کرنے والا ہو اور کبھی کسی معاملے میں خلجان اور شک اس کے ل میں پیدا نہ ہو، یا وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق میں سبقت کرنے کی وجہ سے دوسروں کے لیے اسوہ بنے، اس اعتبار ے اس امت کے صدیق ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دوسرے افاضل صحابہ کے لیے نمونہ بنے ہیں۔ ی رضی اللہ عنہ بھی اول مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں، مگر چھوٹے بچے ہونے کی وجہ سے دوسروں کے لیے نمونہ نہیں بن سکے۔ چونکہ

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ

وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾ ع ۱۱

جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں ﴿۶۹﴾ یہی اللہ کی طرف سے خاص فضل ہے اور اللہ کافی ہے سب کچھ جاننے والا ﴿۷۰﴾

نبی کے بعد صدیق کا درجہ ہے، اس لیے علمائے اہل سنت کا اجماع ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں۔ ”وَالشُّهَدَآءِ“ یہ شہید کی جمع ہے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جان دی اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شہداء ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ”وَالصّٰلِحِيْنَ“ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہر طرح عقیدہ وعمل کے اعتبار سے صالح اور درست رہے اور ہر قسم کے فساد سے محفوظ رہے۔ (رازی)

② مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ...... : یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے انعام کا ذکر ہے کہ انھیں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت، یعنی ان کا ساتھ نصیب ہو گا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا شوق بہت زیادہ تھا، دنیا میں بھی وہ اس کے بہت مشتاق تھے اور انھیں جنت میں آپ کی معیت کا شوق تو حد سے زیادہ تھا۔ ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات بسر کیا کرتا تھا اور آپ کے لیے پانی اور دیگر ضروریات کا اہتمام کر دیا کرتا تھا، ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کچھ مانگ لو!“ میں نے عرض کی: ”میں آپ سے جنت میں آپ کی مرافقت (ساتھ) کا سوال کرتا ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی اور سوال؟“ میں نے عرض کی: ”وہ بھی یہی ہے۔“ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر سجدوں کی کثرت کے ساتھ اپنے بارے میں میری مدد کرو۔“ [مسلم، الصلاۃ، باب فضل السجود والحث علیه : ۴۸۹] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خالص محبت اور اطاعت کی برکت ہے کہ اگر عمل میں کچھ کمی ہوئی تب بھی اطاعت واخلاص کی وجہ سے اتنے اونچے لوگوں کا ساتھ مل جائے گا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت رکھتا ہے، مگر ابھی تک (اعمال میں) ان سے نہیں مل سکا۔“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”آدمی اس کے ساتھ ہو گا جس سے اسے محبت ہو گی۔“ [بخاری، الأدب، باب علامة الحب فی اللہ...... : ۶۱۶۹] حقیقت یہ ہے کہ اطاعت اور محبت لازم وملزوم ہیں، وہ محبت جس میں اطاعت نہ ہو جھوٹی ہے اور وہ اطاعت جس کی بنیاد محبت نہ ہو، دکھاوا ہے۔ ہاں، محبت واخلاص کے ساتھ عمل واطاعت میں کچھ کمی ہو گی تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے پورا کر دے گا، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین سے زیادہ اچھا ساتھی کوئی نہیں اور اللہ کے فضل سے بڑی نعمت کوئی نہیں اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں کے حالات خوب جانتا ہے کہ کسے کس کے ساتھ رکھنا ہے۔

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت ہے، لہٰذا مجھے امید ہے کہ ان کے ساتھ محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے ان کے ساتھ ہی اٹھائیں گے، گو میں ان جیسے عمل نہیں کر سکا۔“ [بخاری، فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ...... : ۳۶۸۸]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَ لَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے بچاؤ کا سامان پکڑو، پھر دستوں کی صورت میں نکلو، یا اکٹھے ہو کر نکلو ﴿۷۱﴾ اور بے شک تم میں سے یقیناً کوئی ایسا بھی ہے جو ہر صورت دیر لگا دے گا، پھر اگر تمھیں کوئی مصیبت آ پہنچی تو کہے گا بے شک اللہ نے مجھ پر انعام فرمایا، جب کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا ﴿۷۲﴾ اور اگر واقعی تمھیں اللہ کی طرف سے کوئی فضل حاصل ہو گیا تو یقیناً وہ ضرور کہے گا، جیسے تمھارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی نہ تھی، اے کاش کہ میں ان کے ساتھ ہوتا تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا ﴿۷۳﴾ پس لازم ہے کہ اللہ کے راستے میں وہ لوگ لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے بیچتے ہیں اور جو شخص اللہ کے راستے میں لڑے، پھر قتل کر دیا جائے، یا غالب آ جائے تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے ﴿۷۴﴾

آیت 71 اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم فرمایا اور اس کی ترغیب کے سلسلہ میں یہ بھی بتایا کہ اس اطاعت سے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت حاصل ہو گی۔ اب اس آیت میں جہاد کا حکم فرمایا، جو سب سے مشکل اطاعت ہے اور کفار و منافقین سے پورا بچاؤ رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ حالات کے مطابق الگ الگ دستوں یا اکٹھے لشکر کی صورت نکلنے میں سے جو بہتر ہو اختیار کرو۔

آیت 73،72 یہ مسلمانوں میں منافقوں کے کردار کا تذکرہ ہے، یعنی ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دیدہ و دانستہ اور حیلوں بہانوں سے جہاد پر نکلنے میں دیر کرتے ہیں اور پیچھے رہ جانے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اگر اس سفر جہاد میں مسلمانوں کو کچھ تکلیف پہنچے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں پیچھے رہ گیا، ورنہ مجھے بھی وہ دکھ اٹھانا پڑتا جو دوسرے مسلمانوں نے اٹھایا ہے اور اگر مسلمانوں کو فتح و خوشی نصیب ہو اور غنیمت کا مال ہاتھ لگے تو حسرت سے کہتے ہیں کہ اگر ہم بھی ان میں شامل ہوتے تو ہمارا بھی کام بن جاتا۔ یہ جملہ وہ اس انداز سے ادا کرتے جیسے پہلے ان کا اور مسلمانوں کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں انھیں محض دنیاوی تکلیف اور دنیاوی مفادات ہی کا احساس ہوتا ہے، اخروی زندگی یا رضائے الٰہی سے انھیں کبھی غرض نہیں ہوتی اور یہی ان کے منافق ہونے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی دلیل ہے۔

آیت 74 ① فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : اوپر کی دو آیتوں میں جہاد سے پیچھے رہنے والوں اور دوسروں کو روکنے

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مدد گار بنا ﴿۷۵﴾

والوں، یعنی " مُبَطِّئِيْنَ " کی مذمت کے بعد اب مخلصین کو ترغیب دی جا رہی ہے۔ " شَرٰی یَشْرِیْ " کے معنی بیچنا اور خریدنا دونوں آتے ہیں، یہاں ترجمہ بیچنے کا کیا گیا ہے اور اکثر مفسرین نے اسے ترجیح دی ہے، لیکن اگر اسے خریدنے کے معنی میں لیا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ جو منافق گھر میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے آخرت کے بدلے دنیا خرید رہے ہیں ان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں اور آخرت کا نقصان کر کے دنیا حاصل نہ کریں۔ (فتح القدیر، طبری)

② فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا: یعنی مسلمانوں پر لازم ہے کہ دنیا کی زندگی پر نظر نہ رکھیں، بلکہ آخرت کی خواہش رکھیں اور سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہر طرح نفع ہے۔ (موضح) مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں، شہادت یا فتح اور دونوں مسلمانوں کے حق میں خوش کن ہیں، کیونکہ دونوں ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر عظیم کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ﴾ [التوبۃ : ۵۲] ''کہہ دے تم ہمارے بارے میں دو بہترین چیزوں میں سے ایک کے سوا کس کا انتظار کرتے ہو۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والے اس شخص کے لیے ضمانت دی ہے جسے اس کے راستے میں جہاد اور اس کے کلمات کی تصدیق کے سوا کوئی چیز نہیں نکالتی کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا، یا اس کی رہائش گاہ پر لائے گا جہاں سے وہ نکلا تھا، ساتھ وہ اجر اور غنیمت بھی ہو گی جو اس نے حاصل کی۔'' [بخاری، فرض الخمس، باب قول النبی ﷺ: أحلت لکم الغنائم : ۳۱۲۳، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ]

آیت 75 وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ ...... : اس آیت کا تعلق بھی ترغیب جہاد سے ہے، یعنی دو وجوہ کی بنا پر تمھارے لیے کفار سے لڑنا ضروری ہے، اول اعلائے کلمۃ اللہ، یعنی اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے، دوم ان مظلوم مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو کفار کے چنگل میں بے بس پڑے ہیں۔ (قرطبی) مکہ معظمہ میں بہت سے لوگ ایسے رہ گئے تھے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے تھے اور ان کے اقارب ان پر تشدد کرنے لگے تھے، تاکہ انھیں اسلام سے پھیر کر پھر کافر بنا لیں۔ پس " الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا " سے مراد مکہ ہے اور مشرک ہونے کی وجہ سے یا مظلوم مسلمانوں کو ستانے کی وجہ سے اس کے باشندوں کو ظالم فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اور میری والدہ بھی ان " الْمُسْتَضْعَفِيْنَ " (بے بس مسلمانوں)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا
اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ ع
وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ
النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى
اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۫ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا وہ باطل معبود کے راستے میں لڑتے ہیں۔ پس تم شیطان کے دوستوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے ﴿۷۶﴾ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو، یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں لکھ دیا، تو نے ہمیں ایک قریب وقت تک مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے اور تم پر دھاگے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۷۷﴾

میں شامل تھے (جنھیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا)۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ إلا المستضعفين من…… ﴾ : ۴۵۹۷] مدینہ میں رسول اللہ ﷺ ان ''مستضعفین'' کے حق میں نام لے کر دعا فرمایا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ وَ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَ عَيَّاشَ بْنَ أَبِيْ رَبِيْعَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ)) ''یا اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور (مکہ میں گھرے ہوئے) دوسرے بے بس مسلمانوں کو رہائی دلا۔'' [بخاری، الأذان، باب يهوي بالتكبير حين يسجد : ۸۰۴، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] افسوس کہ اس وقت مسلمان کفار کے مختلف ممالک کی غلامی میں بے بس ہیں، وہ انھیں نہ آزادی دیتے ہیں، نہ نکلنے دیتے ہیں اور نہ کوئی مسلمان ملک انھیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے، بتائیں اس وقت سے بڑھ کر جہاد کب فرض ہوگا؟ آیت میں مسلمانوں کو تمام مظلوم اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے لڑنے کا حکم ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، جیسے اس وقت بھارت میں مسلمان اور شودر ہندو دونوں ظلم کا شکار ہیں۔

آیت 76 اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ…… : جہاد کی فرضیت اور ترغیب کے بعد اس آیت میں بتایا کہ جہاد کی ظاہری صورت کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ جہاد اپنے مقصد کے اعتبار سے جہاد ہے، مومن ہمیشہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرتا ہے اور کافر کسی طاغوتی طاقت کو بچانے یا مضبوط کرنے کے لیے لڑتے ہیں، لہٰذا تم ان سے خوب لڑو۔ شیطان خواہ اپنے دوستوں کو کتنے ہی مکر وفریب سمجھائے، مگر تمھارے خلاف وہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

آیت 77 ① اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ…… : یعنی جب تک مسلمان مکہ میں تھے اور کافر انھیں ایذا دیتے تھے اللہ تعالیٰ

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔ اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں ﴿۷۸﴾

نے انھیں لڑنے سے روکے رکھا اور صبر کا حکم فرمایا، اب جو (مدینہ منورہ میں) لڑائی کا حکم آیا ہے تو ان کو سمجھنا چاہیے کہ ہماری مراد ملی، لیکن کچے مسلمان کنارہ کرتے ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے برابر آدمیوں سے خطرہ کرتے ہیں۔ (موضح) متعدد روایات میں ہے کہ مسلمانوں نے مکی زندگی میں کئی دفعہ چاہا کہ ظالموں سے دو بدو نمٹیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حکم ہوتا کہ ابھی نماز اور زکوٰۃ (مال خرچ کرنے) کا جو تمھیں حکم ہوا ہے اس کی خوب عادت ڈالو، تاکہ تمھاری تربیت ہو جائے، مدینہ منورہ میں بھی ہجرت کے ابتدائی برسوں میں مسلمانوں کی خواہش یہی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی کی اجازت آ گئی تو اب بعض خام قسم کے مسلمان اس سے ہچکچانے لگے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر، قرطبی)

② لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ کا ترجمہ یہ ہے: ''کیوں نہ جینے دیا ہم کو تھوڑی سی عمر'' جواب آگے ہے۔ بعض نے ترجمہ کیا ہے: ''قتال کی فرضیت کا یہ حکم نازل کرنے میں تو نے ہمیں کچھ مہلت کیوں نہ دی؟''

③ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ: لڑائی سے ہچکچانے والے کمزور ایمان والوں اور منافقین کا حوصلہ دو باتوں سے بلند فرمایا ہے، پہلی تو یہ کہ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کر کے جہاد کی ترغیب دی ہے، دنیا جتنی بھی ہو فانی ہے اور فانی جتنی بھی ہو قلیل (بہت تھوڑی) ہے۔ فانی اور باقی کا مقابلہ ہی کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس طرح کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈبو کر نکالے اور اس کی انگلی میں تھوڑی سی نمی رہ جائے، ایسی ہی مثال دنیا اور آخرت کی ہے۔'' [مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب فناء الدنيا ...... : ۲۸۵۸، عن المستورد الفهری رضی اللہ عنہ] اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اور دنیا کی مثال ایک مسافر کی سی ہے جو ایک درخت کے سائے میں آرام کرتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا ہے۔'' [ترمذی، الزهد، باب حديث " ما الدنيا إلا كراكب استظل" : ۲۳۷۷، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ]

آیت 78 ① اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ: ''بُرُوْجٍ'' یہ ''بُرْجٌ'' کی جمع ہے، مضبوط عمارت، قلعہ۔ ''مُّشَيَّدَةٍ'' جو ''اَلشَّيْدُ'' یعنی چونے سے بنے ہوئے ہوں۔ یہ جہاد کے لیے حوصلہ بڑھانے والی دوسری بات ہے کہ جب موت سے تمھیں کسی حال میں چھٹکارا نہیں تو پھر اللہ کی راہ میں جہاد سے کیوں ہچکچاتے ہو۔ اس مطلب کی آیات قرآن کریم میں بہت ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ ﴾ [الأحزاب : ۱۶] ''کہہ دے تمھیں بھاگنا

مَآ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنۡ سَيِّئَةٍ فَمِنۡ نَّفۡسِكَ ؕ وَ اَرۡسَلۡنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ﴿۷۹﴾

جو کوئی بھلائی تجھے پہنچے سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی تجھے پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے تجھے لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کافی گواہ ہے ﴿۷۹﴾

ہرگز نفع نہ دے گا اگر تم مرنے یا قتل ہونے سے بھاگو گے۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِيۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيۡكُمۡ ﴾ [الجمعة : ٨] ''کہہ دے بلاشبہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو سو یقیناً وہ تم سے ملنے والی ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ﴾ [آل عمران : ١٨٥] ''ہر جان موت کو چکھنے والی ہے۔''

② وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ ...... : اوپر منافقین کی دو مذموم خصلتیں بتائیں، ایک جہاد سے جی چرانا دوسری موت سے ڈرنا، اب یہاں ان کی ایک اور مذموم خصلت کا ذکر فرمایا جو پہلی دونوں سے بری ہے، یعنی نحوست کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرنا۔ یہاں ''حَسَنَةٌ'' (بھلائی) سے مراد فتح، نصرت، غلبہ اور خوش حالی وغیرہ ہے اور ''سَيِّئَةٌ'' سے مراد لڑائی میں نقصان، مصیبت، قتل اور ہزیمت وغیرہ ہے۔

③ قُلۡ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ : یہ ان کے کلام کا جواب ہے کہ برائی اور بھلائی دونوں اسی کی طرف سے اور اسی کے حکم سے ہیں، ہر چیز کا پیدا کرنے والا وہی ہے، بلا اور مصیبت کو کسی کی نحوست قرار دینا قطعی غلط اور پہلے کافروں کا طریقہ ہے، جیسا کہ قوم ثمود کا کہنا: ﴿ قَالُوا اطَّيَّرۡنَا بِكَ وَ بِمَنۡ مَّعَكَ ﴾ [النمل : ٤٧] ''انھوں نے کہا ہم نے تیرے ساتھ اور ان لوگوں کے ساتھ جو تیرے ہمراہ ہیں، بدشگونی پکڑی ہے۔'' اور سورۂ یٰس میں ہے: ﴿ اِنَّا تَطَيَّرۡنَا بِكُمۡ ﴾ [یٰس : ١٨] ''بے شک ہم نے تمھیں منحوس پایا ہے۔'' اور فرعون کی قوم کے بارے میں ہے: ﴿ وَ اِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَ مَنۡ مَّعَهٗ ﴾ [الأعراف : ١٣١] ''اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔''

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیر جنگ درست آئی اور فتح اور غنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی، یعنی اتفاقاً بن گئی۔ آپ ﷺ کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے نبی ﷺ کی تدبیر پر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب اللہ کی طرف سے ہے، یعنی پیغمبر کی تدبیر اللہ کا الہام ہے، غلط نہیں اور اگر بگڑی تو اس کو بگڑا نہ بوجھو، یہ اللہ تم کو سدھاتا ہے تمھاری تقصیر پر۔ اگلی آیت میں کھول کر بیان فرما دیا۔'' (موضح)

④ فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الۡقَوۡمِ ...... : یعنی تعجب ہے کہ کسی غور و فکر کے بغیر سمجھ میں آنے والی حقیقت بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (رازی)

آیت 79 ① مَآ اَصَابَكَ مِنۡ حَسَنَةٍ ...... : اس میں برائی اور بھلائی کا ایک قانون بیان فرما دیا ہے کہ بھلائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے اس کا بھیجنے والا بھی گو اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے مگر اس کا سبب تمھارے گناہ ہوتے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ شوریٰ: ٣٠) اس لیے سلف صالحین کا عام قاعدہ تھا کہ جب کوئی اجتہادی رائے پیش کرتے تو کہتے، اگر یہ

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ وَ مَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ حَفِیۡظًا ﴿۸۰﴾ وَ یَقُوۡلُوۡنَ
طَاعَۃٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوۡا مِنۡ عِنۡدِکَ بَیَّتَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡہُمۡ غَیۡرَ الَّذِیۡ تَقُوۡلُ ؕ وَ اللّٰہُ یَکۡتُبُ
مَا یُبَیِّتُوۡنَ ۚ فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ﴿۸۱﴾

جو رسول کی فرماں برداری کرے تو بے شک اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جس نے منہ موڑا تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ﴿۸۰﴾ اور وہ کہتے ہیں اطاعت ہوگی، پھر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ رات کو اس کے خلاف مشورے کرتا ہے جو وہ کہہ رہا تھا اور اللہ لکھ رہا ہے جو وہ رات کو مشورے کرتے ہیں۔ پس ان سے منہ موڑ لے اور اللہ پر بھروسا کر اور اللہ کافی وکیل ہے ﴿۸۱﴾

صحیح ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسی کی توفیق سے ہے اور اگر غلط ہے تو ہماری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ (ابن کثیر) اوپر کی آیت میں پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے اعتبار سے "حَسَنَۃٌ" اور "سَیِّئَۃٌ" دونوں کو "مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ" (اللہ کی طرف سے) قرار دیا ہے کہ دونوں چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں، لیکن یہاں سبب اور کسب کی مناسبت سے برائی کی نسبت انسان کی طرف کر دی ہے، لہٰذا کوئی تعارض نہیں ہے۔ (رازی) موضح میں ہے: ''بندہ کو چاہیے کہ نیکی اللہ کا فضل سمجھے اور تکلیف اپنی تقصیر سے۔ تقصیروں سے اللہ واقف ہے اور وہی جزا دیتا ہے۔''

2 وَ اَرۡسَلۡنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ......: یعنی آپ کا اصل منصب رسالت اور تبلیغ ہے اور اللہ گواہ ہے کہ آپ نے اس امانت کے ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی اور وہ کافی گواہ ہے، پھر اس کے بعد بھی اگر کسی کو ہدایت نہیں ہوتی تو آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ (رازی) نیز یہ آپ ﷺ کی عمومی رسالت کا بیان بھی ہے کہ آپ تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۵۸) اور سورۂ سبا (۲۸)۔

آیت 80 1 مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ ......: چونکہ نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول اور مبلغ ہیں، اس لیے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے شریعت کے احکام سب ایسے ہیں جنھیں آپ ﷺ کی توضیح کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں، لہٰذا قرآن مجید سمجھنے کے لیے کوئی شخص سنت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الرسالۃ للشافعی رقم: ۵۷، ۵۸) أیضًا بحث البیان الرابع]

2 وَ مَنۡ تَوَلّٰی فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ عَلَیۡہِمۡ: یعنی اس کے بعد بھی اگر لوگ گمراہ ہوتے ہیں تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں، اس میں آپ ﷺ کو تسلی دی ہے۔ (رازی)

آیت 81 وَ یَقُوۡلُوۡنَ طَاعَۃٌ ......: یہاں منافقین کی ایک اور مذموم خصلت بیان فرمائی ہے اور ان کو سرزنش کی ہے اور آپ ﷺ کو ان کی حرکات سیۂ سے چشم پوشی اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم فرمایا ہے۔ "بَیَّتَ" کا لفظ اصل میں "بَیۡتٌ" (گھر) سے ہے اور انسان چونکہ عموماً رات کو گھر میں رہتا ہے، اس لیے "بَاتَ" کے معنی رات گزارنے کے ہیں، پھر چونکہ رات کے فارغ اوقات میں آدمی اپنے معاملات پر غور و فکر کرتا ہے، اس لیے "بَیَّتَ" کا لفظ کسی معاملہ میں نہایت غور و فکر کے معنی میں استعمال ہونے لگا

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے، اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے ﴿۸۲﴾ اور جب ان کے پاس امن یا خوف کا کوئی معاملہ آتا ہے اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر وہ اسے رسول کی طرف اور اپنے حکم دینے والوں کی طرف لوٹاتے تو وہ لوگ اسے ضرور جان لیتے جو ان میں سے اس کا اصل مطلب نکالتے ہیں، اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بہت تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے ﴿۸۳﴾

ہے۔ (رازی) یعنی دن کو وہ آپ کے سامنے اطاعت کا یقین دلاتے ہیں مگر رات کو ان کے بعض گروہ اس کے برعکس مشورے کرتے ہیں، جو وہ دن کو آپ کے سامنے کہہ رہے تھے اس ''طائفہ'' سے مراد لیڈر ہیں کیونکہ عام لوگ تو ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔

آیت 82 اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ...... : منافقین کے مکر وفریب اور مذموم خصائل کے ضمن میں قرآن کی حقانیت کے اثبات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ منافقین یہ سب مکر وفریب اور سازشیں اس بنا پر کر رہے تھے کہ وہ آپ کو سچا نبی نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا یہاں آپ ﷺ کے صدقِ نبوت پر بطور دلیل کے قرآن کو پیش کیا اور قرآن حکیم آپ ﷺ کے صدق نبوت کی تین وجھوں سے دلیل بنتا ہے، اول اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۳) دوم امور غیب کی خبروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اور سوم اختلاف و تناقض سے پاک اور مبرا ہونے کی بنا پر۔ یہاں اسی تیسری چیز کو بیان فرمایا ہے۔ (رازی) مطلب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں کہ ایک انسان برس ہا برس تک مختلف حالتوں میں مختلف موضوعات پر، خصوصاً امورِ غیب سے متعلق اس قدر تفصیل سے گفتگو کرتا رہے اور اس کی ایک بات بھی دوسری سے متصادم نہ ہو۔ یہ خصوصیت صرف قرآن میں پائی جاتی ہے، جو غور وفکر کرنے والے کے لیے اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ (شوکانی) اختلاف سے پاک ہونا بوجہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی فصیح و بلیغ کیوں نہ ہو، جب اتنی بڑی کتاب لکھے گا تو اس کے کلام میں قدرے تفاوت ضرور ہوگا اور ساری کتاب بلاغت میں یکساں مرتبہ کی نہیں ہوگی۔ پھر یہ منافقین خفیہ طور سازشیں کرتے رہتے ہیں اور وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو ان کے بھید من وعن بتا دیے جاتے ہیں اور کبھی یہ نہیں ہوا کہ کسی راز کے افشا کرنے میں قرآن نے تھوڑی بہت بھی غلطی کی ہو اور یہی اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ (رازی)

معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں تدبر کے بغیر انسان کے شکوک وشبہات دور نہیں ہو سکتے اور نہ قرآن صحیح طور پر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ قرآنِ کریم اگر غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلافِ کثیر ہوتا، اب یہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لیے اختلافِ کثیر کجا، سرے سے اس میں اختلاف ہے ہی نہیں۔

آیت 83 ① وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ ......: امن کی خبر یہ کہ مسلمانوں کو فتح ہوئی، یا دشمن کا لشکر

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّ اَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

پس اللہ کے راستے میں جنگ کر، تجھے تیری ذات کے سوا کسی کی تکلیف نہیں دی جاتی اور ایمان والوں کو رغبت دلا، اللہ قریب ہے کہ ان لوگوں کی لڑائی روک دے جنھوں نے کفر کیا اور اللہ بہت سخت لڑائی والا اور بہت سخت سزا دینے والا ہے ﴿۸۴﴾

واپس چلا گیا، جس سے مسلمان بے فکر ہو کر تیاری کم کر دیں وغیرہ اور خوف کی خبر یہ کہ فلاں مقام پر مسلمانوں کو شکست ہوئی، یا دشمن بہت بڑی تعداد میں حملہ آور ہونے والا ہے، جس سے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلے۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے مختلف سرایا (جنگی دستے) لڑائی کے لیے بھیجتے رہتے تھے، اس لیے اس قسم کی افواہیں مدینہ میں اکثر پہنچتی رہتی تھیں، لیکن منافقین اور بے احتیاط قسم کے مسلمان بجائے اس کے کہ انھیں سب سے پہلے آپ ﷺ یا آپ ﷺ کے ذمے دار اصحاب تک پہنچائیں، از خود ان افواہوں کی تشہیر شروع کر دیتے، ان کے اسی طرز عمل کی یہاں مذمت کی جا رہی ہے۔ (فتح القدیر، قرطبی)

② **يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ**: اس کا مادہ " نَبَطٌ " ہے۔ " نَبَطٌ " وہ پانی ہے جو کنواں کھودتے وقت سب سے پہلے نکلتا ہے، اس لیے ''استنباط'' تحقیق اور بات کی تہ تک پہنچنے کو کہا جاتا ہے، اسی طرح مخفی بات کی حقیقت معلوم اور ظاہر کرنے کو بھی " نَبَطٌ " اور "اِسْتِنْبَاطٌ" کہا جاتا ہے۔ کان کی گہرائی سے کوئی معدن نکالنے کو بھی "اِسْتِنْبَاطٌ" کہتے ہیں۔ ﴿ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ﴾ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر امن یا خوف کی وہ خبر بلا تحقیق پھیلانے کے بجائے اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے امراء کو پہنچاتے تو سب سے پہلے وہ غور و خوض اور تحقیق کر کے معلوم کرتے کہ خبر صحیح بھی ہے یا غلط، کیونکہ بلا تحقیق آگے بات کرنے کو رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ قرار دیا ہے، چنانچہ فرمایا: « كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ » [مسلم، المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع : ۵] ''آدمی کو جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ سنے (بلا تحقیق) آگے بیان کر دے۔'' پھر وہ ذمے دار حضرات فیصلہ کرتے کہ اس خبر کی اشاعت کرنی چاہیے یا نہیں، اس کے بعد اگر وہ قابل اشاعت ہوتی تو اسے نشر کرتے، ورنہ روک دیتے۔ انفرادی زندگی میں عموماً اور اجتماعی زندگی میں خصوصاً اس ہدایت پر عمل نہایت ضروری ہے، ورنہ اس بے احتیاطی کے بے حد نقصانات ہو سکتے ہیں، بالخصوص جنگ کے ایام میں، جب خبریں اور افواہیں فوجی کارروائیوں سے بڑھ کر تاثیر رکھتی ہیں، خبروں کے محاذ کو بھی جنگ کا زبردست محاذ سمجھ کر اس کے مطابق معاملہ کرنا چاہیے۔

③ **اِلَّا قَلِيْلًا**: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ جو فرمایا: ''اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا تو شیطان کے پیچھے چلتے مگر تھوڑے'' یعنی ہر وقت احکام تربیت کے نہ پہنچتے رہیں تو کم لوگ ہدایت پر قائم رہیں۔ (موضح)

آیت 84 ① **فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ**...... : اوپر کی آیات میں جہاد کی ترغیب دی، اس کے بعد منافقین کی سرگرمیوں کا ذکر کیا اور اب اس آیت میں فرمایا کہ آپ ان منافقین کے ساتھ ہونے یا نہ ہونے کی پروا نہ کریں، آپ

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

جو کوئی سفارش کرے گا، اچھی سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک حصہ ہوگا اور جو کوئی سفارش کرے گا، بری سفارش، اس کے لیے اس میں سے ایک بوجھ ہوگا اور اللہ ہمیشہ ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۸۵﴾ اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم اس سے اچھی سلامتی کی دعا دو، یا جواب میں وہی کہہ دو۔ بے شک اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کا پورا حساب کرنے والا ہے ﴿۸۶﴾

کی ذمہ داری ہے کہ آپ خود جہاد کے لیے نکلیں اور دوسرے مومنوں کو بھی ترغیب دیں۔ ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''جو شخص مشرکوں پر حملہ کرتا ہے تو کیا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مبعوث کیا اور ان سے فرمایا: ﴿ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ ﴾ اور جس آیت کا آپ حوالہ دے رہے ہیں: ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ [البقرۃ : ۱۹۵] اس کا تعلق تو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے (اور نہ کرنے) سے ہے۔'' [مسند أحمد : ۴/ ۲۸۱، ح : ۱۸۵۰۶] اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کے لیے کئی شرطیں لوگ اپنے پاس ہی سے بنا لیتے ہیں۔

② عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اللہ تعالیٰ کے لیے ''عَسٰی'' کا لفظ یقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، پس آیت میں وعدہ کیا جا رہا ہے کہ عنقریب کفار کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔

آیت 85 مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً ...... : اوپر کی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مومنوں کو جہاد کی ترغیب دو، جو اعمالِ حسنہ میں سے ہے، یہاں بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر اجرِ عظیم ملے گا۔ پس یہاں شفاعت حسنہ سے ترغیب جہاد مراد ہے اور شفاعت سیئہ سے مراد اس کار خیر سے روکنا ہے، دوسرے کاموں کے لیے سفارش کا بھی یہی حکم ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم سفارش کرو تمھیں اجر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان پر جو چاہے گا فیصلہ فرمائے گا۔'' [بخاری، الزکاۃ، باب التحریض علی الصدقۃ...... : ۱۴۳۲، عن أبی موسٰی رضی اللہ عنہ]

آیت 86 وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ ...... : جہاد کا حکم دینے کے بعد اب صلح کے بعض احکام بیان فرمائے، چنانچہ فرمایا کہ اگر کفار کی طرف سے جنگ ختم کرنے اور صلح کرنے کی کوئی پیش کش کی جاتی ہے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا کم از کم اتنی پیش کش ضرور قبول کرو۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ [الأنفال : ۶۱] ''اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔'' ایک مصداق اس آیت کا یہ ہے کہ جہاد کے سفر کے دوران کوئی شخص اگر اطاعت کے اظہار کے لیے یا اسلام قبول کرنے کے اظہار کے لیے سلام کہے تو یہ کہہ کر اسے قتل

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ
حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ۧ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَ اللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا ع ۱۱/۸
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ۙ

اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر صورت تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے ﴿۸۷﴾ پھر تمھیں کیا ہوا کہ منافقین کے بارے میں دو گروہ ہو گئے، حالانکہ اللہ نے انھیں اس کی وجہ سے الٹا کر دیا جو انھوں نے کمایا، کیا تم چاہتے ہو کہ اس شخص کو راستے پر لے آؤ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر تو اس کے لیے کبھی کوئی راستہ نہ پائے گا ﴿۸۸﴾ وہ چاہتے ہیں کاش کہ تم کفر کرو جیسے انھوں نے کفر کیا، پھر تم برابر ہو جاؤ، سو تم ان میں سے کسی طرح کے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کے راستے میں ہجرت کریں، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور نہ ان سے کوئی دوست بناؤ اور نہ کوئی مددگار ﴿۸۹﴾

مت کرو کہ تو مومن نہیں۔ (دیکھیے نساء: ۹۴) اور ایک مصداق وہ ہے جو آیت کے صریح الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ جب کوئی شخص تمھیں سلام کہے تو اسے اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو۔ "تَحِيَّةٌ" "حَيَاةٌ" میں سے باب تفعیل کا مصدر ہے، زندگی کی یا سلامتی کی دعا دینا، مراد سلام ہے۔ بہتر جواب دینے کی تفسیر حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کے جواب میں " وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ " کا اضافہ اور " اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ " کے جواب میں " وَ بَرَكَاتُهٗ " کا اضافہ کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص یہ سارے الفاظ بول دے تو انھی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ "وَ مَغْفِرَتُهٗ وَ رِضْوَانُهٗ " وغیرہ کا اضافہ صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ہر لفظ کے اضافے کے ساتھ دس نیکیاں زیادہ ہوتی جائیں گی۔ [أحمد : ٤/٤٣٩، ٤٤٠، ح : ١٩٩٧٠] گویا کوئی شخص جتنا سلام کہے اتنا جواب دینا فرض ہے، زائد مستحب ہے۔

آیت 88 یعنی تم ان منافقین کے بارے میں دو گروہ کیوں ہو گئے، تمھیں تو ان کے متعلق ایک رائے پر متفق ہونا چاہیے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احد کے لیے نکلے تو کچھ لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ کر راستے ہی سے واپس ہو گئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کے دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ کہنے لگا، آپ انھیں قتل کریں اور دوسرا گروہ اس کے خلاف تھا، تو یہ آیت اتری: ﴿ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ ﴾ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ طیبہ ہے، یہ گند کو اس طرح دور کر دیتا ہے جیسے آگ چاندی کے گند کو۔" [بخاري، التفسير، باب : ﴿ فما لكم في المنافقين ...... ﴾ : ٤٥٨٩] شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ حدیث اس آیت کے اسباب نزول میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔

آیت 89 وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً ...... : معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقوں کی وہ قسم تھی جو مدینہ کے

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ
اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ
اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾
سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ
اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ يُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَ يَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ
وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع ۱۴/۹

مگر وہ لوگ جو ان لوگوں سے جا ملتے ہیں کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان عہد و پیمان ہے، یا وہ تمھارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے دل اس سے تنگ ہوں کہ وہ تم سے لڑیں، یا اپنی قوم سے لڑیں اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور انھیں تم پر مسلط کر دیتا، پھر یقیناً وہ تم سے لڑتے۔ تو اگر وہ تم سے الگ رہیں اور تم سے نہ لڑیں اور تمھاری طرف صلح کا پیغام بھیجیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر زیادتی کا کوئی راستہ نہیں رکھا ﴿۹۰﴾ عنقریب تم کچھ اور لوگ پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں، وہ جب بھی فتنے کی طرف لوٹائے جاتے ہیں اس میں الٹا دیے جاتے ہیں، تو اگر وہ نہ تم سے الگ رہیں اور نہ صلح کا پیغام بھیجیں اور نہ اپنے ہاتھ روکیں تو انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں انھیں پاؤ اور یہی لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمھارے لیے واضح دلیل بنا دی ہے ﴿۹۱﴾

اردگرد پھیلے ہوئے قبائل سے تعلق رکھتی تھی، دلیل اس کی یہ الفاظ ہیں: ﴿فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ”تو ان میں سے کسی طرح کے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ اللہ کے راستے میں ہجرت کریں۔“ یہ لوگ مسلمانوں سے خیر خواہی اور محبت کا اظہار ضرور کرتے تھے مگر عملی طور پر اپنے ہم وطن کافروں کا ساتھ دیتے تھے، یا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ ان کے لیے معیار یہ مقرر کیا گیا کہ اگر وہ ہجرت کر کے تمھارے پاس مدینہ آ جائیں اور تمھیں ان کے ایمان کا یقین ہو جائے تو اس صورت میں تم انھیں سچا بھی سمجھو اور ہمدرد بھی اور اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں تو اگرچہ وہ اسلام کا اظہار کریں ان سے کافروں جیسا سلوک کرو، کیونکہ دار الکفر میں چلے جانے کے بعد ان کا کفر کھل کر سامنے آ گیا، اس لیے انھیں گرفتار کرو اور حل و حرم میں جہاں پاؤ انھیں قتل کرو اور انھیں اپنا دوست نہ بناؤ۔

آیت 90 اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ ...... : منافقین کے سلسلے میں جو اوپر حکم بیان ہوا اس سے دو قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مستثنیٰ کر دیا اور فرمایا کہ انھیں نہ قید کرو اور نہ ان سے قتال (لڑائی) کرو۔ ایک تو وہ منافقین جو کسی ایسی قوم کے پاس جا کر پناہ لے لیں یا حلیف بن جائیں جن کے ساتھ مسلمانوں کا صلح اور امن کا معاہدہ ہو تو وہ انھی کے حکم میں ہو جائیں گے، ورنہ عہد ٹوٹ جائے گا اور جنگ چھڑ جائے گی اور دوسرے وہ لوگ جو اپنی صلح جوئی کی وجہ سے نہ مسلمانوں سے جنگ کرنا چاہتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنی قوم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔

آیت 91 سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ ...... : اس آیت کریمہ میں ایک تیسری قسم کے لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو بہت ہی

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ٘ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

اور کسی مومن کا کبھی یہ کام نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مومن گردن آزاد کرنا اور دیت دینا ہے، جو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی ہو، مگر یہ کہ وہ صدقہ (کرتے ہوئے معاف) کر دیں۔ پھر اگر وہ اس قوم میں سے ہو جو تمھاری دشمن ہے اور وہ مومن ہو تو ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے، اور اگر اس قوم میں سے ہو کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہو تو اس کے گھر والوں کے حوالے کی گئی دیت ادا کرنا اور ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے، پھر جو نہ پائے تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھنا ہے۔ یہ بطور توبہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ ہمیشہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۹۲﴾

بدترین قسم کے منافق ہیں، جو ڈھنڈورا تو اپنی امن پسندی کا پیٹتے ہیں مگر جب داؤ لگ جائے تو اسلام دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کا امن پسندی کا دعویٰ سچا ہونے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں سے صلح کر لیں، دوسرے یہ کہ لشکر کفار میں شامل نہ ہوں اور تیسرے یہ کہ اگر انھیں مجبوراً شامل ہونا ہی پڑے تو پھر اپنے ہاتھ روکے رکھیں، یعنی عملاً لڑائی میں شامل نہ ہوں، جیسا کہ جنگ بدر میں عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ انھیں قتل نہ کیا جائے، کیونکہ وہ مجبور کر کے لائے گئے ہیں۔ اگر یہ تینوں باتیں نہ پائی جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کی نیتوں میں فتور ہے اور وہ امن پسندی کی آڑ میں دھوکا دے کر مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں، لہٰذا ایسے منافقوں کا علاج یہ ہے کہ انھیں پکڑو اور جہاں ملیں قتل کر دو۔

آیت 92 ① وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا: کفار کے ساتھ جنگ کی اجازت نازل ہوئی تو یہ عین ممکن تھا کہ کسی شخص کو کافر حربی (جس سے جنگ ہو) سمجھ کر مسلمان قتل کر دیں اور بعد میں معلوم ہو کہ وہ مسلمان تھا، اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے قتل خطا کے احکام بیان فرما دیے۔ (رازی) آیت میں "اِلَّا" بمعنی "لٰكِنْ" ہے اور مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی کسی بھی حال میں مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر غلطی سے مارا جائے تو اس پر کفارہ ہے، جس کا بعد میں ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کسی آدمی کا خون، جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، تین صورتوں میں سے کسی ایک کے سوا حلال نہیں: ① جان کے بدلے جان۔ ② شادی شدہ بدکار۔ ③ اسلام کو چھوڑنے والا (مرتد) جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والا۔" [بخاري، الديات، باب قول الله تعالى : ﴿ أن النفس بالنفس

وَ مَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾

اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، جس میں ہمیشہ رہنے والا ہو اور اللہ اس پر غصے ہو گیا اور اس نے اس پر لعنت کی اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کیا ہے ﴿۹۳﴾

والعین بالعین ﷺ : ٦٨٧٨، عن عبد الله رضی اللہ عنہ]

❷ وَمَنۡ قَتَلَ مُؤۡمِنًا خَطَـًٔا فَتَحۡرِيۡرُ ...... : یعنی جب کوئی مسلمان غلطی سے کسی مسلمان کو قتل کر دے تو اس کے دو حکم ہیں، ایک کفارہ دوسرا دیت یعنی خون بہا۔ کفارہ تو یہ ہے کہ وہ ایک مسلمان غلام (مرد یا عورت) کو آزاد کرے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے اور اس کے وارثوں کو دیت ادا کرے، کفارہ تو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا، ہاں، دیت اگر وارث معاف کر دیں تو ساقط ہو سکتی ہے، مگر یہ اس وقت ہے کہ جب مقتول کے وارث بھی مسلمان ہوں یا کافر ہوں لیکن ان سے معاہدہ ہو یا ذمی ہوں، جیسے آگے آ رہا ہے۔

❸ فَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍ عَدُوٍّ لَّكُمۡ ...... : لیکن اگر اس کے وارث حربی کافر ہوں تو پھر قاتل کے ذمے صرف کفارہ ہے، یعنی ایک مسلمان گردن آزاد کرنا، اگر نہ ہو سکے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا۔ مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ دشمن ہیں۔ (قرطبی)

❹ وَاِنۡ كَانَ مِنۡ قَوۡمٍۭ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ...... : اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مقتول مسلمان ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جن سے تمھارا معاہدہ ہے، یا ذمی ہیں تو اس صورت میں بھی دو چیزیں واجب ہوں گی، دیت (خون بہا) اور کفارہ۔ یہاں دیت کو کفارہ سے پہلے ذکر فرمایا ہے کہ اسے غیر مسلم قوم کا فرد سمجھ کر دیت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی جائے۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مقتول معاہد یا ذمی ہو (مسلمان نہ ہو) تو اس صورت میں بھی کفارہ اور وارثوں کو خون بہا ادا کرنا پڑے گا، مگر زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہاں بھی مسلمان مقتول ہی کی بات ہو رہی ہے۔ دیت ایک سو اونٹ یا اس کے اندازے کے ساتھ قیمت ہو گی، جو خطا کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہو گی۔

❺ شَهۡرَيۡنِ مُتَتَابِعَيۡنِ : اگر کوئی کسی شرعی عذر یعنی مرض، حیض، نفاس وغیرہ کے بغیر ایک روزہ بھی چھوڑے گا تو نئے سرے سے دوبارہ دو ماہ کے روزے رکھنے پڑیں گے۔ (قرطبی)

آیت 93 وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا ...... : قتل خطا کا حکم بیان کرنے کے بعد اب اس آیت میں قتل عمد (قصداً قتل کرنے) کا حکم بیان فرمایا ہے، اس کا ایک حکم تو بیان ہو چکا ہے، یعنی اس صورت میں قصاص یا دیت واجب ہے، یا مقتول کے وارث کچھ معاف کر دیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۷۸) یہاں صرف اس کے گناہ اور وعید کا ذکر ہے۔ متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس جرم کو اشراک باللہ کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں فرمایا کہ اس کی جزا جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے اور اللہ تعالیٰ اس پر غصے ہو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کے راستے میں سفر کرو تو خوب تحقیق کر لو اور جو تمھیں سلام پیش کرے اسے یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں۔ تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو تو اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں، اس سے پہلے تم بھی ایسے ہی تھے تو اللہ نے تم پر احسان فرمایا۔ پس خوب تحقیق کر لو، بے شک اللہ ہمیشہ اس سے جو تم کرتے ہو، پورا باخبر ہے ﴿۹۴﴾

گیا اور اس پر لعنت کی اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار کیا ہے۔ اتنی سخت سزائیں یکجا ذکر کرنے سے اس گناہ کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے اور بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مومن کو قصداً قتل کرنے والا ابدی جہنمی ہے اور اس کی توبہ بھی قبول نہیں۔ مگر سورۂ فرقان (۶۸) میں قتلِ عمد کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے۔ اب بعض مفسرین کا کہنا تو یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرنے کی توبہ اس وقت قبول ہے جب اس نے حالت کفر میں یہ قتل کیا ہو، مسلمان ہونے کے بعد کسی مسلم کو قتل کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں، بلکہ "خَالِدًا فِيْهَا" کے الفاظ سے اس کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ [بخاری، التفسیر، باب قولہ : ﴿ والذین لا یدعون...... ﴾ : ۴۷۶۲] مگر اکثر سلف اس کی توبہ قبول ہونے کے قائل ہیں، کیونکہ ① شرک باللہ سے بڑا کوئی گناہ نہیں، وہ توبہ سے معاف ہو سکتا ہے تو یہ بھی معاف ہو سکتا ہے۔ ② اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ وہ آگ میں ہمیشہ رہے گا، بلکہ فرمایا یہ ہے (کہ یہ جرم اتنا بڑا ہے) کہ اس کی جزا جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے، باقی اللہ معاف کرنا چاہے تو توبہ کے بعد یا توبہ کے بغیر بھی معاف کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء : ۴۸] "بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔" لہٰذا یہ اللہ کی مشیت پر ہے چاہے تو سزا دے کر معاف کر دے، چاہے تو ویسے ہی معاف کر دے۔ خصوصاً توبہ کے بعد تو واضح بشارت موجود ہے: ﴿ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ﴾ [الزمر : ۵۳] "اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بے شک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔" ③ بنی اسرائیل کا وہ مسلمان جس نے سو آدمی قتل کیے تھے، اس کا واقعہ بھی قتلِ عمد کی توبہ کے قبول ہو سکنے کی دلیل ہے۔ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب : ۳۴۷۰]

بعض اہلِ علم نے فرمایا کہ وہ قاتلِ عمد ابدی جہنمی ہے جو اس عمل کو جائز سمجھے، کیونکہ شریعت کے حرام کام کو حلال سمجھنا کفر ہے اور جنت کی نعمتیں کفار پر حرام ہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [الأعراف : ۵۰] "بے شک اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں۔" بے شک اللہ تعالیٰ نے (جنت کا پانی اور رزق) دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں مگر اس صورت میں اس کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا باعث قتل عمد نہیں بلکہ کفر ہو گا۔

آیت 94 ① فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا ...... : ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنی تھوڑی سی بکریوں کے پاس تھا،

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۹۵﴾

ایمان والوں میں سے بیٹھ رہنے والے، جو کسی تکلیف والے نہیں اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے اور ہر ایک سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت عطا فرمائی ہے ﴿۹۵﴾

کچھ مسلمان وہاں سے گزرے، اس نے "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کہا لیکن مسلمانوں نے اسے قتل کر ڈالا اور اس کی بکریاں لے لیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری، جس میں ہے: ﴿ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ﴾ "تم دنیا کا سامان چاہتے ہو؟" اس سے مراد وہ تھوڑی سی بکریاں ہیں۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولا تقولوا لمن ألقیٰ...... ﴾ : ۴۵۹۱]

❷ فَتَبَیَّنُوْا : یہاں تبین یعنی تحقیق کر لینے کا حکم سفر کے ساتھ ذکر کیا ہے، مگر یہاں سفر کی قید بیان واقعہ کے لیے ہے، یعنی یہ حادثہ جس سے متعلق آیت نازل ہوئی ہے، سفر میں پیش آیا تھا، ورنہ تحقیق کا حکم جس طرح سفر میں ہے اسی طرح حضر میں بھی ہے۔ (قرطبی)

❸ کَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ : یعنی یہی حالت پہلے تمھاری تھی، تم کافروں کے شہر میں رہتے تھے اور اپنے ایمان کو چھپاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دین کو غالب کر کے تم پر احسان کیا۔ (قرطبی)

آیت 95 ❶ لَا یَسْتَوِی الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ...... : جہاد کے فرضِ عین ہونے کی صورت میں تو کسی شخص کو بلا عذر گھر میں بیٹھے رہنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ایسی صورت میں جہاد میں شامل نہ ہونا صریح نفاق ہے، مگر جب نفیرِ عام (سب کے نکلنے) کا حکم نہ ہو اور امام کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے کہ جو شخص جہاد کے لیے نکل سکتا ہو نکلے اور جو اپنے کام کی وجہ سے نہیں نکل سکتا اسے اپنے گھر میں بیٹھے رہنے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں جو شخص جہاد کے لیے نکلے اس آیت میں اس کی فضیلت کا ذکر ہے، یعنی جہاد کے لیے نکلنا لازم نہ ہونے کے باوجود جو لوگ جہاد کے لیے نکلتے ہیں اور جو گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں کتابت کے لیے حاضر ہوا تو عبد اللہ بن ام مکتوم، جو نابینا تھے، آ گئے اور کہنے لگے، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! اگر میں آپ کے ہمراہ جہاد کر سکتا ہوتا تو ضرور کرتا، تو اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرمائی اور "غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ" (جو کسی تکلیف والے نہیں) کا کلمہ نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لکھوا دیا۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا یستوی القاعدون من

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ
اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

اپنی طرف سے بہت سے درجوں کی اور عظیم بخشش اور رحمت کی۔ اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۹۶﴾ بے شک وہ لوگ جنھیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں، کہتے ہیں تم کس کام میں تھے؟ وہ کہتے ہیں ہم اس سرزمین میں نہایت کمزور تھے۔ وہ کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۹۷﴾

المؤمنین ﷺ: ٤٥٩٢] معلوم ہوا کہ جس شخص کی نیت جہاد کی ہو مگر اسے کوئی تکلیف ہو اور وہ کسی عذر کی بنا پر جہاد میں شریک نہ ہو سکے وہ مجاہدین کے برابر ہو سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مدینہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم نے جس قدر سفر کیا اور جتنی وادیاں طے کیں وہ تمھارے ساتھ تھے۔“ صحابہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! وہ تو مدینہ میں ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”(ہاں) اگرچہ وہ مدینہ میں ہیں، لیکن انھیں کسی عذر نے جہاد میں شرکت سے روکا ہے۔“ [بخاري، المغازي، باب: ٤٤٢٣، عن أنس رضی اللہ عنہ] کئی دوسری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مسلمانوں میں سے کسی شخص کو بھی اس کے جسم میں کوئی آزمائش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان محافظ فرشتوں کو حکم دیتا ہے جو اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ میرے بندے کے لیے اسی طرح عمل لکھ دو جس طرح وہ اس وقت عمل کرتا تھا جب وہ تندرست تھا جب تک وہ میری گرفت میں رہے۔“ [أحمد: ۲/ ۱۹٤، ح: ٦٨٢٥، صحيح على شرط مسلم]

❷ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: یعنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو جو فضیلت حاصل ہوگی، جہاد میں حصہ نہ لینے والے اگرچہ اس سے محروم رہیں گے، تاہم اللہ تعالیٰ نے دونوں کے ساتھ ہی بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔ اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ عام حالات میں جہاد کے لیے نکلنا فرضِ عین نہیں، فرضِ کفایہ ہے، یعنی اگر بقدر ضرورت آدمی جہاد میں حصہ لے لیں تو اس علاقے کے دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی یہ فرض ادا شدہ سمجھا جائے گا، لیکن اگر بقدر ضرورت نہ نکلیں تو تمام لوگ گناہ گار ہوں گے۔

آیت 97 ❶ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مکہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان تو ہو چکے تھے لیکن انھوں نے اپنے آبائی علاقے اور خاندان کو چھوڑ کر ہجرت کرنے سے گریز کیا، (حالانکہ انھیں ہجرت میں کوئی رکاوٹ بھی نہ تھی) جب کہ مسلمانوں کی قوت کو ایک جگہ مجتمع کرنے کے لیے ہجرت کا نہایت تاکیدی حکم دیا جا چکا تھا، اس لیے جن لوگوں نے ہجرت کے حکم پر عمل نہیں کیا ان کو یہاں ظالم قرار دیا گیا ہے

اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

مگر وہ نہایت کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو نہ کسی تدبیر کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ کوئی راستہ پاتے ہیں ﴿۹۸﴾ تو یہ لوگ، اللہ قریب ہے کہ انھیں معاف کر دے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے ﴿۹۹﴾

اور ان کا ٹھکانا جہنم بتلایا گیا ہے، جس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ حالات اور موقع کے لحاظ سے اسلام کے بعض احکام کفر یا اسلام کے مترادف بن جاتے ہیں۔ جیسے اس موقع پر ہجرت کو اسلام اور اس سے گریز کو کفر کے مترادف قرار دیا۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ایسے دارالکفر سے ہجرت کرنا فرض ہے جہاں اسلام کی تعلیمات پر عمل مشکل اور وہاں رہنا کفر اور اہل کفر کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو۔

② قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ ...... : یعنی فرشتے ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں ان سے پوچھتے ہیں کہ تم مسلمان تھے یا کافر؟ یا دارالکفر میں پڑے کیا کرتے رہے اور مدینہ کی طرف ہجرت کیوں نہیں کی؟ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بلا عذر ترک ہجرت کی بنا پر ظالم کی موت مرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَ سَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ)) [أبو داوٗد، الجهاد، باب في الإقامة بأرض الشرك : ۲۷۸۷، عن سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ] ”جو شخص مشرک کے ساتھ اکٹھا رہے اور اس کے ساتھ سکونت رکھے تو یقیناً وہ اسی جیسا ہے۔“

آیت 98 ① اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ ...... : اس آیت میں ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو واقعی بے بس اور معذور تھے اور ہجرت نہیں کر سکتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”میں اور میری والدہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا۔“ [بخاري، التفسير، باب : ﴿ وما لكم لا تقاتلون...... ﴾ : ۴۵۸۸] ان لوگوں میں عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام وغیرہ بھی شامل ہیں جن کے حق میں رسول اللہ ﷺ کفار کے پنجے سے نجات کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ [بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ فاولئك عسى الله...... ﴾ : ۴۵۹۸]

② ابن عباس رضی اللہ عنہما کی والدہ ام الفضل بنت الحارث ہیں اور ان کا نام لبابہ ہے، جو ام المومنین میمونہ بنت الحارث کی بہن تھیں۔ ”بنات حارث“ نو بہنیں تھیں، ان میں سے ایک اسماء بنت عمیس خثعمیہ تھیں جو ماں کی طرف سے میمونہ کی بہن تھیں اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی۔ جعفر رضی اللہ عنہ کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آ گئیں۔ (قرطبی)

آیت 99 فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ : اللہ تعالیٰ کے لیے ”عَسٰی“ کا لفظ یقین کے لیے ہوتا ہے، اس لیے اگر کوئی شخص واقعی ہجرت نہیں کر سکتا، وہ کفار کی قید میں ہے، یا اسے راستے کا علم نہیں، یا اس کے پاس زادِ راہ نہیں، غرض کوئی بھی صحیح عذر ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے گا، مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امید کے انداز میں بات کرنے میں حکمت بھی ہے

وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّ سَعَةً ؕ وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع

اور وہ شخص جو اللہ کے راستے میں ہجرت کرے، وہ زمین میں پناہ کی بہت سی جگہ اور بڑی وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے نکلے، پھر اسے موت پا لے تو بے شک اس کا اجر اللہ پر ثابت ہو گیا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۰۰﴾

کہ بندے بے خوف نہ ہو جائیں۔

آیت 100 ❶ **مُرٰغَمًا** : یہ اسم ظرف ہے، یعنی ''مَوْضِعُ رَغْمِ الْاَعْدَاءِ'' دشمنوں کی ناک خاک آلود ہونے کی جگہ، جس سے دشمن ذلیل ہوں۔ ''**مُرٰغَمًا**'' کے معنی جگہ، جائے قیام اور جائے پناہ بھی آتے ہیں۔ ہجرت کر کے نکلنے کے بعد حاصل ہونے والی جائے قیام کو ''**مُرٰغَمًا**'' اس لیے فرمایا کہ وہ تمام دشمنوں کی ناک کو خاک آلود کر دیتی ہے۔ (قرطبی) اس آیت میں اگرچہ ان لوگوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جو مکہ اور دوسرے مقامات پر دار الکفر میں زندگی بسر کر رہے تھے اور ہجرت نہیں کر رہے تھے، لیکن یہ آیت عام ہے اور متعدد احادیث میں ہجرت کی ترغیب دی گئی ہے اور وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دشمنوں کو ذلیل و خوار کرے گا اور اس کی طرف سے بڑی وسعت بھی ملے گی۔

❷ **وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ**...... : اس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خلوصِ نیت سے ہجرت کرتے ہیں مگر راستے میں ان کا وقت آخر آ جاتا ہے تو ان کا اجر اللہ پر ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ اصل مدار نیت پر ہے، جیسا کہ مشہور حدیث ہے: « إِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » [بخاری، بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی ...... : ۱] ''تمام اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔'' چنانچہ خالد بن حزام رضی اللہ عنہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے نکلے، انھیں ایک سانپ نے ڈس لیا تو ان کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿ **وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ** ﴾ [ابن أبی حاتم : ۳۲۸/۴، ح : ۵۸۸۸، حسن] سو آدمیوں کو قتل کر کے ہجرت کرنے والے شخص کا قصہ بھی اس کی دلیل ہے۔

❸ ہجرت کے معنی ہیں دار الحرب سے دار السلام کی طرف منتقل ہونا، یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں فرض تھی اور اس کی فرضیت تا قیامت باقی ہے۔ جس ہجرت کو رسول اللہ ﷺ نے '' لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ '' (فتح کے بعد ہجرت نہیں) فرما کر منسوخ فرمایا ہے، وہ مکہ یا کسی بھی جگہ سے مدینہ کی طرف ہجرت تھی۔ اسی طرح اہل بدعت کی آبادی سے بھی ہجرت کرنی چاہیے، امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کسی شخص کے لیے ایسے مقام پر رہنا جائز نہیں جہاں سلف کو گالیاں دی جاتی ہوں۔'' علی ہذا القیاس جس علاقے میں حلال روزی نہ ملتی ہو، یا دین میں فتنے کا خوف ہو وہاں سے بھی ہجرت کرنی چاہیے۔ (قرطبی)

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کچھ کم کر لو، اگر ڈرو کہ تمھیں وہ لوگ فتنے میں ڈال دیں گے

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَنَا بَرِيءٌ مِنْ كُلِّ مُسْلِمٍ يُقِيمُ بَيْنَ أَظْهُرِ الْمُشْرِكِينَ » ''میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان مقیم ہو۔'' [أبو داؤد، الجهاد، باب النهي عن قتل من اعتصم بالسجود : ٢٦٤٥]

آیت 101 ① وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ ...... : قصر کا معنی کمی ہے، یہ کمی رکعات کی تعداد میں بھی مسنون ہے اور اگر خوف زیادہ ہو تو نماز کی ہیئت وشکل میں بھی کمی ہو سکتی ہے، مثلاً پیدل جاتے جاتے نماز پڑھ لینا۔ ظاہر ہے اس میں سجدہ اور رکوع تو پوری طرح ممکن نہیں، یا سواری پر اشارے سے نماز پڑھ لینا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳۹)۔ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو خالد بن سفیان کے قتل کے لیے بھیجا، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے لشکر تیار کر رہا تھا۔ عبد اللہ وہاں پہنچے تو عصر کا وقت قریب تھا، انھوں نے جاتے جاتے ہی نماز پڑھ لی۔ [أبو داؤد، صلاة السفر، باب صلاة الطالب : ١٢٤٩] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس کی سند کو حسن اور ابن کثیر نے جید کہا ہے۔ [هداية المستنير] عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی کی زبان سے حضر میں چار، سفر میں دو اور خوف میں ایک رکعت فرض کی ہے۔'' [مسلم، صلاة المسافرين، باب صلاة المسافرين و قصرها : ٦٨٧]

عام سفر میں مغرب اور صبح کی نماز کے علاوہ دوسری نمازوں میں چار کے بجائے دو رکعت پڑھنا قصر ہے۔ ''تم پر کچھ گناہ نہیں'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ حالت سفر میں قصر واجب نہیں، اس کی صرف اجازت ہے اور یہی اکثر علمائے سلف کا مسلک ہے، مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ سفر میں قصر پڑھی ہے، لہٰذا آپ کی سنت کو دیکھتے ہوئے امام شافعی، امام احمد ابن حنبل اور اکثر محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک قصر افضل ہے۔

② سفر سے مراد بظاہر تو عام سفر ہے، جسے عرف میں سفر کہا جاتا ہو، اب رہی میلوں یا دنوں کی مقدار کی تعیین تو نہ قرآن کی کسی آیت میں اس کا صاف ذکر ہے اور نہ نبی ﷺ کی کسی صریح حدیث میں۔ اس بنا پر جن ائمہ اور علماء نے کسی مقدار کی تعیین کی ہے، انھوں نے عموماً نبی ﷺ کے سفروں کو دیکھتے ہوئے اپنے اجتہاد سے کی ہے، تاہم سب سے قوی دلیل سفر کی مقدار کی تعیین میں صحیح مسلم (۶۹۱) میں مروی حدیث انس ہے، جس کی رو سے تین فرسخ (۹ کوس) تقریباً اکیس کلو میٹر سفر کرنا ہو تو شہر سے نکل کر قصر کر سکتے ہیں۔

③ کسی صحیح حدیث میں نبی ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کسی سفر میں فرض نماز سے پہلے یا بعد میں سنتیں ادا کی ہوں، ہاں رات کے وتر اور صبح کی سنتیں آپ ﷺ ہر سفر میں پڑھا کرتے تھے اور کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ (زاد المعاد: ۴۵۶/۱) صحابہ میں سے ابو بکر، عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا اسی پر عمل تھا۔ [بخاري، التقصير، باب من لم يتطوع في السفر دبر الصلاة : ١١٠٢]

④ مسافر اگر مقیم کے پیچھے نماز پڑھے گا تو قصر نہیں کرے گا۔ موسیٰ بن سلمہ فرماتے ہیں کہ ہم ابن عباس کے ساتھ مکہ میں تھے

اَنۡ یَّفۡتِنَکُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ؕ اِنَّ الۡکٰفِرِیۡنَ کَانُوۡا لَکُمۡ عَدُوًّا مُّبِیۡنًا ﴿۱۰۱﴾

جنھوں نے کفر کیا۔ بے شک کافر لوگ ہمیشہ سے تمھارے کھلے دشمن ہیں ﴿۱۰۱﴾

تو میں نے کہا جب ہم آپ کے ساتھ ہوتے ہیں تو چار رکعت پڑھتے ہیں اور جب اپنی رہائش کی جگہوں میں جاتے ہیں تو دو رکعت پڑھتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ''یہ ابو القاسم ﷺ کی سنت ہے۔'' [أحمد : ۱/ ۲۱٦، ح : ۱۸٦۷] اس کی ہم معنی روایت صحیح ابی عوانہ (۲/ ۳۴۰) میں ہے۔ [إرواء الغلیل، تحت الحدیث : ۵۷۱]

⑤ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَنۡ یَّفۡتِنَکُمُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ...... : یہ آیت چونکہ جہاد کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے، اس لیے اس میں نماز قصر کی اجازت کے ساتھ ''اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر تمھیں فتنے میں ڈال دیں گے'' کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ باقی رہا عام سفر، جس میں دشمن کا خوف نہ ہو تو اس میں قصر کے حکم کے بارے میں یہ آیت خاموش ہے، اسے نبی ﷺ نے اپنے قول و فعل سے واضح فرمایا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے سوال کیا: ''کیا وجہ ہے کہ لوگ ہر سفر میں قصر کر رہے ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں یہ حکم خوف کے ساتھ مقید ہے؟'' تو عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''خود مجھے بھی اس سے تعجب ہوا تھا اور میں نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ایک صدقہ ہے، جو اللہ نے تم پر کیا ہے، لہٰذا تم اس کا صدقہ قبول کرو۔'' [مسلم، صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ المسافرین و قصرھا : ٦٨٦] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت رب العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا مگر آپ نے دو ہی رکعت نماز پڑھی۔'' [نسائی، تقصیر الصلاۃ فی السفر، بابٌ : ١٤٣٦] انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے تو آپ نماز کی دو دو رکعتیں ادا فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم مدینہ واپس آ گئے۔'' حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ''آپ لوگوں نے مکہ میں کتنی دیر قیام کیا تھا؟'' تو انھوں نے جواب دیا: ''ہم نے دس دن قیام کیا تھا۔'' [بخاری، التقصیر، باب ما جاء فی التقصیر ...... : ١٠٨١]

ایک مرتبہ آپ نے مکہ میں انیس (۱۹) دن بھی قیام کیا تھا۔ [بخاری، المغازی، باب مقام النبی ﷺ بمکۃ زمن الفتح : ٤٢٩٨] جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ تبوک میں بیس دن ٹھہرے رہے اور نماز قصر کرتے رہے۔ [أحمد : ۳/ ۲۹۵، ح : ١٤١٣٩، و صححہ الألبانی فی الإرواء] نبی کریم ﷺ سے یہ مدت صراحت کے ساتھ نہیں آئی کہ کتنے دن کسی جگہ ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو قصر کر سکتا ہے۔ علماء کے اجتہادات مختلف ہیں، بعض نے فرمایا انیس دن ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو نماز پوری پڑھے، اس سے کم ہو تو قصر کرے۔ بعض نے یہ مدت پندرہ دن بیان فرمائی، بعض نے چار دن، مگر راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ جب تک کسی جگہ اقامت کا ارادہ نہ کرے قصر کر سکتا ہے۔ ثمامہ بن شراحیل فرماتے ہیں کہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس گیا تو ہم نے عرض کیا: ''مسافر کی نماز کیسے ہے؟'' انھوں نے فرمایا: ''دو دو رکعتیں سوائے مغرب کے کہ وہ تین رکعتیں ہے۔'' میں نے کہا ''یہ بتائیں اگر ہم ذوالمجاز میں ہوں؟'' انھوں نے فرمایا: ''ذوالمجاز کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''ایک جگہ ہے جس میں ہم جمع ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کرتے ہیں اور بیس راتیں یا پندرہ راتیں ٹھہرتے ہیں۔'' تو انھوں نے فرمایا: ''اے آدمی! میں آذربائیجان میں رہا، میں نہیں جانتا کہ انھوں نے چار مہینے کہا یا دو ماہ، تو میں نے انھیں دیکھا کہ وہ دو دو رکعت پڑھتے تھے اور میں نے اپنی

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ
فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ
وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ
اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ
مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

اور جب تو ان میں موجود ہو، پس ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک جماعت تیرے ساتھ کھڑی ہو اور وہ اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں، پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسری جماعت آئے جنھوں نے نماز نہیں پڑھی، پس تیرے ساتھ نماز پڑھیں اور وہ اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار پکڑے رکھیں۔ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا چاہتے ہیں کاش کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامانوں سے غفلت کرو تو وہ تم پر ایک ہی بار حملہ کر دیں۔ اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تمھیں بارش کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو، یا تم بیمار ہو کہ اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو اور اپنے بچاؤ کا سامان پکڑے رکھو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۰۲﴾

آنکھوں کے سامنے نبی ﷺ کو دو دو رکعت پڑھتے دیکھا۔‘‘ پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ [الأحزاب : ۲۱] [أحمد : ۸۳/۲، ح : ۵۵۵۲، و حسنه شعیب الأرنؤوط]

آیت 102 ① ﴿وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ ......﴾ : اس آیت میں صلاۃ الخوف کی اجازت بلکہ حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ خوف کی نماز کا وہ موقع ہے کہ جب دشمن موجود ہو اور اس کے حملے کا خطرہ ہو، عملاً جنگ نہ ہو رہی ہو، لیکن ذرا سی غفلت بڑے نقصان کا باعث بن سکتی ہو، ایسے حالات میں اگر نماز کا وقت ہو جائے تو صلاۃ الخوف پڑھنے کا حکم ہے، جس کی مختلف صورتیں حدیث میں بیان کی گئی ہیں، مثلاً فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک حصہ (گروہ) دشمن کے بالمقابل کھڑا رہا، تا کہ کافروں کو حملہ کرنے کی جسارت نہ ہو اور ایک حصے نے آ کر نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، جب یہ حصہ نماز سے فارغ ہو گیا تو یہ پہلے کی جگہ مورچہ زن ہو گیا اور مورچہ زن حصہ نماز کے لیے آ گیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے دونوں حصوں کو ایک ایک رکعت پڑھائی، اس طرح آپ ﷺ کی دو رکعت اور باقی فوجیوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ دو، دو رکعات پڑھائیں، اس طرح آپ کی چار رکعت اور فوجیوں کی دو، دو رکعت ہوئیں۔ نیز بعض میں آتا ہے کہ ایک رکعت پڑھ کر

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

پھر جب تم نماز پوری کر لو تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے یاد کرو، پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ تو نماز قائم کرو۔ بے شک نماز ایمان والوں پر ہمیشہ سے ایسا فرض ہے جس کا وقت مقرر کیا ہوا ہے ﴿۱۰۳﴾

التحیات کی طرح بیٹھے رہے، فوجیوں نے کھڑے ہو کر اپنے طور پر ایک رکعت اور پڑھ کر دو رکعات پوری کیں اور دشمن کے سامنے ڈٹ گئے، دوسرے حصے (گروہ) نے آ کر نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ نے انھیں بھی ایک رکعت پڑھائی اور التحیات میں بیٹھ گئے اور اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک فوجیوں نے دوسری رکعت پوری نہیں کر لی، پھر ان کے ساتھ آپ ﷺ نے سلام پھیر دیا، اس طرح آپ کی بھی دو رکعت اور فوج کے دونوں حصوں کی بھی دو رکعات ہوئیں۔

② ابن العربی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چودہ مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھی ہے اور امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صلاۃ الخوف میں تمام احادیث صحیح اور ثابت ہیں، لہٰذا جس صورت میں نماز ادا کر لی جائے جائز ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب احادیث کا مرجع چھ سات صورتوں کی طرف ہے، جن میں سے ہر صورت پر حسب موقع عمل کیا جا سکتا ہے۔ (زاد المعاد: ۵۱۲/۱) امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے صلاۃ الخوف کی صورتیں صحیح سندوں کے ساتھ بہت تفصیل سے ذکر فرمائی ہیں۔ یہ تمام صورتیں اس وقت ہیں کہ جب جماعت ممکن ہو، اگر ممکن نہ ہو تو اکیلا پڑھ لے، پیادہ یا سوار یا اشارے سے، جس طرح ہو سکے ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ [البقرۃ: ۲۳۹] "پھر اگر تم ڈرو تو پیدل پڑھ لو یا سوار۔" اگر جنگ جاری ہو اور اشارے سے بھی نہ پڑھ سکے تو بعد میں قضا کر کے پڑھ لے۔ صحیح بخاری میں ہے، انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تُستر قلعے کی فتح کے وقت موجود تھا، جب فجر روشن ہو رہی تھی اور لڑائی شدید بھڑک اٹھی تھی تو ہم نماز پڑھ ہی نہ سکے، چنانچہ دن بلند ہونے کے بعد ہی نماز پڑھی۔ ہم نے وہ نماز ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پڑھی، اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔ انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "مجھے دنیا و مافیہا مل جائے تب بھی اتنی خوشی نہ ہو، جتنی اس نماز سے ہوئی۔" [بخاري، صلاة الخوف، باب الصلاة عند مناهضة الحصون و لقاء العدو، قبل ح: ۹۴۵]

آیت 103 ① فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ ...... : یعنی صلاۃ الخوف میں نماز کی حالت میں اذکار پورے نہیں ہو سکتے، اس لیے نماز پوری ہونے پر کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرو، تاکہ تلافی ہو جائے، اس کے علاوہ ہر حال ہی میں ذکر کی کثرت ہونی چاہیے۔ جنگ کے موقع پر تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا خاص حکم دیا، فرمایا: ﴿اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ [الأنفال: ۴۵] "جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جمے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

② فَإِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ : یعنی جب خوف کی حالت ختم ہو جائے اور دشمن کا کوئی خطرہ نہ رہے تو نماز کو اس کے پورے ارکان و شرائط اور حدود کے ساتھ مقررہ اوقات پر ادا کرو۔ ہاں سفر میں رسول اللہ ﷺ نے ظہر و عصر اور مغرب و عشاء

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ ۱۵/۱۲ ع
بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾

اور اس قوم کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو، اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو یقیناً وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں، جیسے تم تکلیف اٹھاتے ہو اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۰۴﴾ بے شک ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دکھایا ہے اور تو خیانت کرنے والوں کی خاطر جھگڑنے والا نہ بن ﴿۱۰۵﴾

جمع کر کے پڑھی ہیں، جیسا کہ عرفات، مزدلفہ اور دوسرے سفروں میں جمع کیا ہے، تو سفر میں جمع کرنے کی رعایت بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے پاس سے تو وقت مقرر کرنے کا اختیار ہی نہ تھا۔ اس لیے اس کا وقت وہی ہے۔

آیت 104 **وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ** ...... یہ آیت اس آیت سے ملتی جلتی ہے: ﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ﴾ [آل عمران : ۱٤٠] ''اگر تمھیں کوئی زخم پہنچے تو یقیناً ان لوگوں کو بھی اس جیسا زخم پہنچا ہے۔'' قرطبی نے جنگ احد میں زخم کھانے کے باوجود کفار کا پیچھا کرنے کو اس آیت کی شان نزول بتایا ہے، مگر الفاظ عام ہیں، اس لیے اس واقعہ کے علاوہ ہر ایسے موقع پر یہی حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمت افزائی ہے کہ درد و الم میں تو تم یکساں ہو مگر اللہ سے اجر کی امید میں تمھارا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں، تو پھر ان کا پیچھا کرنے میں کیوں ہمت ہارتے ہو؟

آیت 105 ① **اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ** ...... : جمہور مفسرین نے ان آیات (۱۰۴ سے ۱۱۳ تک) کی شان نزول چوری کا ایک واقعہ بتایا ہے، جو ترمذی میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اور شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ بشر، بشیر اور مبشر تین بھائی تھے، جو اُبیرق یا طعمہ بن اُبیرق کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا کہ ان میں سے بشیر کی کنیت ابوطعمہ تھی، یہ لوگ مدینہ کے قبیلہ بنوظفر سے تھے۔ ان میں بشیر سب سے بدتر تھا، یہ شخص منافق تھا اور مسلمانوں کی ہجو کر کے وہ شعر دوسروں کے نام لگا دیتا تھا۔ یہ غریب فاقہ زدہ لوگ تھے اور رفاعہ بن زید کے ہمسائے تھے۔ ایک دفعہ شام سے ایک قافلہ میدہ لے کر آیا تو رفاعہ بن زید نے اس میں سے ایک بوری خرید لی۔ مدینہ کے لوگ آٹا کھاتے تھے، رہا میدہ تو وہ گھر کے بڑے آدمیوں کے لیے سنبھال کر رکھ لیا جاتا تھا۔ رفاعہ نے وہ میدہ اپنے اسلحہ کے سٹور میں اسلحہ کے ساتھ محفوظ کر دیا۔ اُبیرق کے بیٹوں نے سٹور میں نقب لگا کر میدہ اور اسلحہ چرا لیا۔ صبح ہوئی تو رفاعہ نے اپنا اسلحہ اور میدہ نقب لگا کر چرانے کی بات اپنے بھتیجے قتادہ بن نعمان کے ساتھ کی۔ اب اس نے تفتیش شروع کی تو معلوم ہوا کہ اس رات ابیرق کے بیٹوں نے آگ جلائی تھی اور شاید انھوں نے رفاعہ کے میدہ ہی سے کھانا تیار کیا ہو۔ جب ابیرق کے بیٹوں کا راز فاش ہو گیا تو انھوں نے چوری کا وہ اسلحہ وغیرہ ایک یہودی کے گھر پھینک دیا اور ان کے قبیلے بنوظفر کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہلے ہی آ کر شکایت کر دی کہ رفاعہ بن زید اور اس کے بھتیجے نے ہمارے ایک گھر والوں پر، جو ایمان دار اور نیک لوگ ہیں،

وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ
اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ۚۙ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا
يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

اور اللہ سے بخشش مانگ، یقیناً اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۰۶﴾ اور ان لوگوں کی طرف سے جھگڑا نہ کر جو اپنی جانوں سے خیانت کرتے ہیں، یقیناً اللہ ایسے شخص سے محبت نہیں کرتا جو ہمیشہ بہت خائن، سخت گناہ گار ہو ﴿۱۰۷﴾ وہ لوگوں سے چھپاؤ کرتے ہیں اور اللہ سے چھپاؤ نہیں کرتے، حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتا اور اللہ ہمیشہ اس کا جو وہ کرتے ہیں، احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۰۸﴾

چوری کا الزام لگا دیا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے بلا دلیل ایمان دار نیک لوگوں پر چوری کا الزام لگا دیا ہے۔'' ان لوگوں نے مشہور کر دیا کہ مسروقہ سامان یہودی کے گھر سے نکلا ہے، تو اس پر یہ آیات اتریں۔ [ترمذی، التفسیر، باب و من سورة النساء : ۳۰۳۶] اللہ تعالیٰ نے معاملے کی حقیقت کھول دی، تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ جرم تو بنوابیرق کا تھا، مگر مجرم یہودی کو بنا دیا گیا، کیونکہ وہ اپنا نہیں تھا۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کے انصاف پر بہت بڑا دھبا آ سکتا تھا۔

② **وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا**: اس سے مراد ابیرق کے بیٹے ہیں کہ آپ ان کی حمایت نہ کریں، اس سے معلوم ہوا کہ آپ عالم الغیب نہیں تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانے کی ضرورت نہ تھی کہ ''آپ ان خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا نہ کریں۔''

آیت 106 **وَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ** ...... : یعنی جو حمایت آپ نے کی اس کی مغفرت طلب کریں۔ ایک معنی مفسرین نے یہ بھی کیا ہے کہ ان گناہ گاروں کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات قاضی ایک فریق کی چرب زبانی کی وجہ سے اس کے حق میں فیصلہ دے دے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح نہیں ہو جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خبردار! میں ایک انسان ہی ہوں اور جس طرح سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں، ممکن ہے ایک شخص اپنی دلیل و حجت پیش کرنے میں تیز طرار اور ہوشیار ہو اور میں اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، حالانکہ وہ حق پر نہ ہو اور اس طرح میں دوسرے مسلمان کا حق اسے دے دوں، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ وہ آگ کا ٹکڑا ہے، اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔''
[بخاری، المظالم، باب إثم من خاصم...... : ۲۴۵۸]

آیت 107 **وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ** ...... : مطلب یہ کہ یہ لوگ جنھوں نے دوسروں کی خیانت کی ہے، درحقیقت سب سے پہلے انھوں نے اپنی جانوں سے خیانت کی ہے، کیونکہ دوسروں سے دغا کرنے والا پہلے اپنے آپ سے دغا کرتا ہے۔

آیت 108 **يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ** ...... : یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ گناہوں کا ارتکاب کرنے میں لوگوں سے چھپاؤ تو کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے چھپاؤ نہیں کرتے، جو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کی گھڑیوں میں نامناسب

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ عَنۡهُمۡ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۟ فَمَنۡ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنۡهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَمۡ مَّنۡ يَّكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا ﴿۱۰۹﴾ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا يَكۡسِبُهٗ عَلٰى نَفۡسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۱۱﴾

سن لو! تمھی وہ لوگ ہو جنھوں نے ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا، تو ان کی طرف سے اللہ سے قیامت کے دن کون جھگڑے گا، یا کون ان پر وکیل ہوگا؟ ﴿۱۰۹﴾ اور جو بھی کوئی برا کام کرے، یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش مانگے وہ اللہ کو بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان پائے گا ﴿۱۱۰﴾ اور جو شخص کوئی گناہ کمائے تو وہ اسے صرف اپنی جان پر کماتا ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۱۱﴾

کاموں کے مشورے کر رہے ہوتے ہیں، وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، اس سے بچ کر کہاں جائیں گے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے کے مطلب کے لیے دیکھیے سورۂ حدید (۴) اور سورۂ مجادلہ (۷)۔

آیت 109 هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلۡتُمۡ ...... : یہ ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جو ابیرق کے بیٹوں کی طرف سے وکالت اور بحث کرتے تھے۔

آیت 110 وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ...... : مزید آیات دیکھیے سورۂ زمر (۵۳، ۵۴) سورۂ فرقان (۶۸ تا ۷۱) اور سورۂ آل عمران (۱۳۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی آدمی جب جو کوئی گناہ کرے، پھر اٹھ کر اچھی طرح وضو کرے، پھر اللہ سے معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دیتا ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِيۡنَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَةً اَوۡ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسۡتَغۡفَرُوۡا لِذُنُوۡبِهِمۡ ۟ وَمَنۡ يَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [آل عمران : ۱۳۵] ''اور وہ لوگ جب کوئی بے حیائی کرتے ہیں، یا اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، پس اپنے گناہ کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون بخشتا ہے۔'' [ترمذی، الصلاۃ، باب ما جاء فی الصلاۃ عند التوبۃ : ۴۰۶]

اس آیت میں ہر قسم کے گناہوں کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کی جائے۔ ''سُوۡٓءًا'' وہ گناہ جن سے انسان اپنے علاوہ دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے، جیسے جھوٹی شہادت اور بے گناہ کو متہم کرنا اور ''اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ'' سے ان گناہوں کی طرف اشارہ ہے جن سے انسان صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے، جیسے نماز چھوڑنا اور شراب پینا وغیرہ۔

آیت 111 ''كَسَبَ'' کا لفظ کسی شخص کے اس فعل پر بولا جاتا ہے جس سے اسے کوئی نفع یا نقصان حاصل ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ نفع و نقصان سے غنی ہے، اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف ''كَسَبَ'' کی نسبت نہیں ہو سکتی۔ (قرطبی) یعنی جو گناہ کرے گا وہی

ع ۱۶
وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ
وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور جو بھی کوئی خطا، یا گناہ کمائے پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو یقیناً اس نے بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا ﴿۱۱۲﴾ اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً ان کے ایک گروہ نے ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے غلطی میں ڈال دیں، حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو غلطی میں نہیں ڈال رہے اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا رہے اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر ہمیشہ سے بہت بڑا ہے ﴿۱۱۳﴾

اس کی سزا بھگتے گا، کوئی دوسرا اس گناہ میں نہیں پکڑا جائے گا، دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [بنی إسرائیل : ۱۵] ”اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھاتی۔“

آیت 112 ”خَطِيْٓئَةً“ کا لفظ غیر ارادی گناہ پر بولا جاتا ہے اور اس کے برعکس ”اِثْمًا“ وہ گناہ ہے جو ارادی طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ خود گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد کسی بے قصور آدمی کو اس میں ملوث کرنے کی کوشش کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور کسی بے گناہ شخص پر تہمت لگانے کو بہتان کہا جاتا ہے۔ (قرطبی)

آیت 113 ① وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ …… : اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر یہ تھی کہ آپ کو وحی کے ذریعے سے اصل واقع کی حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ ورنہ وہ طائفہ جو بنو ابیرق کا حامی تھا، آپ کو قائل کر کے انھیں بری کرانے ہی والا تھا، اس کا نتیجہ صرف یہی نہ تھا کہ ایک مجرم بچ جاتا اور ایک بے گناہ مجرم بن جاتا، بلکہ اس کے نتائج بہت دور رس تھے، جس سے مسلمانوں کی ساکھ اور کردار مجروح ہو جاتا۔ فرمایا ایسے لوگ درحقیقت اپنی عاقبت برباد کر کے اپنا ہی نقصان کر رہے تھے، آپ کا محافظ خود اللہ تعالیٰ تھا، آپ کو وہ نہ دھوکا دے سکتے تھے نہ آپ کا کچھ نقصان کر سکتے تھے۔

② وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ : یعنی آپ کو وحی کے ذریعے سے وہ کچھ سکھایا جو آپ جانتے نہ تھے، بلکہ جس کی آپ امید بھی نہ رکھتے تھے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۴۸، ۴۹)، سورۂ قصص (۸۶)، سورۂ شوریٰ (۵۲) اور سورۂ ہود (۴۹) یہ ہے اللہ کا آپ پر فضل عظیم۔ بعض لوگ اس سے رسول اللہ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کی دلیل پکڑتے ہیں، حالانکہ یہی الفاظ اللہ نے ہر انسان کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں: ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ [العلق : ۵] ”اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“ پھر ہر انسان کا عالم الغیب ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کے جو کسی صدقے یا نیک کام یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دے اور جو بھی یہ کام اللہ کی رضا کی طلب کے لیے کرے گا تو ہم جلد ہی اسے بہت بڑا اجر دیں گے ﴿۱۱۴﴾

آیت 114 ① لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ ......: " نَجْوَى " کچھ لوگوں سے علیحدہ ہو کر صلاح مشورہ کو کہتے ہیں، یہ مصدر ہے اور مبالغہ کے طور پر " عَدْلٌ " اور " رِضًى " کی طرح جمع پر بھی بولا جاتا ہے اور "اِلَّا" کے بعد " نَجْوَى" محذوف ہے، یعنی '' إِلَّا نَجْوَى مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ '' یعنی ان کی بہت سی سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں، سوائے اس شخص کی سرگوشی کے جو صدقے کا حکم دے۔

" بِصَدَقَةٍ " صدقہ اس مال کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا جائے۔ یہ اصل میں نفل پر بولا جاتا ہے لیکن بعض اوقات فرض پر بھی بول دیتے ہیں، جیسے: ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ﴾ [التوبة : ٦٠] مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ عمل دل کے صدق سے ادا ہو رہا ہے۔ (راغب) " مَعْرُوْفٍ " یہ لفظ نیکی کے تمام کاموں کو شامل ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا اپنے بھائی کو کھلے چہرے سے ملنا بھی معروف میں سے ہے۔'' [ترمذی، البر والصلة، باب ما جاء فی طلاقة الوجه ...... : ۱۹۷۰، عن جابر رضی اللہ عنہ و صححه الألبانی]

" اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ " کے الفاظ مسلمانوں کے درمیان ہر قسم کے اختلافات ختم کرنے کو شامل ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ﴾ [الأنفال : ۱] ''سو اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔''

ام کلثوم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: ''وہ شخص جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے اور (اس مقصد کے لیے) کوئی اچھی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے یا اچھی بات کہتا ہے۔'' [بخاری، الصلح، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس : ۲٦۹۲]

② منافق لوگ جو راتوں کو الگ بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں، وہ اکثر اوقات بری باتیں ہی سوچتے ہیں، جو خیر سے خالی ہوتی ہیں، کیونکہ بھلائی کی بات اور صاف ستھری بات کو چھپانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ کام چھپا کر کرنا بہتر ہوتے ہیں، مثلاً کسی کو صدقہ دے تو چھپا کر دے، تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو، یا صدقہ دینے سے متعلق الگ مشورہ بھی اچھا کام ہے۔ اسی طرح بھلائی کے کاموں اور بالخصوص لوگوں کے درمیان صلح کرانے سے متعلق اگر خفیہ مشورہ بھی کیا جائے تو یہ بھی ایک نیکی کا عمل ہے، لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ ان امور میں سے تو کسی بات کا مشورہ نہیں کرتے، بلکہ ایسے مشورے کرتے ہیں جن سے شر پیدا ہو اور دوسروں کو نقصان پہنچے اور جو شخص مذکورہ بالا امور سے متعلق محض اللہ کی رضا کے لیے مشورہ کرے تو یہ بڑی نیکی کے کام ہیں۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع

اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے ﴿۱۱۵﴾

آیت 115 ① وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ ......: "يُّشَاقِقِ" "شق" سے باب مفاعلہ کا فعل مضارع معلوم ہے۔ "شق" کا معنی طرف، کنارہ ہے، یعنی جو شخص یا گروہ رسول اللہ ﷺ کی اس طرح مخالفت کرے کہ آپ کے مقابلے میں آ جائے، ایک طرف اللہ کے رسول ہوں دوسری طرف یہ شخص یا گروہ ہو اور حق معلوم ہو جانے کے باوجود مومنوں کے سیدھے اور صاف راستے سے (جو ہر حال میں اتباع رسول ہے) ہٹ جائے، تو ہم بھی اسے اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ پھرے گا اور اسی ٹیڑھی راہ پر جانے دیں گے جو اسے لے جا کر جہنم میں ڈال دے گی اور وہ بہت برا راستہ ہے۔

② ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے کی پیروی کرنا درحقیقت دین اسلام ہی سے نکل جانا ہے، جس پر یہاں جہنم کی وعید بیان فرمائی گئی ہے۔ مومنین سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو دین اسلام کے سب سے پہلے پیروکار اور اس کی تعلیم کا مکمل نمونہ تھے اور ان آیات کے نزول کے وقت جن کے سوا کوئی اور گروہ مومنین کا موجود نہ تھا، جو یہاں مراد ہو سکے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور غیر سبیل المومنین کی پیروی دونوں حقیقت میں ایک ہی چیز کا نام ہے، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستے سے ہٹنا بھی کفر اور گمراہی ہے۔ بعض علماء نے "سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ" سے مراد اجماع امت لیا ہے، یعنی پوری امت کے اجماع سے انحراف بھی کفر ہے۔ اجماعِ امت کا مطلب ہے کسی مسئلے میں امت کے تمام علماء و فقہاء کا اتفاق، یا کسی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو، یہ دونوں صورتیں اجماعِ امت کی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تو بہت سے مسائل میں ملتا ہے، یعنی اجماع کی یہ صورت تو ملتی ہے لیکن اجماعِ صحابہ کے بعد کسی مسئلے میں پوری امت کے اجماع و اتفاق کے دعوے تو بہت مسائل میں کیے گئے ہیں، لیکن ایسے اجماعی مسائل بہت کم ہیں جن میں فی الواقع امت کے تمام علماء و فقہاء میں اتفاق ہو، پھر ایسے مسائل پر سب علماء و فقہاء کے اتفاق کا پتا چلانا اور بھی مشکل ہے۔ پھر امت میں بہت سے فرقوں کے بن جانے نے یہ نتیجہ دکھایا ہے کہ ہر گروہ اپنی بات کو مضبوط بنانے کے لیے اجماع کا دعویٰ کر دیتا ہے، خواہ وہ صریحاً قرآن و حدیث کے خلاف ہو، مثلاً قبروں پر عمارت بنانا، ان پر غلاف چڑھانا، چراغ جلانا، غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا، تعزیہ نکالنا، انبیاء کو انسان نہ سمجھنا، انھیں خدائی اوصاف دینا، میلاد، گیارھویں، تیجہ، ساتواں، دسواں، چالیسواں، عرس، میلے، پیر کا تصور باندھنا، اس کی ہر صحیح و غلط بات ماننا، الغرض! صریح شرک و بدعت کے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا اور جو اللہ کے ساتھ شریک بنائے تو یقیناً وہ بھٹک گیا، بہت دور بھٹکنا ﴿۱۱۶﴾

کاموں کو اجماع کا نام دے دیا گیا ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ایسے مسائل جن پر فی الواقع پوری امت کے علماء و فقہاء کا اجماع ہوان کا انکار بھی صحابہ کے اجماع کے انکار کی طرح کفر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔'' [ترمذی، الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعة : ۲۱۶۷، و صححه الألبانی]

❸ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا: اس آیت میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جو نبی ﷺ کی سنت اور سلف صالحین کے مسلک سے منہ موڑ کر دوسروں کی پیروی کرتے ہیں اور آئے دن نئی بدعات ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تقلید کی ایجاد بھی بعد کی صدیوں میں ہوئی، سلف صالحین کے دور میں اس کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے اور نہ کتاب و سنت کی دلیل سے اس کی کوئی گنجائش نکلتی ہے۔

آیت 116 ❶ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ......: پچھلی آیت میں اس شخص کا ذکر ہے جو رسول کی مخالفت کرتا ہے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرتا ہے۔ ایسا وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے کفر پر اصرار کرے اور دینِ اسلام قبول نہ کرے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے کفر پر اڑنے کو شرک قرار دیا اور صراحت فرما دی کہ اس کی بخشش کی کوئی صورت نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص دینِ اسلام قبول کر لے، اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دے، اس کا عملی ثبوت دے اور ایسے فعل سے بچا رہے جس سے آدمی ملتِ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تو پھر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے چاہے تو ویسے ہی معاف کر دے یا سزا دے کر جنت میں داخل کر دے۔ مگر جو شخص اسلام ہی قبول نہ کرے، یا اسلام لا کر صریح ارتداد والے اعمال کا ارتکاب کرے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی نہیں، کیونکہ ایسے معافی دینے کا مقصد باغی اور غدار کو معافی دینا ہے جو اپنی بغاوت اور عذر پر قائم ہو۔ بغاوت کو کوئی معمولی سے معمولی بادشاہ بھی برداشت نہیں کرتا، تو بادشاہوں کا بادشاہ، جس کی غیرت بے پناہ ہے، وہ بغاوت کو کیسے معاف کر سکتا ہے؟ معلوم ہوا ابدی جہنمی صرف کفار و مشرکین ہوں گے، مسلمان گناہ گار ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔ اس سے ان لوگوں کا رد نکلتا ہے جو کبیرہ گناہ کے مرتکب مسلم کو دائمی جہنمی کہتے ہیں۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۴۸)۔

❷ اوپر سے منافقوں کا ذکر آ رہا ہے جو پیغمبر ﷺ کے فیصلوں کو پسند نہ کرتے اور جدا راستے پر چلتے تھے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا، تو معلوم ہوا کہ اسلام کے سوا کسی دوسرے دین (طریقہ) کو محبوب رکھا جائے اور اس کو معمول

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ إِنَٰثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَٰنًا مَّرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ ٱللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾

وہ اس کے سوانہیں پکارتے مگر مؤنثوں کواورنہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو ﴿١١٧﴾ جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس نے کہا کہ میں ہرصورت تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ ضرور لوں گا ﴿١١٨﴾

بنایا جائے تو یہ شرک ہے، کیونکہ اسلام کے سوا جو دین بھی ہے شرک ہے، اگر چہ پرستش کا شرک نہ بھی کیا جائے۔ (موضح)

آیت 117 ❶ "إِنَاثًا" "أُنْثَى" کی جمع ہے، یعنی مؤنث۔ ان سے مراد یا تو بت ہیں جن کے اکثر نام (لات، مناۃ، عزیٰ وغیرہ) مؤنث تھے۔ یونانیوں اور ہندوؤں نے بھی عبادت کے لیے دیویاں بنا رکھی ہیں۔ مسلمانوں نے ان کی دیکھا دیکھی ایسی ہستیوں میں ایسے اوصاف مشہور کر رکھے ہیں جیسے وہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی محبوبائیں ہوں، بلکہ ان کے خیال میں جو پہنچے ہوئے ہیں وہ اپنی وضع قطع بھی عورتوں والی بنا کر رکھتے ہیں، وہی چوڑیاں وہی زیور وغیرہ، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی جو عورت کا سا لباس پہنے اور اس عورت پر جو مرد کا سا لباس پہنے۔ [صحیح ابن حبان: ۵۷۵۲، عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ و صححہ محققہ]

❷ إِن يَدْعُونَ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شرک کی وضاحت اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارنے کے ساتھ کی ہے، کیونکہ عبادت میں اصل ہے ہی پکارنا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) "پکارنا ہی تو عبادت ہے" [ترمذی، الدعوات، باب منہ [الدعاء مخ العبادۃ] : ۳۳۷۲۔ أبو داوٗد : ۱۴۷۹] اور دیکھیے سورۂ مومن (۶۰) جو شخص بھی غیبی مدد کے لیے کسی کو اللہ کے سوا پکارتا ہے وہ مشرک ہے، کیونکہ عبادت اسی پکارنے ہی کا نام ہے، بلکہ عبادت کی جتنی بھی صورتیں ہیں، یعنی قیام، رکوع، سجدہ، نذر و نیاز اور پکارنا وغیرہ، ان سب کا اصل مقصد کسی کو غیبی قوتوں کا مالک جان کر مانگنا ہی ہوتا ہے، کوئی اللہ کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے تو اس سے مانگتا ہے، غیر اللہ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے مانگتا ہے۔

❸ شَيْطَٰنًا مَّرِيدًا: بتوں، فرشتوں، دیوی دیوتاؤں اور دوسری ہستیوں کی عبادت کرنے والے اپنے خیال میں جس کی بھی عبادت کرتے رہیں حقیقت میں وہ سرکش شیطان ہی کی عبادت کر رہے ہیں، کیونکہ شیطان ہی انھیں اللہ کے دروازے سے ہٹا کر دوسروں کے آستانوں اور چوکھٹوں پر جھکاتا ہے، جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔ جن لوگوں کی یہ پوجا کرتے ہیں، انھیں تو خبر ہی نہیں کہ کوئی ہمیں پکار رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۵، ۶) اور یونس (۲۸، ۲۹) یہ لوگ صرف شیطان کے کہنے پر اپنے وہم و گمان سے بنائی ہوئی ہستیوں کو پوج رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۲۳) اور یونس (۶۶)۔

آیت 118 نَصِيبًا مَّفْرُوضًا: یعنی تیرے بندوں میں سے ایک گروہ کو اپنی راہ پر ڈال لوں گا، وہ اپنے مال میں میرا حصہ مقرر رکھیں گے، جیسے بتوں اور قبروں کے نام کی نذر و نیاز نکالی جاتی ہے۔ (موضح) جتنے گمراہ دوزخی ہیں سب نصیب شیطان (شیطان کے حصے) میں شامل ہو رہے ہیں۔ (قرطبی) شیطان ملعون اپنی سرکشی سے خود بھی گمراہ ہوا اور انسانوں کو گمراہ کرنے پر بھی اسکی

وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

اور یقیناً میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور آرزوئیں دلاؤں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور چوپاؤں کے کان کاٹیں گے اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے اور جو کوئی شیطان کو اللہ کے سوا دوست بنائے تو یقیناً اس نے خسارہ اٹھایا، واضح خسارہ ﴿۱۱۹﴾

کمر باندھی کہ نہ دشمنی چھپاتا ہے اور نہ دشمنی سے باز آتا ہے۔

آیت 119 ❶ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ …… : یہ وہ باطل امیدیں ہیں جو شیطان انسان کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ گناہ کرتے رہو اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے، ایمان مسلمان کے دل میں ہونا چاہیے، نماز پڑھنے اور دوسرے نیک اعمال کی کیا ضرورت ہے، یا ابھی جلدی کیا ہے، مرتے وقت توبہ کر لیں گے، یا جن بزرگوں اور پیروں کا تم دم بھرتے ہو ان کا اللہ پر بڑا زور ہے، تم ان کا دامن تھام لینا وہ تمھیں سیدھے جنت میں لے جائیں گے وغیرہ۔ اس قسم کے تمام خیالات اور گمان شیطانی آرزوؤں میں داخل ہیں۔ (قرطبی، ابن کثیر)

❷ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ : ''بتك'' کا معنی قطع کرنا ہے، یعنی غیر اللہ کے نام پر جانوروں کے کان کاٹ کر ان پر سواری کرنا حرام سمجھیں گے، جنھیں بحیرہ وسائبہ وغیرہ کہتے تھے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۰۳)۔

❸ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ …… : یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پیدا کی ہیں ان کی شکل وصورت تبدیل کریں گے اور ان کے حلال وحرام ہونے کے احکام بھی بدل دیں گے۔ اس میں رہبانیت (دنیا میں اپنی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کر کے جنگل میں جا رہنا)، قوم لوط کا عمل، مردوں کا خصی ہو کر ہیجڑا بن جانا، عورتوں کو بانجھ بنانا، برتھ کنٹرول کے نام پر مردوں کی نس بندی اور عورتوں کے آپریشن کر کے بچے پیدا ہونے میں رکاوٹیں ڈالنا، عورتوں کو گھروں سے نکال کر ان کے فطری فرائض سے سبکدوش کر کے مردوں کی صف میں کھڑا کر دینا، عورتوں کو مملکت کی سربراہ بنا دینا، خوب صورتی کے لیے ابروؤں کے بال اکھاڑنا، جلد میں نیل وغیرہ بھر کر نقش و نگار بنانا، دانت باریک کروانا، سر پر مصنوعی بال لگوانا، مردوں کا داڑھی منڈوانا، عورتوں کا لباس کم از کم کر کے انھیں ننگا کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب شیطانی کام ہیں اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کا موجب ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے لعنت کی گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر (جلد میں نیل یا سرمہ بھر کر نقش بنوانے والیوں)، چہرے کے بال صاف کرنے والیوں اور کروانے والیوں پر اور حسن کے لیے دانتوں میں فاصلہ کروانے والیوں پر جو اللہ عزوجل کی خلق (پیدائش) کو بدلتی ہیں۔'' پھر فرمایا: ''میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی اور وہ اللہ کی کتاب میں بھی ہے'' اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر : ۷] ''جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو، جس سے منع کر دے اس سے باز آ جاؤ۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ وما آتاکم الرسول فخذوہ ﴾ : ٤٨٨٦]

يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۫ وَ لَا
يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ
بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا
وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

وہ انھیں وعدے دیتا ہے اور انھیں آرزوئیں دلاتا ہے اور شیطان انھیں دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتا ﴿۱۲۰﴾ یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے ﴿۱۲۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، عنقریب ہم انھیں ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہمیشہ۔ اللہ کا وعدہ ہے سچا اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے ﴿۱۲۲﴾ نہ تمھاری آرزوؤں پر (موقوف ہے) اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا دی جائے گی اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائے گا اور نہ کوئی مدد گار ﴿۱۲۳﴾

آیت 121،120 ابلیس کے پاس جھوٹے وعدوں، غلط آرزوؤں اور وسوسوں کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ اس کے سب وعدے جھوٹے اور سراسر دھوکا ہیں، بظاہر خوش نما، اندر سے مہلک ہیں۔ دیکھیے سورۂ فاطر (۵، ۶) اور سورۂ ابراہیم (۲۲) اور ظاہر ہے کہ اپنے دشمن کو پہچانتے ہوئے پھر اس کے وعدوں پر اعتبار اور غلط آرزوؤں کو سچ سمجھنے کا نتیجہ جہنم کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

آیت 122 جس طرح شیطان اپنی پیروی کرنے والوں سے وعدے کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے نیک بندوں سے جنت اور بلند درجات کے وعدے فرماتا ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے اور بات میں کون سچا ہو سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ [النساء : ۸۷] ”اور اللہ سے زیادہ بات میں کون سچا ہے۔“

آیت 122 ① لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ ...... : اہل کتاب کا خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں، جن گناہوں پر لوگ پکڑے جائیں گے ہم نہیں پکڑے جائیں گے، ہمارے پیغمبر ہماری حمایت کریں گے، ہم صرف چند دن جہنم میں رہیں گے۔ (دیکھیے بقرہ: ۸۰) جنت میں صرف ہم جائیں گے۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۱۱) آج کل کچھ نادان مسلمان بھی اپنے حق میں یہ خیال رکھتے ہیں، سو اللہ نے فرمایا کہ برا کام جو کرے گا، کوئی ہو، سزا پائے گا، کسی کی حمایت کام نہیں آئے گی۔ اللہ کا پکڑا وہی چھوڑے تو چھوٹے۔ دنیا کی مصیبت پر آدمی قیاس کر لے۔

② مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ......: خوش فہمیاں اور خام خیالیاں سزا کو دفع نہیں کر سکتیں، سزا ضرور ملے گی، خواہ دنیا میں ملے

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

اور جو شخص نیک کاموں میں سے (کوئی کام) کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور کھجور کی گٹھلی کے نقطے کے برابر ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۲۴﴾ اور دین کے لحاظ سے اس سے بہتر کون ہے جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے تابع کر دیا، جب کہ وہ نیکی کرنے والا ہو اور اس نے ابراہیم کی ملت کی پیروی کی، جو ایک (اللہ کی) طرف ہو جانے والا تھا اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنا لیا ﴿۱۲۵﴾

یا آخرت میں، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کی وجہ سے، یا کسی نیک عمل کی وجہ سے، یا دنیا میں آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے معاف فرما دے۔ خلاصہ یہ کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہاں اسے کوئی اپنے زور سے چھڑوا لے گا: ﴿ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴾ ”اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے نہ کوئی دوست پائے گا اور نہ کوئی مدد گار“ ہاں، اللہ تعالیٰ خود ہی دنیا کی تکلیفوں کو اس کے لیے کفارہ بنا دے، یا اس کے توحید و سنت پر گامزن ہونے کی وجہ سے اس سے درگزر کر دے تو وہ مالک و مختار ہے۔

آیت 124 نَقِيْرًا : نقیر اس چھوٹے سے گڑھے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے، یعنی مرد ہو یا عورت اگر ایمان اور عمل صالح موجود ہے تو جنت میں جائیں گے اور ان پر تھوڑے سے تھوڑا ظلم بھی نہیں کیا جائے گا۔

آیت 125 ❶ وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عمل کی قبولیت کی شرطیں بیان کی ہیں، پہلی یہ کہ اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کے تابع کر دے، دوسری یہ کہ وہ محسن ہو، تیسری یہ کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرے، جو حنیف تھے۔ چہرہ تابع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دے، اپنی مرضی ختم کر کے اس کی مرضی پر چلے، یہ ایمان ہے۔ محسن ہونے کا مطلب ہے کہ ہر عمل خالص اللہ کے لیے کرے، جیسا کہ آپ ﷺ نے احسان کے بارے میں فرمایا: ((أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ)) [بخاري، الإيمان، باب سؤال جبريل النبيّ ﷺ : ٥٠] اور ملت ابراہیم کی پیروی کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا پوری طرح فرماں بردار ہو جائے، کیونکہ اب قیامت تک ملت ابراہیم پر قائم صرف امت مسلمہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ [آل عمران : ٦٨] ”بے شک سب لوگوں سے ابراہیم کے قریب یقیناً وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لائے۔“ اور دیکھیے سورۂ نحل (۱۲۳) اگر ایمان نہیں تو کوئی عمل قبول نہیں، احسان و خلوص نہیں تو ریا ہے، جو شرک ہے اور نبی کے طریقے پر نہیں تو سنت نہیں، بلکہ بدعت ہے۔

❷ خَلِيْلًا : جس کی دوستی دل کے درمیان پہنچ جائے اور اس میں کسی پہلو سے بھی کوئی خامی نہ رہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

ع ۱۸/۱۵ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے ﴿۱۲۶﴾ اور وہ تجھ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور جو کچھ تم پر کتاب میں پڑھا جاتا ہے وہ ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنھیں تم وہ نہیں دیتے جو ان کے لیے فرض کیا گیا ہے اور رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو اور نہایت کمزور بچوں کے بارے میں ہے اور اس بارے میں ہے کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو اور تم جو بھی نیکی کرو سو بے شک اللہ ہمیشہ سے اسے خوب جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾

’’اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی خلیل بنایا ہے جس طرح اس نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا۔‘‘ [مسلم، المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور ...... : ۵۳۲]

آیت 126 یعنی اللہ تعالیٰ کے ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوست بنانے کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح دوست برابر ہوتے ہیں، ان کی ملکیت بھی ایک ہی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل تھے، نہیں بلکہ آسمان و زمین کی ملکیت اب بھی اللہ ہی کے پاس ہے اور ہر شے کا احاطہ بھی اسی کے پاس ہے، یہ تو اس کا فضل و کرم ہے کہ اپنے ان خاص بندوں کو اپنا خلیل قرار دے کر ان کی عزت افزائی فرمائی۔ دلیل چاہو تو ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کا معاملہ دیکھ لو۔

آیت 127 ① وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ...... : گو یہاں یہ صراحت نہیں ہے کہ عورتوں کے بارے میں کیا سوال کر رہے تھے، لیکن اگلی چار آیات میں جو فتویٰ دیا گیا ہے اس سے اس سوال کا خود بخود پتا چل جاتا ہے۔

② قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ...... : یہاں دراصل کچھ سوالوں کے جواب کے لیے پچھلی آیات کا حوالہ دیا ہے کہ کتاب کی اسی سورت میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ اسی سے متعلق ہے، مثلاً آیت (۳) اور اس کے بعد کی آیات یتیم لڑکیوں کے نکاح سے متعلق ہیں، پھر عورتوں کے حقوق اور نابالغ بچوں کی نگہداشت اور ان کا مال کھانے سے اجتناب اور ان کا ورثہ دینا یہ سب اسی کے بارے میں ہے۔

③ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ : ’’اور رغبت رکھتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو‘‘ یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ جب ’’ تَرْغَبُوْنَ ‘‘ کا صلہ ’’ فِيْ ‘‘ محذوف مانا جائے، جس کا معنی رغبت کرنا ہے اور اگر اس کا صلہ ’’ عَنْ ‘‘ محذوف مانا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ تم ان سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے اس دوسرے ترجمے کی تائید ہوتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں

وَ اِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا ؕ وَ الصُّلۡحُ خَيۡرٌ ؕ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۲۸﴾

اور اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے کسی قسم کی زیادتی یا بے رخی سے ڈرے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں کسی طرح کی صلح کر لیں اور صلح بہتر ہے، اور تمام طبیعتوں میں حرص (حاضر) رکھی گئی ہے اور اگر تم نیکی کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پورا باخبر ہے ﴿۱۲۸﴾

یتیم بچیوں پر دونوں طرح کا ظلم کیا جاتا تھا۔ ابتدا سورت میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ (قرطبی) اس آیت کے مطلب میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس سورت کے اول میں یتیم کے حق کا ذکر تھا اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی، جس کا کوئی ولی نہ ہو مگر اس کا چچا زاد، سو وہ اگر سمجھے کہ میں اس کا حق ادا نہ کر سکوں گا تو وہ اسے اپنے نکاح میں نہ لائے، کسی دوسرے سے اس کا نکاح کر دے اور خود اس کا ولی بن جائے۔ اب مسلمانوں نے ایسی عورتوں کو نکاح میں لانا موقوف کر دیا، پھر دیکھا گیا کہ بعض اوقات لڑکی کے ولی ہی کے لیے اسے اپنے نکاح میں رکھنا بہتر ہوتا ہے، اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رخصت مانگی گئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اجازت مل گئی اور فرمایا کہ وہ جو کتاب میں منع کیا گیا تھا وہ اس وقت ہے کہ اس کا حق پورا نہ دو، اگر ان کے حق کی بہتری کی سوچو تو رخصت ہے۔'' (موضح)

④ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ: یعنی ان کے بارے میں بھی اپنے احکام یاد دلاتا ہے جو اس سورت کے شروع میں میراث کے تحت دیے گئے ہیں۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۰، ۱۱)۔

آیت 128 ① وَ اِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ ...... : ''نُشُوۡزًا'' کا مطلب ہے زیادتی، لڑائی جھگڑا، اعراض، بے رخی۔ نشوز یا اعراض یہ ہے کہ اس سے بدسلوکی کرے، اس کو حقیر سمجھے، اس کے پاس سونا بیٹھنا چھوڑ دے، اسے نان و نفقہ نہ دے، مارنے کے لیے بہانے تراشے، یا اس کے پاس اور بیوی ہے جسے وہ زیادہ چاہتا ہے، اس لیے اس کی طرف توجہ کم ہے، تو اس صورت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ عورت سمجھے کہ میں اسی شخص کے نکاح میں رہوں تو میرے حق میں بہتر ہے، خواہ مجھے اپنے کچھ حقوق چھوڑنے پڑیں۔ دوسری یہ کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائے، آیت (۱۲۸) میں پہلی صورت کا ذکر ہے اور آیت (۱۳۰) میں دوسری صورت کا ذکر ہے۔

② اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا صُلۡحًا: ''صُلۡحًا'' کی تنکیر (کسی طرح کی صلح) سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی آپس میں کسی طریقے سے بھی صلح کر لیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''کسی مرد کے پاس کوئی عورت ہوتی اور اب وہ اسے مزید نہ رکھنا چاہتا اور طلاق دینے کا ارادہ کرتا تو وہ عورت کہہ دیتی کہ (مجھے طلاق نہ دے، اپنے نکاح میں رہنے دے) میں اپنی

وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَیۡنَ النِّسَآءِ وَ لَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِیۡلُوۡا کُلَّ الۡمَیۡلِ فَتَذَرُوۡهَا کَالۡمُعَلَّقَةِ ؕ وَ اِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۲۹﴾

اور تم ہرگز نہ کر سکو گے کہ عورتوں کے درمیان برابری کرو، خواہ تم حرص بھی کرو، پس مت جھک جاؤ (ایک کی طرف) مکمل جھک جانا کہ اس (دوسری) کو لٹکائی ہوئی کی طرح چھوڑ دو اور اگر تم اصلاح کرو اور ڈرتے رہو تو بے شک اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۲۹﴾

باری کے بارے میں تمھیں اجازت دیتی ہوں (کہ تو جس بیوی کے پاس چاہے رہے) چنانچہ یہ آیت اس سلسلے میں نازل ہوئی۔" [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و إن امرأة خافت...... ﴾ : ٤٦٠١]

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ سودہ رضی اللہ عنہا کو اندیشہ لاحق ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں طلاق دے دیں گے تو انھوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میری باری کا دن عائشہ کو دے دیں مگر مجھے طلاق نہ دیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کیا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ وَ اِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا ﴾ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "وہ دونوں جس چیز پر صلح کر لیں وہ جائز ہے۔" [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة النساء : ٣٠٤٠] عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا عمر رسیدہ ہوگئیں تو انھوں نے اپنا دن عائشہ کو ہبہ کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا دن بھی عائشہ کے پاس گزارتے تھے۔ [بخاری، النکاح، باب المرأة تهب يومها من زوجها...... : ٥٢١٢]

③ وَ الصُّلۡحُ خَیۡرٌ: یعنی صلح ہر حال میں بہتر ہے، کیونکہ شیطان اپنے کارندوں میں سے اس کارندے کو اپنے قریب کر کے شاباش دیتا ہے جو میاں بیوی کے درمیان علیحدگی کروا دے۔ [مسلم، صفات المنافقين و أحكامهم، باب تحريش الشيطان ...... : ٦٧/٢٨١٣]

④ وَ اُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ: "الشُّحَّ" کا معنی ہے بخل، جس کے ساتھ حرص بھی ہو، یعنی انسان کا بخل اور لالچ تو فطری امر ہے، مرد کا شح یہ ہے کہ عورت سے فائدہ اٹھائے مگر اس کے پورے حقوق ادا نہ کرے اور عورت کا شح یہ ہے کہ مہر اور نان و نفقہ تو پورا وصول کرے مگر حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔

⑤ وَ اِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَ تَتَّقُوۡا...... : یعنی اس لالچ کے جذبے کے باوجود اگر میاں بیوی ایک دوسرے سے احسان اور فیاضی کا سلوک کریں اور اللہ سے ڈرتے رہیں تو اللہ کے ہاں اس کا اجر ضرور پائیں گے، جو ان کے ہر عمل سے پورا باخبر ہے۔

آیت 129 ① وَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا...... : یعنی دو یا دو سے زیادہ بیویوں کے درمیان ہر لحاظ سے پوری پوری مساوات برتنا انسانی طاقت سے باہر ہے، کیونکہ عورتوں میں اپنی طبیعتوں، اخلاق و عادات، حسن صورت اور عمر وغیرہ میں ایک دوسری سے فرق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مرد کا میلان ایک کی طرف زیادہ اور دوسری کی طرف کم ہو تو یہ ایک فطری امر ہے، جس پر وہ چاہے بھی تو قابو نہیں پا سکتا۔ لہٰذا قرآن نے اس بات پر زور دیا کہ ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں

وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے غنی کر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے وسعت والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۳۰﴾

ایک کی طرف اس طرح جھک جانا کہ دوسری معلق (لٹکی ہوئی) ہو کر رہ جائے، گویا اس کا کوئی شوہر ہی نہیں اور نہ وہ غیر شادی شدہ ہے کہ کہیں اور نکاح کر لے، تو یہ حرام ہے، ظاہری حقوق میں عورتوں سے مساوی سلوک کیا جائے، دل کے میلان پر گرفت نہیں ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''یا اللہ! یہ میری بیویوں کے درمیان اس چیز کی تقسیم ہے جس کا میں اختیار رکھتا ہوں (یعنی کھانا پینا، کپڑا، سونا بیٹھنا وغیرہ) لہٰذا تو مجھے اس چیز پر ملامت نہ فرما جس کا میں اختیار نہیں رکھتا (یعنی دلی میلان اور محبت)۔'' [أبو داوٗد، النكاح، باب في القسم بين النساء : ۲۱۳٤۔ ترمذی : ۱۱٤۰]

② بعض لوگوں نے اس آیت اور اس سورت کی آیت (۳) دونوں کو ملا کر نتیجہ نکالا ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل ممکن ہی نہیں۔ دوسرا حکم ہے کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو بس ایک بیوی یا لونڈی رکھو۔ معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح جائز نہیں۔ اس کے جواب کے لیے سورۂ نساء کی آیت (۳) کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔ بلکہ زیر تفسیر آیت میں تو عورتوں کے درمیان عدل میں اتنی رعایت دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے منع نہ کیا ہوتا تو آدمی چار سے زیادہ بیویاں بھی رکھ سکتا تھا، بشرطیکہ کوئی عورت ایسی لٹکی ہوئی نہ ہوتی کہ خاوند اس کے پاس چکر ہی نہ لگاتا، نہ اس کے کھانے پینے کی فکر کرتا۔ اگر آدمی اصلاح کرے اور ڈرے تو جو کمی بیشی ہے وہ اللہ معاف کر دے گا۔

آیت 130 ① وَ اِنۡ یَّتَفَرَّقَا یُغۡنِ اللّٰہُ کُلًّا مِّنۡ سَعَتِہٖ: یہ دوسری صورت ہے کہ میاں بیوی کے درمیان صلح کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہی تو اچھے طریقے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ مرد کو دوسری بیوی مل جائے گی، جو اسے پسند ہو اور عورت کو دوسرا شوہر مل جائے گا جو اس سے محبت کرے اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔ (قرطبی) اس سے اسلام کے احکام کی حکمت، وسعت اور رحمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بعض مذاہب میں طلاق کو حرام قرار دیا گیا ہے، ایک دفعہ جب نکاح ہو گیا اب وہ خواہ ایک دوسرے سے کتنے متنفر ہو جائیں، خواہ ان کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جائے، طلاق نہیں دے سکتے۔ نہیں ہرگز نہیں، جب تعلق روگ بن جائے تو اس کا ٹوٹنا ہی اچھا ہے۔ اسلام نے دونوں کے لیے علیحدگی کا راستہ رکھا ہے، جس کے ذریعے سے وہ نئی زندگی شروع کر کے امن و اطمینان سے زندگی بسر کر سکتے ہیں، رہی وہ حدیث جس میں ہے: « أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰهِ الطَّلَاقُ » (اللہ کے نزدیک حلال میں سب سے ناپسندیدہ طلاق ہے) تو یہ حدیث صحیح سند سے رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [دیکھیے إرواء الغلیل : ۷/ ۱۰٦، ح : ۲۰٤۰]

② وَ کَانَ اللّٰہُ وَاسِعًا حَکِیۡمًا: یعنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ کسی کا رزق میرے ہاتھ میں ہے، اگر میں نہ دوں گا تو وہ بھوکا مر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ رازق مطلق ہے اور اس کے انتظامات انسانی سمجھ سے بالاتر ہیں، اس نے جس طرح ملاپ میں حکمت رکھی ہے، جدائی میں بھی رکھی ہے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ لَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمھیں بھی تاکیدی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اگر تم کفر کرو گے تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے ہر طرح بے پروا، ہر تعریف کا حق دار ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بطور وکیل کافی ہے ﴿۱۳۲﴾ اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اے لوگو! اور کچھ دوسروں کو لے آئے اور اللہ ہمیشہ سے اس پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۳۳﴾

آیت 132،131 ① وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: گزشتہ آیات میں عورتوں اور یتیم بچوں سے متعلق احکام بیان کیے گئے تھے، اب جو یہ فرمایا کہ زمین و آسمان کی ہر شے اللہ کی ہے، تو اس سے لوگوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے میں تمھارا ہی فائدہ ہے، اللہ تعالیٰ کسی کے فائدے اور نقصان سے بے نیاز ہے۔

② وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ...... : یعنی تم سے پہلے لوگوں کو اور تم سب کو اس بات کا تاکیداً حکم دیا گیا کہ اللہ سے ڈرو، یعنی اس کے دیے گئے احکام پر عمل کرو۔ یہ جملہ "اتَّقُوا اللّٰهَ" قرآن کی تمام آیات کے لیے بمنزلہ رحی (چکی) کے ہے کہ اسی کی لٹھ پر تمام آیات گھومتی ہیں۔ ابن عاشور رحمہ اللہ نے فرمایا: ''قرآن مجید میں اللہ کے اسماء کے بعد سب سے زیادہ اسی کا ذکر ہوا ہے۔''

③ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''تین بار فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، پہلی بار کشائش (کھلا رزق دینے) کا بیان ہے (کہ علیحدگی کی صورت میں اللہ تعالیٰ دونوں کو غنی کر دے گا، کیونکہ جو کچھ بھی ہے اللہ ہی کا ہے، جسے جس طرح چاہے دیتا ہے) دوسری دفعہ اس کی بے پروائی کا بیان ہے کہ اگر تم کفر کرو، منکر بنو تو اللہ بھی بے پروا ہے، کیونکہ سبھی کچھ اس کا ہے) اور تیسری بار اللہ کے کارساز ہونے کا بیان ہے کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو وہ کافی وکیل ہے۔'' (موضح)

آیت 133: یعنی اگر تم تقویٰ اختیار نہ کرو تو مت بھولو کہ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور تمھاری جگہ اور لوگوں کو یہاں بسا دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد : ۳۸] ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔''

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع ۱۹
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ
وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ
تَعْدِلُوْا ۚ وَ اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

جو شخص دنیا کا بدلہ چاہتا ہو تو اللہ ہی کے پاس دنیا اور آخرت کا بدلہ ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۱۳۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! انصاف پر پوری طرح قائم رہنے والے، اللہ کے لیے شہادت دینے والے بن جاؤ، خواہ تمھاری ذاتوں یا والدین اور زیادہ قرابت والوں کے خلاف ہو، اگر کوئی غنی ہے یا فقیر تو اللہ ان دونوں پر زیادہ حق رکھنے والا ہے۔ پس اس میں خواہش کی پیروی نہ کرو کہ عدل کرو اور اگر تم زبان کو پیچ دو، یا پہلو بچاؤ تو بے شک اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۳۵﴾

آیت 134 یعنی جس شخص کا مطلوب و مقصود صرف دنیا ہی ہے اسے یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے تو تم صرف فانی کی طلب میں کیوں بیٹھے ہو، دنیا اور آخرت دونوں کیوں طلب نہیں کرتے۔ اللہ کے احکام پر عمل کرو گے تو دنیا بھی تمھاری اور آخرت بھی۔ صرف دنیا کی طلب تو خسارا ہی خسارا ہے۔ رہا یہ کہ تمھارا عمل دنیا کے لیے ہے یا آخرت کے لیے، تو اسے اللہ تعالیٰ خوب سنتا ہے، دیکھتا ہے۔ (دیکھیے ہود: ۱۵، ۱۶۔ بقرہ: ۲۰۰ تا ۲۰۲۔ بنی اسرائیل: ۱۸ تا ۲۱)

آیت 135 ① كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ …… : یعنی انصاف پر پوری طرح قائم رہ کر اللہ کے لیے گواہی دو، چاہے وہ تمھارے خلاف ہی پڑے، یا والدین یا قرابت داروں کے اور اس میں تمھارا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ (ابن کثیر)

② اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اولاد کی شہادت ماں باپ کے خلاف قبول ہوگی اور یہ ان کے ساتھ "بِرّ" یعنی احسان کے منافی نہیں ہے۔ والدین اور بھائی کی شہادت بھی سلف کے نزدیک مقبول ہے، مگر یہ اسی صورت میں ہے کہ جب وہ عادل ہوں اور ان پر تہمت نہ ہو۔ اسی تہمت کے پیش نظر بعض ائمہ نے میاں بیوی کی ایک دوسرے کے حق میں شہادت کو جائز رکھا ہے اور بعض نے رد کیا ہے۔ (قرطبی)

③ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا …… : یعنی جس کے خلاف تمھاری گواہی پڑ رہی ہے وہ دولت مند ہے تب اور غریب ہے تب، تم اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت سے بڑھ کر اس کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے، لہٰذا نہ تم دولت مند کی دولت مندی کی وجہ سے اس کی بے جا حمایت یا مخالفت کرو اور نہ غریب پر ترس کھا کر اس کی بے جا رعایت کرو، بلکہ ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سچی گواہی دو۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ غریب کی غربت تمھیں اس کی بے جا حمایت پر آمادہ کر دے، تم اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اس کے بندوں کے، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، نہ زیادہ خیر خواہ ہو سکتے ہو اور نہ زیادہ ان پر حق رکھنے والے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی اور جو شخص اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت (کے ساتھ) کفر کرے تو یقیناً وہ گمراہ ہوا، بہت دور گمراہ ہونا ﴿۱۳۶﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا، پھر وہ کفر میں بڑھ گئے، اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں بخش دے اور نہ یہ کہ انھیں کسی راستے کی ہدایت دے ﴿۱۳۷﴾

④ وَ اِنْ تَلْوٗۤا ...... "لَوٰی يَلْوِيْ لَيًّا (ض)" پیچ دینا، یعنی اگر تم زبان کو پیچ دے کر اس طرح بات بنا کر پیش کرو کہ جس کے خلاف گواہی پڑنی چاہیے وہ بچ جائے، یا "تُعْرِضُوْا" یعنی گواہی دینے ہی سے پہلو بچاؤ، بلکہ چھپا جاؤ تو بے شک تم جو کچھ کرتے ہو اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اس سے پوری طرح باخبر ہے، اس کی پوری سزا اللہ کے ہاں پاؤ گے۔ یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے صاف جھوٹ نہیں بولا تو جھوٹی گواہی کے گناہ سے بچ جائیں گے۔

آیت 136 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ...... : یہاں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دیا جا رہا ہے، یعنی ایمان پر ثابت قدم رہو، یا اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرو، اس کے مخاطب تمام مومنین ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کے مخاطب اہل کتاب کے مومن ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ (فتح القدیر) قرطبی لکھتے ہیں، بعض کا خیال ہے کہ یہ خطاب منافقین سے ہے، ان کے بظاہر مسلمان ہونے کی وجہ سے ایمان والے فرما دیا اور معنی یہ ہے کہ جب تک دل میں کامل یقین پیدا نہیں کرو گے اور خالص اللہ کو نہیں مانو گے تو اللہ کے ہاں مسلمان نہیں ہو سکتے۔

② پہلی کتابوں پر ایمان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ بھی قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ باقی رہا عمل! تو وہ ان پر نہیں بلکہ قرآن مجید اور نبی ﷺ کی سنت پر کیا جائے گا۔ ان کتابوں میں جو چیز کتاب و سنت کے مطابق ہوگی اس کی تصدیق کی جائے گی اور جو ان کے خلاف ہوگی اسے رد کر دیا جائے گا۔

③ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ ...... : یعنی اگر ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کیا تو گویا تمام چیزوں کا انکار کر دیا۔

آیت 137 اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ...... : ان لوگوں سے مراد منافقین ہیں جو مسلمان تو ہو گئے مگر جب کوئی فائدہ دیکھتے تو ایمان کی طرف بڑھ جاتے اور اگر کوئی تکلیف پہنچتی تو کافر ہو جاتے۔ یہ لوگ مشرکین اوس و خزرج میں سے بھی

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ
اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا
فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾

منافقوں کو خوش خبری دے دے کہ بے شک ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے ﴿۱۳۸﴾ وہ جو کافروں کو مومنوں کے سوا دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں؟ تو بے شک عزت سب اللہ کے لیے ہے ﴿۱۳۹﴾ اور بلاشبہ اس نے تم پر کتاب میں نازل فرمایا ہے کہ جب تم اللہ کی آیات کو سنو کہ ان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ مت بیٹھو، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں۔ بے شک تم بھی اس وقت ان جیسے ہو، بے شک اللہ منافقوں اور کافروں، سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے ﴿۱۴۰﴾

تھے اور یہود مدینہ سے بھی۔ اب بھی بے شمار مسلمانوں کا یہی حال ہے، فرمایا: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ [الحج : ۱۱] ''اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی عبادت ایک کنارے پر کرتا ہے۔'' پھر ''کفر میں بڑھ گئے'' یعنی پھر وہ کفر پر قائم رہے اور اسی پر مر گئے، کیونکہ کفر کا یہی وہ درجہ ہے جس کی بخشش نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص تائب ہو جائے اور ایمان لے آئے تو اس کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ یہاں بات ان لوگوں کی ہو رہی ہے جنھوں نے ایمان قبول کیا، پھر اسے چھوڑ دیا، پھر اسے قبول کر لیا، پھر اسے چھوڑ کر گمراہی کو قبول کر لیا اور پھر گمراہی میں بڑھتے ہی گئے، حتیٰ کہ کفر کی حالت میں مر گئے، تو مرنے کے بعد ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں، اللہ انھیں معاف نہیں کرے گا، کیونکہ اس صورت حال تک پہنچنے کے بعد اس سے نکلنے کی کوئی صورت ہی نہیں کہ اب انھیں نکلنے کی کوئی صورت مل سکے۔ انھی لوگوں کا ذکر سورۂ آل عمران (۷۲)، سورۂ منافقون (۳) اور سورۂ نساء (۱۸) میں کیا گیا ہے۔

آیت 139،138 بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ...... : بشارت خوشی کی خبر کو کہتے ہیں، یہاں بطور طنز کہا ہے کہ منافقوں کو عذاب الیم کی خوش خبری دے دو، جو مسلمانوں کے بجائے کافروں کو اس لیے دوست بناتے ہیں کہ اس سے انھیں عزت حاصل ہو گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عزت کافروں کی دوستی میں نہیں بلکہ وہ تو سب کی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہی بات سورۂ فاطر (۱۰) اور سورۂ منافقون (۸) میں بیان فرمائی، بلکہ سورۂ منافقون میں فرمایا: ''لیکن منافق نہیں جانتے'' کہ اللہ کے ہاں عزت تو کفر کی وجہ سے گئی اور کفار کے پاس عزت تھی ہی نہیں جو انھیں ملتی، اگر بظاہر کچھ تھی بھی تو ان کے دوغلے پن کی وجہ سے ان کا اعتبار بھی اٹھ گیا۔ [خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ]

آیت 140 وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ ...... : اس سے پہلے سورۂ انعام (۶۸) میں یہ حکم نازل ہو چکا تھا، چنانچہ فرمایا:

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۷

وہ جو تمھارے بارے میں انتظار کرتے ہیں، پھر اگر تمھارے لیے اللہ کی طرف سے کوئی فتح ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کوئی حصہ مل جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر غالب نہیں ہو گئے تھے اور ہم نے تمھیں ایمان والوں سے نہیں بچایا تھا۔ پس اللہ تمھارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اور اللہ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راستہ نہیں بنائے گا ﴿۱۴۱﴾

''اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔'' [الأنعام : ٦٨] حدیث میں ایسی مجلس میں بیٹھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جہاں اللہ کے حکم کی صریح نافرمانی ہو، چنانچہ فرمایا: ''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اس دستر خوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب کا دور چلتا ہو۔'' [أحمد: ۱ / ۲۰، ح : ۱۲٦ ، و حسنه الألباني في غاية المرام] ایسے واضح احکام کے باوجود منافقین کی یہ روش تھی کہ مسلمانوں کی مجلسوں کو چھوڑ کر یہودیوں اور مشرکوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے جہاں آیات الٰہی کا مذاق اڑایا جاتا۔ زیر تفسیر آیت میں ان کی اسی روش کی طرف اشارہ ہے، ویسے آیت عام ہے اور ہر ایسی مجلس میں شرکت حرام ہے جہاں قرآن و سنت کا مذاق اڑایا جاتا ہو، چاہے وہ کفار و مشرکین کی مجلس ہو یا اہل بدعت اور فساق و فجار کی۔ جب برائی کو ہاتھ سے بھی نہ روک سکے، نہ زبان سے تو پھر خاموش بیٹھ کر سنتے رہنا اور دل میں برا بھی نہ جاننا تو کمزور ترین ایمان کے بھی منافی ہے، بلکہ فرمایا: ''تم بھی اس وقت ان جیسے ہو گے۔'' اسی لیے شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جو شخص ایک مجلس میں اپنے دین کے عیب سنے، پھر انھی میں بیٹھے، اگرچہ آپ نہ کہے وہی منافق ہے۔'' (موضح)

آیت 141 ① الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ...... : یعنی یہ منافقین تمھارے بارے میں تاک اور انتظار میں رہتے ہیں، اگر اللہ کی طرف سے تمھیں فتح مل جائے تو کہتے ہیں، کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے، یعنی اس فتح میں ہمارا بھی حصہ ہے اور اگر کسی وقت کافروں کو کوئی حصہ مل جائے تو ان سے کہتے ہیں، کیا ہم تم پر غالب نہیں آ گئے تھے، پھر یہ ہمارا ہی کام تھا کہ ہم نے ایسے وسائل اختیار کیے جن سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ہم نے تمھیں مسلمانوں سے بچا لیا، یعنی منافقین دونوں طرف اپنا احسان چڑھاتے رہتے تھے۔

② فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: یعنی دنیا میں تو ان منافقین نے بظاہر کلمہ پڑھ کر اپنے آپ کو بچا لیا، لیکن آخرت میں ان کی حقیقت کھول دی جائے گی اور پتا چل جائے گا کہ کون مومن تھا اور کون منافق؟

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

بے شک منافق لوگ اللہ سے دھوکا بازی کر رہے ہیں، حالانکہ وہ انھیں دھوکا دینے والا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاوا کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر بہت کم ﴿۱۴۲﴾ اس کے درمیان متردد ہیں، نہ ان کی طرف ہیں اور نہ ان کی طرف اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر تو اس کے لیے ہرگز کوئی راستہ نہ پائے گا ﴿۱۴۳﴾

③ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ ...... : اگر کوئی کہے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ کافروں کے لیے مومنوں پر ہرگز کوئی راستہ نہیں بنائے گا، مگر اس وقت معاملہ اس کے برعکس ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ ان مومنوں پر جن کا یہاں ذکر ہے، کفار کو کبھی غلبہ حاصل نہیں ہوا، اب اگر مومن ہی وہ مومن نہ رہیں اور جہاد چھوڑ بیٹھیں تو اس میں اللہ کے وعدے کا کیا قصور ہے؟

آیت 142 ① اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ : اس جملے کی تشریح سورۂ بقرہ کی آیت (۹) اور (۱۵) میں ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انھیں دھوکا دینا بھی اسی طرح ہوگا جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔

② وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ...... : اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کو اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرنے کے لیے مسجد میں آنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی مسجد میں نماز نہ پڑھتا تو مسلمان شمار نہیں ہوتا تھا، منافقین کی یہ نمازیں صرف مسلمانوں کے دکھلاوے کے لیے تھیں، اس لیے جن نمازوں میں چھپنے کی گنجائش ہوتی اس میں وہ غیر حاضر رہتے، جیسے صبح اور عشاء کی نماز۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منافقین پر صبح اور عشاء کی نماز تمام نمازوں سے زیادہ بھاری ہے، حالانکہ اگر وہ جانتے کہ ان کا کیا ثواب ہے تو وہ ان میں حاضر ہوتے، چاہے انھیں ان میں گھسٹ کر آنا پڑتا۔'' [بخاری، الأذان، باب فضل فی صلوۃ العشاء...... : ۶۵۷۔ مسلم : ۶۵۱/۲۵۲]

③ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا : یعنی جلدی جلدی، جیسے کوئی بیگار ٹالنا مقصود ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ منافق کی نماز ہے، بیٹھا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان (یعنی غروب کے بالکل قریب) ہو جاتا ہے، تو اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے مار لیتا ہے، ان میں اللہ کو یاد نہیں کرتا مگر بہت کم۔'' [مسلم، المساجد، باب استحباب التبکیر : ۶۲۲] معلوم ہوا کہ عصر کی نماز دیر سے پڑھنا بھی نفاق ہے اور جلدی جلدی اکٹھے دو سجدے بھی، جن میں وقفہ نہ ہو، ایک ہی سجدہ ہوتے ہیں، ورنہ آپ چار کے بجائے آٹھ ٹھونگے فرماتے۔

آیت 143 ① مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ...... : نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو دو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ
تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ
نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَ سَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کے لیے اپنے خلاف ایک واضح حجت بنا لو ﴿۱۴۴﴾ بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا ﴿۱۴۵﴾ مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور اللہ کو مضبوطی سے تھام لیا اور اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر لیا تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مومنوں کو جلد ہی بہت بڑا اجر دے گا ﴿۱۴۶﴾

ریوڑوں کے درمیان ماری ماری پھرتی ہے، کبھی اس ریوڑ کی طرف اور کبھی اس ریوڑ کی طرف اور نہیں جانتی کہ ان دونوں میں سے کس کے پیچھے لگے۔'' [مسلم، صفات المنافقين، باب صفات المنافقين : ۲۷۸۴]

② یعنی جو شخص سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود خود گمراہی میں پڑا ہوا اور باطل پرستی کی طرف راغب ہو تو اسے راہِ راست پر لانے کے لیے کوئی انسانی نصیحت اور کوشش کارگر نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی سزا کے طور پر گمراہی اور باطل پرستی میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے گا۔

آیت 144 ① لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ...... : اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کافروں کو دوست بنانے کی جگہ جگہ ممانعت کی ہے، دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۸)، سورۂ مائدہ (۵۱)، سورۂ مجادلہ (۲۲) اور سورۂ ممتحنہ (۱)۔

② اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا...... : یعنی اس کے حکم کی خلاف ورزی کر کے عذاب الٰہی کے لیے ایسی واضح اور کھلی دلیل اپنے اوپر قائم کرنا چاہتے ہو کہ اس کے بعد مستحق عذاب ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔

آیت 145 اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ...... : جس طرح جنت کے درجات ہیں، سب سے اونچا درجہ فردوس سب سے افضل ہے، اسی طرح جہنم کے بھی درکات ہیں، جو جتنا نیچا ہے اتنا ہی سخت ہے۔ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے، کیونکہ نفاق صریح کفر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

آیت 145 اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا...... : جن منافقین کی اوپر مذمت کی ہے ان کی نجات کے لیے بطور استثنا چار باتیں فرمائیں، ایک یہ کہ اپنے پچھلے رویے پر نادم ہوں، دوسری یہ کہ آئندہ کے لیے اپنی پوری طرح اصلاح کر لیں، تیسری یہ کہ اللہ کی رسی مضبوط پکڑیں، چوتھی یہ کہ دین کا جو کام کریں خالص اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے کریں۔ (احسن التفاسیر) یہ چاروں کام درجہ بدرجہ اور ایک دوسرے کی ترتیب پر قائم ہوں گے۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

اللہ تمھیں عذاب دینے سے کیا کرے گا، اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ۔ اور اللہ ہمیشہ سے قدر کرنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۴۷﴾

آیت 147 مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ ...... : مقصد یہ بتانا ہے کہ عذاب کا باعث تمھارا شکر نہ کرنا اور ایمان نہ لانا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ تمھیں عذاب دے، سو اگر تم دل سے ایمان لے آؤ اور قول و فعل سے اللہ کی فرماں برداری کر کے اس کا شکر ادا کرو تو اللہ قدر دان ہے اور سب کچھ جانتا بھی ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

اللہ بری بات کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتا مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۴۸﴾ اگر تم کوئی نیکی ظاہر کرو، یا اسے چھپاؤ، یا کسی برائی سے درگزر کرو تو بے شک اللہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۴۹﴾

آیت 148 ① لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ...... : یعنی اگر کسی شخص میں کوئی دینی یا دنیوی عیب پایا جاتا ہے تو اسے سرعام ذلیل کرنا جائز نہیں اور نہ ہر شخص کو بتانا جائز ہے، کیونکہ یہ غیبت ہے اور غیبت قطعی حرام ہے، البتہ جب کوئی شخص ظلم پر اتر آئے تو مظلوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کی زیادتی کے خلاف آواز بلند کرے، خصوصاً جہاں آواز بلند کرنے سے اس پر ظلم رک سکتا ہو، یا اس کا مداوا ہو سکتا ہو۔ اسی طرح لوگوں کو اس کے ظلم سے بچانے کے لیے اس کا عیب بیان کرنا بھی جائز ہے۔ حدیث کے راویوں پر جرح بھی اسی ضمن میں آتی ہے، کیونکہ ضعیف روایت بیان کرنا امت پر ظلم ہے۔ کوئی شخص باوجود وسعت کے دوسرے کا حق نہ دیتا ہو تو اس کو طعن و ملامت کرنا بھی جائز ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''غنی آدمی کا حق ادا کرنے میں دیر کرنا، یا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور اس کی عزت کو حلال کر دیتا ہے۔'' [بخاری، الاستقراض، باب لصاحب الحق مقال، قبل ح : ۲٤۰۱] اسی طرح جو زیادتی میں پہل کرے اسے جواب دینا جائز ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''آپس میں گالی گلوچ کرنے والے، وہ دونوں جو کچھ بھی کہیں، سب گناہ پہل کرنے والے پر ہے، جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔'' [مسلم، البر والصلة، باب النهى عن السباب : ۲۵۸۷] اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ ظالم کے حق میں بددعا کرنا جائز ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ (۴۱) کوئی شخص زبردستی اس کے منہ سے برا کلمہ نکلوائے تو وہ بھی اس کے تحت جائز ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی) ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس ہمسائے کی زیادتیوں کی شکایت کی، آپ نے اسے اپنا سامان گھر کے باہر راستے میں نکال کر رکھ دینے کا مشورہ دیا، اب جو گزرتا پوچھتا تو وہ ہمسائے کا ظلم بتاتا۔ ہمسائے نے یہ دیکھ کر معذرت کر لی اور آئندہ ایذا نہ پہنچانے کا وعدہ کیا اور سامان اندر رکھنے کی درخواست کی۔ [أبو داوٗد، الأدب، باب في حق الجوار : ۵۱۵۳]

② گزشتہ آیات میں منافقین کے عیوب کا بیان تھا، یہاں بات مکمل کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ چونکہ ظالم ہیں، اس لیے ان کے عیب ظاہر کرنا جائز ہے۔ (کبیر) تاہم حتی الوسع نام لے کر بیان نہ کرے۔ (موضح) ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴾ یعنی اگر مظلوم زیادتی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو وہ بھی معلوم ہے۔

آیت 149 اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا...... : اس آیت میں معاف کر دینے کی ترغیب ہے، یعنی اگرچہ ظالم کا شکوہ یا اس کے حق میں بددعا جائز ہے، تاہم عفو و درگزر سے کام لینا بہتر ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پوری قدرت رکھنے کے باوجود بہت معاف کرنے والا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مال صدقے سے کم نہیں ہوتا اور معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راستہ اختیار کریں ﴿۱۵۰﴾ یہی لوگ حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۵۱﴾

میں اضافہ ہی کرتا ہے اور کوئی شخص اللہ کے لیے نیچا نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ اسے اونچا کر دیتا ہے۔'' [مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والتواضع : ۲۵۸۸]

آیت 150 ① اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ : منافقین کے قبیح اعمال و اقوال بیان کرنے کے بعد اب یہاں سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے خیالات و شبہات اور ان کی تردید کا بیان شروع ہو رہا ہے اور یہ سلسلہ سورت کے آخر تک چلا گیا ہے۔ (رازی) اللہ تعالیٰ کو ماننا اور رسالت و نبوت کو نہ ماننا کفر ہے۔ (قرطبی) اس لیے کہ اللہ کا ماننا یہی ہے کہ زمانے کے پیغمبر کا حکم مانے، اس کے بغیر اللہ کا ماننا غلط ہے۔ (موضح) نیز اللہ کے احکام ماننے سے انکار اس کا بندہ ہونے سے انکار ہے اور بندگی (عبادت) سے انکار کا مطلب کائنات کو بنانے والے کا انکار ہے تھے۔

② وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ...... : مراد اہل کتاب ہی ہیں اور بعد والے جملے انھی کی خصلتوں کی تفسیر ہیں۔ (قرطبی، رازی) یہود موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے لیکن عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے تھے اور نصاریٰ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو مانتے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے تھے۔ (ابن کثیر)

③ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا : یعنی سب کو ماننا ایمان ہے، کسی ایک کا انکار کفر ہے، جب کہ یہ لوگ بعض پر ایمان لا کر اور بعض سے انکار کر کے ایک تیسری راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اس کا نام یہودیت یا نصرانیت رکھتے ہیں، جیسا کہ ہمارے زمانے کے مادہ پرستوں نے مسجدوں میں نماز، بازاروں میں سود، غم و شادی اور عام رہن سہن میں غیر مسلموں کی نقالی اور عدالتوں اور حکومت کے شعبوں میں کفریہ قوانین، سب کچھ کو ملا کر اس کا نام اسلام رکھ دیا ہے اور بعض نے کہا کہ قرآن کو تو مانیں گے مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو نہیں مانیں گے۔ یہ منکرین حدیث بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں۔

آیت 151 اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا : یعنی ان لوگوں کے کافر ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ ''حَقًّا'' مصدر محذوف کی تاکید ہے۔ (کبیر)

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ
وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۵۲ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ
سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ
ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۵۳

اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انھوں نے ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہ کی، یہی لوگ ہیں جنھیں وہ عنقریب ان کے اجر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ۝۱۵۲ اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتارے، سو وہ تو موسیٰ سے اس سے بڑی بات کا مطالبہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھلا، تو انھیں بجلی نے ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑ لیا، پھر انھوں نے بچھڑے کو پکڑ لیا، اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکی تھیں، تو ہم نے اس سے درگزر کیا اور ہم نے موسیٰ کو واضح غلبہ عطا کیا ۝۱۵۳

آیت 152 وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ...... : مراد امت محمد ﷺ ہے جو تمام پیغمبروں پر ایمان رکھتی ہے، لہٰذا ان کے لیے بشارت ہے۔ (قرطبی)

آیت 152 ❶ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ...... : اس آیت میں یہود کی ایک اور جہالت کا بیان ہے اور اس کا مقصد ان کی سرکشی اور طبعی ضد و عناد کو بیان کرنا ہے۔ (کبیر) ان کا مقصد آپ ﷺ پر ایمان لانا تو تھا نہیں، محض شرارت کے لیے اور لاجواب کرنے کے لیے نت نئے اعتراضات پیش کرتے رہتے۔ ان میں سے ان کی ایک فرمائش یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں ملی تھیں، لہٰذا آپ بھی اللہ تعالیٰ کے پاس سے اسی طرح کی کتاب لا کر دکھائیں، تاکہ ہم آپ کی تصدیق کریں اور آپ پر ایمان لائیں۔ قرآن نے اس اعتراض کے جواب میں پہلے تو ان پر ان کی گزشتہ کارستانیاں بطور الزام پیش کیں (کیونکہ اصل خاموش کرانے والا جواب الزامی ہوتا ہے کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، پھر اعتراض کرو) اور پھر آیت (۱۶۳) ﴿ اِنَّاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ كَمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ ﴾ سے اس اعتراض کا تحقیقی جواب دیا ہے۔ (کبیر) اور یہ سلسلۂ بیان آیت (۱۷۰) تک چلا گیا ہے۔ اس کے بعد ﴿ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ﴾ سے نصاریٰ سے خطاب ہے۔ (فتح الرحمٰن)

❷ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ: فرمایا (تمھاری اس فرمائش کے عین مطابق) موسیٰ علیہ السلام کتاب لائے تو تم نے اس سے بڑا مطالبہ پیش کر دیا، یعنی یہ کہ ہمیں واضح طور پر سامنے اللہ تعالیٰ کا دیدار کراؤ۔ (دیکھیے بقرہ: ۵۵) پھر اس سے بھی بڑی گستاخی کی کہ بچھڑے کو معبود بنا لیا، مگر ہم نے تمھیں معاف کر دیا اور تمھاری اس ضد، عناد اور جہل کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کو ہم

وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

اور ہم نے ان پر پہاڑ کو ان کا پختہ عہد لینے کے ساتھ اٹھا کھڑا کیا اور ہم نے ان سے کہا دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور ہم نے ان سے کہا کہ ہفتے کے دن میں زیادتی مت کرو اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا ﴿۱۵۴﴾ پھر ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے ہی کی وجہ سے (ہم نے ان پر لعنت کی) اور ان کے اللہ کی آیات کا کفر کرنے اور ان کے انبیاء کو کسی حق کے بغیر قتل کرنے اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر کر دی تو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم ﴿۱۵۵﴾

نے غلبہ اور اقتدار عطا فرما دیا اور تم لوگ ان کے حکم کی مخالفت نہ کر سکے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی بشارت ہے کہ آخر کار یہ ضد اور عناد رکھنے والے مغلوب ہوں گے۔ اس کے بعد ان کی دوسری جہالتوں کا بیان ہے۔ (کبیر)

آیت 154 ① ”وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۳) اور ”ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۸، ۵۹)۔

② وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ: ”اصحاب سبت“ جنھیں ہفتے کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا، ان کے قصے کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۵) اور سورۂ اعراف (۱۶۳)۔

آیت 155 ① فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: اس میں ”مَا“ تاکید کے لیے بڑھایا گیا ہے، یعنی ان کے اپنے پختہ عہد کو توڑنے ہی کی وجہ سے۔ یہاں کچھ الفاظ محذوف ہیں جو آیت پڑھنے والے کی سمجھ پر چھوڑ دیے گئے ہیں، چنانچہ اکثر مفسرین نے تو لکھا ہے کہ وہ الفاظ ہیں ”لَعَنَّاهُمْ“ یعنی ہم نے ان پر لعنت کی، اس کی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ﴾ [المائدۃ: ۱۳] ”ان کے اپنے پختہ عہد کو توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی“ اور بعض نے کہا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بات کو عام رکھا ہے اسے عام رکھنا ہی بہتر ہے یعنی ان کے عہد کو توڑنے ہی کی وجہ سے ”فَعَلْنَا بِهِمْ مَّا فَعَلْنَا“ (ہم نے ان کے ساتھ کیا جو کیا) یعنی جو ہم نے ان کے ساتھ کیا وہ تمھارے اندازے سے باہر ہے۔

② ”وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۶۱) اور ”غُلْفٌ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۸۸)۔

③ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: یعنی بہت کم لوگ، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے چند ساتھی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”قَلِيْلًا“ مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی ”اِيْمَانًا قَلِيْلًا“ (وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑا) یعنی صرف موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر۔ یہ ان کے گمان کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ ایک نبی کو بھی جھٹلایا تو گویا سب کو جھٹلا دیا۔ (رازی)

وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾

اور ان کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر ان کے بہت بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے ﴿۱۵۶﴾ اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ بلاشبہ ہم نے ہی مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، جو اللہ کا رسول تھا، حالانکہ نہ انھوں نے اسے قتل کیا اور نہ اسے سولی پر چڑھایا اور لیکن ان کے لیے (کسی کو مسیح کا) شبیہ بنا دیا گیا اور بے شک وہ لوگ جنھوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے، یقیناً اس کے متعلق بڑے شک میں ہیں، انھیں اس کے متعلق گمان کی پیروی کے سوا کچھ علم نہیں اور انھوں نے اسے یقیناً قتل نہیں کیا ﴿۱۵۷﴾

آیت 156 وَ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ ...... : اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی نبوت کا انکار کر کے صریح کفر کا ارتکاب کیا اور پھر مریم علیہا السلام کی طرف زنا کی نسبت کر کے مزید بہتان باندھا۔

آیت 157 ① وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ : یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود خود مسیح علیہ السلام کی رسالت کا اقرار کر کے اپنے گمان میں انھیں قتل کرنے کا دعویٰ اور اس پر فخر کر رہے ہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مفسرین نے اس کے چند جواب دیے ہیں، پہلا یہ کہ وہ جو اپنے آپ کو ''رسول اللہ'' سمجھتا تھا، ہم نے اسے قتل کر دیا۔ دوسرا یہ کہ وہ بطور طنز انھیں ''رسول اللہ'' کہہ رہے تھے۔ تیسرا یہ کہ یہودیوں کا عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کو بطور فخر ذکر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے اکرام اور شرف کے اظہار کے لیے اپنے پاس سے لفظ ''رسول اللہ'' کا اضافہ کر دیا کہ ان ظالموں نے کتنی بڑی ہستی کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا۔ چوتھا یہ کہ یہودیوں کو نہ مریم علیہا السلام کے پاکباز ہونے میں کوئی شک تھا، نہ عیسیٰ علیہ السلام کے رسول ہونے میں، کیونکہ پیدائش کے دن ہی بطور معجزہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کی زبانی تمام یہودیوں کے سامنے مریم علیہا السلام کی پاکبازی اور مسیح علیہ السلام کی رسالت ثابت فرما دی تھی، مگر قوم یہود کو جب مسیح علیہ السلام نے ان کے کفر و شرک، ریاکاری اور سود خوری پر ٹوکا تو وہ ان کی جان کے درپے ہو گئے اور گناہوں نے ان کے دل اس طرح مسخ کر دیے تھے کہ جس عظیم خاتون کو وہ تیس سال تک پاکباز سمجھتے رہے اس پر زنا کی تہمت لگا دی اور جسے دل سے رسول مانتے رہے گناہوں سے ٹوکنے پر اسے قتل کرنے کے درپے ہو گئے، حتیٰ کہ اپنے خیال میں قتل میں کامیاب ہو گئے اور اس پر فخر بھی کرنے لگے۔ انسانی طبائع جب مسخ ہوتی ہیں تو ان کی شقاوت کہاں تک پہنچ جاتی ہے، یہ اس کی مثال ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی رسولوں کو قتل کر چکے تھے۔

② وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ : قرآن پاک نے یہودیوں کے دعویٰ کی صاف نفی کی اور فرمایا کہ نہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ سولی دی، بلکہ ان کے لیے کسی اور آدمی کو مسیح علیہ السلام کی شبیہ (ان جیسا) بنا دیا گیا۔ وہ اسے سولی

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۵۸

بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۝۱۵۸

دے کر سمجھتے رہے کہ ہم نے مسیح کو صلیب پر چڑھا دیا۔ یہ آدمی کون تھا اور کیسے شبیہ بنایا گیا، قرآن مجید یا حدیث رسول میں اس کی تفصیل بیان نہیں ہوئی، ہاں اگلی آیت میں آ رہا ہے کہ (عیسیٰ علیہ السلام کو نہ انھوں نے قتل کیا نہ سولی دیا بلکہ) اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی طرف اٹھا لیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ بنائے جانے کی کیفیت کی ایک روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ امام ابن کثیر اور ابن جریر نے بیان فرمائی ہے کہ جب یہودی مسیح علیہ السلام کو پکڑنے کے لیے گئے تو آپ نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس بات پر راضی ہے کہ اسے میرا شبیہ بنا دیا جائے؟ ایک حواری اس پر راضی ہو گیا، چنانچہ مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف اٹھا لیا اور اس نوجوان کو مسیح علیہ السلام کی شکل و صورت میں تبدیل کر دیا گیا، یہودی آئے اور اس نوجوان کو سولی دے دی۔

3 وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ: عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شکل کو قتل کرنے کے بعد وہ لوگ خود تردد میں پڑ گئے کہ جسے ہم نے سولی دی ہے، کون ہے! بعض نے کہا، مسیح ہی قتل ہوئے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ مسیح تو نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ خود انھیں بھی یقین نہ ہو سکا کہ واقعی ہم نے انھی کو صلیب پر چڑھایا ہے، بس ایک گمان کی پیروی کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ یقینی علم تو بہت دور ہے، خود وہ بھی اختلاف کا شکار ہیں اور شک میں مبتلا ہیں کہ کون قتل ہوا۔ یہ اختلاف یہود میں بھی تھا اور نصاریٰ کے فرقوں میں بھی ہے، جن میں سے بعض کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ناسوت (انسانی جسم) کو سولی دی گئی اور لاہوت (ان کا وہ حصہ جو خدا تھا) اوپر اٹھا لیا گیا۔ بعض دونوں کی سولی کے قائل ہیں وغیرہ، قرآن مجید نے ان سب کو جھوٹا قرار دیا۔

آیت 158 بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا: یہ صاف وصریح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اٹھا لیا۔ صحیح احادیث سے بھی یہ بات ثابت ہے۔ یہ احادیث بخاری و مسلم سمیت حدیث کی اکثر کتابوں میں موجود ہیں۔ [دیکھیے بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب نزول عیسی ابن مریم علیہما السلام : ٣٤٤٨۔ مسلم : ١٥٥] ان احادیث میں آسمان پر اٹھائے جانے کے علاوہ قیامت کے قریب ان کے نزول اور دوسری بہت سی باتوں کا ذکر ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ یہ تمام روایات ذکر کر کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر ہیں، ان کے راویوں میں ابو ہریرہ، عبد اللہ بن مسعود، عثمان بن ابی العاص، ابو امامہ، نواس بن سمعان، عبد اللہ بن عمرو بن عاص، مجمع بن جاریہ، ابو سریحہ اور حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ ان احادیث میں آپ کے نزول کی کیفیت اور جگہ کا بیان ہے۔ آپ دمشق میں منارۂ شرقیہ کے پاس اس وقت اتریں گے جب فجر کی نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی۔ آپ خنزیر کو قتل کریں گے، صلیب توڑ دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، ان کے دور میں سب مسلمان ہو جائیں گے، دجال کا قتل بھی آپ کے ہاتھوں سے ہوگا اور یاجوج ماجوج کا ظہور و فساد بھی آپ کی موجودگی میں ہوگا، بالآخر آپ ہی کی بددعا سے ان کی ہلاکت واقع ہوگی۔ مسیح علیہ السلام کا اپنے جسم کے ساتھ اٹھایا جانا، وہاں ان کا زندہ موجود ہونا، دوبارہ دنیا میں آ کر کئی سال رہنا اور دجال کو قتل کرنے

وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

اور اہل کتاب میں کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا ﴿۱۵۹﴾ تو جو لوگ یہودی بن گئے، ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر کئی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں، جو ان کے لیے حلال کی گئی تھیں اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے ﴿۱۶۰﴾

کے بعد اپنی طبعی موت مرنا امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے، جس کی بنیاد قرآنی تصریحات اور ان تفصیلات پر ہے جو احادیث میں بیان ہوئی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اِتَّفَقَ أَصْحَابُ الْأَخْبَارِ وَالتَّفْسِيرِ عَلٰى أَنَّ عِيسٰى رُفِعَ بِبَدَنِهٖ'' ''تمام اصحاب تفسیر اور ائمہ حدیث اس پر متفق ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے بدن سمیت آسمان پر زندہ اٹھائے گئے۔'' [التلخيص الحبير] لہٰذا حیاتِ مسیح کے انکار سے قرآن وحدیث کا انکار لازم آتا ہے جو سراسر گمراہی ہے۔ ''عَزِيْزًا حَكِيْمًا'' کا لفظ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا عام فوت ہونے والوں کی طرح نہیں تھا۔

آیت 159 ① وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ: اس آیت کے دو مطلب ہیں اور دونوں درست ہیں، پہلا تو یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کا ہر شخص اپنے مرنے سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور ان کے زندہ اٹھائے جانے پر ایمان لے آئے گا، مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب موت سامنے آ جاتی ہے، جیسا کہ فرعون مرتے وقت ایمان لے آیا تھا، مگر اس وقت ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب عادل حاکم کی صورت میں اتریں گے اور دجال اور دوسرے تمام کفار سے جہاد کریں گے، تو ان کی موت سے پہلے پہلے تمام دنیا میں اسلام غالب ہو جائے گا۔ یہود و نصاریٰ یا تو مقابلے میں قتل ہو جائیں گے، یا اسلام لے آئیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام صلیب توڑ دیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، چنانچہ جب عیسیٰ علیہ السلام فوت ہوں گے تو ان کی وفات سے پہلے ہر موجود یہودی اور نصرانی ان کی نبوت اور ان کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے اور دوبارہ اترنے پر ایمان لا چکا ہوگا۔ چنانچہ بخاری اور مسلم میں مذکور اس حدیث کے آخر میں ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان کر کے فرماتے: ''اگر چاہو تو یہ آیت پڑھو: ﴿ وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ ''اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے ضرور اس پر ایمان لائے گا۔''

② وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۱۷)۔

آیت 160 ① فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا: '' فَبِظُلْمٍ '' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے اور جار مجرور پہلے آنے کی وجہ سے تخصیص پیدا ہوگئی، اس لیے ترجمہ ''ان کے بڑے ظلم ہی کی وجہ سے'' کیا گیا ہے۔

② یہود کی سرکشی اور شرارتیں ذکر کرنے کے بعد اب ان پر سختی کا ذکر ہے۔ (کبیر)

③ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ ......: پاکیزہ چیزوں کی یہ حرمت کچھ تو ان کی سرکشی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف

وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ مِنۡهُمۡ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَالۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ وَالۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ اُولٰۤئِكَ سَنُؤۡتِيۡهِمۡ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۲

اور ان کے سود لینے کی وجہ سے، حالانکہ یقیناً انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور ان کے لوگوں کے اموال باطل طریقے کے ساتھ کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے کفر کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۱۶۱﴾ لیکن ان میں سے وہ لوگ جو علم میں پختہ ہیں اور جو مومن ہیں، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں جو تیری طرف نازل کیا گیا اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اور جو خاص کر نماز ادا کرنے والے ہیں اور جو زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے والے ہیں، یہ لوگ ہیں جنھیں ہم عنقریب بہت بڑا اجر عطا کریں گے ﴿۱۶۲﴾

سے تھی، کیونکہ وہ گناہ پر بہت دلیر تھے، تاکہ ان کی سرکشی کچھ ٹوٹے، یہ شرعی حرمت تھی، جیسا کہ سورۂ انعام (۱۴۶) میں ہے اور کچھ چیزیں انھوں نے اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کا اختیار دے کر ان کے حرام قرار دینے کی وجہ سے حرام کر لیں، گویا یہ اللہ کی تقدیر میں ان کے بڑے ظلم شرک (احبار و رہبان کو رب بنانے) کی سزا کے طور پر حرام ہوئیں، جیسا کہ اب مسلمانوں میں سے بھی بعض نے اپنے اماموں کے کہنے پر کئی حلال چیزیں حرام اور کئی حرام چیزیں حلال قرار دے رکھی ہیں۔

④ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ایک اور نفیس مطلب بیان کیا ہے کہ یہاں "طَيِّبٰتٍ" سے مراد ان انعامات کا موقوف کر دینا ہے جو بادشاہی اور نبوت و نصرت کی شکل میں حاصل تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ﴾ [البقرۃ : ٦١] "اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔" (فتح الرحمٰن) حقیقت میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

آیت 161 ① وَاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ: اس وقت جو تورات موجود ہے اس میں بھی متعدد مقامات پر سود کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ (دیکھیے کتاب خروج، باب ۲۲، فقرہ ۲۵ تا ۲۷)۔

② وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ: یعنی رشوت، جوئے، دھوکے اور دوسرے ناجائز ذرائع سے لوگوں کے اموال کھانا۔ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، مخلوق پر ظلم اور حق سے اعراض۔ اوپر کی آیت: ﴿ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ﴾ (اور ان کے اللہ کے راستے سے بہت زیادہ روکنے کی وجہ سے) سے مخلوق پر ظلم کی طرف اشارہ ہے، باقی کا تعلق "اعراض عن الحق" سے ہے۔ (کبیر)

آیت 162 ① لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ ……: علم میں پختہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف سے آنے والی وحی کے متلاشی ہوں اور اسی سے دلیل اور رہنمائی حاصل کریں، نہ لکیر کے فقیر ہوں نہ تقلید آباء کے اور "الۡمُؤۡمِنُوۡنَ" سے مراد تورات پر صحیح ایمان رکھنے والے ہیں، یعنی یہ مومن اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔

اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ ۚ وَاَوۡحَيۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ‌ ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ‌ۚ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ‌ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ‌ۚ﴿۱۶۴﴾

بلاشبہ ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح اور اس کے بعد (دوسرے) نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ﴿۱۶۳﴾ اور بہت سے رسولوں کی طرف جنھیں ہم اس سے پہلے تجھ سے بیان کر چکے ہیں اور بہت سے ایسے رسولوں کی طرف جنھیں ہم نے تجھ سے بیان نہیں کیا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا ﴿۱۶۴﴾

یہ اہل کتاب کے مومنوں کو بشارت ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے، مثلاً عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

② وَالۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ: اس سے پہلے اور بعد والی تمام صفات مرفوع ہیں اور یہ منصوب ہے، اسے "منصوب علی المدح" یا "علی الاختصاص" کہا جاتا ہے۔ گویا یہ "اَخُصُّ" کا مفعول ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "اور جو خاص کر نماز ادا کرنے والے ہیں۔"

آیت 163 ① اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ...... : یہ ان کے اس اعتراض اور مطالبے کا اصل جواب ہے کہ آپ تورات کی طرح آسمان سے اکٹھی کتاب نازل کروائیں، یعنی وحی اور دعوت الی الحق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دوسرے انبیاء سے مختلف نہیں ہے، نوح علیہ السلام سے لے کر جتنے انبیاء و رسل ہوئے ہیں سب کو الگ الگ معجزات ملے اور تورات کے علاوہ کسی کو بھی یک بارگی کتاب نہیں دی گئی، پھر جب یک بارگی کتاب ان پر نازل نہ کرنے سے ان کی نبوت پر حرف نہیں آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے باعث اعتراض کیوں ہے؟ نوح علیہ السلام سے پہلے بھی بہت سے انبیاء ہوئے ہیں مگر اولوالعزم اور صاحب شریعت نبی سب سے پہلے نوح علیہ السلام تھے اور نوح علیہ السلام ہی وہ نبی ہیں جن کی قوم پر عذاب نازل ہوا اور رد شرک کا وعظ بھی نوح علیہ السلام سے شروع ہوا، اس لیے سب سے پہلے ان کا نام ذکر کیا ہے۔ (قرطبی، کبیر) وحی کے اصل معنی تو "کسی مخفی ذریعے سے کوئی بات سمجھا دینا" کے ہیں اور "اِيۡحَاءٌ" (افعال) بمعنی الہام بھی آ جاتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ شوریٰ (۵۱)۔

② وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا : یعنی تم زبور کو تو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہو، حالانکہ وہ بھی داؤد علیہ السلام پر تورات کی طرح تختیوں کی شکل میں نازل نہیں ہوئی تھی، پھر قرآن مجید کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہونے سے کیوں انکار کرتے ہو؟ (کبیر) موجودہ زبور میں ایک سو پچاس سورتیں ہیں، جن میں دعائیں نصیحتیں اور تمثیلیں مذکور ہیں، حلت و حرمت کے احکام مذکور نہیں ہیں۔

آیت 164 ① وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ : جن رسولوں کے اسمائے گرامی اور واقعات قرآن کریم میں بیان کیے گئے ہیں ان کی تعداد چوبیس (۲۴) یا پچیس (۲۵) ہے۔ آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسماعیل، اسحاق، یعقوب،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

ایسے رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہ جائے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۶۵﴾

یوسف، ایوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، الیاس، یسع، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، ذوالکفل (اکثر مفسرین کے نزدیک) اور محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔

2 وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ : جن انبیاء و رسل کے نام قرآن میں ذکر نہیں ہوئے ان کی تعداد کتنی ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے، جو بہت مشہور ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ایک حدیث میں آٹھ ہزار بتائی گئی ہے، مگر ان احادیث میں کلام ہے۔

3 وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا : یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہم کلامی کا شرف بخشا، جو کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۳) پھر اگر موسیٰ علیہ السلام کے اس شرف سے دوسرے انبیاء پر طعن نہیں آ سکتا تو تورات کا یک بارگی نزول دوسرے انبیاء کے لیے موجب طعن کیسے ہو سکتا ہے۔ (رازی)

4 اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا بھی ثابت ہوا، جو لوگ یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے کلام کا انکار کرتے ہیں وہ قیامت کے دن ان آیات و احادیث کا کیا جواب دیں گے جن میں صاف لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا ذکر ہے۔ اللہ کے ان بندوں نے اللہ تعالیٰ کو انسان سے بھی عاجز یعنی گونگا بنا دیا اور اپنے خیال میں اسے اللہ تعالیٰ کی خوبی سمجھ رہے ہیں۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ ایسے ہی لوگوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ قرآن یا حدیث میں کہیں دکھاؤ کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ مخلوق ہے مگر نہ اس وقت ان کے مخالف یہ دکھا سکے نہ اب کوئی دکھا سکتا ہے۔

آیت 165 رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ...... : یعنی انبیاء کی بعثت کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور اپنی اصلاح کر لیں انھیں جنت کی خوش خبری دیں اور جو کفر اور نادانی پر جمے رہیں انھیں ان کے غلط رویے کے انجام بد سے ڈرائیں، تاکہ اس طرح ان پر اتمامِ حجت ہو جائے اور وہ اللہ کے ہاں کوئی عذر پیش نہ کر سکیں کہ ہمارے پاس تو تیری طرف سے کوئی خوش خبری دینے والا یا ڈرانے والا آیا ہی نہیں اور یہ مقصد کتاب و شریعت کے نازل کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت بس یہ دونوں چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی امام یا مجتہد کو دین میں حجت نہیں بنایا) عام اس سے کہ وہ کتاب یک بارگی دے دی جائے یا تدریجاً نازل ہو۔ بعثت کے اس اصلی مقصد پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ کتاب کے حسب ضرورت تدریجاً نازل کرنے سے تو یہ مقصد زیادہ کامل طریقے سے پورا ہوتا ہے، پھر ان کا یہ کہنا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح یک بارگی کتاب لائیں گے تو مانیں گے ورنہ نہیں، محض ضد اور عناد ہے۔ (کبیر)

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ
شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ
جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

لیکن اللہ شہادت دیتا ہے اس کے متعلق جو اس نے تیری طرف نازل کیا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور فرشتے شہادت دیتے ہیں اور اللہ کافی گواہ ہے ﴿۱۶۶﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا یقیناً وہ گمراہ ہو گئے، بہت دور گمراہ ہونا ﴿۱۶۷﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں بخشے اور نہ یہ کہ انھیں کسی راستے کی ہدایت دے ﴿۱۶۸﴾ سوائے جہنم کی راہ کے، جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ، اور یہ ہمیشہ سے اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۱۶۹﴾

آیت 166 لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ ...... : یعنی وحی ہر پیغمبر پر آتی رہی ہے، کچھ نیا کام نہیں، پر اس کلام (قرآن مجید) میں اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ تعالیٰ اس حق کو ظاہر کر دے گا، چنانچہ ظاہر ہوا کہ جس قدر ہدایت اس نبی سے ہوئی اور کسی سے نہ ہوئی۔ (موضح) یہ آیت بھی یہود کے مذکورہ سوال کے جواب میں ہے کہ اگر یہود قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہیں تو اس سے قرآن کا سچا ہونا مجروح نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے قرآن اپنے علم اور حکمت بالغہ کے ساتھ نازل کیا ہے، جو اس کے انتہائی کامل ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ اس کا علم ماضی، حال اور مستقبل سب کو محیط ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ قرآن اپنے علم سے، یعنی خوب جانتے ہوئے اتارا ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں سے بڑھ کر آپ ہی اس چیز کے اہل تھے کہ آپ پر یہ قرآن نازل کیا جاتا۔

آیت 167 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... : ان لوگوں سے مراد یہودی ہیں جو نبی ﷺ پر خود بھی ایمان نہ لاتے اور لوگوں کو بھی یہ کہہ کر روکا کرتے تھے کہ اس شخص کی کوئی صفت ہماری کتاب میں مذکور نہیں، یا یہ کہ نبوت کا دائرہ تو ہارون اور داؤد علیہما السلام کی اولاد تک محدود ہے، یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت منسوخ نہیں ہو سکتی، ان کی اسی قسم کی کوششوں کو قرآن نے دور کی گمراہی قرار دیا ہے۔

آیت 166 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا ...... : ان کی گمراہی کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اب ان کو وعید سنائی جا رہی ہے۔ (کبیر) یعنی گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا، یا آخری نبی ﷺ کی صفات کو چھپا کر ان پر ظلم کیا، یا دوسرے لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ان پر ظلم کیا۔ (قرطبی)

آیت 167 اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ...... : یعنی جب کفر ہی کی حالت میں مر جائیں گے اور مرنے سے پہلے توبہ نہیں کریں گے تو سیدھے جہنم میں جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کو جہنم میں لے جانا اور پھر ہمیشہ وہاں رکھنا

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَیْرًا لَّكُمْ ؕ وَ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۷۰﴾ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ

اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس یہ رسول حق کے ساتھ تمھارے رب کی طرف سے آیا ہے، پس تم ایمان لے آؤ، تمھارے لیے بہتر ہوگا اور اگر کفر کرو تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۷۰﴾ اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ گزرو اور اللہ پر مت کہو مگر حق۔

اللہ تعالیٰ پر کچھ مشکل نہیں ہے، لہٰذا اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ کفر وعناد سے باز آ جائیں اور آپ ﷺ کی اتباع اختیار کر لیں۔

آیت 170 یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ ...... : متعدد طریقوں سے یہود کے اعتراضات و شبہات کی تردید اور قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کے بعد اب سب لوگوں کو آپ ﷺ کی رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے، جن میں یہود بھی شامل ہیں کہ جب یہ رسول برحق ہے اور قرآن بھی اللہ کی سچی کتاب ہے تو تمھیں لازم ہے کہ اس دعوت کو قبول کر لو، اس میں تمھارا بھلا ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے، ورنہ یاد رکھو کہ زمین و آسمان میں جتنی مخلوق ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، اس کا تمھارے ایمان نہ لانے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ دیکھیے سورۂ ابراہیم (۸)۔

آیت 171 ① یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ ...... : رازی لکھتے ہیں، یہود کے شبہات کا جواب دینے کے بعد اب اس آیت میں نصاریٰ کے شبہ کی تردید کی جا رہی ہے۔ (کذا فی فتح الرحمٰن) مگر بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے، اس لیے کہ ''غلو'' راہ اعتدال کے چھوڑ دینے کا نام ہے اور یہ افراط و تفریط (زیادتی اور کمی) دونوں صورتوں میں ہے۔ ایک طرف نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں افراط سے کام لے کر ان کو اللہ کا بیٹا قرار دے رکھا تھا، تو دوسری طرف یہود نے مسیح علیہ السلام سے متعلق یہاں تک تفریط برتی کہ ان کی رسالت کا بھی انکار کر دیا، قرآن نے بتایا کہ یہ دونوں فریق غلو کر رہے ہیں۔ اعتدال کی راہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو اللہ کے بیٹے ہیں کہ ان کو معبود بنا لیا جائے اور نہ جھوٹے نبی ہیں، بلکہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ (قرطبی) آج کل اسی قسم کا غلو مسلمانوں میں بھی آ گیا ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جو نبی ﷺ اور اولیائے امت کا درجہ اس قدر بڑھا دیتے ہیں کہ انھیں خدا کی خدائی میں شریک قرار دیتے ہیں اور پھر رسول اللہ ﷺ کو بشر سمجھنا انتہائی درجے کی گستاخی شمار کرتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ نے اس غلو سے سختی سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارَی ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ» [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالٰی: ﴿ واذكر في الكتاب مريم ...... ﴾ : ۳٤٤٥] ''مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑھایا۔ میں تو اس کا بندہ ہوں، لہٰذا تم مجھے اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہا کرو۔''

② وَ كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْیَمَ : یعنی انھیں کلمہ ''کُنْ'' سے بنایا اور اس طرح ان کی پیدائش بن باپ کے ہوئی، یہ معنی

كَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ۫ۚ وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۠ ﴿۱۷۱﴾

نہیں ہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مگر اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ، جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک روح ہے۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مت کہو کہ تین ہیں، باز آ جاؤ، تمھارے لیے بہتر ہوگا۔ اللہ صرف ایک ہی معبود ہے، وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ بطور وکیل کافی ہے ﴿۱۷۱﴾

نہیں کہ وہ کلمہ ہی عیسیٰ علیہ السلام بن گیا، ورنہ آدم علیہ السلام تو ماں باپ دونوں کے بغیر کلمۂ " کُنْ " سے پیدا ہوئے تھے۔ پھر انھیں بھی رب ماننا پڑے گا، دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۹)۔

③ وَ رُوْحٌ مِّنْهُ : یعنی اس کی پیدا کردہ روح، اس اضافت سے عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت کا اظہار مقصود ہے، ورنہ تمام روحیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں، فرمایا: ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ﴾ [فاطر : ۳] "کیا اللہ کے سوا بھی کوئی پیدا کرنے والا ہے؟" جیسے فرمایا: "نَاقَةُ اللّٰهِ" "اللہ کی اونٹنی" اور "بَيْتِيَ" "میرے گھر کو" حالانکہ تمام اونٹنیوں اور تمام گھروں کا مالک اللہ ہے۔ یہ " مِنْ " تبعیضیہ نہیں ہے بلکہ ابتدائے غایت کے لیے ہے۔ (ابن کثیر)

④ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ : یعنی عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول ہیں، پس تم دوسرے پیغمبروں کی طرح ان کو اللہ کا رسول ہی مانو اور انھیں الوہیت (خدائی) کا مقام مت دو۔ (کبیر)

⑤ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ : " ثَلٰثَةٌ " مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی " اٰلِهَتُنَا ثَلَاثَةٌ " یا " اَلْاَقَانِيْمُ ثَلَاثَةٌ " کہ ہمارے معبود تین ہیں، یا اقانیم تین ہیں۔ مبتدا اس لیے حذف کیا ہے کہ نصرانیوں کے اقوال بہت ہی مختلف ہیں، اگرچہ خلاصہ ان کا ایک ہے کہ خدا تین ہیں مگر وہ تین نہیں ایک ہیں۔ اب ایک ذات اور اس کی بے شمار صفات تو ہو سکتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ، مریم اور عیسیٰ علیہما السلام یہ تو تین مستقل شخصیتیں اور ذاتیں ہیں، یہ ایک ذات کیسے ہو گئے! نصرانی بیک وقت خدا کو ایک بھی تسلیم کرتے ہیں اور پھر اقانیم ثلاثہ کے بھی قائل ہیں۔ یہ اقانیم ثلاثہ کا چکر بھی نہایت پر پیچ اور ناقابل فہم ہے۔ (کبیر) جس طرح بعض مسلمانوں میں " نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ " کا عقیدہ نہایت گمراہ کن ہے، جو واضح طور پر سورۂ اخلاص اور پورے قرآن کے خلاف ہے۔ نصرانی کبھی تو ان تین سے مراد وجود، علم اور حیات بتاتے ہیں اور کبھی انھیں باپ، بیٹا اور روح القدس سے تعبیر کر لیتے ہیں، حالانکہ وجود، علم اور حیات تو ایک ذات کی صفات ہوتی ہیں مگر باپ، بیٹا اور روح القدس تو تین شخصیتیں ہیں، یہ ایک کیسے بن گئے؟ پھر ان کی کور فہمی دیکھو کہ کبھی کہتے ہیں کہ باپ سے وجود، روح سے حیات اور بیٹے سے مراد مسیح علیہ السلام ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ

لَنْ یَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّسْتَنْكِفْ
عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
اَلِيْمًا ۙ۬ وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

مسیح ہرگز اس سے عار نہ رکھے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتے ہی اور جو بھی اس کی بندگی سے عار رکھے اور تکبر کرے تو عنقریب وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا ﴿۱۷۲﴾ پھر جو لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو وہ انھیں ان کے اجر پورے دے گا اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ بھی دے گا اور رہے وہ جنھوں نے عار سمجھا اور تکبر کیا تو وہ انھیں دردناک عذاب دے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۷۳﴾

اقانیم ثلاثہ سے مراد اللہ تعالیٰ، مریم اور عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ قرآن نے بھی اس آخری قول کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۷۳، ۷۵، ۷۶، ۱۱۶) الغرض نصرانیوں کے عقیدۂ تثلیث سے زیادہ بعید از عقل کوئی عقیدہ نہیں اور اس بارے میں ان میں اس قدر انتشار و افتراق ہے کہ دنیا کے کسی عقیدہ میں نہیں، اس لیے قرآن نے انھیں دعوت دی کہ تم تین خداؤں کے گورکھ دھندے کو چھوڑ کر خالص توحید کا عقیدہ اختیار کر لو۔

⑥ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: یعنی نہ کوئی اس کا شریک ہے، نہ بیوی اور نہ کوئی رشتے دار، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا۔

⑦ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اور جسے تم نے اس کا شریک ٹھہرایا ہے وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح اس کا مملوک اور مخلوق ہے اور جو شخص مملوک یا مخلوق ہو وہ خالق یا مالک کا بیٹا یا شریک کیسے ہو سکتا ہے؟

⑧ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: یعنی اس کو بیٹے کی کیا ضرورت ہے، وکیل یعنی سارے کام بنانے والا تو وہ خود ہی ہے۔ (موضح)

آیت 172 لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ ...... : اس آیت میں نصاریٰ اور مشرکین دونوں کے غلط عقیدے کی تردید ہے، کیونکہ نصرانی مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ دونوں اللہ کی بندگی کا اقرار کرتے ہیں اور اس کا بندہ ہونے پر کچھ بھی عار اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ یہی حال ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ جب کوئی شخص آپ کو اللہ کا بندہ کہتا تو آپ کو بے انتہا خوشی ہوتی۔ کیونکہ اس مالک الملک اور شہنشاہِ مطلق کا بندہ ہونا انتہائی عزت و شرف کا مقام ہے، نہ کہ کسی ذلت و رسوائی کا۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''انوار القلوب'' میں لکھا ہے کہ آدمی کے لیے بندگی کے مقام سے زیادہ عزت کا کوئی مقام نہیں، اکرم الخلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تین مقامات پر، جو نہایت عزت کے مقامات ہیں، لفظ ''عبد'' یعنی بندہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے، وہ تین مقام یہ ہیں: ① نزول وحی۔ (دیکھیے کہف: ۱۔ فرقان: ۱۔ نجم: ۱۰۔ حدید: ۹) ② اسراء و معراج۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱) ③ دعا۔ (دیکھیے جن: ۱۹)۔

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ

اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک واضح نور نازل کیا ہے ﴿۱۷۴﴾ پھر جو لوگ تو اللہ پر ایمان لائے اور اسے مضبوطی سے تھام لیا تو عنقریب وہ انھیں اپنی خاص رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور انھیں اپنی طرف سیدھے راستے کی ہدایت دے گا ﴿۱۷۵﴾ وہ تجھ سے فتویٰ مانگتے ہیں، کہہ دے اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی آدمی مرجائے، جس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی

آیت 174 يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ...... : جب اللہ تعالیٰ نے تمام گمراہ فرقوں کفار، منافقین، یہود و نصاریٰ پر دلائل قائم کر دیے اور ان کے شکوک و شبہات کی بھی مکمل تردید فرما دی تو اب اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی عام دعوت دی کہ تمھارے پاس رسول اللہ ﷺ کے نبی برحق ہونے کی واضح دلیل آ چکی اور ہم نے حق کو واضح کرنے والا نور، یعنی قرآن مجید نازل فرما دیا جو انسان کو ضلالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے اور دل میں نور ایمان پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

آیت 176,175 ① يَسْتَفْتُوْنَكَ : سورت کی ابتدا تقویٰ کے حکم کے بعد اموال کے احکام سے ہوئی تھی، اب آخر میں انھی احکام کے ساتھ سورت کا اختتام ہے۔ درمیان سورت میں مخالفین سے مجادلہ اور ان کی تردید ہے۔ (رازی) کلالہ پر بحث اس سورت کی آیت (۱۱) میں گزر چکی ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں اس وقت بیمار اور بے ہوش تھا، آپ نے وضو کیا، پھر وضو کے بچے ہوئے پانی سے مجھ پر چھینٹے مارے، یا فرمایا: ''اس پر چھینٹے مارو۔'' جس سے مجھے ہوش آ گیا، میں نے عرض کی کہ میں کلالہ ہوں، میری میراث کیسے تقسیم ہوگی، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بخاری، المرض، باب وضوء العائد للمریض : ٥٦٧٦۔ مسلم : ١٦١٦]

② لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗٓ اُخْتٌ...... : بعض نے اس سے استدلال کیا ہے کہ جس کی اولاد نہ ہو، خواہ اس کا باپ زندہ ہی ہو، اسے کلالہ کہا جائے گا، مگر یہ صحیح نہیں، صحیح معنی وہی ہے جو پہلے گزرا، یعنی کلالہ اس مرنے والے کو کہا جاتا ہے جس کا باپ یا دادا نہ ہو اور اولاد بھی نہ ہو، کیونکہ باپ کی موجودگی میں بہن سرے سے وارث نہیں ہوتی، باپ اس کے حق میں حاجب بن جاتا ہے لیکن یہاں اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ اگر اس کی بہن ہو تو وہ اس کے نصف مال کی وارث ہوگی، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کلالہ وہ ہے کہ اولاد نہ ہونے کے ساتھ ساتھ باپ دادا بھی نہ ہوں۔ یوں اولاد کی نفی تو الفاظ سے واضح ثابت ہوگئی اور باپ کی نفی اشارے سے۔

وَلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کا نصف ہے جو اس نے چھوڑا اور وہ (خود) اس (بہن) کا وارث ہوگا، اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہ ہو۔ پھر اگر وہ دو (بہنیں) ہوں تو ان کے لیے اس میں سے دو تہائی ہوگا جو اس نے چھوڑا اور اگر وہ کئی بھائی بہن مرد اور عورتیں ہوں تو مرد کے لیے دو عورتوں کے حصے کے برابر ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۷۶﴾

③ اولاد سے مراد بیٹا، بیٹی اور بیٹے کی اولاد ہے، اسی طرح بہن سے مراد یہاں سگی بہن یا علاتی (باپ شریک) بہن ہے، کیونکہ اخیافی بہن، جو صرف ماں کی طرف سے ہو، اس کا حکم پہلے سورۂ نساء (۱۲) میں گزر چکا ہے۔ (ابن کثیر)

④ "وَلَدٌ" کا لفظ بیٹا بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر بعض نے کہا کہ بیٹی ہونے کی صورت میں بہن محروم رہے گی، مگر صحیح بخاری (۶۷۴۱) میں معاذ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے کہ اگر ایک شخص فوت ہو جائے اور اس کے ورثاء میں صرف بیٹی اور بہن ہے تو بیٹی کو نصف اور باقی بہن کو (بوجہ عصبہ ہونے کے) دیا جائے گا۔ اور بخاری ہی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرنے والے کی ایک بہن، ایک بیٹی اور ایک پوتی کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ بیٹی کے لیے نصف ہے، پوتی کے لیے چھٹا حصہ، تاکہ دو ثلث پورے ہو جائیں اور جو باقی بچے گا وہ بہن کے لیے ہے۔ [بخاری، الفرائض، باب میراث ابنة ابن مع ابنة : ۶۷۳۶]

⑤ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا ...... : اور یہی حکم دو سے زیادہ بہنوں کا ہے، انھیں بھی دو ثلث ہی ملے گا اور اگر کلالہ کے وارث بھائی اور بہن دونوں ہوں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔

⑥ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے میراث کے یہ حصے خود اس لیے واضح فرمائے ہیں کہ اگر یہ تم پر چھوڑ دیے جائیں تو تم کبھی صحیح فیصلہ نہ کر سکو، کیونکہ تمھیں ہر بات کا علم نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا خوب علم ہے، اس لیے اس کے فیصلے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔

سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ ۵ مدنیۃ ۱۱۲ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا ۱۲۰ رُكُوْعَاتُهَا ۱۶

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! عہد پورے کرو۔ تمھارے لیے چرنے والے چوپائے حلال کیے گئے ہیں، سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جائیں گے، اس حال میں کہ شکار کو حلال جاننے والے نہ ہو، جب کہ تم احرام والے ہو، بے شک اللہ فیصلہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ①

اس سورت کے مدنی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''یہ سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی، لہٰذا اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو۔'' [أحمد : ۱۸۸/۶، ح : ۲۵۶۰۲۔ ترمذی : ۳۰۶۳، عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہما وحسنه الهلالي في الاستيعاب] سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کی کچھ فضیلت بیان ہو چکی ہے۔

آیت 1 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا......: اس آیت میں پانچ احکام بیان ہوئے ہیں: ① عقود اور عہود کا پورا کرنا۔ ② چوپاؤں کا حلال ہونا۔ ③ کچھ چوپاؤں کا حرام ہونا، جن کا ذکر اس سورت کی دوسری اور تیسری آیت میں ہے۔ ④ محرم کے لیے اور حرم میں شکار کا حرام ہونا۔ ⑤ غیر محرم کے لیے غیر حرم میں شکار کا حلال ہونا۔

② بِالْعُقُوْدِ: یہ '' عَقْدٌ '' کی جمع ہے جس کا معنی گرہ لگانا ہے، عہد و پیمان کے معنی میں بھی آتا ہے، کیونکہ وہ بھی گرہ کی طرح پختہ کیا جاتا ہے، مراد شریعت کے احکام ہیں۔ دوسری جگہ عقد کو عہد سے بھی تعبیر کیا ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْۤ ﴾ [البقرۃ: ۴۰] ''اور تم میرا عہد پورا کرو۔'' اس میں آپس کے عہد و پیمان بھی شامل ہیں۔ یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے، اس کے بعد نیچے اس کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ (کبیر، ابن کثیر)

③ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ: '' بَهِيْمَةٌ '' سے مراد درندوں کو چھوڑ کر باقی چوپائے ہیں، وہ سب حلال ہیں، خواہ پالتو ہوں یا وحشی، مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ، سوائے ان کے جن کا نام لے کر قرآن یا حدیث میں حرام کہا گیا ہے، مثلاً گدھا وغیرہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳) '' الْاَنْعَامِ '' سے مراد اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری ہیں۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۲ تا ۱۴۴)۔

④ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ: اس کی تفسیر اسی سورت کی آیت (۳،۲) میں آ رہی ہے۔

⑤ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ: '' حُرُمٌ '' یہ '' حَرَامٌ '' کی جمع ہے، جس نے عمرہ یا حج کا احرام باندھا ہو، اسی طرح جو شخص مکہ کی حدود حرم میں ہو، خواہ احرام نہ باندھا ہو، اس حالت میں شکار بھی ممنوع ہے اور شکار کرنے والے کی کسی طریقے سے مدد کی بھی ممانعت آئی ہے۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۹۵، ۹۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو بھی حرم قرار دیا، اس کی حدود

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَاۤ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۲

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ حرم کی قربانی کی اور نہ پٹوں (والے جانوروں) کی اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنے والوں کی، جو اپنے رب کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہیں، اور جب احرام کھول دو تو شکار کرو، اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ انھوں نے تمھیں مسجد حرام سے روکا، تمھیں اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ حد سے بڑھ جاؤ، اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے ②

میں بھی شکار منع ہے۔[بخاري، فضائل المدينة، باب حرم المدينة : ١٨٦٨]

آیت 2 ① لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ: "شَعَآئِرَ" یہ " شَعِيْرَةٌ" کی جمع ہے جو "فَعِيْلَةٌ" بمعنی "مُفْعَلَةٌ" ہے، یعنی ہر وہ چیز جس پر نشان لگایا گیا ہو یا جو بطور علامت مقرر کی گئی ہو، مراد وہ چیزیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق ہو اور اس خاص تعلق کی بنا پر ان کی تعظیم کی جاتی ہو۔ بعض نے اسے عام رکھا ہے کہ اس سے مراد اللہ کے تمام اوامر ونواہی ہیں اور بعض نے حج و عمرہ کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیزیں مراد لی ہیں۔ "لَا تُحِلُّوْا" کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ترک نہ کرو اور ان کی بے حرمتی نہ کرو۔

② وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ : ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ''سال کے بارہ مہینے ہیں، جن میں سے چار حرمت والے ہیں، تین مسلسل ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک رجبِ مضر جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔'' [بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ إن عدة الشهور...... ﴾ : ٤٦٦٢] مطلب یہ ہے کہ ان مہینوں میں جنگ کر کے ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۳۶)۔

③ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ: "الْهَدْيَ" ایسے جانور کو کہا جاتا ہے جو حاجی حرم میں قربان کرنے کے لیے ساتھ لے جاتے تھے۔ اونٹوں کی کوہان کی دائیں طرف تھوڑا سا زخم کر کے مل دیتے، اسے اشعار کہتے ہیں اور گلے میں ایک جوتا یا پٹا ڈال دیتے۔ "الْقَلَآئِدَ" یہ " قِلَادَةٌ " کی جمع ہے، جس سے مراد وہ پٹا یا رسی وغیرہ ہے جو پرو کر ہدی (قربانی) کے گلے میں بطور علامت باندھ دی جاتی تھی۔ چھوٹے جانوروں کا اشعار نہیں کرتے تھے۔ "الْقَلَآئِدَ" کا معنی اگرچہ پٹے ہیں مگر مراد وہ جانور ہیں جن کے گلے میں وہ پٹا ڈالا گیا ہو۔ ان سب چیزوں کا ذکر اگرچہ '' شَعَآئِرَ اللّٰهِ '' کے ضمن میں آ چکا ہے مگر ان کے مزید احترام کی خاطر ان کو الگ بیان کیا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ

تم پر مردار حرام کیا گیا ہے اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے والا جانور اور جسے چوٹ لگی ہو اور گرنے والا اور جسے سینگ لگا ہو اور جسے درندے نے کھایا ہو، مگر جو تم ذبح کر لو، اور جو تھانوں

④ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ...... : یعنی وہ لوگ جو مسجد حرام کا قصد کر کے جا رہے ہیں۔ رب کے فضل سے مراد رزق ہے جو تجارت وغیرہ سے کمایا جاتا ہے اور اللہ کی رضا مندی سے مراد حج یا عمرہ ہے جو طلبِ ثواب کے لیے کیا جاتا ہے۔ بعض نے فضل سے ثواب ہی مراد لیا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مکہ جا رہے ہیں۔ اگر اس کے تحت مشرک بھی داخل ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ بھی اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، لہٰذا ان کو تکلیف مت دو۔ مگر یہ حکم سورۂ توبہ کی آیت (۲۸) سے منسوخ ہو گا۔ اب مشرکین کو حدود حرم میں داخلے کی اجازت نہیں۔ (ابن کثیر، قرطبی)

⑤ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا : یعنی احرام کھولنے کے بعد شکار کرو۔ یہ حکم بیانِ جواز کے لیے ہے، یعنی اب شکار جائز ہے، یہ معنی نہیں کہ اب ضرور ہی شکار کرو، کیونکہ وہ احرام سے پہلے بھی ضروری نہ تھا۔ (ابن کثیر)

⑥ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ ...... : یعنی اگرچہ ان مشرکین نے تمھیں ۶ ہجری میں اور اس سے پہلے مسجد حرام میں جانے سے روک دیا تھا لیکن تم ان کے اس روکنے کی وجہ سے ان کی دشمنی کی بنا پر حد سے مت بڑھو۔

⑦ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ...... : ہر قسم کا نیک کام کرنے کا نام " اَلْبِرّ " اور برائی کو ترک کرنے کا نام "اَلتَّقْوٰى" ہے۔ ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور نہ کرنے کے لیے ایک اصول مقرر فرما دیا ہے جس سے اسلامی معاشرے میں برائی کا سدباب ہو سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک آدمی نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! جب وہ مظلوم ہو، میں اس کی مدد کروں گا لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کس طرح کروں؟'' فرمایا: ''اس وقت اس کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکو۔'' [بخاري، الإكراه، باب يمين الرجل...... : ۶۹۵۲۔ مسلم : ۲۵۸٤]

آیت 3 ① حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ : شروع کی آیت میں جن جانوروں کے حرام ہونے کے بیان کا وعدہ ''سوائے ان کے جو تم پر پڑھے جائیں گے'' کے ساتھ کیا گیا تھا اس آیت میں ان کا ذکر ہے۔

② اَلْمَيْتَةُ : مردار میں سے مچھلی اور ٹڈی حلال ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کر دیے گئے ہیں، مردار تو مچھلی اور ٹڈی ہیں (کیونکہ ان میں دم مسفوح نہیں ہوتا) اور خون جگر اور تلی ہیں۔'' [أحمد : ۹۷/۲، ح : ۵۷۲۵۔ ابن ماجه : ۳۳۱٤، و صححه الألباني في الصحيحة : ۱۱۱۸] حرام خون اور لحم خنزیر کی تفصیل سورۂ انعام (۱۴۵) میں ہے۔

وَ اَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ ؕ ذٰلِكُمۡ فِسۡقٌ ؕ اَلۡيَوۡمَ يَئِسَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ دِيۡنِكُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَ اخۡشَوۡنِ ؕ اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَ رَضِيۡتُ لَكُمُ

ذبح کیا گیا ہو اور یہ کہ تم تیروں کے ساتھ قسمت معلوم کرو۔ یہ سراسر نافرمانی ہے۔ آج وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تمھارے دین سے مایوس ہو گئے، تو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا پھر جو شخص بھوک

③ وَالۡمُنۡخَنِقَةُ : گلا گھٹنے والا جانور، خواہ خود بخود رسی وغیرہ سے گھٹ کر مر جائے یا کوئی گلا گھونٹ کر مار دے۔

④ وَالۡمَوۡقُوۡذَةُ : جسے کسی لاٹھی یا پتھر وغیرہ کی چوٹ سے مارا جائے۔

⑤ اِلَّا مَا ذَكَّيۡتُمۡ : اس کا تعلق اس سے پہلے مذکور پانچ چیزوں کے ساتھ ہے کہ ان پانچوں چیزوں میں سے کسی کے اندر اگر جان باقی ہو اور مرنے سے پہلے اسے ذبح کر لو تو وہ حلال ہے۔ شرعی ذبح یہ ہے کہ حلال جانور کو " بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكۡبَرُ" کہہ کر کسی تیز دھار آلے سے اس کا گلا اس طرح کاٹا جائے کہ رگیں کٹ جائیں۔ ذبح کے علاوہ نحر بھی شرعی طریقہ ہے کہ کھڑے اونٹ کے حلق کے گڑھے میں چھری وغیرہ ماری جائے۔ ذبح اور نحر حلق یا لبہ (حلق کے گڑھے) ہی میں ہوتا ہے، البتہ اگر مجبوری ہو، مثلاً جانور قابو نہیں آ رہا، یا ایسی جگہ ہے جہاں پکڑ کر ذبح کرنا مشکل ہے تو " بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكۡبَرُ " پڑھ کر جہاں سے بھی ہو سکے چھری یا نیزے سے خون بہا کر ذبح کیا جا سکتا ہے۔ اگر ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر نہیں بلکہ اتفاقاً گردن الگ ہو جائے تو وہ بھی حلال ہے۔

⑥ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ : مشرکین اپنے جھوٹے معبودوں کے لیے جو جگہیں مقرر کرتے انھیں نصب کہا جاتا تھا، کیونکہ عموماً وہاں کوئی نشان نصب ہوتا، مثلاً بت، درخت، قبر یا دریا وغیرہ۔ پھر اس کے پاس ان کا قرب حاصل کرنے کے لیے جانور ذبح کرتے تھے۔ ایسی جگہوں کو استھان، تھان اور آستانہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ ایسے جانور بھی حرام ہیں خواہ ان پر "بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكۡبَرُ" بھی پڑھا جائے، اگرچہ ان کا ذکر ﴿ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَيۡرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ کے ضمن میں آ چکا تھا مگر مزید تاکید کے لیے ان کو الگ بھی ذکر فرمایا۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے نذر مانی کہ وہ ''بوانہ'' مقام پر اونٹ نحر کرے گا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے ''بوانہ'' مقام پر ایک اونٹ نحر کرنے کی نذر مانی تھی۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہاں ایام جاہلیت کے (انصاب) استھانوں میں سے کوئی استھان تھا؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں!'' آپ نے مزید پوچھا: ''کیا وہاں مشرکین کی عیدوں (میلوں) میں سے کوئی عید تھی؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں!'' آپ نے فرمایا: ''اپنی نذر پوری کرو۔'' [أبو داوٗد، الأیمان والنذور، باب ما یؤمر به من وفاء النذر : ۳۳۱۳]

⑦ وَاَنۡ تَسۡتَقۡسِمُوۡا بِالۡاَزۡلَامِ : " اَزۡلَامٌ " یہ "زَلَمٌ" کی جمع ہے، یہ وہ تیر تھے جو قسمت معلوم کرنے کے لیے ہبل بت کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ میں ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی تصویروں کے ہاتھوں میں بھی تھمائے ہوئے تھے، بلکہ لوگ

الْإِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

کی کسی صورت میں مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ کسی گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ③

اپنے ساتھ بھی قسمت آزمائی کے یہ تھیلے رکھ لیتے تھے، جیسا کہ سراقہ نے نبی ﷺ کا تعاقب کرتے ہوئے ان تیروں سے فال نکالی تھی۔ ان میں سے کسی پر ''اِفْعَلْ'' (کرلو) لکھا ہوتا، کسی پر '' لَا تَفْعَلْ '' (مت کرو) لکھا ہوتا اور کوئی خالی ہوتا۔ قسمت معلوم کرنے والا تیر نکالتا، جو حکم نکلتا اس پر عمل کرتا، اگر خالی تیر نکلتا تو دوبارہ تیر نکالتا۔ اس قسم کے تمام کام، خواہ انھیں فال نامہ کہا جائے یا استخارہ یا کسی نجومی سے پوچھا جائے حرام ہیں، شرک ہیں کیونکہ غیب تو اللہ کے سوا کوئی جانتا ہی نہیں، مسنون استخارے میں اس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ ﴿ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ﴾ کا ایک اور مطلب بھی ہے، یعنی جوئے کے تیروں کے ذریعے سے ذبح شدہ گوشت کے حصے تقسیم کرنا، اس میں کسی کا حصہ نکل آتا، کوئی محروم رہ جاتا، یہ وہی چیز ہے جسے آج کل لاٹری کہا جاتا ہے، یہ بھی حرام ہے۔ (قرطبی)

⑧ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : یعنی اب تمھاری طاقت اس قدر مستحکم ہوگئی ہے کہ تمھارے دشمنوں کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور وہ اس چیز سے قطعی مایوس ہو گئے ہیں کہ تمھارے دین کو نیچا دکھا سکیں۔

⑨ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ...... : طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ اپنی کتاب میں ایک ایسی آیت پڑھتے ہیں کہ اگر ہم یہودیوں کی کتاب میں یہ آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نزول کے دن کو عید بنا لیتے۔'' آپ نے فرمایا: ''کون سی آیت؟'' اس نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ : ۳] یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم اس دن اور جگہ کو جانتے ہیں جب یہ (آیت) رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی، آپ (۹ ذوالحجہ کو) عرفہ میں تھے (پچھلے پہر کا وقت تھا) اور جمعۃ المبارک کا دن۔'' [بخاری، الإیمان، باب زیادۃ الإیمان و نقصانہ : ٤٥]

دین کو مکمل کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اس کے تمام ارکان، فرائض، سنن، حدود اور احکام بیان کر دیے گئے ہیں اور کفر و شرک کا خاتمہ کر کے اس نعمت کو مکمل کر دیا گیا ہے۔ اب دین میں جو حرام ہونا تھا یا حلال ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اگر کوئی اس میں تبدیلی یا اضافہ کرے گا، یا نئی چیز نکالے گا وہ دین نہیں ہو سکتی بلکہ دین میں بدعت ہے، جو سراسر گمراہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) ''جو ہمارے اس امر (دین) میں کوئی نئی چیز شروع کرے گا جو اس میں نہیں تو وہ مردود ہے۔'' [بخاری، الصلح، باب إذا اصطلحوا...... : ٢٦٩٧]

⑩ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ ...... : یعنی بھوک کی وجہ سے مجبور اور لاچار آدمی اگر حرام چیزوں میں سے کچھ کھا لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ حرام کھانے کا شوق نہ ہو اور اسے جائز نہ سمجھنے لگے اور دوسرا بقدر ضرورت کھائے، حد سے نہ گزرے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے؟ کہہ دے تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور شکاری جانوروں میں سے جو تم نے سدھائے ہیں، (جنھیں تم) شکاری بنانے والے ہو، انھیں اس میں سے سکھاتے ہو جو اللہ نے تمھیں سکھایا ہے تو اس میں سے کھاؤ جو وہ تمھاری خاطر روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام ذکر کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۝۴

معلوم ہوا حرام کھانے کا تعلق بھوک اور حقیقی مجبوری سے ہے۔ زندگی کا معیار بلند کرنے کے لیے اضطرار کا بہانہ بنا کر سود کھانا شروع کر دے، یہ مراد نہیں۔

آیت 4 ❶ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ...... : چوپاؤں کا حکم تو فرما دیا، پھر لوگوں نے اور چیزوں کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے دین کا ایک عظیم الشان اصول بیان فرما دیا، جسے فقہی زبان میں یوں ادا کیا جاتا ہے: ''ہر چیز کی اصل اباحت ہے۔'' یعنی کھانے پینے کی تمام طیبات یعنی ستھری چیزیں حلال ہیں، سو رسول اللہ ﷺ نے جو چیزیں حرام فرمائیں معلوم ہوا وہ ستھری نہیں، جیسے کچلی والے درندے اور پنجے سے شکار کرنے والے پرندے، یا جن کا نام لے کر حرام قرار دے دیا، باقی سب حلال ہیں۔ اس قاعدے سے حرام اشیاء کا دائرہ تنگ ہو گیا اور حلال اشیاء کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

❷ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ ...... : شکاری جانور سے ہر وہ درندہ اور پرندہ مراد ہے جسے شکار کے لیے رکھا اور سدھایا جاتا ہے، مثلاً کتا، چیتا، باز اور شکرا وغیرہ اور اس کے ''سدھائے ہوئے'' ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ شکار پر چھوڑا جائے تو اسے اپنے مالک کے لیے پکڑ کر رکھے، اگر وہ خود شکار پکڑ کر کھانے لگے تو وہ شکار کھانا درست نہیں اور یہی معنی ﴿ مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ ﴾ کے ہیں۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اپنے سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑو اور اللہ کا نام لو تو جو شکار وہ تمھارے لیے پکڑے اسے کھا لو'' میں نے کہا: ''خواہ وہ اسے قتل کر دے؟'' فرمایا: ''خواہ وہ اسے قتل کر دے، بشرطیکہ قتل میں کوئی ایسا کتا شریک نہ ہو جو ان میں سے نہ ہو، کیونکہ تم نے اپنے کتے کو چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا ہے، کسی دوسرے پر نہیں لیا۔'' [بخاری، الذبائح و الصید، باب صید المعراض : ۵۴۷۶]

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم اپنا کتا چھوڑو اور وہ تمھارے لیے پکڑ کر رکھے اور اسے زندہ پا لو تو اسے ذبح کر لو اور اگر تم اسے پاؤ کہ اس نے قتل کر دیا ہے لیکن اسے خود نہیں کھایا تو پھر تم اسے کھا لو، کیونکہ کتے کا اسے پکڑنا ہی ذبح کرنا ہے۔'' [بخاری، الذبائح و الصید، باب التسمیة علی الصید : ۵۴۷۵]

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۵

آج تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں اور ان لوگوں کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے جنھیں کتاب دی گئی اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب تم انھیں ان کے مہر دے دو، اس حال میں کہ تم قید نکاح میں لانے والے ہو، بدکاری کرنے والے نہیں اور نہ چھپی آشنائیں بنانے والے اور جو ایمان سے انکار کرے تو یقیناً اس کا عمل ضائع ہوگیا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہے ⑤

③ وَاتَّقُوا اللّٰهَ: یعنی اگر حلال ہونے کی کوئی شرط کم ہے تو شکار کھانے کے شوق میں اللہ سے بے خوف ہو کر اسے مت کھاؤ۔

آیت 5 ① وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ......: اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کا طعام، جس میں ذبیحہ بھی شامل ہے، مسلمانوں کے لیے حلال ہے، بشرطیکہ انھوں نے غیر اللہ کے نام پر ذبح نہ کیا ہو اور واقعی ذبح کیا ہو۔ کسی چھری یا مشین سے سر کاٹ کر الگ کر دینا یا سخت گرم پانی میں جانور کو ڈال کر یا بجلی کے کرنٹ سے مار دینا ذبح نہیں، کیونکہ ان طریقوں سے جسم سے بہتا ہوا خون (دم مسفوح) پوری طرح باہر نہیں نکلتا جو حرام ہے، اس لیے ایسے جانور کا گوشت کھانا درست نہیں۔ اگر صحیح ذبح کیا ہو تو پھر ٹھیک ہے۔ اہل کتاب کا ذبیحہ کھانے سے متعلق حدیث ہے کہ خیبر کی فتح کے بعد نبی کریم ﷺ کو (ایک یہودی عورت کی طرف سے) بکری کے گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا جس میں زہر ملا ہوا تھا اور آپ نے اس میں سے کچھ کھایا۔ [بخاری، المغازی، باب الشاة التی سمت للنبی ﷺ بخیبر : ۴۲۴۹] اسی طرح بعض صحابہ نے بھی وہ چربی کھائی جو خیبر میں یہودیوں سے حاصل ہوئی تھی۔ [مسلم، الجهاد، باب جواز الأكل من طعام الغنيمة ...... : ۱۷۷۲] مگر جو چیزیں ہماری شریعت میں حرام ہیں، جیسے مردار، خون، خنزیر کا گوشت وغیرہ، یہ چیزیں ان کے دستر خوان پر کھانا بھی حرام ہے، بلکہ ایسے دستر خوان پر بیٹھنا بھی جائز نہیں، نہ ان کے ایسے برتن استعمال کرنا جائز ہے، ہاں اگر اور برتن نہ ملیں اور مجبوری ہو تو انھیں خوب دھو کر اور صاف کر کے استعمال کر سکتے ہیں۔

② وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ......: یعنی ان سے نکاح کرنا درست ہے، چاہے وہ اپنے دین پر قائم رہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ پاک دامن ہوں نہ کہ آزاد منش اور آوارہ قسم کی، جو انسان کے ایمان کو بھی تباہ کر ڈالیں۔ جمہور کے نزدیک یہاں "الْمُحْصَنٰتُ" کے یہی معنی مراد ہیں، تاکہ کفر اور زنا کی دو آفات ان میں جمع نہ ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک (دھولو) اور اگر جنبی ہو تو غسل کر لو اور اگر تم بیمار ہو، یا کسی سفر پر، یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آیا ہو، یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو، پھر کوئی پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو، پس اس

دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۲۱)۔

③ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ...... : اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح صرف جائز ہے، مستحسن اور مستحب نہیں، یعنی کوئی باعث ثواب اور اچھی چیز نہیں اور جو شخص اس اجازت سے فائدہ اٹھائے اسے اپنے ایمان کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی غیر مسلم بیوی سے متاثر ہو کر اپنے ایمان و اخلاق سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

آیت 6 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ...... : اوپر کی آیات میں "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" کے تحت حلال و حرام چیزیں بتائی گئی تھیں، اب اس آیت میں اسی کے تحت وضو اور تیمم کے احکام بیان فرمائے ہیں جو عقود میں شامل ہیں اور سہولت پر مشتمل ہونے کے اعتبار سے اتمام نعمت (نعمت پوری کرنا) بھی ہیں۔ (کبیر، قرطبی) غزوۂ مریسیع (۵ یا ۶ ہجری) میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا تھا، ہار کی تلاش میں صبح ہو گئی اور پانی موجود نہ تھا، لوگ فکر مند ہوئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بخاری، التیمم، باب : ۳۳٤] اس آیت سے چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کی رخصت ملی، اس لیے علماء نے اس آیت کو آیتِ وضو کے بجائے آیتِ تیمم بھی کہا ہے۔ (قرطبی)

نماز سے پہلے وضو نہ ہو تو وضو فرض ہے ورنہ مستحب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھی ہیں۔ [مسلم، الطھارۃ، باب جواز الصلوات کلھا بوضوء واحد : ۲۷۷] اس آیت میں وضو کا بیان ہے، وضو میں سب سے پہلے نیت ضروری ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » ''تمام اعمال (عبادات) کے لیے نیت ضروری ہے۔'' [بخاری، بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ ﷺ : ۱] اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ الغرض تمام اعمال داخل ہیں۔'' قرآن نے چار اعضا کا ذکر کیا ہے، مگر اس کا عملی طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق ہونا چاہیے۔

② فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ: منہ دھونے میں کلی کرنا اور ناک میں پانی داخل کر کے جھاڑنا اور داڑھی کا خلال بھی شامل ہے۔[ابن ماجہ، الطھارۃ، باب ما جاء فی تخلیل اللحیۃ : ٤۳۱] ''کہنیوں تک'' میں کہنیاں بھی شامل

صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔ اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تاکہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے، تاکہ تم شکر کرو ۶

ہیں، انھیں بھی دھونا لازم ہے۔ نعیم مجمر فرماتے ہیں میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، انھوں نے چہرہ دھویا اور مکمل وضو کیا، پھر اپنا دایاں ہاتھ دھویا یہاں تک کہ کہنی سے اوپر والے حصے تک لے گئے، پھر بایاں ہاتھ یہاں تک کہ کہنی سے اوپر تک لے گئے، پھر اپنا دایاں پاؤں دھویا یہاں تک کہ پنڈلی تک پہنچا دیا، پھر بایاں پاؤں دھویا یہاں تک کہ پنڈلی تک لے گئے، پھر فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔'' [مسلم، الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة...... : ۲٤٦]

❸ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ : گو بہت سے علماء نے لکھا ہے کہ سارے سر کا مسح فرض نہیں بلکہ سر کے کچھ حصے کا مسح کر لیا جائے تو بھی کافی ہے، مگر قرآن کے ظاہر اور احادیث کی رو سے سارے سر کا مسح کرنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ بھی پگڑی کے بغیر سر کے کچھ حصے کا مسح ثابت نہیں، آپ دونوں ہاتھ آگے سے گدی تک لے جاتے، پھر واپس لے آتے، ہاں پگڑی ہونے کی صورت میں سر کے سامنے والے حصے کے بعد پگڑی پر مسح کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم (۸۱/۲۷۴) میں ہے، پوری پگڑی پر بھی مسح کر سکتا ہے۔ [أبو داؤد : ۱٤٦] سر کے مسح کے ساتھ کانوں کا مسح حدیث سے ثابت ہے۔ [نسائی : ۱۰۳۔ ابن ماجه : ٤۳۹] سر کے مسح کے بعد گردن کا الگ مسح یا الٹے ہاتھوں مسح کرنے کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نہیں ملتا، لہٰذا یہ بدعت ہے۔

❹ وَاَرْجُلَكُمْ : اس میں ''لام'' کے زبر اور زیر کے ساتھ دو قراءتیں مروی ہیں۔ فتح والی قراءت کی رو سے تو ظاہر ہے کہ '' فَاغْسِلُوْا '' کا مفعول ہونے کی بنا پر پاؤں دھونا ثابت ہے۔ زیر والی قراءت میں قریب ہونے کی وجہ سے جر ہے، یعنی پہلا لفظ '' بِرُءُوْسِكُمْ '' مجرور ہونے کی موافقت کے لیے '' وَاَرْجُلَكُمْ '' کو کسرہ دے دیا، ورنہ '' فَاغْسِلُوْا '' کا مفعول ہونے کی وجہ سے دراصل منصوب ہے۔ تمام علمائے اہل سنت کا یہی مذہب ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث میں ثابت ہے کہ آپ پاؤں دھویا کرتے تھے، ان پر مسح نہیں فرماتے تھے۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر آپ نے ہمیں پا لیا، نماز کا وقت ہو گیا تھا، ہم وضو کر رہے تھے اور (جلدی میں) اپنے پاؤں پر گیلا ہاتھ پھیر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں تین مرتبہ فرمایا: '' ان ایڑیوں کے لیے آگ میں بڑی ہلاکت ہے۔'' [بخاری، العلم، باب من رفع صوته بالعلم : ٦٠] اگر موزے یا جرابیں باوضو ہونے کی حالت میں پہنی ہوں تو ان پر صحیح احادیث کے مطابق مسح کیا جا سکتا ہے۔ وضو میں ترتیب بھی ضروری ہے، جیسا کہ '' فَاغْسِلُوْا '' کی ''فاء'' سے ثابت ہوتا

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۷ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۟ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۸

اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کا عہد جو اس نے تم سے مضبوط باندھا، جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ⑦ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر خوب قائم رہنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں ہرگز اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو، یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو ⑧

ہے کہ چہرہ پہلے دھویا جائے گا، باقی اعضاء میں بھی ترتیب ہوگی، مسح راس کے بعد غسل رجلین کے ذکر میں بھی ترتیب کی طرف اشارہ ہے، یعنی ''فَاغْسِلُوْا'' کا مفعول بعد میں ذکر ہوا ہے اور ہمیشہ رسول اللہ ﷺ نے اسی ترتیب سے وضو کیا ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں کیا۔ اعضاء کو کم از کم ایک مرتبہ اور زیادہ سے زیادہ تین دفعہ دھونا ثابت ہے، اس سے زیادہ جائز نہیں۔

⑤ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء (۴۳)۔

⑥ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ...... : تنگی میں نہ ڈالنے کی وجہ سے اور پانی نہ ہونے کی صورت میں مٹی کے ساتھ مکمل طہارت ہی کے لیے اس نے تیمم کا حکم نازل فرمایا ہے، تاکہ تم پر نعمت تمام ہو اور تم شکر ادا کرو۔

آیت 7 وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ...... : اس آیت میں نعمت سے مراد اسلام ہے، میثاق اور اقرار سے مراد وہ عہد ہے جو رسول اللہ ﷺ ہر آدمی سے مسلمان ہونے پر لیا کرتے تھے، چونکہ وہ اللہ کے حکم سے تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا (منکرین حدیث کو غور کرنا چاہیے)۔ اس سے مراد وہ عہد بھی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد سے لیا تھا، جو ان کی فطرت میں داخل ہے اور یہ بھی کہ یہود کو متنبہ فرمایا ہو کہ آخری نبی کی پیروی کا جو عہد تم سے لیا گیا ہے اسے پورا کرو، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی)

آیت 8 كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ : اس کی تشریح سورۂ نساء (۱۳۵) میں گزر چکی ہے، اسی طرح ﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ ...... ﴾ کی تشریح سورۂ مائدہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اکثر کافروں نے مسلمانوں سے بڑی دشمنی کی تھی، جب وہ مسلمان ہوئے تو فرمایا کہ ان سے وہ دشمنی نہ نکالو اور ہر جگہ یہی حکم ہے، حق بات میں دوست اور دشمن برابر ہیں۔'' (موضح)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے کہ بے شک ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ⑨ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی بھڑکتی آگ والے ہیں ⑩ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو۔ جب کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے اور اللہ سے ڈرو اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ⑪

آیت 11 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ : عمومی انعامات کے بعد اب خصوصی انعام کا ذکر ہے۔ (رازی)

② اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ ...... : جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نجد کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں ساتھ تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے تو وہ بھی واپس لوٹے۔ دوپہر کے آرام کا وقت ایسی وادی میں آیا جہاں بہت سے خاردار درخت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے اور لوگ درختوں کے سائے کے لیے درختوں (کی تلاش) میں بکھر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کیکر کے درخت کے نیچے اترے اور اپنی تلوار اس کے ساتھ لٹکا دی۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر ہی سوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بلایا، ہم آپ کے پاس آئے تو آپ کے پاس ایک بدوی بیٹھا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس نے میری تلوار سونت لی، جب کہ میں سویا ہوا تھا، میں جاگ پڑا تو اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی، مجھ سے کہنے لگا، تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا، اللہ! تو دیکھو یہ بیٹھا ہے۔'' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کچھ نہیں کہا۔ [بخاری، المغازی، باب غزوۃ ذات الرقاع : ۴۱۳۵]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دیت کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک یہودی قبیلے بنونضیر کے ہاں تشریف لے گئے، انھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایک دیوار کے سائے میں بٹھایا اور آپس میں پروگرام بنایا کہ ان کے اوپر چکی کا پاٹ گرا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبردار کر دیا اور آپ وہاں سے اٹھ گئے۔ (ابن کثیر) ممکن ہے قرآن نے اس ایک آیت میں ان متعدد واقعات کی طرف اشارہ فرمایا ہو اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک آیت ایک واقعہ کے متعلق نازل ہوتی ہے، پھر یاد دہانی کے لیے دوسرے واقعہ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ (المنار، قرطبی)

وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا

اور بلاشبہ یقیناً اللہ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ نے فرمایا بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور انھیں قوت دی اور اللہ کو قرض دیا، اچھا قرض تو یقیناً میں تم سے تمھارے گناہ ضرور دور کروں گا اور یقیناً تمھیں ایسے باغوں میں ضرور داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، پھر جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ﴿۱۲﴾ تو ان کے اپنے عہد کو توڑنے کی وجہ ہی سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا

آیت 12 وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ...... : پیچھے آیت (۷) میں گزرا ہے کہ مسلمانو! اپنے آپ پر اللہ کی نعمت اور اپنے اس عہد کو یاد کرو جب تم نے سمع و طاعت کا پختہ عہد کیا تھا، اب فرمایا کہ یہ عہد صرف تم ہی سے نہیں لیا گیا بلکہ تم سے پہلے بنی اسرائیل سے بھی اسی قسم کا عہد لیا گیا تھا، مگر انھوں نے عہد توڑ دیا اور ذلت و مسکنت کا شکار ہوئے، لہٰذا تم ان جیسے مت بنو۔ (کبیر) بنی اسرائیل کے کل بارہ قبیلے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھی میں سے ان پر بارہ سردار مقرر کر دیے، تاکہ وہ ان کے حالات پر نظر رکھیں اور انھیں اپنے عہد پر قائم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ نقیب (سردار) ان جبارین (زبردست لوگوں کی قوم) کی خبر لانے کے لیے مقرر کیے تھے جن کا ذکر آیت (۲۱ تا ۲۶) میں آ رہا ہے۔ (ابن کثیر) مگر ظاہر الفاظ سے پہلی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی لیلۃ العقبہ میں جب سمع و طاعت پر بیعت لی تھی تو ان پر بارہ نقیب ہی مقرر فرمائے تھے۔ (قرطبی)

آیت 13 ① فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ ...... : یعنی انھوں نے اپنے عہد و میثاق کی پاس داری کے بجائے سمع و طاعت کا وہ عہد توڑ دیا، نماز کو ضائع کرنا شروع کر دیا اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ (دیکھیے مریم : ۵۹) زکوٰۃ اور قرض حسنہ (صدقہ وغیرہ) کے بجائے بخل اور کمینگی کی انتہا کو پہنچ گئے اور سود لینا شروع کر دیا، رسولوں اور ان کی کتابوں پر ایمان لانے اور جہاد کے ساتھ انھیں قوت دینے کے بجائے کتابوں میں تحریف کی اور جہاد میں جانے ہی سے صاف انکار کر دیا، تورات کے بہت سے حصے پر عمل ترک کر دیا، جس کے نتیجے میں اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں میں نفاق بھر گیا۔ "قَسِيَّةٌ" یا "قَاسِيَةٌ" اصل میں اس سکے کو کہتے ہیں جس میں ملاوٹ ہو، یہ "قَسْوَةٌ" سے ہے جس کا معنی شدت اور سختی ہے۔ خالص سونا اور چاندی نرم ہوتے ہیں اور ان میں جتنی ملاوٹ زیادہ ہو اتنا ہی وہ زیادہ سخت ہو جاتے ہیں، اس تشبیہ کی رعایت سے انھیں "قَاسِيَةٌ" فرمایا۔

قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ⑬

کہ وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی اور تو ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر پاتا رہے گا، سوائے ان کے تھوڑے سے لوگوں کے، سو انھیں معاف کر دے اور ان سے درگزر کر۔ بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ⑬

② يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ : یعنی ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیتے، یا اس کے اصل مفہوم کے بجائے کوئی غلط مفہوم نکال لیتے جسے تاویل باطل کہتے ہیں، اپنی اسی خست کی وجہ سے ہیرا پھیری کر کے انھوں نے نبی ﷺ کی ان صفات کو بدل ڈالا جو تورات میں مذکور تھیں۔ (قرطبی)

③ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ : یعنی انھوں نے تورات کے بہت سے حصے پر عمل ترک کر دیا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا، زانی کو سنگسار کرنا، سود کو حرام سمجھنا وغیرہ۔ افسوس اہل کتاب کی طرح مسلمانوں کی اکثریت نے بھی سمع و طاعت کو چھوڑا، نمازیں ضائع کیں، سود کھانے لگے، جہاد چھوڑ بیٹھے، باہمی فرقوں میں بٹ کر اللہ کی کتاب میں تحریف کی حد تک تاویلیں کرنے لگے، تو نتیجہ بھی وہی ہے جو پہلوں کا تھا، مگر امید افزا بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق امت مسلمہ میں ایسے لوگ قیامت تک رہیں گے جو حق پر قائم رہیں گے اور حق کی خاطر لڑتے رہیں گے، انھی کو "عَلَى الْحَقِّ مَنْصُوْرِيْنَ" کہا گیا ہے۔ [مسلم، الإمارة، باب قوله: لا تزال طائفة...... : ۱۰۳۷، بعد ح : ۱۹۲۳۔ ابن ماجه : ۱۰]

④ "خَآئِنَةٍ" مصدر ہے بروزن "عَافِيَةٌ" بمعنی خیانت یعنی ان سے آئے دن کسی نہ کسی خیانت اور بدعہدی کا ظہور ہوتا رہے گا، یا اسم فاعل ہے کہ خیانت کرنے والی جماعت یا شخصیت یعنی ان میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہیں گے جو خیانت اور بدعہدی کا ارتکاب کرتے رہیں گے اور آپ کو ہرگز ان کی طرف سے امن نصیب نہیں ہوگا۔ "اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ" یعنی ان میں سے چند لوگ ایسے ہیں جو کسی خیانت و بدعہدی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ ان سے خاص کر عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مراد ہیں، یا وہ لوگ جنھوں نے کفر کے باوجود کسی قسم کی خیانت اور بدعہدی نہیں کی۔ (کبیر)

⑤ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ : یعنی ان کی انفرادی خیانتوں اور بدعہدیوں سے درگزر کیجیے نہ کہ ان بدعہدیوں سے جو اجتماعی (یا اجتماعی کے حکم میں) ہوں، کیونکہ اس صورت میں تو وہ واضح حربی (جو حالت جنگ میں ہوں) قرار پائیں گے، جن کی سرکوبی بہرحال کی جائے گی۔ (المنار) یا یہ کہ جو ان میں سے خیانت کا ارتکاب نہیں کرتے اور اپنے عہد پر قائم ہیں، ان کی دوسری لغزشوں سے درگزر فرمائیں۔ (رازی) ان دونوں صورتوں میں یہ آیت محکم رہے گی، ورنہ اسے قتال (لڑائی) کے حکم والی آیت سے منسوخ سمجھا جائے گا۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۲۹)۔

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَهْلَ

اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا بے شک ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان کا پختہ عہد لیا، پھر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور کینہ وری بھڑکا دی اور عنقریب اللہ انھیں اس کی خبر دے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴﴾ اے اہل کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا

آیت 14 ① وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤى ...... : یعنی ''اللہ کے مددگار'' چونکہ یہ لوگ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے نصاریٰ سے اقرار لیا، بلکہ یہ فرمایا کہ ہم نے ان لوگوں سے اقرار لیا جو اپنے آپ کو ''نصاریٰ'' کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کی طرح نصاریٰ سے بھی ہم نے توحید اور نبی آخر الزماں پر ایمان لانے کا عہد لیا مگر انھوں نے بھی اس عہد کو توڑ ڈالا۔ (کبیر، قرطبی)

② فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ : یعنی ہم نے اس وقت سے لے کر قیامت تک ان کے درمیان دشمنی اور کینہ وری بھڑکا دی، چنانچہ اس وقت بھی ان میں آپس میں مذہبی عداوت پائی جاتی ہے اور پھر خود نصرانیوں کے بھی بہت سے فرقے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے دشمن اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ رہا مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا ایک ہونا تو وہ مسلمانوں کے ترکِ جہاد اور کفار کے مسلمانوں کے ممالک سے اپنا اپنا حصہ لینے کے لیے ہے، ورنہ ظاہر میں ایک نظر آنے کے باوجود ان کی باہمی لڑائی ایک یقینی حقیقت ہے، جس کا مطالعہ کر کے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
﴿ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ﴾ [الحشر : ١٤] ''تو خیال کرے گا کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔''
مگر افسوس اب مسلمانوں میں ایسا اختلاف اور دشمنی پیدا ہوگئی کہ صرف مسلمان نام نے انھیں جمع کر رکھا ہے، باقی کفار ان کے افتراق سے فائدہ اٹھا کر ان پر حکومت کر رہے ہیں۔

آیت 15 ① يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا ...... : یہود و نصاریٰ کے عہد توڑنے اور حق سے منہ موڑنے کا ذکر کرنے کے بعد اب ان کو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ (کبیر) اس آیت میں آپ ﷺ کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ بہت سے احکام جو وہ چھپایا کرتے تھے آپ ﷺ ان کو بیان کرتے ہیں، جیسے رجم کی آیت، سبت والوں کا قصہ جن کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور خنزیر بنا دیا گیا تھا، اسی طرح رسول کریم ﷺ کی صفات سے متعلق آیات، الغرض! یہود ان تمام باتوں کو چھپایا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک یہودی مرد اور عورت کو لایا گیا، جنھوں نے زنا کیا تھا، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم اپنی کتاب میں اس کے بارے میں کیا حکم پاتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہمارے علماء نے (اس کی سزا) چہرے کو سیاہ کرنا اور گدھے پر گشت کروانا تجویز کی ہوئی ہے۔'' عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ان (کے علماء) کو تورات سمیت بلائیے۔'' چنانچہ تورات لائی

الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے ان میں سے بہت سی باتیں کھول کر بیان کرتا ہے، جو تم کتاب میں سے چھپایا کرتے تھے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، بے شک تمھارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آئی ہے ﴿۱۵﴾

گئی تو ان میں سے ایک نے رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ کر آگے پیچھے سے پڑھنا شروع کر دیا، عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''اپنا ہاتھ اٹھاؤ'' اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس کے نیچے سے رجم کی آیت نکلی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور وہ دونوں سنگسار کر دیے گئے۔ [بخاری، الحدود، باب الرجم فی البلاط : ۶۸۱۹]

❷ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ: نور سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب ہی ہے۔ واؤ عاطفہ دونوں کو الگ الگ بتانے کے لیے نہیں بلکہ تفسیر کے لیے ہے، یعنی کتاب مبین اس نور کی تفسیر ہے، جس کی واضح دلیل ایک تو اس سے بعد والی یہ آیت ہے: ﴿ يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ ﴾ یعنی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے۔ اب اس آیت میں اگر نور اور کتاب مبین الگ الگ چیزیں ہوتیں تو الفاظ '' يَهْدِيْ بِهِمَا اللّٰهُ '' (اللہ ان دونوں کے ساتھ ہدایت دیتا ہے) ہوتے۔ دوسری جگہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نور قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [الأعراف : ۱۵۷] ''سو وہ لوگ جو اس رسول پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' معلوم ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اترنے والی کتاب ہی نور ہے۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِيْۤ اَنْزَلْنَا ﴾ [التغابن : ۸] ''سو تم اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا۔'' قرآن مجید کے لیے نور کا لفظ سورۂ نساء اور دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے، فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴾ [النساء : ۱۷۴] ''اے لوگو! بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایک واضح نور نازل کیا ہے۔''

بعض مفسرین نے نور سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے مراد قرآن مجید لیا ہے۔ اس صورت میں بھی معنی یہ ہوگا کہ اللہ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روشنی بن کر اور قرآن ایک کتاب مبین بن کر آئے ہیں، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے، یعنی آپ ایک تو ہدایت کا نور ہیں، دوسرا '' نُوْرٌ مِّنَ اللّٰهِ '' یعنی اللہ کی طرف سے آنے والے نور ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں نہ کہ '' نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰهِ '' یعنی اللہ کے نور میں سے نور کا ایک ٹکڑا ہیں کہ اللہ کا حصہ ہوں یا خود ہی اللہ ہوں۔ یہ تو وہی نصرانیوں والا عقیدہ ہے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنایا اور ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا ٹکڑا بنا دیا۔ سورۂ اخلاص اس گندے اور شرکیہ عقیدے کی خوب تردید کرتی ہے۔

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

جس کے ساتھ اللہ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے پیچھے چلیں، سلامتی کے راستوں کی ہدایت دیتا ہے اور انھیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے ﴿۱۶﴾ بلاشبہ یقیناً وہ لوگ کافر ہوگئے جنھوں نے کہا کہ بے شک اللہ مسیح ہی تو ہے، جو مریم کا بیٹا ہے، کہہ دے پھر کون اللہ سے کسی چیز کا مالک ہے، اگر وہ ارادہ کرے کہ مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور زمین میں جو لوگ ہیں سب کو ہلاک کر دے، اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿۱۷﴾

آیت 17 ① لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا ...... : یعنی جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اور مسیح ایک ہی چیز ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پرانے زمانے میں یہ صرف نصرانیوں کے ایک فرقے یعقوبیہ کا عقیدہ تھا، مگر اس زمانے میں نصرانیوں کے جو تین فرقے پروٹسٹنٹ، کیتھولک اور آرتھوڈکس پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب اگرچہ تثلیث کے قائل ہیں لیکن ان کا اصل مقصد مسیح علیہ السلام کو الٰہ (خدا) ماننا ہے، گویا وہ سب کے سب خدا اور مسیح کے ایک چیز ہونے کے قائل ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان سب پر کافر ہونے کا فتویٰ لگایا ہے۔ (المنار) مسلمانوں میں الحمد للہ توحید الٰہی پر قائم لوگ کثرت سے موجود ہیں، مگر کئی ایسے گمراہ بھی ہیں جنھوں نے صاف کہہ دیا ؂

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

یہ بعینہٖ اوپر مذکور شرکیہ عقیدہ ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو توحید الٰہی کا عقیدہ رکھنے کی ہدایت اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین!

② قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ...... : یعنی وہ مالک کل اور مختار کل ہے اور سب چیزوں پر اسے قدرت اور برتری حاصل ہے، وہ چاہے تو سب کو آن کی آن میں فنا کر سکتا ہے، اگر مسیح علیہ السلام خدا ہوتے تو کم از کم خود کو اور اپنی والدہ کو تو بچا سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی والدہ کو فوت کر لیا اور ان کو بھی مقرر وقت پر فوت کرے گا، وہ موت سے بچ نہیں سکیں گے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نہ تو خدا ہیں اور نہ خدا کے بیٹے، بلکہ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ (کبیر، قرطبی)

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ یُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ٝ وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۸﴾

اور یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، کہہ دے پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی وجہ سے سزا کیوں دیتا ہے، بلکہ تم اس (مخلوق) میں سے ایک بشر ہو جو اس نے پیدا کی ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱۸﴾

③ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ : یعنی وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور جس کو جیسے چاہتا ہے بناتا ہے، آدم علیہ السلام کو اس نے ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر دینا اس کے لیے کیا مشکل تھا، محض باپ کے بغیر پیدا ہونے سے کوئی بندہ خدا نہیں بن جاتا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ انبیاء کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تاکہ ان کی امت والے ان کو بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھائیں۔ (موضح)

آیت 18 وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ...... : اس آیت کریمہ میں یہود و نصاریٰ کی ایک اور گمراہی بیان کی گئی ہے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور محبوب لوگ ہیں، چنانچہ بائبل میں آج تک اس قسم کے حوالے موجود ہیں: ''خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے۔'' (خروج: ۴: ۲۲) ''تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔'' (استثناء: ۱۴: ۲۲) اور انجیل میں ہے کہ مسیح علیہ السلام نے نصاریٰ سے کہا: ''میں اپنے اور تمھارے باپ کے پاس جاتا ہوں۔''

اگرچہ بعض یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ بیٹے سے مراد پیارا اور محبوب ہے، مگر پھر بھی ان کا یہ فخر اور دوسروں پر برتری کا اظہار کہ ہم خاص حق کے مقرب اور اونچے طبقے کے لوگ ہیں، جیسے برہمن وغیرہ کہتے ہیں، بالکل غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید فرمائی اور کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر اللہ تمھارے گناہوں کی وجہ سے تمھیں عذاب کیوں دے گا! کہیں کوئی محب اپنے حبیب کو عذاب دیتا ہے؟ حالانکہ تم خود اپنی زبان سے اعتراف کرتے ہو کہ ہمیں صرف گنتی کے دن آگ میں ڈالا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا یہ گمان، جس کے سہارے تم جی رہے ہو، سراسر باطل ہے۔ تم تو انسان ہو، اللہ کا تم سے تعلق بس وہی ہے جو خالق کا مخلوق سے اور مالک کا غلام سے ہوتا ہے، وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے۔ کوئی کتنا بھی مقرب ہو یا سید یا برہمن یا پیر و مرشد ہو، اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو نہ خود عذاب سے بچ سکتا ہے نہ کسی کو بچا سکتا ہے۔ یہ سب تو خود اس کے حضور پیش ہوں گے اور لرز رہے ہوں گے کہ ہمارا کیا فیصلہ ہوتا ہے، تم اپنی جھوٹی امیدوں سے کیوں اپنی بربادی کر رہے ہو۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ‌ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۹﴾ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ‌ۖ وَّاٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۰﴾

اے اہل کتاب! بے شک تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے، جو تمھارے لیے کھول کر بیان کرتا ہے، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد، تا کہ تم یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا، تو یقیناً تمھارے پاس ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ چکا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۹﴾ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تمھیں بادشاہ بنا دیا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا ﴿۲۰﴾

آیت 19 ❶ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا ...... : یعنی ایک مدت سے رسولوں کی آمد کا یہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں ابن مریم (علیہما السلام) کا تمام لوگوں سے زیادہ حق دار یا تمام لوگوں سے زیادہ قریب ہوں، انبیاء آپس میں علاتی بھائی ہیں، میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں۔“ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ واذکر فی الکتاب مریم ﴾ : ٣٤٤٢] بقول سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کی بعثت پر بھی ٦٠٠ سال گزر چکے تھے۔ [بخاری، مناقب الأنصار، باب إسلام سلمان الأنصاری : ٣٩٤٨] اور کوئی نبی نہیں آیا تھا، پھر آخری نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس آیت پر شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی رسول نہیں آیا تھا، سو فرمایا کہ تم افسوس کرتے کہ ہم رسولوں کے وقت میں نہ ہوئے کہ تربیت ان کی پاتے، اب بعد مدت تم کو رسول کی صحبت میسر ہوئی، غنیمت جانو اور اللہ قادر ہے، اگر تم قبول نہ کرو گے تو اور خلق کھڑی کر دے گا تم سے بہتر، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم نے جہاد کرنا پسند نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو محروم کر دیا، اوروں کے ہاتھ سے ملک شام فتح کروا دیا۔ (موضح)

❷ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ : اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد بیان فرمایا ہے، یعنی عرصہ دراز سے کسی اولو العزم پیغمبر کے نہ آنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام میں تغیر و تبدل اور تحریف ہو چکی تھی اور حق و باطل میں امتیاز نہ تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملت ابراہیم کو تغیر و تبدل اور تحریف سے پاک کر کے لوگوں کو حق سے روشناس کرایا تا کہ ان پر حجت پوری ہو جائے اور عذر کی گنجائش نہ رہے۔ (قرطبی)

آیت 20 ❶ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ : اس آیت کا تعلق ﴿ وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴾ [المائدۃ :

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖۗ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اے میری قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمھارے لیے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھوں پر نہ پھر جاؤ، ورنہ خسارہ اٹھانے والے ہو کر لوٹو گے ﴿۲۱﴾ انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک اس میں ایک بہت زبردست قوم ہے اور بے شک ہم ہرگز اس میں داخل نہ ہوں گے، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائیں، پس اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہونے والے ہیں ﴿۲۲﴾

۱۲] کے ساتھ ہے، یعنی ان سے عہد لیا اور موسیٰ علیہ السلام نے ان انعامات الٰہی کو یاد دلا کر ارض مقدس واپس لینے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ اس وقت وہاں عمالقہ (جبارین) کی حکومت تھی، لیکن بنی اسرائیل نے عہد شکنی کی اور عمالقہ کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا۔ (کبیر)

❷ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ...... : اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تین نعمتوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، ایک یہ کہ ان میں جلیل القدر انبیاء مبعوث فرمائے، جیسے اسحاق، یعقوب، یوسف اور موسیٰ علیہم السلام۔ دوسری یہ کہ ان سب (بنی اسرائیل) کو بادشاہ بنا دیا، یعنی ان کو فرعون سے آزادی دی اور اپنی حکومت عطا فرمائی۔ معلوم ہوا کہ آزاد اور حاکم قوم کا ہر فرد ہی بادشاہ اور محکوم قوم کا ہر فرد غلام ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ انھیں توحید کا علم بردار بنایا، جبکہ دوسری تمام قومیں شرک میں مبتلا تھیں۔ اس تیسری نعمت میں وہ معجزات بھی شامل ہیں جو بنی اسرائیل کی مدد کے لیے وجود میں آئے، مثلاً سمندر کا پھٹنا، بادل کا سایہ، پتھر سے چشمے کا پھوٹنا، من و سلویٰ وغیرہ۔

آیت 21 ❶ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ ...... : مراد شام ہے، فلسطین (کنعان) اسی کے ایک علاقے کا نام ہے، کیونکہ یہیں سے بنی اسرائیل مصر گئے تھے اور یہی ان کی آبائی میراث تھی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لکھ دی تھی۔ تورات میں اس وعدے کی صراحتیں موجود ہیں: ''دیکھو میں نے اس ملک کو تمھارے سامنے کر دیا ہے، پس جاؤ اور اس ملک کو اپنے قبضہ میں کر لو جس کی بابت خداوند نے تمھارے باپ دادا ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ اسے ان کو اور ان کے بعد ان کی نسل کو دے گا۔'' (استثناء، باب: ۸)

❷ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل سے یہ خطاب اس موقع پر ہے جب وہ مصر سے نکلنے کے بعد جزیرہ نمائے سینا میں خیمہ زن تھے اور ان پر من و سلویٰ اتر رہا تھا۔ (ابن کثیر)

آیت 22 ❶ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ...... : ایمان کمزور ہونے کی وجہ سے انھوں نے کہا کہ وہاں بڑے

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

دو آدمیوں نے کہا، جو ان لوگوں میں سے تھے جو ڈرتے تھے، ان دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، تم ان پر دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم اس میں داخل ہو گئے تو یقیناً تم غالب ہو اور اللہ ہی پر پس بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو ﴿۲۳﴾ انھوں نے کہا اے موسیٰ! بے شک ہم ہرگز اس میں کبھی داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس میں موجود ہیں، سو تو اور تیرا رب جاؤ، پس دونوں لڑو، بے شک ہم یہیں بیٹھنے والے ہیں ﴿۲۴﴾

زبردست جنگ جو (جبارین) لوگ رہتے ہیں، جن کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں۔ جب تک وہ لوگ آپ کے معجزے کی بدولت وہاں سے نہ نکل جائیں، ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے، اگر وہ خود بخود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ ② "جَبَّارِيْنَ" سے بڑے ڈیل ڈول والے، بہت اسلحے والے جنگ جو مراد ہیں، مگر جس انداز سے بعض تفسیروں میں ان لوگوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ سب ایسی اسرائیلی روایات ہیں جنھیں ایک معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا، خصوصاً عوج بن عنق کا افسانہ جس کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "آدم علیہ السلام کا قد ساٹھ ہاتھ تھا، اس کے بعد سے برابر لوگ گھٹ رہے ہیں۔" [بخاري، أحاديث الأنبياء، باب خلق آدم و ذريته : ۳۳۲۶۔ مسلم : ۲۸٤۱] پھر عوج بن عنق کا قد تین ہزار تین سو تینتیس (۳۳۳۳) ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے!؟ (ابن کثیر)

آیت 23 قَالَ رَجُلٰنِ: اللہ تعالیٰ نے ان دو آدمیوں کا ذکر بطور نکرہ فرمایا ہے اور کسی حدیث میں بھی ان کے ناموں کی صراحت نہیں آئی۔

آیت 24 قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا...... : ان دو آدمیوں نے کہا تھا کہ تم لوگ ان پر حملے کے لیے بس دروازے میں داخل ہو جاؤ، یعنی اللہ کے وعدے اور بشارت کے مطابق تمھارے داخلے کی دیر ہے، دشمن بھاگ جائے گا، لیکن انھوں نے حد سے بڑھا ہوا گستاخانہ جملہ کہا: "جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔" اس کے برعکس بدر کے موقع پر جنگ کے اچانک سامنے آنے کے باوجود اصحاب رسول ﷺ نے کمال عزم و ہمت اور شجاعت و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن عرض کی: "اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ چلیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔" یہ سن کر ایسے محسوس ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی سب پریشانی دور ہو گئی۔ [بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ فاذهب أنت وربك فقاتلا...... ﴾ : ٤٦٠٩]

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۷﴾

اس نے کہا اے میرے رب! بے شک میں اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں، سو تو ہمارے درمیان اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان علیحدگی کر دے ﴿۲۵﴾ فرمایا پھر بے شک وہ ان پر چالیس سال حرام کی ہوئی ہے، زمین میں سر مارتے پھریں گے، پس تو ان نافرمان لوگوں پر غم نہ کر ﴿۲۶﴾ اور ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر کی تلاوت حق کے ساتھ کر، جب ان دونوں نے کچھ قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہ کی گئی۔ اس نے کہا میں تجھے ضرور ہی قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا بے شک اللہ متقی لوگوں ہی سے قبول کرتا ہے ﴿۲۷﴾

آیت 25 قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ ......: اس پر موسیٰ علیہ السلام ایسے بد دل ہوئے کہ انھوں نے دعا کی کہ پروردگارا! میرے اختیار میں میری جان اور اپنے بھائی کے سوا کچھ نہیں، تو ہمیں ان لوگوں سے علیحدہ کر دے، ایسا نہ ہو کہ تیرا عذاب آئے اور ان کے ساتھ ہم بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں۔ (کبیر، ابن کثیر) معلوم ہوا کہ جب کوئی قوم سرکشی اور نافرمانی پر تل جائے تو بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء اور مصلحین کی بھی وہاں کچھ پیش نہیں جاتی۔

آیت 25 قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ ...... : "یَتِیْهُوْنَ" "تَاهَ یَتِیْهُ تَیْهًا" بھٹکتے پھرنا۔ "اَرْضٌ تِیْهٌ" وہ زمین جس میں کوئی راستہ نہ ملے۔ (قاموس) اس کے بعد یہ لوگ چالیس سال تک بیابان میں بھٹکتے رہے اور اس کا نام "صحرائے تیہ" پڑ گیا۔ یہیں پہلے ہارون علیہ السلام کا انتقال ہوا، پھر موسیٰ علیہ السلام بھی وفات پا گئے۔ بعد میں کسی وقت بنی اسرائیل ارض مقدس میں داخل ہوئے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اہل کتاب کو قصہ سنایا، اس پر اگر تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نہ کرو گے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہو گی۔ آگے اس پر قصہ سنایا ہابیل قابیل کا کہ حسد مت کرو، حسد والا مردود ہے۔ (موضح)

آیت 27 ① وَ اتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ: آدم علیہ السلام کے ان دو بیٹوں کا نام ہابیل اور قابیل مشہور ہے، اگرچہ قرآن یا حدیث میں یہ نام نہیں آئے۔

② اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ ......: یہ نذر یا قربانی کس لیے پیش کی گئی اس کے بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں، البتہ مشہور یہ ہے کہ ابتدا میں آدم اور حوا علیہما السلام کے ملاپ سے بیک وقت لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے تھے، دوسرے حمل سے پھر لڑکا لڑکی ہوتے، ایک حمل کے بہن بھائی کا نکاح دوسرے حمل کے بہن بھائی سے کر دیا جاتا۔ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بہن بدصورت تھی، جبکہ قابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بہن خوبصورت تھی، اس وقت کے اصول کے مطابق ہابیل کا نکاح قابیل کی بہن کے ساتھ اور

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾

اگر تو نے اپنا ہاتھ میری طرف اس لیے بڑھایا کہ مجھے قتل کرے تو میں ہرگز اپنا ہاتھ تیری طرف اس لیے بڑھانے والا نہیں کہ تجھے قتل کروں، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو سارے جہانوں کا رب ہے ﴿۲۸﴾

قابیل کا ہابیل کی بہن کے ساتھ ہونا تھا، لیکن قابیل چاہتا تھا کہ وہ ہابیل کی بہن کے بجائے اپنی ہی بہن کے ساتھ، جو خوبصورت تھی، نکاح کرے۔ آدم علیہ السلام نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھا۔ بالآخر آدم علیہ السلام نے دونوں کو بارگاہ الٰہی میں قربانیاں پیش کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جس کی قربانی قبول ہو جائے گی قابیل کی بہن کا نکاح اس سے کر دیا جائے گا۔ ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی، یعنی آسمان سے آگ آئی اور اسے کھا گئی جو اس کے قبول ہونے کی دلیل تھی، لیکن جیسا کہ بتایا گیا ہے یہ بات ثابت نہیں ہے۔

3 اوپر کی آیات میں یہ بیان فرمایا تھا کہ مخالفین ہر طرح سے مسلمانوں پر مصائب و شدائد لانا چاہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِذْ ھَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْٓا اِلَیْکُمْ اَیْدِیَھُمْ ﴾ [المائدۃ : ١١] ”جب کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں۔“ مگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کی حفاظت فرما رہا ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے کچھ واقعات بیان فرمائے، جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیاوی نعمتوں سے نوازا ہے، لوگ اس سے ہمیشہ حسد و بغض سے پیش آتے رہے ہیں، چنانچہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت بھی ان کی سرکشی اور بغض و حسد پر مبنی ہے، لہٰذا ان پر افسوس اور غم نہ کیجیے۔ اب یہاں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کیا، جو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، کیونکہ ایک بھائی کا دوسرے کو قتل کرنا حسد کی بنا پر تھا۔ الغرض ان تمام واقعات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے اور ہو سکتا ہے کہ بتانا مقصود ہو کہ یہود اپنے گمان میں اللہ تعالیٰ کے محبوب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، کہتے ہیں: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ ﴾ [المائدۃ : ١٨] اور انبیاء کی اولاد ہونے پر ان کو فخر ہے، مگر کفر اور حسد و عناد کے ساتھ یہ نسبی شرف ان کے لیے مفید نہیں ہو سکتا، آدم کے دو بیٹوں کا قصہ اس پر شاہد ہے۔ (کبیر، قرطبی) اس سے مقصد حسد سے بچنے کی تاکید ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دونوں آدمی بنی اسرائیل سے تھے۔ یہود کا حسد بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بطور مثال یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کی دلیل اس قصے کے آخر میں آنے والی آیت ہے: ﴿ مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ ۚۛ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ...... ﴾ [المائدۃ : ٣٢] یعنی اس قصے ہی کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا...... (کبیر، قرطبی)

مگر صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کی وجہ سے یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص بھی ظلم سے قتل کیا جاتا ہے (قاتل کے ساتھ) اس کے خون ناحق کا بوجھ آدم (علیہ السلام) کے پہلے بیٹے پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے قتل کا کام شروع کیا۔“ [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم و ذریته: ۳۳۳۵۔ مسلم: ١٦٧٧]

4 اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ: یعنی تم بھی اگر اللہ کی نافرمانی سے بچتے اور اللہ سے ڈرتے تو تمھاری قربانی بھی قبول ہو جاتی۔

28 لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ ......: یعنی میں تمھیں قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ تمھاری طرف نہیں بڑھاؤں گا،

اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِكَ فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۹﴾ فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِیۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ لِیُرِیَهٗ كَیۡفَ یُوَارِیۡ سَوۡءَةَ اَخِیۡهِ ؕ قَالَ یٰوَیۡلَتٰۤی اَعَجَزۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ مِثۡلَ هٰذَا الۡغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوۡءَةَ اَخِیۡ ۚ فَاَصۡبَحَ مِنَ النّٰدِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ لے کر لوٹے، پھر تو آگ والوں میں سے ہو جائے اور یہی ظالموں کی جزا ہے ﴿۲۹﴾ تو اس کے لیے اس کے نفس نے اس کے بھائی کا قتل پسندیدہ بنا دیا، سو اس نے اسے قتل کر دیا، پس خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا ﴿۳۰﴾ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا، جو زمین کریدتا تھا، تاکہ اسے دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے، کہنے لگا ہائے میری بربادی! کیا میں اس سے بھی رہ گیا کہ اس کوے جیسا ہو جاؤں تو اپنے بھائی کی لاش چھپا دوں۔ سو وہ پشیمان ہونے والوں میں سے ہو گیا ﴿۳۱﴾

اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ اٹھاؤں تو الگ بات ہے، کیونکہ اپنا دفاع تو ضروری ہے اور اس پر امت مسلمہ کا بھی اجماع ہے۔ (قرطبی) اگر مقتول بھی اپنے قاتل کو قتل کرنے کے پیچھے لگا ہوا ہو تو ایسی صورت میں دونوں جہنمی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمان اپنی تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔'' احنف بن قیس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! یہ تو قاتل ہے، مقتول کا کیا قصور ہے؟'' فرمایا: ''اس لیے کہ وہ بھی اپنے قاتل کے قتل پر حریص تھا۔'' [بخاری، الإیمان، باب : ﴿ و إن طائفتان من المؤمنین...... ﴾ : ۳۱]

آیت 29 اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَ اِثۡمِكَ ...... : میرا گناہ، یعنی جو مجھے اس صورت میں ہوتا جب میں بھی تجھے قتل کرنے کے درپے ہوتا، جیسا کہ پیچھے حدیث میں گزرا ہے، یا یہ کہ میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ڈالا جائے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: ''قیامت کے دن ظالم کو لایا جائے گا اور اس کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی، اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔'' [بخاری، المظالم، باب من كانت له مظلمة عند الرجل...... : ۲٤٤۹]

آیت 30 فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ: یعنی اس کی دنیا بھی برباد ہو گئی اور آخرت میں بھی سخت عذاب کا مستحق ٹھہرا، کیونکہ ہر بعد والے قتل کا گناہ اس کی گردن پر بھی ہو گا، جیسا کہ پیچھے حدیث میں گزرا ہے۔

آیت 31 ① فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبۡحَثُ فِی الۡاَرۡضِ: اور نقل میں یوں آیا ہے کہ ایک کوے نے زمین کھود کر دوسرے کوے کو دفن کیا، اس نے کوے کی خیر خواہی دوسرے کوے کے لیے دیکھی تو اپنے فعل پر پشیمان ہوا۔ (موضح) مگر یہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہے، قرآن کے ظاہر الفاظ سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اسے زمین کریدتے دیکھا تو اس نے سمجھ لیا کہ اسے دفن کر دینا چاہیے۔ (قرطبی)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ٞ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۳۳﴾

اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جس نے ایک جان کو کسی جان کے (بدلے کے) بغیر، یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اسے زندگی بخشی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول واضح دلائل لے کر آئے، پھر بے شک ان میں سے بہت سے لوگ اس کے بعد بھی زمین میں یقیناً حد سے بڑھنے والے ہیں ﴿۳۲﴾ ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انھیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں، یا انھیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿۳۳﴾

② فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ: یعنی بھائی کے مرنے پر، پھر اسے ٹھکانے لگانے کی بات جلد سمجھ میں نہ آنے پر پشیمان ہوا، کیونکہ اگر وہ اپنے فعل پر پشیمان ہوتا اور توبہ کرتا تو گناہ معاف ہو جاتا اور دنیا میں جو قتل ہوتے ہیں ان کا گناہ اس پر نہ ہوتا۔ (قرطبی)

آیت 32 ① مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ: دیکھیے اس سے پہلے آیت (۲۷) کا حاشیہ (۳) حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حکم صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں ہے بلکہ سب لوگوں کے لیے ہے، کیونکہ بنی اسرائیل کے خون دوسرے مسلمانوں کے خون سے زیادہ قیمتی نہ تھے۔ (ابن کثیر)

② وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ ...... :یعنی اگر ایک شخص کو مرنے سے بچالے گا تو اس کا ثواب اتنا ہے گویا سب کو بچالیا۔

آیت 33 ① اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ...... : یہ آیت محاربہ کہلاتی ہے، مراد وہ لوگ ہیں جو اس حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام نافذ کرنے والی ہے اور اسلام کی سرزمین میں ڈاکا ڈالتے، لوٹ مار کرتے، فساد پھیلانے کی کوشش کرتے اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ حاکم وقت ان چار سزاؤں میں سے کوئی بھی سزا انھیں دے سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ صرف اسی کو قتل کیا جائے گا جس نے قتل کیا ہو اور اتنی ہی سزا دی جائے گی جتنا اس کا جرم ہوگا، مگر آیت کے صریح الفاظ اس کی موافقت نہیں کرتے، بلکہ ان لوگوں کا حکم حربیوں (جنگ کرنے والوں) کا ہے،

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

مگر جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پاؤ تو جان لو کہ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف قرب تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۳۵﴾

وقت ان سزاؤں میں سے جو چاہے سزا دے سکتا ہے، عام اس سے کہ مشرک ہوں یا یہودی یا باغی مسلمان ہوں۔

② اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا: باب تفعیل کی وجہ سے معنی میں زیادتی کے اظہار کے لیے ترجمہ میں ''بری طرح'' کا اضافہ کیا گیا ہے، اسی طرح ''اَوْ يُصَلَّبُوْۤا'' اور '' اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ '' میں بھی باب کا خیال رکھا گیا ہے۔

③ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیت عکل اور عرینہ کے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کا قصہ انس رضی اللہ عنہ نے یوں بیان کیا ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آئے، لیکن وہاں کی آب و ہوا انھیں موافق نہ آئی اور وہ بیمار ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مدینہ سے باہر صدقہ کے اونٹوں میں رہنے کا حکم دیا کہ ان کا دودھ اور پیشاب (ملا کر) پییں۔ یہ لوگ وہاں چلے گئے، تندرست ہونے کے بعد وہ اسلام سے پھر گئے اور چرواہے (یسار نُوبی) کو قتل کر کے اونٹ ہانک کر لے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعاقب میں سوار بھیجے جو انھیں پکڑ کر مدینہ منورہ لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے جائیں اور ان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیری جائیں، پھر انھیں دھوپ میں پھینک دیا گیا، یہاں تک کہ سب مر گئے۔ [بخاری، الجهاد والسير، باب إذا حرق المشرك المسلم هل يحرق: ۳۰۱۸۔ مسلم: ۱۶۷۱] مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے گرم سلائیاں پھیرنے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ انھوں نے چرواہے کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا۔ [مسلم، القسامة والمحاربين، باب حكم المحاربين و المرتدين : ۱۶۷۱/۱۴]

آیت 34 اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ......: یعنی ایسے لوگوں کا قصور معاف کر دیا جائے گا اور انھیں مذکورہ سزائیں نہیں دی جائیں گی، کیونکہ ان کا گرفتار ہونے سے پہلے از خود اپنے آپ کو حوالے کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے اپنے جرائم سے توبہ کر لی ہے، لیکن پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ سزاؤں کی معافی کے ساتھ انھوں نے قتل کر کے یا مال لوٹ کر یا آبرو ریزی کر کے بندوں پر جو دست درازی کی ہے یہ جرائم بھی معاف ہو جائیں گے یا ان کا بدلہ لیا جائے گا؟ بعض علماء کے نزدیک یہ معاف نہیں ہوں گے، ان کا قصاص لیا جائے گا۔ ابن کثیر اور شوکانی رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ مطلقاً انھیں معاف کر دیا جائے گا، انھوں نے آیت کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہی بتایا ہے، البتہ گرفتاری کے بعد توبہ سے جرائم معاف نہیں ہوں گے، وہ مستحق سزا ہوں گے۔ (فتح القدیر، ابن کثیر)

آیت 35 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ......: یعنی رسول کی اطاعت میں جو نیکی کرو وہ قبول ہے (کیونکہ اللہ کے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر واقعی ان کے پاس زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو، تاکہ وہ اس کے ساتھ قیامت کے دن کے عذاب سے فدیہ دے دیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۳۶﴾

قرب کے حصول کے لیے اب رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے سوا کوئی وسیلہ نہیں) اور بغیر اس کے عقل سے کرو سو (وہ) قبول نہیں۔ (موضح) لفظ "اَلْوَسِيْلَةَ" یہ "تَوَسَّلْتُ إِلَيْهِ" سے "فَعِيْلَةٌ" کے وزن پر ہے۔ اس کی جمع "وَسَائِلُ" آتی ہے، اس کا لفظی معنی قرب ہے، مراد ہر وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔ اس آیت میں اللہ کے تقوے کا اور اس کا قرب حاصل کرنے کا حکم دینے کے بعد جہاد کا حکم دیا، معلوم ہوا کہ اللہ کا تقویٰ اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ اس کی راہ میں جہاد (سرتوڑ کوشش خصوصاً قتال) ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی زندہ شخص سے دعا کروانا بھی جائز ہے، مگر کسی زندہ یا مردہ کا نام لے کر کہنا کہ یا اللہ! فلاں کے وسیلے یا طفیل ہماری دعا قبول فرما، نہ قرآن سے ثابت ہے نہ صحیح حدیث سے، ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا واسطہ دے کر یا اپنا کوئی خالص عمل پیش کر کے دعا کر سکتا ہے، یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ وسیلہ ایک مقام کا نام بھی ہے، اس میں بھی قرب کا معنی ہی ملحوظ ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ''جب تم مؤذن کو سنو تو اسی طرح کہو جس طرح وہ کہتا ہے، پھر مجھ پر درود بھیجو، جس نے مجھ پر ایک بار درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمت نازل فرمائے گا، پھر میرے لیے وسیلے کی دعا کرو، وسیلہ جنت کا وہ مقام ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک ہی کو نصیب ہوگا اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں گا، لہٰذا جس نے میرے لیے وسیلے کی دعا کی تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔'' [مسلم، الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن...... : ۳۸٤] اللہ کا قرب (وسیلہ) اتنی بڑی نعمت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے جتنا قریب ہے اس سے مزید قرب کی دعا اور کوشش کرتا ہے۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۵۷)۔

② لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ : یہود کو اپنے نسب پر فخر تھا اور وہ اسی خوش فہمی میں ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے رہتے تھے اور اپنے آپ کو اللہ کا محبوب سمجھتے تھے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ اب اس آیت میں مسلمانوں کو تعلیم دی ہے کہ تم اگرچہ بہتر امت ہو اور تمھارا نبی بھی سب سے افضل ہے، مگر تمھیں چاہیے کہ نیک اعمال کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو، تاکہ آخرت میں فلاح حاصل کر سکو، یعنی یہود کی طرح بدعمل نہ بنو۔ (کبیر)

آیت 36 اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ...... : سورۂ آل عمران کی آیت (۹۱) اس کی ہم معنی ہے، انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص سے کہے گا جسے آگ والوں میں سے سب سے ہلکا

يُرِيدُونَ أَنْ يَّخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٧﴾ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾

وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں، حالانکہ وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے ﴿٣٧﴾ اور جو چوری کرنے والا اور جو چوری کرنے والی ہے سو دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، اس کی جزا کے لیے جو ان دونوں نے کمایا، اللہ کی طرف سے عبرت کے لیے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿٣٨﴾

عذاب ہوگا: ''اگر زمین میں جو بھی چیز ہے تمھاری ہو تو کیا تم اپنی جان چھڑانے کے لیے وہ دے دو گے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں!'' تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں نے تم سے اس سے کہیں زیادہ آسان چیز کا مطالبہ کیا تھا جب تو آدم کی پشت میں تھا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنانا، مگر تو میرے ساتھ شریک بنائے بغیر مانا ہی نہیں۔'' [بخاري، الرقاق، باب صفة الجنة والنار : ٦٥٥٧]

آیت 37 يُرِيدُونَ أَنْ يَّخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا: یہ آیت کفار کے بارے میں ہے، جیسا کہ اوپر کی آیت میں ان کا صاف ذکر کیا گیا ہے، رہے گناہ گار مسلمان تو صحیح احادیث میں ہے کہ انھیں گناہوں کی سزا بھگت لینے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ سورۂ حج کی آیت (۲۲) اس کی ہم معنی ہے۔

آیت 38 ① وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ...... : اوپر کی آیت میں محاربین (جو لوٹ مار کرتے اور فساد پھیلاتے ہیں) کی سزا بیان ہوئی تھی، اب اس آیت میں چوری کی حد (قانونی سزا) بیان فرمائی کہ مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ حدیث میں اس کی تفصیل ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر دینار کے ایک چوتھائی یا زیادہ میں۔'' [مسلم، الحدود، باب حد السرقة و نصابها : ٢/ ١٦٨٤]

② چور کو حاکم کے پاس لے جانے سے پہلے معاف کیا جا سکتا ہے، بعد میں نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چور کو لایا گیا جس نے ایک چادر چرائی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ چادر کے مالک صفوان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میرا ارادہ یہ نہیں تھا (کہ اس کا ہاتھ کٹوا دوں) میری چادر اس پر صدقہ ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو نے اسے میرے پاس لانے سے پہلے کیوں (یہ صدقہ) نہ کیا؟'' [ابن ماجه، الحدود، باب من سرق من الحرز : ٢٥٩٥، قال الألباني صحيح] بعض لوگوں نے چوری کی حد باطل کرنے کے لیے بہت سے حیلے ایجاد کیے ہیں، ان میں سے دو حیلے ایسے ہیں جن کی موجودگی میں کسی چور کا ہاتھ کاٹا ہی نہیں جا سکتا۔ ایک یہ کہ عدالت میں جانے کے بعد مال مسروقہ کا مالک چور کو چرائی ہوئی چیز ہبہ کر دے، یا اس کے ہاتھ بیچ دے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، حالانکہ یہ صحیح حدیث کے صریح خلاف ہے۔ دوسرا یہ کہ چور پر شہادتوں کے ساتھ چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو چور دعویٰ کر دے کہ مال مسروقہ میرا مال ہے، تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، خواہ وہ اپنی ملکیت کی کوئی دلیل پیش نہ کرے۔ یہ حیلہ لکھنے والے نے اس پر لکھا ہے کہ مخالف کی طرف سے اس پر اعتراض ہوتا

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

پھر جو اپنے ظلم کے بعد توبہ کر لے اور اصلاح کرے تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۳۹﴾ کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، عذاب دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۴۰﴾

ہے کہ اس طرح تو کوئی چور بھی جھوٹا دعویٰ کرنے سے عاجز نہیں، ہر چور ہی مالک ہونے کا دعویٰ کر دے گا اور چوری کی حد سرے سے ختم ہو جائے گی۔ اس کا جواب اس نے یہ دیا ہے کہ یہ بات صرف علماء کو معلوم ہے، چوروں کو معلوم نہیں، اس لیے حد ختم ہونے کی کوئی فکر نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے حیلوں کی وجہ سے بھی مسلم حکومتوں میں حدود اللہ ختم ہوئیں جس کے نتیجے میں ظلم وستم حد سے بڑھے، پھر اغیار مسلمانوں پر مسلط ہو گئے، اس کا علاج دوبارہ حدود اللہ کا صحیح نفاذ ہے۔

③ جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ: یہ اس کے گناہ کی سزا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت بھی کہ وہ تمام عمر لوگوں کے لیے چوری سے رکنے کا باعث اور یاددہانی بنا رہے گا کہ چور کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے۔ اگر اسے قتل بھی کر دیا جاتا تو یہ عبرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

آیت 39 فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ ......: یہاں ظلم سے مراد چوری ہے، یعنی جس نے چوری کے بعد توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف فرما دے گا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ توبہ کر لینے سے چوری کی حد اس سے ساقط ہو جائے گی۔ نبی ﷺ نے ایک چور کے متعلق فرمایا: ''اسے لے جاؤ، اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر اسے داغ دو، پھر میرے پاس لاؤ۔'' الغرض! اس کا ہاتھ کاٹا گیا، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا، آپ نے اس سے فرمایا: ''اللہ سے توبہ کرو۔'' اس نے کہا: ''میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تیری توبہ قبول کرے۔'' [مستدرك حاكم: ۳۸۱/۴، ح: ۸۱۵۰ و صححه و قال صاحب نيل الأوطار سنده صحيح] یہ تو بالکل صحیح ہے کہ حدود صرف گناہ سے روکنے کے لیے نہیں بلکہ اس گناہ کا کفارہ بھی ہیں، ان سے وہ گناہ معاف ہو جاتا ہے مگر ساتھ توبہ بھی ضروری ہے، تاکہ آئندہ وہ یہ حرکت نہ کرے۔ ہاں کوئی شخص چوری کرے اور اس کا کسی کو پتا نہ چلے، یا چوری کے مال کا مالک اسے عدالت میں نہ لے جائے تو اس کے لیے توبہ و استغفار ہی کافی ہے۔

آیت 40 اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ......: یہ اس لیے فرمایا کہ کوئی تعجب نہ کرے کہ چور کو تھوڑی خطا پر بڑی سزا فرمائی۔ (موضح) اس آیت کا خطاب تو رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن مراد تمام لوگ ہیں، یا ہر شخص سے خطاب

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

اے رسول! تجھے وہ لوگ غمگین نہ کریں جو کفر میں دوڑ کر جاتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے مونہوں سے کہا ہم ایمان لائے، حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے اور ان لوگوں میں سے جو یہودی بنے۔ بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، بہت سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کے لیے جو تیرے پاس نہیں آئے، وہ کلام کو اس کی جگہوں کے بعد پھیر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تمھیں یہ دیا جائے تو لے لو اور اگر تمھیں یہ نہ دیا جائے تو بچ جاؤ۔ اور وہ شخص کہ اللہ اسے فتنے میں ڈالنے کا ارادہ کرلے اس کے لیے تو اللہ سے ہرگز کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿۴۱﴾

ہے۔ (فتح البیان) یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں سے کسی کو رعایت نہیں مل سکتی، جو بھی جرم کرے گا اسے سزا ملے گی، اس معاملے میں کسی بڑے مرتبے والے کو چھوٹے پر فوقیت نہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ جس جرم پر جو سزا چاہے مقرر فرما دے، اسے مخلوق پر کل اختیار ہے۔ (قرطبی) ایک ملحد شاعر ابو العلاء معری نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر اعتراض کیا کہ دیکھیے ایک ہاتھ جس کی دیت پچاس اونٹ تھی، وہ چوتھائی دینار کی حقیر مالیت پر کاٹ دیا گیا، یہ عجیب تناقض ہے، پھر قرآن پر اعتراض کی وجہ سے گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگ گیا۔ چنانچہ بہت سے علماء نے اس کا جواب لکھا، قاضی عبد الوہاب نے کہا: "لَمَّا كَانَتْ اَمِيْنَةً كَانَتْ ثَمِيْنَةً فَلَمَّا خَانَتْ هَانَتْ" "جب تک ہاتھ امین تھا قیمتی تھا جب خیانت کی تو بے قدر ہو گیا۔" (ابن کثیر) سزاؤں کا ایک مقصد گناہوں سے روکنا بھی ہے، ہاتھ کاٹنے سے روکنے کے لیے ہاتھ کی دیت زیادہ رکھنا ضروری تھا، تاکہ لوگ کسی کا ہاتھ کاٹنے سے بچیں اور چوری سے روکنے کے لیے ہاتھ کاٹنے کا نصاب کم مقرر کرنا ضروری تھا، تاکہ لوگ چوری سے بچیں۔

آیت 41 ① يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ...... : رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو صرف مشرکین سے واسطہ تھا، مدینہ میں آئے تو منافقین اور یہود کی سازشیں بھی ساتھ مل گئیں، اس پر تسلی دینے کے لیے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں جو کفر میں دوڑ کر جاتے ہیں، یعنی جب بھی انھیں کوئی موقع ہاتھ آتا ہے فوراً کفر کی طرف پلٹ جاتے ہیں، کافروں سے مل جاتے ہیں۔ اس کا تعلق منافقین سے ہے۔ (رازی)

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

بہت سننے والے ہیں جھوٹ کو، بہت کھانے والے ہیں حرام کو، پھر اگر وہ تیرے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کر یا ان سے منہ پھیر لے اور اگر تو ان سے منہ پھیر لے تو ہر گز تجھے کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے اور اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۴۲﴾

2 وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ......: یعنی کفر میں دوڑ کر جانے والے یہودی بھی آپ کو غمگین نہ کریں۔ ”سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ“ جو جھوٹی باتیں بہت سنتے ہیں، یعنی جو کچھ ان کو ان کے مذہبی پیشوا تورات میں تحریف کر کے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر طعن کے طور پر کہتے ہیں اسے خوب سنتے اور قبول کرتے ہیں۔ ”سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ“ یعنی پھر یہ ان لوگوں کے جاسوس بن کر مسلمانوں اور نبی کریم ﷺ کی مجالس میں جا کر خوب سنتے ہیں، جو تکبر کی وجہ سے ان مجلسوں میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے۔ (کبیر)

3 يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ: کتب تفاسیر و احادیث میں لکھا ہے کہ یہود میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کا ارتکاب کیا، ان کے علماء نے باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ اس مقدمے کا فیصلہ محمد (ﷺ) سے کروا لیتے ہیں، کیونکہ وہ نرم شریعت لے کر آئے ہیں، اگر انھوں نے کوڑے مارنے کا حکم دیا تو ہماری مراد بر آئے گی اور اگر انھوں نے سنگ سار کرنے کا حکم دیا تو ہم ان کا فیصلہ ٹھکرا دیں گے۔ چنانچہ اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ [مسلم، الحدود، باب رجم الیھود أھل الذمة فی الزنٰی : ۱۶۹۹] مفصل واقعہ کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۵) کا حاشیہ (۱)۔

آیت 42 1 سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، جاسوسی کرنے کے لیے زیادہ باتیں سننا یا دوسروں کی باتیں ماننے اور قبول کرنے کے لیے سننا۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، جیسا کہ آیت (۴۱) کے حاشیہ (۲) میں دونوں قسم کے گروہوں کا بیان ہوا ہے۔

2 لِلسُّحْتِ: اس کے لفظی معنی مٹانے اور ہلاک کرنے کے ہیں، گویا حرام مال وہ چیز ہے جو انسان کی نیکیوں کو اکارت کر دیتا ہے اور ہر اس خسیس مال پر ” سُحْتٌ “ کا لفظ بولا جاتا ہے جس کے لینے میں عار ہو اور خفیہ طور پر لیا جائے، اس میں رشوت بھی شامل ہے اور احادیث میں زانیہ کی اجرت، کتے، شراب اور مردار کی قیمت کو ” سُحْتٌ “ کہا گیا ہے۔ سود، چوری کا مال اور جوئے سے کمایا ہوا مال بھی ” سُحْتٌ “ میں داخل ہے۔ (کبیر، قرطبی)

3 جس زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی یہودیوں کی حیثیت محض ایک معاہد قوم کی تھی جس کے ساتھ صلح سے رہنے کا معاہدہ تھا

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور وہ تجھے کیسے منصف بنائیں گے، جبکہ ان کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا حکم ہے، پھر وہ اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ﴿۴۳﴾

اور وہ ذمی، یعنی اسلامی حکومت کی رعایا نہ تھے، اس لیے نبی ﷺ کی عدالت کو اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو انکار کر دیں اور یہی اختیار اسلامی حکومت کو کسی غیر مسلم معاہد قوم کے افراد کے درمیان فیصلہ کرنے کا ہے۔ رہے ذمی لوگ سو اگر وہ اپنے مقدمات اسلامی عدالت میں لائیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنا ضروری ہوگا۔ (المنار) یہی تفصیل امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے، پس اس اختیار کا تعلق معاہد قوم سے ہے۔ (کبیر) مگر دوسرے علماء کا خیال ہے کہ یہ اختیار منسوخ ہے، اب اگر وہ فیصلہ لائیں تو فیصلہ کرنا ہوگا۔ ان علماء میں عمر بن عبد العزیز اور امام نخعی رحمہما اللہ شامل ہیں۔ نحاس نے بھی ناسخ و منسوخ میں یہی لکھا ہے کہ آیت: ﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ [المائدۃ : ۴۸] سے یہ آیت منسوخ ہے، جس کے معنی ہیں کہ آپ اللہ کے نازل کردہ کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا زیادہ صحیح قول بھی یہی ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''شروع سے یہ طریقہ چلا آیا ہے کہ باہمی حقوق اور وراثت میں اہل کتاب کا فیصلہ ان کے دین کے مطابق کیا جائے، ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کے خواہش مند ہوں تو پھر اسی کے مطابق کر دیا جائے۔'' اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ گو بعض جزئیات میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم ان کی اکثریت نسخ ہی کی قائل ہے۔ (قرطبی)

آیت 43 ① وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ: یہاں ان کی جہالت و عناد کا بیان ہے، یعنی وہ جانتے ہیں کہ جو مقدمہ وہ آپ کے پاس لا رہے ہیں، اس کا فیصلہ تورات میں موجود ہے، تاہم آپ کے پاس اس لیے مقدمہ لاتے ہیں کہ شاید آپ کا فیصلہ تورات کی بہ نسبت کچھ ہلکا ہو، لیکن جب آپ کا فیصلہ بھی وہی ہوتا ہے جو تورات کا ہوتا ہے تو وہ اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تورات پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آپ پر۔ اصل میں یہ اپنی اغراض کے بندے ہیں اور ان کا مقصدِ حیات ہی دنیوی مصالح کا حاصل کرنا ہے۔ (کبیر)

② وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تورات میں موجود رجم کے فیصلے کو اللہ کا فیصلہ قرار دیا ہے، جو لوگ رجم کے منکر ہیں اگرچہ بہت سی صحیح احادیث بھی ان کا رد کرتی ہیں، مگر یہ آیت پختہ ترین مضبوط دلیل ہے کہ قرآن نے تورات میں موجود رجم کے حکم کو اللہ کا حکم قرار دیا ہے، پھر نہ اس کی تردید کی ہے نہ منسوخ کہا ہے، بلکہ اللہ کے اس حکم کو یہود اور مسلمان دونوں پر نافذ فرمایا۔ معلوم ہوا قرآن میں بھی رجم کا ذکر موجود ہے۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

بے شک ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے انبیاء جو فرماں بردار تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی بنے اور رب والے اور علماء، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے۔ تو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں ﴿۴۴﴾

آیت 44 ① اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ...... : اس میں یہود کو تنبیہ ہے جو حد رجم (سنگ ساری) کا انکار کرتے تھے اور ان کے لیے ترغیب ہے کہ وہ اپنے اسلاف، انبیاء، احبار اور علمائے ربانیین کا مسلک اختیار کریں۔ (کبیر) بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک بہت سے پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن پر کوئی نئی کتاب نازل نہیں کی گئی اور وہ اپنے زمانے میں لوگوں کو تورات ہی پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے اور ان کے درمیان اسی کے احکام کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ خود عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی نئی شریعت نہیں دی گئی، بلکہ ان کی بعثت کا مقصد تورات ہی کی شریعت کو زندہ کرنا تھا۔ "الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا" یہ صفت مدح ہے اور ان انبیاء کے فرماں بردار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین ابراہیم کے تابع تھے، یا اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ (قرطبی، کبیر)

② بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ: "بِمَا" کی باء کا تعلق "الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ" سے ہے، مطلب یہ ہے کہ جس زمانے میں کوئی نبی نہیں ہوتا تھا تو یہ درویش اور تعلیم یافتہ لوگ یہودیوں کے مابین تورات کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے، کیونکہ انبیاء نے انھی کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات کا محافظ مقرر کیا تھا اور "شُهَدَآءَ" کے معنی یہ ہیں کہ وہ تورات کے اللہ کی طرف سے ہونے پر گواہ تھے۔ بعض علماء نے "بِمَا اسْتُحْفِظُوْا" کی "باء" کا تعلق "يَحْكُمُ" سے بیان کیا ہے کہ اللہ کی کتاب کی جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی وہ اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ (قرطبی، کبیر)

③ تورات کی حفاظت کے ذمے دار اور اس کے محافظ تو علماء اور رب والے لوگ بنائے گئے تھے مگر قرآن مجید اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا، فرمایا: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر : ٩] "بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔" اگرچہ قرآن کی حفاظت کا کام بھی اللہ تعالیٰ نے علماء اور ربانیین ہی سے لیا، مگر اس کا ذمہ خود اٹھانے کی وجہ سے تورات اور قرآن کے محفوظ

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ

اور ہم نے اس میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان

رہنے میں جو فرق ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

4 فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ: یعنی تم بھی اپنے انبیاء اور بزرگوں کے نقش قدم پر چلو اور تورات میں کوئی تحریف نہ کرو، نہ اسے چھپا کر نہ غلط مسئلہ بتا کر دنیا کا فائدہ اٹھاؤ، کیونکہ دنیا جتنی بھی ہو قلیل ہے اور حق بات کہنے میں اور محمد ﷺ کے جو حالات اس میں مذکور ہیں ان کے بیان کرنے میں لوگوں کی پروا مت کرو، نہ ان سے ڈرو، بلکہ صرف میرے انتقام اور عذاب کا ڈر اپنے دلوں میں رکھو۔ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”حکام پر اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں لازم کی ہیں: ① خواہش کی پیروی نہ کریں: ﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ [صٓ : ۲٦] اور فرمایا: ﴿ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ﴾ [المائدۃ: ٤٤] ② صحیح فیصلہ کرنے میں لوگوں سے نہ ڈریں: ﴿ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ ﴾ [المائدۃ : ٤٤] ③ اور رشوت لے کر غلط فیصلہ نہ کریں: ﴿ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ﴾ [المائدۃ : ٤٤] [بخاری، الأحکام، باب متی یستوجب الرجل القضاء، قبل ح : ۷۱٦۳] یہ تینوں باتیں اس آیت میں مذکور ہیں۔

5 وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ: یہ خطاب یہود سے ہے، یعنی جب وہ جان بوجھ کر تورات کے فیصلے کو چھپاتے ہیں اور اس پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ باوجود زبانی دعویٰ کرنے کے یہ کافر ہیں۔ مسلم حاکم پر کفر کا فتویٰ اسی وقت لگا سکتے ہیں جب وہ قرآن و حدیث کا انکار کر کے ان کے خلاف فیصلہ صادر کرے، ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

آیت 45 1 وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ: اس آیت میں بھی یہود کو ڈانٹ ہے، یعنی انھوں نے جس طرح رجم (سنگ ساری) کے حکم کو تبدیل کر دیا تھا اسی طرح ان پر نفوس (جانوں) اور جروح (زخموں) میں برابری رکھی گئی تھی، جو اب بھی تورات کی کتاب خروج، باب (۲۱) فقرہ (۲۳۔ ۲۵) میں موجود ہے، مگر انھوں نے اس کو تبدیل کر کے معطل کر ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہودی قبائل میں سے بنو نضیر طاقتور اور بنو قریظہ کمزور تھے، اس لیے یہودی بنو نضیر کا قصاص تو بنو قریظہ سے لے لیتے لیکن بنو قریظہ کا قصاص بنو نضیر سے نہیں لیتے تھے، بلکہ ان کے مقتول کی دیت ادا کر دیتے۔ (ابن جریر) ”هداية المستنير“ کے مصنف نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ اس آیت میں مذکور مسائل کے حجت ہونے پر اجماع ہے، پس عورت کے بدلے قاتل مرد ہی قتل کیا جائے گا، خواہ چھوٹے قبیلے کا ہو یا بڑے کا، قصاص میں سب برابر ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاؤُهُمْ » ”مسلمانوں کے خون برابر ہیں۔“ [أبو داوٗد، الجهاد، باب في السرية ترد علی أهل العسكر : ۲۷۵۱۔ أحمد : ۱/ ۱۲۳، ح : ۹۹۵۔ نسائي : ۲۷۵۰، ابن ماجه : ۲٦۸۳، وقال الألباني حسن صحیح] بعض لوگوں نے اس آیت (جان کے بدلے جان) سے نکالا ہے کہ کافر کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائے گا، مگر صحیح بخاری

بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا

کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں میں برابر بدلہ ہے، پھر جو اس (قصاص) کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں﴿۴۵﴾ اور ہم نے ان کے پیچھے ان کے قدموں کے نشانوں پر عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا، جو اس سے پہلے تورات کی تصدیق کرنے

(۶۹۱۵) میں رسول اللہ ﷺ کا یہ صریح فرمان موجود ہے: «وَ اَنْ لَّا يُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ» ”کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر مومن کا کفو (برابر) نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے ان بعض لوگوں کے خلاف امت کا اجماع نقل فرمایا ہے جو کافر کے بدلے مسلمان کو قتل کرنے کے قائل ہیں۔ (ابن کثیر)

2 اس وقت مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے قرآن و سنت کے صریح خلاف ایسے احکام ایجاد کر لیے جن کی موجودگی میں قصاص تقریباً ناممکن ہے۔ انھوں نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ تیز دھار آلے کے ساتھ قتل کرے یا آگ سے جلائے تو قصاص ہے ورنہ نہیں۔ چنانچہ خواہ جان بوجھ کر قتل کے ارادے سے بھاری سے بھاری پتھر مار مار کر قتل کر دے تو قصاص نہیں ہو گا بلکہ دیت ہو گی، حالانکہ یہ بات قرآن و حدیث سے ثابت نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی کا سر پتھروں سے اسی طرح کچلا تھا جس طرح اس نے ایک بچی کا سر کچلا تھا۔ [بخاري، الديات، باب سؤال القاتل حتى يقر...... : ٦٨٧٦] لہٰذا قرآن و حدیث کے مطابق قتل کے ارادے سے اگر جان بوجھ کر قتل کرنا ثابت ہو جائے تو پھر قصاص ہے، خواہ کسی طرح بھی قتل کرے۔ مگر ان بعض لوگوں نے کہا کہ اگر کوئی کسی کو ڈبو کر مار دے، یا بھوکا رکھ کر مار دے، یا برف کے بلاک میں رکھ کر مار دے، غرض بہت سی صورتیں بیان کر کے کہتے ہیں کہ ان میں قصاص نہیں، کیونکہ آلہ تیز دھار نہیں۔ ظاہر ہے جن عدالتوں میں ان لوگوں کا حکم چلتا ہو، وہاں قصاص کا نشانہ صرف وہی لوگ بنتے ہوں گے جو ان حیلوں کو نہیں جانتے ہوں گے، پھر جب قانون ہی میں انصاف نہ رہے تو کوئی قوم اللہ کی نصرت کے وعدے کی حق دار کیسے رہ سکتی ہے؟

3 فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ: عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کے جسم پر کوئی زخم لگایا جائے، پھر وہ اسے معاف کر دے تو جتنا اس نے معاف کیا اللہ تعالیٰ اتنا ہی اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔“ [أحمد : ٣١٦/٥، ح : ٢٢٧٦٧۔ السنن الكبرى للنسائي، التفسير : ١١١٤٦]

4 وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ......: یعنی اگر قرآن و حدیث کا انکار تو نہیں کرتا مگر اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو یہ ظالم ہے۔

آیت 46 وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ...... : عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت یا نیا دین لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ وہ خود بھی اسی شریعت پر چلتے تھے اور انجیل بھی اسی شریعت پر چلنے کا حکم دیتی تھی۔ انجیل میں ہے: ”یہ نہ سمجھو کہ میں

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

والا تھا اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی تھی اور اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے تورات تھی اور متقی لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ﴿٤٦﴾ اور لازم ہے کہ انجیل والے اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ نافرمان ہیں ﴿٤٧﴾ اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ بھیجی، اس حال میں کہ اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو کتابوں میں سے اس سے پہلے ہے اور اس پر محافظ ہے۔ پس ان کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ نے نازل کیا

تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں، کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔'' (انجیل متی: ۵: ۱۷، ۱۸) تورات، انجیل اور پھر قرآن کریم کے متعلق ''هُدًى وَّنُوْرٌ'' کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، ان نازل شدہ کتابوں کا ہدایت ہونا تو اس اعتبار سے ہے کہ یہ دنیا اور آخرت کے حقائق کے بیان پر مشتمل ہیں اور نور (روشنی) اس لحاظ سے کہ انسان کے لیے عملی زندگی میں رہنمائی کا کام دیتی ہیں۔ (کبیر)

آیت 47 وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ...... : اہل انجیل کا اس کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے، فیصلہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر لازم ہے کہ انجیل میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو پیش گوئیاں اور دلائل اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں وہ ان کو چھپانے یا ان کی غلط تاویلیں کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ انجیل کے حکم کے مطابق مسلمان ہو جائیں اور قرآن وسنت کے مطابق فیصلہ کریں اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہ نافرمان ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں اترا ہوا اللہ کا حکم نہیں مانا۔

آیت 48 ① وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ...... : اوپر کی آیات میں تورات اور انجیل کے اوصاف بیان کیے اور اہل کتاب کو ان پر عامل نہ ہونے کی وجہ سے کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا۔ اب اس آیت میں قرآن کی توصیف بیان کی ہے اور آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ قرآن کے مطابق فیصلے کرو۔ ''مُهَيْمِنًا'' کے معنی محافظ، نگہبان اور شاہد کے آتے ہیں۔ قرآن پاک سابقہ کتابوں کا محافظ ہے، یعنی ہدایت کے جو علوم، معانی اور مضامین پہلی کتابوں میں تھے وہ سب کمال

وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّ مِنۡهَاجًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ﴿۴۸﴾

اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر، اس سے ہٹ کر جو حق میں سے تیرے پاس آیا ہے۔ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک راستہ اور ایک طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ایک امت بنا دیتا اور لیکن تاکہ وہ تمھیں اس میں آزمائے جو اس نے تمھیں دیا ہے۔ پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۴۸﴾

امانت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور یہود کی تحریفات اور غلط تاویلات کو بیان کرتا ہے۔ یہ معنی بھی ہیں کہ تورات اور انجیل کے ہر حکم کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا جائے گا، صحیح اترنے کی صورت میں قبول کر لیا جائے گا ورنہ رد کر دیا جائے گا۔

❷ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ ...... : اس سے پہلے آیت (۴۲) میں نبی کریم ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا کہ آپ ان کے معاملات کے فیصلے کریں یا نہ کریں آپ کی مرضی ہے، لیکن اب اس کی جگہ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ ان کے آپس کے معاملات میں بھی قرآن کے مطابق فیصلے فرمائیں۔

❸ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا : اس کے مخاطب یہود و نصاریٰ اور مسلمان ہیں، یعنی گو تمام انبیاء کا دین ایک ہے مگر اپنے اپنے وقت میں ہر امت کی شریعت (احکام فرعیہ) اور طریقے مختلف رہے ہیں، ہر بعد میں آنے والے نبی کی شریعت میں پہلی شریعت سے مختلف احکام پائے جاتے ہیں، اب نبی آخر الزماں کی شریعت ہر لحاظ سے مکمل اور قیامت تک کے لیے ہے۔ ایک حدیث میں ہے: ''انبیاء علاتی بھائی ہیں، ان کی مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔'' [بخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله : ﴿ واذكر في الكتاب مريم...... ﴾ : ۳٤٤۳] یعنی سب کا دین اور اصول تو ایک ہیں، اختلاف جو کچھ بھی ہے وہ صرف فروعی احکام کی حد تک ہے۔ اب آخری نبی کے بعد نہ کسی پہلے نبی کے احکام و مسائل پر عمل ہوگا اور نہ اس امت کے کسی امام و مجتہد کے قول، رائے یا فتویٰ پر۔

❹ وَلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ : یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو جبراً ایک ہی امت بنا دیتا مگر یہ اختلاف اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارا امتحان کرنا چاہتا ہے کہ تم اس عقل اور ان اختیارات کو کیسے استعمال کرتے ہو جو اس نے تمھیں دیے ہیں، تاکہ اس پر جزا و سزا ہو سکے۔

❺ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ : یعنی خواہ مخواہ کی کج بحثیوں کو چھوڑ کر ان نیکیوں کو اختیار کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھو جن کا اب تمھیں آخری شریعت میں حکم دیا جا رہا ہے۔

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ
بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝۴۹ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ
اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۵۰ ع

اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کر جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور ان سے بچ کہ وہ تجھے کسی ایسے حکم سے بہکا دیں جو اللہ نے تیری طرف نازل کیا ہے، پھر اگر وہ پھر جائیں تو جان لے کہ اللہ یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے کچھ گناہوں کی سزا پہنچائے اور بے شک بہت سے لوگ یقیناً نافرمان ہیں ۝۴۹ پھر کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے، ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں ۝۵۰

آیت 49 ① وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ...... : یعنی یہ اہل کتاب اگرچہ آپس میں دست و گریباں رہیں، مگر آپ ان کے باہمی اختلاف سے متاثر نہ ہوں، آپ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں اور ان سے ہوشیار رہیں، ایسا نہ ہو کہ ان کے کسی گروہ کو خوش کرنے یا ان سے مصالحت کی کوئی خواہش آپ کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام سے ہٹا دے۔ مزید دیکھیے سورۂ نساء (۱۱۳)، سورۂ بنی اسرائیل (۷۳ تا ۷۵) اور سورۂ قلم (۸، ۹)۔

② فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ : یعنی اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ان کو ایمان کی توفیق سے محروم رکھ کر اس دنیا میں ان کو جلاوطنی، جزیہ یا قتل کی سزا دے، کیونکہ ان میں انصاف پسند اور حق پر چلنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کو اس کے گناہوں کی شامت کیا کیا نقصان پہنچاتی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ خطبہ میں کہا کرتے تھے: « وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا » [ابن ماجه، النكاح، باب خطبة النكاح : ۱۸۹۲] ''ہم اپنے نفسوں کی شرارتوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔''

آیت 50 اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ...... : کیا یہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق کیے ہوئے فیصلے کو چھوڑ کر کفر و جاہلیت کے زمانے کا فیصلہ پسند کرتے ہیں جس کی بنیاد ذاتی خواہشات پر ہوتی تھی اور جن میں کمزور کے مقابلے میں طاقت ور کی طرف داری کی جاتی تھی، اسی کا نام یہودیت ہے کہ وہ چھوٹے درجے کے آدمی کے مقابلے میں بڑے کی رعایت کرتے، کمزوروں پر حدود قائم کرتے اور مال دار طبقہ کی رعایت کرتے۔ (کبیر، قرطبی)

افسوس بعض مسلم حکام کے زمانے کے علماء نے ایسے احکام اور حیلے ایجاد کیے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کا نفاذ تقریباً ناممکن ہو گیا، مثلاً انھوں نے شراب کی ایک دو قسمیں چھوڑ کر باقی نشہ آور چیزیں حلال کر دیں۔ اجرت پر لائی ہوئی عورت کے ساتھ زنا پر حد ختم کر دی۔ قصاص کو جیسا کہ اوپر گزرا تقریباً باطل کر دیا۔ سود کی کئی صورتوں کو حلال کر دیا۔ چور کو عدالت میں پیش ہونے کے بعد بھی صاحب مال کو معاف کرنے کا اختیار دے دیا۔ شواہد کے ساتھ چور کا جرم ثابت ہونے کے بعد چور کے صرف اس

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿٥٢﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں اور تم میں سے جو انھیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ ان میں سے ہے، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿٥١﴾ پس تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں ایک بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان میں جاتے ہیں، کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی چکر آ پہنچے، تو قریب ہے کہ اللہ فتح لے آئے، یا اپنے پاس سے کوئی اور معاملہ تو وہ اس پر جو انھوں نے اپنے دلوں میں چھپایا تھا، پشیمان ہو جائیں ﴿٥٢﴾

دعوے سے کہ یہ میرا مال تھا، اس کی حد معاف کر دی، خواہ وہ اپنی ملکیت کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ اس امام (حاکم) کو جس سے اوپر کوئی امام نہ ہو ایک دو چیزوں کے سوا تمام حدود معاف کر دیں اور جاہلیت کے ان احکام کو شرع اسلام قرار دے کر مسلمان ملکوں میں نافذ کر دیا، تو کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ''پھر کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں'' جس طرح یہود و نصاریٰ میں شریعت بدلنے والوں کے لیے تھا، اسی طرح ایسے مسلمانوں کے لیے نہیں ہوگا جو قرآن و حدیث کے صریح احکام کے مقابلے میں اپنے من گھڑت احکام نافذ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کا نتیجہ بھی دنیا پر غلبے سے محرومی اور کفار کی بدترین غلامی کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اب بھی مسلمانوں کے اکثر حکام نے طرز حکومت اور ملکی قانون کفار کے طریقے کے مطابق بنایا ہوا ہے اور وہ ایسی علماء کونسلیں بناتے رہتے ہیں جو قدیم جاہلیت کے ساتھ ساتھ نئی سے نئی جاہلیت کے نفاذ کے لیے قانون بنائیں اور اس کا نام اسلامی کونسل رکھتے ہیں۔ [اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ]

آیت 51 لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ...... : ''اَوْلِيَآءَ'' ''وَلِيٌّ'' کی جمع ہے، مراد دلی دوست ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور یہ طے شدہ بات ہے کہ دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے، تو جسے تم اپنا خیر خواہ سمجھ کر دوست بنا رہے ہو اس کی اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ بھی دوستی ہے جو تمھارے شدید دشمن ہیں، وہ آپس میں کتنا بھی اختلاف رکھتے ہوں تمھاری عداوت میں وہ ایک ہیں اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں، تو تمھاری یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس پر اتنی سختی فرمائی کہ فرمایا تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انھی میں سے ہے۔ رہا ان سے اچھا تعلق رکھنا، خوش اخلاقی، حسن سلوک اور احسان تو وہ ان لوگوں کے ساتھ کر سکتے ہو جنھوں نے دین کی وجہ سے تم سے جنگ نہیں کی، جن کا ذکر سورۂ ممتحنہ (٨) میں ہے۔ صرف یہود و نصاریٰ ہی سے نہیں تمام کفار کی دلی دوستی سے منع فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (٢٣)، سورۂ مجادلہ (٢٢) اور آل عمران (٢٨، ١١٨)۔

آیت 52 فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ...... : یعنی منافقین جو یہود و نصاریٰ کی طرف دوڑتے اور ان کے ساتھ

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لائے، کہتے ہیں کیا یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی تھی کہ بلاشبہ وہ یقیناً تمھارے ساتھ ہیں۔ ان کے اعمال ضائع ہو گئے، پس وہ خسارہ اٹھانے والے ہو گئے ﴿۵۳﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۵۴﴾

دوستی کیے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں مسلمان زمانے کے کسی چکر میں آ کر مغلوب نہ ہو جائیں، پھر ہمارا کیا بنے گا، اس وقت ان کی دوستی ہمارے کام آئے گی، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، بلکہ یقیناً ہو گا، (لفظ ”عَسٰی“ اللہ اور رسول کے فرمان میں یقین کے معنی میں آتا ہے) کہ مسلمانوں کو فتح ہو گی، کافر مغلوب ہوں گے، پھر وہ قتل ہوں گے، یا جلا وطن ہوں گے، یا انھیں جزیہ دینا پڑے گا، پھر ان منافقین کو ندامت ہو گی کہ ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا، مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، بنو قریظہ کے یہودی قتل ہوئے، بنو نضیر کو سرزمین مدینہ سے نکال دیا گیا اور یہ لوگ اپنے نفاق پر کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔

آیت 53 وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا...... : یعنی مسلمان جب جنگ کے وقت منافقین کو یہود و کفار کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھتے ہیں تو تعجب سے کہتے ہیں کہ کیا یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ہم سے پکی قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں اور کفار کے دشمن ہیں!! اب ان کی حقیقت کھل گئی۔

آیت 54 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ ...... : اللہ تعالیٰ جو ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ جانتا ہے، اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے عرب قبائل اسلام سے مرتد ہو جائیں گے، اس لیے اس نے آئندہ سے متعلق یہ آیت پہلے ہی نازل فرما دی۔ چنانچہ جب نبی ﷺ فوت ہوئے تو تین مقامات مکہ، مدینہ اور بحرین کے علاوہ تمام علاقوں سے عرب قبائل کے مرتد ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔ اس وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان مرتدین سے جہاد کیا۔ اس فتنۂ ارتداد کا خاتمہ جن لوگوں کے ہاتھوں ہونا

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

رٰكِعُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾

تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں ﴿٥٥﴾ اور جو کوئی اللہ کو اور اس کے رسول کو اور ان لوگوں کو دوست بنائے جو ایمان لائے ہیں تو یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو غالب ہیں ﴿٥٦﴾

تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی پانچ صفات بیان کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی انصار و مہاجرین اور یمن سے آنے والے مجاہدین میں یہ پانچوں خوبیاں موجود تھیں۔ کتنے بے نصیب ہیں وہ لوگ جو ایسے لوگوں سے بغض رکھتے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے: ① اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ ② مومنوں پر بہت نرم ہیں۔ ③ کافروں پر بہت سخت ہیں۔ ④ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ ⑤ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ ان خوش نصیب لوگوں کے سردار اور خلیفہ ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر عرب دین سے پھرے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یمن سے مسلمان بلائے، ان سے جہاد کروایا کہ تمام عرب مسلمان ہوئے، یہ ان کے حق میں بشارت ہے۔ (موضح)

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اس (ابو موسیٰ) کی قوم ہے۔'' (ابن ابی حاتم، ابن جریر) ''ھدایۃ المستنیر'' کے مصنف نے اس کو حسن قرار دیا ہے۔ الغرض ابو بکر رضی اللہ عنہ، ان کے ساتھی مہاجرین و انصار اور اہل یمن میں یہ خوبیاں موجود تھیں۔

صاحب الکشاف نے لکھا ہے کہ مرتد ہونے والوں کے بارہ (۱۲) فرقے تھے، ان میں سے تین فرقے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں مرتد ہو گئے تھے: ① بنو مدلج جن کا رئیس اسود عنسی تھا، جس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اسے فیروز دیلمی نے قتل کیا۔ (کشاف کے محشی نے لکھا ہے کہ اسود عنسی بنو مدلج سے نہیں بلکہ بنو عنس سے تھا) ② مسیلمہ کذاب کی قوم بنو حنیفہ، جس سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ کی اور وہ حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ③ بنو اسد جن کا رئیس طلیحہ بن خویلد تھا، ان کی سرکوبی کے لیے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا۔ یہ شخص آخر میں مسلمان ہو گیا تھا۔

آیت 56،55 ① اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ...... : اوپر کی آیات میں کفار سے دوستی کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اب اس آیت میں '' اِنَّمَا '' کلمہ حصر کے ساتھ بتایا کہ تمھارے دوست صرف اور صرف اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اہل ایمان ہیں، اس لیے یہود کو مددگار اور دوست نہ بناؤ، بلکہ صرف مومنین کو اپنا مددگار سمجھو۔ (ابن کثیر، کبیر) یہاں '' وَهُمْ رٰكِعُوْنَ '' کے معنی ہیں ''جھکنے والے، عاجزی کرنے والے۔'' چنانچہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ [المؤمنون : ٦٠] ''اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِیَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو جنھوں نے تمھارے دین کو مذاق اور کھیل بنا لیا، ان لوگوں میں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور کفار کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو ﴿۵۷﴾

ہیں۔'' (کبیر، ثنائی) بعض لوگوں نے ''وَهُمْ رٰكِعُوْنَ'' کو ''وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ'' کے فاعل سے حال قرار دے کر یہ ترجمہ کیا ہے ''وہ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں'' اور بعض روایات سے ثابت کیا ہے کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی صدقہ کی تھی، اس پر ان کی تعریف میں یہ آیت نازل ہوئی، مگر یہ سب روایات بہت ضعیف اور کمزور ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات پر سخت تنقید کی ہے اور ان کو بے اصل قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ان روایات سے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرنا زکوٰۃ دینے کی افضل ترین صورت ہے، مگر آج تک کسی عالم نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔ (ابن کثیر، المنار) پس صحیح یہ ہے کہ آیت عام مومنین کے حق میں نازل ہوئی ہے اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء اس آیت کے اولین مصداق ہیں۔ ابوجعفر محمد بن علی بن حسین سے پوچھا گیا کہ ''وَلِیُّكُمُ'' سے مراد علی رضی اللہ عنہ ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ علی رضی اللہ عنہ بھی ان مومنوں میں سے ایک ہیں، یعنی یہ آیت سب مومنوں کے حق میں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ یہاں جو صفات مذکور ہیں کہ ''وہ جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں'' ان سے کیا مقصد ہے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ اس سے منافقین پر طنز مقصود ہے جو ان صفات سے خالی تھے۔ (رازی)

2 شیعہ حضرات ان دو آیات سے علی رضی اللہ عنہ کی امامت بلافصل ثابت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسی وقت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ ان کے استدلال کا مدار تو اس بات پر ہے کہ یہ آیت خاص کر علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی ہے، مگر ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ آیت سب مومنوں کے حق میں نازل ہوئی ہے اور علی رضی اللہ عنہ بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس آیت میں تمام صیغے جمع کے ہیں تو پھر صرف علی رضی اللہ عنہ کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟ اور پھر جب آیت کے نزول کے ساتھ ہی علی رضی اللہ عنہ کی ولایت ثابت ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تک اس کو ملتوی رکھنا بے معنی ہے، نیز ولی کے معنی دوست اور مددگار کے بھی آتے ہیں اور والی اور متصرف (حاکم) کے بھی۔ آیت کا سیاق و سباق (اس کے الفاظ اور اس سے پہلے والی آیات کے الفاظ) پہلے معنی کی تائید کرتے ہیں تو سیاق کے قرینہ کے خلاف دوسرے معنی لینے کے لیے کون سی وجہ جواز ہو سکتی ہے؟ امام رازی رحمہ اللہ نے آٹھ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ آیت میں ولی کے پہلے معنی مراد ہیں، دوسرے معنی دلائل کے خلاف ہیں۔ (کبیر)

آیت 57 یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَكُمْ ...... : اوپر کی آیات میں خاص طور پر یہود و نصاریٰ کی دوستی سے منع فرمایا، اب یہاں تمام کفار کی دوستی سے منع فرمایا ہے۔ اس آیت کی رو سے ان بے دین لوگوں اور اہل بدعت سے دلی دوستی رکھنا بھی جائز نہیں جنھوں نے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، کبھی داڑھی کا مذاق اڑاتے ہیں، کبھی مسنون لباس کا

وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب تم نماز کی طرف آواز دیتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ﴿۵۸﴾ کہہ دے اے اہل کتاب! تم ہم سے اس کے سوا کس چیز کا انتقام لیتے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو اس سے پہلے نازل کیا گیا اور یہ کہ بے شک تمھارے اکثر نافرمان ہیں ﴿۵۹﴾

اور کبھی اللہ تعالیٰ کی حدود کا۔ اسی طرح سنت کے مطابق نماز کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو شخص پیدائش، نکاح اور موت کے وقت کفار خصوصاً ہندوؤں کی رسموں میں ان کا ساتھ نہ دے، اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو جب ان میں بھی وہی وصف پایا جاتا ہے جو اہل کتاب اور کفار میں پایا جاتا ہے تو ان کا حکم بھی وہی ہونا چاہیے جو اہل کتاب اور کفار کا ہے۔

آیت 58 ① وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ : ”نَادَيْتُمْ“ کا معنی ہے جب تم آواز دیتے ہو، تو اس سے مراد نماز کے لیے اذان ہے یعنی اس کی نقلیں اتارتے ہیں، تمسخر سے اس کے الفاظ بدلتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں، شور و ہنگامہ برپا کرتے ہیں۔ (ابن کثیر، فتح القدیر) شیطان کو بھی اذان کی آواز برداشت نہیں، حدیث میں ہے: ”شیطان جب اذان کی آواز سنتا ہے تو گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے (کہ اذان اس کے کانوں میں نہ پڑے)، پھر واپس آ جاتا ہے، اقامت کے وقت پھر پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے، جب تکبیر ختم ہوتی ہے تو پھر آ کر نمازیوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔“ [بخاري، الأذان، باب فضل التأذين : ٦٠٨]

② نماز کے لیے آواز دینے کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے، ایک اس آیت میں دوسرا سورۂ جمعہ میں۔ اسی ندا کو اذان کہتے ہیں، مگر پورے قرآن میں نہ اذان کا طریقہ بیان ہوا، نہ اس کے کلمات اور نہ اس کے اوقات۔ یہ آواز کیسے دی جائے، اس کے لیے حدیث رسول سے رہنمائی لینا ہو گی۔ معلوم ہوا حدیث کے بغیر قرآن پر عمل ممکن ہی نہیں۔ ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ [النساء : ٥٩] اور ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ﴾ [آل عمران : ٣١] کے تحت قرآن کے ساتھ حدیث پر عمل بھی واجب ہے، اسی لیے اہل علم نے منکرین حدیث پر کفر کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

③ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ: یعنی اگر ان میں کچھ بھی عقل ہوتی تو اذان کی آواز سن کر ان کے دل نرم پڑ جاتے، وہ حق کی طرف متوجہ ہوتے، یا کم از کم مسلمانوں سے دینی اختلاف رکھنے کے باوجود اس قسم کی گھٹیا حرکتیں نہ کرتے۔

آیت 59 ① وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ: یعنی پہلی کتابوں پر، جیسے تورات، انجیل اور زبور وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ ہمارا ایمان انھی چیزوں پر ہے جنھیں تم بھی صحیح مانتے ہو، پھر تم ہم سے کس بات کا انتقام لیتے ہو اور ہمارا کیا عیب ہے جس

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ أَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾ وَ إِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾

کہہ دے کیا میں تمھیں اللہ کے نزدیک جزا کے اعتبار سے اس سے زیادہ برے لوگ بتاؤں، وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر غصے ہوا اور جن میں سے بندر اور خنزیر بنا دیے اور جنھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔ یہ لوگ درجے میں زیادہ برے اور سیدھے راستے سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ﴿٦٠﴾ اور جب وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے، حالانکہ یقیناً وہ کفر کے ساتھ داخل ہوئے اور یقیناً اسی کے ساتھ وہ نکل گئے اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو وہ چھپاتے تھے ﴿٦١﴾

کی وجہ سے تم ہم سے دشمنی رکھتے ہو؟

② وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ: اصل بات یہ ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ فاسق (نافرمان) اور بدکار ہیں اور تمھاری ساری مذہبی اجارہ داری گروہی تعصب اور غلط قسم کی روایات پر قائم ہے، اس لیے تم اپنے سوا کسی دوسرے میں کوئی اچھی بات دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ فاسق کی تو روایت ہی قابل قبول نہیں، کیونکہ اسے جھوٹ سے کوئی پرہیز نہیں ہوتا، اس لیے اسلام کے خلاف تمھاری تمام روایات و حرکات بے وقعت ہیں۔ قرآن مجید کا انصاف ملاحظہ فرمائیے کہ شدید غضب کے باوجود ان سب کو نہیں بلکہ اکثر کو فاسق کہا ہے۔

آیت 60 ① قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ ......: یعنی تمھارے گمان میں ہم برے ہیں، اس لیے تم ہم پر عیب لگاتے ہو اور انتقام لینے کی کوشش کرتے ہو، لیکن ذرا اپنی تاریخ پر بھی غور کرو اور اپنے ان پہلوں کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی جرأت کرو جن کا انجام اللہ کے ہاں اس سے بھی کہیں بدتر ہوا اور ہونے والا ہے، جس کا تم ہمارے بارے میں دعویٰ کرتے ہو۔ یہ لوگ تمھارے ہی آباء و اجداد تھے جو دین کا مذاق اڑانے اور مختلف جرائم کے مرتکب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کے غضب میں مبتلا ہوئے، ان میں سے بہت سوں (اصحاب سبت) کی صورتیں مسخ کر کے انھیں بندر اور خنزیر بنا دیا گیا اور جو شیطان کی اطاعت میں اس حد تک نکل گئے کہ انھوں نے طاغوت کی عبادت شروع کر دی، جیسے سامری کا بنایا ہوا بچھڑا، جو دراصل شیطان ہی کی پوجا تھی۔

② اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ: یعنی تم ہمیں کتنا ہی گمراہ کہہ لو، لیکن یہ بات ماننے بغیر چارہ نہیں کہ تمھارے باپ دادا یقیناً گمراہ تھے اور ان کا انجام اللہ کے ہاں بہت برا ہو گا۔

آیت 61 ① وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ......: اس سے یہود کے وہ منافق مراد ہیں جو مدینہ اور اس کے قرب و جوار

وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا

اور تو ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور زیادتی اور اپنی حرام خوری میں دوڑ کر جاتے ہیں۔ یقیناً برا ہے جو وہ عمل کرتے تھے ﴿۶۲﴾ انھیں رب والے لوگ اور علماء ان کے جھوٹ کہنے اور ان کے حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے؟ یقیناً برا ہے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۶۳﴾ اور یہود نے کہا اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، ان کے ہاتھ باندھے گئے اور ان

میں رہتے تھے۔ (کبیر)

② وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ: یعنی ان کے دلوں میں مسلمانوں کے متعلق بہت زیادہ بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ ورنہ اگر وہ تمھارے پاس دل میں کفر لے کر نہ آئے ہوتے تو ان پر نبی ﷺ کی اور مسلمانوں کی مجلس کا کچھ اثر تو ضرور ہوتا اور کفر میں کچھ کمی ہوتی، مگر وہ نکلتے وقت بھی اتنا یا اس سے کچھ زیادہ ہی کفر لے کر واپس گئے، جتنا لے کر آئے تھے۔

آیت 63،62 لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ ...... : یعنی جس طرح گناہ کرنا جرم ہے اسی طرح گناہ سے نہ روکنا بھی جرم ہے۔ جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے: ”کوئی بھی شخص جو ایسی قوم میں ہو جن میں معاصی کا ارتکاب کیا جاتا ہو جو اسے روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر اسے نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ ان کے مرنے سے پہلے ان پر کوئی عذاب بھیجے گا۔“ [أبو داوٗد، الملاحم، باب الأمر والنهي: ۴۳۳۹، وحسنه الألباني] ان کے علماء اور مشائخ انھیں جھوٹ کہنے اور حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے، یقیناً ان کے علماء و مشائخ بھی جو کرتے چلے آئے ہیں بہت برا ہے کہ انھیں منع کرنے کے بجائے وہ خود بھی جھوٹ کہہ کر اسلام سے روکتے اور سحت (رشوت اور حرام) کھاتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۳۴)۔

آیت 64 ① وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ...... : اللہ تعالیٰ نے جب اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ان الفاظ میں دی کہ کون اللہ کو قرض حسنہ دیتا ہے؟ حالانکہ وہ مال اللہ تعالیٰ ہی کا تھا، اسی نے دیا تھا اور اسی کے دیے ہوئے میں سے انھوں نے دینا تھا، تو یہودی بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے انداز بیان اور اس کے فضل و کرم پر غور کرتے اور سمجھتے کہ اللہ ہمیں کئی گنا بڑھا کر دینے کے لیے صدقے کی ترغیب دے رہا ہے اور اسے قرض کہہ رہا ہے، کہنے لگے کہ اللہ تو فقیر ہے اور ہم غنی ہیں، تبھی وہ ہم سے قرض مانگتا ہے۔ یہ یہودیوں کی انتہائی خست اور کمینگی تھی، وہی کمینگی اس آیت میں دوسرے الفاظ میں ذکر کی گئی ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، یعنی وہ بخیل ہے، کچھ دیتا نہیں، بلکہ مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاتھ تو انھی کے بندھے ہوئے ہیں اور بخیلی انھی کی صفت ہے اور انھی گستاخیوں اور کمینگیوں کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہیں، وہ بے انتہا فضل و کرم کا مالک اور بے حد و حساب عطا فرمانے والا ہے، تمام خزانے اسی کے پاس ہیں، جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے، تمام مخلوق کی ہر حاجت اور ضرورت جو پڑتی یا پڑ سکتی

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾

پر لعنت کی گئی، اس کی وجہ سے جو انھوں نے کہا، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے، اور یقیناً جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو سرکشی اور کفر میں ضرور بڑھا دے گا، اور ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک دشمنی اور بغض ڈال دیا۔ جب کبھی وہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۶۴﴾

ہے، وہی پوری کرتا ہے، فرمایا: ﴿ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [إبراهيم : ٣٤] "اور اس نے تمھیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے، یقیناً انسان بڑا ظالم بہت ناشکرا ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا ہے، کسی طرح کا خرچ کرنا اسے کم نہیں کرتا۔ کیا تم نے دیکھا کہ اس نے جب سے آسمان و زمین پیدا کیے کس قدر خرچ کیا ہے؟ تو اس سے اس میں کچھ کمی نہیں ہوئی جو اس کے دائیں ہاتھ میں ہے۔" [بخاری، التوحید، باب : ﴿ وکان عرشه علی الماء ﴾ : ٧٤١٩] ایک حدیث میں فرمایا: "اللہ کے دونوں ہاتھ ہی دائیں ہیں۔" [مسلم، الإمارة، باب فضيلة الأمير العادل...... : ١٨٢٧]

❷ اس آیت اور دوسری بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ موجود ہیں۔ بعض لوگ اس کا ترجمہ قبضہ، قدرت وغیرہ کرتے ہیں اور ہاتھوں کا انکار کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اس کے ہاتھ مانیں تو وہ ہمارے جیسا ہو جائے گا، حالانکہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ ان لوگوں کی بات درست نہیں، کیونکہ یہ تو اس وقت ہوگا جب ہم کہیں کہ اس کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں جیسے ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ ہیں مگر ہمارے جیسے نہیں، بلکہ ایسے ہیں جیسے اس کی شان کے لائق ہیں تو اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی، جبکہ اس کے ہاتھوں کے انکار سے کئی احادیث اور قرآن کی آیات کا انکار لازم آتا ہے۔ اب ہم سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ بھی دیکھتا اور سنتا ہے تو کیا وہ ہمارے جیسا ہوگا؟ نہیں، بلکہ اس کا سننا اور دیکھنا ہماری طرح نہیں، بلکہ ایسا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ اسی طرح اللہ بھی موجود ہے ہم بھی موجود ہیں، تو کیا وہ بھی ہماری مثل ہو جائے گا؟ نتیجہ تو یہی نکلا کہ مشابہت ثابت ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ [إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ] نہیں، بلکہ وہ موجود ہے، سمیع و بصیر ہے، اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کا سمع و بصر اور اس کا وجود سب کچھ قرآن سے ثابت ہے اور ماننا لازم ہے، مگر وہ وجود اور سمع و بصر اور ہاتھ ہمارے یا کسی مخلوق جیسے نہیں، بلکہ ایسے ہیں جیسے اس کے لائق ہیں۔ اللہ کی ذات بھی بے مثل ہے، اس کی صفات بھی بے مثل ہیں۔ کئی ایسے بھی بے نصیب ہیں جو اسی

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾
وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ
فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر واقعی اہل کتاب ایمان لے آتے اور ڈرتے تو ہم ضرور ان سے ان کے گناہ دور کر دیتے اور انھیں ضرور نعمت کے باغوں میں داخل کرتے ﴿۶۵﴾ اور اگر وہ واقعی تورات اور انجیل کی پابندی کرتے اور اس کی جو ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے تو یقیناً وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ ان میں سے ایک جماعت درمیانے راستے والی ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ، برا ہے جو کر رہے ہیں ﴿۶۶﴾

شبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سننے، دیکھنے اور قیامت کے دن زمین پر آنے کا صاف انکار کر کے اپنے ڈھکوسلے سے بنایا ہوا کوئی معنی کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرمائے۔

③ وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا ...... : یعنی یہ لوگ اگر ہدایت کے طلب گار ہوتے تو آپ پر نازل ہونے والی ہر آیت و حدیث سے صحابہ کے ایمان کی طرح ان کے ایمان میں اضافہ اور ترقی ہوتی، مگر چونکہ ان کے دل بغض و عناد، ضد اور حسد سے بھرے ہوئے ہیں، اس لیے تیرے رب کی طرف سے جو کچھ بھی تجھ پر نازل ہوگا وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کی سرکشی اور کفر ہی میں اضافہ کرے گا، اسی کا نتیجہ تھا کہ جیسے جیسے قرآن اترتا ان کی سرکشی اور کفر بڑھتا جاتا۔

④ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ ...... : یعنی ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان باہمی عداوت اور بغض اس حد تک پہنچ گیا کہ وہ قیامت تک آپس میں ایک نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ بہت سے فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اسی لعنت کا اثر ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی کی کوششوں کے بجائے وہ دنیا میں کہیں نہ کہیں لڑائی کی آگ بھڑکائے رکھتے ہیں، مگر وہ جب بھی یہ آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے۔ ان کی ساری تگ و دو دنیا میں فساد پھیلانے کی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتا۔ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے موجودہ حالات جاننے والا ہر شخص جانتا ہے کہ کس طرح ہر لڑائی کے پیچھے یہودیوں کا خفیہ ہاتھ ہوتا ہے، یہ تو اللہ کا فضل ہے کہ وہ ان کے منصوبے پورے نہیں ہونے دیتا۔ افسوس! اب مسلمانوں کے اکثر علماء و عوام کا بھی تقریباً یہی حال ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین پر عمل چھوڑ رکھا ہے، بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے اسلام کے کسی نہ کسی حکم سے انکار یا اس کی گستاخی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ یہودیانہ خصلت ہے جس کی وجہ سے مسلمان ملکوں کے مالک ہو کر بھی کفار کے محکوم ہیں اور ان برکات سے محروم ہیں جو کتاب و سنت پر عمل کرنے اور برائیوں کو روکنے کے لیے جہاد کرنے کی صورت میں انھیں حاصل ہوتیں۔

آیت 66 ① وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ: تورات و انجیل کی پابندی کرنے کا مطلب دوسرے احکام و حدود کی پابندی کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بھی ہے، کیونکہ دونوں کتابوں میں اس کا حکم موجود ہے۔ " وَ مَاۤ اُنْزِلَ

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۶۷﴾

اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔ بے شک اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۶۷﴾

اِلَیْهِمْ " سے مراد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن اور آپ کی سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اہل کتاب میں سے ہو، اپنے نبی پر ایمان لایا ہو اور پھر محمد ﷺ پر بھی ایمان لائے تو اس کے لیے دگنا ثواب ہے۔'' [بخاری، العلم، باب تعلیم الرجل أمته و أهله : ۹۷]

② لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ : یعنی آسمان بابرکت بارشیں برساتا، زمین سے کھیتی اور دوسرے خزانوں کی فراوانی ہو جاتی اور انھیں روزی کمانے کے سلسلے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا، جیسا کہ سورۂ اعراف میں صرف اہل کتاب ہی نہیں ہر قوم اور آبادی کے لیے ایمان اور تقویٰ کی صورت میں یہی بشارت دی گئی ہے، فرمایا: ﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف : ۹۶] ''اور اگر واقعی بستیوں والے ایمان لے آتے اور بچ کر چلتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے بہت سی برکتیں کھول دیتے۔'' اب مسلمان بھی اگر یہ نعمت حاصل کرنا چاہیں تو اس کا طریقہ ایمان اور تقویٰ ہے، کفار سے بھیک مانگنا اور ان کے کفریہ طریقے اختیار کرنا نہیں۔

③ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ: یعنی افراط و تفریط (زیادتی اور کمی) سے بچ کر درمیانے راستے پر چلنے والے ہیں۔ ان سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی۔

④ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا یَعْمَلُوْنَ: اس سے مراد بقیہ یہودی ہیں جو ایمان نہیں لائے۔

آیت 67 ① وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ: یعنی اللہ تعالیٰ کے پیغام میں سے اگر کچھ بھی چھپا لیا، یا پہنچانے میں سستی کی تو گویا سرے سے اس کا پیغام پہنچایا ہی نہیں، خصوصاً یہود و نصاریٰ سے متعلق اعلانات۔ اس آیت میں ان لوگوں کی تردید ہے جو نبی ﷺ کے متعلق کہتے ہیں کہ آپ نے قرآن کی بعض آیات مسلمانوں تک نہیں پہنچائیں، بلکہ صرف علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کو بتائیں۔ خود علی رضی اللہ عنہ نے ان کے اس باطل عقیدے کی تردید فرمائی، چنانچہ ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''کیا آپ (اہل بیت) کے پاس کوئی اور کتاب ہے؟'' تو انھوں نے فرمایا: ''نہیں، مگر اللہ کی کتاب یا کتاب اللہ کی وہ سمجھ ہے جو کسی مسلمان آدمی کو عطا کی جائے، یا جو اس صحیفے میں ہے۔'' میں نے پوچھا: اس صحیفے میں کیا ہے؟'' فرمایا: ''دیت اور قیدیوں کو چھڑانے سے متعلق احادیث اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے۔'' [بخاری، العلم، باب کتابة العلم : ۱۱۱] عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جو شخص یہ کہے کہ محمد ﷺ نے اس میں سے کوئی چیز چھپا لی تھی جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائی تو یقیناً اس نے جھوٹ بولا،

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

کہہ دے اے اہل کتاب! تم کسی چیز پر نہیں ہو، یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو قائم کرو اور اس کو جو تمھارے

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ''اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب: ﴿ يأيها الرسول بلغ ما أنزل إليك من ربك ﴾ : ٤٦١٢]

جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حجۃ الوداع کے دن) اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو کیا جواب دو گے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہم سب یہ گواہی دیں گے کہ بے شک آپ نے پیغام رسالت کو پہنچا دیا اور (پہنچانے کا) حق ادا کر دیا اور یہ کہ آپ نے خیر خواہی فرمائی۔'' اس پر آپ نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور صحابہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! تو گواہ ہو جا، اے اللہ! تو گواہ ہو جا۔'' [مسلم، الحج، باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم : ١٢١٨۔ بخاری : ١٧٤١]

2 وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ : اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص حفاظت میں لے لیا اور فرمایا کہ تم میرا پیغام پہنچاؤ، میں خود تمھیں لوگوں سے بچاؤں گا۔ اس آیت کے اترنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہرا دیا جاتا تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو نہیں رہے تھے، میں بھی آپ کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی، میں نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''کاش! کوئی نیک آدمی میرا پہرا دیتا۔'' تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ میں نے ہتھیاروں کی جھنکار سنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کون ہے؟'' آنے والے نے کہا: ''سعد بن ابی وقاص ہوں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیسے آنا ہوا؟'' انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں آیا ہوں کہ (آج رات) آپ کا پہرا دوں۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام سے سو گئے، حتیٰ کہ میں نے آپ کے خراٹوں کی آواز سنی۔'' [بخاری، الجہاد والسیر، باب الحراسة فی الغزو فی سبیل اللہ : ٢٨٨٥۔ مسلم : ٢٤١٠]

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پہرے کا انتظام کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب یہ آیت اتری: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ تو آپ نے خیمے سے سر نکال کر فرمایا: ''لوگو! تم چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ مجھے (دشمن سے) بچائے گا۔'' [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة المائدة : ٣٠٤٦] اس کی ایک مثال وہ اعرابی بھی ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتے ہوئے آپ کی تلوار پکڑ کر کہا تھا کہ تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے فرمایا: ''اللہ!''

3 اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ کفار کو ان کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ (کبیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی اگرچہ وہ دشمن ہوں تم بے فکر یہ پیغام پہنچاؤ اور خطرہ نہ کرو۔ (موضح) یا مطلب یہ ہے کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو فکر نہ کرو۔ (ابن کثیر)

آیت 68 1 قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ ...... : تورات و انجیل قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان میں جو عہد ان

مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ وَ لَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ مَّاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ طُغۡيَانًا وَّ كُفۡرًا ۚ فَلَا تَاۡسَ عَلَى
الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۶۸﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا وَ الصّٰبِـُٔوۡنَ وَ النَّصٰرٰى مَنۡ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۹﴾

رب کی جانب سے تمھاری طرف نازل کیا گیا اور یقیناً جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو سرکشی اور کفر میں ضرور بڑھا دے گا، سو تو کافر لوگوں پر غم نہ کر ﴿۶۸﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصاریٰ، جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۶۹﴾

سے لیے گئے ان کو پورا کریں اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر ایمان لانے کے جو دلائل ان کتابوں میں موجود ہیں ان کے مطابق آپ کی نبوت کا اقرار کریں اور تورات وانجیل کے احکام وحدود پر عمل پیرا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پورے طور پر ان کتابوں پر عمل نہیں کرو گے تو نہ تمھاری کوئی حیثیت اور نہ تمھاری کوئی دین داری۔ (ابن کثیر) یہی بات مسلمانوں پر صادق آتی ہے کہ اگر وہ قرآن پر پوری طرح عمل نہیں کریں گے تو نہ ان کی کچھ حیثیت ہوگی نہ کوئی دین داری۔

② وَلَيَزِيۡدَنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ: دیکھیے اسی سورت کی آیت (۶۴) کا حاشیہ (۳)۔

③ فَلَا تَاۡسَ عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ: اس لیے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے اپنے آپ ہی کو نقصان پہنچا رہے ہیں اور اس کا وبال خود بھگت کر رہیں گے۔

آیت 69 ① اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا...... : اوپر کی آیات میں بتایا کہ اہل کتاب جب تک ایمان لا کر عمل صالح نہ کریں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس میں فرمایا کہ صرف اہل کتاب ہی نہیں سب مسلم و غیر مسلم لوگوں کا یہی حکم ہے۔

② اس آیت میں لفظ "الصَّابِـُٔوۡنَ" بظاہر تو منصوب ہونا چاہیے تھا مگر سیبویہ اور خلیل نے لکھا ہے کہ یہ "مَرۡفُوۡعٌ بِالۡاِبۡتِدَاءِ عَلٰى نِيَّةِ التَّاۡخِيۡرِ" ہے، یعنی یہ لفظ "الصَّابِـُٔوۡنَ" اصل میں "وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ" کے بعد ہونے کی نیت سے مبتدا ہے اور اس کی خبر "كَذٰلِكَ" ہے، یعنی "الصَّابِـُٔوۡنَ" کا بھی یہی حکم ہے۔ اس کے مرفوع لانے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ دراصل یہ سب فرقوں سے زیادہ گمراہ فرقہ ہے۔ اس لیے ان کا علیحدہ بیان ہوا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان فرقوں میں سے جو بھی ایمان لا کر عمل صالح کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، حتیٰ کہ اگر صابی بھی ایمان لے آئیں تو ان کو بھی یہ رعایت مل سکتی ہے۔ (کبیر) "الصَّابِـِٔيۡنَ" کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۶۲) کے حواشی۔ آپ ﷺ کے مبعوث ہونے کے بعد آپ پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، گویا اس آیت میں "اٰمَنَ بِاللّٰهِ" سے مراد مسلمان ہونا ہے، یا یہ کہ اپنے اپنے زمانے میں ان میں جو بھی آسمانی دین تھا اس پر ایمان لا کر عمل کرنے والے مراد ہیں، مگر رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۞ وَ حَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۞

بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لے کر آیا جسے ان کے دل نہیں چاہتے تھے تو انھوں نے ایک گروہ کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے ﴿٧٠﴾ اور انھوں نے سمجھا کہ کوئی فتنہ واقع نہ ہوگا تو وہ اندھے ہو گئے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ ان پر مہربان ہو گیا، پھر ان میں بہت سے اندھے ہو گئے اور بہرے ہو گئے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں ﴿٧١﴾

کوئی شخص کتنا بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اگر آپ ﷺ کی آمد سے مطلع ہونے کے باوجود کلمہ نہیں پڑھتا تو وہ جہنمی ہے۔ ”اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا“ سے مراد یا تو وہ لوگ ہیں جو صرف زبان سے ایمان لائے دل سے نہیں، یعنی منافق، ان میں سے جو دل سے ایمان لا کر عمل صالح کرے گا، یا سب مسلمان مراد ہیں کہ اگر وہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کریں گے تو خوف اور حزن سے بچیں گے۔ صرف کلمہ پڑھ لینا کافی نہیں، عمل صالح بھی ضروری ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (٦٢)۔

آیت 70 لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ……: اس سے مقصود بنی اسرائیل کی سرکشی اور وعدہ پورا نہ کرنے کا بیان ہے، گویا اس کا تعلق ابتدائے سورت ” اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ “ سے ہے، یعنی ہم نے ان سے عہد لیا کہ توحید و شریعت پر قائم رہیں گے اور جو رسول ان کی طرف بھیجے جائیں گے ان کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔ اس میثاق کا ذکر اس سورت کی آیت (١٢) اور سورۂ بقرہ کی آیت (٨٣ تا ٨٥) میں ہے۔

آیت 71 ① وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: ”فِتْنَةٌ“ کے اصل معنی آزمائش کے ہیں، مطلب یہ کہ انھوں نے سمجھا کہ ہم کیسے ہی گناہ کر لیں، خواہ انبیاء تک کو قتل کریں، چونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں، اس لیے دنیا میں کسی قسم کی بدبختی و نحوست یا غلبۂ دشمن قسم کی کوئی بلا ہم پر نازل نہیں ہوگی۔ (کبیر)

② فَعَمُوْا وَصَمُّوْا: مگر حق سے اندھے اور بہرے ہونے کی وجہ سے ان پر بلا نازل ہوئی۔ پہلی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ان پر مسلط کر دیا جس نے ان کی مسجد اقصیٰ کو جلا ڈالا، ان کے اموال لوٹے اور ان کی اکثریت کو لونڈی و غلام بنا کر بابل لے گیا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (٤ تا ٨)۔

③ ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں بخت نصر کی غلامی سے نجات دی اور انھوں نے اپنی حالت سدھاری اور کچھ عرصہ کے لیے ٹھیک رہے۔

④ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ……: یعنی پھر دوبارہ پہلے جیسی سرکشی پر اتر آئے، یہاں تک کہ انھوں نے زکریا اور

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا بے شک اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو، جو میرا رب اور تمھارا رب ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۷۲﴾

یحییٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کو قتل کر ڈالا اور عیسیٰ علیہ السلام سے انتہائی توہین آمیز سلوک کیا، بلکہ انھیں بھی قتل کرنے کے درپے ہوئے۔ بعض نے گمراہی کے پہلے دور کو زکریا اور یحییٰ علیہ السلام کے زمانے کے ساتھ خاص کیا ہے اور دوسرے دور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ اور یہاں "كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ" میں اشارہ ہے کہ ان میں سے بعض حق پرست مسلمان ہو گئے تھے، جیسے عبد اللہ ابن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقا۔ اور ہو سکتا ہے کہ ﴿ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ ﴾ [بنی إسرائیل : ٤] (بے شک تم زمین میں ضرور دو بار فساد کرو گے) سے ان دونوں ادوار کی طرف اشارہ ہو۔ (کبیر) ﴿ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴾ اس سے مقصود انھیں اللہ اور اس کے عذاب سے ڈرانا ہے۔

آیت 72 ① لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۷)۔ یہود کے بعد اب نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان اور انھیں سزا سے ڈرانے کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ (کبیر) ان لوگوں سے نصرانیوں کا وہ فرقہ مراد ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم ہی تو ہے۔ اللہ اور مسیح علیہ السلام کو ایک کہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت تاکیدی الفاظ "لَقَدْ" (بلاشبہ، یقیناً) کے ساتھ کافر قرار دیا۔ مسلمان کہلانے والوں میں بھی کئی لوگ یہ کہنے والے ہیں کہ ''احد'' اور ''احمد'' میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہیں، اللہ تعالیٰ بشری جامہ پہن کر آ گیا، پھر کئی اپنے بزرگوں کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ عبادت کرتے کرتے اللہ میں فنا ہو کر ایک ہو گئے اور بعض ان کے متعلق کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان میں اتر آیا۔ پہلا عقیدہ اتحاد اور دوسرا حلول کہلاتا ہے۔ اگر مسیح کو عین اللہ تعالیٰ، یعنی مسیح علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کو ایک کہنے والے کافر ہیں تو یہ نام نہاد مسلمان کیوں کافر نہیں؟ معلوم ہوا حلول اور اتحاد کا عقیدہ واضح کفر ہے، جسے بعض ملحد لوگوں نے تصوف کے پردے میں معرفت قرار دے رکھا ہے۔

② وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ : حالانکہ مسیح علیہ السلام نے اپنے آپ کو ہمیشہ اللہ کا بندہ کہا، جب پیدا ہوئے تو دنیا میں آنے کے بعد بچپن ہی میں ان کی زبان سے یہی نکلا: ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ [مریم : ۳۰] ''یقیناً میں اللہ کا بندہ ہوں۔'' اور لوگوں کو بھی اسی وقت فرمایا: ﴿ وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ﴾ [مریم : ٣٦] ''یقیناً اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے،

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ‌ۘ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهُوۡا عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوۡبُوۡنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَهٗ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۷۴﴾

بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا بے شک اللہ تین میں سے تیسرا ہے، حالانکہ کوئی بھی معبود نہیں مگر ایک معبود، اور اگر وہ اس سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو یقیناً ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں ضرور دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۷۳﴾ تو کیا وہ اللہ کی طرف توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے، اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۷۴﴾

سوا اسی کی عبادت کرو۔'' جوانی میں بھی یہی فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيۡ وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ﴾ [الزخرف : ٦٤] ''بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمھارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو۔'' نیز مسیح علیہ السلام کا یہ قول آج بھی انجیل یوحنا، باب (۷) میں موجود ہے: ''یہی ہمیشہ رہنے والی زندگی ہے کہ وہ تجھ حقیقی اِلٰہ کو اور اس یسوع مسیح کو پہچانیں جسے تو نے رسول بنا کر بھیجا۔'' (المنار)

❸ اِنَّهٗ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ …… : یعنی اتحاد، حلول یا شرک کی کسی قسم کا عقیدہ و عمل رکھنے والوں پر جنت حرام اور جہنم واجب ہے۔ ''مِنۡ اَنۡصَارٍ '' میں '' اَنۡصَارٍ '' جمع اس لیے لائے ہیں کہ مشرک لوگوں نے کئی ہستیوں کے متعلق گمان کر رکھا ہے کہ وہ ہمیں جہنم سے بچا لیں گی۔

آیت 73 ❶ لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ …… : یعنی اللہ تعالیٰ کو تین میں سے تیسرا قرار دینے والے بھی کافر ہو گئے، جبکہ معبود تو ایک ہی ہے، اب خواہ وہ تین اقانیم، باپ، بیٹا اور روح القدس کو الگ الگ خدا قرار دیں یا کہیں کہ یہ تین الگ الگ نہیں بلکہ مل کر ایک ہی خدا ہیں، بہر حال یہ عقیدہ رکھنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے کافر قرار دیا۔ پھر نیکی کا لبادہ اوڑھ کر شرک پھیلانے والے وہ ظالم جو یہ کہیں کہ ہر چیز ہی خدا ہے اور اسے وحدت الوجود کا نام یا کوئی اور نام دیں، ان کے کافر ہونے میں بھی کیا شک ہے، بلکہ اس عقیدے سے تو قرآن و سنت اور اسلام کی ہر بات اور ہر حکم ہی باطل ٹھہرتا ہے کہ حکم دینے والا بھی وہی ہے اور جسے حکم دیا گیا وہ بھی وہی ہے، جنت و دوزخ بھی اور ان میں جانے والے بھی سب ایک ہی ہیں۔ غرض یہ عقیدہ اسلام کی جڑ اکھاڑ دینے کے لیے بنایا گیا ہے، پھر کیسی توحید اور کہاں کی نماز، غرض سب کچھ ایک ہے تو دین کی کون سی چیز باقی رہے گی۔

❷ وَاِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهُوۡا …… : یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کو تین میں سے تیسرا قرار دینے سے باز نہ آئیں اور خالص توحید اختیار نہ کریں، جس کی طرف انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے۔

آیت 74 اَفَلَا يَتُوۡبُوۡنَ اِلَى اللّٰهِ …… : یہ بظاہر سوال ہے مگر اصل میں امر (حکم دینے) کی ایک صورت ہے۔ (کبیر)

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، یقیناً اس سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے اور اس کی ماں صدیقہ ہے، دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔ دیکھ ان کے لیے ہم کس طرح کھول کر آیات بیان کرتے ہیں، پھر دیکھ کس طرح پھیرے جاتے ہیں ﴿٧٥﴾ کہہ دے کیا تم اللہ کے سوا اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمھارے لیے نہ کسی نقصان کی مالک ہے اور نہ نفع کی، اور اللہ ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿٧٦﴾

یعنی ان کا یہ جرم انتہائی سنگین اور صریحاً شرک کی حد تک پہنچا ہوا ہے، تاہم اگر توبہ کر لیں تو ان کا یہ قصور معاف ہو سکتا ہے۔

آیت 75 ① مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ...... : مسیح علیہ السلام ایک رسول کے سوا کچھ نہیں، یعنی تم جو کچھ کہتے ہو خدا یا خدا کا بیٹا، وہ ہرگز نہیں، وہ تو صرف اللہ کا رسول ہے۔ اسے قصر اضافی کہتے ہیں۔ اس میں یہود کی تردید بھی ہو گئی جو معاذ اللہ مریم اور مسیح علیہما السلام کے متعلق گستاخی کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔

② وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ : یعنی بندگی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھیں، جو نبوت کے بعد دوسرا درجہ ہے، یعنی نہایت سچی اور اللہ اور اس کے رسولوں کی بہت تصدیق کرنے والی تھیں۔ دیکھیے سورۂ تحریم (۱۲) اور سورۂ نساء (۶۹) وہ نبی نہیں تھیں، جیسا کہ ابن حزم وغیرہ کا خیال ہے، کیونکہ انبیاء رجال (مردوں) ہی سے ہوئے ہیں۔ دیکھیے یوسف (۱۰۹)، نحل (۴۳) اور انبیاء (۷) ابوالحسن اشعری نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ (ابن کثیر) بھلا ایک عورت، خواہ کتنی شان والی ہو، تین خداؤں میں سے ایک بن گئی؟

③ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ : یعنی وہ دونوں عام انسانوں جیسے انسان تھے، ان میں وہ تمام بشری خصوصیتیں اور ضروریات پائی جاتی تھیں جو دوسرے انسانوں میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کلام نہایت ہی نفیس اور بلیغ ہے۔ کھانا کھانے کا لازمی نتیجہ قضائے حاجت ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا، صرف یہ کہہ دیا کہ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ اب کھانا کھانے سے جتنی چیزوں کا انسان محتاج ہوتا ہے ان کے ہوتے ہوئے اسے خدا یا اس کی بیوی یا اس کا بیٹا قرار دینا کتنی بڑی جہالت اور ظلم ہے۔ جو خود محتاج ہو وہ دوسروں کی حاجت کیا پوری کرے گا!؟

④ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ...... : یعنی توحید کے اتنے صاف بیان اور تثلیث کی اتنی واضح تردید کے باوجود وہ اپنے گروہی تعصب کی بنا پر اپنے غلط عقیدے سے چمٹے رہیں تو چمٹے رہیں، ورنہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل ان کے پاس نہیں ہے جس کے بودے پن کو ''دو اور دو چار'' کی طرح واضح نہ کر دیا گیا ہو۔ (ابن کثیر)

آیت 76 قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ...... : یہ نصاریٰ کے عقیدے کی تردید پر دوسری دلیل ہے، مطلب یہ ہے کہ

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

کہہ دے اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھو اور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے ﴿۷۷﴾

جن کی تم عبادت کرتے ہو ان میں الوہیت (معبود ہونے) کا کوئی وصف بھی نہیں ہے، ان کا دوسروں کو نفع پہنچانا یا نقصان سے بچانا تو کجا وہ تو خود اپنے سے دشمنوں کے ظلم کو دفع کرنے کے لیے اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ! مجھ سے مصیبت کا یہ وقت ٹال دے۔ پھر اس کے بعد اگر اس سمیع و علیم کو چھوڑ کر عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا معبود بناؤ تو اس سے بڑھ کر جہالت اور کیا ہوگی۔

آیت 77 ① قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ......: یہود و نصاریٰ کی الگ الگ تردید کے بعد اب دونوں کو مخاطب فرمایا ہے۔ (کبیر) نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے معاملہ میں غلو کیا اور ایک بشر جسے اللہ تعالیٰ نے نبوت بخشی تھی اور اسے اپنی قدرت کاملہ کی نشانی قرار دیا تھا (دیکھیے زخرف: ۵۹۔ مومنون: ۵۰) اسے معبود کے مقام پر کھڑا کر دیا۔ دوسری طرف یہودیوں نے انھیں جھوٹا قرار دیا، ان سے انتہائی توہین آمیز سلوک کیا، ان پر اور ان کی والدہ پر تہمت طرازی کی اور ان کے قتل کے درپے ہوئے، بلکہ بقول یہود و نصاریٰ یہود نے مسیح علیہ السلام کو سولی دے دی اور ان کی پسلیوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ (کبیر، ابن کثیر) حقیقت یہ ہے کہ دین میں جو بھی خرابی آئی ہے وہ اسی غلو (راہ اعتدال کو چھوڑنے) کی وجہ سے آئی ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بار بار نصیحت فرمائی: "مجھے اس طرح حد سے نہ بڑھانا جس طرح نصاریٰ نے مسیح ابن مریم (علیہما السلام) کو حد سے بڑھا دیا تھا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، اس لیے تم مجھے اس کا بندہ اور رسول ہی کہو۔" [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب: ﴿ واذکر فی الکتاب مریم ...... ﴾ : ۳۴۴۵] مگر مسلمانوں نے بھی اس قدر غلو کیا کہ اپنے ائمہ کو نبی کا درجہ دے کر ان کی بے دلیل بات پر عمل کو بھی واجب قرار دیا اور جو ایسا نہ کرے اسے لامذہب قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ تعالیٰ والی صفات ہونے کا عقیدہ اپنا لیا کہ وہ بھی ہر بات سنتے اور جانتے ہیں اور کائنات میں ان کا حکم بھی چلتا ہے۔ بعض نے اللہ اور رسول کو ایک ہی ذات قرار دیا، اگر کوئی ان کی تردید کرے تو کہتے ہیں کہ یہ اولیاء کو، نبی کو اور اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے، حالانکہ ہم اللہ کو اپنا معبود اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رسول اور اولیاء کو اللہ کے مقرب بندے مانتے ہیں، مگر اولیاء کو نبی نہیں مانتے اور رسول کو اللہ تعالیٰ نہیں مانتے۔

② قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ ......: پہلے فرمایا: ﴿ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ ﴾ (اس سے پہلے گمراہ ہو چکے) آخر میں پھر فرمایا: ﴿ وَ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ (اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے) گو یہ دونوں جملے بظاہر ایک ہی ہیں، مگر علماء نے لکھا ہے کہ اول سے مراد یہ ہے کہ وہ گمراہ ہوئے اور دوسرے "ضَلُّوْا" سے مراد یہ ہے کہ وہ اب تک اس گمراہی پر جمے ہوئے ہیں اور یہ بھی

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۷۸ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۹

وہ لوگ جنھوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، ان پر داؤد اور مسیح ابن مریم کی زبان پر لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے ﴿۷۸﴾ وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے، جو انھوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے، بے شک برا ہے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۷۹﴾

ہوسکتا ہے کہ پہلی گمراہی سے مراد عقیدہ کی گمراہی اور دوسری سے مراد عمل کی گمراہی ہو۔ یعنی اپنے سے پہلے لوگوں کے پیچھے مت چلو جنھوں نے کسی نبی (مثلاً عزیر یا عیسیٰ علیہما السلام) کو الٰہ بنایا، کسی نبی (مثلاً داؤد، مسیح، ان کی والدہ اور لوط علیہم السلام) پر زنا وغیرہ کی تہمتیں لگائیں اور کسی کو قتل کر دیا، ان کاموں کے ساتھ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور آخر وقت تک سیدھے راستے پر نہیں آئے۔ ''ان کے پیچھے مت چلو'' سے معلوم ہوا کہ یہ گمراہیاں ان میں پہلے لوگوں کی تقلید کی وجہ سے آئی تھیں، تم یہ کام مت کرنا۔

آیت 78 لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ...... : اسرائیلیوں کا یہ کفر اپنے اپنے پیغمبروں کے مقابلے میں تھا، چنانچہ داؤد علیہ السلام کے زمانے میں انھوں نے قانون ''سبت'' کو توڑا اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی نبوت سے انکار کر دیا۔ داؤد علیہ السلام کی زبانی لعنت کے لیے دیکھیے زبور (۷۸ : ۲۱، ۲۲، ۲۳) اور مسیح علیہ السلام کی زبانی لعنت کے لیے دیکھیے انجیل متی (۲۳ : ۳۱، ۳۲) لعنت کا معنی اللہ کی رحمت اور بھلائی سے دوری ہے۔

آیت 78 كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ ...... : ''لَا يَتَنَاهَوْنَ'' باب تفاعل سے ہے، اس کا معنی باز آنا بھی ہے اور ایک دوسرے کو منع کرنا بھی۔ یہاں پچھلی آیت میں مذکور ان کی نافرمانی اور حد سے گزرنے کی تفسیر ہے کہ ایک تو وہ جب کوئی برا کام کرتے اس پر ڈٹ جاتے، باز ہی نہیں آتے تھے، یعنی گناہ پر ندامت کے بجائے اس پر اصرار کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے منع نہیں کرتے تھے، ان کے نیک لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اگر کچھ لوگ برے کام کر رہے ہیں تو کرتے رہیں، ان کا وبال خود ان پر ہوگا، ہم تو اپنی جگہ نیک ہیں، حالانکہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو اور دل سے نفرت بھی نہ ہو تو ایمان کا آخری درجہ، یعنی کمزور ترین ایمان بھی نہیں رہتا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل دے، اگر یہ طاقت نہ رکھے تو اپنی زبان کے ساتھ، اگر یہ بھی نہ ہو تو دل کے ساتھ اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔'' [مسلم، الإیمان، باب کون النهی عن المنکر عن الإیمان...... : ۴۹]

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے، یا پھر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنے ہاں سے عذاب بھیج دے، پھر تم اس سے دعا کرو گے تو وہ تمھاری دعا قبول نہیں کرے گا۔'' [أحمد : ۵/ ۳۸۸، ح : ۲۳۳۶۳۔ ترمذی : ۲۱۶۹، وحسنه الترمذی والألبانی]

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا

تو ان میں سے بہت سوں کو دیکھے گا وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جنھوں نے کفر کیا۔ یقیناً برا ہے جو ان کے نفسوں نے ان کے لیے آگے بھیجا کہ اللہ ان پر غصے ہوگیا اور عذاب ہی میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۸۰﴾ اور اگر وہ اللہ اور نبی پر اور اس پر ایمان رکھتے ہوتے جو اس کی طرف نازل کیا گیا ہے تو انھیں دوست نہ بناتے اور لیکن ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں ﴿۸۱﴾ یقیناً تو ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، سب لوگوں سے زیادہ سخت عداوت

آیت 80 ① تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ ...... : یعنی ان کے پہلے لوگوں کی وہ حالت تھی اور اب جو موجود ہیں ان کی یہ حالت ہے۔ (کبیر) جیسے کعب بن اشرف اور مدینہ کے یہودی قبائل کے دوسرے افراد، جو مسلمانوں کی دشمنی میں مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین سے دوستی رکھتے تھے۔

② لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ ...... : یعنی کفار (مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ) سے دوستی قائم کر کے اہل کتاب نے مسلمانوں کے خلاف جو تیاری کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں ان پر اللہ کا غضب ہوا اور آخرت میں بھی وہ دائمی عذاب کے مستحق قرار پائے۔

آیت 81 وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ...... : یعنی اگر وہ واقعی اللہ تعالیٰ پر اور اپنے نبی (موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام) پر اور ان پر نازل شدہ کتاب (تورات و انجیل) پر ایمان رکھتے تو کبھی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی قائم نہ کرتے، کیونکہ تورات میں اس کام کو حرام کہا گیا ہے، یا یہ کہ اگر وہ کفار صدق دل سے ایمان لائے ہوتے، نفاق کے مریض نہ ہوتے تو پھر یہ کبھی ان سے دوستی پیدا نہ کرتے۔

آیت 82 ① لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً ...... : اس لیے کہ یہودیوں میں عناد و انکار، حق سے دشمنی، تکبر اور اہل علم و ایمان کی تنقیص کا جذبہ بہت پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نبیوں کو جھٹلانا بلکہ قتل کر دینا ان کا شعار رہا ہے، حتیٰ کہ انھوں نے کئی مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی، آپ پر جادو بھی کیا اور ہر طرح نقصان پہنچانے کی مذموم کوشش کی۔ اس معاملے میں مشرکین کا حال بھی یہی ہے۔ یہ واقعی ایک حقیقت ہے جس کا اس زمانے میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، آج بھی جو دشمنی یہودیوں اور مشرکوں (گائے اور بتوں کے پجاری ہندوؤں، دہریوں اور کمیونسٹوں) کو مسلمانوں سے ہے وہ بہرحال نصرانیوں کو نہیں ہے، ہاں جن نصرانیوں پر یہودیت غالب ہے وہ واقعی مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔

② ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ ...... : یہود و نصاریٰ کی مسلم دشمنی میں جو فرق مذکور ہوا یہ اس کی علت ہے، جس طرح یہود کے عالم کو حبر کہا جاتا ہے، جس کی جمع احبار ہے، اسی طرح نصاریٰ کے رئیس اور عالم قسیس کہلاتے ہیں، یعنی جن لوگوں نے کہا

الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

رکھنے والے یہود کو اور ان لوگوں کو پائے گا جنھوں نے شریک بنائے ہیں اور یقیناً تو ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، ان میں سے دوستی میں سب سے قریب ان کو پائے گا جنھوں نے کہا بے شک ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ بے شک ان میں علماء اور راہب ہیں اور اس لیے کہ بے شک وہ تکبر نہیں کرتے ﴿۸۲﴾

کہ ہم نصاریٰ ہیں، جو واقعی عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ مسلمانوں کے نسبتاً قریب ہیں، کیونکہ ان میں علم اور زہد یعنی دنیا سے بے رغبتی پائی جاتی ہے اور دین مسیحی میں نرمی اور عفو و درگزر کی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پھر ان میں علماء، عبادت گزار اور زاہد لوگ بھی ہوتے ہیں، جو تواضع اختیار کرتے ہیں، یہودیوں کی طرح کبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتے۔ نصرانیوں میں رہبانیت (دنیا سے کنارہ کشی) کی بدعت رائج تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا، فرمایا: ﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ [الحدید : ٢٧] ''اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔'' رہبانیت بے شک یہودیوں کی دنیا پرستی اور سخت دلی کے مقابلے میں قابل تعریف تھی، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رہبانیت ہر لحاظ سے قابل تعریف اور اچھی چیز ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر یہود اور مشرکین کی نسبت نصرانیوں کو مسلمانوں کے زیادہ قریب قرار دیا۔ ورنہ جہاں تک خود اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کا تعلق ہے تو بغض و عناد نصرانیوں میں بھی موجود ہے، جیسا کہ صلیب و ہلال کی صدیوں پر محیط لڑائیوں سے واضح ہے اور جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور اب تو اسلام کے خلاف مشرکین کے ساتھ یہودی اور نصرانی دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں، اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو مشرکین کے ساتھ ساتھ یہود و نصاریٰ کی دوستی سے بھی منع فرمایا ہے۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب وہ سنتے ہیں جو رسول کی طرف نازل کیا گیا ہے تو تو دیکھتا ہے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی ہوتی ہیں، اس وجہ سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، سو ہمیں شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ لے ﴿۸۳﴾

آیت 83 ① وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ ...... : مفسرین کے بیان کے مطابق ان سے مراد نصاریٰ کے وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے، سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو میں نے کھانا تیار کیا اور اسے لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سلمان! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''صدقہ ہے۔'' تو آپ نے اپنے اصحاب سے کہا کھاؤ اور خود نہیں کھایا۔ چنانچہ میں واپس آ گیا، پھر کچھ کھانا اکٹھا کیا اور اسے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے فرمایا: ''سلمان! یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''ہدیہ ہے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا اور کھایا اور (ساتھ ہی) اپنے ساتھیوں سے بھی فرمایا کہ کھاؤ۔ میں نے کہا: ''آپ مجھے نصاریٰ کے متعلق بتائیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان میں کوئی خیر نہیں ہے۔'' میں بوجھل دل کے ساتھ اٹھ آیا، تو اللہ عزوجل نے یہ آیات نازل کیں: ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ ...... تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ﴾ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف پیغام بھیجا اور مجھے فرمایا: سلمان! یہ (آنسوؤں والے) تیرے وہ ساتھی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔'' [المعجم الكبير : ٦/ ٤٩، ح : ٦١٢١] سلیم الہلالی اور ان کے ساتھی نے اس حدیث کو کتاب ''الاستیعاب فی بیان الاسباب'' میں صحیح کہا ہے۔

ان لوگوں میں نجاشی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی بھی شامل ہیں کہ جب مکہ میں مسلمان ہونے والے صحابہ ہجرت کر کے نجاشی کے ملک حبشہ میں گئے اور انھیں کفار مکہ کے سفیروں کی شکایت پر بادشاہ کے دربار میں بلایا گیا تو جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کے سامنے تقریر کی اور اس میں سورۂ مریم کی تلاوت کی، جس میں مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا ذکر ہے، تو نجاشی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور نجاشی (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہو گئے، اگرچہ وہ مدینہ نہیں جا سکے مگر ان کی وفات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا غائبانہ جنازہ پڑھایا۔ اس کے علاوہ ایسے مسلمان ہونے والے نصاریٰ کا ذکر دوسرے مقامات پر بھی فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۹۹) اور سورۂ قصص (۵۲ تا ۵۵) اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوہرے اجر کی بشارت دی۔ [بخاري، العلم، باب تعليم الرجل أمته وأهله : ٩٧]

② فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ: یعنی ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل فرما کر ان کی طرح شہادت دینے والوں میں شامل فرما۔ امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت سے متعلق دیکھیں سورۂ بقرہ (۱۴۳) یا یہ کہ انبیاء اور مومنین جو توحید کی گواہی دیتے ہیں، ان کی جماعت میں شامل فرما۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ
وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ (پر) اور اس چیز پر ایمان نہ لائیں جو حق میں سے ہمارے پاس آئی ہے اور یہ طمع نہ رکھیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ داخل کر لے گا ﴿۸۴﴾ تو اللہ نے اس کے بدلے میں جو انھوں نے کہا، انھیں ایسے باغات دیے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی نیکی کرنے والوں کی جزا ہے ﴿۸۵﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہی لوگ بھڑکتی آگ والے ہیں ﴿۸۶﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! وہ پاکیزہ چیزیں حرام مت ٹھہراؤ جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۸۷﴾

آیت 84 مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ: اور یہ طمع نہ رکھیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ داخل کرے گا، یعنی ہمارا حشر مسلمانوں کے ساتھ فرمائے گا۔ اس صورت میں ''وَنَطْمَعُ'' کا عطف ''لَا نُؤْمِنُ'' پر ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''نَطْمَعُ'' کا جملہ ''لَا نُؤْمِنُ'' کی ضمیر سے حال ہو اور مطلب یہ ہو کہ ہم کیوں ایمان نہ لائیں، حالانکہ ہم طمع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں اپنے نیک بندوں کے ساتھ داخل کرے، یعنی ہمیں ضرور ایمان لانا چاہیے، ایمان لائے بغیر قیامت کے دن نیک بندوں کے ساتھ داخل ہونے کی توقع اور طمع سراسر جہالت اور حماقت ہے۔

آیت 87 لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ ...... : عہد توڑنے کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ سے مباحثہ کے بعد اب اصل موضوع کی طرف پھر توجہ کی ہے، یعنی ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' کی تشریح جو اس سورت کا بنیادی موضوع ہے۔ (قرطبی، رازی) نصاریٰ کے راہبوں کی تعریف کے بعد پاکیزہ چیزوں کو حرام ٹھہرانے سے منع کرنا اس لیے بھی زیادہ مناسب تھا کہ انھوں نے ان باتوں کو نیکی میں داخل کر رکھا تھا، لہٰذا مومنین کو اس سے منع فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے رہبانیت سے متعلق فرمایا: ﴿ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [الحدید : ۲۷] ''اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔''

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو چیز شرع میں صاف حلال ہو اس سے پرہیز کرنا برا ہے، یہ دو طرح سے ہوتا ہے، ایک زہد سے، یہ رہبانیت ہے جو ہمارے دین میں پسندیدہ نہیں ہے، اس کے بجائے تقویٰ اختیار کیا جائے، یعنی ممنوع چیز کے قریب نہ جائے۔ دوم یہ کہ کسی مباح (جائز) کام کے نہ کرنے کی قسم کھا لے، یہ بھی بہتر نہیں، اسے چاہیے کہ قسم توڑے اور کفارہ ادا کرے۔'' (موضح) انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے گھروں میں آئے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٨﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ

اور اللہ نے تمھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے حلال، طیب کھاؤ اور اس اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھنے والے ہو ﴿٨٨﴾ اللہ تم سے تمھاری قسموں میں لغو پر مؤاخذہ نہیں کرتا اور لیکن تم سے اس پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم نے پختہ ارادے سے قسمیں کھائیں۔ تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، درمیانے درجے کا، جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک گردن آزاد کرنا، پھر جو نہ پائے تو تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری

کی عبادت کے متعلق دریافت کر رہے تھے، جب انھیں اس کے متعلق بتایا گیا تو جیسے انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے، ہماری رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ کے تو پہلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا، میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا، میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ آئے تو فرمایا: ''تمھی لوگوں نے اس اس طرح کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور اس سے بچنے والا ہوں، لیکن روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، تو جو میری سنت سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔'' [مسلم، النكاح، باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه...... : ١٤٠١۔ بخاری : ٥٠٦٣] اس سلسلے میں اور بھی کئی روایات ہیں جن میں سے بعض میں یہ تصریح ہے کہ یہ آیت ایسے ہی کسی موقع پر نازل ہوئی۔ چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ کرتے تھے، ہمارے ساتھ بیویاں نہیں تھیں تو ہم نے عرض کیا، ہم خصی نہ ہو جائیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس سے منع فرما دیا، پھر ہمیں رخصت دے دی کہ ہم کپڑے کے ساتھ عورت سے نکاح کر لیں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ ﴾ [بخاری، التفسير، باب قوله تعالٰی : ﴿ يأيها الذين آمنوا ...... ﴾ : ٤٦١٥] واضح رہے کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے متعہ ہمیشہ کے لیے حرام فرما دیا، چنانچہ سبرہ (بن معبد) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! میں نے تمھیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت کے دن تک حرام فرما دیا ہے تو جس شخص کے پاس ایسی عورتوں میں سے کوئی موجود ہو وہ اسے چھوڑ دے اور تم نے انھیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے کوئی چیز واپس نہ لو۔'' [مسلم، النكاح، باب نكاح المتعة وبيان أنه ...... : ١٤٠٦/٢١]

آیت 88 یعنی حلال کو حرام تو نہ ٹھہراؤ، ہاں ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور جو چیزیں حرام ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

آیت 89 ① ''الْاَيْمَانَ'' یہ ''يَمِيْنٌ'' کی جمع ہے، بمعنی قسم۔ اس مقام پر یہ دوسرا حکم ہے کہ اگر کوئی طیبات (پاکیزہ چیزیں) چھوڑنے کی قسم کھا لے تو اس کا کیا حکم ہے۔ قسم کی تین قسمیں ہیں: ① یمین لغو، جو بے ساختہ عادت کے طور پر زبان

اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيۡمَانِكُمۡ اِذَا حَلَفۡتُمۡ ؕ وَ احۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اٰيٰتِهٖ
لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۸۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ
مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ فَاجۡتَنِبُوۡهُ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹۰﴾

قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھا لو اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اسی طرح اللہ تمھارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم شکر کرو ﴿۸۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور شرک کے لیے نصب کردہ چیزیں اور فال کے تیر سراسر گندے ہیں، شیطان کے کام سے ہیں، سو اس سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۹۰﴾

سے یوں ہی نکل جاتی ہے، جیسے ''لَا وَاللّٰهِ وَبَلٰى وَاللّٰهِ'' (نہیں ! اللہ کی قسم، یا کیوں نہیں ! اللہ کی قسم) ایسی قسموں پر نہ کفارہ ہے نہ سزا۔ ② یمین غموس، یعنی جھوٹی قسم، جو انسان نیت اور ارادہ کے ساتھ دھوکا و فریب دینے کے لیے جھوٹ بول کر قسم اٹھائے کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں ہوا، حالانکہ اس کی قسم واقعہ کے خلاف ہو۔ یہ کبیرہ گناہ ہے، اس کا کوئی کفارہ نہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ سچے دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرے، کیونکہ اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ③ منعقد ہونے والی قسم، یعنی ارادے اور نیت کے ساتھ قسم کھائے کہ میں ایسا کروں گا یا نہیں کروں گا، پھر اگر وہ قسم پوری نہ کر سکے تو اس آیت میں اس کا کفارہ بیان ہوا ہے۔ جو یہ ہے کہ تین کاموں میں سے جو چاہے اختیار کر لے، یعنی دس مسکینوں کو اوسط (درمیانے) درجے کا کھانا کھلانا، یا انھیں کپڑے پہنانا، یا ایک گردن آزاد کرنا، اگر ان تینوں ہی کی طاقت نہ ہو تو تین روزے رکھے۔ بعض اہل علم نے اوسط کا معنی افضل لکھا ہے، لغت میں یہ معنی بھی موجود ہے، فرمایا: ﴿ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ [البقرة : ۱۴۳] اور آیت: ﴿ حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى ﴾ [البقرة : ۲۳۸] یہ تین روزے خواہ پے در پے رکھے یا الگ الگ، دونوں طرح درست ہے۔

② وَ احۡفَظُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ : یعنی قسم توڑنے سے پرہیز کرو، لیکن اگر اسے توڑ دو تو اس کا کفارہ ادا کرو۔ ہاں، اگر وہ قسم کوئی ناجائز کام کرنے کی ہے تو وہ ہرگز پوری نہ کرو بلکہ توڑ دو، اس کا کفارہ ہے یا نہیں، اہل علم کا اس میں اختلاف ہے، بہتر ہے کہ ادا کر دو اور اگر یہ قسم کسی جائز کام کے چھوڑنے کی ہے تو اسے توڑ کر کفارہ ادا کر دو۔ عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی کام پر قسم کھاؤ اور اس کے علاوہ دوسرے کام کو بہتر سمجھو تو بہتر کام کر لو اور قسم کا کفارہ ادا کر دو۔'' [بخاري، الأيمان والنذور، باب قول الله تعالٰى : ﴿لا يؤاخذكم الله......﴾ : ۶۶۲۲]

③ اگر کسی نے کوئی نذر مانی ہو اور اسے پورا نہ کر سکے تو اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا ہے۔ [مسلم، النذر، باب في كفارة النذر : ۱۶۴۵، عن كعب بن عجرة رضی اللہ عنہ]

آیت 90 ① اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ ...... : یہ شراب کے سلسلے میں تیسرا اور آخری حکم ہے، جس کے بعد وہ قطعی حرام قرار دے دی گئی، اس سے پہلے دو حکم آ چکے تھے، پہلا حکم سورۂ بقرہ (۲۱۹) میں اور دوسرا سورۂ نساء (۴۳) میں، مگر ان دونوں آیتوں میں قطعی حرمت کا ذکر نہیں تھا، اس لیے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کی آیات نازل ہونے کے بعد کہا

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمھارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آنے والے ہو ﴿۹۱﴾

"یا اللہ! ہمارے لیے شراب کے بارے میں واضح حکم فرما۔" آخر صریح حرمت کی یہ آیت تین مزید چیزوں کی حرمت کے ساتھ اتری۔
[نسائی، الأشربۃ، باب تحریم الخمر : ۵۵۴۲]

❷ "اَلْخَمْرُ" کی تفسیر خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی، چنانچہ صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَ كُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ » "ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے (خواہ کسی بھی چیز سے بنی ہو)۔" [مسلم، الأشربۃ، باب بیان أن کل مسکر خمر...... : ۲۰۰۳] خلافت اسلامیہ کو برباد کرنے کے اسباب میں سے یہ بھی ایک بڑا سبب ہے کہ بعض علماء نے صرف انگور اور کھجور کی شراب پینے پر حد لازم قرار دی، باقی ہر نشہ آور چیز پینے پر حد ختم کر دی، خواہ وہ کسی چیز سے بنی ہو اور خواہ اس سے نشہ کیوں نہ آ جائے۔ اب جن اسلامی خلافتوں میں ام الخبائث کی کئی قسمیں پینے پر حد معاف ہو وہاں رعایا، لشکر اور خلفاء کا کیا حال ہو گا؟

❸ اس آیت اور اس سے اگلی آیت سے شراب اور جوئے کی حرمت سات وجہوں سے ثابت ہوتی ہے، اسی لیے اسے "ام الخبائث" قرار دیا گیا ہے: ① "رِجْسٌ" گندی چیز ہے۔ ② عمل شیطان ہے۔ ③ "فَاجْتَنِبُوْهُ" امر کا صیغہ فرض کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ اس سے اجتناب فرض ہے، لہٰذا پینا حرام ہے۔ ④ "لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" اس کے ترک سے فلاح کی امید ہے، ورنہ نہیں۔ ⑤ شیطان اس کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈالنا چاہتا ہے اور عداوت اور بغض پیدا کرنے والا ہر کام حرام ہے۔ ⑥ اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنا چاہتا ہے۔ یہ بھی اس کی حرمت کی ایک وجہ ہے۔ ⑦ "تو کیا تم باز آنے والے ہو؟" یہ سوال کی صورت میں امر ہے اور امر فرض کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم نے سن کر کہا "اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا" یعنی ہم باز آ گئے، ہم باز آ گئے۔ چنانچہ صحابہ نے شراب کے مٹکے توڑ دیے اور شراب گلیوں میں بہنے لگ گئی۔ اتنی صراحتوں کے باوجود کفار کے نمائندے کئی لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں شراب کہاں حرام ہے؟

❹ "اَلْمَيْسِرُ" علماء نے لکھا ہے کہ جس چیز میں بھی ہار جیت پر شرط لگائی جائے وہ جوا ہے، لاٹری، قسمت کی پڑی، انعامی بانڈ، انعامی معمے، انعامی سکیمیں سب جوئے کی قسمیں ہیں۔ کئی ظالم جوئے والی سکیموں پر عمرے یا حج کا انعام رکھ کر لوگوں کو پھنساتے ہیں، یاد رکھیں حرام مال اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا نہ حرام کے ساتھ کی ہوئی عبادت قبول ہے۔ انشورنش (بیمہ) سود اور جوئے کا بدترین مرکب ہے، بولی والی کمیٹی سراسر سود ہے اور شطرنج وغیرہ میں گو شرط نہ بھی لگائی جائے، پھر بھی یہ حرام ہے، کیونکہ یہ نماز سے غفلت کا سبب بنتی ہے۔

آیت 91 اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ ...... : جوئے اور شراب کی حرمت کا حکم دے کر اب ان کے

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور بچ جاؤ، پھر اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمے تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے ﴿۹۲﴾ ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو وہ کھا چکے، جب کہ وہ متقی بنے اور ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، پھر وہ متقی بنے اور ایمان لائے، پھر وہ متقی بنے اور انھوں نے نیکی کی اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۹۳﴾

دینی اور دنیاوی نقصانات بیان فرمائے ہیں، دینی نقصان تو یہ کہ شراب اور جوا نماز اور ذکر الٰہی سے روکنے اور غافل کرنے کا سبب بنتے ہیں اور دنیاوی نقصان یہ کہ آپس میں عداوت اور کینہ پیدا کرتے ہیں اور ان دونوں میں ان خرابیوں کا پایا جانا بالکل واضح ہے۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں انصار اور مہاجرین کے کچھ لوگوں کے پاس آیا تو انھوں نے کہا، آؤ تمھیں کھلائیں اور شراب پلائیں۔ یہ شراب کی حرمت سے پہلے کی بات ہے، چنانچہ میں ان کے پاس ایک باغ میں گیا، وہاں ان کے پاس اونٹ کی بھنی ہوئی سری اور شراب کا ایک مشکیزہ تھا۔ میں نے ان کے ساتھ کھایا اور پیا، ان کے پاس مہاجرین و انصار کا ذکر ہوا تو میں نے کہا، مہاجرین انصار سے بہتر ہیں، تو ایک آدمی نے سری کا ایک جبڑا پکڑا اور مجھے دے مارا، جس سے میری ناک زخمی ہو گئی، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کو یہ بات بتائی تو اللہ تعالیٰ نے شراب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ ﴾ [مسلم، فضائل الصحابة، باب فی فضل سعد بن أبی وقاص، قبل ح : ۱۷٤۸]

آیت 92 ① وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: یعنی جوئے اور شراب سے باز رہنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت سے بچ جاؤ۔ (رازی، قرطبی) یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے مراد قرآن و سنت کی پیروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَلَا اِنِّیْ أُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ » "مجھے کتاب یعنی قرآن دیا گیا ہے اور اس جیسی ایک اور چیز (حدیث) بھی۔" [أبو داوٗد، السنة، باب فی لزوم السنة: ٤٦٠٤ وصححه الألبانی]

② فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ ......: اس میں ان لوگوں کے لیے وعید ہے جو اس حکم قطعی کے باوجود شراب نوشی اور جوئے سے باز نہیں آتے۔ (کبیر)

آیت 93 ① لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ...... : یعنی اس کی حرمت سے پہلے ایمان اور عمل صالح والے جو لوگ شراب پیتے رہے اور جوا کھیلتے رہے، ان پر اس سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ یہ آیت اس وقت اتری جب شراب کی حرمت نازل

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۹۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ تمھیں شکار میں سے کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائے گا، جس پر تمھارے ہاتھ اور نیزے پہنچتے ہوں گے، تاکہ اللہ جان لے کون اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے، پھر جو اس کے بعد حد سے بڑھے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۹۴﴾

ہونے کے بعد بعض صحابہ یہ کہنے لگے کہ ہمارے ان بھائیوں کا کیا حال ہوگا جو شراب پیتے اور جوا کھیلتے تھے اور ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے کیا بدلہ ملے گا جو جنگ احد میں شہید ہو گئے، حالانکہ شراب ان کے پیٹوں میں تھی۔ (کبیر، ابن کثیر)

❷ اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ...... : یہاں تقویٰ کا حکم تین دفعہ دینے سے مراد یا تو تاکید ہے یا پہلے "اتَّقَوْا" سے مراد شرک سے بچے، دوسرے تقویٰ سے مراد شراب سے بچے اور تیسرے تقویٰ سے مراد سب بری باتوں سے بچے یا تقویٰ پر قائم رہے۔

بعض نے لکھا ہے کہ پہلے "اتَّقَوْا" سے مراد شرک سے بچے، دوسرے سے مراد گناہوں سے بچے اور تیسرے سے مراد صغیرہ گناہوں سے بچے۔ اسی طرح "اٰمَنُوْا" میں پہلے ایمان سے مراد اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے اور دوسرے سے مراد ایمان پر ثابت رہنا ہے۔ تیسری مرتبہ "اٰمَنُوْا" کے بجائے "اَحْسَنُوْا" فرمایا، یعنی لوگوں کے ساتھ احسان کریں اور عبادت میں احسان حاصل کریں جو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، پھر اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

آیت 94 ❶ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ ...... : اس سے پہلے آیت: ﴿لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ [المائدۃ : ۸۷] میں حلال چیزوں کو حرام ٹھہرانے سے منع کیا تھا، اب اس آیت میں وہ حلال چیزیں ذکر کی ہیں جو کچھ وقت کے لیے بطورِ امتحان حرام فرمائی ہیں، یعنی احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا منع کر دیا، تاکہ فرماں برداروں اور نافرمانوں کی آزمائش ہو جائے کہ بن دیکھے اللہ سے کون ڈرتا ہے۔

❷ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ : یعنی چھوٹے جانور یا جانوروں کے بچے جنھیں تم ہاتھ سے پکڑ سکتے ہو، یا بڑے جانور جن کا تم نیزوں سے شکار کر سکتے ہو۔

❸ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ ...... : یعنی اب جبکہ احرام کی حالت میں خشکی کے جانوروں کا شکار منع کر دیا گیا ہے۔ (قرطبی)

❹ یہ اور اگلی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب مسلمان حدیبیہ میں احرام باندھے ہوئے تھے اور خلاف معمول چھوٹے بڑے جنگلی جانور ان کے خیموں میں گھس آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان کے شکار سے منع فرما دیا۔ (ابن کثیر)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! شکار کو مت قتل کرو، اس حال میں کہ تم احرام والے ہو اور تم میں سے جو اسے جان بوجھ کر قتل کرے تو چوپاؤں میں سے اس کی مثل بدلہ ہے جو اس نے قتل کیا، جس کا فیصلہ تم میں سے دو انصاف والے کریں، بطور قربانی جو کعبہ میں پہنچنے والی ہے، یا کفارہ ہے مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا اس کے برابر روزے رکھنا، تاکہ وہ اپنے کام کا وبال چکھے۔ اللہ نے معاف کر دیا جو گزر چکا اور جو دوبارہ کرے تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ سب پر غالب، بڑے انتقام والا ہے ﴿۹۵﴾

آیت 95 ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ: محرم نہ شکار کرے نہ شکار میں کسی طرح مدد کرے، فرمایا: ﴿ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ﴾ [المائدۃ : ۲] ”اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔“ ہاں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”پانچ جانور فاسق ہیں، انھیں حرم میں بھی قتل کیا جاتا ہے، یعنی چوہا، بچھو، چیل، کوا اور کاٹنے والا کتا۔“ [بخاری، بدء الخلق، باب إذا وقع الذباب أحدکم...... : ۳۳۱۴]

اہل علم نے فواسق، یعنی خواہ مخواہ ایذا دینے والے جانوروں میں ”اَلْكَلْبُ الْعَقُوْرُ“ شامل ہونے کی بنا پر سانپ، بھیڑیے، چیتے اور شیر وغیرہ کو مارنے کی اجازت اخذ کی ہے۔

② وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا...... : یعنی احرام کی حالت میں جیسا شکار مارے اسی کی ”مثل“ کا فدیہ دے۔ مثل سے مراد یہ ہے کہ تن و توش، قد و قامت اور شکل و صورت میں اس سے ملتا جلتا ہو، جیسے ہرن کی جگہ بکرا۔

③ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ...... : یعنی دو عادل مسلمان مل کر فیصلہ کریں کہ اس شکار کی مثل کون سا جانور ہو سکتا ہے۔

④ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ: یعنی اس جانور کو مکہ معظمہ میں لے جا کر ذبح کیا جائے اور وہیں اس کا گوشت مسکینوں میں تقسیم کیا جائے، اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔

⑤ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ...... : اس آیت میں ”اَوْ“ اختیار کے لیے ہے، یعنی شکار کرنے والے کو اختیار ہے کہ ان تینوں میں سے جو کفارہ چاہے ادا کر دے، شکار کردہ جانور کی مثل جانور کعبہ، یعنی حرم میں لے جا کر قربان کیا جائے، یا اس کی مثل کے مساوی قیمت کا غلہ بطور کفارہ مسکینوں میں تقسیم کیا جائے، یا اس کے برابر روزے رکھے جائیں۔ قاموس اور دوسری کتب لغت میں ”مُد“ کی تعریف یہ لکھی ہے کہ ایک معتدل قد والا آدمی دونوں ہاتھ پھیلا کر کوئی چیز اٹھائے تو وہ ایک مد ہے۔ صاحب

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

تمھارے لیے سمندر کا شکار حلال کر دیا گیا اور اس کا کھانا بھی، اس حال میں کہ تمھارے لیے سامانِ زندگی ہے اور قافلے کے لیے اور تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا ہے، جب تک تم احرام والے رہو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿۹۶﴾

قاموس کہتے ہیں میں نے تجربہ کر کے دیکھا تو اسے درست پایا۔ صاع چار مُد کا ہوتا ہے، آپ خود تجربہ کر کے دیکھ لیں، ایک مُد میں گندم آدھ کلو سے زیادہ نہیں آتی، ظاہر ہے دوسری اجناس کا وزن مختلف ہوگا۔ یعنی ہر دو مُد غلے (یعنی ایک کلو) کے بدلے میں ایک روزہ رکھے۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت (۱۹۶) میں مذکور کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جو صحیح بخاری (۴۵۱۷، ۴۱۹۱، ۵۹۱۷) میں آئی ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ: یعنی زمانۂ جاہلیت میں یا اس حکم کے آنے سے پہلے احرام کی حالت میں جو شکار تم کر چکے ہو اسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، اب اس کا بدلہ دینا ضروری نہیں۔

آیت 96 ① اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ ......: "اَلْبَحْرِ" سے مراد پانی ہے، اس میں سمندر اور غیر سمندر سب پانی برابر ہیں اور اس میں وہ تمام جانور شامل ہیں جو پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتے، وہ مچھلی ہو یا کوئی اور جانور۔ زندہ بھی پکڑے جائیں تو ذبح کی ضرورت ہی نہیں۔ قرآن و حدیث میں پانی کے شکار کو حلال کہا گیا ہے اور کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں کہ مچھلی کے سوا سب حرام ہیں۔ "صَيْدُ الْبَحْرِ" سے مراد پانی کا ہر وہ جانور ہے جو زندہ پکڑا جائے اور "طَعَامُهٗ" سے مراد پانی کا وہ جانور ہے جو وہیں مر جائے اور سمندر یا دریا اسے باہر پھینک دے، یا مر کر پانی کے اوپر آ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ تفسیر آئی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے: «طَعَامُهُ مَا لَفِظَهُ الْبَحْرُ مَيْتًا» یعنی اس آیت میں "طَعَامُهٗ" سے مراد وہ جانور ہے جسے سمندر مردہ حالت میں کنارے پر پھینک دے۔ "هداية المستنير" کے مصنف نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ ابن جریر نے بہت سے صحابہ سے یہی معنی نقل فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے صرف مچھلی کو حلال اور پانی کے دوسرے تمام جانوروں کو حرام کہہ دیا ہے اور وہ بھی صرف وہ جو زندہ پکڑی جائے، اگر مر کر پانی کے اوپر آ جائے تو اسے حرام کہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں، کیونکہ وہ اس آیت کے خلاف ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: «هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ، الْحِلُّ مَيْتَتُهُ» "سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔" [الموطأ، الطهارة، باب الطهور للوضوء : ۱۲۔ أبوداوٗد : ۸۳۔ ترمذی : ۶۹، صححه الألبانی] اسی طرح کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگی مہم پر بھیجا، ان کے پاس کھانے کی چیزیں ختم ہو گئیں تو انھوں نے ٹیلے جیسی ایک بہت بڑی مچھلی دیکھی، جسے سمندر کنارے پر چھوڑ کر ہٹ چکا تھا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ امیر تھے، انھوں نے اسے کھانے کی اجازت دے دی، ایک ماہ تک تین سو

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اللہ نے کعبہ کو، جو حرمت والا گھر ہے، لوگوں کے قیام کا باعث بنایا ہے اور حرمت والے مہینے کو اور قربانی کے جانوروں کو اور پٹوں (والے جانوروں) کو۔ یہ اس لیے کہ تم جان لو کہ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور یہ کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۹۷﴾

آدمی اسے کھاتے رہے اور خشک کر کے ساتھ بھی لے آئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھارے پاس اس کا کچھ گوشت ہے تو ہمیں بھی دو۔'' چنانچہ صحابہ نے کچھ گوشت آپ ﷺ کی طرف بھیجا تو آپ نے تناول فرمایا۔ [مسلم، الصید و الذبائح، باب إباحة میتات البحر : ۱۹۳۵]

2 مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ: اس سے یہ اشارہ فرمایا کہ یہ رخصت تمھارے فائدے کے لیے ہے، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حج کے طفیل حلال ہوئی ہے، یعنی سمندر کا جانور محرم و غیر محرم سب کے لیے حلال ہے۔

آیت 97 1 جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ......: اوپر کی آیت میں محرم کے لیے شکار کو حرام قرار دیا، اب اس آیت میں بتایا کہ جس طرح حرم کو اللہ تعالیٰ نے وحشی جانوروں اور پرندوں کے لیے سبب امن قرار دیا ہے اسی طرح اسے لوگوں کے لیے بھی جائے امن بنا دیا ہے اور دنیوی اور اخروی سعادتیں حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ (کبیر) دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۷)، سورۂ قصص (۵۷) اور سورۂ بقرہ (۱۲۵) یعنی اہل مکہ کی معاش (روزی) کا مدار اسی پر ہے کہ لوگ دور دراز سے حج اور تجارت کے ارادے سے یہاں پہنچتے ہیں اور ہر قسم کی ضروریات ساتھ لاتے ہیں، جس سے اہلِ مکہ رزق حاصل کرتے ہیں اور لوگ یہاں پہنچ کر امن و امان پاتے ہیں، حتیٰ کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی حرم کے اندر کوئی شخص اپنے باپ یا بیٹے کے قاتل تک کو کچھ نہیں کہتا تھا اور عبادت و ثواب کے اعتبار سے یہ بہترین جگہ ہے۔ الغرض! یہ تمام چیزیں لوگوں کے قیام کا باعث ہیں۔ (کبیر، فتح القدیر) کعبۃ اللہ لوگوں کے قائم رہنے کا ایک ذریعہ ہے، کیونکہ قیامت کے قریب جب ایک حبشی کعبۃ اللہ کو گرا دے گا تو اس کے بعد بہت جلد قیامت آجائے گی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کعبہ کو دو پتلی پنڈلیوں والا حبشی گرائے گا۔'' [بخاری، الحج، باب هدم الكعبة : ۱۵۹۶۔ مسلم : ۲۹۰۹]

2 وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ : حرمت والے مہینے چار ہیں، ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔ ان چار مہینوں میں لوگ امن سے سفر اور تجارت کرتے اور سال بھر کی ضروریات جمع کر لیتے تھے، اس اعتبار سے یہ مہینے بھی گویا لوگوں کی زندگی قائم رہنے کا ذریعہ ہیں۔

3 وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ: ان کا لوگوں کے لیے قیام کا سبب ہونا اس اعتبار سے ہے کہ ہدی (قربانی) کا گوشت مکہ کے فقراء میں تقسیم ہوتا اور ہدی اور قلادہ والے جانور کوئی شخص لے کر چلتا تو اس کا تمام عرب احترام کرتے۔ مقصد کعبہ کی عظمت کو بیان کرنا تھا، اس کے ساتھ ان چیزوں کا بھی ذکر کر دیا، کیونکہ ان کا تعلق بھی بیت اللہ سے ہے۔ (کبیر)

4 ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ ......: ''ذٰلِكَ'' (یہ) یعنی اللہ تعالیٰ کا ان چیزوں کو لوگوں کے قیام کا باعث بنانا اس لیے ہے کہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کی تفصیل جانتا ہے اور اس نے اپنے علم کے مطابق لوگوں کے قیام اور فائدے کے لیے یہ

اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَ اللّٰهُ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ
تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا وَ اللّٰهُ
غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

جان لو! بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے اور بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۹۸﴾ رسول پر
پہنچا دینے کے سوا کچھ نہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو ﴿۹۹﴾ کہہ دے ناپاک اور پاک برابر
نہیں، خواہ ناپاک کی کثرت تجھے تعجب میں ڈالے۔ پس اللہ سے ڈرو اے عقلوں والو! تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۱۰۰﴾ اے لوگو
جو ایمان لائے ہو! ان چیزوں کے بارے میں سوال مت کرو جو اگر تمھارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری
لگیں اور اگر تم ان کے بارے میں اس وقت سوال کرو گے جب قرآن نازل کیا جا رہا ہے تو تمھارے لیے ظاہر کر
دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت بردبار ہے ﴿۱۰۱﴾

احکام جاری فرمائے ہیں۔ ﴿ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی تمام تفصیلات جانتا ہے اور اسے خوب معلوم ہے کہ تمھاری دینی اور معاشی بہتری کس چیز میں ہے اور کس چیز میں نہیں۔

آیت 98 اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ...... : لہٰذا تم ایک طرف اس کے عذاب سے بھی پناہ مانگتے رہو اور دوسری طرف اس کی رحمت کے بھی امیدوار رہو۔ اصل ایمان یہ ہے کہ بندے پر خوف و رجا (ڈر اور امید) کی حالت طاری رہے، فرمایا: ﴿ وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ﴾ [الأعراف : ٥٦] ''اور اسے خوف اور طمع سے پکارو۔'' ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر مومن کو اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ سزا (عذاب کا علم ہو جائے تو کوئی جنت کی طمع نہ کرے اور اگر کافر کو اللہ تعالیٰ کی رحمت (کی وسعت) کا علم ہو جائے تو کوئی اس کی جنت سے مایوس نہ ہو۔'' [مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله ...... : ٢٧٥٥]

آیت 99 مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ : یعنی جب انھوں نے یہ حکم پہنچا دیا تو اپنا فریضہ ادا کر دیا اور تم پر حجت قائم ہو گئی، اب کسی شخص کا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو گا۔ (ابن کثیر)

آیت 100 قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ ...... : یعنی حرام اور حلال یا کافر اور مومن برابر نہیں ہو سکتے۔ حرام رزق کی فراوانی اور اس پر عیش و عشرت گو بظاہر کتنی ہی خوش کن کیوں نہ ہو، انسان پر لازم ہے کہ وہ رزق حلال پر قناعت کرے، خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر ہو۔ اسی طرح کافر کتنا بھی اچھا نظر آئے مومن کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ رزقِ حلال اور مومن طیب ہیں اور رزقِ حرام اور کافر خبیث ہیں، خبث نے ان کی اچھائی کو ختم کر دیا ہے۔

آیت 101 ① لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ ...... : یعنی اگر بلا ضرورت سوال کرو گے اور اس کا جواب تمھاری آسانی کے

قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ثُمَّ اَصۡبَحُوۡا بِهَا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰـكِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَاَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

بے شک تم سے پہلے ان کے بارے میں کچھ لوگوں نے سوال کیا، پھر وہ ان سے کفر کرنے والے ہو گئے ﴿۱۰۲﴾ اللہ نے نہ کوئی کان پھٹی اونٹنی مقرر فرمائی ہے اور نہ کوئی سانڈ چھٹی ہوئی اور نہ کوئی اوپر تلے بچے دینے والی مادہ اور نہ کوئی بچوں کا باپ اونٹ اور لیکن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان کے اکثر نہیں سمجھتے ﴿۱۰۳﴾

خلاف اتر آیا تو خواہ مخواہ مشکل میں پڑ جاؤ گے اور پھر بجا نہ لانے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نافرمان قرار پاؤ گے۔ اب جب کہ قرآن اتر رہا ہے، تمھارے سوالوں کا جواب بھی اتر سکتا ہے، تو تم بہت سی چیزوں کو اپنے اوپر فرض یا حرام قرار دلوا لو گے۔ اس بنا پر متعدد روایات میں رسول اللہ ﷺ نے زیادہ سوال کرنے سے منع فرمایا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک مسلمانوں کے حق میں مسلمانوں میں سے جرم کے لحاظ سے سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو حرام قرار نہیں دی گئی تھی، پھر اس کے سوال کی وجہ سے حرام قرار دے دی گئی۔'' [بخاری، الاعتصام، باب ما یکرہ من کثرۃ السؤال ..... : ۷۲۸۹۔ مسلم : ۲۳۵۸] مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۰۸)۔

② عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا: ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس سے پہلے جو سوال تم کر چکے اللہ تعالیٰ نے وہ معاف فرما دیے ہیں اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور معافی ہے کہ اس نے ان چیزوں سے درگزر کیا ہے، بیان نہیں فرمایا اور تمھارے لیے ان کے کرنے اور نہ کرنے کی گنجائش باقی چھوڑ دی۔ (رازی، ابن کثیر)

آیت 102 قَدۡ سَاَلَهَا قَوۡمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ ...... : یہ بنی اسرائیل کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان کا حال یہ تھا کہ اپنے انبیاء سے ایک چیز خواہ مخواہ کرید کرید کر دریافت کرتے اور جب وہ حرام قرار دے دی جاتی تو بجا نہ لاتے، اس طرح دونوں حالتوں میں نافرمان ٹھہرتے۔ یہ ساری آفت بلا ضرورت کثرتِ سوال سے پیش آتی۔ ان کی اس روش کی متعدد مثالیں سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: ''لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے، لہٰذا حج کرو۔'' تو ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہر سال؟'' آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہی بات کہی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو فرض ہو جاتا اور تم نہ کر سکتے۔'' پھر فرمایا: ''مجھے چھوڑے رکھو جب تک میں تمھیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے سوالوں کی کثرت اور انبیاء سے اختلاف کی وجہ ہی سے ہلاک ہوئے، تو جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس میں سے جتنا کر سکو کرو اور جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اسے چھوڑ دو۔'' [مسلم، الحج، باب فرض الحج مرۃ فی العمر : ۱۳۳۷]

آیت 103 مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ ...... : اوپر کی آیات میں ایسی باتوں کو کرید کرنے اور ایسے سوال کرنے سے منع فرمایا جو

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے آؤ اس کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت پاتے ہوں ﴿۱۰۴﴾

لوگوں پر لازم نہیں کی گئیں، اب اس آیت میں ایسے کام اپنے اوپر لازم کر لینے سے منع فرمایا جو اللہ کی طرف سے لازم نہ ہوں۔ (کبیر)

اہلِ عرب زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے، پھر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھتے۔ یہاں چار قسم کے جانور بیان کیے ہیں، سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ① ''بحیرہ'' وہ جانور ہے جس کا دودھ بتوں کے لیے روک لیا جاتا، پھر لوگوں میں سے کوئی اسے نہیں دوہتا تھا۔ ② ''سائبہ'' وہ جسے وہ اپنے معبودوں کے لیے کھلا چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی چیز نہیں لادی جاتی تھی۔ ③ ''وصیلہ'' وہ اونٹنی جو پہلی دفعہ مادہ بچہ دیتی، پھر دوسری بار بھی مادہ بچہ دیتی، وہ اسے اپنے بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے (کیونکہ وصیلہ وصل سے نکلا ہے) یہ نام اس لیے رکھتے کہ اس نے دو مادہ بچے یکے بعد دیگرے جنے ہیں، بیچ میں نر نہیں ہے۔ ④ ''حام'' وہ سانڈ اونٹ جس کے جفتی کرنے سے اونٹنیوں کی ایک مخصوص تعداد حاملہ ہوتی، اسے وہ اپنے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس پر کوئی چیز نہ لادتے اور اس کا نام ''حامی'' رکھتے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی انتڑیاں آگ میں کھینچ رہا تھا، یہ پہلا شخص تھا جس نے سائبہ چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ما جعل الله من بحيرة ...... ﴾ : ٤٦٢٣] بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی یہ تفسیر سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے کی ہے، مشرکین عرب کسی ایک دین پر تو متفق تھے نہیں، خصوصاً بدعات ہر قبیلے کی الگ الگ ہوتی ہیں، اس لیے تابعین سے ان چاروں کی تفسیر اور بھی آئی ہے، چنانچہ بعض نے فرمایا کہ بحیرہ وہ ہے جس کا کان بتوں کے نام پر پھاڑا ہوا ہو۔ یہ ''بحر'' سے ''فَعِيْلَةٌ'' بمعنی ''مَفْعُوْلَةٌ'' ہے، جس کا معنی شق یعنی پھاڑنا ہے۔ سائبہ آزاد چھوڑی ہوئی، جس اونٹنی کے پیٹ سے دس بچے سب کے سب مؤنث پیدا ہوتے تو اسے چھوڑ دیتے، نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کے بچے اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ پیتا۔ وصیلہ دو مادہ بچے سات مرتبہ یکے بعد دیگرے لانے والی۔ حامی یعنی اپنی حفاظت کرنے والا، جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پیدا ہو جاتے اسے سانڈ بنا کر چھوڑ دیتے کہ اس نے اپنی پشت محفوظ کر لی ہے، پھر اس پر نہ سواری کی جاتی نہ بوجھ لادا جاتا نہ اسے پانی یا چارے سے روکا جاتا۔ مزید ظلم یہ کرتے کہ ایسا کرنے کو اللہ کا حکم قرار دیتے۔ اللہ نے اس کی تردید ''مَا جَعَلَ اللّٰهُ'' کہہ کر فرمائی۔ ان کی دوسری تشریحات بھی تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں اور اس کی وجہ اوپر گزر چکی کہ عرب کے جاہلوں میں سے ہر ایک کا الگ ہی طریقہ تھا۔ غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنے کا یہ سلسلہ اب بھی کفار کے علاوہ نام نہاد مسلمانوں میں جاری ہے، مثلاً پیروں کی گائیں، یا مختلف درباروں کے نام کے جانور جہاں چاہیں پھریں، انھیں کچھ نہیں کہا جاتا۔

104 وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا ...... : اس آیت میں اگرچہ عرب کے مشرکین کی بات ہو رہی ہے مگر لفظ عام ہیں جن میں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ
جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ
الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر اپنی جانوں کا بچاؤ لازم ہے، تمھیں وہ شخص نقصان نہیں پہنچائے گا جو گمراہ ہے، جب تم ہدایت پا چکے، اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ۝۱۰۵ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھاری آپس کی شہادت، جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے، وصیت کے وقت، دو عدل والے آدمی ہوں گے، جو تم میں سے ہوں، یا دو اور تمھارے غیر سے ہوں، اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو، پھر تمھیں موت

ان تمام لوگوں کی مذمت کی جا رہی ہے جو حق بات پر غور و فکر کرنے اور اسے مان لینے کے بجائے اپنے باپ دادا کے رسم و رواج یا مذہبی پیشواؤں کی تقلید کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۰)۔

آیت 105 يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ...... : یعنی توحید اور شریعت کے احکام کی اس قدر وضاحت اور بار بار ترغیب دلانے اور اللہ کے احکام کی نافرمانی اور اس کے عذاب سے ڈرانے کے باوجود اگر یہ لوگ اپنی جہالت پر اصرار کریں تو تم ان کی گمراہی اور جہالت کی پروا نہ کرو، خود سیدھے راستے پر رہو گے تو ان لوگوں کی جہالت کا تم پر کوئی وبال نہیں ہوگا۔ یعنی اپنی اصلاح کی سب سے پہلے فکر کرو، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کی غلطیوں اور عیوب کی فکر میں لگ کر اپنی اصلاح کو بھول ہی جاؤ۔ اگر تم سیدھے راستے پر ہو گے تو گمراہ لوگ تمھارا کچھ نقصان نہیں کر سکیں گے۔ خود سیدھے راستے اور ہدایت پر رہنے میں یہ بھی شامل ہے کہ نیکی کا حکم دیتے رہو گے اور برائی سے منع کرتے رہو گے تو ان کی گمراہی قطعاً تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انسان بس اپنی نجات کی فکر کرے، دوسروں کی اصلاح ضروری نہیں۔ چنانچہ اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: ''لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کا غلط مطلب لیتے ہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے: ''جب لوگ ظالم کو دیکھیں، پھر اس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب لے آئے۔'' اسی حدیث میں ہے: ''کوئی قوم ایسی نہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں پر عمل کیا جاتا ہو، پھر وہ طاقت رکھتے ہوں کہ اسے بدل دیں، مگر وہ نہ بدلیں مگر قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ان سب کو عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔'' [أبو داوٗد، الملاحم، باب الأمر والنهي : ۴۳۳۸] '' اِذَا اهْتَدَيْتُمْ '' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ باوجود تمھارے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لوگ باز نہ آئیں تو امر بالمعروف کرنے والوں پر کچھ بوجھ نہیں ہوگا۔ (ابن کثیر)

آیت 106 تا 108 يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ ...... : ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! جب تم سفر کی حالت میں ہو اور تم پر موت کے آثار ظاہر ہونے لگیں اور تمھارے پاس کوئی مال یا اثاثہ ہو تو اللہ کا حکم یہ ہے کہ مسلمانوں یا

الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ
ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ
الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ
اَيْمَانِهِمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع

کی مصیبت آ پہنچے، تم ان دونوں کو نماز کے بعد روک لو گے، اگر تم شک کرو، پس وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں گے کہ ہم
اس کے ساتھ کوئی قیمت نہیں لیں گے، اگرچہ وہ قرابت والا ہو اور نہ ہم اللہ کی شہادت چھپائیں گے، بے شک ہم
اس وقت یقیناً گناہ گاروں سے ہوں گے ﴿۱۰۶﴾ پھر اگر اطلاع پائی جائے کہ بے شک وہ دونوں کسی گناہ کے مرتکب
ہوئے ہیں تو دو اور ان کی جگہ کھڑے ہوں گے، ان میں سے جن کے خلاف گناہ کا ارتکاب ہوا ہے، جو زیادہ قریب
ہوں، پس وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں گے کہ یقیناً ہماری گواہی ان کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم نے زیادتی نہیں
کی، بے شک ہم اس وقت یقیناً ظالموں میں سے ہوں گے ﴿۱۰۷﴾ یہ زیادہ قریب ہے کہ وہ گواہی کو اس کے طریقے پر
ادا کریں، یا اس سے ڈریں کہ (ان کی) قسمیں ان (قرابت داروں) کی قسموں کے بعد رد کر دی جائیں گی اور اللہ
سے ڈرو اور سنو اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۸﴾

غیر مسلموں میں سے دو عدل و صدق والے آدمیوں کو اس پر گواہ بنا دو۔ جو میت کے وارثوں کے پاس مرنے والے کا سامان پہنچا دیں، اگر ان دونوں گواہوں کے بارے میں میت کے ورثا کو شبہ ہو جائے کہ انھوں نے خیانت کی ہے اور میت کا کچھ مال چھپا لیا ہے تو انھیں نماز کے بعد حلف اٹھانے کے لیے روک لیا جائے گا، پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں گے اور کہیں گے کہ ہم مال کی وجہ سے اللہ کی جھوٹی قسم نہیں کھائیں گے، چاہے جسے فائدہ پہنچانے کے لیے ہم قسم کھا رہے ہیں وہ ہمارا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو اور جس گواہی کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے نہیں چھپائیں گے، اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً گناہ گاروں میں سے ہوں گے۔ اگر ان دونوں کے قسم کھا لینے کے بعد پتا چل جائے کہ انھوں نے خیانت کی ہے تو میت کے رشتے داروں میں سے دو قریبی رشتے دار آگے بڑھیں گے اور حلف اٹھائیں گے کہ ہم دونوں کی گواہی کہ ان دونوں نے خیانت کی ہے اور جھوٹی قسم کھائی ہے، ان دونوں کی گواہی سے زیادہ قابل قبول ہے اور یہ کہ ہم نے ان پر خیانت کی جو شہادت دی ہے تو اس میں ہم نے ان پر زیادتی نہیں کی، اگر ہم نے زیادتی کی ہے تو یقیناً ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس طرح حلف لینے کی

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر کہے گا تمھیں کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں، بے شک تو ہی چھپی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۱۰۹﴾

حکمت و مصلحت بیان فرمائی کہ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ گواہ آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہوئے امر واقع میں کوئی تبدیلی لائے بغیر گواہی دیں گے اور خیانت کی شکل میں دو قریبی رشتہ داروں سے حلف لینے کی حکمت یہ ہے کہ حالتِ سفر کے گواہ ڈریں گے کہ اگر ہم نے جھوٹی قسم اٹھائی تو وہ رد کر دی جائے گی، کیونکہ قریبی رشتہ دار قسم کھائیں گے اور ہمارا جھوٹ لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

ان آیات کی شانِ نزول یہ ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بنوسہم قبیلے کا ایک (مسلم) شخص تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ سفر کے لیے نکلا۔ (یہ دونوں اس وقت نصرانی تھے) سہمی کو اس سرزمین پر موت آئی جہاں کوئی مسلمان نہ تھا جسے وہ وصیت کرتا، لہٰذا اس نے اپنا سامان تمیم داری اور عدی کے حوالے کر دیا، پھر جب وہ دونوں اس کے ترکے کے ساتھ واپس آئے تو ورثا نے دیکھا کہ چاندی کا ایک جام، جس پر سونے کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، غائب ہے۔ (مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمیم داری اور عدی سے قسم لی (اور انھیں چھوڑ دیا) بعد میں وہ جام مکہ میں ملا، ان لوگوں نے (جن کے پاس سے وہ جام ملا تھا) کہا کہ ہم نے اسے تمیم اور عدی بن بداء سے خریدا ہے، پھر اس سہمی کے ورثا میں سے دو آدمی کھڑے ہوئے اور انھوں نے گواہی دی کہ یقیناً یہ جام ہمارے قریبی رشتے دار، یعنی سہمی کا جام ہے، چنانچہ یہ آیت انھی کے بارے میں نازل ہوئی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ [المائدۃ : ۱۰۶] [بخاری، الوصایا، باب قول اللہ عزوجل : ﴿ یأیھا الذین امنوا شھادۃ بینکم...... ﴾ : ۲۷۸]

آیت 109 ❶ **يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ......** : دین کے کچھ مسائل اور احکام بیان کرنے کے بعد اب قیامت کے بعض احوال ذکر فرما دیے، تاکہ نافرمانی کرنے والوں کو تنبیہ ہو۔ (کبیر) مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن پیغمبروں کو جمع کرکے ان سے سوال ہوگا کہ جو دعوت تم نے دی تھی تمھاری امتوں نے اسے کس حد تک قبول کیا۔ پیغمبروں سے یہ سوال درحقیقت امتوں کو ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے لیے ہوگا۔ (ابن کثیر) جیسا کہ آیت: ﴿ وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ﴾ ''جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا'' یہ سوال درحقیقت زندہ درگور کرنے والوں کو ذلیل کرنے کے لیے ہوگا۔

❷ **قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا......** : وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتوں کے اپنے اپنے رسولوں کو جواب کا کچھ علم تو پیغمبروں کو تھا، کیونکہ ان کی عمر انھی میں گزری تھی، تو وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ علم نہیں۔ اس سوال کا جواب ﴿ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴾ میں موجود ہے، یعنی ہم تو صرف ان کے ظاہری جواب کی حد تک واقف ہیں، جو ہماری زندگی میں انھوں نے دیا اور پیغمبر شہادت بھی اسی کے متعلق دیں گے۔ (دیکھیے نساء: ۴۱۔ بقرہ: ۱۴۳) باقی رہا کہ انھوں

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم! اپنے اوپر اور اپنی والدہ پر میری نعمت یاد کر، جب میں نے روح پاک سے تیری مدد کی، تو گود میں اور ادھیڑ عمر میں لوگوں سے باتیں کرتا تھا اور جب میں نے تجھے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائی اور جب تو مٹی سے پرندے کی شکل کی مانند میرے حکم سے بناتا تھا، پھر تو اس میں پھونک مارتا تو وہ میرے حکم سے ایک پرندہ بن جاتی تھی اور تو پیدائشی اندھے اور برص والے کو میرے حکم سے تندرست کرتا تھا اور جب تو مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روکا، جب تو ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو ان میں سے ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۱۰﴾

نے فی الحقیقت ہماری دعوت کو دل سے قبول کیا یا نہیں اور ہمارے بعد ہماری امتیں اس دعوت پر کہاں تک ثابت قدم رہیں تو اس کا علم تیرے سوا کسی کو نہیں، کیونکہ چھپی ہوئی باتوں کو تو ہی خوب جاننے والا ہے، سو آیات میں بحمد اللہ کوئی تعارض نہیں۔ (کبیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ان کو سنایا جو پیغمبروں کی شفاعت پر مغرور ہیں، تاکہ معلوم کریں کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی کسی کے دل پر گواہی نہیں دیتا اور کوئی کسی کی سفارش نہیں کرتا۔ (موضح)

آیت 110 ① چونکہ پیغمبروں سے سوال امتوں کے سرکش لوگوں کو ڈانٹنے اور ملامت کرنے کے لیے ہوگا اور سب سے زیادہ ملامت کے لائق نصاریٰ ہوں گے جنھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنا لیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے لیے بیوی اور اولاد ثابت کی تھی (جس سے اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے) اس بنا پر تمام پیغمبروں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات ذکر فرمائیں گے اور پھر ان سے سوال ہوگا، اس سے مقصد نصرانیوں کی تردید ہے۔ (کبیر)

② **اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ:** یعنی جبریل علیہ السلام کو تمھاری مدد کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ پہلا احسان یہ ذکر فرمایا۔

③ **وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ:** یہاں "تَخْلُقُ" کا لفظ صرف ظاہری شکل و صورت بنانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تصویر بنانے والوں سے فرمائے گا: «أَحْيُوْا مَا خَلَقْتُمْ» "جو تم نے خلق کیا ہے اسے زندہ کرو۔" [بخاري، اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة : ٥٩٥١] پیدا کرنے اور زندگی دینے کے معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۴۹)۔

وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ، انھوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہ کہ بے شک ہم فرماں بردار ہیں (۱۱۱) جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان اتارے؟ اس نے کہا اللہ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو (۱۱۲)

④ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ: اس آیت میں "بِاِذْنِيْ" (میرے حکم سے) کا لفظ چار مرتبہ آیا ہے، جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو عیسیٰ (علیہ السلام) یہ معجزات نہیں دکھا سکتے تھے اور یہی حال ہر نبی کے معجزات کا ہے، وہ نہ عالم الغیب ہوتے ہیں، نہ انھیں ہر کام کا اختیار ہوتا ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا جائے یا جس کام کا اختیار دیا جائے صرف وہی ان کے علم اور اختیار میں ہوتا ہے۔

⑤ وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ……: یہودیوں نے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے شر سے محفوظ رکھا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۵) اور سورۂ نساء (۱۵۸) یہ بھی احسان فرمایا۔

⑥ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکروں نے ان کے معجزات کو کھلا جادو قرار دیا۔ بدبخت اتنا نہ سمجھ سکے کہ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو شفایاب اور مردے کو زندہ کرنا کسی جادوگر کے لیے ممکن نہیں، چاہے وہ جادو میں کتنا ہی کمال کیوں نہ رکھتا ہو اور یوں بھی جادو کرنا اور کرانا فاسق و بدکار قسم کے لوگوں کا کام ہے، حالانکہ وہ خود دیکھ رہے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام انھیں ایک اللہ کی عبادت و اطاعت کا حکم دیتے تھے۔ یہود کی اس حرکت کی بنیاد حسد تھی اور سچ ہے کہ " كُلُّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ " ہر صاحب نعمت پر لوگ حسد کرتے ہیں۔

آیت 111 وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ……: یہ بھی اللہ تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام پر احسان تھا کہ حواریوں کو ان کا مخلص ساتھی اور مددگار بنا دیا۔ حواری کے قریب قریب وہی معنی ہیں جو ہمارے ہاں انصار کے ہیں۔ یہاں "اَوْحَيْنَاۤ" کا معنی انبیاء والی وحی نہیں بلکہ الہام ہے، جو غیر انبیاء کو بھی ہوتا ہے اور اس پر بھی وحی کا لفظ بول دیا جاتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى ﴾ [القصص : ۷] "اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی۔" حالانکہ قرآن مجید میں صاف آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا (کوئی عورت نبی نہیں ہوئی)۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۷) اسی طرح فرمایا: ﴿ وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ﴾ [النحل : ٦٨] "اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی فرمائی۔"

آیت 111 ① اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ……: حواری اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے تھے، جیسا کہ اوپر کی آیت میں مذکور

قَالُوۡا نُرِيۡدُ اَنۡ نَّاۡكُلَ مِنۡهَا وَ تَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا وَ نَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا وَ نَكُوۡنَ عَلَيۡهَا
مِنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ
لَنَا عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰيَةً مِّنۡكَ‌ۚ وَارۡزُقۡنَا وَ اَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾

انھوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ واقعی تو نے ہم سے سچ کہا ہے اور ہم اس پر گواہوں سے ہو جائیں ﴿۱۱۳﴾ عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے اللہ! اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان اتار، جو ہمارے پہلوں اور ہمارے پچھلوں کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور ہمیں رزق دے اور تو سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ﴿۱۱۴﴾

ہے، اس لیے ان کا یہ سوال اللہ کی قدرت پر شک و شبہ کے طور پر نہ تھا، بلکہ دلی اطمینان حاصل کرنے کے لیے تھا، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ (ابن کثیر) اور یہ الفاظ کہ کیا تیرا رب یہ کر سکتا ہے، ان کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہے، بلکہ مطلب یہ پوچھنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تو نہیں، یا اس میں کوئی مانع تو نہیں؟ "مائدہ" وہ بڑا تھال جس پر کھانا رکھا ہو۔ اب اس تھال اور کھانے دونوں پر مائدہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (راغب)

② قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ...... : کیونکہ ایسے معجزات معین کر کے طلب کرنا حکم چلانے اور سرکشی کرنے کا معنی رکھتا ہے، اس لیے اللہ سے ڈرو اور ایسا سوال نہ کرو۔ (کبیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "ڈرو اللہ سے" یعنی بندے کو چاہیے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں، اگرچہ مالک بہت زیادہ مہربانی کرے۔" (موضح) ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے اندر تقویٰ پیدا کرو اور اسے مائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ بناؤ، جیسے فرمایا: ﴿ وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ﴾ [الطلاق : ۲، ۳] "اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔" (ابن کثیر)

آیت 113 ① قَالُوۡا نُرِيۡدُ اَنۡ نَّاۡكُلَ مِنۡهَا: یعنی ہم یہ معجزہ ایمان لانے کی شرط کے طور پر نہیں مانگ رہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے کہا تھا: ﴿ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً ﴾ [البقرۃ : ۵۵] "ہم ہرگز تیرا یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ لیں۔" بلکہ چند امور کے پیش نظر طلب کر رہے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم بھوکے ہیں یا برکت کے لیے کچھ کھانا چاہتے ہیں۔

② وَتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُنَا: یعنی ہمیں اس بات کا اطمینان ہو جائے (جو ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے) اور ہم عین الیقین کے درجے کا علم حاصل کر لیں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور بنی اسرائیل کے سامنے آپ کے سچا رسول ہونے کی گواہی دے سکیں۔

آیت 114 ① قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ...... : یہ انتہا درجے کی عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ "اَللّٰهُمَّ" (اے اللہ!) کے ساتھ "رَبَّنَاۤ" (اے ہمارے پالنے والے!) بھی ملایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ اللہ تھے، نہ اللہ

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اللہ نے فرمایا بے شک میں اسے تم پر اتارنے والا ہوں، پھر جو اس کے بعد تم میں سے ناشکری کرے گا تو بے شک میں اسے عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ وہ جہانوں میں سے کسی ایک کو نہ دوں گا ﴿۱۱۵﴾

کے بیٹے، نہ اللہ کے اختیار رکھنے والے، ان کے حواری بھی ان میں سے کسی چیز کے قائل نہ تھے، ورنہ وہ عیسیٰ علیہ السلام سے دعا کیوں کرواتے اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اتنی عاجزی کے ساتھ دعا کیوں کرتے، بلکہ ان کے حواری خود ان سے مائدہ کا مطالبہ کرتے اور وہ خود ہی پورا کر دیتے۔

② تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا: علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ وہ دستر خوان اتوار کے دن اترا، کیونکہ وہ نصرانیوں کی عید ہے، سبت یہودیوں کی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عید کا دن جمعہ تھا مگر یہودیوں اور نصرانیوں نے اصل دن میں اختلاف کیا اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر کسی چون و چرا کے بغیر جمعہ کو تسلیم کر لیا۔ [دیکھیے مسلم، الجمعة، باب هداية هذه الأمة...... : ۸۵۶] لفظ عید "عَادَ يَعُوْدُ" سے ہے، یعنی ایسی خوشی جو بار بار لوٹ کر آئے، یہ سالانہ بھی ہو سکتی ہے اور ہفتہ وار بھی۔ مسلمانوں کی دو عیدیں سالانہ ہیں اور ایک ہر ساتویں دن عید جمعہ ہے۔ ان کے علاوہ کوئی عید قرآن و سنت سے ثابت نہیں، مثلاً عید میلاد یا عید غدیر وغیرہ، یہ سب خود ساختہ اور بدعت ہیں۔

③ وَاٰيَةً مِّنْكَ: یعنی تیری توحید اور تیرے نبی کی رسالت کے حق ہونے پر دلیل قائم ہو۔ (کبیر)

④ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: کیونکہ حقیقت میں تو ہی روزی دینے والا ہے، تیرے سوا ایک بھی روزی پیدا کرنے والا نہیں، سب تیرا دیا ہوا ہی کھاتے، یا کسی دوسرے کو دیتے ہیں۔

آیت 115 قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ...... : علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ دستر خوان اترا یا نہیں، اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ اترا، شوکانی، ابن جریر اور بہت سے علماء نے اسی کو صحیح کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا تاکید کے ساتھ فرمانا: ﴿ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ﴾ "یقیناً میں اسے تم پر اتارنے والا ہوں۔" یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اتارا۔ جامع ترمذی میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مائدہ آسمان سے گوشت روٹی کی صورت میں اترا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ نہ خیانت کریں اور نہ کل کے لیے ذخیرہ کریں، مگر انھوں نے خیانت کی اور ذخیرہ کیا اور کل کے لیے اٹھا رکھا تو انھیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں بدل دیا گیا۔" [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة المائدة : ۳۰۶۱] اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو کسی کو اختلاف کی مجال ہی نہ تھی، مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس کے حدیث رسول ہونے یا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کا قول ہونے، دونوں باتوں کو ضعیف کہا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء کا کہنا ہے کہ بعد کے الفاظ: ﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یہ الفاظ سن کر وہ ڈر گئے اور انھوں نے دعا کا مطالبہ واپس لے لیا۔ یہ قول

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

اور جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود بنا لو؟ وہ کہے گا تو پاک ہے، میرے لیے بنتا ہی نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں، اگر میں نے یہ بات کہی تھی تو یقیناً تو نے اسے جان لیا، تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے، یقیناً تو ہی سب چھپی باتوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۶﴾

مجاہد اور حسن بصری کا ہے، ان کی سندوں کو ابن کثیر نے صحیح کہا ہے، مگر یہ بھی تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں کا قول ہے، رسول اللہ ﷺ سے یہ بات بھی ثابت نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مائدہ اترا تھا، وہ اس کا ایک قرینہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس سے پہلی آیات میں اللہ نے مسیح علیہ السلام پر اپنے احسان شمار کیے ہیں، ان کے ساتھ اس واقعہ کو بھی بطور احسان ذکر فرمایا ہے اور آخر میں ان سے سوال کیا ہے کہ کیا تم نے میرے اتنے احسانات کے باوجود لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لینا، اس لیے مائدہ کا اترنا بھی ایک احسان تھا۔ دوسرے حضرات کہہ سکتے ہیں کہ مائدہ نہ اتار کر انھیں امتحان سے بچا لینا بھی ایک احسان ہی تھا۔ بہرحال قرآن مجید کے الفاظ دونوں صورتوں کا احتمال رکھتے ہیں اور اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”شاید عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کا اثر ہے کہ اس کی امت میں مال کی آسودگی ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے۔“ مگر رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا امتی وہی ہے جو اسلام قبول کر لے، دوسرے لوگوں کا اپنے آپ کو مسیح علیہ السلام کا امتی کہلانا سینہ زوری ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے واضح طور پر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ اب تمام دنیا رسول اللہ ﷺ ہی کی امت ہے، خواہ وہ امت اجابت ہو یا امت دعوت۔ رہا دنیا کا مال تو وہ کبھی کسی کے پاس زیادہ ہوتا ہے، کبھی کسی کے پاس، اس کا ایمان و کفر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَآءِ وَ هٰۤؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ﴾ [بنی إسرائیل : ۲۰] ”ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [آل عمران : ۱٤۰] ”اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔“

آیت 116 ① وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ...... : اس کا تعلق اوپر کی آیت: ﴿ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ ﴾ کے ساتھ ہے، گویا پہلے بطور تمہید عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات شمار کیے اور اب اصل مقصد شروع ہو رہا ہے۔ یہ

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

میں نے انھیں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو، جو میرا رب اور تمھارا رب ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب تک ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۱۱۷﴾

سوال قیامت کے دن ہو گا، کیونکہ آگے چل کر آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ﴾ اس خطاب سے مقصود عیسیٰ علیہ السلام کو ڈانٹنا نہیں ہو گا، بلکہ ان کو ڈانٹنا مقصود ہو گا جنھوں نے مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کو معبود بنا لیا۔ تاکہ وہ جان لیں کہ انھوں نے جس مسیح اور اس کی ماں کو معبود اور حاجت روا بنایا وہ تو خود اللہ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے اور امت کے شرک کی وجہ سے ان سے باز پرس ہو گی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نصرانیوں نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ ان کی والدہ کو بھی معبود بنا لیا، تیسری یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ بھی " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " (اللہ کے سوا) ہیں، صرف پتھر یا لکڑی یا کسی دھات کے بنے ہوئے بت ہی " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " نہیں، جنھیں پکارنے سے آدمی مشرک ہو جاتا ہے، جیسا کہ آج کل کے قبر پرست لوگوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " نہیں، ان سے مرادیں مانگنا اور فریاد کرنا جائز ہے، یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " میں مسیح علیہ السلام، ان کی والدہ ماجدہ اور تمام انبیاء و صلحاء شامل ہیں، ان میں سے کسی کو حاجت روا، مشکل کشا اور خدائی اختیارات کا مالک سمجھنا صاف شرک اکبر ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی ہے ہی نہیں۔

② سُبْحٰنَكَ: تو ہر شریک سے پاک ہے، پھر میں اور میری والدہ تیرے شریک کیسے ہو سکتے ہیں۔

③ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ...... : یعنی میں تو تیرے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، پھر بندے کی کیا مجال کہ اپنے آقا کے مقابلے میں خدائی کا دعویٰ کرے۔

④ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ: یعنی بالفرض میں نے ایسی کوئی بات کہی بھی ہو تو تجھے ضرور اس کا علم ہو گا، کیونکہ تجھ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

⑤ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ...... : جب تو میرے دل کی بات جانتا ہے تو زبان سے نکالی ہوئی کیوں نہ جانے گا؟ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے لیے نفس ثابت ہوتا ہے۔

⑥ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: تیرے سوا کسی کو علم غیب نہیں، جس بندے کے پاس جو بھی علم ہے وہ سب تیرا ہی عطا کردہ ہے، کسی اور کا علم تیرے علم کے مقابلے میں اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا جتنی سمندر کے مقابلے میں پانی کا ایک قطرہ اور جسے اتنا ہی علم ہو جو اسے بتایا گیا ہے وہ عالم الغیب نہیں، عالم الغیب تو وہ ہے جو کسی کے بتائے بغیر سب کچھ جانتا ہے اور وہ فقط تیری ذات پاک ہی ہے۔

آیت 117 ① اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ...... : یعنی صرف اللہ ہی کی عبادت کرو جو میرا اور تمھارا سب کا رب ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اگر تو انھیں عذاب دے تو بے شک وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں بخش دے تو بے شک تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۱۸﴾

② فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ : اس آیت سے قادیانی استدلال کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ عیسیٰ علیہ السلام یہ بیان قیامت کے دن دیں گے جب وہ زمین پر آنے کے بعد اپنی عمر پوری کر کے فوت ہو چکے ہوں گے۔ اگر اصرار کیا جائے کہ "تَوَفَّيْتَنِيْ" سے مراد پہلا وقت ہے، جب انھیں آسمان پر اٹھایا گیا تھا تو معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ وفات قرآن پاک میں تین معنی میں آیا ہے، ایک موت، جیسے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ [الزمر : ۴۲] ''اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے۔'' دوسرے نیند، جیسے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ ﴾ [الأنعام : ۶۰] ''اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے۔'' تیسرے جسم سمیت اٹھا کر لے جانا، جیسے یہاں ہے اور سورۂ آل عمران (۵۵) اور سورۂ نساء (۱۵۸) میں ہے۔

③ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ...... : یعنی میں تو اس وقت تک کے ان کے ظاہری اعمال کی شہادت دے سکتا ہوں جب تک میں ان کے اندر موجود تھا، جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو پھر تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر چیز پر شہید ہے، یعنی ان میں میری موجودگی کے وقت بھی تو ہی شہید تھا اور میرے الگ ہونے کے بعد بھی تو ہی شہید ہے۔ شہید اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ شہادت دیکھنے، سننے اور جاننے کے معنی میں بھی ہو سکتی ہے اور کلام کے ساتھ شہادت دینے کے معنی میں بھی۔ (کبیر) مگر دوسروں کے حق میں مطلق شہید یا شاہد کا لفظ (جب کہ کوئی خاص قرینہ نہ ہو) تو کلام کے ساتھ شہادت کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز اور ہر شخص کی ہر وقت خبر رکھنے والا ایک اللہ ہی ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری امت کے کچھ آدمیوں کو لایا جائے گا تو انھیں بائیں طرف کر دیا جائے گا، میں کہوں گا: ''یہ تو میرے ساتھی ہیں۔'' تو کہا جائے گا: ''تو نہیں جانتا کہ انھوں نے تیرے بعد کیا کیا کام شروع کر دیا تھا۔'' تب میں بھی اسی طرح کہوں گا جیسے اللہ کے نیک بندے (عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے: ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ پھر کہا جائے گا کہ جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ اپنی ایڑیوں پر پھرنے والے (مرتد) ہی رہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و کنت علیهم...... ﴾ : ۴۶۲۵]

آیت 118 اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ...... : اس آیت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام نہایت حکیمانہ طریقے سے ان کی سفارش کریں گے۔ پہلے اللہ کی کبریائی بیان کرتے ہوئے کہیں گے کہ اگر تو انھیں عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہی ہیں، نہ دم مار سکتے ہیں نہ بھاگ کر کہیں جا سکتے ہیں اور اگر تو انھیں معاف ہی فرما دے تو تو ہر کام پر غالب ہے اور تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ ساری رات صبح تک (نماز میں) اسی آیت کو بار بار پڑھتے

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِيْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

اللہ فرمائے گا یہ وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ، اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱۹﴾ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۲۰﴾

رہے۔“ [نسائی، الافتتاح، باب ترديد الآية : ۱۰۱۱]

آیت 119 ① قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ : سب سے بڑا ظلم اور جھوٹ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور کفر کرنا ہے اور سب سے بڑا سچ اور انصاف اللہ تعالیٰ کی توحید اور ایمان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا۔ یعنی مشرکین کی معافی اور بخشش کی کوئی صورت نہ ہوگی، البتہ توحید والوں کو ان کی توحید ضرور نفع پہنچائے گی، خواہ کتنے گناہ گار ہوں۔ چنانچہ ابوذر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تک اس آیت کو نماز میں پڑھتے رہے: ﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ [المائدۃ : ۱۱۸] ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ اس آیت کو ساری رات پڑھتے رہے، یہاں تک کہ اپنے رکوع اور سجدے میں بھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس آیت کو بار بار پڑھ کر میں نے اللہ تعالیٰ سے شفاعت کی التجا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے میری التجا قبول کر لی ہے، میری امت میں سے جو شخص بغیر شرک کی حالت میں مرے گا اس کو میری شفاعت نصیب ہوگی۔“ [أحمد : ۱۴۹/۵، ح : ۲۱۳۸٦] ”الصّٰدِقِيْنَ“ کے لیے مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۷)، سورۂ زمر (۳۳) اور سورۂ حجرات (۱۵)۔

② ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ : اس کے مقابلے میں دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی بھی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

آیت 120 سورت کے آخر میں نصاریٰ کی تردید کے سلسلہ میں یہ خاتمہ نہایت مناسب ہے، یعنی اکیلا وہی زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا (جن میں انسان بھی ہیں) بادشاہ ہے اور یہ حق بھی اسی کا ہے کہ اس کی بندگی کی جائے، عیسیٰ علیہ السلام ہوں یا ان کی والدہ یا روح القدس، سب اس کے بندے ہیں، جو کسی طرح معبود ہونے میں اس کے شریک قرار نہیں دیے جا سکتے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ ۶ مدنیۃ ۵۵ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰیَاتُهَا ۱۶۵ رُکُوْعَاتُهَا ۲۰

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؕ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں ① وہی ہے جس نے تمھیں حقیر مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت مقرر کی اور ایک اور مدت اس کے ہاں مقرر ہے، پھر (بھی) تم شک کرتے ہو ②

یہ سورت اسلام کے بنیادی عقائد توحید و آخرت وغیرہ کے ثبوت اور مشرکین اور اہل بدعت کے رد کے دلائل پر مشتمل ہے، سورۂ بقرہ کے ساتھ اس کی فضیلت ذکر ہو چکی ہے۔

آیت 1 ① اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: اس آیت میں اکیلے اللہ تعالیٰ کے تمام خوبیوں کا مالک اور معبود ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے اور کفار کے شرک پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔

② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ...... : اللہ تعالیٰ نے یہاں دو قسم کی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک زمین و آسمان کا جو جوہر ہیں، یعنی اپنا الگ وجود رکھتے ہیں اور دوسرے اندھیروں اور اجالے کا جو عرض ہیں، یعنی دوسری چیزوں کے ذریعے سے قائم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی جوہر یا عرض ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا نہ کیا ہو۔ اندھیروں اور اجالے سے یہی رات اور دن مراد ہیں، یا پھر ایمان کا نور اور کفر کے اندھیرے۔ (قرطبی) "النُّوْرَ" کو واحد اور "الظُّلُمٰتِ" کو جمع بیان کرنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ ایمان کا نور ایک ہی ہے، جبکہ کفر کی گمراہیاں بے شمار ہیں۔ سیدھا راستہ ایک ہے اور غلط راستوں کا شمار ہی نہیں۔

③ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ : یعنی جب ہر چیز کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور یہ مشرکین اسے اپنا رب (پالنے والا) بھی تسلیم کرتے ہیں تو ان پر لازم تھا کہ عبادت بھی اسی کی کرتے، مگر یہ پھر بھی دوسروں کو اس کے برابر گردانتے ہیں، ان کے سامنے سجدے کرتے ہیں، ان کے نام کی نذریں چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں اور مشکلات میں ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ کس قدر بے عقلی ہے کہ پیدا اللہ تعالیٰ کرے، روزی بھی وہی دے، پھر مانگا غیر سے جائے اور اسے اپنے رب کے برابر ٹھہرایا جائے۔ دیکھیے سورۂ لقمان (۱۰، ۱۱) اور سورۂ عنکبوت (۶۱ تا ۶۳)۔

آیت 2 ① هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ: تمھیں مٹی سے پیدا کیا، یعنی آدم علیہ السلام کو، باقی سب لوگ چونکہ آدم ہی کی اولاد ہیں، اس لیے گویا سبھی مٹی سے پیدا ہوئے۔ "طِیْنٍ" میں تنوین تحقیر کے لیے ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "حقیر مٹی" کیا گیا ہے۔

② ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا: پھر ایک مدت مقرر کی، یعنی موت کا وقت اور ایک اور مدت اس کے ہاں مقرر ہے، یعنی قیامت کا وقت،

وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝۳ وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝۴

اور آسمانوں میں اور زمین میں وہی اللہ ہے، تمھارے چھپے اور تمھارے کھلے کو جانتا ہے اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو ۳
اور ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی مگر وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہوتے ہیں ۴

جسے صرف وہ جانتا ہے، اس کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں۔ پھر بھی تم شک کرتے ہو، یعنی اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جس نے مٹی کی ایک مٹھی سے تمھیں پیدا کیا، وہ دوبارہ بھی تمھیں زندہ کر سکتا ہے۔

آیت 3 وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ ...... : اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال کو ثابت کیا ہے، اس آیت میں اس کے علم کا کامل ہونا ثابت فرمایا ہے، یعنی وہی ہستی ہے جسے آسمانوں اور زمین میں اللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ آیت تقریباً اس آیت کی ہم معنی ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴾ [الزخرف : ۸۴] ''اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہ کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔'' یعنی آسمانوں اور زمین میں ایک ہی ذات ہے جسے ''اللہ'' کہہ کر پکارا جاتا ہے، جس کی آسمانوں اور زمین دونوں میں حکومت ہے اور دونوں میں اس اکیلے ہی کی عبادت کی جاتی ہے، کیونکہ وہ تمھاری ہر چھپی یا کھلی بات کو اور تمھارے ہر عمل کو جانتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے علم کا کمال ثابت ہوتا ہے اور یہ کمال اس کے معبود برحق ہونے کی ایک دلیل ہے۔

بعض لوگ اس آیت کو اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کے خلاف بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ ہے اور کوئی عرش وغیرہ نہیں، جس پر اللہ تعالیٰ بلند ہو، حالانکہ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں، کیونکہ آیت میں اس کی ذات یا شخصیت کے آسمان و زمین میں ہونے کا بیان نہیں بلکہ زمین و آسمان میں اس کے ''اللہ'' یعنی معبود برحق ہونے کا بیان ہے، رہی اس کی ذات تو قرآن مجید میں اس کے عرش کا اور اللہ تعالیٰ کے اس کے اوپر ہونے کا واضح بیان ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً اٹھارہ جگہ اللہ تعالیٰ کے عرش کا ذکر ہے، اور آٹھ جگہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر ہے، اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش کے اوپر ہے، البتہ اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے وہ ہر جگہ ہے۔ اس لیے یہاں اس کے زمین و آسمان میں اللہ اور الٰہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ دونوں جگہ عبادت اسی کی کرنا لازم ہے اور دونوں جگہ وہی ہے جو کمال علم کی وجہ سے معبود برحق ہونے کا حق دار ہے۔

آیت 4 وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ ...... : ان آیات سے مراد وہ احکام بھی ہیں جو آیات کی صورت میں انبیاء علیہم السلام پر اترتے رہے اور وہ معجزات بھی جو نبوت کی دلیل کے طور پر اترتے رہے۔ اس کے علاوہ زمین و آسمان میں موجود وہ بے شمار نشانیاں بھی جو اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں، مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۴)، یوسف (۱۰۵) اور ذاریات (۲۰ تا ۲۳)۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶

پس بے شک انھوں نے حق کو جھٹلا دیا، جب وہ ان کے پاس آیا، تو عنقریب ان کے پاس اس کی خبریں آ جائیں گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے ہیں ⑤ کیا انھوں نے نہیں دیکھا ہم نے ان سے پہلے کتنے زمانوں کے لوگ ہلاک کر دیے، جنھیں ہم نے زمین میں وہ اقتدار دیا تھا جو تمھیں نہیں دیا اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش برسائی اور ہم نے نہریں بنائیں، جو ان کے نیچے سے بہتی تھیں، پھر ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسرے زمانے کے لوگ پیدا کر دیے ⑥

آیت 5 فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ ...... : اوپر کی آیات میں توحید اور آخرت کو ثابت کیا ہے، اس آیت میں تقلید کا باطل ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ (رازی) حق سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ پر اترنے والی کتاب ہیں۔ کفار جس چیز پر ہنستے تھے وہ آخرت اور اس میں پیش آنے والے معاملات تھے اور اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے بھی جو اس نے قرآن میں دین اسلام کے غالب اور دشمنوں کے مغلوب ہونے سے متعلق کیے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تو یہ کفار اس وعدے کو محض مذاق سمجھتے ہوئے اس پر ہنستے اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن عنقریب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا جائے گا اور پھر ایسے واقعات پیش آئیں گے کہ جن سے یہ وعدہ حقیقت بن کر ان کے سامنے آ جائے گا اور آنکھیں بند ہونے کی دیر ہے کہ آخرت بھی، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ان کے سامنے آ جائے گی۔

آیت 6 اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا ...... : کفار کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ کیا انھیں معلوم نہیں کہ ان سے پہلے کئی اقوام، مثلاً قوم نوح، عاد و ثمود اور آل فرعون جو قوت و اقتدار میں ان سے کہیں بڑھ کر تھے اور بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ اور کھیت سرسبز و شاداب تھے اور عیش و خوشحالی کا دور دورہ تھا، جب انھوں نے بغاوت اور سرکشی پر کمر باندھی تو ہم نے ان کا نام و نشان مٹا دیا، پھر ان کے بعد اور قومیں پیدا کر دیں۔ جب تم سے زیادہ طاقت ور قوموں کو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا تو تمھاری کیا حیثیت ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ احقاف (۲۶، ۲۷) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیوی ترقی اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ ان پر حجت قائم کرنے کے لیے استدراج (رسی ڈھیلی کرنا) بھی ہو سکتا ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ آخرت کو سامنے آئے گا۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ
جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝

اور اگر ہم آپ پر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی چیز اتارتے، پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، یہی کہتے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ⑦ اور انھوں نے کہا اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو ضرور کام تمام کر دیا جاتا، پھر انھیں مہلت نہ دی جاتی ⑧ اور اگر ہم اسے فرشتہ بناتے تو یقیناً اسے آدمی بناتے اور ضرور ان پر وہی شبہ ڈالتے جو وہ (اپنے آپ پر اور دوسروں پر) ڈال رہے ہیں ⑨

آیت 7 وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا...... : اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو انبیاء کے معجزات کی کوئی الٹی سیدھی تاویل کر کے انھیں جھٹلا دیتے تھے۔ (رازی) اس آیت میں کفار مکہ کی نبی کریم ﷺ کو جھٹلانے کے لیے پیش کردہ فرمائشوں میں سے ایک فرمائش (بنی اسرائیل: ۹۳) کا جواب ہے کہ ہم اس وقت تک تمھارے آسمان پر چڑھنے کا یقین نہیں کریں گے جب تک تم ہم پر ایسی کتاب نازل نہیں کرتے جسے ہم خود پڑھیں۔ یہ لوگ اپنی سرکشی اور کفر کی روش میں اس قدر پختہ ہیں کہ اگر ہم ان پر آسمان سے لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے، جسے یہ اپنے ہاتھوں سے چھو کر صاف معلوم کر لیتے کہ یہ کوئی خیالی اور نظر بندی جیسی چیز نہیں، بلکہ حقیقت ہے، تب بھی یہ لوگ اسے کھلا جادو قرار دیتے، پھر اگر یہ بد بخت قرآن کو جادو قرار دیتے ہیں تو کیا تعجب ہے؟ (قرطبی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جس کی قسمت میں ہدایت نہیں اس کا شبہ نہیں مٹتا۔'' (موضح) مزید دیکھیے سورۂ حجر (۱۴، ۱۵) اور طور (۴۴)۔

آیت 8 ① وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ : یہ نبوت کے منکرین کا ایک اور اعتراض ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی طرف رسول بھیجنا ہی تھا تو وہ انسان کے بجائے فرشتہ ہونا چاہیے تھا، یا فرشتہ اس کے ساتھ ساتھ پھرتا اور کہتا کہ یہ اللہ کا رسول ہے، اس پر ایمان لے آؤ، ورنہ تمھیں سزا دی جائے گی۔

② وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ...... : یہ پہلا جواب ہے۔ (رازی) کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ چلا آیا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نبی سے معجزہ طلب کرے اور وہ اسے دکھا دیا جائے، لیکن اس کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے تو اسے ہلاک کر دیا جاتا ہے، اس لیے اگر فرشتے اصل صورت میں نازل ہوتے تو ان کے پاس عذاب لے کر آتے اور ان کا قصہ ہی تمام ہو جاتا۔ دیکھیے سورۂ حجر (۶ تا ۸) اور سورۂ فرقان (۲۱، ۲۲)۔

آیت 9 وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا...... : یہ کفار کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے، یعنی ان کے مطالبے کو مانتے ہوئے ہم فرشتہ اتارنا منظور کر بھی لیتے تو وہ بھی انسانی صورت میں آتا، کیونکہ یہ اسے اس کی اصل شکل میں تو دیکھ ہی نہیں سکتے اور جب وہ

وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾
قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا، تو ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے مذاق اڑایا تھا، اسی چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۱۰﴾ کہہ دے زمین میں چلو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۱۱﴾ کہہ کس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے؟ کہہ اللہ کا ہے، اس نے اپنے آپ پر رحم کرنا لکھ دیا ہے، یقیناً وہ تمھیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) ضرور جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، سو وہی ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲﴾

آدمی کی شکل میں ہوتا تو پھر یہی اعتراض کرتے جو اب کر رہے ہیں۔ اس وقت کے کافر کسی انسان کو نبی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، کیونکہ آپ ﷺ ان کی قوم سے تھے، ان کے سامنے جوان ہوئے اور انھی میں زندگی گزاری۔ اب کچھ لوگ آپ ﷺ کو نبی تو مانتے ہیں، مگر آپ ﷺ کو انسان ماننے کے لیے تیار نہیں۔ گویا ایک ہی عقیدے کی دو شکلیں ہیں اور دونوں باطل ہیں، حالانکہ اللہ نے اپنا احسان جتلایا ہے کہ میں نے انسانوں میں انھی کے اندر سے رسول بھیجا ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۶۴)۔

آیت 10 وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ ...... : اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ آپ کو جھٹلانے اور اللہ کے عذاب کا مذاق اڑانے کا جو معاملہ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، پہلے رسولوں کے ساتھ بھی ہوا، آخر کار اسی عذاب نے کفار کو آ گھیرا جس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی عذاب نہیں آئے گا، یہ محض دھمکی ہے۔

آیت 11 قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... : اس سے کفار کو ڈرانا مقصود ہے، یعنی دنیا کے مختلف خطوں میں جو قومیں پائی گئی ہیں، ذرا ان کے حالات اور تاریخ پر غور کرو، تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کی اطاعت سے انکار کیا انھیں کیسے عبرت ناک انجام سے دو چار ہونا پڑا، پھر اس سے اندازہ کر لو کہ اب جو تم ہمارے آخری رسول ﷺ اور آخری کتاب کا مذاق اڑا رہے ہو تمھارا انجام کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

آیت 12 ① قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...... : وعظ و نصیحت اور ڈرانے کے بعد انھی تینوں اصولوں (کائنات کی ابتدا، اسے دوبارہ زندہ کرنے اور انبیاء کی نبوت) کو ثابت کرنے پر دلیل قائم کی ہے۔ نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ان کافروں سے پوچھیے کہ آسمانوں اور زمین کا مالک کون ہے؟ اس سوال کا مقصد ڈانٹ اور پھٹکار ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ⑬

اور اسی کا ہے جو کچھ رات اور دن میں ٹھہرا ہوا ہے اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ⑬

آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ خود ہی جواب دے دیجیے کہ اللہ کے سوا کون ہو سکتا ہے اور یہ جملہ بھی رسول اللہ ﷺ ہی کی زبانی ادا کیا گیا ہے کہ آپ یہ بھی کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کرنا لازم کر لیا ہے، وہ توبہ و استغفار قبول کرتا ہے اور اسی صفت رحمت کا تقاضا ہے کہ اس نے تمھیں دنیا میں مہلت دی ہے، فوراً نہیں پکڑتا، لیکن قیامت کے دن تم سب کو اکٹھا کرے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے اپنے پاس کتاب میں، جو اس کے پاس عرش کے اوپر ہے، اپنے متعلق لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''
[بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالٰی: ﴿ ویحذرکم اللہ نفسہ...... ﴾ : ۷۴۰۴]

لیکن یہ رحمت قیامت کے دن صرف اہل ایمان کے لیے ہوگی، کافروں کے لیے اللہ تعالیٰ سخت غضب ناک ہوگا۔ دنیا میں اس رحمت سے مسلم اور کافر، نیک اور بد سب فائدہ اٹھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأعراف : ۱۵٦] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں۔'' مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸) رہا دنیا میں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَاۗءِ وَهٰٓؤُلَاۗءِ مِنْ عَطَاۗءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَاۗءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴾ [بنی إسرائیل : ۲۰] ''ہم ہر ایک کی مدد کرتے ہیں، ان کی بھی اور ان کی بھی، تیرے رب کی بخشش سے اور تیرے رب کی بخشش کبھی بند کی ہوئی نہیں۔''

② لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَارَيْبَ فِيْهِ ......: یعنی قیامت کا آنا ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی سمجھ دار آدمی انکار نہیں کر سکتا، اس سے انکار اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہی جو اپنی عقل و فطرت سے کام نہیں لیتا اور خسارے کے سودے پر اڑا ہوا ہے، نفع کے سودے کی خواہش ہی نہیں رکھتا، حالانکہ اللہ نے فرمایا: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾ [آل عمران : ۱۸۵] ''پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا۔''

آیت 13 وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ......: گزشتہ آیت: ﴿ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ میں مکان (جگہ) کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہر جگہ بادشاہ ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں زمان اور وقت کے اعتبار سے اس کی بادشاہی عام ہونے کا ذکر ہے۔ کیونکہ آسمان و زمین کے سوا کوئی مکان (جگہ) نہیں اور رات اور دن کے سوا کوئی زمانہ (وقت) نہیں، گویا ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور اسی کا قبضہ و اقتدار ہے۔ پھر یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ تمام جگہوں اور تمام اوقات اور زمانوں کا مالک ہے، فرمایا: ﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ یعنی وہ ہر چیز کی دعا اور پکار سنتا ہے۔ ''اَلْعَلِيْمُ'' ہر چیز کے عمل اور اس کی ضرورت سے آگاہ ہے تو پھر کسی اور کو پکارنے کی ضرورت کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہاں ''مَا سَكَنَ'' میں

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ
اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ
رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی مالک بناؤں جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، حالانکہ وہ کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا۔ کہہ بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا شخص بنوں جو فرماں بردار بنا، اور تو ہرگز شریک بنانے والوں سے نہ ہو ﴿۱۴﴾ کہہ دے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بے شک میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۱۵﴾ جس شخص سے اس دن وہ ہٹا لیا جائے گا تو یقیناً اس نے اس پر رحم کر دیا اور یہی کھلی کامیابی ہے ﴿۱۶﴾

سکون سے مراد حلول، یعنی رہنا ہے اور سکون جو حرکت کی ضد ہے وہ مراد نہیں۔ اس لیے ٹھہرا ہوا ہے کا معنی بھی یہی ہے کہ جو بھی رات اور دن میں بس رہا ہے۔

آیت 14 ❶ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا: ''ولی'' کا معنی دوست بھی آتا ہے، مالک و مددگار اور معبود و کارساز بھی، یہاں اس کا معنی مالک و مددگار اور معبود و کارساز ہے، یعنی وہ زمان و مکاں کا خالق ہی نہیں بلکہ اسے باقی رکھنے والا اور چلانے والا بھی وہی ہے، اسے کسی سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں، باقی سب اسی کا دیا ہوا کھانے والے اور ہر لحاظ سے اس کے محتاج ہیں۔ اس ایک جملے سے مشرکین نے اللہ کے سوا جتنے معبود بنا رکھے تھے، ان سب کی نفی ہو جاتی ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ ذاریات (۵۶ تا ۵۸)۔

❷ قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ ...... : کیونکہ میں اس کا رسول ہوں اور رسول کا کام یہ ہے کہ تمام بندوں سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اپنے مالک کے احکام کو مانے۔ اور ﴿ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شرک میں مبتلا ہوتا ہے تو ہوتا پھرے، آپ کا یہ کام نہیں کہ اس لعنت میں پڑنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں لائیں۔

آیت 15 قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ ...... : رسول اللہ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان کروا کر دوسرے سب لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اگر بفرض محال ہمارے معصوم اور سب سے زیادہ نیک بندے سے بھی نافرمانی کا ارتکاب ہو جائے تو وہ بھی ہمارے عذاب سے نہیں بچ سکتا، پھر دوسروں کے لیے کیسے ممکن ہے کہ انبیاء کو جھٹلانے جیسے جرائم کرنے کے باوجود ہمارے عذاب سے بے فکر ہو کر بیٹھ رہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ انعام (۸۱ تا ۸۸) اور سورۂ زمر (۶۴، ۶۵)۔

آیت 16 مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ ...... : یعنی بلند مقام حاصل کرنا تو بہت بڑی بات ہے، اگر کسی سے آخرت کا عذاب ہی ٹل جائے تو اپنی جگہ یہی بہت واضح کامیابی ہے۔

وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡكَ بِخَیۡرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱۷﴾ وَ هُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الۡحَكِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۸﴾ قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَكۡبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ۙ شَهِیۡدٌۢ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَكُمۡ ۟ وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَ مَنۡۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمۡ

اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۱۷﴾ اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہی کمال حکمت والا، ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۸﴾ کہہ کون سی چیز گواہی میں سب سے بڑی ہے؟ کہہ اللہ میرے درمیان اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے، تاکہ میں تمھیں اس کے ساتھ ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے، کیا

آیت 17 وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ ...... : اس آیت سے شرک کی جڑ کٹ گئی۔ کیونکہ جس انسان کا یہ عقیدہ پختہ ہو جائے کہ دکھ اور تکلیف کو دور کرنے والا اور ہر قسم کی خیر کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے تو پھر وہ دوسروں کے آگے سجدے کرنا اور ان کی قبروں پر نذرانے چڑھانا اور سمجھنا کہ وہ حاجتیں پوری کر سکتے ہیں، بہت بڑی حماقت سمجھے گا۔ قرآن نے اس بات پر خصوصی زور دیا ہے کہ ہر قسم کا نفع وضرر اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس پر عقیدہ پختہ ہو جائے تو انسان شرک میں مبتلا نہیں ہوتا۔ مزید دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۸)، یونس (۱۰۴ تا ۱۰۷)، فاطر (۲)، سورۂ زمر (۳۸) اور سورۂ جن (۲۱)۔

آیت 18 وَ هُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ ...... : یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے سوا کسی کو ولی نہیں بنانا چاہیے۔ (رازی) مطلب یہ ہے کہ سب لوگ، خواہ بڑے سے بڑے جابر ہوں، اس کے سامنے بے بس ہیں، تمام گردنیں اس کے آگے جھکی ہوئی ہیں، وہ ہر ایک پر غالب ہے اور ساری کائنات اس کی مطیع ہے۔ صفات کمال دو ہیں، قدرت اور علم، پہلے جملے ﴿ وَ هُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ ﴾ میں کمال قدرت کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے جملے ﴿ وَ هُوَ الۡحَكِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴾ سے کمال علم ثابت ہوتا ہے، یعنی وہ اپنے احکام میں کمال حکمت والا اور اپنے بندوں کے معاملات کی پوری خبر رکھنے والا ہے۔ (رازی) اس لیے غلبہ و تسلط کے باوجود اپنی مخلوق کے معاملے میں حکمت اور آگاہی کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔

آیت 19 ① قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَكۡبَرُ شَهَادَةً ...... : کفارِ مکہ کے بعد جب یہود و نصاریٰ کی اکثریت نے بھی آپ کو جھٹلا دیا تو کفار کہنے لگے، بتاؤ اب تمھاری رسالت کی گواہی کون دیتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ ان کافروں سے کہیے کہ اللہ کی ہستی سے بڑی ہستی کون سی ہے؟ جب کوئی نہیں تو بتاؤ سب سے بڑا شہادت دینے والا کون ہوگا؟ آپ خود ہی ان کے سامنے واضح فرما دیجیے کہ وہ تو اللہ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی گواہی یہ ہے کہ اس نے مجھ پر قرآن اتارا، جو قیامت تک کے لیے زندہ معجزہ ہے کہ کوئی بھی اس کی کسی ایک سورت جیسی کوئی سورت نہیں لا سکا اور نہ لا سکے گا۔ یہ قرآن معجزہ ہونے کے اعتبار سے میرے سچے نبی ہونے کی صریح دلیل ہے، اسی کے پیش نظر فرمایا: ﴿ وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ ﴾ ''اور میری طرف

لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ⑲ ۘ

بے شک تم واقعی گواہی دیتے ہو کہ بے شک اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دے میں (یہ) گواہی نہیں دیتا، کہہ دے وہ تو صرف ایک ہی معبود ہے اور بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک ٹھہراتے ہو ⑲

یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔'' (رازی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہاں گواہی فرمایا قسم کو، یعنی میں قسم کھاتا ہوں اللہ کی، اس سے زیادہ کیا قسم ہوگی۔ (موضح) اس آیت میں اللہ کے لیے ''شَیْءٌ'' ہونے کو ثابت کیا جا رہا ہے کہ وہ ایک موجود، زندۂ جاوید ہستی ہے، محض ایک خیال و تصوراتی ہستی نہیں ہے۔

② لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ: یعنی میری طرف یہ قرآن اس لیے وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمھیں اس سے ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے۔ اس سے مراد قیامت تک آنے والے تمام عرب و عجم اور جن و انس ہیں اور مقصد یہ ہے کہ میری رسالت عالم گیر اور قیامت تک کے لیے ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے مطابق روم، ایران، حبشہ اور کئی ممالک کو دین اسلام کی دعوت دی اور اپنی امت کے ہر فرد کو حکم دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً)) ''میری طرف سے پہنچا دو خواہ ایک آیت (مسئلہ) ہو۔'' [بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بنی إسرائیل : ۳۴٦۱، عن عبد الله بن عمرو رضی اللہ عنہ] اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری بات سننے والوں میں سے ہر شخص اسے پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔'' [بخاری، الحج، باب الخطبة أیام منًی : ۱۷٤۱]

اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ہر اس بندے (کے چہرے) کو تر و تازہ رکھے جو میری بات یاد رکھے اور آگے پہنچا دے۔'' [ترمذی، العلم، باب ما جاء فی الحث علی تبلیغ السماع : ۲٦۵٦ تا ۲٦۵۸] ان احادیث اور آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے احکام تمام لوگوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ ہر زمانے کے لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اسے اگلے زمانے کے لوگوں تک پہنچائیں۔ قرآن کے احکام کو صرف نبی ﷺ کے زمانے تک محدود رکھنا اور حالات کی تبدیلی کے بہانے قرآن و حدیث کے احکام میں تبدیلی کرنا، قرآن کے احکام سے جان چھڑانے کی کوشش ہے اور صریح تحریف ہے، جس کی وجہ سے یہودی ملعون ٹھہرے۔

③ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ......: یعنی قرآن میں مذکور توحید کے واضح اور قطعی دلائل کے باوجود کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہیں۔ آپ کہہ دیجیے تم جو چاہو کہو، میں یہ شہادت کبھی نہیں دے سکتا۔ کہہ دیجیے کہ معبود تو صرف ایک اللہ ہے، میں کسی اور کو معبود نہیں مانتا اور صاف کہتا ہوں کہ میں ان تمام ہستیوں سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، بری ہوں ''مَا'' مصدریہ ہو تو معنی ہوگا، میں تمھارے شرک سے جو تم کرتے ہو، بری ہوں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۰ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۱

وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی وہ اسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، سو وہ ایمان نہیں لاتے ۝۲۰ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ پر کوئی جھوٹ باندھا، یا اس کی آیات کو جھٹلایا، بے شک حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے ۝۲۱

آیت 20 ❶ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ ......: یعنی یہود و نصاریٰ کو رسول اللہ ﷺ کے سچے رسول ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ ان کی اپنی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر خیر موجود ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۴۶)، سورۂ اعراف (۱۵۷) اور سورۂ صف (۶)۔

❷ کفارِ مکہ نے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا تو انھوں نے آپ کی نبوت سے انکار کیا اور کہا کہ تورات و انجیل میں آپ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس پر کفار نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ اہل کتاب تو آپ کی نبوت کا انکار کر رہے ہیں، پھر آپ کی نبوت کی شہادت کون دیتا ہے؟ اس کا جواب اس سے پہلی آیت میں دیا گیا ہے، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ذکر تورات و انجیل میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ آپ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کو پورے یقین سے جانتے ہیں مگر ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر انکار کر کے اپنے آپ کو خسارے میں ڈال رہے ہیں، ایسے لوگوں سے ایمان کی امید نہیں، ہاں جن لوگوں کے دلوں میں اخلاص ہے وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔

آیت 21 وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى ......: یعنی اگر میں نے جھوٹ بولا تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں اور اگر میں نے سچ پہنچایا اور تم نے جھٹلایا تو تم سے زیادہ گناہ گار کوئی نہیں، پس اپنی فکر کرو۔ (موضح) اب اس آیت میں ان کے خسارے کا سبب بیان فرمایا۔ (رازی) خسارے کا پہلا سبب افتراء علی اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا قرار دیا ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ کفار مکہ کے دین کی بنیاد ہی جھوٹ گھڑنے پر تھی۔ بتوں کو اللہ کا شریک قرار دینا، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنا اور بحیرہ و سائبہ وغیرہ کو حرام قرار دینا، یہ سب چیزیں جھوٹ گھڑنے پر مبنی تھیں۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے دین میں بہت سے افترا شامل ہو گئے تھے، مثلاً وہ تورات و انجیل کو ناقابل نسخ قرار دیتے، اپنے آپ کو اللہ کے بیٹے اور اس کے حبیب کہتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے متعلق بہت سی جہالت کی باتیں کرتے تھے۔ خسارے کا دوسرا سبب اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا ہے، جس میں معجزات و احکام کو جھٹلانا بھی شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والوں میں نبوت کے جھوٹے دعوے دار وہ تیس کذاب بھی شامل ہیں جن کی نبی ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی۔ [مسلم، الفتن، باب لا تقوم الساعۃ ...... : ۲۹۲۳/۸۴] جن میں مرزا قادیانی اور اسے نبی کہنے والے بھی

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جنھیں تم گمان کرتے تھے ﴿۲۲﴾ پھر ان کا فریب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کہیں گے اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے ﴿۲۳﴾ دیکھ انھوں نے کیسے اپنے آپ پر جھوٹ بولا اور ان سے گم ہوگیا جو وہ جھوٹ بنایا کرتے تھے ﴿۲۴﴾ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں، اس سے کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں بوجھ (رکھ دیا ہے) اور اگر وہ ہر نشانی دیکھ لیں، اس پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ جب تیرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہیں تو وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، کہتے ہیں یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ﴿۲۵﴾

شامل ہیں، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے ذمے کوئی جھوٹی حدیث لگانے والے بھی، کیونکہ آپ کے ذمے کوئی بات لگانے والا درحقیقت وہ بات اللہ کے ذمے لگا رہا ہوتا ہے۔

آیت 23،22 وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا...... : اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن جب ان سے ان کے بنائے ہوئے شریکوں سے متعلق باز پرس ہوگی تو ان کے پاس کوئی بہانہ یا فریب اس کے سوا نہ ہوگا کہ وہ قسم کھا کر اپنے شرک کرنے ہی سے انکار کر دیں گے۔ دیکھیے سورۂ مجادلہ (۱۸)۔

دوسری آیت میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۲) دونوں باتوں میں تطبیق یہ ہے کہ پہلے وہ اہل توحید کو جنت میں داخل ہوتا دیکھیں گے تو اپنے شرک کا انکار کریں گے، پھر جب ان کے مونہوں پر مہر لگے گی اور ان کے ہاتھ، پاؤں اور جسم کا ہر حصہ بول کر گواہی دے گا تو پھر ان کی کوئی بات چھپ نہیں سکے گی۔

آیت 24 اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا...... : یعنی وہاں ان کا شرک ان کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کے بنائے ہوئے حاجت روا اور مشکل کشا کہیں نظر آئیں گے۔

آیت 25 وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ...... : یعنی کان لگا لگا کر سنتے ہیں، جب قیامت کے دن گزشتہ کافروں پر گزرنے والے کچھ احوال بیان فرمائے تو موجودہ کافروں کا بھی کچھ حال بیان فرمایا۔ (رازی) فرمایا کہ مشرکین آپ کے پاس آ کر

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ
وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾

اور وہ اس سے روکتے ہیں اور اس سے دور رہتے ہیں اور وہ اپنے سوا کسی کو ہلاک نہیں کر رہے اور نہیں سمجھتے ﴿۲۶﴾ اور کاش! تو دیکھے جب وہ آگ پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش! ہم واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی آیات کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں ﴿۲۷﴾

بڑے غور سے قرآن سنتے ہیں، لیکن ضد اور عناد کی وجہ سے ہدایت حاصل کرنا ان کا مقصد ہی نہیں ہوتا، اس لیے انھیں سننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ ان کے حق کو پہچان کر نہ ماننے اور ان کی بدنیتی کی وجہ سے ہم نے انھیں یہ سزا دی ہے کہ ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگا دیے ہیں، جن کی وجہ سے وہ کان لگا کر سننے کے باوجود نہ سمجھتے ہیں، نہ سنتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹) اب قرآن جیسا عظیم معجزہ دیکھ کر وہ ایمان نہیں لائے تو یہ امید مت رکھیں کہ وہ کوئی بھی معجزہ دیکھ کر ایمان لے آئیں گے۔ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کو برحق جاننے کے باوجود ان کی ضد اور عناد یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ آپ کے پاس آ کر جب وہ آپ سے جھگڑتے ہیں اور ان انکار کرنے والوں کو آپ ﷺ کے واضح دلائل کا کوئی جواب نہیں سوجھتا تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیاں ہیں، حالانکہ قرآن مجید میں اخلاق، حکمت اور شریعت کی باتیں ہیں اور اس میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں، وہ سب سچے واقعات ہیں اور صرف عبرت و نصیحت کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

آیت 26 ❶ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ: یعنی صرف قرآن پر طعن کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قرآن سننے سے اور لوگوں کو آپ ﷺ کے پاس جانے سے بھی روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں۔ آج کل مسلمانوں میں سے بہت سے شرک و بدعت میں مبتلا مولوی بھی اہل توحید کی تقریریں سننے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں اور خود بھی نہیں سنتے، بلکہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنے سے لوگوں کو روکتے ہیں کہ کہیں حق واضح ہو جانے کے بعد اسے قبول کر کے ہمارے چنگل سے نہ نکل جائیں۔

❷ وَإِنْ يُّهْلِكُوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ: یعنی ایسا کرنے سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، بلکہ اپنی ہی ہلاکت کا سامان کر رہے ہیں اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ایسا کرنے سے ہم اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔

آیت 27 وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ ......: جب قیامت کا عذاب دیکھ لیں گے تو اس کی ہلاکت اور تباہی سے بچنے کے لیے اس خواہش کا اظہار کریں گے کہ اے کاش! ہمیں دنیا میں دوبارہ جانے کا موقع ملے تو ہم اس تکذیب سے جس کی بنا پر ہم عذاب سے دوچار ہو رہے ہیں، باز آ جائیں اور توحید و نبوت پر یقین کر لیں، لیکن یہ ان کی محض ایک خواہش ہوگی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس لیے اگلی آیت میں بتا دیا کہ وہ اس خواہش میں جھوٹ بول رہے ہیں۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾
وَ قَالُوْۤا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ
قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾

بلکہ ان کے لیے ظاہر ہوگیا جو وہ اس سے پہلے چھپاتے تھے اور اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو ضرور پھر وہی کریں گے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں ﴿۲۸﴾ اور انھوں نے کہا، نہیں ہے یہ (زندگی) مگر ہماری دنیا کی زندگی اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ﴿۲۹﴾ اور کاش! تو دیکھے جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، وہ فرمائے گا کیا یہ حق نہیں؟ کہیں گے کیوں نہیں! ہمارے رب کی قسم! فرمائے گا پھر چکھو عذاب اس کے بدلے جو تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۳۰﴾

آیت 28 ① بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا …… : اس سے پہلے (اللہ تعالیٰ کے سامنے) جس کفر و شرک اور نفاق کو وہ جھوٹی قسمیں کھا کر چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، اس کی حقیقت کھل جائے گی۔ بعض نے ”مِنْ قَبْلُ“ سے دنیا میں چھپانا مراد لیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے، یا پھر اس سے کفار کے سردار مراد ہیں، یعنی وہ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کا سچا ہونا جانتے تھے، مگر اپنے پیروکاروں سے چھپاتے تھے۔ قیامت کے دن یہ حقیقت ان کے پیروکاروں پر کھل جائے گی اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ ہمیں دھوکا دیتے رہے ہیں۔

② وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ : یعنی پھر کفر و شرک اور نفاق کی راہ اختیار کریں گے، کیونکہ ان کی یہ آرزو ایمان لے آنے کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی طرح جہنم سے بچنے کے لیے ہے۔

③ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ : اس لیے آخرت میں اس آرزو کے اظہار میں بھی جھوٹ ہی سے کام لیں گے۔

آیت 29 وَقَالُوْۤا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا …… : یعنی زندگی بس وہی ہے جو دنیا میں ہم گزار رہے ہیں، کوئی آخرت نہیں، نہ کچھ ثواب و عذاب ہے، یہ محض لوگوں کو الو بنانے کے لیے ڈھکوسلا ہے۔

آیت 30 ① وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا …… : پچھلی آیت میں کفار کا وہ قول بیان کیا ہے جو وہ دنیا میں کہا کرتے تھے اور اب آخرت میں ان کی حالت کا ذکر ہے۔

② قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ …… : کاش! آپ وہ منظر دیکھیں جب انھیں آگ کے سامنے کھڑا کر کے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا یہ (آخرت اور جزا و سزا) حق نہیں ہے۔ اب وہ اپنا قول بالکل ہی بدل لیں گے اور قسم کھا کر قیامت کے دن کے حق ہونے کا اقرار کریں گے، مگر اس وقت کا اقرار انھیں کچھ فائدہ نہیں دے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ پھر اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔ قرآن مجید میں قیامت کے دن ان کی اس خواہش کا اور اسے ٹھکرا دیے جانے کا کئی جگہ ذکر ہے۔ دیکھیے

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَ هُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

یقیناً خسارے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس قیامت اچانک آ پہنچے گی کہیں گے ہائے ہمارا افسوس! اس پر جو ہم نے اس میں کوتاہی کی اور وہ اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ سن لو! برا ہے جو وہ بوجھ اٹھائیں گے ﴿۳۱﴾ اور دنیا کی زندگی کھیل اور دل لگی کے سوا کچھ نہیں اور یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تو کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۳۲﴾ بے شک ہم جانتے ہیں کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ یقیناً تجھے وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، تو بے شک وہ تجھے نہیں جھٹلاتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات ہی کا انکار کرتے ہیں ﴿۳۳﴾

سورۂ مومنون (۱۰۷، ۱۰۸) اور سورۂ سجدہ (۱۲)۔

آیت 31 عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا: یہاں "فِيْهَا" کی ضمیر یا تو "الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ" کی طرف جا رہی ہے، یا "السَّاعَةُ" کی طرف، یعنی ہائے ہمارا افسوس! اس کوتاہی پر جو ہم نے دنیا میں کی، یا اس کوتاہی پر جو ہم نے قیامت کے بارے میں کی۔

آیت 32 ❶ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ ...... : دنیوی زندگی کے بہت جلد ختم ہونے کے اعتبار سے اس کو لہو و لعب فرمایا ہے۔ (رازی) یعنی آخرت کی حقیقی اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی اور اس کی لذتیں ایسی ہی ہیں جیسے بچوں کا کھیل تماشا جو تھوڑی دیر میں ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورۂ حدید (۲۰) انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کے راستے میں ایک شام یا ایک صبح دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے اور جنت میں تمھارے کسی شخص کی ایک کمان کی مقدار کے برابر یا اس کے کوڑے کے برابر جگہ دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے، اور اگر اہل جنت میں سے کوئی عورت زمین والوں کی طرف جھانک لے تو آسمان و زمین کے درمیان کی جگہ کو روشن کر دے اور اسے خوشبو سے بھر دے اور اس کے سر کا دوپٹا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔" [بخاری، الجهاد والسير، باب الحور العين و صفتهن : ۲۷۹۶]

❷ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ ...... : یعنی آخرت کا گھر دنیا سے کہیں بہتر ہے، مگر ان کے لیے جو کفر و شرک، نفاق اور کبائر سے بچتے ہیں، ورنہ کافر کے لیے تو دنیا کی زندگی ہی بہتر ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّةُ الْكَافِرِ » [مسلم، الزهد، باب الدنیا سجن...... : ۲۹۵۶] "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔"

آیت 33 قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ ...... : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تک نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا آپ کی قوم کے تمام لوگ

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً تجھ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تو انھوں نے اس پر صبر کیا کہ وہ جھٹلائے گئے اور ایذا دیے گئے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی اور کوئی اللہ کی باتوں کو بدلنے والا نہیں اور بلاشبہ یقیناً تیرے پاس ان رسولوں کی کچھ خبریں آئی ہیں ﴿۳۴﴾

آپ کو صادق اور امین کہتے تھے، لیکن جونہی آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور انھیں اللہ کی آیات سنانا شروع کیں تو ان میں سے اکثر آپ کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے اور آپ کو (نعوذ باللہ) جھوٹا قرار دینے لگے۔ ابوسفیان جو بدر، احد اور خندق کی جنگ کا باعث تھا، اس سے رومی بادشاہ ہرقل نے پوچھا کہ محمد (ﷺ) نے کبھی جھوٹ بولا ہے، تو اس نے کافر ہونے کے باوجود جواب دیا کہ محمد (ﷺ) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ یہ لوگ جو آپ کو جھٹلا رہے ہیں، وہ حقیقت میں آپ کو نہیں بلکہ ہماری آیات کو جھٹلا رہے ہیں، کیونکہ شخصی لحاظ سے تو آپ کو جھٹلا ہی نہیں سکتے، آپ کے نبوت سے پہلے کے چالیس سال اس کا ثبوت ہیں۔ ان سے مراد دراصل وہ کفار ہیں جو بشر کے نبی اور رسول ہونے کو محال سمجھتے تھے۔ (ابن کثیر، رازی)

آیت 34 ① وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ ...... : اس آیت میں ایک دوسرے طریقے سے آپ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ صرف آپ ہی کو نہیں، بلکہ آپ سے پہلے کئی انبیاء و رسل کو بھی جھٹلایا گیا، اس لیے آپ بھی اسی طرح صبر و استقامت سے کام لیں جس طرح انھوں نے لیا۔

② وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ : "لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آپ کی نصرت اور آپ کو غالب اور کفار کو مغلوب کرنے کا وعدہ کیا ہے، جیسے: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ [المؤمن : ۵۱] ''بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ﴾ [المجادلة : ۲۱] ''اللہ نے لکھ دیا کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول۔'' اور فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ [الفتح : ۲۸] ''وہی ہے جس نے اپنا رسول بھیجا ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔'' تو یہ وعدہ ہر حال میں پورا ہو گا، لہٰذا آپ اطمینان رکھیں کہ اللہ کی باتوں کو کوئی نہیں بدل سکتا، جس طرح انھوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اسی طرح آپ بھی صبر و استقامت سے اپنی دعوت پیش کرتے رہیں اور کسی بے چینی کو اپنے اندر راہ نہ پانے دیں۔ یقیناً آپ کی بھی اسی طرح نصرت و تائید کی جائے گی۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔؕ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

اور اگر تجھ پر ان کا منہ پھیرنا بھاری گزرا ہے تو اگر تو کر سکے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ نکالے، پھر ان کے پاس کوئی نشانی لے آئے (تو لے آ) اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً انھیں ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تو جاہلوں میں سے ہرگز نہ ہو ﴿۳۵﴾ قبول تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں انھیں اللہ اٹھائے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۳۶﴾

آیت 35 ① وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ ...... : نبی کریم ﷺ کو کفار کے جھٹلانے سے جو تکلیف اور دل شکنی ہوتی تھی اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ان لوگوں کی بے رخی اگر بہت زیادہ ہی آپ پر شاق گزر رہی ہے تو زمین میں سرنگ نکال کر یا آسمان پر سیڑھی کے ذریعے سے چڑھ کر آپ کوئی معجزہ لا کر ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں، تو آپ ایسا بھی کر کے دیکھ لیجیے، لیکن یہ چونکہ آپ سے ہو نہیں سکتا تو رنجیدہ ہونے سے کیا فائدہ، بہتر ہے کہ انجام کار ہم پر چھوڑتے ہوئے پورے اطمینان اور پورے سکون کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگے رہیں۔ کفار کس طرح کے معجزات کا تقاضا کرتے تھے، اس کے لیے دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۷)۔

② وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ ...... : یعنی ایسا خیال مت کیجیے کہ کوئی نشانی (معجزہ) لانے سے یہ راہِ ہدایت پر ضرور ہی آجائیں گے، کیونکہ ہدایت سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں اور ان لوگوں کے ایمان نہ لانے پر ہرگز کوئی غم یا افسوس نہ کریں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں تو اسے یہ کام کچھ مشکل نہ تھا، اس نے صرف "کُنْ" کہنا تھا کہ سب لوگ ایمان لے آتے اور ہدایت پر جمع ہو جاتے۔ دیکھیے یونس (۹۹) مگر ایسا کرنا اس کی مشیت اور حکمت کے خلاف ہے، جو بظاہر یہ ہے کہ اس سے اختیار دے کر آزمانے کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ بہرحال اپنے کاموں کی حقیقی حکمت و مصلحت وہی جانتا ہے، لہٰذا اس قسم کے نظریے کو اپنے دل میں جگہ نہ دیجیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و تقدیر اور اس کی مصلحتوں پر ایمان رکھ کر تسلی حاصل کریں۔

آیت 36 اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو مردوں کے مشابہ قرار دیا ہے جن کو جتنا بھی پکارا جائے وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے، یعنی ان کفار کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور ان مردوں کو اگر عقل آئے گی تو اسی وقت جب اللہ تعالیٰ ان کو دنیا سے اٹھائے گا اور ان کا محاسبہ کرے گا۔ سورۂ نمل کی آیات (۸۰، ۸۱) اس کی ہم معنی ہیں۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور انھوں نے کہا اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ کہہ دے بے شک اللہ اس پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتارے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۳۷﴾ اور زمین میں نہ کوئی چلنے والا ہے اور نہ کوئی اڑنے والا، جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے مگر تمھاری طرح امتیں ہیں، ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی، پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ﴿۳۸﴾

آیت 37 ① وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ ...... : منکرین نبوت یہ شبہ بھی پیش کرتے تھے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو اپنے ساتھ نظر آنے والا ایسا معجزہ کیوں نہیں لاتے جسے دیکھ کر ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والا رسول ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ ایسا کرنے پر قادر ہے، مگر اس کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ اگر صاف کھلی نشانی آجائے، جیسے اونٹنی جو صالح علیہ السلام کے عہد میں بھیجی گئی تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کی مدتِ مہلت ختم ہو جائے گی اور فوراً عذاب آجائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ ان کو ہلاک نہ کیا جائے، مگر ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ (رازی) دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۵۹)۔

آیت 38 ① وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ ...... : یعنی زمین پر چلنے والا کوئی جانور (دیکھیے سورۂ نور: ۴۵) اور کوئی دو پروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں، مگر سب تمھاری طرح امتیں ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ طائر کا معنی ہی پرندہ (اڑنے والا) ہے، پھر ان الفاظ کی کیا ضرورت تھی کہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض اوقات تیز دوڑنے والے کو بھی پرندہ کہہ دیا جاتا ہے، جیسے کہہ دیا جائے کہ گھوڑا اڑتا جا رہا تھا۔ ''دو پروں'' کے لفظ نے یہ احتمال ختم کر دیا اور بتا دیا کہ یہاں مراد حقیقی پرندہ ہے، جو پروں سے اڑتا ہے، صرف تیز رفتار مراد نہیں۔

② اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ : یعنی زمین پر چلنے والے اور اڑنے والے تمام جانور تمھاری طرح کی امتیں ہیں، تمھاری طرح پیدا ہوتی ہیں، جوانی کو پہنچتی ہیں، پھر مر جاتی ہیں، تمھاری طرح ان کا پیدا کرنا، ان کی روزی کا سامان اور ہر ضرورت پوری کرنا اور ان کی مصلحتوں کا اہتمام کرنا سب اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ (دیکھیے سورۂ ہود: ۶) جس طرح اللہ تعالیٰ ان کی مصلحتوں کی رعایت کرتا ہے اسی طرح تمھاری تمام مصلحتوں کا بھی خیال رکھتا ہے، ان لوگوں کے مطالبے کے مطابق نشانیاں اور معجزے نازل کرنا خود ان کی مصلحت کے خلاف ہے۔

③ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ : ''الْكِتٰبِ'' سے مراد لوح محفوظ ہے، جو مخلوقات کے تمام احوال پر حاوی ہے، کوئی چیز ایسی

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں، اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں، جسے اللہ چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے ﴿۳۹﴾

نہیں جس کے بیان کی اس میں کمی رہ گئی ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قلم خشک ہو چکا ہے اس پر جو تم کرنے والے ہو۔'' [بخاری، القدر، باب جف القلم علی علم اللہ ۰۰۰ قبل ح : ۶۵۹۶] ''الْكِتٰبِ'' سے مراد یہاں قرآن کریم بھی ہو سکتا ہے۔ رازی نے فرمایا (یہی معنی زیادہ ظاہر ہے) اس لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں دین کے متعلق تمام اصول (بنیادی امور) بیان کر دیے اور جن جزئیات کا ذکر نہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے بیان فرما دی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النحل : ۸۹] ''ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی، اس حال میں کہ وہ ہر چیز کا واضح بیان ہے۔'' اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ پیغمبر جس چیز کا حکم دیں اسے بجا لاؤ اور جس چیز سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ، فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر : ۷] خلاصہ یہ کہ حدیث نبوی بھی کتاب الٰہی ہے اور دین کی کوئی ایسی بات نہیں جو ''الْكِتٰبِ'' (قرآن و حدیث) میں بیان نہ کر دی گئی ہو۔

④ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ: کفار کو متنبہ کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ زمین کے کسی جانور یا پرندے کے حالات سے ناواقف نہیں ہے اور اس کا نامۂ اعمال محفوظ ہے اور اس کا بدلہ بھی اسے ملے گا تو تم اپنے بارے میں یہ کیوں سمجھ رہے ہو کہ تمھیں تمھارے اعمال کا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ (رازی)

⑤ اس آیت : ﴿ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ اور ایک دوسری آیت : ﴿ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ﴾ [التکویر : ۵] (اور جب جنگلی جانور اکٹھے کیے جائیں گے) سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کا بھی قیامت کے دن حشر ہو گا۔ ان سے کفر و شرک اور ایمان و اعمال کا محاسبہ تو نہیں ہو گا، مگر جو ظلم کسی جانور نے دوسرے پر کیا ہو گا اس کا بدلہ ضرور دلوایا جائے گا، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ضرور بالضرور حق داروں کے حقوق ادا کروائے جائیں گے، حتیٰ کہ بے سینگ بکری کا بدلہ سینگ والی بکری سے لیا جائے گا۔'' [مسلم، البر و الصلة، باب تحریم الظلم : ۲۵۸۲] بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ بات بطور تمثیل بیان کی گئی ہے، کیونکہ جانور تو مکلف ہی نہیں ہیں، مگر حدیث میں ''بدلے'' کے صریح الفاظ اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔

آیت 39 ① وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ......: یعنی ہماری آیات کو جھٹلانے والے چونکہ حق بات نہ سنتے ہیں، نہ ان کی زبانوں سے حق بات نکلتی ہے، اس لیے وہ بہرے اور گونگے ہیں اور کفر و شرک اور نفس کی بے جا خواہشوں کے اندھیروں میں

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے، یا تم پر قیامت آ جائے تو کیا اللہ کے سوا غیر کو پکارو گے؟ اگر تم سچے ہو ﴿۴۰﴾ بلکہ تم اسی کو پکارو گے، تو وہ دور کر دے گا جس کی طرف تم اسے پکارو گے، اگر اس نے چاہا اور تم بھول جاؤ گے جو شریک بناتے ہو ﴿۴۱﴾

پھنسے ہوئے ہیں۔ یہی بات سورۂ بقرہ (۱۷، ۱۸) اور سورۂ نور (۴۶) میں بیان ہوئی ہے۔

2 مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ...... : مگر وہ گمراہ انھی کو کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کو صحیح استعمال نہیں کرتے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶، ۲۷) اور سورۂ اعراف (۱۷۶) اور ہدایت انھی کو دیتا ہے جو اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۱۱)۔

آیت 41،40 قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ ...... : اس مضمون کو بھی اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ بیان کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۶۷)، سورۂ زمر (۳۸)، سورۂ مومنون (۸۴ تا ۸۹)، سورۂ لقمان (۳۲) اور سورۂ یونس (۲۲) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے زمانے کے مشرکین کا طرزِ عمل بیان فرمایا، مطلب یہ ہے کہ توحید انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے، وہ ماحول کے اثر سے یا آباء و اجداد کی تقلید سے شرک میں گرفتار ہوتا ہے اور غیر اللہ کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتا رہتا ہے، نذر و نیاز بھی ان کے نام کی نکالتا ہے، لیکن جب آزمائش سے دو چار ہوتا ہے تو پھر سب کو بھول جاتا ہے اور فطرت ان سب پر غالب آ جاتی ہے، پھر بے بس انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور صرف اسی ایک ذات کو پکارتا ہے جسے پکارنا چاہیے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی طرزِ عمل کو بطور ثبوت توحید کی دلیل کے طور پر بیان کیا، یعنی اگر اپنے اس دعویٰ میں کہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ تم پر آئی ہوئی بلا ٹال سکتے ہیں تو یہ بتاؤ کہ اللہ کا عذاب آنے کی صورت میں، یا قیامت آنے پر بھی کیا تم غیر اللہ کو پکارو گے؟ نہیں بلکہ تم صرف اسی کو پکارو گے، باقی مشکل کشا تمھیں بھول جائیں گے۔ یہ تو ان کفار و مشرکین کا حال تھا لیکن آج خود مسلمانوں کے اندر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کی فطرت اس قدر مسخ ہو چکی ہے کہ وہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی فریاد کرتے ہیں تو اپنے کسی خود ساختہ داتا سے یا علی (رضی اللہ عنہ) سے، یا شیخ عبد القادر جیلانی سے، انھیں غوث اعظم، یعنی سب سے بڑا مدد گار کہہ کر، یا رسول اللہ ﷺ سے، یا فاطمہ، حسین اور حسن رضی اللہ عنہم سے۔ نعرے بھی ان سے مدد مانگنے کے الفاظ کے ساتھ لگاتے ہیں، جیسا کہ یا رسول اللہ، یا علی، یا غوث اعظم وغیرہ، گویا ان کی حالت عملی طور پر ان پہلے کفار و مشرکین سے بھی بدتر ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی امتوں کی طرف رسول بھیجے، پھر انھیں تنگ دستی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ عاجزی کریں ﴿۴۲﴾ پھر انھوں نے کیوں عاجزی نہ کی، جب ان پر ہمارا عذاب آیا اور لیکن ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے لیے خوش نما بنا دیا جو کچھ وہ کرتے تھے ﴿۴۳﴾ پھر جب وہ اس کو بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کے ساتھ خوش ہو گئے جو انھیں دی گئی تھیں، ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا تو اچانک وہ ناامید تھے ﴿۴۴﴾

آیت 43،42 وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ ...... : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کا ذکر فرمایا ہے جن کے دل ایسے سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے بداعمال کو ان کے لیے ایسا خوبصورت بنا دیا کہ وہ اللہ کا عذاب آنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے دنیاوی اسباب ہی کو اس عذاب کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔ حالانکہ مصائب و آفات بھیجنے کا مقصد لوگوں کو اپنی روش سے باز آنے کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے، لیکن وہ اس موقع کو بھی گنوا دیتے ہیں۔ کیا آج کل ہم مسلمانوں کی اکثریت کا یہ حال نہیں ہو گیا کہ جب کوئی جنگ یا قحط یا سیلاب یا زلزلہ یا کوئی دوسری اجتماعی آفت ہم پر نازل ہوتی ہے تو ہم میں سے کئی افراد اسے محض مادی اسباب کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ اور سزا سمجھنے کو جہالت اور بے وقوفی قرار دیتے ہیں، خصوصاً منکرین حدیث اور کفار سے مرعوب لوگوں کا یہی حال ہے۔

آیت 44 ① فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ ......: جب انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرامین کو فراموش ہی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کر دی اور ان پر ہر قسم کی نعمتوں کے دروازے کھول دیے، پھر جب وہ عیش و آرام میں پوری طرح مگن ہو گئے تو اللہ نے اچانک انھیں پکڑ لیا، یعنی اچانک ایسا عذاب آیا کہ وہ اپنا تمام عیش و آرام بھول گئے اور انھیں بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور اسی یاس اور ناامیدی کی حالت میں تباہ و برباد کر دیے گئے۔ عقل مند آدمی کو چاہیے کہ جب سختی اور مصیبت آئے تو اسے اللہ کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر برے کاموں سے توبہ کر لے، ورنہ غفلت بڑھتی جائے گی اور اچانک ایسی سخت پکڑ ہو گی کہ توبہ کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ "مُّبْلِسُوْنَ" یہ "مُبْلِسٌ" کی جمع ہے، یعنی جس کی امید ختم ہو جائے۔

② فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کفر و شرک اور اللہ کی نافرمانی کے باوجود کوئی قوم دنیوی مال کے لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ اور خوش حال ہے تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس پر خوش ہے، نہیں، بلکہ یہ استدراج ہے اور ان کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۷۸)۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

تو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے ﴿۴۵﴾ کہہ کیا تم نے دیکھا اگر اللہ تمھاری سماعت اور تمھاری نگاہوں کو لے لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں یہ چیزیں لا دے؟ دیکھ ہم کیسے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، پھر وہ منہ موڑ لیتے ہیں ﴿۴۶﴾ کہہ کیا تم نے دیکھا اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک یا کھلم کھلا آ جائے، کیا ظالم لوگوں کے سوا کوئی ہلاک کیا جائے گا؟ ﴿۴۷﴾

آیت 45 فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ...... : یعنی وہ سب نیست و نابود کر دیے گئے اور ان کی ہلاکت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تھی، جس پر ہر چیز نے سکھ کا سانس لیا اور ان کا نام ونشان مٹنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، جس نے رب العالمین ہونے کی وجہ سے اپنی مخلوق پر رحم فرما کر زمین کو ان کے وجود سے پاک کیا۔

آیت 46 قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ ...... : فرمایا، اب تو تمھارے کان، آنکھیں اور دل موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور آیات سن کر، دیکھ کر اور ان سے متعلق سوچ کر کفر سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کو لے ہی جائے اور دلوں پر مہر لگا دے تو بتاؤ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہے جو یہ نعمتیں واپس دے دے؟ اس لیے ان کے جانے سے پہلے پہلے توبہ کر لو اور اس میں ہرگز دیر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے حقائق بیان کرتا ہے، تاکہ لوگ حقائق سے آگاہ ہو جائیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی روش سے باز نہیں آتے اور اللہ کی آیات سے بے رخی پر قائم رہتے ہیں۔

آیت 47 قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ ...... : "بَغْتَةً" اچانک، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے، یعنی رات کو اور "جَهْرَةً" کھلم کھلا، سب کے دیکھتے ہوئے، یعنی دن کو، جیسا کہ سورۂ یونس کی آیت (۵۰) میں ہے: ﴿بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا﴾ "رات کو یا دن کو۔" پہلی آیت میں صرف ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں کو لے جانے یا مہر لگا کر بند کر دینے کی بات کی تھی، اب اس آیت میں عام عذاب کے ساتھ ڈرایا جا رہا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو تم کسی صورت بچ نہیں سکو گے۔ باقی رہے رسول کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی تو اللہ تعالیٰ انھیں ضرور بچائے گا، کیونکہ پہلے جتنی بھی قومیں تباہ کی گئیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا مستقل طریقہ یہی رہا ہے کہ پہلے رسول اور اس کے پیروکاروں کو ظالم قوم کی بستی سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، جب وہ نکل گئے تو ظالم لوگوں کو تباہ کر دیا گیا۔

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾
قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ
اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے، پھر جو شخص ایمان لے آئے اور اصلاح کر لے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۴۸﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا انھیں عذاب پہنچے گا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۴۹﴾ کہہ دے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں تو فرشتہ ہوں، میں پیروی نہیں کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ کہہ کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں؟ تو کیا تم غور نہیں کرتے ﴿۵۰﴾

آیت 50 ① قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ: وہ لوگ نبی کریم ﷺ سے کہتے تھے کہ اگر تم اللہ کے رسول ہو تو اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کرو کہ ہمیں دنیا کا ساز و سامان اور فراوانی حاصل ہو جائے، تو اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ فلاں مرید کو فلاں پیر نے ایک خزانہ بخش دیا، یا مال دار کر دیا تو یہ عقیدہ شرک کے ذیل میں آئے گا۔

② وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: اور نہ میں غیب جانتا ہوں کہ آئندہ کی جو بات مجھ سے پوچھتے جاؤ میں تمھیں بتلاتا جاؤں۔ غیب کا جاننا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مجھے جو اور جتنا علم ہے اس کی اسی نے اطلاع دی ہے، وہ چاہتا تو مجھے اتنا علم بھی نہ دیتا اور چاہتا تو اس سے بھی زیادہ دے دیتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو علم غیب ہوتا ہے تو وہ مشرک ہے۔ جب سید الرسل ﷺ کو علم غیب نہ ہوا تو دوسروں کا ذکر کیا ہے اور جب رسول غیب دان نہ ٹھہرے تو پھر کوئی پیر، شہید، ولی، مجذوب، سالک یا عالم و عابد کیسے غیب دان ہو سکتا ہے؟ اور کاہن، نجومی اور رمل والے کس شمار و قطار میں ہیں؟ دیکھیے سورۂ نمل (۶۵) اور سورۂ لقمان (۳۴)۔

③ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ: اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، بلکہ تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں، تو پھر تم مجھ سے آسمان پر چڑھنے کا مطالبہ کیوں کرتے ہو۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۸۸) اور سورۂ ہود (۳۱)۔

④ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ: یعنی میں تمھی جیسا انسان ہوں، فرشتہ نہیں، البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے اور تمھارے پاس نہیں آتی (دیکھیے کہف: ۱۱۰) اور میں کسی معاملے میں اپنی خواہش کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے بندوں تک جتنے احکام پہنچائے، چاہے قرآن کی شکل میں یا احادیث کی صورت میں، وہ سب اللہ کی طرف سے تھے، لہٰذا قرآن کی طرح سنت کی پیروی بھی ضروری ہے، بلکہ سنت کے

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو ڈرا جو خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کی طرف (لے جا کر) اکٹھے کیے جائیں گے، ان کے لیے اس کے سوا نہ کوئی مدد گار ہو گا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۵۱﴾ اور ان لوگوں کو دور نہ ہٹا جو اپنے رب کو پہلے اور پچھلے پہر پکارتے ہیں، اس کا چہرہ چاہتے ہیں، تجھ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر کچھ ہے کہ تو انھیں دور ہٹا دے، پس تو ظالموں میں سے ہو جائے ﴿۵۲﴾

بغیر قرآن کی پیروی ممکن ہی نہیں ہے۔ جو لوگ سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کی پیروی پر زور دیتے ہیں وہ دراصل اپنی من مانی تاویلات کرنا چاہتے ہیں، جن کی راہ میں حدیث حائل ہے۔

❺ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ : یہ بظاہر سوال ہے مگر حقیقت میں اس بات کا انکار ہے کہ اندھا اور دیکھنے والا برابر ہو سکتے ہیں۔ اسے استفہام انکاری کہتے ہیں، اندھے اور دیکھنے والے سے مراد باطل پرست اور حق پرست، یا کافر اور مسلمان، یا جاہل اور عالم ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ پیغمبر آدمی کے سوا کچھ اور نہیں ہو جاتے کہ ان سے محال باتیں طلب کی جائیں۔ ایک اندھے اور ایک دیکھتے کا یہی فرق ہے۔ (موضح)

آیت 51 ❶ وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ ...... : اوپر کی آیت میں پیغمبروں کے متعلق فرمایا کہ وہ مبشر (خوشخبری دینے والے) اور منذر (ڈرانے والے) ہوتے ہیں، اب اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو انذار (ڈرانے) کا حکم دیا۔ (رازی) یعنی ڈرانے کا فائدہ انھی کو ہو سکتا ہے جنھیں دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کا خوف ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے سوا نہ ان کی حمایت کرنے والا کوئی مدد گار ہو گا اور نہ سفارشی۔ جو لوگ حشر اور قیامت کو مانتے ہی نہیں اور انکار پر اڑے ہوئے ہیں، انھیں آپ کے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [البقرۃ : ۶] ”ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انھیں ڈرایا ہو، یا انھیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔“

❷ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ : یعنی ان لوگوں کو ڈرانے کا یہ فائدہ ہو گا کہ آپ کے ڈرانے سے ان میں اللہ کا خوف اور زیادہ ہو جائے گا اور وہ گناہوں سے باز آ جائیں گے۔ اس آیت سے ان کافروں کا رد بھی مقصود ہے جو یہ گمان رکھتے تھے کہ ان کے معبود اور ٹھاکر وغیرہ اللہ تعالیٰ سے سفارش کر کے انھیں بچا لیں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے لیے بھی اس میں عبرت ہے جو اپنے بزرگوں کی سفارش پر تکیہ کر کے بے فکر ہو کر بے کھٹکے گناہ کرتے رہتے ہیں، کیونکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی سفارش نہیں چل سکے گی۔

آیت 52 ❶ وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ ...... : سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم چھ آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ مشرکین نے کہا، ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نکال دیں، تاکہ یہ ہم پر جرأت نہ کر سکیں۔ ان لوگوں میں میں تھا، ابن مسعود،

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لِّيَقُوۡلُوۡۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا ؕ اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰكِرِيۡنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾

اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کی بعض کے ساتھ آزمائش کی ہے، تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے احسان فرمایا ہے؟ کیا اللہ شکر کرنے والوں کو زیادہ جاننے والا نہیں؟ ﴿۵۳﴾ اور جب تیرے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ سلام ہے تم پر، تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کرلیا ہے کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص جہالت سے کوئی برائی کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو یقیناً وہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۴﴾

ہذیل کا ایک آدمی اور دو اور جن کا میں نام نہیں لیتا، تو رسول اللہ ﷺ کے دل میں اللہ نے جو چاہا خیال آیا، آپ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرما دی: ﴿ وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ﴾ [مسلم، الفضائل، باب في فضل سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه : ۲۴۱۳/۴۶] یعنی اللہ کے طالب اگرچہ غریب ہیں انھی کی خاطر داری مقدم ہے۔ (موضح)

❷ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ ...... : یعنی نہ ان کا حساب آپ کے ذمے ہے، نہ آپ کا ان کے ذمے، تو ان کا کیا قصور ہے کہ آپ انھیں اپنے سے دور کریں، جس کے نتیجے میں آپ ظالم ٹھہریں۔

آیت 53 وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ...... : جیسا کہ معلوم ہے ابتدا میں ایمان لانے والوں کی اکثریت کمزور مردوں، عورتوں، لونڈیوں اور غلاموں کی تھی، دولت مند بہت کم تھے اور یہی چیز کافر سرداروں کی آزمائش کا ذریعہ بن گئی۔ وہ ان غریبوں کا مذاق بھی اڑاتے اور جن پر ان کا بس چلتا انھیں زیادہ سے زیادہ اذیت بھی پہنچاتے اور کہتے کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا ہے؟! مقصد ان کا یہ تھا کہ ایمان اور اسلام اگر واقعی اللہ کا احسان ہوتا تو سب سے پہلے ہم پر ہوتا (دیکھیے احقاف: ۱۱) کیونکہ دنیوی زندگی میں اس نے ہم کو برتری دی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ لائق ہیں اللہ کے فضل کے اور اللہ دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق مانتے ہیں۔'' (موضح) دراصل اللہ کے ہاں قدر و منزلت ہے تو انھی لوگوں کی جو اخلاص سے اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں، چاہے وہ کتنے ہی غریب اور محتاج ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک خالی دنیوی حسب نسب اور خوش حالی کی کوئی قدر نہیں، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ ﴾ [الحجرات : ۱۳] ''تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ باعزت وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

آیت 53 ❶ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ ...... : پہلی آیت میں کمزور اہلِ ایمان کو اپنے پاس سے دور ہٹانے سے منع فرمایا، اب اس آیت میں ان کے اکرام اور عزت افزائی کا حکم دیا۔ (رازی) یعنی جو لوگ کفر و شرک کے غلبے کے باوجود اس پر آشوب دور

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے ﴿۵۵﴾ کہہ دے بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کہہ دے میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چلتا، یقیناً میں اس وقت گمراہ ہو گیا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہیں ہوں ﴿۵۶﴾

میں آپ کی دعوت قبول کر کے مسلمان ہو رہے ہیں انھیں امن اور سلامتی کی خوش خبری دے دیجیے، یعنی یہ کہ اسلام لانے کے بعد وہ اللہ کے عذاب سے امن والے ہو گئے، اب ان کی ان اعمال پر پکڑ نہیں ہوگی جو وہ کفر کی زندگی میں کرتے رہے ہیں۔ (المنار) اس سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کا احترام کرنا چاہیے اور انھیں ناراض نہیں کرنا چاہیے۔

❷ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۲) کی تفسیر۔

❸ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ...... : جہالت کے ساتھ گناہ کا مطلب اس کے برے انجام کو نہ سمجھنا ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۷) پہلے انذار (ڈرانا) تھا، اب تبشیر (خوش خبری) ہے، یعنی یہ اس کی رحمت کا اثر ہے کہ وہ اعمال سیئہ کو چھوڑ کر اعمال حسنہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ اصلاح کاروں سے مجرموں کا راستہ ممتاز اور خوب واضح ہو جائے۔

آیت 55 ❶ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ ...... : اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ باتیں اس لیے کھول کر بیان کی ہیں تاکہ حق ظاہر ہو جائے اور اس پر عمل کیا جا سکے اور مجرموں کا راستہ خوب واضح ہو جائے، تاکہ اس سے بچا جا سکے۔ (جلالین) اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہیں انھیں مخالفین (مجرمین) کے ہتھکنڈوں سے پوری طرح باخبر ہونا چاہیے، تاکہ ان کی تردید کر سکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہی خوبی تھی کہ ایک طرف تو وہ اسلام کو خوب سمجھتے تھے اور دوسری طرف جاہلیت کے رسم و رواج اور قوانین سے پوری واقفیت رکھتے تھے، کیونکہ وہ جاہلیت سے گزر کر آئے تھے۔ یہ مضمون حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب الفوائد میں خوب بیان ہوا ہے۔

❷ وَلِتَسْتَبِيْنَ: ”بَانَ يَبِيْنُ“ کا معنی ہے الگ ہونا، واضح ہونا، تو باب استفعال میں حروف کی کثرت کی وجہ سے ”خوب واضح ہو جائے“ ترجمہ کیا ہے۔

آیت 56 ❶ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ ...... : اوپر کی آیت میں تو یہ بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، تاکہ حق واضح ہو اور مجرموں کا راستہ ظاہر ہو جائے، اب اس آیت میں مجرموں کے راستے پر چلنے سے منع فرمایا، جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ مجرموں کا راستہ کیا ہے، جس پر چلنے سے تمھیں منع کیا گیا ہے؟ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ میں تمھاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چلوں گا، اگر میں ایسا کروں تو میں گمراہوں میں شامل ہو جاؤں گا اور میں ہدایت پانے والوں میں

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا
لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ
بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي
الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

کہہ دے بے شک میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جسے تم جلدی مانگ رہے ہو، فیصلہ اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، وہ حق بیان کرتا ہے اور وہی فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے ﴿۵۷﴾ کہہ دے اگر واقعی میرے پاس وہ چیز ہوتی جو تم جلدی مانگ رہے ہو تو میرے درمیان اور تمھارے درمیان معاملے کا ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور اللہ ظالموں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۵۸﴾ اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی تر ہے اور نہ خشک مگر وہ ایک واضح کتاب میں ہے ﴿۵۹﴾

سے نہیں ہوں گا۔ اللہ کی ہدایت کے مخالف قول کو کتنا ہی حکیمانہ اور دانشمندانہ سمجھا جائے وہ محض خواہش پر مبنی ہے اور سراسر ضلالت و گمراہی ہے۔ کیونکہ کسی کے پاس حکم کا اختیار سمجھنا اس کی عبادت ہے اور غیر اللہ کی عبادت شرک ہے، جو سب سے بڑا گناہ ہے۔

② قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ : یعنی آپ ان سے کہہ دیں کہ مجھے اللہ کے سوا ان تمام چیزوں کی عبادت سے منع کیا گیا ہے جنھیں تم پکارتے ہو۔

آیت 57 ① قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ ...... : کہہ دیجیے کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح دلیل، یعنی وحی الٰہی موجود ہے، جس کا اصل الاصول توحید ہے، اسے تم نے جھٹلایا۔ اب جس عذاب کے جلدی لانے کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ میرے اختیار میں نہیں۔ عذاب لانے یا نہ لانے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔

② اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ : معلوم ہوا کہ انبیاء کو معجزات پر کوئی اختیار نہیں ہوتا، یہ اختیار صرف اللہ عزوجل کے پاس ہے۔

آیت 58 ① لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ : یعنی اگر عذاب کا لانا میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمھارے جھٹلانے کی وجہ سے اب تک تمھیں ہلاک کر چکا ہوتا۔ (رازی)

② وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ : یعنی اللہ ہی جانتا ہے کہ کب عذاب لانا ہے اور کب تک انھیں مہلت دینی ہے۔

آیت 59 ① وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ ...... : یعنی خلق میں سے کسی ایک کو بھی غیبی امور کا علم نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجومی یا پنڈت یا رمال اور جفار جو اپنی غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کو آئندہ پیش

وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ

اور وہی ہے جو تمھیں رات کو قبض کر لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کمایا، پھر وہ تمھیں اس میں اٹھا دیتا ہے، تاکہ مقرر مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿۶۰﴾ اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور وہ تم پر کئی محافظ بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تمھارے

آنے والی باتیں بتاتے ہیں، وہ سب جھوٹے اور ٹھگ ہیں اور ان کے پاس جانا کسی مسلمان کا کام نہیں ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نمل (۶۵)۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ [لقمان: ۳٤] ''بے شک اللہ، اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔'' [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وعنده مفاتح الغيب...... ﴾: ٤٦٢٧]

② اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ: یعنی اس کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی اور پوشیدہ سے پوشیدہ چیز لوح محفوظ میں درج ہے۔

آیت 60 ① يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ: یہاں قبض کرنے سے مراد نیند ہے۔ ''تَوَفِّيْ'' کی تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ زمر (۴۲)۔

② ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ: یعنی دن کے وقت تمھاری روح لوٹا دیتا ہے، معلوم ہوا کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔

③ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى: یعنی تم میں سے ہر ایک کے لیے جو رزق اور عمر متعین ہے وہ پوری کی جاتی ہے۔

④ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ...... : یعنی دن میں تمھاری روح لوٹا کر زندہ کر دیتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تم نے اچھے عمل کیے یا برے، پھر اچھا کام کیا ہوگا تو اچھا بدلہ دے گا اور برا کیا ہوگا تو برا بدلہ دے گا۔ اوپر کی آیت میں کمال علم کا بیان تھا اور اس سے کمال قدرت ثابت ہوتی ہے۔ (رازی)

آیت 61 ① وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ: ''هُوَ'' اس جملے میں مبتدا ہے، ''اَلْقَاهِرُ'' خبر پر الف لام آنے کی وجہ سے ترجمہ ''وہی'' کیا ہے۔ ''اَلْقَاهِرُ'' کے معنی غالب ہیں اور یہ ''اَلْقَادِرُ'' سے زائد صفت ہے، یعنی خود قادر ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے کو مراد حاصل کرنے سے روک دینے والا بھی ہے۔ (بغوی) اللہ تعالیٰ کی صفت قہاریت یہ ہے کہ وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا، پھر وجود پر فنا اور خرابی طاری کرتا رہتا ہے، تو کائنات میں جس قدر بھی پیدا کرنے اور فنا کرنے کا کام ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کی قہاریت کا مظہر ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیات (۲۶، ۲۷) اس صفت کی پوری تشریح کر رہی ہیں۔

② وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً: حفاظت کرنے والے کچھ فرشتے تو وہ ہیں جو انسان کی آفات سے حفاظت کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الرعد: ۱۱] ''اس کے لیے اس کے

عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْۤا
اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ
الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ
اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

کسی ایک کو موت آتی ہے اسے ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ﴿۶۱﴾ پھر وہ اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے، جو ان کا سچا مالک ہے، سن لو! اسی کا حکم ہے اور وہی سب حساب لینے والوں سے زیادہ جلد (حساب لینے والا) ہے ﴿۶۲﴾ کہہ کون تمھیں خشکی اور سمندر کے اندھیروں سے نجات دیتا ہے؟ تم اسے گڑگڑا کر اور خفیہ طریقے سے پکارتے ہو کہ بے شک اگر وہ ہمیں اس سے نجات دے دے تو ہم ضرور شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے ﴿۶۳﴾ کہہ دے اللہ تمھیں اس سے نجات دیتا ہے اور ہر بے قراری سے، پھر تم شریک بناتے ہو ﴿۶۴﴾

آگے اور اس کے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے کئی پہرے دار ہیں، جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔" اور کچھ وہ ہیں جو انسان کا عمل لکھتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [الانفطار : ۱۰ تا ۱۲] "حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں۔ جو بہت عزت والے لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔"

③ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ...... : فوت کرنے والے فرشتے کا نام عزرائیل مشہور ہے، لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ نے ایسی تمام روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [أحكام الجنائز، باب بدع الجنائز، حاشيه بدعة، رقم : ۹۲] قرآن مجید میں اسے ملک الموت کہا گیا ہے، فرمایا: ﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ﴾ [السجدة : ۱۱] "کہہ دے تمھیں موت کا فرشتہ قبض کر لے گا۔"
"تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" سے معلوم ہوتا ہے کہ موت والے کئی فرشتے ہیں اور کئی آیات میں اللہ تعالیٰ کے روح قبض کرنے کا ذکر ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ [الزمر : ۴۲] "اللہ جانوں کو ان کی موت کے وقت قبض کرتا ہے۔" ان تمام آیات کو مدنظر رکھیں تو صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ روح قبض کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس کے حکم سے سب کچھ ہوتا ہے، پھر ملک الموت ہے، جو اکثر علماء کے نزدیک ایک ہی ہے، البتہ اس کے معاون رحمت اور عذاب کے فرشتے کئی ہیں، جیسا کہ زیر تفسیر آیت اور براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ملک الموت کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے بھی ہوتے ہیں۔

④ وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ: یعنی جس کی جان قبض کرتے ہیں اللہ کے حکم سے اس کے مقررہ وقت پر کرتے ہیں، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

آیت 62 ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ: پھر اللہ تعالیٰ جو ان کا سچا مالک ہے، جس نے اپنے حکم سے انھیں دنیا میں بھیجا تھا، اس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

آیت 64،63 قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ...... : یہ حالت ان مشرکوں کی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے، ہمارے زمانے

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ
شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵ وَ كَذَّبَ
بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶۶ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۶۷

کہہ دے وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے، یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے، یا تمھیں مختلف گروہ بنا کر گتھم گتھا کر دے اور تمھارے بعض کو بعض کی لڑائی (کا مزہ) چکھائے، دیکھ ہم کیسے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ سمجھیں ۝۶۵ اور اسے تیری قوم نے جھٹلا دیا، حالانکہ وہی حق ہے، کہہ دے میں ہرگز تم پر کوئی نگہبان نہیں ۝۶۶ ہر خبر کے لیے واقع ہونے کا ایک وقت ہے اور تم عنقریب جان لو گے ۝۶۷

میں مسلمان کہلانے والے کئی ایسے لوگ ہیں جو مشکل میں پھنسے ہوئے بھی دوسروں کو پکارتے ہیں۔ [اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ]

آیت 65 **قُلْ هُوَ الْقَادِرُ** ...... : اوپر سے عذاب جیسے بارش کی کثرت، طوفان، بجلی، اولے اور آندھی وغیرہ، یا ظالم حکمران، یا عورت کے لیے اس پر ظلم کرنے والا خاوند اور نیچے سے عذاب، جیسے زلزلہ، قحط، زمین میں دھنس جانا، یا ایسے ماتحت جو خائن اور بد دیانت ہوں، مرد کے لیے ناموافق بیوی۔ "اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا" یعنی مختلف گروہ بنا کر انھیں آپس میں گتھم گتھا کر دے، یہ لڑائی بھی خوفناک عذاب ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "کہہ دے وہی اس پر قادر ہے کہ تم پر تمھارے اوپر سے عذاب بھیج دے" تو آپ نے دعا کی: "میں تیرے چہرے کی پناہ چاہتا ہوں۔" پھر یہ نازل ہوا: "یا تمھارے نیچے سے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: "میں تیرے چہرے کی پناہ چاہتا ہوں۔" پھر یہ نازل ہوا: "یا تمھیں گروہ بنا کر آپس میں گتھم گتھا کر دے" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ ان دونوں سے ہلکا عذاب ہے۔" [بخاري، التفسير، باب: ﴿ قل هو القادر على...... ﴾ : ٤٦٢٨]

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے اپنے رب سے تین دعائیں کی ہیں: ① میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری ساری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ نے میری یہ دعا قبول فرمائی۔ ② میں نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ میری ساری امت کو قحط میں مبتلا نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ نے میری اس دعا کو بھی قبول فرما لیا۔ ③ میں نے دعا کی کہ میری امت کو آپس میں اختلاف اور انتشار سے بچائے تو اللہ تعالیٰ نے میری اس دعا کو قبول نہیں فرمایا۔" [مسلم، الفتن، باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض : ٢٨٩٠]

آیت 66 **وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ** : تیری قوم نے اسے جھٹلا دیا۔ اس "بِهٖ" کی ضمیر سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور اوپر کی آیات میں مذکور عذاب بھی۔ ﴿ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴾ یعنی میرا یہ کام نہیں ہے کہ تمھارے جھٹلا دینے اور بدتمیزی کرنے پر خود عذاب نازل کر دوں، میرا کام تو صرف یہ ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دوں اور نہ ماننے والوں کو اس کی سزا بتا دوں، اس کے بعد عذاب بھیجنا یا نہ بھیجنا اللہ کے اختیار میں ہے اور اس سے بچنے کی فکر کرنا تمھارا کام ہے۔

آیت 67 **لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ** ...... : اس آیت میں کفار کے لیے دھمکی ہے۔ (رازی) یعنی اللہ کی دی ہوئی خبر غلط نہیں ہو سکتی،

وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۶۸ وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۶۹

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں (فضول) بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کر، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر کبھی شیطان تجھے ضرور ہی بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ ۶۸ اور ان لوگوں کے ذمے جو بچتے ہیں، ان کے حساب میں سے کوئی چیز نہیں اور لیکن یاد دہانی ہے، تاکہ وہ بچ جائیں ۶۹

لیکن اس کا ایک وقت متعین ہے۔ چنانچہ جس عذاب کا تم مطالبہ کر رہے ہو، جب اس کا وقت آئے گا تو وہ بھی نازل ہو جائے گا۔ اس وقت تم جان لو گے کہ جس چیز سے میں تمھیں بار بار ڈرا رہا تھا وہ کہاں تک سچی تھی۔ اس عذاب سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہے اور وہ عذاب بھی جو دنیا میں کفار پر لڑائی، خوف اور قحط کی صورت میں نازل ہوا۔

آیت 68 وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ...... : یعنی جب تم ایسے لوگوں کی مجلس دیکھو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کا مذاق اڑا رہے ہوں، یا عملاً ان کی بے قدری کر رہے ہوں، یا وہ اہل بدعت ہوں جو اپنی بے جا تاویلوں اور تحریفات سے آیات الٰہی کو توڑ مروڑ رہے ہوں، یا ان پر نکتہ چینی کر رہے ہوں اور الٹے سیدھے معنی پہنا کر ان کا مذاق اڑا رہے ہوں، تو اس مجلس سے اس وقت تک کنارہ کرو جب تک وہ دوسری باتوں میں مشغول نہ ہو جائیں اور اگر شیطان کے بھلانے سے اس مجلس میں بیٹھ ہی جاؤ تو یاد آنے کے بعد ان ظالموں کی مجلس میں بیٹھے نہ رہو۔ سورۂ نساء (۱۴۰) میں یہ حکم پہلے بھی گزر چکا ہے، اس میں یہ بھی ہے: ﴿ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ ''بے شک اس وقت تم بھی ان جیسے ہو گے۔'' اہل بدعت کی صحبت اس صحبت سے بھی کئی درجے بدتر ہے جس میں گناہوں کا علانیہ ارتکاب ہو رہا ہو، خصوصاً اس شخص کے لیے جو علمی اور ذہنی طور پر پختہ نہ ہو اور بدعتیوں کی غلط تاویلوں کی غلطی سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ ہاں، اہل علم ان کی غلط باتوں پر تنقید کے لیے اور کلمۂ حق بلند کرنے کے لیے ایسی مجلسوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔

آیت 69 وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ...... : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی اگر کوئی متقی شخص چاہے کہ ایسے جاہلوں کے پاس نصیحت کے لیے بھی نہ بیٹھے تو اس کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ نہ بیٹھے تو اس پر ان کے گمراہ رہنے کا کوئی گناہ نہیں، البتہ انھیں نصیحت کرے تو بہتر ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر جائیں تو اسے نصیحت کرنے کا ثواب مل جائے۔ (موضح) اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ پرہیز گار لوگ اگر ان کی مجلس میں نصیحت کے لیے بیٹھ جائیں تو کچھ حرج نہیں ہے، لیکن ہم نے جو کنارہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس نصیحت کے پیش نظر کہ شاید تمھارے کنارہ کرنے کی وجہ سے وہ اس قسم کی بے ہودگی سے باز آ جائیں۔ واللہ اعلم! (ابن کثیر)

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ
نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖۗ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا
يُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ عَلٰۤى اَعْقَابِنَا بَعْدَ
اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۪ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى
الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَ اَنْ
اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٧٢﴾

اور ان لوگوں کو چھوڑ دے جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور دل لگی بنا لیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور اس کے ساتھ نصیحت کر کہ کہیں کوئی جان اس کے بدلے ہلاکت میں (نہ) ڈال دی جائے جو اس نے کمایا، اس کے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی مدد گار ہو اور نہ کوئی سفارش کرنے والا۔ اور اگر وہ فدیہ دے، ہر فدیہ، تو اس سے نہ لیا جائے، یہی لوگ ہیں جو ہلاکت کے سپرد کیے گئے، اس کے بدلے جو انھوں نے کمایا، ان کے لیے گرم پانی سے پینا اور دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے ﴿٧٠﴾ کہہ دے کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے اور نہ ہمیں نقصان دے اور ہم اپنی ایڑیوں پر پھیر دیے جائیں، اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہے، اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا، اس حال میں کہ حیران ہے، اسی کے کچھ ساتھی ہیں جو اسے سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں کہ ہمارے پاس چلا آ۔ کہہ دے بے شک اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی اصل راستہ ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم جہانوں کے رب کے فرماں بردار بن جائیں ﴿٧١﴾ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرو اور وہی ہے جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿٧٢﴾

آیت 70 وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا...... : اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا کہ جو لوگ دینِ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں اور دنیا کی زندگی نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، آپ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور اس قرآن کے ذریعے سے لوگوں کو نصیحت کرتے رہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص اپنے برے اعمال کی وجہ سے جو اس نے کمائے، ہلاک کر دیا جائے، پھر آخرت میں اس کے چھوٹنے کی کوئی صورت ہی نہ رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا اور وہ کوئی بھی فدیہ دیں ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی کمائی اور بداعمال کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے۔ ان کے پینے کے لیے سخت گرم پانی ہوگا اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۸)۔

آیت 72,71 قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ...... : آپ ان سے کہہ دیں کہ کیا ہم توحید کی سیدھی سڑک چھوڑ کر پھر شرک

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَ یَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۷۳﴾

اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن کہے گا ''ہو جا'' تو وہ ہو جائے گا۔ اس کی بات ہی سچی ہے اور اسی کی بادشاہی ہوگی، جس دن صور میں پھونکا جائے گا، غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے اور وہی کمال حکمت والا، پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۷۳﴾

میں مبتلا ہو جائیں، اگر ہم ایسا کریں تو ہماری مثال اس شخص کی طرح ہوگی جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی صحرا سے گزر رہا ہو اور شیطانوں کے نرغے میں آ جائے، جو اسے سیدھے راستے سے بھٹکا کر کسی اور طرف لے جائیں اور وہ حیران و پریشان نہ سمجھ سکے کہ کیا کرے اور اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ہماری طرف آ جاؤ، سیدھی راہ ادھر ہے، لیکن وہ شیطانوں کے چکر میں ایسا پھنس گیا ہے کہ نہ وہ ساتھیوں کی پکار کا جواب دیتا ہے اور نہ ان کی طرف جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک اختیار کر کے جو گمراہ ہو گیا ہے، وہ بھٹکے ہوئے راہی کی طرح ہدایت کی طرف نہیں آ سکتا۔ ہاں، اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہدایت مقدر کر دی ہے تو یقیناً اللہ کی توفیق سے وہ راہ یاب ہو جائے گا، کیونکہ سیدھے راستے پر چلانا اسی کا کام ہے، ہمارے لیے یہ حکم ہے کہ ہم اللہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور نماز قائم کریں اور اللہ سے ڈرتے رہیں، اس یقین کے ساتھ کہ قیامت کے دن سب کو اسی کے سامنے جمع ہونا ہے۔

آیت 73 ① وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ...... : یعنی اللہ تعالیٰ ہی نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، لیکن بے مقصد اور کھیل کے لیے نہیں بلکہ حق، یعنی خاص مقصد کے لیے پیدا فرمایا ہے، وہ مقصد کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا: ﴿ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك : ۱] ''تاکہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔'' اور انسان اور جن کی تخلیق کا مقصد یہ بیان فرمایا: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاريات : ۵٦] ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا، مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔'' دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثية : ۱۳] ''اور اس نے تمھاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا۔'' اور فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾ [البقرة : ۲۹] ''وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ بھی ہے سب تمھارے لیے پیدا فرمایا۔'' معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ انسان کے فائدے اور اس کی آزمائش کے لیے ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔

② وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ: یعنی حشر کے دن جب وہ تمام مردوں کو زندہ کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ کے لفظ ''كُنْ'' کہنے سے تمام مردے زندہ ہو جائیں گے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْۤ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾

اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے؟ بے شک میں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں ﴿۷۴﴾

③ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ : یعنی دنیا میں مجازی طور پر جن کو بادشاہ کہا جاتا تھا ان کی مجازی بادشاہت بھی ختم ہو جائے گی، اللہ فرمائے گا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن : ١٦] ''آج کس کی بادشاہی ہے، صرف اللہ کی جو ایک ہے، زبردست ہے۔'' نیز دیکھیے سورۂ فاتحہ میں "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" کی تفسیر۔ "الصُّوْرِ" کیا چیز ہے؟ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک اعرابی آیا، اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! صور کیا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس سے مراد وہ سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا۔'' [أحمد : ١٦٢/٢، ح : ٦٥١٤۔ ترمذی، صفات المؤمنین، باب صفة القیامة...... : ٢٤٣٠] اس لیے عام طور پر اس کا ترجمہ نرسنگا کیا جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے: ''صور پھونکنے والا فرشتہ اس وقت سے تیار عرش کی طرف دیکھ رہا ہے جب سے اسے صور دیا گیا ہے اور وہ آنکھ بھی نہیں جھپک رہا کہ کہیں اسی اثنا میں اسے حکم نہ دے دیا جائے۔'' [مستدرک حاکم : ٥٥٨/٤، ح : ٨٦٧٦۔ الصحیحة : ٦٥/٢، ح : ١٠٧٨] پس صحیح یہی ہے کہ صور ایک قرن (نرسنگا) ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ "الصُّوْرِ" "صُوْرَةٌ" کی جمع ہے اور اس سے مراد مخلوق کی صورتیں ہیں تو یہ قول قرآن و سنت کی رو سے مردود ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ نمل (۸۷) پہلے ایک صور پھونکا جائے گا، ساری خلقت گھبرا جائے گی، پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو ساری خلقت فنا ہو جائے گی، پھر تیسری دفعہ پھونکا جائے گا تو ساری خلقت زندہ ہو کر ایک جگہ جمع ہو جائے گی۔ بعض نے لکھا ہے کہ نفخہ اصل میں دو بار ہو گا، پہلے کو نفخۂ فزع یا صعق کہا جاتا ہے، گویا پہلے گھبراہٹ پھر بے ہوشی اور نتیجتاً فنا، یعنی دونوں ایک ہی ہیں اور دوسرے کو نفخۂ قیام۔ واللہ اعلم! (ابن کثیر، قرطبی)

④ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ : "الْغَيْبِ" سے مراد بندوں کے اعتبار سے غیب (پوشیدہ) اور "الشَّهَادَةِ" کا معنی حاضر ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی بھی چیز پوشیدہ نہیں، سب حاضر ہی حاضر ہے۔

⑤ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ : یعنی جو رب یہ صفات رکھتا ہے وہی اس لائق ہے کہ تم اس کی فرماں برداری اختیار کرو، اس کے بندے بن کر رہو اور سمجھو کہ تمھیں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور اچھے یا برے ہر عمل کا بدلہ پانا ہے۔

آیت 74 ① وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ ...... : اوپر کی آیات میں توحید کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کے دلائل بیان کرتے ہوئے مشرکین مکہ کے غلط عقائد پر تنقید کی گئی اور اب شرک کی تردید کے لیے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بطور تائید بیان فرمایا کہ وہ توحید کے سب سے بڑے داعی اور شرک سے بے زار تھے اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ دیکھو انھوں نے کس طرح قوم سے علیحدگی اختیار کی۔ مشرکین مکہ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہونے کے دعوے دار تھے، جب ابراہیم علیہ السلام موحد تھے تو اب شرک کے جواز پر تمھارے پاس کیا دلیل رہ جاتی ہے۔

② اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر تھا۔ اب پہلی کتابوں میں اگر ان کا نام آرخ یا تارخ لکھا ہو تو

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ
رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا
رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ
بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی عظیم سلطنت دکھاتے تھے اور تاکہ وہ کامل یقین والوں سے ہو جائے ﴿۷۵﴾
تو جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا تو اس نے
کہا میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۷۶﴾ پھر جب اس نے چاند کو چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، پھر
جب وہ غروب ہوگیا تو اس نے کہا بلاشبہ اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں ضرور گمراہ لوگوں میں
سے ہو جاؤں گا ﴿۷۷﴾ پھر جب اس نے سورج چمکتا ہوا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ
غروب ہوگیا کہنے لگا اے میری قوم! بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو ﴿۷۸﴾ بے شک میں
نے اپنا چہرہ اس کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ایک (اللہ کی) طرف ہو کر اور
میں مشرکوں سے نہیں ﴿۷۹﴾

قرآن کی بات ہی حق ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزر یا تارخ اس کا لقب ہوگا، مگر یہ کہنا کہ ان کے باپ کا نام آزر نہیں تھا بلکہ یہ نام چچا کا تھا، بالکل ہی بے دلیل ہے۔

آیت 75 مَلَكُوْتَ: " مُلْكٌ " کے آخر میں واؤ اور تاء کا اضافہ کر کے "مَلَكُوْتَ" فرمایا، مقصد حروف بڑھانے کا معنی میں زیادتی ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "عظیم سلطنت" کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے پچھلی آیات میں شرک کی تردید کی ہے اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمان و زمین کی عظیم سلطنت کا مشاہدہ کروایا، جس کے کئی مقاصد کے ساتھ ایک یہ بھی تھا کہ انھیں توحید کا آنکھوں دیکھا یقین حاصل ہو جائے۔ ایسے ہی انھیں یہ مشاہدہ بھی کروایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔

آیت 76 تا 79 فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ ...... : ابراہیم علیہ السلام کی قوم کئی معبودوں کی پرستش کرتی تھی، جن میں بت، سورج، چاند اور ستارے بھی تھے بلکہ بادشاہ بھی ان کا رب تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان سب چیزوں کے معبود نہ ہونے کے ایسے زبردست دلائل پیش کیے، جن کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ بتوں کے معبود نہ ہونے کو انھوں نے بت توڑ کر ثابت کیا۔ بادشاہ سے ایسی

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور اس کی قوم نے اس سے جھگڑا کیا، اس نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو، حالانکہ یقیناً اس نے مجھے ہدایت دی ہے اور میں اس سے نہیں ڈرتا جسے تم اس کے ساتھ شریک بناتے ہو، مگر یہ کہ میرا رب کچھ چاہے، میرے رب نے ہر چیز کا احاطہ علم سے کر رکھا ہے، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۸۰﴾

مدلل بات کی کہ آخر وہ "فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ" بالکل لاجواب ہو گیا۔ یہاں زیر تفسیر آیات میں ان کا اپنی قوم کے ساتھ سورج، چاند اور ستاروں کے معبود نہ ہونے پر مناظرے کا ذکر ہے۔ چنانچہ ایک رات ابراہیم علیہ السلام نے ایک بہت چمکتا ہوا ستارہ دیکھ کر کہا: "یہ میرا رب ہے۔" یقیناً وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے ہوں گے، مگر یہ تو توحید کے منکروں کو گھیر کر مارنے کی عظیم تدبیر تھی۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ایک محال چیز کو مفروضہ کے طور پر تسلیم کیا، تاکہ دل نشین طریقے سے انھیں قائل کیا جائے۔ چنانچہ جب وہ غروب ہوا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔" پھر چاند کو اپنا رب کہا، جب وہ بھی غروب ہو گیا تو فرمایا: "میرے رب نے اگر مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں بھی گمراہوں سے ہو جاؤں گا۔" اس میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ میں جس ہدایت پر ہوں وہ میری ذاتی سوچ اور فکر نہیں ہے اور نہ یہ میری ذاتی اور شخصی دعوت ہے، یہ میرے رب کی عنایت اور اسی کا احسان ہے، اس لیے میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پھر سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا اور کہا: "یہ سب سے بڑا ہے، اس لیے یہی میرا رب ہے۔" قوم کو امید پیدا ہوئی ہوگی کہ چلو ہمارے کسی معبود کو ماننے پر تو تیار ہو گیا ہے، مگر سورج کے غروب ہونے پر ان کے تمام معبودوں سے بے زاری کا اور زمین و آسمان کو پیدا کرنے والے ایک ہی معبود برحق کا اعلان کیا تو قوم جھگڑے پر اتر آئی، جھگڑے کے ساتھ اپنے خداؤں کے غضب سے ڈرانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: "میں تمھارے شریکوں سے نہیں ڈرتا، ہاں، اللہ تعالیٰ کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو وہ پہنچا سکتا ہے۔"

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کی ولادت اور پرورش ایک غار کے اندر ہوئی تھی، تاکہ بادشاہ اپنے ایک خواب کی وجہ سے انھیں قتل نہ کر دے۔ جب باہر آئے تو اپنا رب ڈھونڈنے کے لیے غور و فکر کے یہ مراحل طے کیے اور آخر کار اللہ تعالیٰ تک پہنچ گئے، حالانکہ ان آیات میں صاف ذکر ہے کہ قوم کی مجلس میں یہ سب باتیں ہوئی ہیں جن کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو لاجواب کیا ہے۔ پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود یہاں فرمایا: ﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ﴾ [الأنعام : ۸۳] "یہ تمام باتیں ہم نے دلیل کے طور پر ابراہیم کو قوم کے مقابلے میں عطا فرمائی تھیں۔" اور جب انھوں نے اللہ کے حکم کے مطابق قوم کو اس دلیل کے ذریعے سے سورج، چاند اور ستارے کے رب نہ ہو سکنے کی بات سمجھائی تو وہ جھگڑے پر اتر آئے، جو ان کے لاجواب ہونے کی دلیل تھی۔

آیت 80 ① وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ...... : قوم کے ساتھ یہ مناظرہ ہوا تو ان کی قوم نے اپنے عقیدے کے صحیح ہونے کے بہت سے دلائل پیش کیے، مثلاً انھوں نے ایک دلیل یہ پیش کی: ﴿اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ﴾ [الزخرف : ۲۲] "بے شک

وَ كَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور میں اس سے کیسے ڈروں جسے تم نے شریک بنایا ہے، حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ بے شک تم نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک بنایا ہے جس کی کوئی دلیل اس نے تم پر نہیں اتاری، تو دونوں گروہوں میں سے امن کا زیادہ حق دار کون ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۸۱﴾ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں ﴿۸۲﴾

ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے۔'' نیز ابراہیم علیہ السلام کو دھمکی دی کہ یہ بت تمھیں آفات اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ فرما کر ''وَقَدْ هَدٰىنِ'' (اللہ نے مجھے سیدھا راستہ بتا دیا ہے) ان کی پہلی دلیل کا جواب دیا کہ یقینی دلیل کے مقابلے میں تمھارے باپ دادا کا دین بے معنی ہے اور ان کی دھمکی کے جواب میں فرمایا کہ پروردگار کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچنی ہو تو پہنچ سکتی ہے مگر یہ تمھارے بت اور جھوٹے پروردگار میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ (رازی)

2 وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا: ہر چیز کی حقیقت و اصلیت کا علم میرے رب کو ہے، اس لیے وہی بتا سکتا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے، جب اس نے مجھے ہدایت کا علم عطا فرما دیا ہے تو پھر ہدایت کوئی اور چیز کیسے ہو سکتی ہے، تو کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے؟

آیت 81 1 وَكَيْفَ اَخَافُ...... : یہ اوپر کی آیت میں دوسرے جواب کو مکمل کیا ہے، یعنی میں تمھارے ان معبودوں سے کیوں ڈروں، جب کہ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے، ڈرنا تو تمھیں چاہیے جو بلا دلیل اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنا کر ظلم عظیم کر رہے ہو۔

2 فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ...... : ہم دونوں میں سے کون امن (بے خوف ہونے) کا زیادہ حق دار ہے؟ کیا تم مشرکین، جو ان بتوں کے متعلق محض وہم پرستی کی راہ سے یہ سمجھ رہے ہو کہ شاید یہ نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں، یا ہم خالص توحید پرست، جنھیں یہ یقین و اطمینان حاصل ہے کہ اللہ ہی ہر نفع و نقصان پر قادر ہے اور اس کے سوا دنیا کی کوئی مردہ یا زندہ ہستی ہمارا ذرہ بھر نقصان نہیں کر سکتی۔ اس امت کے کلمہ گو پیر پرست بھی اہل توحید سے کہتے ہیں کہ جو شخص بڑے پیر کی گیارھویں چھوڑ دے اس کا بیٹا یا بھینس مر جاتی ہے، یا کوئی اور نقصان پہنچ سکتا ہے، تو ان کے لیے بھی یہی جواب ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

آیت 82 1 اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا...... : یہ آیت اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی ہو سکتا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی بات کو مکمل کرنے والا حصہ بھی۔

2 تنوین اکثر تنکیر کے لیے ہوتی ہے، اس سے لفظ عام ہو جاتا ہے اور اس کا ہر فرد اس میں شامل ہو جاتا ہے، جیسے اس آیت

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی، ہم درجوں میں بلند کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں۔ بے شک تیرا رب کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۸۳﴾

میں مذکور " بِظُلْمٍ " کی تنوین کو تنکیر کے لیے لیں تو معنی ہوگا: ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو کسی ظلم کے ساتھ نہیں ملایا'' اور بعض اوقات وہ دوسرے معانی کے لیے بھی ہوتی ہے، جن میں سے ایک معنی تعظیم بھی ہے، جس سے اس لفظ کا بڑا فرد مراد ہوتا ہے۔ جیسے اسی آیت میں " بِظُلْمٍ " کی تنوین کو تعظیم کے معنی میں لیا جائے تو مطلب ہوگا: ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو بہت بڑے ظلم کے ساتھ نہیں ملایا۔'' عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ [الأنعام : ۸۲] تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اس آیت کا مضمون شاق گزرا۔ انھوں نے عرض کیا: ''ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر (کوئی) ظلم (یعنی گناہ) نہیں کیا؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں، کیا تم نے لقمان کا قول نہیں سنا، جو وہ اپنے بیٹے سے کہہ رہے تھے: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان : ۱۳] ''یقیناً شرک ظلم عظیم ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ولم يلبسوا إيمانهم بظلم ﴾ : ۴۶۲۹۔ مسلم : ۱۲۴]

آپ دیکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان ہونے کے باوجود " بِظُلْمٍ " کی تنوین کو تنکیر کے لیے سمجھ کر پریشان ہو گئے کہ کون ہے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لقمان کا قول ذکر کر کے انھیں بتایا کہ یہ تنوین تعظیم کے لیے ہے، نہ کہ تنکیر کے لیے اور معنی یہ نہیں کہ کسی ظلم کے ساتھ نہیں ملایا، بلکہ معنی یہ ہے کہ بہت بڑے ظلم، یعنی شرک کے ساتھ نہیں ملایا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان جاننا کافی نہیں، کئی مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر بھی ضروری ہے، اس لیے قرآن کو حدیث کے بغیر سمجھنے کا دعویٰ کرنے والے واضح گمراہ ہیں۔

③ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ امن و سکون اور ہدایت ایسے خالص ایمان ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں جس میں توحید کے ساتھ کسی قسم کے شرک کی آمیزش نہ کی گئی ہو، جو قوم خالص ایمان اور خالص توحید سے محروم اور کسی بھی قسم کے شرک میں مبتلا ہو اسے کسی صورت امن و چین اور ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ مسلمانوں نے خالص توحید کو چھوڑا اور قبروں اور آستانوں کی پرستش شروع کر دی (الا ما شاء اللہ) جس کے نتیجے میں پورا عالم اسلام ذلت و مسکنت کا نشانہ بن گیا۔ اب نہ کہیں امن ہے نہ ہدایت جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ امت مسلمہ دوبارہ خالص توحید کی طرف پلٹے اور صرف اپنے رب کے آستانے پر جمی رہے۔

آیت 83 ① وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ ...... : اس حجت سے مراد توحید کے وہ دلائل ہیں جو قوم کے مقابلے میں ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیے، یہ دلائل اللہ تعالیٰ نے قوم کے مقابلے میں ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے۔ اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ١ؕ كُلًّا هَدَيْنَا١ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ١ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَۙ۝۸۴ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَ اِلْيَاسَ١ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَۙ۝۸۵ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ يُوْنُسَ وَ لُوْطًا١ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَۙ۝۸۶

اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ان سب کو ہدایت دی اور اس سے پہلے نوح کو ہدایت دی اور اس کی اولاد میں سے داوٗد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں ﴿۸۴﴾ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو، یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے ﴿۸۵﴾ اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو، اور ان سب کو جہانوں پر فضیلت دی ﴿۸۶﴾

کہ یہ باتیں ان کے بچپن کے زمانے کی نہیں کہ آپ شرک سے درجہ بہ درجہ توحید کی طرف بڑھے ہوں، کیونکہ اللہ کا نبی اللہ تعالیٰ کی توحید سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔

② نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ: یعنی چونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جان کی پروا نہیں کی اور اپنے آپ کو توحید کی دعوت دینے کے لیے وقف کر دیا، اس لیے ہم نے بھی ان پر بڑے بڑے احسانات فرمائے۔ دنیا ہی میں انھیں یہ انعام دیا کہ بڑھاپے میں انھیں نیک اولاد سے نوازا، ان کے بعد ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب اتارنے کا سلسلہ جاری کر دیا اور اسی سلسلے کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

آیت 84 ① كُلًّا هَدَيْنَا: یعنی ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر لگایا اور نبوت عطا کی۔ دیکھیے سورۂ مریم (۴۹)۔

② وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ ...... : "ذُرِّيَّتِهٖ" میں موجود ضمیر سے مراد نوح علیہ السلام بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ مذکور نبیوں میں سب سے قریب نوح علیہ السلام ہی ہیں، امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہ ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے اور کلام کے سیاق کے پیش نظر اس کو ترجیح دی جا سکتی ہے، مگر اس کے تحت مذکور انبیاء میں سے لوط علیہ السلام کے ذکر سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں تھے، بلکہ ان کے بھتیجے تھے، مگر ہو سکتا ہے کہ بھتیجے کو بھی اولاد میں شمار کر لیا ہو، جیسا کہ سورۂ بقرہ (۱۳۳) میں اسماعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے آباء میں ذکر کیا ہے۔ (ابن کثیر)

③ عیسیٰ علیہ السلام کو نوح علیہ السلام اور دوسرے قول کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بیٹیوں کی اولاد بھی آدمی کی اولاد میں سے شمار ہوتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت صرف ماں کی طرف سے ہے، ان کا باپ نہیں تھا۔ (ابن کثیر)

آیت 86 وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: یعنی اپنے اپنے زمانے کے تمام لوگوں پر فضیلت بخشی۔

وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَ هَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ
هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾
اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا
قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ
عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۰﴾

اور ان کے باپ دادا اور ان کی اولادوں اور ان کے بھائیوں میں سے بعض کو بھی اور ہم نے انھیں چنا اور انھیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ﴿۸۷﴾ یہ اللہ کی ہدایت ہے، وہ اس پر اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے چلاتا ہے اور اگر یہ لوگ شریک بناتے تو یقیناً ان سے ضائع ہو جاتا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۸۸﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی، پھر اگر یہ لوگ ان باتوں کا انکار کریں تو ہم نے ان کے لیے ایسے لوگ مقرر کیے ہیں جو کسی صورت ان کا انکار کرنے والے نہیں ﴿۸۹﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر، کہہ میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، یہ تو تمام جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں ﴿۹۰﴾

آیت 87 وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ ...... : یعنی ان کے باپ دادا اور پڑدادا اوپر تک اور ان کے بیٹوں، پوتوں، پرپوتوں نیچے تک اور ان کے بھائیوں میں سے جو بھی ایمان دار تھے انھیں بھی ہم نے ہدایت پر لگایا اور بزرگی دی۔ (ابن کثیر)

آیت 88 وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ ...... : اٹھارہ پیغمبروں کا نام لے کر، ان کے ساتھ ان کے آباء، اولاد اور اخوان کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر بفرض محال نبی یا اس کے قرابت دار بھی شرک کر بیٹھتے تو ان کا کیا کرایا سب ضائع ہو جاتا۔ کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی قبول نہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ﴾ [الزمر : ٦٥] ''اگر آپ نے شرک کیا تو آپ کا بھی تمام عمل ضائع ہو جائے گا۔'' پیغمبر سے شرک ہونا تو ممکن نہیں، یہ سب کچھ امتیوں کو سنایا جا رہا ہے۔

آیت 89 فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ ...... : یعنی اگر یہ لوگ اس کتاب، حکم اور نبوت کو نہ مانیں (اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو نہ ماننے والے کفار اور مشرکین ہیں) تو ہم نے ان (کتاب اور نبوت) کے لیے ایسے لوگ مقرر کیے ہیں (اس سے مراد مہاجرین انصار اور قیامت تک آنے والے ایمان دار ہیں) جو ان نعمتوں کا انکار نہیں کرتے۔

آیت 90 ① فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ: یعنی توحید اور عقائد میں ان کی راہ پر قائم رہیے، کیونکہ تمام انبیاء ان باتوں میں متفق ہیں، باقی احکام میں سے بھی جو منسوخ نہیں ہوئے ان کی بھی پیروی کیجیے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ان انبیاء کی طرح آپ بھی دشمنوں کی ایذا رسانی پر صبر کیجیے۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جن کاموں میں کوئی نیا حکم نہیں آیا ان میں نبی ﷺ کو پہلے انبیاء کے طریق پر رہنے کا حکم تھا۔ مجاہد رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا:

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَ عُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَ لَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی، جو اس کی قدر کا حق تھا، جب انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ کہہ وہ کتاب کس نے اتاری جو موسیٰ لے کر آیا؟ جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی، تم اسے چند ورق بناتے ہو، جنھیں ظاہر کرتے ہو اور بہت سے چھپاتے ہو اور تمھیں وہ علم دیا گیا جو نہ تم نے جانا اور نہ تمھارے باپ دادا نے۔ کہہ اللہ نے، پھر انھیں چھوڑ دے، اپنی (فضول) بحث میں کھیلتے رہیں ﴿۹۱﴾

''کیا سورۂ ص میں سجدہ ہے؟'' تو انھوں نے ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ﴾ سے لے کر ﴿فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ تک تلاوت کر کے فرمایا: ''ہاں، وہ (داؤد علیہ السلام) بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کی پیروی کا آپ کو اس آیت میں حکم دیا گیا ہے اور اس آیت میں داؤد علیہ السلام کے سجدے کا ذکر ہے اور آپ ﷺ کو ان انبیاء کی پیروی کا حکم ہے۔'' [بخاري، التفسير، باب قوله: ﴿ أولئك الذين هدى الله ...... ﴾ : ٤٦٣٢]

2 اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِیْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ جن و انس دونوں کی طرف بھیجے گئے اور آپ کی رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔

آیت 91 وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ ...... : یہ خطاب یہود کو ہے، جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے دشمنی اور بغض و عناد کی بنا پر ایسی حقیقت کا انکار کر دیا جسے وہ خود بھی مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس آیت میں ان کے اعتراض کا دو طرح سے جواب دیا گیا، ایک یہ کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر اور اسے پہچاننے کا جو حق تھا اس کے مطابق انھوں نے اسے پہچانا ہی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نہ خود لوگوں سے کلام کرتا ہے اور نہ اس کام کے لیے کوئی فرشتہ بھیجتا ہے۔ اس کی ممکن صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام فرشتوں کے ذریعے سے صرف نبی پر نازل فرمائے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ تو تم بھی مانتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام بشر تھے، آدم کی اولاد سے تھے، ان کے ماں باپ بھی تھے، تو ان پر جو کتاب اتاری گئی تھی وہ کس نے اتاری تھی؟ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے نہیں اتاری تھی تو پھر تم اسے اتنا سنبھال سنبھال کر کیوں رکھتے ہو؟ اور اس کتاب میں جو ہدایت کی باتیں اور علم کی روشنی ہے، کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور ایسی باتیں بتا سکتا ہے؟ جو ہدایت کی باتیں اس کتاب میں موجود ہیں، انھیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے آباء و اجداد، پھر تمھارا اس کتاب کا کچھ حصہ لوگوں کو بتانا اور اپنی خواہشات کے مطابق کچھ حصہ چھپانا، یہ سب کچھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور تمھارے لیے حجت ہے، ورنہ اگر یہ کسی انسان کی تصنیف ہوتی تو تمھیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کہہ دیجیے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے اور محمد ﷺ کو وہ علوم اور

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ

اور یہ ایک کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا، بڑی برکت والی ہے، اس کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے ہے اور تاکہ تو بستیوں کے مرکز اور اس کے ارد گرد لوگوں کو ڈرائے اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ﴿۹۲﴾ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا کہے میری طرف وحی کی گئی ہے، حالانکہ اس کی طرف کوئی چیز وحی نہیں کی گئی اور جو کہے میں (بھی) ضرور اس جیسا نازل

معارف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی تو پھر رسولوں پر بالعموم اور نبی کریم ﷺ پر بالخصوص وحی کے نازل ہونے کا انکار تم کیسے کر سکتے ہو؟ یہ سارا خطاب کفارِ مکہ کو بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو وہ بھی مانتے تھے۔ "قَرَاطِيْسَ" یہ "قِرْطَاسٌ" کی جمع ہے، یعنی ورق، کاغذ، یعنی یہودی تورات کو ایک کتاب کی طرح جمع کرنے کے بجائے الگ الگ ورقوں کی صورت میں رکھتے تھے اور اپنے مطلب کا ورق نکال کر دکھا دیتے تھے۔

آیت 92 ① وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا: اس آیت میں مکہ کو "امّ القریٰ" کہا گیا ہے، جس کا معنی ہے تمام بستیوں کی جڑ یا ان کا مرکز اور "وَمَنْ حَوْلَهَا" سے مراد قبائلِ عرب اور آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، خواہ عرب ہوں یا عجم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً)) "مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔" [بخاری، الصلاة، باب قول النبی ﷺ : جعلت لي الأرض...... : ٤٣٨] نیز دیکھیے سورۂ انعام (۹)، سورۂ اعراف (۱۵۸) اور سورۂ سبا (۲۸)۔

② وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: کیونکہ قرآن مجید آخرت کی راہ بتلاتا ہے۔

③ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ: کیونکہ نماز تمام عبادتوں کی اصل اور آخرت میں کامیابی کی کنجی ہے۔ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوا کہ اس شخص کا ایمان آخرت پر صحیح اور درست ہے جو قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہے اور نماز کی نگہداشت اور نگرانی کرتا ہے، جو شخص قرآن پر ایمان نہیں رکھتا یا نماز کی حفاظت نہیں کرتا اس کا آخرت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔

آیت 93 ① وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی......: اس آیت کریمہ میں تین قسم کے لوگوں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے زیادہ اپنے حق میں کون ظالم ہوسکتا ہے، ایک تو وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے غیروں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں، یا جو اپنی طرف سے حلال و حرام کے احکام وضع کرتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم پر اللہ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے، جیسے اسود عنسی، مسیلمہ کذاب اور قادیانی دجال وغیرہ اور تیسرے وہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قرآن جیسا کلام پیش کر سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے کچھ مشرکوں نے کہا تھا: ﴿ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ

مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

کروں گا جو اللہ نے نازل کیا۔ اور کاش! تو دیکھے جب ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، نکالو اپنی جانیں، آج تمھیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا، اس کے بدلے جو تم اللہ پر ناحق (باتیں) کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے ﴿۹۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آئے ہو، جیسے ہم نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اپنی پیٹھوں کے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو کچھ ہم نے تمھیں دیا تھا اور ہم تمھارے ساتھ وہ سفارش کرنے والے نہیں دیکھتے جنھیں تم نے گمان کیا تھا کہ بے شک وہ تم میں حصے دار ہیں۔ بلاشبہ یقیناً تمھارا آپس کا رشتہ کٹ گیا اور تم سے گم ہو گیا جو کچھ تم گمان کیا کرتے تھے ﴿۹۴﴾

هٰذَآ ﴾ [الأنفال : ۳۱] اگر ہم چاہیں تو یقیناً اس جیسا ہم بھی کہہ دیں حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ تین ہی وعیدیں ان کے حق میں بیان کی گئی ہیں، ایک سب سے بڑے ظالم ہونا، دوسری فرشتوں کا ان کی روح قبض کرتے وقت سختی کرنا اور تیسری ذلت کا عذاب۔

② اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ : نکالو اپنی جانیں اور انھیں ہمارے حوالے کرو کہ سزا دیں، یا انھیں موت کی سختیوں اور عذاب سے بچا کر تو دکھاؤ۔ (فتح القدیر)

③ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ ...... : آج سے مراد وہ دن ہے جس میں ان کی روح قبض کی جائے گی اور عذاب قبر کی ابتدا ہو گی۔ اس آیت میں واضح عذاب قبر کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ قیامت تو جب اللہ چاہے گا قائم ہو گی، درمیان کا وقفہ یعنی برزخ ہم سے پردے میں ہے۔ انسان کا کوئی جز کسی بھی جگہ میں ہو یا راکھ بن جائے، اسے وہیں عذاب قبر ہو گا۔

آیت 94 وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى ...... : یعنی ان سے کہا جائے گا کہ آج تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے ہو کر آئے ہو اور جو مال و اولاد تمھارے پاس تھا وہیں چھوڑ آئے ہو اور ہم تمھارے ساتھ وہ سفارشی بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں یہ بھی حق رکھتے ہیں۔ لاؤ دکھاؤ، یہ ڈانٹنے کے لیے کہا جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۹۵ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۹۶ وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۹۷

بے شک اللہ دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے، وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا ہے، یہی اللہ ہے، پھر تم کہاں بہکائے جاتے ہو ۝۹۵ صبح کو پھاڑ نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا۔ یہ اس زبردست غالب، سب کچھ جاننے والے کا مقرر کردہ اندازہ ہے ۝۹۶ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے، تاکہ تم ان کے ساتھ خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں راستہ معلوم کرو۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے کھول کر نشانیاں بیان کر دی ہیں جو جانتے ہیں ۝۹۷

آیت 95 ❶ اِنَّ اللّٰهَ فٰلِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى …… : اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس سے تعلق رکھنے والی کچھ چیزیں بیان کرنے کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور کمال قدرت و علم کا بیان شروع کیا جو اس سورت کا اصل موضوع ہے۔

❷ " النَّوٰى " یہ " نَوَاةٌ " کی جمع ہے، اس لیے ترجمہ ''گٹھلیاں'' کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ زمین کے اندر دانے کو پھاڑ کر لہلہاتا ہوا پودا اور گٹھلی کو پھاڑ کر کھجور کا ہرا بھرا درخت نکالتا ہے۔ اس کی کاری گری دیکھیے کہ مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، نطفے اور انڈے سے جان دار، دانے اور گٹھلی سے زندہ درخت اور کافر سے مسلمان کو پیدا کرتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، جیسے حیوان اور پرندے سے نطفہ اور انڈا، پودوں اور درختوں سے دانے اور گٹھلیاں اور مسلمان سے کافر پیدا کرتا ہے۔ یہ ہے اللہ جو تمھاری عبادت کا حق دار ہے، پھر کیسی عجیب بات ہے کہ تم شیطان کے بہکاوے میں آ کر اس کے غیر کی عبادت کرنے لگتے ہو۔

آیت 96 فَالِقُ الْاِصْبَاحِ …… : وہی رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح روشن نکالنے والا ہے، پھر اس نے رات کا اندھیرا طاری کر کے سب کو سکون اور آرام کا موقع فراہم کیا اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا، جس سے وقت، دن، رات، مہینوں اور سالوں کا حساب وجود میں آتا ہے۔ " الْعَزِيْزِ " سے مراد کمال قدرت والا اور " الْعَلِيْمِ " سے مراد کمال علم والا ہے۔ جس کا علم اور قدرت آسمان و زمین کے ذرے ذرے کو محیط ہے۔ عموماً قرآن میں رات دن اور سورج چاند کے پیدا کرنے اور مسخر کرنے کو اسمائے حسنیٰ میں سے ان دو صفاتی ناموں کے ساتھ ختم کیا ہے۔

آیت 97 وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ …… : یہ ستاروں کا ایک فائدہ ہے، دوسری آیات میں تاروں کو آسمان کی زینت اور شیطانوں کے لیے سنگ باری (رجوم) کا سامان فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ صافات (۶، ۷) اور سورۂ ملک (۵) اللہ ہی

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝۹۹

اور وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا، پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ اور ایک سونپے جانے کی جگہ ہے۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھتے ہیں ۹۸ اور وہی ہے جس نے آسمان سے کچھ پانی اتارا تو ہم نے اس کے ساتھ ہر چیز کی انگوری نکالی، پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی نکالی، جس میں سے ہم تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے درختوں سے ان کے گابھے میں سے جھکے ہوئے خوشے ہیں اور انگوروں اور زیتون اور انار کے باغات ملتے جلتے اور نہ ملنے جلنے والے۔ اس کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل لائے اور اس کے پکنے کی طرف۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ۹۹

بہتر جانتا ہے کہ ان میں اور کتنے فوائد ہیں، مگر ان کے ذریعے سے غیب معلوم ہونے یا ان کا قدرت کے کارخانے میں کوئی اختیار ہونے کا عقیدہ صاف گمراہی اور شرک ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں بار بار علم اور قدرت کا مالک صرف ایک اللہ کو قرار دیا گیا ہے۔

آیت 98 ① وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ...... : یعنی اسی نے تمھیں ایک جان آدم علیہ السلام سے پیدا کیا، پھر اس کے لیے ٹھہرنے کی جگہ بنائی اور سونپے جانے کی جگہ بنائی۔ ٹھہرنے کی جگہ ماں کا رحم اور سونپے جانے کی جگہ باپ کی پشت۔ مفسرین کی ایک جماعت سے اس کے برعکس بھی منقول ہے، یعنی "فَمُسْتَقَرٌّ" باپ کی پشت اور "مُسْتَوْدَعٌ" ماں کا رحم۔ بعض نے ان سے دنیا اور آخرت یا قبر مراد لی ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اول ماں کے پیٹ میں سپرد ہوتا ہے، تا کہ آہستہ آہستہ دنیا میں رہنے کی صلاحیت حاصل کر لے، پھر دنیا میں آ کر ٹھہرتا ہے، پھر سپرد ہوگا، قبر میں تا کہ آہستہ آہستہ آخرت کا اثر قبول کر سکے، پھر جا ٹھہرے گا جنت یا دوزخ میں۔ (موضح)

② لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ: پہلے آفاقی دلائل بیان فرمائے، جو انسان کی ذات سے باہر کی دنیا ہے، دوسری آیت میں انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے، جو انسان کی ذات میں موجود ہیں۔ دلائل آفاقی سے دلائل انفسی کا سمجھنا ذرا زیادہ غور کا محتاج ہے، اس لیے یہاں سمجھ کا لفظ فرمایا اور پہلے کے متعلق علم کا۔ (واللہ اعلم)

آیت 99 ① وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... : "قِنْوَانٌ" یہ "قِنْوٌ" کی جمع ہے بمعنی خوشے۔ "دَانِیَةٌ" یہ "دَنَا یَدْنُوْ" سے اسم فاعل ہے، یعنی قریب، مراد نیچے جھکے ہوئے۔ "مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ" یعنی پتے ملتے ہیں، مگر پھل

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾

اور انھوں نے جنوں کو اللہ کے شریک بنا دیا، حالانکہ اس نے انھیں پیدا کیا اور اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں کچھ جانے بغیر تراش لیں، وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۱۰۰﴾ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہوگی، جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۰۱﴾

مختلف ہیں، یا ایک ہی درخت، مثلاً آم کو لے لیں کہ ان کے پودے ملتے جلتے ہیں، مگر ہر پودے کے پھل کی لذت الگ ہے۔

② یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتوں میں سے ایک عظیم قدرت اور نعمت کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کے ذریعے سے نرم و نازک انگوری نکالی، جس سے تہ بہ تہ دانوں سے بھرے ہوئے خوشے نکالے اور کھجور کو دیکھو کہ پہلے ایک سُوا سا نکلا، پھر وہ درخت بن گیا، پھر اس سے کچا پھل بنایا، پھر اس کا رنگ بدلتا جاتا ہے اور وہ بڑا بھی ہو جاتا ہے۔ ان کے پھل دینے کو اور ان کے پکنے کو دیکھو، جب کچا ہوتا ہے تو اس کی کچھ حیثیت نہیں اور پک کر کس قدر لذیذ ہو جاتا ہے۔ یہی حال انگور، زیتون اور انار کا ہے۔

آیت 100 وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ ...... : اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے معبودِ برحق ہونے کے لیے آسمان و زمین اور ان کے درمیان والی چیزوں میں سے پانچ دلائل بیان فرمائے، اب بتایا کہ بعض لوگ پھر بھی اللہ کے لیے جنوں کو شریک بناتے ہیں، حالانکہ انھیں بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، پھر مخلوق کو خالق کا شریک ٹھہرانا سراسر جہالت نہیں تو کیا ہے؟ (رازی)

عرب میں بعض فرقے ایسے بھی تھے جو جنات اور خبیث شیطانوں کی عبادت کرتے تھے اور مصیبت کے وقت ان کے نام کی دہائی دیتے اور کائنات میں ان کا تصرف مانتے تھے۔ ان سب کی اس آیت میں تردید فرمائی کہ بے سمجھے انھوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا اور اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔ چنانچہ عرب کے مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ ان گھڑی ہوئی باتوں سے پاک ہے۔ بعض سلف نے فرمایا کہ یہ آیت ان زندیقوں اور مجوسیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کو انسانوں، جانوروں اور ہر اچھی چیز کا خالق سمجھتے اور اسے ''یزداں'' کہتے تھے اور شیطان (ابلیس) کو درندوں، سانپوں اور ہر قسم کے شر کا خالق سمجھتے تھے اور اسے ''اہرمن'' کہتے تھے اور ان دونوں کو کائنات کے پیدا کرنے میں اللہ کا شریک بناتے تھے، حالانکہ ان کا اور ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے اہلِ علم نے مجوس کو زنادقہ (بالکل بے دین) قرار دیا ہے۔ امام رازی لکھتے ہیں کہ زیرِ تفسیر آیت کی مذکورہ توجیہات میں سے یہ بہترین توجیہ ہے۔

آیت 101 ① بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: بدیع کا معنی ہے کسی چیز کو بغیر نمونے کے پیدا کرنے والا، یعنی ان کا پہلے

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

یہی اللہ تمھارا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ سو تم اس کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے ﴿۱۰۲﴾ اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے اور وہی نہایت باریک بین، سب خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۰۳﴾

کوئی نمونہ موجود نہ تھا، اس نے ان کو ایجاد فرمایا۔

② اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ …… : مشرکین کی تردید کے بعد اب ان کی تردید کی ہے جو اللہ کی اولاد مانتے تھے۔ فرمایا، اللہ کی اولاد کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ اولاد تو وہ ہوتی ہے جو بیوی کے ذریعے سے پیدا ہو اور اگر کسی کو بیوی کے بغیر بنایا جائے تو وہ مخلوق ہوتی ہے نہ کہ اولاد، جیسا کہ آسمان و زمین کی پیدائش یا آدم علیہ السلام کی پیدائش۔ (رازی)

آیت 102 ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ …… : یعنی صرف اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرو اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے یقین رکھو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق، حفیظ اور رقیب ہے۔ (ترجمان)

آیت 102 لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ …… : "اَدْرَكَ يُدْرِكُ" کا معنی کسی چیز کو پالینا ہے، اس لیے اس کا معنی دیکھنا بھی ہو سکتا ہے اور کسی چیز کی حقیقت کو پالینا بھی۔ ادراک کا معنی اگر آنکھوں سے دیکھنا ہو تو اس کے متعلق ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "جو تمھیں بیان کرے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا تو اس نے یقیناً جھوٹ کہا۔" پھر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ﴾…… پھر فرمایا: "لیکن آپ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دو دفعہ دیکھا ہے۔" [بخاري، التفسير، سورة والنجم : ۴۸۵۵] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا (سورۂ نجم میں مذکور آیات) ﴿ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے۔ [بخاري، التفسير، باب : ﴿ فكان قاب قوسين أو أدنى ﴾ : ۴۸۵۶]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں رب تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، صرف ابن عباس رضی اللہ عنہما دیکھنے کے قائل ہیں، مگر وہ بھی ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل کی آنکھ سے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے۔ مزید تفصیل سورۂ نجم میں آئے گی۔ یہ تمام بحث دنیا میں نہ دیکھ سکنے کی ہے، مگر قرآن مجید کی متعدد آیات اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن انبیاء کے علاوہ مومنوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا اور وہ بغیر کسی تکلیف کے اپنی اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، جیسے چاند کے دیکھنے میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور جنت کی سب سے بڑی نعمت یہی ہو گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القيامة : ۲۱، ۲۲] "کئی چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔"

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَ مَاۤ اَنَا
عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کئی نشانیاں آ چکیں، پھر جس نے دیکھ لیا تو اس کی جان کے لیے ہے
اور جو اندھا رہا تو اسی پر ہے اور میں تم پر کوئی محافظ نہیں ﴿۱۰۴﴾ اور اسی طرح ہم آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں اور
تاکہ وہ کہیں تو نے پڑھا ہے اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لیے واضح کر دیں جو جانتے ہیں ﴿۱۰۵﴾

لیکن ادراک کا معنی اگر حقیقت کو پا لینا ہو تو یہ تو قیامت کے دن بھی نہ کسی فرشتے کے لیے ممکن ہے نہ رسول کے لیے، کیونکہ محدود مخلوق لامحدود کی حقیقت کو کیسے پا سکتی ہے۔ پھر زیر تفسیر آیت کے مطابق دنیا اور آخرت کسی جگہ بھی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو نہیں پا سکتیں۔

آیت 104 قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ...... : "بَصَآىِٕرُ" یہ "بَصِیْرَةٌ" کی جمع ہے، جو دل کی روشنی کا نام ہے، جیسا کہ بصارت آنکھوں سے دیکھنے کو کہتے ہیں، یعنی مالک کی طرف سے تمھارے پاس دل اور آنکھوں کو روشن کرنے والے دلائل تو پہنچ چکے، جو اوپر کی آیات میں مذکور ہیں، اب ان پر غور و فکر کر کے جو ایمان لے آئے تو اس کا اپنا ہی فائدہ ہے اور جو ان پر غور نہ کرے اور ایمان نہ لائے تو اپنا ہی برا کرے گا۔ میں تم پر کوئی محافظ نہیں کہ تمھارے چاہنے یا نہ چاہنے کے باوجود تمھیں سیدھی راہ پر ڈال سکوں، ہدایت دینا یا نہ دینا تو اللہ ہی کا کام ہے۔

آیت 105 ① وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ : یہاں تک اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق ہونے کا اثبات تھا، اب نبوت کو ثابت کرنے کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ ہم ایسے ہی مختلف طریقوں کے ساتھ بار بار دہراتے ہیں، کبھی مومنوں کو خوش خبری، کبھی کافروں کو تنبیہ، کبھی گزشتہ قوموں کے واقعات کے ذریعے سے نصیحت اور کبھی کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کے احکام، تاکہ جو لوگ عقل و فہم رکھتے ہیں، وہ ان کے ذریعے سے راہ ہدایت پائیں اور مخالفین پر حجت ہو۔

② وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ : یعنی ہم آیات کو پھیر پھیر کر اس لیے بیان فرماتے ہیں کہ اگر ایک طرف ان آیات کے ذریعے سے عقل و فہم والے راہِ ہدایت پائیں گے تو دوسری طرف ضدی اور آباء و اجداد کے رسم و رواج سے چمٹے رہنے والے کافر و مشرک آپ سے یہ کہہ کر گمراہ ہوں گے کہ یہ قرآن جسے تم ہمارے سامنے پڑھ رہے ہو، تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں ہوا، بلکہ تم نے کسی سے پڑھا اور سیکھا ہے۔ مشرکین کے اسی قسم کے اقوال کئی دوسری آیات میں مذکور ہیں، مثلاً سورۂ فرقان (۴، ۵) اور سورۂ مدثر (۱۸ تا ۲۵) (رازی، قرطبی) "وَ لِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ" کی واؤ سے دیگر حکمتوں کی طرف اشارہ ہے جنھیں قصداً حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ ان سب کا بیان بہت طویل تھا۔ واؤ کے بعد ایک حکمت بیان فرما دی گئی۔

③ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ : آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرنے کی پہلی حکمت یہ بیان فرمائی کہ کفار اور عناد رکھنے والے یہ کہیں کہ تم نے یہ قرآن کسی سے پڑھ لکھ کر سیکھ لیا ہے، تاکہ اس طرح زیادہ گمراہ ہوں، یہاں دوسری حکمت بیان کی ہے "تاکہ

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ
مَاۤ اَشۡرَكُوۡا ؕ وَمَا جَعَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَكِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ
یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمۡ ۪ ثُمَّ
اِلٰی رَبِّهِمۡ مَّرۡجِعُهُمۡ فَیُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

اس کی پیروی کر جو تیری طرف تیرے رب کی جانب سے وحی کی گئی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے کنارا کر ﴿۱۰۶﴾ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شریک نہ بناتے، اور ہم نے تجھے ان پر محافظ نہیں بنایا اور نہ تو ان پر کوئی نگہبان ہے ﴿۱۰۷﴾ اور انھیں گالی نہ دو جنھیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، پس وہ زیادتی کرتے ہوئے کچھ جانے بغیر اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل مزین کر دیا ہے، پھر ان کے رب ہی کی طرف ان کا لوٹنا ہے تو وہ انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۰۸﴾

اہل علم کے لیے بیان اور فہم حاصل ہو۔'' (رازی)

آیت 106 اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ...... : یعنی ان کے اس قسم کے بے بنیاد شبہات سے متاثر ہو کر دعوت و تبلیغ ترک نہ کرو۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کو تسلی دینا ہے۔

آیت 107 وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكُوۡا...... : یعنی آپ ان کی حماقتوں اور کفر سے متاثر نہ ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر ایمان و کفر دونوں کی استعداد رکھی ہے اور اس سے ان کا امتحان مقصود ہے کہ شکر گزار بنتے ہیں یا کفر اختیار کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو فرشتوں کی طرح بھی بنا سکتا تھا کہ وہ فطری طور پر مومن ہونے کے ساتھ کفر یا نافرمانی کر ہی نہیں سکتے، بلکہ ہر طرح فرماں بردار ہیں، لیکن یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

آیت 108 ❶ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ...... : یہ آیت سدِ ذرائع کی دلیل ہے، یعنی اگر ایک جائز کام کسی بڑی خرابی کا ذریعہ بنتا ہو تو اس جائز کام کو بھی چھوڑنا ضروری ہے۔ یعنی اگر تم مشرکین کے معبودوں کو گالی دو گے تو وہ جہالت سے اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے اور تم اس کا سبب بنو گے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کے ماں باپ کو گالی دینے سے منع فرمایا کہ اس طرح تم خود اپنے والدین کو گالی دینے کا سبب بن جاؤ گے۔ [بخاری، الأدب، باب لا یسب الرجل والدیه : ۵۹۷۳]

❷ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ...... : یعنی انسان کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ہر کام کو، چاہے وہ درحقیقت اچھا ہو یا برا، اچھا ہی سمجھتا ہے، یعنی: ﴿ كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴾ [المؤمنون : ۵۳] ''ہر گروہ کے لوگ اسی پر خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔'' لیکن انسان میں غور و فکر کی صلاحیت بھی رکھی ہے کہ وہ برے کام کو پوری آزادی سے چھوڑ کر نیک راستہ اختیار کر سکتا ہے، دنیا کا ہر کام اللہ کے چاہنے سے ہوتا ہے، وہ نہ چاہے تو نہیں ہوتا۔ انسانوں کو امتحان کے لیے اچھے برے دونوں

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ
عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ
كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اور انھوں نے اپنی پختہ قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو اس پر ضرور ہی ایمان لے آئیں گے تو کہہ نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں اور تمھیں کیا چیز معلوم کرواتی ہے کہ بے شک وہ جب آئے گی تو یہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۱۰۹﴾ اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے اور انھیں چھوڑ دیں گے، اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں گے ﴿۱۱۰﴾

کاموں کا اختیار دینا بھی اس کی مرضی اور حکمت سے ہے، مگر وہ اپنے بندوں کے لیے کفر اور برے کاموں کو پسند نہیں کرتا۔ دیکھیے سورۂ زمر (۷)۔

آیت 109 لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ ......: مثلاً صفا پہاڑی کو سونے کا بنا دیا جائے، یا ان مطالبوں کو پورا کیا جائے جو ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں ذکر فرمائے ہیں۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں، میرے اختیار میں نہیں اور تمھیں کیا خبر کہ نیا معجزہ یا نشانی آ بھی جائے تو یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

آیت 110 وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ ......: یعنی اس سے پہلے معجزے دیکھ کر جب یہ ایمان نہیں لائے تو اب کیسے لائیں گے؟ جو شخص حق واضح ہونے کے بعد ہٹ دھرمی سے ایک دفعہ انکار کر دیتا ہے، پھر وہ مسلسل انکار ہی کرتا رہتا ہے۔ اس کے اس بدعمل کی وجہ سے آئندہ ایمان لانے کی توفیق اس سے چھین لی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۷۴) اور سورۂ انفال (۲۴) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، یعنی جن کو اللہ ہدایت دیتا ہے وہ پہلی دفعہ ہی حق کی بات سن کر انصاف سے قبول کر لیتے ہیں اور جس شخص نے پہلے ہی ضد سے ٹھان رکھی ہے کہ مانے گا ہی نہیں، وہ معجزہ دیکھ کر بھی کوئی حیلہ بنا لیتا ہے، مثلاً فرعون نے کتنے ہی معجزے دیکھے پر وہ ایمان نہ لایا۔ (موضح)

وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور اگر واقعی ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیتے اور ان سے مردے گفتگو کرتے اور ہم ہر چیز ان کے پاس سامنے لا جمع کرتے تو بھی وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لے آتے مگر یہ کہ اللہ چاہے اور لیکن ان کے اکثر جہالت برتتے ہیں﴿۱۱۱﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ گھڑتے ہیں﴿۱۱۲﴾

آیت 111 ① وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ ...... : پچھلی آیت : ﴿ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ میں جو بات مختصر بیان کی گئی تھی یہاں اسی کی تفصیل ہے، یعنی اگر ہم ان کے تمام مطالبات پورے کر دیں، جیسے فرشتوں کو نازل کرنا اور مُردوں کا کلام کرنا وغیرہ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہم ہر چیز گروہ در گروہ یا آمنے سامنے لا کھڑی کر دیں تو پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہر چیز سے مراد ان کے مطالبات میں سے ہر چیز ہے، کیونکہ "كُلَّ" کے لفظ سے موقع کے مناسب ہر چیز ہوتا ہے، جیسا کہ ہدہد نے ملکۂ سبا سے متعلق کہا: ﴿ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل : ۲۳] "اور اسے ہر چیز دی گئی ہے۔" ظاہر ہے کہ ہر چیز تو اسے نہیں دی گئی تھی، حکومت و سلطنت سے متعلقہ اشیاء ہی عنایت کی گئی تھیں۔

② اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: مگر اللہ چاہے تو ضدی سے ضدی منکر کو بھی ایمان سے نواز سکتا ہے، جیسا کہ بعد میں عرب کے بے شمار عناد رکھنے والے کافر بھی مکہ فتح ہونے پر مسلمان ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کے لیے بشارت کے الفاظ ہیں۔

③ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ: یہاں وہ جہل مراد نہیں جو علم کے مقابلے میں ہوتا ہے، بلکہ وہ جہل ہے جو حلم کے مقابلے میں ہوتا ہے، یعنی اکھڑ پن یعنی بعض حلم والے بھی ان میں موجود ہیں۔

آیت 112 ① وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا......: یعنی جس طرح جن و انس کے شیطان آپ سے دشمنی کر رہے ہیں، یہ صرف آپ کا حال نہیں، بلکہ اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے تمام انبیاء کے لیے بھی جن و انس شیطان دشمن بنائے تھے، لہٰذا آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، بلکہ جس طرح پہلے انبیاء نے اپنے شریر دشمنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لیا، آپ بھی ان کی ایذا رسانی پر صبر کیجیے، مایوسی اور گھبراہٹ کو اپنے اندر راہ نہ دیجیے۔

② يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ...... : وحی کا معنی خفیہ طریقے سے اطلاع دینا ہے، یعنی وہ انسان اور جن جو شیطان ہیں، وہ

وَ لِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ لِيَرْضَوْهُ وَ لِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور تاکہ ان لوگوں کے دل اس (جھوٹ) کی طرف مائل ہوں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اسے پسند کریں اور تاکہ وہ بھی وہی برائیاں کریں جو یہ کرنے والے ہیں ﴿۱۱۳﴾ تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور منصف تلاش کروں، حالانکہ اسی نے تمھاری طرف یہ کتاب مفصل نازل کی ہے اور وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ یقیناً یہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی ہوئی ہے، پس تو ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو ﴿۱۱۴﴾

اپنوں میں سے سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے چوری چھپے طرح طرح کے مزین اور ملمع کیے ہوئے حیلے اور مکر سکھاتے ہیں۔ "غُرُوْرًا" مفعول لہ ہے، یعنی دھوکا دینے کے لیے۔

③ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ: مگر وہ چونکہ حجت پوری کرنے کے لیے انھیں امتحان کا پورا پورا موقع دینا چاہتا ہے اور کسی کو زبردستی اپنی نافرمانی سے باز رکھنا اس کی حکمت اور تکوینی نظام کے خلاف ہے، اس لیے وہ انھیں ڈھیل دے رہا ہے۔

④ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ: یعنی ان کی کوئی پروا نہ کریں، انھیں اور ان کے جھوٹ گھڑنے کو اللہ پر چھوڑ دیں، وہ خود ان سے نمٹ لے گا۔

آیت 113 ① وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ ...... : اس کا عطف "غُرُوْرًا" پر ہے، یعنی "لِيَغُرُّوْا بِذٰلِكَ وَ لِتَصْغٰى" "تاکہ وہ اس کے ساتھ دھوکا دیں اور تاکہ ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اس (جھوٹ) کی طرف مائل ہوں۔" یہ توجیہ ان تمام توجیہوں سے بہتر ہے جو یہاں کی گئی ہیں۔ (رازی)

② لِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا ...... : "اِكْتَسَبَ يَكْتَسِبُ" اچھی یا بری دونوں کمائیوں کو کہتے ہیں، جبکہ "اِقْتَرَفَ يَقْتَرِفُ" برے اعمال کمانے کو کہتے ہیں، یعنی ان شیاطین کے پیشِ نظر اس وحی سے یہ سب مقاصد ہیں۔ (رازی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ کئی آیتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کفار کہنے لگے کہ مسلمان اپنا مارا ہوا جانور کھاتے ہیں اور اللہ کے مارے ہوئے کو حرام سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسی فریب کی باتیں شیطان کرتے ہیں، تاکہ انسانوں کو شبہات میں ڈالا جائے۔ عقل کا حکم نہیں، حکم اللہ کا ہے۔ آگے پھر واضح طور پر سمجھایا گیا کہ ہر جانور کو مارنے والا اللہ ہی ہے اور اس کے نام میں برکت ہے، سو جو اس کے نام پر ذبح ہوا وہ حلال ہے اور جو اس کے نام کے بغیر مر گیا وہ مردار ہے۔ (موضح)

آیت 114 ① اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا ...... : اوپر کی آیات میں یہ بتا دیا کہ یہ کفار کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے، لہٰذا ان کے لیے آیات کا نازل کرنا بے فائدہ ہے۔ اب یہاں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مفصل کتاب نازل فرمائی ہے وہ آپ کی نبوت کے سچا ہونے پر دلیل کے لیے کافی ہے۔ کفار مکہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان جو مخالفت ہے اس

وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ۚ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۱۵﴾ وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ یُضِلُّوۡکَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾

اور تیرے رب کی بات سچ اور انصاف کے اعتبار سے پوری ہوگئی، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہیں ﴿۱۱۶﴾

کے بارے میں اہل کتاب یا کسی اور کو حکم بنا لیا جائے، پھر جو فیصلہ وہ دیں اسے تسلیم کر لیا جائے، اس آیت میں ان کی اس تجویز کا جواب دیا جا رہا ہے کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور منصف تلاش کروں۔

2 یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ: کیونکہ ان کے انبیاء بھی انھیں نبی ﷺ کی بشارت دیتے رہے ہیں اور ان کی کتابوں میں بھی آپ کی علامات موجود ہیں۔

3 فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ: یعنی اس بارے میں کہ اہل کتاب کے دلوں میں قرآن کے سچا ہونے کا یقین ہے۔ خطاب تو آپ ﷺ سے ہے، مگر اس سے مراد سارے مسلمان ہیں۔ (رازی)

آیت 115 1 وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ...... : یہاں کلمہ اور کلمات سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن معجزہ ہونے اور آپ ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی دلیل کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ قرآن کے تمام مضامین دو ہی قسم کے ہیں، خبریں یا احکام۔ یہاں "صِدۡقًا" کا تعلق خبروں سے ہے اور "عَدۡلًا" کا تعلق احکام سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تمام خبریں، خواہ ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ہو یا گزشتہ واقعات یا مستقبل کے وعدے اور حوادث سے، وہ سب پورے طور پر سچے ہیں اور اس میں جتنے احکام ہیں وہ سب عدل و انصاف پر مشتمل ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسی کامل کتاب کی موجودگی میں ان شیطانی وساوس یا عقلی شکوک و شبہات کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ (رازی) پھر ذبیحہ جیسے اہم مسئلے میں یہ اپنی کج فہمی سے کیوں دخل دے رہے ہیں۔

2 لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ: یعنی نہ تو اس قسم کے شبہات قرآن کے معجزہ ہونے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے اوامر و نواہی میں کوئی ترمیم جائز ہے اور نہ جیسے تورات و انجیل میں تحریف ہوئی، قرآن میں ہو سکے گی۔ (رازی)

آیت 115 وَ اِنۡ تُطِعۡ اَکۡثَرَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ......: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنے نبی کو متنبہ کیا ہے کہ کثرت آپ کے نزدیک حق کی دلیل نہیں ہونی چاہیے اور محض کثرت کی بنیاد پر آپ کو اہل زمین کا اتباع نہیں کرنا چاہیے، ورنہ آپ راہ حق سے ہٹ جائیں گے۔ یہ کفار جو کثیر تعداد میں ہیں، اس جھوٹے گمان میں مبتلا ہیں کہ ان کے آباء و اجداد حق پر تھے،

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

بے شک تیرا رب ہی خوب جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکتا ہے اور وہی ہدایت پانے والوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۷﴾ تو اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو ﴿۱۱۸﴾ اور تمھیں کیا ہے کہ تم اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، حالانکہ بلاشبہ اس نے تمھارے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کر دی ہیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، مگر جس کی طرف تم مجبور کر دیے جاؤ اور بے شک بہت سے لوگ اپنی خواہشوں کے ساتھ کچھ جانے بغیر یقیناً گمراہ کرتے ہیں، بے شک تیرا رب ہی حد سے بڑھنے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے ﴿۱۱۹﴾

اس لیے ان کی تقلید کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ لوگوں کی اکثریت اسی دین پر قائم ہے جو ان کا بھی دین ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں، کبھی کسی کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں تو کبھی بتوں کو اللہ کے پاس اپنا سفارشی بناتے ہیں اور کبھی مردوں اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانوروں کو حلال قرار دیتے ہیں۔ اس آیت سے جمہوریت کی حقیقت بھی خوب واضح ہوتی ہے، جس میں اکثریت ہی کو فیصلہ کن سمجھا جاتا ہے۔ اکثریت سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے علاوہ بھی حق پر نہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے: ﴿وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ [یوسف : ۱۰۳] ''اور اکثر لوگ خواہ تو حرص کرے ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [یونس : ۵۵] ''اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔'' اور فرمایا: ﴿وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾ [سبا : ۱۳] ''اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ﴾ [ص : ۲٤] ''مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور یہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔''

اب ایک طرف اللہ کا حکم ہو جس سے بڑی دلیل کوئی ہو نہیں سکتی اور ایک طرف اکثریت ہو جن کی بنیاد محض ان کے گمان اور اٹکل پر ہے اور اس اٹکل کی بنیاد پر انھوں نے بے شمار حرام چیزوں، مثلاً شرک، سود، زنا، قوم لوط کے عمل وغیرہ کو حلال کر لیا اور بے شمار حلال چیزوں کو حرام قرار دے دیا ہے تو بتائیے حق کس طرف ہو گا؟ اس لیے اس آیت میں اللہ کے حکم کے مقابلے میں اہل زمین کی اکثریت کی اطاعت سے منع فرمایا۔

آیت 118 فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ......: یعنی وہ حلال جانور جسے ذبح یا شکار کرتے وقت اللہ کا نام یعنی '' بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ '' لیا جائے اسے کھاؤ، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو، یعنی صرف ایسا ذبیحہ کھانا ایمان کا تقاضا ہے۔

آیت 119 ① وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ : یعنی جب اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے حرام چیزوں کو خوب کھول کر

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾
وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤی
اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ لِیُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

اور ظاہر گناہ کو چھوڑ دو اور اس کے چھپے کو بھی، بے شک جو لوگ گناہ کماتے ہیں عنقریب انھیں اس کا بدلہ دیا جائے گا، جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے ﴿۱۲۰﴾ اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور بلاشبہ یہ یقیناً سراسر نافرمانی ہے اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ضرور باتیں ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے ان کا کہنا مان لیا تو بلاشبہ تم یقیناً مشرک ہو ﴿۱۲۱﴾

بیان کر دیا ہے، جن کی تفصیل آگے اسی سورت میں آ رہی ہے اور سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں بھی ہے اور بعض کا ذکر احادیث میں ہے، تو ان کے علاوہ سب جانور حلال ہیں اور اللہ کے نام پر ذبح یا شکار کیا ہوا جانور ان حرام چیزوں میں شامل نہیں ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم اسے نہ کھاؤ اور اللہ کے نام کے بغیر یا غیر اللہ کے نام پر ذبح یا شکار کیا ہوا جانور کھاؤ۔

② اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ : یعنی اضطرار اور مجبوری میں حرام کھانا جائز ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳)، سورۂ مائدہ (۳) اور اسی سورت کی آیت (۱۴۵)۔

③ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ : مراد وہ لوگ ہیں جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے ہیں۔ مقصود اس سے ڈرانا ہے۔ (رازی)

آیت 120 وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ...... : یعنی حلال و حرام صرف کھانے کی چیزوں میں منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر ظاہر و باطن گناہ کو چھوڑنا ضروری ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی کافروں کے بہکانے پر نہ ظاہر میں عمل کرو اور نہ دل میں شبہ رکھو۔'' (موضح) علماء نے لکھا ہے کہ ظاہر گناہ وہ ہیں جو ہاتھ پاؤں سے کیے جائیں، جیسے چوری، زنا وغیرہ اور چھپے گناہ وہ ہیں جن کے کرنے کا دل میں عزم ہو، یا جو عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں، جیسے کفر و شرک اور نفاق وغیرہ، یا جن گناہوں کا نقصان عام لوگوں پر واضح ہو وہ ظاہر گناہ کہلاتے ہیں اور جن کے نقصان سے چند مخصوص آدمیوں کے سوا دوسرے واقف نہ ہوں وہ باطن کہلاتے ہیں۔ (المنار)

آیت 121 ① وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ : پہلے اللہ نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ کے نام کا ذبیحہ حلال ہے۔ اب اس آیت میں بیان فرمایا کہ جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا حرام ہے، اس میں مردار اور وہ جانور تو آیت کے صاف الفاظ میں داخل ہیں جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے ہوں اور لفظ عام ہونے کی وجہ سے آیت گو ہر اس چیز کو شامل ہے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، خواہ وہ کھانے کی کوئی بھی چیز ہو، مگر فقہاء نے اس سے بالاجماع ذبیحہ مراد لیا ہے۔ (رازی)

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ
لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ
قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنا دی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں۔ اسی طرح کافروں کے لیے وہ عمل خوشنما بنا دیے گئے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۲۲﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں سب سے بڑے اس کے مجرموں کو بنا دیا، تا کہ وہ اس میں مکروفریب کریں اور وہ مکروفریب نہیں کرتے مگر اپنے ساتھ ہی اور وہ شعور نہیں رکھتے ﴿۱۲۳﴾

یاد رہے! اگر کسی ذبیحہ پر جان بوجھ کر اللہ کا نام ترک کر دیا جائے تو وہ اکثر فقہاء کے نزدیک حرام ہے، مگر جب مسلمان ذبح کرتے وقت " بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ " بھول جائے تو اس کا کھانا جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے خطا اور نسیان معاف کر دیا ہے۔

② وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ: یعنی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا فسق ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۵)۔

③ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ......: دیکھیے اسی سورت آیت کی (۱۱۳) کا حاشیہ (۲)۔

④ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ: اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام اور حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دینے والا بھی مشرک ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کو حاکم بنا لیا، یعنی تحلیل و تحریم کا حق کسی اور کے لیے تسلیم کر لیا، جب کہ یہ صرف اللہ کا حق ہے۔ (رازی) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے اللہ کے پوجے، بلکہ شرک حکم میں بھی ہے کہ کسی اور کا مطیع ہووے۔ (موضح)

آیت 122 ① اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ......: یعنی وہ کافر تھا اسے مسلمان بنایا۔ (شوکانی) اوپر جانوروں کے مُردوں کا ذکر تھا، یہاں کافر پر وہی مثال فرمائی، یعنی جب کافر تھے تو جہل اور کفر و شرک کے باعث سب مُردے تھے، پھر جس کو ایمان ملا وہ زندہ ہوا اور روشنی اور راہِ ہدایت پائی اور اس کے چہرے پر سب لوگ ایمان کی روشنی دیکھتے ہیں اور جس کو ایمان نہ ملا وہ اندھیروں میں پڑا رہا۔ (موضح) مسلمان اور کافر کے زندہ اور مردہ ہونے کا مضمون دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۷)، سورۂ ہود (۲۴) اور سورۂ فاطر (۱۹ تا ۲۲) میں۔

② كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: یعنی شیطان اپنے وسوسوں کے ذریعے سے ان کافروں کی نگاہ میں ان کے اعمال کو خوبصورت کر کے پیش کرتا ہے۔

آیت 123 ① وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ......: " اَكٰبِرَ " یہ " اَكْبَرُ " کی جمع ہے، " مُجْرِمِيْنَ " کا نون

وَ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ حَتّٰى نُؤۡتٰى مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيۡبُ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا صَغَارٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيۡدٌۢ بِمَا كَانُوۡا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾ فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا، اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔ عنقریب ان لوگوں کو جنھوں نے جرم کیے، اللہ کے ہاں بڑی ذلت پہنچے گی اور بہت سخت عذاب، اس وجہ سے کہ وہ فریب کیا کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾ تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ اسے گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ، نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ مشکل سے آسمان میں چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ﴿۱۲۵﴾

" ھا " کی طرف اضافت کی وجہ سے گر گیا، یعنی مکہ کی طرح پہلے بھی ہم نے ہر بستی کے اکابر یعنی چودھری اور کھڑپنچ اس کے مجرموں کو بنا دیا، جس کے نتیجے میں وہ اپنے مکر و فریب اور قوت و اقتدار کے ذریعے سے لوگوں کو ایمان سے روکتے رہے اور فسق و فجور میں پڑے رہے۔ انبیاء کے مقابلے میں بھی یہی لوگ آتے رہے، مگر آخر انجام ایمان والوں کے غلبے پر ہوا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں، ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے ہیں، تاکہ عوام الناس پیغمبر کے مطیع نہ ہو جائیں، جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ جادو کے زور سے سلطنت لینا چاہتا ہے۔ (موضح)

② وَمَا يَمۡكُرُوۡنَ اِلَّا بِاَنۡفُسِهِمۡ: یعنی اس کا وبال خود ان پر پڑے گا، تو گویا اپنے آپ کو فریب دے رہے ہیں۔

آیت 124 ① وَ اِذَا جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ ...... : یعنی ان کفار کے مکر و فریب کا یہ عالم ہے کہ جب بھی ان کے سامنے نبی ﷺ کے صدق کی دلیل کے طور پر کوئی معجزہ ظاہر ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ جب تک ہم خود اس منصب پر فائز نہ ہوں اور ہمیں یہ معجزہ نہ ملے ہم ایمان نہیں لا سکتے۔

② اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسٰلَتَهٗ: یعنی نبوت و رسالت محض وہبی چیز ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے نبوت کی امانت اس کے سپرد کر دیتا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ نعمت کسے عطا کرنی ہے، مکہ کے ایک یتیم کو یا مکہ اور طائف کے کسی متکبر سردار کو۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۳۱، ۳۲)۔

آیت 125 ① فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ...... : "اسلام" کا لفظی معنی ہے تابع ہو جانا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ

اور یہ تمھارے رب کا راستہ ہے سیدھا۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ انھی کے لیے ان کے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا مددگار ہے، ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے ﴿۱۲۷﴾ اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، اے جنوں کی جماعت! بلاشبہ تم نے

"**حَرَجًا**" نہایت تنگ، گھٹا ہوا، درختوں کا وہ جھنڈ جس میں کوئی چیز داخل نہ ہو سکے۔ "**يَصَّعَّدُ**" یہ "صَعِدَ يَصْعَدُ (س)" سے باب تفعّل کا مضارع ہے، یعنی "**يَصَّعَّدُ**" اصل میں "يَتَصَعَّدُ" تھا، حروف زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہو گیا ہے، یعنی مشکل سے چڑھ رہا ہے۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ رسالت کی طرح ہدایت و گمراہی بھی اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے نظام عدل کے مطابق جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ صحیح بات تسلیم کرنے کے لیے کھول دیتا ہے، اس کے لیے ہدایت کے راستے آسان کر دیتا ہے، اسے حق قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور وہ آسانی سے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے تابع فرمان کر دیتا ہے اور جسے اس کی سرکشی کے باعث ہدایت نہیں دینا چاہتا اس کا سینہ حق قبول کرنے کے لیے تنگ اور نہایت گھٹا ہوا کر دیتا ہے، جیسا کہ وہ بلندی کی طرف مشکل سے چڑھ رہا ہے، جوں جوں اوپر چڑھتا ہے، ایک تو چڑھائی کی وجہ سے دوسرے آکسیجن کے کم اور پھر ختم ہونے کی وجہ سے سانس ہی نہیں لے سکتا۔ جو لوگ حق سمجھ کر انکار کا راستہ اختیار کرنے والے ہیں ان پر ایمان کی طہارت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے کفر کی گندگی چڑھتی چلی جاتی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۶، ۷)، سورۂ توبہ (۱۲۵)، سورۂ لیل (۵ تا ۱۰) اور سورۂ یونس (۱۰۰)۔

③ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اوپر فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ ایک آیت (نشانی) دیکھیں تو ضرور یقین لے آئیں گے، اب فرمایا کہ ہم نہ دیں گے ایمان تو کیونکر لائیں گے۔ بیچ میں مردہ حلال کرنے کے حیلے ذکر کیے، اب اس بات کا جواب فرمایا کہ جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات کو نہ چھوڑے، جو دلیل دیکھے کچھ حیلہ بنا لے، وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری پر وہ نشان ہدایت ہے۔ ان لوگوں میں نشان ہیں گمراہی کے، ان کو کوئی آیت اثر نہ کرے گی۔" (موضح)

آیت 126 وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ ...... : "هٰذَا" یعنی حکم برداری میں عقل کو راہ نہ دینا سیدھی راہ ہے۔ (موضح)

آیت 126 ① وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ...... : جنوں سے مراد یہاں شیطان جن ہیں۔ ان کا بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لینے کا مطلب انھیں گمراہ کر کے اپنے راستے پر لگا لینا ہے اور جنوں کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے کہ انھوں نے ان کو گمراہی کی دعوت دی اور انھوں نے اسے قبول کر لیا اور ان کی تعظیم و تکریم اور مصیبتوں کے وقت ان کو پکارنا شروع کر دیا اور

قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا، اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے اے ہمارے رب! ہمارے بعض نے بعض سے فائدہ اٹھایا اور ہم اپنے اس وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ فرمائے گا آگ ہی تمھارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنا دیتے ہیں، اس کی وجہ سے جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۱۲۹﴾

یہی شیاطین کی کامیابی ہے اور انسانوں کا جنوں سے فائدہ اٹھانے سے مراد ان سے آسمان کے فرشتوں سے سنی ہوئی خبریں، جو وہ جھوٹ ملا کر بتاتے ہیں، سن کر اپنی جھوٹی غیب دانی کا بازار چمکانا، جادو ٹونے میں ان سے مدد لینا وغیرہ ہے اور پھر لوگوں سے پیسے بٹورنا، مزید کئی فوائد حاصل کرنا اور انھیں گمراہ کرنا ہے۔

② قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ : یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے بعد جو شخص بھی کسی جن سے کوئی غلط فائدہ اٹھائے یا قید کر کے اس سے کوئی مقصد حاصل کرے اس شخص اور جن دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شیطان جن کو نماز کے دوران آپ پر حملہ کرنے پر گرفتار کر لیا اور مسجد کے ستون سے باندھنے کا ارادہ کیا تو سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد کر کے اسے چھوڑ دیا کہ انھوں نے دعا کی تھی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ......﴾ [ص : ٣٤ تا ٤٠] مزید دیکھیے سورۂ شعراء (۲۲۱ تا ۲۲۳) اور سورۂ جن (٦)۔

③ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ : اس لفظ سے جو شبہ پیدا ہوتا ہے کہ جہنم آخر ختم ہو جائے گی اس کے جواب میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو فرمایا کہ آگ میں رہا کریں گے مگر جو چاہے اللہ تو یہ اس لیے کہ اگر دوزخ کا عذاب دائمی ہے تو اسی کے چاہنے سے ہے، وہ چاہے تو موقوف کرے مگر وہ چاہ چکا۔ (موضح)

آیت 129 وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا ...... : یعنی جس طرح ہم نے جنات اور بعض انسانوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا اسی طرح ہم ظالم اور فاسق و فاجر انسانوں کو ان کے اعمال کے سبب ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں، جیسا کہ دیکھیے سورۂ توبہ (٦٧، ٧١) ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی طرح ہم (آخرت میں) ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیں گے کہ جس طرح وہ دنیا میں گناہوں کے ارتکاب میں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار تھے اسی طرح آخرت کا عذاب بھگتنے میں بھی وہ ایک دوسرے کے شریک حال ہوں گے۔ بعض نے "نُوَلِّيْ" کا ایک معنی یہ کیا ہے کہ ہم ظالموں میں سے بعض کو بعض پر والی اور حاکم بنا دیتے ہیں کہ جس طرح ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بعض کو بعض پر مسلط کر دیا،

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم میں سے کوئی رسول نہیں آئے، جو تم پر میری آیات بیان کرتے ہوں اور تمھیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے ہوں؟ وہ کہیں گے ہم اپنے آپ پر گواہی دیتے ہیں اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا اور وہ اپنے آپ پر گواہی دیں گے کہ یقیناً وہ کافر تھے ﴿۱۳۰﴾ یہ اس لیے کہ بے شک تیرا رب کبھی بستیوں کو (ان کے) کسی ظلم کی وجہ سے ہلاک کرنے والا نہیں، جب کہ اس کے رہنے والے بے خبر ہوں ﴿۱۳۱﴾ اور ہر ایک کے لیے مختلف درجے ہیں، ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے کیے اور تیرا رب اس سے ہرگز بے خبر نہیں جو وہ کر رہے ہیں ﴿۱۳۲﴾

اسی طرح دنیا میں ہم ظالموں کو بھی ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں کہ ظالم ماتحت پر ظلم کرتا ہے اور کمزور زبردست کا ظلم سہتا ہے، مگر آیات کے سیاق اور الفاظ "اَوْلِيٰٓـُٔهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ" کی یہاں حاکم کے معنی کے ساتھ مناسبت محل نظر ہے۔

آیت 130 ① يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: "تم میں سے رسول" کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول جن و انس میں سے انسان ہی ہوئے ہیں۔ افضل مخلوق فرشتے یا انسان ہیں۔ دیکھیے سورۂ یوسف (۱۰۹) اور سورۂ فرقان (۲۰) جنوں کا نبی ہونا ثابت نہیں، علمائے سلف و خلف کی اکثریت کا یہی قول ہے کہ کسی جن کو رسول نہیں بنایا گیا، البتہ ان میں سے کئی منذرین گزرے ہیں، یعنی اپنی قوم کو خبردار کرنے والے، جو انسانوں کی طرف آنے والے رسولوں پر ایمان لا کر اپنی قوم کو پیغام پہنچاتے تھے۔ دیکھیے سورۂ احقاف (۲۹ تا ۳۲) اور سورۂ جن۔ جنوں نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کیا ہے اور اپنی قوم کو ایمان لانے کی دعوت دی ہے، بلکہ سورۂ احقاف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن پہلے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔

② اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس سورت میں اوپر مذکور ہوا کہ اول کافر اپنے کفر کا انکار کریں گے، پھر حق تعالیٰ تدبیر سے ان کو قائل کرے گا۔ (موضح) دیکھیے سورۂ انعام (۲۳ اور ۲۷ تا ۳۰)، سورۂ حم السجدۃ (۲۰، ۲۱) اور سورۂ یٰس (۶۵)۔

آیت 131 ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ......: یعنی ان کے پاس کوئی پیغمبر یا اس کا نائب نہ پہنچا ہو اور اس نے انھیں حقیقت حال سے آگاہ نہ کر دیا ہو۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۵)۔

آیت 132 وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا......: اس سے معلوم ہوا کہ جنوں میں سے بھی جو نیک ہیں وہ جنت میں اور جو بدکار

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَاۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؕ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور تیرا رب ہی ہر طرح بے پروا، کمال رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تو تمھیں لے جائے اور تمھارے بعد جانشین بنا دے جسے چاہے، جس طرح اس نے تمھیں کچھ اور لوگوں کی اولاد سے پیدا کیا ہے ﴿۱۳۳﴾ بے شک وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، ضرور آنے والی ہے اور تم کسی صورت عاجز کرنے والے نہیں ﴿۱۳۴﴾ کہہ دے اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کرو، بے شک میں (بھی) عمل کرنے والا ہوں، تو تم عنقریب جان لو گے وہ کون ہے جس کے لیے اس گھر کا اچھا انجام ہوتا ہے۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے ﴿۱۳۵﴾

ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔ سورۂ رحمٰن میں اس کی تفصیل موجود ہے اور جنت اور جہنم میں بھی ان کے درجات و درکات مختلف ہوں گے۔

آیت 133 ① وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ: یہاں "اَلْغَنِيُّ" خبر معرفہ ہونے اور "اَلرَّحْمَةِ" پر "الف لام" ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا ہے "اور تیرا رب ہی ہر طرح بے پروا، کمال رحمت والا ہے" اس کے سوا کوئی اور نہ ہی بے پروا ہے نہ کمال رحمت والا، یعنی اسے مخلوق سے کوئی حاجت نہیں، پھر بھی بطور احسان کمال رحمت والا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ پہلے جو نعمتیں ذکر ہوئی ہیں، مثلاً رسولوں کا بھیجنا وغیرہ، محض رحمت کی بنا پر ہیں، اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں۔

② ذُو الرَّحْمَةِ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں، ایک رحمت اس نے جنوں، آدمیوں، جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں میں اتاری ہے، وہ اسی ایک رحمت کی وجہ سے ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں اور رحم کرتے ہیں اور اسی ایک رحمت کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھی ہیں جو اپنے بندوں پر قیامت کے دن کرے گا۔" [مسلم، التوبة، باب فى سعة رحمة الله تعالى ...... : ۲۷۵۲/۱۹]

③ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ ...... : یعنی جس طرح تمھیں پہلے لوگوں کا جانشین بنایا اسی طرح تمھیں تباہ کر کے دوسروں کو تمھارا جانشین بنا سکتا ہے، یا یہ کہ اس کی قدرت جن و انس کو پیدا کرنے ہی پر منحصر نہیں، بلکہ وہ ان کے بجائے کوئی تیسری قسم کی مخلوق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ (رازی) دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۳)، سورۂ ابراہیم (۱۹، ۲۰) اور سورۂ فاطر (۱۵ تا ۱۷)۔

آیت 134 وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ: باء تاکید کی وجہ سے ترجمہ میں "کسی صورت" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ تم اس سے بچ کر کہیں جا نہیں سکتے کہ وہ تمھیں پکڑنے سے عاجز رہ جائے۔

آیت 135 ① قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ: مطلب یہ نہیں کہ تمھیں اجازت ہے کہ جو چاہو کرو، بلکہ ڈانٹنا

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

اور انھوں نے اللہ کے لیے ان چیزوں میں سے جو اس نے کھیتی اور چوپاؤں میں سے پیدا کی ہیں، ایک حصہ مقرر کیا، پس انھوں نے کہا یہ اللہ کے لیے ہے، ان کے خیال کے مطابق اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے، پھر جو ان کے شرکا کے لیے ہے سو وہ اللہ کی طرف نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لیے ہے سو وہ ان کے شریکوں کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں ﴿۱۳۶﴾

مقصود ہے، جیسے کوئی شخص کہتا ہے کہ اچھا جو کچھ تم کر رہے ہو کرتے رہو، میں عنقریب تم سے نمٹ لوں گا۔

2 مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ : ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے وعدہ پورا فرمایا اور انھیں تمام ملک پر قبضہ عطا فرمایا، مخالفین ان کے رحم و کرم پر رہ گئے، مکہ فتح کروا دیا اور یہ سب کچھ آپ کی زندگی میں ہو گیا، پھر آپ کی وفات کے بعد مشرق سے مغرب تک ملک فتح ہو گئے۔ آخرت میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر اچھا انجام ہو گا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۵۱، ۵۲)

3 اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ : ''بلاشبہ'' ''اِنَّ'' کا اور ''حقیقت یہ ہے۔'' ضمیر شان ''هٗ'' کا ترجمہ ہے۔

آیت 136 وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ ...... : قیامت اور جزا و سزا کے متعلق ان کے خیالات کی تردید کے بعد یہاں سے ان کی دوسری اعتقادی اور عملی حماقتوں اور جہالتوں کا بیان شروع ہو رہا ہے جو مدت سے چلی آ ئی تھیں۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب تم عربوں کی جہالت معلوم کرنا چاہو تو سورۂ انعام کی آیت (۱۳۰) سے لے کر ﴿ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا ﴾ یعنی آیت (۱۴۰) تک پڑھ لو۔ [بخاری، المناقب، باب قصة زمزم و جهل العرب : ۳۵۲۴] ان میں سے پہلی جہالت یہ تھی کہ اپنی کھیتی اور چوپاؤں میں سے ایک حصہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے، یعنی مہمان نوازی، صلہ رحمی اور اللہ کو خوش کرنے والے کاموں کے لیے مقرر کیا ہوا تھا اور ایک حصہ اپنے داتاؤں، مشکل کشاؤں، ان کی شکل پر بنائے ہوئے بتوں، ان کے پروہتوں اور کاہنوں کے لیے۔ اگر کسی وجہ سے بتوں اور کاہنوں کا حصہ کم پڑ جاتا تو اللہ تعالیٰ کے حصے میں سے لے کر اس میں ڈال دیتے اور کہتے کہ اللہ تو غنی ہے، اس کو زیادہ مال کی کیا ضرورت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا حصہ کم پڑ جاتا تو اس میں بتوں کے حصے میں سے کچھ نہ ڈالتے۔ اب بتائیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں شریک بنانا کون سی کم جہالت تھی کہ اس سے بڑھ کر ان شرکا کو خوش کرنے کے لیے کھیتی اور چوپاؤں کے حصے میں ان کو اللہ پر ترجیح دینے کی جہالت اختیار کرتے! یہ اسی طرح ہے جیسے آج کل بعض مسلمان اللہ کا فرض زکوٰۃ اور عشر نہیں نکالیں گے، مگر اپنے فوت شدہ داتاؤں اور غریب نوازوں کی نیاز میں کبھی ناغہ نہیں آنے دیں گے اور عقیدہ یہ رکھیں گے کہ اگر اس میں کمی ہو گئی تو جانوروں کے تھنوں میں سے دودھ

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کو مار ڈالنا ان کے شریکوں نے خوش نما بنا دیا، تاکہ وہ انھیں ہلاک کریں اور تاکہ وہ ان پر ان کا دین خلط ملط کریں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ باندھتے ہیں ﴿۱۳۷﴾

کے بجائے خون آئے گا۔ نام اس کا ایصال ثواب رکھیں گے، مگر ایصال ثواب تو اللہ کے نام پر صدقہ کرنے سے ہوتا ہے، نہ کہ بزرگوں کی قبروں پر چڑھاوے چڑھا کر اور اگر اللہ ہی کو خوش کرنا ہو تو غیر اللہ کی نذر و نیاز کے بجائے عشر اور زکوٰۃ نکالیں۔

آیت 137 ① **وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ**...... : یہ ان کی دوسری جہالت اور گمراہی تھی، اس کا عطف "**جَعَلُوْا**" پر ہے، یعنی جیسے کھیتی اور جانوروں میں سے انھوں نے اپنے شرکاء کا حصہ مقرر کیا، اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکا نے اپنی اولاد کو قتل کرنا بھی خوش نما بنا دیا اور عام طور پر ان کے سامنے تین چیزیں جواز کے بہانے کے طور پر رکھ دیں، ایک یہ کہ انھیں کہاں سے کھلاؤ گے، یعنی ﴿ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ [بنی إسرائیل : ۳۱] "مفلسی کے ڈر سے۔" جیسا کہ آج کل کے نام نہاد مسلمان بھی منصوبہ بندی کے نام پر یہ کام کر رہے ہیں، کفار کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ دوسرا لڑکی کا باعث عار ہونا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ﴾ [النحل : ۵۹] "وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس خوش خبری کی برائی کی وجہ سے جو اسے دی گئی۔" اور تیسرا اپنے شریکوں کو خوش کرنے کے لیے اولاد کو ان کے نام پر ذبح کر دینا، جسے ہندو بھینٹ چڑھانا کہتے ہیں۔ ان پروہتوں اور بت خانوں کے پجاریوں کو شریک اس لیے کہا کہ وہ انھیں اپنے نفع و نقصان میں دخیل سمجھتے تھے اور انھی کی ترغیب پر بچوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، جیسا کہ آج کل کئی قبروں کے پجاری یہ کام کرتے ہیں اور اس لیے بھی کہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی اور کا حکم ماننا بھی اسے شریک بنانا ہے اور سب سے بڑا شریک تو شیطان ہے جس کے خوش نما بنانے پر وہ اللہ کے ساتھ شرک اور اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔

② **لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ**: "**لِيُرْدُوْهُمْ**" باب افعال سے "اَرْدٰى يُرْدِىْ" کا معنی ہے ہلاک کرنا۔ "**لِيَلْبِسُوْا**" اگر "لَبَسَ يَلْبِسُ (ض)" ہو تو خلط ملط کرنا اور "لَبِسَ يَلْبَسُ (س)" ہو تو پہننا۔ اہل عرب اصل میں ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہونے کے مدعی تھے، لیکن شیطان نے آہستہ آہستہ بت پرستی، قتل اولاد اور بہت سی غلط باتیں ان کے دین میں داخل کر دی تھیں۔ فرمایا کہ ان کے شرکاء نے یہ سب کچھ انھیں برباد کرنے اور ان کے دین کو خلط ملط کرنے کے لیے کیا۔

③ **وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ**...... : مگر یہ جبر ہوتا اور اس اختیار کے خلاف ہوتا جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دے کر امتحان لے رہا تھا، اس لیے آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، ان کی ان تمام حرکتوں کو افترا (جھوٹ باندھنا) قرار دیا۔

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ
ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ
وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

اور انھوں نے کہا یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں کھائے گا جسے ہم چاہیں گے، ان کے خیال کے مطابق اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام کی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے، اس پر جھوٹ باندھتے ہوئے۔ عنقریب وہ انھیں اس کی جزا دے گا جو وہ جھوٹ باندھتے تھے ﴿۱۳۸﴾ اور انھوں نے کہا جو ان چوپاؤں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری بیویوں پر حرام کیا ہوا ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو وہ سب اس میں شریک ہیں۔ عنقریب وہ انھیں ان کے کہنے کی جزا دے گا۔ بے شک وہ کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۳۹﴾

آیت 138 ① ''حِجْرٌ'' بمعنی ''مَحْجُوْرٌ'' ہے، یعنی ممنوع۔ اس آیت میں ان کی جاہلیت کی تین اور صورتیں بیان فرمائی ہیں، پہلی صورت یہ کہ فلاں جانور یا کھیت کا استعمال ممنوع ہے، مگر اس کے لیے جسے ہم اجازت دیں گے اور یہ اجازت بت خانوں کے مجاوروں اور خادموں کے لیے ہوتی تھی۔

② **حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا** : یہ دوسری صورت ہے کہ وہ مختلف قسم کے جانوروں کو اپنے بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے اور ان سے سواری یا بوجھ اٹھوانے کا کام نہ لیتے، جیسے بحیرہ، سائبہ وغیرہ۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۱۰۳)۔

③ **وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا ......** : یہ تیسری صورت ہے کہ وہ کچھ جانوروں کو بت خانوں کے مجاوروں کے لیے خاص کرتے ہوئے انھیں ذبح کرتے وقت یا سوار ہوتے وقت صرف اپنے بت کا نام لیتے، اللہ کا نام نہ لیتے، بلکہ ان پر حج کے لیے بھی نہ جاتے، تاکہ ان مجاوروں کے سوا کوئی انھیں استعمال نہ کر سکے۔ بہر حال یہ ساری صورتیں گھڑی ہوئی تو ان کی اپنی تھیں مگر وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے اور باور کرواتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

آیت 139 **وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ ......** : یہ ایک اور شکل تھی کہ جو جانور وہ اپنے بتوں کے نام پر وقف کرتے، ان میں سے بعض کے بارے میں کہتے کہ ان کا دودھ اور ان کے پیٹ سے پیدا ہونے والا زندہ بچہ صرف ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے، عورتوں کے لیے حرام ہے، ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو پھر مرد اور عورت اس کے کھانے میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کی ان غلط بیانیوں پر عنقریب انھیں بدلہ دے گا اور اپنی کامل حکمت اور علم کے مطابق دے گا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى
اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۴۰ وَ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ
وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ
ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۱۴۱

بے شک ان لوگوں نے خسارہ اٹھایا جنھوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے کچھ جانے بغیر قتل کیا اور اللہ نے انھیں جو کچھ دیا تھا اسے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے حرام ٹھہرا لیا۔ یقیناً وہ گمراہ ہو گئے اور ہدایت پانے والے نہ ہوئے ۝۱۴۰ اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کیے چھپروں پر چڑھائے ہوئے اور نہ چڑھائے ہوئے اور کھجور کے درخت اور کھیتی، جن کے پھل مختلف ہیں اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے۔ اس کے پھل میں سے کھاؤ، جب وہ پھل لائے اور اس کا حق اس کی کٹائی کے دن ادا کرو اور حد سے نہ گزرو، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا ۝۱۴۱

آیت 140 قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ ...... : فرمایا جن لوگوں نے یہ کام کیے انھوں نے دنیا اور آخرت میں خسارا اٹھایا، دنیا میں اپنی بے وقوفی اور جہالت سے اپنی اولاد کو قتل کرنے کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوئے اور اپنے اموال میں سے کچھ چیزوں کو خود ہی حرام قرار دے کر اپنے آپ کو تنگی اور مشکل میں ڈال لیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور بہتان باندھنے کی وجہ سے بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔

آیت 141 ① وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ...... : ”مَعْرُوْشٰتٍ“ کا مادہ ”عرش (ن، ض)“ ہے۔ جب اس کا ذکر کسی پودے کی بیل کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اس کی ٹہنیوں کو لکڑیوں وغیرہ پر اوپر اٹھانا ہے۔ ”عَرَشَ الْكَرْمَ“ یعنی اس نے انگور کی بیل کو لکڑی وغیرہ پر بلند کیا۔

② مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے اس سورت کی آیت (۹۹) کا حاشیہ۔

③ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زمین سے پیدا ہونے والی ہر کھیتی، پھل، سبزی اور درخت کا ذکر فرما کر حکم دیا ہے کہ کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو، اس لیے زمین سے پیدا ہونے والے ہر پھل اور کھیتی میں سے اللہ کا حق ادا کرنا ضروری ہے، خواہ وہ ”مَعْرُوْشٰتٍ“ ہوں، یعنی جن کی بیلیں چھتوں پر چڑھائی جاتی ہیں، مثلاً انگور، توری وغیرہ، یا ایسے باغات ہوں جن کی بیلیں زمین پر پھیلتی ہیں، مثلاً خربوزہ، تربوز، گرما وغیرہ، یا ایسے پھل دار درخت ہوں جو اپنے تنے پر قائم ہوں، مثلاً کھجور، زیتون اور انار وغیرہ، یا کوئی بھی کھیتی ہو، زمین سے پیدا ہونے والے ہر پھل اور کھیتی میں سے اللہ تعالیٰ کا حق نکالنا فرض ہے اور مال میں اللہ

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

اور چوپاؤں میں سے کچھ بوجھ اٹھانے والے اور کچھ زمین سے لگے ہوئے (پیدا کیے)۔ کھاؤ اس میں سے جو اللہ نے تمھیں رزق دیا اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿۱۴۲﴾

کا سب سے بڑا حق زکوٰۃ وعشر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق بارش، چشموں اور نہروں سے سیراب ہونے والی ہر فصل میں عشر، یعنی دس من میں سے ایک من اور پانی کھینچ کر سیراب کی جانے والی ہر فصل میں نصف العشر، یعنی بیس من میں سے ایک من ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے کسی فصل کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ مفصل احکام کتب احادیث میں ملاحظہ فرمائیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ سبزیوں میں اور ان پھلوں میں عشر نہیں ہے جن کا ذخیرہ نہ ہو سکتا ہو، مثلاً مالٹا، انار وغیرہ، دلیل کے طور پر ترمذی کی حدیث بیان کرتے ہیں کہ سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے، مگر خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور نہ اس مطلب کی کوئی اور حدیث نبی ﷺ سے ثابت ہے۔ اس آیت میں ہر کھیتی، زیتون اور انار کا ذکر ہے، حالانکہ انار کا ذخیرہ نہیں ہوتا۔ دورِ رسالت کے عمل کو دیکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت ایسی چیزوں کے عشر لینے کا اہتمام کرے جن کا ذخیرہ کر سکے، باقی باغوں اور کھیتوں والے اللہ کا حق خود مستحقین میں تقسیم کر دیں۔ فتاویٰ علمائے حدیث کی ساتویں جلد میں متعدد جلیل القدر علماء کے مقالات میں ہر پھل اور کھیتی میں سے عشر کی بات نہایت مفصل اور مدلل بیان کی گئی ہے۔

④ ”وَلَا تُسْرِفُوْا“ سے مراد ناجائز جگہ خرچ کرنا بھی ہے اور اعتدال سے بڑھ کر خرچ کرنا بھی، اسی طرح کھانے میں زیادتی بھی منع ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ [الأعراف : ۳۱] ”اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ گزرو۔“ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق یہ آخری معنی یہاں زیادہ موزوں ہے، اس لیے بھی کہ یہ جسم اور عقل دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اتنا صدقہ کرنا بھی اسراف ہے کہ اس کے بعد آدمی خود محتاج ہو کر مانگنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ حکم حکمرانوں کے لیے بھی ہے کہ جتنا کسی کے ذمے بنتا ہے اس سے زیادہ وصول نہ کریں۔

آیت 142 وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ...... : ”حَمُوْلَةً“ جن پر بوجھ لادا جاتا ہے، مثلاً اونٹ اور بیل اور ”فَرْشًا“ سے مراد زمین سے لگے ہوئے، جیسے بھیڑ اور بکری۔ (موضح) جیسا کہ اگلی آیات میں ان کی تصریح ہے۔ بیل کی پشت پر اگرچہ بوجھ نہیں لادا جاتا مگر وہ بہت بھاری بوجھ کھینچ کر لے جاتے ہیں، اسے بھی بوجھ لادنا کہہ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کھیت اور چوپائے جو تمھیں عطا کیے ہیں تمھارے لیے حلال ہیں، انھیں کھاؤ اور شیطان کی پیروی مت کرو، جس کے بہکانے پر جاہل مشرکوں نے ان میں سے کئی قسموں کو حرام کر رکھا ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ
اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ﴿۱۴۳﴾ وَ مِنَ الْاِبِلِ
اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ
اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى
اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

آٹھ قسمیں، بھیڑ میں سے دو اور بکری میں سے دو۔ کہہ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے یا دونوں مادہ؟ یا وہ (بچہ) جس پر دونوں ماداؤں کے رحم لپٹے ہوئے ہیں؟ مجھے کسی علم کے ساتھ بتاؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۱۴۳﴾ اور اونٹوں میں سے دو اور گائیوں میں سے دو، کہہ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ؟ یا وہ (بچہ) جس پر دونوں ماداؤں کے رحم لپٹے ہوئے ہیں؟ یا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ نے تمھیں اس کی وصیت کی تھی؟ پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، تاکہ لوگوں کو کسی علم کے بغیر گمراہ کرے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۴۴﴾

آیت 144،143 ① ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: یہ آیت (۱۴۱) میں "اَنْشَاَ" کا مفعول بہ ہے۔ "اَزْوَاجٍ" "زَوْجٌ" کی جمع ہے۔ عربی میں جوڑے کے دو افراد میں سے ہر ایک کو زوج کہتے ہیں، نر ہو یا مادہ۔ اس لیے زوجین کا معنی (نر اور مادہ دو قسمیں) ایک جوڑا ہو گا نہ کہ دو جوڑے۔ اسی کے مطابق ترجمہ آٹھ قسمیں کیا گیا ہے۔

② قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ ...... : جب مشرکین نے اونٹوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں میں سے بعض مخصوص جانوروں کو حرام اور ان کے پیٹ کے بچوں میں سے زندہ بچوں کو عورتوں کے لیے حرام اور مردہ کو سب کے لیے حلال قرار دیا تو اللہ تعالیٰ اب ان سے اس کی دلیل کا مطالبہ فرما رہے ہیں کہ اگر وہ دلیل عقلی ہے تو بتاؤ کہ حرام ہونے کی وجہ ان دونوں کا نر ہونا ہے، اگر یہ وجہ ہے تو پھر ان میں سے کئی نر تم کیوں کھاتے ہو؟ یا مادہ ہونا ہے تو پھر تم ان میں سے کئی مادہ جانور حلال کیوں سمجھتے ہو؟ یا پیٹ کا بچہ ہونا ہے تو تم کئی پیٹ کے بچے خود کیوں کھاتے ہو اور اگر دلیل نقلی ہے تو اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم لاؤ جس میں اس نے ان جانوروں کے کسی نر یا مادہ یا رحم میں موجود بچے کو تمھارے کہنے کے مطابق حلال یا حرام کہا ہو، یا تم خود اس وقت موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے حلال یا حرام کرنے کا یہ حکم جاری فرمایا؟ پھر بتاؤ اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے نہ خود سنا، نہ کسی رسول کے واسطے سے سنا بلکہ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ رہا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نے عمرو بن لحی کو جہنم میں اپنی انتڑیاں کھینچتے ہوئے دیکھا، سب سے پہلے بتوں کے نام پر جانور (بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی) اسی نے چھوڑے تھے۔''
[بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ما جعل الله من بحيرة ولا سائبة...... ﴾ : ٤٦٢٣]

مقصود مشرکین کے خود ساختہ حرام کیے ہوئے جانوروں کی حرمت کی تردید ہے کہ بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کو انھوں

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کہہ دے میں اس وحی میں، جو میری طرف کی گئی ہے، کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اس کے کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو کہ بے شک وہ گندگی ہے، یا نافرمانی (کا باعث) ہو، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، پھر جو مجبور کر دیا جائے، اس حال میں کہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو بے شک تیرا رب بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴۵﴾

نے اپنی طرف سے حرام کر رکھا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ نے یہ جانور حلال کیے ہیں۔

③ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ: ہرن بکری کی جنس میں داخل ہے اور بھینس، نیل گائے اور گورخر (جنگلی گدھا) یہ گائے اور بیل کی جنس ہیں۔ یہ جانور عرب میں اتنے نہیں ہوتے۔ چوپاؤں کی مشہور چار قسمیں وہی ہیں جو یہاں مذکور ہیں۔

آیت 145 ① قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ ...... : مردہ سے مراد ہر وہ حلال جانور ہے جو بغیر ذبح کیے طبعی طور پر یا حادثے سے (جس کی تفصیل مائدہ کی آیت ۳ میں ہے) مر جائے یا شرعی طریقے کے خلاف ذبح کیا گیا ہو، مثلاً جان بوجھ کر تیز دھار آلے کی ایک ہی ضرب سے گردن جدا کر دی جائے، یا سخت گرم پانی میں ڈبو کر مار دیا جائے، یا کرنٹ وغیرہ کے ذریعے سے، غرض شرعی ذبیحہ یا شکار کے علاوہ سب مردار ہیں اور حرام ہیں۔ خون جو بہایا جائے، زندہ کا یا ذبیحہ کا، حرام ہے، البتہ جسم کے ساتھ لگا رہ جانے والا خون یا کلیجی اور تلی، بہایا ہوا خون نہ ہونے کی وجہ سے حلال ہیں۔ خنزیر کا گوشت کہ وہ گندگی ہے، یعنی صحت کے لحاظ سے بے شمار بیماریوں کا باعث ہونے اور بے غیرتی میں بدترین جانور ہونے کی وجہ سے کھانے والوں میں اس کی تاثیر کی بنا پر معنوی طور پر سراسر گندگی ہے۔ "اَوْ فِسْقًا" اس کا عطف "لَحْمَ خِنْزِیْرٍ" پر ہے، یعنی یہ بھی اسی طرح حرام ہے۔ "فِسْقًا" کا معنی اللہ کی فرماں برداری سے نکل جانا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، اس لیے وہ جانور جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے، حرام ہے۔ "اُهِلَّ" کا معنی آواز بلند کرنا ہے، کسی جانور پر اگر کسی غیر اللہ کا نام مشہور کر دیا جائے کہ یہ داتا کا بکرا ہے، یا بری امام کی گائے ہے، یا فلاں پیر یا امام کی نذر و نیاز ہے، اس سے مقصود چونکہ غیر اللہ کو راضی کرنا ہے کہ وہ راضی ہو کر ہمارے کام سنوار دیں گے، اس لیے ایسے جانور کو ان کی رضا کے لیے ذبح کرتے وقت اس پر "بِسْمِ اللّٰهِ" پڑھی جائے تو بھی حرام ہے، کیونکہ اعتبار نیت کا ہے اور نیت کا اظہار خود ان کی زبانی ہو چکا ہے اور عرس اور قبر کا ماحول بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور ان لوگوں پر جو یہودی بن گئے، ہم نے ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا اور گائیوں اور بھیڑ بکریوں میں سے ہم نے ان پر دونوں کی چربیاں حرام کر دیں، سوائے اس کے جو ان کی پشتیں یا انتڑیاں اٹھائے ہوئے ہوں، یا جو کسی ہڈی کے ساتھ ملی ہو۔ یہ ہم نے انھیں ان کی سرکشی کی جزا دی اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں ﴿۱۴۶﴾

② فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ...... : یعنی جو شخص مجبوری کی بنا پر ان حرام چیزوں کو کھا لے بشرطیکہ نہ انھیں حلال سمجھے اور نہ ضرورت سے آگے بڑھے تو تیرا رب نہایت بخشنے والا بے حد رحم والا ہے۔ سورۂ بقرہ میں صراحت ہے: ﴿ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ ”اس پر کوئی گناہ نہیں۔“ [البقرة : ۱۷۳]

③ اس آیت پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ حرام چیزیں تو ان کے علاوہ بھی ہیں، پھر یہ فرمانے کا کیا مطلب کہ میں اپنی طرف کی ہوئی وحی میں ان کے علاوہ کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا؟ اس کا جواب سورۂ بقرہ کی آیت (۱۷۳) کی تفسیر میں گزر چکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دراصل اس زمانے کے مشرکین کے لحاظ سے بات ہو رہی ہے کہ انھوں نے بحیرہ، سائبہ وغیرہ کو حرام کر رکھا تھا اور مذکورہ بالا چاروں چیزیں وہ حلال سمجھتے اور کھاتے تھے، اس لیے فرمایا کہ میری وحی میں تو تمھاری حرام کردہ چیزیں حرام نہیں، صرف یہ چار چیزیں، جو تم بے دریغ کھاتے ہو، حرام ہیں۔ دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ان آیات کے اترنے تک یہی چیزیں حرام تھیں، بعد میں رسول اللہ ﷺ نے مزید کئی چیزیں حرام فرمائیں، جیسے قرآن مجید میں وہ رشتے مذکور ہیں جن سے نکاح حرام ہے، باقی سب کو حلال فرمایا، مگر رسول اللہ ﷺ نے حدیث میں ان دو عورتوں کو جو آپس میں خالہ اور بھانجی یا پھوپھی اور بھتیجی ہوں، ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح نبی ﷺ سے صحیح احادیث میں مزید کئی جانوروں کو حرام قرار دینا ثابت ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۳) کے حواشی۔

آیت 146 ① وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ...... : ہر ناخن والے جانور سے مراد وہ جانور یا پرندہ ہے جس کی انگلیاں پھٹی ہوئی، یعنی الگ الگ نہ ہوں، مثلاً اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ۔ یعنی صرف وہ پرندے یا جانور حلال تھے جن کے پنجے کھلے ہوں۔

② اَوِ الْحَوَايَاۤ : یہ ”حَوِيَّةٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”عَطِيَّةٌ“ کی جمع ”عَطَايَا“ اور ”خَطِيَّةٌ“ کی جمع ”خَطَايَا“ ہے، یا یہ ”حَاوِيَةٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”ضَارِبَةٌ“ کی جمع ”ضَوَارِبُ“ مطلب وہ انتڑیاں جن میں مینگنیاں ہوتی ہیں۔

③ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ: یعنی یہ چیزیں جس طرح اب شریعت محمدی ﷺ میں حرام نہیں ہیں، اس سے

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿۱۴۷﴾
سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ
كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ
لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿۱۴۸﴾

پھر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے تمھارا رب وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا ﴿۱۴۷﴾
عنقریب وہ لوگ کہیں گے جنھوں نے شریک بنائے ہیں، اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شریک بناتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان لوگوں نے جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ کہہ کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے کہ تم اسے ہمارے لیے نکالو، تم تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے اور تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہو ﴿۱۴۸﴾

پہلے بھی حرام نہ تھیں، البتہ یہودیوں کو ان کی سرکشی کی سزا دینے کے لیے ہم نے انھیں وقتی طور پر حرام کر دیا تھا۔ (دیکھیے نساء: ۱۶۰) مقصد یہودیوں کے اس دعوے کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کوئی چیز حرام نہیں کی، سوائے ان چیزوں کے جو اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے خود اپنے آپ پر حرام کر لی تھیں۔ (قرطبی، ابن کثیر) اور "اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ" (بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ دعویٰ غلط ہے اور صحیح بات وہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے، نیز دیکھیے سورۂ آل عمران (۹۳)۔
مگر یہودیوں نے حیلے سے چربی کی ایک صورت حلال کر ہی لی۔ جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ کے سال مکہ میں سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ یہود کو برباد کرے، جب ان کے لیے چربیوں کو حرام کیا گیا تو انھوں نے انھیں پگھلایا اور پھر ان کی قیمت کھا گئے۔" [بخاري، البيوع، باب بيع الميتة والأصنام : ۲۲۳۶] یہ ایسے ہی ہے جیسے آج کل کئی مسلمان شراب خود نہیں پیتے اور خنزیر کا گوشت وغیرہ خود نہیں کھاتے، مگر کفار کے ہاتھوں بیچ کر قیمت کھا جاتے ہیں۔

آیت 147 فَإِنْ كَذَّبُوكَ ...... : یعنی اگر تم اب بھی نافرمانی کی روش چھوڑ کر حق کی سیدھی راہ اختیار کر لو تو اپنے رب کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے کھلا پاؤ گے، لیکن اگر اپنی موجودہ روش پر اڑے رہے تو یہ مت سمجھو کہ اللہ کا عذاب تم پر سے ٹل گیا ہے، جب اس کا عذاب آتا ہے تو مجرموں اور سرکشوں کو کوئی چیز اس سے بچا نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ آیت کے پہلے حصے "ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ" میں ترغیب (شوق دلانا) ہے اور آخری حصہ "وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ" میں ترہیب (ڈرانا) ہے اور یہ قرآن کا خاص اندازِ نصیحت ہے۔ (ابن کثیر)

آیت 148 ① سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ...... : یعنی جب وہ اپنے شرک اور مجرمانہ روش پر قائم رہنے کی دلیل نہیں پاتے تو تقدیر کا سہارا لے کر کہتے ہیں کہ ہمارے حق میں خود اللہ کی مرضی اور ارادہ یہ ہے کہ ہم شرک کریں اور جو چیزیں ہم نے

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

کہہ دے پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا ﴿۱۴۹﴾

حرام ٹھہرائی ہیں انھیں حرام ٹھہرائیں، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوتی تو ہم سے یہ کام ہو ہی نہیں سکتے تھے، یہ دلیل ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ خوش ہے، لہٰذا یہ صحیح اور حق ہے۔ مطلب یہ کہ انھوں نے اللہ کی مشیت اور ارادے کو شرک کے اور بعض حلال چیزوں کو حرام ٹھہرا لینے کے صحیح اور حق ہونے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا، گویا ان کے کہنے کے مطابق اللہ تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کاموں پر خوش ہے اور انھیں پسند کرتا ہے اور وہ درست ہیں، حالانکہ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ﴾ [الزمر : ۷] ”اگر تم ناشکری کرو تو یقیناً اللہ تم سے بہت بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ اسے تمھارے لیے پسند کرے گا۔“ یعنی کفر اور ناشکری اللہ کے ارادے کے بغیر نہیں ہو سکتی مگر وہ نہ اس پر راضی ہے نہ اسے پسند کرتا ہے۔ مشیت و ارادہ اور رضا و محبت ایک دوسرے کو لازم نہیں، دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے تحت ہو رہا ہے لیکن وہ ہر چیز پر راضی نہیں ہے، رضا اس کی شریعت کی پابندی کا نام ہے اور ارادہ و مشیت اس کی تکوین ہے یعنی اس کا کائنات کو چلانے کا نظام ہے۔ تکوینی طور پر وہ کیا چاہتا ہے اسے کوئی نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہے، تشریعی طور پر وہ کس چیز کو پسند کرتا ہے یہ بتانے کے لیے اس نے پیغمبر بھیجے اور ہر شخص اسے جان سکتا ہے، اس لیے ہم شریعت پر عمل کے پابند ہیں۔

② كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ : یعنی درحقیقت یہ بات کہنا اور اللہ کی تقدیر اور مشیت کو اس کے خوش ہونے کی دلیل قرار دینا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی تکذیب (جھٹلانا) ہے۔ ان سے پہلے لوگ بھی اسی بہانے کو بنیاد بنا کر رسولوں کو جھٹلاتے آئے ہیں۔

③ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا : یعنی ان کا یہ عذر قطعی غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگر یہ صحیح ہوتا تو ان سے پہلے لوگوں پر ان کے جرائم اور تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنا عذاب کیوں نازل کرتا؟ (ابن کثیر)

④ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ ...... : یعنی تم جو یہ عذر پیش کر رہے ہو وہ کسی عقلی یا علمی بنیاد پر قائم نہیں ہے، اگر تمھارے پاس علم کی کوئی بات ہے تو لاؤ اور پیش کرو۔ کبھی دنیا کی کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے بھی تم نے تقدیر کو بہانہ بنا کر جدوجہد کو ترک کیا ہے، یا اللہ تعالیٰ نے تمھیں پہلے بتا دیا ہے کہ میں نے آئندہ اس طرح کرنا ہے۔ جب تمھیں معلوم ہی نہیں کہ تقدیر میں کیا ہے تو یہ بہانہ یا شبہ محض تمھارا وہم و گمان ہے اور تم لوگ صرف اٹکل لگا کر اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھ رہے ہو، جب کہ حقیقت کی دنیا میں وہم و گمان کی کچھ حیثیت نہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۲۳ اور ۲۸)۔

آیت 149 ① قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ...... : آپ ان سے کہہ دیں کہ پھر کامل دلیل تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے جو واقع کے عین مطابق ہے کہ اس کی مشیت، ارادہ اور اختیار الگ چیز ہے اور کسی کام پر راضی اور خوش ہونا الگ چیز ہے اور اس میں

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ
مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ
يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا

کہہ لاؤ اپنے وہ گواہ جو شہادت دیں کہ واقعی اللہ نے یہ چیزیں حرام کی ہیں، پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تو ان کے ساتھ شہادت مت دے اور ان لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے مت چل جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں ﴿۱۵۰﴾ کہہ دے آؤ میں پڑھوں جو تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، (اس نے تاکیدی حکم دیا ہے) کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ خوب احسان

اس کی حکمت ہے کہ اس نے تمھیں ہدایت اور گمراہی کا اختیار دے کر آزمایا ہے، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا، پھر کوئی گمراہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر یہ جبر ہوتا، جو اس کی حکمت کا تقاضا نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ ہود (۱۱۸، ۱۱۹) اور یونس (۹۹)۔

آیت 150 ① **فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ:** کیونکہ جو بھی یہ گواہی دے گا وہ کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔

② **وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ:** یعنی وہ مخلوق کو رب کے برابر ٹھہرا کر شرک جیسے ظلم عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں، خواہ کسی طرح برابر ٹھہرائیں، حالانکہ رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کی برابری ہو ہی نہیں سکتی، نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ علم میں، نہ حقوق و اختیار میں اور نہ کسی اور چیز میں، تو پھر ایسے جاہلوں کی خواہشات کی پیروی آپ کیوں اختیار کریں؟ دیکھیے سورۂ رعد (۱۶) اور سورۂ شعراء (۹۱ تا ۹۸)۔

آیت 151 ① **قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ:** اب اللہ تعالیٰ تفصیل سے بیان فرماتے ہیں کہ حرام وہ نہیں جو تم نے اپنی مرضی سے حرام بنا لیا، بلکہ وہ ہے جو تمھیں پیدا کرنے والے اور ہر لمحے پالنے والے نے تم پر حرام کیا ہے، آؤ! میں خود وہ تم سے بیان کرتا ہوں۔ یہ دس احکام ہیں جو اسلام کا خلاصہ ہیں۔

② **اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا:** یہاں بیان تو وہ چیزیں کرنی تھیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمائی ہیں، مگر بیان وہ چیزیں کی ہیں جن کا نہایت تاکید کے ساتھ حکم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کرنے سے تمھارے لیے جو حکم تاکید کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔ گویا یہ مفہوم "حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ" کے ضمن ہی میں شامل ہے کہ یہاں "وَصَّاكُمْ بِهٖ" محذوف ہے، یعنی اس نے تمھیں تاکیداً حکم دیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اس کی دلیل یہاں مذکور تینوں آیات کے آخری الفاظ ہیں: ﴿ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ﴾ یعنی یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے۔ اگر مراد ہوتا کہ یہ چیزیں حرام کی ہیں تو آخر میں یہ الفاظ ہونے چاہییں تھے: " ذٰلِكُمْ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ " یعنی یہ ہیں وہ چیزیں جو اس نے تم پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا تاکیدی حکم یہ دیا کہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، نہ کسی انسان کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی پہاڑ، پتھر، دریا یا درخت کو۔ غرض کوئی چیز کتنی بھی عظیم الشان ہو اسے اللہ کا کسی بھی چیز میں شریک مت بناؤ، کیونکہ سب اللہ

تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی اور بے حیائیوں کے قریب نہ جاؤ، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۱۵۱﴾

کے پیدا کردہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کا شریک بناؤ، حالانکہ اس نے تمھیں پیدا کیا۔'' [بخاری، التفسیر، باب قوله تعالىٰ ﴿ فلا تجعلوا للّٰه اندادًا...... ﴾ : ٤٤٧٧]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے جسے چاہے گا۔'' [النساء : ١١٦] اور اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کا قول ذکر فرمایا کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔ [المائدۃ : ٧٢]

③ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا : "اِحْسَانًا" فعل محذوف "اَحْسِنُوْا" کا مفعول مطلق ہے جس سے مقصود تاکید ہے، اس لیے ترجمہ ''خوب احسان کرو'' کیا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور شرک سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی بھی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ والدین کو اللہ تعالیٰ نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر ولادت کا اور دلی محبت کے ساتھ پالنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد بندوں کے حقوق میں سے سب سے مقدم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۲۳) اور سورۂ لقمان (۱۴، ۱۵)۔

④ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ...... : پیدا ہو چکنے کے بعد یا جب وہ ماؤں کے پیٹ میں ہوں، مثلاً کوئی دوا کھلا کر قبل از وقت حمل گرا دینا۔ سورۂ بنی اسرائیل (۳۱) میں بھی یہی حکم دیا گیا ہے، مگر یہاں اور وہاں دو فرق ہیں، یہاں "مِّنْ اِمْلَاقٍ" (مفلسی کی وجہ سے) ہے اور وہاں "خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" (مفلسی کے ڈر سے) ہے۔ اسی طرح یہاں "نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ" (ہم ہی تمھیں رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی) ہے اور وہاں "نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ" (ہم ہی انھیں رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی) ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر ان لوگوں کی بات ہے جو مفلسی میں گرفتار ہیں۔ فرمایا کہ اس مفلسی میں انھیں قتل مت کرو، ہم مفلسی کے باوجود تمھیں جو روزی دیتے ہیں انھیں بھی دیں گے، جبکہ بنی اسرائیل میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو مفلسی میں مبتلا تو نہیں مگر بچوں کے پیدا ہونے پر مفلسی سے ڈر رہے ہیں، فرمایا کہ ڈرو نہیں ہم انھیں بھی روزی دیں گے، تمھیں بھی تو دے رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تمھارا یہ سمجھنا کہ روزی کے مالک تم خود ہو، بالکل غلط ہے، یہ ہمارا کام اور ہمارا ذمہ ہے۔ (دیکھیے ہود: ٦) کفار کا تو کہنا ہی کیا ہے، اس وقت مسلم حکومتیں اسی بہانے سے ضبطِ ولادت یا خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر منظم طریقے سے قتل اولاد کا جرم کر رہی ہیں کہ ہمارے پاس وسائل کم ہیں، ہم زیادہ آبادی کی خوراک کا بندوبست نہیں کر

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے اور ماپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ ہم کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتے مگر اس کی طاقت کے مطابق اور جب بات کرو تو انصاف کرو خواہ رشتہ دار ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۱۵۲﴾

سکتے، حالانکہ یہ کفر کا کلمہ ہے۔ خوراک کا بندوبست تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، بلکہ ان حکمرانوں کا تمام عیش ان مفلسوں کی محنت ہی کا نتیجہ ہے، جن کی خوراک کے وہ ذمہ دار بن رہے ہیں۔ ہر بچے کو اللہ تعالیٰ کھانے کے لیے ایک منہ اور کمانے کے لیے دو ہاتھ دے کر بھیجتا ہے اور جیسے جیسے آبادی بڑھتی ہے زمین کے خزانوں کے منہ کھلتے جا رہے ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجر (۱۹ تا ۲۲)۔

5 وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ...... : " اَلْفَاحِشَةُ "، " اَلْفَحْشَاءُ " اور " اَلْفُحْشُ " کا معنی ہے ہر وہ قول یا فعل جو قباحت میں بہت بڑھا ہوا ہو، مثلاً زنا، شدید بخل وغیرہ۔ (راغب) اس لیے اس کا ترجمہ بے حیائی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہر کام کو خواہ ظاہر ہو، جیسے سب کے سامنے زنا یا قوم لوط کی حرکتیں کرنا، یا پوشیدہ، مثلاً چھپ کر زنا اور چوری وغیرہ کرنا، انھیں حرام قرار دیا۔ اس مقام پر ایسے ہر کام کے قریب جانے کو بھی حرام قرار دیا، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل (۳۲) میں زنا کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا، کیونکہ قریب جانا ہی گناہ کے ارتکاب کا باعث بنتا ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی غیرت والا نہیں، اسی لیے اس نے بے حیائی کی ظاہر اور پوشیدہ تمام شکلوں کو حرام قرار دیا ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب قوله تعالٰی : ﴿ ولا تقربوا الفواحش ...... ﴾ : ٤٦٣٤]

6 وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ...... : عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان کا خون، جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، تین صورتوں کے سوا کسی بھی صورت میں حلال نہیں: ① جان کے بدلے جان۔ ② شادی شدہ زانی۔ ③ اور دین سے جدا ہو کر (مسلمانوں کی) جماعت کو ترک کر دینے والا۔'' [بخاری، الدیات، باب قول الله تعالٰی : ﴿ إن النفس بالنفس و العين بالعين ﴾ : ٦٨٧٨] یا ان تینوں کے علاوہ جس کے قتل کرنے کا واضح حکم قرآن یا حدیث میں موجود ہو، مثلاً محارب (ڈاکو، باغی) یا محرم سے نکاح کرنے والا، انھیں قتل کرنا ناحق نہیں بلکہ حق ہے۔

7 لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سمجھو، عقل کرو، کیونکہ یہ ایسے کام ہیں کہ ان کا ارتکاب عقل کی خست کی دلیل ہے اور ان کاموں کی قباحت عقل بھی محسوس کرتی ہے، نصیحت اس لیے ہے کہ تم عقل کے تقاضے کے مطابق چلو۔

آیت 152 ① وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ......: ''سب سے اچھے طریقے'' میں یتیم کے مال کی حفاظت کرنا، اسے

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

اور یہ کہ بے شک یہی میرا راستہ ہے سیدھا، پس اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ یہ ہے جس کا تاکیدی حکم اس نے تمھیں دیا ہے، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۱۵۳﴾

بڑھانے کے متعلق سوچنا، یتیموں کی بہتری کے سوا اسے خرچ کرنے سے بچنا وغیرہ سب شامل ہیں۔ ”حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ“ میں جوانی کے ساتھ سمجھ داری بھی شامل ہے کہ اس میں معاملات کو خود نپٹانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۶)۔

② وَاَوْفُوا الْكَيْلَ......: اس میں انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیتے وقت ماپ تول میں کمی نہ کرنا اور لیتے وقت زیادہ نہ لینا دونوں شامل ہیں۔ دیکھیے سورۂ مطففین (۱ تا ۳)، سورۂ رحمٰن (۹) اور سورۂ بنی اسرائیل (۳۵)۔

③ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: یعنی اگر پورا تولنے اور ماپنے کی کوشش کرے مگر بھول چوک کی وجہ سے غلطی کر بیٹھے تو اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ ”اِلَّا وُسْعَهَا“ کا یہی مطلب ہے۔

④ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا......: جب بات کرو، خواہ فیصلہ کر رہے ہو یا حکم دے رہے ہو یا شہادت دے رہے ہو، تو ہر حال میں عدل و انصاف سے کام لو، کوئی رشتہ داری یا قرابت یا دوستی انصاف میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۳۵) اور سورۂ مائدہ (۸)۔

⑤ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا: یعنی تم نے اسلام قبول کر کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا جو عہد کیا ہے وہ پورا کرو۔ اس سے مراد قرآن و سنت کے تمام احکام پر عمل کرنا ہے۔ لوگوں سے کیے ہوئے عہد پورا کرنے کا بھی اللہ نے حکم دیا ہے۔

⑥ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ: اس آیت میں مذکور چیزیں ایسی ہیں جو معاشرے میں معروف ہیں، ان کی تاکید اس لیے کی ہے کہ تمھیں یاد آ جائے اور تمھیں نصیحت ہو جائے۔ ” ذِكْرٌ “ کا معنی ”یاد“ اور ”نصیحت“ دونوں ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَإِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ)) [بخاری، الصلوة، باب التوجه نحو القبلة حيث كان : ٤٠١] ”جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کروا دو۔“

آیت 153 ① وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا......: یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ ایک ہی ہے اور وہی سیدھی اور جنت تک پہنچانے والی ہے، مگر شیطان نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اس کے اردگرد بہت سی راہیں بنا ڈالی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ہمارے لیے ایک لکیر کھینچی، پھر فرمایا: ”یہ اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہے۔“ پھر اس کے دائیں بائیں کئی لکیریں کھینچیں اور فرمایا: ”یہ الگ الگ راستے ہیں، ان میں سے ہر راہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔“ اس کے بعد آپ نے سیدھی راہ پر ہاتھ رکھا اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [أحمد : ۱/۴۶۵، ح : ٤٤٣٦۔ مستدرك حاكم : ۲/۳۱۸، ح : ۳۲٤۱]

تمام دینوں میں سے صراط مستقیم صرف اسلام ہے، باقی سب باطل ہیں، اس آیت میں جس طرح تمام باطل دینوں سے منع

ثُمَّ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ وَ تَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃً لَّعَلَّہُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّہِمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ وَ ہٰذَا کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰہُ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوۡہُ وَ اتَّقُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ الۡکِتٰبُ عَلٰی طَآئِفَتَیۡنِ مِنۡ قَبۡلِنَا ۪ وَ اِنۡ کُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِہِمۡ لَغٰفِلِیۡنَ ﴿۱۵۶﴾

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اس شخص پر (نعمت) پوری کرنے کے لیے جس نے نیکی کی اور ہر چیز کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت کے لیے، تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں ﴿۱۵۴﴾ اور یہ عظیم کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، بڑی برکت والی، پس اس کی پیروی کرو اور بچ جاؤ، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۵۵﴾ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ کتاب تو صرف ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور بے شک ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے یقیناً بے خبر تھے ﴿۱۵۶﴾

فرمایا گیا ہے اسی طرح اسلام میں بھی فرقے بنانے سے روک دیا گیا ہے۔ اسلام میں سیدھی راہ صرف کتاب و سنت کی راہ ہے، جس پر وہ پہلے تین زمانے گزرے ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے ''خیر الناس'' قرار دیا ہے۔ [بخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب فضائل أصحاب النبی ﷺ ...... : ۳٦٥١] اس کے سوا سب راستے ممنوع ٹھہرے، خواہ وہ مذاہب اربعہ کی تقلید ہو یا اہل بدعت کے بنائے ہوئے اور طریقے ہوں، کیونکہ یہ شروع ہی بعد میں ہوئے ہیں۔ پرانی اور نئی ہر قسم کی بدعات گمراہ کن ہیں، خود ائمۂ دین اور سارے مجتہدینِ سلف و خلف نے یہی وصیت کی ہے کہ کوئی ان کی تقلید نہ کرے، بلکہ سب کے سب کتاب و سنت کا اتباع کریں، یہی صراط مستقیم ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے دعوت دی ہے۔

❷ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ: تاکہ تم اللہ کی نافرمانی، اس کے عذاب اور جہنم سے بچ جاؤ، کیونکہ مختلف راستوں سے بچ کر اس کے سیدھے راستے پر چلنے کے سوا بچنے کی کوئی صورت نہیں، اس لیے تقویٰ کی راہ یہی ہے۔

آیت 154 ❶ ثُمَّ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ: ''پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی'' میں ''پھر'' کا لفظ زمانے کی ترتیب کے لیے نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بعد میں ملی، بلکہ بعد میں ذکر کی وجہ سے ہے، اسے ترتیب ذکری کہتے ہیں، مثلاً دیکھیے سورۂ بلد کی آیت (۱۷)۔ متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید اور تورات کا ذکر اکٹھا کیا ہے۔ (ابن کثیر)

❷ تَمَامًا عَلَی الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ...... : ''تَمَامًا'' یہاں '' اِتۡمَامًا '' (پورا کرنے) کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے تورات ہر اس شخص پر نعمت پوری کرنے کے لیے جو نیکی کرے اور ہر چیز کی تفصیل، رہنمائی اور رحمت کے لیے نازل فرمائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یعنی بنی اسرائیل اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔

آیت 155 وَ ہٰذَا کِتٰبٌ ...... : اس سے مراد قرآن مجید ہے۔

آیت 156 اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ...... : تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہماری طرف تو کوئی کتاب آئی ہی نہیں، کتاب تو صرف

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ

یا یہ کہو کہ اگر واقعی ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت والے ہوتے۔ پس بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت آ چکی، پھر اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے کنارا کرے۔ عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیات سے کنارا کرتے ہیں، برے عذاب کی جزا دیں گے، اس کے بدلے جو وہ کنارا کرتے تھے ﴿۱۵۷﴾ وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے

ہم سے پہلے دو گروہوں یہود و نصاریٰ پر اتری اور وہ صرف ان کے لیے تھی اور انھوں نے ہمیں دعوت بھی نہیں دی کہ ہم ان سے پڑھ کر ایمان لے آتے، بلکہ وہ اسے بنی اسرائیل ہی کے لیے قرار دیتے رہے، ہم بھی اسے ان کے ساتھ مخصوص سمجھ کر اور کچھ اپنی غفلت کی وجہ سے اسے پڑھنے سے بے خبر رہے، ورنہ زبان نہ جاننا تو کوئی معقول عذر نہیں کیونکہ جب معلوم ہو جائے کہ اللہ کا حکم آیا ہے تو آدمی کسی سے سمجھ بھی سکتا ہے۔

آیت 157 ① اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ ......: یعنی یہ عذر بھی نہ کر سکو۔ "بَيِّنَةٌ" (روشن دلیل) سے مراد قرآن مجید ہے، جو صرف ہدایت اور رحمت ہی نہیں بلکہ اپنے سچے ہونے کی واضح اور روشن دلیل بھی ہے اور جو صرف عربوں ہی کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے تمام لوگوں اور تمام اقوام کے لیے ہے اور وہ کسی سے عربی پڑھ کر اللہ کے احکام معلوم کر سکتے ہیں، جیسا کہ اللہ کے فضل سے تمام اقوام میں اسلام پھیل چکا ہے۔

② صَدَفَ عَنْهَا: اس کے معنی کنارہ کرنے کے بھی ہیں اور دوسروں کو روکنے کے بھی۔ کفار خود بھی ایمان نہیں لاتے تھے اور دوسروں کو بھی روکتے تھے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۲۶، ۲۷)۔

آیت 158 ① هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ: کفار پر اسلام کے حق ہونے کے دلائل تو پوری طرح واضح ہو چکے تھے، مگر وہ صرف لاجواب کرنے کے لیے ایسی چیزیں دکھانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے جن کا دنیا میں ہوتے ہوئے دکھایا جانا ممکن ہی نہیں، کیونکہ ان کے آنے کے بعد اپنے اختیار سے غیب پر ایمان کا موقع ہی باقی نہیں رہتا، نہ ان کے آنے کے بعد کسی کی مجال ہے کہ وہ ایمان نہ لائے، مگر اس وقت ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ ان مطالبات کا قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل (۹۰ تا ۹۳) میں اکٹھے نو مطالبات پیش کیے گئے ہیں، جن میں نہایت گستاخانہ مطالبہ خود اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لانے کا تھا: ﴿ اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل : ۹۲] "یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔" سورۂ فرقان میں بھی یہ مطالبہ ذکر فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ

الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا

آئیں، یا تیرا رب آئے، یا تیرے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی کسی شخص کو

اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾ [الفرقان : ۲۱] ''ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے گئے، یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟'' اس مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان پر حجت تو پوری ہو چکی، یعنی: ﴿ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ﴾ [الأنعام : ۱۵۷] اب دلیل کی تو نہ انھیں ضرورت ہے نہ ان کا مطالبہ، اب اس کے سوا انھیں کیا انتظار ہے کہ ان کے پاس فرشتے آ جائیں، یا تیرا رب خود آئے، یا تیرے رب کی کوئی نشانی آ جائے۔ مگر فرشتے آئے تو موت یا عذاب لے کر آئیں گے، پھر ایمان کی مہلت کہاں؟ جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْۤا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ﴾ [الحجر : ۸] ''ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔'' اور اللہ تعالیٰ آئے گا تو قیامت کے دن فیصلے کے لیے فرشتوں کے ساتھ آئے گا: ﴿ كَلَّاۤ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۙ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ [الفجر: ۲۱، ۲۲] ''ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے۔'' پھر تو دنیا کا کام ہی تمام ہو جائے گا، فرمایا: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ﴾ [البقرۃ : ۲۱۰] ''وہ اس کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں آ جائے اور فرشتے بھی اور کام تمام کر دیا جائے۔'' اور تیرے رب کی بعض نشانیوں سے مراد خاص نشانیاں ہیں، جن کی تفصیل آ رہی ہے۔

② بعض لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے آنے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے آنے کا مطلب اس کے حکم کا یا عذاب کا آنا ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے زمین و آسمان کو پیدا فرما کر عرش پر بلند ہونے کے بھی منکر ہیں اور اس کے آسمان دنیا پر اترنے کے بھی، بلکہ عرش کو بھی نہیں مانتے۔ سورۂ حاقہ (۱۷) میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ کا عرش آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔ یہاں لاجواب ہو کر کہتے ہیں کہ یہ متشابہات سے ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا آنا پھر بھی نہیں مانتے۔ اللہ کے بندو! تم نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سے بھی عاجز سمجھ لیا کہ تم اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہو جاؤ، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اپنی مرضی سے آنا جانا ممکن ہی نہیں مانتے۔ یہ سب نتیجہ یونانی فلسفے اور ان کے خدا کے متعلق تصورات سے متاثر ہونے کا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، ہر رات آسمانِ دنیا پر اترتا ہے، قیامت کے دن زمین پر آئے گا اور زمین اس کے نور سے روشن ہو جائے گی، مگر اس کا آنا مخلوق کی طرح نہیں، بلکہ اس طرح ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔

③ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ: اس سے مراد صحیح احادیث کے مطابق قیامت کے قریب نمودار ہونے والی چند نشانیاں ہیں، جن میں سے سب سے پہلے ظاہر ہونے والی نشانی سورج کا مغرب کی طرف سے طلوع ہونا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ سورج اپنے مغرب سے طلوع ہوگا، جب اسے لوگ

اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔ کہہ دے انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) منتظر ہیں ﴿۱۵۸﴾

دیکھیں گے تو جو بھی زمین پر ہوں گے ایمان لے آئیں گے، تو یہ وہ وقت ہوگا جب کسی جان کو اس کا ایمان فائدہ نہیں دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لائی ہوگی۔‘‘ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ لا ینفع نفسا إیمانها ﴾ : ٤٦٣٥]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’تین نشانیاں جب نمودار ہوں گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ نہ دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، دجال کا آنا اور زمین سے جانور کا نکلنا۔‘‘ [مسلم، الإیمان، باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیه الإیمان : ١٥٨]

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’قیامت کی نشانیوں میں سے سب سے پہلے نکلنے والی نشانی مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ہے اور زمین سے ایک جانور کا دوپہر کے وقت لوگوں کے سامنے نکلنا ہے۔ دونوں میں سے جو بھی پہلے ہوئی دوسری قریب ہی اس کے پیچھے ہوگی۔‘‘ [مسلم، الفتن، باب فی خروج الدجال و مکثه فی الأرض...... : ٢٩٤١]

اس جانور کا ذکر سورۂ نمل (۸۲) میں بھی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مراد قیامت کی کوئی بھی بڑی نشانی ہے جس کے بعد اختیار ختم ہو جائے گا اور ایمان لانے اور توبہ کرنے کے بغیر چارہ ہی نہیں رہے گا، البتہ اکثر اہل ایمان کا رجحان مغرب سے سورج طلوع ہونے کی طرف ہے، جیسا کہ ہمارے استاد مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ نے صرف اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔

④ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ...... : طبری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ کسی کافر کو جو سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے ایمان نہ لایا ہو، اس کے طلوع ہونے کے بعد اس کا ایمان لانا اسے کوئی نفع نہیں دے گا اور کسی مومن کو بھی، جس نے طلوع سے پہلے نیک عمل نہ کیا ہوگا طلوع کے بعد وہ اسے نفع نہیں دے گا، کیونکہ اس وقت ایمان اور عمل کا حکم اس شخص کے ایمان و عمل جیسا ہے جو موت کے غرغرہ کے وقت ایمان لائے یا عمل کرے، جبکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ﴾ [المؤمن : ٨٥] ’’پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔‘‘ اور جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک اس کا غرغرہ (موت کے وقت گلا بولنا) شروع نہ ہو۔ (ترمذی : ۳۵۳۷) اور ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب کافر اس دن ایمان لائے گا تو اس سے قبول نہیں ہوگا لیکن جو اس سے پہلے مومن ہوگا تو اگر اپنے عمل میں درست ہوگا تو وہ بہت بڑی بھلائی پر ہوگا اور اگر درست نہیں ہوگا اور اس وقت توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور یہی مطلب ہوگا ﴿ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ﴾ کا، یعنی اس کا نیک عمل اس وقت قبول نہیں ہوگا جب وہ اس سے پہلے اسے کرنے والا نہ ہوگا۔

⑤ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: یہ ایمان لانے اور نافرمانی ترک کرنے میں دیر کرنے والوں کے لیے شدید دھمکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر لیا اور کئی گروہ بن گئے، تو کسی چیز میں بھی ان سے نہیں، ان کا معاملہ تو اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۵۹﴾

دیکھیے سورۂ محمد (۱۸) اور سورۂ مومن (۸۴، ۸۵)۔

آیت 159 اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ ......: یعنی اصل دین شروع سے ایک ہی ہے جس کی بنیاد اللہ کی توحید، یوم آخرت اور انبیاء پر ایمان اور ان کی اطاعت پر ہے۔ دیکھیے سورۂ مومنون (۵۲، ۵۳)، سورۂ یونس (۱۹)، سورۂ انعام (۱۵۳) اور سورۂ بقرہ (۲۱۳) اپنے اپنے زمانے کے مطابق احکام میں کچھ فرق ہو سکتا ہے مگر اصل سب کا ایک اسلام ہی ہے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد پر اللہ تعالیٰ نے قیامت تک ہر شخص کے لیے آپ پر ایمان لانا اور آپ کے طریقے پر چلنا لازم قرار دے دیا۔ اب جو شخص بھی اپنا کوئی جدا راستہ اختیار کر کے الگ گروہ بنائے، خواہ وہ دہریہ ہو یا مشرک یا یہودی یا نصرانی، اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو حکم دے رہے ہیں کہ آپ ان سے بری ہیں اور آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح آپ کی امت میں سے اسلام قبول کرنے کے بعد جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے احکام، یعنی قرآن و سنت کے علاوہ کوئی نیا طریقہ یعنی بدعت اختیار کر کے اپنا الگ گروہ بنا لیں، آپ ان سے بری ہیں، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہود ۷۱ یا ۷۲ فرقوں میں اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں جدا جدا ہو گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔'' [أبو داوٗد، السنة، باب شرح السنة : ۴۵۹۶۔ ترمذی : ۲۶۴۰۔ ابن ماجه : ۳۹۹۲۔ ابن حبان : ۶۷۳۱] معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''یاد رکھو، تم سے پہلے اہل کتاب ۷۲ ملتوں میں فرقہ فرقہ ہو گئے اور یہ ملت ۷۳ ملتوں میں فرقہ فرقہ ہو جائے گی، ۷۲ آگ میں ہوں گے اور ایک جنت میں اور وہ جماعت ہے۔'' [أبو داوٗد، السنة، باب شرح السنة : ۴۵۹۷۔ أحمد : ۱۰۲/۴، ح : ۱۶۹۴۰] عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے: ''وہ سب آگ میں ہوں گے مگر ایک ملت۔'' لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ)) ''جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔'' [ترمذی، الإیمان، باب ما جاء في افتراق هذه الأمة : ۲۶۴۱] اس حدیث کے مزید حوالوں اور صحت کے لیے دیکھیے ''السلسلة الصحیحة : ۴۰۲/۱ تا ۴۱۴، ۲۰۳: ۲۰۴۔''

یاد رہے کہ سوچ اور اجتہاد کا اختلاف یا علم نہ ہو سکنے کی وجہ سے اختلاف تو صحابہ اور تابعین میں بھی پایا جاتا تھا، مگر وہ سب ایک ہی جماعت تھے، انھوں نے کسی شخصیت کی تقلید کی خاطر فرقے نہیں بنائے تھے۔ مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنا اپنا الگ پیشوا بنا کر اس کی ہر صحیح اور غلط بات کو دین قرار دے کر الگ فرقہ بنا لیا۔ یہ چیز مسلمانوں کے تین بہترین زمانوں میں

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہوں گی اور جو برائی لے کر آئے گا سوا سے جزا نہیں دی جائے گی، مگر اسی کی مثل اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۶۰﴾

نہیں تھی، پہلے انبیاء کی امتوں کو اسی چیز نے برباد کیا اور امت محمدیہ ﷺ کے بگاڑ کا باعث بھی یہی بات بنی کہ قرآن وحدیث کا واضح حکم آنے کے بعد بھی کچھ لوگ اپنے دھڑے کی وجہ سے اپنے امام یا مرشد کی غلط باتوں پر اڑ کر الگ الگ ہو گئے اور مسلمانوں کا شخصیتوں کی بنیاد پر بنے ہوئے فرقوں کو چھوڑ کر کتاب و سنت پر جمع ہونا ایک خواب ہی رہ گیا جس کی تعبیر کسی زبردست خلیفہ یا مہدی یا مسیح علیہ السلام ہی کے ذریعے سے پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔

آیت 160 ① مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا...... : اللہ تعالیٰ ڈرانے کے ساتھ بشارت کا سلسلہ بھی جاری رکھتا ہے، اب اللہ تعالیٰ کا نیکی کرنے والوں پر اپنے فضل اور برائی کرنے والوں پر عدل کا بیان ہے۔ نیکی کرنے والوں کی نیکی میں دس گنا اضافہ کم از کم ہے، ورنہ وہ سات سو گنا سے لے کر بے حساب بھی بڑھایا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے والے کی مثال ایک دانے کو سات سو دانوں تک بڑھانے کے ساتھ اپنی مرضی کے ساتھ اس سے بھی بڑھانے کی بات فرمائی ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۱) خوشے کی مثال کا جہاد سے تعلق سمجھنے کے لیے سورۂ بقرہ (۲۷۳) اور سورۂ توبہ (۶۰) ملاحظہ فرمائیں۔ جہاد کے ساتھ دوسری نیکیوں میں سات سو سے بڑھ کر ثواب بھی قرآن میں مذکور ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر : ۱۰] ”صرف صبر کرنے والوں ہی کو ان کا اجر کسی شمار کے بغیر دیا جائے گا۔“

② وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: یعنی ایک بدی کا بدلہ ایک سے زیادہ کا نہیں دیا جائے گا۔

③ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے فرمایا: ”جو شخص نیکی کا ارادہ کرے، پھر اسے نہ کرے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اگر کرے تو دس سے لے کر سات سو گنا سے بہت گنا تک لکھی جاتی ہے اور جو شخص برائی کا ارادہ کرے، پھر اسے نہ کرے تو اس کے لیے ایک پوری نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر برائی کا ارادہ کیا اور اسے کر بھی لیا تو اللہ اس کے لیے ایک ہی برائی لکھتا ہے، یا اللہ عزوجل اسے بھی مٹا دیتا ہے اور اللہ کے ہاں ہلاک نہیں ہوتا مگر جو سرے ہی سے ہلاک ہونے والا ہو۔“ [مسلم، الإیمان، باب إذا هم العبد بحسنة ...... : ۱۳۱۔ بخاری : ۶٤۹۱] اس مقام پر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک نفیس بات لکھی ہے کہ برائی چھوڑنے والا جو اسے نہیں کرتا، تین طرح کا ہوتا ہے، کبھی تو وہ اسے اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑتا ہے، اس پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے کہ برائی سے اللہ کے لیے رک جانا ایک عمل اور نیت ہے، جیسا کہ بعض صحیح احادیث میں ہے کہ اس نے اسے میری خاطر چھوڑا ہے اور کبھی وہ غفلت یا بھول کی وجہ سے برائی نہیں کرتا، اسے نہ

قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۬ۚ دِیۡنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبۡرٰهِیۡمَ حَنِیۡفًا ۚ وَ
مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ
الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیۡکَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾

کہہ دے بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر دی ہے، جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت، جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا ﴿۱۶۱﴾ کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے ﴿۱۶۲﴾ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں ﴿۱۶۳﴾

گناہ ہے نہ ثواب، کیونکہ اس کی نیت نہ خیر کی ہے نہ شر کی اور کبھی اپنی پوری کوشش کے باوجود بس نہ چلنے کی وجہ سے کر نہیں سکتا، تو یہ اس شخص کی طرح ہے جس نے وہ برائی کی ہو، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں تو قاتل اور مقتول دونوں آگ میں ہوں گے۔'' لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! یہ تو قاتل ہے، مقتول کا کیا معاملہ ہے؟'' فرمایا: ''وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل کی حرص رکھتا تھا۔'' [بخاری، الإیمان، باب : ﴿ و إن طائفتان من المؤمنین اقتتلوا ...... ﴾ : ۳۱۔ مسلم : ۲۸۸۸]

آیت 161 ❶ قُلۡ اِنَّنِیۡ هَدٰىنِیۡ رَبِّیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ...... : پوری سورت میں توحید کو دلائل سے ثابت کرنے اور مشرکین کی تردید کے بعد آخر میں خلاصہ چند حقائق کی صورت میں بیان فرمایا۔ ''قِیَمًا'' یہ '' قِیَامٌ '' کے معنی میں مصدر ہے جسے مبالغے کے لیے دین کی صفت قرار دیا ہے، جیسے '' زَیْدٌ عَدْلٌ '' ہے، یعنی زید بہت عادل ہے، گویا سراسر عدل ہے، یعنی یہ دین نہایت قائم، مضبوط اور سیدھا ہے۔

❷ وَ مَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ : اس میں مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ کی تردید ہے جو اس زعم میں مبتلا تھے کہ وہ دین ابراہیم پر قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تمھارا دعویٰ غلط ہے، تمھاری اور ان کی کیا نسبت! تم مشرک اور ابراہیم علیہ السلام شرک سے بے زار اور ایک اللہ کی طرف ہو چکنے والے۔ ان کا دین تو سچا، سیدھا اور نہایت مضبوط دین اسلام تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص بندوں کے لیے پسند فرمایا اور جس کی ہدایت میرے رب نے مجھے عطا فرمائی۔

آیت 163،162 قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ ...... : '' اَلنُّسُكُ '' کا معنی عبادت ہے، یہ ذبح، قربانی اور حج کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ لِکُلِّ اُمَّةٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَکًا لِّیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ عَلٰی مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِیۡمَةِ الۡاَنۡعَامِ ﴾ [الحج : ۳٤] ''اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کی، تاکہ وہ ان پالتو چوپاؤں پر اللہ کا نام ذکر کریں جو اس نے انھیں دیے ہیں۔'' اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿ وَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا ﴾ [البقرة : ۱۲۸] ''اور ہمیں ہماری عبادت (یا حج)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔ اور کوئی جان کمائی نہیں کرتی مگر اپنے آپ پر اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی، پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹ کر جانا ہے، تو وہ تمھیں بتائے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۶۴﴾

کے طریقے دکھا۔'' ''اَلصَّلَاةُ'' قلبی، زبانی اور جسم کے تمام اعضاء کی عبادت کا مجموعہ ہے۔ ''مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ'' یہ مصدر بھی ہو سکتے ہیں اور ظرف زمان بھی، یعنی مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی قلبی، زبانی اور جسمانی عبادات، مثلاً قیام، رکوع اور سجود، یہ سب غیر اللہ کے لیے تھیں، اسی طرح ان کی قربانیاں اور زندگی اور موت کا وقت سب انھی کی نذر تھا، ہاں کبھی اللہ تعالیٰ کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ فرمایا، ان سے صاف کہہ دیجیے کہ میرا تو یہ سب کچھ ایک اللہ ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے یہی حکم ہے اور سب سے پہلے میں اپنے آپ کو ایک اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے والا اور اس کا فرماں بردار بنانے والا ہوں، میرا جینا اور مرنا بھی اس اکیلے کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے ساتھ شرک کو ختم کرنے کے لیے ہے، حتیٰ کہ اسی پر میری موت آ جائے۔

آیت 164 ❶ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا ...... : مکہ کے مشرک اللہ تعالیٰ کو رب مانتے تھے، مگر معبود کئی بنا رکھے تھے جن سے وہ نفع و نقصان کی امید رکھتے اور انھی کی پوجا کرتے اور پکارتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے رب ہونے کو اپنی الوہیت، یعنی معبود ہونے کی دلیل کے طور پر بار بار پیش کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۳۱)، سورۂ سبا (۲۲) اور سورۂ فاطر (۱۳) یہاں بھی مراد یہی ہے کہ عبادت تو صرف اسی کی ہو سکتی ہے جو رب ہو، اس لیے تمھارا غیر اللہ کو پکارنا، ان کی عبادت کرنا انھیں رب بنانا ہی ہے، اب اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کر کے اسے رب کیسے بناؤں، جب کہ ہر شے کا رب وہی ہے۔

❷ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ...... : کفار رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے کہتے کہ تم آبائی دین میں ہماری پیروی اختیار کرو اور گناہ کی فکر مت کرو، اگر یہ گناہ ہوا تو ہم اٹھا لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی نہیں اٹھائیں گے، بلکہ وہ صاف جھوٹے ہیں۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۱۲، ۱۳) یہاں بھی ان کے اس فریب اور چکمے کا جواب دیا ہے، فرمایا، کوئی جان بھی کوئی گناہ کماتی ہے تو وہ اسی پر ہوتا ہے، کوئی دوسری جان کسی صورت اسے نہیں اٹھائے گی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے عدل ہی کے خلاف ہے، جس کے سامنے تم نے لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھارے اختلاف کا اور حق و ناحق ہونے کا فیصلہ تمھیں سنائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کا ذکر کئی جگہ فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۳۱)، سورۂ فاطر (۱۸) اور سورۂ نجم (۳۸، ۳۹)۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ١ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ١ۖ٘ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۠ ﴿۱۶۵﴾

اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین کے جانشین بنایا اور تمھارے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کر دیا، تا کہ وہ ان چیزوں میں تمھاری آزمائش کرے جو اس نے تمھیں دی ہیں۔ بے شک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۶۵﴾

آیت 165 ① وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ: یعنی زمین میں ایک دوسرے کے بعد اقتدار بخشا، یا ایک دوسرے کا جانشین اور وارث بنایا۔

② وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ...... : یعنی شکل وصورت، مال و جاہ اور علم و عقل میں ایک دوسرے پر برتری بخشنے کا مقصد اپنی دی ہوئی نعمتوں میں تمھارا امتحان ہے، اگر کفر اختیار کر کے ناکام ہو گئے تو بہت جلد سزا مل جائے گی، کیونکہ ہر آنے والی چیز قریب ہے اور موت اور قیامت تو یقیناً آنے والی ہیں اور بہت جلد آنے والی ہیں اور اگر ایمان لے آئے، پھر کوئی لغزش بھی ہوئی تو وہ ذات پاک حد سے بڑھ کر بخشنے والی اور بے حد رحم کرنے والی ہے۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ ۷ مَدَنِيَّةٌ ۳۹ — بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اٰيَاتُهَا ۲۰۶ رُكُوْعَاتُهَا ۲۴

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾
اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

الٓمّٓصٓ ① ایک عظیم کتاب ہے جو تیری طرف نازل کی گئی ہے، تو تیرے سینے میں اس سے کوئی تنگی نہ ہو، تاکہ تو اس کے ساتھ ڈرائے اور ایمان والوں کے لیے سراسر نصیحت ہے ② اس کے پیچھے چلو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے سوا اور دوستوں کے پیچھے مت چلو۔ بہت کم تم نصیحت قبول کرتے ہو ③

آیت 1 الٓمّٓصٓ : یہ حروف مقطعات ہیں، تشریح کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱)۔

آیت 2 كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ...... : کتاب نازل کی گئی، کس نے نازل کی، یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ کتاب کس نے نازل کی ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ آپ جھٹلانے والوں کو ڈرائیں اور خبردار کریں، تاکہ وہ ایمان لے آئیں اور ایمان والوں کو نصیحت کریں، تاکہ ان کے ایمان اور ہدایت میں اضافہ ہو، اس لیے آپ اسے پہنچانے میں دل میں کوئی تنگی یا خوف نہ آنے دیں کہ لوگ آپ کی مخالفت کریں گے، کیونکہ اگر کچھ جھٹلانے والے ہوں گے تو ایمان لانے والے بھی ہوں گے اور آپ پر یہ کتاب اتارنے والا آپ کا حامی و ناصر ہو گا، اس لیے کسی تنگ دلی یا خوف میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، آپ کا کام صرف پہنچانا ہے، ہدایت دینا نہ دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

آیت 3 اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ...... : رسالت (پیغام پہنچانے) کا معاملہ تین افراد کے درمیان ہوتا ہے: "مُرْسِلٌ" پیغام بھیجنے والا، یعنی اللہ تعالیٰ، "مُرْسَلٌ" جسے پیغام دے کر بھیجا جائے، یعنی رسول اور "مُرْسَلٌ اِلَيْهِ" جس کی طرف پیغام بھیجا جائے، یعنی امت۔ پچھلی آیت میں رسول کو انذار (ڈرانے) اور تذکیر (نصیحت کرنے) کا حکم ہے، اس آیت میں امت کو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکام کی پیروی کا اور اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے کی پیروی نہ کرنے کا حکم ہے، کیونکہ اللہ کے نازل کردہ کے سوا کسی بھی دوسرے کی پیروی کرنا اللہ کے مقابلے میں غیر اللہ (من دون اللہ) کو اولیاء بنانا ہے۔ حکم صرف اللہ کا حق ہے، جسے پہنچانا رسول کی ذمہ داری ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف قرآن اور حدیث دونوں وحی کے ذریعے سے نازل ہوئے، اس لیے رسول کا ہر حکم اللہ کا حکم ہے، سو اسی کی پیروی کرو، قرآن و سنت کے مقابلے میں کسی کی بات مت مانو، خواہ وہ کتنا ہی بڑا امام، بزرگ، محقق یا دانش ور ہو، ہر ایک کی بات کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المائدۃ : ۳] کے مطابق دین کا ہر مسئلہ قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ اگر کوئی بات قرآن و حدیث میں صریح الفاظ میں نہ ملے تو کسی آیت یا حدیث میں اس کی طرف اشارہ ضرور ہو گا، اس کے لیے

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآىِٕلُوْنَ ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ
جَآءَهُمْ بَاْسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْـَٔلَنَّ
الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا، تو ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آیا، یا جب کہ وہ دوپہر کو آرام کرنے والے تھے ④ پھر ان کی پکار، جب ان پر ہمارا عذاب آیا، اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا یقیناً ہم ہی ظالم تھے ⑤ تو یقیناً ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور یقیناً ہم رسولوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے ⑥

کسی بھی بڑے عالم سے پوچھ سکتے ہیں۔ کسی ایک ہی کی ہر بات کی تقلید، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، تو یہ "مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ" کی طرف لے جائے گی، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

آیت 4 وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ...... : پچھلی آیت میں فرمایا کہ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو، یہاں فرمایا کہ دیکھ لو کہ نصیحت اور عبرت کے لیے تمھارے سامنے کتنی ہی بستیاں ہیں، جنھیں غیر اللہ کی عبادت اور رسولوں کو جھٹلانے کی وجہ سے ہم نے ہلاک کر دیا، جن میں سے کچھ تو وہ تھے جو رات امن و اطمینان سے سو رہے تھے کہ ان پر ہمارا عذاب آ گیا، جیسا کہ قوم لوط اور کچھ وہ تھے جو دوپہر کو آرام کر رہے تھے، جیسے شعیب علیہ السلام کی قوم۔ آرام اور بے خبری کی حالت میں آنے والا عذاب زیادہ خوف ناک ہوتا ہے، یعنی ان کفار کو اپنی خوش حالی پر مغرور نہیں ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک آ کر اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور اس کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۹۷، ۹۸) اور سورۂ نحل (۴۵ تا ۴۷)۔

آیت 5 فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ ...... : "دعویٰ" کا معنی دعا بھی ہوتا ہے اور ادّعا بھی، یعنی اس وقت ان سے سوائے گناہ کے اعتراف کے کچھ بن نہ پڑا اور وہ اپنے بنائے ہوئے اولیاء، یعنی جھوٹے معبودوں کو بھول گئے اور اپنے تمام دعوے بھی، مثلاً یہ کہ آخرت کو بھی ہم ہی مقرب ہوں گے، مگر اس وقت کا اعترافِ گناہ ان کے کس کام آ سکتا تھا؟ جب گناہ سے توبہ کا وقت تھا اس وقت تو غفلت کی نیند سوتے رہے۔ ایسے وقت میں ان کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلنے سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے بھی ان کے دماغ میں یہ بات ہر وقت رہتی تھی کہ تم شرک کر کے اور اللہ کے رسول کو جھٹلا کر ظلم کر رہے ہو، مگر ان کے تکبر اور عناد نے انھیں اقرار نہیں کرنے دیا۔ دیکھیے سورۂ انبیاء (۱۱ تا ۱۵) اور سورۂ مومن (۸۵)۔

آیت 6 فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ ...... : پچھلی آیت میں جس چیز سے ڈرایا گیا وہ دنیا کا عذاب تھا، اس آیت میں آخرت کے معاملات سے ڈرایا گیا ہے۔ (کبیر) یعنی ہم لوگوں سے تو یہ پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے پیغمبروں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا جیسا کہ سورۂ قصص میں فرمایا: ﴿ وَ يَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَاۤ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [القصص : ٦٥]

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّ مَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۞ وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

پھر یقیناً ہم ان کے سامنے ضرور پورے علم کے ساتھ بیان کریں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے ⑦ اور اس دن وزن حق ہے، پھر وہ شخص کہ اس کے پلڑے بھاری ہوگئے، تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں ⑧

''اور جس دن وہ انھیں آواز دے گا، پس کہے گا تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا۔'' اور پیغمبروں سے دریافت کریں گے کہ تم نے لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچایا تھا یا نہیں؟ اور پہنچایا تھا تو انھوں نے کیا جواب دیا تھا؟ جیسا کہ سورۂ مائدہ میں فرمایا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ [المائدۃ : ۱۰۹] جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا، پھر کہے گا تمھیں کیا جواب دیا گیا۔'' مقصود کفار کو ڈانٹنا اور ذلیل کرنا ہوگا۔

آیت 7 فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ ...... : یعنی ہم سب کچھ سن رہے تھے اور دیکھ رہے تھے اور ان کے عمل کے وقت غائب نہیں تھے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۶۱) اور سورۂ مجادلہ (۶، ۷) اگر وہ خاموش رہیں گے یا غلط بات کریں گے تو ہم خود پورے علم کے ساتھ بتا دیں گے، یعنی دلیل بھی ساتھ ہوگی کہ خود ان کے اعضاء گواہی دیں گے۔ [دیکھیے یٰس : ۶۵۔ حٰم السجدۃ : ۱۹ تا ۲۱] زمین گواہی دے گی۔ [دیکھیے الزلزال : ۴] امت محمد ﷺ گواہی دے گی۔ [دیکھیے البقرۃ : ۱۴۳] اور جہنم کے داروغے کے سامنے وہ خود اپنی زبان سے مان جائیں گے۔ [دیکھیے الزمر : ۷۱۔ الملک : ۱۰] '' بِعِلْمٍ '' تنوین کی وجہ سے ''پورے علم'' ترجمہ کیا ہے۔

آیت 8 وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ...... : اوپر کی آیت میں سوال اور حساب کا ذکر ہے، اس آیت میں وزن اعمال کا، یعنی ہر ایک کے نیک و بد اعمال کا وزن ہوگا۔ یہاں اس اشکال کی بنا پر کہ ان اعمال کا تو اس وقت وجود ہی ختم ہو چکا ہوگا، بعض عقل پرستوں نے وزن اعمال ہی سے انکار کر دیا، مگر اللہ تعالیٰ کی بات کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری کو ختم ہی اس بات کو قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ ثابت کرنے سے کیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ انبیاء (۴۷) یہ وزن کیسے ہوگا، کچھ اہل علم نے کہا کہ وہ کاغذ تولے جائیں گے جن میں عمل لکھے ہوں گے۔ بعض نے کہا کہ ان اعمال کو جسم دے کر وہ جسم تولے جائیں گے۔ بعض نے کہا کہ اس عمل والے کو تولا جائے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ''تینوں صورتیں ممکن ہیں اور آیات و احادیث میں ہر ایک کی تائید ملتی ہے۔'' چوتھی صورت یہ ہے کہ خود عمل تولے جائیں گے، کیونکہ ان کا وجود ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ [الکھف : ۴۹] ''اور انھوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے۔'' اور فرمایا: ﴿وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا﴾ [الأنبیاء : ۴۷] ''اور اگر رائی کے ایک دانہ کے برابر عمل ہوگا تو ہم اسے لے آئیں گے۔'' اور سورۂ لقمان (۱۶) میں بھی یہی بات فرمائی، سورۂ زلزال میں فرمایا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال : ۷، ۸] ''اور جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ⑨
وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ⑩ ع ۸

اور وہ شخص کہ اس کے پلڑے ہلکے ہوگئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے ⑨ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھیں زمین میں ٹھکانا دیا اور ہم نے تمھارے لیے اس میں زندگی کے سامان بنائے، بہت کم تم شکر کرتے ہو ⑩

لے گا اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔'' سورۂ آل عمران (۳۰) میں بھی یہ بات موجود ہے اور یہی چوتھی صورت راجح ہے۔ اب تو جدید سائنس نے دنیا ہی میں یہ مسئلہ حل کر دیا ہے، ہوا میں تحلیل ہو جانے والی آوازوں اور اعمال کا سارا نقشہ اور ختم ہونے والی چیزوں کا وزن سب کچھ انسان کے ہاتھوں ظاہر ہو رہا ہے۔[وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى] مگر ماننے کا لطف اس وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی بات عقل میں آئے یا نہ آئے اسے من وعن تسلیم کیا جائے اور اسی کا نام اسلام ہے، سائنس سے ثابت ہونے کے بعد کسی نے مانا تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات کو کیا مانا؟

آیت 9 **وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ**......: اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد کافر ہیں، کیونکہ قرآن نے انھیں ''**خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ**'' قرار دیا ہے، مومن گناہ گار تو آخر کار کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں پہنچ جائیں گے۔ (کبیر) مزید دیکھیے سورۂ حاقہ (۲۵ تا ۲۹) کی تفسیر۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے ایک شخص کو قیامت کے روز سب کے سامنے لایا جائے گا، اس کے ننانویں اعمال نامے پھیلائے جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک اتنا لمبا ہوگا جتنی دور نگاہ جاتی ہے، پھر پروردگار اس سے فرمائے گا: ''کیا تم ان میں سے کسی عمل سے انکار کرتے ہو؟'' وہ عرض کرے گا: ''نہیں۔'' پھر پروردگار فرمائے گا: ''تمھاری ایک نیکی بھی ہمارے پاس ہے اور آج تم سے کوئی بے انصافی نہیں کی جائے گی۔'' پھر ایک بطاقہ (کاغذ کا ٹکڑا) لایا جائے گا جس پر '' أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ '' درج ہوگا۔ وہ عرض کرے گا: ''بھلا یہ ایک پرزہ ان تمام دفتروں کے مقابلے میں کس کام آئے گا؟'' حکم ہوگا کہ تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا (لہٰذا صبر کرو) پھر وہ تمام دفتر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور یہ کاغذ کا ایک پرزہ دوسرے پلڑے میں، تو وہ دفتر ہلکے ہو جائیں گے اور وہ پرزہ بھاری ہوگا اور اللہ کے نام کے مقابلے میں کوئی چیز بھاری نہیں ہوگی۔'' [ترمذی، الإیمان، باب ما جاء فیمن یموت...... : ۲۶۳۹۔ ابن ماجہ : ۴۳۰۰۔ سلسلة الأحادیث الصحیحة : ۲۶۱/۱] اہل علم نے دوسری آیات و احادیث کو مد نظر رکھ کر اس شخص سے وہ آدمی مراد لیا ہے جسے کلمہ پڑھنے کے بعد عمل کا موقع ہی نہیں ملا، یعنی جسے آخری وقت پر کفر و شرک سے باز آنے اور اسلام لانے کی توفیق ملی اور اسلام لانے سے اس کے تمام گناہ معاف ہو گئے، یا بدعمل تھا اور آخری وقت توبہ کی توفیق نصیب ہو گئی۔

آیت 10 **وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ**......: اوپر کی آیات میں انذار و تبشیر کے ساتھ لوگوں کو انبیاء کی دعوت قبول کرنے

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖۗ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ سجدہ کرنے والوں سے نہ ہوا ⑪ فرمایا تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا، جب میں نے تجھے حکم دیا؟ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا ہے ⑫

کی ترغیب دی اور ترغیب میں نعمتوں کی کثرت کی طرف اشارہ تھا، اب یہاں سے نعمتوں کے بیان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، ساتھ ہی شیطان کے حسد اور انسان کو اللہ کی نعمتوں سے محروم کرنے کی جدوجہد کا ذکر ہے، تاکہ ہم اس سے بچ سکیں۔

آیت 11 ① **وَ لَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ** : " خَلَقَ " کا اصل معنی جس چیز کا وجود نہ ہو اس کا صحیح خاکہ بنانا اور وجود میں لانا ہے۔ اس معنی میں خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہاں، کسی چیز سے کوئی خاکہ تیار کرنے کو بھی " خَلَقَ " کہہ لیتے ہیں، یہ مخلوق بھی کر سکتی ہے، سورۂ مائدہ (۱۱۰) میں عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے: ﴿ وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ ﴾ (راغب) "خلق، برأ" اور "تصویر" پیدائش کے تین مراحل ہیں، سورۂ حشر (۲۴) میں فرمایا: ﴿ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ﴾ تینوں الفاظ میں سے اکیلا کوئی بھی لفظ آئے تو پیدا کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، اکٹھے آئیں تو کچھ فرق ہے، یعنی ہم نے تمھارا خاکہ بنایا، پھر تمھیں صورت بخشی۔

② **ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ** : اس سجدے سے مراد مطلق تعظیم ہے یا حقیقی سجدہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۴)

آیت 12 ① **قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ** : یہاں " اَلَّا " زور اور تاکید کے لیے ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ ص (۷۵) میں فرمایا: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ ﴾ "تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا" اور یہاں ہے کہ تجھے کس نے روکا کہ اس کے روکنے کے باعث تو نے سجدہ نہ کیا۔

② اس سے وہ مشکل حل ہو جاتی ہے کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو تھا، ابلیس جنوں میں سے تھا، فرشتہ تھا ہی نہیں تو وہ نافرمان کیوں ٹھہرا؟ اس کے عجیب وغریب جواب دیے گئے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کے علاوہ ابلیس کو بطور خاص مخاطب کر کے حکم دیا گیا تھا۔

③ **خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ** : آگ مٹی سے افضل ہے اور افضل اپنے سے کم درجہ کو کیسے سجدہ کر سکتا ہے؟ اس نے یہ نہ دیکھا کہ حکم کون دے رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی موجودگی میں عقلی قیاس سے کام لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ دھتکارا گیا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اسی لیے اہل علم فرماتے ہیں کہ پہلا شخص جس نے واضح حکم کی موجودگی میں قیاس کیا ابلیس تھا۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾
قَالَ اَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ
لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾

فرمایا پھر اس سے اتر جا، کیوں کہ تیرے لیے یہ نہ ہوگا کہ تو اس میں تکبر کرے۔ سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے ﴿۱۳﴾ اس نے کہا مجھے اس دن تک مہلت دے جب یہ اٹھائے جائیں گے ﴿۱۴﴾ فرمایا بے شک تو مہلت دیے جانے والوں سے ہے ﴿۱۵﴾ اس نے کہا پھر اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، میں ضرور ہی ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا ﴿۱۶﴾

ابن سیرین نے فرمایا کہ شرک کی بنیاد بھی قیاس ہی تھا۔ (طبری) اب بھی آیات واحادیث کے مقابلے میں جو شخص اسی طرح عقلی قیاس سے کام لے گا اس کا یہ کام شیطانی ہے، اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو ابلیس کا ہوا۔

④ وَخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ: یہاں شیطان نے متعدد غلطیاں کیں، ایک تو یہ بات ہی غلط ہے کہ افضل اپنے سے کم تر کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ بات برتر یا کم تر کی نہیں، حکم کی ہے اور اللہ تعالیٰ جسے جو چاہے حکم دے سکتا ہے۔ دوسرا اس کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ میں آدم سے بہتر ہوں، کیونکہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنانے کا اور عزت و تکریم بخشنے کا جو شرف عطا فرمایا وہ کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا، اس لیے فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [صٓ : ۷۵] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔“ اور تیسری یہ بات بھی غلط ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے، کیونکہ آگ میں تیزی، جلانا اور بھڑکنا ہے، جبکہ مٹی میں تواضع، ٹھکانا بننے، اگانے اور بڑھانے کی خوبی موجود ہے۔ اب بھی جو لوگ قرآن و حدیث کے مقابلے میں قیاس کرتے ہیں اس پر تھوڑا سا غور کریں تو اس کا فاسد و باطل ہونا آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔

آیت 13 فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کبریائی (بڑائی) میری رداء (اوپر کی چادر) اور عزت میری ازار (نیچے کی چادر) ہے، جو ان میں سے ایک بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے آگ میں پھینکوں گا۔“ [مسلم، البر والصلة، باب تحریم الکبر : ۲۶۲۰، عن أبی ہریرة رضی اللہ عنہ] یعنی تکبر کے بعد جنت میں رہنے کا شرف تیرے پاس رہنا ممکن ہی نہیں۔ یہی حال ہر تکبر اور غرور والے کا ہوگا۔

آیت 13 قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ: شیطان نے مہلت تو قیامت تک کی مانگی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علم میں طے شدہ وقت تک مہلت دی۔ دیکھیے سورۂ حجر (۳۸) اور سورۂ ص (۸۱) قیامت تک مہلت کی کہیں تصریح نہیں ہے۔ شیطان کو مہلت دینے سے مقصود بندوں کا امتحان ہے کہ وہ رحمان کی راہ پر چلتے ہیں یا شیطان کی۔

آیت 16 ① قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ: ابلیس کی شیطنت دیکھیے کہ گمراہ ہونے میں سارا قصور اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا ہے

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۱۸

پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا ⑰ فرمایا اس سے نکل جا، مذمت کیا ہوا، دھتکارا ہوا، بے شک ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا میں ضرور ہی جہنم کو تم سب سے بھروں گا ⑱

اور اپنے اختیار کی نفی کر رہا ہے، یہی جبریہ کا عقیدہ ہے اور مشرکین نے بھی اللہ تعالیٰ کے ذمے یہی الزام لگایا کہ اگر وہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۱۴۸)۔

② لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ : یعنی میں تو گمراہ ہوں ہی ان کی بھی راہ ماروں گا۔ (موضح) یہاں شیطان جبری کے بجائے قدری بن گیا کہ میں یہ کروں گا اور وہ کروں گا، پہلے کہتا تھا کہ سب تو نے ہی کیا۔ معلوم ہوا شیطان میں جبری اور قدری (تقدیر کا منکر) ہونے کی دونوں گمراہیاں موجود ہیں، جبکہ ایمان ان دونوں کے درمیان ہے۔

آیت 17 ① ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ ...... : اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شیطان اور دوسری تمام آفات سے تمام اطراف سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، چنانچہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ صبح و شام یہ کلمات پڑھا کرتے تھے اور کبھی ان میں ناغہ نہیں کرتے تھے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِيْ دِيْنِيْ وَ دُنْيَايَ وَأَهْلِيْ وَمَالِيْ، اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِيْ وَآمِنْ رَّوْعَاتِيْ، اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَ مِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَّمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ أُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ » [أحمد : ۲/ ۲۵، ح : ٤٧٨٤۔ أبو داوٗد، الأدب، باب ما يقول إذا أصبح : ٥٠٧٤] ”اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ! میں تجھ سے اپنے دین میں اور اپنی دنیا میں اور اپنے اہل میں اور مال میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! تو میری پردے والی چیزوں پر پردہ ڈال دے اور میری گھبراہٹوں کو امن عطا فرما۔ اے اللہ! میری حفاظت فرما میرے آگے سے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں سے اور میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے اور میں تیری عظمت کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں اپنے نیچے سے اچانک پکڑ لیا جاؤں۔“

② وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ : ابلیس کو غیب کی خبر تو نہ تھی محض گمان پر اس نے یہ دعویٰ کر دیا مگر ظالم نے اپنا یہ گمان واقعی سچا کر دکھایا، جیسا کہ سورۂ سبا (۲۰) میں ہے۔

وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَ قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور اے آدم! تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو، پس دونوں کھاؤ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے قریب مت جاؤ کہ دونوں ظالموں سے ہو جاؤ گے ﴿۱۹﴾ پھر شیطان نے ان دونوں کے لیے وسوسہ ڈالا، تاکہ ان کے لیے ظاہر کر دے جو کچھ ان کی شرم گاہوں میں سے ان سے چھپایا گیا تھا اور اس نے کہا تم دونوں کے رب نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا مگر اس لیے کہ کہیں تم دونوں فرشتے بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ ﴿۲۰﴾

آیت 19 وَ يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ ...... : اس کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ (۳۵)۔

آیت 20 ① لِيُبْدِيَ لَهُمَا: بعض علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ ”لِيُبْدِيَ“ میں ”لام“ عاقبت کا ہے، یعنی شیطان کے دل میں نہیں تھا کہ وہ ننگے ہو جائیں گے مگر ایسا کرنے کا انجام یہی تھا، لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ یہ ”لام“ تعلیل کا ہے اور اس کی غرض یہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ درخت کھانے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ شرم گاہ کو ” سَوْءَةٌ “ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا ننگا ہونا انسان کو طبعاً برا لگتا ہے اور ”سَاءَ يَسُوْءُ“ کا معنی برا لگنا ہے، گویا ان کو جنت کا جو لباس پہنایا گیا تھا، جس سے ان کی شرم گاہیں چھپی ہوئی تھیں، وہ ممنوعہ درخت کھانے سے اتر جانا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پہلے ہی جنت کی چار خصوصی سہولتیں بتائی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ تو جنت میں ننگا نہیں ہوگا اور ساتھ ہی بتا دیا تھا کہ ممنوعہ درخت کھانے سے یہ سہولتیں چھن جائیں گی، اس لیے یہ بات آدم علیہ السلام کو بھی معلوم تھی، مگر شیطان کے قسم کھانے سے بھول گئے۔ ان سہولتوں کے لیے دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۱۸، ۱۱۹)۔

② ”وٗرِيَ“ یہ ” وَارٰى يُوَارِيْ مُوَارَاةً “ (مفاعلہ) سے ماضی مجہول ہے۔

③ وَ قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا ...... : شیطان نے ان دونوں کو یوں بہکایا کہ اللہ تعالیٰ کے تمھیں اس درخت سے منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کھانے سے تم فرشتے بن جاؤ گے، یعنی ان کی خصوصیات اور فطری کمالات تم میں بھی پیدا ہو جائیں گی، یا ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ جن دو چیزوں کے درمیان ” أَوْ “ کا لفظ آئے ان میں سے ایک چیز بھی ہو سکتی ہے اور دونوں بھی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بھی نہ ہو۔ ایک بہرحال ضرور ہوگی، دوسری بھی ممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام فرشتوں کو اللہ کے قریب رہنے کی وجہ سے اپنے سے بہتر سمجھتے تھے، سورۂ انبیاء میں ہے: ﴿ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴾ [الأنبياء : ۱۹] ”اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اس کی عبادت سے تکبر کرتے

وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۲۱﴾ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۲﴾

اور اس نے دونوں سے بار بار قسم کھا کر کہا کہ بے شک میں تم دونوں کے لیے یقیناً خیر خواہوں سے ہوں ﴿۲۱﴾ پس اس نے دونوں کو دھوکے سے نیچے اتار لیا، پھر جب دونوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کے لیے ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں اور دونوں جنت کے پتوں سے (لے لے کر) اپنے آپ پر چپکانے لگے اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا اور تم دونوں سے نہیں کہا کہ بے شک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے ﴿۲۲﴾

ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔'' مگر یہ ایک جزوی فضیلت ہے، اس سے ہر لحاظ سے فرشتوں کا انسان سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

آیت 21 **وَ قَاسَمَهُمَاۤ**: باب مفاعلہ (مقاسمہ) دو طرف سے مقابلہ کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں صرف شیطان نے قسم کھائی تھی، آدم علیہ السلام نے مقابلے میں کوئی قسم نہیں کھائی، اس لیے یہاں مبالغہ کے لیے ہے، لہٰذا ترجمہ ''بار بار قسم کھائی'' کیا گیا ہے۔

آیت 22 ① **فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ**: ''دَلّٰی یُدَلِّیْ تَدْلِیَةً'' (تفعیل) اور ''اَدْلٰی یُدْلِیْ اِدْلَاءً'' (افعال) یہ ''دَلْوٌ'' (ڈول) سے ہے، یعنی جیسے ڈول نیچے گرایا جاتا ہے اس طرح کسی چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف چھوڑنا، یعنی شیطان نے دھوکے سے ان کو ان کے بلند مرتبے سے نیچے اتار دیا۔

② **فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ**: سورۂ طٰہٰ (۱۲۱) میں ہے: ﴿ فَاَكَلَا مِنْهَا ﴾ کہ انھوں نے اس میں سے کھا لیا۔ زیر تفسیر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں سے صرف چکھنے کی دیر تھی کہ جنت کی کرامت چھن گئی اور وہ بے لباس ہو گئے۔

③ **وَ طَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ**: معلوم ہوا انسان فطرتاً باحیا پیدا ہوا ہے اور ننگا ہونا انسانی فطرت کے خلاف ہے، اس لیے آدم اور حوا علیہما السلام درختوں کے پتوں سے ستر چھپانے لگے۔ شیطان اسی لیے بے لباس ہونے کو پسند کرتا ہے، جبکہ ننگا ہونا جانوروں کی فطرت ہے اور کفار اور ان کے پیروکار ننگا ہونا پسند کرتے ہیں، اگر لباس پہنتے ہیں تو ایسا جو انھیں بے لباس ہونے سے بھی زیادہ ننگا کرے، ان کی انسانی فطرت مسخ ہو چکی ہے، انھی کے بارے میں آتا ہے: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] ''یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

④ **وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ**: اس آیت اور دوسری بہت سی آیات و احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں صوت (آواز) ہے اور فرشتے اور آدمی اسے سن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آواز اور کلام سے انکار کر کے قرآن کو کلام اللہ کے بجائے مخلوق قرار دینا سراسر گمراہی ہے۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی عظیم استقامت کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کے دلائل سے

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿٢٥﴾ ع يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٢٦﴾

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے ﴿٢٣﴾ فرمایا اتر جاؤ، تمھارا بعض بعض کا دشمن ہے اور تمھارے لیے زمین میں ایک وقت تک ایک ٹھکانا اور کچھ (زندگی کا) سامان ہے ﴿٢٤﴾ فرمایا تم اسی میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے نکالے جاؤ گے ﴿٢٥﴾ اے آدم کی اولاد! بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا ہے، جو تمھاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت بھی اور تقویٰ کا لباس! وہ سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿٢٦﴾

تمام دنیا کے سامنے اس بات کا غلط ہونا ثابت فرما دیا۔

آیت 23 قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ...... : سورۂ بقرہ میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے یہ کلمات رب تعالیٰ سے سیکھے تھے اور انھی کلمات سے ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳۷) کے حواشی۔ آدم علیہ السلام کی اس دعا سے ان کا اور ابلیس کا فرق واضح ہوتا ہے، یہاں عجز ہے، اعتراف گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار اور بخشش کی درخواست ہے، وہاں تکبر ہے، اپنے گناہ پر اصرار ہے، آئندہ مزید نافرمانی کے ارادے کا اظہار ہے اور مہلت کی درخواست ہے۔ اسی طرح یہاں پاک فطرت ہونے کی بنا پر قسم کی وجہ سے دشمن پر بھی اعتبار ہے، وہاں حسد کی وجہ سے بے گناہوں سے بھی دشمنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بے نیازی دیکھیے کہ دوست کی دعا بھی قبول اور دشمن کی بھی۔ یقیناً اس میں اس پاک پروردگار کی بے شمار حکمتیں تھیں۔

آیت 24 قَالَ اهْبِطُوْا ...... : "مَتَاعٌ" یعنی عارضی لذتیں اور فائدے، تنوینِ تنکیر سے معلوم ہوا کہ وہ بھی چند۔ مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۳۶) کے حواشی۔

آیت 25 قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو بنی آدم کے لیے زندگی میں جائے سکونت قرار دیا ہے، پھر مرنے کے بعد بھی اسی میں دفن ہوں گے اور قیامت کے دن بھی اسی سے زندہ ہو کر نکلیں گے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۵۵)۔

آیت 26 ① يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا: یعنی آسمان سے پانی اتارا، جس سے روئی اگتی ہے، ریشم اور پشم کا سامان مہیا ہوتا ہے، پھر تمھیں زراعت، شجرکاری، حیوان پروری، کپڑا بننے اور دوسری چیزیں بنانے کا طریقہ سکھا دیا۔ راغب نے فرمایا کہ یہاں "اَنْزَلَ" بمعنی "خلق" ہے، جیسے: ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ﴾ [الحدید : ۲۵] "اور ہم نے لوہا اتارا۔"

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے آدم کی اولاد! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے، جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، وہ دونوں سے ان کے لباس اتارتا تھا، تاکہ دونوں کو ان کی شرمگاہیں دکھائے، بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں وہاں سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ﴿۲۷﴾

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''یعنی دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروائے، پھر ہم نے تم کو دنیا میں لباس کی تدبیر سکھا دی۔'' (موضح)

② يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا: یعنی لباس کا مقصد ستر پوشی اور زینت ہے۔ اس کے علاوہ وہ سردی، گرمی اور چوٹ وغیرہ سے بھی بچانے کا باعث بنتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ﴾ [النحل: ۸۱] ''اور اس نے تمھارے لیے کچھ قمیصیں بنائیں جو تمھیں گرمی سے بچاتی ہیں اور کچھ قمیصیں جو تمھیں تمھاری لڑائی میں بچاتی ہیں۔''

③ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ: یعنی اس ظاہری لباس کے علاوہ جس سے تم صرف بدن ڈھانکتے ہو یا زینت کا کام لیتے ہو ایک اور معنوی لباس بھی ہے جو ہر لباس سے بہتر ہے، لہٰذا تمھیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور وہ ہے پرہیز گاری، یعنی اللہ کا خوف، ایمان اور عمل صالح کا لباس۔ بعض نے کہا ہے کہ '' لِبَاسُ التَّقْوٰى '' سے مراد اون اور کھدر وغیرہ کی قسم کا کھردرا اور موٹا لباس ہے، جسے صوفی لوگ پہنتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں، خود رسول اللہ ﷺ اور سلف صالحین، جن کی پرہیز گاری بے مثال تھی، عمدہ لباس بھی پہنا کرتے تھے اور وسعت کے باوجود سادہ لباس بھی پہنتے تھے۔ بعض نے زرہ وغیرہ فوجی لباس مراد لیا ہے جو دشمن سے بچاؤ کا ذریعہ بنتا ہے۔ (قرطبی، روح المعانی) ہاں یہ ضرور ہے کہ جس لباس کی ممانعت آئی ہے وہ نہ پہنا جائے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیز گاری ہو، یعنی مرد ریشمی (اور زعفرانی رنگ کا) لباس نہ پہنے، دامن لمبا نہ رکھے جو ٹخنوں کو ڈھانک لے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک (یا تنگ) لباس نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھائے۔ (موضح)

④ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی اس بڑی نعمت کی قدر کریں، یا نصیحت حاصل کریں اور برے کاموں سے بچیں۔

آیت 27 ① يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ...... : شیطان کی کوشش یہ ہے کہ تم جنت میں نہ جانے پاؤ، جیسا کہ اس

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور جب وہ کوئی بے حیائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہہ دے بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے وہ بات لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے ﴿۲۸﴾

نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا، اس کے لیے وہ بے پردگی کو اور بے لباس ہونے کو عام کرتا ہے، تاکہ بے حیائی اور بدکاری پھیل جائے۔ دیکھنا کہیں اس فتنے میں مبتلا ہو کر جنت سے محروم نہ ہو جانا۔

② اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ ...... : یعنی ایسے دشمن سے تو بہت زیادہ محتاط اور چوکنا رہنا چاہیے جو ہمیں دیکھے مگر ہم اسے دیکھ نہ پائیں۔ اس آیت سے بعض اہل علم نے یہ استدلال کیا ہے کہ جنوں کو دیکھنا ممکن نہیں ہے، مگر یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگرچہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا قبیلہ ہمیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جبکہ ہم انھیں نہیں دیکھتے ہوتے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا دکھائی دینا کسی وقت بھی ممکن نہیں۔ یہ " قَضِيَّةٌ مُطْلَقَةٌ لَا دَائِمَةٌ " ہے، لہٰذا صحیح یہی ہے کہ جنوں کو دیکھنا ممکن ہے۔ احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں کو دیکھا ہے۔ (فتح القدیر) اور زکوٰۃ رمضان کی نگرانی کے قصے میں مذکور ہے کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مسلسل تین راتیں ایک شیطان کو پکڑتے رہے۔ [بخاری : ۲۳۱۱] اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات میری نماز قطع کرنے کے لیے میرے پاس ایک سرکش جن آ گیا، اگر میرے بھائی سلیمان (علیہ السلام) کی دعا نہ ہوتی تو میں اسے پکڑ کر ستون سے باندھ دیتا اور صبح کو مدینہ کے بچے اس سے کھیلتے۔'' [مسلم، المساجد، باب جواز لعن الشیطان ...... : ۵۴۱۔ بخاری : ۴۶۱] سلیمان علیہ السلام کے پاس تو باقاعدہ جنوں کی قوم تھی۔ [دیکھیے النمل : ۱۷] اب رہا امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ فرمانا کہ جو شخص جنات کو دیکھنے کا دعویٰ کرے اس کی شہادت مردود ہے، تو شاید ان کا مطلب یہ ہو کہ انھیں ان کی اصل شکل پر دیکھنے کا دعویٰ کرے، ورنہ احادیث سے ثابت شدہ بات مقدم ہے۔

آیت 28 ① وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ...... : یہاں " فَاحِشَةً " اور " بِالْفَحْشَآءِ " سے مراد وہ عبادات ہیں جو انھوں نے از خود ایجاد کر لی تھیں، مثلاً ان کے مرد اور عورتیں ننگے ہو کر طواف کرتے کہ جن کپڑوں میں ہم گناہ کرتے ہیں ان میں طواف کیسے کریں؟ اس کے علاوہ اس آیت میں مشرکین کے اپنی بے حیائی اور بدکاری پر قائم رہنے کے دو عذر بیان کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ ہم نے بڑوں کو ایسا کرتے پایا ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ پہلی بات یعنی اپنے بڑوں کو ایسا کرتے ہوئے پانے کی چونکہ درست تھی اس لیے یہاں اس کی نفی نہیں کی گئی۔ ہاں دوسری کئی آیات میں بتایا گیا ہے کہ باپ دادا کے نقش قدم پر چلتے رہنا کوئی دلیل نہیں ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۰) اور سورۂ مائدہ (۱۰۴) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی سن چکے کہ باپ نے شیطان کا فریب کھایا، پھر باپ کی سند کیوں لاتے ہو؟'' (موضح) رہا دوسرا عذر تو چونکہ بطور واقعہ بھی غلط تھا اور بطور دلیل بھی، اس لیے یہاں اس کی تردید فرمائی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انبیاء کی زبان سے

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۣ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ۝۲۹

کہہ دے میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے رخ ہر نماز کے وقت سیدھے رکھو اور اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کو پکارو۔ جس طرح اس نے تمھاری ابتدا کی، اسی طرح تم دوبارہ پیدا ہو گے ۝۲۹

ان کاموں کا برا اور قبیح ہونا ثابت ہو چکا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی بے حیائی کا حکم دے۔ (رازی)

② اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ ...... : اس آیت میں ان لوگوں کو بھی سخت تنبیہ ہے جو محض باپ دادا کی رسموں کو دین سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہونے کو ثواب سمجھتے ہیں اور ان مقلدین کے لیے بھی جو امام پرستی، شیخ پرستی یا کسی بھی شخصیت پرستی میں گرفتار ہیں، جب بھی انھیں حق کی بات دلیل کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ لاجواب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کو کیا اس کا علم نہ تھا؟ کیا وہ جاہل تھے؟ ہمارے بڑے یہی کرتے آئے ہیں، ہم بھی اسی پر قائم رہیں گے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کی وجہ سے یہودی یہودیت پر، نصرانی نصرانیت پر اور بدعتی بدعت پر قائم رہے۔

آیت 29 ① قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ: لہٰذا تم اس کی پیروی کرو۔ یہاں " اَلْقِسْطُ " (انصاف) سے مراد توحید ہے، پھر بے حیائی اور بدکاری سے بچنا ہے، کیونکہ سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ شرک ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان : ۱۳] " بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔" پھر کسی انسان کی جان، مال یا آبرو برباد کرنا بڑا ظلم ہے اور سب سے بڑا انصاف اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے: ﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ﴾ [آل عمران : ۱۸] " اللہ نے گواہی دی کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔"

② وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: " مَسْجِدٍ " سے مصدر میمی، ظرف زمان اور ظرف مکان تینوں مراد ہو سکتے ہیں۔ مصدر میمی ہو تو اس کا معنی سجدہ بھی ہے اور نماز بھی، جیسے " رَكْعَةٌ " کا معنی رکوع بھی ہے اور نماز میں قیام، رکوع، قومہ، سجدہ اور قراءت وغیرہ کے مجموعہ کو بھی " رَكْعَةٌ " کہا جاتا ہے اور سجدہ بھی اور قیام بھی۔ یعنی جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے، تو معنی ہو گا ہر نماز میں۔ اگر مراد زمان ہو تو ہر سجدے یا نماز کے وقت اور مکان ہو تو ہر سجدے یا نماز کی جگہ اپنے رخ سیدھے کر لو، یعنی قبلہ کی طرف، یا جیسے اللہ کے رسول نے حکم دیا ہے اس طرح اپنے چہروں، یعنی اپنے آپ کو سیدھا کر لو اور ان کے بتائے ہوئے طریقے پر نماز پڑھو۔

③ وَ ادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: " الدِّيْنَ " کا معنی یہاں عبادت ہے، یعنی خالصتاً اس کی عبادت کرو اور اس کو پکارنے اور اس کی عبادت کرنے میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو، مراد ریا سے بچنا ہے۔ الغرض اس آیت میں تین باتوں کا حکم دیا

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

ایک گروہ کو اس نے ہدایت دی اور ایک گروہ، ان پر گمراہی ثابت ہو چکی، بے شک انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنا لیا اور سمجھتے ہیں کہ یقیناً وہ ہدایت پانے والے ہیں ﴿۳۰﴾ اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت اپنی زینت لے لو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ گزرو، بے شک وہ حد سے گزرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۳۱﴾

ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ جو عبادت شرک یا ممنوع چیزوں، مثلاً ننگے ہونے یا ریا وغیرہ پر مشتمل ہو وہ فواحش میں داخل ہے۔ (رازی) خلاصہ یہ کہ ہر عبادت کے لیے توحید، اتباع رسول اور اخلاص (ریا سے پاک ہونا) تینوں چیزیں ضروری ہیں، ورنہ وہ مردود ہوگی۔

④ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ: یعنی جس طرح تم پہلے کچھ نہ تھے، اللہ نے کسی مشکل کے بغیر تمھیں پیدا فرمایا، اسی طرح تمھارے مر جانے کے بعد وہ تمھیں دوبارہ نہایت آسانی سے زندہ کر دے گا اور جس طرح تم پیدا ہوئے تو تمھارے پاس کچھ نہ تھا اور بغیر ختنے اور لباس کے تھے، ایسے ہی دوبارہ زندہ ہوتے وقت ہو گے۔

آیت 30 ① فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ: ایک گروہ، یعنی مومنوں کو اس نے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق بخشی اور ایک گروہ، یعنی کافروں پر گمراہی ثابت ہو چکی۔

② اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ ...... : یعنی ان پر ضلالت اس لیے ثابت ہوئی کہ وہ شیاطین کے کہنے پر چلتے رہے اور سمجھتے رہے کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

آیت 31 ① خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ ...... : زینت سے مراد لباس ہے، یعنی طواف اور نماز میں پردے کی چیزوں کو چھپانا فرض ہے، مرد کے لیے کمر سے گھٹنوں تک (اور نماز میں اس کے ساتھ کندھے پر کچھ لباس کا ہونا) اور عورت کے لیے چہرہ اور ہاتھوں کے سوا سارا بدن۔ باریک کپڑا جس سے بدن اور بال نظر آئیں معتبر نہیں، یعنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ (موضح) البتہ جمعہ کے دن خاص طور پر غسل، خوش بو اور اپنے بہترین لباس پہننے کا حکم دیا۔ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ سالانہ عیدیں ہیں، ان میں تو بدرجۂ اولیٰ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

② ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عورت بیت اللہ کا طواف ننگی ہو کر کرتی تھی اور کہتی کہ کون مجھے طواف کے لیے کپڑا دے گا، اس کو وہ شرم گاہ پر ڈال لیتی اور کہتی:

اَلْيَوْمَ يَبْدُوْ بَعْضُهٗ اَوْ كُلُّهٗ وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا اُحِلُّهٗ

''آج اس کا کچھ حصہ یا سارے کا سارا ظاہر ہو جائے گا اور اس میں سے جو ظاہر ہو گا میں اسے حلال نہیں کروں گی۔'' [مسلم،

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟ کہہ دے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں (بھی) ہیں، جبکہ قیامت کے دن (ان کے لیے) خالص ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں ﴿۳۲﴾

التفسیر، باب فی قوله تعالٰی : ﴿ خذوا زینتکم عند کل مسجد ﴾ : ۳۰۲۸] کئی مرد بھی ننگے طواف کرتے تھے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس حج (یعنی ۹ ہجری) میں، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع سے پہلے ان کو امیر بنا کر بھیجا تھا، مجھے قربانی کے دن چند آدمیوں کے ہمراہ بھیجا کہ میں لوگوں میں اعلان کر دوں کہ اس سال کے بعد نہ کوئی مشرک حج کرے گا اور نہ کوئی شخص ننگا ہو کر طواف کرے گا۔ [بخاری، الحج، باب لا یطوف بالبیت عریان...... : ۱۶۲۲]

③ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ...... : جب اوپر کی آیت میں قسط (عدل و انصاف) کا حکم دیا، تو دوسری چیزوں کے ساتھ لباس اور کھانے پینے میں بھی ''قسط'' کا حکم ہو گیا، اس لیے ان میں بھی اسراف سے منع فرما دیا۔ (کبیر) اسراف یہ ہے کہ آدمی حلال کو حرام ٹھہرا لے، جیسا کہ مشرکین کرتے تھے، یا اہل تصوف کرتے ہیں، یا حلال سے تجاوز کر کے حرام کھائے یا حرام کام میں خرچ کرے کہ یہ تھوڑا بھی اسراف ہے۔ اسراف، یعنی حد سے نکلنا کسی بھی چیز میں ناپسندیدہ ہے، خصوصاً کھانے پینے میں بے احتیاطی تو اکثر بیماریوں کی جڑ اور دنیا و آخرت دونوں میں نقصان دہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کھاؤ، پیو، پہنو اور صدقہ کرو بغیر اسراف کے اور بغیر تکبر کے۔'' [بخاری، اللباس، باب قول الله تعالٰی : ﴿ قل من حرم زینة الله التی...... ﴾ قبل ح : ۵۷۸۳، تعلیقًا] جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور اپنی تہ بند پنڈلی تک اٹھاؤ، اگر نہیں مانتے تو ٹخنوں تک اور تہ بند لٹکانے سے بچو، کیونکہ یہ تکبر میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔'' [أبو داؤد، اللباس، باب ما جاء فی إسبال الأزار : ۴۰۸۴۔ ترمذی : ۱۷۸۳، و صححه الألبانی] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص تکبر سے اپنا کپڑا کھینچے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔'' [بخاری، اللباس، باب قول الله تعالٰی : ﴿ قل من حرم زینة الله التی...... ﴾ : ۵۷۸۳، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] معلوم ہوا صرف تہ بند ہی نہیں کوئی بھی کپڑا جان بوجھ کر ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر اور حرام ہے، بے اختیار یا بے دھیانی میں لٹک جائے تو الگ بات ہے۔

مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''ابن آدم نے پیٹ سے برا کوئی برتن نہیں بھرا، ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں، اگر ضرور ہی کھانا ہے تو ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے ہے۔'' [أحمد : ۱۳۲/۴، ح : ۱۷۱۹۱۔ ترمذی : ۲۳۸۰، صحیح] ہاں زیادہ دیر کا بھوکا ہو تو زیادہ کھا سکتا ہے، جیسا کہ احادیث سے بعض مواقع پر ثابت ہے۔

آیت 32 قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ ...... : اس آیت میں ''زِيْنَةَ اللّٰهِ'' سے عمدہ لباس اور وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

کہہ دے میرے رب نے تو صرف بے حیائیوں کو حرام کیا ہے، جو ان میں سے ظاہر ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ کہو جو تم نہیں جانتے ﴿۳۳﴾

سے انسان کو حسن و جمال حاصل ہوتا ہے اور "الطَّیِّبٰتِ" سے عمدہ قسم کے لذیذ کھانے مراد ہیں۔ اس آیت میں ان لوگوں کی سخت تردید ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے ترک استعمال کو درویشی سمجھتے ہیں اور گھٹیا قسم کا کھانا کھانے اور لباس پہننے ہی کو بڑی نیکی سمجھتے ہیں اور ان صوفیوں کی بھی تردید ہے جو خود ساختہ وظیفے بتانے کے ساتھ ہی ہر جان دار کا اور جان دار سے حاصل ہونے والی چیز، مثلاً دودھ، گھی اور شہد کا کھانا منع کر دیتے ہیں اور اسے ترک حیوانات جلالی و جمالی کا نام دے رکھا ہے جو دراصل ہندو سادھوؤں اور جوگیوں کا مذہب ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کا اثر اس پر ظاہر ہو۔" [ترمذی، الأدب، باب ما جاء أن اللہ یحب...... : ۲۸۱۹، و صححہ الألبانی] شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "یعنی منع کام میں خرچ نہ کرے، باقی کھانا پینا سب روا ہے، جو نعمت ہے مسلمان کے واسطے پیدا ہوئی ہے، دنیا میں کافر بھی شریک ہو گئے، آخرت میں صرف انھی کے لیے ہے۔" مزید دیکھیے سورۂ احقاف (۲۰)۔

آیت 33 قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ...... : اوپر کی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ لوگوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام کر رکھی تھیں، اب اس آیت میں اصل حرام چیزوں کو بیان فرما دیا۔ (رازی) "الْفَوَاحِشَ" یہ "فَاحِشَةٌ" کی جمع ہے اور انتہائی قبیح فعل کو کہتے ہیں۔ "الْاِثْمَ" سے تمام چھوٹے بڑے گناہ مراد ہیں اور شراب کو بھی "اِثْمٌ" کہہ لیتے ہیں اور "الْبَغْيَ" کے معنی لوگوں پر ظلم اور زیادتی کے ہیں۔ الغرض یہاں محرمات کی پانچ قسمیں بیان فرمائی ہیں اور وہ بھی "اِنَّمَا" کلمۂ حصر کے ساتھ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے علاوہ اور کوئی چیز حرام نہیں ہے، حالانکہ بہت سی دوسری اشیاء کی حرمت بھی قرآن و حدیث میں مذکور ہے۔ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دراصل جنایات (جرائم، قصور، زیادتیاں) پانچ ہی قسم کی ہیں، پہلی نسب پر جنایت ہے، اس کا سبب زنا (اور اس سے ملتی جلتی چیزیں) ہے۔ "الْفَوَاحِشَ" سے یہی مراد ہے۔ دوسری عقل پر جنایت جس کے دوسرے معنی شراب نوشی کے ہیں اور "الْاِثْمَ" میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ تیسری عزت پر جنایت، چوتھی جان و مال پر جنایت اور "الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ" میں ان دونوں کی حرمت کی طرف اشارہ ہے۔ پانچویں دین پر جنایت اور یہ دو قسم کی ہے: ① توحید میں طعن کرنا جس کی طرف ﴿وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ﴾ سے اشارہ فرمایا ہے۔ ② اور بغیر علم کے اللہ کے ذمے بات لگانا اور فتویٰ دینا جس کی طرف ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ سے اشارہ فرمایا ہے۔ غرض کہ تمام

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

اور ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں ﴿۳۴﴾ اے آدم کی اولاد! اگر کبھی تمھارے پاس واقعی تم میں سے کچھ رسول آئیں، جو تمھارے سامنے میری آیات بیان کریں تو جو شخص ڈر گیا اور اس نے اصلاح کر لی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور انھیں ماننے سے تکبر کیا، وہی آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۳۶﴾ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں لکھے ہوئے میں سے ان کا حصہ ملے گا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے آئیں گے، جو انھیں قبض کریں گے تو کہیں گے کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے؟ کہیں گے وہ ہم سے گم ہو گئے اور وہ اپنے آپ پر شہادت دیں گے کہ واقعی وہ کافر تھے ﴿۳۷﴾

جرائم اور جنایات میں یہ پانچ اصول کی حیثیت رکھتی ہیں اور باقی ان کی شاخیں اور ان کے تحت آنے والی چیزیں ہیں، اس بنا پر "اِنَّمَا" کے ساتھ حصر صحیح ہے اور اس پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ (کبیر) یاد رہے کہ اللہ کے ذمے بات لگانے میں رسول اللہ ﷺ کے ذمے بات لگانا بھی شامل ہے، کیونکہ وہ اللہ ہی کی بات ہے، اسی لیے جو جان بوجھ کر ان پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ رازی رحمہ اللہ کے جواب کے لاجواب ہونے میں شک نہیں، مگر ایک سادہ جواب یہ ہے کہ "اَلْاِثْمَ" میں ہر گناہ آ جاتا ہے، اس لیے "اِنَّمَا" کے ساتھ حصر پر کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔

آیت 34 تا 36 وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ...... : پہلی آیت میں بیان فرمایا کہ ہر ایک کے لیے ایک وقت مقرر ہے جو آگے پیچھے نہیں ہو سکتا، دوسری آیت میں بتایا کہ جو لوگ فرماں بردار ہوں گے مرنے کے بعد ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا، مگر جو سرکش ہوں گے وہ سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اسی قسم کا خطاب سورۂ بقرہ میں آدم علیہ السلام کے قصے کے آخر میں بھی مذکور ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳۸، ۳۹)۔

آیت 37 ① فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ...... : اس کا تعلق اوپر کی آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ﴾ سے

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

فرمائے گا ان جماعتوں کے ہمراہ جو جنوں اور انسانوں میں سے تم سے پہلے گزر چکی ہیں، آگ میں داخل ہو جاؤ۔ جب بھی کوئی جماعت داخل ہوگی اپنے ساتھ والی کو لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جس وقت سب ایک دوسرے سے آملیں گے تو ان کی پچھلی جماعت اپنے سے پہلی جماعت کے متعلق کہے گی اے ہمارے رب! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا، تو انھیں آگ کا دگنا عذاب دے۔ فرمائے گا سبھی کے لیے دگنا ہے اور لیکن تم نہیں جانتے ﴿۳۸﴾

ہے، یعنی یہ دو قسم کے لوگ تو بہت ہی بڑے ظالم ہیں، پہلی قسم میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے یا اللہ کا شریک بنانے والے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف کسی حکم کی جھوٹی نسبت کرنے والے، (اس میں رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی بات کی جھوٹی نسبت کرنے والے بھی شامل ہیں) اور دوسری قسم میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں، یا رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے منکر ہیں۔

2 **اُولٰٓىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ**: یعنی اللہ تعالیٰ نے کتاب ''لوح محفوظ'' میں ان کا جو حصہ عمر، رزق، راحت یا رنج وغیرہ کا لکھا ہے وہ انھیں ملے گا اور ان کے ظلم اور بدکاری کے باوجود اس میں کمی نہیں کی جائے گی کہ شاید توبہ کر لیں، یہاں تک کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو انھیں ڈانٹتے ہوئے کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ وہ تو ہم سے گم ہو گئے اور وہ اپنے آپ پر شہادت دیں گے کہ واقعی وہ کافر تھے۔ یہ آیت صریح نص ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی پکارنا، اس سے مدد مانگنا، فریاد کرنا، استغاثہ کرنا، اسے غوث یا مشکل کشا کہنا یا سمجھنا کفر ہے، خواہ وہ اللہ کے سوا کتنی بڑی ہستی کوئی فرشتہ یا رسول یا ولی ہو۔ قیامت کے دن وہ حضرات ان کو منہ بھی نہیں دکھائیں گے اور اللہ کے سوا کسی کو پکارنے والے خود اپنے آپ پر شہادت دیں گے کہ واقعی ہم کافر تھے اور ایمان سے محروم تھے۔ ایک دفعہ غیر اللہ کو پکارنے والوں سے گفتگو کے موقع پر مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ نے ندائے غیر اللہ کے کفر ہونے کی دلیل کے لیے یہ آیت پڑھی اور آخر گفتگو تک اسی پر قائم رہے۔ غیر اللہ کو پکارنے والوں میں سے کوئی بھی اس آیت کا جواب نہیں دے سکا تھا۔ افسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ایسی واضح آیات کے ہوتے ہوئے مسلمان کہلانے والے بعض علماء اور ان کے پیروکار غیر اللہ کو پکارتے ہیں، ان سے مدد طلب کرتے ہیں، کوئی '' یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! اَغِثْنِیْ '' کہتا ہے، کوئی یا علی مدد کہتا ہے، کوئی شیخ عبد القادر کو مدد کے لیے پکارتا ہے، پھر بھی ایسے لوگ اپنے آپ کو مسلمان اور موحدین کو کافر قرار دیتے ہیں۔ بہر حال قیامت کچھ دور نہیں ہے۔

آیت 38 **قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ ......**: اس میں بھی کفار کی حالت کا بیان ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کفار

وَ قَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

اور ان کی پہلی جماعت اپنی پچھلی جماعت سے کہے گی پھر تمھاری ہم پر کوئی برتری تو نہ ہوئی، تو عذاب چکھو اس کے بدلے جو تم کمایا کرتے تھے ﴿۳۹﴾ بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور انھیں قبول کرنے سے تکبر کیا، ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے اور ہم مجرموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۰﴾

ایک ساتھ جہنم میں نہیں جائیں گے، بلکہ ان میں سے کچھ پہلے جائیں گے، کچھ بعد میں جائیں گے۔ (رازی)

② كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا: " اُخْتٌ " کا معنی بہن ہوتا ہے، یعنی ہر بعد میں داخل ہونے والی امت اپنی پہلی ہم مذہب امت پر لعنت کرے گی جو اس سے پہلے جہنم میں داخل ہو گی، مثلاً یہودی دوسرے یہودیوں پر، دہریے دوسرے دہریوں پر، نصاریٰ دوسرے نصاریٰ پر، مشرکین اور ندائے غیر اللہ والے دوسرے مشرکین اور غیر اللہ کو پکارنے والوں پر۔

③ حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا: "اِدَّارَكُوْا" اصل میں " تَدَارَكُوْا " ہے، یعنی ایک دوسرے کو آ ملیں گے۔

④ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ: یعنی جہنم میں بعد میں داخل ہونے والے پہلے داخل ہونے والوں کے بارے میں، یا پیروی کرنے والے عوام اپنے سرداروں اور پیشواؤں کے بارے میں کہیں گے۔

⑤ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا ...... : یعنی ہم تو اپنے ان پہلوں کی تقلید میں یا انھی کی باتوں میں آ کر ایمان کے بجائے شرک و بدعت اور منکرات کی راہ پر چلتے رہے، ہمیں گمراہ کرنے والے یہی ہیں۔ مزید دیکھیے سورۂ احزاب (۶۷، ۶۸)۔

⑥ لِكُلٍّ ضِعْفٌ: ہر ایک کے لیے ایک عذاب کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اگر خود گمراہ ہوئے تو پچھلوں نے ان کا کہا مانا اور خود غور و فکر نہ کیا، لہٰذا دونوں مجرم ہوئے اور دوگنا عذاب ہونے کی وجہ یہ کہ پہلوں نے انھیں گمراہ کیا تو انھوں نے بھی اپنے بعد والوں کو گمراہ کیا، لہٰذا دونوں دگنے عذاب کے حق دار ٹھہرے۔ رازی نے لکھا ہے کہ جہنم کا عذاب چونکہ مسلسل اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہو گا اور ایک دور کے بعد دوسرا دور شروع ہو جائے گا، اس اعتبار سے ہر ایک کے لیے " ضِعْفٌ " ''دوگنا'' قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نحل (۸۸) دونوں گروہوں کا ایسا ہی مکالمہ سورۂ سبا (۳۱، ۳۲) میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

آیت 39 فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ: یعنی اگر ہم مجرم و بدکار تھے تو تمھارا حال ہم سے کون سا بہتر تھا، تم نے بھی اپنی مرضی سے کفر کی روش اختیار کی اور اگر ہم نے تمھیں گمراہ کیا تھا تو تم نے بھی کتنے لوگوں کا بیڑا غرق کیا، اب تمھیں ہم پر کون سی برتری حاصل رہی؟

آیت 40 ① اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ...... : یہ پچھلی آیت میں مذکور وعید ''پس چکھو عذاب ......'' کی کچھ تفصیل

لَهُمۡ مِّنۡ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجۡزِي الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۱﴾ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَاۤ ۫ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۴۲﴾

ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا اور ان کے اوپر کے لحاف ہوں گے اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۱﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، ہم کسی شخص کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتے، یہ لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۴۲﴾

ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمانوں کے دروازے ہیں۔ بہت سی صحیح احادیث میں ان دروازوں کا ذکر موجود ہے۔ دروازے نہ کھولے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال اور دعا کے اوپر جانے کے لیے دروازے نہیں کھلتے اور یہ بھی کہ مرنے کے بعد ان کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے، جیسا کہ مومن کی روح کے اوپر چڑھنے کے لیے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث میں ہے کہ مومن کی روح اوپر چڑھتی ہے تو اس کے لیے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور فرشتے مرحبا کہہ کر اس کا استقبال کرتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ساتویں آسمان پر چلی جاتی ہے، مگر جب کافر کی روح آسمان تک پہنچتی ہے تو اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ...... ﴾ [مسند أحمد : ۲۸۸/۴، ح : ۱۸۵۶۱]

② حَتّٰى يَلِجَ الۡجَمَلُ فِيۡ سَمِّ الۡخِيَاطِ : یہ ایک محاورہ ہے جو ایسے کام کے لیے بولا جاتا ہے جس کا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔ نہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو سکے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں۔

آیت 41 لَهُمۡ مِّنۡ جَهَنَّمَ مِهَادٌ ...... : ”غَوَاشٍ“ یہ ”غَاشِيَةٌ“ کی جمع ہے، ڈھانپنے والے، یعنی ان کے نیچے اور اوپر آگ ہوگی۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۴، ۵۵) ”الظّٰلِمِيۡنَ“ سے مراد یہاں مشرک ہیں، کیونکہ آیات کو جھٹلانا اور ان سے تکبر کرنا مسلمان کا کام نہیں۔

آیت 42 لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَاۤ : یہ جملہ کہ ”ہم کسی شخص کو اس کی طاقت کے سوا تکلیف نہیں دیتے“ جملہ معترضہ ہے، اس جملے کو بیچ میں لانے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جنت میں جانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو کام فرض کیے ہیں وہ انسان کی وسعت اور طاقت سے زیادہ نہیں کہ انسان کے لیے ان کا کرنا مشکل ہو، بلکہ سب اس کی وسعت کے مطابق ہیں کہ ان کا کرنا اس کے لیے آسان ہے، نیز وہ اتنے ہی بجا لانے فرض ہیں جتنی انسان میں طاقت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب میں تمھیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے بچ جاؤ اور جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو اس میں سے اتنا بجا لاؤ جتنی تم میں طاقت ہو۔“ [بخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ : ۷۲۸۸، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَ نُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳

اور ان کے سینوں میں جو بھی کینہ ہوگا ہم نکال دیں گے، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے سب تعریف اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اور ہم کبھی نہ تھے کہ ہدایت پاتے، اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ہمیں ہدایت دی، بلاشبہ یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے۔ اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے ۝۴۳

آیت 43 ① وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ : ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اہل جنت کے اوصاف میں ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے دل ایک آدمی کے دل کی طرح ہوں گے، نہ ان میں کوئی اختلاف ہوگا نہ باہمی بغض۔'' [بخاری، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة و أنها مخلوقة : ۳۲۴۶]

دنیا میں اگر ان کے درمیان کوئی بغض تھا تو وہ صاف ہونے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن آگ سے بچ کر نکلیں گے تو انھیں جنت اور آگ کے درمیان ایک پل پر روک لیا جائے گا، پھر وہ ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا قصاص لیں گے جو دنیا میں ان سے ہوئیں، یہاں تک کہ جب وہ تراش خراش کروا کر بالکل صاف ستھرے ہو جائیں گے تو انھیں جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔'' [بخاری، الرقاق، باب القصاص یوم القیامة : ۶۵۳۵، عن أبي سعید الخدري رضی اللہ عنہ] سینوں میں موجود کینے میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کی باہمی رنجشیں بھی شامل ہیں، جو دنیا میں سیاسی یا دوسری وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئیں۔

② وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا ...... : یعنی یہ ہدایت جس سے ہمیں ایمان اور عمل صالح کی توفیق عطا ہوئی، پھر انھیں قبولیت کا شرف حاصل ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور اس کا فضل ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔

③ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ : یہ باء سببیہ ہے، باء عوض نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ یہ جنت میرے فضل سے تمھارے کسی عوض یا قیمت ادا کیے بغیر تمھیں بطور ہبہ دی جا رہی ہے، جیسا کہ میراث بغیر کسی عوض کے دی جاتی ہے اور تمھاری اس عزت افزائی کا سبب دنیا میں تمھارے اعمال صالحہ ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا۔'' لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟'' فرمایا: ''نہیں، مجھے بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔'' [بخاری، الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل : ۶۴۶۳] آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رحمت انسانی اعمال کی بنیاد پر ہوگی، یعنی اس کے اعمال صالحہ ہی رحمت کا سبب بنیں گے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۱۸)۔

وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ ﴿۴۵﴾

اور جنت والے آگ والوں کو آواز دیں گے کہ ہم نے تو واقعی وہ وعدہ سچا پالیا ہے جو ہم سے ہمارے رب نے کیا تھا، تو کیا تم نے وہ وعدہ سچا پالیا جو تمھارے رب نے تم سے کیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے ﴿۴۴﴾ جو اللہ کے راستے سے روکتے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں ﴿۴۵﴾

آیت 44 وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ...... : جنتی جہنمیوں کی حسرت و ندامت بڑھانے کے لیے اور اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے اور انتقام لینے کے لیے ان سے یہ باتیں کہیں گے: ﴿ فَالۡيَوۡمَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنَ الۡكُفَّارِ يَضۡحَكُوۡنَ ۙ عَلَى الۡاَرَآئِكِ ۙ يَنۡظُرُوۡنَ ؕ هَلۡ ثُوِّبَ الۡكُفَّارُ مَا كَانُوۡا يَفۡعَلُوۡنَ ﴾ [المطففين : ۳۴ تا ۳۶] ”سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں، تختوں پر (بیٹھے) نظارہ کر رہے ہیں، کیا کافروں کو اس کا بدلہ دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟“ بالکل یہی الفاظ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مشرک مقتولین سے کہے تھے، چنانچہ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن قریش کے چوبیس سرداروں کے متعلق حکم دیا، تو انھیں بدر کے ایک نہایت گندے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ تیسرے دن آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہو کر اس کی طرف چلے، کنویں کے کنارے پر جا کھڑے ہوئے، آپ کے صحابہ بھی ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں ایک ایک کا نام لے کر پکارنا شروع کیا: ”اے فلاں بن فلاں! اے فلاں بن فلاں! کیا تمھیں پسند ہے کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانی ہوتی؟ کیونکہ ہم نے تو جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا سچا پالیا، تو کیا تم نے بھی جو وعدہ تمھارے رب نے کیا تھا سچا پالیا؟“ تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”آپ ایسے لاشوں سے بات کر رہے ہیں جن میں جان ہی نہیں۔“ فرمایا: ”تم ان سے زیادہ وہ بات نہیں سن رہے جو میں انھیں کہہ رہا ہوں۔“ قتادہ نے کہا کہ اللہ نے انھیں زندگی دی، یہاں تک کہ انھیں ڈانٹنے، ذلیل کرنے، انتقام اور حسرت و ندامت کے لیے آپ کی بات سنوا دی۔ [بخاري، المغازي، باب قتل أبي جهل : ۳۹۷۶]

آیت 45 ① الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ......: یعنی اللہ کے راستے (اسلام) میں کجی تلاش کرتے ہیں اور اس میں شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو اس سے نفرت دلاتے ہیں، یا لوگوں کو دھمکی دے کر راہِ حق سے روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ راہ سیدھی راہ نہیں، صحیح راہ وہ ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔

② وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ: یعنی وہ ظالم جن میں یہ تین صفات ہوں گی کہ وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اللہ کی راہ میں کجی

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَ هُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور (اس کی) بلندیوں پر کچھ مرد ہوں گے، جو سب کو ان کی نشانی سے پہچانیں گے اور وہ جنت والوں کو آواز دیں گے کہ تم پر سلام ہے۔ وہ اس میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور وہ طمع رکھتے ہوں گے ﴿۴۶﴾

تلاش کرتے ہیں اور آخرت کا انکار کرتے ہیں ان پر لعنت کی ہے، ورنہ ہر فاسق پر لعنت نہیں۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں بے انصاف (ظالم) فرمایا اکثر گناہوں پر لیکن لعنت نہیں کی مگر ایسوں پر۔ (موضح) مطلب یہ ہے کہ وہ بے دریغ ہر قسم کے برے اقوال و اعمال کا ارتکاب اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔

آیت 46 ① **وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ**: جو جنت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار ہوگی، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ **فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ** ﴾ [الحدید : ۱۳] یعنی جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے گی، جس کے اندر کی طرف اللہ کی رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وآں مسمّٰی باعراف است۔'' یعنی اس دیوار کو ''اعراف'' کہا جاتا ہے۔ (فتح الرحمٰن)

② **وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ**: ''**الْاَعْرَافِ**'' یہ '' عُرْفٌ '' کی جمع ہے اور لغت میں ''عَرَفَ يَعْرِفُ مَعْرِفَةً'' پہچاننے کو اور '' عُرْفٌ '' بلند جگہ کو کہتے ہیں، کیونکہ بلند چیز ممتاز ہونے کی وجہ سے آسانی سے پہچانی جاتی ہے، اسی سے مرغ کی کلغی اور گھوڑے کی گردن کے بلند حصے کے بالوں کو '' عُرْفٌ '' کہتے ہیں، کیونکہ بلندی کی وجہ سے وہ پہچان میں ممتاز ہوتے ہیں، لہٰذا ''**الْاَعْرَافِ**'' سے مراد جنتیوں اور جہنمیوں کے درمیان دیوار کی بلندیاں ہیں، جہاں ٹھہرنے والوں کو ایک طرف جنتی اور دوسری طرف جہنمی لوگ نظر آئیں گے، اکثر مفسرین یہی فرماتے ہیں۔

③ **يَعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ**: '' سِيْمَا '' کا معنی نشانی ہے، مثلاً جنتیوں کے چہرے سفید اور نورانی ہوں گے اور جہنمیوں کے کالے سیاہ، یا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کے اعضاء چمک رہے ہوں گے۔ ''**الْاَعْرَافِ**'' میں کون لوگ ہوں گے، اس بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ قرطبی نے دس قول ذکر کیے ہیں، ان میں سب سے مشہور قول جسے جمہور مفسرین نے کثرت روایات کی بنا پر ترجیح دی ہے، یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی، اس لیے وہ بیچ میں دیوار پر ہوں گے۔ اس کا ایک قرینہ یہ جملہ بھی ہے: ﴿ **لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ** ﴾ ''وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور اس کی طمع رکھتے ہوں گے۔''

④ **وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ**: یعنی جنت میں جانے کی امید رکھتے ہوں گے، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اعراف والے

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

وَ نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَ مَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور جب ان کی نگاہیں آگ والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ مت کر ﴿۴۷﴾ اور ان بلندیوں والے کچھ مردوں کو آواز دیں گے، جنھیں وہ ان کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے، کہیں گے تمھارے کام نہ تمھاری جماعت آئی اور نہ جو تم بڑے بنتے تھے ﴿۴۸﴾

ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، مگر امید رکھتے ہوں گے کہ انھیں آئندہ جنت نصیب ہو گی۔ دوسرے یہ کہ اعراف والے ان لوگوں کو پکاریں گے جن کا جنتی ہونا ان کی علامات دیکھ کر معلوم ہو جائے گا، حالانکہ وہ ابھی حساب کتاب میں مشغول ہونے کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے۔ (ابن کثیر)

5 ابن کثیر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب الاعراف سے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ وہ لوگ ہیں جو نافرمانی کرتے ہوئے ماں باپ کی اجازت کے بغیر چلے گئے اور اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے، اب انھیں جنت میں داخلے سے ماں باپ کی نافرمانی نے روک دیا اور آگ میں داخل ہونے سے انھیں اللہ کی راہ میں قتل ہونے نے روک دیا۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان روایات کے غیر معتبر ہونے کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا کہ مرفوع روایات کی صحت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور ابن کثیر کی تخریج ''هداية المستنير'' میں ان تمام روایات کا غیر معتبر ہونا تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے۔

آیت 47 1 وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ : ''صُرِفَتْ'' مجہول کا صیغہ ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اعراف والے جنتیوں کی طرف تو شوق اور رغبت سے دیکھیں گے اور انھیں سلام کریں گے، مگر جہنمیوں کی طرف خود نگاہ اٹھانا بھی پسند نہیں کریں گے، بلکہ ان کی نگاہیں ان کی طرف پھیری جائیں گی، تاکہ انھیں عافیت کی قدر معلوم ہو۔ (المنار)

2 مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ : یعنی جہاں وہ اب ہیں یا آئندہ ہوں گے۔

آیت 48 1 يَعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ : کہ یہ جہنمی ہیں یا جن کو وہ دنیا میں پہچانتے ہوں گے۔

2 مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اہل نار میں سے اس شخص کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ خوش حال تھا، پھر اسے آگ میں ایک غوطہ دیا جائے گا، پھر کہا جائے گا: ''اے ابن آدم! تو نے کبھی کوئی آرام دیکھا تھا؟'' وہ کہے گا: ''نہیں، اللہ کی قسم! اے میرے رب!'' [مسلم، صفات المنافقين و أحكامهم، باب صبغ أنعم أهل الدنيا في النار...... : ۲۸۰۷]

اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ انھیں کوئی رحمت نہیں پہنچائے گا؟ جنت میں داخل ہو جاؤ، نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے ﴿۴۹﴾ اور آگ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ ہم پر کچھ پانی بہا دو، یا اس میں سے کچھ جو اللہ نے تمھیں رزق دیا ہے۔ وہ کہیں گے بے شک اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر دی ہیں ﴿۵۰﴾ وہ جنھوں نے اپنے دین کو دل لگی اور کھیل بنا لیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا تو آج ہم انھیں بھلا دیں گے، جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے اور جیسے وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۵۱﴾

آیت 49 **اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ** ...... : قریش کے کھاتے پیتے لوگ جب نبی ﷺ کے پاس غریب و نادار مسلمانوں کو دیکھتے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ان لوگوں کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے نوازے۔ اب اعراف والے جہنم میں ان لوگوں کو پہچان کر جو نادار مسلمانوں سے اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، کہیں گے کہ دیکھو یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کوئی رحمت نہیں پہنچائے گا، دیکھ لو! اب یہ وہی ہیں جنھیں کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔

آیت 50 **اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ**: جیسا کہ پہلے گزرا کہ جنت کی نعمتیں اہل ایمان کے لیے خالص ہوں گی، جنتی انھیں جواب دیں گے کہ جنت کا پانی اور رزق اللہ تعالیٰ نے کافروں پر حرام کر دیا ہے، لہٰذا ہم تم سے کوئی ہمدردی کا سلوک کر کے اس کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اصحاب اعراف کے جنت میں داخل ہونے کے بعد کفار، یعنی جہنمی لوگ یہ فریاد کریں گے۔ (شوکانی)

آیت 51 ① **فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ** ...... : آیت کے شروع میں کافروں کی علامات بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے دین کو دل لگی اور کھیل بنا لیا اور انھیں دنیوی زندگی کی فراوانی اور خوشحالی نے آخرت کے بارے میں دھوکے میں رکھا اور انھوں نے آخرت کو بھلا دیا اور اسی نسیان کے نتیجے میں انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بندے سے ملے گا اور فرمائے گا: ''اے فلاں! کیا میں نے یہ نہیں کیا کہ تجھے عزت بخشی؟ تجھے سردار بنایا؟ تیری شادی کی؟ تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ تابع کر دیے اور تجھے کھلا چھوڑ دیا کہ لوگوں کا سردار بنے اور ان کی آمدنی کا چوتھا حصہ ٹیکس

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ
اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ
فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْۤا
اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کی بنا پر خوب کھول کر بیان کیا ہے، ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت بنا کر جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۵۲﴾ وہ اس کے انجام کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ جس دن اس کا انجام آ پہنچے گا تو وہ لوگ جنھوں نے اس سے پہلے اسے بھلا دیا تھا، کہیں گے یقیناً ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے، تو کیا ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والے ہیں کہ وہ ہمارے لیے سفارش کریں، یا ہمیں واپس بھیجا جائے تو ہم اس کے برخلاف عمل کریں جو ہم کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے ﴿۵۳﴾

لے؟'' وہ کہے گا: ''کیوں نہیں، اے میرے رب!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''تو تو نے یقین کیا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے؟'' وہ کہے گا: ''نہیں!'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''پھر میں بھی تجھے بھلا رہا ہوں جیسے تو نے مجھے بھلا دیا۔'' [مسلم، الزھد والرقائق، باب الدنیا سجن المؤمن وجنۃ الکافر : ۲۹۶۸، عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ] یہاں نسیان کا معنی چھوڑ دینا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بھولتا ہی نہیں، فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ﴾ [طٰہٰ : ۵۲] ''میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ انھیں جہنم میں ڈال کر ان کی کوئی خبر نہیں لیں گے۔ یہاں بھلانے کے بدلے کو بھلانا فرمایا ہے، یعنی خواہ کتنا ہی پکاریں ان پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

② كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا: معلوم ہوا کہ دین کو لہو و لعب بنانے والے اور آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے والے وہی ہوتے ہیں جو آخرت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو بھول جاتے ہیں اور دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔

آیت 52 وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ ...... : یعنی یہ کفار یہ عذر نہیں کر سکتے کہ ہمیں معلوم نہ تھا، کیونکہ ہم نے ان کی طرف یہ کتاب بھیج کر ہر بات کھول کر بیان کر دی تھی اور ہمارا طریقہ ہی نہیں کہ پیغام پہنچائے بغیر عذاب دیں، فرمایا: ﴿ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بنی إسرائیل : ۱۵] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔''

آیت 53 ① هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ: تاویل کا معنی کسی چیز کی اصل حقیقت یا اس کا انجام ہے۔ اس میں جھٹلانے والوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ قرآن میں جس عذاب (دنیوی یا اخروی) کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، کیا وہ اس کے پیش آنے کا انتظار کر رہے ہیں؟

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، جو تیز چلتا ہوا اس کے پیچھے چلا آتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے (پیدا کیے) اس حال میں کہ اس کے حکم سے تابع کیے ہوئے ہیں، سن لو! پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کا کام ہے، بہت برکت والا ہے اللہ جو سارے جہانوں کا رب ہے ﴿۵۴﴾

❷ **يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ**...... : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی کافر راہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خبر ہے عذاب کی، ہم دیکھ لیں کہ ٹھیک پڑے (درست نکلے) تب قبول کر لیں۔ سو جب ٹھیک پڑے گی تو خلاصی کہاں ملے گی۔ خبر اس لیے ہے کہ آگے (پہلے) سے بچاؤ پکڑیں۔'' (موضح) یعنی جس انجام کے یہ منتظر تھے اس کے سامنے آ جانے کے بعد حق کا اعتراف یا دوبارہ دنیا میں بھیجے جانے کی آرزو اور کسی سفارشی کی تلاش، یہ سب چیزیں بے فائدہ ہوں گی، وہ معبود بھی ان سے گم ہو جائیں گے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے، وہ ان کی مدد کر سکیں گے نہ سفارش اور نہ جہنم کے عذاب سے چھڑا سکیں گے۔

آیت 54 ❶ **اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ**...... : ان چھ دنوں سے مراد دنیا کے چھ دن تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ ان کا وجود سورج اور زمین سے ہے اور اس وقت سورج تھا نہ زمین۔ اب یا تو مراد ہزار سال کا وہ دن ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا: ﴿ وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [الحج : ٤٧] ''اور ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار سال کے برابر ہے، اس گنتی سے جو تم شمار کرتے ہو'' یا چھ ادوار مراد ہیں۔ قرآن مجید کی مختلف آیات پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر دور میں کون سی چیز بنائی گئی۔ دیکھیے سورۂ حم السجدہ (۱۰) صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم الاحد (اتوار) سے خلق کی ابتدا ہوئی اور جمعہ کے دن پوری ہو گئی۔ (ابن کثیر، المنار) اللہ تعالیٰ چاہتا تو لفظ ''كُنْ'' سے ایک لمحے میں سب کچھ پیدا فرما دیتا، مگر اس کی حکمت کا تقاضا اسی طرح کرنے کا تھا جو اس نے کیا۔ بعض اہل علم نے اس سے اپنے کام بالتدریج کرنے کا استنباط فرمایا ہے۔

❷ **ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ**: یہ جملہ قرآن میں سات مقامات پر آیا ہے۔ آٹھویں جگہ سورۂ طٰہٰ (۵) میں ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ ہے۔ اس کے معنی عرش پر بلند ہونے کے ہیں۔ سلف صالحین نے بلا تاویل اللہ تعالیٰ کو عرش پر تسلیم کیا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ ''استواء'' کے معنی تو معلوم ہیں، مگر اس کی کیفیت ہماری عقل سے بالا ہے، اس کا اقرار عین ایمان ہے اور انکار کفر ہے۔ یہی مذہب چاروں اماموں کا ہے۔ پس صحیح عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری مخلوق سے الگ عرش پر ہے، تاہم

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ
اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

اپنے رب کو گڑ گڑا کر اور خفیہ طور پر پکارو، بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا ﴿۵۵﴾ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت پھیلاؤ اور اسے خوف اور طمع سے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے ﴿۵۶﴾

اس کا علم وقدرت سب پر حاوی ہے۔ اہل السنہ کا یہی عقیدہ ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش آسمان و زمین پر محیط ہے۔ (ابن کثیر، شوکانی)

③ **يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا:** یعنی رات کے بعد دن تیزی سے پہنچ جاتا ہے، کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔

④ **مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ:** یعنی اللہ تعالیٰ نے جو وقت اور راستہ ان کے لیے مقرر فرمایا ہے وہ اسی پر چلتے رہتے ہیں اور بال برابر اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتے۔

⑤ **اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ:** یعنی جس طرح خلق (پیدا کرنے) میں اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح حکم بھی اسی کا ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، خواہ تکوینی حکم ہو جو ساری کائنات میں چلتا ہے، یا تشریعی، یعنی شریعت کا قانون جو اس نے اپنے بندوں کو ایک حد تک اختیار دے کر دیا ہے اور جس پر عمل کے مطابق جنت یا جہنم کی جزا یا سزا ملے گی۔

آیت 56،55 ① **اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً:** ان دو آیات میں چار حکم ہیں، پہلا یہ کہ دعا عاجزی سے گڑ گڑا کر اور خشوع سے ہونی چاہیے اور دعا تنہائی میں کرنا مستحب اور بہتر ہے، کیونکہ اس سے ریا کو راستہ نہیں ملتا اور اخلاص میں خلل نہیں آتا۔

② **اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ:** دوسرا یہ کہ حد سے بڑھنا اللہ تعالیٰ کو کسی صورت پسند نہیں۔ اس میں اللہ کے ساتھ شرک کرنا یا کسی پر ظلم کرنا بھی شامل ہے اور ایسی چیز کی دعا کرنا جو ناممکن ہو، مثلاً میں ہمیشہ زندہ رہوں، یا مجھے آخرت میں انبیاء کا مرتبہ حاصل ہو جائے، یا ایسی چیز کی دعا کرنا جس کے متعلق علم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا مانگنا پسند ہے، جیسے نوح علیہ السلام کی اپنے بیٹے کے لیے دعا بھی حد سے تجاوز تھا۔ اسی طرح چیخنا چلانا اور مسنون دعائیں چھوڑ کر مقفّٰی و مسجّع کلام اور اشعار وغیرہ بھی حد سے تجاوز میں شامل ہیں۔ (شوکانی) ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ سفر کے دوران میں ہماری آوازیں تکبیر اور لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ بلند ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگو! اپنے آپ پر نرمی کرو (یعنی ذرا آہستہ پکارو)، کیونکہ تم کسی گونگے یا غائب کو نہیں پکار رہے، بلکہ جسے پکار رہے ہو وہ سننے والا ہے اور قریب بھی۔'' [بخاری، الجهاد و السیر، باب ما یکره من رفع الصوت فی التکبیر : ۲۹۹۲]

③ **وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا:** تیسرا یہ کہ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو، یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور شرک کے کام مت کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر اور گناہوں کا ارتکاب ہی ''فساد فی الارض'' ہے، فرمایا: ﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ﴾ [الروم : ۴۱] ''خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا اس کی وجہ سے جو

وَ هُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مُردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کچھ پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۵۷﴾

لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔“

④ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا: چوتھا یہ کہ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف بھی ہو اور دل میں دعا کی قبولیت کی طمع بھی، اسی طرح جہنم سے خوف بھی ہو اور جنت کی طمع بھی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”یعنی اللہ پر دلیر مت ہو اور نا امید بھی مت ہو۔“ (موضح) طمع میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ انسان دعا کے بعد مایوس نہ ہو، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کسی کی دعا اس وقت تک قبول ہوتی ہے جب تک وہ جلدی نہ کرے اور جلدی یہ ہے کہ کہے میں نے اپنے رب سے دعا کی، مگر اس نے قبول نہ کی۔“ [بخاري، الدعوات، باب يستجاب للعبد ما لم يعجل : ٦٣٤٠]

⑤ کئی صوفیا کہتے ہیں کہ دعا کسی طمع اور خوف کے بغیر محض رب کی رضا کے لیے ہونی چاہیے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ جنت کو جلا دوں اور جہنم کو بجھا دوں، تاکہ لوگ کسی خوف اور طمع کے بغیر اللہ کو یاد کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ بس اللہ تعالیٰ مجھ پر راضی ہو جائے، پھر خواہ مجھے جنت میں بھیج دے یا جہنم میں پھینک دے۔ یہ بات کتاب و سنت کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے جنت کی دعا مانگتے اور جہنم سے پناہ مانگتے تھے۔ زیر تفسیر آیت بھی اس نظریے کے خلاف ہے اور دیگر بہت سی آیات بھی، مثلاً: ﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ﴾ [السجدۃ : ١٦] ”وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔“ درحقیقت یہ بات اسلام کا لبادہ اوڑھنے والے بعض لوگوں نے جنت اور جہنم کو بے وقعت ٹھہرانے کے لیے بنائی ہے۔ جنت کی طمع اور جہنم سے خوف اللہ کی رضا سے الگ چیز نہیں ہے، بلکہ جنت اللہ کی رضا ہی سے حاصل ہوگی اور جہنم بھی اسی کے غضب کا نتیجہ ہے، جس سے بچنا بھی اس کی رضا ہی سے ممکن ہوگا۔

⑥ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ: اس میں ترغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے اصل حق دار وہی ہیں جو احسان کرنے والے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری بہتر سے بہتر انداز میں بجا لانے کی کوشش کرتے ہیں اور اعمالِ صالحہ پر دوام کرتے ہیں۔ ”قَرِیْبٌ“ یہ ”فَعِیْلٌ“ کے وزن پر ہے، جب یہ مسافت کے لیے آئے تو اس میں تذکیر و تانیث برابر ہوتی ہے اور اگر نسب کے لیے ہو تو بلا اختلاف ”قَرِیْبَةٌ“ بولا جاتا ہے۔ یعنی مذکر اور مؤنث میں تاء کے ساتھ فرق کیا جاتا ہے۔ (شوکانی)

آیت 57 ① وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا ...... : ”بُشْرًا“ یہ ”بَشِیْرٌ“ کی جمع ہے، یہ وزن مذکر و مؤنث دونوں

وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کی کھیتی اس کے رب کے حکم سے نکلتی ہے اور جو خراب ہے (اس کی کھیتی) ناقص کے سوا نہیں نکلتی۔ اس طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں جو شکر کرتے ہیں ﴿۵۸﴾

کے لیے آتا ہے، یعنی "مُبَشِّرَاتٌ" خوش خبری دینے والیاں۔ "رَحْمَتِهٖ" سے مراد یہاں بارش ہے۔ دیکھیے سورۂ شوریٰ (۲۸) اور سورۂ روم (۴۶) "ثِقَالًا" یہ "ثَقِيْلٌ" کی جمع ہے، یعنی پانی کی کثرت سے بھاری۔ "لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ" مردہ شہر، یعنی جس زمین میں کوئی پودا نہیں اور نہ چرنے کی کوئی چیز ہے۔

② كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى ...... : بارش کے ساتھ مردہ زمین کی زندگی کو آخرت میں مُردوں کو زندہ کرنے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے، یعنی جس ذات پاک نے مردہ زمین کو دم بھر میں زندہ کر دیا وہ انسانوں کو بھی ان کے مر جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر سکتی ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش نازل فرمائے گا جس سے لوگوں کے جسم اس طرح (زمین سے) اگ پڑیں گے جس طرح سبزی اگتی ہے۔" [مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب ما بين النفختين : ۲۹۵۵، عن أبي هريرة رضي الله عنه]

آیت 58 ① وَ الْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ ...... : یہی مثال مومن اور کافر و منافق کے دل کی ہے، جیسا کہ تابعین سے مروی ہے۔ (شوکانی) ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم و ہدایت دے کر بھیجا ہے اس کی مثال رحمت کی اس بارش کی ہے جو ایک زمین پر برسی، اس کے جو حصے زرخیز تھے انھوں نے پانی کو جذب کر لیا اور خوب گھاس اور چارا اگایا، بعض حصے سخت تھے، انھوں نے پانی کو روک لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ لوگوں کو نفع دیا، چنانچہ انھوں نے خود پیا اور پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا اور اس کا ایک حصہ ایک اور ٹکڑے پر برسا جو محض چٹیل میدان تھے، انھوں نے نہ پانی روکا اور نہ کوئی سبزہ اگایا، یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین کو سمجھ کر اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا اور اس شخص کی جس نے نہ اس کے ساتھ سر ہی اٹھایا (نہ خود سمجھا) اور نہ اللہ کی وہ ہدایت قبول کی جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔" [بخاري، العلم، باب فضل من علم و علّم : ۷۹]

② لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیت میں بارش کے ساتھ زمین کو زندہ کرنے کی مثال مردوں کو زندہ کرنے کے لیے بیان فرمائی، اس سے مقصود نصیحت حاصل کرنا ہے، اس لیے وہاں "لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ" فرمایا۔ اس آیت کا موضوع وحی الٰہی کا علم، اس پر عمل اور دعوت کا فائدہ اٹھانا ہے جس پر شکر لازم ٹھہرتا ہے، اس لیے یہاں "لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ" فرمایا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾

بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، بے شک میں تم پر ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۵۹﴾ اس کی قوم میں سے سرداروں نے کہا بے شک ہم یقیناً تجھے کھلی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں ﴿۶۰﴾ اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں اور لیکن میں جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿۶۱﴾

آیت 59 **لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ** ...... : اوپر بیان فرمایا ہے کہ ہدایتِ الٰہی اور اس کی برکات سے فائدہ اٹھانے یا نہ اٹھانے میں لوگوں کی دو قسمیں ہیں، ایک پاکیزہ فطرت (طیب) جو ہدایتِ الٰہی اور اس کی برکات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے علم و عمل سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، دوسرے وہ جو شرارت پسند اور بدفطرت ہوتے ہیں، یہ لوگ ہدایت کی بارش سے فائدہ اٹھانے کے بجائے الٹا جھاڑیاں اور کانٹے بن کر نکل آتے ہیں اور ان کے دلوں کی زمین چونکہ شور ہوتی ہے، اس لیے ان پر رحمت کی بارش فائدہ بخش نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد اب یہاں سے تاریخی شواہد کے طور پر پہلی قوموں کے واقعات بیان کر کے گویا تاریخی ثبوت پیش کیا ہے کہ ہمیشہ سے لوگ دو قسم کے چلے آئے ہیں۔ (کبیر) نوح علیہ السلام چونکہ سب سے پہلے نبی مرسل تھے جو مشرک قوم کی طرف بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعتِ کبریٰ (بخاری : ۴۷۱۲) اور بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے انھی کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (سورۂ نوح میں مذکور بت) ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نیک لوگوں کے نام تھے، جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ان کی مجالس میں، جن میں وہ بیٹھا کرتے تھے، ان کے مجسمے نصب کر دو اور ان کے نام پر ان کے نام رکھ دو، یہاں تک کہ جب وہ نسل فوت ہو گئی اور علم مٹ گیا تو ان کی عبادت شروع ہو گئی۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ ودا ولا سواعا ولا یغوث و یعوق ﴾ : ۴۹۲۰] تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح عراق میں آباد تھی، ان کا زمانہ ۳۸۰۰ تا ۲۸۰۰ قبل مسیح ہے، مگر اس زمانے کی صحت کی کوئی دلیل نہیں۔

آیت 60 **قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ** ...... : کھلی گمراہی میں اس لیے کہ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر ہمیں ایک نئے دین (توحید) کی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں یہ بات قرآن نے نمایاں طور پر بیان فرمائی ہے کہ ان کی دعوتِ توحید کی مخالفت کرنے والوں میں امراء کا طبقہ ہر زمانے میں پیش پیش رہا ہے، کیونکہ انقلابی دعوت کا پہلا نشانہ یہی لوگ بنتے ہیں۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ
ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ
ع وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

میں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۶۲﴾ اور کیا تم نے عجیب سمجھا کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر ایک عظیم الشان نصیحت آئی، تا کہ وہ تمھیں ڈرائے اور تا کہ تم بچ جاؤ اور تا کہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۶۳﴾ پھر انھوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو کشتی میں اس کے ساتھ تھے، بچا لیا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ یقیناً وہ اندھے لوگ تھے ﴿۶۴﴾

آیت 62 وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ : کیونکہ میری طرف وحی آتی ہے اور تمھاری طرف وحی نہیں آتی۔ (شوکانی)

آیت 62 ① اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ ...... : تمام کافر اقوام کا اعتراض یہی تھا کہ ہمیں میں سے ایک شخص یعنی کوئی انسان رسول کیسے ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ آج کل کے کئی کلمہ گو کہتے ہیں کہ جو نبی ہو وہ انسان کیسے ہو سکتا ہے؟ دونوں کی اصل مشکل ایک ہی ہے۔ نوح علیہ السلام کا جواب یہ تھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھاری طرف نصیحت بھیجی، تا کہ وہ نمونہ بنے، تمھیں خبردار کرے اور تم اللہ سے ڈرو اور تم پر رحم ہو جائے۔ فرشتے یا کسی اور مخلوق کو بھیجنے سے یہ مقصد کبھی حاصل نہ ہوتا۔

② وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ : اشارہ فرمایا کہ انبیاء کی دعوت قبول کر لینے سے دلوں میں تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور یہی تقویٰ آخرت میں رحمت کا سبب بنے گا۔ (رازی)

آیت 64 فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ...... : آخر مومنوں کو سفینے (بحری جہاز) میں اللہ تعالیٰ نے نجات دی اور مخالفین طوفان سے ہلاک ہو گئے۔ اہل تاریخ کا کہنا ہے کہ طوفان نوح کا تخمینی سال ۳۲۰۰ قبل مسیح ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کا یہ سفینہ تین منزلہ تھا، طول ۳۰۰ ہاتھ، عرض ۵۰ ہاتھ اور اونچائی ۳۰ ہاتھ، لیکن ان باتوں کی کوئی دلیل نہیں۔ تورات کے بیان کے مطابق یہ جہاز تقریباً پانچ ماہ چلتا رہا، مگر ہمارے پاس اس کی تصدیق یا تکذیب کا کوئی ذریعہ نہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں اور مختلف پہاڑوں پر ایک قدیم اور زبردست طوفان کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ قصۂ نوح کی تفصیل سورۂ نوح اور سورۂ ہود وغیرہ میں ہے۔ ان کا اندھا پن یہ تھا کہ حق نہ دیکھتے تھے نہ قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔

وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾ اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم نہیں ڈرتے؟ ﴿۶۵﴾ اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا، کہا بے شک ہم یقیناً تجھے بہت بڑی بے وقوفی میں (مبتلا) دیکھ رہے ہیں اور بے شک ہم یقیناً تجھے جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں کوئی بے وقوفی نہیں اور لیکن میں سارے جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا ہوں ﴿۶۷﴾ میں تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمھارے لیے ایک امانت دار، خیر خواہ ہوں ﴿۶۸﴾ اور کیا تم نے عجیب سمجھا کہ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر عظیم الشان نصیحت آئی، تاکہ وہ تمھیں ڈرائے اور یاد کرو جب اس نے تمھیں نوح کی قوم کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں قد وقامت میں زیادہ پھیلاؤ دیا۔ سو اللہ کی نعمتیں یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿۶۹﴾

آیت 65 **وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا:** عاد عرب کی ایک قدیم ترین قوم تھی جو جنوبی عرب میں آباد تھی۔ قرآن کے بیان کے مطابق ان کا مسکن ''احقاف'' کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور عمان کے درمیان واقع ہے اور اب ''ربع خالی'' کے نام سے مشہور ہے۔ یمن کا شہر حضر موت ان کا پایۂ تخت تھا۔ ان کا نسب یوں بیان کیا جاتا ہے، عاد بن عوض بن ارم بن سام بن نوح۔ (ابن کثیر) مگر اس کی صحت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہود علیہ السلام کی قومِ عاد قرآن میں عادِ ارم یا عادِ اولیٰ کے نام سے مذکور ہے۔ حضر موت کے نزدیک ایک مقام پر ہود علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے۔ (المنار) مگر ملا علی قاری نے الموضوعات میں لکھا ہے کہ انبیاء میں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ میں سے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں کے سوا کسی نبی یا صحابی کی قبر کا کوئی صحیح علم نہیں ہے۔

آیت 66 **اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ:** ان کے نزدیک آباء کی تقلید میں شرک کرنا اور دوسری خرافات اختیار کرنا عین عقل مندی اور اس کی مخالفت بے وقوفی تھی۔

آیت 69 **وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ**......: یعنی تمھیں قوی اور زبردست بنایا اور قوم نوح کے

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَ نَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۷۰ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ
سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۝۷۱

انھوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اس اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس کی دھمکی تو ہمیں دیتا ہے وہ ہم پر لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے (۷۰)
اس نے کہا یقیناً تم پر تمھارے رب کی طرف سے بھاری عذاب اور غضب آ پڑا ہے، کیا تم مجھ سے ان ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، جن کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔ تو انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں (۷۱)

بعد ایک زبردست قوم کی حیثیت سے تمھیں زمین میں آباد کیا۔ یہاں ”خُلَفَآءَ“ سے یہی معنی مراد ہے، یہ مطلب نہیں کہ قوم نوح کے وطن عراق میں ان کا جانشین بنایا۔ (قرطبی) قوم عاد کے قد و قامت میں پھیلاؤ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود شہادت دی ہے، فرمایا: ﴿ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴾ [الفجر : ۸] یعنی ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا اور یہ کہ عذاب کے بعد وہ یوں گرے ہوئے تھے جیسے کھجوروں کے گرے ہوئے تنے۔ دیکھیے سورۂ الحاقہ (۷)۔

بعض علمائے تفسیر نے قوم عاد کی جسمانی قوت اور ان کے قد و قامت کی لمبائی کے بارے میں عجیب و غریب روایات نقل کی ہیں، مثلاً یہ کہ قوم عاد کا لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور سب سے چھوٹے قد کا ساٹھ ہاتھ کا ہوتا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ اس کا ایک آدمی اتنے بڑے پتھر کو اٹھا لیتا تھا جسے ہمارے زمانے کے پانچ سو آدمی بھی نہیں اٹھا سکتے وغیرہ۔ مگر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی صورت پر پیدا فرمایا کہ اس کا طول ساٹھ ہاتھ تھا...... پھر اس کے بعد سے اب تک یہ مخلوق گھٹتی رہی ہے۔“ [بخاری، الاستئذان، باب بدء السلام : ۶۲۲۷] اس لیے قوم عاد سے متعلق اس قسم کی کہانیوں پر اعتماد جائز نہیں۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ عاد کے لوگ غیر معمولی جسمانی قوت اور قد و قامت رکھتے تھے، اونچی اونچی عمارتیں بنانے والے اور نہایت سخت گیر تھے، جیسا کہ سورۂ شعراء (۱۲۳ تا ۱۳۴) اور حم السجدہ (۱۵) میں مذکور ہے۔

آیت 71 ① اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْۤ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ : کسی کو بارش کا، کسی کو ہوا کا، کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا خدا کہتے ہو، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی درحقیقت کسی چیز کا خدا نہیں ہے، یہ صرف نام ہی نام ہیں، ان کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں۔

② مَا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ : یعنی اس نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ میں نے اپنی خدائی کے اس قسم کے اختیارات فلاں کی

فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾
وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ

تو ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے، اپنی عظیم رحمت سے نجات دی اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ایمان والے نہ تھے ﴿۷۲﴾ اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح

طرف منتقل کر دیے ہیں اور فلاں کو مشکل کشا، فلاں کو گنج بخش، فلاں کو غوث، فلاں کو دستگیر اور فلاں کو داتا بنایا ہے، یہ اور اس قسم کے القاب لوگوں نے گھڑ کر ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیے ہیں جو شرک کا موجب بنے ہیں۔

آیت 72 وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا...... : اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کے تباہ کیے جانے کی کیفیت تفصیل سے بیان فرمائی ہے، مثلاً سورۂ قمر (۱۸ تا ۲۰)، سورۂ ذاریات (۴۱، ۴۲) اور سورۂ حاقہ (۶ تا ۸) میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان خیز آندھی چلائی جو مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی، وہ آندھی اس قدر تند و تیز تھی کہ جس چیز پر سے گزرتی اسے چورا کر ڈالتی، حتیٰ کہ اس نے انھیں پٹخ پٹخ کر ہلاک کر ڈالا، ان کی لاشیں اس طرح دکھائی دیتیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہیں۔ قرآن نے یہاں اور دوسرے مقامات پر بھی تصریح فرمائی ہے کہ عاد اولیٰ کا نام و نشان تک باقی نہ چھوڑا، فرمایا: ﴿ فَهَلْ تَرٰی لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِیَةٍ ﴾ [الحاقة : ۸] ''تو کیا تو ان میں سے کوئی بھی باقی رہنے والا دیکھتا ہے۔'' عرب مؤرخین نے بھی بالاتفاق ان کو عرب بائدہ (ہلاک ہو جانے والوں) میں شمار کیا ہے۔ صرف ہود علیہ السلام اور ان کے متبعین اس عذاب سے محفوظ رہے اور بقول بعض ان کی نسل ''عادِ ثانیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ بعض آثارِ قدیمہ سے ان کے متعلق معلومات بھی ملتی ہیں۔

آیت 73 ① وَاِلٰی ثَمُوْدَ : ثمود کا شمار بھی عرب کی قدیم ترین قوموں میں ہوتا ہے، عاد کے بعد سب سے مشہور قوم یہی ہے، اسی بنا پر بعض نے اسے ''عادِ ثانیہ'' بھی لکھ دیا ہے۔ ان کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی ''الحجر'' کے نام سے معروف ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۸۰) (ابن کثیر) بعض علماء کا کہنا ہے کہ ان کے علاقے میں پانی کی کمی کی وجہ سے ان کا نام ثمود پڑا، کیونکہ ''ثمد'' قلیل پانی کو کہتے ہیں۔ مدینہ اور تبوک کے درمیان شام کو جانے والی شاہراہ پر ایک شہر مدائن صالح کے نام سے مشہور ہے، یہی قوم ثمود کا صدر مقام تھا۔ سورۂ شعراء (۱۴۶ تا ۱۴۹) میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعمیری اور زرعی مہارت کا ذکر فرمایا ہے۔ وہاں اب بھی اچھی خاصی تعداد میں وہ عمارتیں پائی جاتی ہیں جو ثمود نے پہاڑوں کو تراش کر بنائی تھیں اور ان کے اردگرد بڑا وسیع میدان ہے جہاں وہ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کے پاس رکے تو آپ صحابہ کے ساتھ حجر میں ثمود کے گھروں کے پاس ٹھہرے، لوگوں نے ان کنوؤں سے پانی پیا جہاں سے ثمود پیتے تھے، اسی پانی کے ساتھ آٹا بھی گوندھا اور ہانڈیاں بھی پکا لیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو انھوں نے ہانڈیاں گرا دیں

مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

دلیل آ چکی۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے، سو اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اسے کسی برے طریقے سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ تمھیں ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا ﴿۷۳﴾

اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیا، پھر آپ وہاں سے روانہ ہوئے اور اس کنویں کے پاس پڑاؤ ڈالا جس سے (صالح علیہ السلام کی) اونٹنی پانی پیتی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کے گھروں میں جانے سے منع فرما دیا جن پر عذاب نازل ہوا تھا اور فرمایا: ''میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آ جائے جو ان پر نازل ہوا تھا، اس لیے ان کے گھروں میں نہ جاؤ۔'' [أحمد : ۱۱۷/۲، ح : ۵۹۸۹۔ مسلم : ۲۹۸۰]

وہ کنواں اب بھی موجود ہے، مگر خشک ہو چکا ہے۔ (ابن کثیر) جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک لمبی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حجر میں اترے تو خطبہ دیا، فرمایا: ''لوگو! اپنے نبی سے آیات (معجزات) طلب مت کیا کرو، دیکھو صالح علیہ السلام کی قوم نے اپنے نبی سے سوال کیا کہ ان کے لیے اونٹنی بھیجے تو وہ اس پہاڑی درے سے آتی اور ان کا پانی پیتی جس دن اس کے پینے کی باری ہوتی اور وہ اس کا دودھ اتنا حاصل کرتے جتنا پانی سے سیراب ہوتے تھے۔'' [مستدرك حاكم : ۳٤۰/۲، ح ۳۳۰٤۔ صححه الحاكم ووافقه الذهبي] بعض سیاحت ناموں میں مذکور ہے کہ جس پہاڑی سے وہ اونٹنی بطور معجزہ برآمد ہوئی تھی اس میں اب تک شگاف موجود ہے۔ ابن کثیر نے اس چٹان کا نام ''الکاتبہ'' لکھا ہے۔ (البدایہ) مگر ہزاروں برس گزرنے کے بعد کسی پختہ دلیل کے بغیر کسی شگاف کو اونٹنی برآمد ہونے کی جگہ قرار دینا اندھیرے میں تیر چلانے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

② **اَخَاهُمْ صٰلِحًا:** حافظ بغوی رحمہ اللہ نے ان کا نسب نامہ یوں بیان کیا ہے، صالح بن عبید بن آسف بن ماشح بن عبید بن حاذر بن ثمود۔ (بغوی) اس سے آگے مزید بیان کیا جاتا ہے، عاثر بن ارم بن سام بن نوح۔ ثمود کے دو بھائی اور تھے جن کے نام پر طسم اور جدیس دو قبیلے مشہور ہیں۔ (ابن کثیر) مگر اس زمانے کے انساب کا درست ہونا یقینی نہیں، کیونکہ اس کا کوئی معتبر ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی کنارے پر صالح علیہ السلام کی قبر موجود ہے جو آج بھی زیارت گاہِ خلائق ہے اور اسی جزیرے میں جبل موسیٰ کے قریب صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا نقش قدم معروف ہے، مگر جیسا کہ میں نے آیت (۶۵) میں ملا علی قاری سے نقل کیا ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی نبی کی قبر معلوم نہیں اور نقش قدم بنانے میں تو دیر ہی نہیں لگتی، ہاں کوئی پختہ ذریعۂ علم ہو تو الگ بات ہے اور وہ یہاں موجود نہیں۔

③ **هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ:** سورۂ شعراء (۱۴۸ تا ۱۵۹) میں مذکور ہے کہ صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنی رسالت و اطاعت کی اور فساد فی الارض سے بچنے کی دعوت دی تو انھوں نے آپ کو جادو زدہ اور اپنے جیسا انسان کہہ کر جھٹلا دیا، انھیں نبی تسلیم کرنے کے لیے کوئی معجزہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ صالح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی بھیج دی جو عجیب معجزہ تھی کہ ایک دن وہ ان کا سارا پانی پیتی اور دوسرے دن ان کی اور ان کے جانوروں کی باری ہوتی۔ قرآن و حدیث

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّ تَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۷۴ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۷۵

اور یاد کرو جب اس نے تمھیں عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں جگہ دی، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو مکانوں کی صورت میں تراشتے ہو۔ سو اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے دنگا نہ مچاؤ ۝۷۴ اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے، ان لوگوں سے کہا جو کمزور گنے جاتے تھے، ان میں سے انھیں (کہا) جو ایمان لے آئے تھے، کیا تم جانتے ہو کہ واقعی صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا بے شک ہم جو کچھ دے کر اسے بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لانے والے ہیں ۝۷۵

میں یہ تفصیل نہیں کہ وہ اونٹنی کیسے نمودار ہوئی، مگر تواریخ و تفاسیر میں ہے کہ پہاڑی چٹان پھٹی اور اس میں سے وہ اونٹنی برآمد ہوئی۔ صالح علیہ السلام نے انھیں آگاہ کیا کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو کوئی نقصان پہنچایا تو تمھیں بہت بڑا اور دردناک عذاب پکڑ لے گا، پھر ان کے ۹ بدمعاشوں نے صالح علیہ السلام اور ان کے اہل خانہ کو شب خون مار کر شہید کرنے کا منصوبہ بنایا، جس کی تفصیل سورۂ نمل (۴۸ تا ۵۳) میں ہے۔ آخر کار انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ہی ڈالا، پھر ان پر عذاب آ گیا جس کی تفصیل اس مقام پر اور سورۂ ہود، شعراء، نمل اور شمس وغیرہ میں مذکور ہے اور اپنے اپنے مقام پر آ رہی ہے۔ "نَاقَةُ اللّٰهِ" اگرچہ تمام اونٹنیاں بلکہ ساری کائنات ہی اللہ مالک الملک کی ہے، مگر اس اونٹنی کو خاص طور پر "اللہ کی اونٹنی" قرار دے کر اس کی عظمت اور معجزانہ شان کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جیسے تمام گھر اللہ کی ملکیت ہونے کے باوجود "بیت اللہ" اسی کو کہا ہے جو مکہ میں ہے۔

④ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: یعنی اگر اسے ستاؤ گے یا زخمی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کا عذاب تم پر نازل ہو جائے گا۔

آیت 74 ① تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا...... : یعنی ہموار علاقہ ہو تو اینٹوں سے عالی شان محل بنا لیتے ہو اور پہاڑ ہوں تو انھیں کھود اور تراش کر سردی، گرمی اور طوفان سے محفوظ مکان بنا لیتے ہو۔

② "اٰلَآءَ" یہ "اِلًى" کی جمع ہے جو اصل میں "اِلَيٌ" تھا، جیسے اَمْعَاءٌ (انتڑیاں) "مِعًى" کی جمع ہے۔ "وَلَا تَعْثَوْا" یہ "عَثِيَ يَعْثَى (س)" سے نہی کا صیغہ ہے، اس کا معنی سخت فساد کرنا ہوتا ہے، "مُفْسِدِيْنَ" تاکید کے لیے حال ہے، اس لیے ترجمہ میں "وَلَا تَعْثَوْا" کا معنی "دنگا نہ مچاؤ" اور "مُفْسِدِيْنَ" کا معنی "فساد کرتے ہوئے" کیا ہے۔

آیت 75 ① اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ: ان کا یہ پوچھنا اپنے تکبر کے اظہار اور طنز کے لیے تھا۔

② اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ: یعنی ہمیں نہ صرف ان کے رسول ہونے پر یقین ہے، بلکہ ان کے دیے ہوئے ایک ایک حکم

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

وہ لوگ جو بڑے بنے ہوئے تھے، انھوں نے کہا بے شک ہم جس پر تم ایمان لائے ہو، اس کے منکر ہیں ﴿۷۶﴾ تو انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکش ہوگئے اور انھوں نے کہا اے صالح! لے آ ہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو رسولوں سے ہے ﴿۷۷﴾ تو انھیں زلزلے نے پکڑ لیا تو انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے گھر میں گرے پڑے تھے ﴿۷۸﴾

کے صحیح ہونے پر بھی یقین ہے۔

آیت 77 ① **فَعَقَرُوا النَّاقَةَ** …… : اگرچہ اونٹنی کو ایک ہی شخص نے کاٹا تھا مگر چونکہ ان سب نے اسے مقرر کیا تھا اور وہ سب اس کی پشت پناہی کر رہے تھے، اس لیے سب ہی مجرم ٹھہرے اور سبھی پر عذاب آیا۔ سورۂ قمر میں ہے: ﴿ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴾ [القمر : ۲۹] ”تو انھوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، سو اس نے (اسے) پکڑا، پس (اس کی) کونچیں کاٹ دیں۔“ علمائے تفسیر نے اس اشقیٰ ”سب سے بڑے بدبخت“ (شمس: ۱۲) کا نام قُدار بن سالف لکھا ہے۔ (واللہ اعلم)

② **وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ** …… : یعنی تو کہتا تھا کہ دیکھنا اس اونٹنی کو کسی برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگا بیٹھنا، ورنہ اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ اب اگر واقعی رسول ہو تو وہ عذاب لے آؤ۔

آیت 78 ① **فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ** …… : سورۂ ہود (۶۵، ۶۶) میں ہے کہ صالح علیہ السلام نے جب دیکھا کہ انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا ہے تو انھیں تین دن کی مہلت دی، جب یہ مہلت پوری ہوگئی تو ان پر عذاب نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام اور آپ کے اہل ایمان ساتھیوں کو بچا لیا، ان کے سوا ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ تفاسیر و احادیث میں ہے کہ ان میں سے صرف ایک شخص ابو رغال ان دنوں حرم میں مقیم تھا، وہ عذاب سے محفوظ رہا، لیکن جب وہ حرم چھوڑ کر طائف کی طرف روانہ ہوا تو وہ بھی ہلاک ہوگیا اور راستے میں دفن کر دیا گیا۔ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا کہ راستے سے گزرنے والے اس کی قبر پر سنگ باری کرتے تھے۔ [ابن حبان : ٤٦٣] جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے آسمان کے نیچے ان سب کو ہلاک کر دیا، صرف ایک شخص بچا جو حرم میں تھا۔“ پوچھا گیا: ”وہ کون تھا؟“ تو آپ نے فرمایا: ”وہ ابو رغال تھا، لیکن جیسے ہی وہ حرم سے نکلا عذاب نے اسے بھی پکڑ لیا۔“ [مستدرك حاكم : ۲/ ۳۲۰، ح : ۳۲٤۸۔ أحمد : ۳/ ۲۹٦، ح : ۱٤۱٦۰] شعیب ارنؤوط اور اس کے ساتھیوں نے اس حدیث کو قوی کہا ہے۔

فَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَ قَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّیۡ وَ نَصَحۡتُ لَكُمۡ وَ لٰكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿۷۹﴾ وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۸۰﴾

تو وہ ان سے واپس لوٹا اور اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ یقیناً میں نے تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی اور لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے ﴿۷۹﴾ اور لوط کو (بھیجا)، جب اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اس بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے نہیں کی ﴿۸۰﴾

یہاں "الرَّجْفَةُ" (زلزلے) کا ذکر ہے، سورۂ ہود (۶۷) میں "الصَّيْحَةُ" (چیخ) کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم پر دو طرح کا عذاب آیا، اوپر سے صیحہ (چیخ) اور نیچے سے زلزلہ، یا وہ خوف ناک آواز یعنی چیخ زلزلے ہی کی تھی، جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ زلزلے کے ساتھ خوف ناک آواز بھی ہوتی ہے۔

② "جٰثِمِيْنَ" یہ "جُثُوْمٌ" سے اسم فاعل ہے، یہ انسان اور پرندوں کے لیے انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں اونٹوں کے لیے "بُرُوْكٌ" ہوتا ہے، یعنی سینے کے بل گرنے والے یا اپنی جگہ سے نہ ہل سکنے والے۔ یعنی وہ اپنے گھٹنوں پر منہ کے بل گرے ہوئے تھے، ان میں کوئی حرکت باقی نہ رہی۔ (طنطاوی)

آیت 79 فَتَوَلّٰی عَنۡهُمۡ وَ قَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ : یہ اسی قسم کا خطاب تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے مشرک مقتولین سے کیا تھا۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۴۳) کی تفسیر۔ دوسرے تمام انبیاء کے ذکر میں "رِسٰلٰتِ رَبِّیْ" جمع کا لفظ ہے اور یہاں "رِسَالَةَ رَبِّیْ" واحد ہے۔ بقاعی نے فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک ہی معجزہ تھا، یعنی اونٹنی۔ (نظم الدرر) (واللہ اعلم)

آیت 80 ① وَ لُوۡطًا : ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے بحفاظت نکل آئے تو لوط علیہ السلام ان پر ایمان لے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اتنا بڑا معجزہ دیکھنے کے باوجود قوم کے ایمان نہ لانے پر عراق سے ہجرت اختیار فرمائی۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۲۶) ان کے ساتھ ان کی بیوی سارہ اور لوط علیہما السلام بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو سدوم والوں کی طرف مبعوث فرمایا، جو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا اور نہایت آباد اور زرخیز تھا۔

② اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ : اہل سدوم کو لوط علیہ السلام کی قوم اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ ان کی طرف مبعوث تھے، ورنہ وہ تو عراق سے آئے تھے، یا شاید ان کا ان سے سسرالی رشتہ ہوگا، کیونکہ اگر وہاں ان کا کوئی نسبی رشتہ ہوتا تو وہ اس بے چارگی کا اظہار نہ فرماتے جس کا ذکر سورۂ ہود (۸۰) میں ہے۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ مَا كَانَ
جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

بے شک تم تو عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو، بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو ﴿۸۱﴾ اور
اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا انھیں اپنی بستی سے نکال دو، بے شک یہ ایسے لوگ ہیں جو
بہت پاک بنتے ہیں ﴿۸۲﴾

آیت 81 ① **اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ:** چھوٹے یا بے ریش لڑکوں کے بجائے مردوں کا لفظ ان کے فعل کی قباحت کے مزید اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ فعل بد تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں ہے: ﴿ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ یعنی تم دوہرے مجرم ہو، ایک اس فعل بد کی وجہ سے، دوسرے اس فعل بد کا آغاز کرنے کی وجہ سے۔ اب قیامت تک اس جرم کے ہر مرتکب کا گناہ اس کے ساتھ ساتھ قوم لوط کی گردن پر بھی ہوتا ہے۔

② **شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ:** یہ تیسرا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری خواہش نفس پوری کرنے کے لیے جو بیویاں بنائی ہیں انھیں چھوڑ کر مردوں سے خواہش نفس پوری کرتے ہو، یہ تمھاری فطرت مسخ ہونے کی دلیل ہے، پھر بیویوں سے حاجت پوری کرنے میں خواہش نفس پوری کرنے کے ساتھ بہت سی حکمتیں وابستہ ہیں، اولاد کی طلب، گھر کی رونق، دلی سکون، میاں بیوی کی باہمی دوستی کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم اور شفقت۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۱)۔ جبکہ تمھارا مردوں کے پاس جانا صرف خواہش نفس پوری کرنے کے لیے ہے جو نہایت کمینگی کی بات ہے۔

③ **مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ:** سورۂ شعراء میں فرمایا: ﴿ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴾ [الشعراء : ۱٦٦] ''اور انھیں چھوڑ دیتے ہو جو تمھارے رب نے تمھارے لیے تمھاری بیویاں پیدا کی ہیں، بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔'' یعنی تم نے اس خبیث فعل کی وجہ سے بیویوں کو چھوڑ رکھا ہے، تم اپنے آپ پر بھی زیادتی کر رہے ہو اور ان مردوں پر بھی جن سے یہ فعل کرتے ہو اور ان عورتوں پر بھی جو تمھاری بیویاں ہیں۔ ذرا غور کرو کہ اس عمل کا نتیجہ تمھاری بیویوں پر کیا مرتب ہو گا؟ ان کی کچھ اور زیادتیوں کا ذکر سورۂ عنکبوت (۲۹) میں بھی کیا گیا ہے۔ اس وقت امریکہ اور یورپ کی اقوام نے ہم جنس پرستی کو جائز قرار دے کر مرد کی مرد اور عورت کی عورت کے ساتھ شادی کو قانونی تحفظ دے رکھا ہے، اب ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلم معاشرے میں بھی اس فعل کو جرم نہ سمجھا جائے اور اس کے لیے وہ اپنے تمام وسائل استعمال کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حق پر قائم رہنے کی اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے کفار کی اللہ تعالیٰ سے علانیہ بغاوت کو کچلنے کی توفیق عطا فرمائے، کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کا قانون آسمانی عذاب کے بجائے مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دینا ہے، فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ﴾ [التوبة : ۱٤] ''ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔''

آیت 82 **اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ:** یعنی ان پاک باز لوگوں کا ہم گناہ گار و ناپاک لوگوں میں کیا کام؟ یہ بات انھوں

فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖۗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ

تو ہم نے اسے اور اس کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی، وہ پیچھے رہنے والوں میں سے تھی ﴿۸۳﴾ اور ہم نے ان پر بارش برسائی، ایک زبردست بارش۔ پس دیکھ مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۸۴﴾ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں،

نے طنز اور تمسخر سے کہی اور ان کا جرم کیا بتایا کہ وہ گندگی میں آلودہ ہونے کا جرم کیوں نہیں کرتے، انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔ "یَتَطَهَّرُوْنَ" باب تفعل سے ہے جس کا ایک معنی تکلف بھی ہے، اس صورت میں ان کا کہنا طنز کے ساتھ بہتان بھی ہے کہ یہ لوگ پاک باز بنتے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ پاک باز نہیں ہیں۔

آیت 83 ① فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ: یعنی ہم نے لوط علیہ السلام اور اس کے گھر والوں کو عذاب سے بچا لیا، کیونکہ اس بستی میں یہی ایک گھر مسلم تھا۔ دیکھیے سورۂ ذاریات (۳۶)۔

② اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖۗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ ہم نے تمھاری بیوی کی خیانت و کفر کی وجہ سے اس کا پیچھے رہنا طے کر دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نمل (۵۷) اور سورۂ تحریم (۱۰) چنانچہ وہ ان لوگوں میں رہ گئی جو لوط علیہ السلام کے ساتھ نہیں نکلے، بلکہ اپنے علاقے ہی میں رہے، ان پر عذاب نازل ہوا تو وہ بھی ان کے ساتھ تباہ ہو گئی۔

آیت 84 وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ......: "مَطَرًا" یہ "اَمْطَرْنَا" کی تاکید ہے اور تنوین اس کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے، یعنی ایک زبردست بارش۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بستی الٹ دی، اس لیے قرآن میں اس بستی اور اس کے ارد گرد کی بستیوں کو "الْمُؤْتَفِكَةَ" (نجم: ۵۳) یعنی الٹنے والی اور "الْمُؤْتَفِكٰتِ" (توبہ: ۷۰) کہا گیا ہے، پھر ان پر کھنگر والے تہ در تہ پتھروں کی بارش برسائی۔ (دیکھیے ہود: ۸۲) اور وہ علاقہ ایسا تباہ ہوا کہ اب تک آباد نہیں ہو سکا۔ ان پر عذاب کا باعث ان کے فعل بد اور اس پر اصرار کے ساتھ ساتھ پیغمبر کے ساتھ کفر اور استہزا تھا۔

آیت 85 ① وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا: مدین کا علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا اور آج بھی اس علاقے میں ایک جگہ اسی نام سے مشہور ہے۔ شعیب علیہ السلام کا نسب نامہ امام نووی رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے، شعیب بن میکائیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم۔ (المنار) مگر اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ شعیب علیہ السلام کو اہل مدین کا بھائی قرار دیا، کیونکہ وہ اس قوم سے تھے اور ان کا قبیلہ بہت زبردست تھا جس کی وجہ سے ان کے کفار آپ کو نقصان پہنچانے سے ڈرتے تھے، اس لیے انھوں نے کہا تھا: ﴿وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ﴾ [ھود : ۹۱] "اور اگر تیری برادری نہ ہوتی تو ہم ضرور تمھیں سنگسار کر دیتے۔" شعیب علیہ السلام ہی کو اصحاب الایکہ کی طرف بھیجا گیا، مگر وہاں انھیں ان کا بھائی نہیں کہا گیا، فرمایا: ﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۚۖ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ﴾ [الشعراء : ۱۷۶، ۱۷۷]

اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آ چکی۔ پس ماپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو ﴿۸۵﴾

''ایکہ والوں نے رسولوں کو جھٹلایا، جب ان سے شعیب نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟'' اب بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی قوم کے نام ہیں اور ان پر دو قسم کے عذاب آئے، ایک ''عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ'' (شعراء: ۱۸۹) اور ایک ''الرَّجْفَةُ'' (اعراف: ۹۱) اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ دو الگ الگ قومیں تھیں، اصحاب مدین پر ''الرَّجْفَةُ'' (زلزلے) کا عذاب آیا اور اصحاب ایکہ پر ''يَوْمِ الظُّلَّةِ'' کا عذاب آیا۔ (واللہ اعلم)

② قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ...... : مدین والوں کا سب سے بڑا جرم اللہ کے ساتھ شرک تھا، شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے انھیں اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی اور ہر پیغمبر کی پہلی دعوت یہی تھی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الأنبياء: ۲۵] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔''

③ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ : یعنی میرے سچا ہونے کی واضح دلیل تم دیکھ چکے ہو، لہٰذا ضروری ہے کہ جو بات میں کہتا ہوں اسے صحیح سمجھو۔ رازی نے فرمایا کہ یہاں ''بَيِّنَةٌ'' (واضح دلیل) سے مراد معجزہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کو کوئی نہ کوئی ایسا معجزہ دے کر بھیجا گیا جسے دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے اور مجھے جو (معجزہ) دیا گیا وہ وحی (قرآن و سنت) ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف فرمائی اور مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے۔'' [بخاری، فضائل القرآن، باب كيف نزل الوحي و أول ما أنزل: ۴۹۸۱۔ مسلم: ۱۵۲، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

مگر شعیب علیہ السلام کے معجزے کا قرآن کریم میں ذکر نہیں۔ زمخشری لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جو عصا یعنی لاٹھی تھی وہ شعیب علیہ السلام ہی نے انھیں عطا فرمائی تھی اور وہ دراصل شعیب علیہ السلام ہی کا معجزہ تھا۔ (کشاف) مگر موسیٰ علیہ السلام مدین کے جس بزرگ کے پاس ٹھہرے اور ان کے داماد بنے تھے، ان کے شعیب علیہ السلام ہونے کی کوئی دلیل نہیں، نہ ہی مدین کے کسی بزرگ کا ذکر کرنے پر بلا دلیل یہ سمجھ لینا درست ہے کہ وہ لازماً اللہ کے رسول شعیب علیہ السلام ہی تھے۔ قرآن مجید میں نہ ہر پیغمبر کا نام مذکور ہے نہ ہر نبی کا معجزہ۔ اتنا ہی کافی ہے کہ یقیناً شعیب علیہ السلام کوئی معجزہ لے کر آئے تھے، زیادہ کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔

④ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ اس قوم میں شرک کے ساتھ دوسری خرابی ماپ تول میں لیتے وقت زیادتی اور دیتے وقت کمی تھی، اگر کوئی ان کی اس زیادتی کے خلاف احتجاج کرتا تو مل کر اس کی بے عزتی کرتے اور اسے مارتے پیٹتے، جیسا کہ آج کل بھی عموماً ریڑھیوں والے ایسے موقع پر گاہک کے خلاف ایکا کر لیتے ہیں، اس لیے شعیب علیہ السلام نے انھیں سمجھایا

وَ لَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہر راستے پر نہ بیٹھو کہ دھمکاتے ہو اور اللہ کے راستے سے روکتے ہو ہر اس شخص کو جو اس پر ایمان لائے اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہو۔ اور یاد کرو جب تم بہت کم تھے تو اس نے تمھیں زیادہ کر دیا اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ ﴿۸۶﴾ اور اگر تم میں سے کچھ لوگ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے اور کچھ لوگ ایمان نہیں لائے تو صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۸۷﴾

کہ ماپ تول ہر حال میں پورا کرو اور انبیاء اور صالحین کی محنت سے دنیا میں جو اصلاح ہوئی ہے اس کے بعد شرک اور بددیانتی اور ان کے ساتھ پیدا ہونے والی برائیوں کے ذریعے سے اس میں فساد مت پھیلاؤ، کیونکہ ان دونوں سے اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں اور لوگوں کے بھی۔

5 اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: یعنی اگر تم مجھ پر ایمان لا کر شرک اور بددیانتی ترک کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، کیونکہ کافر رہتے ہوئے یہ چیزیں چھوڑ بھی دو تو قیامت کے دن اس کا کچھ فائدہ نہیں

آیت 86 وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ...... : یہ لوگ راستوں پر ناکے لگا کر لوگوں سے زبردستی ٹیکس وصول کرتے، کبھی ڈرا دھمکا کر ان کی بے عزتی کرتے اور ان کا سب کچھ ہی چھین لیتے۔ اگر کوئی شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے کی طرف مائل نظر آتا تو اسے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کرتے اور اسلام کے احکام میں طرح طرح کی خرابیاں نکال کر اور شبہات پیدا کر کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ سیدھا نہیں بلکہ غلط راستہ ہے، جیسا کہ آج کل بھی نام کے وہ مسلمان دانش ور، صحافی، پروفیسر اور حکمران جو کفار سے مرعوب ہیں اسلام کے احکام کو وحشیانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ شعیب علیہ السلام نے انھیں ان برائیوں سے روکا اور اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلایا کہ اس نے تمھاری تھوڑی سی نسل کو کس قدر بڑھایا اور انھیں مفسدین کے انجامِ بد سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین فرمائی۔

آیت 87 فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ: یہ انھیں کفر پر صبر کا حکم نہیں بلکہ انھیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴾ [التوبة : ۵۲] ”سو انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) تمھارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔“

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ۚ۟ ﴿۸۸﴾

اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جو بڑے بنے ہوئے تھے، اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ہمراہ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور ہی نکال دیں گے، یا ہر صورت تم ہمارے دین میں واپس آ ؤ گے۔ اس نے کہا اور کیا اگرچہ ہم ناپسند کرنے والے ہوں؟ ﴿۸۸﴾

آیت 88 ① قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ : "اسْتَكْبَرُوْا" باب استفعال سے ہے، جس کا معنی عموماً طلب ہوتا ہے، یعنی وہ سردار بڑا بننے کے بہت خواہش مند تھے، گویا ان کی طلب ہی یہ تھی۔

② لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ : یعنی انھوں نے صرف جھٹلانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ نہایت بدتمیزی سے نام کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمھیں ہر صورت دو باتوں میں سے ایک اختیار کرنا ہوگی، یا ہم تمھیں اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا تمھیں پھر سے ہماری ملت، یعنی کفر و شرک میں پلٹنا ہوگا۔ اب تم سوچ لو کہ اپنے لیے ان میں سے کون سی بات پسند کرتے ہو؟

③ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ : "مَعَكَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس کا تعلق "اٰمَنُوْا" سے ہو، یعنی جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، دوسرا یہ کہ اس کا تعلق "لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ" کے ساتھ ہو، یعنی تجھے اور تیرے ساتھ ان لوگوں کو بھی نکال دیں گے جو ایمان لائے ہیں۔ ہمارے استاذ محمد عبدہ رحمہ اللہ نے اس کا تعلق "لَنُخْرِجَنَّكَ" کے ساتھ قرار دیا ہے۔

④ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا : "عَادَ يَعُوْدُ عَوْدًا" کے معنی کسی چیز کی طرف لوٹ آنے کے ہیں۔ شعیب علیہ السلام خود تو کبھی کفر و شرک میں مبتلا نہیں رہے، پھر ان کے دین میں لوٹ آنے کے کیا معنی ہوں گے؟ اگلی آیت میں شعیب علیہ السلام کے قول "اِنْ عُدْنَا" (اگر ہم تمھاری ملت میں پھر آجائیں) اور "اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ" سے یہ اشکال اور قوی ہو جاتا ہے۔ علماء نے اس کے مختلف جواب دیے ہیں، ایک یہ کہ نبوت سے پہلے شعیب علیہ السلام اگرچہ کفر و شرک سے اور نبوت کے منصب کے منافی ناپسندیدہ کاموں سے محفوظ تھے، مگر نبوت عطا ہونے سے پہلے عام طور طریقے میں اپنی قوم ہی کے ساتھ تھے۔ البتہ کفر، شرک اور گندے کاموں سے اجتناب کے باوجود مبعوث نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہتے تھے۔ جس سے ان کی قوم کے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ہمارے ہی دین پر ہیں۔ اس لیے انھوں نے "اَوْ لَتَعُوْدُنَّ" کہہ دیا، ورنہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ یا ان کا مطلب یہ تھا کہ پہلے کی طرح اب بھی خاموش ہو جاؤ، تو ہم تمھیں اپنا ہی سمجھ لیں گے۔ فرمایا، اب ہم پہلے کی طرح نہیں ہو سکتے۔ دوسرا یہ کہ ان کے اکثر ساتھی چونکہ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے ان سب کے ساتھ شعیب علیہ السلام کو بھی شامل کر دیا۔ اسے تغلیب کہتے ہیں، یعنی سب پر وہی الفاظ بول دیے جو اکثر پر صادق آتے تھے۔ شعیب علیہ السلام نے بھی انھی کے لہجہ میں "اِنْ عُدْنَا" اور "اَنْ نَّعُوْدَ" فرما دیا۔ تیسرا یہ کہ "عَادَ يَعُوْدُ" بعض اوقات "صَارَ يَصِيْرُ" کے معنی میں بھی آتا ہے، اسے "صَيْرُوْرَةٌ" کہتے ہیں، یعنی ابتداءً (پہلی بار) کسی چیز کو اختیار کرنا، معنی یہ کہ تم ہمارا دین اختیار کر لو گے۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

یقیناً ہم نے اللہ پر جھوٹ باندھا اگر ہم تمھاری ملت میں پھر آ جائیں، اس کے بعد کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دی اور ہمارے لیے ممکن نہیں کہ اس میں پھر آ جائیں مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو ہمارا رب ہے، ہمارے رب نے ہر چیز کا علم سے احاطہ کر رکھا ہے، ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا، اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور تو سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ﴿۸۹﴾

⑤ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ: یعنی اگر ہمیں دونوں باتیں ہی گوارا نہ ہوں تو کیا پھر بھی ہم ایک ضرور اختیار کریں گے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ سوال درحقیقت انکار کے لیے ہے۔

آیت 89 ① قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ...... : یہ ایک دوسرے طریقے سے جواب ہے، شعیب علیہ السلام عرب تھے اور عربوں میں شروع ہی سے جھوٹ سے شدید نفرت رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وہ نبی جو تمام دنیا کی طرف اور قیامت تک کے لیے تھا عربوں میں مبعوث کرنا اس لیے طے فرمایا کہ عرب اپنی تمام برائیوں کے باوجود کچھ اوصاف حمیدہ رکھتے تھے، دوسری قومیں ان کی طرح نہیں تھیں، ان میں سے ایک وصف سچ سے محبت اور جھوٹ سے نفرت تھی۔ اسی لیے ابوسفیان نے ہرقل کے دربار میں جھوٹ نہیں بولا کہ مکہ میں جا کر کوئی یہ نہ کہے کہ سردار نے جھوٹ بولا۔ اس لیے شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب ہمیں تمھارے دین سے بچا کر توحید کا اعلان کرنے کی توفیق بخشی تو اب ہم پھر تمھارا دین اختیار کریں تو مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جھوٹ باندھا تھا اور وہ بھی اللہ تعالیٰ پر! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

② وَمَا يَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَاۤ ......: یعنی ہمارے لیے تمھارے دین کو اختیار کرنا ممکن ہی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، اس لیے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ اب ہم جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ دوبارہ تمھارا دین اختیار نہیں کریں گے، وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کی بنا پر کر رہے ہیں، کیونکہ ارادہ خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو اس کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت پر موقوف ہے۔ اس استثنا سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ شعیب علیہ السلام کو اپنے خاتمہ بالخیر میں شک تھا، بلکہ انھوں نے یہ بات صرف اپنی عاجزی کے اظہار اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرنے کے لیے کہی ہے اور اس میں دوسرے مومنوں کو بھی شامل رکھا ہے۔ واحدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور امت کے اکابر ہمیشہ ہی برے انجام سے پناہ مانگتے رہے۔ خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴾ [إبراھیم : ۳۵] ''اور مجھے اور میرے بیٹوں کو بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ تھی: ((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰی دِيْنِكَ))

وَ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۝۹۰ فَاَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۝۹۱ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۛ
اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ۝۹۲

اور اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے کہا جنھوں نے کفر کیا بے شک اگر تم شعیب کے پیچھے چلے تو بے شک تم اس وقت ضرور خسارہ اٹھانے والے ہو۝۹۰ تو انھیں زلزلے نے پکڑ لیا، تو انھوں نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے گھر میں گرے پڑے تھے۝۹۱ وہ لوگ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا گویا وہ اس میں بسے ہی نہ تھے، وہ لوگ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی خسارہ اٹھانے والے تھے۝۹۲

''اے دلوں کو پھیرنے والے ! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔'' [ترمذی، الدعوات، باب یا مقلب القلوب ...... : ۳۵۲۲، عن أم سلمۃ رضی اللہ عنہا و صححہ الألبانی] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ بطورِ فرض ہو، یعنی تمھارے جبر و اکراہ سے تو ہم کفر اختیار نہیں کر سکتے، ہاں! (بالفرض) اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی یہ ہو تو دوسری بات ہے۔

③ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا : یعنی ہم ایمان پر استقامت کے لیے اپنی قوت پر نہیں بلکہ صرف اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔ ''عَلَى اللّٰهِ'' کو پہلے لانے سے حصر کا معنی پیدا ہو گیا۔

④ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا ...... : ''فَتْح'' کا معنی واضح فیصلہ ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو اپنے ماننے والوں ہی کے حق میں ہوگا، یعنی انکار اور ضد پر اڑے ہوئے ان مشرکین کے مقابلے میں ہماری مدد فرما کر ہمارے حق پر ہونے اور ان کے باطل پر ہونے کو خوب واضح کر دے۔

آیت 90 اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ : یعنی شعیب علیہ السلام کی پیروی کی صورت میں تم یقیناً خسارہ اٹھاؤ گے کہ اپنے آبائی دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے اور جن ناجائز ذرائع سے دولت کما رہے ہو ان کو بھی ترک کرنا پڑے گا۔ یہ بات شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں تک محدود نہیں بلکہ ہر زمانے میں دنیا پرستوں نے اخلاق و دیانت کے اصولوں کی پابندی سے یہی خطرہ محسوس کیا ہے اور ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ تجارت اور دیگر بنیادی معاملات بددیانتی، دغا بازی اور سود خوری کے بغیر نہیں چل سکتے اور سمجھتے رہے ہیں کہ سچی اور صاف بات کہنے سے کاروبار تباہ ہو جاتے ہیں۔

آیت 91 فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ ...... : ان پر عذاب دونوں طرح سے آیا، یعنی ''الرَّجْفَةُ'' (زلزلہ) بھی، جیسے یہاں مذکور ہے اور ''الصَّيْحَةُ'' (چیخ) بھی، جیسا کہ سورۂ ہود (۹۴) میں ہے۔ ''جٰثِمِيْنَ'' کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۷۸) کے حواشی۔

آیت 92 كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا : ''غَنِيَ يَغْنَى (س)'' کا معنی ہے کسی جگہ رہنا، یعنی وہ جو شعیب علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بستی سے نکالنے کے درپے تھے وہ خود اس طرح ہو گئے جیسے وہ کبھی اس میں رہے ہی نہیں تھے اور انھیں خسارے سے ڈرانے والے خود ہی خسارا اٹھانے والے ہو گئے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

پھر وہ ان سے واپس لوٹا اور اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ یقیناً میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی، تو میں نہ ماننے والے لوگوں پر کیسے غم کروں ﴿۹۳﴾ اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس کے رہنے والوں کو تنگی اور تکلیف کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ گڑ گڑائیں ﴿۹۴﴾ پھر ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوشحالی بدل کر دے دی، یہاں تک کہ وہ خوب بڑھ گئے اور انھوں نے کہا یہ تکلیف اور خوشی تو ہمارے باپ دادا کو (بھی) پہنچی تھی۔ تو ہم نے انھیں اچانک اس حال میں پکڑ لیا کہ وہ سوچتے نہ تھے ﴿۹۵﴾

آیت 93 فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ: یعنی بے شک تم میرے عزیز تھے، مگر جب تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا تو کافروں کی ہلاکت پر میں کیسے غم کروں۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۷۹) کے حواشی۔

آیت 94 ① وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ ......: اس سے پہلے بعض انبیاء، نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کے اپنی اقوام کے ساتھ گزرے ہوئے چند واقعات کے ذکر کے بعد اور آگے موسیٰ علیہ السلام کے فرعون اور بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والے مفصل واقعات سے پہلے درمیان میں مختصر طور پر تمام انبیاء اور ان کی اقوام کا ذکر فرمایا۔ مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور کفار کو خبردار کرنا ہے۔

② بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ: "بِالْبَاْسَآءِ" سے مراد اموال میں پہنچنے والی مصیبت، مثلاً فقر و فاقہ اور قحط وغیرہ اور "الضَّرَّآءِ" سے مراد انسانی بدن کو نقصان پہنچانے والی اشیاء، مثلاً بیماری، مصائب اور جنگ وغیرہ۔

③ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ: یعنی جب بھی ہم نے کسی بستی کی طرف کوئی نبی بھیجا اور وہ اس پر ایمان نہ لائے تو ہم نے ان کی نصیحت کے لیے بڑے عذاب سے پہلے کم تر عذاب بھیجے جو جنگ، تنگ دستی، قحط یا بیماری اور دوسرے مصائب کی صورت میں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی شامت اعمال سے آگاہ ہو کر ہمارے سامنے عجز کا اظہار کریں اور سیدھی راہ پر آجائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [السجدة: ۲۱] "اور یقیناً ہم انھیں قریب عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔"

آیت 95 ① ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ ......: "عَفَوْا" یہ "عَفَا يَعْفُوْ" سے ماضی معلوم جمع مذکر غائب ہے، معنی ہے "بڑھ گئے۔" باب افعال کا معنی "بڑھانا" ہے، جیسا کہ فرمایا: ((أَعْفُوا اللِّحٰى)) [بخاری، اللباس، باب إعفاء اللحی :

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

اور اگر واقعی بستیوں والے ایمان لے آتے اور بچ کر چلتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے بہت سی برکتیں کھول دیتے اور لیکن انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے انھیں اس کی وجہ سے پکڑ لیا جو وہ کمایا کرتے تھے ﴿۹۶﴾

۵۸۹۳] ''ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ۔'' مگر جب انھوں نے ایسا نہ کیا تو ہم نے بدحالی کی جگہ انھیں خوش حالی دے کر واپس پلٹنے کا موقع دیا، انھیں قحط کے بجائے ارزانی اور بیماری کے بجائے تندرستی عطا فرمائی، آبادی ان کی خوب بڑھ گئی اور مال و دولت کی ریل پیل ہو گئی، تو ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے رب کے رسول پر ایمان لے آنے کے بجائے پہلی سختی کو بھول گئے اور ان نعمتوں کی بھی قدر نہ کی اور کہنے لگے، اگر ہم قحط اور دوسری مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو محض زمانے کی گردش کی وجہ سے ہوئے ہیں نہ کہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے۔ دنیا میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے، موسم کے تغیر سے حالات بدلتے رہتے ہیں، کبھی بیماری اور کبھی تندرستی، کبھی خوش حالی اور کبھی بدحالی وغیرہ۔ یہ حالات ہمیں کو نہیں بلکہ ہمارے باپ دادا کو بھی پیش آتے رہے ہیں، مگر جلد ہی ٹلتے بھی رہے ہیں، اس قسم کے حالات پیش آنے میں انسانوں کے اعمال کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایسی توجیہات اب بعض مسلمان بھی کرنے لگے ہیں۔

② فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: یعنی جب اللہ تعالیٰ کو اس طرح فراموش کر بیٹھے تو یکا یک اللہ کا غضب نازل ہوا اور ایسا عذاب آیا کہ آن کی آن میں سب نیست و نابود ہو گئے۔ ان قوموں کے بعد فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آ رہا ہے، فرعون کی قوم پر تنگی اور تکلیف کی گرفت متعدد بار آئی، مثلاً طوفان، جراد اور قمل وغیرہ، مگر انھوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو پہلی قوموں کی طرح اچانک عذاب آیا اور سمندر میں غرق کر دیے گئے۔ اس کے برعکس مومنین خوش حالی میں شکر اور تنگ دستی میں صبر کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ بھی خوب ہے، کیونکہ اس کا سارا معاملہ بہترین ہے اور یہ چیز مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے تو وہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔'' [مسلم، الزھد، باب المؤمن أمرہ کلہ خیر: ۲۹۹۹] اس آیت کی تشریح میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بندے کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی ہے تو امید ہے توبہ کرے اور جب گناہ راست (موافق) آ گیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا بھلاوا ہے، پھر ڈر ہے ہلاک (ہونے) کا، جیسے زہر کھایا، اگل دے تو امید ہے اور اگر پچ گیا (ہضم ہو گیا) تو کام آخر ہوا۔'' (موضح)

آیت 96 ① وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا ...... : اگر واقعی بستیوں والے ایمان لاتے اور اللہ کی حدود کی پابندی کرتے تو اس ایمان اور تقویٰ کا نتیجہ ان انعامات کی شکل میں پاتے کہ ......! اور ایمان اور تقویٰ اختیار نہ کرنے کا نتیجہ عذاب الٰہی کی صورت میں نکلتا ہے کہ وہ برکات سے محروم ہو کر عذاب سے دو چار ہوتے ہیں۔

اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا بَيَاتًا وَّ هُمۡ نَآٮِٕمُوۡنَؕ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ بَاۡسُنَا ضُحًى وَّهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوۡا مَكۡرَ اللّٰهِ‌ۚ فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۹۹﴾ اَوَلَمۡ يَهۡدِ لِلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَاۤ اَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ اَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ‌ۚ وَنَطۡبَعُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

تو کیا بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر راتوں رات آجائے اور وہ سوئے ہوئے ہوں ﴿۹۷﴾ اور کیا بستیوں والے بے خوف ہو گئے کہ ہمارا عذاب ان پر دن چڑھے آجائے اور وہ کھیل رہے ہوں ﴿۹۸﴾ پھر کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں، تو اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۹۹﴾ اور کیا اس بات نے ان لوگوں کی رہنمائی نہیں کی جو زمین کے وارث اس کے رہنے والوں کے بعد بنتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں تو وہ نہیں سنتے ﴿۱۰۰﴾

② لَفَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ بَرَكٰتٍ: "بَرَكٰتٍ" "بَرَكَةٌ" کی جمع ہے، کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر ہونا۔ اصل میں "بَرَكَةٌ" حوض کو کہتے ہیں، جس طرح حوض میں پانی جمع ہوتا ہے، اسی طرح کسی چیز میں بہت سی خیر موجود ہونا "بَرَكَةٌ" کہلاتا ہے۔ راغب نے فرمایا: ''چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر اس طرح آتی ہے کہ آتے ہوئے نہ اس کا احساس ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی شمار ہوتا ہے، اس لیے اگر کسی شخص یا چیز میں محسوس نہ ہونے والی بہتری کا مشاہدہ ہو رہا ہو تو کہتے ہیں کہ وہ مبارک ہے اور اس میں برکت ہے۔'' (طنطاوی)

''برکتیں کھول دیتے'' یہ استعارہ ہے کہ جس طرح دروازہ کھل جاتا ہے اس طرح ان پر برکات کا نزول ہوتا، یعنی آسمان سے بارش اور رحمتوں کی صورت میں اور زمین سے پانی زرعی اجناس (غلے اور پھل) اور زمین سے نکلنے والی بے شمار نعمتوں، مثلاً پٹرول، گیس، سونا، چاندی اور جواہرات وغیرہ کی صورت میں۔

آیت 98،97 اَفَاَمِنَ اَهۡلُ الۡقُرٰۤى ...... : یعنی اللہ کا عذاب ان کے بے خبر سونے کی حالت میں بھی آسکتا ہے اور عین دوپہر جاگتے ہوئے مصروفیت کی صورت میں بھی آسکتا ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ دن ہو تو اس کا مقابلہ کر لیں گے۔ (بقاعی)

آیت 99 فَلَا يَاۡمَنُ مَكۡرَ اللّٰهِ......: اللہ تعالیٰ کے مکر (خفیہ تدبیر) سے مراد کسی شخص کے خلاف ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے کہ جب تک وہ عین اس کے سر پر نہ پہنچ جائے اسے کوئی ہوش نہ آئے اور نہ کچھ پتا ہی چلے کہ اس کی شامت آنے والی ہے، یہ خفیہ تدبیر چونکہ کافروں کے مکر و فریب کے جواب میں ہوتی ہے یا اس کی سزا دینے کے لیے کی جاتی ہے، اس لیے اسے بھی بطور مجانست ''مکر'' کہہ دیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۵)۔

آیت 100 ① اَوَلَمۡ يَهۡدِ لِلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ......: یعنی کیا بعد میں آنے والوں کو پہلوں کے حالات سن اور

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

یہ بستیاں ہیں، ہم تجھ سے ان کے کچھ حالات بیان کر رہے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے، تو وہ ایسے نہ تھے کہ اس چیز کو مان لیتے جسے وہ اس سے پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے ﴿۱۰۱﴾

دیکھ کر یہ بات واضح طور پر معلوم نہیں ہوئی اور انھیں اس سے رہنمائی حاصل نہیں ہوئی کہ ہم چاہیں تو ان کی طرح ان کو بھی ان کے گناہوں میں پکڑ لیں۔

② **وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ:** یعنی ہم ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں تو وہ نصیحت کی کوئی بات نہیں سنتے، آخر کار اللہ کا عذاب آتا ہے اور وہ بھی تباہ کر دیے جاتے ہیں۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس فقرے کا یہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا جب اسے " **اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ** " پر معطوف نہ مانا جائے (بلکہ نیا کلام مانا جائے) اور اگر اسے " **اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ** " پر معطوف مانا جائے (اور ہمارے خیال میں زیادہ صحیح یہی ہے) تو ترجمہ یوں ہوگا: ''اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیں کہ پھر وہ نصیحت کی کوئی بات نہ سن سکیں۔'' مگر ابن عاشور صاحب ''التحریر والتنویر'' اور محیی الدین الدرویش صاحب ''اعراب القرآن'' نے اس معنی کی تردید کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس کا عطف '**بِذُنُوْبِهِمْ**' پر مانا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے دل پر مہر کر دیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک مہر نہیں لگائی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، اس لیے '' **وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ** '' نیا کلام ہے، اس کا عطف '**بِذُنُوْبِهِمْ**' پر درست نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنی زمین کے کسی حصے میں آباد فرماتا ہے انھیں ہر آن اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور یہ جانتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی چاہیے کہ اگر ظلم و فساد کا ارتکاب کریں گے تو اللہ تعالیٰ انھیں بھی اسی طرح تباہ کر دے گا جس طرح اس نے پہلی امتوں کو تباہ کر دیا۔ پہلی امتوں پر جو تباہی آئی وہ ناگہانی حادثہ نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ سزا تھی۔

آیت 101 ① **تِلْكَ الْقُرٰى......** : یہاں "**الْقُرٰى**" سے مراد گزشتہ پانچ اقوام (قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب) کی بستیاں ہیں۔ آپ کو ان کے کچھ حالات سنانے کا مقصد یہ ہے کہ کفار مکہ جو ان بستیوں میں رہنے والوں کی طرح آپ کی مخالفت کر رہے ہیں، عبرت حاصل کریں۔

② **فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ:** یعنی ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے رسولوں کے پاس اپنے سچا ہونے کے دلائل نہیں تھے، یا وہ دلائل اتنے واضح اور روشن نہیں تھے کہ قائل کر سکیں، بلکہ اس کا سبب ان کی قوم کا پہلے سے طے کر لینا تھا کہ ہم نے ماننا ہی نہیں۔ اب پہلے جھٹلا دینے کے بعد وہ ایمان لے آتے تو ان کی جھوٹی عزت نفس پر حرف آتا

وَ مَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ اِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۠ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور ہم نے ان میں سے اکثر کا کوئی بھی عہد نہیں پایا اور بے شک ہم نے ان کے اکثر کو فاسق ہی پایا﴿۱۰۲﴾ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا تو انھوں نے ان کے ساتھ ظلم کیا۔ پھر دیکھ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا؟﴿۱۰۳﴾

تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴾ [البقرۃ : ۲۰۶] ''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اس کی عزت اسے گناہ میں پکڑے رکھتی ہے، سو اسے جہنم ہی کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے۔'' یہی گناہ (یعنی دلائل دیکھنے کے باوجود پہلے ہی جھٹلا دینا اور اس پر اصرار کرنا) ان کے دلوں پر مہر کا باعث بن گیا، دیکھیے سورۂ انعام (۱۰۹، ۱۱۰)۔

③ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ: یعنی جس طرح پہلی امتوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے دلوں کی صلاحیتیں سلب کر لی گئی تھیں اور انھیں ایمان نصیب نہیں ہوا تھا اسی طرح ان کے دل بھی مسخ ہو چکے ہیں اور ان میں ایمان کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔

آیت 102 ① وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ: ''مِنْ عَهْدٍ'' (کوئی بھی عہد) کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے، جس کا عموم ''مِنْ'' سے مزید بڑھ گیا ہے۔ مراد کسی بھی قسم کا عہد ہے، نہ فطری جو ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' کے وقت کیا تھا، نہ شرعی جو پیغمبروں سے عذاب ٹالنے کی درخواست کے وقت کرتے تھے اور نہ عرفی جو وہ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔

② لَفٰسِقِيْنَ: ''نافرمان''، یعنی کسی عہد کا پاس نہ کرنے والے پکے بے ایمان۔

آیت 102 فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ: وہ سب کے سب غرق کر دیے گئے اور ان کی ساری شان و شوکت خاک میں ملا دی گئی۔ یہ چھٹا قصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں بیان فرمایا ہے اور اسے جس تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے دوسرے کسی قصے کو اس طرح بیان نہیں فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ان تمام انبیاء سے بڑھ کر تھے اسی طرح ان کی امت بھی جہالت اور سرکشی میں سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ البتہ یہاں ان کی زندگی کے ابتدائی حالات کے بجائے دوسرے انبیاء کی طرح دعوت کے آغاز سے بات شروع فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا، اس آیت میں موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجنے کا ذکر فرمایا ہے، فرعون اور اس کی قوم کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ سارا اختیار فرعون کے ہاتھ میں تھا، اگر وہ ایمان لے آتا تو اس کی قوم بھی ایمان لے آتی اور اس جبر و قہر میں اس کے سردار اس کے معاون تھے۔ اس ظالم نے بنی اسرائیل کے علاوہ اپنی قوم کو بھی اتنا بے وقعت بنا دیا تھا کہ ان کے پاس فرعون کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۵۴) گویا اس کی اپنی قوم بھی اس کے ہاتھوں مظلوم تھی مگر بنی اسرائیل پر ظلم تو انھیں غلام بنا کر رکھنے،

وَقَالَ مُوسَىٰ يَٰفِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَٰلَمِينَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰٓ أَن لَّآ أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ﴿١٠٥﴾

اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! بے شک میں جہانوں کے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں ﴿١٠٤﴾ اس بات پر پوری طرح قائم ہوں کہ اللہ پر حق کے سوا نہ کہوں، بلاشبہ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل لے کر آیا ہوں، سو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے ﴿١٠٥﴾

ملک سے نکلنے کی ممانعت اور ان کی اولاد کے قتل کی حد تک پہنچ چکا تھا۔

آیت 104 **وَقَالَ مُوسَىٰ يَٰفِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ**...... : فرعون مصر کے ہر بادشاہ کا لقب تھا، جیسا کہ روم کے بادشاہ کا قیصر اور فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے اس کے عزت والے نام کے ساتھ نہایت نرمی کے ساتھ مخاطب فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھیجتے وقت تلقین فرمائی تھی۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۴۴) اس فرعون کا نام منفتاح بن رمسیس ثانی یا ولید بن ریان بتایا جاتا ہے، مگر یہ بات کسی قابل اعتماد ذریعے سے ثابت نہیں۔

آیت 105 ❶ **حَقِيقٌ عَلَىٰٓ أَن لَّآ أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ** : کیونکہ میں اللہ کا رسول (پیغام پہنچانے والا) ہوں اور رسول کا کام یہ ہے کہ بھیجنے والے کا پیغام کسی کمی بیشی کے بغیر پہنچا دے، اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہ کرے، لہٰذا میری ہر بات صحیح اور سچی ہوگی۔ نافع کی قراءت میں ہے: "حَقِيقٌ عَلَيَّ أَلَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ" اس صورت میں "**حَقِيقٌ**" کا معنی ہے واجب، یعنی مجھ پر واجب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ عاصم کی قراءت میں وہی ہے جو ہم پڑھتے ہیں: ﴿ **حَقِيقٌ عَلَىٰٓ أَن لَّآ أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ** ﴾ اس صورت میں "**حَقِيقٌ**" کا معنی ہے قائم، ثابت۔ "**حَقِيقٌ**" مبتدا محذوف "أَنَا" کی خبر ہے، یعنی میں اس بات پر قائم ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔

❷ **فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ**: یعنی انھیں غلامی سے آزاد کر، تاکہ وہ میرے ساتھ کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اپنے اور تیرے رب کی پوری آزادی کے ساتھ عبادت کر سکیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے اس مطالبے کا پس منظر یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے میں ان کے بھائی مصر میں آ کر آباد ہو گئے اور وہیں ان کی نسل پھیلی جو بنی اسرائیل کہلائی۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی تک تو انھیں پوری طرح اقتدار حاصل رہا لیکن اس کے بعد فرعونوں نے انھیں غلام بنا لیا اور مصر میں ان کی حالت اچھوتوں سے بھی بدتر ہو گئی، وہ چونکہ مسلمان تھے اس لیے موسیٰ علیہ السلام کے مشن میں جہاں یہ چیز شامل تھی کہ فرعون کو توحید کی دعوت دی جائے وہاں یہ بھی ضروری تھا کہ اگر فرعون دعوت حق کو قبول نہ کرے اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز نہ آئے تو بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نجات دلا کر کسی دوسری جگہ لے جایا جائے، جہاں وہ آزادی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر سکیں۔ یہاں "**فَأَرْسِلْ**" میں حرف فاء تفریع کے لیے ہے، یعنی جب تو کھلے دلائل جاننے کے باوجود انکار پر قائم ہے تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ مطالبہ اس وقت کیا جب فرعون نے ہر طرح رب العالمین کا اقرار کرنے سے انکار کر دیا، جیسا کہ اس کی

قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلۡقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ
ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ﴿۱۰۸﴾ قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اِنَّ
هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيۡدُ اَنۡ يُّخۡرِجَكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ‌ۚ فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

اس نے کہا اگر تو کوئی نشانی لے کر آیا ہے تو وہ لے آ، اگر تو سچوں میں سے ہے ﴿۱۰۶﴾ تو اس نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اچانک وہ ایک ظاہر اژدہا تھی ﴿۱۰۷﴾ اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید چمکنے والا تھا ﴿۱۰۸﴾ فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یقیناً یہ تو ایک ماہر فن جادوگر ہے ﴿۱۰۹﴾ جو چاہتا ہے کہ تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دے، تو تم کیا حکم دیتے ہو؟ ﴿۱۱۰﴾

تفصیل دوسرے مقامات پر مذکور ہے۔

آیت 106 قَالَ اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ ...... : فرعون موسیٰ علیہ السلام کی شرافت و نجابت اور ان کے صدق و امانت سے پوری طرح واقف تھا، کیونکہ ان کی پرورش اسی کے گھر میں ہوئی تھی، مگر اس نے ان کی رسالت اور صدق کو تسلیم کرنے کے لیے کوئی معجزہ پیش کرنے کا مطالبہ کر دیا، تاکہ انکار کا کوئی بہانہ مل سکے۔

آیت 107 فَاَلۡقٰى عَصَاهُ ...... : موسیٰ علیہ السلام نے فوراً ہی اپنا عصا پھینکا تو وہ خوف ناک اژدہا بن گیا۔ بعض مفسرین نے اس کی عجیب و غریب صفات لکھی ہیں، مثلاً اس نے منہ کھولا تو اس کا نچلا جبڑا زمین پر اور اوپر کا جبڑا اسی (۸۰) ہاتھ اوپر کی طرف اٹھ کر محل کی دیوار کی بلندی تک پہنچ گیا اور وہ فرعون کی طرف بڑھا تو وہ بھاگ اٹھا اور اس کا پاخانہ خطا ہو گیا، لوگ بھی بھاگ گئے، فرعون چیخا کہ موسیٰ! اسے پکڑو، میں ایمان لے آؤں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پکڑا تو وہ پھر لاٹھی بن گیا۔ (ابن کثیر، بقاعی) اگرچہ اس کی کوئی صحیح سند نہیں اور نہ اس کی تصدیق یا تردید کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہے، تاہم "ثُعۡبَانٌ" کی صفت "مُّبِيۡنٌ" سے اور اتنی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل جانے سے جن سے میدان بھرا ہوا تھا، اس کا غیر معمولی ہونا ضرور معلوم ہوتا ہے اور اس سے فرعون اور اس کے سرداروں کا خوف زدہ ہونا تو صاف ظاہر ہے، کیونکہ وہ قتل کی دھمکیوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی نصرت اور ان معجزوں کی دہشت کی وجہ سے انھیں کوئی نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکے۔ دیکھیے سورۂ مومن (۲۶)۔

اس معجزے سے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں قدرت کا بھی اظہار ہو گیا کہ وہ چاہے تو ایک بے جان اور بے ضرر سی لاٹھی کو زندگی عطا فرما کر اتنا بڑا خوف ناک اژدہا بنا دے اور چاہے تو ایک مہیب اژدہا کو بے جان لاٹھی بنا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرعون کے لیے یہ معجزہ ہی کافی تھا، مگر وہ دل سے مان جانے کے باوجود (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۲) بار بار معجزے دیکھ کر ایمان لانے کا وعدہ کرنے کے بعد مکرتا رہا، حتیٰ کہ سمندر میں غرق کر دیا گیا۔

آیت 108 بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کی وہ سفیدی عام سفیدی نہیں تھی بلکہ اس میں کوئی معجزانہ شان تھی کہ اس کی چمک اور ہیبت کی وجہ سے فرعون نے اسے جادو قرار دیا، ورنہ عام سفیدی کو جادو کون کہتا ہے؟

آیت 110،109 قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ ...... : یہاں یہ ذکر ہوا ہے کہ فرعون کی قوم کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کو

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾ وَ جَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

انھوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو مؤخر رکھ اور شہروں میں جمع کرنے والے بھیج دے ﴿۱۱۱﴾ کہ وہ تیرے پاس ہر ماہر فن جادوگر لے آئیں ﴿۱۱۲﴾ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے، انھوں نے کہا یقیناً ہمارے لیے ضرور کچھ صلہ ہوگا، اگر ہم ہی غالب ہوئے ﴿۱۱۳﴾ کہا ہاں! اور یقیناً تم ضرور مقرب لوگوں سے ہو گے ﴿۱۱۴﴾ انھوں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تو پھینکے، یا ہم ہی پھینکنے والے ہوں ﴿۱۱۵﴾ کہا تم پھینکو۔ تو جب انھوں نے پھینکا، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں سخت خوف زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لے کر آئے ﴿۱۱۶﴾

جادوگر قرار دیا۔ سورۂ شعراء (۳۴) میں مذکور ہے کہ فرعون نے اپنے سرداروں سے یہ بات کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو بے اثر بنانے کے لیے دو بہتان گھڑے، ایک تو یہ کہ یہ ماہر جادوگر ہے اور دوسرا یہ کہ یہ حکومت پر قبضہ کر کے تمھیں سرزمین مصر سے نکالنا چاہتا ہے۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۳۴، ۳۵) اس کی قوم جسے اس نے اس حد تک بے وقوف اور بے وقعت بنایا تھا کہ وہ اسے اپنا معبود اور اس کی بات کو اپنے رب کی بات ماننے لگ گئے تھے (دیکھیے زخرف: ۵۴) اس قوم نے بھی اسی کی بات کو دہرا دیا۔

آیت 112،111 **قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَ اَخَاهُ ......** : "**اَرْجِهْ**" یہ "أَرْجَأَ يُرْجِئُ إِرْجَاءً" سے امر حاضر کا صیغہ ہے، جو اصل میں "اَرْجِئْهُ" تھا، جس کا معنی "اَخِّرْهُ" ہے، یعنی ان کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور ان کا معاملہ چند روز تک ملتوی رکھا جائے، اس اثنا میں ملک بھر کے شہروں سے تمام ماہر فن جادوگر جمع کیے جائیں۔ چنانچہ فرعون نے ایسا ہی کیا (دیکھیے شعراء: ۳۸) اور موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا کر کے مقابلے کا دن یوم الزینہ اور دن چڑھے کا وقت طے کر لیا۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۵۹) یہاں یہ سب محذوف ہے۔

آیت 113 **قَالُوْۤا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا ......** : جادوگروں کے سامنے کوئی بلند مقصد نہ تھا، بلکہ محض پیشہ ورانہ کمائی تھی، اس لیے انھوں نے پہلے فرعون سے بطور سوال اس کا تقاضا کیا۔

آیت 114 **قَالَ نَعَمْ وَ اِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ**: فرعون نے اجرت کا بلکہ مقربین میں شامل کرنے کا وعدہ کیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ فرعون کی بات پوری ہوئی مگر ان کے لیے وہ اجرت اور مقرب ہونا فرعون کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہونا مقدر تھا، اللہ کی شان دیکھیے کہ خدائی کے دعویدار کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ انھیں اجرت اور قرب کس کی طرف سے ملنا ہے۔

آیت 116،115 ① **وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ** : "اَرْهَبَ يُرْهِبُ" کا معنی ہے ڈرانا، خوف زدہ کرنا، "**وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ**" میں

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَ انْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی لاٹھی پھینک، تو اچانک وہ ان چیزوں کو نگلنے لگی جو وہ جھوٹ موٹ بنا رہے تھے ﴿۱۱۷﴾ پس حق ثابت ہو گیا اور باطل ہو گیا جو کچھ وہ کر رہے تھے ﴿۱۱۸﴾ تو اس موقع پر وہ مغلوب ہو گئے اور ذلیل ہو کر واپس ہوئے ﴿۱۱۹﴾ اور جادوگر سجدے میں گرا دیے گئے ﴿۱۲۰﴾

حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ ''سخت خوف زدہ'' کیا ہے۔ جادوگروں نے اپنے غلبے کے یقینی اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو لوگوں کے سامنے بے وقعت ظاہر کرنے کے لیے پوچھا کہ تم پہلے اپنا معجزہ پیش کرو گے یا ہم اپنے جادو کے ہتھیار پیش کریں؟ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے بڑھ کر شانِ بے نیازی سے فرمایا کہ تمھیں جو کچھ پیش کرنا ہے سب پیش کر لو۔ چونکہ مقابلے میں جس کی پہل ہو اسے ایک قسم کی برتری پہلے ہی حاصل ہوتی ہے، تم اس برتری سے فائدہ اٹھا لو، چنانچہ انھوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں تو ہر طرف زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے، فرمایا: ﴿ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾ [طٰہٰ : ٦٦] ''تو اچانک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں، اس کے خیال میں ڈالا جاتا تھا ان کے جادو کی وجہ سے کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔'' یہاں بھی فرمایا کہ ''انھوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں سخت خوف زدہ کر دیا اور وہ بہت بڑا جادو لے کر آئے۔'' درحقیقت وہ زمانہ ہی جادو کے کمال کا تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا معجزہ دیا جس کے سامنے جادو بے بس ہو۔

② سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ: اس سے معلوم ہوا کہ جادو سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی، صرف دیکھنے میں وہ چیز دوسری نظر آتی ہے اور اس کا اثر محض خیال پر ہوتا ہے، چونکہ انسان کا جسم دماغ کے تابع ہے، اس لیے خیال کا نقصان یا فائدہ بعض اوقات جسم کو بھی ہوتا ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کا جادو دیکھ کر خوف محسوس کیا، فرمایا: ﴿ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴾ [طٰہٰ : ٦٧] ''تو موسیٰ نے اپنے دل میں ایک خوف محسوس کیا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لبید بن اعصم کے جادو کی وجہ سے کچھ عرصہ بیمار رہے۔ اس لیے جادو کی تاثیر سے انکار درست نہیں۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے جادو کو بہت بڑا قرار دیا ہے۔

آیت 118،117 وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ......: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی وحی سے اپنی لاٹھی پھینکی تو اس نے ان کے جھوٹ موٹ بنائے ہوئے سانپوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معجزہ جو حق تھا، ثابت ہو گیا اور جادو جو جھوٹ شعبدے اور مکاری پر مبنی تھا، بے کار اور باطل ہو گیا۔

آیت 120 وَ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ: یعنی چونکہ جادوگر جادو کی حقیقت کو سمجھتے تھے، اس لیے معجزہ دیکھ کر وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑے، جیسے وہ خود نہ گرے ہوں بلکہ اندر سے کسی چیز نے انھیں گرا دیا ہو۔

قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ
لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

انھوں نے کہا ہم جہانوں کے رب پر ایمان لائے ﴿۱۲۱﴾ موسیٰ اور ہارون کے رب پر ﴿۱۲۲﴾ فرعون نے کہا تم اس پر اس سے پہلے ایمان لے آئے کہ میں تمھیں اجازت دوں، بے شک یہ تو ایک چال ہے جو تم نے اس شہر میں چلی ہے، تاکہ تم اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال دو، سو تم جلد جان لو گے ﴿۱۲۳﴾ یقیناً میں ضرور تمھارے ہاتھ اور تمھارے پاؤں مخالف سمت سے بری طرح کاٹوں گا، پھر یقیناً تم سب کو ضرور بری طرح سولی دوں گا ﴿۱۲۴﴾

آیت 122،121 قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ……: ''ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے'' کے ساتھ ﴿ رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ﴾ (جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے) اس لیے کہا کہ کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ انھوں نے فرعون کو رب العالمین سمجھتے ہوئے سجدہ کیا ہے۔ اس طرح فرعون اور اس کے مشیروں کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہا کہ لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام کے محض ایک جادوگر ہونے کا یقین دلا سکیں۔

آیت 124،123 ① قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ……: یعنی میری اجازت سے پہلے تمھیں کوئی حق نہ تھا کہ تم موسیٰ کی برتری اور کامرانی کا اعلان کرتے۔ ہر متکبر و سرکش یہی چاہتا ہے کہ لوگ اس کی ہاں میں ہاں ملائیں اور جو کچھ وہ کہے اسے مان کر اسی کی تشہیر و اشاعت کریں، اسی طرح دنیا میں ہر متکبر اور سرکش حکمران کا یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ دلیل کے میدان میں ہار جاتا ہے تو جیل، پھانسی، سولی اور قتل کی دھمکی دینے پر اتر آتا ہے اور اس کے لیے ایسے قوانین وضع کرتا ہے جن کی رو سے کسی پر اس کا جرم ثابت کیے بغیر اسے سزا دی جا سکے۔ چنانچہ یہی کام فرعون نے کیا، جب وہ دلیل کے میدان میں شکست کھا گیا تو سزا دینے کی دھمکی پر اتر آیا اور فی الفور عوام کے سامنے دو الزام لگا دیے، پہلا کہ یہ جادوگروں اور موسیٰ کی باہمی سازش ہے اور دوسرا یہ کہ یہ لوگ اس سازش کے ذریعے سے مصریوں کو ملک بدر کر کے حکومت پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔ اس لیے پہلے ''فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'' (سو تم جلد جان لو گے) کہہ کر دھمکی دی، پھر اس دھمکی کی وضاحت بھی سنا دی۔

② ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ: یعنی ایک جانب سے ہاتھ اور دوسری جانب سے پاؤں کٹوا کر تمھیں سولی دے دوں گا۔ عام طور پر لوگ سولی اور پھانسی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں، حالانکہ پھانسی میں تو گلے میں رسا ڈال کر گلا گھونٹ کر مارا جاتا ہے، جبکہ سولی میں ایک اونچا کھمبا کھڑا کر کے اس کے اوپر ایک آڑی لکڑی باندھ دی جاتی ہے، پھر ملزم کو اوپر چڑھا کر اس کے بازو اس آڑی لکڑی کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں، جبکہ جسم اونچی لکڑی کے ساتھ بندھا ہوتا ہے، وہ وہیں دھوپ، سردی، پرندوں کی نوچ کھسوٹ اور دشمنوں کے تیروں یا نیزوں کے زخم کھاتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سورۂ طٰہٰ (۷۱) میں ہے: ''میں تمھیں ہر صورت کھجور کے تنوں پر بری طرح سولی دوں گا۔'' یہ پھانسی سے کہیں زیادہ خوف ناک سزا ہے۔

قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

انھوں نے کہا یقیناً ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۱۲۵﴾ اور تو ہم سے اس کے سوا کس چیز کا بدلہ لے رہا ہے کہ ہم اپنے رب کی آیات پر ایمان لے آئے، جب وہ ہمارے پاس آئیں، اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں اس حال میں فوت کر کہ فرماں بردار ہوں ﴿۱۲۶﴾

آیت 125 **قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ:** یعنی موت سے کسی حال میں چھٹکارا نہیں، وہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور آنی ہے، اگر ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ہمارا خاتمہ سولی پر ہو تو ہمیں بڑی خوشی سے سولی دو، ہمیں کوئی پروا نہیں۔

آیت 125 **وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا ......:** " نَقِمَ مِنْهُ (ض، ع) " اور "اِنْتَقَمَ" عَاقَبَهُ یعنی "نَقَمَ مِنْهُ" اور "اِنْتَقَمَ مِنْهُ" کا معنی بدلہ لینا، سزا دینا ہے اور " نَقَّمَ الْأَمْرَ " کا معنی " کَرِهَهُ " یعنی کسی شے سے بہت زیادہ نفرت اور کراہت ہے۔ (قاموس) مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارا کوئی گناہ ہے تو صرف یہ کہ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی فن کو جتنا اس فن والا جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا، چنانچہ ان جادوگروں نے جب موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھا تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ ہرگز جادو نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزہ ہے، اس لیے وہ اس پر فوراً ایمان لے آئے اور ان کے ایمان میں اس قدر پختگی تھی کہ انھوں نے جان تک کی پروا نہیں کی، بلکہ اللہ تعالیٰ سے صبر و استقامت اور ایمان و اسلام پر موت کی دعا کی۔

مشہور قول کے مطابق وہ قتل کر دیے گئے، چنانچہ طبری اور دوسرے مفسرین نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے کہ شروع دن میں وہ جادوگر تھے اور پھر دن کے آخری حصے میں شہداء میں داخل ہو گئے۔ دکتور حکمت بن بشیر نے تفسیر ابن کثیر کی تخریج میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ابن ابی حاتم نے ضعیف سند کے ساتھ سدی عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے، جب کہ سدی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نہیں سنا (لہٰذا روایت منقطع ہے صحیح نہیں)۔

قرآن مجید نے اس مقام پر یہ ذکر نہیں فرمایا کہ ان کا انجام کیا ہوا، نہ ہی سورۂ شعراء اور سورۂ طٰہٰ میں یا کسی اور جگہ یہ ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقصد عبرت کے لیے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی مدد، فرعون کی شکست، جادوگروں کے ایمان لانے، فرعون کی دھمکیوں کے باوجود اس پر قائم رہنے کے عزم اور صبر اور ایمان پر خاتمے کی دعا کا بیان ہے، محض قصہ بیان کرنا نہیں، جیسا کہ سورۂ نازعات میں فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾ [النازعات : ۲٦] "بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے جو ڈرتا ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ فرعون اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا، جیسا کہ اس نے اپنے سرداروں سے کہا تھا: "مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں۔" [المؤمن : ۲٦] اور آلِ فرعون میں سے وہ مومن جس نے بھرے دربار میں موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی مخالفت کی اس کے خلاف بھی فرعون نے بدترین سازش کی، مگر وہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کر سکا اور اس مومن کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی سازشوں

وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَ قَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ يَذَرَكَ

اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا، تا کہ وہ زمین میں فساد پھیلائیں

سے بچالیا۔ دیکھیے سورۂ مومن (۴۵) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دے کر بھیجا تھا: ﴿ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَاۤ ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴾ [القصص : ۳۵] ''ہم تیرے بھائی کے ساتھ تیرا بازو ضرور مضبوط کریں گے اور تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے، ہماری نشانیوں کے ساتھ تم دونوں اور جنھوں نے تمھاری پیروی کی، غالب آنے والے ہو۔'' زیر تفسیر مقام پر بھی اگر وہ اپنی اس دھمکی پر عمل کر چکا ہوتا تو اس کی قوم کے سرداروں کو اسے نئے سرے سے بھڑکانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) چونکہ قرآن مجید میں ان کے انجام کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے اس لیے سلامتی اسی میں ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے۔

آیت 127 ① وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ ...... : موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے غلبے اور جادوگروں کے ایمان لانے پر اگرچہ چند ہی نوجوانوں نے ایمان لانے کی جرأت کی اور وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے۔ (دیکھیے یونس: ۸۳) تاہم فرعون کی بنی اسرائیل کے خلاف کارروائیاں کچھ کم ہو گئیں تو اس کے سرداروں نے اسے یہ کہہ کر بھڑکایا کہ کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو چھوڑے رکھے گا کہ وہ زمین میں فساد کریں، یعنی وہ تمھاری رعیت کو دعوت دیتے پھریں کہ وہ تمھارے اور تمھارے معبودوں کے بجائے اللہ واحد کی عبادت کریں اور ملک میں دعوتِ توحید سے فساد پھیلاتے پھریں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تعجب ہے کہ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے فساد پھیلانے سے ڈر رہے ہیں، حالانکہ فساد پھیلانے والے تو وہ خود ہیں۔'' جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [البقرة : ۱۲] ''سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے۔''

② وَ يَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ : '' آلِهَةٌ '' یہ '' اِلٰهٌ '' کی جمع ہے، جس کا معنی معبود ہے، یعنی وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے بھی کچھ معبود تھے جن کی وہ عبادت کرتا تھا۔ بعض صحابہ کی قراءت میں ''اِلَاهَتَكَ'' ہے، '' اِلَاهَةٌ '' کا معنی عبادت ہے، یعنی وہ تجھے اور تیری عبادت کو چھوڑے رکھیں، یہ بھی اگرچہ درست ہے مگر مشہور قراءت پہلی ہی ہے۔ اس لیے اہل علم نے اس کی کئی توجیہات کی ہیں اور وہ سبھی ممکن ہیں۔ ایک توجیہ اس کی یہ ہے کہ وہ واقعی ربِ اعلیٰ ہونے کے اعلان کے باوجود خود کئی معبودوں کی پرستش کرتا تھا اور ان معبودوں کے تقدس کا عقیدہ اس کی قوم میں بھی موجود تھا، مثلاً گائے کی پرستش تو عام تھی، جس کے نتیجے میں ان سے میل جول اور ان کی محکومیت کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بھی یہ عقیدہ در آیا تھا۔ جس کی دلیل آزاد ہونے کے بعد بھی گائے ذبح کرنے کے حکم پر ان کے بہانے اور موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کے بعد سامری کا بچھڑا بنا کر قوم کو اس کی عبادت پر لگانا ہے۔ مصری تہذیب ہندوؤں سے ملتی جلتی تھی۔ مشرکانہ

وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور وہ تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دے؟ اس نے کہا ہم ان کے بیٹوں کو بری طرح قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور یقیناً ہم ان پر قابو رکھنے والے ہیں ﴿۱۲۷﴾

مذاہب میں عجیب پیچیدگی پائی جاتی ہے، عموماً ان کے ہاں اصل خدا کسی انسان میں اتر آتا ہے جو مسلمان صوفیا کے ہاں حلول کے نام سے معروف ہے۔ فرعون اپنے آپ کو ان تمام معبودوں کا نمائندہ قرار دے کر اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ کہلاتا تھا اور اپنے سرداروں سے کہتا تھا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [القصص : ۳۸] ''مجھے اپنے سوا تمھارا کوئی معبود معلوم نہیں۔'' یہ وہی بات ہے جو بعض مسلمانی کا دعویٰ کرنے والوں نے کہی ہے ؎

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

مگر یہ لوگ مصطفیٰ ﷺ کو اصلی خدا مان کر بھی بہت سے زندہ خداؤں، مثلاً مرشدوں اور مردہ خداؤں کی قبروں کی پرستش کرتے ہیں اور ان میں بھی اللہ کے ظہور کا عقیدہ رکھتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس قسم کے تمام گندے عقیدوں سے بری ہیں۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ درحقیقت فرعون دہری تھا۔ کائنات کا کوئی بنانے والا مانتا ہی نہ تھا، اس کے نزدیک بادشاہ ہی معبود کا مقام رکھتا تھا کہ جو اس کے منہ سے نکلے وہی دین اور قانون ہے۔ اپنے سرداروں کے لیے یہ مقام وہ خود رکھتا تھا اور اس کے سردار اپنے اپنے علاقے کی رعایا کے لیے یہ مقام رکھتے تھے، چنانچہ اس نے اپنے بت بنوا کر لوگوں کے گھروں میں رکھے ہوئے تھے، جیسا کہ آج کل کے اکثر حکمران اپنی تصاویر اور مجسموں کے ذریعے سے لوگوں کے ذہنوں میں اپنی خدائی بٹھاتے ہیں، کمیونسٹ حکمران سٹالن، لینن اور ماؤزے تنگ بھی خدا کے منکر ہونے کے باوجود لوگوں کے دماغوں میں اپنی خدائی کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جمہوری حکمران بھی اس کوشش میں حتی الوسع کمی نہیں کرتے، اگرچہ وہ نام عوام کا استعمال کرتے ہیں۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ حاکمیت میں وہ اپنے سوا کسی کو معبود نہیں مانتا تھا، البتہ غیبی مدد کرنے والے کچھ معبود اس نے بھی رکھے ہوئے تھے، جس طرح آج کل بعض حکمران قانون اپنا چلاتے ہیں مگر غیبی مدد حاصل کرنے کے لیے کئی ہستیوں کی نیاز دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ کعبہ کی طرح پختہ قبروں کو عرق گلاب سے غسل دیتے اور بزرگوں کو کرنی والا سمجھتے ہیں اور کچھ کچھ اللہ کو بھی مان لیتے ہیں، مگر کیا مجال کہ اس کا کوئی قانون عمل میں لائیں یا لانے دیں۔

③ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ ......: یعنی ہم جو ظلم و ستم موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بنی اسرائیل پر کرتے تھے اس کا سلسلہ پھر سے شروع کریں گے، اس طرح یہ تباہ ہو جائیں گے اور ان کا تخم تک باقی نہیں رہے گا۔ ان کے مرد مارے جائیں گے اور صرف عورتیں بچیں گی، وہ کیا کر سکیں گی، ان کو ہم لونڈیاں بنا کر اپنے گھروں میں رکھیں گے۔ ابھی تک اس کی جرأت نہ کرنے

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین اللہ کی ہے، وہ اس کا وارث اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے بناتا ہے اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے ﴿۱۲۸﴾ انھوں نے کہا ہمیں اس سے پہلے ایذا دی گئی کہ تو ہمارے پاس آئے اور اس کے بعد بھی کہ تو ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا تمھارا رب قریب ہے کہ تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ﴿۱۲۹﴾

کے لیے اس نے یہ حیلہ تراشا کہ ایسی کیا جلدی ہے، ہم ان پر پوری طرح قابو رکھتے ہیں، جب چاہیں گے ایسا کر لیں گے۔

آیت 128 ① **قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ ......** : فرعون کی دھمکیوں پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تسلی دینا ضروری سمجھا، چنانچہ انھیں اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے اور صبر کرنے کی تلقین فرمائی، جس پر انھوں نے ظالموں سے پناہ کی وہ دعا لازم کر لی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس میں ذکر فرمائی ہے: ﴿ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [یونس : ۸۵، ۸۶] موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تسلی دیتے ہوئے یہ خوش خبری بھی سنائی کہ آج اگر مصر پر فرعون حکمران ہے تو کل اللہ تعالیٰ تمھیں اس کی سرزمین کا وارث، یعنی حکمران بنا سکتا ہے۔

② **وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ** : " عَاقِبَةٌ " کا لفظی معنی تو انجام ہے جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [القصص : ۴۰] ''سو دیکھو ظالموں کا انجام کیسا تھا۔'' مگر جب اس پر ''الف لام'' آ جائے تو اس کا معنی اچھا انجام ہی ہوتا ہے۔

آیت 129 ① **قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ ......** : پہلے بھی ہمارے بچوں کو قتل کیا جاتا رہا ہے، ہم سے مشقت کے کام لیے جاتے رہے ہیں اور ہماری آزادی سلب رہی ہے، اب آپ کے آنے کے بعد بھی وہی غلامی اور مشقت ہے اور دوبارہ بچوں کے قتل کے فیصلے کیے جا رہے ہیں۔

② **فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ** : موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی کہ عن قریب تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کر کے تمھیں آزادی اور حکومت دینے والا ہے اور دیکھنے والا ہے کہ تم اس کا شکر کرتے اور احکام بجا لاتے ہو یا تم بھی ناشکری اور نافرمانی کرنے لگتے ہو؟ معلوم ہوا کہ آزادی اور حکومت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کفار کی غلامی پر راضی رہنا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ کلام نقل فرمایا مسلمانوں کے سنانے کو، یہ سورت مکی ہے، اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے، پھر بشارت پہنچی پردے میں۔'' (موضح)

وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا
جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى وَ مَنْ مَّعَهٗ ؕ
اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے فرعون کی آل کو قحط سالیوں اور پھلوں کی کمی کے ساتھ پکڑا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں ﴿۱۳۰﴾ تو جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ تو ہمارا حق ہے اور اگر انھیں کوئی تکلیف پہنچتی تو موسیٰ اور اس کے ساتھ والوں کے ساتھ نحوست پکڑتے۔ سن لو! ان کی نحوست تو اللہ ہی کے پاس ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۱۳۱﴾

آیت 130 وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ …… : اوپر کی آیت میں جب موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ وعدہ فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے کہ تمھارا مالک تمھارے دشمن کو تباہ کر دے، تو اب یہاں سے ان تکلیفوں اور مصیبتوں کا بیان شروع کیا جن میں وقتاً فوقتاً آل فرعون کو مبتلا کیا گیا، حتیٰ کہ آخر کار تباہ کر دیے گئے، تاکہ ان مشرکین کو کفر پر کچھ تنبیہ ہو اور انھیں خبردار کیا جائے کہ پیغمبروں کے جھٹلانے کا انجام تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ تکالیف اور مصیبتیں ان پر اس لیے بھیجیں کہ نصیحت حاصل کریں اور اپنی سرکشی سے باز آ جائیں، کیونکہ مصیبت کے وقت دل نرم اور اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

آیت 131 ❶ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ …… : جیسا کہ آیت (۹۴، ۹۵) میں ذکر فرمایا تھا کہ ہر قوم کی آزمائش تنگی اور تکلیف کے علاوہ خوش حالی اور آسودگی کے ساتھ بھی ہوئی، اس کے مطابق فرعون کی قوم پر سختی اور مصیبت کے بعد راحت اور خوش حالی آتی تو بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر گزاری کریں، وہ "لَنَا هٰذِهٖ" کہتے، یعنی یہ ہمارے حسن انتظام کا نتیجہ اور ہمارا حق ہے۔

❷ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى …… : "یَطَّیَّرُوْا" "تَطَیَّرَ یَتَطَیَّرُ" باب تفعل سے ہے جس کا مادہ "طَیْرٌ" (پرندہ) ہے۔ اصل میں "یَتَطَیَّرُوْا" تھا، تاء کا طاء میں ادغام کر دیا ہے۔ مشرکین کا طریقہ تھا کہ فال لینے کے لیے کسی پرندے کو اڑاتے، اگر وہ اڑ کر دائیں طرف جاتا تو اسے نیک فال اور باعث برکت سمجھتے اور اگر بائیں طرف جاتا تو بدفال اور باعث نحوست سمجھتے، یہاں تمام مفسرین کے نزدیک "تَطَیَّرَ" کا معنی فالِ بد اور نحوست ہے، یعنی اپنی مصیبتوں کا باعث موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کو قرار دیتے۔

❸ اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ …… : یعنی اس نحوست کا اصل سبب تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور خیر و شر جو کچھ ان کو پہنچ رہا ہے تمام کا تمام اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہے جو ان کے اعمال کے سبب ان کے حق میں لکھا جا چکا ہے، یہ سراسر جہالت ہے کہ بھلائی کو اپنی خوبی اور برائی کو کسی دوسرے کی نحوست قرار دیا جائے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یعنی شومی قسمت بد ہے، سو اللہ کی تقدیر سے ہے، برائی اور بھلائی کا اثر آخرت میں ہوگا، اس کا جواب یہاں یہ نہیں فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی، کیونکہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں۔ اصل حقیقت (جو) تھی سو فرمائی کہ دنیا کے احوال موقوف بہ تقدیر ہیں۔" (موضح)

وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا
وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَ لَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ
عِنْدَكَ ۚ لَىِٕنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا

اور انھوں نے کہا تو ہمارے پاس جو نشانی بھی لے آئے، تاکہ ہم پر اس کے ساتھ جادو کرے تو ہم تیری بات ہرگز ماننے والے نہیں ﴿۱۳۲﴾ تو ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون، جو الگ الگ نشانیاں تھیں، پھر بھی انھوں نے تکبر کیا اور وہ مجرم لوگ تھے ﴿۱۳۳﴾ اور جب ان پر عذاب آتا تو کہتے اے موسیٰ! اپنے رب سے ہمارے لیے اس عہد کے واسطے سے دعا کر جو اس نے تیرے ہاں دے رکھا ہے، یقیناً اگر تو ہم سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ضرور ہی تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ضرور ہی بھیج دیں گے ﴿۱۳۴﴾ پھر جب ہم ان سے عذاب کو

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بدشگونی شرک ہے، بدشگونی شرک ہے'' تین دفعہ فرمایا ''اور ہم میں سے ہر ایک کو (کوئی نہ کوئی وہم ہو جاتا ہے) مگر اللہ تعالیٰ اسے توکل کی برکت سے دور کر دیتا ہے۔'' [أبو داؤد، الطب، باب في الطيرة : ۳۹۱۰ ترمذی : ۱٦۱٤]

آیت 132 وَ قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ ...... : اوپر کی آیت میں ان کی یہ جہالت بیان فرمائی کہ وہ حوادث کی نسبت اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کی طرف کرنے کے بجائے دوسرے اسباب کی طرف کرتے ہیں، اب اس آیت میں ان کی دوسری جہالت بیان فرمائی کہ اتنی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی کم بخت فرعونی موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر ہی کہتے رہے اور انھوں نے معجزات اور جادو کا فرق آخر تک تسلیم نہ کیا، بلکہ اپنی سرکشی اور تمرد سے بالآخر قطعی طور پر اعلان کر دیا کہ تم (موسیٰ علیہ السلام) جو بھی معجزہ دکھاؤ ہم اسے تمھارا جادو ہی سمجھیں گے اور تم پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے، حالانکہ انھیں ان معجزوں کے حق ہونے کا یقین تھا۔ دیکھیے سورۂ نمل (۱۴،۱۳)۔

آیت 133 تا 136 فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ ...... : جب وہ قحط سالی اور پھلوں کی کمی کی گرفت کے باوجود کفر اور سرکشی پر ڈٹ گئے اور اس مصیبت کو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مزید سختیاں نازل ہونا شروع ہوئیں جو فرعون اور اس کی فوجوں کے مکمل خاتمے اور غرق ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ قحط سالیوں کے بعد ''الطُّوْفَانَ'' یعنی سخت بارش اور سیلاب شروع ہوا جس سے ان کی زندگی دشوار ہو گئی تو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی کہ تمھارا اپنے رب سے جو عہد اور معاملہ ہے اسے پیش کر کے اس سے ہمارے لیے یہ عذاب دور کرنے کی دعا کریں، اگر تم نے ہم سے یہ عذاب دور کروا دیا تو ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو

كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اس وقت تک دور کر دیتے جسے وہ پہنچنے والے ہوتے تو اچانک وہ عہد توڑ دیتے تھے﴿۱۳۵﴾ تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پس انھیں سمندر میں غرق کر دیا، اس وجہ سے کہ بے شک انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے﴿۱۳۶﴾

تمھارے ساتھ بھیج دیں گے۔ (لام تاکید اور نون ثقیلہ عربی میں قسم کا مفہوم رکھتا ہے) ظالم اب بھی اپنے اور ساری کائنات کے رب کو موسیٰ علیہ السلام کا رب ہی کہہ رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب ٹلا تو مدت کی سوکھی زمین نے پانی کی فراوانی کی وجہ سے بے حساب چارا اور غلہ پیدا کیا، یہ ان کی خوش حالی کے ساتھ آزمائش تھی، جس سے وہ سب عہد و پیمان بھول کر کہنے لگے کہ یہ سیلاب تو ہمارے لیے نعمت تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان پر "اَلْجَرَادَ" (ٹڈیوں) کا عذاب بھیجا جو ان کے درخت، چارے اور لکڑیاں تک چٹ کر گئیں۔ انھوں نے پھر موسیٰ علیہ السلام سے انھی الفاظ میں عذاب ٹالنے کی دعا کی درخواست کی جو اوپر ذکر ہوئے ہیں۔ یہ عذاب دور ہوا تو پھر خوش حالی کا ایک وقفہ آیا کہ بچی فصل سے بھی بے شمار غلہ پیدا ہوا، جسے کاٹ کر انھوں نے اپنے گھروں میں محفوظ کر لیا اور اپنے خیال میں کم از کم سال بھر کے لیے بے فکر ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے کیا ہوا عہد و پیمان پھر بھول گئے۔ اب ان پر "اَلْقُمَّلَ" کا عذاب نازل ہوا، یعنی جوئیں، چچڑیاں، چھوٹے چھوٹے کالے کیڑے، گھن کے کیڑے، پسو وغیرہ، ان سب پر "اَلْقُمَّلَ" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ انسانوں اور جانوروں کے جسموں، کپڑوں اور بستروں پر جوؤں، پسوؤں اور کھٹملوں کی یلغار ہو گئی۔ غلے کو گھن لگ گیا، پسوانے کے لیے بوریاں لے جاتے تو آٹے کا فقط ایک تھیلا نکلتا، پھر مجبور ہو کر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اسی طرح دعا کی درخواست کی۔ جب ان کی دعا سے وہ بلا ٹلی اور راحت و آرام کا وقفہ آیا تو اپنے عہد سے پہلے کی طرح پھر گئے، اب ان پر "اَلضَّفَادِعَ" یعنی "مینڈکوں" کا عذاب آیا اور وہ اس کثرت سے پھیل گئے کہ ہر چیز اور برتن میں مینڈک ہی مینڈک نظر آنے لگے، کھانا کھاتے ہوئے لقمے کی جگہ اچھل کر منہ میں مینڈک جا پڑتا، لیٹتے تو بستر اور جسم مینڈکوں سے بھر جاتا۔ مجبور ہو کر انھوں نے پھر موسیٰ علیہ السلام سے یہ عذاب ٹالنے کے لیے دعا کی درخواست انھی وعدوں کے ساتھ کی، مگر جب عافیت ملی تو پھر ایمان لانے اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے سے انکار کر دیا۔ اب ان پر خون کا عذاب آیا، کھانے یا پینے کی جو چیز رکھتے خون میں بدل جاتی، پانی کے برتنوں اور ذخیروں نے خون کی صورت اختیار کر لی۔ بعض مفسرین نے خون کے عذاب میں نکسیر کی وبا کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ان کے رجوع اور درخواست پر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب ٹلا تو پھر اپنے کیے ہوئے عہد سے پھر گئے۔ اب اللہ تعالیٰ کے انتقام کا وقت آ گیا اور ان سب کو اللہ کی آیات و معجزات جھٹلانے اور ان سے جان بوجھ کر غفلت اختیار کرنے کی پاداش میں سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ یہاں اس غرق کی تفصیلات بیان نہیں ہوئیں، وہ سورۂ یونس، شعراء اور طٰہٰ وغیرہ میں بیان ہوئی ہیں، کیونکہ یہاں اصل مقصد کفار کو سختی اور خوش حالی کی آزمائش کی پروا نہ کرتے ہوئے کفر پر اصرار کے انجام سے ڈرانا ہے۔ "اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ" سے معلوم ہوتا ہے کہ

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ

اور ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس سرزمین کے مشرقوں اور اس کے مغربوں کا وارث بنا دیا، جس میں

عذاب اور عافیت کے یہ وقفے یکے بعد دیگرے آئے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ اس بات پر چالیس برس رہا کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن جانے دے اور آخر میں یہ عذاب ایک ایک ہفتے کے وقفے سے آئے۔ (موضح) تفسیر طبری میں تابعین کی بعض روایات میں عذاب کا عرصہ ایک ہفتہ اور درمیانی عافیت کا عرصہ ایک ماہ لکھا ہے، مگر ہمارے پاس ان میں سے کسی قول کی تصدیق یا تردید کا کوئی صحیح ذریعہ نہیں۔ نصیحت کے لیے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے وہی کافی ہے۔

آیت 138،137 ① وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ : موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے دو وعدے کیے تھے، دشمن کی ہلاکت اور ملک کی وراثت و خلافت۔ چنانچہ پہلا وعدہ پورا ہونے کے بعد اب یہاں دوسرے وعدے کی تکمیل کا بیان ہے۔ یہاں مبارک سرزمین سے شام کی سرزمین مراد ہے اور یہ وعدہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یوشع علیہ السلام کے دور میں پورا ہونا شروع ہوا، جب انھوں نے عمالقہ سے جہاد کر کے بعض علاقے اپنے قبضے میں لے لیے مگر پورا ملک شام داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں قبضے میں آیا۔

② مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا : "مَشَارِقَ الْاَرْضِ" یہ "يُسْتَضْعَفُوْنَ" کا مفعول نہیں بلکہ "اَوْرَثْنَا" کا مفعول ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کو زیادہ سے زیادہ کمزور اور بے بس تو مصر میں بنایا گیا تھا، شام میں نہیں۔ ارض مبارک سے مراد قرآن مجید میں عام طور پر سرزمین شام لی گئی ہے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱)، انبیاء (۷۱، ۸۱) اور سبا (۱۸) مشارق و مغارب جمع لانے کا مقصد یہ ہے کہ سرزمین شام کے تمام مشرقی اور مغربی علاقوں پر ان کی حکومت ہوگئی۔ کیونکہ ہر روز زمین کے ہر حصے میں سورج کے طلوع و غروب کا وقت اور جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ بعض اہل علم نے مصر اور شام دونوں مراد لیے ہیں اور لکھا ہے کہ فرعون کی تباہی کے بعد بنی اسرائیل مدتوں مصر پر حکمران رہے۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ دخان (۲۸)، شعراء (۵۹) اور قصص (۵) اس صورت میں "بٰرَكْنَا فِيْهَا" سے مراد سرزمین مصر و شام کا نہایت زرخیز اور آباد ہونا ہوگا۔

③ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى ...... : "الْحُسْنٰى" یہ "اَلْاَحْسَنُ" کی مؤنث ہے جو تفضیل کا صیغہ ہے۔ بہترین بات سے مراد اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہم تمھارے دشمنوں کو ہلاک کریں گے اور تمھیں اس سرزمین کی وراثت اور حکومت عطا فرمائیں گے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ وعدہ پورا کرنے کا باعث اللہ تعالیٰ نے ان کا صبر بیان فرمایا کہ اتنی سختیوں کے باوجود انھوں نے فرعون کو رب نہیں مانا، اپنے مسلمان ہونے پر قائم رہے، اگرچہ غلامی اور محکومیت کی وجہ سے ان کے مزاج اور دینی حالت میں کئی خرابیاں آچکی تھیں، مگر انھوں نے اسلام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

④ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ : "يَصْنَعُ" سے مراد ان کی مصنوعات، کارخانے، عمارتیں اور ہتھیار وغیرہ ہیں اور "يَعْرِشُوْنَ" کا معنی اگرچہ انگور وغیرہ کے لیے چھپر وغیرہ بنانا بھی ہوتا ہے، مگر مصر میں چونکہ چھپر والے انگوروں کا رواج

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ

ہم نے برکت رکھی ہے اور تیرے رب کی بہترین بات بنی اسرائیل پر پوری ہوگئی، اس وجہ سے کہ انھوں نے صبر کیا او

نہیں تھا، اس لیے اس سے مراد وہ بلند عمارتیں ہیں جو وہ بناتے تھے۔

⑤ وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ : فرعون سے نجات پا کر سمندر پار کرنے کا یہ مبارک دن عاشوراء (دس محرم) تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے شکر ادا کرنے کے لیے اس دن کا روزہ رکھا اور یہودی بھی اس دن روزہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں سے روزے کی وجہ پوچھ کر فرمایا: ''ہم تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام پر حق رکھتے ہیں۔'' چنانچہ خود بھی روزہ رکھا اور تمام مسلمانوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ آئندہ سال رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشوراء کا روزہ نفل ہو گیا، جو چاہے رکھے جو چاہے نہ رکھے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ و لقد أوحينا إلى موسىٰ ...... ﴾ : ۴۷۳۷، ۱۵۹۲، عن ابن عباس وعائشة رضی اللہ عنہم]

اہل مکہ بھی جاہلیت میں اس دن کا روزہ رکھتے تھے اور اس دن کعبہ پر نیا غلاف چڑھایا جاتا تھا۔ [بخاری، الحج، باب قول الله تعالىٰ : ﴿ جعل الله الكعبة...... ﴾ : ۱۵۹۲، عن عائشة رضی اللہ عنہا] آخر عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روزے کی فضیلت کے حصول اور یہود کی مخالفت کی خاطر فرمایا: ((لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ)) ''اگر میں آئندہ سال تک زندہ رہا تو ۹ کا روزہ رکھوں گا۔'' مگر آئندہ سال آنے سے پہلے آپ فوت ہو گئے۔ [مسلم، الصیام، باب أي يوم يصام في عاشوراء : ۱۳۴/۱۱۳۴، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما] حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت بھی اس دن ہوئی مگر دین اس سے پہلے مکمل ہو چکا تھا، ان کی شہادت کی وجہ سے دین میں کوئی بھی اضافہ، مثلاً ماتم یا جلوس یا سبیلیں وغیرہ لگانا بدعت ہوگا۔

⑥ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ : پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کے مظالم پر بنی اسرائیل کے صبر کی تعریف اور اس کی وجہ سے ان پر اپنے مزید انعامات کا ذکر فرمایا تھا۔ اب یہاں سے ان کی خوش حالی کے دور کی آزمائش کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اسی سورت میں ہر قوم کی تنگی اور آسانی کے ساتھ آزمائش کا ذکر ہوا تھا۔ (دیکھیے اعراف : ۹۴) اور اس بات کا بھی کہ ہم نے ان میں سے اکثر کے لیے کوئی عہد نہیں پایا اور ان کے اکثر کو ہم نے فاسق ہی پایا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۰۲) آزادی ملنے کے بعد بنی اسرائیل کی بدعہدی اور فسق کا اور اس کے نتیجے میں انھیں ملنے والی سزا کا تذکرہ بنی اسرائیل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی دعوت اور آپ کی مخالفت سے باز رہنے کی نصیحت کے لیے کیا گیا ہے۔ اس میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی نصیحت ہے کہ تم لوگ بھی ان کے نقش قدم پر نہ چل نکلنا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں سمندر سے پار کر دیا تو انھوں نے مشرق کی طرف بیت المقدس ارضِ شام کا رخ کیا، ابھی چلے ہی تھے کہ ان کا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں پر مجاور بنے بیٹھے تھے، یعنی ان کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ بت بزرگوں کے تھے یا گائے وغیرہ کے، قرآن نے ذکر نہیں فرمایا اور نہ ہی حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کا جہل اور کفر دیکھیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اتنے واضح معجزات اور اللہ تعالیٰ کے انعامات دیکھنے کے بعد انھوں نے گستاخانہ لہجے میں نام لیتے ہوئے ''اے موسیٰ'' کہہ کر مطالبہ کر دیا کہ ہمارے لیے بھی ان کے معبودوں جیسے معبود بنا دو۔ اس کی وجہ لمبے عرصے تک غلامی کی وجہ سے اہل مصر کے

فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ

ہم نے برباد کر دیا جو کچھ فرعون اور اس کے لوگ بناتے تھے اور جو عمارتیں وہ بلند کرتے تھے ﴿۱۳۷﴾ اور ہم نے

مشرکانہ عقائد کا ذہنوں میں جاگزیں ہونا تھا۔

بعض علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل چونکہ موحد تھے، اس لیے ان کی بت بنانے کے اس مطالبے سے یہ غرض نہ تھی کہ وہ شرک کریں، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم اس بت کی تعظیم سے اللہ کا تقرب چاہیں گے، وہ سمجھے کہ یہ شرک نہیں ہے، حالانکہ اس کا شرک ہونا انبیاء علیہم السلام کا اجماعی مسئلہ ہے، کیونکہ اگر یہ شرک نہ ہو تو مکہ کے مشرک اور دوسرے بہت سے مشرک بھی موحد ہی رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک جگہ ذکر فرمایا ہے: ﴿ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾ [یونس : ۱۸] ''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو انھیں نہ نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے نہ وہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔'' اور دوسری آیت میں ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر : ۳] ''اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا۔''

7 اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ: یعنی افسوس کہ تم اللہ تعالیٰ کی شان نہیں پہچانتے، اللہ تعالیٰ کی ذات تو وہ ہے کہ نہ اس کی کوئی صورت بن سکتی ہے اور نہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک ٹھہرایا جا سکتا ہے، سو یہ مطالبہ سراسر جاہلانہ اور مشرکانہ ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جاہل آدمی نظر نہ آنے والے رب کی عبادت کر کے تسکین نہیں پاتا جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو، بنی اسرائیل نے جب وہ قوم دیکھی کہ گائے کی صورت کی پوجا کرتے تھے تو انھیں بھی یہ ہوس آئی، آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا۔'' (موضح) آیت میں گائے کی صورت کی صراحت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کی بنیاد بن دیکھے رب تعالیٰ پر ایمان لانا ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ (۳) میں ہے: ﴿ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی لذت نے موسیٰ علیہ السلام کے دل کو پروردگار کو دیکھنے کی درخواست پر مجبور کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں مشاہدہ کروا کر واضح کر دیا کہ دنیا میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب پیغمبر کا بن دیکھے رب پر ایمان دیکھیے اور قوم کا نظر آنے والے خدا کا مطالبہ دیکھیے! دراصل شرک کی بنیاد ہی یہ ہے کہ معبود آنکھوں کے سامنے نظر آنا ضروری ہے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

ذوق حضور در جہاں رسم صنم گری نہاد　　عشق فریب می دہد جان امیدوار را

یعنی معبود کو اپنے سامنے حاضر دیکھنے کے ذوق ہی نے دنیا میں بت بنانے کی رسم کی بنیاد رکھی، کیونکہ عشق امید رکھنے والی

يَعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اتارا تو وہ ایسے لوگوں پر آئے جو اپنے کچھ بتوں پر جمے بیٹھے تھے، کہنے لگے اے موسیٰ! ہمارے لیے کوئی معبود بنا دے، جیسے ان کے کچھ معبود ہیں؟ اس نے کہا بے شک تم ایسے لوگ ہو جو نادانی کرتے ہو ﴿۱۳۸﴾

جان کو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ افسوس کہ بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کچھ مسلمانوں نے تو پختہ قبریں بنا کر ان پر مجاورت کے ذریعے سے اپنا یہ ذوق پورا کیا اور اکثر لوگوں نے معرفت کے نام پر اپنے شیخ کا تصور ہر لمحے آنکھوں کے سامنے اس طرح رکھا کہ وہ عدم موجودگی میں بھی انھیں آنکھوں سے نظر آنے لگا اور وہ اپنے خیال میں اس سے پوچھ کر ہر کام کرنے لگے۔ اس کا نام انھوں نے فنا فی الشیخ ہونا رکھا، پھر کچھ آگے بڑھے اور اسی صورت کو رسول قرار دے کر انھیں آنکھوں سے دیکھنا، ان سے باتیں کرنا اور ہدایات لینا شروع کر دیا اور اسے فنا فی الرسول قرار دیا، پھر کچھ اور آگے بڑھے تو اسی صورت کو رب قرار دے کر ہر لمحے آنکھوں کے سامنے رکھ لیا اور اسے فنا فی اللہ کہہ کر شیخ کی صورت کے خدا ہونے اور ہر وقت اس کے دیدار اور اس سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ انتہا یہاں جا کر ہوئی کہ اپنے آپ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ہو جانے کا دعویٰ کر دیا۔ کسی نے کہا "اَنَا الْحَقُّ" میں خدا ہوں۔ کسی نے کہا "سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ" میں سبحان ہوں، میری شان کس قدر عظیم ہے اور کسی نے کہا ؎

من تو شدم تو من شدی   من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں   من دیگرم تو دیگری

یعنی "میں تو ہو گیا، تو میں ہو گیا، میں جان بن گیا تو جسم بن گیا، تاکہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہے کہ میں اور ہوں اور تو کوئی دوسرا ہے۔" شرک اور مشرکین کا یہ سارا گورکھ دھندا دماغ کی خرابی اور وہم و خیال پر مبنی ہے اور ان کی تمام ریاضتیں دماغ کو خراب کرنے کے لیے ہیں، جو ہندو جوگیوں اور نصرانی راہبوں سے لی گئی ہیں۔ جن کے نتیجے میں وہ کچھ آنکھوں کو دکھائی دینے لگتا ہے جو محض گمان اور خیال کی پیداوار ہوتا ہے اور جس کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ترک حیواناتِ جلالی و جمالی کی اصطلاح بنا کر اللہ تعالیٰ کی بہت سی نعمتوں، مثلاً گوشت، دودھ، دہی، گھی اور شہد چھوڑنے سے دماغ میں مزید خشکی اور خرابی پیدا ہو کر انھیں نظر نہ آنے والی چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ تمام بت پرست اسی خیال اور خواہشِ نفس کے پیچھے لگ کر خیالی خداؤں کی پرستش کر رہے ہیں، کوئی پتھر کی بنی ہوئی صورت سامنے رکھ کر اور کوئی اس کا تصور سامنے رکھ کر، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت قرآن و حدیث میں قرب الٰہی کے لیے ان ریاضتوں، سلسلوں اور ذریعوں کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے وہم و گمان اور خواہش نفس کا اتباع کہہ کر بت پرستی قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ نجم (۱۹ تا ۲۵) اگر اللہ تعالیٰ کے

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

بے شک یہ لوگ، تباہ کیا جانے والا ہے وہ کام جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اور باطل ہے جو کچھ وہ کرتے چلے آرہے ہیں ﴿۱۳۹﴾ کہا کیا میں اللہ کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تمھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ہے ﴿۱۴۰﴾ اور جب ہم نے تمھیں فرعون کی آل سے نجات دی، وہ تمھیں برا عذاب دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو بری طرح قتل کرتے اور تمھاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ﴿۱۴۱﴾

قرب اور دیدار کا طریقہ یہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ہمیں ضرور بتا دیتے۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر دنیا میں رب تعالیٰ کا دیدار برداشت نہیں کر سکے تو کسی اور بے چارے کی کیا مجال ہے۔

آیت 139 اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ ...... : موسیٰ علیہ السلام نے ان کے مطالبے کے جواب میں چار باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ تم لوگ جہالت، یعنی نادانی اور اکھڑ پن اختیار کر رہے ہو، جیسا کہ پچھلی آیت میں گزرا ہے۔ دوسری یہ کہ یہ لوگ اس وقت جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ و برباد کر دیا جانے والا ہے اور اس سے پہلے بھی یہ جو کچھ کرتے آئے ہیں، باطل ہے۔ ایسے کام کا مطالبہ دنیا میں گمراہی و تباہی اور آخرت میں عذاب کا باعث ہے۔

آیت 140 قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا ...... : تیسری ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے بطور سوال ڈانٹ ہے کہ کیا الٰہ (معبود) بھی کوئی ایسی ہستی ہے کہ انسان جسے جی چاہے بنا لے، بلکہ معبود تو وہی ہو سکتا ہے جو انسان کو ہر قسم کے انعامات سے نوازتا ہے اور پھر جس ذات نے تم پر بے بہا انعامات کیے ہیں اور تمھیں تمام عالم پر فضیلت بخشی ہے، کیا اب اس کی شکر گزاری یہی ہے کہ اسے چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرنے لگو؟ یہ شکر گزاری نہیں بلکہ عین ناشکری اور نمک حرامی ہے۔

آیت 141 وَ اِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ...... : چوتھی یہ کہ آل فرعون سے نجات کو یاد کرو کہ اکیلے فرعون ہی نے نہیں بلکہ پوری قوم نے تمھیں غلام بنا رکھا تھا۔ "بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" آزمائش انعام اور مصیبت دونوں طرح ہوتی ہے۔ اس واقعہ میں تم پر مصیبت کا ابتلا بھی آیا اور انعام کا بھی۔ تمھارے لڑکوں کا ذبح کرنا اور عورتوں کو زندہ رکھ کر لونڈیاں بنا کر ان سے کام لینا اور اپنی خواہش نفس پوری کرنا اور مردوں کو ختم کرنے کے ذریعے سے بنی اسرائیل کی نسل ختم کرنے کا منصوبہ بنانا مصیبت تھا اور اس سے نجات انعام۔ مزید دیکھیے سورۂ بقرہ (۴۹)۔

ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حنین کی طرف نکلے تو مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کی میعاد مقرر کی اور اسے دس راتوں کے ساتھ پورا کر دیا، سو اس کے رب کی مقررہ مدت چالیس راتیں پوری ہوگئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا میری قوم میں تو میرا جانشین رہ اور اصلاح کرنا اور مفسدوں کے راستے پر نہ چلنا ﴿۱۴۲﴾

گزرے، جسے ذاتِ انواط کہا جاتا تھا، وہ لوگ اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ تو (نومسلم) لوگ کہنے لگے: ''یا رسول اللہ! آپ ہمارے لیے بھی ایک ذاتِ انواط مقرر فرما دیں، جیسا کہ ان کے لیے ذاتِ انواط ہے۔'' تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! یہ تو اسی طرح کی بات ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی کہ ہمارے لیے کوئی معبود بنا دے جس طرح ان (مشرکین) کے معبود ہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر سوار ہو جاؤ گے۔'' [ترمذی، الفتن، باب ما جاء لترکبن سنن ...... : ۲۱۸۰] ترمذی اور البانی رحمہما اللہ دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔

آیت 142 وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً ...... : فرعون سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر طلب فرمایا، تاکہ انھیں کتاب دی جائے۔ پہلے تیس دن کی میعاد مقرر کی گئی، پھر اس میں دس دن کا اضافہ کر دیا گیا، تاکہ ان چالیس دنوں میں موسیٰ علیہ السلام روزہ رکھیں اور دن رات عبادت اور تفکر و تدبر میں مصروف رہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تیس راتوں کی خلوت سے عبادت اور مناجات کی عادت پڑ جائے گی اور مناجات کی لذت سے آشنائی کے بعد دس راتیں بڑھانے سے بھی طبیعت پر بوجھ نہیں پڑے گا، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو پہلے ہی چالیس راتیں تھیں جو دس بڑھانے سے مکمل ہوگئیں۔ (واللہ اعلم) بعض روایات میں ہے کہ ان دس دنوں کا اضافہ اس لیے کیا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن کے روزوں کے بعد مسواک کر لی، جس سے وہ بو جاتی رہی جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب تھی، مگر اس روایت کا کوئی سراغ قرآن و حدیث سے نہیں ملا، نہ کسی صحیح سند سے اس کی تائید ہوتی ہے اور مسواک سے وہ بو جاتی بھی نہیں، کیونکہ وہ درحقیقت معدہ خالی ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے روزے دار کے لیے مسواک کے مستحب ہونے کا ایک باب مقرر فرمایا ہے: ((بَابُ السِّوَاكِ الرَّطْبِ وَالْيَابِسِ لِلصَّائِمِ)) یعنی روزے دار تازہ اور خشک مسواک کر سکتا ہے۔ [بخاری، الصوم، قبل ح : ۱۹۳۴]

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کی یہ میعاد پوری کر چکے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمایا اور انھیں تورات کی الواح (تختیاں) عطا فرمائیں۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کا مزاج سمجھتے تھے، ہارون علیہ السلام اگرچہ اس سے پہلے بھی اصلاح کی کوشش کرتے رہتے تھے مگر ان

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَ لٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔ فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا اور لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھ، سو اگر وہ اپنی جگہ برقرار رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ تو جب اس کا رب پہاڑ کے سامنے ظاہر ہوا تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا، پھر

کی حیثیت ایک مددگار اور وزیر کی تھی، اصل قائد موسیٰ علیہ السلام ہی تھے، اب ان دنوں کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے انھیں اپنا خلیفہ (جانشین) مقرر فرمایا اور تاکید فرمائی کہ وہ ان کی اصلاح کرتے رہیں اور فسادیوں کے پیچھے مت لگیں۔

آیت 143 ① وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا: میقات سے مراد مقرر کردہ وقت ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حاضری کا وعدہ تھا، اس لیے "وٰعَدْنَا" (باب مفاعلہ) استعمال فرمایا جو دو فریقوں کے درمیان ہوتا ہے۔

② وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ: یعنی کسی واسطے کے بغیر کلام فرمایا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵۳) اور نساء (۱۶۴) یہ ان کا اللہ سے ہم کلام ہونے کا دوسرا موقع تھا۔ پہلے موقعے کا ذکر سورۂ طٰہٰ (۱۲) میں ہے، جب آگ لینے گئے تھے اور رسالت سے سرفراز ہوئے تھے۔ واسطے کے بغیر اس لیے کہ فرشتے کے ذریعے سے یا دل میں ڈال کر تو ہر نبی سے کلام ہوتا تھا، جسے "وحی" کہتے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کیا ہوئی؟ جس کا ذکر تمام لوگ قیامت کے دن موسیٰ علیہ السلام سے کر کے سفارش کی درخواست کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ مشرک یونانیوں کے فلسفی عقائد سے متاثر لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کلام کر ہی نہیں سکتا، اس لیے یہاں ایسا کلام مراد ہے جس میں نہ لفظ تھے نہ آواز۔ کوئی ان سے پوچھے کہ یہ بات تمھیں قرآن مجید کی کس آیت یا حدیث سے معلوم ہوئی؟ قرآن مجید نے تو موسیٰ علیہ السلام کے لیے "کلام" کا لفظ استعمال فرمایا اور "ندا" کا بھی۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۱۰) اللہ کے کلام کرنے کے منکروں نے کہا، کلام سے مراد کلام نفسی ہے جو دل میں ہوتا ہے۔ مگر وہ تو سنائی نہیں دیتا اور وہ تو گونگوں کے دل میں بھی ہوتا ہے، اسے آپ سوچ، فکر اور ارادہ وغیرہ کہہ سکتے ہیں، مگر الفاظ کے نکلے بغیر کلام کیسے بن گیا؟ تم نے اللہ تعالیٰ کی کیا قدر کی کہ اسے بولنے سے معذور قرار دے کر گونگوں کے برابر کر دیا!! یہ لوگ قرآن کو بھی اللہ کا کلام نہیں مانتے، بلکہ اسے مخلوق کہتے ہیں کہ جو مفہوم اور معانی اللہ تعالیٰ کی ذات کے اندر موجود تھے اللہ تعالیٰ نے وہ معانی موسیٰ علیہ السلام کو پہنچانے کے لیے ہوا میں ایسے لفظ پیدا کر دیے جو وہ مفہوم ادا کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن اللہ کا کلام نہیں، اس کی مخلوق ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مخلوق تو فنا بھی ہو سکتی ہے، اس لیے قرآن سے جان چھڑانے کا ایک حیلہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قرآن اللہ کی مخلوق تھا، فنا ہو گیا، لہٰذا اب عمل کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں سے بس ایک ہی سوال ہے جو امام اہل السنہ احمد ابن حنبل رحمہ اللہ نے ان سے بار بار اور مسلسل کیا کہ بتاؤ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہاں فرمائی ہے؟! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فرمان اس کے ثبوت کے لیے پیش کرو؟ محض فلسفیوں کے دماغ کی خرابی سے دین کبھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ تو کلام اللہ کو مخلوق کہنے والے اور اسے اللہ کی

وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

جب اسے ہوش آیا تو اس نے کہا تو پاک ہے، میں نے تیری طرف توبہ کی اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں ﴿۱۴۳﴾

صفت ماننے کے منکر آخر وقت تک یہ مطالبہ پورا نہ کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔

❸ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ...... : فرشتے کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلام کی لذت سے موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ایسا شوق پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر دی کہ پروردگارا ! اپنا آپ مجھے دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا: ﴿ لَنْ تَرٰىنِيْ ﴾ ”تو مجھے ہرگز نہ دیکھے گا۔“ یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے کسی آنکھ میں یہ طاقت نہیں رکھی کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کو برداشت کر سکے۔ رہا آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار تو وہ مومنوں کے حق میں قرآن مجید کی آیات اور متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ قیامہ (۲۲، ۲۳) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس مقام پر لکھا ہے: ”یقین ہے کہ آخرت میں اللہ کو دیکھنا ہے، گمراہ لوگ منکر ہیں کہ ان کے نصیب میں نہیں۔“ (موضح)

❹ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ: یعنی جب میں پہاڑ پر تجلی فرماؤں تو دیکھ اگر...... یہ مشاہدہ کروا کر موسیٰ علیہ السلام کی دل جوئی فرمائی کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا کوئی برداشت ہی نہیں کر سکتا، تا کہ وہ درخواست قبول نہ ہونے پر دل گیر نہ ہوں۔

❺ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ ...... : ” تَجَلّٰى “ یہ ”جَلَا يَجْلُوْ جَلْوَةً“ سے باب تفعل ہے۔ ”جَلَا “ کا معنی ظاہر کرنا، پردہ ہٹانا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ؎

وَجَلَا السُّيُوْلُ عَنِ الطُّلُوْلِ كَاَنَّهَا زُبُرٌ تُجِدُّ مُتُوْنَهَا اَقْلَامُهَا

”سیلابوں نے پرانے کھنڈر اس طرح ظاہر کر دیے جیسے وہ ایسی کتابیں ہیں جن کے قلم ان کے متون کو نیا کر دیتے ہیں۔“ ” تَجَلّٰى “ کا معنی ظاہر ہوا۔ ” دَكًّا “ مصدر ہے۔ ” دَكَّ يَدُكُّ “ (ن) اور ” دَقَّ يَدُقُّ “ قریب قریب معنی رکھتے ہیں، یعنی کسی چیز کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دینا۔ یہاں ” دَكًّا “ مفعول مطلق ہے، یعنی ”دَكَّهٗ دَكًّا“ کہ اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴾ [الفجر : ۲۱] اور ﴿ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴾ [الحاقة : ۱۴] ”اَرْضٌ دَكَّاءُ“ اس زمین کو بھی کہتے ہیں جو برابر اور ہموار ہو، یعنی جب رب تعالیٰ پہاڑ کے لیے ظاہر ہوا تو اس جلوے نے پہاڑ کو زمین کے برابر کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا جلوہ تو کجا پہاڑ کی حالت دیکھنے کی تاب بھی نہ لا سکے، بلکہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بعض لوگوں نے ” صَعِقًا “ کا معنی کیا ہے کہ فوت ہو کر گر پڑے، اگرچہ ” صَعِقًا “ اس معنی میں بھی آتا ہے، مگر ” فَلَمَّآ اَفَاقَ “ (جب اسے ہوش آیا) کے الفاظ بتاتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام فوت نہیں بلکہ بے ہوش ہوئے تھے۔ انس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے متعلق بیان کرتے ہیں: ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا ﴾ [الأعراف : ۱۴۳] فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سمجھانے کے لیے) اپنا انگوٹھا انگلی کے پورے کے قریب رکھا (اور فرمایا) ”تو پہاڑ دھنس گیا۔“ [ابن أبي عاصم في السنة : ۴۸۰، و صححه الألباني]

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَ بِكَلَامِيْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

فرمایا اے موسیٰ! بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے، پس لے لے جو کچھ میں نے تجھے دیا ہے اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جا ﴿۱۴۴﴾ اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں ہر چیز کے بارے میں نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، سو انھیں قوت کے ساتھ پکڑ اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کی بہترین باتوں کو پکڑے رکھیں، عنقریب میں تمھیں نافرمانوں کا گھر دکھاؤں گا ﴿۱۴۵﴾

6 قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ: تو پاک ہے (کہ تجھے دنیا میں کوئی دیکھ سکے) میں توبہ کرتا ہوں (اس بات سے کہ تیری اجازت کے بغیر تجھے دیکھنے کی درخواست کر بیٹھا)

7 وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ: اور میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں، یعنی تجھ پر اور تیری عظمت وجلال پر، یا اس پر کہ کوئی تجھے قیامت سے پہلے نہیں دیکھ سکتا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے بزرگی دی کہ فرشتے کے بغیر خود کلام فرمایا، ان کو شوق ہوا کہ دیدار بھی کروں، اس کی برداشت نہ ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہے، کیونکہ نمود (ظہور) ہوا تھا پہاڑ کی طرف، لیکن دنیا کے وجود کو برداشت نہ ہوئی مگر آخرت کے وجود کو برداشت ہوگی، وہاں دیکھنا یقینی ہے۔“ (موضح)

آیت 144 وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ: یعنی میں نے جو اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے لیے تمھیں چنا ہے یہی بہت بڑی نعمت ہے، لہٰذا جو چیز مل گئی اس پر قناعت کر اور کسی ایسی چیز کا مطالبہ نہ کر جو تیری طاقت سے باہر ہے۔ اس سے مقصود موسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا ہے کہ دیکھنے سے روک دینے پر دل گرفتہ نہ ہوں۔

آیت 145 1 وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ......: یعنی تمام عقائد و احکام اور نصائح جن کی حلال وحرام اور دین کے دوسرے معاملات معلوم کرنے کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کو ضرورت پیش آسکتی تھی۔ ”كُلِّ“ کا لفظ موقع کی مناسبت ہی سے متعین ہوتا ہے، مثلاً ملکۂ سبا کے متعلق آتا ہے: ﴿ وَ اُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النمل : ۲۳] ”اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔“ اور قوم عاد پر آنے والی آندھی کے متعلق فرمایا: ﴿ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا ﴾ [الأحقاف : ۲۵] ”جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی۔“ حالانکہ ظاہر ہے کہ نہ ملکۂ سبا کو کائنات کی ہر چیز عطا ہوئی تھی اور نہ اس آندھی نے کائنات کی ہر چیز کو برباد کیا تھا۔

2 فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ: اسے قوت کے ساتھ پکڑ۔ مجاہد نے فرمایا، جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کر۔ [بخاری، التفسیر، قبل ح : ٤٤٧٧]

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا

عنقریب میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں حق کے بغیر بڑے بنتے ہیں اور اگر ہر نشانی دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لاتے اور اگر بھلائی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے راستہ نہیں بناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے (۱۴۶) اور جن لوگوں نے

③ موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن کے اعتکاف کے بعد کتاب ملی، جب کہ اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور ان کے احکام سے انکار کی وجہ سے ہلاک کی جا چکی تھی اور اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کو کوئی کتاب نہیں ملی تھی، تقریباً چالیس سال تک اترنے والی وحی موسیٰ علیہ السلام کی حدیث ہی تھی، جس کے انکار کی وجہ سے فرعون غرق ہوا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اسی طرح دونوں قسم کی وحی اتری، ایک کتاب اللہ اور دوسری حدیث۔ جس طرح کتاب اللہ کا منکر مسلمان نہیں، اسی طرح حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننے والا بھی کافر ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پہلے نبیوں کی طرح دونوں قسم کی وحی اتری۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۶۳ تا ۱۶۵) از فوائد مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ۔

④ وَاْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا: ''اس کی بہتر باتیں'' یعنی جو کرنے کے حکم ہیں اور بری باتیں (وہ ہیں) جن کے نہ کرنے کا حکم ہے۔ (موضح) یا رخصت کے بجائے عزیمت اختیار کریں جو بہترین ہے اور جس کا اجر زیادہ ہے۔ یا دو کاموں میں سے ایک اچھا ہے اور ایک اس سے بھی اچھا ہے تو بہترین پر عمل کی کوشش کریں، مثلاً قصاص لینا، یا معاف کر دینا، انتقام لینا یا صبر کرنا اور درگزر سے کام لینا۔ قرض وصول کرنے میں مہلت دینا یا چھوڑ دینا وغیرہ، اگرچہ دونوں اچھے ہیں مگر احسن پر عمل کی کوشش کریں۔

⑤ سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ: یعنی میں تمھیں فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا، یعنی دوبارہ فرعون اور اس کی آل کے گھر مصر لے جاؤں گا، اگرچہ کچھ دیر کے بعد، جیسا کہ بعد میں بنی اسرائیل کو فرعون کے باغات اور خزانوں کا مالک بنا دیا۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۳۷) کے حواشی۔ استاد محمد عبدہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے، یعنی اگر تم نے ان باتوں پر عمل نہ کیا تو تمھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ میری نافرمانی کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور انھیں کس قسم کی تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے (گویا "دَارَ الْفٰسِقِیْنَ" سے مراد جہنم ہے)۔ (ابن جریر) بعض نے لکھا ہے کہ "دَارَ الْفٰسِقِیْنَ" سے مراد اہل شام ہیں، گویا اس میں وعدہ ہے کہ ملک شام تمھارے قبضے میں آئے گا۔ (کبیر) یا یہ کہ اگر تم نے نافرمانی کی تو تم کو اسی طرح ذلیل کریں گے جس طرح شام کا ملک ان سے چھین کر تم کو دیا۔ (موضح)

آیت 146 ① سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ ...... : نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا جس کے دل میں

وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ضائع ہوگئے، وہ اسی کا بدلہ دیے جائیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴۷﴾ اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑا بنا لیا، جو ایک جسم تھا، جس کی گائے جیسی آواز تھی۔ کیا انھوں نے یہ نہ دیکھا کہ بے شک وہ نہ ان سے بات کرتا ہے اور نہ انھیں کوئی راستہ بتاتا ہے۔ انھوں نے اسے (معبود) بنا لیا اور وہ ظالم تھے ﴿۱۴۸﴾

ذرہ برابر کبر ہوگا۔'' ایک آدمی نے کہا: ''آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (کیا یہ بھی کبر ہے)؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو بڑا بنتے ہوئے حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر اور بے وقعت جاننے کا نام ہے۔'' [مسلم، الإیمان، باب تحریم الکبر و بیانہ : ۹۱، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ] اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سن کر جو لوگ اپنی بڑائی اور برتری کے زعم میں حق قبول نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ بھی انھیں اپنی آیات قبول کرنے سے دفع دور کر دیتا ہے۔ یہاں فرمایا: ''میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا.....'' یعنی انھیں یہ سزا دوں گا کہ وہ میری عظمت، شریعت اور احکام کو سمجھ نہ سکیں گے اور پھر جاہل رہنے کی وجہ سے دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ہوں گے۔ (نیز دیکھیے انعام : ۱۱۰) اس لیے بعض سلف کا قول ہے: ''متکبر شخص علم حاصل نہیں کر سکتا اور جو شخص علم حاصل کرنے کے لیے ایک ساعت کی ذلت گوارا نہیں کر سکتا وہ جاہل رہ کر ہمیشہ کی ذلت مول لیتا ہے۔'' (ابن کثیر) ''**بِغَيْرِ الْحَقِّ**'' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حق بنتا ہو وہاں بڑا بن کے دکھانا درست ہے، مثلاً کفار کے مقابلے میں میدان جنگ کے اندر اللہ تعالیٰ کو متکبرانہ انداز کی چال بھی محبوب ہے جو عام حالات میں اسے سخت ناپسند ہے۔

② **وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ**: یعنی یہ سب ان کے اپنے کیے کی سزا ہوگی، جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ **فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ** ﴾ [الصف : ۵] ''جب وہ ٹیڑھے ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''الواح (تختیاں) دے کر یہ بھی فرمایا کہ قوم کو تقید (پابند) کرو کہ عمل کریں اور یہ بھی فرما دیا کہ جو بے انصاف ہیں اور حق پرست نہیں ان کے دل میں پھیر دوں گا، اس پر عمل نہیں کریں گے، یعنی ان حکموں کی توفیق نہ ہوگی اور جو اپنی عقل سے کریں گے وہ قبول نہ ہوگا۔'' (موضح)

آیت 148 ① **وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى**...... : یہی قصہ سورۂ طٰہٰ میں بھی بیان ہوا ہے۔ ''**مِنْ حُلِيِّهِمْ**'' (اپنے زیوروں سے) یہ الفاظ صراحت کر رہے ہیں کہ وہ زیورات بنی اسرائیل کے اپنے تھے، اس لیے بائبل اور ہماری تفسیروں کی اسرائیلی

وَ لَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ يَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور جب وہ پشیمان ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ بے شک وہ تو گمراہ ہوگئے ہیں، تو انھوں نے کہا یقیناً اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور ہی خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے ﴿۱۴۹﴾

روایات میں جو کہا گیا ہے کہ وہ زیور قبطیوں کے تھے اور بنی اسرائیل نے ان سے ادھار لیے تھے وہ درست نہیں، مزید تفصیل سورۂ طٰہٰ (۸۷) میں دیکھیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تو ان میں سے ایک شخص سامری نے ان سے یہ زیورات لے لیے اور انھیں آگ میں پگھلا کر بچھڑے کی شکل کا ایک مجسمہ بنا ڈالا، جس سے گائے کی آواز نکلتی تھی، اس آیت میں اس مجسمے کے بنانے کو بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کیونکہ سامری نے اسے ان کی اجازت اور رضا مندی سے بنایا تھا اور وہ اپنے لیے اس قسم کے ایک معبود کی خواہش رکھتے تھے۔ (ابن کثیر) تفسیر ثنائی میں ہے کہ موجودہ تورات کی دوسری کتاب کے بتیسویں باب میں جو لکھا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے خود ہی ان کو بچھڑا بنا دیا تھا، یہ صریح غلط ہے، شانِ نبوت اور شرک اجتماع ضدین ہے۔ عیسائیو! قرآن کے "مُهَيْمِنٌ عَلَى التَّوْرَاةِ" ہونے میں اب بھی شک کرو گے؟ (مُهَيْمِنٌ کا معنی سمجھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے سورۂ مائدہ: ۴۸ کے حواشی) مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ بچھڑا واقعی گوشت پوست اور خون کا بن گیا تھا اور اس میں جان پڑ گئی تھی، یا وہ محض ایک مجسمہ رہا، جس میں ہوا داخل ہوتی یا داخل کی جاتی تو اس سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی؟ جو مفسرین اس کے واقعی جاندار بچھڑا ہونے کے قائل ہیں وہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے پاس گھوڑی پر سوار آئے، سامری نے انھیں دیکھ لیا اور ان کی گھوڑی کے پاؤں تلے کی کچھ مٹی لے لی اور انھوں نے سورۂ طٰہٰ کی آیت (۹۶) ﴿ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ ﴾ کے یہی معنی کیے ہیں، چنانچہ اس مٹی کو جب انھوں نے بچھڑے کے اس مجسمے پر ڈالا تو وہ سچ مچ کا بچھڑا بن گیا، لیکن یہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ نیز دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۸ تا ۹۶)۔

② اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا: اللہ تعالیٰ نے تو نظر نہ آنے کے باوجود موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور ہدایت کا راستہ بھی بتایا، یہ عجیب معبود ہے کہ سامنے ہونے کے باوجود نہ بات کر سکتا ہے نہ ہدایت دے سکتا ہے، پھر وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر بالفرض اس میں جان بھی پڑ گئی ہے تو وہ ایک عاجز حیوان ہے، اس جیسی بلکہ اس سے بہتر بے شمار گائیں ڈنڈے کھاتی پھرتی ہیں اور زنجیروں میں بندھی ہوئی بے بس ہو کر دودھ دے رہی ہیں۔ معلوم ہوا معبود کے لیے کلام کرنے والا اور ہدایت دینے والا ہونا ضروری ہے۔ "کلام کرنے والا" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکم دے سکے، منع کر سکے اور "ہدایت دینے والا" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہدایت دینے پر قدرت ہو۔

آیت 149 وَلَمَّا سُقِطَ فِيْۤ اَيْدِيْهِمْ: یہ عربی زبان کا محاورہ ہے، جس کا معنی ہے کہ جب وہ نادم اور پشیمان ہوئے۔ رہی یہ بات کہ یہ محاورہ کیسے بنا تو ظاہر ہے کہ یہاں ان کے ہاتھوں میں گر پڑنے والی چیز مجہول رکھی گئی ہے، گویا ندامت کی

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗۤ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَ كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖؗ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

اور جب موسیٰ غصے سے بھرا ہوا، افسوس کرتا ہوا اپنی قوم کی طرف واپس آیا تو اس نے کہا بری ہے جو تم نے میرے بعد میری جانشینی کی، کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے جلدی کی، اور اس نے تختیاں پھینک دیں اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ لیا، اسے اپنی طرف کھینچتا تھا۔ اس نے کہا اے میری ماں کے بیٹے! بے شک ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا اور قریب تھے کہ مجھے قتل کر دیتے، سو دشمنوں کو مجھ پر خوش نہ کر اور مجھے ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر ﴿۱۵۰﴾

وجہ سے ان کے منہ ہاتھوں میں آ گرے اور اس پشیمانی میں انھوں نے اپنے چہرے ہاتھوں میں چھپا لیے۔ یا انسان جب پشیمان اور نادم ہوتا ہے تو وہ دانتوں سے ہاتھ کاٹتا ہے، گویا اس کا منہ اور دانت ہاتھوں میں آ گرتے ہیں، یعنی بے اختیار پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی جب انھیں کچھ ہارون علیہ السلام کے سمجھانے سے اور کچھ موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری پر ان کے غیظ و غضب سے احساس ہوا کہ ہم کتنا بڑا غلط کام کر بیٹھے ہیں تو انھوں نے یہ دعا کی۔ سورۂ بقرہ (۵۴) کی تفسیر میں ان کی توبہ، ایک دوسرے کو قتل کرنے اور توبہ کی قبولیت کا ذکر گزر چکا ہے۔

آیت 150 ① **وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا:** "**غَضْبَانَ**" "فَعْلَانُ" کے وزن پر کسی چیز سے بھرے ہوئے ہونے پر دلالت کرتا ہے، یعنی غصے سے بھرے ہوئے۔ "**اَسِفًا**" صفت کا صیغہ ہے، لغت میں اس کا معنی غصے والا بھی ہے جو غضب سے بھی بڑھ کر ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ **فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ** ﴾ [الزخرف : ۵۵] "پھر جب انھوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔" اور اس کا معنی افسوس اور غم بھی ہوتا ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ شدید غصہ اور افسوس ایک ہی چیز کی دو حالتیں ہیں، کوئی کمزور ہو تو اس پر غصہ آتا ہے اور طاقت ور ہو تو افسوس ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل میں رہ کر موسیٰ علیہ السلام کو ان پر غلبہ بھی حاصل تھا اور ان کی جہالتوں پر بے بس بھی تھے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام غصے اور افسوس سے بھرے ہوئے واپس لوٹے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں طور پر ہی خبر دے دی تھی کہ سامری نے آپ کے بعد آپ کی قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۸۵)۔

② **بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ:** یعنی میں جاتے وقت تمھیں کہہ گیا تھا کہ جب تک میں نہ آؤں ہارون میرے خلیفہ ہوں گے، ان کا حکم ماننا اور مفسدوں کے پیچھے نہ لگنا، مگر میں جب مقرر میعاد (۳۰) دن تک واپس نہ آیا تو تم نے سمجھ لیا کہ میں مر گیا ہوں، اس پر تم نے بچھڑا بنا کر پوجنا شروع کر دیا، اس طرح تم میرے بعد بہت برے جانشین ثابت ہوئے، یا تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ (المنار)

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِاَخِيْ وَ اَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

اس نے کہا اے میرے رب! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر لے اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم والا ہے ﴿۱۵۱﴾

③ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ...... : موسیٰ علیہ السلام کا شدید غصہ دو کاموں کی صورت میں ظاہر ہوا، ایک الواح کو پھینکنا اور دوسرا ہارون علیہ السلام کے سر کو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سنی ہوئی بات آنکھوں سے دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی، اللہ عزوجل نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دی جو ان کی قوم نے بچھڑے کے معاملے میں کیا تھا، مگر انھوں نے تختیاں نہیں پھینکیں، جب آنکھوں سے دیکھا جو کچھ انھوں نے کیا تھا تو تختیاں پھینک دیں تو وہ ٹوٹ گئیں۔'' [أحمد : ۱/ ۲۷۱، ح : ۲٤٥۱۔ مستدرك حاكم : ۲/ ۳۲۱، ح : ۳۲٥۰، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما وصححه الألباني]

④ قَالَ ابْنَ اُمَّ : موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کے سگے بھائی ہی تھے، مگر انھوں نے ان کی شفقت حاصل کرنے کے لیے ''اے میری ماں کے بیٹے'' کہا۔ ''ابْنَ اُمَّ '' اصل میں ''يَا ابْنَ أُمِّيْ ''تھا، حرف ندا یاء حذف کر دیا اور ''أُمِّيْ'' کی یاء کو الف سے بدل دیا تو ''ابْنَ أُمَّا'' بن گیا، پھر مزید تخفیف کے لیے الف بھی حذف کر دیا تو '' ابْنَ اُمَّ '' بن گیا۔

⑤ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ......: یعنی میں نے انھیں بچھڑے کی پوجا سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ (دیکھیے طٰہٰ : ۹۰) مگر یہ لوگ مجھ پر پل پڑے اور قریب تھا کہ مجھے قتل ہی کر دیتے۔

⑥ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ......: ''شَمَاتَةٌ '' کا معنی کسی نقصان پر دشمن کا خوش ہونا ہے۔ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس انداز غضب پر دشمن تو ضرور خوش ہوئے ہوں گے، دشمنوں سے مراد بچھڑا بنانے والے اور اس کی عبادت کی حمایت کرنے والے ہیں۔ اس لیے ہارون علیہ السلام نے کہا کہ اس طرح میری گرفت کر کے دشمنوں کو خوش نہ کرو۔ ﴿وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اور یہ طے نہ کرلو کہ میں بھی ان کے بچھڑا بنانے یا پوجنے کے عمل میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ اس سے ہارون علیہ السلام پر تورات کی اس تہمت کا واضح رد ہو گیا جس کا ذکر پیچھے (آیت ۱۴۸) میں ہوا ہے کہ یہ بچھڑا ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا۔ ہارون علیہ السلام کو اس بات سے بھی بہت تکلیف ہوئی کہ بھائیوں کے اختلاف سے دشمن خوش ہوں گے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ''شَمَاتَةُ الْأَعْدَاءِ'' سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے، یعنی اس بات سے ہمیشہ پناہ مانگتے کہ کسی مصیبت پر دشمنوں کو خوشی حاصل ہو۔ پوری دعا اس طرح ہے: ((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَ دَرَكِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ)) [بخاري، الدعوات، باب التعوذ من جهد البلاء : ٦٣٤٧]

آیت 151 قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِاَخِيْ: ہارون علیہ السلام کے حلیمانہ دعاجزانہ لہجے اور عذر سے موسیٰ علیہ السلام نرم ہو گئے اور اللہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ كَذٰلِكَ
نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ۝۱۵۲ وَ الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا ؗ اِنَّ رَبَّكَ
مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۵۳ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَ فِیْ
نُسْخَتِهَا هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ ۝۱۵۴

بے شک وہ لوگ جنھوں نے بچھڑا بنا لیا عنقریب انھیں ان کے رب کی طرف سے بھاری غضب پہنچے گا اور بڑی رسوائی دنیا کی زندگی میں اور ہم جھوٹ باندھنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ۝۱۵۲ اور جن لوگوں نے برے اعمال کیے، پھر ان کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، بے شک تیرا رب اس کے بعد ضرور بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۱۵۳ اور جب موسیٰ کا غصہ خاموش ہو گیا تو اس نے تختیوں کو اٹھا لیا اور ان کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو صرف اپنے رب سے ڈرتے ہیں ۝۱۵۴

تعالیٰ سے دعا کی کہ میری اس زیادتی کو معاف فرما جو مجھ سے غصہ کی حالت میں ہارون علیہ السلام کو ڈانٹنے میں ہوئی اور ہارون علیہ السلام کی اس کوتاہی سے درگزر فرما جو ممکن ہے لوگوں کو باز رکھنے میں ان سے ہوئی ہو۔

آیت 152 ① سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا: اللہ تعالیٰ کا ان پر غضب یہ ہوا کہ جب تک ان میں سے بعض نے بعض کو قتل نہیں کیا ان کی توبہ قبول نہیں ہوئی۔ (دیکھیے بقرہ: ۵۴) بنی اسرائیل میں جس طرح قتل عمد کی حد قتل تھی اسی طرح شرک کی حد بھی قتل ہی تھی اور یہ اس ''اِصْر'' یعنی بوجھ میں شامل تھی جو پہلی امتوں پر ڈالے گئے۔ ہماری امت میں یہ تخفیف ہوئی کہ شرک کی حد اب قتل نہیں بلکہ صدق دل سے توبہ ہی سے معافی ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر شرک پر اصرار کرے تو وہ مرتد ہے اور اسے قتل کیا جائے گا۔

② وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ: ابو قلابہ رحمہ اللہ نے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا: ''قیامت تک ہر مفتری کی یہی سزا ہے (خواہ دین میں شرکیہ کام ایجاد کرے یا کوئی اور)۔'' کیونکہ کوئی بھی نئی چیز دین میں داخل کرنے والا مفتری ہے اور بدعت بدترین جھوٹ ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے لگایا جاتا ہے۔ امام مالک اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مفترین'' کے معنی ''مبتدعین'' یعنی اہل بدعت کے ہیں اور ہر بدعتی قیامت تک ذلیل و خوار ہوتا رہے گا۔ (قرطبی، بغوی)

آیت 153 وَ الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ...... : معلوم ہوا خالص توبہ کے بعد ایمان و اصلاح کے ساتھ زندگی گزارنے سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے، وہ چھوٹا ہو یا بڑا، جس توبہ کے بعد عمل کی اصلاح نہ ہو اس کا اعتبار نہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۶۰)، آل عمران (۸۹) اور سورۂ نحل (۱۱۹)۔

آیت 154 ① وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ: ''سَكَتَ'' کا لفظی معنی ''خاموش ہونا'' ہے۔ یہ ایک پر لطف استعارہ

وَ اخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّاۤ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ
اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ
بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمی ہمارے مقررہ وقت کے لیے چنے، پھر جب انھیں زلزلے نے آ پکڑا تو اس نے کہا اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو انھیں اس سے پہلے ہلاک کر دیتا اور مجھے بھی، کیا تو ہمیں اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو ہم میں سے بے وقوفوں نے کیا ہے؟ یہ نہیں ہے مگر تیری آزمائش، جس کے ساتھ تو گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے، تو ہی ہمارا یار و مددگار ہے، سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے ﴿۱۵۵﴾

ہے، گویا یہاں غصے کو ایسے آدمی سے تشبیہ دی ہے جو مسلسل موسیٰ علیہ السلام کو بھڑکا رہا تھا، جب وہ انھیں بھڑکانے سے خاموش ہو گیا تو موسیٰ علیہ السلام بھی ٹھنڈے پڑ گئے۔ قرآن مجید میں جو لطف یہاں "سَكَتَ" کا لفظ دے رہا ہے کوئی دوسرا لفظ، مثلاً "سَكَنَ" (ساکن ہو گیا) وغیرہ کبھی یہ لطف نہ دیتا۔

② اَخَذَ الْاَلْوَاحَ: غصہ ٹھنڈا ہونے پر موسیٰ علیہ السلام نے وہ تختیاں اٹھائیں جو اگرچہ گرنے کی وجہ سے کچھ ٹوٹ گئی تھیں، جیسا کہ اس سے پہلے آیت (۱۵۰) کے حاشیہ (۳) میں صحیح حدیث سے نقل ہوا، مگر اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ ٹوٹنا معمولی تھا، ایسا نہ تھا کہ تختیاں اٹھائی نہ جا سکتیں، یا انھیں پڑھنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہوتا۔

③ وَ فِيْ نُسْخَتِهَا: "نُسْخَةٌ" "فُعْلَةٌ" کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے۔ "نَسَخَ يَنْسَخُ (ف)" کے معنی اگرچہ پہلے حکم کو دوسرے حکم کے ساتھ ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، مگر اس کا معنی "لکھنا" بھی آتا ہے۔ "اِسْتَنْسَخَ" بھی اسی معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الجاثیۃ : ۲۹] "بے شک ہم لکھواتے جاتے تھے جو تم عمل کرتے تھے۔" "نُسْخَةٌ" اس اصل کو بھی کہتے ہیں جس سے نقل کیا جائے اور نقل شدہ کو بھی "نُسْخَةٌ" کہا جاتا ہے۔

④ لِلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ: آسمانی کتابوں سے فائدہ اور ہدایت انھی کو حاصل ہوتی ہے جو صرف اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۳)۔

آیت 155 ① وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ ......: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ وقت پر اپنے ساتھ جانے کے لیے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب فرمایا، ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے بہترین آدمیوں ہی کا انتخاب کیا ہوگا، مگر وہاں جا کر ان پر اللہ کا ایسا غضب ہوا کہ وہ سب زلزلے سے مر گئے۔ اس عذاب کا باعث کیا تھا؟ مفسرین نے مختلف وجوہ بیان کی ہیں، جن میں سے سب سے راجح وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ (۵۵) میں ذکر ہوئی ہے کہ انھوں نے

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بھی، بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ فرمایا میرا عذاب، میں اسے پہنچاتا ہوں جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، سو میں اسے ان لوگوں کے لیے ضرور لکھ دوں گا جو ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور (ان کے لیے) جو ہماری آیات پر

تھا: ''اے موسیٰ! جب تک ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں تیرا یقین ہرگز نہیں کریں گے۔'' اس گستاخی پر ان پر بجلی گری جس سے وہ سب مر گئے۔ یہاں ''الرَّجْفَةُ'' (زلزلے) کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ بجلی کی کڑک سے، خصوصاً جب وہ بصورت عذاب ہو، زلزلہ آنا معمول کی بات ہے۔

2 قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ: یعنی اگر تو چاہتا تو ان ستر آدمیوں کو بنی اسرائیل سے نکلنے سے پہلے وہیں ہلاک کر دیتا، تاکہ بنی اسرائیل ان کی ہلاکت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے اور مجھ پر الزام نہ رکھ سکتے کہ میں نے انھیں ہلاک کر دیا ہے اور تو چاہتا تو میری قوم کی گستاخی کی پاداش میں مجھے بھی ہلاک کر دیتا، تو نے جب اس وقت ہم پر رحم کرتے ہوئے ایسا نہیں کیا تو اب بھی ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما اور انھیں ہلاک نہ کر۔

3 اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا: بے وقوفوں کے فعل سے مراد بچھڑے کی عبادت بھی ہو سکتی ہے، مگر زیادہ واضح بے وقوفی موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کو صاف دکھانے کا مطالبہ اور شرط ہے کہ ہم اس کے بغیر تیری بات کا یقین ہی نہیں کریں گے۔

4 بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا: معلوم ہوا کہ نہ بچھڑے کی عبادت تمام بنی اسرائیل نے کی تھی اور نہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا مطالبہ ستر کے ستر نے کیا تھا۔ یہ ان کے جاہل اور بے وقوف لوگوں کا فعل تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ پروردگارا! کیا تو ہم میں سے بے وقوف لوگوں کے فعل کی وجہ سے سب کو ہلاک کر دے گا۔

5 اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ: یعنی جنھوں نے بچھڑے کی پوجا کی یا تجھے آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کیا، حقیقت میں یہ سب کام تیری طرف سے ایک آزمائش تھے، تو جس طرح چاہتا ہے امتحان لیتا ہے، پھر اس کے ذریعے سے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ (ابن کثیر) اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۶)۔

آیت 156 1 قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ...... : یعنی میرا عذاب تو صرف ان کافروں اور نافرمانوں کے لیے مخصوص ہے جنھیں میں ان کی نافرمانی پر سزا دینا چاہتا ہوں، کیونکہ عذاب دینا میری غالب صفت نہیں بلکہ وہ میرا ایک فعل ہے جو عدل کے تقاضے کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے۔ میری اصل اور غالب صفت جس کے ساتھ کائنات کا نظام چل رہا ہے، وہ میری رحمت ہے، جس سے کائنات کی ہر چیز فیض یاب ہو رہی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، اسی اثنا میں ایک اعرابی نے نماز کی حالت میں کہہ دیا: ''اے اللہ!

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ

ایمان لاتے ہیں۞ وہ جو اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جو اُمّی نبی ہے، جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا

مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ فرما۔" جب رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو اس اعرابی سے فرمایا: « لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا » "تو نے اللہ تعالیٰ کی رحمت واسع کو محدود کر دیا۔" [بخاري، الأدب، باب رحمة الناس والبهائم : ٦٠١٠] اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں بھی خاص نیکوکاروں کے لیے ہوتی اور کفر و نافرمانی پر فوراً مؤاخذہ ہوتا تو وہ روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتا۔ دیکھیے سورۂ نحل (۶۱) اور فاطر (۴۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے سو رحمت پیدا فرمائی، اس میں سے ایک رحمت جن و انس، جانوروں اور زہریلے سانپوں اور کیڑوں میں اتاری، اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر شفقت اور ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور ننانویں رحمتیں اللہ تعالیٰ نے مؤخر کر رکھی ہیں جن کے ساتھ وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔" [مسلم، التوبة، باب في سعة رحمة الله تعالى...... : ٢٧٥٢، ٢٧٥٣، عن أبي هريرة رضي الله عنه]

❷ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ: "وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ" کے الفاظ میں ابلیس اور تمام کفار بھی شامل تھے، کیونکہ "كُلَّ شَيْءٍ" میں یہ سب داخل ہیں، اس لیے یہ بتانے کے لیے کہ یہ سب میری رحمت سے محروم ہیں، فرمایا کہ میں اپنی رحمت صرف ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو ڈرتے ہیں اور ان تمام صفات کے حامل ہیں جو اس آیت اور اس سے اگلی آیت میں مذکور ہیں۔ یہ بھی وضاحت فرما دی کہ نبی اُمّی ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اس رحمت کے مستحق صرف وہ ہیں جو آپ ﷺ کے متبع ہوں گے۔

❸ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: دوسرے ارکان و فرائض کو چھوڑ کر خاص طور پر زکوٰۃ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہودیوں میں مال کی محبت بہت پائی جاتی تھی جس کی بنا پر وہ جتنی کوتاہی ادائے زکوٰۃ میں کرتے تھے کوئی اور فریضہ ادا کرنے میں نہیں کرتے تھے، حتیٰ کہ اس محبت نے زکوٰۃ دینے میں کوتاہی سے آگے بڑھ کر انھیں سود خوری پر لگا دیا۔ وہی حال اب امت محمد ﷺ کا ہے، مگر جس پر میرے رب کا خاص کرم ہو۔

❹ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ آیت تمام احکام شریعت پر حاوی ہے۔ تقویٰ (نافرمانی سے پرہیز)، زکوٰۃ (حقوق مالی) اور اللہ کی آیات پر ایمان میں ہر قسم کی معرفت آ جاتی ہے، یہاں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا جواب ختم ہو گیا، اب اگلی آیت سے موقع کی مناسبت سے یہود و نصاریٰ کو نبی ﷺ کی پیروی اختیار کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ دنیا و آخرت میں رحمتِ الٰہی کے حصول کے لیے مندرجہ بالا صفات کے علاوہ "نبی اُمّی" کی پیروی بھی ضروری ہے۔

آیت 157 ❶ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ......: یعنی اس زمانے میں میری رحمت کے خاص طور پر مستحق وہ لوگ ہیں......۔ (قرطبی)

مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ

ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم دیتا اور انھیں برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان سے ان کا بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر پڑے ہوئے تھے۔ سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی

2 اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی نو صفات مذکور ہیں اور الْأُمِّيَّ (جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو) کے لفظ سے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود آپ میں جو کمال علم پایا جاتا ہے وہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے، جو ''علوم نبوت'' قرآن مجید اور احادیث کی شکل میں موجود ہیں انھیں پڑھ کر عرب جیسی ان پڑھ قوم دنیا کی انتہائی تعلیم یافتہ اور مہذب ترین قوموں کی راہنما بن گئی۔

3 الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا...... : اگرچہ یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل میں لفظی اور معنوی تحریف میں کم ہی کسر چھوڑی ہے، خصوصاً مختلف زبانوں کے تراجم میں آپ ﷺ کے نام کے بجائے اس کا ترجمہ کر دیا ہے، حالانکہ نام کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، پھر ترجمہ بھی اپنی مرضی کے مطابق کیا ہے اور اصل زبان میں جو کتابیں تھیں وہ ملتی ہی نہیں، تاہم آج بھی تورات و انجیل میں وہ مقامات موجود ہیں جن میں بنی اسرائیل کو نبی ﷺ کی آمد کی بشارت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے استثناء، باب ۱۸، فقرہ ۱۵ تا ۱۹۔ باب ۳۳، فقرہ ۲۔ متی، باب ۳، فقرہ ۱ تا ۱۲۔ یوحنا، باب ۱، فقرہ ۱۹ تا ۲۳۔ باب ۱۴، فقرہ ۱۵ تا ۱۷ اور ۲۵ تا ۲۷۔ باب ۱۶، فقرہ ۱۲ تا ۱۵۔ علاوہ ازیں دیکھیے تورات کی پانچویں کتاب استثناء، باب ۱۷، فقرہ ۱۴۔ یوحنا، باب ۱۶، فقرہ ۱۲ تا ۱۴۔

4 وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ...... : یعنی جو طیب چیزیں ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کر دی گئی تھیں، یا انھوں نے خود انھیں اپنے اوپر حرام کر لیا تھا (جیسے اونٹ کا گوشت اور چربی وغیرہ) وہ انھیں حلال قرار دیتا ہے اور جن ناپاک چیزوں کو انھوں نے حلال قرار دے رکھا تھا (جیسے سور کا گوشت اور شراب وغیرہ) وہ انھیں حرام قرار دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو چیز شریعت نے حلال قرار دی ہے وہ طیب ہے اور جو حرام قرار دی ہے وہ خبیث ہے۔

5 وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ ...... : ''اِصْرٌ'' (بوجھ) سے مراد وہ سخت احکام ہیں جو پچھلی شریعت میں تھے، مثلاً نماز صرف عبادت خانوں ہی میں ادا کرنا، شرک کی حد قتل ہی ہونا وغیرہ اور ''الْأَغْلٰلَ'' (طوقوں) سے مراد وہ خود ساختہ پابندیاں ہیں جو ان کے علماء نے ان پر لگا رکھی تھیں، یا ان کے عوام نے جو رسوم خود اپنے آپ پر لازم قرار دے رکھی تھیں، مثلاً حائضہ کو کھانے پینے میں الگ کر دینا، اس کی رہائش بھی الگ کر دینا، جیسا کہ مسلمانوں میں نصرانیوں اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی موت کی

الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

لوگ فلاح پانے والے ہیں﴿۱۵۷﴾ کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، وہ (اللہ) کہ

رسوم تیجا، ساتواں، چالیسواں، پیدائش اور نکاح کی رسوم، مثلاً بچے کی پیدائش پر دروازے پر سرس یعنی شَرِ ینہ کے پتے لٹکانا، زچہ کی چارپائی پر لوہا رکھنا، کھسرے نچانا، ان پر خرچ کرنا، بے اولاد خاتون کو منحوس سمجھ کر گھر میں نہ آنے دینا، نکاح میں سہرا، گانا، مہندی، منگنی کی خود ساختہ رسمیں، اسی طرح نیوندرہ، سلامی اور جہیز وغیرہ جن سے لوگوں کی زندگی دشوار ہو چکی ہے اور جو نہ اللہ کی کتاب میں ہیں نہ سنت رسول ﷺ میں۔ اسی طرح اللہ بہتر جانتا ہے کہ پیغمبروں کی گستاخی کرنے والی حتیٰ کہ انھیں قتل تک کر دینے والی اس امت کے احبار و رہبان نے کتنی حلال چیزوں کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا ہوگا اور ختم اور میت بخشوانے وغیرہ کے نام پر لوگوں کا مال کس کس طرح کھایا ہوگا۔ محمد ﷺ نے وہ تمام بوجھ اور طوق اتار کر اور وہ تمام پابندیاں توڑ کر اصل اسلام پیش فرمایا جو نہایت سادہ اور آسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « أَحَبُّ الدِّيْنِ إِلَى اللّٰهِ الْحَنِيْفِيَّةُ السَّمْحَةُ » ''اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب آسان حنفی دین ہے۔'' [بخاري، الإيمان، باب الدين يسر، قبل ح : ۳۹، تعليقًا] اور فرمایا: « اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ » ''دین آسان ہے۔'' [بخاري، الإيمان، باب الدين يسر : ۳۹] ایک دوسری حدیث ہے: « لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ » [السلسلة الصحيحة : ۲۵۰] یعنی نہ ابتداءً نقصان پہنچانا جائز ہے نہ بدلے میں نقصان پہنچانا۔ نیز آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہمیشہ تلقین فرماتے: « يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا » ''آسانی کرو، تنگی مت کرو۔'' [بخاري، الأدب، باب قول النبي ﷺ : يسروا ولا تعسروا : ۶۱۲۵]

افسوس مسلمانوں نے بھی اہل کتاب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شریعت کے فرائض کی پابندی کرنا اور منع کردہ چیزوں سے اجتناب چھوڑ دیا اور اپنی اور اپنے مولویوں اور جاہل عوام کی خود ساختہ رسوم و رواج کے بوجھ اور طوق اپنے اوپر ڈال کر اپنی زندگی کو مشکل میں ڈال دیا۔ وہ حج پر نہیں جاتے مگر قبروں پر عرسوں میں ہزاروں لٹا دیتے ہیں، نماز نہیں پڑھتے مگر مرشدوں کے وظائف پر گھنٹے لگا دیتے ہیں۔ زکوٰۃ و عشر نہیں دیتے مگر میت کے موقع پر دیگوں، ختموں اور مولوی صاحبان پر لاکھوں اڑا دیتے ہیں، نکاح کی رسوم پوری کرنے، جہیز بنانے کے لیے ساری عمر کے لیے مقروض ہو جاتے ہیں مگر لڑکیوں کو ورثہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اب اس کی شکایت اللہ کے سوا کس کے سامنے کی جائے۔

⑥ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ...... : وہ نور جو آپ کے ساتھ اتارا گیا وحیٔ الٰہی ہے جو قرآن و سنت کی صورت میں قیامت تک محفوظ ہے۔ ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد آپ کی آمد کا علم ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا، خواہ یہودی ہو یا نصرانی یا کوئی اور، وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۶۲) کا حاشیہ (۲)۔

آیت 158 ① قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ...... : یعنی میری رسالت تمام دنیا کے لوگوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ ''جَمِيْعًا'' کے مفہوم میں یہ دونوں باتیں صاف ظاہر ہیں اور مجھے ہدایت کا پیغام پہنچانے

وَ الۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ وَ اتَّبِعُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَ بِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پس تم اللہ پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ، جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، تاکہ تم ہدایت پاؤ﴿۱۵۸﴾ اور موسیٰ کی قوم میں سے کچھ لوگ ہیں جو حق کے ساتھ رہنمائی کرتے اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں﴿۱۵۹﴾

کے لیے بھیجنے والا وہ ہے جو آسمان و زمین کا بادشاہ، اکیلا عبادت کا حق دار اور موت و حیات کا مالک ہے۔ اب مجھ پر ایمان نہ لانے کی صورت میں اپنا انجام سوچ لو۔ رسول اللہ ﷺ کے تا قیامت تمام قوموں کے لیے رسول ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر کیا ہے۔ دیکھیے سورۂ سبا (۲۸)، فرقان (۱) اور احزاب (۴۰)۔ ''جہاں تک پہنچے'' کے الفاظ کے ساتھ رسالت عام ہونے کی تصریح کے لیے دیکھیے سورۂ انعام (۱۹) عرب اور اہل کتاب کی صراحت کے ساتھ دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۰) اور دوسری آیات۔

② فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہِ ...... : پچھلی آیت میں اور اس میں نبی ﷺ کے وصف نبی اُمی کا خاص ذکر فرمایا ہے اور قرآن مجید میں کئی مقامات پر نبوت سے پہلے آپ کے ان پڑھ ہونے اور پہلی کتابوں اور ایمان کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہونے کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ''آپ اس سے پہلے نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔'' [العنکبوت : ۴۸] اور فرمایا: ''یہ غیب کی خبروں سے ہے۔ اس سے پہلے انھیں نہ آپ جانتے تھے، نہ آپ کی قوم۔'' [ھود : ۴۹] اور فرمایا: ''آپ وحی سے پہلے نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔'' [الشوریٰ : ۵۲] بلکہ فرمایا: ''آپ کو امید تک نہ تھی کہ آپ کو کتاب عطا کی جائے گی۔'' [القصص : ۸۶] کئی لوگوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ قرآن کو مانتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں کہ نبی ﷺ پیدا ہونے سے بھی پہلے ہر چیز کا علم رکھتے تھے، پھر آپ کا خاص وصف امی کیا ہوا کہ ایک بالکل ان پڑھ شخص دنیا کے تمام پڑھے لکھے، دانشور، فلسفی اور دوسرے علوم میں کمال رکھنے والوں کا استاد بن گیا۔

③ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ: اللہ تعالیٰ کے کلمات کے لامحدود ہونے کا تذکرہ دیکھیے سورۂ کہف (۱۰۹) اور لقمان (۲۷) میں۔

④ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ : معلوم ہوا اب ہدایت صرف رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی میں ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی (انفرادی ہو یا اجتماعی اس) کے ہر گوشہ میں آپ ہی کی ہدایت اور نقش قدم پر چلا جائے، اس کے علاوہ ہدایت کا کوئی راستہ نہیں۔ دیکھیے سورۂ نجم (۳، ۴)۔

آیت 159 وَ مِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی اُمَّۃٌ ...... : اس سے مراد وہ یہودی ہیں جو تورات پر قائم رہے اور وہ جو نبی ﷺ کی آمد

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ
بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ
وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ
وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ اِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا
حَیْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِیْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۶۱﴾
فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ
بِمَا كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ ع

اور ہم نے انھیں بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیا، جو کئی گروہ تھے اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی، جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مار تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بلاشبہ سب لوگوں نے اپنی پانی پینے کی جگہ معلوم کر لی اور ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا اور ان پر من اور سلویٰ اتارا، کھاؤ ان پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں عطا کیں اور انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۰﴾ اور جب ان سے کہا گیا اس بستی میں رہو اور اس میں سے جہاں چاہو کھاؤ اور کہو بخش دے اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو تو ہم تمھارے لیے تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے، عنقریب ہم نیکی کرنے والوں کو زیادہ دیں گے ﴿۱۶۱﴾ تو ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا، انھوں نے بات کو اس کے خلاف بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی، تو ہم نے ان پر آسمان سے ایک عذاب بھیجا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۲﴾

پر آپ پر ایمان لے آئے، جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی۔

آیت 160 تا 162 ① وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا: "اَسْبَاطًا" یہ "سِبْطٌ" کی جمع ہے جس کا معنی اولاد کی اولاد ہے۔ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے بارہ قبائل وجود میں آئے۔ اپنے الگ الگ اوصاف کی وجہ سے ہر قبیلے نے اپنا الگ وجود برقرار رکھا، اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے پر ایک نقیب مقرر فرمایا: ﴿وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ [المائدۃ : ۱۲] "اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔" "اُمَمًا" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعداد میں بہت بڑھ گئے۔

② اس آیت میں "فَانْۢبَجَسَتْ" اور سورۂ بقرہ میں "فَانْفَجَرَتْ" ہے۔ راغب اصفہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اِنْبَجَسَ" اکثر اس کے متعلق کہا جاتا ہے جو تنگ چیز سے نکلے اور "اِنْفَجَرَ" اس معنی میں بھی آتا ہے اور اس کے متعلق بھی جو کھلی چیز سے

وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

اور ان سے اس بستی کے بارے پوچھ جو سمندر کے کنارے پر تھی، جب وہ ہفتے کے دن میں حد سے تجاوز کرتے تھے، جب ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے کے دن سر اٹھائے ہوئے ان کے پاس آتیں اور جس دن ان کا ہفتہ نہ ہوتا وہ ان کے پاس نہ آتی تھیں، اس طرح ہم ان کی آزمائش کرتے تھے، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۳﴾

نکلے۔ (مفردات) ان آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۵۸ تا ۶۰)۔

آیت 163 ❶ **وَ سْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ** ...... : اس واقعہ کا انداز بیان پچھلی آیات سے ذرا مختلف ہے، فرمایا، ان سے اس بستی کے بارے میں پوچھیے، کیونکہ تورات یا کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں تھا مگر یہودیوں کو یہ واقعہ خوب معلوم تھا اور وہ اپنے دوسرے عیوب کی طرح اسے بھی چھپاتے تھے۔ جب آپ پوچھیں گے تو انھیں ضرور سوچنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ اس واقعہ کی خبر آپ تک کیسے پہنچی، وحی کے سوا کوئی اور ذریعہ اس کے لیے ممکن نہیں، اس لیے لامحالہ انھیں آپ کے نبیٔ الٰہی ہونے کی ایک اور شہادت مل جائے گی۔

❷ اللہ تعالیٰ نے صرف یہ بتایا ہے کہ وہ بستی سمندر کے کنارے آباد تھی اور نصیحت کے لیے اتنا بتانا ہی کافی تھا۔ البتہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس قریہ (شہر) سے مراد ''ایلات'' ہے جو بحر قلزم کے ساحل پر مدین اور طور کے درمیان واقع ہے۔ یہ شہر بحر قلزم کے اندر خلیج عقبہ میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب اردن کی بندرگاہ عقبہ پائی جاتی ہے، اس کے قریب خلیج عقبہ ہی میں یہودیوں نے جونئی بندرگاہ بنائی ہے اس کا نام انھوں نے ''ایلات'' ہی رکھا ہے۔ مگر کسی یقینی دلیل کے بغیر اس شہر کی تعیین ممکن نہیں۔

❸ **اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ**: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کے دن ان کے لیے شکار جائز نہیں تھا۔

❹ **اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ** ...... : ''حِيْتَانٌ'' یہ ''حُوْتٌ'' کی جمع ہے، یعنی بڑی مچھلی۔ دوسری جگہ یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ ﴾ [الصافات : ۱٤۲] ''پس مچھلی نے اسے نگل لیا۔'' (راغب) ''**شُرَّعًا**'' ''شَارِعٌ'' کی جمع ہے، یعنی پانی سے سر نکالے ہوئے آجاتیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ انھیں حکم تو یہ تھا کہ اس دن کی تعظیم کریں اور اس میں شکار وغیرہ سے باز رہیں مگر انھوں نے فریب اور حیلہ سازی سے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیا، چنانچہ انھوں نے سمندر کے کنارے بڑے بڑے حوض کھود لیے، ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں تو ان حوضوں میں داخل ہو جاتیں، وہ سمندر کی طرف سے ان کا راستہ بند کر دیتے اور اتوار کے دن ان کو پکڑ لیتے، یا جمعہ کے دن سمندر میں جال نصب کر دیتے اور ہفتہ کے دن ان میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کو اتوار کے دن پکڑ لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی حرام کام کا ارتکاب کرنے کے لیے حیلہ کرنا حرام ہے۔ ہاں جائز کام کے لیے حیلہ بھی جائز ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام ابو عبد اللہ بن بطہ رحمہ اللہ کی سند سے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل فرمایا ہے: ((لَا تَرْتَكِبُوْا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُوْدُ فَتَسْتَحِلُّوْا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ)) ''وہ کام مت کرو جو یہود نے کیا، ورنہ تم اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو معمولی حیلوں سے حلال کر لو گے۔'' اور فرمایا کہ یہ سند جید ہے۔ مگر افسوس کہ بعض مسلمان فقہاء نے اسلام کے فرائض سے جان چھڑانے کے لیے کئی حیلے ایجاد کیے، مثلاً رمضان کے آخر میں دو

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے، یا انھیں عذاب دینے والا ہے، بہت سخت عذاب؟ انھوں نے کہا تمھارے رب کے سامنے عذر کرنے کے لیے اور اس لیے کہ شاید وہ ڈر جائیں ﴿۱۶۴﴾

رکعتوں کا نام قضائے عمری رکھ کر پچھلی نمازیں معاف ہونے کا فتویٰ دے دیا اور صاف لکھ دیا کہ زکوٰۃ اور شفعہ سے جان چھڑانے کے لیے حیلہ حرام تو کجا مکروہ بھی نہیں۔ قتل کے قصاص کو ختم کرنے کے لیے تیز دھار آلے سے قتل کی شرط لگا دی اور کہا کہ اگر کوئی جان بوجھ کر بھاری سے بھاری پتھر یا ہتھوڑے کے ساتھ قتل کر دے، یا ڈبو کر مار دے، یا برف کے بلاک میں رکھ کر، یا کسی چار دیواری میں بھوکا پیاسا رکھ کر مار دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، زیادہ سے زیادہ دیت لے سکتے ہیں۔ زنا کو حلال کرنے کے لیے اجرت پر عورت لا کر زنا کرنے سے حد ختم کر دی۔ شراب حلال کرنے کے لیے صرف انگور اور کھجور کی شراب کو حرام اور باقی سب کو حلال کہہ دیا۔ چور کی حد چوری کا جرم شہادتوں سے ثابت ہونے کے بعد صرف اتنی بات سے ختم کر دی کہ چور مسروقہ مال کا مالک ہونے کا دعویٰ کر دے، خواہ اس کی کوئی دلیل بھی پیش نہ کرے۔ بتایئے بلا دلیل دعویٰ کرنے سے ہاتھ کٹنے سے بچ جائے تو کون سا چور یہ دعویٰ نہیں کرے گا۔ سود کو دار الحرب میں اور بہت سی خود ساختہ صورتوں میں حلال کر دیا۔ بعض نے جو شخص نماز پڑھے اور جو نہ پڑھے دونوں کا ایمان برابر قرار دے دیا۔ جب اتنے بڑے گناہ حیلے سے جائز ہو گئے تو ان کے مرتکب بھی صالح اور عادل ٹھہرے اور حکومت اور قضاء کے اہل قرار دیے گئے۔ ایسے حکام، ایسی عدالتوں اور ایسے شاہدوں اور قاضیوں کے فیصلوں کا نتیجہ اہل کتاب ہی کی طرح پہلے شدید بد عملی، پھر انتہائی ذلت کی صورت میں سب کے سامنے ہے، اس کا علاج یہی ہے کہ مسلمان ان "اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ" کا طریقہ چھوڑ کر کتاب و سنت کو بلا حیل و حجت مضبوطی سے تھام لیں تو اللہ تعالیٰ انھیں پھر وہی عزت و کرامت عطا فرمائے گا جو اس نے پہلے عطا فرمائی تھی۔

5 كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو حلال روزی نہ ملے اور حرام آسانی سے ملے تو لازم ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھے، اگر حرام کا مرتکب ہو جائے گا تو وہ روزی وبال ہو گی اور اگر صبر کرے گا اور حرام سے بچ کر امتحان میں کامیاب ہو جائے گا تو انعام ملے گا۔

آیت 164 1 وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ ...... : یعنی اس بستی کے نیک لوگوں میں سے ایک گروہ نے ان لوگوں سے کہا جو اس حیلہ سازی سے شکار کرنے والوں کو منع کرتے تھے۔ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اس بستی کے لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، ایک وہ ظالم جو اس حیلہ سازی سے ہفتہ کے دن مچھلیوں کا شکار کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ جو ان کو ایسا کرنے سے منع کرتا تھا اور تیسرا گروہ وہ جو خود اگرچہ نیک تھا لیکن دوسروں کو برائی سے منع نہیں کرتا تھا، پس یہاں "اُمَّةٌ" سے

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ
بَىٕیْسٍۭ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ۝۱۶۵ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـٕیْنَ۝۱۶۶

پھر جب وہ اس بات کو بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے منع کرتے تھے، اور ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا جنھوں نے ظلم کیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۵﴾ پھر جب وہ اس بات میں حد سے بڑھ گئے جس سے انھیں منع کیا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ ﴿۱۶۶﴾

مراد یہی تیسرا گروہ ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ گروہ جو برائی سے منع کرنے والوں سے کہتا تھا کہ تم ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، یہ بھی نیک لوگ تھے اور اپنی طرف سے پورا زور لگا چکے تھے کہ انھیں اس گناہ سے منع کریں مگر ان کی ہٹ دھرمی کے بعد ان سے مایوس ہو کر خاموش ہو گئے تھے اور اب ان پر عذاب آنے کے منتظر تھے۔

② لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ ...... : یعنی کیوں ان کے سمجھانے میں وقت ضائع کرتے ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں عذاب لکھ دیا ہے تو تم انھیں کیسے بچا لو گے؟! مطلب یہ کہ خود نیکی پر قائم رہو اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔

③ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ ...... : برائی سے منع کرنے والوں نے اپنے عمل کی دو وجہیں بیان کیں، ایک تو یہ کہ کہیں اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس جرم میں نہ پکڑ لے کہ تم نے انھیں نصیحت کرنا کیوں چھوڑ دیا تھا، تاکہ ہمارا عذر بن جائے کہ ہم تو منع کرتے رہے تھے اور دوسری یہ کہ ہم کسی صورت ناامید ہونے والے نہیں، شاید یہ سب یا ان میں سے کچھ لوگ اس عمل بد سے بچ جائیں، کیونکہ داعی کو ہمیشہ پر امید رہنا چاہیے۔

آیت 166،165 ① فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ ...... : یعنی جب ہفتہ کی تعظیم کا حکم انھوں نے سرے سے بھلا ہی دیا اور حیلے سے بڑھ کر علانیہ نافرمانی شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ نے برائی سے منع کرنے والوں کو عذاب سے بچا لیا اور ظلم کرنے والوں کو بہت سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ اب بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ پہلے ان پر نافرمانی کی وجہ سے ایک عذاب بھیجا گیا، جیسا کہ یہاں "بِعَذَابٍۭ بَىٕیْسٍۭ" فرمایا ہے کہ شاید وہ باز آ جائیں۔ (دیکھیے سورۂ سجدہ: ۲۱) لیکن جب اس پر بھی باز نہ آئے تو اگلی آیت میں مذکور مسخ کی سزا دی گئی اور بعض نے فرمایا کہ "بِعَذَابٍۭ بَىٕیْسٍۭ" سے مراد یہی مسخ ہے، لیکن ﴿ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ﴾ کے بعد دوبارہ ﴿ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا عذاب تنبیہ کے لیے تھا، پھر بھی جب وہ متنبہ نہ ہوئے، بلکہ سرکشی اختیار کی تو ان سرکشوں کو بندر بنا دیا گیا۔ واللہ اعلم!

② وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ...... : اللہ تعالیٰ نے برائی سے منع کرنے والوں کی نجات اور ظلم کرنے والوں کو سخت عذاب، مثلاً قحط یا بیماری وغیرہ میں پکڑنے کا ذکر کیا ہے اور اس سے اگلی آیت میں سرکشی کرنے والوں کی شکلیں بدل کر بندر بنا دینے کا ذکر فرمایا ہے۔ تیسرے گروہ کا واضح ذکر نہیں فرمایا کہ ان کا کیا بنا۔ اکثر مفسرین کا کہنا یہی ہے کہ صرف اس جرم کا مسلسل ارتکاب

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

اور جب تیرے رب نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسا شخص ضرور بھیجتا رہے گا جو انھیں برا عذاب دے، بے شک تیرا رب یقیناً بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۶۷﴾

کرنے والے ہی عذاب میں گرفتار ہوئے، جیسا کہ ”بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ“ کے استمرار سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی دونوں گروہ بچ گئے۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ بھی برائی سے منع نہ کرنے کی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام سے خاموشی اختیار فرمائی تو ہمیں بھی خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ مگر حافظ ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے ان کے بچ جانے ہی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ لوگ سرکشی اختیار کرنے والے ہرگز نہ تھے، بلکہ جیسا کہ اسی آیت کے حاشیہ (۱) میں ذکر ہوا ہے، یہ لوگ اس برائی سے نفرت رکھنے والے تھے اور عین ممکن ہے کہ منع کرنے کے بعد تھک کر ان پر عذاب کے منتظر ہوں، مگر ان پر لازم تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جاری رکھتے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ”کوئی بھی قوم جس میں اللہ کی نافرمانیوں پر عمل ہوتا ہو، پھر وہ اسے بدلنے کی طاقت رکھتے ہوں، پھر نہ بدلیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے۔“
[أبو داؤد، الملاحم، باب الأمر والنهي : ۴۳۳۸۔ ترمذی : ۳۰۵۷، و قال الألباني صحيح]

راجح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ان پر ” بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍ “ آیا، جو قحط یا بیماری یا خوف وغیرہ کی شکل میں تھا، اس میں شکار کرنے والے اور اس پر خاموش رہنے والے دونوں گرفتار ہوئے، کیونکہ برائی پر خاموش رہنا بھی ایک قسم کا ظلم تھا مگر جب بندر بنانے کا عذاب آیا تو یہ صرف ان پر آیا جو اس سرکشی کے مرتکب تھے اور اب کھلم کھلا بلاجھجک یہ کام کر رہے تھے۔ [وَاللّٰهُ أَعْلَمُ وَ عِلْمُهُ أَتَمُّ]

③ قرآن کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی شکلیں بدل کر بندر کی بنا دی گئیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان میں صرف بندروں کی خصلتیں پیدا کر دی گئیں، مگر اس تاویل کی ضرورت تب ہے جب اللہ تعالیٰ کا انھیں بندر بنانا ممکن نہ ہو، یا پہلے ان کی خصلتیں انسانوں والی ہوں اور اب بندروں والی بنا دی گئی ہوں، جبکہ ان کے تمام حیلے ایسے تھے جو سلیم الفطرت انسان کر ہی نہیں سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو مسخ کرے (شکل بدل دے) تو نہ اس کے پیچھے رہنے والا کوئی ہوتا ہے اور نہ اس کی نسل ہوتی ہے۔“ [المعجم الكبير : ۷۴۶، و صححه الألباني في صحيح الجامع : ۵۶۷۳، عن أم سلمة رضي الله عنها۔ مسلم : ۲۶۶۳]

آیت 167 وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ ..... : گزشتہ آیات میں یہود کی آسانی اور سختی کے ساتھ آزمائشوں اور ان کے بعض نیک و بد اعمال کا ذکر فرمایا، اب اس آیت میں بتایا کہ قیامت تک ان پر ایسے لوگ مسلط کیے جاتے رہیں گے جو انھیں

وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

اور ہم نے انھیں زمین میں مختلف گروہوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، انھی میں سے کچھ نیک تھے اور ان میں سے کچھ اس کے علاوہ تھے اور ہم نے اچھے حالات اور برے حالات کے ساتھ ان کی آزمائش کی، تاکہ وہ باز آجائیں ﴿۱۶۸﴾

بدترین عذاب چکھاتے رہیں گے۔ سورۂ آل عمران (۱۱۲) میں فرمایا کہ ان پر ذلت مسلط کر دی گئی مگر اللہ کی پناہ اور لوگوں کی پناہ کے ساتھ۔ دیکھیے آیت مذکورہ کی تفسیر۔ یہودیوں کی پوری تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے، وہ ہر زمانے میں جہاں بھی رہے دوسروں کے محکوم اور غلام بن کر رہے اور آئے دن ان پر ایسے حکمران مسلط ہوتے رہے جنھوں نے انھیں ظلم وستم کا تختۂ مشق بنایا۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۴ تا ۸) قریب زمانے میں ہٹلر نے ان سے جو سلوک کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اگر کسی جگہ عارضی طور پر انھیں امن و امان نصیب ہوا بھی اور ان کی برائے نام حکومت قائم ہوئی بھی تو وہ اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ سراسر دوسروں کے سہارے پر۔

آیت 168 ① وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا: تاکہ ان کی کوئی اجتماعی قوت وجود میں نہ آ سکے۔ اس لیے یہودی تمام دنیا میں ٹکڑوں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں رہتے ہیں اپنی سود خوری اور اس ملک کے خلاف سرگرمیوں اور جاسوسی کی وجہ سے نفرت کی نگاہوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں، پھر ان کی برتری کی خواہش اور دنیا کی دولت اور حکومت کو اپنے قبضے میں لینے کی خواہش کے لیے ان کی سازشیں یہودی پروٹوکول کی صورت میں دنیا کے سامنے آ چکی ہیں۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور کتنے ہی ملکوں سے انھیں نکالا گیا اور تہ تیغ کیا گیا، اب اگرچہ جرمنی سے غداری کے انعام میں برطانیہ اور امریکہ کے بل بوتے پر وہ عربوں کے قلب میں اسرائیل کے خنجر کی صورت میں پیوست ہو چکے ہیں، مگر ان کی اصل قوت امریکہ اور برطانیہ وغیرہ ہی ہیں۔ یہاں جمع ہو کر بھی وہ ظلم وستم سے باز آنے کے بجائے فلسطینی عربوں پر ناقابل بیان مظالم ڈھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے مؤاخذے میں اس دیر کا انجام کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

② مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ: ان میں سے کچھ نیک ہیں، یعنی وہ جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے، یا جیسے وہ لوگ جنھوں نے ہفتے کے روز مچھلی کے شکار سے منع کیا تھا۔ دیکھیے آل عمران (۱۱۳ تا ۱۱۵) اور کچھ ان کے علاوہ، یعنی نیک نہیں بلکہ شریر اور بدکار، جیسے سود، رشوت اور دوسرے طریقوں سے حرام کھانے والے اور انبیاء تک کو قتل کر ڈالنے والے اور نبی کریم ﷺ کو پہچاننے کے باوجود آپ کی مخالفت کرنے والے۔

③ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ ...... : کبھی راحت اور آرام دیا اور کبھی تکلیف میں مبتلا کر دیا، اس طرح کبھی خوش حالی عطا فرمائی، کبھی فقر و فاقہ سے دوچار کر دیا، تاکہ وہ باز آ جائیں، یعنی اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور تورات کے احکام پر عمل کریں۔ شاہ عبد القادر ؒ فرماتے ہیں: ”یہود کی دولت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت سے ہر طرف نکل گئے اور مختلف

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

پھر ان کے بعد ان کی جگہ نالائق جانشین آئے، جو کتاب کے وارث بنے، وہ اس حقیر دنیا کا سامان لیتے اور کہتے ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا اور اگر ان کے پاس اس جیسا اور سامان آجاتا تو اسے بھی لے لیتے، کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا کہ اللہ پر حق کے سوا کچھ نہ کہیں گے اور انھوں نے جو کچھ اس میں تھا پڑھ بھی لیا تھا اور آخری گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ﴿۱۶۹﴾

مذاہب پیدا ہوئے، یہ احوال اس امت کو سنایا کہ یہ سب کچھ ان پر بھی ہوگا۔ حدیث میں فرمایا ہے کہ اس امت میں بعض بندر اور سور ہو جائیں گے۔ اللہ گمراہی سے پناہ دے۔" (موضح) یہ حدیث بخاری میں ہے، فرمایا: ((وَ يَمْسَخُ آخَرِيْنَ قِرَدَةً وَ خَنَازِيْرَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ)) [بخاری، الأشربہ، باب ما جاء فیمن یستحل الخمر...... : ۵۵۹۰] "اور ان میں سے بہت سوں کو قیامت تک کے لیے بندروں اور خنزیروں کی صورت میں مسخ کر دے گا۔"

آیت 169 ① **فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ**......: قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا " اَلْخَلْفُ " لام کے سکون کے ساتھ، بمعنی اولاد، واحد جمع یکساں ہیں اور " اَلْخَلَفُ " لام کے فتح کے ساتھ پہلوں کی جگہ آنے والا، اولاد ہو یا اجنبی۔ ابن الاعرابی نے فرمایا، لام کے فتح کے ساتھ نیک جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ نالائق جانشین اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال کر لیے جاتے ہیں۔ (طنطاوی) "**عَرَضٌ**" دنیا کا سامان، کیونکہ وہ عارضی ہے۔ "**هٰذَا الْاَدْنٰى**" میں "**هٰذَا**" (اس) کے لفظ سے حقارت مراد ہے اور " **الْاَدْنٰى** " کے لفظ سے بھی دنیا کی دنایت اور حقارت مراد ہے۔ (کشاف) پھر ان کے جانشین ایسے نالائق ہوئے جو کتاب اللہ کے وارث بنے، یعنی انھوں نے اسے پڑھا، اس کا علم حاصل کیا اور اس میں مذکور حلال و حرام اور امر و نہی سے پوری طرح آگاہ ہوئے، مگر انھوں نے اس کا اثر قبول کرنے کے بجائے اس کے احکام کی مخالفت کی اور اس کے حرام کو حلال کر لیا اور شدید حرص کی وجہ سے اس حقیر دنیا کے مال کے حصول کی کوشش میں لگ گئے، حلال طریقے سے ملے یا حرام سے، سود ہو یا رشوت یا غیر کا حق۔ اس کے باوجود یہ کہتے رہے کہ ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا۔ "**سَيُغْفَرُ لَنَا**" میں سین تاکید کے لیے ہے۔ (آلوسی) کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے، اس کے محبوب اور اس کے انبیاء کی نسل سے ہیں، فرمایا: ﴿ **وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ** ﴾ [المائدۃ : ۱۸] "اور یہود و نصاریٰ نے کہا ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔"

② **وَ اِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ**: یعنی گناہ کرنے اور حرام کھانے کے بعد نہ وہ شرمندہ ہوتے ہیں اور نہ ان میں توبہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بلکہ گناہوں پر اور حرام خوری پر ان کی جرأت بڑھتی جاتی ہے، حالانکہ بخشش کے لیے تو توبہ کی ضرورت ہے، جس کا لازمی جزو گزشتہ پر ندامت اور آئندہ کے لیے وہ کام نہ کرنے کا خالص اور پختہ عزم ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ

وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع ۹

اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور انھوں نے نماز قائم کی، یقیناً ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ﴿۱۷۰﴾ اور جب ہم نے پہاڑ کو ہلا کر ان کے اوپر اٹھایا، جیسے وہ ایک سائبان ہو اور انھوں نے یقین کر لیا کہ بے شک وہ ان پر گرنے والا ہے۔ جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے اسے قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو، تاکہ تم بچ جاؤ ﴿۱۷۱﴾

پہلی دفعہ حرام کھانے کے بعد اسی طرح کا حرام دوبارہ مل جائے تو اسے بھی نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رشوت لینے کے بعد جونہی انھیں دوبارہ رشوت کا موقع ملتا ہے بلا جھجک اسے قبول کر لیتے ہیں۔ یہ ان کے علماء کا حال ہے کہ لوگوں کو غلط مسئلے بتا کر حرام کھانے کے باوجود دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بخشش ہو جائے گی، حالانکہ وہ غلط کام چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، جو بخشش کی شرطِ اول ہے۔

③ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ...... : یہ عہد تفصیل کے ساتھ تورات کے علاوہ آل عمران کی آیت (۱۸۷) میں مذکور ہے۔

④ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ : اور انھوں نے جو کچھ اس میں ہے پڑھ لیا ہے، یعنی خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں کہیں نہیں لکھا کہ تم جو گناہ چاہو کرتے جاؤ، میں تمھیں بخش دوں گا، مگر ان کی جرأت اور بے خوفی کا یہ عالم ہے کہ گناہ بھی کیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیات کو بیچ کر دنیا بھی کمائے جاتے ہیں اور اللہ عزوجل کی طرف وہ باتیں بھی منسوب کیے جاتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔

⑤ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ : یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر حرام کھانے سے بچنے والوں کے لیے آخرت میں جو نعمتیں تیار ہیں وہ اس حقیر دنیا کے عارضی ساز و سامان سے کہیں بہتر ہیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے حرام کھانے والو! کیا تم یہ نہیں سمجھتے؟

آیت 170 وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ...... : کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے سے مراد اس پر عمل کرنا ہے اور نماز بھی اگرچہ اس میں شامل تھی مگر اس کو خصوصاً اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ دین کا بنیادی ستون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ)) [مسلم، الإیمان، باب بیان اطلاق اسم الکفر...... : ۸۲، عن جابر رضی اللہ عنہ] ”یقیناً آدمی کے درمیان اور شرک و کفر کے درمیان نماز کا ترک ہے۔“ گویا نماز نہیں تو کتاب سے تمسک بھی نہیں۔

آیت 171 وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ...... : ” نَتَقَ يَنْتِقُ “ کا معنی ”کسی چیز کو زور سے کھینچ کر ہلانا“ ہے۔ (راغب) یہاں پہاڑ کا ذکر ہے اور سورۂ بقرہ میں طور کا ذکر ہے، یا تو وہ طور نامی پہاڑ تھا اور یا لفظ ”طور“ عام پہاڑ کے معنی میں بھی آتا

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ

اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انھیں خود ان کی جانوں پر

ہے، دونوں جگہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی سابقہ سرکشیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے تورات کے احکام پر عمل کا پختہ عہد لینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زلزلے کے ساتھ پہاڑ کو اکھاڑ کر ان کے سروں پر سایہ فگن کر دیا اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ ہم پر گرنے ہی والا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس ہیبت ناک ماحول میں وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے عمل کا سچا عہد کریں۔ قوت کے ساتھ پکڑنے کا مطلب اس پر عمل کرنا ہے۔

آیت 172 ① وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ ...... : یہاں تک رسولوں اور کتابوں کے ذریعے سے بنی آدم کی ہدایت کا جو اہتمام فرمایا اس کا ذکر تھا، اب کائنات میں اور خود انسان کی ذات (اَنْفُسِهِمْ) میں ہدایت کی جو دلیلیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں ان کا ذکر ہے۔ اہلِ علم نے اس آیت کی دو تفسیریں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ یہ جانے کہ میرا ایک رب ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے روزی دیتا ہے اور یہ بات جب اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی اولاد کو نسلاً بعد نسل پیدا کرتا ہے اور بنی آدم میں سے کسی کی پشت سے اس کا نطفہ جدا کر کے ماں کے رحم میں اس کی اولاد پیدا کرتا ہے، اسی وقت اس اولاد کی فطرت میں رکھ کر اس کے نفس اور اس کی ذات میں اپنے رب ہونے کے اتنے دلائل رکھ دیتا ہے گویا خود اسے اپنے آپ پر گواہ بنا دیتا ہے کہ اس کا رب اللہ ہے۔ گویا وہ پیدا ہی اسلام پر ہوتا ہے۔ ایک بوند جو جونک بنی، پھر مضغہ بنی، پھر ہڈیاں، پھر کامل اعضا والا جان دار انسان، یہ اور بے شمار نشانیاں خود اس کی ذات اور کائنات میں اس بات کی کافی شہادت ہیں کہ اس کا ایک رب ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ [حٰمٓ السجدۃ : ۵۳] ”عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یقیناً یہی حق ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الذاریات : ۲۰، ۲۱] ”اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں اور تمھارے نفسوں میں بھی تو کیا تم نہیں دیکھتے؟“ اور شہادت ضروری نہیں زبان ہی سے ہو، قرآن مجید کے مطابق حالت کی بھی شہادت ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ﴾ [التوبۃ : ۱۷] ”مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴾ [العادیات : ۶، ۷] ”بے شک انسان اپنے رب کا یقیناً بہت ناشکرا ہے اور بے شک وہ اس بات پر یقیناً خود گواہ ہے۔“

معلوم ہوا کہ انسان کی فطرت ہی توحید ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔“ [بخاري، الجنائز، باب ما قيل في أولاد المشركين : ۱۳۸۵] اس

بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

گواہ بنایا، کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا کیوں نہیں، ہم نے شہادت دی۔ (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو بے شک ہم اس سے غافل تھے ﴿۱۷۲﴾

لیے انسان کی ذات میں اور کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کے رب واحد ہونے کے دلائل ہی اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ اس لیے بعض علماء نے کہا کہ اگر کوئی بھی رسول نہ آتا تو انسان پر عقل، فطرتِ سلیمہ اور اپنی ذات اور کائنات میں موجود توحید کے بے شمار دلائل کی وجہ سے شرک سے بچنا لازم تھا، اگر وہ شرک کرے تو اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ اس سے مؤاخذہ فرمائے۔ مگر قرآن مجید سے اللہ تعالیٰ کا یہ بے حد وحساب رحم و کرم ثابت ہے کہ انسان کے نفس پر اس کی اپنی شہادت کے باوجود وہ رسولوں کے ذریعے سے حق واضح کیے بغیر عذاب نہیں دیتا، فرمایا: ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴾ [بنی إسرائیل : ۱۵] ''اور ہم کبھی عذاب دینے والے نہیں، یہاں تک کہ کوئی پیغام پہنچانے والا بھیجیں۔'' اس کی مثال یوں سمجھیے کہ دیکھنے کے لیے آنکھ میں نور ہونا بھی ضروری ہے اور سورج، چاند یا کسی اور چیز کے ذریعے سے روشنی ہونا بھی ضروری ہے، آنکھ میں روشنی نہ ہو یا باہر روشنی نہ ہو تو نظر نہیں آتا۔ فطرت میں رکھی ہوئی عقل اور کائنات کے دلائل رب کی پہچان کے لیے آنکھ کے نور کی طرح ہیں اور پیغمبر سورج اور چاند کی طرح اس کے لیے دلائل کو روشن کرکے سمجھانے والے ہیں۔ شیخ صالح آل الشیخ نے شرح عقیدہ طحاویہ میں فرمایا کہ اہل السنہ کے بہت سے ائمہ مثلاً شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ، ابن القیم، ابن کثیر، ابن ابی العز حنفی شارح طحاویہ، شیخ عبد الرحمان سعدی اور دوسرے کئی ائمہ رحمہم اللہ نے '' واخذ ربك '' کی یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے۔ واضح رہے کہ آنکھ اور سورج کی روشنی کی مثال ان ائمہ کی تفسیر کا حصہ نہیں۔

دوسری تفسیر وہ میثاق (عہد و پیمان) ہے جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام اولادِ آدم کو نکال کر ان سے لیا اور جو عموماً عہد الست سے مشہور ہے، وہ عبد اللہ بن عباس اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نعمان (نون کے فتحہ کے ساتھ) یعنی عرفہ میں آدم علیہ السلام کی پشت سے میثاق (عہد و پیمان) لیا، چنانچہ اس کی پشت سے تمام اولاد جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنی تھی نکالی اور اس کے آگے بکھیر دی، پھر ان سے آمنے سامنے بات کی، فرمایا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ ''کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟'' انھوں نے کہا: ﴿ بَلٰي ﴾ کیوں نہیں، ہم نے شہادت دی! (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو ہم اس سے غافل تھے۔ آخر آیات تک۔ [أحمد : ۱/ ۲۷۲، ح : ۲۴۵۹۔ مستدرك حاکم : ۲/ ۵۴۴، ح : ۴۰۰۰] حاکم اور ذہبی نے اس حدیث کو صحیح فرمایا ہے، شوکانی اور بہت سے علماء نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے، مگر قرآن کے الفاظ اور حدیث کے الفاظ میں کئی لحاظ سے فرق ہے، ایک تو یہ کہ آیت میں ﴿ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ ﴾ ہے '' مِنْ آدَمَ '' نہیں، دوسرا ﴿ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ﴾ ہے '' مِنْ ظَهْرِهِ '' نہیں۔ تیسرا ﴿ ذُرِّيَّتَهُمْ ﴾ ہے، '' ذُرِّيَّتَهُ '' نہیں، چوتھا یہ کہ فرمایا: ﴿ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ﴾ گواہ کو وہ بات یاد تو ہونی چاہیے جس کی گواہی اس نے دینی ہے جبکہ وہ عہد کسی کو یاد نہیں، البتہ انسان کے نفس اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور توحید کے دلائل کا وہ خود فطری شاہد ہے، یہ الگ بات ہے کہ گندے

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿١٧٣﴾ وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿١٧٤﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿١٧٥﴾

یا یہ کہو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا ہی نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ایک نسل تھے، تو کیا تو ہمیں اس کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے جو باطل والوں نے کیا؟ ﴿١٧٣﴾ اور اسی طرح ہم آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور تاکہ وہ پلٹ آئیں ﴿١٧٤﴾ اور انھیں اس شخص کی خبر پڑھ کر سنا جسے ہم نے اپنی آیات عطا کیں تو وہ ان سے صاف نکل گیا، پھر شیطان نے اسے پیچھے لگا لیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا ﴿١٧٥﴾

عقیدوں والوں کے ساتھ مل کر اس کی فطرت پر پردہ پڑ گیا ہو۔ اگر کوئی کہے کہ بے شک آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلتے وقت کیا ہوا عہد ہمیں یاد نہیں مگر پیغمبروں کا اس میثاق کو یاد کرا دینا ہی کافی ہے تو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ مشرک تو پیغمبروں کی کوئی بات صحیح مانتے ہی نہیں تھے، ان کا یاد کرا دینا ان پر حجت کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ (جب کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اس گواہ بنانے کو بطور حجت ذکر فرمایا ہے، جس طرح رسولوں کے بھیجنے کو بطور حجت ذکر فرمایا ہے) غرض ابن ابی العز نے شرح عقیدہ طحاویہ میں آیت اور احادیث کے درمیان دس فرق بیان کیے ہیں۔ اس لیے دونوں الگ الگ ہیں، ہاں! تطبیق کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولادوں کو نکالنا بھی آدم علیہ السلام کی پشت سے اس کی اولاد کو نکالنے ہی کی تفصیل ہے۔ (واللہ اعلم)

② اَنْ تَقُوْلُوْا: یہ اصل میں ''لِئَلَّا تَقُوْلُوْا'' یا ''كَرَاهَةَ اَنْ تَقُوْلُوْا'' ہے، یعنی یہ عہد تم سے اس لیے لیا کہ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا میں شرک و نافرمانی کی روش اختیار کرو اور قیامت کے روز تم سے باز پرس کی جائے تو یہ کہہ کر اپنی صفائی پیش کرنے لگو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ (ابن کثیر)

آیت 173 اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ ...... : یا یہ عذر پیش کرو کہ ہم تو اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی شرک کی راہ پر چلتے رہے، ہمارا کیا قصور ہے، مطلب یہ ہے کہ شرک کے بارے میں مقلد کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ''الْمُبْطِلُوْنَ'' سے مراد آباء و اجداد ہیں، یعنی یہ کہنا ہے کہ اصل مجرم وہی ہیں ہم نہیں، اس قسم کے عذر کا وہاں کوئی موقع نہیں ہوگا، کیونکہ ابتداءً ہر شخص کی فطرت میں اپنے رب کی پہچان اور اس کی توحید رکھ دی گئی ہے، پھر اس کی یاد دہانی اور تفسیر و تشریح کے لیے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائی گئی ہیں اور کائنات میں اس کے دلائل رکھ دیے گئے ہیں اور ان کے فہم کے لیے عقل بھی عنایت کی گئی ہے۔

آیت 174 وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ : ''اور تاکہ وہ پلٹ آئیں'' اور باطل کو چھوڑ دیں۔ یہ واقعہ یہود کو سنایا، کیونکہ وہ بھی مشرکوں کی طرح اپنے عہد سے پھرے ہوئے تھے۔

آیت 173 وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ ...... : ''سَلَخَ (ن، ف)'' ''کھال اتارنا۔'' ''مَسْلُوْخٌ'' وہ بکری جس کی کھال

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا
وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان کے ذریعے بلند کر دیتے، مگر وہ زمین کی طرف چمٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، تو اس کی مثال کتے کی مثال کی طرح ہے کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تو زبان نکالے ہانپتا ہے، یا اسے چھوڑ دے تو بھی زبان نکالے ہانپتا ہے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ سو تو یہ بیان سنا دے، تاکہ وہ غور وفکر کریں ﴿۱۷۶﴾ برے ہیں وہ لوگ مثال کی رو سے جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے ﴿۱۷۷﴾

اتار لی گئی۔ "اِنْسَلَخَ الْحَيَّةُ" ''سانپ اپنی کینچلی سے نکل گیا۔'' (قاموس) ان الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کا قصہ یہاں عبرت کے لیے بیان کیا جا رہا ہے وہ ضرور کوئی خاص شخص ہے، لیکن قرآن اور صحیح حدیث میں نہ تو اس کے نام کی تصریح ہے اور نہ ہی زمانے کا ذکر ہے۔ صاحب المنار فرماتے ہیں کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ پر اتاری جانے والی آیات کو جھٹلانے والوں کی بیان فرمائی۔ یہ اس شخص کی مثال ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا علم عطا فرمایا، وہ ان کا عالم، ان کے قواعد کا حافظ اور اس کے احکام کو بیان کرنے اور بحث کر کے ثابت کرنے کے لائق ہو گیا مگر شیطان نے اسے اپنے پیچھے ایسا لگایا کہ وہ اس علم پر عامل نہ ہوا، بلکہ اس کا عمل اپنے علم کے سراسر مخالف رہا تو پھر اس سے ان آیات کا علم بھی چھن گیا، کیونکہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ تھوڑی مدت ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ تو یہ شخص اس سانپ کی طرح ہو گیا جو اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے اور اسے اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے، یا اپنے علم و عمل میں مخالفت کی وجہ سے اس شخص کی طرح ہو گیا جو اپنے علم سے نکل جاتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے، جیسے کوئی شخص اپنے پرانے کپڑے اتار دیتا ہے اور سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ مثال کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے رسول پر نازل کردہ آیات کو جھٹلانے والے لوگ اس عالم کی طرح ہیں جو اپنے علم کے پھل سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو گیا ہو، کیونکہ دونوں ہی نے دلائل و آیات میں اخلاص کے ساتھ عبرت حاصل کرنے کے لیے غور نہیں کیا۔

آیت 177،176 ① وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا ...... : اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیات پر عمل کی توفیق دے کر صالحین و ابرار کے آسمان پر بلند کر دیتے، مگر وہ زمین اور پستی (دنیا کے حقیر ساز وسامان) کی طرف چمٹ ہی گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگ کر ہر وقت دنیا کی طلب میں لگ گیا، تو اس کی مثال ہر وقت زبان نکال کر ہانپتے ہوئے کتے کے ساتھ دی گئی۔ مفسرین میں سے بعض نے گزشتہ امتوں میں سے اس کا نام بلعم بن باعورا بتایا ہے اور بعض نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بعض

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

جسے اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے سو وہی خسارہ اٹھانے والے ہیں﴿۱۷۸﴾

اشخاص، مثلاً امیہ بن صلت وغیرہ کا نام ذکر کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب لوگ اس آیت کے مصداق ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا اور ان میں یہ اشخاص بھی شامل ہیں۔

② فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ…… : " لَهَثٌ " تھکاوٹ یا پیاس اور گرمی کی وجہ سے زبان باہر نکال کر ہانپنے کو کہتے ہیں۔ دوسرے جانوروں پر اگر حملہ کیا جائے تو دوڑنے اور پیاس اور گرمی کی وجہ سے وہ ہانپنے لگتے ہیں، لیکن اگر انھیں کچھ نہ کہا جائے تو آرام سے بیٹھے رہتے ہیں، زبان باہر نکالے ہوئے ہانپتے نہیں، مگر کتا ایسا جانور ہے کہ تازہ ہوا سہولت کے ساتھ نہ اندر کھینچ سکتا ہے نہ گرم ہوا باہر نکال سکتا ہے، اس لیے کوئی اس پر حملہ کرے اور دوڑنے کی وجہ سے اسے سانس چڑھا ہو یا وہ آرام سے بیٹھا ہو، ہر حال میں اس کی زبان لٹکی ہوئی ہوگی اور وہ ہانپ رہا ہوگا۔ دنیا کی حرص کی وجہ سے اللہ کی آیات کو جھٹلانے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنے علم کے مطابق اللہ کی آیات پر ایمان لاتا اور عمل کرتا تو اپنی ضروریات اور خواہشات کو اللہ اور اس کے رسول کے مطابق حلال تک محدود کرکے باقی وقت ہر قسم کی حرص اور فکر سے آزاد ہو کر اللہ کی بندگی اور دین کی تعلیم و تعلم اور اس پر عمل میں صرف کرتا تو نہایت چین اور اطمینان کے ساتھ حیاتِ طیبہ بسر کرتا۔ مگر اسے دنیا کی ضرورت تھی یا نہ تھی، حلال و حرام ہر طریقے سے ہر وقت دنیا کے حصول کی جدوجہد میں لگا رہا، اس کتے کی طرح جس پر حملہ ہو یا نہ ہو، زبان نکالے ہانپتا رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے لائق بری مثال نہیں ہے، وہ شخص جو اپنا دیا ہوا ہبہ واپس لیتا ہے اس کتے کی طرح ہے جو دوبارہ اپنی قے چاٹ لیتا ہے۔'' [بخاری، الهبة و فضلها، باب لا یحل لأحد أن یرجع في هبته : ۲٦۲۲، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما]

آیت 178 مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ…… : ہدایت کا نور اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ اس کا مالک ہے، جسے چاہے عطا کر دے اور جسے چاہے عطا نہ کرے اور وہ ضلالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہے۔ یہ مسئلۂ تقدیر ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ کسی کو ہدایت نہ دے تو ظالم نہیں، کیونکہ مالک جسے چاہے اپنی چیز دے جسے چاہے نہ دے اور وہ تو ایسا مالک ہے جس سے کوئی پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا، فرمایا: ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبیاء : ۲۳] ''اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔'' ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ عین عدل ہے، کیونکہ وہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا، فرمایا: ﴿ وَ مَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ [حٰمٓ السجدة : ٤٦] ''اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ اپنے ہر خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے: ((مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ)) [مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة : ۸٦۸، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما] ''جسے اللہ سیدھی راہ پر لگائے اسے

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖۗ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۷۹ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں ﴿۱۷۹﴾ اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سوائے ان کے ساتھ پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں،

کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی سیدھی راہ پر نہیں لگا سکتا۔''

آیت 179 ① وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ: "لِجَهَنَّمَ" میں لام عاقبت (برائے انجام) بھی ہو سکتا ہے، یعنی اپنے حواس سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے وہ انجام کار جہنم میں جائیں گے، گویا انھیں جہنم ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور لام غایت کا بھی ہو سکتا ہے، یعنی کائنات کو بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو آئندہ کی ہر بات کا علم تھا کہ فلاں جن یا انسان نے دنیا میں جا کر دوزخیوں والے کام کرنے تھے، اسی علم کے مطابق اس نے سب کچھ لکھ دیا تھا، اس کا نام قضا و قدر ہے، آگے اہل جہنم کی صفات بیان ہوئی ہیں کہ جن میں یہ صفات ہوں وہ ہدایت قبول نہیں کیا کرتے، گو اللہ کا شریعت اور انبیاء کے بھیجنے کا مقصد یہی ہے کہ انسان اللہ کی عبادت کرے، مگر اسے پہلے ہی یہ بھی علم ہے کہ کون شریعت پر چلے گا اور کون نہیں چلے گا۔ علماء نے تقدیر میں اور انسان کے مجبور ہونے میں فرق کی وضاحت فرمائی ہے۔

② لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ......: یعنی اللہ تعالیٰ نے انھیں دل، آنکھیں اور کان تو اس لیے دیے ہیں کہ انسان ان سے فائدہ اٹھا کر اپنے مالک کو پہچانیں، کائنات اور اپنی ذات میں اس کی نشانیوں کا مشاہدہ کریں، حق کی بات غور سے سنیں اور اسے قبول کریں، مگر جب انھوں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ انعام (چوپاؤں) کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ثابت ہوئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کی طبیعت میں جو تقاضے رکھے ہیں اور جس مقصد کے لیے وہ پیدا ہوئے ہیں وہ بخوبی پورا کر رہے ہیں، اس کے برعکس کفار اپنے مقصدِ حیات، یعنی عبادت کے بجائے اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے خالق کی نافرمانی کر رہے ہیں۔

③ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ: یعنی اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہیں اور مرنے کے بعد زندگی اور جواب دہی سے بے فکر ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ اور رسول ﷺ کو پہچاننا اور ان کے احکام کو سیکھنا ہر شخص پر فرض ہے، اگر کوئی ایسا نہ کرے گا تو جہنم میں جائے گا۔'' (موضح)

آیت 180 ① وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى: "الْحُسْنٰى" یہ "اَلْاَحْسَنُ" کی مؤنث ہے، سب سے اچھے نام۔ "لِلّٰهِ"

اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

انھیں جلد ہی اس کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۸۰﴾

خبر کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا کہ سب سے اچھے نام اور صفات صرف اور صرف اللہ کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ پچھلی آیت میں مذکور ضلالت اور جہنم سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انھی ناموں کے ساتھ اسے پکارو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّ تِسْعِيْنَ اسْمًا، مِائَةً إِلَّا وَاحِدَةً، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ » ”بے شک اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں، جو ان کا احصاء کرلے جنت میں داخل ہوگا۔“ [بخاری، الشروط، باب ما یجوز من الاشتراط …… : ۲۷۳۶، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ] احصاء کا معنی یاد کرنا، شمار کرنا اور حفاظت کرنا سبھی آتے ہیں، یعنی ان کے معانی پر ایمان لائے، برکت اور ثواب کے لیے اخلاص کے ساتھ انھیں گن گن کر پڑھے، انھیں حفظ کرے اور ان کے تقاضوں کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالے۔ حدیث کے جو الفاظ اوپر ذکر ہوئے ہیں وہ تو بہت سی روایات میں صحیح سندوں کے ساتھ آئے ہیں، البتہ ترمذی کی ایک روایت میں ان ننانوے ناموں کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، مگر اہل علم کا تقریباً اتفاق ہے کہ یہ نام بعض راویوں نے قرآن مجید سے ترتیب دے کر روایت میں شامل کر دیے ہیں، ورنہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت روایت میں یہ نام نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ناموں کے سوا اللہ تعالیٰ کے اور نام نہیں بلکہ قرآن و حدیث میں کئی اور نام بھی آئے ہیں۔ علماء نے اسمائے حسنیٰ پر کتابیں لکھی ہیں، بعض علماء نے قرآن و حدیث سے ہزار سے زیادہ اسمائے حسنیٰ نکالے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات کا شمار نہیں تو اس کے اسماء کا شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کئی نام ایسے ہیں جو اس نے کسی کو بھی نہیں بتائے، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص کو جب بھی کوئی فکر یا غم لاحق ہو وہ یہ دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا غم و فکر دور کر دیتا ہے۔“ آپ سے عرض کیا گیا: ”یا رسول اللہ! ہم اسے سیکھ نہ لیں؟“ فرمایا: ”جو بھی اسے سنے اسے اس کو سیکھ لینا چاہیے۔“ دعا یہ ہے: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُكَ وَ ابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِيْ كِتَابِكَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَ نُوْرَ صَدْرِيْ وَ جَلَاءَ حُزْنِيْ وَ ذَهَابَ هَمِّيْ » ”اے اللہ! بے شک میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں اور تیری بندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرا فیصلہ مجھ پر نافذ ہے، تیرا فیصلہ میرے بارے میں عین انصاف ہے، میں تیرے ہر نام کے وسیلے سے جسے تو نے خود اپنا نام رکھا ہے، یا اسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یا اپنی کتاب میں نازل کیا ہے، یا تو نے اسے علم غیب میں اپنے پاس رکھنے کو ترجیح دی ہے، میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا ازالہ اور میرے فکر کو دور کرنے کا ذریعہ بنا دے۔“ [أحمد : ۳۹۱/۱، ح : ۳۷۱۱]

وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے پیدا کیا کچھ لوگ ایسے ہیں جو حق کے ساتھ رہنمائی کرتے اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں ﴿۱۸۱﴾

ابن حبان (۹۷۲) اور ابو یعلیٰ (۱۹۸/۹، ۱۹۹، ح: ۵۲۹۷) میں الفاظ میں کچھ فرق ہے۔

اس مبارک دعا میں اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کے واسطے سے دعا کی گئی ہے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام صرف ننانوے تک محدود نہیں ہیں۔ حدیثِ شفاعت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضری کی اجازت ہوگی اور آپ سجدے میں گر جائیں گے تو اس وقت آپ اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد و ثنا کریں گے جو صرف اسی وقت اللہ تعالیٰ آپ کو سکھائے گا۔ [بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالی : ﴿ وجوہ یومئذ ناضرۃ ﴾ : ۷٤٤٠۔ مسلم : ۱۹٤]

② فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآىِٕهٖ: اللہ کا ذاتی نام ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے، باقی صفاتی نام ہیں۔ فرمایا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں کے بارے میں کج روی اختیار کرتے، یعنی سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں۔ سیدھے راستے سے ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے پاس سے اس کا کوئی نام رکھ لے، یا ایسے لفظ سے پکارے جس سے اللہ تعالیٰ کی شان میں کمی ہوتی ہو۔ بعض قوموں میں اللہ تعالیٰ کے ایسے نام رائج ہیں جو ایک سے زائد معبودوں میں سے کسی ایک پر بولے جاتے ہیں، مثلاً یزدان، بھگوان اور رام وغیرہ، ایسے نام اللہ تعالیٰ پر بولنے سے بچنا فرض ہے۔ سیدھے راستے سے ہٹنے کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کو بگاڑ کر بتوں کے نام رکھے جائیں، جیسے اللات، العزیٰ اور منات کہ یہ لفظ اللہ، عزیز اور منان کی بگاڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ (ابن کثیر) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے کج روی کی ایک صورت یہ بھی لکھی ہے: ''اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ٹونے ٹوٹکوں میں استعمال کیا جائے، ایسے لوگوں کو دنیوی مطلب اگرچہ حاصل ہو جائے مگر سزا ان کو ضرور ملے گی۔'' (موضح) اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ان کے واضح معنی سے انکار کر دیا جائے (یہ تعطیل ہے)، یا تحریف کر دی جائے اور اسے تاویل کا نام دیا جائے، یا ان کو مخلوق کے مشابہ سمجھا جائے (یہ تشبیہ ہے)، یا کہا جائے کہ معلوم ہی نہیں ان کا معنی کیا ہے (یہ تفویض ہے) بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان صفات پر مشتمل الفاظ کا جو معنی ہے وہ سب کو معلوم ہے، مثلاً '' سَمِيْعٌ '' کا معنی سننے والا ہے، مگر وہ اس طرح ہے جس طرح اللہ کی شان کے لائق ہے۔ رہا یہ کہ وہ کیسے ہے؟ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جائے۔ عربی زبان میں اللہ تعالیٰ کے کسی صفاتی نام کا اگر ترجمہ اپنی زبان میں کر دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، مثلاً رب کو پروردگار، یا پالنے والا، رزاق کو روزی دینے والا کہہ دیا جائے تو یہ جائز ہے۔

آیت 181 وَ مِمَّنْ خَلَقْنَاۤ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ: یہی وصف اس سے پہلے آیت (۱۵۹) میں موسیٰ علیہ السلام کی امت کے بعض اشخاص کا بیان ہوا ہے۔ یہاں مراد امت محمد ﷺ ہے، کیونکہ اب حق صرف اس امت کے پاس ہے۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم،

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم ضرور انھیں آہستہ آہستہ کھینچ کر لے جائیں گے، جہاں سے وہ نہیں جانتے ﴿۱۸۲﴾ اور میں انھیں مہلت دوں گا، بے شک میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے ﴿۱۸۳﴾ اور کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی میں جنون کی کون سی چیز ہے؟ وہ تو ایک کھلم کھلا ڈرانے والے کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۸۴﴾

تابعین، سلف صالحین اور وہ تمام لوگ شامل ہیں جو کتاب و سنت کو چھوڑ کر نئے راستے اختیار نہیں کرتے، بلکہ صرف کتاب و سنت پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی بھی اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، کیونکہ حق یہی ہے اور اسی کے مطابق تمام معاملات میں لوگوں کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی آخری کوشش تک لگا دیتے ہیں، یعنی جہاد کرتے ہیں۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''میری امت میں سے ایک گروہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گا، نہ انھیں وہ شخص نقصان پہنچا سکے گا جو انھیں چھوڑ دے اور نہ وہ جو ان کی مخالفت کرے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا اور وہ اسی پر قائم ہوں گے۔'' [بخاري، المناقب، باب : ۳٦٤۱] اس جماعت کی خاص صفت کتاب و سنت پر عمل کے ساتھ کفار سے لڑنا بھی ہے۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔'' [مسلم، الإمارة، باب قوله صلی اللہ علیہ وسلم : لاتزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۰]

آیت 182 وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ......: یعنی ان پر فوری گرفت نہیں کروں گا، تاکہ وہ غفلت میں پڑے رہیں اور گناہ پر گناہ کرتے جائیں، اسی کا نام ڈھیل اور استدراج (آہستہ آہستہ کھینچ کر لے جانا) ہے، جو کفار کو ان کے گناہوں کی سزا میں دی جاتی ہے، مگر وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پر بڑی مہربانی ہو رہی ہے، حالانکہ انھیں آخری عذاب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ دیکھیے سورۂ انعام (۴۴، ۴۵)۔

آیت 182 ① وَ اُمْلِيْ لَهُمْ : '' اَمْلَى يُمْلِيْ اِمْلَاءً '' لمبی مہلت دینے کو کہتے ہیں۔

② اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ : جس کی کسی حیلہ اور تدبیر سے مدافعت نہیں کی جا سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اسے پکڑتا ہے تو اسے بھاگ کر جانے نہیں دیتا۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى ﴾ [هود : ۱۰۲][بخاري، التفسير، باب : ﴿ و كذلك أخذ ربك...... ﴾ : ٤٦٨٦، عن أبي موسى رضی اللہ عنہ]

آیت 184 اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ : اوپر کی آیات میں ان کی غفلت اور بے رخی پر تنبیہ تھی، اب یہاں سے نبوت پر ان کے شبہات کی تردید ہو رہی ہے۔ کفار قریش آپ کو مجنون (پاگل) قرار دیتے تھے، دیکھیے سورۂ حجر

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ

اور کیا انھوں نے نگاہ نہیں کی آسمانوں اور زمین کی عظیم الشان سلطنت میں اور کسی بھی ایسی چیز میں جو اللہ نے پیدا کی ہے اور اس بات میں کہ شاید ان کا مقررہ وقت واقعی بہت قریب آ چکا ہو، پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے ﴿۱۸۵﴾ جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور وہ انھیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیتا ہے،

---

(۶) اور دخان (۱۳، ۱۴) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کے دو جواب دیے، ایک یہ کہ کبھی تم نے سوچا ہے کہ نبی ﷺ کسی اور جگہ سے نہیں آئے، تمھارے ساتھی ہیں، تمھی میں رہتے ہیں، تم ان سے خوب واقف ہو، انھوں نے چالیس برس تم میں گزارے ہیں، کچھ غور تو کرو، کیا پاگل ایسے ہوتے ہیں؟ "صَاحِبُكُمْ" (تمھارے ساتھی) کے لفظ میں یہی جواب دیا گیا ہے۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۶) دوسرا یہ کہ ان لوگوں نے کبھی یہ سوچا بھی ہے کہ جن باتوں کا آپ ﷺ حکم دیتے ہیں، مثلاً توحید، نماز، صدقہ، صلہ رحمی، پاک دامنی اور صدق وغیرہ ان میں سے کون سی چیز جنون ہے، یا آپ کے عادات و خصائل میں کون سی چیز ہے جسے جنون کہا جا سکے، آپ تو محض اللہ تعالیٰ اور اس کے عذاب سے کھلم کھلا ڈرانے والے ہیں۔ دیکھیے سورۂ سبا (۴۶)۔

آیت 185 ① اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ: "مَلَكُوْتِ" یہ "مُلْكٌ" کے لفظ میں واؤ اور تاء کا اضافہ معنی میں وسعت کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "عظیم الشان سلطنت" کیا گیا ہے۔ دلائل کونیہ یعنی اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان سلطنت سے بھی رسول اللہ ﷺ کے سچے نبی ہونے کا ثبوت مل رہا ہے، کیونکہ آپ ﷺ جس توحید کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ آسمان و زمین کی عظیم الشان سلطنت اور پوری کائنات کی ایک ایک چیز بلکہ ایک ایک ذرے سے ثابت ہو رہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ﴾ کے الفاظ کے ساتھ اس سلطنت میں جو بھی بڑی سے بڑی یا چھوٹی سے چھوٹی چیز پیدا فرمائی ہے اس کی طرف نگاہ کرنے کی بھی دعوت دی ہے۔ اتنی بڑی سلطنت کا ہر ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ مجھے کوئی پیدا کرنے والا ہے اور وہ ایک ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے کسی حصے میں کوئی خرابی، کوئی ٹکراؤ یا حادثہ نہیں۔

② وَّ اَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ: اور کیا انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کا مقرر وقت بالکل قریب آ پہنچا ہو، یعنی موت کا مقرر وقت تو کسی کو معلوم نہیں، انسان کو کم از کم یہی سمجھ کر اپنے عقائد و اعمال کی پڑتال کرتے رہنا چاہیے کہ شاید اس کی موت کی گھڑی قریب آ گئی ہو، مگر یہ بدبخت اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

③ تفکر اور غور و فکر کی دعوت اس بات کی دلیل ہے کہ تقلید کا عذر قیامت کے دن کسی کام نہیں آئے گا۔

④ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ: یعنی قرآن سے بڑا معجزہ کیا ہوگا اور اس سے بہتر نصیحت کس کتاب میں ہوگی اور محمد ﷺ سے بہتر سمجھانے والا اور کون ہوگا، جس کی باتوں پر یہ ایمان لائیں گے؟ آئندہ آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل باعث ان کا تکبر اور سرکشی ہیں جو انھیں غور و فکر کرنے ہی نہیں دیتے۔

وَ يَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

بھٹکتے پھرتے ہیں ﴿۱۸۶﴾ وہ تجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں اس کا قیام کب ہوگا؟ کہہ دے اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اس کے وقت پر اس کے سوا کوئی ظاہر نہیں کرے گا، وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری واقع ہوئی ہے، تم پر اچانک ہی آئے گی۔ تجھ سے پوچھتے ہیں جیسے تو اس کے بارے میں خوب تحقیق کرنے والا ہے۔ کہہ دے اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۱۸۷﴾

آیت 186 مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ …… : ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اس کا قانون ہے کہ وہ گمراہ اس کو کرتا ہے جو نیکی کا واضح راستہ چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کر لیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ بھی اسے اس کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۵، ۲۶) اور سورۂ اعراف (۱۷۸، ۱۷۹)۔

آیت 187 ❶ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا : "اَلسَّاعَةِ" ایک گھڑی، لحہ، پل یا سیکنڈ، کیونکہ قیامت اچانک ایک ہی لمحے میں برپا ہو جائے گی۔ "اَيَّانَ" زیادہ صحیح یہی ہے کہ "اَيٌّ" سے "فَعْلَانَ" کا وزن ہے، ظرف زمان بمعنی "مَتٰی" یعنی کب۔ "مُرْسٰىهَا" یہ "اَرْسٰی یُرْسِیْ" باب افعال سے مصدر میمی ہے، لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے، زیادہ تر بہت بھاری چیز کے ٹھہرنے، گڑ جانے، گاڑ دینے اور ٹھہرا دینے کو کہتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا﴾ [النازعات : ۳۲] ''اور پہاڑ، اس نے انھیں گاڑ دیا۔'' ''اَرْسَتِ السَّفِيْنَةُ'' ''بحری جہاز لنگر انداز ہوا۔'' ''اَيَّانَ مُرْسٰىهَا'' کا معنی ہے " اَيَّانَ وُقُوْعُهَا " کہ اس کا واقعہ ہونا کب ہے؟ (قاموس) توحید، نبوت اور قضا و قدر کے بعد اب چوتھی چیز قیامت کے بارے میں بات ہو رہی ہے، کیونکہ قرآن میں یہ چاروں چیزیں اصل بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

❷ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ …… : "اِنَّمَا" کلمۂ حصر ہے، یعنی اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اس نے یہ بات نہ کسی مقرب فرشتے کو بتائی ہے نہ کسی نبی مرسل کو۔ دیکھیے سورۂ نازعات (۴۴) اور نمل (۶۶)۔

❸ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ اس کی ہیبت سے زمین و آسمان لرزتے ہیں، کیونکہ وہ سب اس وقت زیر و زبر ہو جائیں گے۔ دیکھیے سورۂ تکویر، انفطار، انشقاق، قمر (۴۶) اور حج (۱، ۲) دوسرا یہ کہ اس کا علم زمین و آسمان سے بھی برداشت نہیں ہو سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے صرف اپنے پاس رکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ''الفوز الکبیر'' میں اس کا معنی " خَفِيَتْ " کیا ہے، یعنی وہ آسمانوں اور زمین میں کسی کو معلوم نہیں۔ ابن جزی نے فرمایا: " ثَقُلَتْ ثَقُلَ عِلْمُنَا اَیْ خَفِیَ " یعنی اس کا علم مخفی ہے۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

کہہ دے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں نہیں ہوں مگر ایک ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۱۸۸﴾

④ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً: بے شک اس کی علاماتِ عامہ اور علاماتِ خاصہ، مثلاً دجال، دابہ، یاجوج ماجوج کا خروج اور عیسیٰ علیہ السلام کا نزول وغیرہ بتائی گئی ہیں، مگر ان واقعات میں سے بھی کوئی اس کا عین مقرر وقت نہیں کہ اس کے ساتھ ہی قیامت آجائے، اصل وقت صرف اللہ کے پاس ہے اور وہ اچانک یک لخت آئے گا۔

⑤ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا: "حَفِيٌّ" اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جس نے کسی چیز کے متعلق بار بار پوچھ کر اچھی طرح اس کا علم حاصل کر رکھا ہو، یعنی یہ لوگ آپ سے بار بار اس طرح پوچھتے ہیں جیسے آپ نے بڑی کرید اور جستجو کے بعد اس کا پورا پورا علم حاصل کر لیا ہے۔

آیت 188 ① قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا ..... : یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جو کچھ ہونا ہے ہو رہا ہے، مجھ میں ذاتی طور پر یہ بھی قدرت و اختیار نہیں کہ میں اپنی جان سے کسی نقصان یا تکلیف کو روک سکوں، یا کچھ نفع حاصل کر سکوں۔ تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ اختیار نہیں تو پھر وہ کون ہو گا جسے اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار عطا فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۳) اور یونس (۱۰۶، ۱۰۷) بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لیے واقعی اختیار نہیں رکھتے، مگر دوسرے سب لوگوں کے لیے نفع و ضرر کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس کے لیے دیکھیے سورۂ جن (۲۰ تا ۲۲)۔

② وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: یعنی نہ میں غیب دان ہی ہوں، اگر ایسا ہوتا تو کتنے ہی فائدے ہیں جنھیں میں پیشگی سمیٹ لیتا اور کتنے ہی نقصانات ہیں جن سے قبل از وقت آگاہ ہونے کی بنا پر میں بچ جاتا۔ یہاں لفظ "لَوْ" (اگر) سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود افضل المرسلین ہونے کے علم غیب نہیں رکھتے تھے، کیونکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ دیکھیے سورۂ نمل (۶۵) اس کے باوجود بعض نادان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب باور کرواتے ہیں، حالانکہ بعض جنگوں میں آپ کا چہرہ زخمی ہوا، دانت مبارک بھی شہید ہوا، چہرے میں خود کی کڑیاں چبھ گئیں، ہونٹ پھٹ گیا، گھوڑے سے گر کر زخمی ہوئے تو کتنے دن صاحبِ فراش رہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگا تو پورا ایک مہینا آپ پریشان رہے، ایک یہودی عورت نے کھانے میں زہر ملا دیا، جسے کھانے سے آپ کے بعض صحابہ شہید بھی ہو گئے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زہر کا اثر آخر تک محسوس کرتے رہے۔ یہ سب واقعات شاہد ہیں کہ "اگر میں غیب جانتا ہوتا تو مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔" اس مضمون کو تفصیل سے پڑھنے کے لیے تقویۃ الایمان شاہ اسماعیل رحمہ اللہ اور تلاش حق از ارشاد اللہ مان صاحب کا مطالعہ فرمائیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا

وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بنایا، تاکہ وہ اس کی طرف (جاکر) سکون حاصل کرے، پھر جب اس نے اس (عورت) کو ڈھانکا تو اس نے ہلکا سا حمل اٹھالیا، پس اسے لے کر چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ بھاری ہوگئی تو دونوں نے اللہ سے دعا کی، جوان کا رب ہے کہ بے شک اگر تو نے ہمیں تندرست

③ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو جو اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں سے بڑا بنایا ہے، سو ان میں بڑائی یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور اس بات میں کچھ ان کی بڑائی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عالم میں تصرف کی قدرت دے دی ہو کہ موت وحیات یا نفع ونقصان ان کے اختیار میں ہو، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیب دانی دے دی ہو کہ جس کے احوال جب چاہیں معلوم کر لیں۔ اس آیت سے شرک کی جڑ کٹ گئی، جب رسول اللہ ﷺ کو جو تمام عالم کے سردار ہیں، اپنی جان کے نفع ونقصان کا اختیار نہ ہو، نہ غیب کی بات معلوم ہو تو کسی اور نبی یا ولی یا بزرگ یا فقیر یا جن یا فرشتے کو کیا قدرت ہے کہ کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچائے، یا غیب کی کوئی بات بتائے، البتہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ آپ کو جو بات بتا دیتا وہ آپ کو معلوم ہو جاتی اور آپ لوگوں کو اس کی خبر دے دیتے۔ (وحیدی)

آیت 190,189 ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ...... : ایک جان، یعنی آدم علیہ السلام سے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نساء کی پہلی آیت۔

② لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا ...... :معلوم ہوا میاں بیوی کے تعلق کا اصل سکون وراحت ہے۔ دیکھیے سورۂ روم (۲۱) "فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا" جس مقصد کے لیے قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال فرمائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر ادب، حیا، پردے اور پاکیزگی کے ساتھ وہ مطلب ادا کرنے والے اور لفظ ملنا مشکل ہیں۔ "صَالِحًا" یعنی صحیح وسالم بچہ، جس میں کوئی جسمانی نقص نہ ہو۔

اس آیت کی صحیح تفسیر جسے حافظ ابن کثیر اور دوسرے محققین نے اختیار فرمایا ہے، وہ ہے جو حسن بصری رحمہ اللہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ بے شک شروع میں بطور تمہید آدم وحوا علیہما السلام کا ذکر ہے، مگر اس کے بعد "فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا" سے سلسلۂ کلام ان کی اولاد میں سے مشرکین کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں جن میں فرد کے ذکر سے سلسلۂ کلام جنس کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعد میں ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ وغیرہ یعنی تمام آیات میں آخر تک جمع کے الفاظ استعمال ہوئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے جنس آدم مراد ہے۔ آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہو کر شرک کا ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں؟ بہت سے مفسرین نے ان سے مراد آدم اور حوا علیہما السلام لیے ہیں، ان کی بنیاد

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

بچہ عطا کیا تو ہم ضرور ہی شکر کرنے والوں سے ہوں گے ﴿۱۸۹﴾ پھر جب اس نے انھیں تندرست بچہ عطا کیا تو دونوں نے اس کے لیے اس میں شریک بنا لیے جو اس نے انھیں عطا کیا تھا، پس اللہ اس سے بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۱۹۰﴾

اس روایت پر ہے جو سمرہ رضی اللہ عنہ سے ترمذی اور حاکم وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حوا نے بچہ جنا تو ابلیس ان کے پاس آیا، ان کا کوئی لڑکا زندہ نہیں رہتا تھا۔ ابلیس کہنے لگا: ''اس کا نام عبد الحارث رکھو تو یہ زندہ رہے گا۔'' چنانچہ انھوں نے بچے کا نام عبد الحارث رکھا اور وہ زندہ بچ گیا۔ یہ سب کچھ شیطان کے اشارے سے تھا۔'' لیکن حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو ضعیف اور اسرائیلیات سے ماخوذ قرار دیا ہے اور اس کے ضعف کے تین اسباب بیان فرمائے ہیں، خصوصاً اس لیے بھی کہ اس میں شرک کی نسبت اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی سلسلہ ضعیفہ (۳۴۲) میں اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ اس روایت کی سند میں موجود ایک راوی حسن بصری رحمہ اللہ نے وہ تفسیر فرمائی جو اوپر گزری اور صحیح سند کے ساتھ ان سے تفسیر طبری وغیرہ میں مروی ہے، اگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کو صحیح سمجھتے تو خود اس کے خلاف ہرگز تفسیر نہ فرماتے۔ اس لیے وہی تفسیر درست ہے۔ ہمارے استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اگر یہ سارا قصہ آدم و حوا علیہما السلام کے متعلق ہی تسلیم کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ '' جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ '' میں استفہام انکاری ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں تندرست بچہ عطا کیا تو کیا آدم و حوا نے شرک کیا تھا؟ جیسا کہ مشرکین عرب ان کی طرف شرک کی نسبت کرتے ہیں، یعنی نہیں۔ یہ تاویل بھی درست ہے، کیونکہ یہاں تک تثنیہ کی ضمیریں ہیں، آگے جمع کے صیغے کے ساتھ مشرکین پر رد ہے۔

③ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ : اس سے مراد بالاتفاق کفار عرب ہیں، جیسا کہ بعد والی آیات سے ثابت ہو رہا ہے، یعنی جب اولاد کی امید ہوتی ہے تو مشرکین اللہ سے تندرست اولاد عطا کرنے کی دعا کرتے اور شکر گزار ہونے کا وعدہ کرتے ہیں، مگر جب ٹھیک ٹھاک تندرست اولاد عطا ہو جاتی ہے تو اسے غیر اللہ کی دین قرار دے دیتے ہیں، کوئی اسے عبد العزیٰ کہتا ہے، کوئی عبد المطلب، کوئی عبدِ ود اور کوئی عبد یغوث، یا کسی مردے کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں، یا شکریہ ادا کرنے کے لیے بچے کو کسی قبر پر لے جا کر اس کا ماتھا وہاں ٹکاتے ہیں کہ ان کے بزرگوں کے طفیل یہ بچہ ملا ہے۔ یہ سب صورتیں اللہ کا شریک ٹھہرانے کی ہیں جو صرف مشرکین عرب ہی میں نہیں تھیں بلکہ مسلمان کہلانے والے بہت سے لوگوں میں اب بھی عام ہیں، چنانچہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اللہ کو سب سے پیارے دو نام عبد اللہ یا عبد الرحمٰن یا اس سے ملتے جلتے نام یا شرک سے پاک نام رکھنے کے بجائے نبی بخش، حسین بخش، پیراں دتہ، عبد النبی، عبد الرسول اور بندۂ علی وغیرہ نام رکھتے ہیں۔ پھر وہ کسی کو کسی آستانے کا فقیر بنا دیتے ہیں، کسی کو کسی قبر کا مجاور بنا دیتے ہیں۔ کوئی اپنا نام سگ دربار غوثیہ رکھ لیتا ہے، کوئی سگ رسول یا سگ مدینہ۔ [اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ]

اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

کیا وہ انھیں شریک بناتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں ﴿۱۹۱﴾ اور نہ ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اور اگر تم انھیں سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو وہ تمھارے پیچھے نہیں آئیں گے، تم پر برابر ہے کہ تم نے انھیں بلایا ہو، یا تم خاموش ہو ﴿۱۹۳﴾ بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمھارے جیسے بندے ہیں، پس انھیں پکارو تو لازم ہے کہ وہ تمھاری دعا قبول کریں، اگر تم سچے ہو ﴿۱۹۴﴾

آیت 192,191 اَیُشْرِكُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا ...... : اس سلسلۂ کلام سے مقصود بتوں کی پرستش کی تردید ہے کہ ان میں معبود ہونے کی کوئی صفت نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے کوئی چیز پیدا ہی نہیں کی، حتیٰ کہ وہ سب جمع بھی ہو جائیں تو مکھی تک بنانا بلکہ اس سے چھینی ہوئی چیز واپس لینا بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ دیکھیے سورۂ حج (۷۳) وہ خود مخلوق ہیں، اپنے پوجنے والوں کی مدد تو درکنار اگر خود انھیں کوئی توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تو وہ اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے، تو پھر خالق کو چھوڑ کر اس بے بس مخلوق کی پوجا کیوں؟

آیت 193 وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَتَّبِعُوْكُمْ .... : اوپر کی آیات میں بتوں سے ہر قسم کی قدرت کی نفی تھی، اب ان سے ہر طرح کے علم کی نفی کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بت، جن کی یہ پوجا کر رہے ہیں، ان میں نہ تو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت ہے، نہ سننے یا دیکھنے یا کسی اور طرح سے تمھاری حالت سے باخبر ہونے کی۔ (دیکھیے مریم: ۴۲) پھر تم کتنے احمق ہو کہ ان سے امید رکھتے ہو کہ تمھیں سیدھے راستے پر لگائیں گے، یا تم انھیں سیدھے راستے پر چلنے کی دعوت دو گے تو تمھارے پیچھے چلے آئیں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تم ان کے لیے کسی کام کے ہو نہ وہ تمھارے لیے۔

آیت 193 اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ .... : بت پرستوں نے اللہ کے نبیوں اور نیک لوگوں کے مجسمے ہی بت بنا کر رکھے ہوئے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ نوح (۲۳) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بتوں کی صورت میں تمھارے یہ معبود جنھیں تم پکارتے ہو، تمھارے جیسے بندے ہی ہیں۔ یہ الفاظ بھی دلیل ہیں کہ وہ لوگ صرف پتھروں کو نہیں بلکہ بتوں کی صورت میں بزرگوں کو پوجتے اور پکارتے تھے، کیونکہ پتھروں کو تمھارے جیسے بندے نہیں کہا جا سکتا۔ بزرگ خواہ بت کی صورت میں ہوں، خواہ پختہ قبر میں مدفون ہوں، بات ایک ہی ہے کہ تمھاری طرح عبد ہیں، معبود نہیں، یعنی تمھارے

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۫ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۫
اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿١٩٥﴾ اِنَّ وَلِيِّۦَ
اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٧﴾

کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ کہہ دے تم اپنے شریکوں کو بلا لو، پھر میرے خلاف تدبیر کرو، پس مجھے مہلت نہ دو ﴿١٩٥﴾ بے شک میرا یارو مددگار اللہ ہے، جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہی نیکوں کا یارو مددگار بنتا ہے ﴿١٩٦﴾ اور جنھیں تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ نہ تمھاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں ﴿١٩٧﴾

عقیدے کے مطابق اگر ان میں عقل و فہم مان بھی لیں، یا ان کے زندہ ہونے کے وقت کو سامنے رکھ لیں تو زیادہ سے زیادہ ان کا تمھارے جیسا بندہ ہونا ثابت ہو سکتا ہے، عبادت کے لائق ہونا نہیں، مگر یہ تو تمھاری طرح کے جاندار بھی نہیں، جیسا کہ بعد کی آیت میں "اَمْثَالُكُمْ" (تمھارے جیسے) ہونے کی بھی نفی کر دی ہے۔ فرمایا انھیں پکارو کہ تمھاری دعاؤں کو قبول اور تمھاری مرادوں کو پورا کریں۔ یہ بات مشرکوں کو لاجواب کرنے کے لیے فرمائی۔

آیت 195 ❶ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ: تو پھر تمھاری عقل کہاں چلی گئی کہ انھیں مدد کے لیے پکارتے ہو اور ان کے سامنے ماتھے رگڑتے ہو۔ اس آیت سے مقصد یہ ہے کہ بے شک تم نے ان بتوں کے ہاتھ، پاؤں، آنکھیں اور کان بنا رکھے ہیں، مگر زندہ انسان بہرحال ان بتوں سے بہتر ہے، کیونکہ ان چاروں اعضا کی وجہ سے وہ احساس بھی رکھتا ہے اور حرکت بھی کر سکتا ہے۔ رہے یہ بت، تو ان میں نہ شعور و احساس ہے نہ حس و حرکت۔

❷ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ: یعنی اپنا جو زور میرے خلاف لگا سکتے ہو لگا لو، جو خفیہ سے خفیہ تدبیر میرے خلاف کر سکتے ہو اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔

آیت 196 اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ......: یہ جواب ہے مشرکین کی ان دھمکیوں کا جو وہ نبی ﷺ کو دیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تم ہمارے ان معبودوں کو برا کہنے سے باز آ جاؤ، ورنہ تم ان کے غضب میں گرفتار ہو کر تباہ ہو جاؤ گے۔ فرمایا میرا یارو مددگار اللہ ہے، مجھے تمھاری دھمکیوں کی کوئی پروا نہیں۔ نیز اس میں توحید کی دعوت بھی ہے کہ جب یہ اصنام قدرت و علم سے محروم ہیں تو جو لوگ عقل و فکر رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کریں، جس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کامل کتاب نازل فرمائی اور وہ ہر طرح سے نیک لوگوں کا یارو مددگار بھی ہے۔

آیت 197 وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: یہ بات پہلے بھی بیان فرمائی تھی، اس کا دوبارہ تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾
خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

اور اگر تم انھیں سیدھے راستے کی طرف بلاؤ تو نہیں سنیں گے اور تو انھیں دیکھتا ہے کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ نہیں دیکھتے ﴿۱۹۸﴾ درگزر اختیار کر اور نیکی کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کر ﴿۱۹۹﴾

ان مشرکین کی بے وقوفی خوب واضح ہو جائے۔ (شوکانی)

آیت 198 وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ ...... : یعنی مشرکین اپنے بتوں کی صورتیں بناتے وقت ان کی آنکھیں ایسی بناتے کہ ان کی طرف دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہو کہ وہ سچ مچ دیکھ رہے ہیں، مگر جب وہ بے جان بت ہیں تو دیکھیں گے کیسے؟ (ابن جریر) یا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مشرکین بظاہر تو آنکھیں رکھتے ہیں مگر بصیرت کے اندھے ہیں، اس لیے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (ابن کثیر)

آیت 199 ① خُذِ الْعَفْوَ : یعنی توحید کی دعوت کے جواب میں آپ کو مشرکوں اور جاہلوں کی طرف سے بہت تکلیف اٹھانا پڑے گی۔ دیکھیے آل عمران (۱۸۶) اور بقرہ (۱۰۹) آپ اس کے مقابلے میں درگزر سے کام لیں۔ یہاں آپ ﷺ کو حسن اخلاق کی تعلیم دی ہے اور آپ کے واسطے سے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اسلام کی دعوت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل : ۱۲۵] ''اور ان سے اس طریقے سے بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ [آل عمران : ۱۵۹] ''اور اگر تو بدخلق سخت دل ہوتا تو یقیناً وہ تیرے گرد سے منتشر ہو جاتے۔''

② وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ: ''عَرَفَ يَعْرِفُ'' سے مصدر بمعنی معروف ہے، وہ بات جس کا اچھا ہونا فطرتِ انسانی پہچانتی ہے اور شریعت اس کی تائید کرتی ہے۔ یعنی درگزر کا مطلب یہ نہیں کہ آپ انھیں نیکی کا حکم دینا چھوڑ دیں، بلکہ عفو و درگزر کا تعلق حسن اخلاق سے ہے۔

③ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ: اگر وہ ضد پر اڑ کر مخالفانہ رویہ اختیار کریں اور بے فائدہ تکرار کریں تو بجائے الجھنے کے آپ خاموشی اختیار کریں، خواہ وہ اس خاموشی کو کوئی معنی پہنا دیں۔ امید ہے کہ اس سے ان کے رویے میں تبدیلی پیدا ہو گی اور ان کی جارحیت کا وار خالی جائے گا۔ دیکھیے سورۂ قصص (۵۵) اور فرقان (۶۳) بعض علماء نے فرمایا کہ عفو و درگزر کا یہ حکم مکہ میں تھا، مدینہ میں جا کر قتال اور اقامتِ حدود کا حکم نازل ہوا تو یہ منسوخ ہو گیا۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۰۹) مگر اس کے بعد بھی جو لوگ مسلمانوں میں سے جہالت اختیار کریں، جیسے منافق یا وہ کفار جن سے جنگ نہیں ہو رہی، ان سے درگزر کرنے، نیکی کا حکم دینے اور ان کی جہالت سے اعراض کا حکم اب بھی ہے، بلکہ دعوت کے وقت ان چیزوں کا خیال ہمیشہ رکھنا پڑے گا۔ ہاں حدود کے مجرموں یا جنگ پر آمادہ لوگوں سے ان کے لائق معاملہ کیا جائے گا اور اس کے واضح احکام قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تجھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بے شک وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۰۰﴾ یقیناً جو لوگ ڈر گئے، جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی (برا) خیال چھوتا ہے وہ ہشیار ہو جاتے ہیں، پھر اچانک وہ بصیرت والے ہوتے ہیں ﴿۲۰۱﴾

آیت 200 وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ ...... : قرآن میں تین مقامات پر معروف کا حکم دینے، درگزر کرنے، بہترین طریقے سے جواب دینے اور جاہلوں سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک پچھلی آیت میں، دوسرا سورۂ مومنون (۹۶ تا ۹۸) میں اور تیسرا حم السجدہ (۳۴ تا ۳۶) میں اور حم السجدہ میں اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ دشمن بھی متاثر ہو کر دلی دوست کی طرح ہو جائے گا، مگر شیطان پر احسان کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کھلا دشمن ہے اور ہر موقع پر انسان کو اکساتا اور غصہ دلاتا ہے۔ اس شیطانی حملے کا مقابلہ انسان کے بس کی بات نہیں، اس لیے تینوں آیات میں حکم دیا کہ اگر معلوم ہو کہ شیطان مجھے بھڑکا رہا ہے، غصے پر اکسا رہا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو۔ اس پناہ کے سامنے شیطان بے بس ہے۔ قاموس میں "نَزْغٌ" کا معنی "چوکا مارنا، بھڑکانا اور وسوسہ ڈالنا" لکھا ہے۔

سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمی آپس میں گالی گلوچ کرنے لگے، ہم آپ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے، ان میں سے ایک سخت غصے میں اپنے ساتھی کو گالیاں دے رہا تھا تو نبی ﷺ نے فرمایا: "میں ایسا کلمہ جانتا ہوں کہ اگر وہ اسے کہہ لے تو جو حالت اس کی ہے ختم ہو جائے، وہ ہے " اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ " لوگوں نے اس آدمی سے کہا: "تم سنتے نہیں، نبی ﷺ کیا فرما رہے ہیں؟" اس نے کہا: "میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔" [بخاري، الأدب، باب الحذر من الغضب ..... : ٦١١٥۔ مسلم : ٢٦١٠] اوپر جن تین آیات کے حوالے دیے گئے ہیں ان کے حواشی بھی ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 201 اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ ...... : "طٰٓئِفٌ" "طَافَ يَطُوْفُ" کا معنی ہے گھومنا، چکر لگانا، تو "طٰٓئِفٌ" وہ خیال جو ذہن میں آتا ہے، رات خواب میں آنے والا کسی کا خیال بھی "طَيْفٌ" یا "طٰٓئِفٌ" کہلاتا ہے۔ قاموس میں اس کا ترجمہ غضب بھی کیا گیا ہے۔ "مَسَّ يَمَسُّ (ع)" کا معنی ہے چھونا، یعنی شیطان کی طرف سے آنے والے خیال یا غصے کے چھونے کے ساتھ ہی انھیں اللہ تعالیٰ کا جلال، آخرت کی جوابدہی اور شیطان کی دشمنی یاد آ جاتی ہے، جس سے فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، ان میں بصیرت اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے، وہ اسی وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہوئے اس وسوسے، خیال یا غصے کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں اور اس پر عمل سے باز رہتے ہیں۔

وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا
اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

اور جو ان (شیطانوں) کے بھائی ہیں وہ انھیں گمراہی میں بڑھاتے رہتے ہیں، پھر وہ کمی نہیں کرتے ﴿۲۰۲﴾ اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہ لائے تو کہتے ہیں تو خود اس کا انتخاب کر کے کیوں نہیں لے آیا؟ کہہ دے میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی جانب سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے سمجھ کی باتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۲۰۳﴾ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۲۰۴﴾

آیت 202 وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ...... : یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے مقابلے میں ان کفار و منافقین کا جو اپنی شرارت اور خباثت نفس میں شیاطین کے بھائی ہیں، یہ حال ہے کہ ان کے بھائی شیاطین انھیں گمراہی میں بڑھاتے اور گھسیٹتے ہی لیے جاتے ہیں اور انھیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ (ابن کثیر)

آیت 202 ❶ وَ اِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ ...... : اس آیت میں شیاطین کے بھائیوں کی گمراہی اور بے جا ضد کی ایک مثال بیان فرمائی ہے، یعنی وہ پیغمبر سے ازراہ عناد کہتے ہیں کہ تم اپنے پاس ہی سے کوئی آیت (معجزہ) کیوں نہیں لے آتے۔ فرمایا میں تو صرف وحیِ الٰہی کا تابع ہوں اور اپنی طرف سے کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ دیکھیے سورۂ یونس (۱۵ تا ۱۷)۔

❷ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ...... : اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم ہی بڑا کافی معجزہ ہے، اس کے ہوتے ہوئے مزید معجزوں کی طلب محض نہ ماننے کا بہانہ ہے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۰، ۵۱) پھر یہاں قرآن کے تین بڑے اوصاف بیان فرمائے ہیں، جو صرف اس معجزے کی خصوصیت ہیں۔

آیت 204 وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ...... : قرآن کی عظمت بیان کرنے کے بعد اب اس سے فائدہ اٹھانے کے آداب کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ اس کے پڑھے جانے کے وقت استماع اور انصات ضروری ہے، سو توجہ اور خاموشی سے سنو، تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کا رحم ہو جائے۔ یہ ان ضد اور عناد کے مارے ہوئے کفار کو نصیحت ہے جن کا ذکر مسلسل چلا آ رہا ہے اور جو ہمیشہ نئے سے نئے معجزے کا مطالبہ کرتے اور جب قرآن پڑھا جاتا تو شور مچا کر دوسروں کو بھی سننے سے روکتے اور اس بے ہودہ طریقے سے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حم السجدہ (۲۶) میں فرمایا: ''اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔'' اس آیت میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں جو کفار نے کہیں، پہلی یہ کہ اس قرآن کو مت سنو، دوسری یہ کہ اس میں شور کرو، تیسری یہ کہ تاکہ تم غالب رہو،

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

اور اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی سے اور خوف سے اور بلند آواز کے بغیر الفاظ سے صبح وشام یاد کر اور غافلوں سے نہ ہو ﴿۲۰۵﴾

اس کے جواب میں سورۂ اعراف کی زیر تفسیر آیت: ﴿ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ﴾ میں تین باتوں کی تلقین فرمائی، چنانچہ "لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ" کے جواب میں "فَاسْتَمِعُوْا" فرمایا، یعنی کان لگا کر سنو اور "وَالْغَوْا فِيْهِ" یعنی شور وغل کرو کے جواب میں "اَنْصِتُوْا" یعنی خاموش رہو فرمایا اور "لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ" کے جواب میں فرمایا "لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمھیں قرآن سنایا جائے تو شور وغل کے بجائے کان لگا کر خاموشی سے سنو۔ یہ حکم عام ہے، کافر ہوں یا مسلمان، سب کو قرآن مجید توجہ سے سننا چاہیے۔ خصوصاً نماز اور خطبہ جمعہ میں تو خاموش رہنا فرض ہے، جس کے دلائل حدیث میں موجود ہیں۔ ہاں، اگر کوئی اپنے طور پر قرآن پڑھ رہا ہے تو سب کچھ چھوڑ کر اسے سننا ضروری نہیں، ورنہ ایک مسجد کے سپیکر سے قرآن کی تلاوت پوری بستی کو خاموش کرانے کے لیے کافی ہو گی۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے، مگر یہ استدلال بالکل بے محل ہے، کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور ماقبل سے مشرکین سے خطاب چلا آ رہا ہے، اس لیے نظم قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں بھی مشرکین ہی مخاطب ہوں، اگر اس آیت کو عام بھی مان لیا جائے تو اصولِ فقہ کی رو سے حدیث « لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ » (جسے امام بخاری نے متواتر قرار دیا ہے) کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی تخصیص ہو جائے گی، کیونکہ اس کے بغیر امام، منفرد، مقتدی کسی کی بھی نماز نہیں ہوتی۔ مقتدی آواز کے بغیر پڑھے تو خاموشی کے خلاف بھی نہیں۔

جیسا کہ آپ ﷺ نے خطبہ جمعہ میں خاموش رہ کر غور سے سننے کا حکم دیا، اس کے باوجود صحیح مسلم (۸۷۵/۵۹) میں جابر رضی اللہ عنہ سے آپ کا یہ حکم مروی ہے: ''تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعتیں پڑھے اور انھیں مختصر پڑھے۔'' اب ظاہر ہے کہ اس کا دو رکعتیں پڑھنا خاموشی کے خلاف نہیں، ورنہ اس صحیح حدیث میں آپ ﷺ خطبہ کے دوران میں ہر آنے والے شخص کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہ دیتے، مگر آپ کے حکم کی وجہ سے خطبہ کے دوران میں آنے پر دو رکعتیں پڑھنا ہوں گی، اسی طرح امام کے پیچھے فاتحہ بھی پڑھنی ہو گی اور خاموشی بھی قائم رہے گی۔ تعجب اس بات پر ہے کہ بعض لوگ اس وقت بھی مقتدی کو کچھ نہ پڑھنے کا حکم دیتے ہیں جب امام بلند آواز سے قراءت نہ کر رہا ہو۔ فرمائیے اس کے ساتھ اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ پھر ہمارے بعض بھائی امام کی قراءت سنتے ہوئے صبح کی سنتیں پڑھتے رہتے ہیں، مگر انھیں اس وقت یہ آیت یاد نہیں آتی اور سب سے زیادہ تعجب تو ان کی اس بات پر ہے کہ ان کے ہاں سورۂ فاتحہ امام، منفرد، یا مقتدی کسی کے لیے بھی نماز میں فرض نہیں۔ قرآن کی کوئی بھی ایک آیت پڑھ لینے سے نماز ہو جائے گی۔ بتائیے پھر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ ''جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں'' یہ امام، منفرد یا مقتدی میں سے کسی کے لیے نہیں تو اس کا مخاطب کون ہو گا؟

آیت 205 وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ ... : "بِالْغُدُوِّ" سے مراد فجر سے لے کر سورج طلوع ہونے تک کا وقت ہے اور

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

بے شک جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں ﴿۲۰۶﴾

"اَلْاٰصَالِ" "اَصِيْلٌ" کی جمع ہے، جیسے "اَيْمَانٌ" "يَمِيْنٌ" کی جمع ہے، اس سے مراد عصر سے لے کر مغرب تک کا وقت ہے۔ ان اوقات میں دل کی حاضری کے ساتھ اللہ کا ذکر غفلت دور کرنے میں بے حد مفید ہے۔ بعض اوقات صبح و شام بول کر ہر وقت بھی مراد لیا جاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی تاکید اور اس کے آداب بیان ہوئے ہیں: ① "فِيْ نَفْسِكَ" ذکر دل کے ساتھ کرے، صرف زبان چل رہی ہو اور دل حاضر نہ ہو تو خاص فائدہ نہیں۔ ② "تَضَرُّعًا" ذکر خوب عاجزی کے ساتھ اور گڑگڑا کر کیا جائے۔ ③ "خِيْفَةً" اللہ کا خوف دل پر طاری ہو اور اپنی عملی کوتاہی اور اللہ تعالیٰ کی گرفت کا ڈر ہو۔ ④ "دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ آواز کے بغیر ہو، کیونکہ یہ اخلاص سے قریب اور ریا سے دور ہے۔ دوسرا یہ کہ ذکر اور قرآن کی تلاوت نہ بالکل آہستہ ہو نہ بہت بلند آواز سے، بلکہ درمیانی آواز کے ساتھ پڑھا جائے۔ دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل (۱۱۰) اور جیسا کہ آپ ﷺ نے نمازِ تہجد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آواز کچھ بلند کرنے اور عمر رضی اللہ عنہ کو کچھ پست کرنے کا حکم دیا تھا۔ [أبو داوٗد، التطوع، باب في رفع الصوت...... : ۱۳۲۹] دونوں صورتوں میں دل کی حاضری کے ساتھ زبان سے الفاظ کا ادا ہونا بھی ضروری ہے، صرف دل میں ذکر کو فکر کہتے ہیں، ذکر نہیں۔ اگر کوئی شخص نماز صرف دل سے پڑھتا جائے، زبان سے الفاظ ادا نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ ⑤ "وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ" ذکر ہر وقت جاری رہے، خصوصاً صبح و شام کے اوقات میں اور کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو۔

آیت 206 اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب مقرب فرشتے بھی اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو چاہیے کہ اس کے سوا اور کسی کو سجدہ نہ کرے۔'' (موضح)

سُورَةُ الْأَنفَال ۸ مدنية ۸۸ — بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ — اٰيَاتُهَا ۷۵ رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ تجھ سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دے غنیمتیں اللہ اور اس کے رسول کی ہیں، سو اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر تم مومن ہو①

آیت 1 ① يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ: "الْاَنْفَالِ" یہ " نَفَلٌ" (نون اور فاء کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے، جیسا کہ "فَرَسٌ" کی جمع " اَفْرَاسٌ " ہے۔ جس کا معنی زائد چیز ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ [بني إسرائيل : ۷۹] ''اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں کہ تیرے لیے زائد ہے۔'' یعنی رات کا قیام فرض نمازوں سے زائد ہے۔ یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے: ① مال غنیمت، کیونکہ جہاد کا اصل مقصد تو ثواب اور حصولِ جنت ہے، غنیمت تو ایک زائد چیز ہے۔ شاید اسی لیے پہلی امتوں کے لیے غنیمت حلال نہیں تھی، اس امت کو ثواب پر مزید غنیمت بھی حلال کر دی گئی۔ ② امیر کسی خاص کارنامے پر غنیمت کے حصے سے زائد کسی انعام کا اعلان کر دے، یا دینا چاہے تو یہ بھی نفل ہے۔ ③ مقتول کے پاس جو بھی سامان اسلحہ یا سواری وغیرہ ہو وہ قاتل کو دیا جائے، اسے ''سلب'' کہتے ہیں، یہ بھی نفل ہے۔ ④ عام جنگ کے علاوہ کچھ دستے جنگ کے لیے جاتے ہوئے یا واپسی پر کسی بستی پر حملے کے لیے بھیجے جائیں اور وہ غنیمت لے کر آئیں تو وہ پورے لشکر کے لیے ہوگی، مگر اس دستے کو مجموعی غنیمت میں سے الگ زائد حصہ بھی دیا جائے گا جو رسول اللہ ﷺ جاتے وقت چوتھا حصہ اور واپسی پر تیسرا حصہ عطا فرماتے تھے۔ ⑤ امیر غنیمت کی تقسیم سے پہلے کوئی ایک چیز اپنے لیے چن لے، مثلاً کوئی اسلحہ یا سواری، یا لونڈی وغیرہ، اسے ''صفی'' بھی کہتے تھے۔

زمانۂ جاہلیت میں معمول تھا کہ جنگ میں جو شخص جو کچھ لوٹ لیتا اسی کا ہوتا۔ اسلام میں سب سے پہلا عظیم الشان معرکہ بدر واقع ہوا تو ابھی تک کفار سے حاصل ہونے والے مال کی تقسیم کا طریقہ مقرر نہیں ہوا تھا۔ بدر میں جب بہت سا مالِ غنیمت حاصل ہوا تو یہ مسئلہ پیش آیا۔ چنانچہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے تو میں آپ کے ساتھ بدر میں شریک ہوا۔ لوگوں کا باہمی مقابلہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی، تو ایک گروہ انھیں ہزیمت دیتے اور قتل کرتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑا، ایک گروہ لشکر گاہ پر متوجہ ہو کر اس کی حفاظت اور مال جمع کرنے لگ گیا اور ایک گروہ نے رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے رکھا کہ دشمن آپ کے متعلق کسی غفلت سے فائدہ نہ اٹھا لے۔ آخر سب لوگ واپس آ کر جمع ہوئے تو جنھوں نے غنیمتیں جمع کی تھیں، کہنے لگے، یہ ہم نے جمع کی ہیں، کسی اور کا ان میں کوئی حصہ نہیں، جو دشمن کے پیچھے گئے تھے انھوں نے کہا تم ہم سے زیادہ اس کے حق دار نہیں ہو، ہم نے دشمن کو ان سے ہٹایا اور انھیں مار بھگایا ہے۔ جنھوں نے

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ

(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی

رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے رکھا، انھوں نے کہا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کو گھیرے میں رکھا اور اس بات سے ڈرے کہ دشمن کسی طرح کی غفلت میں آپ کو نقصان نہ پہنچائے، چنانچہ ہم اس کام میں مشغول رہے، تو اس وقت یہ آیات اتریں: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ﴾ تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور رسول اللہ ﷺ جب دشمن کی زمین میں حملے کے لیے جاتے تو چوتھا حصہ بطور نفل (زائد) دیتے تھے، پھر جب واپس آتے، لوگ تھکے ہوئے ہوتے تو تیسرا حصہ بطور نفل عطا فرماتے تھے اور آپ خصوصاً زائد حصے دینا پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''مومنوں کا قوت والا ان کے کمزور پر غنیمت واپس لاتا ہے۔'' [أحمد : ٥/ ٣٢٣، ٣٢٤، ح ٢٢٧٦٢، وقال شعيب الأرنؤوط حسن لغيره] ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور مستدرک حاکم میں بھی اس حدیث کے بعض اجزا مروی ہیں۔

② قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ...... : فرمایا آپ سے غنیمتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ کس کا حق ہیں، کس طرح تقسیم ہوں گی، آپ فرما دیں کہ غنیمتیں حقیقت میں تم میں سے کسی کی بھی ملکیت نہیں، یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ملکیت ہیں، تمھارا ان میں کچھ دخل نہیں، کیونکہ فتح تمھاری طاقت سے نہیں بلکہ اللہ کی مدد سے ہوئی ہے۔ آگے دور تک یہ بات بیان کی ہے کہ فتح اللہ کی مدد ہی سے ہوئی ہے اور ہوتی ہے، اس لیے تم اللہ سے ڈرو اور ان اموال کی وجہ سے تمھارے باہمی تعلقات میں جو خرابی آئی ہے اسے درست کرو اور اگر تم مومن ہو تو اللہ اور اس کا رسول جو بھی حکم دیں اس کی اطاعت کرو، جسے جتنا دیں یا نہ دیں، وہ اس پر راضی رہے اور اس مال کی بنا پر تمھارے آپس کے تعلقات ہرگز خراب نہیں ہونے چاہییں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم آپس کے تعلقات بگاڑنے سے بچو، اس لیے کہ یہ چیز (دین) کو مونڈ دینے والی ہے۔'' [ترمذی، صفة القيامة، باب في فضل صلاح ذات البين : ٢٥٠٨، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] تفسیر ابن کثیر میں یہاں مسند ابی یعلیٰ کے حوالے سے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس میں اپنے بھائی کو معاف کرنے والے کے لیے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں جانے کا ذکر ہے، یہ روایت مستدرک میں بھی ہے، جسے امام حاکم نے صحیح کہا ہے، مگر ذہبی نے اس کے ایک راوی عباد کو ضعیف اور اس کے شیخ کو ''لَا يُعْرَفُ'' کہا ہے۔

③ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو بھی ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے مراد (جیسا کہ ظاہر ہے) آپ کی سنت کی پیروی ہے، لہٰذا جو شخص آپ کی سنت سے منہ موڑ کر صرف قرآن کی اطاعت کرنا چاہتا ہے (جبکہ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل کسی صورت ممکن ہی نہیں) وہ قرآن کی واضح تصریح کے مطابق دائرۂ ایمان سے خارج ہے۔

آیت 2 تا 4 اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ ...... : اوپر فرمایا کہ اطاعت ہے تو ایمان ہے، اب ان آیات میں

اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۚ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۚ﴿۴﴾
كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ﴿۵﴾

جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں ② وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں
اور اس میں سے جو ہم نے انھیں دیا، خرچ کرتے ہیں ③ یہی لوگ سچے مومن ہیں، انھی کے لیے ان کے رب کے
پاس بہت سے درجے اور بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے ④ جس طرح تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے
ساتھ نکالا، حالانکہ یقیناً مومنوں کی ایک جماعت تو ناپسند کرنے والی تھی ⑤

ایمان والوں کی چند صفات بیان فرمائیں۔ سرفہرست یہ ہے کہ جب ان کے تنازعات کے درمیان اللہ کا ذکر یا اس کا حکم آجائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور وہ اس کی نافرمانی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ دوسری علامت یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کے احکام بیان کیے جائیں تو وہ انھیں سچے دل سے مانتے ہوئے ان کی اطاعت کرتے ہیں، جس سے ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان ایک ہی حالت پر نہیں رہتا بلکہ اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ دلائل کو دیکھ کر یقین وتصدیق میں بھی اور اعمال کی کمی بیشی کے لحاظ سے بھی۔ تیسری علامت یہ ہے کہ جس کام کا انھیں حکم دیا جاتا ہے وہ اس کے تمام ذرائع اور اسباب تو اختیار کرتے اور اپنی کوشش پوری کرتے ہیں، مگر ان کا بھروسا ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، اپنی تیاری یا اسباب پر نہیں۔ اپنی پوری کوششوں کے بعد وہ اس کے انجام کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان کی چوتھی علامت یہ ہے کہ وہ نماز کو اس کے پورے حقوق اور آداب کے ساتھ ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور پانچویں علامت یہ ہے کہ اپنے اموال میں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق بھی ادا کرتے ہیں، جن لوگوں میں یہ پانچ علامات پائی جائیں اللہ تعالیٰ نے صرف انھی کو "الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" یعنی پکے سچے مومن قرار دیا ہے، ایسے ہی مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند درجات بھی ہوں گے، بڑی بخشش بھی اور باعزت روزی بھی۔

آیت 5 كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ...... : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی بات ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ بھی اسی طرح ہے جیسے تیرے رب نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ نکالا۔ مفسرین نے اس " كَمَآ " (جس طرح) کی کئی توجیہیں کی ہیں، بعض نے وہ بیس تک پہنچا دی ہیں، البتہ صاحب کشاف نے صرف دو توجیہیں کی ہیں، جن میں سے زیادہ واضح یہ ہے کہ یہاں مبتدا محذوف ہے اور عبارت یوں ہوگی " هٰذِهِ الْحَالُ كَحَالِ إِخْرَاجِكَ يَعْنِيْ اَنَّ حَالَهُمْ فِيْ كَرَاهِيَةِ مَا رَأَيْتَ مِنْ تَنْفِيْلِ الْغُزَاةِ مِثْلُ حَالِهِمْ فِيْ كَرَاهَةِ خُرُوْجِكَ لِلْحَرْبِ " یعنی غزوۂ بدر سے حاصل ہونے والی غنیمت کی تقسیم کے بارے میں آپ کی رائے اور فیصلے کو ناگوار سمجھنے میں ان کا حال ایسا ہی ہے جس طرح ان کا حال آپ کے لڑائی کے لیے نکلنے کے بارے میں تھا، حالانکہ دونوں ہی میں آپ کے لیے اور مسلمانوں کے لیے خیر ہی خیر

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

وہ تجھ سے حق میں جھگڑتے تھے، اس کے بعد کہ وہ صاف ظاہر ہو چکا تھا، جیسے انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں۞ اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہوگا اور تم چاہتے تھے کہ جو کانٹے والا نہیں وہ تمھیں مل جائے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں کے ساتھ سچا کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۞

تھی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غنیمت کا یہ جھگڑا ابھی ویسا ہی ہے جیسا کہ نکلتے وقت عقل سے تدبیریں کرنے لگے اور آخر کار صلاح وہی ٹھہری جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تو ہر کام میں یہی اختیار کرو کہ حکم برداری میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔'' (موضح)

آیت 6 ❶ **يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ ......** : حق سے مراد کفار کا قافلہ نکل جانے کے بعد کفار سے ہر صورت لڑائی ہے، جس کا انجام فتح اور غنائم ہوگا۔ مختصراً واقعہ یہ ہے کہ سن ۲ ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ کفارِ قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے مکہ جا رہا ہے اور مدینہ کے قریب کے راستے پر پہنچ چکا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی مختصر سی جمعیت جو تین سو سے کچھ اوپر تھی، لے کر قافلے کے تعاقب کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ابوسفیان کو آپ کے نکلنے کی اطلاع ہوگئی، اس نے ایک تیز رفتار سوار کے ذریعے سے مکہ اطلاع بھیج دی اور خود احتیاطاً اصل راستہ چھوڑ کر ساحلی راستہ اختیار کر لیا۔ مکہ میں جب یہ خبر پہنچی تو ابوجہل ایک بڑا مسلح لشکر لے کر قافلے کی حفاظت کے لیے روانہ ہو گیا اور آ کر بدر میں ڈیرے ڈال دیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ نے مسلمانوں کے سامنے ساری صورت حال رکھ دی کہ ایک طرف تجارتی قافلہ ہے اور دوسری طرف قریش کا لشکر ہے، اللہ کا وعدہ ہے کہ تمھیں دونوں میں سے ایک ضرور ملے گا۔ اس پر بعض صحابہ کو تردد ہوا، وہ چاہتے تھے کہ لشکر کے بجائے قافلے کا تعاقب کیا جائے۔ اس وقت ابوبکر، عمر، سعد بن معاذ اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم نے اطاعت کی تقریریں کیں، مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ہمیں موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں جیسا نہیں پائیں گے، جنھوں نے کہا کہ جا تو اور تیرا رب لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں!! تب آپ بدر کی طرف روانہ ہوئے اور اس وقت بعض صحابہ نے لشکر سے نہ لڑنے کا مشورہ دیا تھا، اسے ''**يُجَادِلُوْنَكَ**'' (وہ تجھ سے جھگڑتے تھے) سے تعبیر کیا ہے۔

❷ **كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ ......** : یعنی سمجھتے تھے کہ اتنے بڑے لشکر سے لڑنا اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔

آیت 7 ❶ **وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ** : یعنی قافلے یا کفار پر فتح اور اموال غنیمت۔

❷ **وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ ......** : ''**الشَّوْكَةِ**'' کانٹے کو کہتے ہیں، یعنی تمھاری خواہش یہ تھی کہ کسی تکلیف اور جنگ کے بغیر حاصل ہونے والا قافلہ تمھیں مل جائے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنی باتوں اور وعدوں کے مطابق حق کو سچا

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸﴾ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿۹﴾

تاکہ وہ حق کو سچا کر دے اور باطل کو جھوٹا کر دے، خواہ مجرم ناپسند ہی کریں ﴿۸﴾ جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمھاری دعا قبول کر لی کہ بے شک میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمھاری مدد کرنے والا ہوں، جو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں ﴿۹﴾

ثابت فرمائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

آیت 8 لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ...... اس لیے اس نے ایسے اسباب پیدا فرما دیے کہ تمھارا مقابلہ تجارتی قافلے کے بجائے قریش کے لشکر سے ہوا اور تمھیں فتح نصیب ہوئی، جس سے ان کی سیاسی اور فوجی طاقت پر کاری ضرب لگی، یہی اللہ تعالیٰ کی وہ حکمت تھی جسے تم نہیں سمجھ رہے تھے اور تم میں سے بہت سے لوگ یہ چاہ رہے تھے کہ لشکر سے مقابلے کے بجائے تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ لگے۔

آیت 9 ① اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ...... : اپنی تعداد، تیاری، اسلحہ کی کمی اور دشمن کے تین گنا سے زیادہ اور ہر قسم کے اسلحے سے لیس ہونے کی وجہ سے سب مسلمان ہی اپنے پروردگار سے مدد کے لیے فریاد کر رہے تھے۔ خصوصاً رسول اللہ ﷺ تو نہایت عجز اور الحاح کے ساتھ دعا فرما رہے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بدر کا دن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا، وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے ساتھی تین سو انیس آدمی تھے، تو اللہ کے نبی ﷺ نے قبلے کی طرف رخ کر کے ہاتھ پھیلا دیے اور اپنے رب سے بلند آواز سے فریاد کرنے لگے: ''اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ مجھ سے پورا کر، اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ مجھ سے پورا کر۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔'' آپ اپنے رب سے بلند آواز سے فریاد کرتے رہے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے دعا کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی چادر کندھوں سے گر گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے، آپ کی چادر پکڑی، اسے آپ کے کندھوں پر ڈالا، پھر پیچھے سے آپ سے چمٹ گئے اور کہا: ''اے اللہ کے نبی! آپ کا اپنے رب کو قسم دینا آپ کے لیے کافی ہے، کیونکہ یقیناً وہ آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرے گا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔ [مسلم، الجهاد، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر...... : ۱۷۶۳] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کہنے کے بعد آپ یہ کہتے ہوئے نکلے: ﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴾ [القمر : ٤٥] ''یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھیں پھیر کر بھاگیں گے۔'' [بخاری، المغازی، باب قول الله تعالى : ﴿ إذ تستغيثون ربكم...... ﴾ : ۳۹۵۳]

② اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ: ایک دوسرے کے پیچھے، یعنی پے در پے آنے والے ہیں۔ چنانچہ بدر میں

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىِٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۠﴿۱۰﴾

ع ۱۵

اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر ایک خوش خبری اور تاکہ اس کے ساتھ تمھارے دل مطمئن ہوں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۰﴾

فرشتے نازل ہوئے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن فرمایا: ''یہ جبریل ہیں، اپنے گھوڑے کے سر (لگام) کو پکڑے ہوئے ہیں، لڑائی کے ہتھیار پہنے ہوئے ہیں۔'' [بخاری، المغازی، باب شهود الملائكة بدرًا: ۳۹۹۵] یہاں ایک ہزار فرشتے اترنے کے وعدے کا ذکر ہے جو واقعی اترے۔ رفاعہ بن رافع قرظی بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، پوچھا: ''تم اہل بدر کو اپنے میں کیسا شمار کرتے ہو؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے سب سے بہتر لوگ۔'' یا اس کے ہم معنی کوئی بات کہی۔ (جبریل علیہ السلام نے) فرمایا: ''اسی طرح وہ فرشتے بھی (افضل) ہیں جو بدر میں شریک ہوئے تھے۔'' [بخاری، المغازی، باب شهود الملائكة بدرًا: ۳۹۹۲] سورۂ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے وعدے کا ذکر ہے، تطبیق کے لیے دیکھیے آل عمران (۱۲۴، ۱۲۵)۔

آیت 10 ① **وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى** ...... : آیت کے ان الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ فرشتوں نے خود لڑنے میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مسلمانوں کی مدد کے لیے محض اس لیے بھیجا تھا کہ ان کے حوصلے بلند ہوں اور انھیں اطمینان رہے کہ ان کی مدد کے لیے فرشتے موجود ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ صحیح مسلم میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس دوران میں کہ ایک مسلمان مشرکین میں سے ایک آدمی کے پیچھے دوڑ رہا تھا کہ اس نے کوڑا مارنے کی ضرب کی آواز سنی اور ایک سوار کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا حیزوم! آگے بڑھو۔ اس نے اس مشرک کو دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے، دیکھا تو اس کی ناک پر نشان تھا، چہرہ پھٹ گیا تھا، جس طرح کوڑا مارنے سے ہوتا ہے اور وہ ساری جگہ سبز ہو گئی تھی۔ وہ انصاری آیا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات بیان کی، تو آپ نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا، یہ تیسرے آسمان کی مدد میں سے تھا۔'' [مسلم، الجهاد، باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر...... : ۱۷۶۳] بدر کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے کئی جنگوں میں فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ میں نے بہت سے قابل اعتماد لوگوں سے سنا کہ متحدہ ہندوستان میں حافظ عبد اللہ روپڑی رحمہ اللہ کے حکم پر مسلمانوں نے عید الاضحیٰ کے دن گائیں ذبح کیں، تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، مسلمانوں نے تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مقابلہ کیا تو کفار کثیر تعداد میں قتل ہوئے اور بھاگ گئے۔ جب مقدمہ چلا تو جنگ میں شریک مسلمان اور کافر پیش ہوئے، کفار کو شناخت کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا، ہم سے تو وہ لوگ لڑے ہیں جو سفید لباس میں ملبوس گھوڑوں پر سوار تھے، حالانکہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس حالت میں نہ تھا۔ کشمیر میں کفار کے خلاف کارروائیوں کے دوران بھی فرشتوں کی مدد کے کئی واقعات پیش آئے ہیں جو مجلّۃ الدعوۃ اور غزوہ کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے ہیں۔ شاعر

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَ لِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ يُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ⑪

جب وہ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا، اپنی طرف سے خوف دور کرنے کے لیے اور تم پر آسمان سے پانی اتارتا تھا، تاکہ اس کے ساتھ تمھیں پاک کر دے اور تم سے شیطان کی گندگی دور کرے اور تاکہ تمھارے دلوں پر مضبوط گرہ باندھے اور اس کے ساتھ قدموں کو جما دے ⑪

نے سچ کہا ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

② وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ...... : یعنی یہ نہ سمجھو کہ تمھیں جو فتح نصیب ہوئی ہے وہ ان فرشتوں کی وجہ سے ہوئی ہے، بلکہ حقیقت میں مدد اللہ کی طرف سے ہے، وہ چاہتا تو فرشتوں کے بغیر ہی تمھیں فتح عطا کر دیتا، مگر جہاد کو دین کا حصہ بنانے سے تمھارے ایمان کا امتحان، تمھارے ہاتھوں کافروں کو ذلیل اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت سے سرفراز کرنا مقصود ہے۔ پہلی امتوں میں سے جو امت اپنے پیغمبر کو جھٹلاتی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نہ کسی طرح کا عذاب نازل ہو جاتا، پانی میں غرق کرنا، خوف ناک چیخ، زلزلہ، پتھروں کی بارش اور شکلیں مسخ کر دینا وغیرہ۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے غرق ہونے سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک یہی سلسلہ قائم رہا۔ آخر کار جب موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل ہوئی تو جہاد شروع ہوا اور اس کے بعد یہی طریقہ جاری ہے، اب اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ہاتھوں کفار کو عذاب دینا چاہتا ہے، فرمایا: ﴿ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ ...... ﴾ [التوبة : ١٤، ١٥] ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کے چھ فائدے بیان فرمائے ہیں، تفصیل کے لیے سورۂ توبہ میں ان آیات کی تفسیر دیکھیے۔ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی آسمان سے عذاب کے بعض واقعات پیش آئے، جیسے اصحاب الفیل کا واقعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق آپ کی امت میں شراب، زنا، ریشم اور باجوں گاجوں کو حلال کر لینے والوں پر زمین میں دھنس جانے اور بندر اور خنزیر بنا دیے جانے کے عذاب آئیں گے۔ [بخاري، الأشربة، باب ما جاء فيمن يستحل الخمر...... : ٥٥٩٠، عن أبي مالك الأشعري رضي الله عنه] مگر وہ عبرت کے لیے ہوں گے اور جزوی، یعنی کہیں کہیں ہوں گے۔ کفار کو کفر سے روکنے اور ان کی سرکشی ختم کر کے انھیں اسلام کے زیر نگیں لانے کی ذمہ داری اب جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں ہی پر ہے، جس میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل ہو گی۔

آیت 11 ① اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ : جنگ بدر میں فرشتوں کے ساتھ مدد کے علاوہ یہ دوسری مدد تھی۔ یہ اونگھ دو طرح سے آئی، ایک تو یہ کہ جس رات کی صبح کو لڑائی ہونے والی تھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوب سوئے، حالانکہ دشمن کی فکر لگی ہوئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند بھیج دی، تاکہ وہ تازہ دم ہو جائیں اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''بدر کے دن مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا اور کسی کے پاس گھوڑا نہیں تھا، میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ہر شخص سو رہا تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ اَنِّیۡ مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ فَاضۡرِبُوۡا فَوۡقَ الۡاَعۡنَاقِ وَاضۡرِبُوۡا مِنۡهُمۡ كُلَّ بَنَانٍ ؕ﴿۱۲﴾

جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا۔ پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ﴿۱۲﴾

درخت کے نیچے نماز پڑھتے رہے اور رو رو کر دعائیں کرتے رہے، حتیٰ کہ صبح ہوگئی۔‘‘ [أحمد : ۱۲۵/۱، ح : ۱۰۲۳، قال شعیب الأرنؤوط إسناده صحیح] اس نیند کے ساتھ مسلمان تازہ دم ہو گئے۔ دوسرا یہ کہ لڑائی سے پہلے میدان میں آنے پر تمام مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے اونگھ طاری کر دی، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ پر بھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’لڑائی کے دوران میں اونگھ طاری ہونے کا واقعہ جنگِ احد میں بھی پیش آیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَیۡكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا یَّغۡشٰی طَآئِفَةً مِّنۡكُمۡ ﴾ [آل عمران : ۱۵٤] ’’پھر اس غم کے بعد اس نے تم پر ایک امن نازل فرمایا، جو ایک اونگھ تھی، جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی۔‘‘ یہاں مذکور آیت: ﴿ اِذۡ یُغَشِّیۡكُمُ النُّعَاسَ ﴾ میں یہ معاملہ بدر کے دن پیش آیا، جس سے مسلمانوں کے دلوں سے دشمن کا خوف ختم ہو گیا اور امن و اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی۔‘‘ سبھی شرکاء پر ایک ہی وقت میں اونگھ طاری کرنا، جس سے وہ بے سدھ ہو کر سو بھی نہ جائیں، بلکہ دشمن کی حرکت پر فوراً متحرک ہو جائیں اور اس اونگھ کی برکت سے انھیں ہر قسم کے خطرے سے بے خوف کر کے امن عطا کرنا، یقیناً ایک عظیم معجزہ تھا۔ اہل علم فرماتے ہیں، لڑائی کے دوران میں اونگھ آنا اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہوتی ہے۔

② وَیُنَزِّلُ عَلَیۡكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ...... : یہ بھی اسی رات کا واقعہ ہے کہ رات کو بارش ہو گئی، جس سے ایک تو ریت جم گئی اور زمین پر پاؤں اچھی طرح جمنے لگے، جس سے فائدہ اٹھا کر مسلمان آگے بڑھے، نقل و حرکت آسان ہو گئی، دوسرے پانی کی کمی دور ہو گئی اور وضو اور طہارت کے لیے آسانی ہو گئی، جب کہ کفار کے پڑاؤ کی جگہ نیچی تھی، وہاں بارش کی وجہ سے کیچڑ ہو گئی اور پاؤں پھسلنے لگے۔ تیسرے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کی گندگی، یعنی گھبراہٹ، خوف، اللہ تعالیٰ سے بدگمانی اور مایوسی کی کیفیت دور ہو گئی اور صبح ہوئی تو وہ لڑنے کے لیے چاق چوبند تھے۔ بدر کے موقع پر یہ تیسرا انعام تھا جس سے کفار پر فتح یاب ہونے میں بڑی مدد ملی۔ (ابن کثیر)

آیت 12 ① اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّكَ اِلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ اَنِّیۡ مَعَكُمۡ : اس سے معلوم ہوا کہ فرشتے بھی اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے۔

② سَاُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ كَفَرُوا الرُّعۡبَ : یہ چوتھا انعام ہے جو میدان بدر ہی میں نہیں بلکہ تمام جنگوں میں رسول اللہ ﷺ اور امت مسلمہ کو عطا ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔‘‘ ان میں سے ایک یہ بیان فرمائی: ’’مجھے ایک مہینے کی مسافت پر رعب کے ذریعے سے مدد دی گئی۔‘‘ [بخاری، التیمم، باب : ۳۳۵]

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾
ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَ اَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾

یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بے شک اللہ بہت سخت عذاب والا ہے﴿۱۳﴾ یہ ہے! سو اسے چکھو اور (جان لو) کہ بے شک کافروں کے لیے آگ کا عذاب ہے﴿۱۴﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا، آمنے سامنے مقابلے کی صورت میں ملو تو ان سے پیٹھیں نہ پھیرو﴿۱۵﴾

اس کا باعث اللہ تعالیٰ نے دوسری آیات میں کفار کا مشرک ہونا بیان فرمایا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۵۱)۔

③ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ ...... : گردنوں پر مارو، تاکہ ان کے ناپاک جسموں سے زمین پاک ہو اور ہاتھوں اور پاؤں کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ، تاکہ وہ ہاتھوں سے لڑ نہ سکیں اور پاؤں سے بھاگ نہ سکیں۔

آیت 13 ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ: یعنی کفار کو بدر کے دن جو ذلت آمیز شکست ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی اس طرح مخالفت کی کہ صاف مقابلے پر اتر آئے۔ "شَآقُّوْا" یہ "شِقٌّ" سے مفاعلہ ہے کہ ایک طرف ایک ہو اور دوسری طرف دوسرا اس کے مقابلے میں ہو، یعنی مخالفت، مقابلے میں آنا۔

آیت 14 ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ: "ذٰلِكُمْ" یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر گزشتہ آیت میں مذکور "الْعِقَابِ" ہے، یعنی "ذٰلِكُمُ الْعَذَابُ فَذُوْقُوْهُ" "یہ ہے وہ عذاب سو اسے چکھو۔"

آیت 15 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا ......: "زَحَفَ الصَّبِيُّ" جب بچہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے۔ "زَحَفَ الْجَيْشُ" بڑا لشکر بھی چونکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے، اس لیے لشکر کے بڑھنے کو بھی "زَحْفٌ" کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دشمن جب مقابلے کے لیے میدان میں سامنے آ کھڑا ہوا، تو بھاگو نہیں۔ یہ حکم صرف بدر ہی میں نہیں تھا بلکہ یہ حکم سب مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ہے۔ متعدد احادیث میں کفار سے بھاگنے کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سات ہلاک کرنے والے گناہوں سے بچو۔'' ان میں سے ایک دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت پیٹھ پھیرنا ہے۔ [بخاری، الوصایا، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ إن الذین یأکلون...... ﴾ : ۲۷۶۶] رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے بزدلی سے پناہ کی کئی دعائیں سکھائی ہیں، چنانچہ آپ ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلٰی أَرْذَلِ الْعُمُرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ)) [بخاری، الدعوات، باب الاستعاذۃ من أرذل العمر...... : ۶۳۷۴، عن سعد رضی اللہ عنہ]

انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ جب کسی منزل پر اترتے تو میں کثرت سے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنتا: ((اَللّٰهُمَّ

وَ مَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَ لِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

اور جو کوئی اس دن ان سے اپنی پیٹھ پھیرے، ماسوائے اس کے جو لڑائی کے لیے پینترا بدلنے والا ہو، یا کسی جماعت کی طرف پناہ لینے والا ہو تو یقیناً وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ﴿۱۶﴾ پس تم نے انھیں قتل نہیں کیا اور لیکن اللہ نے انھیں قتل کیا اور تو نے نہیں پھینکا جب تو نے پھینکا اور لیکن اللہ نے پھینکا اور تا کہ وہ مومنوں کو انعام عطا کرے، اپنی طرف سے اچھا انعام، بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۷﴾

أَعُوذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَ ضَلَعِ الدَّيْنِ وَ غَلَبَةِ الرِّجَالِ» [بخاری، الجهاد والسير، باب من غزا بصبي للخدمة : ۲۸۹۳]

آیت 16 اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ: "مُتَحَيِّزًا" " تَحَرَّفَ " سے اسم فاعل ہے، جس کا معنی ایک طرف ہونا ہے، یعنی ایک طرف سے دوسری طرف دشمن کو دھوکا دینے کے لیے پلٹنا، پینترا بدلنا۔ "مُتَحَيِّزًا" " تَحَيَّزَ " سے ہے، کسی جگہ اکٹھا ہونا، یعنی دشمن کو گھیرنے کے لیے یا ان کو دھوکا دینے کے لیے ایک طرف سے دوسری طرف پلٹنا یا پیچھے ہٹنا یا مسلمانوں کی بڑی جماعت کی طرف پناہ کے لیے اور دوبارہ حملے کے لیے لوٹ آنا گناہ نہیں، یعنی اللہ کا غضب اور جہنم کا ٹھکانا ہونا تو جنگ سے بھاگنے والے پر ہے، اگر فنونِ حرب کے تحت میدان چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائے تو گناہ نہیں۔

آیت 17 ① فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ...... : صاحب کشاف نے فرمایا، یہاں حرف "فاء" یعنی "پس" ایک شرط کا جواب ہے کہ اگر تم فخر کرو کہ ہم نے یہ کیا وہ کیا تو درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا، کیونکہ نہ تمھاری تعداد زیادہ تھی اور نہ تمھارے پاس اتنا سروسامان تھا کہ تم کافروں کے ہر طرح سے مسلح اور عظیم لشکر کو شکست دے سکتے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ اس لیے فرمایا کہ مسلمان یہ سمجھیں کہ فتح ہماری قوت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہے، لہٰذا ان کو چاہیے کہ کسی بات میں اپنا دخل نہ دیا کریں۔ (موضح)

② وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ: یعنی وہ مٹھی جو آپ نے پھینکی، درحقیقت آپ نے نہیں پھینکی، کیونکہ اگر وہ آپ کی پھینکی ہوئی ہوتی تو اتنی دور ہی جا سکتی جتنی ایک آدمی کے پھینکنے سے جا سکتی ہے، اس کو اتنا بڑھانا اور ٹھیک نشانے پر پہنچانا کہ ہر مشرک کی آنکھ میں پہنچ جائے صرف اللہ تعالیٰ کا کام تھا۔ یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو حافظ ابن کثیر نے علی بن طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حسن سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا: "یا رب! اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٨﴾

بات یہ ہے! اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کی خفیہ تدبیر کو کمزور کرنے والا ہے ﴿١٨﴾

تو پھر زمین میں تیری عبادت کبھی نہیں ہوگی۔'' تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ''آپ مٹی کی ایک مٹھی لیں اور ان کے چہروں پر پھینکیں۔'' آپ ﷺ نے مٹی کی ایک مٹھی پکڑی اور ان کے چہروں کی طرف پھینکی تو جو بھی مشرک تھا اس کی آنکھوں، نتھنوں اور منہ میں اس مٹھی کا کچھ حصہ جا پہنچا تو وہ پیٹھ دے کر بھاگ گئے۔ گویا مٹی پھینکی آپ نے لیکن اس کو نشانے تک اللہ نے پہنچایا، ابتدائی کام پھینکنا آپ کا تھا اور انتہا نشانے پر لگانا اللہ کا فعل تھا۔ اگر درحقیقت خود آپ ہی اللہ تعالیٰ تھے تو دونوں فعل آپ کے ہوئے، آپ سے ایک فعل (نشانے پر لگانے) کی نفی کیوں کی گئی؟

③ بعض لوگ ''مَا رَمَيْتَ'' سے ثابت کرتے ہیں کہ درحقیقت نبی ﷺ خود ہی پروردگار عالم تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے پھینکنے کو اپنا پھینکنا قرار دیا، مگر اس صورت میں تو لازم آئے گا کہ ''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ'' سے بدری مسلمان بھی خود اللہ تعالیٰ ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفار کے قتل کرنے کو اپنا کام قرار دیا ہے۔ مگر یہ نہایت کفریہ بات ہے جس سے دین اسلام کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کچھ بدر ہی میں شہید ہوئے، کچھ بعد میں فوت یا شہید ہوئے، خود نبی ﷺ نے زہر کے اثر سے وفات پائی اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ زندہ حی و قیوم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ہستی تو ایک ہی ہے، فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ ان لوگوں کا رب عجیب ہے، جو ایک نہیں بلکہ بڑی تعداد میں ہے اور وہ شہید ہوتا اور مرتا بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہندوؤں کی طرح ہر چیز کو رب مانتے ہیں اور اسے وحدت الوجود کہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ قرآن و حدیث کے احکام کا خاتمہ اور اسلام و کفر اور جنت و دوزخ سب کے وجود کا انکار ہے۔ [نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ]

④ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا: ''لِيُبْلِيَ'' یہ ''بَلَاءٌ'' سے مشتق ہے، از باب افعال، آزمانا، جو سختی اور مصیبت کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور نعمت عطا فرما کر بھی، اس لیے ''بَلَاءٌ'' کا معنی مصیبت بھی ہے اور انعام بھی۔ یہاں مراد انعام یا احسان اور عطا کے ساتھ آزمانا ہے۔ یعنی باوجود یہ کہ مسلمانوں کا سامان اور لشکر کافروں کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں فتح دی، تاکہ وہ اس نعمت کو پہچانیں اور اس کا شکر بجا لائیں۔

آیت 18 ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ: یعنی یہ بات تو ہے ہی جس کا ذکر گزرا، یعنی فرشتوں کے ساتھ مدد، بارش برسانا، اونگھ ڈالنا، مشرکین کی آنکھوں میں خاک ڈالنا، ان کے ستر آدمیوں کا قتل اور ستر کا قید ہونا اور مسلمانوں کو فتح عظیم عطا ہونا وغیرہ، اس کے ساتھ مزید سنو کہ اللہ آئندہ بھی کفار کی سازشوں کو کمزور کر دے گا اور یہ اپنی کسی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ (ابن کثیر) یا یہ کہ انھوں نے جو یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اپنے تجارتی قافلے کو بچا لے جائیں گے اور مسلمانوں کا زور بھی توڑ دیں گے، ان کا منصوبہ خاک میں ملا دیا، وہ خود مارے گئے اور تمھارے ہاتھوں قیدی بن گئے اور بھاری جانی و مالی نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔

اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ ۚ وَ اِنۡ تَنۡتَهُوۡا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَ اِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ ۚ وَ لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡكُمۡ فِئَتُكُمۡ شَيۡـًٔـا وَّلَوۡ كَثُرَتۡ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ﴿۲۰﴾

اگر تم فیصلہ چاہو تو یقیناً تمھارے پاس فیصلہ آ چکا اور اگر باز آ جاؤ تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ کرو گے تو ہم (بھی) دوبارہ کریں گے اور تمھاری جماعت ہرگز تمھارے کچھ کام نہ آئے گی، خواہ بہت زیادہ ہو اور (جان لو) کہ بے شک اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اس سے منہ نہ پھیرو، جب کہ تم سن رہے ہو ﴿۲۰﴾

آیت 19 ① اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ ...... : فتح کا معنی یہاں فیصلہ ہے، جیسا کہ کفار کہتے تھے: ﴿ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴾ [السجدة : ٢٨] ''یہ فیصلہ کب ہوگا، اگر تم سچے ہو؟'' عبد اللہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ''جب (بدر کے دن) لوگ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو ابوجہل نے کہا، اے اللہ! ہم میں سے جو شخص زیادہ رشتوں کو توڑنے والا اور ہمارے سامنے غیر معروف بات پیش کرنے والا ہے، اسے آج صبح ہلاک کر دے، تو یہ فیصلہ طلب کرنے والا ابوجہل تھا۔'' [مستدرك حاكم ٢/ ٣٢٨، ح : ٣٢٦٤۔ أحمد : ٥/ ٤٣١، ح : ٢٣٦٦١، وصححه شعيب الأرنؤوط۔ السنن الكبرىٰ للنسائي : ٦/ ٣٥٠، ح : ١١٢٠١] ''اگر تم فیصلہ چاہو'' یہ خطاب کفار سے ہے، کیونکہ انھوں نے مکہ سے روانہ ہوتے وقت اور ابوجہل نے معرکۂ بدر سے پہلے یہ دعا کی تھی: ''اے اللہ! ہم میں سے جو حق پر ہے اسے غالب اور جو باطل پر ہے اسے رسوا کر۔'' گویا یہاں ''الۡفَتۡحُ'' کا معنی حکم اور فیصلہ ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مکی سورتوں میں ہر جگہ کافروں کا یہ کلام نقل فرمایا کہ ہر گھڑی کہتے ہیں: ﴿ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ ﴾ یعنی کب فیصلہ ہوگا، سو اب فرمایا کہ یہ فیصلہ آ پہنچا۔'' (موضح)

② وَ اِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ: یعنی اگر پھر مسلمانوں کی مخالفت اور ان سے جنگ کرو گے تو ہم پھر تمھارے ساتھ یہی سلوک کریں گے، اگرچہ تمھاری جماعت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

③ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: ''اَنَّ'' سے پہلے کئی الفاظ مقدر مانے جا سکتے ہیں، آسان یہ ہے کہ اس جملے کو ''وَاعۡلَمُوۡا'' کا مفعول مان لیا جائے، یعنی جان لو کہ یقیناً اللہ مومنوں کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ ہو کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

آیت 20 يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ...... : کفار کو تنبیہ کے بعد اب مسلمانوں کو تلقین ہو رہی ہے کہ جب تمھیں کسی معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم معلوم ہو جائے تو اس کے خلاف کسی کی مت سنو! بلکہ اس کی اطاعت کرو۔ پہلے اللہ کی اطاعت بطور تمہید ہے، کیونکہ رسول کی اطاعت بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ سورت کے ابتدا میں اموالِ غنیمت کے متعلق اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ﴿ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ ﴾ کا اعلان فرمایا تھا اور اطاعت رسول کو ایمان کی شرط

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ
الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ
لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا ہم نے سنا، حالانکہ وہ نہیں سنتے ﴿۲۱﴾ بے شک تمام جانوروں سے برے
اللہ کے نزدیک وہ بہرے، گونگے ہیں، جو سمجھتے نہیں ﴿۲۲﴾ اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا
اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا تو بھی وہ منہ پھیر جاتے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے ہوتے ﴿۲۳﴾

قرار دیا تھا، پھر درمیان میں اپنے انعامات ذکر فرمائے اور اب پہلے کلام کو پھر اطاعت کی تلقین پر ختم فرمایا۔

② **وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ**: اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تم سن رہے ہو اس وقت اس سے منہ نہ پھیرو، دوسرے اوقات میں بے شک پھیر لو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم ہر وقت اللہ کے احکام قرآن و حدیث کی صورت میں سنتے ہو، اگر نہ سنا ہو، یا علم نہ ہو تو عذر ہو سکتا ہے، مگر حکم سن کر پھر بجا نہ لانا ایمان والوں کو زیب نہیں دیتا۔ جو شخص خود حکم سن کر بجا نہیں لاتا اس تک حکم اگر کسی کے واسطے سے پہنچے گا تو کیسے مانے گا۔

آیت 21 **وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا ......**: ان سے مراد مشرکین، منافقین اور اہل کتاب ہیں جو کانوں سے تو اللہ اور اس کے رسول کا کلام سنتے ہیں، مگر اس طرح کہ وہ نہیں سنتے، کیونکہ نہ وہ دل سے سنتے ہیں نہ قبول کرتے ہیں، ان کا سننا نہ سننے کے برابر ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۶)۔

آیت 22 **اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ ......**: "الدَّوَآبِّ" "دَابَّةٌ" کی جمع ہے، "دَبَّ يَدِبُّ (ض)" زمین پر چلنا۔ انسان کو "الدَّوَآبِّ" میں اس لیے شمار کیا کہ کتب لغہ میں ہر جاندار کو دابہ کہہ لیتے ہیں۔ مصباح میں ہے "دَابَّةٌ" زمین کا ہر جاندار، خواہ سمجھ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، یعنی کفار و منافقین جو کان سے اچھی بات نہ سنیں، زبان سے اچھی بات نہ نکالیں اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام نہ لیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام جانوروں سے بدتر ہیں، کیونکہ جانور تو اپنے فطری تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور ان لوگوں کو عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، مگر یہ اس غرض کو بھی پورا نہیں کرتے۔ یہاں پہلے بہرے ہونے کا ذکر ہے، پھر گونگے ہونے کا، کیونکہ حق سن کر ہی اس کی تائید و تبلیغ زبان سے ہوتی ہے، پھر بے عقل ہونے کا، کیونکہ بعض بہرے اور گونگے عقل سے حق کو سمجھتے اور اسے قبول کر لیتے ہیں، مگر یہ لوگ تینوں چیزوں سے خالی ہیں۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۷۹) اور فرقان (۴۴)۔

آیت 23 **وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ......**: یعنی اگر ان کے دل میں خیر یعنی حق کی طلب ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے سننے کو نافع بنا کر ایمان و عمل کی توفیق دے دیتا۔ پہلے "**لَّاَسْمَعَهُمْ**" (انھیں ضرور سنوا دیتا) سے مراد وہ سنانا ہے جو دل سے ہو اور فائدہ مند ہو اور "**لَوْ اَسْمَعَهُمْ**" (اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا) سے مراد محض کانوں سے سنوانا ہے، یعنی اگر انھیں

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اور رسول کی دعوت خوشی سے قبول کرو، جب وہ تمھیں اس چیز کے لیے دعوت دے جو تمھیں زندگی بخشتی ہے اور جان لو کہ بے شک اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے اور یہ کہ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴﴾

اسی حال میں کہ ان کے اندر کوئی بھلائی نہیں ہے، سنوا تا تو یقیناً وہ منہ پھیر کر چل دیتے، یعنی ان لوگوں نے گناہوں کا ارتکاب کر کر کے اپنے اندر سے وہ استعداد ہی ختم کر دی ہے جو ایمان اور راہِ ہدایت کی پیروی کے لیے بیج کی حیثیت رکھتی ہے، پھر جب بیج ہی نہ ہو تو پھل کی امید کیا ہو سکتی ہے، چنانچہ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ [المطففین : ١٤] ’’خبردار رہو کہ ان کے برے اعمال ان کے دلوں پر زنگ بن کر چھا گئے ہیں۔‘‘

آیت 24 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ: ’’اَجَابَ يُجِيْبُ‘‘ کا معنی قبول کرنا ہے اور ’’اسْتَجِيْبُوْا‘‘ باب استفعال ’’اِسْتَجَابَ يَسْتَجِيْبُ‘‘ سے ہے، جس میں عموماً طلب ہوتی ہے، یہاں طلب کا معنی نہیں ہو سکتا، لہٰذا سین اور تاء کے اضافے سے معنی میں زیادتی مراد ہوگی، اس لیے ’’خوشی سے قبول کرو‘‘ ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر خوشی سے لبیک کہنا تم پر لازم ہے۔

② اِذَا دَعَاكُمْ: ’’جب وہ تمھیں دعوت دے‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ فوراً قبول کرو، دیر نہ کرو۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بلایا، وہ نماز پوری کر کے آئے تو آپ نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا: ’’تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’آئندہ میں ان شاء اللہ ایسا نہیں کروں گا۔‘‘ [ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاء فی فضل فاتحة الکتاب : ٢٨٧٥] صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں ابوسعید بن معلی رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے ہوئے بلانا اور اسی وقت نہ آنے پر یہی تلقین فرمانا موجود ہے۔ [بخاری، التفسیر، باب : ﴿ يأيها الذين امنوا استجيبوا...... ﴾ : ٤٦٤٧]

③ لِمَا يُحْيِيْكُمْ: ’’اس چیز کے لیے جو تمھیں زندگی بخشتی ہے‘‘ اس سے متعلق علمائے سلف کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے اسلام و ایمان اور بعض نے قرآن، لیکن اکثر نے اس سے جہاد مراد لیا ہے، کیونکہ جہاد دنیا اور آخرت میں زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، خصوصاً اس لیے کہ شروع سورت سے یہی بات چلی آ رہی ہے، آیت: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ﴾ [البقرة : ٢٤٣] سے مراد بھی جہاد کی ترغیب ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: ’’جب تم عینہ (حیلے سے سود کی ایک قسم) کے ساتھ بیع کرو گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے اور کاشت کاری پر خوش ہو جاؤ گے اور جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی بڑی ذلت مسلط کرے گا جسے دور نہیں کرے گا، حتیٰ کہ تم اپنے دین (جہاد) کی طرف لوٹ آؤ۔‘‘ [أبو داوٗد، البیوع، باب فی النهی عن العینة : ٣٤٦٢۔ السلسلة الصحیحة : ١١]

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور اس عظیم فتنے سے بچ جاؤ جو لازماً ان لوگوں کو خاص طور پر نہیں پہنچے گا جنھوں نے تم میں سے ظلم کیا اور جان لو کہ بے شک اللہ بہت سخت سزا والا ہے ﴿۲۵﴾

④ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ: یعنی حق واضح ہو جانے کے بعد بھی اگر کوئی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا حکم نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہ سزا ملتی ہے کہ وہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق نہیں ملتی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ [الصف : ۵] ''جب وہ خود ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔'' آیت کے یہ معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور مفسرین نے بیان فرمائے ہیں۔ سورۂ انعام کی آیت (۱۰۹، ۱۱۰) میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے، جنگِ تبوک میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فوری طور پر نہ نکل سکے تو بعد میں جانے کی توفیق ہی نہیں ملی، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق اور انابت کی وجہ سے انھیں توبہ کی توفیق دی اور قرآن میں ان کا ذکر خیر فرمایا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح یہ فرماتے ہیں: ''حکم بجا لانے میں دیر نہ کرو، شاید اس وقت دل ایسا نہ رہے، دل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' (موضح) بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ اللہ کے حائل ہونے سے مراد موت ہے، یعنی موت آنے سے پہلے اطاعت بجا لاؤ، اس کے بعد ﴿وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ (اور جان لو کہ یہ یقینی حقیقت ہے کہ تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) کے جملے سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں معنی ہی مراد ہو سکتے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں۔

آیت 25 ① وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ...... : ''فِتْنَةً'' میں تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ''عظیم فتنہ'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ جب کسی قوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام نہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر ہمہ گیر عذاب بھیج دیتا ہے۔ (ابن کثیر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے، یا پھر اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب بھیج دے گا، پھر تم اس سے دعا کرو گے مگر وہ تمھاری دعا قبول نہیں کرے گا۔'' [أحمد : ۵ / ۳۸۸، ۳۸۹، ح : ۲۳۳۰۱، عن حذیفة بن یمان رضی اللہ عنہ وحسنه شعیب الأرنؤوط] اصحاب سبت یعنی ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے والوں کا قصہ اس کی ایک مثال ہے۔ دیکھیے سورۂ اعراف (۱۶۴ تا ۱۶۷)۔

② وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: مطلب یہ ہے کہ حکم کی بجا آوری میں کاہلی کرنے سے ایک تو دل ہٹتا ہے، دم بدم مشکل میں پڑتا ہے، دوسرے نیک لوگوں کے عمل میں سستی اختیار کرنے سے گناہ گار بالکل ہی عمل چھوڑ بیٹھیں گے، تو رسم بد پھیلے گی، اس کا وبال سب پر پڑے گا۔

وَ اذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ
النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ اعْلَمُوْٓا
اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ ع

اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں نہایت کمزور سمجھے گئے تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تمھیں اچک کر لے جائیں گے تو اس نے تمھیں جگہ دی اور اپنی مدد کے ساتھ تمھیں قوت بخشی اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، تاکہ تم شکر کرو ﴿۲۶﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو، جبکہ تم جانتے ہو ﴿۲۷﴾ اور جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد ایک آزمائش کے سوا کچھ نہیں اور یہ کہ یقیناً اللہ، اسی کے پاس بہت بڑا اجر ہے ﴿۲۸﴾

آیت 26 وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ...... : اس میں مکی زندگی میں مسلمانوں کی قلت تعداد، سختی اور خوف کا، پھر مدینہ میں ان کو اپنا گھر، امن و سکون اور راحت و آرام ملنے کا ذکر ہے۔ ''اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا'' میں دوسری تمام پاکیزہ نعمتوں کے ساتھ غنیمت کے اموال کا حلال کرنا بھی شامل ہے، کیونکہ یہ پہلی امتوں کے لیے حلال نہیں تھے، بلکہ جلا دیے جاتے تھے۔

آیت 27 يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ...... : امانتوں میں خیانت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس سے وہ تمام ذمہ داریاں اور عہد معاہدے مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ یا بندوں سے کیے گئے ہوں۔ صلح، جنگ اور نکاح وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں، ایک دوسرے کے ذاتی راز اور فوجی راز بھی امانت ہیں۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے پہلے ایک عورت کو خط دے کر مکہ بھیجا تھا، جس میں اہل مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حملے کے ارادے سے آگاہ کیا تھا اور اس پر اللہ کی طرف سے تنبیہ ہوئی تھی۔ [بخاری، ۳۹۸۳۔ مسلم : ۲۴۹۴] سورۂ ممتحنہ کے شروع میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کم ہی کوئی خطبہ دیا مگر اس میں فرمایا: « لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّآ أُمَانَةَ لَهُ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّآ عَهْدَ لَهُ » [أحمد : ۳/ ۱۳۵، ح : ۱۲۳۸۳، و حسنه شعيب الأرنؤوط۔ ابن حبان : ۱۹۴] ''اس شخص کا کوئی ایمان نہیں جس کی کوئی امانت نہیں اور اس شخص کا کوئی دین نہیں جس کا کوئی عہد نہیں۔'' عبد اللہ بن عمرو اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ منافق کی علامات میں سے ایک علامت امانت میں خیانت بھی ہے۔ [بخاری، الإيمان، باب علامات المنافق : ۳۳۔ مسلم : ۵۹]

آیت 28 وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ...... : مال اور اولاد کی محبت انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے، کیونکہ عام طور پر انھی کے لیے آدمی خیانت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ مَجْهَلَةٌ مَحْزَنَةٌ » ''بے شک بچہ بخل، بزدلی، جہالت اور غم کا باعث ہوتا ہے۔'' [صحیح

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹ وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمھارے لیے (حق و باطل میں) فرق کرنے کی بڑی قوت بنادے گا اور تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۲۹﴾ اور جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے، تاکہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے

الجامع الصغير : ۱۹۹۰۔ مستدرك حاكم : ۲۹۶/۳، ح : ۵۲۸٤، عن الأسود بن خلف] درحقیقت اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتا ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ترجیح دیتا ہے، یا مال اور اولاد کی ایسی محبت کو جس سے خیانت اور احکامِ الٰہی کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ اس ناجائز محبت پر غالب آنے کا طریقہ اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بہت ہی بڑا اجر ہے۔

آیت 29 ❶ اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا...... : مال اور اولاد کی آزمائش سے خبردار کرنے کے بعد اب تقویٰ کی تعلیم دی ہے اور اس کے فوائد بیان کیے ہیں، تقویٰ کا مادہ ''و ق ی'' ہے اور یہ اسم مصدر ہے۔ ''تَتَّقُوْا'' باب افتعال سے ہے، اس کا معنی بچنا ہے، آدمی اسی چیز سے بچتا ہے جس سے ڈرتا ہو، اس لیے اس کا معنی ڈرنا بھی کر لیا جاتا ہے۔ ''فَرْقٌ'' اور ''فُرْقَانٌ'' مصدر ہیں، دونوں کا ایک ہی معنی ہے، مگر ''فُرْقَانًا'' کے حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی اگر تم ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کی نافرمانی سے بچتے رہو گے، خواہ کوئی دوسرا تمھارے پاس ہو یا نہ ہو تو تمھیں چار نعمتیں عطا ہوں گی، پہلی یہ کہ تم میں حق اور باطل کو پہچاننے اور ان کے درمیان فرق کرنے کی بہت بڑی قوت پیدا ہو جائے گی اور اس قوت کی بدولت اللہ تعالیٰ تمھیں کسی بھی شبہے، شک یا تذبذب کا شکار ہونے کے بجائے واضح طور پر ہر کام کے درست یا نادرست ہونے کی پہچان اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے کی قوت عطا کرے گا، تم آسانی سے حق کا فیصلہ کر کے اس پر عمل کر سکو گے۔ دیکھیے سورۂ حدید (۲۸) اسی طرح وہ تمھیں فتح و نصرت عطا کر کے تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ دوسری یہ کہ وہ تم سے تمھاری برائیاں دور کر دے گا اور تیسری یہ کہ قیامت کے دن وہ تمھارے گناہ بخش دے گا۔

❷ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ : یہ چوتھی نعمت ہے۔ فضل کا معنی زائد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں اتنا ہی بدلہ نہیں دے گا جتنا تم عمل کرو گے بلکہ اس سے کہیں زیادہ دے گا، کیونکہ وہ بہت زائد حتیٰ کہ تمھاری سوچ سے بھی بہت زائد عطیہ دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ [السجدة : ۱۷] ''پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے۔''

آیت 30 وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... : جب تقریباً تمام صحابہ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، علی رضی اللہ عنہما اور اکا دکا مسلمان مکہ میں رہ گئے تو کفار کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر محمد (ﷺ) بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تو وہ ہمارے لیے ایسا خطرہ ثابت ہوں گے جو ہمارے قابو سے باہر ہو گا۔ چنانچہ ان کی دار الندوہ میں مجلس ہوئی، جس میں تجاویز و

يُخْرِجُوْكَ ۭ وَ يَمْكُرُوْنَ وَ يَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾

نکال دیں اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے ﴿۳۰﴾ اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو یقیناً اس جیسا ہم بھی کہہ دیں، یہ تو پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ﴿۳۱﴾

آراء طلب کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا خلاصہ بیان فرمایا ہے، ایک رائے یہ تھی کہ آپ کو قید کر دیں اور موت تک وہاں سے نہ نکلنے دیں، اس پر یہ امکان سامنے آیا کہ ان کے ساتھی کارروائی کر کے انھیں چھڑا لیں گے۔ ایک تجویز یہ آئی کہ انھیں قتل کر دیا جائے، اس پر آپ کے خاندان بنو عبد مناف کے ساتھ لڑائی کا خطرہ سامنے آیا اور ایک مشورہ یہ آیا کہ ہم خود ہی انھیں مکہ سے نکال دیں، جہاں چاہیں جائیں، ہماری تو جان چھوٹے گی، اس پر یہ خطرہ سامنے آیا کہ وہ اپنے صدق و امانت، خوش خلقی اور خوش کلامی سے لوگوں کو اکٹھا کر کے تم پر حملہ آور ہوں گے۔ آخر فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ہر قبیلے سے ایک نوجوان لیا جائے، وہ سب رات کو آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیں، آپ جونہی باہر نکلیں وہ سب مل کر حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیں۔ بنو عبد مناف کس کس سے لڑیں گے، آخر دیت پر راضی ہو جائیں گے۔ جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کو ان کی سازش کی اطلاع دے دی اور یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ آپ اس رات اپنے بستر پر نہیں سوئے، بلکہ علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ کافر ساری رات انتظار میں رہے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خفیہ تدبیر سے کفار کی سازش کو ناکام کر کے آپ کو بحفاظت نکال لیا، اگلے دن آپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت فرمائی۔ سیرت کی تمام کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے جس کا یہ خلاصہ قرآن مجید کے مطابق ہے۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''ہجرت کی رات علی رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کا سودا کیا، وہ یہ کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھی اور آپ کی جگہ سو گئے۔'' [أحمد : ۱/ ۳۳۰، ۳۳۱، ح : ۳۰۶۲۔ مستدرك حاكم : ۳/ ۴، ح ۴۲۶۴۔ وصححه الحاكم و وافقه الذهبي] ہجرت کے واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ توبہ (۴۰) اور ''مکر'' کے معنی کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۵۴)۔

آیت 31 ① وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا ...... : ''اَسَاطِيْرُ'' یہ ''اُسْطُوْرَةٌ، اُسْطَارَةٌ، اُسْطِيْرَةٌ'' کی جمع ہے، بے ترتیب کہانیاں۔ (قاموس) ابن جریر نے فرمایا کہ ''سَطْرٌ'' کی جمع ''اَسْطُرٌ'' ہے اور اس کی جمع ''اَسَاطِيْرُ'' ہے۔ کفار کہتے تھے کہ یہ قرآن ہے ہی کیا، محض پہلے لوگوں کی بے ترتیب فرضی کہانیاں ہیں۔ یہ انھوں نے محض جہل کی وجہ سے کہا، کیونکہ قرآن ترتیب وار تاریخ اور قصے بیان کرنے کے لیے نہیں، بلکہ نصیحت کے لیے اتارا گیا ہے، اس لیے جس مقام پر جس واقعے کے جس قدر بیان کی ضرورت تھی، بیان فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ان کا یہ اعتراض اور اس کا جواب اس مقام

وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

اور جب انھوں نے کہا اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ ﴿۳۲﴾

سے کچھ مفصل ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۵، ۶)۔

❷ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ : یہ ان کے عجز کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلے پورے قرآن، پھر اس کی دس سورتوں اور پھر صرف ایک سورت کی مثل لانے کے لیے کہا۔ وہ جواب میں کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو اس جیسا ہم بھی کہہ دیں، کوئی ان سے پوچھے اگر واقعی ایسا ہی ہے تو تمھیں کس نے اس جیسا کلام لانے سے روکا ہے، تمھاری مقابلے کی غیرت کہاں گئی؟ اس قدر لاجواب ہونے کے باوجود تم کیوں نہیں کہنا چاہتے؟ کچھ تو زبان کھولو، صرف ﴿ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴾ کی تین آیتوں جیسی ہی سورت لے آؤ۔ معلوم ہوا تم صاف جھوٹ کہہ رہے ہو۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۳، ۲۴)۔

آیت 32 وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ...... : یہ آیت اس بات کی مثال ہے کہ انسان جب مخالفت اور شدید دشمنی پر اتر آئے تو وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یا کر رہا ہوں اس میں خود میرا کس قدر نقصان ہے۔ اب مکہ کے جاہل کافروں کو دیکھیے، اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنے کے بجائے کہ یا اللہ! اگر یہ دین حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہمیں اس کے قبول کرنے کی توفیق دے، وہ رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں کہہ رہے ہیں کہ یا اللہ! اگر یہ دین واقعی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر عذاب الیم لے آ۔ اپنے خیال میں انھوں نے یہ بڑی دانش مندی کی بات کی ہوگی، مگر یہ قیامت تک کے لیے ان کی بے عقلی اور جہالت کی دلیل اور ان کے لیے عار کا باعث بن گئی۔ قرآن میں ان کے بار بار عذاب لے آنے کے مطالبے کا کئی مقامات پر ذکر ہے۔ دیکھیے سورۂ عنکبوت (۵۳)، سورۂ ص (۱۶) اور معارج (۱ تا ۳) صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ مطالبہ ابوجہل نے کیا تھا۔ [بخاري، التفسير، باب : ﴿ و إذ قالوا اللهم إن كان هذا...... ﴾ : ٤٦٤٨] چونکہ باقی سب نے اسے پسند کیا تھا، اس لیے اسے سب کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ التفسیر الوسیط میں سید طنطاوی رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے جس کی سند ذکر نہیں کی (واللہ اعلم) مگر واقعہ دلچسپ اور سبق آموز ہے، اگر سنداً ثابت نہ بھی ہو تو بھی بات درست ہے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے قوم سبا (اصحاب یمن) کے ایک آدمی سے کہا: ''تیری قوم کس قدر جاہل تھی کہ جنھوں نے ایک عورت کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔'' اس نے جواب میں کہا: ''میری قوم سے آپ کی قوم زیادہ جاہل تھی کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق کے جواب میں یہ تو کہا: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ ''اے اللہ! اگر صرف یہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب لے آ) مگر یہ نہ کہا کہ یا اللہ! اگر یہی حق ہے تو ہمیں اس کے لیے ہدایت عطا فرما۔''

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَ هُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ مَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے، جب کہ تو ان میں ہو اور اللہ انھیں کبھی عذاب دینے والا نہیں جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں﴿۳۳﴾ اور انھیں کیا ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جب کہ وہ مسجد حرام سے روک رہے ہیں، حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی نہیں ہیں مگر جو متقی ہیں اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے﴿۳۴﴾

آیت 33 ❶ **وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ** : یعنی جب تک آپ ان میں موجود تھے اللہ تعالیٰ ان پر کبھی عذاب بھیجنے والا نہیں تھا، کیونکہ اس کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان کا رسول اور ایمان والے ان میں موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ نوح، ہود، صالح اور لوط علیہم السلام کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ قومِ لوط کے متعلق فرمایا: ﴿فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الذاریات : ۳۵] ''ہم نے اس بستی سے جو بھی مومن تھا نکال لیا۔'' اسی طرح نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تمام اہل ایمان کو کشتی میں بٹھا لو، پھر عذاب بڑھنا شروع ہوا۔ دیکھیے سورۂ ہود (۴۰) اور سورۂ مومنون (۲۷)۔

❷ **وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ** ...... : یعنی یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے گناہوں پر نادم ہو کر استغفار کرتی رہتی ہے وہ اسے ہلاک نہیں کرتا۔ یہاں فرمایا: ''جب کہ وہ بخشش مانگتے ہوں۔'' اس کی دو توجیہیں زیادہ معتبر ہیں، ایک تو یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر جانے کے بعد بھی کچھ مسلمان مجبوراً مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اپنے رب سے استغفار کرتے رہتے تھے، ان کے استغفار کی برکت سے اہلِ مکہ پر عذاب نہیں آیا، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ [الفتح : ۲۵] ''اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ضرور ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا تھا، عذاب دیتے دردناک عذاب۔'' دوسری توجیہ یہ ہے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے علم میں ایسے لوگ موجود تھے جو آئندہ چل کر مسلمان ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں گے، اس لیے ان پر ایسا عذاب نہیں آ سکتا تھا جو سب کو سرے سے فنا کر ڈالے۔ اس توجیہ کی طرف اشارہ بھی سورۂ فتح (۲۵) میں موجود ہے: ﴿لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے۔''

آیت 34 **وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ** ...... : اس آیت میں ان کے عذاب کا مستحق ہونے کی چند وجہیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کے مسجد حرام میں داخلے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ زبردستی مسجد حرام کے مالک اور متولی بنے بیٹھے ہیں، حالانکہ کعبہ کی تولیت صرف موحدین متقین کا حق ہے، مشرکین کا نہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۷، ۱۸) تیسری یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی شان کے لائق اور اس کے بتائے ہوئے طریقے سے کرنے کے بجائے تالیاں پیٹ کر اور

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور ان کی نماز اس گھر کے پاس سیٹیاں بجانے اور تالیاں بجانے کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوتی۔ سو عذاب چکھو اس وجہ سے جو تم کفر کرتے تھے ﴿۳۵﴾

سیٹیاں بجا کر قوالی کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ اس لیے ان پر عذاب کیوں نہ آئے، عذاب آئے گا اور ضرور آئے گا۔ پچھلی آیت میں جس عذاب کی نفی کی تھی وہ تھا جس سے قوموں کا نام و نشان مٹ جاتا تھا، یعنی عذاب استیصال۔ اس آیت میں اس عذاب کا ذکر ہے جو قحط، خوف اور جنگ کی صورت میں عبرت کے لیے ان پر مسلط ہوا، دیکھیے سورۂ نحل (۱۱۲، ۱۱۳)، سورۂ سجدہ (۲۱) اور سورۂ دخان (۱۰ تا ۱۶) یہ عذاب جنگِ بدر، قحط، بھوک، خوف اور آخر میں فتح مکہ کی صورت میں اہلِ مکہ پر مسلط ہوا۔ جس سے ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، یا قید ہوئے اور جو مرنے سے بچ گئے وہ آخر کار اسلام میں داخل ہو گئے۔

آیت 35 ① وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً: "مُكَآءً" "مَكَا يَمْكُوْ مَكْوًا وَ مُكَاءً" سیٹی بجانا اور "تَصْدِيَةً" "صَدّٰى يُصَدِّيْ تَصْدِيَةً" (تفعیل) تالیاں بجانا۔ یعنی وہ لوگ کعبہ کے پاس عین حرم میں تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے اور اسے اپنی نماز، اللہ کی عبادت اور اس کے قرب کا ذریعہ قرار دیتے۔ افسوس کہ اب مسلمانوں نے بھی نمازیں اور قرآن چھوڑ کر عاشقانہ اشعار، سیٹیوں اور تالیوں کے مجموعے قوالی کو طریقت و معرفت کا نام دے کر روح کی غذا قرار دے رکھا ہے۔ بے شمار لوگ اسے تصوف کا اہم رکن قرار دے کر صرف سیٹیوں اور تالیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ باقاعدہ مرشد کے اردگرد طواف اور رقص کر کے اسے اپنی نماز سمجھتے ہیں اور برملا کہتے ہیں ؎

نماز عابداں سجدہ سجود است   نماز عاشقاں کلی وجود است

"عابدوں کی نماز سجدہ سجود ہے مگر عاشقوں کی نماز (معشوق کا) پورا وجود ہی ہے۔"

ایک صوفی نے تو صاف ہی اپنے مرشد کو قبلہ بھی قرار دے دیا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے   من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

"ہر قوم کا ایک راستہ، ایک دین اور ایک قبلہ ہوتا ہے، مگر میں نے تو اپنا قبلہ ایک ٹیڑھی ٹوپی والے کی طرف سیدھا کر لیا ہے۔" اگر ان میں سے کوئی نماز پڑھتا بھی ہے تو ایسے طریقے سے جس طریقے سے پڑھنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دوبارہ نماز پڑھ، تو نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ اللہ کی قسم! جب تک مسلمان تصور شیخ کا شرک اور صوفیوں کی عبادت کے یہ خود ساختہ طریقے اور موسیقی و رقص جیسی دل میں نفاق پیدا کرنے والی خرافات ترک نہیں کرتے اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ارکان اسلام و ایمان کی پابندی، خصوصاً جہاد نہیں کرتے کبھی دنیا میں سر نہیں اٹھا سکتے، ہمیشہ ذلت و خواری ہی ان پر مسلط رہے گی۔

② فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: کفر و شرک کے ارتکاب، سیٹیوں، تالیوں اور رقص کو نماز سمجھنے کا نتیجہ دنیا اور

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ
عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۙ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ
مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ ع ۱۸

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں، تاکہ اللہ کے راستے سے روکیں۔ پس عنقریب وہ انھیں خرچ کریں گے، پھر وہ ان پر افسوس کا باعث ہوں گے، پھر وہ مغلوب ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے ﴿۳۶﴾ تاکہ اللہ ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور ناپاک کو، اس کے بعض کو بعض پر رکھے، پس اسے اکٹھا ڈھیر بنا دے، پھر اسے جہنم میں ڈال دے۔ یہی لوگ اصل خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۳۷﴾ ان لوگوں سے کہہ دے جنھوں نے کفر کیا، اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ گزر چکا انھیں بخش دیا جائے گا اور اگر پھر ایسا ہی کریں تو پہلے لوگوں کا

آخرت کے عذاب کی صورت میں چکھو۔

آیت 36 الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ...... : یہاں "عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" سے مراد اسلام ہے، یعنی کفار خصوصاً اہلِ مکہ کہ جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، وہ اپنے اموال لوگوں کو اسلام سے روکنے کے لیے ہر طرح سے خرچ کرتے ہیں، مال کا لالچ دے کر بھی اور جنگ کی تیاری کے لیے خوراک، سواریاں اور اسلحہ و افراد مہیا کر کے بھی۔ انھیں اسلام سے اس قدر دشمنی اور عناد ہے کہ اس سے روکنے کے لیے وہ اپنی محبوب ترین چیز مال خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی خبردار کر دیا کہ آئندہ جب بھی یہ مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے انھیں اسی طرح ناکامی اور حسرت کا سامنا کرنا پڑے گا جس طرح اب بدر میں ان کا حشر ہوا ہے، چنانچہ اس کے بعد جنگ احد اور خندق میں بھی انھیں ناکامی کے ساتھ لوٹنا پڑا، نہ مدینہ پر قبضہ کر سکے، نہ مال غنیمت حاصل کر سکے اور نہ ہی کسی کو لونڈی و غلام بنا سکے اور آخرت میں ان کافروں کا انجام یہ ہے کہ وہ جہنم میں دھکیل کر اکٹھے کیے جائیں گے۔ بعد میں بھی جب تک مسلمان اللہ کے احکام پر کاربند رہے اور انھوں نے جہاد کی تیاری میں کوتاہی نہ کی، ان کے خلاف جنگ کے لیے خرچ کیے ہوئے کفار کے اموال ہمیشہ ان کے لیے باعث حسرت ہی بنے اور وہ ہمیشہ مغلوب ہی ہوئے۔

آیت 37 لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ...... : ناپاک کو پاک سے جدا کرنے سے مراد یا تو قیامت کے دن کفار اور مسلمانوں کو جدا جدا کر کے خبیث کفار کو تہ بہ تہ جمع کر کے جہنم میں پھینکنا ہے، یا دنیا ہی میں جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کو جدا جدا کرنے کے بعد خبیث لوگوں یعنی کفار کو تہ تیغ کر کے جہنم میں پھینکنا ہے اور یہی لوگ ہیں جو اصل خسارا اٹھانے والے ہیں۔

آیت 38 ① قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ يَّنْتَهُوْا: "نَهٰى يَنْهٰى" منع کرنا اور "اِنْتَهٰى يَنْتَهِيْ" باز آ جانا۔ اس آیت

اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾

طریقہ گزر ہی چکا ہے ﴿۳۸﴾ اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳۹﴾

میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ عذاب کی ان تمام وعیدوں کے باوجود امید کا دروازہ کھلا ہے۔ چنانچہ نبی رحمت ﷺ کو حکم ہوا کہ آپ ان منکروں سے کہہ دیں کہ اب بھی اگر وہ عناد اور کفر سے باز آ جائیں، اسلام میں داخل ہو جائیں اور ایک اللہ کی عبادت اور نبی ﷺ کی اطاعت اختیار کر لیں تو ان کے پہلے قصور معاف کر دیے جائیں گے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو اسلام کی طرف مائل کیا تو میں نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیے کہ میں بیعت کروں۔'' آپ نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا، آپ نے فرمایا: ''عمرو! تمھیں کیا ہوا؟'' میں نے عرض کیا: ''میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں؟'' فرمایا: ''کس چیز کی شرط کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔'' آپ نے فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے گناہ گرا دیتا ہے اور ہجرت اپنے سے پہلے گناہ گرا دیتی ہے اور حج اپنے سے پہلے گناہ گرا دیتا ہے۔'' [مسلم، الإیمان، باب کون الإیمان یهدم ما قبله : ۱۲۱]

باز آ جانے میں یہ بھی شامل ہے کہ اسلام لا کر اپنی حالت بھی بدل لیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: ''یا رسول اللہ! کیا ہم نے جو کچھ جاہلیت میں کیا اس پر ہمارا مؤاخذہ ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اسلام میں اچھے عمل کرے گا تو اس سے جاہلیت میں کیے ہوئے اعمال کا مؤاخذہ نہیں ہوگا اور جس نے اسلام میں برے عمل کیے وہ پہلے اور پچھلے اعمال کے ساتھ پکڑا جائے گا۔'' [بخاری، استتابة المرتدين والمعاندين و قتالهم ، باب إثم من أشرك…… : ۶۹۲۱]

❷ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ: یعنی اگر پھر اسلام کو اکھیڑنے اور مسلمانوں کی طاقت ختم کرنے کا منصوبہ بنائیں تو جس طرح پہلے لوگ تباہ و برباد ہوئے، جنھوں نے انبیاء کو ستایا اور ان سے جنگ کی اسی طرح یہ بھی تباہ و برباد ہوں گے اور اس سے پہلے جنگِ بدر میں ان کا جو حشر ہوا اب بھی وہی ہوگا۔ (ابن کثیر)

آیت 39 ❶ وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: ''فِتْنَةٌ'' کے لفظی معنی آگ میں تپانے اور آزمانے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک کفار سے لڑتے رہو جب تک کسی شخص کے اسلام لانے پر مشرکوں کی اسے ستانے اور آزمائش میں ڈالنے کی قوت ختم نہیں ہو جاتی اور تمام دنیا سے شرک کا غلبہ ختم نہیں ہوتا۔ اس لیے صحیح احادیث میں فتنہ کا معنی شرک بھی آیا ہے۔ مگر اس سے مراد زبردستی مسلمان بنانا اور مشرکین و کفار کو ختم کرنا نہیں، فرمایا: ﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾ [البقرة : ۲۵۶] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' کیونکہ پھر کفار کے جزیہ دینے کی نوبت ہی نہیں آ سکتی، بلکہ اس وقت تک لڑتے رہنا ہے جب تک ایمان لانے والوں کے راستے میں کفار کے رکاوٹ بننے کی قوت ختم نہیں ہوتی، پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ نہیں ہوتا اور کفر پر

وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

اور اگر وہ منہ موڑ لیں تو جان لو کہ یقیناً اللہ تمھارا دوست ہے، وہ اچھا دوست اور اچھا مددگار ہے ﴿۴۰﴾

اصرار کی صورت میں جزیہ دے کر اسلام کی برتری تسلیم نہیں کرتے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۹۱، ۱۹۳، ۲۱۷) اور توبہ (۲۹)۔

② وَ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ: یعنی تمام دینوں پر اسلام کا غلبہ ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت اور محمد رسول اللہ (ﷺ) کی شہادت دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، پھر جب وہ یہ کچھ کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اموال مجھ سے محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔'' [بخاری، الإیمان، باب فإن تابوا و أقاموا...... : ۲۵، عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما۔ مسلم : ۲۲]

③ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: یعنی اسلام لے آئیں تو تمھارے لیے ان کا ظاہر کافی ہے۔ اگر وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے یا چھپ کر کوئی غلط کام کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے، وہ خود نمٹ لے گا۔

آیت 40 ① وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ: یعنی اگر وہ مسلمانوں کو ستانا اور ان سے لڑنا ترک نہ کریں تو یقیناً اللہ دشمنوں کے خلاف تمھارا دوست اور یار و مددگار ہے۔

② نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ: اور جس کا دوست اور یار و مددگار وہ ہو تو وہ بہت اچھا دوست اور بہت اچھا مددگار ہے، پھر اس پر کون غالب آ سکتا ہے؟ دیکھیے سورۂ محمد (۱۰، ۱۱)۔

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ

اور جان لو کہ بے شک تم جو کچھ بھی غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے، اگر تم اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر

آیت 41 ① وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ : غنیمت وہ مال ہے جو کفار سے جنگ کی صورت میں حاصل ہو، اگر ان سے جنگ کے بغیر کوئی مال حاصل ہو تو اسے فے کہتے ہیں، اس کا ذکر سورۂ حشر (۶ تا ۹) میں ہے، مثلاً کفار خود ہی ہتھیار پھینک دیں، یا صلح کی صورت میں ان سے جزیہ وصول ہو، یا زمین کا خراج وغیرہ ہو۔ غنیمت اور فے بعض اوقات ایک دوسرے کے معنی میں بھی آ جاتے ہیں۔ " غَنَمٌ " کا معنی بھیڑ بکریاں ہے، جو عرب میں اکثر جنگ کے بعد غالب فریق کے قبضے میں آتی تھیں۔ بعد میں قبضے میں آنے والی ہر چیز کو غنیمت کہنے لگے۔

② سورت کے شروع میں ''انفال'' کو اللہ اور اس کے رسول کی ملکیت قرار دیا گیا تھا، اب غنیمت کی تقسیم کا طریقہ بیان ہوتا ہے۔ ایک مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلے ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ میں لڑائی کا حکم ہے جس کے نتیجے میں عموماً مالِ غنیمت حاصل ہوتا ہے، اس لیے اب اس کے خرچ کی جگہیں بیان فرمائیں۔

③ مِنْ شَيْءٍ : اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی چیز بڑی سے بڑی ہو یا چھوٹی سے چھوٹی، کوئی شخص اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق سوئی دھاگا حتیٰ کہ اونٹ کی اون کی گچھی تک جمع کروانا ہوگی، اگر رکھے گا تو یہ غلول (خیانت) شمار ہوگا، جس کی وعید سورۂ آل عمران (۱۶۱) میں ہے۔

④ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ...... : مطلب یہ ہے کہ کل غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے، چار حصے ان لوگوں کو ملیں گے جنھوں نے جنگ میں شرکت کی، ان میں بھی پیادے کو ایک حصہ اور سوار کو تین حصے ملیں گے، ایک اس کا اپنا اور دو حصے گھوڑے کے اور خمس (پانچواں حصہ) ان اغراض کے لیے الگ کر لیا جائے گا جن کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی امت محمد (ﷺ) پر احسان ہے، ورنہ پہلی امتوں میں تو اموال غنیمت حلال ہی نہ تھے بلکہ انھیں جلا دیا جاتا تھا۔

یہاں اللہ تعالیٰ کا نام بطور برکت وتمہید آیا ہے، کیونکہ سب مال اللہ ہی کا ہے۔ اصل میں خمس کے مصرف پانچ ہیں، ایک حصہ رسول اللہ ﷺ اپنی اور اپنی بیویوں کی ضروریات کے بعد عام مسلمانوں کی مصلحت میں خرچ کرتے تھے، مثلاً مجاہدین کے لیے اسلحہ اور سواریاں وغیرہ۔ آپ کے بعد خلیفۂ وقت جہاں مناسب سمجھے خرچ کرنے میں آپ کا جانشین ہوگا۔ خمس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کو سارے مال غنیمت میں سے کوئی ایک چیز مثلاً کوئی ہتھیار یا گھوڑا یا لونڈی اپنے لیے رکھنے کا اختیار تھا، اسے "صَفِيٌّ" کہتے ہیں۔ "وَلِذِي الْقُرْبٰى" سے مراد رسول اللہ ﷺ کے قرابت دار ہیں، آپ کے جد اعلیٰ عبد مناف کی اولاد چار قبیلے تھے، بنو ہاشم، بنو مطلب، بنو عبد شمس اور بنو نوفل۔ آپ ﷺ بنو ہاشم میں سے تھے، مگر آپ نے " ذَوِي الْقُرْبٰى " میں

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤١﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ

فیصلے کے دن نازل کی، جس دن دو جماعتیں مقابل ہوئیں اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ﴿٤١﴾ جب تم قریب والے

سے پہلے دو قبیلوں کو خمس میں سے حصہ دیا، بعد والے دو کو نہیں دیا اور ان کے پوچھنے پر بتایا کہ بنو مطلب اسلام لانے سے پہلے بھی بنو ہاشم کے ساتھی رہے ہیں، جبکہ آخری دونوں قبیلے اس وقت مخالفت میں سرگرم رہتے تھے۔ "الْيَتٰمٰى" وہ نابالغ بچے جن کے باپ فوت ہو چکے ہوں۔ "الْمَسٰكِيْنِ" وہ ضرورت مند جن کی آمدنی ضرورت سے کم ہو۔ "ابْنِ السَّبِيْلِ" راہ گیر مسافر۔ اس خمس کا پانچ حصوں میں تقسیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا سب کو برابر دیا جائے گا، یا حسب ضرورت خرچ کیا جائے گا؟ امام مالک اور اکثر سلف رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ امام (خلیفۂ اسلام) کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت، مثلاً جہاد کی تیاری، اسلحہ کی خریداری وغیرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس طرح چاہے اسے تقسیم یا خرچ کرے۔ اسی پر خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کا عمل رہا ہے۔ (قرطبی) نسائی کی حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اونٹ کی کوہان سے دو انگلیوں میں تھوڑی سی پشم پکڑی، پھر فرمایا: "میرے لیے فے (غنیمت) میں سے کچھ نہیں، حتیٰ کہ یہ (پشم) بھی نہیں، مگر پانچواں حصہ اور وہ پانچواں حصہ بھی تمھی میں لوٹایا جائے گا۔" [نسائي، أول كتاب قسم الفيء : ٤١٤٤، و صححه الألباني]

پھر ضروری نہیں کہ پانچ حصوں میں برابر تقسیم کرے، جہاں زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت ہو زیادہ کر سکتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اور ابن کثیر رحمہما اللہ نے اس کو سب سے صحیح قول قرار دیا ہے۔

⑤ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا: یعنی جو فرشتے، آیات و معجزات اور نصرتِ الٰہی بدر میں اللہ تعالیٰ نے اتارے۔ "عَبْدِنَا" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بندہ کہہ کر خاص اعزاز بخشا، جیسا کہ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ [بني إسرائيل : ١] میں اور ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ [البقرة : ٢٣] میں فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا یہ اعزاز بہت عزیز تھا، آپ کی مشہور دعا ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ أَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ» [أحمد : ٣٩١/١، ح : ٣٧١١، عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ]

⑥ يَوْمَ الْفُرْقَانِ: "الْفُرْقَانِ" واضح فیصلہ، یعنی بدر کے دن جس میں حق اور باطل کا فیصلہ ہوا، حق کو فتح ہوئی اور باطل مغلوب ہوا۔ (ابن کثیر) حق و باطل کے درمیان یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی جو ١٧ رمضان بروز جمعہ (بروایت ابن جریر عن علی) واقع ہوئی۔

آیت 42 ① اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا...... : جنگ کا محل وقوع ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ تم جس ارادے سے نکلے تھے کہ ہمیں وہ قافلہ مل جائے گا جو نہایت قیمتی ہے اور جس کے محافظ صرف تیس یا چالیس شخص ہیں، اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایسی جگہ لا کھڑا کیا جہاں لڑائی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ "عُدْوَةٌ" کنارا۔ "الدُّنْيَا" "دُنُوٌّ" (قریب ہونا) میں سے "أَدْنٰى" کی مؤنث ہے، قریب ترین، یعنی تم وادی بدر کے اس سرے پر تھے جو مدینہ کے قریب ترین ہے۔ "الْقُصْوٰى" "أَقْصٰى" کی مؤنث ہے دور ترین، یعنی قریش اسی وادی بدر کے مدینہ سے دور والے کنارے پر تھے۔ "وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ

الْقُصْوٰى وَ الرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَ لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَ لٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَ لَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾

کنارے پر اور وہ دور والے کنارے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو ضرور مقرر وقت کے بارے میں آگے پیچھے ہو جاتے اور لیکن تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو کیا جانے والا تھا، تاکہ جو ہلاک ہو واضح دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے واضح دلیل سے زندہ رہے اور بے شک اللہ یقیناً سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۴۲﴾ جب اللہ تجھے تیرے خواب میں دکھا رہا تھا کہ وہ تھوڑے ہیں اور اگر وہ تجھے دکھاتا کہ وہ بہت ہیں تو تم ضرور ہمت ہار جاتے اور ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑتے اور لیکن اللہ نے سلامت رکھا۔ بے شک وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۴۳﴾

مِنْكُمْ " یعنی جس قافلے کی خاطر تم نکلے تھے وہ تم سے نیچے ساحل سمندر پر تھا، جہاں تمھارا پہنچنا اس وقت ممکن نہ تھا اور تم اور قریش کسی پیشگی ارادے کے بغیر ایک ہی وادی کے کناروں پر آ جمع ہوئے تھے، نہ انھیں تمھارا علم تھا نہ تمھیں ان کا اور اللہ تعالیٰ یہ چاہتا تھا کہ حق و باطل کا ٹکراؤ کروا کر حق واضح کر دے۔ اگر تم اور قریش وقت اور جگہ طے کر کے لڑائی کے لیے نکلتے تو یقیناً طے کردہ وعدے پر پہنچنے میں کمی بیشی ہو جاتی، یا تم اپنی تعداد اور تیاری کی کمی کی وجہ سے نہ پہنچتے، یا کفار رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ رعب سے خائف ہو کر نہ پہنچتے، مگر اللہ تعالیٰ کا تمھیں عین ایک ہی وادی میں لا جمع کرنا اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرنا چاہتا تھا وہ پورا کر دے، یعنی مسلمانوں کو فتح اور کفار کو شکست ہو۔

② لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ......: یعنی اس لیے کہ کفار کی اتنی کثرت اور تیاری اور مسلمانوں کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں کی فتح کے ساتھ کفار پر حجت پوری ہو جائے اور اسلام کی حقانیت واضح ہو جائے، اس کے بعد اگر کوئی کافر رہے تو دلیل دیکھ کر کافر رہے اور ہلاکت میں پڑے اور جو کوئی مسلمان ہو تو وہ بھی دلیل دیکھ کر مسلمان ہو اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کرے۔

آیت 43 ① اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا : نبی ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ کافروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، اس کی خبر آپ ﷺ نے صحابہ کو دی، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ہمت اور ثابت قدمی پیدا ہو گئی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کا خواب تو وحی ہوتا ہے، پھر آپ کو وہ کم کیوں نظر آئے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ آپ کا خواب اس لحاظ سے سچا تھا کہ بعد میں ان کافروں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ فرشتے بھی شامل تھے،

وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا

اور جب وہ تمھیں، جس وقت تم مقابل ہوئے، انھیں تمھاری آنکھوں میں تھوڑے دکھاتا تھا اور تمھیں ان کی آنکھوں میں بہت کم کرتا تھا، تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو کیا جانے والا تھا اور سب معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (۴۴) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جمے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو،

اس لیے ان کے مقابلے میں کافروں کی تعداد کم ہی تھی یا معنوی طور پر یعنی اخلاقی اور روحانی طور پر ان میں قوت و طاقت نہ تھی، بظاہر وہ بہت تھے لیکن میدان کارزار میں ثبات واستقلال میں کمزور تھے، اس لیے گویا وہ تعداد میں بھی کم تھے۔

② وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ : یعنی کوئی کہتا لڑو اور کوئی کہتا نہ لڑو، وہ بہت ہیں اور ہم کم۔

③ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ : یعنی نہ ہمت ہار جانے کا موقع دیا اور نہ آپس میں لڑنے جھگڑنے کا۔

آیت 44 ① وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا...... : پہلا واقعہ رسول اللہ ﷺ کے خواب کا تھا، یہ عین میدان جنگ کا واقعہ ہے، جب جنگ ہونے والی تھی مگر ابھی شروع نہیں ہوئی تھی، کافر مسلمانوں کو تھوڑے نظر آتے تھے، حتیٰ کہ بعض نے دوسرے سے پوچھا، تمھارے خیال میں یہ کتنے ہوں گے؟ اس نے کہا، ستر (۷۰) کے قریب ہوں گے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کے خواب کی بھی تائید ہو رہی تھی اور یہ بھی کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھ جائے اور کفار کی نظر میں مسلمانوں کو کم دکھانے کی حکمت یہ تھی کہ وہ زیادہ تیاری کی ضرورت نہ سمجھیں اور لڑائی سے گریز نہ کریں، بلکہ دونوں فریق ایک دوسرے کو کم سمجھتے ہوئے لڑائی پر آمادہ ہو جائیں۔ یہ شروع کی بات ہے، مگر جب جنگ شروع ہوگئی تو کافروں کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی، جیسا کہ آل عمران میں ہے: ﴿ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ﴾ [آل عمران : ۱۳] ''اور دوسری جماعت کافر تھی جو ان (مسلمانوں) کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔'' اس کا فائدہ یہ ہوا کہ جنگ شروع ہوگئی، پھر شروع ہونے پر کافروں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ جلد ہی شکست کھا کر پیچھے کی طرف بھاگنے لگے اور مسلمانوں کے حوصلے بدستور بڑھتے گئے۔

② لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا : یعنی وہی کہ اسلام کی فتح اور کفر کی شکست ہو اور رسول اللہ ﷺ کی سچائی پر معجزانہ دلیل قائم ہو جائے۔

③ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ : یعنی وہی جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور پھر جب اصل اختیار ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے تو مسلمان کو چاہیے کہ اسی کو اپنا مقصود بنائے۔

آیت 46،45 اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا...... : ''لَقِيْتُمْ'' ''لِقَاءٌ'' سے ہے، یعنی ملنا اور آمنے سامنے ہونا، اکثر لڑائی

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾

تاکہ تم فلاح پاؤ﴿۴۵﴾ اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور آپس میں مت جھگڑو، ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے﴿۴۶﴾

کی ملاقات کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہاں بھی یہی مراد ہے۔ "فِئَةٌ" جماعت، گروہ۔ یہ " فَاءَ يَفِيْءُ فَيْئًا " (لوٹنا) سے مشتق ہے، کیونکہ ایک جماعت کے لوگ مدد کے لیے ایک دوسرے کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ (راغب) قرآن مجید میں زیادہ تر یہ لفظ لڑنے والی جماعت کے لیے استعمال ہوا ہے، خواہ وہ کفار کی جماعت ہو یا مسلمانوں کی اور خواہ مستقل جماعت ہو یا کمک کے لیے آنے والی، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة : ۲۴۹] ''کتنی ہی تھوڑی جماعتیں زیادہ جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں۔'' اور دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۳) اور سورۂ کہف (۴۳) اس آیت میں دشمن سے مقابلے کے وقت لڑائی کے آداب اور دلیری و شجاعت حاصل کرنے کے طریقے سکھائے۔ ان میں سے پہلی چیز ثابت قدمی اور ڈٹے رہنا ہے، کیونکہ اس کے بغیر میدانِ جنگ میں ٹھہرنا ممکن ہی نہیں۔ ثابت قدمی سے مراد انتہائی بے جگری سے لڑنا ہے، لہٰذا یہ آیت ﴿ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ ﴾ [الأنفال : ۱۶] کے خلاف نہیں، کیونکہ جنگی چال کے طور پر ایک طرف ہونا یا پیچھے ہٹنا فرار نہیں بلکہ ثابت قدمی ہی کی ایک صورت ہے۔ دوسری چیز اللہ کو کثرت سے یاد کرنا ہے، کیونکہ فتح و نصرت کا انحصار ظاہری اسباب پر نہیں بلکہ دل کی استقامت، اللہ کی یاد اور اس کا حکم بجا لانے پر ہے، اس لیے طالوت کے ساتھیوں نے دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت یہ دعا کی تھی: ﴿ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة : ۲۸۶] ''اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور ان کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد فرما۔'' نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بدر اور دوسرے مقامات پر نہایت عجز و زاری سے اللہ کو یاد کیا اور اس سے مدد مانگی۔ مسلمان تھوڑے ہوں تو اللہ کی مدد طلب کریں اور زیادہ ہوں تو بھی اپنی طاقت اور کثرت کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسا رکھیں اور اس کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ تیسری ہدایت اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری ہے جو ہر حال میں لازم ہے، مگر میدانِ جنگ میں اس کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہاں تھوڑی سی نافرمانی بھی بعض اوقات نا قابل تلافی نقصان کا باعث بن جاتی ہے، جیسا کہ جنگ اُحد میں ہوا۔ اس میں امیر کی اطاعت بھی شامل ہے کہ وہ بھی اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔ چوتھی ہدایت یہ کہ آپس میں جھگڑا اور اختلاف نہ کرو، ورنہ فتح کے بعد شکست نظر آنے لگے گی، جس سے تمھارے دلوں میں بزدلی پیدا ہو جائے گی اور تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا جاتی رہے گی، یعنی تمھارے درمیان پھوٹ دیکھ کر دشمنوں پر سے رعب اٹھ جائے گا اور وہ تم پر غلبہ پانے کے لیے اپنے اندر جرأت محسوس کرنے لگیں گے۔ پانچویں ہدایت یہ کہ صبر کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اگر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت و معیت، یعنی خاص مدد اور خصوصی ساتھ بھی حاصل نہیں رہے گا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۲۰۰)۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اکڑتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاوا کرتے ہوئے نکلے اور وہ اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور اللہ اس کا جو وہ کر رہے تھے، احاطہ کرنے والا تھا۔﴿۴۷﴾

عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنگ کے موقع پر انتظار کیا، یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا، پھر لوگوں میں کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا، فرمایا: ''اے لوگو! دشمن سے مڈ بھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے رہو اور جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو صبر کرو (ڈٹے رہو) اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' [بخاري، الجهاد والسير، باب كان النبي ﷺ إذا لم يقاتل أول النهار...... : ۲۹۶۵، ۲۹۶۶] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں وہ شجاعت، صبر و ثبات اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ایسی فرماں برداری تھی جو نہ اس سے پہلے کسی کو حاصل ہوئی نہ بعد میں ہو گی، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت کی برکت اور آپ کی اطاعت سے شرق و غرب کے ممالک کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی فتح کیا اور روم و فارس کے مقابلے میں نہایت تھوڑی تعداد کے باوجود سب پر غالب آئے، یہاں تک کہ اللہ کا بول سب پر بالا ہو گیا اور اس کا دین سب ادیان پر غالب آ گیا اور صرف تیس سال سے بھی کم عرصے میں اسلامی ممالک مشرق سے مغرب تک پھیل گئے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انھیں راضی کرے اور ہمارا حشر بھی ان کے ساتھ کرے، وہ بے حد کرم اور عطا والا ہے۔

آیت 47 وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ......: مسلمانوں کو لڑائی میں ثابت قدمی اور ذکر الٰہی کی کثرت کا حکم دینے کے بعد اب کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) ان سے مراد ہیں ابو جہل اور اس کے ساتھی، جو تین مقصد لے کر نکلے تھے، ''بَطَرًا'' اپنی اکڑ اور بڑائی ثابت کرنے کے لیے، ''رِئَآءَ النَّاسِ'' لوگوں کو اپنی شان و شوکت اور شجاعت دکھانے کے لیے اور ''يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ'' اللہ کے راستے، یعنی اسلام سے لوگوں کو روکنے کے لیے، جبکہ مومن صرف اور صرف اللہ کا دین غالب کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شان و شوکت کا اظہار، فخریہ اشعار اور شراب نوشی کی محفلوں کے بجائے انھیں موت کے پیالے پی کر، ذلت و رسوائی اور دردناک مصیبتوں کے ساتھ واپس لوٹنا پڑا۔ یہ لوگ گویا اپنے رب کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلے تھے اور اس قادر و قہار کے احاطے سے تو ان کا کوئی چھوٹا بڑا عمل باہر نہ تھا، اس کے آگے ان کی کیا پیش جا سکتی تھی۔ خندق کے موقع پر کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے کیا خوب کہا تھا:

جَاءَتْ سَخِيْنَةُ كَيْ تُغَالِبَ رَبَّهَا وَلَيُغْلَبَنَّ مُغَالِبُ الْغَلَّابِ

''سخینہ یعنی قریش اپنے رب سے مقابلے کے لیے آئے اور اس زبردست غالب کا مقابلہ کرنے والا یقیناً ہر صورت مغلوب ہو گا۔''

وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾ ع

اور جب شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوشنما بنا دیے اور کہا آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں اور یقیناً میں تمھارا حمایتی ہوں، پھر جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی ایڑیوں پر واپس پلٹا اور اس نے کہا بے شک میں تم سے بری ہوں، بے شک میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۴۸﴾

آیت 48 ① وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ...... : "جَارٌ" کا معنی یہاں مجیر، معین، ناصر یعنی حمایتی و مددگار ہے۔ "نَكَصَ" الٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ شیطان کے ان کے لیے ان کے اعمال کو مزین کرنے، انھیں ان کے غالب ہونے اور اپنی حمایت کا یقین دلانے کی تفسیر بعض مفسرین، مثلاً طبری، ابن کثیر اور قرطبی رحمہم اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمائی ہے کہ قریش اور بنو کنانہ کی باہم دشمنی تھی اور انھیں ان کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ پیچھے سے ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ شیطان نے ان کے سردار سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں آ کر ان کی طرف سے قریش کو بے فکر ہو جانے کا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا اور اپنے لشکر کو بھی لے کر آیا، مگر بدر میں جب مسلمانوں کے ساتھ جبریل علیہ السلام اور فرشتوں کو دیکھا تو الٹے پاؤں یہ الفاظ کہتا ہوا بھاگ گیا جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔

بعض مفسرین مثلاً صاحب المنار نے یہ تفسیر کی ہے کہ شیطان انسانی شکل میں نہیں آیا بلکہ یہ تمام باتیں بطور وسوسہ اس نے ان کے دلوں میں ڈالیں کہ میں تمھارا حمایتی ہوں، یعنی جن بتوں اور خداؤں کو تم پوجتے ہو وہ ہر طرح سے تمھاری حمایت اور مدد کریں گے اور اس وقت تم اتنی تعداد اور قوت میں ہو کہ تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ اپنے بتوں اور خداؤں کے بھروسے پر جو درحقیقت شیطان پر بھروسا تھا اور اپنی قوت کے زعم میں شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے پر اپنی فتح کا یقین کر بیٹھے، مگر بدر کے میدان میں لڑائی شروع ہونے کے بعد انھیں مسلمان دگنے نظر آنے لگے تو شیطان کے سارے دلائے ہوئے وسوسے اور یقین باطل ہو گئے۔ سید رشید رضا نے شیطان کے انسانی صورت میں آنے کی روایات کی صحت میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ روایات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں جو اس وقت پانچ برس کے تھے، انھوں نے کسی اور ہی سے سنی ہوں گی، مگر صحابہ کی مرسلات بھی قبول ہوتی ہیں، کیونکہ انھوں نے کسی نہ کسی صحابی ہی سے سنی ہوتی ہیں جو سب معتبر ہیں۔

ابن کثیر کی تخریج "هداية المستنير" میں لکھا ہے کہ ابن کثیر نے ان آیات کے تحت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی روایات

إِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں ایک بیماری تھی، کہہ رہے تھے ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے۔ اور جو اللہ پر بھروسا کرے تو بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۴۹﴾

ذکر کی ہیں جن میں سے کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں، مگر ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کا اصل ضرور ہے، اس لیے انھیں بیان کرنے میں کوئی مانع نہیں اور " الاستیعاب فی بیان الأسباب " میں سلیم الہلالی اور محمد بن موسیٰ نے لکھا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی (یہاں مذکور) روایت حسن ہے، اس میں دو علتیں بیان کی گئی ہیں مگر ان کی کچھ حیثیت نہیں۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کی کوئی وضاحت صحیح حدیث میں نہیں آئی اور یہ معاملہ غیب سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے اگرچہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان نے واقعی انسانی وجود میں آ کر انھیں یہ کہا یا محض دل میں غرور پیدا کر کے انھیں دھوکا دیا، مگر قرآن کے الفاظ "قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ" اور "نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ" سے یہی راجح نظر آتا ہے کہ وہ ظالم انسانی شکل میں آیا تھا اور شیطان کا بعض اوقات انسانی شکل میں آنا کچھ بعید نہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ وہ رسول اللہ ﷺ پر نماز میں حملہ آور ہوا تو آپ نے پکڑ کر اس کا گلا گھونٹا، مگر پھر سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد کر کے اسے چھوڑ دیا۔ [بخاری، الصلاۃ، باب الأسیر أو الغریم یربط فی المسجد : ٤٦١] ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھی تین دن نظر آتا رہا اور وہ گرفتار کر کے اسے چھوڑ دیتے رہے، اس لیے اس اہم موقع پر خود اس کا آنا کوئی بعید نہیں ہے۔

② اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ: یعنی مجھے وہ فرشتے نظر آ رہے ہیں جو تمھیں نظر نہیں آ رہے۔

③ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ: ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے اس دن تک مہلت دی جو اللہ کے علم میں ہے۔ دیکھیے سورۂ حجر (۳۷، ۳۸) اور سورۂ ص (۸۰، ۸۱) قیامت تک کا وعدہ نہیں فرمایا، اس لیے ہو سکتا ہے کہ ابلیس نے فرشتوں کو دیکھ کر یہ سمجھا ہو کہ میری مہلت کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے اس نے اللہ سے ڈرنے کا ذکر کیا، ورنہ وہ ظالم کب اللہ سے ڈرتا تھا۔

آیت 49 ① اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: "جن کے دلوں میں بیماری" سے مراد نئے مسلمان ہیں، جن کے دلوں میں شک ختم ہو کر یقین کی پوری کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہودی اور مدمقابل مشرکین بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

② غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ : یعنی ان کے دینی جوش نے ان کو بالکل دیوانہ بنا دیا ہے، دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تھوڑی سی تعداد ہے، کوئی سروسامان بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ لڑنے کے لیے ایک کے سوا دوسرا گھوڑا بھی نہیں ہے، مگر چلے ہیں قریش کے مسلح اور

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

اور کاش! تو دیکھے جب فرشتے ان لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جنھوں نے کفر کیا، ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے ہیں۔ اور جلنے کا عذاب چکھو ﴿۵۰﴾ یہ اس کے بدلے ہے جو تمھارے ہاتھوں نے آگے بھیجا اور اس لیے کہ یقیناً اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ﴿۵۱﴾

عظیم الشان لشکر سے مقابلہ کرنے، پاگل ہی تو ہیں جو اپنی موت کو خود دعوت دے رہے ہیں۔ رسولوں اور ان کے ساتھیوں کو پاگل و دیوانہ کہنے کا یہ سلسلہ پہلے رسول سے لے کر ہمارے رسول تک چلا آیا ہے، کیونکہ کفار وہ بات سمجھ ہی نہیں سکتے جو ایمان سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ دیکھیے سورۂ ذاریات (۵۲، ۵۳) شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مسلمانوں کی دلیری دیکھ کر منافق طعن کرنے لگے، اللہ نے فرمایا، یہ غرور (دھوکا کھانا) نہیں، توکل ہے۔'' (موضح)

③ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ...... : اور جس کا بھروسا اس سب پر غالب اور کمال حکمت والے پر ہو اس کا دل یقیناً مضبوط ہو گا، اس لیے مسلمان کفار کے عظیم الشان لشکر کے ساتھ مقابلے کے لیے ہر طرح سے آمادہ اور پر عزم ہیں۔

آیت 50 وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ...... : کفار کی زندگی کے بعض احوال بیان کرنے کے بعد ان کی موت کی حالت بیان کی ہے۔ یہ آیت یہاں اگرچہ واقعۂ بدر کے سلسلے میں آئی ہے، اس لیے بعض مفسرین نے اسے بدر کے کفار کا حال قرار دیا ہے، لیکن لفظ عام ہونے کی وجہ سے یہ ہر کافر کے مرنے کے وقت کا حال بیان کر رہی ہے۔ فرمایا کہ کافروں کی روح قبض کرتے وقت فرشتے جس طرح ان کے مونہوں اور پشتوں پر مارتے اور جس طرح جھڑکتے اور سختی کرتے ہیں، کاش آپ وہ منظر دیکھ لیں، کیونکہ سننے میں وہ بات نہیں جو دیکھنے میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام (۹۳) اور سورۂ محمد (۲۷، ۲۸) میں یہی بات بیان فرمائی ہے اور احادیث میں کافر کی جان کنی کا منظر بہت ہی ہولناک بیان کیا گیا ہے۔

آیت 51 ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ ...... : یعنی یہ عذاب عین عدل ہے، کیونکہ اس نے تمھارے سمجھانے کے لیے اپنے رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، مگر تم نے ایک نہ مانی۔ '' ظَلَّامٌ '' مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت ظلم کرنے والا، مگر یہاں اس پر نفی آئی ہے تو مبالغے کی نفی نہیں کہ معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت ظلم کرنے والا نہیں (گویا تھوڑا کر سکتا ہے) بلکہ یہاں نفی میں مبالغہ مراد ہو گا، یعنی اللہ تعالیٰ بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنے والا بھی نہیں۔ دیکھیے فوائد سورۂ آل عمران (۱۸۲) ایک لمبی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، میرے بندو! میں نے ظلم اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا ہے اور اسے تمھارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا ہے، لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ میرے بندو! یہ تمھارے اپنے ہی اعمال ہیں جن کو

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ ۙ

(ان کا حال) فرعون کی آل اور ان لوگوں کے حال کی طرح (ہوا) جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا بے شک اللہ بہت قوت والا، بہت سخت عذاب والا ہے ﴿۵۲﴾ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ کبھی وہ نعمت بدلنے والا نہیں جو اس نے کسی قوم پر کی ہو، یہاں تک کہ وہ بدل دیں جو ان کے دلوں میں ہے اور اس لیے کہ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۵۳﴾

میں محفوظ رکھتا ہوں، پھر تمھیں ان کا پورا بدلہ دوں گا، پھر جو خیر پائے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جو اس کے سوا پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔'' [مسلم، البر والصلة، باب تحريم الظلم : ۲۵۷۷، عن أبي ذر رضی اللہ عنہ]

آیت 52 كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... : یہاں مبتدا محذوف ہے '' دَأْبُهُمْ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ......'' یعنی ان کا حال اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور اس کے نتیجے میں عذاب میں مبتلا ہونے میں آل فرعون اور ان سے پہلے کفار کی طرح ہے۔

آیت 52 ① حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ : ''جو ان کے دلوں میں ہے'' یعنی اعتقاد اور نیت جب تک نہ بدلے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی۔ (موضح) مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اپنی عطا کردہ نعمت سے اسی صورت میں محروم کرتا ہے جب وہ اپنے عقائد و اعمال اور اخلاق کو بدل کر اپنے متعلق ثابت کر دیتی ہے کہ وہ اس نعمت کی مستحق ہرگز نہیں ہے. مثلاً ایمان کے بجائے کفر، شکر کے بجائے ناشکری اور نیکی کے بجائے گناہ کرنے لگتی ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ بھی اس سے اپنی عطا کردہ نعمت واپس لے لیتا ہے اور اسے مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ فرعون کی قوم اور اسی طرح قریش کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شان و شوکت اور خوش حالی سے نوازا تھا، لیکن ان سے اپنی نعمتیں چھین لیں۔ اس زمانے میں مسلمان جو ساری دنیا میں ذلت، غلامی اور دوسروں کی حاشیہ برداری کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ بھی ان کی اپنی بداعمالیوں کی سزا ہے، ورنہ ممکن ہی نہیں کہ ایک قوم کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتی ہو اور اس پر عامل ہو، پھر بھی دنیا میں ذلیل و خوار رہے۔

② وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ : یعنی وہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے، اس کے بندے جیسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں ویسا ہی وہ انھیں بدلہ دیتا ہے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ
اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

(ان کا حال) فرعون کی آل اور ان لوگوں کے حال کی طرح (ہوا) جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے انھیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون کی آل کو غرق کیا اور وہ سب ظالم تھے ﴿۵۴﴾ بے شک سب جانوروں سے برے اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا، سو وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۵۵﴾ وہ جن سے تو نے عہد باندھا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ نہیں ڈرتے ﴿۵۶﴾

آیت 54 كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ...... : یعنی آپ سے لڑنے والے ان لوگوں کا حال آل فرعون اور ان سے پہلے کفار جیسا ہے۔ یہ بات دہرانے سے مقصود ایک تو پہلی بات کی تاکید ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۙ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ [القیامۃ: ۳۴، ۳۵] دوسرا اس میں پچھلی آیت کی کچھ تفصیل ہے، اُس میں "كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ" یعنی اللہ کی آیات کے انکار اور نہ ماننے کا ذکر تھا، یہاں تفصیل ہے کہ انھوں نے انکار کے ساتھ انھیں جھٹلایا بھی تھا۔ تیسرا اُس میں گناہوں پر گرفت کا ذکر تھا، اس میں آل فرعون پر اس گرفت کی تفصیل، یعنی غرق کا بیان ہے اور عذاب کے سبب کی صاف الفاظ میں وضاحت ہے کہ وہ سب ظالم تھے، جب کہ اس سے پہلے قریب ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں، اگر وہ ظالم و گناہ گار نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی ذاتی بیر نہ تھا کہ انھیں بلاوجہ ہلاک یا غرق کر دیتا۔ واضح رہے کہ اللہ کی آیات سے مراد رسولوں کے لائے ہوئے احکام بھی ہیں اور نشانیاں اور معجزات بھی۔

آیت 55، 56 اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ ...... : اوپر کی آیت میں جب تمام کفار کا یہ وصف بیان فرمایا کہ وہ ظالم ہیں تو اب یہاں کفار کی بعض خاص شرارتوں کا ذکر فرمایا۔ "وَهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے نہیں ڈرتے، یا وہ اپنی بدعہدی کے انجام سے نہیں ڈرتے۔ ان سے مراد خاص طور پر مدینہ منورہ کے یہودی ہیں، جن سے مدینہ منورہ پہنچ کر نبی ﷺ نے اچھے ہمسایوں کی طرح رہنے اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا، لیکن اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت انھیں ایک نظر نہ بھاتی تھی، چنانچہ کبھی وہ اوس و خزرج کے درمیان جاہلی عصبیت ابھار کر ان کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے اور کبھی اسلام کے دشمنوں کی ہتھیاروں سے مدد کر کے معاہدے کی بار بار خلاف ورزی کرتے اور جب ان سے کہا جاتا تو کہہ دیتے کہ ہمیں معاہدہ یاد نہیں رہا تھا، لیکن جونہی موقع ملتا پھر کوئی ایسی حرکت کر گزرتے جو معاہدے کے خلاف ہوتی، حتیٰ کہ اس معاہدے کے ہوتے ہوئے ان کا سردار کعب بن اشرف (جو بدر میں قریش کی شکست سے انتہائی سیخ پا ہوا تھا) مکہ پہنچا اور وہاں مقتولین کفارِ بدر کے ہیجان انگیز مرثیے پڑھ کر قریش کے نوجوانوں کو مسلمانوں سے انتقام لینے کا جوش دلاتا رہا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنھیں

فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِي الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾

پس اگر کبھی تو انھیں لڑائی میں پا ہی لے تو ان (پر کاری ضرب) کے ساتھ ان لوگوں کو بھگا دے جو ان کے پیچھے ہیں، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں﴿۵۷﴾ اور اگر کبھی تو کسی قوم کی جانب سے کسی خیانت سے فی الواقع ڈرے تو (ان کا عہد) ان کی طرف مساوی طور پر پھینک دے۔ بے شک اللہ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا﴿۵۸﴾

"شَرَّ الدَّوَآبِّ" (بدترین جانور) فرمایا ہے۔ (ابن کثیر) یہاں انھیں " شَرَّ النَّاسِ" (سب لوگوں سے برے) کے بجائے "شَرَّ الدَّوَآبِّ" کہا گیا ہے، اگرچہ "الدَّوَآبِّ" میں انسان بھی آ جاتے ہیں، کیونکہ وہ بھی چلتے پھرتے ہیں، مگر عام طور پر یہ لفظ انسان کے بجائے جانوروں پر بولا جاتا ہے، گویا کفر کی وجہ سے یہ لوگ انسانیت کے شرف سے محروم ہو چکے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بینہ (۶)، سورۂ اعراف (۱۷۹) اور سورۂ فرقان (۴۴)۔

آیت 57 فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِي الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ ...... : " تَشۡرِيۡدٌ " کا معنی خوف پیدا کرنے کے ساتھ بھگدڑ مچا کر انھیں منتشر کرنا ہے، یعنی اگر کبھی لڑائی میں آپ انھیں کہیں پا لیں تو انھیں بدعہدی کی ایسی سخت سزا دیں کہ ان کے پیچھے جو دوسرے ایسے کفار ہیں اور جن سے تمھارا معاہدہ ہے، وہ بھی مرعوب اور خوف زدہ ہو جائیں اور انھیں ایسی عبرت حاصل ہو کہ معاہدے کی خلاف ورزی کا نام تک نہ لیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ اس سے پہلے یہود بنو نضیر اور بنو قینقاع کی جلاوطنی ہی پر اکتفا فرمایا تھا، مگر بنو قریظہ کی مسلسل بدعہدیوں اور عین خندق کے موقع پر معاہدہ توڑنے کے نتیجے میں انھیں ۲۵ دن کے محاصرے کے بعد انتہائی عبرت ناک سزا دی کہ ان کے تمام ۶۰۰ بالغ مردوں کو قتل کروا دیا، جن میں ایک جنگی مجرم عورت بھی تھی اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا۔ افسوس کہ اس وقت کفار، بھارت ہو یا امریکہ و یورپ، کوئی بھی مسلمانوں سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہیں کر رہے، مگر مسلمان اپنی نااہلی اور عیش و عشرت کی وجہ سے غیرت و حمیت کے اظہار کے بجائے ذلت اور بے بسی پر قناعت کر رہے ہیں۔

آیت 58 وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً ...... : یعنی عہد توڑنا خیانت ہے جو مسلمان کے لیے کسی صورت جائز نہیں، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو ان کے خلاف کوئی بھی کارروائی جائز نہیں، خواہ وہ لوگ تمھاری ریاست کے اندر ہوں یا باہر۔ اگر فی الواقع ان کی طرف سے عہد توڑنے یا دھوکا دینے کا خطرہ پیدا ہو جائے، جو آثار سے نظر آ جاتا ہے تو پھر بھی آگاہ کیے بغیر ان کے خلاف خفیہ کارروائی یا کھلا حملہ کر دینا جائز نہیں، بلکہ صاف اعلان کر کے واضح کر دو کہ ہمارا تمھارا معاہدہ ختم ہے، تاکہ تم پر عہد توڑنے یا دھوکا دینے کا الزام نہ آئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے خلفاء کی سیرت بھی یہی رہی کہ کفار کی طرف سے عہد شکنی کے خطرے کی صورت میں معاہدے کے خاتمے کا اعلان فرما دیتے اور پھر حملہ آور ہوتے۔ مگر جب کسی قوم نے بدعہدی کر دی ہو تو اس پر بے خبری میں حملہ بھی جائز ہے، جیسا کہ کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے حلیف بنو خزاعہ پر بنو بکر کے حملے میں شریک ہو کر صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑا تو رسول اللہ ﷺ

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝۵۹ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ

اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ہرگز گمان نہ کریں کہ وہ (بچ کر) نکل گئے، بے شک وہ عاجز نہیں کریں گے ۝۵۹ اور ان کے لیے جتنی کر سکو قوت کی صورت میں اور تیار بندھے گھوڑوں کی صورت میں تیاری رکھو، جس کے ساتھ تم اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو ڈراؤ گے اور ان کے علاوہ کچھ دوسروں کو بھی جنھیں تم نہیں جانتے، اللہ انھیں جانتا ہے اور تم

نے ان پر خبر دیے بغیر چڑھائی کر دی اور انھیں خبر اس وقت ہوئی جب اسلامی فوجیں مکہ کے قریب آ پہنچیں۔ مسلمان اپنے معاہدوں کی کس قدر پاس داری کرتے تھے، اس کی مثال وہ واقعہ ہے جو سلیم بن عامر بیان کرتے ہیں کہ معاویہ رضی اللہ عنہ رومیوں کی سرزمین کی طرف کوچ کر رہے تھے، جبکہ آپ کے اور ان کے درمیان ایک معاہدہ تھا، آپ چاہتے تھے کہ ان کے قریب پہنچ جائیں اور جب معاہدے کی مدت ختم ہو تو (اچانک) ان پر حملہ کر دیں، تو انھوں نے دیکھا کہ ایک بزرگ سواری پر سوار ہیں اور کہہ رہے ہیں اللہ اکبر، اللہ اکبر، عہد پورا کرنا ہے، عہد توڑنا نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”جس کا کسی قوم سے کوئی عہد ہو تو ہرگز نہ کوئی گرہ کھولے اور نہ اسے باندھے یہاں تک کہ اس کی مدت ختم ہو جائے، یا برابری کی بنیاد پر ان کا عہد ان کی طرف پھینک دے۔“ یہ حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو واپس آ گئے۔ حدیث بیان کرنے والے یہ بزرگ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔ [أحمد : ۱۱۱/۴، ح : ۱۷۰۱۷۔ أبو داوٗد : ۲۷۵۹]

آیت 59 **وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا** ...... : یہاں سب سے پہلے وہ کفار قریش مراد ہیں جو میدان بدر سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز نہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر نکل گئے ہیں، اس کی گرفت سے کون نکل سکتا ہے اور اسے کون عاجز اور بے بس کر کے بھاگ سکتا ہے؟ ویسے الفاظ کے عموم کا تقاضا اور حقیقت واقعی یہی ہے کہ کافر کوئی بھی ہو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نکلنے میں ہرگز کامیاب نہ سمجھے، اگر دنیا میں اس گرفت کا مظاہرہ نہ ہو تو موت کے وقت اور اس کے بعد وہ بچ کر کہاں جائیں گے؟ وہ کبھی اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے جیسا چاہے ان پر عذاب بھیج سکتا ہے۔

آیت 60 ① **وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ** : ”**قُوَّةٍ**“ کا لفظ نکرہ لایا گیا ہے، ”**مِنْ**“ کے ساتھ عموم اور زیادہ ہو گیا ہے، یعنی ہر قسم کی قوت، خواہ جو بھی ہو، تاکہ اس میں وہ تمام چیزیں آ جائیں جو جنگ میں قوت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿ **وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ** ﴾ اور فرمایا: « أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ » تین دفعہ فرمایا کہ یاد رکھو اصل قوت ”رَمْيٌ“ ہے۔ [مسلم، الإمارۃ، باب فضل الرمی والحث علیه...... : ۱۹۱۷] ”رَمْيٌ“ کا لفظ اگرچہ تیر اندازی کے معنی میں بھی آتا ہے، مگر اس میں تیر کے ساتھ ساتھ وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو دور سے پھینکی جاتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان:

اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾

جو چیز بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے وہ تمھاری طرف پوری لوٹائی جائے گی اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۶۰﴾

﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ ﴾ [الأنفال : ۱۷] سے مراد مٹی اور کنکریوں کی مٹھی پھینکنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دور سے مار کرنے والی جو بھی چیز تھی آپ نے جنگ میں استعمال فرمائی، حتیٰ کہ منجنیق بھی دشمن کے خلاف استعمال فرمائی، جس کے ساتھ دور سے پتھر پھینک کر قلعوں کی دیواریں توڑ دی جاتی تھیں اور ہمیشہ مسلمانوں نے اپنے غلبے کے زمانے میں ہر جدید ہتھیار مثلاً نِفط (پٹرول وغیرہ) کے ہتھیار استعمال کیے۔ بارود کی ایجاد کے بعد بھی ترک خلفاء توپوں کی تیاری سے غافل نہیں رہے، مگر افسوس اس کے بعد مسلمانوں نے اس حکم سے اتنی بے پروائی کی کہ دشمن اس میدان، یعنی اسلحہ کی تیاری میں ان سے بہت آگے نکل گیا۔ اب عالم اسلام اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر نعمت کے باوجود اسلحے کے لیے غیروں کا محتاج ہے، چھوٹے موٹے ہتھیار تو بنتے ہیں، مگر ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر، گاڑیاں، کمپیوٹر، توپیں، ریڈار وغیرہ تمام چیزوں میں وہ دوسروں کا دست نگر ہے۔ (الا ماشاء اللہ) جس کے نتیجے میں کفار مسلمانوں کی دولت بھی لوٹ رہے ہیں، ان کے وسائل اور دینی اقدار کو بھی چھین رہے ہیں اور جب چاہتے ہیں ان ہتھیاروں اور جہازوں کی ضروریات وغیرہ روک کر بے بس کر دیتے ہیں، حالانکہ پاکستان اگر ایٹم بم بنا سکتا ہے تو وہ کون سی چیز ہے جو مسلم ممالک نہیں بنا سکتے؟ مگر مسلمانوں کی دین سے بے گانگی، دشمن کی چال بازی، اپنوں کی غداری اور طمع وحرص کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بزدلی ان میں یہ چیزیں بنانے کی جرأت ہی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی گاڑی، ریل یا ہوائی جہاز پر سوار ہو کر اپنے ملک میں یا بیرون ملک سفر کرتے ہیں تو دل میں سخت تکلیف ہوتی ہے کہ یہ تمام سواریاں ہمارے دشمنوں کی بنائی ہوئی ہیں، ہم اپنے بل بوتے پر کچھ بھی نہیں بنا سکے۔ یہ سب مسلمانوں کے رہنماؤں کا کیا دھرا ہے، جو اپنے عوام ہی کی تصویر ہیں، مگر مایوس ہونا کسی صورت بھی جائز نہیں اور نہ کفار کو ناقابل شکست سمجھ کر ہاتھ توڑ کر بیٹھ جانا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق کفار جتنی بھی کوشش کر لیں کبھی نورِ اسلام کو بجھا نہ سکیں گے، فرمایا: ﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ [الصف : ۸] ”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کے ساتھ بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، اگرچہ کافر لوگ ناپسند کریں۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت قیامت قائم ہونے تک اس کی خاطر لڑتی رہے گی۔“ [مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۲، عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ] مغیرہ بن شعبہ، جابر بن عبد اللہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم سے مروی رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں ان لوگوں کے دین پر قائم رہنے اور غالب رہنے کی خوش خبری بھی آئی ہے۔ [دیکھیے مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۱، ۱۹۲۳، ۱۹۲۳، ۱۰۳۷، بعد ح : ۱۹۲۳] اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس وقت مجاہدین اسلام اور کفار کے درمیان جو جنگ جاری ہے اس میں اہل اسلام کی کس قدر آزمائش باقی ہے؟ اور کفار اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی جس حد تک پہنچ چکے ہیں ان کی سزا میں کتنی دیر ہے؟

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسا کر۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۶۱﴾

اور اللہ تعالیٰ اپنے کن بندوں کے ہاتھوں کفار کو کس طرح کیفر کردار تک پہنچاتا ہے؟ فرمان الٰہی ہے: ﴿ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد : ۳۸] ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمھاری جگہ تمھارے سوا اور لوگ لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔'' اور دیکھیے سورۂ مائدہ (۵۴)۔

❷ وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ: اس حکم سے سوار فوج کی اہمیت ظاہر ہے۔ ''قُوَّةٍ'' اور ''رِبَاطِ الْخَيْلِ'' میں فوجی گاڑیاں، ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، جنگی جہاز، آبدوزیں، بحری بیڑے، جاسوسی کے آلات اور ادارے، اعلام کے ذرائع، سب آ جاتے ہیں، مگر ان سب کے باوجود قیامت تک جنگ میں گھوڑوں کی ضرورت اور اہمیت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ جو کام یہ مبارک جانور سرانجام دے سکتا ہے دنیا کی کوئی چیز نہیں دے سکتی۔ عروہ بارقی اور جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''یہ گھوڑے، ان کی پیشانیوں میں قیامت کے دن تک خیر باندھ دی گئی ہے، اجر اور غنیمت۔'' [مسلم، الإمارة، باب فضيلة الخيل ...... : ۱۸۷۲، ۱۸۷۳] اس لیے مسلمانوں کو ڈرائیور، پائلٹ، ملاح، بحری مجاہد، تیراک اور غوطہ خور ہونے کے ساتھ ساتھ گھڑ سوار ہونا بھی لازم ہے۔

❸ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ: یعنی اس قدر مضبوط تیاری رکھو کہ اللہ کا دشمن اور تمھارا دشمن اور تمھارے ساتھ کد رکھنے والا ہر شخص تم سے خوف زدہ رہے اور لڑنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ ان واضح دشمنوں میں مشرکین، یہود و نصاریٰ اور جانے پہچانے منافق سب شامل ہیں۔

❹ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ: اس سے مراد مسلمانوں کی صفوں میں کفار کے چھپے ہوئے ہمدرد منافق ہیں۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۱۰۱) علاوہ ازیں کئی اقوام جو بظاہر اس وقت تمھارے خلاف نہیں، مگر موقع پانے پر دل میں تم سے لڑائی کا ارادہ رکھتی ہیں، تمھاری مکمل تیاری اور ہر وقت جہاد میں مصروف رہنا سب کو خوف زدہ رکھے گا۔ بعض مفسرین نے اس سے جن و شیاطین کے لشکر مراد لیے ہیں، تمھاری تیاری کی بدولت وہ بھی دشمنوں کے دلوں میں لڑائی کے جذبات نہیں ابھار سکیں گے۔

❺ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ......: اس سے جہاد میں مال خرچ کرنے کی ترغیب مقصود ہے۔ فی سبیل اللہ خرچ کی فضیلت کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۱)۔

آیت 61 وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا......: بھرپور جنگی تیاری اور جہاد جاری رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دشمن صلح کی طرف مائل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے صلح کی طرف مائل ہونے والوں سے صلح کر لینے کا حکم دیا، کیونکہ اسلامی جہاد کا مقصد اللہ کے دین کا غلبہ ہے، ہر حال میں غیر مسلموں کو تہ تیغ کرنا نہیں، نہ انھیں زبردستی مسلمان بنانا ہے۔ اس صلح کے نتیجے میں بہت سی

وَ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡۤا اَنۡ یَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیۡۤ اَیَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۙ﴿۶۲﴾
وَ اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَ لٰكِنَّ
اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ عَزِیۡزٌ حَكِیۡمٌ ﴿۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۶۴﴾ ع

اور اگر وہ ارادہ کریں کہ تجھے دھوکا دیں تو بے شک تجھے اللہ ہی کافی ہے۔ وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی ﴿۶۲﴾ اور ان کے دلوں کے درمیان الفت ڈال دی، اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا ان کے دلوں کے درمیان الفت نہ ڈالتا اور لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی۔ بے شک وہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۳﴾ اے نبی! تجھے اللہ کافی ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیرے پیچھے چلے ہیں ﴿۶۴﴾

دینی اور دنیوی برکات حاصل ہوں گی، مسلمانوں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے کفار اسلام سے واقف ہوں گے، اسلام کی اشاعت بڑھے گی، جس کا نتیجہ اسلام کا غلبہ ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔ بعض اوقات جزیے پر صلح ہوگی جو مسلمانوں کی مالی قوت میں اضافے کا باعث ہوگی اور دنیا میں جنگ کے ماحول کے بجائے امن و اطمینان کا دور دورہ ہوگا جو صرف اسلام کے غلبے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ محض ہمت ہار کر بزدلی کی وجہ سے خود دشمن کو صلح کی پیش کش اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ دیکھیے سورۂ محمد (۳۵) صلح کی صورت میں کفار کی عہد شکنی یا سازشوں کے خطرے کی پروا نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھیں، وہ سب کچھ سن رہا ہے، دیکھ رہا ہے۔

آیت 63،62 **وَ اِنۡ یُّرِیۡدُوۡۤا اَنۡ یَّخۡدَعُوۡكَ ......** : اس جملے میں پچھلی آیت کے جملے ''**وَ تَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ**'' کی مزید تفصیل و تاکید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یقین دلایا کہ اگر ان کے ارادے میں فتور بھی ہے تب بھی آپ فکر نہ کریں، آپ کو اللہ تعالیٰ ہر طرح کافی ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ اس نے کس طرح اپنی خاص نصرت کے ساتھ آپ کو قوت بخشی، اہل ایمان ساتھی عطا کیے، ان کی باہمی عداوتیں، جو آپ کے پوری زمین کی ہر چیز خرچ کرنے پر بھی دور نہیں ہو سکتی تھیں، اس نے اپنے خاص فضل سے دور کر کے ایمان کی بدولت ان کے دلوں میں الفت و محبت ڈال دی اور انھیں یک جان کر کے آپ کی پشت پر کھڑا کر دیا۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے، مگر اس کا غلبہ اندھے کی لاٹھی نہیں، وہ کمال درجے کی حکمت بھی رکھتا ہے، اس لیے تم صرف اسی پر بھروسا رکھو۔

آیت 64 **یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ ......** : اوپر فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کافی ہے، اس سے شاید کوئی خیال کرتا کہ اللہ تعالیٰ کی تائید صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، اس لیے یہاں دوبارہ اس جملے کو لا کر ساتھ مومنین کا بھی اضافہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پیروی کرنے والے تمام مومنوں کو کافی ہے۔ ''**وَ مَنِ اتَّبَعَكَ**'' میں واؤ کا عطف ''**حَسۡبُكَ**'' کے کاف پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تجھے اور تیرے پیچھے چلنے والے مومنوں کو کافی ہے۔ یہ واؤ بمعنی ''مَعَ'' بھی ہو سکتی ہے، یعنی اللہ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

اے نبی! ایمان والوں کو لڑائی پر ابھار، اگر تم میں سے بیس صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو ان ہزار پر غالب آئیں گے جنھوں نے کفر کیا۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ﴿۶۵﴾

تعالیٰ آپ کو مع آپ کے ساتھیوں کے سب کو کافی ہے۔ بعض لوگوں نے اس واؤ کا عطف لفظ "اللّٰہ" پر ڈالا ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ تجھے اللہ کافی ہے اور وہ مومن کافی ہیں جو تیرے پیروکار ہیں، مگر یہ عطف اور ترجمہ سراسر غلط ہے، کیونکہ پورے قرآن و حدیث میں صرف اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنے اور اسی کو کافی سمجھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کا حکم ہے، فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ ......﴾ توکل کا یہ حکم "الْمُؤْمِنُوْنَ" اور "الْمُتَوَكِّلُوْنَ" کے الفاظ کے ساتھ ۹ جگہ ہے اور فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [المائدۃ : ۲۳] ''اور صرف اللہ پر بھروسا کرو، اگر تم مومن ہو۔'' مخلوق تو خود اپنے لیے کافی نہیں، وہ دوسروں کو کیا کفایت کرے گی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ ایسے مواقع پر ایک شعر لکھا کرتے تھے ؎

سنبھلتا نہیں جن سے اپنا دوپٹا   سنبھالیں گے کیا وہ کلیجہ کسی کا

ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں پھینکے جانے کے وقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے احد کے بعد کفار کے جمع ہو کر دوبارہ حملہ آور ہونے کے موقع پر ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران : ۱۷۳] کہا۔ [بخاری، التفسیر، سورۃ آل عمران : ۴۵۶۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ اور میرے ساتھی کافی ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ [التوبۃ : ۱۲۹] ''پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔'' بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [آل عمران : ۱۶۰] ''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمھارا ساتھ چھوڑ دے تو وہ کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کرے گا؟ اور اللہ ہی پر پھر لازم ہے کہ مومن بھروسا رکھیں۔''

آیت 65 ① حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ...... : ''تحریض'' کا معنی خوب رغبت دلا کر کسی کام پر ابھار دینا ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں جہاد کا ذکر تقریباً سات پاروں کے برابر بنتا ہے۔ کتب احادیث میں کتاب الجہاد اس

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

اب اللہ نے تم سے (بوجھ) ہلکا کر دیا اور جان لیا کہ یقیناً تم میں کچھ کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں سے ہزار ہوں تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۶۶﴾

کے فضائل سے بھری ہوئی ہیں۔ یہاں بیس مسلمانوں کو کفار کے دو سو آدمیوں پر غالب آنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مگر یہ حکم خبر کی صورت میں ہے، کیونکہ یہ بات معروف ہے کہ حکم بہت تاکید کے ساتھ دینا ہو تو وہ خبر کے الفاظ میں دیا جاتا ہے، مثلاً یہ کہنا ہو ''سب لوگ نماز کے لیے مسجد میں جائیں'' تو کہا جاتا ہے ''سب لوگ مسجد میں جائیں گے۔'' یہاں بیس مسلمانوں کو کفار کے دو سو آدمیوں پر غالب آنے کا حکم دیا جا رہا ہے مگر خبر کے الفاظ میں کہ اگر تم میں سے بیس صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے، مراد یہ ہے کہ غالب آئیں۔ اس کی دلیل اگلی آیت ہے کہ اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے، سو اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔ مراد یہ ہے کہ دو سو پر غالب آئیں، ظاہر ہے کہ تخفیف امر (حکم) میں ہوتی ہے، خبر میں نہیں۔ ان آیات میں خوش خبری بھی ہے مگر ایمان اور صبر کی شرط کے ساتھ۔

2 بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ: یعنی سمجھ سے کام نہیں لیتے، نہ ثواب یا شہادت کے حصول کی نیت ہوتی ہے، نہ عذاب سے بچنے کی، نہ ہی وہ کسی پائدار اور دائمی مقصد کے لیے لڑتے ہیں، اس لیے ان میں وہ جذبہ اور اخلاقی قوت موجود نہیں ہوتی جو انھیں میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنے کا حوصلہ عطا کرے، لہٰذا یہ ان سرفروش مجاہدین کا کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں جن کی بڑی تمنا شہادت کی فضیلت حاصل کرنا ہے؟

3 بیس کے دو سو پر غالب آنے کے بعد سو کے ہزار پر غالب آنے کے بیان میں یہ حکمت ہے کہ لشکر چھوٹا ہو یا بڑا، ہر ایک کو یہ حکم ہے اور ہر ایک سے نصرت کا وعدہ ہے۔

آیت 66 اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ ......: اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب گزشتہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں کو اپنے سے دس گنا کفار کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کا حکم دشوار معلوم ہوا، پھر تخفیف کا حکم آ گیا اور اپنے سے دوگنا کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا واجب اور بھاگنا حرام قرار دے دیا گیا۔ [بخاري، التفسير، سورة الأنفال، باب : ﴿ الآن خفف الله عنكم ...... ﴾ : ٤٦٥٣] اگر کفار دوگنا سے زیادہ ہوں تو بھاگنا گناہ نہیں، لیکن لڑنا اور جمے رہنا بہر حال افضل ہے، جیسا کہ عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین کے عہد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ (ابن کثیر، قرطبی) اس آیت میں یہ خوش خبری بھی ہے کہ مسلمانوں کے لشکر ہزاروں تک جائیں گے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۶۷﴾

آیت 67 مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى ...... : کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ وہ قیدی بنائے، پھر انھیں قید رکھے یا احسان کرے یا فدیہ لے، جب تک میدانِ جنگ میں خوب خون ریزی کے بعد کفر کی کمر نہ ٹوٹ جائے اور وہ دوبارہ مقابلے کے قابل نہ رہ جائیں، اس کے بعد قیدی بنانے میں کوئی حرج نہیں، لیکن مسلمانو! تم نے بدر میں قیدی بنانے میں جلدی سے کام لیا، تم فدیے کی صورت میں دنیا کا سامان چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اعلائے کلمۃ اللہ کے ذریعے سے آخرت کے ثواب کا ارادہ رکھتا تھا اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے، تمھارا یہ عمل عزت و حکمت کے مطابق نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ﴾ [محمد : ٤] ''تو جب ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب انھیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو) مضبوط باندھ لو۔''

سن ۲ ہجری غزوۂ بدر میں قیدی بنانے میں عجلت کے بعد دوسری فرو گزاشت یہ ہوئی کہ قیدیوں کا فیصلہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا، کیونکہ اس وقت فدیہ لینے کے بجائے انھیں قتل کرنے سے کفر کی کمر مزید ٹوٹتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سمیت تمام مسلمانوں پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ (جنگ بدر میں) جب قیدی گرفتار کر لیے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا کہ ان قیدیوں کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے نبی! یہ ہمارے چچا زاد بھائی اور خاندان ہی کے لوگ ہیں، سو میری رائے تو یہ ہے کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے، تاکہ (اس رقم سے) کفار کے مقابلے میں قوت حاصل ہو اور کیا عجب کہ اللہ انھیں اسلام کی ہدایت دے دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابن خطاب! تمھاری کیا رائے ہے؟'' عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے کہا، اے اللہ کے رسول! میری رائے ابو بکر کی رائے کے مطابق نہیں ہے، میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کیجیے، تاکہ ہم ان کی گردنیں اڑا دیں۔ عقیل کو علی کے حوالے کیجیے، تاکہ وہ اس کی گردن اڑائیں اور میرے حوالے فلاں کو کیجیے، تاکہ میں اس کی گردن اڑاؤں، اس لیے کہ یہ لوگ کفر کے سرغنے اور اس کے سردار ہیں۔ (اکثر مسلمانوں کی رائے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق تھی، کچھ مالی فائدے کے پیش نظر اور کچھ انسانی اور رشتہ داری کی محبت کی وجہ سے) نبی ﷺ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے اختیار فرمائی اور میری رائے اختیار نہیں کی، پھر جب دوسرے دن کی صبح ہوئی، میں آیا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! مجھے بھی بتائیے آپ اور آپ کے دوست کیوں رو رہے ہیں، تاکہ اگر مجھے رونا آئے تو میں بھی روؤں، ورنہ کم از کم آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے رونے

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۹﴾ ع

اگر اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی بات نہ ہوتی، جو پہلے طے ہو چکی تو جو کچھ تم نے لیا اس کی وجہ سے تمھیں بہت بڑا عذاب پہنچتا ﴿۶۸﴾ سو اس میں سے کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی، اس حال میں کہ حلال، طیب ہے اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۶۹﴾

والی صورت ہی بنا لوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس فیصلے کے مشورے کی وجہ سے رو رہا ہوں جو تمھارے ساتھیوں نے قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے متعلق دیا تھا، اب میرے سامنے ان کا عذاب پیش کیا گیا جو اس درخت سے بھی قریب تھا۔'' اور آپ کے قریب ایک درخت تھا۔'' اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ﴾ [الأنفال : ٦٧ تا ٦٩] [مسلم، الجهاد، باب الإمداد بالملائكة في غزوة بدر …… : ١٧٦٣] علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام اترے اور آپ ﷺ سے کہا کہ اپنے ساتھیوں کو بدر کے قیدیوں کے متعلق اختیار دیں کہ انھیں قتل کر دیں یا فدیہ لے لیں، اس شرط پر کہ ان میں سے آئندہ اتنے ہی قتل کیے جائیں گے۔ انھوں نے فدیہ لینا اور آئندہ اپنے آدمیوں کی شہادت اختیار کی۔ [ترمذي، السير، باب ما جاء في قتل الأسارى و الفداء : ١٥٦٧ وقال الألباني صحيح] یہ صورت چونکہ بہتر نہ تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر عتاب فرمایا۔

آیت 68 لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ …… : یہاں ''اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب'' سے مراد کئی باتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اگر اس امت کے لیے غنیمت حلال نہ کر دی گئی ہوتی، جیسا کہ بخاری کی حدیث (۳۳۵) « وَ اُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ » (اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئیں) سے معلوم ہوتا ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو پسند فرمایا۔ دوسری یہ کہ بدر میں جو صحابہ شریک ہوئے ان کے گناہ بخشے جا چکے وغیرہ۔ (ابن کثیر، فتح القدیر) بعض اہل علم نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا وجود عذاب نازل ہونے سے مانع تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ﴾ [الأنفال : ٣٣] ''اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ انھیں عذاب دے جب کہ تو ان میں ہو۔'' شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''وہ بات یہ لکھ چکا کہ ان قیدی لوگوں میں بہت سوں کی قسمت تھی مسلمان ہونا۔'' (موضح) الغرض اگر یہ باتیں پہلے نہ لکھی جا چکی ہوتیں تو تم پر عذاب نازل ہو جاتا۔

آیت 69 فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا …… : اللہ تعالیٰ کے ناراضگی کے اظہار سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ فدیے کا مال لینا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس شبے کو دور فرمایا کہ یہ بھی مال غنیمت ہے اور اس امت کے لیے حلال اور طیب ہے، سوائے کسی شک و شبہ کے بغیر کھاؤ۔ اس سے ''لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ'' کی تفسیر ''اس امت کے لیے غنیمت حلال ہونے''

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

اے نبی! تمھارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دے اگر اللہ تمھارے دلوں میں کوئی بھلائی معلوم کرے گا تو تمھیں اس سے بہتر دے دے گا جو تم سے لیا گیا اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے (۷۰) اور اگر وہ تجھ سے خیانت کا ارادہ کریں تو بے شک وہ اس سے پہلے اللہ سے خیانت کر چکے ہیں، تو اس نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے (۷۱)

کے قول کو تقویت ملتی ہے۔ "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" البتہ یہ اصل مقصود نہیں، بلکہ اصل مقصود اللہ کا تقویٰ ہے، اسے اختیار کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ بے حد بخشنے والا نہایت مہربان ہے۔

آیت 70 قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ...... : جب بدر کے قیدی لائے گئے تو بعض نے اسلام کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے مجبور کیے جانے پر جنگ میں شرکت کی تھی، ان میں عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کو فدیے کی معافی نہیں دی گئی، بلکہ دل سے مسلمان ہونے کی صورت میں لیے گئے فدیے سے بہتر عطا اور مغفرت کا وعدہ کیا گیا۔ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم! یہ آیت میرے بارے میں اتری، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اسلام لانے کی خبر دی اور درخواست کی کہ مجھ سے جو بیس اوقیہ فدیہ لیا گیا ہے اس کے بدلے میں مجھے کچھ دیں، تو آپ نے مجھے ان کے بدلے میں بیس غلام دیے جو سب میرے مال سے میرے لیے تجارت کر رہے ہیں، اس کے ساتھ میں اللہ جل ذکرہٗ سے مغفرت کی بھی امید رکھتا ہوں۔" [مسند إسحاق بن راهويه۔ تفسير طبري۔ طبراني وغيرهم] "الاستيعاب في بيان الأسباب" میں بہت سے حوالے دے کر اسے حسن کہا گیا ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بھتیجے عقیل کا فدیہ بھی اپنے پاس سے دیا تھا۔ [بخاري، الجهاد والسير، باب فداء المشركين : ۳۰۴۹]

آیت 71 وَ اِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ ...... : یعنی اگر وہ اسلام کا دعویٰ یا آئندہ آپ سے نہ لڑنے کا وعدہ صرف رہائی اور آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں اور ان کے دل میں کھوٹ ہے، تو پہلے انھوں نے اللہ کے ساتھ شرک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کی خیانت کر کے کیا حاصل کر لیا، یہی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر قابو عطا فرمایا، اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوش خبری اور قیدیوں کے لیے وعید ہے۔ "فَاَمْكَنَ" کا مفعول محذوف ہے، یعنی "أَمْكَنَكَ مِنْهُمْ" کہ اس نے آپ کو ان پر قابو دے دیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، یہ لوگ! ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تمھارے لیے ان کی دوستی میں سے کچھ بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۷۲﴾

آیت 72 ① سورۂ انفال کے آخر میں ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمان چار قسم کے تھے، پہلے وہ جو پہلی ہجرت کرنے والے مہاجرین اولین ہیں، دوسرے انصار مدینہ، تیسرے وہ مومن جنھوں نے ہجرت نہیں کی اور چوتھے وہ جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی۔

② اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا ...... : ان سے مراد اولین مہاجر ہیں جو سب سے افضل ہیں۔

③ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا : یہ انصار ہیں، ان کی فضیلت بھی بے شمار ہے، مگر اس بات پر اتفاق ہے کہ مہاجرین انصار سے افضل ہیں۔ عبد اللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اگر ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ایک شخص ہوتا۔“ [بخاري، المغازي، باب غزوة الطائف...... : ۴۳۳۰]

④ اُولٰٓىِٕكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ : ”اَوْلِيَآءُ“ سے مراد دوست، حمایتی اور مددگار بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے وارث بھی۔ دوسرے مفہوم کے مطابق اشارہ ہوگا اس مؤاخات (بھائی چارے) کی طرف جو رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مہاجرین و انصار کے درمیان قائم کیا، جس کی بنا پر جاہلیت کے رواج کے مطابق آپس میں بھائی بننے والے ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے، یہاں تک کہ میراث کی آیت: ﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال : ۷۵] نازل ہوئی تو یہ طریقہ منسوخ ہو گیا۔

⑤ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا : یہ اس عہد کے مسلمانوں کی تیسری قسم ہے۔ دار الاسلام قائم ہونے کے باوجود اس کی طرف ہجرت نہ کرنے اور کفار کی غلامی میں رہنے پر قناعت کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان کچا ہے، یہ لوگ جہاد میں حصہ لے ہی نہیں سکتے، اس لیے ان کے ساتھ پہلے دو فریقوں جیسی دوستی اور حمایت کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی، جب تک ہجرت نہ کریں۔

⑥ وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ ...... : مثلاً کافر ان پر ظلم کر رہے ہوں اور وہ تم سے مدد مانگیں تو تم پر انھیں ظالموں کے پنجے سے

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾
وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓىِٕكَ هُمُ

اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا﴿۷۳﴾
اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی

چھڑانا فرض ہے، فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا﴾ [النساء : ٧٥] ''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں۔''

⑦ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ: یعنی اگر تمھارا کفار سے کوئی معاہدہ ہو کہ آپس میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے تو تم معاہدے کو پس پشت ڈالتے ہوئے ان کی مدد نہیں کر سکتے، بلکہ ان مسلمانوں سے یہی کہا جائے گا کہ ''دارالکفر'' کو چھوڑ کر ''دارالاسلام'' میں چلے آئیں۔

آیت 73 ① وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: یعنی کافر آپس میں خواہ جتنی بھی دشمنی رکھتے ہوں تمھارے خلاف سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں۔ کافر، کافر ہی کا دوست ہے، مسلمان کا نہیں، اس لیے مسلمان اور کافر کا آپس میں موالات (دوستی، حمایت اور مدد) کا رشتہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔

② اِلَّا تَفْعَلُوْهُ: یعنی اگر تم آپس میں محبت، حمایت اور نصرت نہیں کرو گے اور کفار سے ترک موالات نہیں کرو گے، یعنی ان کے ساتھ باہمی محبت، تعاون اور ایک دوسرے کا وارث بننا نہیں چھوڑو گے اور قطع تعلق نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان کافر کا وارث نہیں بنتا، نہ کافر مسلمان کا وارث بنتا ہے۔'' [بخاری، الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر ...... : ٦٧٦٤۔ مسلم : ١٦١٤]

③ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ: یعنی مسلمانوں کے راز افشا ہوتے رہیں گے، آئے دن جنگ رہے گی، کفار کے خلاف مسلمانوں کے یک جان نہ ہونے سے اسلام اور مسلمان کمزور ہوں گے، ان کا رعب جاتا رہے گا، کفار غالب آئیں گے، تو ان کے ساتھ رہنے والے مسلمان مجبوراً مرتد ہو جائیں گے، یا ان کے رسوم و رواج، عقائد اور اعمال قبول کریں گے، یا ان پر خاموش رہیں گے، یا شدید آزمائش کا شکار ہوں گے۔ غرض کفار کے غلبے اور ان کے ساتھ رہ کر ان کی غلامی پر قناعت یا ان سے دوستی کی صورت میں اللہ کی زمین پر امن کسی صورت قائم نہیں رہ سکتا، بلکہ ہر طرف فتنہ و فساد، جنگ و جدل، شرک و کفر، بے حیائی اور بدکاری ہی کا دور دورہ ہوگا۔

آیت 74 وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا...... : اس آیت میں مسلمانوں کے پہلے دو گروہوں، یعنی مہاجرین اولین اور

الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

وہی سچے مومن ہیں، انھی کے لیے بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے ﴿۷۴﴾ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا تو وہ تم ہی سے ہیں، اور رشتے دار اللہ کی کتاب میں، ان کے بعض، بعض کے زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۷۵﴾

انصار کی تعریف فرمائی ہے، کیونکہ پہلے ان کا ذکر باہمی دوستی اور تعاون کی تاکید کے لیے تھا۔ اس آیت میں ان کی تعریف تین طرح سے کی ہے، پہلا تو یہ کہ یہ لوگ ایمان، ہجرت، جہاد اور اہل ایمان کو جگہ دینے اور نصرت کی وجہ سے پکے مومن ہیں، بخلاف ان کے جو ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی، جس کی وجہ ان کے ایمان کی خامی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۹۷) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مہاجرین و انصار کے لیے ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ﴾ بہت بڑی سند ہے۔ دوسرا ان کے لیے عظیم مغفرت اور بخشش ہے۔ "مَغْفِرَةٌ" میں تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ تیسرا یہ کہ ان کے لیے رزق کریم ہے، اس میں جنت کی بے شمار نعمتوں کے ساتھ دنیا میں باعزت روزی کا وعدہ ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں عزت کی روزی سے مراد مال غنیمت اور فے ہے، جو خالص ان لوگوں کا حق ہے جو سردار کے ساتھ شریک جنگ ہوں۔ (موضح)

آیت 75 ① وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ...... : اس آیت میں مسلمانوں کے چوتھے گروہ کا ذکر ہے جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد یا بدر کے بعد، جب اسلام ایک طاقت بن گیا، ایمان لا کر ہجرت کی، یہ لوگ بھی مہاجرین اولین اور انصار کے ساتھی شمار ہوں گے، اگرچہ سبقت کی وجہ سے پہلوں کا درجہ ان سے مقدم ہے، فرمایا: ﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ [الواقعۃ : ۱۰] "اور جو پہل کرنے والے ہیں، وہی آگے بڑھنے والے ہیں۔" مگر بخاری (۶۱۶۸) اور مسلم (۲۶۴۰) کی حدیث ((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ)) (قیامت کے دن انسان اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت اور دوستی رہی ہے) کی رو سے ان کا شمار انھی میں ہوگا۔ [فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ]

② وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ: یعنی اب آئندہ سے میراث دینی بھائی چارے کی بنا پر نہیں بلکہ رشتہ داری کی بنا پر تقسیم ہوگی، کیونکہ ایمان، ہجرت اور جہاد کے ساتھ ساتھ رشتہ داری ان کے قرب کی ایک زائد وجہ ہے۔ اس سے وہ طریقہ منسوخ ہو گیا جس میں مہاجرین و انصار ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے۔ (ابن کثیر)

③ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ : وہی جانتا ہے کہ کس کا حق پہلے اور کس کا بعد میں ہے، لہٰذا اس کے تمام احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں۔

بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖۤ اِلَی الَّذِیْنَ عٰھَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۱

اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکوں کی طرف بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا ①

یہ پوری کی پوری سورت مدنی ہے جو فتح مکہ کے بعد ۹ھ میں نازل ہوئی۔ چونکہ سورۂ توبہ اور انفال میں ذکر ہونے والے واقعات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اس لیے ان دونوں سورتوں کو ایک سورت کے حکم میں رکھا گیا ہے اور ان دونوں کے درمیان ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھی گئی اور یہ سبع طوال (سات لمبی سورتوں) میں سے ساتویں سورت ہے، جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ أَخَذَ السَّبْعَ الْأُوَلَ مِنَ الْقُرْآنِ فَهُوَ حَبْرٌ)) ''جس نے قرآن مجید کی یہ پہلی سات سورتیں حاصل کر لیں وہ بہت بڑا عالم بن گیا۔'' [أحمد : ٦/ ٨٢، ح : ٢٤٥٨٥، عن عائشة رضی اللہ عنہا]

اس کے کئی نام ہیں جن میں سے ایک ''توبہ'' اور دوسرا ''براءۃ'' ہے۔ ''توبہ'' اس اعتبار سے کہ اس میں ایک مقام پر بعض اہل ایمان کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے اور ''براءۃ'' اس لحاظ سے کہ اس کے شروع میں مشرکین سے براءت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو ''سورۃ الفاضحہ'' یعنی (منافقوں کو) رسوا کرنے والی سورت بھی کہتے ہیں۔ اس سورت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھی جاتی، مفسرین نے اس کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں، مثلاً یہ کہ اس میں مشرکین سے قطع تعلق اور مسلمان نہ ہونے کی صورت میں ان کے قتل کا حکم ہے اور اہل کتاب کے مسلمان نہ ہونے یا جزیہ نہ دینے کی صورت میں ان سے مسلسل لڑتے رہنے کا حکم ہے وغیرہ، مگر سب سے معقول اور سیدھی سادھی بات یہ ہے کہ چونکہ نبی ﷺ نے اس کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' نہیں لکھوائی، اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں لکھی۔

آیت 1 بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖۤ......: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان تمام معاہدوں کی تنسیخ کا اعلان فرمایا ہے جو مسلمانوں نے مشرکوں سے کیے تھے۔ منسوخ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مشرکین ان عہد ناموں کو بار بار توڑ دیتے تھے اور ان کی شرائط کو پورا نہیں کرتے تھے، خصوصاً جب آپ ﷺ فتح مکہ کے بعد تبوک گئے تو کفار نے سمجھا کہ مسلمان رومیوں کی طاقت کے مقابلے میں فنا ہو جائیں گے، اس لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے کیے ہوئے کسی عہد کا لحاظ رکھا نہ باہمی رشتہ داری کا، فرمایا: ﴿ لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّۃً ﴾ [التوبة : ١٠] ''یہ لوگ کسی مومن کے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کا۔'' اور فرمایا: ﴿ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّکَثُوْۤا اَیْمَانَھُمْ ﴾ [التوبة : ١٣] ''کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں۔'' مگر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم دیکھو کہ ان مشرکین کو اچانک حملہ کر کے برباد کرنے کے بجائے پہلے تمام عہد منسوخ کرنے کا اعلان دنیا کے سب سے بڑے مجمع میں کیا گیا۔ ۹ھ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیر امارت حج کے دن دس ذوالحجہ یوم نحر کو میدانِ منیٰ میں دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کی موجودگی میں اعلان ہوا اور کئی آدمی

فَسِيحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٣

تو اس سرزمین میں چار ماہ چلو پھرو اور جان لو کہ بے شک تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ۲ اور اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کی طرف صاف اعلان ہے کہ اللہ مشرکوں سے بری ہے اور اس کا رسول بھی۔ پس اگر تم توبہ کرلو تو وہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر منہ موڑو تو جان لو کہ یقیناً تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں اور جنھوں نے کفر کیا انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دے ۳

مقرر کیے گئے، جنھوں نے اس مجمع کے ہر مقام پر پہنچ کر بلند آواز کے ساتھ یہ اعلان کیا۔ اس سال رسول اللہ ﷺ کے خود حج پر نہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس اعلان کے بعد ہی مکہ میں مشرکوں کا داخلہ بند ہوا اور ان کی بے حیائی کی رسمیں ختم ہوئیں۔

آیت 2 ① فَسِيحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ : یہ اللہ تعالیٰ کا مزید کرم تھا کہ مشرکین کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے چار ماہ کی مہلت دی گئی، جس کی ابتدا ۱۰ ذوالحجہ یوم النحر سے ہوئی، کیونکہ اس دن یہ اعلان کیا گیا اور ۱۰ ربیع الثانی کو یہ مدت ختم ہوگئی۔ اس مہلت کا مقصد یہ تھا کہ وہ اتنی مدت میں اپنے بارے میں خوب سوچ سمجھ لیں، پھر یا تو مسلمان ہو جائیں یا سرزمین عرب سے باہر کسی ملک میں اپنا ٹھکانا بنالیں۔ اگر وہ اس کے بعد بھی باقی رہیں تو انھیں پکڑ کر، گھیر کر، گھات لگا کر جیسے بھی ممکن ہو قتل کر دیا جائے۔ یہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے لیے تھی جن سے معاہدے کی مدت چار ماہ سے کم باقی تھی، یا معاہدہ تو زیادہ مدت کا تھا مگر انھوں نے اس کی خلاف ورزی کی تھی، یا مدت کے تعین کے بغیر معاہدہ تھا، البتہ وہ قبائل جن سے کسی خاص مدت تک معاہدہ تھا اور انھوں نے معاہدے کی کسی قسم کی مخالفت بھی نہ کی تھی ان کا عہد ان کی مدت تک پورے کرنے کا حکم دیا گیا، فرمایا: ﴿ فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ﴾ [التوبة : ٤] ”تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو۔“

② وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ...... : مشرکوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ مہلت مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے نہیں دی گئی بلکہ اس میں کئی حکمتیں ہیں، ورنہ تم لوگ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں، اگر تم کفر پر قائم رہے تو خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ذلیل و رسوا کرنے والا ہے۔ دیکھیے سورۂ انفال کی آیت (۵۹) کے حواشی۔ غرض صرف بیت اللہ ہی نہیں پورے جزیرۂ عرب کو مشرکین کے نجس وجود سے پاک کر دیا گیا۔

آیت 3 ① وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ ...... : یوم حج اکبر سے مراد ۱۰ ذوالحجہ ہے، جس دن حاجی منیٰ میں

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝۴ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ

مگر مشرکوں میں سے وہ لوگ جن سے تم نے عہد کیا، پھر انھوں نے تم سے عہد میں کچھ کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ متقی لوگوں سے محبت کرتا ہے ④ پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان

آ کر قربانی کرتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے ان لوگوں کے ہمراہ بھیجا جو قربانی کے دن منیٰ میں اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی ننگا شخص بیت اللہ کا طواف نہیں کرے گا اور حج اکبر کا دن یوم النحر (قربانی کا دن) ہے، کیونکہ لوگ (عمرے کو) حج اصغر کہتے تھے، چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سال صاف اعلان کروا دیا، تو حجۃ الوداع جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کیا، کسی مشرک نے حج نہیں کیا۔ [بخاري، الجزية و الموادعة، باب كيف ينبذ إلى أهل العهد ؟ : ٣١٧٧]

اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو اس حج کو حجِ اکبر کہتے ہیں جو جمعہ کے دن آئے ان کی بات درست نہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے ایک روایت میں مزید اضافہ ہے کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو یہ اعلان دے کر بھیجا، پھر آپ نے ان کے بعد علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) یہ اعلان کریں، چنانچہ ابو بکر رضی اللہ عنہ، جو امیر حج تھے، ان کے حکم پر میں نے، میرے ساتھیوں نے اور علی رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں یہ اعلان کیا۔ [بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ و أذان من الله ...... ﴾ : ٤٦٥٦] مسند احمد میں ہے کہ چار ماہ کی مہلت دینے، ننگے کو طواف کی اجازت ختم کرنے اور آئندہ سال کسی مشرک کے حج نہ کرنے کے اعلان کے ساتھ ایک اعلان یہ بھی کرتے تھے کہ جنت میں ایمان والوں کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا۔ [أحمد : ٢٩٩/٢، ح : ٧٩٩٦]

② وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا ...... : یہ اعلان تاکید کے لیے دوبارہ کیا گیا، تاکہ کافر اپنے آپ کو اللہ کی پکڑ سے کسی طرح بھی بچ نکلنے والے نہ سمجھیں۔

آیت 4 اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ...... : یعنی معاہدوں کی پاس داری میں کوئی کمی نہ کرنے والے مشرکوں کے لیے چار ماہ کی مہلت نہیں بلکہ ان کے لیے معاہدے کی طے کردہ مدت پوری کرو، کیونکہ تقوے کا تقاضا عہد پورا کرنا ہے اور اللہ متقین سے محبت رکھتا ہے۔

آیت 5 ① فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ ...... : ان چار مہینوں سے مراد ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۰ ربیع الثانی تک کے ایام ہیں۔ بعض لوگوں نے اس سے معروف حرمت والے مہینے مراد لیے ہیں، یعنی رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ ۱۰ ذوالحجہ کو اعلان براءت ہو تو محرم ختم ہونے تک کل پچاس دن بنتے ہیں، اس لیے حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے ۱۰ ذوالحجہ سے ۱۰ ربیع الثانی

فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَيۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡهُمۡ وَخُذُوۡهُمۡ وَاحۡصُرُوۡهُمۡ وَاقۡعُدُوۡا لَهُمۡ كُلَّ مَرۡصَدٍ ۚ

فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوۡا سَبِيۡلَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۵

کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ۝۵

تک ہی چار ماہ مراد لیے ہیں اور انھیں ”اَلْاَشْهُرُ الْحُرُمُ“ اس لیے کہا گیا کہ اس مہلت میں مشرکین کا قتل حرام کر دیا گیا، یہی تفسیر درست ہے۔

❷ كُلَّ مَرْصَدٍ: گھات کی جگہ سے مراد وہ راستہ یا جگہ ہے جہاں سے دشمن کے گزرنے کی توقع ہو اور جہاں سے اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کرنا ممکن ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین سے صرف میدانِ جنگ میں لڑنا ہی کافی نہیں، بلکہ جس طریقے سے بھی تم ان پر قابو پا کر انھیں قتل کر سکتے ہو ضرور کرو۔

❸ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ...... : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جن سے وعدہ ٹھہر گیا تھا اور دغا ان سے نہ دیکھی ان کی صلح قائم رہی اور جن سے کچھ وعدہ نہ تھا ان کو فرصت ملی چار مہینے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دل کی خبر اللہ کو ہے، ظاہر میں جو مسلمان ہو وہ سب کے برابر امان میں ہے اور ظاہر مسلمانی کی حد ٹھہرائی ایمان لانا، کفر سے توبہ کرنا اور نماز اور زکوٰۃ۔ اس واسطے جب کوئی شخص نماز چھوڑ دے تو اس سے امان اٹھ گئی۔“ (موضح) یہی وہ حکم ہے جس کی بنا پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کے منکرین سے جنگ کی اور فرمایا کہ میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑائی کروں، یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پھر جب وہ یہ (تین) کام کر لیں تو انھوں نے اپنے خون اور اپنے مال مجھ سے محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔“ [بخاري، الإيمان، باب : ﴿ فإن تابوا و أقاموا الصلاة...... ﴾ : ۲۵]

یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت میں آپ کے تمام احکام کی فرماں برداری کا اقرار آ جاتا ہے، اگر ان میں سے کسی حکم کا انکار کرے، جو عام سب کو معلوم ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے تو مرتد ٹھہرے گا اور اگر کسی حکم کا انکار تو نہ کرے مگر عمل نہ کر سکے تو گناہ گار مسلمان ہو گا، کافر نہیں ہو گا۔ البتہ مسلمان ہونے کی ظاہری نشانیاں وہ ہیں جو اوپر ذکر ہوئیں، ان کا صرف اقرار کرنا یا دل میں ماننا کافی نہیں، بلکہ ان پر عمل کرنا خون اور مال کی حفاظت کا ضامن ٹھہرایا گیا ہے۔

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پر پہنچا دے۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے ⑥ ان مشرکوں کا اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد کیسے ممکن ہے، سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا۔ سو جب تک وہ تمھارے لیے پوری طرح قائم رہیں تو تم ان کے لیے پوری طرح قائم رہو۔ بے شک اللہ متقی لوگوں سے محبت کرتا ہے ⑦

آیت 6 ① وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ...... : یعنی امن کی مدت گزرنے کے بعد اگر کوئی مشرک، جس سے تمھارا کوئی عہد نہیں، تم سے درخواست کرے کہ مجھے اپنے ہاں پناہ دو تو اسے پناہ دے دو، تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے اور اگر آیا ہی اسلام کو سمجھنے یا اپنے شبہات دور کرنے کے لیے ہے تو اسے بدرجۂ اولیٰ پناہ دینی چاہیے۔ اب اگر وہ اسلام لانے کے لیے آمادہ نہ ہو اور اپنے ٹھکانے پر واپس جانا چاہے تو تم اسے اس کے ٹھکانے پر پہنچا دو، کیونکہ ان لوگوں کو اسلام کی حقیقت معلوم نہیں، ممکن ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کی باتیں سن کر، ان کا معاشرہ اور اخلاق و کردار دیکھ کر مسلمان ہو جائیں، پھر جب وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے تو دوسرے مشرکین کی طرح اسے مارنا اور قتل کرنا جائز ہے، اس سے پہلے جائز نہیں۔ یہ حکم ہمیشہ کے لیے ہے اور کوئی بھی مسلمان ہو وہ کافر کو پناہ دے سکتا ہے، خواہ مسلمانوں میں اس کی حیثیت معمولی ہو اور تمام مسلمانوں پر یہ پناہ پوری کرنا لازم ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر ام ہانی رضی اللہ عنہا نے ایک مشرک کو پناہ دی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا: ''ہم نے اسے پناہ دی جسے تم نے پناہ دی، ہم نے اسے امان دی جسے تم نے امان دی۔'' [أبو داوٗد، الجهاد، باب في أمان المرأة : ۲۷۶۳۔ بخاری : ۳۵۷]

② حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کو پناہ دینے سے اصل مقصود دعوت دین، قرآن سنانا اور اسلام کا تعارف کروانا ہے، پھر اگر وہ مسلمان نہ ہوں تو انھیں جلدی رخصت کر دینا چاہیے، یہ نہیں کہ وہ اپنے اڈے بنا کر جاسوسی کریں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔

آیت 7 ① كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ...... : یعنی وہ لوگ جو ہیں ہی مشرک، جنھوں نے اپنے خالق کی توحید کا عہد ہی پورا نہیں کیا، ان کی طرف سے کوئی عہد پورا ہونا کیسے ممکن ہے، وہ تو جو عہد کرتے ہیں توڑ ڈالتے ہیں۔

كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ تَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾

کیسے ممکن ہے جبکہ وہ اگر تم پر غالب آ جائیں تو تمھارے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کریں گے اور نہ کسی عہد کا، تمھیں اپنے مونہوں سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے اور ان کے اکثر نافرمان ہیں ﴿۸﴾

② اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : ان سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر پہلے ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّ لَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ﴾ [التوبة : ٤] میں گزر چکا ہے۔ صلح حدیبیہ جو رسول اللہ ﷺ اور کفار قریش کے درمیان دس سال کے لیے قرار پائی، یہ صلح نامہ چونکہ حدود حرم کے اندر قرار پایا تھا، اس لیے اسے ”عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ فرما دیا۔ (ابن کثیر) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس عہد پر قائم رہے ان سے قتال مت کرو۔ اس معاہدے میں شرط یہ تھی کہ ایک دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوں گے اور نہ دوسرے کے خلاف کسی کی مدد کریں گے۔ اس معاہدے میں بنو خزاعہ مسلمانوں کے ساتھ شامل تھے اور بنو بکر قریش کے حلیف تھے، مگر کچھ عرصہ بعد بنو بکر اور بنو خزاعہ کے درمیان لڑائی چھڑ گئی اور مشرکین نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بنو خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی مدد کی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے رمضان ۸ ھ کو مکہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ (ابن کثیر) ابن جریر طبری نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد بنو بکر کے وہ قبائل ہیں جو صلح حدیبیہ والے اپنے عہد پر قائم رہے اور انھوں نے بنو خزاعہ پر نہ حملہ کیا، نہ اس میں مدد کی، کیونکہ ان آیات کے نزول کے وقت فتح مکہ کو ایک سال گزر چکا تھا، قریش کو ان کی بدعہدی کی سزا بھی مل چکی تھی۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”صلح والے تین قسم فرمائے، ایک جن سے مدت نہیں ٹھہری، ان کو جواب دیا (کہ تم کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے) مگر جو مکے کی صلح میں شامل تھے (تو) جب تک وہ دغا نہ کرے، یہ ادب ہے مکہ کا اور تیسرے جن سے مدت ٹھہری وہ صلح قائم رہی، لیکن آخر سب مشرک عرب کے ایمان لائے۔“ (موضح) ”اسْتَقَامُوْا“ میں حروف ”سین“ اور ”تا“ کی زیادتی کی وجہ سے ترجمہ ”پوری طرح قائم رہیں“ کیا گیا ہے۔

③ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ : اور عہد کا پورا کرنا بھی متقی ہونے کے لیے ضروری شرط ہے۔

آیت 8 كَيْفَ وَ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا ...... : مشرکین سے ”براءت“ کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے معاہدے کا کوئی اعتبار نہیں، یہ لوگ زبان سے دوستی اور وفاداری کی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور دل میں یہ ہے کہ اگر کبھی موقع مل جائے تو معاہدے کو پس پشت ڈال کر ان مسلمانوں کو کچا چبا ڈالیں۔ ” اَلْإِلُّ “ کے معنی عہد، حلف، قرابت سبھی آتے ہیں اور یہاں آگے ”ذِمَّةً“ (عہد) الگ ذکر ہونے کی وجہ سے قرابت مراد ہے۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹
لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۱۰ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا
الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۱۱

انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لے لی، پھر انھوں نے اس کے راستے سے روکا۔ بے شک یہ لوگ برا ہے جو کچھ کرتے رہے ہیں ⑨ وہ کسی مومن کے بارے میں نہ کسی قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ کسی عہد کا اور یہی لوگ حد سے گزرنے والے ہیں ⑩ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں، اور ہم ان لوگوں کے لیے آیات کھول کر بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں ⑪

آیت 9 اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا...... : یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی چند روزہ زندگی کے مفاد کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام کو رد کر دیا، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ خود اسلام نہیں لائے، بلکہ دوسروں کو بھی اسلام کی راہ اختیار کرنے سے روکتے رہے۔ (شوکانی)

آیت 10 ① لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً : ان کی مذمت کی تاکید کے لیے دوبارہ ان کے اس فعل بد کا تذکرہ فرمایا۔ بعض مفسرین نے پہلی آیات سے مراد تمام مشرکین اور ان آیات سے مراد یہود مدینہ لیے ہیں، کیونکہ اللہ کی کتاب انھی کے پاس تھی جس کی آیات پر عمل کر کے مسلمان ہونے کے بجائے وہ دنیا کے مفاد کو ترجیح دیتے تھے، اگرچہ اللہ کے احکام کو رد کر کے دنیا کے مفاد کو ترجیح دینا مشرکین و یہود سب کا وتیرہ ہے۔ اس صورت میں ”بِاٰيٰتِ اللّٰهِ“ سے مراد نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی آیات ہوں گی۔

② وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ : یعنی عہد شکنی اور زیادتی جب بھی ہوئی انھی کی طرف سے ہوئی۔

آیت 11 ① فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ...... : یعنی ایمانی اخوت، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات (۱۰) میں کیا ہے: ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ ”مومن تو سب بھائی ہی ہیں“ وہ ان تین چیزوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ ان تین چیزوں سے انھیں اسلامی معاشرے میں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہ جو فرمایا بھائی ہیں حکم شرع میں، اس میں سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہر میں مسلمان ہے اور دل سے یقین نہیں رکھتا تو چاہیے اسے حکم ظاہری میں مسلمان گنیں، مگر معتمد اور دوست نہ پکڑیں۔“ (موضح) یہ بات پہلے بھی گزری ہے یہاں مزید تاکید ہوگئی کہ نماز اور زکوٰۃ کا محض اقرار ہی اخوت دینی کے لیے کافی نہیں بلکہ عملاً ان کی ادائیگی امت مسلمہ میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے اور مسلمان حاکم پر لازم ہے کہ ان کی عدم ادائیگی پر باز پرس کرے اور سزا دے اور اگر وہ ان کی ادائیگی سے انکار یا انھیں مذاق کریں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرح انھیں مرتد قرار دے کر ان سے جنگ کی جائے۔

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمھارے دین میں طعن کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو۔ بے شک یہ لوگ، ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، تاکہ وہ باز آجائیں ﴿۱۲﴾

❷ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: جاننے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی نافرمانی کا انجام سمجھتے اور اس کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں، ایسے ہی لوگ ہیں جو اس کی آیات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

آیت 12 ❶ وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ ...... : یعنی جن لوگوں کی حالت یہ ہو کہ وہ نہ صرف تم سے معاہدہ کر کے اسے توڑتے ہوں بلکہ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے، اس میں طعن کرتے اور عیب نکالتے ہوں تو سمجھ لو کہ یہی "اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ" (کفر کے سردار) ہیں۔ ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں، لہٰذا تم ان لوگوں کو کسی قسم کا موقع دیے بغیر ان سے جنگ کرو، تاکہ تمھاری تلواروں کی کاٹ سے وہ اپنے کرتوتوں سے باز آجائیں۔ معلوم ہوا کہ دینِ اسلام پر طعن کرنے والا اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کرنے والا واجب القتل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ تمام کفار سے جنگ کی، مگر دین میں طعن، اسلام اور مسلمانوں کی توہین اور آپ ﷺ کی توہین کرنے والوں کے قتل کا خاص اہتمام فرمایا۔ کعب بن اشرف یہودی اور ابو رافع یہودی وغیرہ کو فدائی حملوں کے ذریعے سے قتل کروانے کے واقعات اس کی واضح مثالیں ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر بدزبانوں کا خون رائگاں قرار دینا بھی اس کی مثال ہے۔ کفار کی طرف سے عہد توڑنے کے بعد اگر ان سے جنگ نہ کی جائے تو یہ مسلمانوں کی طرف سے بے حد کمزوری کا اظہار اور انتہا درجے کی ذلت اور بے غیرتی ہوگی، اس لیے رسول اللہ ﷺ عہد توڑنے والوں سے درگزر نہیں فرماتے تھے، بلکہ فوراً انھیں ان کے انجام تک پہنچاتے تھے۔ بنو قریظہ اور اہلِ مکہ کے عہد توڑنے پر رسول اللہ ﷺ کی کارروائی اس کی روشن مثال ہے، مگر افسوس آج کفار کے اپنے تمام معاہدے توڑنے کے باوجود مسلمان حکام ان سے خوف زدہ اور خاموش ہیں۔

❷ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے کفار کے کسی عہد و پیمان کے معتبر نہ ہونے کا جو ذکر فرمایا یہ واقعی حقیقت ہے جس کا ثبوت نصرانیوں کا اندلس سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دینا ہے اور وہ سلوک بھی جو تاتاریوں نے مسلمانوں خصوصاً بغداد کے مسلمانوں کے ساتھ ۶۵۶ھ میں کیا اور جو کچھ ہندوؤں نے پاکستان آنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیا اور اب تک کشمیر اور بھارت کے مسلمانوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ روس اور دوسری کمیونسٹ ریاستوں نے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کے لیے کیا اور اب امریکہ، یورپ اور پورا عالم کفر جس طرح عراق، افغانستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ کر رہا ہے اور جھوٹے الزام گھڑ کر وہ تمام عہد جو اقوام متحدہ کے ذریعے سے کیے تھے، پس پشت ڈال کر اسلام اور مسلمانوں کو برباد کر رہا ہے، یہ سب کفار کے کسی عہد کے عہد نہ ہونے کی واضح مثالیں ہیں۔

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ وَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَ هُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ
اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝١٣ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ
وَ يُخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝١٤ۙ وَ يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ

کیا تم ان لوگوں سے نہ لڑو گے جنھوں نے اپنی قسمیں توڑ دیں اور رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انھوں نے ہی پہلی بار تم سے ابتدا کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو ⑬ ان سے لڑو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا ⑭ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے

آیت 13 ① اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ ...... : اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نہایت بلیغ طریقے سے کفار کے خلاف جنگ پر ابھارا ہے اور انھیں جوش اور غیرت دلائی ہے کہ جن لوگوں کے یہ جرائم ہیں کیا تم ان کے خلاف بھی نہیں لڑو گے؟ پھر ان کے تین جرم بیان فرمائے، پہلا یہ کہ انھوں نے اپنے عہد توڑ ڈالے اور وہ قسمیں بھی جو عہد پختہ کرنے کے لیے کھائی تھیں، صلح حدیبیہ ہو جانے کے بعد بھی وہ بنوخزاعہ کے خلاف (جو مسلمانوں کے حلیف تھے) بنوبکر کی پیٹھ ٹھونکتے اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی مدد کرتے رہے، حالانکہ ان کا ایسا کرنا صلح کے معاہدے کی صریح خلاف ورزی تھی۔ دوسرا یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو وہ آپ کے خلاف منصوبے سوچتے رہتے، جیسا کہ سورۂ انفال (۳۰) میں گزر چکا ہے کہ قتل، قید اور کم از کم یہ کہ آپ کو مکہ سے نکال دیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے کسی ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آپ ﷺ نے خود اللہ کے حکم سے ہجرت کی اور تیسرا یہ کہ پہلی بار لڑنے کی ابتدا انھوں نے کی کہ بدر کے موقع پر جب ان کا تجارتی قافلہ بچ گیا تھا تو انھوں نے واپس جانے کے بجائے خواہ مخواہ جنگ چھیڑی۔ اس کے بعد احد، خندق اور بنوخزاعہ کے خلاف جنگ کی ابتدا بھی انھوں نے کی۔ ان تینوں میں سے ہر جرم ہی ان سے لڑنے کا کافی سبب ہے، اب یہ تین سبب جمع ہونے پر بھی کیا تم ان سے نہیں لڑو گے؟

② اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ ...... : یہ بھی جنگ پر ابھارنے کا ایک زبردست طریقہ ہے کہ کسی کو کہا جائے کہ کیا تم دشمنوں سے ڈرتے ہو؟ غیرت مند یہی کہے گا اور کر کے دکھائے گا کہ نہیں، میں دشمنوں سے نہیں ڈرتا، پھر مسلمانوں کی ہمت بندھائی کہ تم تو اللہ پر ایمان و یقین رکھنے والے ہو کہ فتح و شکست اور نفع و نقصان اسی کے ہاتھ میں ہے، ایسی صورت میں تو لازماً حق بنتا ہے کہ تم کفار کے بجائے اللہ سے ڈرو اور ان سے قتال کرو۔

آیت 15،14 ① قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ ...... : ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے والے کفار سے لڑنے کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ پانچ وعدے کیے ہیں جو سب کے سب پورے فرمائے، پہلا یہ کہ "يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ"

وَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۵﴾

یعنی پہلی قوموں پر اللہ کی طرف سے قدرتی آفات کے ذریعے سے عذاب آتا تھا، اب تم ان سے لڑو، اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں انھیں عذاب دے گا، جو کفار کے قتل، زخمی، قید ہونے اور ان سے مال غنیمت کے حصول کی صورت میں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ "يُخْزِهِمْ" انھیں رسوا کرے گا، ان کی فوجی قوتوں کا گھمنڈ توڑ کر ان کی حکومت کی عزت خاک میں ملا کر انھیں ذلیل و رسوا کرے گا۔ تیسرا یہ کہ " وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ " ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں غلبہ عطا کرے گا۔ اسے الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ ہوسکتا تھا کہ کفار تو ذلیل ہو جائیں مگر مسلمانوں کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے۔ چوتھا یہ کہ "وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ" تمھارے ان سے لڑنے اور غلبہ پانے سے ان مومنوں کے سینوں کو شفا ملے گی جو ان کفار موذیوں کے ہاتھوں ظلم وستم سہتے رہے۔ ان سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مکہ اور دوسری جگہوں میں کفار کی ایذا کا نشانہ بنے۔ بعض نے فرمایا کہ ان سے مراد بنوخزاعہ ہیں جنھیں بنوبکر اور قریش نے بدعہدی کر کے سخت نقصان پہنچایا اور واقعی یہ لوگ بھی کفار کے زخم خوردہ لوگوں میں شامل تھے اور پانچواں یہ کہ " وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ " ان کے دلوں کے غصے کو دور کرے گا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ شفائے صدور ہی کی تاکید ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک الگ نعمت ہے۔ شفائے صدور سے مراد ان ظالموں کا قتل اور ان کی رسوائی ہے اور دلوں کا غصہ دور کرنے سے مراد مسلمانوں کو محکومی کی بے بسی میں جو غصہ کفار پر آتا تھا مگر کچھ کر نہ سکتے تھے، اب فتح و غلبہ کی صورت میں اس غصے کو دور کرنا ہے اور ویسے بھی شفائے قلوب کے بعد بھی ظلم وستم کے جو آثار غصے کی صورت میں باقی رہتے ہیں الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے واقعات سن کر دل میں غصہ تو آتا ہی ہے، جیسے اب بھارت و کشمیر، فلسطین و فلپائن، برما، عیسائی اور کمیونسٹ ممالک میں مسلمانوں پر ظلم کی داستانیں سن کر دل کو غصہ آتا ہے، کفار پر فتح یاب ہونے سے اس غصے کا بھی مداوا ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ: اس سے پہلے پانچ الفاظ "يُعَذِّبْهُمْ" "يُخْزِهِمْ" "يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ" "يَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ" اور "يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ "فعل مضارع مجزوم تھے، کیونکہ وہ " قَاتِلُوْهُمْ" امر کا جواب تھے کہ لڑنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمھیں یہ پانچ انعام عطا فرمائے گا۔ اب " وَيَتُوْبُ اللّٰهُ" مجزوم نہیں بلکہ مرفوع ہے۔ معلوم ہوا یہاں سے نئی بات شروع ہو رہی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: "اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔" یہاں اس جملے کے لانے کا مقصد یہ ہے کہ تمھارے جہاد کی صورت میں جب بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں خم ہوں گی، تو وہ اسلام کی حقانیت پر غور کریں گے اور یہ عام مشاہدہ ہے کہ لوگ غالب قوم کے دین اور ان کی تہذیب کو قبول کرتے ہیں، لہٰذا اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو توبہ کی توفیق بھی دے گا، جیسا کہ فتح مکہ کے بعد عکرمہ بن ابی جہل، ابو سفیان، سہیل بن عمرو اور ان کے علاوہ فوج در فوج لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ مگر اس کو "قَاتِلُوْهُمْ" کا جواب بنانے کے بجائے الگ اس لیے ذکر کیا

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ ع ۸

یا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور نہ اللہ کے اور نہ اس کے رسول کے اور نہ ایمان والوں کے سوا کسی کو راز دار بنایا اور اللہ اس سے پورا باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔﴿۱۶﴾

ہے کہ توبہ کی توفیق صرف کفار سے لڑائی ہی پر موقوف نہیں بلکہ اسلام اتنا واضح ، روشن، مدلل اور فطرت کے مطابق دین ہے کہ بعض لوگ لڑائی کے بغیر بھی اللہ کی توفیق سے اسے سینے سے لگا لیتے ہیں اور اس میں اتنی کشش اور اتنا حسن ہے کہ اسے مٹانے کی کوشش کرنے والے لوگ اور مسلمانوں پر فتح یاب ہو جانے والے کفار بھی اللہ کی توفیق سے اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں ہر جگہ مسلمان اگرچہ مغلوب ہیں، مگر اسلام تمام ادیان سے زیادہ یورپ، امریکہ اور دنیا بھر کے ممالک میں پھیل رہا ہے۔ تاتاریوں نے بھی بغداد فنا کرنے کے بعد آخر اسی اسلام کی آغوش میں پناہ لی اور اسلام کو مٹانے والے ہی صدیوں تک اس کے محافظ بنے رہے ؏

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے　　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

③ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ : وہ گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کی ہر بات جانتا ہے اور اپنی کمال حکمت کے مطابق جسے چاہتا ہے توبہ کی توفیق سے نوازتا ہے۔

④ ان آیات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے علم میں پکے مومن تھے، تبھی یہ پیش گوئیاں انھی مومنین کے ہاتھوں پوری ہوئیں، انھوں نے ہی مکہ اور جزیرۂ عرب فتح کیا، روم، شام، یمن، ایران، عراق، افریقہ وایشیا، مشرق سے مغرب تک اللہ تعالیٰ نے انھی کے ہاتھوں اسلام پھیلایا۔ ان کے ذکر سے مومنوں کے دل ٹھنڈے ہوتے ہیں اور کفار کے دل غصے سے بھر جاتے ہیں، دیکھیے سورۂ فتح کی آخری آیت۔

آیت 16 ① أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا ...... : "وَلِيْجَةً" "وَلَجَ يَلِجُ" (وَعَدَ) سے ہے جس کا معنی داخل ہونا ہے، یعنی دل کے اندر داخل ہو جانے والا، قلبی دوست اور محبوب، جس کے سامنے آدمی اپنے دلی راز بھی رکھ دے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ کفار کو کسی صورت دلی دوست نہ بناؤ، فرمایا: ﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ [آل عمران : ۱۱۸] ''اپنے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، وہ تمھیں کسی طرح نقصان پہنچانے میں کمی نہیں کرتے۔'' احکامِ جہاد کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جہاد کی ایک حکمت بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے کھرے اور کھوٹے اہلِ ایمان کو الگ الگ کرنا چاہتا ہے اور ان لوگوں کو خالص کرنا چاہتا ہے جن میں جہاد اور صرف مسلمانوں سے دلی دوستی اور راز داری کا وصف پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ چیز لڑائی ہی سے نکھر کر سامنے آتی ہے۔ منافقین بھی بعض اوقات جہاد میں شریک ہو جاتے ہیں، مگر کفار

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

مشرکوں کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی شہادت دینے والے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۷﴾

سے دلی دوستی اور راز داری کا تعلق ختم نہیں کرتے، نہ ہی وہ صرف اللہ کی رضا کے لیے لڑتے ہیں، نیز دیکھیے سورۂ عنکبوت (۱ تا ۳) اور سورۂ آل عمران (۱۷۹)۔

② وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ تمھارے تمام اعمال سے پوری طرح با خبر ہے، وہ ظاہر اعمال کے ساتھ دل کا حال بھی جانتا ہے، اس لیے اپنے اعمال درست کرو اور ان کے لیے نیت خالص اللہ کی رضا رکھو۔

آیت 17 ① مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ ...... : یہاں تک کفار کے عہد و پیمان سے براءت کا اعلان، کفار سے جہاد، اس کے فوائد اور حکمتوں کا بیان تھا۔ اب یہ بیان شروع ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مساجد کی آباد کاری، ان کی نگرانی اور تولیت و خدمت مشرکین کا کسی صورت حق نہیں بنتا، کیونکہ مساجد تو خالص اللہ کے لیے ہیں: ﴿ وَ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾ [الجن : ۱۸] ''اور یہ کہ بلاشبہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، پس اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔'' سو ان کی نگرانی اور آباد کاری ان لوگوں کا حق کیسے ہو سکتا ہے جو خود اپنے آپ پر اس اکیلے مالک کے ساتھ کفر کے گواہ اور شاہد ہیں، جو حج اور عمرہ کے وقت بھی (جو صرف اللہ کے لیے ہیں) لبیک کہتے وقت غیروں کو علی الاعلان اس کا شریک بناتے ہیں۔ چنانچہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے: ((لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ)) ''حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: ''اسی پر بس کر دو، آگے مت کہنا۔'' مگر وہ کہتے: ((إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَ مَا مَلَكَ)) ''مگر ایک شریک جو تیرا ہی ہے جس کا تو مالک ہے، وہ خود مالک نہیں۔'' وہ لوگ یہ الفاظ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ [مسلم، الحج، باب التلبية و صفتها و وقتها : ۱۱۸۵] ان کی اپنے کفر پر شہادت وہ تین سو ساٹھ بت بھی تھے جو انھوں نے کعبہ کے اندر اور اس کے ارد گرد رکھے ہوئے تھے، کعبہ کی دیواروں پر بزرگوں اور دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنا رکھی تھیں۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی صورتیں بنا کر ان کے ہاتھ میں فال کے تیر پکڑائے ہوئے تھے، ان کی عبادت غیر اللہ کو پکارنا تھا، ان کا بیت اللہ کا احترام انتہائی بے حیائی، یعنی ننگے ہو کر مردوں اور عورتوں کا طواف کرنا تھا اور ان کی نماز تالیاں پیٹ کر اور سیٹیاں بجا کر مشرکانہ قوالیاں کرنا تھا۔ ایسے لوگ اللہ کے سب سے پہلے اور افضل گھر کے تو کجا اس کی کسی مسجد کے متولی، مجاور یا خادم بننے کا بھی کوئی حق نہیں رکھتے، اس لیے ان سے کعبہ اور دوسری مساجد کو آزاد کروانا مسلمانوں پر فرض ہے۔ علامہ اقبال نے یہاں ایک نہایت نفیس نکتہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے پوری زمین کو مسجد بنایا ہے، جیسا کہ فرمایا: ((جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّ طَهُوْرًا)) [بخاری، التيمم، باب قول الله تعالٰى : ﴿ فلم تجدوا ماء...... ﴾ : ۳۳۵۔ مسلم : ۵۲۳] اس

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔ تو یہ لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں سے ہوں گے ﴿۱۸﴾ کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کو آباد کرنا اس جیسا بنا دیا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا۔ یہ اللہ کے ہاں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۹﴾

لیے مسلمانوں کے لیے غیرت اور ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ان کی مسجد پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو، نہیں بلکہ یہ ساری مسجد، یعنی ساری زمین مسلمانوں کے قبضے میں ہونی چاہیے اور کفار کو ان کے ماتحت ہونا چاہیے۔

② اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ : یعنی انھوں نے اگر کچھ نیک کام کیے بھی ہیں، جیسے مسجد حرام اور حاجیوں کی خدمت وغیرہ، تو ان کے شرک کی وجہ سے وہ سب اکارت گئے۔

آیت 18 اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ...... : آباد کرنے میں مساجد کی تعمیر، ان میں نمازوں کے لیے آنا، صفائی، روشنی، مرمت اور نگرانی وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں اور یہ صرف ان لوگوں کا کام ہے جن میں خصوصاً چار چیزیں پائی جائیں: ① اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان۔ ② ظاہر میں اس ایمان کی شہادت کے لیے نماز کا قیام۔ ③ زکوٰۃ کی ادائیگی۔ ④ اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا، جبکہ مشرکین ان چاروں صفات سے عاری ہیں۔ مساجد کی تعمیر، آباد کاری اور ان کا ادب و احترام نہایت اعلیٰ درجے کا عمل ہے۔ امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اللہ کے لیے کوئی مسجد بنائے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے اس جیسا گھر بنائے گا۔'' [بخاري، الصلاة، باب من بنى مسجدًا : ٤٥٠]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام بلاد (جگہوں) میں سب سے زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام بلاد (جگہوں) سے زیادہ ناپسند ان کے بازار ہیں۔'' [مسلم، المساجد، باب فضل الجلوس في مصلاه ...... : ٦٧١]

آیت 19 اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ ...... : اس آیت کے مخاطب مشرکین اور مسلمان دونوں ہیں، کیونکہ مشرکین کعبہ کی خدمت، تولیت اور حاجیوں کو شربت اور پانی پلانے پر بہت فخر کرتے تھے اور بعض مسلمان بھی اس کو سب سے اعلیٰ عمل سمجھتے تھے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس آپ کے اصحاب کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا، تو

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ
دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ
وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا وہ اللہ کے ہاں درجے میں بہت بڑے ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں ۝۲۰ ان کا رب انھیں اپنی طرف سے بڑی رحمت اور عظیم رضامندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے ۝۲۱ جس میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس بہت بڑا اجر ہے ۝۲۲

ایک آدمی نے کہا کہ اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ میں کوئی کام نہ کروں تو مجھے کچھ پروا نہیں۔ دوسرے نے کہا، بلکہ مسجد حرام کی آباد کاری (افضل ہے)۔ ایک اور نے کہا، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ اس سے بہتر ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تو عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں ڈانٹا اور فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس آوازیں مت بلند کرو، یہ جمعہ کے دن کی بات ہے، لیکن جب تم جمعہ پڑھ چکو گے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور تمھارے اس جھگڑے کا فیصلہ کروا لوں گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [مسلم، الإمارة، باب فضل الشهادة في سبيل الله تعالى: ۱۸۷۹] یعنی یہ کام گو فضیلت کے ہیں مگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے اور پھر یہ ایمان کے بغیر مقبول بھی نہیں۔ ﴿ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ شرک سب سے بڑا ظلم ہے، پھر جو اس پر اصرار کرے اس ظالم کو سیدھی راہ کیسے نصیب ہو؟

آیت 20 ❶ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا: "هَاجَرُوْا" یعنی اپنا دین اور جان و مال بچانے کے لیے اپنا گھر بار اور رشتہ داروں کو چھوڑا۔

❷ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ: اس آیت سے مہاجرین کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے جن میں ابو بکر، عمر، عثمان، علی، ابو عبیدہ بن جراح، طلحہ، زبیر اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب پر راضی ہو اور ہمیں ان کے ساتھ اٹھائے۔ قرآن خود ان کے آخرت میں فائز و سرخرو ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ انھیں برا بھلا کہتے اور ان پر لعنت بھیجتے ہیں وہ خود لعنتی ہیں۔

آیت 22،21 يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ ...... : "بِرَحْمَةٍ" اور "رِضْوَانٍ" پر تنوین تعظیم کی ہے۔ اب اس رحمت اور رضامندی کا کون اندازہ کر سکتا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے اور عظیم قرار دے رہا ہے، اگلی آیت میں دوبارہ اسے اجر عظیم قرار دیا ہے۔ جب مالک خود ان لوگوں سے راضی اور انھیں اپنی رحمت اور جنت کی خوش خبری دے رہا ہے، تو

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر سے محبت رکھیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا سو وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۳﴾ کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات، جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ

ڈوب مرنا چاہیے ان لوگوں کو جو ان کے خلاف اپنی زبانیں کھولتے ہیں، اگر ان میں ذرہ بھر بھی غیرت اور شرم و حیا ہے۔ ورنہ سیدھی طرح اپنی بدتمیزی اور گستاخی سے توبہ کر کے ان کا وہ مقام تسلیم کرنا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول نے انھیں دیا ہے۔ یاد رہے کہ ایمان، جہاد اور ہجرت کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا اور وہ سب مجاہدین اس فضیلت میں شامل ہیں جو یہ شرف حاصل کریں گے۔ ابو حیان نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے تین وصف ایمان، ہجرت اور مال و جان کے ساتھ جہاد ذکر فرمائے، ان کے مقابلے میں تین ہی انعام ذکر فرمائے، ایمان کے مقابلے میں رحمت، کیونکہ وہ صرف ایمان سے حاصل ہوتی ہے اور سب سے عام ہے۔ جان و مال کے ساتھ جہاد کے مقابلے میں رضوان جو کسی سے حسن سلوک کی انتہا ہے اور ہجرت، یعنی وطن چھوڑنے کے بدلے میں جنت جو دائمی اقامت کا گھر ہے۔

آیت 23 يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ ...... : یعنی بعض لوگ دل سے مسلمان ہیں لیکن برادری سے تعلق توڑ بھی نہیں سکتے کہ اپنے اسلام کا اعلان کر دیں، ان کا حال یہاں سے سمجھو۔ (موضح) مزید دیکھیے سورۂ مجادلہ (۲۲)، سورۂ ممتحنہ (۱ تا ۳)، سورۂ آل عمران (۲۸، ۱۱۸) اور سورۂ مائدہ (۵۱)۔

آیت 24 ① قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ ...... : یہ اور اس سے پہلی آیت دونوں مسلمانوں کے کسی خاص گروہ یا واقعہ سے متعلق نہیں بلکہ عام اور ہر زمانے کے لیے ہیں، ان میں تمام مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی محبت انھیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ہونی چاہیے، یہ تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے شمار فرمائی ہیں ہر انسان کو طبعی طور پر محبوب ہوتی ہیں، فرمایا: ﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ [آل عمران : ١٤] ”لوگوں کے لیے نفسانی

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۴

اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (۲۴)

خواہشوں کی محبت مزین کی گئی ہے جو عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی ہیں، یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔'' ان چیزوں سے محبت کوئی گناہ بھی نہیں، بلکہ ان سے محبت اور ان کے حقوق کی ادائیگی آدمی کی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقاضا صرف یہ ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کے راستے میں جہاد سے بڑھ کر نہیں ہونی چاہیے۔ پیمانہ اس کا یہ ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کا حکم ہو اور اسلام کی خاطر جہاد کرتے ہوئے سب کچھ قربان کر دینے کی ضرورت ہو اور دوسری طرف ماں باپ اور خویش و اقارب کی محبت ہو اور دنیا کے دوسرے تعلقات یا مفادات و خطرات اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہوں تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص اور ہر مصلحت سے بے پروا ہو کر اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے حکم کی پیروی کرے اور کوئی دنیوی مفاد یا خطرہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اسے اللہ کا حکم ماننے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے باز رکھ سکے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی وقت عذاب آ سکتا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی ﷺ نے بار بار واضح فرمایا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' [بخاري، الإيمان، باب حب الرسول ﷺ من الإيمان : ۱۵، عن أنس رضی اللہ عنہ] عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے اور عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے اپنی جان کے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جب تک کہ میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔'' فرمایا: ''اب اے عمر! (تیرے ایمان کا معاملہ درست ہوا)۔'' [بخاري، الأيمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي ﷺ : ٦٦٣٢]

② حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ: ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم ''عینہ'' (حیلے کے ساتھ سود کی ایک قسم) کے ساتھ بیع کرو گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ لو گے اور کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد ترک کر دو گے، تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کرے گا جسے ختم نہیں کرے گا، جب تک تم اپنے دین (جہاد) کی طرف لوٹ نہیں آؤ گے۔'' [أبو داوٗد، البيوع، باب في النهي عن العينة : ٣٤٦٢، و صححه الألباني] زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ آیت بہت سخت ہے، اس سے سخت آپ کوئی آیت نہیں دیکھیں گے۔ یہ انسان کی دینی کمزوری اور یقین کی کمی کی نشان دہی کرتی ہے۔ اپنے دل میں بہت پرہیز گار اور متقی شخص انصاف سے سوچے کہ کیا واقعی اس میں اتنی دینی پختگی ہے کہ اس آیت میں مذکور تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

بلاشبہ یقیناً اللہ نے بہت سی جگہوں میں تمھاری مدد فرمائی اور حنین کے دن بھی، جب تمھاری کثرت نے تمھیں خود پسند بنا دیا، پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین تنگ ہوگئی، باوجود اس کے کہ وہ فراخ تھی، پھر تم پیٹھ پھیرتے ہوئے لوٹ گئے ﴿۲۵﴾ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کو سزا دی جنھوں نے کفر کیا اور یہی کافروں کی جزا ہے ﴿۲۶﴾

کی رضا کے خلاف ہونے کی بنا پر کسی معاملے میں چھوڑ سکتا ہے، یا کسی کی تھوڑی سی ناراضگی یا دنیا کے معمولی سے مفاد کی بنا پر وہ کش مکش میں پڑ جاتا ہے کہ کسے رکھوں اور کسے چھوڑ دوں؟ پھر اکثر یہی ہوتا ہے کہ اس کی بیوی، اولاد، دوستوں، معاشرے اور تجارتی مفاد کے تقاضے ہی اللہ کے دین کے تقاضوں پر غالب آتے ہیں۔ (الا ماشاء اللہ)

آیت 26،25 ❶ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ: بدر میں اپنے انعامات کے تذکرے، جہاد کی ترغیب، کفار سے دوستی ترک کرنے کی تلقین اور دنیا کی ہر چیز پر اللہ اور اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ کی ترجیح کے حکم کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ مزید انعامات ذکر فرمائے، جن میں حنین کا خاص ذکر فرمایا، مگر حنین کا ذکر کرنے سے پہلے بہت سے گزشتہ مواقع میں (فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ) اپنی مدد کا ذکر فرمایا، ان میں ہجرت ﴿ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [التوبة : ٤٠] بدر ﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ ﴾ [آل عمران : ١٢٣] احد ﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ﴾ [آل عمران : ١٥٢] خندق ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ ﴾ [الأحزاب : ٩] حدیبیہ ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ [الفتح : ١] فتح مکہ ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ [النصر : ١] یہودی قبائل ﴿ هُوَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ﴾ [الحشر : ٢] اور منافقین سے معاملات وغیرہ سب شامل ہیں اور سب کا ذکر قرآن و حدیث میں مختلف مقامات پر موجود ہے، مگر ان کو یہاں بطور تمہید ذکر فرما کر اصل تذکرہ حنین کے دن کیے جانے والے انعام کا فرمایا اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی۔ حنین مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان ایک وادی ہے، وہاں فتح مکہ (رمضان ۸ ھ) کے ایک ماہ بعد شوال ۸ ھ میں مسلمانوں کی ہوازن، ثقیف، بنو جشم، بنو سعد اور بعض دوسرے قبائل سے جنگ ہوئی تھی۔

❷ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ ......: نبی ﷺ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تو ان مہاجرین و انصار کا تھا جو فتح مکہ

ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

پھر اس کے بعد اللہ توبہ کی توفیق دے گا جسے چاہے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۷﴾

کے لیے آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے اور دو ہزار آدمی آپ کے ساتھ اہلِ مکہ (طلقاء) میں سے شامل ہو گئے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کا کل لشکر بارہ ہزار لڑنے والوں پر مشتمل تھا، جبکہ اس کے مقابلے میں دشمنوں کی تعداد صرف چار ہزار کے قریب تھی، اس پر بہت سے مسلمانوں میں عجب (خود پسندی) اور ایک قسم کا غرور پیدا ہو گیا، حتیٰ کہ بعض نے کہا آج ہم قلت تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا۔ (ابن کثیر) جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم وادیٔ حنین کی طرف چلے تو ہم تہامہ کی وادیوں میں سے ایک وادی میں اترے، وادی بڑی وسیع و عریض تھی، اس میں اوپر نیچے ٹیلے اور چھوٹی چھوٹی ڈھلوانی پہاڑیاں تھیں، ہم اوپر چڑھتے اور نیچے اترتے ہوئے آگے کی جانب بڑھتے اور لڑھکتے جا رہے تھے، ابھی صبح کا اندھیرا تھا، دشمن ہمارے لیے مختلف گھاٹیوں، کناروں اور تنگ گزرگاہوں میں پورے اتفاق اور مقابلے کی تیاری کے ساتھ چھپے بیٹھے تھے۔ اللہ کی قسم! ہمیں اترتے اترتے پتا ہی نہ چلا کہ دشمن نے مل کر اس طرح حملہ کیا جیسے ایک آدمی کرتا ہے۔ (دوسری روایات میں ہے کہ وہ زبردست نشانہ باز تھے، انھوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی) لوگ شکست کھا کر واپس پلٹے، وہ بھاگے جاتے تھے اور کوئی کسی کو مڑ کر نہیں دیکھتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائیں طرف ایک جگہ ہو گئے، پھر فرمایا: ''لوگو! میری طرف توجہ کرو، میری طرف آؤ، میں رسول اللہ ہوں، میں محمد بن عبد اللہ ہوں۔'' کہیں سے جواب نہیں آ رہا تھا، اونٹ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے، لوگ ادھر ادھر نکل گئے، سوائے مہاجرین و انصار کے ایک گروہ اور آپ کے خاندان کے لوگوں کے جو زیادہ نہ تھے۔ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما آپ کے ساتھ ڈٹے رہے، آپ کے خاندان والوں میں سے علی بن ابو طالب، عباس بن عبد المطلب، ان کے بیٹے فضل، ابو سفیان بن حارث اور ایمن بن عبید جو ام ایمن کے بیٹے تھے اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم۔
[أحمد : ۳۷۶/۳، ح : ۱۵۰۲۷، وحسنه شعيب الأرنؤوط۔ ابن حبان : ٤٧٧٤]

عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری آواز بڑی بلند تھی، اس وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا: ''اے عباس! کیکر (کے درخت) والوں کو آواز دو۔'' چنانچہ میں نے بلند آواز سے پکارا کہ کیکر (تلے بیعت رضوان کرنے) والے کہاں ہیں؟ اللہ کی قسم! ان لوگوں نے جب میری آواز سنی تو وہ ''ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں'' کہتے ہوئے اس طرح دوڑے جس طرح گائے اپنے بچے کی طرف دوڑتی ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکر پکڑے اور دشمنوں کی طرف پھینکے، اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''محمد کے رب کی قسم! وہ شکست کھا گئے۔'' [مسلم، الجهاد، باب غزوة حنين : ۱۷۷۵] یہ وہ وقت ہے جب مسلمان جم گئے اور فرشتے نازل ہوئے: ﴿وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ ''اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا۔''

③ وَ عَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... : اللہ تعالیٰ نے کفار کو یہ سزا دی کہ انھیں شکست فاش ہوئی، ان کے بچے اور عورتیں لونڈی و غلام اور ان کے اموال مسلمانوں کی غنیمت بنے، بہت سے بڑے بھی اسیر ہوئے اور دنیا میں کفار کی یہی جزا ہے۔

آیت 27 ① ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ : چنانچہ غزوۂ حنین کے تقریباً بیس روز بعد ہوازن کے بقیہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بات یہی ہے کہ مشرک لوگ ناپاک ہیں، پس وہ اپنے اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب

لوگ مسلمان ہو کر جعرانہ کے مقام پر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، رسول اللہ ﷺ کا ان لوگوں سے رضاعی رشتہ بھی تھا، کیونکہ آپ کی رضاعی ماں حلیمہ رضی اللہ عنہا انھی سے تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مسلمان ہونے کی توفیق بخشی، یہ اپنے اموال اور قیدی واپس لینے کی درخواست لے کر آئے۔ آپ نے فرمایا: ''تم نے آنے میں دیر کر دی، میں نے غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے تمھارا بہت انتظار کیا، اب دیکھ رہے ہو یہ لشکر میرے ساتھ ہے، اب ایک چیز کا انتخاب کر لو، یا اپنے اموال لے لو یا قیدی۔'' انھوں نے کہا، آپ ہمارے قیدی آزاد کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ان کے قیدی جو ابن کثیر کے مطابق (عورتیں بچے ملا کر) چھ ہزار تھے، سب مسلمانوں کو ترغیب دلا کر آزاد کر دیے، البتہ مال غنیمت واپس نہیں کیا۔ [بخاري، المغازي، باب قول الله تعالىٰ : ﴿ ويوم حنين...... ﴾ : ٤٣١٨، ٤٣١٩]

❷ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے غزوات کا آغاز بدر سے اور خاتمہ حنین سے کیا، اس لیے یہاں دونوں کو یکے بعد دیگرے ملا کر ذکر فرمایا، ان دونوں کے درمیان سات سال کا فاصلہ تھا، اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے مقابلے میں عرب کی جنگ کا انگارا بجھ گیا۔ پہلی جنگ نے انھیں خوف زدہ کر کے ان کی قوت توڑ دی تھی، آخری جنگ نے ان کی قوت کا خاتمہ کر دیا، ان کا اسلحہ بے اثر کر دیا اور ان کی جماعت کو اس طرح پیسا کہ ان کے لیے اسلام میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ ادھر اس آخری جنگ میں مسلمانوں کو یہ سبق بھی خوب یاد کروا دیا کہ جنگ میں فتح تمھاری کثرت یا اسلحہ کی برتری کی وجہ سے نہیں بلکہ دین کی برکت اور اللہ کی مدد سے حاصل ہوتی ہے۔

آیت 28 ❶ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ......** : زمخشری نے فرمایا: ''نَجَسٌ'' مصدر ہے، کہا جاتا ہے ''نَجِسَ نَجَسًا وَ قَذِرَ قَذَرًا (ع، ن)'' گندا، ناپاک، پلید ہونا۔ گویا تمام مشرک اتنے ناپاک ہیں کہ یوں سمجھو کہ وہ سراسر نجاست ہیں۔ ناپاک ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ عقائد و اعمال اور اخلاق کے لحاظ سے گندے ہیں، ان کی نجاست معنوی نجاست ہے، بدن ناپاک ہونا مراد نہیں کہ اسے ہاتھ لگنے یا اس کے ہاتھ لگانے سے کوئی چیز پلید ہو جاتی ہو، اس لیے اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنا، انھیں لونڈی و غلام بنا کر خدمت لینا جائز ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک عورت کے مشکیزوں کا پانی پیا۔ [بخاري : ٣٥٧١] اور آپ نے خیبر کے یہود کی دعوت قبول فرمائی۔ [بخاري : ٢٦١٧] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ہاتھ یا جسم لگنے سے کوئی چیز پلید نہیں ہوتی۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو مشرک بدنی طور پر بھی طہارت کا اہتمام نہیں کرتے، نہ استنجا، نہ غسل جنابت، نہ زیر ناف کی صفائی، نہ کسی نجاست سے اجتناب، پھر خنزیر کھانا، سگریٹ اور شراب پینا اور زنا کرنا ان کی عام روش ہے۔ الغرض مشرک جتنا بھی صاف ستھرا ہو، فرانس وغیرہ کی بنی ہوئی خوشبو جتنی بھی لگا لے اس کے جسم اور کپڑوں سے بدبو ختم نہیں ہوگی۔ مسلمان جتنا بھی میلا کچیلا ہو اس سے اس قسم کی بدبو کبھی نہیں آئے گی، بشرطیکہ نماز پڑھتا ہو، اگر نماز ہی نہیں پڑھتا تو مشرک کا اور اس کا معاملہ ایک جیسا ہی ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات

هٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٨﴾

نہ آئیں اور اگر تم کسی قسم کے فقر سے ڈرتے ہو تو اللہ جلد ہی تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا، اگر اس نے چاہا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿٢٨﴾

ہے، اس لیے کفار کو مسلمان ہونے سے پہلے غسل کی تاکید کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو ناپاک قرار دے کر آئندہ کے لیے مسجد حرام کے قریب آنے سے بھی منع فرما دیا، چنانچہ جیسا کہ پہلے گزرا ہے ۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے اعلان کروایا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک ہرگز حج نہیں کرے گا۔ قریب آنے سے ممانعت کا صاف مطلب ہے کہ غیر مسلم کا پورے حرم مکہ میں داخلہ منع ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت ابن کثیر نے جابر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے اس سال کے بعد ہماری اس مسجد میں ذمی اور ان کے خادم کے سوا کوئی نہ آئے۔'' مسند احمد میں ایک اور روایت ہے: ''ہماری اس مسجد میں ہمارے اس سال کے بعد اہل کتاب اور ان کے خادموں کے سوا کوئی داخل نہ ہو۔'' مگر یہ دونوں روایتیں ثابت نہیں۔ شعیب الارنؤوط نے دونوں کی سند کو ضعیف کہا ہے، حسن بصری نے جابر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا اور دو راوی اشعث بن سوار اور شریک ضعیف ہیں، لہٰذا کسی بھی غیر مسلم کو حرم مکہ میں داخلے کی اجازت نہیں، بلکہ اپنی آخری وصیت میں تو آپ ﷺ نے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب ہی سے نکال دینے کا حکم دیا تھا، چنانچہ اس وصیت کے مطابق امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے یہود و نصاریٰ کو بھی جزیرۂ عرب سے نکال دیا۔

② مسجد حرام کے سوا دوسری مساجد میں غیر مسلم داخل ہو سکتا ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے بعض مشرکوں کو اپنی مسجد میں آنے کی اجازت دی اور ثمامہ کو مسجد کے ستون سے باندھنے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے۔

③ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً ...... : غیر مسلموں کی سال بھر تجارت اور حج و عمرہ کے لیے آمد و رفت بند ہونے سے وہ سامان تجارت جو وہ لایا کرتے تھے اور دوسرے مالی فوائد جو ان کی آمد سے اہل مکہ کو حاصل ہوتے تھے، لازماً ختم ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اندیشے کو رفع کرنے اور مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے یہ الفاظ نازل فرمائے کہ تجارت اور کاروبار کی بندش کی فکر مت کرو، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو تمھیں ضرور غنی کر دے گا، وہ سب کچھ جانتا ہے، یہ تو اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں کہ وہ مسلمانوں کو کیسے غنی کرتا ہے، مگر اس کا ہر کام اور ہر طریقہ حکمت پر مبنی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فتوحات عالم کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور وہ سب اللہ کے فضل سے غنی ہو گئے، پھر حج و عمرہ کرنے والے مسلمانوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ اہل مکہ کے لیے فقر کا مسئلہ ہی نہ رہا۔ اس وقت ۱۴۳۱ھ میں تقریباً ۳۵ یا ۴۰ لاکھ حاجیوں نے حج ادا کیا ہے اور حکومت سعودیہ کا اندازہ ہے کہ چند ہی سال میں یہ تعداد ایک کروڑ تک پہنچ جائے گی اور حکومت اس کے مطابق باقاعدہ حرم کی عمارات اور رہائشی عمارات کی توسیع کے منصوبے پر نہایت تیزی کے ساتھ عمل کر رہی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا

لڑو ان لوگوں سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے

4 اِنْ شَآءَ: یہ بطور شرط نہیں بلکہ بات کو پختہ کرنے کے لیے ہے، کیونکہ ہر معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ فتح (۲۷)۔

آیت 29 ① قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ...... : مشرکین عرب سے قتال (لڑائی) کا حکم دینے کے بعد اب اہل کتاب سے قتال کا حکم دیا جا رہا ہے اور اس کی چار وجہیں بیان فرمائی ہیں: ① ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں ہے۔ رہا ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان کا دعویٰ تو وہ درست نہیں، کیونکہ وہ اس کے مطابق نہیں جو رسول اللہ ﷺ اور تمام رسولوں نے بتایا، بلکہ وہ اللہ پر ایمان کے بجائے اللہ تعالیٰ کی توہین والا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں فرمایا: ﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ﴾ [التوبۃ : ۳۰] ''اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔'' یعنی یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دے کر اسے محتاج ثابت کر رہے ہیں اور اس کی وحدانیت کا انکار کر رہے ہیں۔ ② یوم آخرت پر ان کا ایمان بھی کالعدم ہے، کیونکہ ایک تو وہ خاتم النبیین ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آپ کے بتانے کے مطابق نہ ہو وہ نہ ہونے کے برابر ہے اور پھر بھی وہ اپنے تمام اعمال بد کے باوجود جنت کے ٹھیکیدار ہونے کے دعوے دار ہیں، فرمایا: ﴿ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ [البقرۃ : ۱۱۱] ''جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے مگر جو یہودی یا نصاریٰ بنیں گے۔'' پھر یہودیوں نے زیادہ سے زیادہ چند دن جہنم میں رہنے کی، یعنی: ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ [البقرۃ : ۸۰] اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو اپنے گناہوں کا کفارہ قرار دے کر سرے ہی سے جہنم سے محفوظ رہنے کی آرزوئیں دل میں پال رکھی ہیں۔ کیا کوئی بھی سلیم العقل انسان ایسے یوم آخرت کو یوم جزا سمجھ سکتا ہے؟ اگر کوئی کہے کہ یہ بات تو اب بعض مسلمانوں میں بھی آ چکی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور اپنے پیشواؤں کے اعتماد پر جہنم سے بے فکر ہو چکے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ بھی انھی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو ان کے پیچھے چلنے سے منع فرمایا تھا۔ ③ وہ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ پر تو ان کا ایمان ہی نہیں، اس لیے ان کی حرام کردہ کو حرام سمجھنا تو دور کی بات ہے، وہ اپنی کتاب تورات میں مذکور حرام چیزوں کو بھی حرام نہیں سمجھتے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں انھوں نے سود لینا، رشوت اور حرام کھانا اختیار کر رکھا تھا، فرمایا: ﴿ وَ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾ [النساء : ۱۶۱] یعنی ان پر لعنت کا سبب ان کا سود لینا تھا، حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانا بھی لعنت کا سبب تھا۔ نصرانیوں نے ایک نیا دین رہبانیت نکال لیا تھا، فرمایا: ﴿ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ﴾ [الحدید : ۲۷] ''اور رہبانیت، اسے انھوں نے خود ہی ایجاد کر لیا، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔'' اور اب تو یہود و نصاریٰ نے مروت و انسانیت کی ہر حد پار کر کے زنا، قوم لوط کے عمل اور بے شمار

يَدِيۡنُوۡنَ دِيۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾ ع ۱۰

رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں ﴿۲۹﴾

خلافِ فطرت کاموں کو جمہوریت کے نام پر حلال قرار دے دیا ہے اور تمام دنیا کو زور و زبردستی سے ان میں مبتلا کرنے کی جد و جہد شروع کر رکھی ہے۔ ④ وہ دین حق قبول نہیں کرتے، حالانکہ اسے قبول کرنے کے لیے ان کے انبیاء کے صریح احکام موجود ہیں اور اسلام کے حق ہونے کے واضح دلائل ان کے سامنے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہلِ کتاب سے لڑنے کا حکم دیا۔ یہ ۹ ھ کی بات ہے، آپ نے رومیوں سے جہاد کی تیاری کی، لوگوں کو اس کے لیے دعوت دی، مدینہ کے اردگرد سے بھی لوگوں کو بلایا، تقریباً تیس ہزار مجاہد لے کر آپ روانہ ہوئے، مدینہ اور اس کے اردگرد کے منافقین ہی پیچھے رہ گئے، یا چند مخلص مسلمان۔ آپ نے شام کا رخ کیا، تبوک تک پہنچے، تقریباً بیس دن وہاں ٹھہرے، مگر رومی سامنے نہ آئے اور آپ اس علاقے کے لوگوں سے معاہدے کر کے واپس آ گئے۔ (ملخصاً) اس کے بعد خلفائے راشدین، بنو امیہ، بنو عباس اور دوسرے خلفاء نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو مسلمانوں کی عزت اور غلبہ بھی قائم رہا اور مشرق سے مغرب تک ان کی حکومت بھی رہی، مگر افسوس جب مسلمانوں نے اس حکم کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ کے شرعی اور کونی نظام کی مخالفت کے نتیجے میں انھیں خود ذلیل ہو کر زندگی گزارنا قبول کرنا پڑا۔ ہاں ایک گروہ ہے جو اس پر اب بھی قائم ہے اور قائم رہے گا اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق غالب رہے گا۔

② حَتّٰى يُعۡطُوا الۡجِزۡيَةَ عَنۡ يَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ : اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کا مقصد ان کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانا نہیں، بلکہ اگر وہ اطاعت قبول کر لیں اور جزیہ دیتے رہیں تو وہ اپنے دین پر رہ کر پر امن زندگی گزار سکتے ہیں، اس کے عوض اسلامی حکومت ان کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو گی۔ یہاں صرف اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا ذکر ہے، یعنی اہلِ کتاب کے سامنے تین راستے ہیں، مسلمان ہو جائیں یا جزیہ دے کر ماتحتی قبول کر لیں یا لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ رہے دوسرے کفار تو عرب کے مشرکین کے سامنے دو ہی راستے تھے، اسلام قبول کریں یا قتل ہونے کے لیے تیار ہو جائیں، الا یہ کہ وہ اس سے پہلے ہی جزیرۂ عرب سے نکل جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مجوس سے بھی اہلِ کتاب والا معاملہ کیا۔ [بخاری، الجزية، باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب : ۳۱۵۶، عن عبد الرحمن بن عوف رضي الله عنه] باقی دنیا کے مشرکین کے متعلق تاریخ اسلام میں مشرکین عرب والے سلوک کا کہیں ذکر نہیں، مثلاً ہندو، بدھ اور دوسرے بت پرست وغیرہ، بلکہ مسلمانوں نے انھیں بھی اپنی رعایا بنا کر ان سے بہترین سلوک کیا۔ اگر اسلامی لڑائی کا مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو جس طرح عیسائیوں نے اندلس میں اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان عیسائی نہ ہونے پر مٹا دیا، اسی طرح مصر، شام، عراق، ایران، ہند، چین، ترکستان وغیرہ ہر جگہ سے بزور شمشیر کفار کو ختم کر دیا جاتا۔ برصغیر میں مسلمان اقلیت میں نہ ہوتے،

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کا اپنے مونہوں کا کہنا ہے، وہ ان لوگوں کی بات کی مشابہت کر رہے ہیں جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ انھیں مارے، کدھر بہکائے جا رہے ہیں ﴿۳۰﴾

بلکہ سارا ہند مسلمان ہوتا اور یہاں کفار کا نام و نشان تک نہ ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا، ارشاد ہوتا ہے: ﴿ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ﴾ [البقرۃ : ۲۵٦] ''دین میں زبردستی نہیں۔'' جو مسلمان ہو سوچ سمجھ کر مسلمان ہو۔ ہاں یہ بات حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کسی طرح قبول نہیں کہ دنیا میں اللہ کے باغی غالب ہوں اور اسلام اور مسلمان مغلوب ہو کر رہیں، کیونکہ اس صورت میں نہ دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے نہ فتنہ و فساد ختم ہو سکتا ہے۔ امن صرف اسلام ہی کے ذریعے سے ممکن ہے، اس لیے تمام دنیا کے کفار سے اسلام قبول کرنے یا جزیہ دینے تک لڑتے رہنے کا حکم دیا گیا اور یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ کفار میں اتنی قوت کبھی نہ ہونے پائے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں آ سکیں، بلکہ لازم ہے کہ وہ اسلام کے مقابلے سے دستبردار ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور حقیر ہو کر رہیں۔ ''صٰغِرُوْنَ'' کا معنی یہی ہے کہ وہ محکوم بن کر اسلام کے سائے میں زندگی بسر کریں۔ اس جزیے کی رقم کا تعین ہر علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کو مدنظر رکھ کر کیا جائے گا، جوان کے ہر شخص کی طرف سے ہر سال ادا کیا جائے گا۔ معاذ رضی اللہ عنہ یمن گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ہر بالغ سے ایک دینار یا اس کے برابر وہاں کے بنے ہوئے کپڑے وصول کرنے کا حکم دیا۔ [أبو داوٗد، الخراج، باب فی أخذ الجزیۃ : ۳۰۳۸]

آیت 30 ① وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ ...... : پچھلی آیت میں اہل کتاب کے ساتھ قتال کی چار وجوہ بیان فرمائی تھیں، اب ان میں سے بعض کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص] ''کہہ دے اللہ ایک ہے، اللہ ہی بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ کبھی کوئی اس کے برابر کا ہے۔'' ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کا بیٹا ماننے کی صورت میں اس کی بیوی بھی ماننا پڑے گی اور خاوند، بیوی، باپ، بیٹا ایک ہی جنس سے ہوتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ان سب چیزوں سے پاک ہے۔ الغرض ان سے قتال کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے متعلق ان کا عقیدہ سراسر اللہ تعالیٰ کی توہین اور متعدد معبودوں کو ماننا ہے، تثلیث (تین خدا ماننا) ہو یا حلول (کسی انسان یا مخلوق میں اللہ کا اتر آنا) یا اتحاد کسی انسان کا خدا بن جانا، ان سب کو قرآن نے کفر قرار دیا۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۷۲، ۷۳) پھر جو شخص ہر چیز ہی کو اللہ تعالیٰ قرار دے، ''ہر میں ہر'' کا نعرہ لگائے، وحدت الوجود کو معرفت قرار دے، اس کے کفر میں کیا شک ہے؟ اسی طرح اب اگر کوئی مسلمان بھی یہ عقیدہ رکھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اللہ تعالیٰ ہی تھے، یا اس کے نور کا ٹکڑا تھے، یا اولیاء میں اللہ تعالیٰ اتر آتا ہے، یا ترقی کر کے ولی بھی اللہ تعالیٰ بن جاتا ہے اور اس کے اختیارات کا مالک بن جاتا ہے، اس

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا

انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا

لیے وہ " أَنَا الْحَقُّ " (میں ہی حق یعنی اللہ ہوں) کا نعرہ لگاتا ہے اور "سُبْحَانِيْ مَا اَعْظَمَ شَانِيْ" (میں پاک ہوں، میری شان کتنی بڑی ہے) کہتا ہے، تو بے شک یہ مسلمان کہلاتا رہے حقیقت میں یہود و نصاریٰ میں اور اس میں کوئی فرق نہیں اور ہندوؤں کے کروڑوں خداؤں کے عقیدے اور اس کے عقیدے میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اس خبیث عقیدے سے تو تمام دین، تمام انبیاء و رسل اور ان کے احکام ہی بے کار ٹھہرتے ہیں۔ ایسے عقیدے والا شخص اپنے آپ کو تصوف یا معرفت یا طریقت کے پردوں میں لاکھ چھپائے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی تمام شریعتوں، رسولوں، کتابوں اور ان کے احکام کا منکر ہے، جس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے تقدس کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔

② ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ : یعنی نہ عقل سے اس کی کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے نہ نقل سے، محض منہ کی بے کار بات ہے، جیسے خواہ مخواہ کوئی شخص مہمل اور بے معنی باتیں کرتا رہے۔

③ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ : یعنی (یہ لوگ) اہل کتاب ہو کر بھی مشرکوں کی ریس کرنے لگے۔ (موضح) اور پہلی مشرک اور کافر قوموں کی طرح گمراہ ہو گئے۔ صاحب المنار فرماتے ہیں کہ شرق و غرب کے قدیم بت پرستوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن اللہ ہونے، حلول اور تثلیث (اور متعدد معبودوں) کا عقیدہ ہند کے برہمنوں میں معروف تھا (اور اب بھی ہے)، اسی طرح چین، جاپان، قدیم مصریوں اور قدیم ایرانیوں میں بھی یہ عقائد مشہور و معروف تھے۔ اہل کتاب بھی ان کفار کی ریس کرنے لگے اور اب بعض مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑے۔

④ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ : یعنی یہ لوگ اس کے حق دار ہیں کہ ان کے حق میں یہ بددعا کی جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو دعا یا بددعا کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو خود جو چاہے کر سکتا ہے۔

آیت 31 ① اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ ...... : "حَبْرٌ" حاء کی زبر اور زیر دونوں کے ساتھ آتا ہے اور باء ساکن ہے، وہ عالم جو بہت خوب صورت اور پختہ بات کہے۔ یہ "تَحْبِيْرٌ" سے ہے جس کا معنی مزین کرنا ہے۔ رہبان، راہب کی جمع ہے، ڈرنے والا، یعنی جو اللہ کے خوف سے دنیا ترک کر کے لوگوں سے الگ کسی کٹیا میں جا ڈیرہ لگائے۔ ان کے مسیح ابن مریم علیہ السلام کو رب بنانے کا ذکر تو اوپر بھی آ چکا ہے، کیونکہ بیٹا باپ کے اختیارات میں اس کا شریک اور جانشین ہوتا ہے، اس لیے مسیح علیہ السلام کو بیٹا ماننے پر ان کو رب بنانے میں کیا کسر رہ گئی۔ رہے ان کے عالم اور درویش تو انھیں رب بنانے والے کچھ لوگ تو وہ تھے جو واقعی کائنات میں ان کا حکم چلنے کا عقیدہ رکھتے تھے، جس طرح آج کل بعض مسلمان پیروں، فقیروں کو سجدہ کرتے، ان سے اولاد، حاجتیں اور مرادیں مانگتے ہیں اور یہ باطل عقیدہ رکھتے ہیں کہ کائنات کو قطب، ابدال اور اوتاد چلا رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ان پہلوں ہی کے نقش قدم پر چل رہے

لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱

حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ۝۳۱

ہیں، مگر بعض اہل کتاب نے انھیں ایک اور طریقے سے رب بنا رکھا تھا۔ چنانچہ عدی بن حاتم طائی، جو مسلمان ہو چکے تھے، فرماتے ہیں میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بت اپنے آپ سے اتار کر پھینک دو۔'' اور میں نے آپ سے سنا کہ آپ سورۂ براءت میں یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ میں نے کہا: ''احبار و رہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ ان کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے، لیکن وہ جب ان کے لیے کوئی چیز حلال کر دیتے اسے حلال سمجھ لیتے اور جب ان پر کوئی چیز حرام کرتے تو اسے حرام سمجھ لیتے۔'' [ترمذی، التفسیر، باب و من سورة التوبة : ۳۰۹۵، و حسنه الألبانی]

گویا یہ ان کا دوسرا شرک تھا کہ انھوں نے حلال و حرام قرار دینے کا اختیار اپنے مشائخ و علماء کو دے دیا، حالانکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور ان پر لازم تھا کہ اپنے نبی کے بتائے ہوئے طریقے اور فرامین پر قائم رہتے۔ بالکل یہی طرز عمل ہمارے زمانے کے مقلدین کا ہے کہ ان کے امام کا قول صاف قرآن یا صحیح حدیث کے خلاف آ جائے تب بھی وہ قرآن اور صحیح حدیث ماننے کے بجائے اپنے امام کے حلال کردہ کو حلال اور اس کے حرام کردہ کو حرام کہیں گے، پھر اس پر اصرار کریں گے، مثلاً قرآن مجید کا صاف حکم ہے کہ رضاعت کی مکمل مدت دو سال ہے، مگر کچھ لوگوں نے اسے ماننے کے بجائے اپنے امام کے کہنے پر اسے اڑھائی سال قرار دے لیا اور رسول اللہ ﷺ کے صحیح اور صریح فرمان: ''ہر نشہ آور حرام ہے'' کے باوجود کھجور اور انگور کے سوا کسی بھی چیز سے بنی ہوئی نشہ آور چیز کو حلال قرار دے لیا، زنا کو حلالہ کہہ کر حلال کر لیا، اجرت پر لائی عورت سے زنا پر حد معاف کر دی، تیز دھار آلے اور آگ کے سوا جان بوجھ کر کسی بھی طریقے سے قتل کر دینے پر قصاص ختم کر دیا، بادشاہِ وقت سے اللہ تعالیٰ کی کئی حدود بالکل ہی معاف کر دیں، چور کے چوری کے مال پر ملکیت کے خالی دعوے سے، جس پر وہ کوئی دلیل بھی نہ دے، چوری کی حد ختم کر دی، گانے بجانے اور رقص کو مشائخ کے کہنے پر معرفت اور روح کی غذا قرار دے لیا اور بعض مشائخ و علماء نے عوام سے یہ بیعت لینا شروع کر دی کہ ہمارا ہر حکم، خواہ وہ قرآن و حدیث کے موافق ہو یا مخالف، تم مانو گے۔ بتایئے ان مسلمانوں کے احبار و رہبان کو رب بنانے میں کیا کسر رہ گئی؟! خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمان بالکل پورا ہوا کہ تم ہو بہو پہلے لوگوں کے نشان قدم پر چل پڑو گے، پھر ہر گروہ کے اپنے پیشوا کی غلط باتوں پر ڈٹ جانے سے مسلمانوں میں ایسا شگاف پڑا جو قرآن و حدیث کی طرف واپس آنے کے بغیر کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ ''اِتَّسَعَ الْخَرْقُ عَلَى الرَّاقِعِ'' کی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ شگاف پیوند لگانے والے کی بساط سے بھی زیادہ کھلا ہو گیا۔ پہلے (۷۲) گروہ بنے تھے یہ (۷۳) بن گئے۔ [فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ]

② یہود و نصاریٰ کا اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کا اختیار دینا انھیں رب بنانا تھا، اب جب یہود و نصاریٰ نے احبار و

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۳۲

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں اور اللہ نہیں مانتا مگر یہ کہ اپنے نور کو پورا کرے، خواہ کافر لوگ برا جانیں ۝۳۲

رہبان کے کرتوتوں کو دیکھ کر ان سے بغاوت کر دی تو عوام کی اکثریت کو حلال و حرام کا اختیار دے کر انھیں رب بنا لیا اور اس نئے دین کا نام جمہوریت رکھا، جس میں حلال و حرام کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بجائے پارلیمنٹ کی اکثریت کرتی ہے، جو صریح شرک ہے۔ افسوس کہ مسلمان اس شرک میں ان کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں، بلکہ اسلام سے اس بغاوت پر فخر کرتے اور دن رات اس کی تعریف کرتے ہیں اور یہ کہنے میں کوئی حیا محسوس نہیں کرتے کہ رسول اللہ ﷺ بھی جمہوریت نافذ کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان بے چاروں کو معلوم نہیں کہ جمہوریت صرف ان امور میں مشورے کا نام نہیں جہاں اللہ اور اس کے رسول کا حکم موجود نہ ہو بلکہ یہ ایک الگ دین ہے جس کا رب بھی عوام یا ان کے نمائندے ہیں اور رسول بھی۔ انھی کو حلال و حرام اور جائز و ناجائز قرار دینے کا حق حاصل ہے۔ اس دین میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول یا اس کی کتاب کا کچھ دخل نہیں، ہاں دھوکا دینے کے لیے ان کا نام استعمال ہوتا ہے۔

③ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ : مسیح ابن مریم علیہ السلام کو دوبارہ لا کر ان کا رب بنانا اس لیے ذکر فرمایا کہ یہودیوں نے عزیر علیہ السلام یا علماء و رہبان کی پرستش اس طرح نہیں کی تھی جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کی کی اور نہ وہ اس معنی میں عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ماننے کا اقرار کرتے ہیں جن معنوں میں نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ رہے احبار و رہبان تو ان کو یہود و نصاریٰ دونوں نے ایک ہی معنی میں رب بنایا تھا۔ پیچھے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا ذکر کر کے ان کی اس دلیل کو بھی بے معنی قرار دیا تھا کہ وہ تو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے، اگر وہ رب نہیں تو ماں سے پیدا ہونے والا کیسے رب ہو گیا؟

④ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا: یعنی یہ تمام بے ہودگی یہود و نصاریٰ نے تورات میں موجود واضح احکام کے باوجود اختیار کی کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، جو اب بھی تورات کی تحریف کے باوجود مختلف الفاظ کے ساتھ اس میں جا بجا موجود ہیں۔

آیت 32 يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ ...... : اللہ کے نور سے مراد اسلام اور اس کے صدق کے دلائل ہیں جو بے انتہا روشن ہیں۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ کی تیسری قبیح صفت کا بیان ہے کہ وہ اسلام کے پھیلاؤ کو روکنے اور اسے مٹانے کے لیے ہر قسم کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ یہاں ان کی اسلام کو روکنے اور مٹانے کی تمام کوششوں کے بے کار ہونے کو استعارے کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک طرف بہت ہی بڑا نور مثلاً سورج یا چاند ہو اور دوسری طرف اسے

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تا کہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جانیں ﴿۳۳﴾

بجھانے کی سب سے کمزور کوشش منہ سے پھونکیں مارنا ہو تو ان پھونکوں کا انجام ہر ایک پر واضح ہے۔ اسی طرح ایک طرف اللہ کا نور، یعنی اسلام ہے، جسے اللہ تعالیٰ ہر حال میں پورا کرنا طے کر چکا ہے، دوسری طرف ان یہود و نصاریٰ کی اسے روکنے اور مٹانے کی حقیر اور بے کار کوششیں ہیں، جو سورج کو نہیں بلکہ کائنات کے سب سے بڑے نور کو سب سے حقیر چیز منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں۔ بھلا اس سے وہ نورِ اسلام کی تکمیل کو روک سکتے ہیں؟

آیت 33 هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ ...... : اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا دین اس لیے نہیں آیا کہ وہ کسی دوسرے دین، بت پرستی، دہریت، یہودیت، عیسائیت، جمہوریت یا سوشلزم سے مغلوب ہو کر اس سے مصالحت کر کے دنیا میں زندہ رہے، بلکہ دینِ اسلام کا اول و آخر مقصد یہ ہے کہ وہ دوسرے تمام ادیان اور نظام ہائے زندگی کو مغلوب کر کے ساری دنیا پر غالب دین اور نظام زندگی کی حیثیت سے زندہ رہے۔ یہاں ''لِيُظْهِرَهٗ'' میں ظہور (غلبہ) سے مراد دلائل و براہین کے ساتھ غلبہ بھی ہے اور حکمرانی کے لحاظ سے بھی۔ پہلی قسم کا غلبہ تو ہمیشہ اور دائمی ہے اور آج تک کوئی شخص قرآن کے چیلنج تین آیتوں کی سورت کا جواب لانے کی جرأت نہیں کر سکا۔ دوسری قسم کا غلبہ ایک مرتبہ ہم دورِ نبوت و خلافت میں دیکھ چکے ہیں اور دوبارہ مزید غلبے کی بشارتیں ضرور پوری ہو کر رہیں گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے صحیح مومن ہونے کی شرط لگائی ہے، فرمایا: ﴿ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [آل عمران : ۱۳۹] ''اور تم ہی غالب ہو اگر تم مومن ہو۔'' الحمد للہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مختلف مقامات پر جہاد کے ساتھ اس کے آثار شروع ہو چکے ہیں۔ ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے لیے یہ زمین، اس کے مشرق و مغرب لپیٹ دیے گئے اور میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی جو میرے لیے اس میں سے لپیٹا گیا ہے۔'' [مسلم، الفتن، باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض : ۲۸۸۹]

مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمین کی پشت پر نہ کوئی اینٹ کا مکان اور نہ پشم کا (خیمہ) باقی رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کا کلمہ داخل کر دے گا، عزت والے کو عزت بخش کر اور ذلیل کو ذلت دے کر، یا تو انھیں عزت بخشے گا تو وہ اس میں داخل ہو جائیں گے، یا انھیں ذلیل کرے گا تو اس کے تحت ہو جائیں گے۔ [مستدرك حاكم : ۴/ ۴۳۰، ح : ۸۳۲۴، و صححه هو والذهبي] یہ پیش گوئی ابھی پوری نہیں ہوئی، پوری ہو کر رہے گی۔ (ان شاء اللہ) جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ

يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَ الرُّهۡبَانِ لَيَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک بہت سے عالم اور درویش یقیناً لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، اس پر مسلمانوں کی ایک قوی جماعت لڑتی رہے گی، حتیٰ کہ قیامت قائم ہو۔'' [مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ : لا تزال طائفة من أمتي...... : ۱۹۲۲]

آیت 35،34 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّهۡبَانِ...... : سلسلۂ کلام کو دیکھیں تو یہاں احبار و رہبان سے مراد اہل کتاب کے عالم اور درویش ہیں، مگر الفاظ عام ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے علماء اور زہاد وصوفیا بھی اس میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ سب احبار و رہبان کو ایک جیسا قرار نہیں دیا بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں کا یہ حال بیان فرمایا کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ مائدہ (۶۲، ۵۹) رازی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہود و نصاریٰ کے بہت سے احبار و رہبان کے فخر و کبر، اللہ کے محبوب ہونے، عام لوگوں سے اونچی مخلوق ہونے اور خدائی اختیارات کے دعووں کا ذکر کیا تو اب بتایا کہ ان تمام چیزوں کے اظہار سے ان کا مقصود لوگوں سے رشوت لے کر، غلط مسئلے بتا کر، رسول اللہ ﷺ کے متعلق بشارتوں کو چھپا کر اور ان کو غلط معنی پہنا کر ان کا مال باطل طریقے سے ہتھیانا اور انھیں اللہ کے راستے، یعنی اسلام سے روکنا ہے۔ اللہ جانتا ہے آپ یہود و نصاریٰ کے بہت سے احبار و رہبان کی جگہ آج کل مسلمانوں کے بہت سے احبار و رہبان کا لفظ لگا دیں تو آپ دونوں میں کوئی فرق نہیں پائیں گے، وہی خدا کے محبوب ہونے اور اس سے ہم کلام ہونے کے دعوے، اسی طرح ترک دنیا کا اظہار جس کے پیچھے بدترین حرص چھپی ہوئی ہے، تقدس کا اظہار جس کے پیچھے کتنی عفیفاؤں کی عزت لوٹنے کی وارداتیں موجود ہیں، دین اسلام کے عالم، ستون اور محقق ہونے کے دعووں کے باوجود وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنے یا اپنے پیشواؤں کے اقوال کو اللہ اور اس کے رسول کا حکم کہہ کر پیش کرتے اور اصل قرآن وسنت سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو کسی گدی نشین، خانقاہ کے شیخ یا دار العلوم کے حضرت صاحب (الا ما شاء اللہ) کا تجربہ کر لیں، آپ کو وہی فرشتوں جیسی پاکیزگی اور دنیا سے کامل بے رغبتی کے اظہار کے پیچھے بہت کچھ چھپا ہوا مل جائے گا۔ جس سے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی تصدیق ہوگی، آپ نے فرمایا: ''یقیناً تم اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر (برابر) سوار ہو جاؤ گے، جس طرح ایک بالشت دوسری بالشت کے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔'' [مستدرك حاكم ٤/ ٤٥٥، ح: ٨٤٠٤] ہاں، یہ اللہ کا شکر ہے کہ اس دین کی حفاظت کا ذمہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہوا ہے، اس لیے آپ ہی کی پیش گوئی کے مطابق مسلمانوں میں اصل دین پر قائم رہنے والے اہل حق ہر طبقہ، مثلاً علماء، زہاد، مجاہدین، تجار وغیرہم میں قیامت تک موجود رہیں گے اور اللہ کی مدد سے غالب و منصور

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۴ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

کرتے، تو انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دے ۳۴ جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے خزانہ بنایا تھا، سو چکھو جو تم خزانہ بنایا کرتے تھے ۳۵

رہیں گے، جیسا کہ چند احادیث پچھلی آیت کی تفسیر میں گزری ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے ان لوگوں میں شامل فرمائے۔

2 وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ...... : اس میں ”اَلَّذِيْنَ“ (وہ لوگ) سے مراد بعض صحابہ اور مفسرین نے یہود و نصاریٰ کے احبار و رہبان ہی لیے ہیں، جن کی پہلی دو کمینگیوں (باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانا اور اللہ کی راہ سے روکنا) کے بعد تیسری کمینگی سونا چاندی جمع کرنا بیان فرمائی ہے، کیونکہ بات انھی کی ہو رہی ہے، لیکن اکثر صحابہ اور مفسرین کے مطابق الفاظ کے عام ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مسلمان، یہ کمینگی جس میں بھی پائی جائے وہ اس وعید کا مستحق ہے اور حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی بھی شخص جو سونے یا چاندی کا مالک ہو، اس سے اس کا حق ادا نہ کرے، اس کے لیے قیامت کے دن آگ سے (اس سونے یا چاندی کی) سلاخیں یا تختے بنائے جائیں گے، پھر جہنم کی آگ میں انھیں خوب گرم کر کے اس کے پہلو، پیشانی اور پیٹھ کو داغا جائے گا، جب وہ ٹھنڈے ہو جائیں گے تو انھیں دوبارہ گرم کر لیا جائے گا، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، یہاں تک کہ بندوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے، تو وہ جنت یا آگ کی طرف اپنا راستہ دیکھے گا۔“ (لمبی حدیث ہے جس میں اونٹوں، بکریوں اور گھوڑوں وغیرہ کا حق ادا نہ کرنے والوں کی وعید بھی مذکور ہے) [مسلم، الزکاۃ، باب إثم مانع الزکاۃ : ۹۸۷/۲۴]

3 وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ : اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یہ ہے کہ زکوٰۃ دیتا رہے، اس کے علاوہ بھی ضرورت مندوں پر خرچ کرتا رہے، حاجت مندوں کو قرض دے، حق داروں کا حق ادا کرے، جیسا کہ ”لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا“ والی آیت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال دینے کا بیان ہے۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۱۷۷) مثلاً اہل خانہ کے اخراجات، مہمان کی ضیافت، مسجد بنانا، جہاد کی تیاری میں مال خرچ کرنا وغیرہ۔

4 فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ : بعض صحابہ جیسے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی رو سے مطلقاً سونا چاندی جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے، مگر جمہور صحابہ جیسے امیر المومنین عمر، ابن عمر، ابن عباس، جابر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اس طرف گئے ہیں کہ جس مال کی زکوٰۃ دے دی جائے وہ یہ کنز نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس وعید کے تحت آتا ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”یہ زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے، جب زکوٰۃ کا حکم اترا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اموال کے پاک کرنے کا ذریعہ بنا دیا۔“ [بخاری، التفسیر، باب قولہ عز وجل : ﴿ يوم يحمى عليها ﴾ : ۴۶۶۱] اگر ضرورت سے زائد سارا مال خرچ کرنا واجب ہو تو میراث

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ

بے شک مہینوں کی گنتی، اللہ کے نزدیک، اللہ کی کتاب میں بارہ مہینے ہے، جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا

اور وصیت وغیرہ کا کچھ مطلب باقی نہیں رہتا اور ایک صحابی کو رسول اللہ ﷺ نے ارکانِ اسلام بتاتے ہوئے جب زکوٰۃ کے فرض ہونے کا ذکر فرمایا تو اس نے پوچھا: ((هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟)) ''کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی فرض ہے؟'' تو آپ ﷺ نے جواب دیا: ((لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ)) ''نہیں، مگر یہ کہ تو خوشی سے دے۔'' یعنی اس سے زائد فرض نہیں نفل ہے۔ [بخاری، الإیمان، باب الزکوٰۃ : ٤٦۔ مسلم : ١١]

زکوٰۃ جس کی ادائیگی سے مال کنز کے حکم میں نہیں رہتا، پاک ہو جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی مقدار مقرر فرمائی۔ چاندی پانچ اوقیہ (٢٠٠ درہم) سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔ جب دو سو درہم ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں پانچ درہم زکوٰۃ ہو گی، یعنی اڑھائی فیصد (چالیس میں سے ایک درہم) اور سونے میں جب تک بیس دینار نہ ہوں زکوٰۃ نہیں، جب بیس دینار ہوں اور ان پر سال گزر جائے تو ان میں نصف دینار زکوٰۃ ہے، جو زیادہ ہو اس کی زکوٰۃ اسی حساب سے ہو گی۔ [أبو داؤد، الزکاۃ، باب زکاۃ السائمۃ : ١٥٧٣، عن علی، عن رسول اللہ ﷺ و صححہ الألبانی]

آیت 36 ❶ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا ...... : سورۂ توبہ میں مشرکین سے براءت اور ان سے جہاد کے درمیان ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾ آیت (٢٩) سے لے کر ﴿ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ آیت (٣٥) تک سات آیات میں اہل کتاب سے قتال اور ان کے تینوں سربرآوردہ طبقات احبار، رہبان اور مال دار لوگوں کے بگاڑ کا ذکر اور مذمت کرنے کے بعد آگے ان دو آیات میں مشرکین کی کچھ مزید خرابیوں کا ذکر فرمایا۔

❷ یہود و نصاریٰ کی طرح مشرکین عرب بھی اللہ کے احکام بدلنے کے لیے حیلہ سازی سے کام لیتے تھے، مثلاً آسمان و زمین کی پیدائش کے دن سے تمام ادیان میں یہ طریقہ چلا آ رہا تھا کہ مہینے اور سال شمسی حساب یعنی سورج کے بجائے قمری حساب یعنی چاند کے لحاظ سے معتبر سمجھے جاتے تھے اور تمام عبادات میں یہی تاریخیں ملحوظ رکھی جاتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی طریقہ قائم رکھا، کیونکہ چاند کی حالت کا روزانہ بدلنا تاریخ کے تعین میں اتنا واضح اور آسان ہے کہ آبادیوں کے علاوہ جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور سمندروں میں رہنے والے لوگ کسی کیلنڈر کی محتاجی کے بغیر مہینوں اور سالوں کا حساب آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ﴾ [یونس : ٥] ''وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔'' اللہ تعالیٰ نے تمام شرعی احکام قمری حساب کے مطابق رکھے، جس میں دوسری بے شمار حکمتوں کے ساتھ یہ حکمت بھی ہے کہ یہ عبادات ہر سال ایک ہی موسم میں نہ آئیں بلکہ بدل بدل کر آتی رہیں، ورنہ کسی علاقے میں روزے ہمیشہ گرمی میں آتے، کہیں ہمیشہ سردی میں۔ قمری حساب کی وجہ سے حج بھی مختلف موسموں میں آتا ہے، تاکہ مسلمان سختی اور نرمی

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ

کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ سو ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور مشرکوں سے ہر

دونوں حالتوں میں روزہ و حج اور اللہ کے دوسرے احکام ادا کرنے کی عادت ڈال سکیں۔

قمری مہینا ۲۹ یا ۳۰ دن کا ہوتا ہے، نہ اس سے ایک دن کم نہ زیادہ اور سال بارہ ماہ میں ۳۵۴ یا ۳۵۵ دنوں کا ہوتا ہے، جبکہ شمسی سال ۳۶۵ دن اور ایک دن کے چوتھائی حصے کے برابر ہوتا ہے اور اس کے بارہ ماہ میں سے کوئی تیس، کوئی اکتیس دن کا اور فروری ۲۸ دن کا ہوتا ہے جو چوتھے سال ۲۹ دن کا شمار کیا جاتا ہے، شمسی سال کا ہر ماہ اور دن اپنے مقرر موسم ہی میں آتا ہے۔

③ قمری مہینوں میں سے چار ماہ کو دین ابراہیمی میں حرمت والے مہینے قرار دیا گیا تھا، جن میں ہر قسم کی لڑائی حرام تھی، حتیٰ کہ اگر کوئی ان دنوں میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ لیتا تو قتل نہ کرتا، جن میں سے تین مسلسل تھے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم، تاکہ حج کے ایام اور ان سے ایک ماہ پہلے اور ایک ماہ بعد پورے عرب میں لوگ حج کے لیے بے خوف اور پرامن ہو کر حج کر سکیں اور رجب کا مہینا الگ رکھا، تاکہ لوگ امن کے ساتھ عمرہ کے لیے آنے جانے کا سفر کر سکیں۔

④ اللہ تعالیٰ نے یہاں مہینوں کی گنتی بارہ ماہ ہونے کی صراحت اس لیے فرمائی ہے کہ مشرکین عرب حج کو شمسی سال کی طرح ہر سال ایک ہی دن خوشگوار موسم میں ادا کرنے کے لیے قمری مہینوں کے سال کو شمسی سال کے برابر کرنے کے لیے کبھی قمری سال میں اضافہ کر کے اسے تیرہ یا چودہ ماہ کا کر لیتے تھے اور اسے ''کبیسہ'' کہتے تھے۔ یہ بھی ''نسیٔ'' کی ایک صورت تھی، یعنی حرمت والے مہینے اپنے اصل مقام سے مؤخر ہو جاتے تھے اور حلال مہینوں کو وہ حرمت والا قرار دے لیتے تھے۔ جس سال رسول اللہ ﷺ نے حج کیا اس سال اتفاق سے حج اپنے اصلی دن، یعنی قمری لحاظ سے ۱۰ ذوالحجہ کو ادا ہوا تھا، اس کے بعد سے لے کر اللہ کے حکم کے مطابق حج اور اسلام کی دوسری تمام عبادات قمری تاریخ کے مطابق اصل وقت ہی پر ادا ہو رہی ہیں۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جو ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (حجۃ الوداع کے خطبہ میں) فرمایا: ''زمانہ گھوم پھر کر اپنی اس اصل پر آ گیا ہے جو اس دن تھی جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ ماہ کا ہے، جن میں سے چار حرمت والے ہیں، تین پے در پے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور مضر قبیلے کا رجب جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے۔'' [بخاري، المغازي، باب حجة الوداع : ۴۴۰۶] آپ ﷺ نے اسے مضر کا رجب اس لیے فرمایا کہ بنو ربیعہ رمضان کو حرمت کا مہینا قرار دیتے تھے اور بنو مضر اصل رجب کو، اس لیے آپ ﷺ نے اس کے جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہونے کی تصریح فرمائی۔

⑤ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ : اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے مہینوں میں بے شک اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہو، بلکہ کچھ مقامات اور اوقات جو زیادہ فضیلت رکھتے ہیں، مثلاً مکہ، مدینہ، بیت المقدس، اللہ تعالیٰ کی مساجد، ماہ رمضان، لیلۃ القدر، حرمت والے ماہ وغیرہ، ان میں نیکی کی تاکید زیادہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ [البقرۃ :

كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي
الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

حال میں لڑو، جیسے وہ ہر حال میں تم سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ بے شک اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہے ﴿۳۶﴾ حقیقت یہی
ہے کہ مہینوں کو پیچھے کر دینا کفر میں زیادتی ہے، جس کے ساتھ وہ لوگ گمراہ کیے جاتے ہیں جنھوں نے کفر کیا، ایک سال

۲۳۸] ''سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی۔'' اسی طرح ان میں ظلم سے باز رہنے کی تاکید بھی زیادہ ہے، حتیٰ کہ حرم مکہ میں ظلم کے ساتھ الحاد (کج روی) کے ارادے پر بھی عذاب الیم کی وعید ہے۔ دیکھیے سورۂ حج (۲۵) جب کہ دوسری جگہوں میں ارادے پر یہ مؤاخذہ نہیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مہینوں کو آگے پیچھے کر کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر کے اپنے آپ پر ظلم مت کرو۔

⑥ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ...... : ''كَآفَّةً'' مصدر ہے اور فاعل اور مفعول دونوں سے حال بن سکتا ہے۔ یہ لفظ اسی طرح آتا ہے، اس کا تثنیہ یا جمع نہیں آتا، نہ اس پر ''الف لام'' آتا ہے اور یہ لازماً مؤنث ہی آتا ہے، جیسا کہ '' عَامَّةً '' یا ''خَاصَّةً '' ہے۔ ''كَآفَّةً'' کا معنی ''جَمِيْعًا '' ہے۔ اس کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ جس طرح مشرکین تم سے سب کے سب اکٹھے ہو کر لڑتے ہیں تم بھی سب مل کر ان سے اکٹھے ہو کر لڑو۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ بے شک یہ چار مہینے حرمت والے ہیں، مگر مشرکین چونکہ اس کی پروا نہیں کرتے اور عین حرمت والے مہینوں میں بھی وہ تم سے لڑنے سے دریغ نہیں کرتے، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ذوالقعدہ میں وہ لڑنے پر تیار ہو گئے تھے، اس سے پہلے انھوں نے حرم کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا تھا اور پھر وہاں داخلے سے روک دیا تھا، مسلمانوں پر ظلم کرنے میں نہ حرم کا خیال رکھا نہ حرمت والے مہینوں کا، اس لیے تم بھی ان سے تمام مہینوں میں اور ہر حال میں ہر جگہ لڑو، جس طرح وہ تم سے ہر حال میں ہر جگہ اور تمام مہینوں میں لڑتے ہیں۔ تفصیل ''التحریر والتنویر'' میں دیکھیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اور لڑو مشرکوں سے ہر حال، جیسے وہ لڑتے ہیں تم سے ہر حال۔'' اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ صراحت فرمائی ہے: ﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ [البقرۃ : ۱۹۴] ''حرمت والا مہینا حرمت والے مہینے کے بدلے ہے اور سب حرمتیں ایک دوسری کا بدلہ ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اگر مشرکین حرمت والے مہینوں کی حرمت اور حرم مکہ کی حرمت کا پوری طرح پاس کریں اور ان میں کوئی جنگی کارروائی نہ کریں تو مسلمانوں کو بھی اس کا پاس رکھنا چاہیے، ورنہ ہر وقت اور ہر جگہ ان کے خلاف جنگ کی جائے گی، فرمایا: ﴿ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ﴾ [البقرۃ : ۱۹۱] ''اور مسجد حرام کے پاس ان سے نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں۔''

آیت 37 اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ......: ''النَّسِيْٓءُ'' یہ '' فَعِيْلٌ '' کے وزن پر مصدر ہے۔ ''نَسَأَ الشَّيْءَ'' کا

فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ يٰۤاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ

اسے حلال کر لیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام کر لیتے ہیں، تا کہ ان کی گنتی پوری کر لیں جو اللہ نے حرام کیے ہیں، پھر جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے گئے ہیں اور اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا﴿۳۷﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کے راستے میں

معنی ہے اس نے فلاں چیز کو مؤخر (پیچھے) کر دیا۔ اونٹوں کو حوض سے ہٹایا جائے تو کہا جاتا ہے: ''نَسَأْتُ الْإِبِلَ عَنِ الْحَوْضِ'' ''میں نے اونٹوں کو حوض سے پیچھے ہٹا دیا۔'' مشرکین ''نسی'' دو طرح سے کرتے تھے، ایک تو وہ جو اوپر حاشیہ (۴) میں بیان ہوا ہے، دوسرا یہ کہ وہ لوگ جنگ و جدل اور لوٹ مار کے عادی تھے، مسلسل تین ماہ اس کام سے باز رہنا ان کے لیے مشکل تھا، اس لیے وہ حرمت والے مہینے، مثلاً محرم کو حلال قرار دے کر اس سے اگلے ماہ صفر کو حرمت والا مقرر کر لیتے۔ ان کے ہاں بس چار ماہ حرمت والے پورے کرنے ضروری تھے، رہی ان کی تعیین تو وہ انھوں نے اپنے اختیار میں لے رکھی تھی، اسی کو اللہ تعالیٰ نے کفر میں زیادتی قرار دیا، کیوں کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینا تو اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادات کے اوقات جو قمری حساب سے بدل بدل کر ہر موسم میں آتے رہتے تھے انھوں نے ان کے اصل اوقات سے ہٹا دیے تھے، یہ بھی کفر پر مزید کفر تھا۔ پھر وہ اپنے اس عمل پر خوش تھے اور شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال بھی خوشنما بنا دیے تھے۔ ﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ یعنی اب جو حق کو چھپانے اور اس سے انکار پر تل ہی جائے تو اللہ تعالیٰ اسے سیدھے راستے پر کیوں لائے گا؟ کفر کا معنی چھپانا اور انکار دونوں آتے ہیں۔

آیت 38 ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا ......: سورت کے شروع سے لے کر ۳۷ آیات تک عرب کے مشرکین سے اعلانِ براءت اور اہل کتاب سے مسلمانوں کے تعلقات اور جہاد کے بنیادی احکام، بدر اور حنین کے واقعات اور ان میں اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی مدد کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد اب جنگ تبوک کا تفصیلی ذکر اور اس میں منافقین کے کردار کو کھول کر بیان کیا گیا ہے اور اس جنگ سے پیچھے رہنے والوں پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے، اس لیے اس سورت کو فاضحہ یعنی منافقین کو رسوا کرنے والی بھی کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں جہاد پر ابھارنے کے لیے وعدہ وعید، انذار و تبشیر اور ثواب و عذاب وغیرہ کے بیان کے کئی طریقے اختیار کیے گئے ہیں، اس لیے اس کا نام بحوث یعنی نہایت ابھارنے والی سورت بھی ہے۔

② علمائے تفسیر متفق ہیں کہ یہاں سے ان لوگوں پر عتاب کا آغاز ہوتا ہے جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہے تھے، جب پھل تیار تھے، گرمی شدید تھی اور سائے نہایت خوش گوار محسوس ہو رہے تھے، اس لیے بعض نام نہاد مسلمان جہاد پر

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

نکلو تو تم زمین کی طرف نہایت بوجھل ہو جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے ہو؟ تو دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں نہیں ہے مگر بہت تھوڑا ﴿۳۸﴾

روانہ ہونے سے جی چرانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بات شروع ہی ایمان کو حرکت دینے سے کی ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تمھیں کیا ہو گیا؟ اپنے ایمان کے تقاضے ہی پر غور کرو، کیا اس کا تقاضا یہی ہے جو جہاد کے لیے نکلنے کے حکم پر تم اختیار کر رہے ہو۔ "اثَّاقَلْتُمْ" اصل میں "تَثَاقَلْتُمْ" تھا جو باب تفاعل سے ہے۔ "ثَقُلَ" سے بڑھا کر تفاعل میں لے جا کر بھاری ہونے کے مفہوم کو انتہا تک پہنچانے کے لیے لفظ بھی آخری حد تک بھاری بنا دیا "اثَّاقَلْتُمْ" یعنی نہایت بھاری اور بوجھل ہو جاتے ہو کہ اٹھانے سے نہیں اٹھتے، اس کا باعث اس کے سوا کیا ہے کہ تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کے معمولی، حقیر اور ناپائدار ساز و سامان پر جو کسی وقت بھی چھن جائے گا، اس آخرت کے مقابلے میں راضی ہو گئے ہو جو ہمیشہ رہنے والی ہے اور جس میں وہ نعمتیں ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھی ہیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ان کا خیال ہی کسی انسان کے دل میں آیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو دنیا کی زندگی کا یہ ساز و سامان تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی تھوڑا ہے، کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ اس کی مثال تو سمندر کے مقابلے میں انگلی ڈبونے سے اس پر لگنے والے پانی کی سی ہے، جیسا کہ مستورد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا ہے۔ [مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب فناء الدنيا ...... : ۲۸۵۸]

③ تبوک ایک مشہور مقام کا نام ہے جو مدینہ سے شمال کی طرف تقریباً چھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ واقعہ فتح مکہ کے بعد ۹ ھ میں پیش آیا۔ اس غزوے کا پس منظر یہ تھا کہ ملک شام پر قبیلہ غسان حکمران تھا، جو شاہِ روم کے تابع تھا، اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیرۂ عرب سے فارغ ہو چکے ہیں، اب ہماری باری ہے تو کیوں نہ شاہِ روم کو بلا کر عرب پر پہلے ہی چڑھائی کر دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ سرزمین عرب سے نکل کر دشمن کے علاقے، یعنی شام میں جا کر انھیں عرب پر حملے سے روکا جائے، چونکہ سفر بہت مشکل اور لمبا تھا، فصل کی کٹائی کا موسم تھا اور سواریاں اور سامان حرب بھی پوری طرح میسر نہ تھا، اس لیے اسے جیش العسرۃ "تنگی کے زمانے کا لشکر" کہا جاتا ہے۔ اس لیے اگرچہ اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ آپ جب کہیں حملہ کرنا چاہتے تو توریہ کرتے، یعنی اصل جگہ کی نشان دہی کے بجائے ادھر ادھر کے متعلق لوگوں سے حالات معلوم کرتے، تاکہ لوگوں کو حملے کے اصل مقام کا پتا نہ چلے، لیکن اب آپ نے لوگوں کو صاف الفاظ میں اپنا ہدف واضح کر دیا اور سب کو نکلنے کا حکم دیا۔ تقریباً تیس ہزار مجاہد تیار ہو گئے۔ آپ نے اس سے پہلے شاہِ روم کو خط بھی لکھا تھا جس میں اسے دین اسلام کی دعوت دی۔ وہ اسلام لانے پر آمادہ بھی ہو گیا، لیکن قوم نے اس کا ساتھ نہ دیا، اس لیے وہ اسلام سے محروم رہا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر تبوک پہنچ گئے اور دشمن کا بیس دن تک انتظار کرتے رہے، مگر کسی میں مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی، نہ ہی کوئی جنگ ہوئی، اس علاقے کے اور ارد گرد کے

اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ وَّ يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ وَلَا تَضُرُّوۡهُ شَيۡـًٔـا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذۡ اَخۡرَجَهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ اِذۡ هُمَا فِى الۡغَارِ اِذۡ يَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلَيۡهِ وَ

اگر تم نہ نکلو گے تو وہ تمھیں دردناک عذاب دے گا اور بدل کر تمھارے علاوہ اور لوگ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ نقصان نہ کرو گے اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۳۹﴾ اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنھوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان

لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت کا عہد کیا، اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے۔ آپ دشمن کو خوف زدہ کر کے اسلام کی دھاک بٹھا کر کامیاب فاتح ہو کر واپس تشریف لائے۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سارا ملک شام فتح ہو گیا اور اسرائیل کے مقبوضہ حصے کے سوا اب تک اسلام کے زیر نگین ہے۔

آیت 39 ﴿ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴾...... : عذاب الیم یعنی دنیا میں ذلت و رسوائی، محکومیت اور غلامی اور آخرت میں آگ کا عذاب جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ ﴿ وَّ يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ ﴾ یعنی یہ نہ سمجھو کہ اگر ہم جہاد کے لیے نہ نکلیں گے تو اللہ تعالیٰ کا کام پورا ہونے سے رہ جائے گا، ہرگز نہیں، اگر تم نہ نکلو گے تو وہ تمھاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور انھیں اسلام غالب کرنے کے لیے جہاد کی سعادت سے نوازے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے، کیونکہ وہ تمھاری یا کسی اور کی مدد کے بغیر خود اکیلا ہی ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔

آیت 40 ① ﴿ اِلَّا تَنۡصُرُوۡهُ فَقَدۡ نَصَرَهُ اللّٰهُ ﴾...... : یعنی اگر تم تبوک کے لیے نہیں نکلو گے اور اس کی مدد نہیں کرو گے تو وہ خود اکیلا ہی اس کی مدد کے لیے کافی ہے، دیکھ لو جب مکہ کے مشرکوں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر کے اسے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کے ساتھ صرف ایک ساتھی تھا، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے کسی کی مدد کے بغیر خود اس کی مدد کی تھی۔ اب بھی اسے تم میں سے کسی کی ضرورت نہیں، ہاں تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ دشمنانِ اسلام کے مقابلے کے لیے نکلو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔

② ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ: ''دو میں سے دوسرا'' سے مراد پہلا ہے۔ ''ثَانِىَ اثۡنَيۡنِ'' میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح ''ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ'' یا ''رَابِعُ اَرۡبَعَةٍ'' میں ثالث یا رابع وہ ہو گا جو پہلا ہو گا، باقی بعد میں ہوں گے، ہاں ''رَابِعُ ثَلَاثَةٍ'' یا ''خَامِسُ اَرۡبَعَةٍ'' میں رابع یا خامس وہ ہو گا جو بعد میں ملے گا اور اس کا نمبر چوتھا یا پانچواں ہو گا۔ [الوسیط للطنطاوی] تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دوسرے ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے اور اکثر دینی منصبوں اور عہدوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۴۰﴾

کے بعد دوسرے نمبر پر وہی فائز رہے۔ سب سے پہلے مسلمان ہوئے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، جس پر بہت سے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم مسلمان ہوئے، جنگوں میں آپ ﷺ سے الگ نہیں ہوئے۔ مرض الموت میں آپ ﷺ کے نہایت تاکیدی حکم کے ساتھ اور کسی بھی دوسرے کی امامت سے آپ ﷺ کے انکار کے بعد آپ کے قائم مقام کی حیثیت سے آپ ﷺ کے مصلے پر کھڑے ہوئے، پھر آپ کے پہلو میں دفن ہوئے، اس طرح اول و آخر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دوسرا ہونے کا شرف حاصل رہا۔

③ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ: یہاں صاحب (ساتھی) ہونے کا شرف بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔ صاحب کا لفظ اصل میں اکثر اوقات ساتھ رہنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے بیوی کو "صَاحِبَةٌ" کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ [الأنعام: ۱۰۱] ''اس کی اولاد کیسے ہوگی جبکہ اس کی کوئی بیوی ہی نہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبِ رسول، یعنی آپ کے خاص ساتھی اور یار غار ہونے کا منکر ہے وہ درحقیقت قرآن کا منکر ہے۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''رفیقِ غار ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، صرف یہی آپ ﷺ کے ساتھ تھے، دوسرے اصحاب بعض پہلے نکل گئے تھے بعض بعد میں آئے۔'' (موضح)

④ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ: اس غار سے مراد ثور پہاڑ کی چوٹی کے قریب واقع غار ہے، جو مکہ سے جنوب کی طرف تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ آپ کا تعاقب کیا جائے گا، اس لیے آپ نے مدینے کا راستہ جو شمال کی طرف ہے، چھوڑ کر جنوب کی سمت اختیار کی اور غار ثور میں چھپ گئے، تاکہ تلاش کرنے والے آپ کو آسانی سے پا نہ سکیں۔ تفسیر ماجدی میں ہے: ''اس غار کا دہانہ اب تک اتنا تنگ ہے کہ اندر صرف لیٹ کر ہی جانا ممکن ہے۔'' شیخ رشید رضا مصری نے تفسیر المنار میں ایک مصری امیر الحج ابراہیم رفعت پاشا (سنِ حج ۱۳۸۱ھ) کے حوالے سے غار کی پیمائش وغیرہ دی ہے اور اس کی تنگی کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ آپ ﷺ وہاں تین دن چھپے رہے، پھر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کی گرفتاری پر انعام مقرر ہو چکا تھا، اس لیے دشمنوں نے آپ کی تلاش کے لیے ہر ممکن کوشش کی، حتیٰ کہ بعض قدموں کے نشان پہچاننے والے غار کے سرے پر پہنچ گئے اور آپ ﷺ کو ان کے قدم نظر آنے لگے، ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے متعلق فکر لاحق ہوئی اور وہ سخت غم زدہ ہو گئے۔

⑤ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا: انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے نبی ﷺ سے کہا، جب کہ میں اس غار میں تھا: ''اگر ان میں سے کوئی شخص اپنے قدموں کے نیچے نظر ڈالے تو ہمیں ضرور دیکھ لے گا۔'' تو آپ ﷺ نے

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

نکلو ہلکے اور بوجھل اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۴۱﴾

فرمایا: ''اے ابوبکر! ان دو کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ ہے۔'' [بخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب مناقب المهاجرين وفضلهم...... : ۳٦٥٣] ''اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا'' (بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے) اس ''ساتھ'' سے مراد خاص ساتھ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی خاص مدد اور نصرت، ورنہ عام معیت (ساتھ) تو ہر شخص کو حاصل ہے، فرمایا: ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ [الحدید : ٤] ''اور وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔'' اس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے سمندر کے کنارے پہنچنے پر اور فرعون کی فوج کو دیکھنے پر ان کی قوم نے اپنے پکڑے جانے کا خطرہ پیش کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ ﴾ [الشعراء : ٦٢] ''ہرگز نہیں، بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے۔'' چنانچہ انھوں نے ''مَعِيَ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی معیت میں اپنے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾ ''بے شک اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔''

6 فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ: یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ پر اپنی سکینت نازل فرمائی۔ بعض مفسرین نے مراد ابوبکر رضی اللہ عنہ لیے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ پر تو اللہ تعالیٰ کی سکینت پہلے ہی نازل تھی، مگر اس سے ''عَلَيْهِ'' کی ضمیر کی بعد میں آنے والی ضمیر ''وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا'' کے ساتھ مطابقت نہیں رہتی اور کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر پہلی سکینت کے علاوہ خاص سکینت نازل فرمائی ہو۔ جس سے آپ کے اطمینان میں مزید اضافہ ہوا ہو، اس لیے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ ''عَلَيْهِ'' سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

7 وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا: یعنی فرشتوں کے لشکروں کے ساتھ جنھیں تم نے نہیں دیکھا کہ انھوں نے تعاقب کرنے والوں کی نگاہیں آپ پر پڑنے ہی نہیں دیں۔ جیسا کہ حنین میں مدد فرمائی (دیکھیے توبہ: ۲۶) اور بدر میں (دیکھیے انفال: ۹۔ آل عمران: ۱۲۴، ۱۲۵)۔

8 بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ عنکبوت (مکڑی) نے جالا بن دیا تھا اور کبوتری نے گھونسلا بنا کر انڈے دے دیے تھے، مگر یہ بات ثابت نہیں، الشیخ علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے سلسلہ ضعیفہ میں عنکبوت کے قصے کو ضعیف قرار دیا ہے۔

9 وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى......: یعنی ہجرت، بدر، احد، خندق، حدیبیہ، فتح مکہ، حنین، تبوک، ہر جگہ کفر کو نیچا دکھایا۔ ''وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا'' اور اللہ تعالیٰ کا بول ہی سب سے بالا اور اس کی بات ہی سب سے اونچی ہے، اگر کہیں مسلمان نیچے رہے تو اللہ کی بات کے نیچا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ایمان و عمل کی کسی کمی کی وجہ سے، فرمایا: ﴿ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [آل عمران : ۱۳۹] ''اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مومن ہو۔'' اور دیکھیے سورۂ محمد (۳۵)۔

آیت 41 1 اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا...... : اللہ تعالیٰ نے تبوک کے لیے نہ نکلنے کی صورت میں دنیا و آخرت میں

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ

اگر کوئی قریب سامان اور درمیانہ سفر ہوتا تو وہ ضرور تیرے ساتھ جاتے، لیکن ان پر فاصلہ دور پڑ گیا اور عنقریب وہ اللہ کی

عذاب الیم کی وعید سنا کر اور نبی ﷺ کو اللہ کے سوا کسی کی مدد کا محتاج نہ ہونے کا ذکر فرما کر اب تاکید کے ساتھ تمام مسلمانوں کو جنگ کے لیے نکلنے کا حکم دیا، اسے ''نفیر عام'' کہا جاتا ہے۔ اس حکم کے بعد ہر مسلمان پر نکلنا فرض ہو جاتا ہے، ماں باپ یا کسی کے اذن (اجازت) کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ''ہلکے اور بوجھل'' الفاظ عام ہیں، اس لیے اس میں سب شامل ہیں، یعنی طبیعت چاہتی ہے یا نہیں، خوش حال ہو یا تنگ دست، مجرد ہو یا عیال دار، جوان ہو یا بوڑھے، ہتھیار بند ہو یا بے ہتھیار، ہر حال میں جہاد کے لیے نکلو۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ تو کہنے لگے: ''میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم بوڑھوں اور جوانوں سب کو نکلنے کے لیے کہا ہے۔'' ان کی اولاد نے کہا: ''ابا جان! آپ نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگیں لڑیں، حتیٰ کہ وہ فوت ہو گئے اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی تو ہم آپ کی جگہ جنگ کریں گے، مگر وہ نہ مانے، چنانچہ انھوں نے سمندر کا سفر اختیار کیا، یہاں تک کہ فوت ہو گئے۔ تو سات دن تک انھیں دفن کرنے کے لیے کوئی جزیرہ نہ ملا اور اس دوران میں ان کے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ [مستدرك حاكم : ٢/ ٣٥٣، ح : ٥٥٠٨، صححه الحاكم و سكت عنه الذهبي] اسی طرح مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بڑھاپے اور بھاری جسم کے باوجود نکلے، ایک آدمی نے ان سے کہا، کاش آپ اس سال جنگ کے لیے نہ جائیں تو انھوں نے کہا: ''سورۂ بحوث (توبہ) ہمیں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ ''نکلو، ہلکے ہو یا بھاری'' اور میں اپنے آپ کو ہلکا ہی پاتا ہوں۔'' [السنن الكبرىٰ للبيهقي : ٩/ ٢١، ح : ١٨٢٥٦]

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدر میں شریک ہوئے، پھر ایک سال کے سوا کبھی مسلمانوں کی کسی جنگ سے پیچھے نہیں رہے۔ تاریخ کی کتابوں کے مطابق نوے سال کی عمر میں قسطنطنیہ جانے والے لشکر میں آپ شریک ہوئے، ان کے امیر یزید بن معاویہ تھے، بیمار ہوئے تو یزید ان کی بیمار پرسی کے لیے آئے۔ پوچھا: ''کوئی خواہش ہو تو بتائیں؟'' فرمایا: ''میری خواہش یہ ہے کہ جب میں فوت ہو جاؤں تو سوار ہو کر دشمن کی سرزمین میں جہاں تک آگے جا سکو جاؤ، جب اس سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہ رہے تو مجھے وہاں دفن کر دو، پھر واپس آ جاؤ۔'' ابوایوب رضی اللہ عنہ یہ آیت پڑھا کرتے: ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ﴾ اور فرماتے: ''تو میں یا تو ہلکا ہوں گا یا بوجھل۔'' یعنی ہر حال میں نکلنے کا حکم ہے۔ [مستدرك حاكم : ٣/ ٤٥٨، ح : ٥٩٣٠، سكت عنه الذهبي]

(2) جہاد کے لیے نکلنا کسی شخص پر کب ہر حال میں فرض ہوتا ہے اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (٢١٦) کے حواشی۔

آیت 42 لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا ...... : یہ آیت غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾
عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

قسم کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ ضرور جھوٹے ہیں ﴿۴۲﴾ اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی، یہاں تک کہ تیرے لیے وہ لوگ صاف ظاہر ہو جاتے جنھوں نے سچ کہا اور تو جھوٹوں کو جان لیتا ﴿۴۳﴾

”عَرَضًا“ دنیا کا وہ ساز و سامان جو انسان کی خواہشوں کے پیش نظر رہتا ہے۔ ”قَرِيْبًا“ جس کا حصول بالکل آسان ہو۔ ”قَاصِدًا“ درمیانہ، یعنی جس میں شدید مشقت درپیش نہ ہوتی۔ ”الشُّقَّةُ“ وہ فاصلہ جو نہایت مشقت اور تھکن سے طے ہو۔ یہ مشقت سے مشتق ہے۔ ابوعبیدہ نے فرمایا ”الشُّقَّةُ“ کا معنی ارضِ بعید کا سفر ہے، یعنی اگر آسانی سے مالِ غنیمت ملنے کی توقع ہوتی اور سفر بہت لمبا نہ ہوتا، جس کا راستہ بھی نہایت کٹھن تھا تو یہ لوگ ضرور آپ کے ساتھ جاتے۔ مگر خالص فی سبیل اللہ جہاد جس میں آسانی سے حصولِ غنیمت کے بجائے مال و جان کی قربانی، بعید سفر اور شہادت کا واضح امکان سامنے ہو، منافق کے لیے نہایت دشوار ہے۔

آیت 43 عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ...... : ہوا یہ کہ جب نبی ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہونے لگے تو بعض منافقین نے بناوٹی حیلے بہانے پیش کر کے آپ ﷺ سے مدینہ ہی میں رہنے کی اجازت چاہی، حالانکہ انھوں نے طے کر رکھا تھا کہ اجازت نہ ملی پھر بھی نہیں جائیں گے۔ اب ان کی آزمائش کے لیے انھیں اجازت دینے سے اس وقت تک گریز کرنا چاہیے تھا جب تک واضح نہ ہو جاتا کہ کس کا عذر حقیقی ہے اور کون بہانے باز ہے، مگر آپ ﷺ نے ان کی حقیقت کھلنے سے پہلے ہی انھیں مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اس اجازت دینے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے ناراض ہونے کا اظہار فرمایا، مگر نہایت لطف و کرم اور مہربانی کے ساتھ کہ اس اظہار سے پہلے معاف کر دینے کی اطلاع دی اور پھر فرمایا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس میں پیچھے رہنے والوں کی مذمت بھی صاف نمایاں ہے، کیونکہ ان میں کم ہی تھے جن کا عذر صحیح تھا، اکثر جھوٹ ہی بول رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں ان لوگوں کو اجازت دینے پر ناراضی کا اظہار فرمایا جنھوں نے آپ سے اجازت مانگی اور انھیں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہ رکھنے والے بتایا جو جہاد میں نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے اور سورۂ نور میں فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [النور : ٦٢] ”بے شک جو لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔“ وہاں مراد یہ ہے کہ منافقین اجتماعی کام مثلاً جہاد وغیرہ میں آئے ہوئے ہوں تو بغیر پوچھے کھسک جاتے ہیں، اجازت مانگتے ہی نہیں، جب کہ اہل ایمان ضرورت کے وقت بھی آپ سے پوچھے بغیر نہیں جاتے۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝ وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝

تجھ سے وہ لوگ اجازت نہیں مانگتے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کریں اور اللہ متقی لوگوں کو خوب جاننے والا ہے (۴۴) تجھ سے اجازت صرف وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سو وہ اپنے شک میں حیران پھرتے ہیں (۴۵) اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے کچھ سامان ضرور تیار کرتے اور لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انھیں روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو (۴۶)

آیت 44 لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ...... : کیونکہ انھیں تو خود جہاد میں جانے کا شوق ہے اور وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب انھیں اللہ کی راہ میں شہید ہونے کا موقع ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کے معاش میں ان کے لیے سب سے بہتر وہ آدمی ہے جو اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے ہے، اس کی پشت پر اڑتا پھر رہا ہے، جب کبھی دشمن کی آمد پر کوئی خوف کی آواز یا گھبراہٹ سنتا ہے تو اڑ کر وہاں پہنچ جاتا ہے، وہ قتل اور موت کو ان جگہوں میں تلاش کرتا ہے جہاں وہ مل سکتی ہیں۔'' [مسلم، الإمارة، باب فضل الجهاد والرباط : ۱۸۸۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

آیت 45 اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ...... : پس مومنین اور منافقین کے درمیان فرق یہ ہے کہ جہاد کا اعلان ہونے پر مومن تو بلا تامل نکل کھڑے ہوتے ہیں، مگر جو منافق ہیں وہ بہانے تراشتے ہیں اور ہر ایسے موقع پر مذبذب بھی ہو جاتے ہیں، کبھی دل کہتا ہے چلو! شاید پیغمبر ﷺ سچ ہی کہتے ہوں اور کبھی دل میں آتا ہے نہیں، یہ سب ڈھکوسلے اور ڈرانے کی باتیں ہیں، بس دنیا میں چند روز جینا ہے، آرام سے دن کاٹ لیں۔

آیت 46 ❶ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنگ تبوک کے موقع پر منافقین اور ان تمام جھوٹے دعوے داروں کی حقیقت کھول دی جو کہتے ہیں کہ ہم بھی مجاہد ہیں اور ہر وقت جہاد کے لیے نکلنے کو تیار ہیں، مگر ساٹھ ستر برس کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود کبھی نہ مجاہدین کے ساتھ نکلے، نہ نشانہ بازی سیکھی، نہ تیراکی، نہ فنون حرب میں سے کوئی فن سیکھا، نہ کسی معرکے میں شریک ہوئے، نہ جہاد کے لیے جسم تیار کیا، نہ جہاد کے لیے درکار سامان جمع کیا۔ بس ڈگریوں کے حصول، ملازمت، کفار کی غلامی، کاروبار اور حلال و حرام ہر طرح دنیا کمانے میں لگے رہے، یا پیری فقیری اور ھُو حق میں لگے رہے۔ اولاد کو بھی اسی پر لگائے رکھا اور جب جہاد کا تذکرہ ہوا تو اللہ کے راستے میں نکلنے والوں پر دو چار طنزیہ

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۝۴۸

اگر وہ تم میں نکلتے تو خرابی کے سوا تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور ضرور تمھارے درمیان (گھوڑے) دوڑاتے، اس حال میں کہ تم میں فتنہ تلاش کرتے، اور تم میں کچھ ان کی باتیں کان لگا کر سننے والے ہیں اور اللہ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ۴۷ بلاشبہ یقیناً انھوں نے اس سے پہلے فتنہ ڈالنا چاہا اور تیرے لیے کئی معاملات الٹ پلٹ کیے، یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم غالب ہوگیا، حالانکہ وہ ناپسند کرنے والے تھے ۴۸

فقرے کس کر اپنے آپ کو نفس سے جہاد کرنے والا مجاہد اکبر اور جان قربان کرنے والوں کو جہاد اصغر میں مصروف قرار دے دیا (جو نبی ﷺ کے ذمے صاف جھوٹ ہے)۔ ان کے جہاد اکبر اور نفس سے جہاد کی حقیقت ان کی جہاد کی تیاری ہی سے ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ کو بھی ان کے نفاق اور بدعملی کی وجہ سے مخلص مجاہدین کے ساتھ ان کا نکلنا پسند نہیں ہے، تبھی اس نے انھیں نکلنے کی توفیق ہی سے محروم کر دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص مر گیا اور اس نے نہ جنگ کی اور نہ اپنے دل کے ساتھ کبھی جنگ کرنے کی بات چیت کی تو وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرے گا۔" [مسلم، الإمارة، باب ذم من مات ولم يغز...... : ۱۹۱۰]

2 فَثَبَّطَهُمْ : " ثَبَّطَهُ تَثْبِيطًا " کسی آدمی کے کام میں رکاوٹ ڈال دینا، یا کسی طریقے سے اسے اس سے باز رکھنا۔

3 وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ: اس سے ان کی مذمت مقصود ہے کہ انھوں نے اپنے نفاق، بزدلی اور بے ہمتی کی وجہ سے عورتوں، بچوں، بیماروں اور جنگ میں شرکت سے لاچار بوڑھوں کے ساتھ پیچھے بیٹھ رہنا پسند کر لیا۔

آیت 47 1 لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا ...... : اس میں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی تمھارے لیے بہتر تھا، کیونکہ یہ لوگ ساتھ جا کر مزید خرابی ہی پیدا کرتے اور تمھارے درمیان فساد ڈالنے کی نیت سے ہر طرح کی دوڑ دھوپ کرتے، کبھی کسی کی چغلی کھاتے، کبھی ایک مسلمان کو دوسرے سے لڑانے کی کوشش کرتے اور کبھی مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی تدبیریں سوچتے، انھی وجوہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انھیں نکلنے کی توفیق نہیں دی۔

2 وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ...... : تبوک کے لیے نکل آنے والوں میں بعض لوگ منافقین کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سے دوسرے تمام مجاہدوں کو خبردار کیا ہے کہ تم میں سے بعض سادہ دل ان کی باتیں بڑے غور سے سنتے ہیں، حالانکہ ایسے بزدلی پھیلانے والوں کی بات سننی بھی نہیں چاہیے۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں، یعنی تمھاری کمزوریاں انھیں پہنچاتے ہیں۔ " بِالظّٰلِمِيْنَ " کے الف لام برائے عہد کی وجہ سے "ان ظالموں کو" ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو خوب جاننے والا ہے جو اس کام کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر بھی ظلم کر رہے ہیں اور دوسروں میں افتراق اور شبہات پیدا کر کے ان پر بھی ظلم کرتے ہیں۔

آیت 48 لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ ...... : اس آیت میں ان کے خبث باطن اور مزید مکاریوں کا پردہ چاک کیا گیا

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّيۡ وَ لَا تَفۡتِنِّيۡ ؕ اَلَا فِي الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۴۹﴾

اور ان میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے مجھے اجازت دے دے اور مجھے فتنے میں نہ ڈال۔ سن لو! وہ فتنے ہی میں تو پڑے ہوئے ہیں اور بے شک جہنم کافروں کو ضرور گھیرنے والی ہے ﴿۴۹﴾

ہے، یعنی آپ ﷺ کے خلاف مکر و فریب کرنا ان کی پرانی عادت ہے۔ پہلے بھی مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی تدبیریں کرتے رہے، مگر جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو ان کے نہ چاہتے ہوئے غلبہ عطا فرمایا تو یہ بظاہر اسلام میں داخل ہوگئے، پھر بھی شرارتوں سے باز نہ آئے، جیسا کہ عبداللہ بن ابی منافق نے غزوۂ احد کے دن کیا کہ عین میدان جنگ سے اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر لوٹ آیا۔ ہر موقع پر ان کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ رہیں، بنو نضیر اور دوسرے کئی یہودیوں کو قتل سے بچایا، بنو قریظہ کو ابھارتے رہے، ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان لگایا، مسجد ضرار بنا کر مسلمانوں کے خلاف مورچہ تعمیر کیا، تبوک میں جانے پر بد دلی پھیلاتے رہے۔ واپسی پر جب موقع ملا تو آپ ﷺ پر چھپ کر حملہ آور ہونے سے بھی دریغ نہ کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد سے مکہ فتح ہونے اور تبوک کی فتح کے بعد سارا عرب اسلام میں داخل ہو گیا اور یہ بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔

آیت 49 ❶ **وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّيۡ وَلَا تَفۡتِنِّيۡ:** فتنے کا معنی یہاں گناہ میں مبتلا ہونا کیا گیا ہے اور ہلاکت بھی۔ اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ آپ مجھے اتنی شدید گرمی میں اتنے طویل و پر مشقت سفر اور جنگ کا حکم دے کر گناہ میں نہ ڈالیں، کیونکہ اگر میں آپ کے حکم کے بعد نہ گیا تو گناہ گار ہوں گا اور گیا تو ہلاکت کا خطرہ ہے، ادھر گھر اکیلے رہ جائیں گے اور اہل و عیال ہلاک ہو جائیں گے، اس لیے آپ خود ہی مجھے مدینہ میں رہ جانے کی اجازت دے کر اس فتنے سے بچا لیں۔ یہ تفسیر الفاظ کے قریب ہے، جنگ خندق میں بھی منافقین کے بہانوں میں سے ایک بہانہ گھروں کے غیر محفوظ ہونے کا تھا۔ دیکھیے سورۂ احزاب (۱۳) دوسری تفسیر یہ ہے کہ ایک منافق جد بن قیس نے یہ بہانہ بنایا کہ یا رسول اللہ! رومی عورتیں بہت خوبصورت ہیں، اگر میں وہاں چلا گیا تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکوں گا، اس لیے آپ مجھے معذور سمجھ کر یہاں رہنے کی اجازت دے دیجیے۔ (ہاں، میں مال خرچ کر کے مدد کروں گا)۔ [المعجم الکبیر : ۲/۲۷۵، ح : ۲۱۵٤۔ أبو نعیم فی المعرفۃ] اسے "ھدایۃ المستنیر" والے نے ضعیف کہا ہے اور " الاستیعاب فی بیان الأسباب" والوں نے حسن کہا ہے۔ (واللہ اعلم!)

❷ **اَلَا فِي الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا:** یعنی بہانے تو یہ کرتے ہیں کہ ہم فتنے میں نہ پڑ جائیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فتنے ہی میں تو پڑے ہوئے ہیں کہ جہاد پر جانے سے گریز کر رہے ہیں۔ "فِي الۡفِتۡنَةِ" پہلے لانے سے حصر کا معنی حاصل ہوتا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر سے بڑھ کر بھی دنیا میں کوئی فتنہ ہوگا اور پھر جہاد میں شریک نہ ہونا خود ایک فتنہ ہے، اب تو

اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَ اِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ يَتَوَلَّوۡا وَّ هُمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۵۰﴾ قُلۡ لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوۡلٰٮنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۱﴾

اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں ہم نے تو پہلے ہی اپنا معاملہ سنبھال لیا تھا اور اس حال میں پھرتے ہیں کہ وہ بہت خوش ہوتے ہیں ﴿۵۰﴾ کہہ دے ہمیں ہرگز نہیں پہنچے گا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا، وہی ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ ایمان والے بھروسا کریں ﴿۵۱﴾

حیلے بہانے تراش کر یہ نکل جائیں گے، مگر جہنم کے گھیرے سے کیسے نکل پائیں گے؟

آیت 50 اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ...... : یہاں "حَسَنَةٌ" سے مراد کامیابی، فتح، غنیمت اور سلامتی ہے اور "مُصِيۡبَةٌ" سے مراد فتح حاصل کرنے میں وقتی ناکامی یا مسلمانوں کا زخمی اور شہید ہونا ہے۔ یہ بھی ان کے خبث باطن اور مکر وفریب کی ایک دلیل ہے کہ انھیں مسلمانوں کو کوئی فائدہ حاصل ہونا ناگوار ہوتا ہے اور اگر وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو خوش ہوتے ہیں اور انھیں اپنی ہوش مندی اور سیاست دانی کا پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی بچاؤ کر لیا تھا، جیسے جنگ احد کے بعد عبد اللہ بن ابی منافق نے کہا تھا کہ ہم تو اسی وجہ سے پہلے پلٹ آئے تھے کہ ہمیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہوگی اور وہ مارے جائیں گے۔ ایسے ہی وہ منافق جو غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ میں رہ گئے تھے، نبی ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق مشہور کرتے رہے کہ یہ لوگ رومیوں سے بچ کر نہیں آسکیں گے، لیکن جب انھیں اطلاع ملی کہ مسلمان صحیح وسالم فتح حاصل کر کے واپس آرہے ہیں تو انھیں انتہائی غم ہوا۔ (ابن کثیر) ان کی اس بدخصلت کے مزید تذکرے کے لیے دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۵۶) اور نساء (۷۲)۔

آیت 51 ① قُلۡ لَّنۡ يُّصِيۡبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا : یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان و یقین کی برکت کا ذکر ہے، سچ ہے: " مَنۡ عَلِمَ سِرَّ اللّٰهِ فِي الۡقَدَرِ هَانَتۡ عَلَيۡهِ الۡمَصَائِبُ " ''جس نے قضا و قدر میں اللہ تعالیٰ کے راز کو پا لیا اس پر مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں۔'' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کوئی مصیبت نہ زمین میں پہنچتی ہے اور نہ تمھاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں، یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے، تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمھارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمھیں عطا فرمائے۔'' [الحدید : ۲۲، ۲۳]

② هُوَ مَوۡلٰٮنَا ...... : وہی ہمارا مالک، مددگار اور حمایتی ہے۔ ہم اپنے مالک پر خوش ہیں اور ایمان والوں کو تو بس اللہ ہی پر بھروسا رکھنا لازم ہے، نہ دنیا کے ساز و سامان پر اور نہ اس کے سوا کسی اور ذات پر۔ "عَلَى اللّٰهِ" کے پہلے آنے سے حصر کا مفہوم پیدا ہو گیا اور "فَلۡيَتَوَكَّلِ" میں فاء کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان منافقین کے رویے سے پیدا ہونے والی بددلی کا علاج

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَ نَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

کہہ دے تم ہمارے بارے میں دو بہترین چیزوں میں سے ایک کے سوا کس کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمھارے بارے میں انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تمھیں اپنے پاس سے کوئی عذاب پہنچائے، یا ہمارے ہاتھوں سے۔ سو انتظار کرو، بے شک ہم (بھی) تمھارے ساتھ منتظر ہیں ﴿۵۲﴾ کہہ دے خوشی سے خرچ کرو، یا ناخوشی سے، تم سے ہر گز قبول نہ کیا جائے گا۔ بے شک تم ہمیشہ سے نافرمان لوگ ہو ﴿۵۳﴾

چاہتے ہیں تو ایمان والوں کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صرف اللہ پر بھروسا رکھیں اور اس کے سوا کسی کی پروا نہ کریں۔

آیت 52 قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ......: "اِحْدٰی" کا معنی ایک اور "الْحُسْنَيَيْنِ" "اَلْحُسْنٰی" کی تثنیہ ہے، جو "اَلْاَحْسَنُ" (اسم تفضیل) کی مؤنث ہے، یعنی سب سے اچھی دو چیزوں میں سے ایک۔ مسلمانوں کی مصیبت پر منافقین کی خوشی کا یہ دوسرا جواب ہے کہ ہم ہر حال میں سب لوگوں سے اچھے ہیں، دنیا میں یا تو ہمیں فتح اور غنیمت حاصل ہوگی جو بہترین چیز ہے، یا پھر ہم اللہ کی راہ میں شہید ہوں گے، تو یہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اور ہماری عین تمنا ہے کہ ہم جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے لیے ضمانت دی ہے جس نے اس کے راستے میں جہاد کیا۔ اسے اس کے راستے میں جہاد اور اس کی باتوں کو سچا یقین کرنے کے سوا کسی اور چیز نے نہیں نکالا کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا، یا اسے اس کے گھر جس سے نکل کر گیا ہے، اجر یا غنیمت دے کر واپس لائے گا۔'' [بخاری، فرض الخمس، باب قول النبی ﷺ : أحلت لكم الغنائم : ۳۱۲۳، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ] اس کے برعکس منافقین ہیں کہ دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں یا اللہ کی طرف سے انھیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخرت میں اللہ کی طرف سے جہنم کے درکِ اسفل میں دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے، پس ہم اور تم ایک دوسرے کے متعلق دو حالتوں میں سے ایک کے منتظر ہیں۔

آیت 53 ① قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا......: اوپر کی آیت میں بتایا کہ منافقین کے لیے بہر حال عذاب ہے، اب اس آیت میں فرمایا کہ اس عذاب سے کسی طور وہ نجات نہیں پا سکتے، کیونکہ آخرت میں ان کی کوئی نیکی قبول نہیں ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر بعض منافقین ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ ہمیں ساتھ جانے سے معافی دی جائے، اس کے عوض ہم مالی اعانت پر تیار ہیں۔ وہ یہ بات اس لیے کہتے تھے کہ کہیں مسلمانوں میں بالکل ہی بدنام ہو کر نہ رہ جائیں، انھی کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں نفاق اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی بھری ہو، ان کی مالی امداد کسی

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ بِرَسُوْلِهٖ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور انھیں کوئی چیز اس سے مانع نہیں ہوئی کہ ان کی خرچ کی ہوئی چیزیں قبول کی جائیں مگر یہ بات کہ بے شک انھوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز کو نہیں آتے مگر اس طرح کہ سست ہوتے ہیں اور خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ ناخوش ہوتے ہیں ﴿۵۴﴾ سو تجھے نہ ان کے اموال بھلے معلوم ہوں اور نہ ان کی اولاد، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا کی زندگی میں عذاب دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں ﴿۵۵﴾

طور قبول نہیں، خواہ خوشی سے دیں یا مجبوراً۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جد بن قیس نے مال خرچ کرنے کی بابت جو کہا تھا اس کا جواب یہ ہے کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں۔'' (موضح)

② اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: عمل کی قبولیت کے لیے تقویٰ شرط ہے جو تم میں ہے ہی نہیں، فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [المائدۃ : ۲۷] ''بے شک اللہ متقی لوگوں ہی سے قبول کرتا ہے۔'' اور دیکھیے سورۂ حج (۳۷) اور بقرہ (۲۶۵)۔

آیت 54 وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ ......: اس آیت میں ان کے صدقات قبول نہ ہونے کے تین اسباب بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ ان کے دل اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے خالی ہیں، بلکہ وہ دونوں کے منکر ہیں اور ان کا کفر ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی بدنی شہادت نماز ہے، وہ بھی یہ لوگ خوشی اور نشاط سے نہیں بلکہ مارے باندھے سستی سے صرف اپنے ایمان کے دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں، ان کا سستی سے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کے سامنے ہوئے تو پڑھ لی اکیلے ہوئے تو چھوڑ دی۔ دیکھیے سورۂ نساء (۱۴۲) تیسرا مالی عبادت بھی خوش دلی سے نہیں بلکہ مجبوراً جرمانہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ دیکھیے سورۂ بقرہ (۲۶۴) اب ان کا خرچ کیا ہوا مال اللہ تعالیٰ کی جناب میں کیسے قبول ہو؟ پکے مومن تو اپنے مال کی پاکیزگی اور سکون قلب کے حصول کے لیے زکوٰۃ دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴾ [التوبۃ : ۱۰۳] ''ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے۔''

آیت 55 ① فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ : یعنی آپ ان لوگوں کے مال و دولت، اولاد اور دنیوی چمک دمک سے دھوکے میں نہ پڑیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوتا تو یہ اس قدر مال دار اور صاحب اولاد کیوں ہوتے؟ بلکہ آپ ان کی ان چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ دیکھیے سورۂ طٰہٰ (۱۳۱) اور مومنون (۵۵، ۵۶)۔

وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ بے شک وہ ضرور تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں اور لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں﴿۵۶﴾ اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ پالیں، یا کوئی غاریں، یا گھسنے کی کوئی جگہ تو اس کی طرف لوٹ جائیں، اس حال میں کہ وہ رسیاں تڑا رہے ہوں﴿۵۷﴾

---

② **اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا**: یعنی دنیا میں ان چیزوں کو سعادت مندی خیال مت کریں، اللہ تعالیٰ نے انھیں صرف اس لیے ڈھیل دے رکھی ہے کہ دن رات مال جمع کرنے اور اولاد کی حفاظت کی فکر میں لگے رہیں، نہ انھیں دن کا چین نصیب ہو نہ رات کا آرام۔ سکون قلب جو فقط اللہ کی یاد سے حاصل ہوتا ہے، یعنی ﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ [الرعد : ۲۸] اس سے یہ سراسر محروم رہیں۔

③ **وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ**: یعنی آخر دم تک انھیں توبہ کرنے اور سچے دل سے ایمان لانے کی توفیق نصیب نہ ہو، بلکہ جب یہ مریں تو اپنے مال اور اولاد ہی کی طرف ان کا دھیان ہو، نہ آخرت کی فکر نہ اللہ تعالیٰ سے کوئی غرض۔ اگرچہ مومن کو بھی اپنے مال اور اولاد کی فکر ہوتی ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے نزدیک ہر چیز سے مقدم ہوتی ہے اس لیے یہ چیزیں اس کے لیے نعمت ہی ہوتی ہیں وبال جان نہیں ہوتیں۔

آیت 56 **وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ** ......: "فَرِقَ يَفْرَقُ (ع)" سخت خوف زدہ ہونا اور گھبرانا، یعنی یہ منافق تم سے شدید خوف کی وجہ سے اپنے کفر کا اظہار نہیں کر سکتے، نہ مقابلے میں آنے کی جرأت کر سکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں انھیں اپنے قتل اور بیوی بچوں کے لونڈی غلام بننے کا سخت خطرہ ہے، اس لیے قسمیں کھا کھا کر تم میں سے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نفاق آدمی میں دوسروں کا خوف اور بزدلی پیدا کرتا ہے۔

آیت 57 **لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً** ......: "**مَلْجَاً**" "لَجَأَ يَلْجَأُ (ف، س)" سے اسم ظرف ہے، پناہ لینے کی جگہ۔ "**مَغٰرٰتٍ**" "مَغَارَةٌ" کی جمع ہے۔ "غَوْرٌ" گہری جگہ کو کہتے ہیں، پہاڑ یا زمین میں کوئی غار۔ "**مُدَّخَلًا**" "دَخَلَ" سے باب افتعال میں سے ظرف ہے، حروف بڑھ جانے سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی مشکل اور مشقت سے گھس جانے کی کوئی جگہ۔ مطلب یہ ہے کہ انھیں فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، ورنہ اگر انھیں بری سے بری جگہ بھی جانے کے لیے مل جائے تو رسیاں تڑاتے ہوئے اس کی طرف بھاگ جائیں، کیونکہ بری سے بری جگہیں یہی تین ہو سکتی ہیں، جن کی طرف جایا جا سکتا ہے۔ "**يَجْمَحُوْنَ**" "جَمَحَ الْفَرَسُ" اصل میں گھوڑے کے منہ زور ہو کر سوار کے قابو سے نکل کر بھاگ جانے کو کہتے ہیں، یعنی انھیں مسلمانوں سے، ان کی مجالس اور ان کے معاشرے سے بڑا شدید بغض ہے مگر ان کا بس نہیں چلتا، اس لیے مسلم معاشرے میں رہنے اور

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَ اِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوۡلُهٗ ۙ وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تجھ پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں، پھر اگر انھیں ان میں سے دے دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انھیں ان میں سے نہ دیا جائے تو اسی وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں ﴿۵۸﴾ اور کاش کہ واقعی وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا اور کہتے ہمیں اللہ کافی ہے، جلد ہی اللہ ہمیں اپنے فضل

اس کے فوائد حاصل کرنے کے لیے تمھارے سامنے تمھارا ہونے کی قسمیں کھاتے ہیں۔

آیت 58 وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ......: " لَمَزَ (ض) " سامنے عیب نکالنا، طعن کرنا، یہ بھی منافقین کا شیوہ تھا کہ غنائم و صدقات کی تقسیم میں وہ رسول اللہ ﷺ پر طعن کرنے اور عیب لگانے سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ نہیں کہ صرف صدقات کی تقسیم میں طعن کرتے ہوں، بلکہ یہ ان کے لگائے ہوئے الزامات میں سے ایک تھا، چنانچہ آپ غنائم یا صدقات تقسیم فرماتے تو کہتے دیکھو کیسی خویش پروری اور دوست نوازی ہو رہی ہے، انصاف نہیں ہو رہا۔ مطلب یہ کہ ہمیں کیوں نہیں ملا، ان کے ہاں انصاف کا پیمانہ بس اتنا تھا کہ انھیں مل جائے تو وہ خوش ہیں اور آپ ﷺ زبردست انصاف کرنے والے ہیں، لیکن اگر اسلام کی مصلحت کے پیش نظر یا کسی دوسرے شخص کے زیادہ ضرورت مند ہونے کی وجہ سے انھیں کچھ نہ مل سکے تو وہ سخت ناراض اور ان کے بقول نبی ﷺ عدل نہ کرنے والے۔ (نعوذ باللہ) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کچھ تقسیم فرما رہے تھے کہ ذوالخویصرہ تمیمی آیا، کہنے لگا: ''یا رسول اللہ! عدل کیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں ویل ہو، جب میں عدل نہیں کروں گا تو اور کون عدل کرے گا؟'' عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اجازت دیجیے میں اس کی گردن اتار دوں۔'' فرمایا: ''رہنے دو، اس کے کچھ ساتھی ہیں (اور ہوں گے) کہ تم میں سے ایک اپنی نماز ان کی نماز کے مقابلے میں اور اپنے روزے ان کے روزوں کے مقابلے میں حقیر سمجھے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔'' ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ﴾ [بخاری، المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام : ۳٦۱۰] حنین کی غنیمتوں کی تقسیم کے وقت اور دوسرے کئی موقعوں پر بھی ان لوگوں نے اس قسم کی گستاخیاں کیں۔ خالد بن ولید اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ نے ان کے قتل کی اجازت مانگی، مگر آپ ﷺ نے فرمایا، رہنے دو۔ بعض موقعوں پر جب انھوں نے مہاجرین و انصار کو بھڑکا کر ایک دوسرے سے لڑا دیا اور آپ نے صلح کروا دی، اس وقت بھی عبد اللہ بن ابی نے اور اس کے ساتھیوں نے بہت بڑی گستاخی کی، جس کا ذکر سورۂ منافقون میں ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کے اجازت مانگنے کے باوجود آپ نے ان کے قتل کی اجازت نہیں دی، یہ کہہ کر کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ [بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿سواء علیهم أستغفرت لهم﴾ : ٤٩٠٥]

آیت 59 ① وَ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ......: یعنی کاش! وہ طعنہ زنی اور عیب جوئی کے بجائے اس

مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۵۹ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ

سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ بے شک ہم اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں ۵۹ صدقات تو صرف فقیروں

طرح کہتے، کیونکہ ان کے حق میں یہی بہتر تھا اور یقیناً اللہ تعالیٰ بھی ان پر فضل کرتا مگر ان ناشکروں کو اتنی توفیق کہاں کہ اس قسم کا کلمۂ خیر کہہ سکیں، یہ تو جب بات کریں گے ایسی ہی کریں گے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی برائی کا پہلو نکلتا ہو۔

❷ بعض لوگوں نے اس آیت سے زبردستی یہ بات نکالنے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی دیتے ہیں، حالانکہ ان آیات میں آپ کی زندگی میں غنیمت اور صدقات کی تقسیم کا ذکر ہو رہا ہے اور اگر شرک کی نجاست ذہن میں نہ بھری ہو تو اسی آیت میں یہ الفاظ ”حَسْبُنَا اللّٰهُ“ (ہمیں اللہ کافی ہے) پھر ”سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ“ اور ”وَرَسُوْلُهٗۤ“ کے درمیان ”مِنْ فَضْلِهٖ“ اللہ کے فضل کا ذکر کر کے دونوں کو الگ کرنا اور آخر میں ”اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ“ (بے شک ہم تو اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں) کے الفاظ واضح دلالت کر رہے ہیں کہ دینے والا فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس سے پہلے فرمایا: ”کاش وہ اس پر راضی ہو جاتے جو انھیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا۔“ اس کے بعد وہ الفاظ ذکر فرمائے جو اوپر ذکر ہوئے ہیں، جن کا معنی یہ ہے کہ اصل دینے والا تو اللہ ہے لیکن اس کے حکم سے تقسیم آپ کرتے تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ)) [بخاری، العلم، باب من یرد الله ...... : ۷۱] ”میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ ہی ہے۔“ اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ اللہ کے حکم کے مطابق تقسیم فرماتے تھے، اب ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق امیر المومنین تقسیم فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کئی جگہ یہ اعلان فرمانے کا حکم دیا کہ میں نہ اپنے نفع و نقصان کا مالک ہوں نہ تمھارے اور یہ بھی کہ اللہ کے سوا کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ دیکھیے سورۂ جن (۲۱)، اعراف (۱۸۸، ۱۹۷، ۱۹۸) اور فاطر (۱۳ تا ۱۵) جنگِ تبوک میں جب آپ سے سواریاں مانگنے کے لیے بعض مجاہد آپ کے پاس آتے اور آپ فرماتے کہ میرے پاس سواریاں نہیں ہیں جو میں تمھیں دوں، تو سواریاں حاصل نہ کر سکنے والے مجاہد روتے ہوئے واپس جاتے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (۹۲)۔

آیت 60 ❶ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ ...... : منافقین کا طعن دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود صدقات کے حق دار بیان فرما دیے، تاکہ سب لوگ جان لیں کہ صدقات کی تقسیم کا رسول اللہ ﷺ کو بھی اختیار نہیں، لہٰذا آپ ﷺ پر طعن بے سود ہے۔ یہاں صدقات سے مراد فرض صدقات، یعنی زکوٰۃ و عشر ہیں، کیونکہ حکومت کی طرف سے وصولی کے لیے عاملین فرض زکوٰۃ ہی کے لیے بھیجے جاتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی ان کے پاس نفل صدقہ بھی جمع کروا دے۔ صدقہ کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اللہ کے لیے مال خرچ کرنے والا عملی طور پر اپنے ایمان کے صدق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر نفلی خرچ پر بولا جاتا ہے، مگر کبھی فرض پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ [التوبۃ :

عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَ فِي الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ فَرِيۡضَةً

اور مسکینوں کے لیے اور ان پر مقرر عاملوں کے لیے ہیں اور ان کے لیے جن کے دلوں میں الفت ڈالنی مقصود ہے اور گردنیں چھڑانے میں اور تاوان بھرنے والوں میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافر میں (خرچ کرنے کے لیے ہیں)۔

۱۰۳] یہاں فرض صدقات ہی مراد ہیں۔ اس آیت کے آخر میں "فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ" سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ نفلی صدقات کو فریضہ نہیں کہا جاتا۔ "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ" سے معلوم ہوا کہ ان مقامات کے علاوہ زکوٰۃ و عشر خرچ کرنا جائز نہیں۔

② لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ: فقیر اور مسکین دونوں لفظ محتاج کے معنی میں آتے ہیں، بعض اہل علم فقیر کو زیادہ بدحال قرار دیتے ہیں، بعض مسکین کو اور بعض دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ دلائل کے لحاظ سے راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ فقیر مسکین سے زیادہ بدحال ہوتا ہے، کیونکہ یہ "فقر" سے مشتق ہے، کمر کے مہروں کو " فَقَرَاتُ الظَّهۡرِ" کہتے ہیں۔ فقیر بمعنی مفقور ہے، یعنی ضرورت کی اشیاء نہ ہونے کی وجہ سے گویا اس کی کمر ٹوٹی ہوئی ہے۔ مسکین "سکن" سے مشتق ہے کہ ضرورت مندی نے اس کی حرکت کو سکون میں بدل دیا ہے۔ گویا فقیر کی حالت اس شخص کی سی ہے جس کے پاس کچھ نہیں اور مسکین وہ ہے جس کی آمدنی اس کی ضروریات سے کم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَمَّا السَّفِيۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ فِي الۡبَحۡرِ ﴾ [الکہف : ۷۹] یعنی وہ کشتی چند مساکین کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کشتی کا مالک جو کام بھی کرتا ہو بالکل خالی ہاتھ نہیں ہوتا۔ ہاں، آمدنی ضرورت سے کم ہونے کی وجہ سے وہ ضرورت مند ومحتاج ہوتا ہے۔ زیر تفسیر آیت میں فقراء کو پہلے لانے سے بھی ان کے زیادہ بدحال ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہ فرق اس وقت ضروری ہوگا جب فقیر اور مسکین دونوں لفظ اکٹھے آئیں، جیسے ایمان اور اسلام کا فرق ہے، لیکن الگ الگ آئیں تو دونوں ایک ہی ہیں۔ اسی طرح ان میں سے صرف فقیر یا مسکین کا لفظ آئے تو وہ دونوں قسم کے ضرورت مندوں پر بول لیا جاتا ہے، خواہ ان کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو۔ یہ دونوں زکوٰۃ کے مستحق ہیں، خواہ وہ بدحال فقیر ہوں یا سفید پوش ضرورت مند۔

③ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا: زکوٰۃ و عشر کی وصولی کے لیے رسول اللہ ﷺ آدمی مقرر فرماتے تھے اور باقاعدہ ان کا محاسبہ فرماتے تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ابن اللتبیہ رضی اللہ عنہ کو اس کام پر مقرر فرمایا تھا اور ان کی آمد پر محاسبہ کرتے ہوئے حکومت کے عمال کو ملنے والے تحائف کو ان کے لیے ناجائز قرار دیا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے " کِتَابُ الۡاَحۡكَامِ" میں باب قائم فرمایا ہے:
"بَابُ رِزۡقِ الۡحُكَّامِ وَالۡعَامِلِيۡنَ عَلَيۡهَا۔"

④ وَالۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ: اس سے مراد وہ نومسلم ہیں جن کی دل جوئی کر کے انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھنا مقصود ہو، یا وہ کفار جن کی دل جوئی سے ان کے اسلام لانے کی امید ہے، یا وہ بااثر لوگ جن پر خرچ کرنے سے کئی لوگوں کے مسلمان ہونے کی امید ہے، یا وہ کافر سردار جن پر خرچ کرنے سے ان کے علاقے میں مسلمانوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رہنے کی امید ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام کے غلبے کے بعد یہ مد ختم ہوگئی، جیسا کہ امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا، مگر موجودہ زمانے کے

مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰

یہ اللہ کی طرف سے ایک فریضہ ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۝۶۰

حالات کو سامنے رکھیں تو آج کل شاید رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے، کیونکہ کفار اسی طریقے سے مسلمانوں کو مرتد کر رہے ہیں۔

❺ وَفِی الرِّقَابِ: گردنیں چھڑانے سے مراد غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا ہے۔ مکاتب غلاموں کی (جنھوں نے اپنے مالکوں سے اپنی قیمت قسطوں میں ادا کرنے کی شرط پر آزادی کا معاہدہ کیا ہوا ہے) مدد کرنا ہے۔ آج کل عدالتوں کے کفریہ نظام کی وجہ سے بے گناہ لوگ یا وہ گناہ گار جن کی شرعی سزا قید نہیں ہے، مگر کافرانہ قانون کی وجہ سے قید ہیں، یا کفر کی عدالتوں کا عائد کردہ جرمانہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے یا مقدمہ کے اخراجات ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے جیلوں میں سال ہا سال سے سڑ رہے ہیں ان کو چھڑانے پر زکوٰۃ صرف کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ (واللہ اعلم)

❻ وَالْغٰرِمِيْنَ: وہ مقروض جو قرض ادا نہیں کر سکتے، یا وہ کاروباری لوگ یا زمیندار وغیرہ جو کاروبار یا فصل برباد ہو جانے کی وجہ سے زیر بار ہو گئے، اگر وہ اپنی جائداد میں سے قرض ادا کریں تو فقیر ہو جائیں، یا وہ بااثر لوگ جنھوں نے صلح کروانے کے لیے لوگوں کی دیتیں یا رقوم اپنے ذمے لے لیں، یہ سب غارمین میں آتے ہیں۔

❼ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس لفظ کے دو استعمال ہیں، ایک تو ہر نیکی ہی اللہ کے لیے اور اللہ کے راستے میں ہے اور فقراء و مساکین وغیرہ پر خرچ بھی فی سبیل اللہ ہے، جن کا ذکر اسی آیت میں پہلے ہو چکا ہے۔ دوسرا ان سب سے الگ فی سبیل اللہ ہے۔ اس سے مراد تمام مفسرین کے اتفاق کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ مجاہد غنی بھی ہو تو اس پر جہادی ضروریات کی خاطر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں حج و عمرہ کو بھی اس مد میں شامل کیا گیا ہے۔ آپ تفسیر کی کتابیں دیکھ لیں یا فقہ کی "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" کی تشریح "هُمُ الْغُزَاةُ" ہی پائیں گے کہ اس سے مراد اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہیں، بلکہ اہل علم کا فیصلہ ہے کہ اگر ایک طرف فقراء و مساکین ہوں اور ایک طرف غازیانِ اسلام کو ضرورت ہو تو مجاہدین کی مدد کو ترجیح دی جائے گی، کیونکہ شکست کی صورت میں فقر و مسکنت کے ساتھ کفار کی غلامی کی ذلت اور اسلام کی بے حرمتی کی مصیبت بھی جمع ہو جائے گی۔

❽ وَابْنِ السَّبِيْلِ: مسافر خواہ صاحب حیثیت ہو اگر سفر میں اسے ضرورت پڑ جائے تو اس پر زکوٰۃ میں سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

❾ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ: معلوم ہوا کہ یہ مصارف فرض صدقات و عشر کے بیان ہوئے ہیں۔ چند اہل علم نے کہا کہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ اور عشر میں آنے والا مال آٹھ حصوں میں تقسیم کیا جائے اور لازماً ہر مصرف میں خرچ کیا جائے، مگر رسول اللہ ﷺ اور خلفاء کے عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر اہل علم کا کہنا یہ ہے کہ ان میں سے جس مصرف میں زیادہ ضرورت ہو وہاں زیادہ بلکہ سب کا سب بھی صرف کیا جا سکتا ہے۔ ہاں، ان مصارف کے علاوہ خرچ کرنا جائز نہیں اور یہی بات درست ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے۔ یاد رہے کہ فرض صدقہ صرف مسلمانوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ

وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ
اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

اوران میں سے کچھ وہ ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں وہ (تو) ایک کان ہے۔ کہہ دے تمھارے لیے بھلائی کا کان ہے، اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مومنوں کی بات کا یقین کرتا ہے اور ان کے لیے ایک رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۶۱﴾ تمھارے لیے اللہ کی قسم کھاتے ہیں، تا کہ تمھیں خوش کریں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے کہ وہ اسے خوش کریں، اگر وہ مومن ہیں ﴿۶۲﴾

کو یمن بھیجتے وقت انھیں اہل یمن کو کلمۂ شہادت اور روزانہ پانچ نمازیں تسلیم کر لینے کے بعد زکوٰۃ بتانے کا حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال میں صدقہ فرض فرمایا ہے: ((تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَاءِهِمْ فَتُرَدُّ فِيْ فُقَرَاءِهِمْ)) ''جو ان کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور انھی کے فقراء پر واپس کر دیا جائے گا۔'' [بخاري، الزكوة، باب أخذ الزكوة من الأغنياء ...... : ۱۴۹۶] مولفۃ القلوب پر خرچ بھی دراصل مسلمانوں ہی پر خرچ کی ایک صورت ہے۔

آیت 61 ① مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ ...... : زمخشری نے فرمایا ''اُذُنٌ'' (کان) وہ آدمی ہے جو ہر ایک کی بات سن کر اسے سچا سمجھے۔ سنتے چلے جانے کی وجہ سے اس آدمی کا نام ہی کان رکھ دیا، جیسے جاسوس کا کام آنکھ سے تعلق رکھتا ہے، اس کا نام ہی ''عین'' (آنکھ) رکھ دیا گیا۔ ان منافقین کا مطلب یہ تھا کہ آپ کان کے کچے ہیں، ہر ایک کی بات سن کر اس پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ دیکھیے یہ آپ پر کتنا تکلیف دہ تبصرہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے والوں کے لیے سورۂ احزاب (۵۷) میں دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت اور رسوا کن عذاب کا ذکر ہے اور یہاں ان کے لیے عذاب الیم بیان فرمایا۔

② قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ : یعنی ہاں تمھاری بات اس حد تک صحیح ہے کہ محمد ﷺ ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں، مگر یہ الزام صحیح نہیں کہ ہر بات سن کر اس پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ اعتبار صرف اسی بات کا کرتے ہیں جو سچی اور حقیقی ہوتی ہے، جو پکے مومن بتاتے ہیں۔ جھوٹی بات کو سن تو لیتے ہیں مگر اس پر صبر اور درگزر سے کام لیتے ہیں، یہ چیز تمھارے حق میں خیر (بہتر) ہے۔ ورنہ آپ جھوٹی بات سن کر اگر اس پر فوراً مؤاخذہ کرنے والے ہوتے تو تم اپنے جھوٹے عذروں کی بنا پر یا تو کب کے قتل کر دیے گئے ہوتے یا مدینہ سے نکال دیے گئے ہوتے۔

③ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ : یہاں ایمان لانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، چاہے دل سے ایمان دار نہ ہوں، ایسے لوگوں کے لیے رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے راز کھولتے نہیں بلکہ انھیں اپنی اصلاح کر لینے کا موقع دیتے ہیں۔ (فتح القدیر)

آیت 62 يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ...... : منافقین جب الگ مجلسوں میں بیٹھتے یا کہیں اکیلے ہوتے تو مسلمانوں

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ
الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝۶۳ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ
قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝۶۴ وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ
وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶۵

کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرے تو بے شک اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے، یہی بہت بڑی رسوائی ہے ۝۶۳ منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی ایسی سورت اتاری جائے جو انھیں وہ باتیں بتا دے جو ان کے دلوں میں ہیں۔ کہہ دے تم مذاق اڑاؤ، بے شک اللہ ان باتوں کو نکال ظاہر کرنے والا ہے جن سے تم ڈرتے ہو ۝۶۴ اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے تو ضرور ہی کہیں گے ہم تو صرف شغل کی بات کر رہے تھے اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہہ دے کیا تم اللہ اور اس کی آیات اور اس کے رسول ہی کے ساتھ مذاق کر رہے تھے؟ ۝۶۵

اور رسول اللہ ﷺ پر پھبتیاں کستے۔ مسلمانوں کو یا نبی ﷺ کو اگر کبھی ان کی اطلاع ہو جاتی تو وہ قسمیں کھا کھا کر مسلمانوں کو راضی کرنے کی کوشش کرتے اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی پروا نہ کرتے۔ اس آیت میں منافقین کی اس حرکت کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت 63 اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ...... : ''يُحَادِدِ'' یہ ''حَدٌّ'' سے مشتق ہے جس کا معنی ''جانب'' ہے۔ باب مفاعلہ عموماً مقابلے کے لیے آتا ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول ایک جانب ہوں اور یہ اس کے مقابلے میں دوسری جانب ہوں۔ آگے سوال کے طور پر ان کا انجام ذکر فرمایا کہ کیا انھیں یہ معلوم نہیں؟ سوال کا مقصد پوچھنا نہیں بلکہ بتانا ہے کہ یہ بات اتنی واضح ہے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے مقابلے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

آیت 64 يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ ...... : اب منافقین کی مزید کمینی حرکتوں کا ذکر ہوتا ہے اور کافی آگے تک چلا جاتا ہے، اس بنا پر اس سورت کو ''الفاضحہ'' بھی کہتے ہیں، یعنی منافقوں کے راز کھولنے والی اور ان کو رسوا کرنے والی۔ منافقین بظاہر ایمان کے باوجود دل میں رسول اللہ ﷺ سے کفر رکھتے تھے، ان میں سے بعض رسول اللہ ﷺ کو سچا سمجھنے کے باوجود ضد اور تعصب کی وجہ سے دل میں آپ سے کفر رکھتے تھے، کچھ شک میں مبتلا تھے، اس لیے ایمان سے خالی تھے اور جو بالکل دل سے آپ کو جھوٹا سمجھتے تھے وہ بھی کئی دفعہ مشاہدہ کر چکے تھے کہ جوں ہی وہ ایسی کوئی بات یا حرکت کرتے تو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کر دیتا، اس لیے وہ اپنے دلی کفر کی وجہ سے کبھی کبھی آپس میں اپنے دلی بغض کا اظہار کر لیتے، مگر ساتھ ہی خوف زدہ رہتے کہ کوئی سورت اترے گی جو ان کے راز اور دلی کیفیت ان کے سامنے اور مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھ دے گی۔ ''تُنَبِّئُهُمْ'' میں ''هُمْ'' کی ضمیر منافقوں کی طرف بھی جا سکتی ہے اور مومنوں کی طرف بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، تم مذاق اڑا لو، تم جس بات کے ظاہر ہونے سے ڈر رہے ہو اللہ تعالیٰ یقیناً اسے سب کے سامنے لے آنے والا ہے۔

آیت 65 وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ ...... : منافق آپس میں گپیں لگاتے ہوئے اللہ، اس کے رسول اور آیاتِ الٰہی کا مذاق

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ
طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۠ ﴿۶۶﴾ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

بہانے مت بناؤ، بے شک تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف کر دیں تو ایک گروہ کو عذاب دیں گے، اس وجہ سے کہ یقیناً وہ مجرم تھے ﴿۶۶﴾ منافق مرد اور منافق عورتیں، ان کے بعض بعض سے ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں بھلا دیا۔ یقیناً منافق لوگ ہی نافرمان ہیں ﴿۶۷﴾ اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، وہی ان کو کافی ہے اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے ﴿۶۸﴾

اڑاتے۔ رسول اللہ ﷺ کو کسی ذریعے سے یا وحی الٰہی سے اطلاع ہوتی اور آپ پوچھتے تو وہ کہتے ہم تو یوں ہی راستہ کاٹنے کے لیے شغل کی باتیں اور دل لگی کر رہے تھے۔ فرمایا ان سے کہیے کہ تمھارے آپس کے شغل اور دل لگی کا اللہ اور اس کے رسول اور اس کی آیات کے ساتھ مذاق سے کیا تعلق اور کیا دل لگی کے لیے تمھیں یہی ملے ہیں؟ وہ لوگ بار بار معذرت کرتے، مگر رسول اللہ ﷺ یہی فرماتے۔

آیت 66 ① لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ...... : بہانے مت بناؤ، صاف مانو کہ تم نے ایمان لا کر پھر صریح کفر کیا ہے۔ جو شخص دین کی باتوں میں ٹھٹھا کرے اگرچہ دل سے منکر نہ ہو تو وہ کافر ہو گیا، اگر یہ نہ بھی ہو تو تب بھی وہ منافق تو لازماً ہے۔ اصل یہ ہے کہ دین کی باتوں میں ظاہر و باطن کا باادب رہنا ضروری ہے۔ (موضح)

② اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ ...... : یعنی جس نے نفاق سے توبہ کر لی اور آئندہ مخلص ہو کر زندگی بسر کی، اسے تو ہم معاف کرتے ہیں مگر جو اپنے کفر پر قائم رہا اسے ضرور عذاب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی دیکھیے منافقین کو بھی اخلاص اختیار کرنے پر معافی کا وعدہ اور اس کی ترغیب دی جا رہی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی منافقین بھی بعد میں مخلص مسلمان ہو گئے تھے۔

آیت 67 ① اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ...... : یعنی منافق مرد ہوں یا عورتیں سب ایک جیسے ہیں

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾

ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے تھے، وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور اموال اور اولاد میں بہت زیادہ تھے۔ تو انھوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا، پھر تم نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا، جس طرح ان لوگوں نے اپنے حصے سے فائدہ اٹھایا جو تم سے پہلے تھے اور تم نے فضول باتیں کیں، جس طرح انھوں نے فضول باتیں کیں۔ یہ لوگ! ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے اور یہی خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿٦٩﴾

اور سب کی ایک جیسی عادات اور بد خصلتیں ہیں، وہ برے کام کا حکم دیں گے، اچھے کام سے روکیں گے اور بخل کی وجہ سے اپنے ہاتھ بند رکھیں گے، یعنی خرچ نہیں کریں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے انھیں بھلا دینے کا ذکر ان کے اللہ تعالیٰ کو بھول جانے کے مقابلے میں فرمایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے یہی سلوک کیا کہ ان کی پروا ہی نہیں فرمائی، بلکہ انھیں اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیا۔ اس تاویل کی ضرورت اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴾ [طٰہٰ: ٥٢] ''میرا رب بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔'' معلوم ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی بھولنے کی طرف نسبت صرف لفظ کے ہم شکل ہونے تک ہے، ورنہ وہ ذات پاک بھولنے سے ہر طرح پاک ہے۔

2 هُمُ الْفٰسِقُوْنَ: یعنی فسق (نافرمانی) میں حد کمال تک پہنچ چکے ہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بے اعتقاد کی صلاحیت کیا معتبر ہے، اسے فاسق ہی کہنا چاہیے۔'' (موضح)

آیت 69 كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ......: اس سے پہلے منافقین کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ ہو رہا تھا، اب مزید تنبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں براہِ راست مخاطب فرمایا، یعنی تم بھی ان لوگوں کی طرح ہو اور تمھارے کرتوت بھی ان لوگوں جیسے ہیں جنھوں نے تم سے پہلے رسولوں کے ساتھ کفر کیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور اموال و اولاد میں بہت زیادہ تھے۔ تمھاری ایک دوسرے سے مشابہت دو طرح سے ہے، دنیا میں انھوں نے اپنے لکھے ہوئے حصے سے فائدہ اٹھایا، تم نے بھی اپنے سے پہلے لوگوں کی طرح اپنے نصیب سے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے اپنے انبیاء کا مذاق اڑایا اور ان کے متعلق فضول باتیں کیں، تم نے بھی یہی کام کیا۔ اب آخرت میں بھی اعمال ضائع ہونے اور خائب و خاسر ہونے میں تم دونوں ایک جیسے ہو۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

کیا ان کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو ان سے پہلے تھے؟ نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور مدین والے اور الٹی ہوئی بستیوں والے، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا اور لیکن وہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۷۰﴾ اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ان کے بعض بعض کے دوست ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم کرے گا، بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۷۱﴾

آیت 70 اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... : "الْمُؤْتَفِكٰتِ" "اِئْتَفَكَ يَأْتَفِكُ" باب افتعال سے اسم فاعل ہے، الٹنے والیاں، یعنی لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں جن کا مرکز سدوم تھا، جنھیں ان کے اعمال بد کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر الٹا گرا دیا گیا اور کھنگروں کی بارش برسائی گئی۔ ان چھ قوموں کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ عرب کے آس پاس عراق، شام اور یمن میں آباد تھیں۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اس کے انبیاء کو جھٹلایا، اس لیے انھوں نے خود اپنے اوپر عذاب کو دعوت دی۔ سورۂ اعراف میں ان کے واقعات گزر چکے ہیں اور آگے سورۂ ہود میں مزید تفصیل آ رہی ہے۔

آیت 71 وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ...... : منافق مردوں اور منافق عورتوں کی بد عادات ذکر کرنے کے بعد اب اہل ایمان مردوں اور اہل ایمان عورتوں کے خصال حمیدہ کا ذکر ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے اولیاء، یعنی دوست، محبت رکھنے والے اور مدد کرنے والے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص صاحب ایمان نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ وہ اپنے (مسلم) بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔" [بخاري، الإيمان، باب من الإيمان أن يحب لأخيه : ۱۳، عن أنس رضی اللہ عنہ] نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مومنوں کی مثال آپس کی محبت، ایک دوسرے پر رحم اور شفقت میں ایک جسم کی ہے، جس کے اگر ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو بقیہ سارے اعضا بخار اور بے چینی کی صورت میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔" [مسلم، البر والصلة، باب تراحم المؤمنين...... : ۲۵۸٦] اور فرمایا: "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کی مانند ہے جس کی بعض اینٹیں بعض کو سہارا دیتی ہیں۔" [مسلم، البر والصلة،

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً
فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ ع ۱۵

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے، اور پاکیزہ رہنے کی جگہوں کا جو ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گی اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۷۲﴾ اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور

باب تراحم المؤمنين...... : ٢٥٨٥] اس کے بعد مومنوں کی مزید صفات جو منافقوں کے بالکل برعکس ہیں، بیان فرمائیں اور ان پر رحم کا وعدہ فرمایا، ساتھ ہی اپنے ہر چیز پر غلبے اور کمال حکمت کا ذکر فرمایا کہ وہ ہر چیز پر غالب ہے مگر اس کا غلبہ اندھا غلبہ نہیں بلکہ کمال حکمت کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

آیت 72 ① وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ...... "عَدْنٍ" ہمیشہ رہنے کا مقام، ابوسعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' (جنت میں) ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے اور تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم زندہ رہو گے کبھی نہیں مرو گے اور تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمھارے لیے یہ (نعمت) ہے کہ تم خوش حال رہو گے کبھی تنگی میں مبتلا نہیں ہو گے، سو یہ ہے اس کا فرمان: ﴿ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف : ٤٣] ''انھیں آواز دی جائے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے، اس وجہ سے کہ تم عمل کرتے تھے۔'' [مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب في دوام نعيم أهل الجنة...... : ٢٨٣٧]

② وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ : ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جنت والوں سے فرمائے گا: ''اے جنت والو! کیا تم خوش ہو گئے؟'' وہ عرض کریں گے: ''اے ہمارے پروردگار! ہم خوش کیوں نہ ہوں، تو نے ہمیں وہ کچھ عنایت فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا۔'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''کیا میں تمھیں ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر ایک اور نعمت نہ دوں؟'' وہ عرض کریں گے: ''اب اس سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے؟'' اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں تمھیں اپنی خوشنودی سے نوازتا ہوں، اب کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔'' [بخاري، التوحيد، باب كلام الرب مع أهل الجنة : ٧٥١٨۔ مسلم : ٢٨٢٩]

③ "رِضْوَانٌ" میں تنوینِ تقلیل اللہ تعالیٰ کی رضا کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تھوڑی سے تھوڑی رضا بھی جنت کی نعمتوں اور جنت عدن کے پاکیزہ مکانوں سے بہت ہی بڑی ہے، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

آیت 72 یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ...... : مدینہ آنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طویل مدت تک منافقین سے نرمی برتتے رہے اور ان کی سازشوں اور کمینگیوں سے درگزر فرماتے رہے، مگر اس حسن سلوک سے اصلاح کے بجائے ان

الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ

ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بری جگہ ہے ﴿۷۳﴾ وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے بات نہیں کہی، حالانکہ بلاشبہ یقیناً انھوں نے کفر کی بات کہی اور اپنے اسلام کے بعد کفر کیا اور اس چیز کا ارادہ کیا جو انھوں نے نہیں

کی سرکشی بڑھتی ہی گئی، اس لیے جب یہ سورت اتری جو قرآن کی سب سے آخر میں اترنے والی سورتوں میں سے ہے تو حکم ہوا کہ اب نرمی اور درگزر کے بجائے سختی اور بندوبست کا وقت آگیا ہے، اس لیے اب تک آپ جو نرمی اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے رہے اسے ختم کیجیے اور ان کے ہر قصور پر سختی سے گرفت کیجیے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ منافقین صریح کفر کا اظہار کریں اور اس پر قائم رہیں تو کفار کی طرح ان سے بھی جہاد بالسیف کیا جائے۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ البتہ اگر وہ کفر کے اظہار کے بعد اس لیے مکر جائیں تو ان پر سختی کی جائے اور زبان سے طعن و ملامت کی جائے، تلوار سے قتال نہ کیا جائے۔ ہاں حدودِ الٰہی ان پر ضرور نافذ کی جائیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین سے قتال بالسیف نہیں کیا بلکہ قتل کی اجازت طلب کرنے پر بھی فرمایا: ''رہنے دو لوگ کہیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''ان اقوال میں اختلاف نہیں، اصل بات یہ ہے کہ مختلف حالات میں حسب موقع سزا دی جا سکتی ہے، یعنی منافقین صریح کفر کے اظہار کی جرأت کریں تو پھر ان سے کفار کی طرح ہی معاملہ ہوگا۔''

آیت 74 ❶ **يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا:** منافقین اپنی نجی مجلسوں میں کفریہ باتیں کرتے، مگر پردہ چاک اور راز فاش ہونے پر جھوٹی قسمیں کھا کر مکر جاتے، جب گواہیوں سے بات ثابت ہو جاتی تو بہانہ بنا لیتے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی میں ایسی باتیں کر رہے تھے، آپ نے انھیں سنجیدہ لے لیا ہے اور اپنی قسموں کو بطور ڈھال استعمال کرتے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۶۲) اور توبہ (۴۲، ۵۶، ۱۰۷)۔

❷ **وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ......** : وہ کفر کی بات کیا تھی جو ان منافقوں نے کہی تھی، قرآن مجید نے یہاں اس کی صراحت نہیں فرمائی، اس لیے کہ یہ کوئی ایک آدھ واقعہ نہیں تھا نہ ہی ایک آدھ شخص کی بات تھی، اکثر منافقین بلکہ سبھی کا یہی وتیرہ تھا اور ان لوگوں نے مختلف موقعوں پر کفر کی باتیں کہی تھیں۔ یہاں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے جو سورۂ منافقون میں مختصر اور بخاری و مسلم میں کچھ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک لڑائی میں تھا تو میں نے عبد اللہ بن ابی سے سنا، وہ کہہ رہا تھا: ''ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ منتشر ہو جائیں جو آپ کے اردگرد ہیں اور یہ کہ ہم اگر مدینہ واپس پہنچ گئے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل تر کو نکال دے گا۔'' میں نے یہ بات اپنے چچا یا عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کی، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں نے آپ کو یہ بات بیان کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی طرف پیغام بھیجا، وہ

وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

پائی اور انھوں نے انتقام نہیں لیا مگر اس کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ پس اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا اور اگر منہ پھیر لیں تو اللہ انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کے لیے زمین میں نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار ﴿۷۴﴾

سب قسمیں کھا گئے کہ انھوں نے یہ بات نہیں کہی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے جھوٹا قرار دے دیا، مجھے ایسی فکر لاحق ہوئی جو مجھے کبھی لاحق نہ ہوئی تھی تو میں گھر میں بیٹھ گیا۔ میرے چچا نے کہا، تم نے یہ کیا چاہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمھیں جھوٹا قرار دیا اور تم پر ناراض بھی ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقون نازل فرما دی، رسول اللہ ﷺ نے میری طرف آدمی بھیجا اور یہ سورت پڑھی اور فرمایا: ''زید! اللہ تعالیٰ نے تمھیں سچا قرار دیا ہے۔'' [بخاری، التفسیر، باب قوله : ﴿ إذا جاء ك المنافقون..... ﴾ : ۴۹۰۰، ۴۹۰۱۔ مسلم : ۲۷۷۲]

③ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ...... : یعنی منافقین نے جو ارادہ کیا تھا وہ اپنی مراد کو نہیں پہنچ سکے اور یہ ناکامی اور نامرادی کوئی ایک مرتبہ نہیں ہوئی، بلکہ وہ ہمیشہ اپنے ناپاک منصوبوں اور سازشوں میں ناکام ہوئے، جن کی چند مثالیں یہ ہیں: ① وہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنا چاہتے تھے اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ ② مجاہدین کے مالی ذرائع بند کرنا چاہتے تھے۔ ③ یہودیوں کو مدینہ میں آباد دیکھنا چاہتے تھے۔ ④ عبد اللہ بن ابی کو تاجِ سلطانی پہنانا چاہتے تھے۔ ⑤ مسلمانوں کے خلاف مسجد ضرار کا مورچہ بنانا چاہتے تھے۔ ⑥ تبوک میں رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا نام و نشان مٹتا ہوا دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے، مگر سب منصوبوں میں ناکام اور نامراد ہوئے۔ آخری حد جس تک وہ پہنچے وہ جنگ تبوک سے واپسی پر آپ کے قتل کا منصوبہ تھا۔ راستے میں عقبہ ایک بلند، دشوار گزار اور تنگ جگہ تھی، رسول اللہ ﷺ نے اعلان کروا دیا کہ آپ اس راستے سے جائیں گے، اس لیے ادھر سے کوئی نہ جائے۔ چند منافقین نے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس مقام پر آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ صحیح مسلم کی اس حدیث سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے، ابو طفیل بیان فرماتے ہیں کہ ''عقبہ'' والے لوگوں میں سے ایک شخص اور حذیفہ رضی اللہ عنہ (رسول اللہ ﷺ کے خاص راز دار) کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوگئی، تو وہ کہنے لگا: ''میں تمھیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ وہ ''عقبہ'' والے کتنے آدمی تھے۔'' (حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کچھ گریز کیا) تو لوگوں نے کہا: ''جب وہ پوچھ رہا ہے تو آپ اسے بتا دیں۔'' انھوں نے فرمایا: ''ہمیں بتایا جاتا تھا کہ وہ چودہ تھے، اگر تو بھی ان میں شامل تھا تو یہ لوگ پندرہ ہو گئے اور میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ ان میں سے بارہ تو دنیا کی زندگی میں اور اس دن جب گواہ پیش ہوں گے دونوں (جہاں) میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمن ہیں۔ باقی رہے تین تو انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ نہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اعلان کرنے والے کو سنا تھا اور نہ ہمیں معلوم ہو سکا کہ ان لوگوں کا ارادہ کیا

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا کہ یقیناً اگر اس نے ہمیں اپنے فضل سے کچھ عطا فرمایا تو ہم ضرور ہی صدقہ کریں گے اور ضرور ہی نیک لوگوں سے ہو جائیں گے ﴿۷۵﴾ پھر جب اس نے انھیں اپنے فضل میں سے کچھ عطا فرمایا تو انھوں نے اس میں بخل کیا اور منہ موڑ گئے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے تھے ﴿۷۶﴾ تو اس کے

ہے۔'' [مسلم، صفات المنافقین : ۲۷۷۹/۱۱] بیہقی کی دلائل النبوۃ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے انھیں دیکھ کر للکارا تو وہ بھاگ گئے (کیونکہ ان کا منصوبہ خفیہ نہ رہ سکنے کی وجہ سے ناکام ہو گیا)۔ صاحب ''ھدایۃ المستنیر'' نے دلائل النبوۃ (۲۶۰/۷) کا حوالہ دے کر اسے صحیح لغیرہ قرار دیا ہے۔ اس روایت سے صحیح مسلم کی حدیث کی وضاحت ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت میں سے بارہ منافق ایسے ہیں جو نہ جنت میں جائیں گے اور نہ اس کی خوشبو پائیں گے، حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے، ان میں سے آٹھ کے لیے تو پھوڑا کافی ہو گا جو آگ کا چراغ ہو گا، جو ان کے کندھوں میں نکلے گا، یہاں تک کہ ان کے سینوں سے نمودار ہو گا۔'' [مسلم، صفات المنافقین، باب صفات المنافقین...... : ۲۷۷۹/۱۰]

آیت 75تا77 ❶ وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ ...... : پہلے یہ لوگ فاقوں مرتے تھے اور ان کے شہر مدینہ جس کا نام ان دنوں یثرب تھا، اس کی بھی کوئی حیثیت نہ تھی، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ان کا شہر پورے عرب کا مرکز بن گیا اور ان کی تجارت کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا اور جنگوں کی وجہ سے بہت سا مال غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا، جس سے یہ لوگ مال دار ہو گئے۔ آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ منافقین اتنے احسان فراموش ہیں کہ اللہ اور رسول جن کی بدولت انھیں یہ خوش حالی نصیب ہوئی، انھی کے خلاف بگڑ کر یہ اپنے دلوں کا فساد ظاہر کر رہے ہیں اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد تو یہ کیا تھا کہ اگر اس نے ہمیں اپنا فضل عطا کیا تو ہم صدقہ بھی ضرور کریں گے اور نیک بھی ہو جائیں گے، لیکن اب اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور اس نے مال و دولت سے نوازا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ مال اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کرنے کے بجائے بخل کر کے اللہ اور اس کے رسول سے منہ ہی موڑ لیا، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ان کے دلوں میں نفاق رکھ دیا۔

❷ بعض مفسرین نے ان آیات کا سبب نزول ثعلبہ بن حاطب کو قرار دیا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کے لیے دعا کروائی اور صدقہ کرنے کا وعدہ کیا، جب مال بہت بڑھا تو نماز با جماعت چھوڑنے کے بعد جمعہ بھی چھوڑ دیا اور زکوٰۃ لینے والا اس کے پاس گیا تو کہنے لگا، یہ تو جزیہ ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''افسوس ثعلبہ پر!'' یہ سن کر وہ زکوٰۃ لے کر آیا، مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کے بعد ابوبکر، پھر عمر، پھر عثمان رضی اللہ عنہم نے بھی قبول کرنے سے انکار کیا، اسی حالت

اِلٰی یَوۡمِ یَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَ بِمَا كَانُوۡا یَكۡذِبُوۡنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ
اللّٰهَ یَعۡلَمُ سِرَّهُمۡ وَ نَجۡوٰىهُمۡ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ

نتیجے میں اس نے ان کے دلوں میں اس دن تک نفاق رکھ دیا جس میں وہ اس سے ملیں گے۔ اس لیے کہ انھوں نے اللہ سے اس کی خلاف ورزی کی جو اس سے وعدہ کیا تھا اور اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے ﴿۷۷﴾ کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ان کا راز اور ان کی سرگوشی جانتا ہے اور یہ کہ بلاشک اللہ سب غیبوں کو بہت خوب جاننے والا ہے ﴿۷۸﴾ وہ لوگ جو صدقات

میں وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں فوت ہو گیا۔ مگر اہل علم نے اس روایت کا شدید رد کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ اس کی کوئی صحیح سند نہیں۔ ابن حزم رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ قصہ باطل ہے، کیونکہ ثعلبہ رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہیں۔

آیت 78 اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ سِرَّهُمۡ وَ نَجۡوٰىهُمۡ ...... : اس آیت میں منافقین کو سخت ڈرایا گیا ہے کہ کیا انھیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کے راز اور سرگوشیاں سب جانتا ہے اور وہ تو تمام غیبوں کو بہت خوب جاننے والا ہے۔ کیا یہ اس سے بھی اپنی دلی حالت چھپا سکیں گے۔ دیکھیے سورۂ زخرف (۸۰) اور مجادلہ (۷)۔

آیت 78 ① اَلَّذِیۡنَ یَلۡمِزُوۡنَ الۡمُطَّوِّعِیۡنَ ...... : "اَلۡمُطَّوِّعِیۡنَ" باب تفعّل سے اسم فاعل ہے جو اصل میں "مُتَطَوِّعِیۡنَ" تھا۔ جو لوگ فرض زکوٰۃ کے علاوہ مزید مال خوشی سے خرچ کرتے ہیں۔ جہد کا معنی محنت و مشقت ہے، یعنی وہ لوگ جو مال دار نہیں مگر محنت مشقت کر کے کمایا ہوا تھوڑا مال بھی خرچ کرتے ہیں۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل کی تو بڑے بڑے مال دار منافقین ہاتھ سکیڑ کر بیٹھ رہے، لیکن مخلص اہل ایمان چندہ لانے لگے تو یہ ان پر باتیں چھانٹنے لگے، جب کوئی شخص زیادہ چندہ لاتا تو یہ اسے ریا کار کہتے اور جب کوئی تھوڑا مال یا غلہ لا کر پیش کرتا تو یہ کہتے کہ بھلا اللہ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟ دونوں صورتوں میں مذاق اڑاتے اور ٹھٹھا کرتے۔ یہ وہ موقع تھا جب عمر رضی اللہ عنہ اپنا نصف مال لے آئے اس خیال سے کہ اگر بڑھ سکا تو آج ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ جاؤں گا، جب ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو گھر کا سارا مال لے آئے تھے۔ [ترمذی، المناقب، باب رجاؤہ أن یکون أبوبکر...... : ۳۶۷۵، وقال حسن صحیح وحسنہ الألبانی]

عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے وقت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں رکھ دیے۔ عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دیناروں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے دو مرتبہ فرمایا: "آج کے (اس عمل کے) بعد عثمان جو بھی عمل کریں وہ انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔" [ترمذی، المناقب، باب فی عد عثمان تسمیته شهیدا...... : ۳۷۰۱] ابو مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب صدقے کی آیت اتری تو ہم اپنی پیٹھوں پر بوجھ اٹھاتے، یعنی اس طرح اجرت حاصل کرتے تو ایک آدمی آیا اس نے بہت زیادہ چیز کا صدقہ کیا تو (منافق) کہنے لگے، یہ دکھاوا چاہتا ہے اور ایک آدمی آیا اور اس نے ایک صاع (دو کلو غلہ) صدقہ کیا تو انھوں نے کہا، اللہ تعالیٰ اس کے صدقے سے بے نیاز ہے (اسے اس کی کیا ضرورت ہے؟) تو یہ آیت اتری۔ [بخاری، الزکوٰۃ، باب : اتقوا النار ولو بشق تمرة

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ
اللّٰهُ مِنْهُمْ ؗ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۹ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ
مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۸۰ ع ۸ / ۱۶

میں خوش دلی سے حصہ لینے والے مومنوں پر طعن کرتے ہیں اور ان پر بھی جو اپنی محنت کے سوا کچھ نہیں پاتے، سو وہ ان سے مذاق کرتے ہیں۔ اللہ نے ان سے مذاق کیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۝۷۹ ان کے لیے بخشش مانگ، یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ، اگر تو ان کے لیے ستر بار بخشش کی دعا کرے گا تو بھی اللہ انھیں ہرگز نہ بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ۝۸۰

...... : ۱٤۱۵] ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ابوعقیل (مزدوری کرکے) آدھا صاع (ایک کلو غلہ) لائے اور ایک اور صاحب زیادہ مال لائے، تو منافق کہنے لگے، اس (نصف صاع) کی اللہ کو کیا ضرورت تھی اور اس دوسرے نے تو محض دکھاوے کے لیے دیا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ ﴾ [بخاری، التفسیر، باب قولہ : ﴿ الذین یلمزون المطوعین...... ﴾ : ٤٦٦٩]

❷ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت (۱۵)۔

آیت 80 ❶ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ......: یعنی آپ کا ان کے لیے استغفار کرنا یا نہ کرنا برابر ہے، یہاں یہ بات امر کے صیغے کے ساتھ آئی ہے، مگر مراد خبر دینا ہی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ صاف خبر کے الفاظ میں فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ [المنافقون : ٦] ''ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔'' اس آیت کی تفسیر کا کچھ حصہ آیت (۸۴) کی تفسیر میں آ رہا ہے۔

❷ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ : یعنی آپ ان کے حق میں کتنا ہی استغفار کریں اللہ تعالیٰ انھیں ہرگز نہیں بخشے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کی وجہ سے وہ بخشے جانے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہاں سے فرق نکلتا ہے بے اعتقاد اور گناہ گار کا۔ گناہ ایسا کون سا ہے جو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بخشانے سے نہ بخشا جائے اور بے اعتقاد کو پیغمبر کا ستر دفعہ استغفار فائدہ نہ کرے۔ اب بے اعتقاد لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر کس دلیل سے بھروسا کر سکتے ہیں؟ آدمی سے برائی ہو جائے یا عمل میں کوتاہی ہو اور وہ شرمندہ ہے تو وہ گناہ گار ہے اور جو بدکام کو عیب نہ جانے اور اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرض کے کرنے اور نہ کرنے کو برابر سمجھے اور کرنے والوں پر طعن کرے، وہ بے اعتقاد

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اللہ کے رسول کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور انھوں نے کہا اس گرمی میں مت نکلو۔ کہہ دے جہنم کی آگ کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ سمجھتے ہوتے ﴿۸۱﴾

ہے۔ ایسے شخص کو پیغمبر ﷺ کا استغفار بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ (موضح)

آیت 81 ❶ **فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ** ...... : منافقین کے مختلف احوال اور ان کی سازشوں اور منصوبوں کے طویل ذکر کے بعد اب خصوصاً ان منافقین کا ذکر شروع ہوتا ہے جو جنگ تبوک میں نبی ﷺ کے ساتھ نہ گئے بلکہ جھوٹے عذر پیش کر کے اجازت لی اور مدینہ منورہ میں ٹھہرے رہے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے "**اَلْمُخَلَّفُوْنَ**" کا لفظ استعمال کیا ہے ''وہ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے'' یعنی وہ خوش نہ ہوں کہ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ وہ آپ ﷺ کے ساتھ نہیں گئے اور آرام کے ساتھ مدینہ کے اندر گھروں میں رہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھیں اللہ کی طرف سے جانے کی توفیق ہی نہیں ملی اور وہ اس کی جناب سے دھکیلے ہوئے پیچھے چھوڑ دیے گئے۔ ان کی حیثیت اس ردی سامان کی ہے جو ساتھ نہیں لے جایا جاتا، بلکہ پھینک دیا جاتا ہے، یا پیچھے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

❷ **وَ كَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ** ...... : کیونکہ اللہ کی خاطر خوشی سے مال و جان کی قربانی ایمان کے بغیر نہیں دی جا سکتی، جس سے یہ محروم ہیں۔ اس میں نکلنے والے مومنوں کی دلی کیفیت اور ان کی تعریف بھی ظاہر ہے کہ وہ کس خوشی سے نکلے۔

❸ **وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ** ...... : یعنی صرف خود ہی نہیں دوسروں کو گرمی کی شدت اور لمبے سفر کی صعوبتوں سے ڈرا کر پیچھے رکھنے کی کوشش کرتے رہے، کیونکہ یہ سفر سخت گرمی کے موسم میں پیش آیا تھا۔ زمخشری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی جہالت کا نتیجہ قرار دیا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ آدمی تھوڑی سی تکلیف برداشت کرنے سے اگر ہمیشہ کی ناقابل برداشت تکلیف سے بچ رہا ہو تو کوئی جاہل بلکہ اجہل ہی ہو گا جو وہ تھوڑی سی تکلیف برداشت نہ کرے اور ہمیشہ کی سخت ترین تکلیف برداشت کرنا پسند کر لے۔ اسی طرح انھیں معلوم ہی نہیں کہ اصل گرمی کیا ہوتی ہے، ورنہ اگر وہ جہنم کی گرمی سے آگاہ ہوتے اور ان کا اس پر ایمان ہوتا تو وہ دنیا کی شدید سے شدید گرمی کی بھی پروا نہ کرتے۔ "**لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ**" کا یہی مطلب ہے، کیونکہ جہنم کا ایک غوطہ دنیا کی تمام لذتیں بھلا دے گا۔ [مسلم : ۲۸۰۷] اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمھاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔'' آپ سے کہا گیا: ''یا رسول اللہ! یقیناً وہی کافی تھی۔''

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى
طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ
عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پس وہ بہت کم ہنسیں اور بہت زیادہ روئیں، اس کے بدلے جو وہ کمائی کرتے رہے ہیں﴿۸۲﴾ پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ تجھ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو کہہ دے تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے۔ بے شک تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے، سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو﴿۸۳﴾

فرمایا: ”وہ ان (آگوں) سے انہتر (۶۹) حصے زیادہ کر دی گئی ہے اور وہ سب اس کی گرمی کی طرح ہیں۔“ [بخاری، بدء الخلق، باب صفة النار و أنها مخلوقة : ۳۲۶۵۔ مسلم : ۲۸۴۳]

آیت 82 فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّ لْيَبْكُوْا كَثِيْرًا: کیونکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے، فانی اور باقی کا کیا مقابلہ؟ اس لیے ان کا ہنسنا بہت ہی کم عرصے کے لیے اور رونا بے حد وحساب مدت کے لیے ہے جس کی انتہا ہی نہیں۔ یہ بظاہر حکم ہے مگر منافقین حکم ماننے والے کب تھے، اس لیے یہ امر کے الفاظ میں خبر دی جا رہی ہے، یعنی یہ لوگ بہت کم ہنسیں گے اور بہت زیادہ روئیں گے۔ ”جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ“ سے اس امر کے بمعنی خبر ہونے کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ خبر میں تو صدق و کذب کا بھی احتمال ہوتا ہے، مگر انشاء (امر و نہی) میں اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا، وہ حتمی ہوتی ہے (اگرچہ اللہ تعالیٰ کی خبر میں بھی کذب کا احتمال نہیں)۔ (المنار) اسی آیت کی ہم معنی وہ حدیث ہے کہ اگر تم وہ کچھ جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت کم ہنسو اور بہت زیادہ روؤ۔ [بخاری، الکسوف، باب الصدقة فی الکسوف : ۱۰۴۴]

آیت 83 ① فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ: ”اگر اللہ تجھے ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے۔“ ”رَجَعَ“ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے، یعنی لوٹنا اور لوٹانا، یہاں متعدی کے معنی میں ہے۔

یعنی جو جنگ تبوک کے لیے نہیں نکلے تھے بلکہ گھروں میں بیٹھے رہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو آئندہ انھیں اپنے ساتھ لے جانے اور اپنے ہمراہ لڑانے سے منع فرما دیا، اس لیے کہ ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ جب وہ مشکل وقت میں ساتھ نہیں گئے تو آسان وقت میں بھی کیوں جائیں، جیسا کہ سورۂ فتح میں حدیبیہ کے لیے نہ جانے والے اعراب کو خیبر کی فتح میں شرکت سے منع فرما دیا۔ دیکھیے سورۂ فتح (۱۱ تا ۱۵) مگر وہاں ہمیشہ کے لیے منع نہیں فرمایا، جبکہ تبوک سے پیچھے رہنے والے منافقین کو ہمیشہ کے لیے ساتھ لے جانے سے منع فرما دیا۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جو فرمایا کہ ”اگر پھر لے جائے تجھے اللہ کسی فرقہ کی طرف“ وہ اس واسطے کہ یہ آیت سفر میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ مدینہ میں منافق تھے اور فرقے اس واسطے فرمایا کہ بعض منافق پیچھے مر گئے اور سب بیٹھنے والے منافق نہ تھے، بعض مسلمان بھی تھے، ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ (موضح)

② فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ: یعنی پہلی مرتبہ کی طرح اب بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہو جو بے عذر گھروں میں رہ گئے

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے ﴿۸۴﴾ اور تجھے ان کے اموال اور ان کی اولاد تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا میں سزا دے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں ﴿۸۵﴾

یا معذوروں کے ساتھ بیٹھے رہے، جیسے عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار اور اپاہج وغیرہ۔

آیت 84 وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا …… : ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی فوت ہوا تو اس کا بیٹا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا کہ مجھے اپنی قمیص دیجیے کہ میں اسے اس میں کفن دوں اور آپ اس پر جنازہ پڑھیں اور اس کے لیے بخشش کی دعا فرمائیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی قمیص دی اور فرمایا: ''مجھے اطلاع دینا، تاکہ میں اس کا جنازہ پڑھوں۔'' اس نے اطلاع دی تو جب آپ نے اس پر جنازے کا ارادہ کیا، عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو کھینچ لیا اور کہا، کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین کا جنازہ پڑھنے سے منع نہیں فرمایا؟ آپ نے فرمایا: ''مجھے دو اختیار ہیں: ﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ [التوبة : ۸۰] (ان کے لیے بخشش مانگ یا ان کے لیے بخشش نہ مانگ)۔'' سو آپ نے اس کا جنازہ پڑھا تو یہ آیت اتری: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا﴾ [بخاری، الجنائز، باب ما یکرہ من الصلوة علی المنافقین …… : ۱۳۶۶۔ مسلم : ۲۴۰۰]

اب جو شخص کلمہ پڑھ کر صریح شرک کرتا ہے اور غیر اللہ سے وہ مدد مانگتا ہے جو اللہ کے سوا کسی کے اختیار ہی میں نہیں، یا کلمہ کے بعد مسلمان ہونے کی پہلی شناخت نماز ہی اس میں نہیں پائی جاتی، یا وہ صاف اللہ تعالیٰ کی حدود کو وحشیانہ سزائیں کہتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے احکام کا مذاق اڑاتا ہے، یا اس زمانے میں انھیں ناقابل عمل کہتا ہے، اس کا جنازہ پڑھنا کیسے درست ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میت کو جنازے کے بعد دفن کر کے قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگتے تھے۔ مختلف دوسرے اوقات میں وہاں جا کر ان کے لیے دعا کرتے تھے، منافقین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بھی منع فرما دیا۔ کیونکہ اس میں منافق، کافر اور مشرک کی تکریم اور عزت افزائی ہے جو اللہ تعالیٰ کو کسی صورت منظور نہیں۔

آیت 85 وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ …… : اس سے پہلے آیت (۵۵) میں بھی چند الفاظ کے فرق کے ساتھ یہ آیت گزری ہے، یہاں دوبارہ لانے کا مقصد یہ ہے کہ نفاق انھی چیزوں کی محبت اور حرص سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ منافقون میں ان کے اعمال بد کے تذکرے کے بعد آخر میں یہی تلقین فرمائی: ﴿لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [المنافقون : ۹] ''دیکھنا کہیں تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔'' یہاں بھی گزشتہ آیت کو

وَ اِذَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ جَاهِدُوۡا مَعَ رَسُوۡلِهِ اسۡتَاۡذَنَكَ اُولُوا الطَّوۡلِ مِنۡهُمۡ
وَ قَالُوۡا ذَرۡنَا نَكُنۡ مَّعَ الۡقٰعِدِيۡنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوۡا بِاَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ وَ طُبِعَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ
فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُوۡنَ ﴿۸۷﴾ لٰكِنِ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ جٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ ؕ
وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الۡخَيۡرٰتُ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۸۸﴾

اور جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت والے تجھ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ دے کہ ہم بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ رہ جائیں ﴿۸۶﴾ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی، سو وہ نہیں سمجھتے ﴿۸۷﴾ لیکن رسول نے اور ان لوگوں نے جو اس کے ہمراہ ایمان لائے، اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے سب بھلائیاں ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں ﴿۸۸﴾

دوبارہ لانے سے مقصود دنیا کی فراوانی پر رشک سے بچنے کی تاکید اور منافقین کے لیے اموال و اولاد کی فراوانی کے ان کے لیے نقصان دہ ہونے کا بیان ہے۔ مزید اسی سورت کی آیت (۵۵) کے حواشی دیکھیے۔

آیت 87،86 وَ اِذَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ ...... : "سُوۡرَةٌ" آیات کا ایک حصہ، ٹکڑا۔ "الطَّوۡلِ" کا معنی "اَلْفَضْلُ وَ الْقُدْرَةُ وَالْغِنٰی وَ السَّعَةُ" ہے۔ (قاموس) یعنی وسعت و طاقت اور مال و دولت۔ "الۡخَوَالِفِ" یہ "خَالِفَةٌ" کی جمع ہے "پیچھے رہنے والی عورتیں۔" "فَاعِلَةٌ" کی جمع "فَوَاعِلُ" آتی ہے، جیسے "قَاطِعَةٌ" کی جمع "قَوَاطِعُ" اور "ضَارِبَةٌ" کی جمع "ضَوَارِبُ" اور "قَافِلَةٌ" کی جمع "قَوَافِلُ" یعنی جہاد کے حکم والی آیات کا کوئی حصہ اترنے پر وہ لوگ عذر کریں جن کے پاس کچھ نہیں اور جو ضروریات جہاد حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے ساتھ نہیں جا سکتے تو بات سمجھ میں آتی ہے، مگر ان منافقین میں سے وسعت و طاقت والے بھی جہاد میں نہ جانے اور پیچھے رہنے کی اجازت مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اسباب بیان فرمائے کہ بزدلی کی وجہ سے ان میں ایسی کمینگی پیدا ہو چکی ہے کہ انھیں عورتوں کے ساتھ پیچھے رہ جانے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس پر خوش ہیں اور ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ جہاد کی برکات کو اور بزدلی اور ترک جہاد کی نحوست اور نقصانات کو نہیں سمجھتے۔ نہ ان پر اللہ اور اس کے رسول کی بات کا اثر ہوتا ہے اور نہ کسی سمجھانے والے کی نصیحت کا۔

آیت 88 لٰكِنِ الرَّسُوۡلُ وَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ...... : لیکن رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کا حال منافقین جیسا نہیں، ان میں نہ ان کی طرح بزدلی ہے، نہ جہاد سے گریز، نہ مال و جان کی قربانی میں بخل، نہ اللہ اور اس کے رسول سے کفر، نہ نافرمانی، بلکہ وہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد یعنی اپنی آخری کوشش کرتے ہیں اور ہر حال میں اطاعت کرتے ہیں۔ انھی کے لیے تمام بھلائیاں، یعنی دنیا کی فتوحات و غنائم اور آخرت کے سب سے بلند درجے

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾ وَجَآءَ
الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۸۹﴾ اور بدویوں میں سے بہانے بنانے والے آئے، تاکہ انھیں اجازت دی جائے اور وہ لوگ بیٹھ رہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا۔ ان میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے کفر کیا، جلد ہی دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۹۰﴾

ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجرات (۱۵) اور صف (۱۰ تا ۱۲) انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں پہنچ جانے والا کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو پسند کرے کہ دنیا میں واپس آئے، خواہ دنیا کی ہر چیز اسے دے دی جائے، سوائے شہید کے، وہ تمنا کرے گا کہ دنیا کی طرف واپس جائے، پھر دس مرتبہ قتل کیا جائے، اس عزت و کرامت کی وجہ سے جو وہ دیکھے گا۔'' [بخاري، الجهاد والسير، باب تمنى المجاهد أن يرجع إلى الدنيا : ۲۸۱۷]

آیت 89 اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ ...... : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار کیے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہے تو جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے بہتر اور سب سے بلند حصہ ہے، جس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔'' [بخاري، الجهاد والسير، باب درجات المجاهدين في سبيل الله : ۲۷۹۰، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ]

آیت 90 وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ ...... : اس سے پہلے مدینہ کے منافقین اور اہل ایمان کا ذکر تھا، اب مدینہ کے اردگرد بادیہ نشینوں کا حال ذکر ہوتا ہے، کیونکہ ان میں بھی دونوں قسم کے لوگ موجود تھے، جیسا کہ آگے آیت (۹۸، ۹۹) اور پھر (۱۰۱، ۱۰۲) میں ذکر آ رہا ہے۔ مفسرین نے اس کی تفسیر دو طرح کی ہے، کیونکہ عذر کرنے والے سچے بھی ہو سکتے ہیں اور جھوٹے بھی، اس لیے بعض نے تو ''الْمُعَذِّرُوْنَ'' سے مراد وہ اعراب لیے ہیں جو صحیح مومن تھے مگر کسی حقیقی عذر کی وجہ سے نہیں جا سکے تھے، یہ لوگ تو اپنا عذر بیان کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا اور دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ گھروں ہی میں بیٹھے رہے، انھوں نے آکر عذر پیش کرنے کی زحمت ہی نہیں کی، چنانچہ ان میں سے کفر کرنے والوں کو عذاب الیم کی وعید سنائی گئی، یعنی دنیا میں قید اور قتل اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

بعض مفسرین نے '' الْمُعَذِّرُوْنَ'' سے مراد جھوٹے بہانے اور باطل عذر پیش کرنے والے لیے ہیں۔ زمخشری رحمہ اللہ نے اس رائے کی تائید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''الْمُعَذِّرُوْنَ'' باب تفعیل سے ہو تو ''عَذَّرَ فِي الْأَمْرِ'' کا معنی ہی یہ ہے کہ اس نے

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾

نہ کمزوروں پر کوئی حرج ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جو وہ چیز نہیں پاتے جو خرچ کریں، جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خلوص رکھیں۔ نیکی کرنے والوں پر (اعتراض کا) کوئی راستہ نہیں اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۹۱﴾

کام میں سستی کی، اس کی کوشش ہی نہیں کی اور ظاہر یہ کیا کہ اس کا عذر تھا، حالانکہ اس کا عذر کوئی نہ تھا اور اگر ''اَلْمُعَذِّرُوْنَ'' باب افتعال سے ہو اور اس کا اصل ''مُعْتَذِرُوْنَ'' ہو پھر بھی جھوٹے بہانے ہی مراد ہیں، جیسا کہ آگے صاف آ رہا ہے: ﴿ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ﴾ [التوبة : ٩٤] ''تمھارے سامنے عذر پیش کریں گے، جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے۔''

پہلی تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ہر عذر والا جھوٹا نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود اگلی آیت میں کئی عذر والوں کو گناہ سے بری قرار دیا ہے اور اس آیت میں بھی دونوں قسموں میں سے ''اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' ہی کو عذاب کی وعید سنائی ہے، اگرچہ ترجیح کا رجحان دوسری تفسیر کی طرف ہے، مگر امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی بات میں وزن معلوم ہوتا ہے۔

آیت 91 ① لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ...... : اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو واقعی معذور تھے اور ان کا عذر واضح تھا۔ ان میں سب سے پہلے ''اَلضُّعَفَآءِ'' ہیں، ان سے مراد لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، عورتیں اور بچے ہیں۔ دوسرے ''اَلْمَرْضٰى'' (مریض کی جمع) جو بیماری کی وجہ سے نہیں جا سکتے، دوسری جگہ فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ﴾ [الفتح : ١٧] ''نہیں ہے اندھے پر کوئی تنگی اور نہ لنگڑے پر کوئی تنگی اور نہ مریض پر کوئی تنگی۔'' اور تیسرے وہ تندرست طاقت رکھنے والے جو مالی استطاعت نہیں رکھتے کہ جہاد کے سفر اور اس کے ساز و سامان مثلاً سواری اور ہتھیار وغیرہ کی تیاری کر سکیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة : ٢٨٦] ''اللہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔''

② اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: یعنی وہ کام نہ کرتے ہوں جس سے اللہ کے دین، رسول کریم ﷺ یا مومنوں کو کوئی نقصان اور ان کے دشمنوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)) ''دین خیر خواہی (خلوص) ہی کا نام ہے۔'' ہم نے کہا: ''کس کے لیے؟'' فرمایا: ''اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے حکام کے لیے اور ان کے تمام لوگوں کے لیے۔'' [مسلم، الإيمان، باب بيان أن الدين النصيحة : ٥٥، عن تميم رضی اللہ عنہ] عام لوگوں کی خیر خواہی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ جب مجاہدین جہاد پر گئے ہوئے ہوں تو یہ لوگ شہر میں رہیں، ان کے گھروں کی، کاروبار کی اور بال بچوں کی خبر گیری رکھیں، ان کی عزت و آبرو کی ہر طرح سے حفاظت کریں، مجاہدین کی ضروریات بھیجتے رہیں، جھوٹی خبریں یا افواہیں نہ پھیلائیں، کسی قسم کا فساد برپا نہ کریں اور مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے والوں کا منہ بند کریں۔

③ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ: یعنی یہ لوگ معذور ہیں، اگر جہاد میں شرکت نہ کریں تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس آئے، مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا: ''بے شک مدینہ میں کئی لوگ ہیں، تم

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور نہ ان لوگوں پر کہ جب بھی وہ تیرے پاس آئے ہیں، تاکہ تو انھیں سواری دے تو تو نے کہا میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں، تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی تھیں، اس غم سے کہ وہ نہیں پاتے جو خرچ کریں ﴿۹۲﴾ (اعتراض کا) راستہ تو صرف ان لوگوں پر ہے جو تجھ سے اجازت مانگتے ہیں، حالانکہ وہ دولت مند ہیں، وہ اس پر راضی ہو گئے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی، سو وہ نہیں جانتے ﴿۹۳﴾

کسی راستے پر نہیں چلے اور نہ تم نے کوئی وادی طے کی ہے، مگر وہ تمھارے ساتھ رہے ہیں۔'' لوگوں نے پوچھا: ''یا رسول اللہ! اور وہ مدینہ ہی میں تھے؟'' فرمایا: '' (ہاں) وہ مدینہ ہی میں تھے، انھیں عذر نے روک رکھا تھا۔'' [بخاري، المغازي، باب : ٤٤٢٣]

آیت 92 ① وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ ...... : یہ مخلص مسلمانوں کے ایک اور گروہ کا ذکر ہے جن کے پاس اپنی سواریاں نہیں تھیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سواریاں لینے کے لیے آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، میرے پاس تمھیں سواری دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، اس پر انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے اور ایسے روئے گویا آنکھیں پانی کے چشمے بن گئیں، جن سے آنسوؤں کی نالیاں رواں ہوں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں کہ ہم جہاد میں شریک ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی گناہ سے بری قرار دیا کہ ان لوگوں پر اعتراض کا کوئی راستہ اور کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ محسنین ہیں۔

② اس آیت پر ان لوگوں کو خلوص کے ساتھ غور کرنا چاہیے جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دنیا و آخرت کے خزانوں کے مالک اور مختار کل ہیں۔ یہ حضرات آپ کے اس فرمان کا ترجمہ کیا کریں گے: ﴿لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ﴾ ''میں وہ چیز نہیں پاتا جس پر تمھیں سوار کروں۔'' ان بھائیوں کو اللہ کا خوف کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو مالک الملک اور مختار کل کہہ کر اللہ کا شریک بنانے سے توبہ کرنی چاہیے، کیونکہ یہ گناہ اللہ کے ہاں کسی صورت قابل معافی نہیں ہے۔

آیت 92 ① اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ ......: اللہ تعالیٰ اکثر مقامات پر ہر چیز کے دونوں پہلو بیان کرتا ہے، فرمایا ان پر تو کچھ اعتراض نہیں جن کا ذکر اوپر گزرا، صرف ان لوگوں پر گناہ کا سارا بوجھ ہے جن کے پاس سواری بھی ہے، زادِ راہ بھی اور تندرستی بھی اور پھر اغنیاء ہو کر بھی آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور اپنی بزدلی، نفاق اور کفر کی وجہ سے پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جانے میں انھیں کوئی عار نہیں، بلکہ اس پر انھیں فخر اور خوشی ہے کہ ہم گرمی میں سفر اور ہلاکت سے بچ گئے۔

② وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ......: ان کے نفاق کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا کر انھیں ایسا بند کر دیا ہے کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے میں اور جہاد فی سبیل اللہ میں کیا لذت ہے اور ان کی کیا فضیلت اور کیا ثواب ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

تمھارے سامنے عذر پیش کریں گے، جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے، کہہ دے عذر مت کرو، ہم ہرگز تمھارا یقین نہ کریں گے، بے شک اللہ ہمیں تمھاری کچھ خبریں بتا چکا ہے، اور عنقریب اللہ تمھارا عمل دیکھے گا اور اس کا رسول بھی، پھر تم ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے ﴿۹۴﴾

آیت 94 ① **يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ** ...... : جیسا کہ پہلے گزرا کہ یہ سلسلۂ آیات تبوک سے واپسی پر نازل ہوا، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو پہلے ہی ان کے جھوٹے بہانوں کی اطلاع دے دی اور ساتھ ہی حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ بہانے مت تراشو، ہم کسی صورت تمھارا اعتبار نہیں کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمھاری کچھ خبریں بتا دی ہیں۔ اب دیکھا جائے گا کہ تمھارا آئندہ رویہ کیا رہتا ہے، آیا تم موجودہ روش سے باز آتے ہو یا اسی پر جمے رہتے ہو۔

② **وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ**: یہ عبارت یوں بھی ہو سکتی تھی کہ "وَ سَيَرَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ عَمَلَكُمْ" کہ عنقریب اللہ اور اس کا رسول تمھارا عمل دیکھیں گے، مگر مفعول "عَمَلَكُمْ" کو "رَسُوْلُهٗ" سے پہلے لانے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اصل دیکھنے والا اور نگرانی کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، کیونکہ وہ ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ اس کے بعد اللہ کے رسول بھی تمھارا عمل جو سامنے ہوگا دیکھیں گے، لیکن رسول اللہ ﷺ کو اگر ظاہری عمل سے مطمئن کر بھی لو اور تمھاری دلی کیفیت درست نہیں تو پھر تمھیں غائب و حاضر کو جاننے والے کے سامنے بھی حاضر ہونا ہے اور وہ تمھیں تمھاری اصل حقیقت سے آگاہ کرے گا۔ بعض شرک کے بیماروں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حالات سے واقف ہے اور اس کا رسول بھی، کیونکہ اس آیت کے مطابق وہ دونوں سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ آیت کا مطلب تو اوپر بیان ہو چکا ہے مگر یہ حضرات اسی سورت کی آیت (۱۰۵) کا کیا کریں گے کہ جس میں ہے: ''اور کہہ دے تم عمل کرو پس عنقریب اللہ تمھارا عمل دیکھے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی۔'' تو کیا اللہ کے سوا رسول اور مومنین بھی سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور ہر بات سے واقف ہیں؟ مومن ہونے کا خیال تو ان حضرات کا اپنے بارے میں بھی ہوگا، ذرا اپنی حیثیت اور علم کی رسائی پر غور فرما لیں تو بہت جلد بات سمجھ میں آ جائے گی۔ سورۂ نمل کی آیت (۶۵) اور اعراف کی آیت (۱۸۸) پر بھی ایک نظر ڈال لیں اور اسی سورۂ توبہ کی آیت (۱۰۱) ﴿ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ﴾ پر بھی غور فرما لیں۔

③ ان آیات میں منافقین کو اخلاص کی طرف پلٹنے کی دعوت بھی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ منافقین کو بھی اسی طرح بار بار بلاتا ہے کہ ہاں عمل کرو ہم تمھاری نگرانی کر رہے ہیں، اگر پلٹ آؤ گے تو ہم معاف کر دیں گے اور فی الواقع کئی منافقین

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫ وَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

عنقریب وہ تمھارے لیے اللہ کی قسم کھائیں گے جب تم ان کی طرف واپس آؤ گے، تاکہ تم ان سے توجہ ہٹا لو۔ سو ان سے بے توجہی کرو، بے شک وہ گندے ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اس کے بدلے جو وہ کماتے رہے ہیں ﴿۹۵﴾ تمھارے لیے قسم کھائیں گے، تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، پس اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو بے شک اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا ﴿۹۶﴾

اخلاص کی دولت سے سرفراز بھی ہوئے۔ دیکھیے سورۂ توبہ (٦٦) اور نساء (۴۴، ۴۵)۔

آیت 95 سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ ...... : اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تمھارے سامنے اللہ کی قسم کھانے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ تم ان سے اعراض کرو، سو واقعی تم ان سے اعراض کرو۔ پہلے اعراض کا مطلب ہے کہ تم ان سے درگزر اور چشم پوشی کرو اور دوسرے اعراض کا مطلب یہ ہے کہ تم ان سے درگزر اور چشم پوشی کے ساتھ قطع تعلق بھی کرو۔ پھر ان سے قطع تعلق کا سبب بیان فرمایا کہ یہ رجس ہیں، جس کا معنی ''گندگی'' ہے، یعنی عقائد و اعمال کے لحاظ سے وہ اتنے گندے ہیں کہ سمجھو سراسر گندگی ہیں، گندگی کی پوٹ ہیں۔ گندگی سے تعلق کا نتیجہ آلودگی ہی ہے، اس لیے ان سے بچ جاؤ، تاکہ کہیں ان سے متاثر نہ ہو جاؤ۔ ''صحبت طالح ترا طالح کند'' پھر ان کا انجام بیان فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ان سے چشم پوشی اور درگزر ہی سے کام لیا۔ چنانچہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (ان تین مخلص مسلمانوں میں سے ایک جو بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سفر سے واپس آتے تو مسجد سے ابتدا کرتے، چنانچہ آپ لوگوں کے لیے بیٹھ گئے تو پیچھے رہ جانے والے آئے اور عذر پیش کرنے لگے اور آپ کے سامنے قسمیں کھانے لگے، یہ اسی (٨٠) سے کچھ زیادہ لوگ تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ظاہر کو قبول فرمایا، ان سے بیعت لی، ان کے لیے استغفار کیا اور ان کے پوشیدہ معاملات اللہ کے سپرد کر دیے۔ [بخاري، المغازي، باب حديث كعب بن مالك رضی اللہ عنہ ...... : ٤٤١٨]

آیت 96 يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ...... : یعنی ان کے قسمیں کھانے اور حیلے بہانے کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ تم ان سے درگزر کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور پھر یہ چاہتے ہیں کہ ان سے راضی بھی ہو جاؤ، اگر تم ان کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو بھی جاؤ تو اللہ تعالیٰ ان کے فسق کی وجہ سے ان سے کبھی راضی نہیں ہوگا۔ '' فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنْهُمْ '' کے بجائے ﴿لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ﴾ کہنے میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بیان ہوا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے بھی ان کے فسق کی وجہ سے کسی صورت ان سے راضی ہونا جائز نہیں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جس

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۹۷

بدوی لوگ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور زیادہ لائق ہیں کہ وہ حدیں نہ جانیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۹۷﴾

شخص کے حالات سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ منافق ہے، اس کی طرف سے تغافل تو جائز ہے مگر اس سے دوستی اور محبت روا نہیں۔'' (موضح)

آیت 97 ① اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّ نِفَاقًا...... : ''اَلۡاَعۡرَابُ'' عرب کے صحرا اور بادیہ میں رہنے والوں کے لیے اسم جنس ہے، واحد کے لیے ''اَعۡرَابِی'' اور مؤنث کے لیے ''اَعۡرَابِیَّةٌ'' استعمال ہوتا ہے، جمع ''اَعَارِیۡبُ'' ہے۔ '' اَلۡعَرَبُ '' اس نسل کے لیے اسم جنس ہے جو عربی زبان بولتی ہے، خواہ شہری ہو یا بادیہ نشیں، اس کا واحد '' عَرَبِیٌّ '' آتا ہے۔ یہاں اعراب سے مراد ان کی جنس کے بعض افراد ہیں ہر شخص نہیں، کیونکہ ان میں سے بعض مخلص اہل ایمان کا ذکر آئندہ آیات میں آ رہا ہے۔

② ''اَلۡاَعۡرَابُ'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو مدینہ منورہ سے دور دیہاتی اور صحرائی علاقوں میں رہتے تھے، ان میں سے اکثر اسلام کی دعوت کو سمجھ کر سچے دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ محض اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ انھیں شہر (مدینہ منورہ) میں آنے، مسلمانوں سے میل جول رکھنے اور آپ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا بہت کم موقع ملتا تھا، اس لیے یہ نرے گنوار اور اجڈ قسم کے لوگ تھے، جن کے دلوں میں نہ نرمی پیدا ہوئی تھی اور نہ انھیں علم کی ہوا لگی تھی۔ اس لیے ان میں جو منافق تھے ان کا نفاق بھی اہل مدینہ کے نفاق سے سخت تھا۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ بدوی اور شہری لوگوں کی طبیعتوں میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو ایک باغ کے میوے اور پہاڑی درخت کے میوے میں محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بستیوں سے مبعوث فرمایا: ﴿ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰی ﴾ [یوسف : ۱۰۹] ''اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم ان بستیوں والوں میں سے وحی کیا کرتے تھے۔'' اور آخری رسول ﷺ کو تمام بستیوں کی ماں ام القریٰ مکہ میں پیدا فرمایا، تاکہ وہ شہری معاشرے کی شائستگی اور نرم دلی کے حامل ہوں۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بدویوں کی سرشت میں بے حکمی، مفاد پرستی اور جہالت رچی بسی ہوئی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت سے نہ ان پر زیادہ ذمہ داری ڈالی اور نہ ان کو درجات کی بلندی عطا ہوئی۔'' (موضح)

لوگوں کے ساتھ میل جول کی کمی کی وجہ سے طبیعت میں سختی پیدا ہو جانا فطری سی بات ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بادیہ میں سکونت رکھے وہ سخت دل ہو جاتا ہے، جو شکار کے پیچھے ہی لگ جائے وہ غافل ہو جاتا ہے اور جو سلطان کے پاس آئے وہ آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے۔'' [أحمد : ۱/ ۳۵۷، ح : ۳۳۶۱۔ أبو داوٗد : ۲۸۵۹۔ ترمذی : ۲۲۵۶۔ نسائی : ۴۳۱۴، وصححه الألبانی]

وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ ؕ عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ

اور بدویوں میں سے کچھ وہ ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تم پر (زمانے کے) چکروں کا انتظار کرتے ہیں، برا چکر انھی پر ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۹۸﴾ اور بدویوں میں سے کچھ وہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں قربتوں اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ

بعض اعراب کی سخت دلی پر اس حدیث سے کافی روشنی پڑتی ہے جو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمائی کہ اعراب کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے (انھوں نے آپ کو حسن یا حسین رضی اللہ عنہما کو چومتے دیکھا) تو کہنے لگے: ''کیا تم لوگ اپنے بچوں کو چومتے ہو؟'' لوگوں نے کہا: ''ہاں!'' تو وہ کہنے لگے: ''لیکن اللہ کی قسم! ہم تو نہیں چومتے!'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور کیا میں اختیار رکھتا ہوں، اگر اللہ نے تم سے رحم کرنا نکال لیا ہے۔'' [مسلم، الفضائل، باب رحمته ﷺ الصبيان ...... : ۲۳۱۷۔ بخاری : ۵۹۹۸] مفسرین نے اس مقام پر اعراب کی سخت دلی کے کئی واقعات لکھے ہیں۔

آیت 98 ① **وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ ......** : **''مَغْرَمًا''** سے مراد تاوان، چٹی اور جرمانہ ہے، قرض کو بھی **''مَغْرَمًا''** کہہ لیتے ہیں۔ قرض خواہ کو غریم کہتے ہیں، کیونکہ غرام کا معنی لازم ہونا، چمٹنا بھی ہے۔ تاوان بھی لازم ہو جاتا ہے اور قرض خواہ بھی جان نہیں چھوڑتا، سورۂ فرقان میں ہے: ﴿ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴾ [الفرقان : ٦٥] ''بے شک اس کا عذاب ہمیشہ چمٹ جانے والا ہے۔'' یعنی بعض اعراب ایسے ہیں کہ زکوٰۃ ہو یا جہاد، اس کے لیے جب بھی چندہ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر نہیں اور نہ دلی جذبہ کے ساتھ، بلکہ محض چٹی یا جرمانہ سمجھ کر بادل ناخواستہ ادا کرتے ہیں کہ اگر ادا نہ کریں گے تو مسلمان انھیں مشتبہ نگاہوں سے دیکھیں گے اور ان کے درمیان زندگی بسر کرنا دوبھر ہو جائے گا۔

② **وَ یَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآىِٕرَ** : **''الدَّوَآىِٕرَ''** ''دَائِرَةٌ'' کی جمع ہے، جو ''دَارَ يَدُوْرُ دَوْرًا'' (گھومنا) سے اسم فاعل ہے، چکر، گھومنے والا، یعنی وہ انتظار کر رہے ہیں کہ تم پر کب کوئی اچانک مصیبت اترتی ہے اور تم کب زمانے کے کسی چکر کے گھیرے میں آ کر زوال کا شکار ہوتے ہو، یا یہ کہ کب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوتے ہیں اور مشرکین کو تم پر غلبہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زبانی بدگوئی اور دلی بدخواہی کو ہی نہیں، بلکہ ہر بات کو سننے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

③ **عَلَیْهِمْ دَآىِٕرَةُ السَّوْءِ** : **''السَّوْءِ''** ''سَاءَهُ يَسُوْءُهُ سَوْءًا'' سین کے فتح کے ساتھ مصدر ہے، جب کسی کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جو اسے برا لگے اور سین کے ضمہ کے ساتھ اسم مصدر ہے، یعنی یہ برا چکر انھی پر آنے والا ہے، یا بددعا ہے کہ برا چکر انھی پر آئے، مگر اللہ تعالیٰ کو بددعا کی کیا ضرورت ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کی اس بدخواہی کا تقاضا ہے کہ ان پر یہ بددعا کی جائے کہ برا چکر انھی پر چلے۔

آیت 98 **وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ......** : **''قُرُبٰتٍ''** یہ ''قُرْبَةٌ'' کی جمع ہے، وہ عمل جسے انسان اپنے خالق کے

قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
ع غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ

سمجھتے ہیں۔ سن لو! بے شک وہ ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے، عنقریب اللہ انھیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۹۹﴾ اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے سب سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے

قریب ہونے کا ذریعہ بنائے۔ ”صَلَوٰتِ“ یہ ” صَلَاۃٌ “ کی جمع ہے جس کا معنی نماز کے علاوہ دعا بھی آتا ہے۔ یعنی سب اعراب ایک جیسے نہیں، ان میں کئی مخلص مسلمان بھی ہیں، جو خوش دلی سے صدقہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کے ہاں قربتوں اور رسول کی دعاؤں کو حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شہادت دی کہ ان کے یہ اعمال یقیناً ان کے لیے قرب کا ذریعہ ثابت ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں ضرور اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ لے کر آتا تو آپ اس کے لیے دعا کرتے ہوئے کہتے: ((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی فُلَانٍ)) ”اے اللہ! فلاں پر رحم فرما۔“ عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب میرے والد زکوٰۃ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ نے انھیں دعا دیتے ہوئے فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ اَبِیْ اَوْفٰی)) ”اے اللہ! ابو اوفی کی آل پر رحم فرما۔“ [بخاری، الزکاۃ، باب صلاۃ الإمام و دعاءہ لصاحب الصدقۃ ...... : ۱۴۹۷]

آیت 100 ① **وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ......** : مدینہ کے اندر رہنے والے منافقین کے ذکر کے بعد اس کے اردگرد رہنے والے بعض اعراب منافقین کا ذکر فرمایا، پھر بعض اعراب مومنوں کے اخلاص کا ذکر فرمایا اور انھیں اپنی رحمت کی خوش خبری سنائی، اب ان سے اعلیٰ مراتب والے خوش نصیبوں کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے تین گروہوں کی تعریف فرمائی ہے، پہلا گروہ مہاجرین میں سے سبقت کرنے والے پہلے لوگ۔ ان کی تعیین میں مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں، وہ لوگ جنھوں نے مکہ میں اپنی جائدادیں، گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر ہجرت کی، بعض نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھنے والے، بعض نے بدری صحابہ، بعض نے بیعت رضوان تک والے اور بعض نے فتح مکہ تک والے صحابہ مراد لیے ہیں۔ بہر حال ان سب کو دوسروں پر یقیناً ایک قسم کی سبقت حاصل ہے۔ دوسرا گروہ انصار میں سے سابقون وہ ہیں جنھوں نے مدینہ سے آ کر ۱۱ نبوی میں مکہ میں حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر پہلی بیعت عقبہ کی۔ یہ سات افراد تھے، دوسری بیعت عقبہ جو ۱۲ نبوی میں ہوئی اس میں ستر (۷۰) آدمی اور دو خواتین شامل تھیں، پھر وہ جو ان کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ ہجرت سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، پھر وہ سب اہل مدینہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کے بعد مسلمان ہوئے، ان سب کو درجہ بدرجہ سبقت حاصل ہے۔ تیسرا گروہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سابقین مہاجرین و انصار کے بعد ایمان لا کر ہجرت یا نصرت کا شرف حاصل کیا، جیسا کہ سورۂ انفال میں مہاجرین و انصار کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۰۰﴾

اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ ﴾ [الأنفال : ۷۵] ''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا۔'' گویا صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ایمان لانے والے اور اس پر استقامت اختیار کرنے والے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس تیسرے گروہ میں شامل ہیں۔

❷ آلوسی صاحب روح المعانی نے فرمایا: ''بہت سے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ ﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت کے شرف کی بنا پر بعد والے تمام لوگوں پر سبقت حاصل ہے، جو پھر کسی کو نصیب نہ ہو سکی اور ﴿ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ﴾ (اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے) سے قیامت تک آنے والے وہ تمام مسلمان مراد ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے صرف قرآن اور سنت رسول پر اخلاص کے ساتھ عمل کرتے رہے۔'' کیونکہ دوسرے کسی بھی فرقے کے لوگ اپنے امام کی تقلید کا دعویٰ تو کر سکتے ہیں، مگر تمام صحابہ کی اچھے طریقے اور نیکی سے پیروی کا دعویٰ نہیں کر سکتے، کیونکہ صحابہ کا عمل صرف قرآن و سنت پر تھا۔ اس وقت نہ فرقے تھے نہ وہ لوگ جن کے نام پر فرقے بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تفسیر بھی بالکل درست ہے، البتہ اس آیت سے صرف اصطلاحی تابعین مراد لینا کہ وہ لوگ جنھوں نے ایمان کی حالت میں صحابہ کی زیارت کی ہو ہرگز درست نہیں، کیونکہ احسان کے ساتھ مہاجرین و انصار کے پیچھے چلنے والے صرف وہی نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے سبھی مسلمان ہیں جن کے اخلاص اور قول و عمل میں احسان پایا جاتا ہے۔ ہاں اصطلاحی تابعین بدرجۂ اولیٰ ان میں شامل ہیں۔

❸ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جو اسلام میں بھی اول ہیں اور ہجرت میں بھی آپ ﷺ کے ساتھی ہیں، پھر بالترتیب دوسرے خلفاء رضی اللہ عنہم کے درجے ہیں، ان کے بعد باقی عشرہ مبشرہ جن میں طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، عبد الرحمٰن بن عوف اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم شامل ہیں، پھر بدری اور عقبہ والے صحابہ کا درجہ ہے اور ان کے بعد جو بیعت رضوان میں شریک ہوئے، پھر جو فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور ہجرت و نصرت کی۔ صحابہ کی فضیلت کی اس ترتیب پر اہل السنہ والجماعہ متفق ہیں۔

❹ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ: چونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور جنت میں داخلے کی خوش خبری کی جو وجہ بیان ہوئی ہے، یعنی ہجرت و نصرت وہ دائمی ہے۔ کوئی شخص ان سے یہ اعزاز نہیں چھین سکتا۔ اس لیے اس پر ملنے والی بشارت بھی دائمی

وَ مِمَّنۡ حَوۡلَکُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ؕۛ وَ مِنۡ اَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ ۟ۛ مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ ۟ لَا تَعۡلَمُہُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُہُمۡ ؕ سَنُعَذِّبُہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ ثُمَّ یُرَدُّوۡنَ اِلٰی عَذَابٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۰۱﴾ۚ

اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے ارد گرد بدویوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہل مدینہ میں سے بھی جو نفاق پر اڑ گئے ہیں، تو انھیں نہیں جانتا، ہم ہی انھیں جانتے ہیں۔ عنقریب ہم انھیں دوبار عذاب دیں گے، پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۱۰۱﴾

اور ہمیشہ کے لیے ہے، لہٰذا ان صحابہ میں سے۔ (العیاذ باللہ) کسی کے مرتد ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اپنی رضا اور جنت کی خوش خبری دے ہی نہیں سکتا جس کے متعلق اسے علم ہو کہ اس نے مرتد ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جس طرح گزشتہ اور موجودہ حالات کا مکمل علم ہے آئندہ آنے والی ہر بات کا بھی اسی طرح مکمل علم ہے۔ وہ کفر پر مرنے والوں کو جنت اور رضا کی بشارت کیسے دے سکتا ہے؟ پھر کتنے بدبخت اور لعنتی ہیں وہ لوگ جو ان حضرات کے خلاف عموماً اور ان میں سے افضل ترین اور رسول اللہ ﷺ کی محبوب ترین ہستیوں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات امہات المومنین رضی اللہ عنہن جو ہجرت و نصرت کا شرف بھی رکھتی ہیں، ان کے خلاف زبان درازی، سب و شتم، تہمت تراشی اور تبرا بازی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور ان کو برے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

آیت 101 ① وَ مِمَّنۡ حَوۡلَکُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ...... : پہلے اعراب (بدوی) منافقین کا ذکر فرمایا، پھر اعراب میں سے مخلصین کا تذکرہ کیا۔ ان کے بعد سابقین مہاجرین و انصار اور ان کے پیچھے آنے والے صاحب احسان لوگوں کو خوش خبری دی اور ان کے لیے بلند مراتب کا بیان فرمایا (ان کا تذکرہ سورۂ جمعہ کی ابتدائی آیات میں بھی فرمایا ہے) اب ان ضمنی مباحث کے بعد پھر منافقین کے ایک گروہ کا ذکر فرمایا جو مدینہ اور اس کے ماحول میں رہتے ہوئے اپنے نفاق میں "مَرَدُوۡا" اتنے مشاق اور ماہر ہو گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی تیز ترین فراست اور قوی ترین اندازے کے باوجود ان سب کو معین طور پر نہیں پہچان سکے، گو بعض کو ان کے لہجے اور دوسری علامات سے، یا اللہ تعالیٰ کی نشان دہی سے پہچانتے ہوں۔ دیکھیے سورۂ محمد (۳۰) لہٰذا جن روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے بعض منافقین کے نام بھی حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بتا دیے تھے، وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ آپ ان تمام کو نہیں جانتے، گویا آپ بعض منافقین کو جانتے تھے اور بعض کو نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ کے عالم الغیب ہونے کے غلط دعویٰ کی حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے۔

② سَنُعَذِّبُہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ : ایک تو دنیا میں غم و اندوہ اور فکر مندی کا عذاب، جس میں منافقین ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں، فرمایا: ﴿ یَحۡسَبُوۡنَ کُلَّ صَیۡحَۃٍ عَلَیۡہِمۡ ﴾ [المنافقون : ٤] کہ وہ ہر لحہ اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کرتے ہیں، ہر بلند آواز کو اپنے خلاف گمان کرتے ہیں اور پھر یہ رسوائی بھی کہ کفار اور مسلمانوں میں سے انھیں اپنا سمجھنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا اور مرنے کے بعد قبر کے عذاب کو دوسرا عذاب فرمایا۔ یا "مَرَّتَیۡنِ" سے مراد موت کے وقت فرشتوں کی مار ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ یَضۡرِبُوۡنَ

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور کچھ دوسرے ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے کچھ عمل نیک اور کچھ دوسرے برے ملا دیے، قریب ہے کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰۲﴾

وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴾ [محمد : ٢٧] ''وہ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہوں گے۔'' پھر قبر کا عذاب، اس کے بعد '' عَذَابٍ عَظِيْمٍ '' سے مراد جہنم کا عذاب ہے۔ ''مَرَّتَيْنِ'' کا معنی ''بار بار'' بھی آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ﴾ [الملك : ٤] ''پھر بار بار نگاہ لوٹا، نظر ناکام ہو کر تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔'' یعنی دنیا میں مال و اولاد، پریشانیوں اور ذلتوں کے ذریعے سے، پھر موت کے وقت، پھر قبر کے اندر بار بار عذاب دے کر آخر کار جہنم میں پہنچا دیں گے۔ یہ معنی بہت جامع ہے۔

③ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ : شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مَرَّتَيْنِ'' یعنی دنیا میں تکلیف پائیں گے، پھر آخرت میں پکڑے جائیں گے۔'' (موضح)

آیت 102 وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ ......: ﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ والی آیت میں مسلمانوں کے بہترین لوگوں کا ذکر ہے اور ﴿ وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ﴾ میں مسلمان کہلانے والے بدترین لوگوں کا ذکر ہے، جو آگ کے درکِ اسفل (سب سے نچلے حصے) کا ایندھن بننے والے ہیں اور اب عام مسلمانوں کا ذکر ہے جن کے صالح اعمال بھی ہیں اور کچھ اعمال سیئہ (برے کام) بھی ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مفسرین نے یہاں ابولبابہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کا تذکرہ فرمایا کہ وہ مخلص مسلمان ہونے کے باوجود تبوک پر نہ جا سکے تو انھوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خود کھولیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری توبہ قبول ہوگئی۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے انھیں اپنے ہاتھ سے کھولا اور پہلے ان کا پیش کردہ صدقہ قبول نہیں کیا تھا پھر اگلی آیت ﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ﴾ اتری تو ان کا صدقہ بھی قبول فرمایا۔ اس مفہوم کی اکثر روایات مرسل یا کمزور ہیں، البتہ ''الاستیعاب فی بیان الأسباب'' میں ابن عباس اور جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت کو حسن قرار دیا گیا ہے، جس میں ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پیچھے رہ جانے پر اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھنے اور آخر کار اللہ کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انھیں اپنے ہاتھ سے کھولنے کا اور ﴿ وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ ﴾ سے ﴿ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ﴾ تک آیات اترنے کا ذکر ہے۔ (واللہ اعلم) البتہ اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ جس طرح ﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ﴾ والی آیت میں مذکور افراد ﴿ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ﴾ میں قیامت تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تمام محسن پیروکار شامل ہیں، اسی طرح یہ آیت قیامت تک آنے والے تمام گناہ گار مخلص مسلمانوں کو شامل ہے، جنھوں نے اپنے اچھے اعمال کے ساتھ کچھ دوسرے برے اعمال بھی ملا جلا رکھے ہیں۔ سند کے لحاظ سے اس کی صحیح ترین

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

ان کے مالوں سے صدقہ لے، اس کے ساتھ تو انھیں پاک کرے گا اور انھیں صاف کرے گا اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے باعث سکون ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۰۳﴾

تفسیر وہ ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنی صحیح میں درج فرمائی ہے کہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آج رات دو آنے والے میرے پاس آئے، انھوں نے مجھے اٹھایا، پھر وہ مجھے ایک ایسے شہر میں لے گئے جو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنایا گیا تھا، وہاں میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کا نصف بدن سب سے زیادہ خوبصورت شخص کی طرح تھا جو تم دیکھنے والے ہو اور نصف اس بدصورت ترین شخص کی طرح تھا جو تم دیکھنے والے ہو۔ دونوں فرشتوں نے ان لوگوں سے کہا، اس نہر کے اندر داخل ہو جاؤ، وہ اس میں داخل ہو گئے، پھر ہماری طرف واپس آئے تو ان سے وہ بدصورتی جا چکی تھی اور وہ بہترین صورت میں بدل چکے تھے۔ دونوں (فرشتوں) نے مجھ سے کہا، یہ جنت عدن ہے اور وہ تمھارا گھر ہے۔ دونوں نے کہا کہ وہ لوگ جن کا نصف حصہ خوبصورت اور نصف بدصورت تھا «فَإِنَّهُمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُمْ» تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نیک عمل کیے اور ان کے ساتھ برے عمل بھی ملا جلا دیے، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرما دیا۔'' [بخاري، التفسير، باب قوله : ﴿ وآخرون اعترفوا بذنوبهم ﴾ : ٤٦٧٤]

آیت 103 ① **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** : ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جو پچھلی آیت کی تفسیر میں ذکر ہوئی، اس میں ہے کہ جب ان لوگوں کی توبہ قبول ہو گئی تو یہ اپنے اموال لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہمارا صدقہ قبول فرمایئے اور ہمارے لیے استغفار کیجیے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ قبول کرنے سے انکار فرما دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے ان کا صدقہ قبول فرما لیا۔

② اس حکم میں ان اعتراف گناہ کرنے والوں کا صدقہ قبول کرنے کے ساتھ تمام مسلمانوں سے بھی صدقہ وصول کرنے کا حکم ہے، کیونکہ زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکانِ خمسہ میں شامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں ان کے نائب کو صدقہ ادا کرنا ہو گا۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا کہ زکوٰۃ وصول کرنے کا حق صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا، آپ کے بعد کسی کا یہ حق نہیں۔ چنانچہ آپ کی وفات کے بعد بعض لوگوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ نے ان کی تاویل کو رد کیا اور ان سے اس وقت تک جنگ کی جب تک انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کو زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا وہ مشہور قول ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ مجھ سے ایک عناق (بکری کی پٹھوری) اور ایک روایت میں ہے کہ ایک عقال (ایک رسی یا ایک سال کی زکوٰۃ) روکیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ

کیا انھوں نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور صدقے لیتا ہے اور یہ کہ بے شک اللہ ہی ہے جو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰۴﴾ اور کہہ دے تم عمل کرو، پس عنقریب اللہ تمھارا عمل

تھے تو میں ہر صورت ان کے نہ دینے کی وجہ سے ان سے جنگ کروں گا۔

③ تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا : اس سے زکوٰۃ اور صدقات کی فضیلت ظاہر ہے کہ اس کے ذریعے سے انسان کے مال کو اور اس کی نیت اور عمل کو طہارت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور دونوں میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ " زَكَا يَزْكُوْ " جس سے "تُزَكِّيْهِمْ" مشتق ہے، پاک ہونے اور بڑھنے دونوں معنی میں آتا ہے۔ ویسے بھی صدقہ کو صدقہ کہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے کے صدق کو ظاہر کرتا ہے۔

④ وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ...... : " صَلاَةٌ " کا معنی نماز، رحمت اور دعا بھی آتا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صدقہ پیش کرنے والوں کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کا حکم دیا کہ اس سے ان کے دل کو سکون حاصل ہوتا ہے، اس لیے آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی صدقہ (فرض زکوٰۃ یا نفل صدقہ) لے کر آتا تو آپ اس کے لیے دعا فرماتے، جیسا کہ پیچھے آیت (۹۹) کی تفسیر میں باحوالہ گزرا ہے کہ آپ نے ابو اوفی رضی اللہ عنہ کے زکوٰۃ لانے پر « اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى آلِ اَبِيْ اَوْفٰى » کہہ کر ان کے ساتھ ان کے پورے اہل کو بھی دعا میں شامل فرما لیا۔ ﴿ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جو وہ کہہ رہے ہیں یا جو ان کے دل میں ہے سب سے واقف ہے، کیونکہ وہ سمیع بھی ہے علیم بھی۔

آیت 104 اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ ...... : اس آیت میں (گناہ گاروں کو) توبہ اور صدقے پر ابھارا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بھی توبہ کرے اور پھر عمل صالح کرے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے، بلکہ ساتھ ہی اس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ دیکھیے سورۂ فرقان (۷۰، ۷۱) بھلا اس کرم کی کوئی حد ہے؟ پھر وہ صدقہ قبول ہی نہیں کرتا، بلکہ اسے بڑھاتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ قبول کرتا ہے اور اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لیتا ہے، پھر اسے تمھارے ایک کے لیے پالتا بڑھاتا ہے، جس طرح تمھارا کوئی شخص اپنے گھوڑی کے بچھیرے کو پالتا ہے، یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔'' پھر اس کی تصدیق میں زیر تفسیر آیت اور یہ آیت پڑھی: ﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ [البقرة : ۲۷٦] ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔'' [ترمذی، الزکوٰۃ، باب ما جاء فی فضل الصدقة : ٦٦٢] اس کا اصل بخاری اور مسلم میں بھی ہے۔ [هداية المستنير]

آیت 105 ① وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ ...... : یعنی اب اگر قصور ہو گیا تو آئندہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاء

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾ وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللّٰهِ إِمَّا يُعَذِّبُهُمْ
وَإِمَّا يَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٠٦﴾ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا

دیکھے گا اور اس کا رسول اور ایمان والے بھی اور عنقریب تم ہر پوشیدہ اور ظاہر بات کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے، تو وہ تمھیں بتائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے ﴿١٠٥﴾ اور کچھ دوسرے ہیں جو اللہ کے حکم کے لیے مؤخر رکھے گئے ہیں، یا تو وہ انھیں عذاب دے اور یا پھر ان پر مہربان ہو جائے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿١٠٦﴾ اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی نقصان پہنچانے اور کفر کرنے (کے لیے) اور ایمان والوں

کے دور میں جو جہاد ہونے والے ہیں ان میں خوب کام کر لو۔ (موضح) اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے تمام احوال سے پوری طرح باخبر ہے مگر تم عمل کرو، تمھارے عمل کو وجود میں آتا ہوا اللہ تعالیٰ بھی دیکھ لے گا، اس کا رسول بھی اور ان کے زمانے کے مومن اور بعد میں آنے والے خلفاء اور اہل ایمان بھی، کیونکہ آدمی اچھا یا برا جو کام بھی کرتا ہے اس کی اسی طرح کی شہرت ہر طرف پھیل جاتی ہے، خصوصاً مومن اس سے بے خبر نہیں رہتے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ)) [النسائي، الجنائز، باب الثناء : ١٩٣٤، ١٩٣٥] ”تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔“ یہ الفاظ آپ ﷺ نے ایک جنازے کے گزرنے پر لوگوں کی اچھی تعریف اور دوسرے کے گزرنے پر لوگوں کے اس کی بری تعریف کرنے پر ارشاد فرمائے اور پہلے کے لیے جنت کی بشارت دی اور دوسرے کے لیے آگ کی۔ ایک روایت میں ہے: ((اَلْمُؤْمِنُونَ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ)) ”مومن زمین میں اللہ کے گواہ ہیں۔“ [بخاري، الجنائز، باب ثناء الناس على الميت : ١٣٦٧]

② وَسَتُرَدُّونَ إِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ...... : یعنی اگر بالفرض لوگوں کو تمھاری حقیقت کی خبر نہ ہو سکی تو آخر کار تمھیں واپس عالم الغیب والشہادہ کے پاس جانا ہے، وہاں کچھ مخفی نہیں رہے گا۔

آیت 106 وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللّٰهِ ...... : جو لوگ غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوئے اور مدینہ سے نہیں نکلے، وہ تین طرح کے تھے، ایک منافقین، دوسرے ابولبابہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور تیسرے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دو ساتھی مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، جنھوں نے اگرچہ آپ ﷺ کے سامنے کوئی جھوٹا عذر بنا کر پیش نہیں کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ جلدی قبول نہ فرمائی بلکہ ان کے معاملے کو مؤخر رکھا۔ اس آیت میں انھی کا ذکر ہے اور ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر آگے آیت میں آ رہا ہے۔

آیت 107 وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا ...... : یہ منافقین کے ایک اور قبیح کام کا ذکر ہے کہ انھیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منصوبے اور سازشیں بنانے کے لیے جمع ہونے اور اپنے راز مخفی رکھنے کے لیے کوئی موزوں جگہ نہیں ملتی تھی، چنانچہ انھوں نے مسجد قبا کے ساتھ ہی ایک مسجد بنائی جس کے بنانے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے چار مقصد بیان فرمائے ہیں۔ چاروں

بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

کے درمیان پھوٹ ڈالنے (کے لیے) اور ایسے لوگوں کے لیے گھات کی جگہ بنانے کے لیے جنھوں نے اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور یقیناً وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے بھلائی کے سوا ارادہ نہیں کیا اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں ﴿۱۰۷﴾

مقصد مصدر کے لفظ کے ساتھ آئے ہیں: ① "ضِرَارًا" یعنی یہ مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے نہیں بلکہ مومنوں کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے لیے ہے۔ ② "وَكُفْرًا" یعنی مساجد کی بنیاد تو اللہ اور رسول پر ایمان اور اکیلے اللہ کو پکارنے کے لیے ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن : ۱۸] مگر اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف دلوں میں چھپا ہوا کفر و شرک اور اس کی اشاعت ہے۔ ③ "وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" مسجد قبا کی موجودگی میں اس کے ساتھ ہی مسجد بنانے کا واضح مطلب مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا تھا کہ وہ ایک جگہ نماز نہ پڑھیں، کیونکہ مسلمانوں کی اسلام کی وجہ سے باہمی محبت اور اتفاق و اتحاد سے منافقین کو شدید حسد تھا۔ ④ "وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ" اس سے پہلے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے رہے اور ان سے برسر جنگ رہے، خصوصاً منافقین اور وہ لوگ جو مدینہ سے بھاگ گئے تھے اور دشمنوں کی پناہ میں رہ کر اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے تھے ان کے لیے اور ان کے بھیجے ہوئے آدمیوں کے لیے مسجد کے پردے میں چھپاؤ کی جگہ مہیا کرنا۔ مورخین نے خصوصاً یہاں ابوعامر راہب (جس کا نام مسلمانوں نے ابوعامر فاسق رکھا ہوا تھا) کا ذکر کیا ہے، جو مشہور صحابی حنظلہ غسیل الملائکہ کا والد تھا اور عیسائی ہو کر ہرقل کے پاس مسلمانوں کے خلاف کمک حاصل کرنے کے لیے گیا تھا، اس کی تجویز پر مسلمانوں سے جنگ کے لیے آنے والوں کے لیے بطور گھات اور کمین گاہ یہ مسجد بنائی گئی تھی۔

منافقین نے مسلمانوں کے دلوں سے شک دور کرنے کے لیے مسجد بنانے کا بہانہ یہ بنایا کہ ہم نے بیماروں اور کمزوروں کی سہولت کے لیے یہ مسجد بنائی ہے، تاکہ وہ سردی اور بارش میں سہولت سے یہاں نماز پڑھ سکیں اور ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے درخواست کی کہ آپ وہاں چل کر نماز پڑھیں، تاکہ ہمیں برکت حاصل ہو۔ خواہش ان کی یہ تھی کہ آپ کے نماز پڑھنے سے ہماری مسجد تسلیم ہو جائے اور ہم اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ آپ اس وقت تبوک کے لیے روانہ ہو رہے تھے، اس لیے آپ نے فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو واپسی پر میں تمھاری مسجد میں آ کر نماز پڑھوں گا۔ جب آپ ﷺ تبوک سے واپسی پر مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو جبریل علیہ السلام یہ آیات لے کر نازل ہوئے جن میں اس مسجد ضرار کا پول کھولا

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ

اس میں کبھی کھڑے نہ ہونا۔ یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی زیادہ حق دار ہے کہ تو اس میں

گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ یہ لوگ یقیناً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ اس مسجد بنانے سے بھلائی کے سوا کچھ نہ تھا، جب کہ اللہ تعالیٰ کی شہادت یہ ہے کہ بلاشک وشبہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں۔

آیت 108 ① **لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا:** اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ آپ اس میں کبھی نماز نہ پڑھیں، کیونکہ قیام نماز کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ حدیث ہے: «مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا» دوسرا یہ کہ نماز تو دور کی بات ہے آپ کبھی اس مسجد میں جا کر کھڑے بھی نہ ہوں، کیونکہ اس میں ان کی عزت افزائی ہوگی، جیسا کہ آپ کو منافقین کا جنازہ پڑھنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے بھی منع فرمایا: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ [التوبۃ : ۸٤] چنانچہ آپ نے راستے ہی سے آدمی بھیج کر اس مسجد کو جلوا کر مسمار کروا دیا۔

② **لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ ......:** اس مسجد سے کون سی مسجد مراد ہے؟ سیاق وسباق سے واضح طور پر مسجد قبا ہی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کی بنیاد مسجد ضرار کے برعکس پہلے دن ہی سے اللہ کے تقویٰ اور اس کی رضا کے حصول پر رکھی گئی تھی اور اس کی خاص فضیلت بھی صحیح احادیث میں آئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسجد قبا میں نماز عمرہ کی طرح ہے۔'' [ترمذی، الصلاۃ، باب ما جاء فی مسجد قباء : ۳۲٤، عن أسید بن ظہیر رضی اللہ عنہ] عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ کے دن مسجد قبا میں سوار ہو کر یا پیدل آیا کرتے تھے اور اس میں دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ [مسلم، الحج، باب فضل مسجد قباء...... : ۱۳۹۹]

صحیح بخاری میں ہجرت سے متعلق طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کے موقع پر پہلے بنو عمرو بن عوف میں دس سے کچھ زیادہ راتیں ٹھہرے اور اس مسجد کی بنیاد رکھی جو ﴿اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ﴾ ہے اور آپ نے اس میں نماز پڑھی، پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور لوگوں کے ساتھ چلتے ہوئے آگے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ اونٹنی رسول اللہ ﷺ کی اس مسجد کے پاس بیٹھ گئی جو مدینہ میں ہے اور وہ سہل اور سہیل رضی اللہ عنہما کی کھجوریں سکھانے کی جگہ تھی۔ [بخاری، مناقب الأنصار، باب ہجرۃ النبی ﷺ و أصحابہ إلی المدینۃ : ۳۹۰٦] اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسجد قبا ہے، مگر بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا مصداق مسجد نبوی کو قرار دیا، چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو آدمیوں کی اس مسجد کے بارے میں بحث ہوگئی کہ وہ کون سی مسجد ہے جو ﴿اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ﴾ ہے۔ ایک نے کہا، وہ مسجد قبا ہے۔ دوسرے نے کہا، وہ مسجد رسول ﷺ، یعنی مسجد نبوی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ہے۔'' [ترمذی، تفسیر القرآن، سورۃ التوبۃ : ۳۰۹۹] اس کی سند بھی صحیح ہے اور احمد، مسلم اور نسائی میں مذکور احادیث میں بھی آپ ﷺ نے اسے مسجد نبوی ہی قرار دیا ہے۔ اہل علم نے فرمایا، ان دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں،

رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝۱۰۸

کھڑا ہو۔ اس میں ایسے مرد ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ بہت پاک رہیں اور اللہ بہت پاک رہنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۱۰۸﴾

کیونکہ دونوں مسجدوں کی بنیاد پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور آپ کا مسجدِ نبوی کی صراحت کرنا اس لیے تھا کہ کوئی شخص یہ نہ سمجھ لے کہ پہلے دن سے تقویٰ پر بنیاد صرف مسجد قبا کی رکھی گئی ہے، بلکہ واضح فرمایا کہ مسجدِ نبوی کی بنیاد بھی پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور وہ بالا ولیٰ اس آیت کی مصداق ہے۔

③ ہر وہ مسجد جس کی بنیاد مسلمانوں کو نقصان پہنچانے یا تفریق ڈالنے کے لیے رکھی جائے، اس میں نماز جائز نہیں اور اسے ڈھا دینا لازم ہے اور ایک مسجد کے ساتھ ہی دوسری مسجد بنانا درست نہیں، الا یہ کہ آبادی زیادہ ہو جو ایک مسجد میں نماز نہ پڑھ سکیں۔ اسی طرح کوئی بھی مسجد جس کے بنانے والوں نے اس کی بنیاد ہی مشرکانہ عقائد پھیلانے اور توحید اور اہلِ توحید و سنت کی عداوت اور مخالفت کے لیے رکھی ہو اور اس میں قبر بنا دی ہو یا شرکیہ کلمات لکھے ہوں، اس میں بھی نماز پڑھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ہاں، جس مسجد کی بنیاد پوری بستی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز ہی کے لیے رکھی ہو بعد میں کوئی مشرکانہ عقیدے والا اس میں شرک کی کوئی علامت نمایاں کر دے، جسے ختم کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو، یا کوئی قدیم مسجد جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس کے بنانے والے نے اس کی بنیاد مشرکانہ عقیدے پر رکھی ہے، وہاں نماز پڑھنا جائز ہے، کیونکہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے، جیسا کہ مشرکین نے کعبہ کے اندر اور اردگرد بت رکھ دیے تھے، مگر رسول اللہ ﷺ فتح مکہ سے پہلے اس میں نماز پڑھتے اور طواف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ قوت عطا فرمائے تو ان مساجد کو شرک کے مظاہر و علامات سے پاک کر دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب ان کی باہمی تفریق ہے، اس لیے تمام کفار اور منافقین اسے زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ تفریق صوفیانہ فرقوں کی ہو یا فقہی فرقوں کی، یا سیاسی فرقوں کی مسلمانوں کی نجات، ترقی اور غلبہ تمام فرقے ختم کر کے صرف کتاب و سنت پر ایک ہو جانے میں ہے۔ ہماری تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ حنفی، مالکی، حنبلی اور شافعی چاروں کی الگ مسجدیں، الگ مدرسے، الگ عدالتیں تھیں، حتیٰ کہ عین مسجد حرام میں چار الگ الگ مصلوں پر جماعتیں ہوتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے سلطان عبد العزیز رحمہ اللہ کو جنھوں نے تمام مملکت نجد و حجاز میں اور خانہ کعبہ میں یہ تفریق ختم کر کے سب کو ایک ہی امام پر جمع فرمایا۔ دوسرے ممالک میں ابھی تک ہر فرقے کی الگ الگ مسجدیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو فرقہ بازی چھوڑ کر توحید و سنت پر جمع ہونے کی توفیق عطا فرمائے، جیسا کہ مسلمانوں کا پہلا ایک سو سال کا روشن ترین زمانہ ان فرقوں اور الگ الگ عدالتوں اور مساجد سے پاک تھا اور تمام مسلمانوں کے کتاب و سنت پر متحد ہونے کی وجہ سے پوری دنیا پر ان کا غلبہ تھا۔ یہ تمام فرقے اور جن کے ناموں پر فرقے بنے ہیں سب بعد میں ظہور پذیر ہوئے، خیر القرون میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

④ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا...... : "يَتَطَهَّرُوْا" اور "الْمُطَّهِّرِيْنَ" یہ "طَهُرَ (کرم)" میں سے باب تفعل یعنی "تَطَهَّرَ يَتَطَهَّرُ" کے صیغے ہیں، اس لیے ان کا معنی حروف میں اضافے کی وجہ سے بہت پاک ہونا اور رہنا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

تو کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی، بہتر ہے، یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کھوکھلے تودے کے کنارے پر رکھی، جو گرنے والا تھا؟ پس وہ اسے لے کر جہنم کی آگ میں گر گیا اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۹﴾

سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ آیت: ﴿ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ اہل قبا کے متعلق اتری، وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے۔'' [أبو داوٗد، الطھارۃ، باب فی الاستنجاء بالماء: ٤٤۔ ترمذی: ٣١٠٠۔ ابن ماجہ: ٣٥٥، و صححہ الألبانی]

5 حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل قبا سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ تمھاری تعریف کرتا ہے (اس کی کیا وجہ ہے؟) انھوں نے کہا کہ ہم پتھروں کے بعد پانی استعمال کرتے ہیں۔ اس حدیث کی وجہ سے بہت سے لوگ جہاں پانی میسر ہو وہاں بھی پہلے ڈھیلے استعمال کرتے ہیں پھر پانی، جس سے گندگی بھی پھیلتی ہے اور گٹر بھی بند ہوتے ہیں۔ کئی لوگ استنجا خانے سے باہر شلوار ہاتھ میں پکڑ کر ڈھیلے سے پیشاب خشک کر رہے ہوتے ہیں جو نہایت بے ہودہ دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل قبا کی تعریف اس لیے تھی کہ وہ پانی کے ساتھ استنجا کرتے تھے، پانی کی موجودگی میں ڈھیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی کو صرف پانی کے ساتھ طہارت سے تسلی نہیں ہوتی تو وہ وسوسے کا مریض ہے۔ یہ حدیث جس میں پتھروں کے بعد پانی کا ذکر ہے، اس کے متعلق خود حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بلوغ المرام میں فرمایا کہ اسے بزار نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اصل حدیث ابوداؤد اور ترمذی میں ہے، جسے ابن خزیمہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح کہا ہے اور وہ پتھروں کے ذکر کے بغیر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التلخیص الحبیر'' میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اسے صرف محمد بن عبد العزیز راوی نے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اسے ابو حاتم نے ضعیف کہا ہے۔ ہاں استنجا صرف پتھروں سے بھی جائز اور کافی ہے اور اگر کبھی اس کا اتفاق ہو اور اس کے بعد پانی سے مزید صفائی کر لے تو بہتر ہے، ورنہ پانی کی موجودگی میں پتھر استعمال کرنے کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

آیت 109 1 **اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى......** : ''شَفَا'' کنارا ''جُرُفٍ'' ندی نالے یا دریا کا کنارا جس کے نیچے سے پانی مٹی بہا کر لے گیا ہو اور وہ بس گرنے ہی والا ہو، کیونکہ اس کے نیچے کوئی بنیاد ہی نہیں کہ ٹھہر سکے، صرف مٹی کا نیچے سے کھوکھلا تودا ہے۔ ''هَارٍ'' اسم فاعل ہے ''هَارَ يَهَارُ (خَافَ يَخَافُ)'' سے یا هَارَ يَهُوْرُ (قَالَ يَقُوْلُ) '' سے۔ اصل ''هَائِرٌ'' تھا، جیسا کہ ''خَائِفٌ'' یا ''قَائِلٌ''، پھر اس میں قلب واقع ہوا تو ''هَارِيٌ'' ہو گیا اور ''رَاضِيٌ'' سے یاء گرنے کے بعد ''رَاضٍ'' کی طرح ''هَارِيٌ'' سے ''هَارٍ'' ہو گیا۔ ''فَانْهَارَ'' باب انفعال '' اِنْهِيَارٌ '' سے ماضی معلوم ہے۔

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ
حَكِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ

ان کی عمارت جو انھوں نے بنائی، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے چینی کا باعث بنی رہے گی، مگر اس صورت میں کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۱۰﴾ بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ یقیناً ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں

یہ دو شخصوں کی مثال ہے، ایک وہ جس کے عقیدہ وعمل کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور اس کی رضا پر ہے، دوسرا وہ جس کے عقیدہ وعمل کی بنیاد محض کفر و نفاق پر ہے۔ اول الذکر کی عمارت کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہے، وہ کبھی گرنے والی نہیں اور دوسرے کی عمارت ایسی چیز پر ہے جو دکھائی تو دیتی ہے مگر نیچے سے خالی ہے، گویا اس کی بنیاد ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ عمارت ہر حال میں اسے بھی لے کر گرے گی اور کفر و نفاق (جس کا انجام آگ ہے) کے اوپر کھڑی ہونے کی وجہ سے جہنم کی آگ میں لے کر گرے گی۔

② وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ: یعنی بے انصافی (ظلم) کی یہ شامت پڑتی ہے کہ نیک عمل کرنا بھی چاہیں تو بن نہیں آتا۔ (موضح)

آیت 110 لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً ...... : "رِیْبَةً" بے چینی، جیسا کہ حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « اَلصِّدْقُ طُمَانِیْنَةٌ وَالْكَذِبُ رِیْبَةٌ » [أحمد : ۱/ ۲۰۰، ح ۱۷۲۸۔ ترمذی : ۲۵۱۸، و صححه الألبانی] "سچ اطمینان کا باعث ہے اور جھوٹ بے چینی کا باعث ہے۔" یعنی یہ مسجد ضرار گرائے جانے کے بعد اس کے بنانے والوں کے دلوں کو بے چین رکھے گی کہ ہمارا نفاق و کفر ظاہر ہو گیا، اب کوئی مسلمان ہمیں دل سے اپنا سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، ان کی یہ حالت موت تک ایسے ہی رہے گی۔ ﴿ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ﴾ کا یہی معنی ہے، نہ ان کا دل نفاق سے پاک ہوگا نہ انھیں اطمینان نصیب ہوگا۔

آیت 110 ① اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ ...... : "فَاسْتَبْشِرُوْا" "اَلْاِسْتِبْشَارُ" ایسی زبردست خوشی جس کے اثرات بشرے یعنی چہرے پر بھی ظاہر ہوں۔ سین اور تاء کے اضافے سے بشریٰ، یعنی خوش خبری کے مفہوم میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ جہاد کی اس سے بہتر اور اس سے بڑھ کر مؤثر ترغیب آپ کسی آیت میں نہیں پائیں گے، کیونکہ اسے ایک سودے اور معاہدے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو سودا رب العزت کے ساتھ ہے۔ سودے کا سامان مومنوں کی جانیں اور مال ہیں اور قیمت اس کی اتنی قیمتی اور بے مثال ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال تک آیا۔ یہ سودا اور معاہدہ صرف اس پر نہیں کہ وہ قتل کیے جائیں گے تو قیمت ملے گی، بلکہ اللہ کے دین کی

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾

لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے زیادہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ تو اپنے اس سودے پر خوب خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے کیا ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿١١١﴾

نصرت اور اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے وہ کفار کو قتل کریں گے تب بھی یہی قیمت ملے گی۔ پھر اس معاہدے کی باقاعدہ تسجیل (رجسٹری) آسمانی کتابوں تورات، انجیل اور قرآن میں کی گئی، اس سے بڑھ کر سودے کی پختگی کا تحریری ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے، پھر اسے اللہ تعالیٰ کا سچا پکا عہد قرار دے کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنا عہد کون پورا کرنے والا ہے۔ سو اس کا ادھار دوسرے تمام نقدوں سے بڑھ کر ہے، پھر اس کا ادھار وعدہ جنت یقینی ہے۔ اس آیت کے علاوہ دیکھیے سورۂ حدید (٢١)، سورۂ صف (١٠ تا ١٢) اور سورۂ توبہ (٢٠ تا ٢٢) اور اگر کچھ زندگی باقی ہے تو وہ بھی اس کے بے پایاں انعام سے خالی نہیں۔
ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ضمانت دی ہے کہ جو اس کے راستے میں جہاد کرے اور اسے اس کے راستے میں نکلنے والی چیز اس کی راہ میں جہاد اور اس کی باتوں کو سچا یقین کرنے کے سوا کچھ نہ ہو تو وہ اسے جنت میں داخل فرمائے گا، یا اسے اس کے گھر میں اجر یا غنیمت سمیت واپس لائے گا جس گھر سے وہ نکل کر گیا تھا۔'' [بخاري، فرض الخمس، باب قول النبي ﷺ : أحلت لكم الغنائم : ٣١٢٣]
مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مجاہدین ایران میں جہاد کے لیے گئے تو کسریٰ کے جرنیل نے مسلمانوں کے سفیر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تم لوگ کیا ہو؟'' انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا تعارف کرانے کے بعد فرمایا: ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہمارے رب کا پیغام پہنچایا کہ ہم میں سے جو قتل کر دیا جائے گا وہ جنت کی ایسی نعمتوں میں جائے گا جو کبھی کسی کے دیکھنے میں نہیں آئیں اور جو ہم میں سے باقی رہے گا وہ تمھاری گردنوں کا مالک بنے گا۔'' [بخاري، الجزية والموادعة، باب الجزية والموادعة ...... : ٣١٥٩] جہاد کے بے شمار فضائل کے لیے کتب احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

2 وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ : اس میں حصر کے لیے ''هُوَ'' ضمیر لا کر اور خبر ''الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'' پر الف لام لا کر واضح فرمایا کہ فوزِ عظیم ہے تو بس یہ ہے، اس کے سوا کوئی کامیابی عظیم نہیں، بلکہ معمولی اور بے وقعت ہے۔

3 حسن بصری رحمہ اللہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھیے، جانیں ہیں تو اسی نے دیں، اموال ہیں تو اس نے عطا فرمائے، پھر وہ ہم ہی سے سودا کر رہا ہے کہ ہم اس کے راستے میں خرچ کریں گے اور وہ ہمیں اس کے بدلے جنت میں داخل ہی نہیں کرے گا بلکہ وہ اسے ہماری ملکیت بنا دے گا۔ ''لَهُمُ'' پہلے آنے سے حصر کا معنی حاصل ہوا ''بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ'' کہ جنت انھی کی ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

(وہ مومن) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، (اللہ کی راہ میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے منع کرنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور ان مومنوں کو خوش خبری دے دے ﴿۱۱۲﴾

آیت 112 ① اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سچے مجاہد مومنوں کی نو صفات بیان فرمائی ہیں۔ پہلی چھ صفات میں صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے، ساتویں اور آٹھویں صفت کا تعلق مخلوق سے ہے اور آخری کا تعلق دونوں سے ہے۔

② **اَلتَّآئِبُوْنَ**: اپنے گناہوں پر نادم ہو کر ان کو چھوڑنے کا عزم کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے والے، کیونکہ توبہ ان تینوں کے جمع ہونے سے مکمل ہوتی ہے۔ میدان قتال میں توبہ و استغفار سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے نبیوں کے ہمراہ قتال کرنے والوں کی دعا ذکر فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [آل عمران : ۱٤٦] ”اور ان کا کہنا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہماری زیادتی کو بھی اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافر لوگوں پر ہماری مدد فرما۔“

③ **الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ**: مشکل اور آسانی، خوشی اور ناخوشی، آرام اور تکلیف ہر حال میں اللہ کی عبادت کرنے والے اور ہر حال میں اس کی تعریف کرنے والے اور اس پر راضی رہنے والے۔

④ **السَّآئِحُوْنَ**: ”سَاحَ یَسِیْحُ سِیَاحَةً“ کا معنی پانی کا زمین پر چلنا، پھیل جانا۔ ” اَلسِّیَاحَةُ “ عبادت کے لیے (گھر بار چھوڑ کر) زمین میں نکل جانا۔ (قاموس) چونکہ اس میں آرام و آسائش کا ترک اور دنیا کا ترک پایا جاتا ہے۔ نصرانیت میں اس نے رہبانیت کی صورت اختیار کی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ [الحديد : ۲۷] ”اور رہبانیت (دنیا سے کنارہ کشی) تو انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں لکھا تھا۔“ اب اس کی صورت اللہ تعالیٰ کی خاطر ہجرت (وطن چھوڑنا) ہے کہ جہاں اللہ کے دین پر عمل نہ کر سکے، نہ اس کی دعوت دے سکے، اسے چھوڑ کر اللہ کی زمین میں کہیں اور نکل جائے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۹۷ تا ۱۰۰)، زمر (۱۰) اور عنکبوت (۵۳) ایک صورت جہاد فی سبیل اللہ ہے جس میں مجاہد گھر سے نکل کر آرام و آسائش ترک کر کے اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے اللہ کی زمین کے مشکل سے مشکل اور خوبصورت سے خوبصورت مقامات پر پھرتا ہے اور ہر جگہ اللہ کا بول بالا کرتا ہے۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ”یا رسول اللہ! مجھے سیاحت کی اجازت دیجیے۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ سِيَاحَةَ أُمَّتِي الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ)) ”میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ [أبو داوٗد، الجهاد، باب في النهي عن السياحة : ۲٤۸٦، و صححه الألباني] بعض علماء کے مطابق ”السَّآئِحُوْنَ“ میں وہ طالب علم بھی آ جاتے ہیں جو اللہ کا دین سیکھنے کے لیے شہر بہ شہر

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ

اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ

سفر کرتے ہیں۔ ایک صورت " اَلسّٰٓئِحُوْنَ " کی روزہ کی ہے کہ اس میں انسان تمام گناہ چھوڑنے کے ساتھ اپنی سب سے زیادہ مرغوب تین چیزیں کھانا پینا اور بیوی سے مباشرت ترک کر دیتا ہے۔ "اَلسّٰٓئِحُوْنَ" کا معنی ''روزہ رکھنے والے'' ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور کئی تابعین سے آیا ہے۔ (ابن کثیر) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلسَّائِحُوْنَ هُمُ الصَّائِمُوْنَ)) ''سائحون روزہ دار ہی ہیں۔'' مستدرک وغیرہ مگر شیخ البانی رحمہ اللہ نے سلسلہ ضعیفہ (۳۷۲۹) میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

شاہ عبد القادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بے تعلق رہنا روزہ ہے یا ہجرت ہے یا دل نہ لگانا دنیا کے مزوں میں۔ (موضح) "اَلسّٰٓئِحُوْنَ" کے لغوی معنی اور صحیح حدیث کو مدنظر رکھیں تو ہجرت یا جہاد اور اعلائے دین کے لیے یا دوسرے نیک مقاصد کے لیے زمین میں پھرنے والے ہی اس کا اصل مصداق ٹھہرتے ہیں۔ پاسپورٹ اور ویزا کا نظام کفار نے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو ختم کرنے ہی کے لیے اپنے اور مسلمانوں کے ملکوں میں نافذ کروا دیا ہے، کیونکہ سفر کے ذریعے ہی سے ہجرت، جہاد، طلب علم، تبلیغ دین، تجارت اور بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں جو اس وقت تک حاصل رہے جب تک مسلمان ساری زمین پر پھرتے رہے اور اس قوت سے سرفراز رہے۔ جب وہ گھروں میں بیٹھ گئے اور آرام طلبی اختیار کی تو کفار کی مراد بر آئی۔

⑤ اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ: اس کے اولین مصداق تو وہ ہیں جو فرض نمازوں کے علاوہ نوافل بھی ادا کرتے ہیں، جن کے متعلق کفار نے بھی شہادت دی: "هُمْ بِاللَّيْلِ رُهْبَانٌ وَبِالنَّهَارِ فُرْسَانٌ" کہ وہ رات کو راہب اور دن کو شاہسوار ہوتے ہیں۔ ورنہ کم از کم فرض نمازوں کے پابند ہونا تو اس کے لیے بنیادی چیز ہے۔ ترک نماز کے ساتھ اپنے آپ کو جنت کے سوداگر سمجھنا اپنی جان کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں۔

⑥ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ...... : یعنی دوسروں کو نیکی کا حکم دے کر اور برائی سے منع کر کے کفار کو مسلمان بنانے والے اور مسلمانوں کو اسلام پر عمل کی تاکید کرنے والے اور صرف دوسروں ہی کو نہیں خود بھی اللہ کی ہر حد کی پابندی اور ہر حکم کی اطاعت کرنے والے۔ "اَلْمُؤْمِنِيْنَ" میں الف لام کی وجہ سے ''ان مومنوں کو'' ترجمہ کیا ہے کہ خوش خبری کے حق دار ان صفات کے حامل مومن ہیں، فقط دعویٰ رکھنے والے نہیں۔

آیت 113 ① مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا......: ابتدا سورت سے لے کر یہاں تک مشرکین اور منافقین سے کلی طور پر تعلق ختم کرنے کے اعلان واظہار کا حکم دیا ہے۔ اب یہاں بتایا کہ جس طرح ان کے زندوں سے لاتعلقی کا اظہار ضروری ہے، اسی طرح ان کے مردوں سے براءت کا اظہار بھی لازم ہے اور ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا جائز نہیں۔ مسیّب بن حزن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس آئے تو اس کے پاس ابو جہل بن ہشام اور

مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾

قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں ﴿۱۱۳﴾

عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ کو پایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب سے کہا: ''اے چچا! تو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ دے، میں اللہ کے پاس اس کلمے کی شہادت دوں گا۔'' تو ابوجہل اور عبد اللہ بن امیہ نے ابوطالب سے کہا: ''کیا تو عبد المطلب کے دین سے منہ موڑ رہا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ اس کے سامنے یہی (کلمہ) پیش کرتے رہے اور وہ دونوں اپنی بات دہراتے رہے، یہاں تک کہ مرتے وقت آخری بات جو اس نے کہی: « عَلٰى مِلَّةِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ » کہ میں عبد المطلب کے دین پر مر رہا ہوں۔ اس نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے سے انکار کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں تیرے لیے استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے منع نہ کر دیا گیا۔'' اس پر یہ آیت اتری۔ [بخاری، الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت لا إله إلا الله : ۱۳۶۰۔ مسلم : ۲۴]
دوسری کتب حدیث میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس حدیث میں ابوطالب کے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے سے انکار کی صراحت موجود ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ دینِ عبد المطلب دینِ ابراہیم ہی تھا، اس لیے ابوطالب مسلمان تھے، ان کی بات کی حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ ابوطالب کے کفر پر مرنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو بے حد غم اور صدمہ ہوا، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴾ [القصص : ۵۶] ''بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔''

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ جہنم میں سب سے ہلکا عذاب ابوطالب کو ہوگا، اسے (آگ کی) دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جن کی وجہ سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔ [مسلم، الإيمان، باب أهون أهل النار عذابا : ۲۱۲]

2 مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ ...... : جب تک کوئی کافر زندہ ہے اس کے ایمان کی امید ہے، اس لیے اس کی ہدایت اور مغفرت کی دعا جائز ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اس کے لیے دعائے مغفرت سے منع نہیں کیا گیا، البتہ جب کفر پر موت کے بعد صاف واضح ہو گیا کہ وہ جہنمی ہے، اب نبی کریم ﷺ یا ایمان والوں کو اس کے لیے بخشش کی دعا کرنا جائز نہیں، کیونکہ مشرک پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔ دیکھیے سورۂ نساء (۴۸) اور مائدہ (۷۲) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، آپ خود بھی روئے اور اپنے اردگرد والوں کو بھی رلایا، پھر آپ نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اجازت مانگی کہ اس کے لیے استغفار کروں مگر مجھے اجازت نہیں دی گئی اور میں نے اس سے اجازت مانگی کہ اس کی قبر کی زیارت کر لوں تو مجھے اجازت دے دی گئی، سو تم قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔'' [مسلم، الجنائز، باب استئذان النبي ﷺ ربه عزوجل...... : ۱۰۸/۹۷۶] مسند احمد وغیرہ میں اس مفہوم کی اور بھی احادیث ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بخاری کی شرح فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ یہ سارے واقعات نزول آیت کا سبب بن سکتے ہیں۔ مگر جن روایات میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ کے والدین کو زندہ کیا گیا اور وہ ایمان لا کر پھر فوت ہو گئے ان روایات میں سے کوئی ایک بھی حافظ

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدے کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا، پھر جب اس کے لیے واضح ہو گیا کہ بے شک وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے تعلق ہو گیا۔ بے شک ابراہیم یقیناً بہت نرم دل، بڑا بردبار تھا ﴿۱۱۴﴾

ابن کثیر اور دوسرے محققین کی تصریح کے مطابق ثابت نہیں۔

آیت 114 ① وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ ...... : علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کر رہا تھا، جب کہ وہ مشرک تھے۔ میں نے کہا تم ان کے لیے بخشش کی دعا کر رہے ہو جب کہ وہ مشرک تھے، تو اس نے کہا، کیا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار نہیں کیا تھا؟ چنانچہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے یہ بات ذکر کی تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ﴾ ''اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا نہیں تھا مگر اس وعدہ کی وجہ سے جو اس نے اس سے کیا تھا۔'' [نسائی، الجنائز، باب النهی عن الاستغفار للمشرکین : ۲۰۳۸، و حسنه الألبانی] ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مشرک باپ سے یہ وعدہ اس وقت کیا تھا جب اس نے انھیں توحید کی دعوت کی وجہ سے گھر سے نکال دیا تھا۔ دیکھیے سورۂ مریم (۴۷) چنانچہ حسبِ وعدہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ دیکھیے سورۂ شعراء (۸۶) قیامت کو بھی سفارش کریں گے کہ یا اللہ! میرے باپ کے جہنم میں ہونے سے زیادہ میری کیا رسوائی ہے تو حکم ہو گا کہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھو، دیکھیں گے تو ان کے والد کی شکل گندگی میں آلودہ بجو کی بنا دی جائے گی اور فرشتے اسے پاؤں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیں گے کہ نہ کوئی اسے پہچانے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا والد ہے اور نہ ان کی رسوائی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کو رسوائی سے بچا لیا مگر مشرک کو جہنم سے نہیں بچایا۔ [دیکھیے بخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ واتخذ اللہ إبراهیم خلیلا ...... ﴾ : ۳۳۵۰]

② فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ : یعنی قیامت کے دن سفارش کے بعد اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سلوک کو دیکھ کر جب انھیں اپنے والد کا ابدی جہنمی، شرف انسانیت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کا دشمن ہونا خوب واضح ہو گیا تو وہ اس سے بری اور لاتعلق ہو گئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا خلیل اپنے خلیل کے دشمن سے دوستی یا تعلق کیسے رکھ سکتا ہے، چنانچہ ان کے دل میں جو تعلق باقی تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

③ اگر کسی کا کوئی کافر رشتے دار یا دوست فوت ہو جائے تو مسلمان اس کی تجہیز و تکفین میں شریک تو ہو سکتا ہے، مگر اس کے لیے دعائے مغفرت نہیں کر سکتا۔ (ابن کثیر)

④ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ : ''لَاَوَّاهٌ'' کا معنی بہت آہ، آہ کہنے والا ہے اور یہ دل کی نرمی کی علامت ہے، یعنی وہ اللہ کے

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ

اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ کسی قوم کو اس کے بعد گمراہ کر دے کہ انھیں ہدایت دے چکا ہو، یہاں تک کہ ان کے لیے وہ
چیزیں واضح کر دے جن سے وہ بچیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ بے شک اللہ ہی ہے جس کے
لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست
ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۱۶﴾ بلاشبہ یقیناً اللہ نے نبی پر مہربانی کے ساتھ توجہ فرمائی اور مہاجرین و انصار پر بھی، جو تنگ دستی

حضور بہت آہیں بھرنے والے، بڑے حلم والے تھے۔ یہ ابتدا میں اپنے والد کے حق میں ان کی نرمی اور استغفار کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تھے ہی ایسے کہ اگر کوئی سختی سے پیش آتا تو اسے نرمی سے جواب دیتے۔

آیت 115 وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا...... : اس میں ان مسلمانوں کو تسلی دی ہے جنھوں نے اوپر کی آیت کے نزول سے پہلے اپنے کافر رشتہ داروں کے لیے دعائے مغفرت کی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کے مسلمان ہونے کے بعد گمراہ ہونے کا حکم نہیں لگاتا جب تک اس کے لیے یہ واضح نہ کر دے کہ فلاں کام منع ہے اس سے بچ جاؤ، اگر پھر بھی وہ اس پر اصرار کرے تو گناہ گار بھی ہے اور شامتِ اعمال کے نتیجے میں اس کا رخ بھی گمراہی کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا جانتے ہوئے نافرمانی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے، اگر ابھی کسی کام سے منع ہی نہیں کیا گیا تو اس کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ کبھی گرفت کرنے والا نہیں، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ کوئی بھی کام کرنے والا اسے لاعلمی میں کر رہا ہے یا دیدہ و دانستہ، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے پہلے جو استغفار مشرکین کے لیے کیا اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

آیت 115 اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ...... : کفار سے ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد ہر طرح کی دلی لاتعلقی کا سبب بیان فرمایا کہ آسمانوں کا اور زمین کا مالک صرف اللہ، زندگی بخشنے والا اور موت دینے والا صرف اللہ، تمھارا والی وارث اور تمھارے تمام کاموں کا متولی اور سنبھالنے والا صرف اللہ، مشکل کے وقت اور دشمن کے مقابلے میں تمھارا مددگار صرف اللہ، اس کے سوا تمھارا نہ کوئی والی نہ مددگار، تو پھر اس کے دشمن سے تمھارا کیا تعلق، کیسی دوستی اور اس کے لیے کیسا استغفار؟

آیت 117 ① لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ...... : "تَابَ" کے معانی لوٹ آنا، مہربان ہو جانا، معافی مانگنا، معاف کر دینا، آئندہ غلطی سے باز آنا اور توبہ قبول کر لینا سبھی آتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مہاجرین و انصار پر مہربان ہونے اور معاف فرمانے کا مطلب " فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ" کے الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ تنگی کی گھڑی سے مراد غزوۂ تبوک پر

اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ
بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۙ﴿۱۱۷﴾ وَّ عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْهِمُ الْاَرْضُ
بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَیْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَیْهِ ؕ ثُمَّ
تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۠﴿۱۱۸﴾ ع ۱۴/۸

کی گھڑی میں اس کے ساتھ رہے، اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ٹیڑھے ہو جائیں، پھر وہ ان پر دوبارہ مہربان ہوگیا۔ یقیناً وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۱۷﴾ اور ان تینوں پر بھی جو موقوف رکھے گئے، یہاں تک کہ جب زمین ان پر تنگ ہوگئی، باوجود اس کے کہ فراخ تھی اور ان پر ان کی جانیں تنگ ہوگئیں اور انھوں نے یقین کر لیا کہ بے شک اللہ سے پناہ کی کوئی جگہ اس کی جناب کے سوا نہیں، پھر اس نے ان پر مہربانی کے ساتھ توجہ فرمائی، تاکہ وہ توبہ کریں۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۱۸﴾

روانگی کا وقت ہے جب شدید گرمی کا موسم تھا، قحط سالی تھی، فصلیں پکنے والی تھیں اور بے سروسامانی کی حالت تھی، ادھر چھ سو کلو میٹر کا طویل اور پر مشقت سفر سامنے تھا۔ دس آدمیوں کے لیے صرف ایک اونٹ تھا، سواریوں، زادِ راہ اور پانی تینوں کی سخت تنگی تھی۔ چنانچہ اس وقت بعض سچے مخلص مسلمان بھی جہاد پر روانہ ہونے سے گھبرانے لگے، آخر ان کے ایمان کی پختگی ان کے نفس پر غالب آئی اور وہ پورے عزم کے ساتھ جہاد پر نکل کھڑے ہوئے۔ یہاں اللہ کی مہربانی سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اس گھبراہٹ کے عالم میں انھیں روانگی کے لیے ہمت و جرأت عطا فرمائی اور ان کے دل میں آنے والے خطرات بھی معاف فرما دیے اور نبی ﷺ پر مہربانی سے مراد وہ آیت (۴۳) ہے جس کا آغاز ہی اس طرح ہوا تھا: ﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ﴾ کہ اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا، آپ نے ایسے ہٹے کٹے، تنومند اور کھاتے پیتے منافقوں کو جہاد پر جانے کی رخصت کیوں دے دی؟

آیت 118 ① وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا...... : "خُلِّفُوْا" کا لفظی معنی اگرچہ پیچھے چھوڑے گئے ہے، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ جن کا فیصلہ مؤخر کر دیا گیا۔ اسی بات کا تذکرہ اس سے پہلے آیت (۱۰۷) ﴿ وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ ﴾ میں گزرا ہے۔ "وَعَلَى الثَّلٰثَةِ" کا عطف "عَلَى النَّبِیِّ" پر ہے (یعنی انصار و مہاجرین پر مہربان ہونے اور انھیں معاف کرنے میں) وہ تین شخص بھی داخل ہوئے جن پر پچاس دن میں ایسی حالت گزری کہ موت سے بھی بدتر۔ (موضح) یہ تین صحابہ تھے، کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، اس سے قبل تقریباً ہر غزوے میں یہ شریک ہوتے رہے، اس

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١١٩﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ ﴿١١٩﴾

غزوۂ تبوک میں صرف سستی کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے، بعد میں انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سوچا کہ ایک غلطی (پیچھے رہنے کی) تو ہو ہی گئی ہے، لیکن اب منافقین کی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جھوٹا عذر پیش کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ چنانچہ حاضر خدمت ہو کر اپنی غلطی کا صاف اعتراف کر لیا اور اس کی سزا کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ نبی ﷺ نے ان کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا کہ وہی ان کے بارے میں کوئی حکم نازل فرمائے گا، تاہم اس دوران میں آپ نے تمام صحابہ کو ان سے بائیکاٹ کا حکم دے دیا، حتیٰ کہ بات چیت تک سے روک دیا اور چالیس راتوں کے بعد حکم دیا کہ وہ اپنی بیویوں سے بھی دور رہیں۔ یہ وہ وقت تھا جس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے تین جملوں میں کھینچا ہے کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور خود ان کی جانیں ان پر تنگ ہو گئیں اور انھوں نے یقین کر لیا کہ بے شک اللہ سے پناہ کی کوئی جگہ اس کی جناب کے سوا نہیں۔ آخر مزید دس دن گزرنے کے بعد ان کی توبہ قبول کر لی گئی اور مذکورہ آیت اتری۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنی قلبی کیفیت کی بہترین ترجمانی کرتے ہوئے بڑی لمبی حدیث میں بیان فرمایا ہے جو صحیح بخاری کی کتاب المغازی اور مسلم کی کتاب التوبہ میں مذکور ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں بھی اسے مفصل نقل کیا گیا ہے۔

② إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ : معلوم ہوا کہ توبہ کا قبول ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے، ورنہ اس پر کسی کا زور نہیں۔

آیت 119 وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ : یہ صادقین رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخلص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ صدق نیت، قول اور فعل تینوں میں ہو تو صدق ہے، ورنہ فعل قول کی تکذیب کرے تو یہ بھی صدق نہیں، اس لیے جو لوگ اپنے اخلاص نیت اور قول کے مطابق عملاً تبوک کی طرف نکلے بھی وہی صادقین ٹھہرے اور ان کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا۔ ان تینوں نے بھی سچ کہا، اپنی خطا مانی اس لیے بخشے گئے، نہیں تو منافقین میں ملتے۔ (موضح) اللہ تعالیٰ نے سچے مومن قرار ہی ان لوگوں کو دیا ہے جو ایمان لانے کے بعد شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا، فرمایا کہ صادق صرف یہی لوگ ہیں۔ دیکھیے سورۂ حجرات (۱۵) اور سورۂ حشر (۸) کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام مجھ پر یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ بولا، ورنہ میں بھی جھوٹ بول کر ہلاک ہو جاتا جس طرح دوسرے ہلاک ہو گئے۔ [بخاری، المغازی، باب حدیث کعب بن مالك رضی اللہ عنہ ...... : ٤٤١٨] بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس سچ بولنے کے انعام میں ان کی توبہ کا تذکرہ قرآن میں فرمایا جو قیامت تک پڑھا جائے گا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”سچ کو لازم پکڑو، کیونکہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ کہتا رہتا ہے اور سچ بولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ سے

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ۙ

مدینہ والوں کا اور ان کے ارد گرد جو بدوی ہیں، ان کا حق نہ تھا کہ وہ رسول اللہ سے پیچھے رہتے اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ عزیز رکھتے۔ یہ اس لیے کہ بے شک وہ، اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی جگہ پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ﴿۱۲۰﴾

بچ جاؤ، کیونکہ جھوٹ نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور نافرمانی آگ کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی جھوٹ کہتا رہتا ہے اور جھوٹ کی کوشش کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔“ [بخاري، الأدب، باب قول اللہ تعالٰی : ﴿ یأیها الذین اٰمنوا اتقوا اللہ ...... ﴾ : ۶۰۹۴۔ مسلم : ۲۶۰۷]

آیت 120 ① مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ...... : مدینہ میں رہنے والے لوگوں اور ان کے ارد گرد رہنے والے بدویوں یعنی مزینہ، جہینہ، اشجع، اسلم اور غفار وغیرہ قبائل کے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ تنگی اور تکلیف میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ رہیں اور مشکل مواقع پر پیش آنے والے تمام مصائب و آلام میں خوش دلی کے ساتھ آپ کے ہمراہ رہیں، جو سختیاں آپ ﷺ اٹھا رہے ہیں وہ بھی اٹھائیں، کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزیز اور مکرم آپ ﷺ ہی ہیں، تو جب آپ اتنی عزت و کرامت کے باوجود ان سختیوں اور مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں تو پھر سب کا حق ہے کہ جن چیزوں کا سامنا آپ کر رہے ہیں وہ بھی کریں اور آپ کی جان عزیز کی خاطر اپنی جانوں کی نہ پروا کریں، نہ ان کی کوئی قدر و قیمت سمجھیں، کجا یہ کہ رسول اللہ ﷺ تو اپنی جان اور اپنا راحت و آرام سب کچھ قربانی کے لیے پیش کریں اور یہ اپنی جانیں بچا بچا کر رکھیں، یہ کبھی بھی ان کا حق نہیں بنتا۔ (زمخشری) عبد اللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ تھے، آپ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا تو عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: ”یا رسول اللہ! یقیناً آپ مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، سوائے میری جان کے۔“ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”نہیں! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہاں تک کہ میں تمھیں تمھاری جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں۔“ تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تو پھر یقین کیجیے کہ اب اللہ کی قسم! آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔“ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”اب اے عمر! (تو کامل مومن ہوا)۔“ [بخاري، الأیمان والنذور، باب کیف کان یمین النبی ﷺ : ۶۶۳۲]

وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَةً صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً وَّلَا يَقۡطَعُوۡنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾

اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں، مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۲۱﴾

② ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ لَا يُصِيۡبُهُمۡ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ...... : "ظَمَاٌ" پیاس، "نَصَبٌ" تھکاوٹ، مشقت، محنت۔ "مَخۡمَصَةٌ" سخت بھوک جس میں پیٹ ساتھ لگ جائے، جس طرح پاؤں کا تلوا (اَخۡمَصُ) ہوتا ہے۔ "وَطِئَ يَطَأُ مَوۡطِئًا (ع)" ظرف ہے، روندنے، قدم رکھنے کی جگہ۔ "غَاظَ يَغِيۡظُ" غصہ دلانا، یعنی جن راستوں، پہاڑیوں، بستیوں، زمینوں، مکانوں اور کھیتوں وغیرہ پر ان کے قدم رکھنے سے یا ان کے گھوڑوں اور دوسری سواریوں کے انھیں روندتے ہوئے گزرنے سے کفار کے دلوں میں غصہ اور جلن پیدا ہو اور وہ ہراساں اور خوف زدہ ہوں۔ (ابن کثیر) "وَلَا يَنَالُوۡنَ" "نَالَ يَنَالُ" کا لفظی معنی لینا، حاصل کرنا ہے، یعنی مسلمان دشمن کی کوئی زمین یا شہر فتح کریں، یا انھیں قتل یا قید کریں، یا مال غنیمت حاصل کریں، یا انھیں کوئی نقصان پہنچائیں، غرض ان سے حاصل ہونے والی ہر کامیابی اور ہر نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے اور اس کا اجر انھیں ضرور ملے گا، کیونکہ ان کے یہ تمام اعمال اللہ کی خاطر اور رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری میں ہیں اور اسی کا نام احسان اور نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتا۔

آیت 121 ① وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَةً صَغِيۡرَةً...... : پچھلی آیت میں جہاد میں کیے جانے والے وہ اعمال بھی ہیں جو انسان کے اختیار میں ہیں اور وہ بھی جو بے اختیار پیش آتے ہیں، مثلاً مشکلات و مصائب، اس آیت میں صرف ان اعمال کا ذکر ہے جو آدمی کے اختیار میں ہیں، مگر جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد ہیں، یعنی زادِ سفر، سواری اور اسلحہ پر جو میسر ہو خرچ کرنا، پھر سفر جہاد پر نکل کھڑے ہونا اور جنگل اور وادیاں طے کرتے چلے جانا، سب کچھ لکھا جاتا ہے۔

② اس جنگ میں عثمان رضی اللہ عنہ نے لشکر کی تیاری میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا، یعنی ''نفقہ کبیرہ'' (بڑا خرچ) اور انھوں نے اس وقت صحابہ کو مخاطب کر کے اس کا ذکر بھی فرمایا تھا جب باغیوں نے ان کا محاصرہ کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں نے "جَيۡشُ الۡعُسۡرَةِ" (تنگ دستی کے وقت کے لشکر) کا سامان تیار کیا تھا؟ تمام صحابہ نے اس کا اعتراف کیا۔ [ترمذي، المناقب، باب في عد عثمان تسميته شهيدا...... : ۳۶۹۹، وحسنه الألباني] تفصیل اس کی یہ ہے کہ عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار اپنی آستین میں لے کر آئے، جب آپ ﷺ نے "جَيۡشُ الۡعُسۡرَةِ" کو تیار کیا تو اسے آپ ﷺ کی گود میں ڈال دیا۔ عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ انھیں اپنی گود میں الٹ پلٹ کرتے تھے اور فرماتے تھے: ''آج کے بعد عثمان جو کام بھی کرے اسے کچھ نقصان نہیں دے گا۔'' دو مرتبہ فرمایا۔ [ترمذي، المناقب، باب في عد عثمان تسميته شهيدا...... : ۳۷۰۰، ۳۷۰۱، و حسنه الألباني] اور کم خرچ کرنے والے (نفقہ صغیرہ) وہ

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۭ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ

اور ممکن نہیں کہ مومن سب کے سب نکل جائیں، سو ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ کیوں نہ نکلے، تاکہ وہ دین میں

بھی تھے جو رات بھر محنت کر کے نصف صاع (اکلو) کھجوریں لے کر آئے۔ دیکھیے سورۂ توبہ آیت (۷۹) کی تفسیر۔

③ وَلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ : پہاڑوں کے درمیان کے میدان اور پانی کی گزرگاہ کو وادی کہتے ہیں، یعنی ہر وادی طے کرنے پر وہ ان کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہے۔

④ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ ...... : یہ سب کچھ اس لیے لکھا جاتا ہے کہ کسی بھی عمل کی زیادہ سے زیادہ اچھی جزا جو ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں وہ عطا فرمائے۔

آیت 122 وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ...... : " نَفَرَ يَنْفِرُ " عام طور پر لڑائی کے لیے نکلنے کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾ [التوبۃ : ۳۸] اور فرمایا: ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا﴾ [التوبۃ : ۴۱] اور فرمایا: ﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ﴾ [التوبۃ : ۳۹] اور فرمایا: ﴿وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ﴾ [التوبۃ : ۸۱] اور یہ سورت شروع سے آخر تک جہاد ہی کے تذکرے سے بھری پڑی ہے، اس لیے "لِيَنْفِرُوْا" کا معنی ''لڑائی کے لیے نکلیں'' ہی سیاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ جنگ تبوک میں نفیر عام، یعنی تمام مسلمانوں کو نکلنے کا حکم تھا اور فرمایا کہ اہل مدینہ اور اس کے اردگرد کے اعراب کا حق ہی نہیں بنتا تھا کہ وہ جنگ میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہیں، اب اس آیت میں ایسے مواقع کا ذکر ہے جن میں سب کے نکلنے کا حکم نہیں، بلکہ کچھ لوگوں کا نکلنا کافی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ تمام مسلمان جنگ کے لیے نکل جائیں، کیونکہ کچھ لوگوں کا شہروں کی حفاظت اور گھروں کے انتظام کے لیے پیچھے رہنا بھی ضروری ہے، کچھ لوگ کسی اور ضروری عذر کی وجہ سے نہیں نکل سکتے، اس لیے ہر بڑے گروہ میں سے جنگ کی ضرورت کے حساب سے کچھ لوگوں کے لیے لازم ہے کہ جہاد کے لیے نکلیں، تاکہ وہ جہاد کے سفر، اس کے درمیان پڑاؤ، رباط کے دوران اور میدان قتال میں پوری کوشش کے ساتھ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈرائیں کہ دشمن کیا کیا منصوبے بنا رہا ہے اور اس کی تیاری کس قدر ہے اور اس سے نمٹنے کی کیا صورت ہے، تاکہ وہ آئندہ کے لیے مکمل تیاری کر کے دشمن پر فتح یاب ہو سکیں۔ ''تفقہ فی الدین'' سے یہاں مراد یہ ہے جو بیان ہوا، جب کہ اس وقت ہمارے ہاں ''تفقہ فی الدین'' صرف نماز، روزے وغیرہ کے مسائل ہی کو سمجھ لیا گیا ہے، دشمن کے منصوبوں، سازشوں، چالوں اور کارروائیوں کو سمجھنے، ان سے بچنے اور دفاع کے بجائے ان پر حملہ آور ہونے کو ''تفقہ فی الدین'' سے باہر قرار دے دیا گیا ہے۔

اس آیت سے چند باتیں واضح طور پر سمجھ میں آ رہی ہیں: ① ہر جنگ میں تمام مسلمانوں کا نکلنا نہ ضروری ہے نہ ممکن، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر عمل ہوگا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو لحیان کی طرف ایک لشکر بھیجتے ہوئے فرمایا: ''ہر دو آدمیوں میں سے ایک آدمی نکلے اور اجر دونوں کے لیے برابر ہے (تاکہ ایک میدان میں جائے اور دوسرا اپنے اور اپنے بھائی کے پیچھے کے

لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

سمجھ حاصل کریں اور تاکہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں، جب ان کی طرف واپس جائیں، تاکہ وہ بچ جائیں ﴿۱۲۲﴾

معاملات کی خیر کے ساتھ نگرانی کرے)۔'' [مسلم، الإمارة، باب فضل إعانة الغازی...... : ۱۸۹۶/۱۳۸] ہاں، اگر ضرورت کی بنا پر امیر نفیر عام کا حکم دے تو سب کا نکلنا ضروری ہوگا۔ ② فرقہ بڑا ہوتا ہے اور طائفہ چھوٹا، حتیٰ کہ ایک آدمی پر بھی طائفہ کا لفظ بولا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا﴾ [الحجرات : ۹] یہ آیت دو لڑنے والے آدمیوں کے لیے بھی ہے، کسی گروہ میں سے جنگ کے لیے زیادہ لوگ نکلیں یا ایک آدمی، سب پر طائفہ کا لفظ صادق آتا ہے۔ ③ '' لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ '' تفقہ باب تفعل سے ہے، مراد کوشش اور محنت کے ساتھ اچھی طرح سمجھ حاصل کرنا ہے۔ یہاں دین کے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک تو قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستے میں لڑنا، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم عینہ (حیلے کے ساتھ سود کی ایک صورت) کے ساتھ بیع کرنے لگو گے اور کھیتی باڑی پر خوش ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کرے گا جسے دور نہیں کرے گا ((حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ)) ''یہاں تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس پلٹ آؤ۔'' [أبو داوٗد، البیوع، باب فی النهی عن العینة : ۳۴۶۲، و صححه الألبانی]

یہاں دین سے مراد قتال فی سبیل اللہ ہے، اس میں تفقہ جنگ کے میدانوں ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ سو سال تک شیخ الحدیث کی مسند پر بیٹھے رہیں، کبھی یہ تفقہ حاصل نہیں ہوگا، آپ اپنے گھر یا سکول یا کالج یا یونیورسٹی یا اکیڈمی یا دار العلوم میں جتنی بھی جنگی کتابیں اور دشمن کی چالیں پڑھ لیں، یا غازیان اسلام کے معرکے پڑھ لیں، میدانِ جنگ میں جائے بغیر دین (جنگ) کی حقیقی اور واقعی سمجھ کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتی، نہ ہی آدمی اپنی قوم کو دشمن کے خطرے سے صحیح طور پر ڈرا کر اس سے بچنے کے لیے خبردار کر سکتا ہے۔

دین کا دوسرا معنی عام ہے، یعنی پورا دین اسلام، اس میں تفقہ حاصل کرنے کے لیے بھی جہاد کے میدانوں کا رخ کرنا ضروری تھا، کیونکہ دین کے علم کا سرچشمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی اور آپ مدینہ میں ہجرت کے بعد اکثر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سفر ہی میں رہتے، یا پھر اپنے کسی صاحب علم و فقہ صحابی کو امیر بنا کر بھیجتے تھے۔ بہت سے معجزات اور مسائل و احکام دوران سفر ہی واقع یا نازل ہوئے، اس لیے جب صحابہ کے حالات بیان ہوتے ہیں تو ان کی قابلیت و فضیلت کا ذکر اس طرح ہوتا ہے: ''شَهِدَ الْمُشَاهِدَ كُلَّهَا'' کہ وہ تمام جنگوں میں حاضر رہے اور کہا جاتا ہے: '' شَهِدَ الْبَدْرَ اَوِ الْحُدَيْبِيَةَ اَوْ فَتْحَ مَكَّةَ اَوْ حُنَيْنًا اَوْ تَبُوْكَ '' کہ فلاں صاحب بدر یا حدیبیہ یا فتح مکہ یا حنین یا تبوک میں شریک ہوئے اور یہ بات تو عیاں ہے کہ گھر کے بکھیڑوں میں علم و فقہ کا حصول اس طرح ممکن ہی نہیں جس طرح ہر چیز سے فارغ ہو کر لشکرِ اسلام میں جا کر ممکن ہے۔ دیکھو مسیلمہ کذاب کی لڑائی میں قرآن کے کتنے قاری اور علماء و فقہاء شہید ہوئے۔ لڑائی تو تھوڑی دیر کے لیے ہوئی تھی، باقی دوران سفر اقامت اور رباط میں تعلیم و تعلّم یعنی تفقہ فی الدین ہی کا شغل ہوتا تھا، جس میں لڑنے کے سلیقے کے ساتھ ساتھ زندگی

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں سے لڑو جو کافروں میں سے تمھارے قریب ہیں اور لازم ہے کہ وہ تم میں کچھ

کے تمام مسائل سیکھے سکھائے جاتے تھے اور سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، ابوبکر، عمر، عشرہ مبشرہ اور دوسرے افاضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دورانِ جہاد میں دین سیکھتے اور واپس اپنی قوم میں جا کر انھیں دوسرے دینی مسائل سکھانے کے ساتھ ساتھ دنیا اور آخرت کی ذلت، ترکِ جہاد سے ڈرا کر انھیں دشمن سے بچنے کی ترغیب دیتے۔ "لِيُنْذِرُوْا" اور "يَحْذَرُوْنَ" پر غور فرمائیں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آ جائے گی کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی حالتِ زار کون سی چیز میں تفقہ حاصل نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ سید المفسرین امام طبری رحمہ اللہ اور کئی اور مفسرین نے اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے، البتہ "لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" میں دین سے جہاد مراد لینے کی دلیل: ((حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ)) انھوں نے ذکر نہیں فرمائی۔

آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۂ توبہ میں جنگ تبوک سے رہ جانے والوں پر اللہ تعالیٰ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا تو ہر مسلمان کی کوشش اور خواہش یہ تھی کہ آئندہ ہم ہر جنگ میں ضرور جائیں گے، اس پر یہ آیت اتری کہ تمام مسلمانوں کو ہر مہم کے لیے نہیں نکل جانا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں اکیلے رہ جائیں، بلکہ ہر قبیلے میں سے کچھ لوگوں کو مدینہ میں آپ کے پاس بھی آ کر حاضر رہنا چاہیے، تاکہ وہ مدینہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہرے داری کا فریضہ بھی سرانجام دیں اور علم بھی حاصل کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو تعلیم دین سے آراستہ کریں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو دینی مدارس میں پڑھنے کے لیے بھی نکلنا چاہیے، تاکہ وہ یکسوئی سے دین کی اچھی طرح سمجھ حاصل کریں اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کو دین سمجھا سکیں۔ ہاں حالات کے تحت امیر المومنین نفیر عام کا حکم دیں تو پھر سب کو نکلنا چاہیے، کیونکہ جب قیام کا وقت ہو سجدہ نہیں کیا جاتا۔ یہ مطلب بھی بہت سے مفسرین نے بیان فرمایا ہے۔

آیت 123 ① يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ : یعنی کفار میں سے جو لوگ تم سے جتنے زیادہ قریب ہیں اتنا ہی ان سے پہلے جہاد کرو، پہلے انھیں اسلامی قلمرو میں شامل کرنے کے بعد ان سے جہاد کرو جو ان کی بہ نسبت دور ہیں، کیونکہ ہر کام میں آسان سے آسان اور بہتر سے بہتر ہونے کا خیال سب سے پہلے رکھا جاتا ہے۔ اپنی سرحد سے ملنے والوں کے ساتھ لڑائی میں نہ زیادہ سواریوں کی ضرورت ہے نہ زیادہ اخراجات کی، نہ دور کے سفر کی مشقت ہے، نہ ان کے احوال سے باخبر رہنے کے لیے زیادہ محنت اور وسائل کی، کیونکہ آپ ان کے محل وقوع، ان کے مراکز قوت اور ان کی کمزوریوں سے خوب واقف ہیں۔ پھر دور والے دشمن سے لڑائی میں پیچھے سے اپنے ملک پر کسی دشمن کے حملے یا اندرونی خلفشار کا جو خطرہ رہتا ہے قریب والوں کے ساتھ جنگ میں وہ بھی نہیں ہوگا، بلکہ اپنی پشت محفوظ رہے گی۔ بے شک تمام مشرکین سے لڑنے کا حکم ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ [التوبة : ٣٦] مگر ترتیب کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ دعوت میں بھی یہی

أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۳ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا

سختی پائیں اور جان لو کہ بے شک اللہ متقی لوگوں کے ساتھ ہے ۱۲۳ اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو

ترتیب ہے، پہلے گھر والے، پھر خاندان، پھر قبیلہ، پھر شہر، پھر اپنا ملک، پھر تمام دنیا اور جہاد میں بھی یہی ترتیب ہے، کیونکہ جہاد بھی دعوت ہی کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب کے ساتھ نبی ﷺ نے پہلے اپنے خاص قبیلہ قریش سے جنگ کی، پھر جزیرۂ عرب کے دوسرے قبائل سے، پھر بنی قریظہ اور بنی نضیر سے، پھر خیبر اور فدک کے اہلِ کتاب سے جو مدینہ کے اردگرد تھے، پھر مکہ فتح ہوا اور پھر یمن اور بحرین حتیٰ کہ پورا جزیرۂ عرب مسلمان ہوگیا۔ جب ان سے فارغ ہوئے تو غزوۂ تبوک کی مہم پر ملک شام کے نصاریٰ سے جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ یہی ترتیب آپ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، عمر فاروق شہید محراب رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء نے ملحوظ رکھی۔ چنانچہ ان کے زمانے میں پہلے ملک شام اور عراق و فارس فتح کیے گئے، پھر مصر، پھر مشرق کی طرف ہند، خراسان، کاشغر (چین) اور مغرب کی طرف افریقہ، اندلس اور فرانس، غرض مشرق سے مغرب تک اسلام کا پھریرا لہرانے لگا۔ والحمد للہ! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ جہاد کے ساتھ کفار کے تسلط کو ختم کر کے اپنے موجودہ ممالک میں اور دنیا بھر کے ممالک میں اللہ کے دین کو غالب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

❷ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً: لازم ہے کہ تم حملہ کرو تو اس کی شدت کفار کو واضح طور پر محسوس ہو اور اگر کبھی وہ حملہ کرنے کی غلطی کریں تو جواب میں انھیں کسی جگہ نرمی اور کمزوری نہ مل سکے۔ کیونکہ ایمان کا کمال ہی مسلمان بھائی کے لیے نرم ہونا اور کفار کے لیے سخت ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خوبی بتائی: ﴿ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ۲۹] ''کافروں پر بہت سخت، آپس میں نہایت رحم دل۔'' اور مجاہدین کی شان بیان فرمائی: ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [المائدۃ: ۵٤] ''مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت۔''

❸ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ: اس کا مشاہدہ پوری تاریخ اسلام میں ہوتا رہا ہے۔ مسلمانوں کے خلفاء و ملوک اور امراء و عوام جب متقی ہوتے اللہ تعالیٰ کی خاص معیت و نصرت ان کے ساتھ ہوتی اور ہر جگہ فتح ان کے قدم چومتی اور جب وہ ظالم یا فاسق ہوتے اور عیش و عشرت یا باہمی لڑائیوں میں مصروف ہوتے، تو اللہ کی مدد اٹھ جاتی اور دشمن ان کے علاقوں پر قابض ہو جاتے۔ اب بھی اللہ تعالیٰ کی معیت، ساتھ اور نصرت و تائید حاصل کرنی ہے تو وہ تقویٰ کے ساتھ ہی حاصل ہوگی، محض سائنسی ترقی یا کثرت تعداد سے کبھی نہیں۔

آیت 125،124 ❶ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ ......: ''يَسْتَبْشِرُوْنَ'' حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، ایسی زبردست خوشی جس کے آثار بشرے پر بھی ظاہر ہوں۔ ''سُوْرَةٌ'' سے مراد پوری سورت بھی ہوسکتی ہے اور آیات کا کوئی

اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں اس نے تم میں سے کس کو ایمان میں زیادہ کیا؟ پس جو لوگ ایمان لائے، سو ان کو تو اس نے ایمان میں زیادہ کر دیا اور وہ بہت خوش ہوتے ہیں ﴿۱۲۴﴾ اور رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں کوئی بیماری ہے تو اس نے ان کو ان کی گندگی کے ساتھ اور گندگی میں زیادہ کر دیا اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ کافر تھے ﴿۱۲۵﴾

ٹکڑا بھی۔ کسی بھی سورت کے نزول پر اسے قبول کرنے میں اہل ایمان اور اہل نفاق کا واضح فرق ہوتا ہے، بیج کی عمدگی زمین کی قابلیت کے بغیر فائدہ مند نہیں ہوتی، چنانچہ منافقین ایک دوسرے سے بطور استہزا و مذاق یا بعض کمزور ایمان والے مسلمانوں کو شک میں ڈالنے کے لیے پوچھتے ہیں کہ ان آیات کے ساتھ تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے؟ فرمایا کہ اہل ایمان کے ایمان میں تو ان سے اضافہ اور زیادتی ہوتی ہے، دل کے علم اور یقین میں بھی، زبانی تصدیق میں بھی اور عمل میں بھی اور ان تینوں کا نام ایمان ہے۔ "وَهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ" اور وہ بہت ہی خوش ہوتے ہیں، جس کے آثار ان کے چہرے پر بھی نمایاں ہوتے ہیں اور وہ لوگ جن کے دلوں میں کفر اور نفاق کا مرض ہے وہ پہلی سورتوں اور آیات ہی کے منکر تھے، جب اس سے بھی انکار کیا تو کفر کا ایک اور ردہ ان کے دلوں پر چڑھ گیا اور ان کی کفر پر موت کا باعث بن گیا۔

2 یہ آیت اور قرآن مجید کی کئی اور آیات واضح الفاظ میں ایمان کے زیادہ ہونے کی صراحت فرما رہی ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کتاب الایمان کے شروع میں آٹھ آیات اور پھر بہت سی احادیث ذکر فرمائی ہیں جو صاف ایمان کی کمی اور زیادتی پر دلالت کرتی ہیں اور صرف عمل کے لحاظ ہی سے نہیں، بلکہ نفس تصدیق اور یقین میں بھی کمی اور زیادتی پر دلالت کرتی ہیں۔ تعجب ہے ان شیوخ الحدیث والتفسیر پر جو ساری عمر صحیح بخاری اور قرآن مجید پڑھاتے ہیں مگر ایمان کے زیادہ یا کم ہونے کی آیات و احادیث آتی ہیں تو یا تو انھیں مذہب کے خلاف کہہ کر رد کر دیتے ہیں، یا ایسی تاویل کرتے ہیں جو آیات و احادیث کے منشا کے صریح خلاف اور تاویل کے بجائے تحریف کہلانے کے زیادہ لائق ہے۔ اس وقت تو ان کے سامنے شاید کوئی نہ بول سکے مگر وہ پاک پروردگار جو آیات کے ساتھ مومنوں کے دلوں میں ایمان و یقین بڑھاتا ہے، اس کے سامنے کیا تاویل کریں گے؟ اور وہ حضرات اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے جو کہتے ہیں کہ میرا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اور میرا اور جبریل علیہ السلام کا ایمان ایک جیسا ہے، کیونکہ ایمان سب کا برابر ہے، اس میں نہ کمی ہوتی ہے نہ زیادتی۔ وہ خود ہی سوچیں کہ کیا انھیں اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کا وہ یقین حاصل ہے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جبریل علیہ السلام کو حاصل تھا؟

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ
ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ

اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ بے شک وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی وہ نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ نصیحت پکڑتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ اور جب بھی کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان کا بعض بعض کی طرف دیکھتا ہے کہ کیا تمھیں کوئی دیکھ رہا ہے؟ پھر واپس پلٹ جاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں، اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں سمجھتے ﴿۱۲۷﴾ بلاشبہ یقیناً تمھارے پاس تمھی سے ایک رسول آیا ہے، اس پر بہت شاق ہے کہ تم

آیت 126 اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ...... : اکثر جنگ و جہاد کے وقت منافق معلوم ہو جاتے تھے (مگر پھر بھی وہ نفاق پر قائم رہتے تھے)۔ (موضح) اسی طرح ہر آدمی پر کوئی نہ کوئی آزمائش بیماری یا خوف وغیرہ کی صورت میں ہر سال ایک دو مرتبہ آتی رہتی ہے، تاکہ اسے سوچنے کا موقع ملے، فرمایا: ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ [السجدۃ : ۲۱] ''اور یقیناً ہم انھیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔'' سعادت مندوں کو اس سے توبہ اور نصیحت حاصل کرنے کی توفیق ملتی ہے، مگر منافق محروم رہتا ہے۔ پہلا معنی اس مقام پر زیادہ موزوں ہے۔

آیت 127 ❶ وَ اِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ...... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے جب منافقین رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں موجود ہوتے اور ان کے راز کھولنے والی یا جہاد کے حکم پر مبنی کوئی سورت یا آیات اترتیں، پھر وہ کمینگی اور شرارت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور موقع پا کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، مجلس سے کھسک جاتے۔ ان کی سمجھ میں صاف آ رہا ہوتا کہ ان آیات کا مصداق وہی ہیں، کیونکہ جہاد کے لیے نکلنا ان کے لیے موت تھی اور اس مجلس میں بیٹھنا ان کے لیے سراسر تذلیل کا باعث ہوتا، چنانچہ وہ تائب ہونے کے بجائے نکل جانے کو ترجیح دیتے۔ فرمایا: ﴿قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا﴾ [النور : ۶۳] ''بے شک اللہ ان لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں۔''

❷ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ : ''اللہ نے ان کے دل پھیر دیے ہیں'' کیونکہ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہماری فلاح اور بھلائی کس چیز میں ہے، یا یہ بددعا ہے کہ وہ اس کے اہل ہیں کہ ان کے حق میں کہا جائے کہ اللہ ان کے دلوں کو پھیر دے۔

آیت 126 لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ...... : اس میں آپ ﷺ کی بعض صفات عالیہ کا اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ہے۔ ایک صفت ''لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ'' میں لفظ ''رَسُوْلٌ'' ہے کہ آپ ﷺ رسول ہیں، یعنی

مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾

مشقت میں پڑو، تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے، مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

خود نہیں آئے بلکہ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ایک احسان "جَآءَكُمْ" ہے، یعنی تمام لوگوں کی طرف قیامت تک کے لیے آنے والا رسول تم عربوں میں آیا ہے، عربی رسول بھیج کر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی امامت کے لیے تمھیں منتخب فرمایا ہے۔ "كُمْ" کے مخاطب تمام دنیا کے لوگ ہیں، مگر اول مخاطب عرب ہیں، آپ کی تیسری صفت اور اللہ کا احسان "مِنْ اَنْفُسِكُمْ" ہے کہ آپ ﷺ تمھاری جنس سے، یعنی انسانوں میں سے ہیں، انھیں تمام انسانی ضروریات لاحق ہیں، وہ آدم کی اولاد سے ہیں، ان کے ماں باپ بھی ہیں، قریش کے ہر خاندان سے کوئی نہ کوئی رشتہ داری ہے، بیویاں اور اولاد بھی ہیں، بچپن، جوانی، بڑھاپا، بھوک، پیاس اور وفات سب کچھ آپ پر گزرا، صحت و مرض، رنج و راحت ہر مرحلے سے گزرے، اس لیے آپ ﷺ ہر چیز میں تمھارے لیے نمونہ ہیں۔ اگر وہ جن یا فرشتہ یا کوئی اور جنس ہوتے تو تمھارے لیے نمونہ اور اسوۂ حسنہ کیسے بنتے؟ اللہ کا احسان مانو کہ اس نے خود تم میں سے ایک نمونہ اپنا پیغام دے کر بھیجا کہ اس کی بات بھی سنو اور اس کی ذات کو دیکھ کر اس کے مطابق عمل بھی کرو۔ مزید دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۶۴) چوتھی یہ کہ "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" تمھارا کسی طرح بھی مشقت یا مصیبت میں پڑنا اس پر نہایت شاق ہے، وہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ تم کفر اختیار کر کے دنیا میں حیوانوں سے بدتر زندگی گزارو، پھر آخرت میں جہنم کا ایندھن بنو، اس فکر میں وہ گھلتا جا رہا ہے، اتنا کہ اللہ تعالیٰ کو اسے تسلی دلانا پڑتی ہے۔ دیکھیے سورۂ کہف (۶)، آل عمران (۱۷۶)، شعراء (۳) اور شوریٰ (۴۸) پھر وہ ایسا دین لے کر آیا ہے جس میں کوئی مشکل نہیں، نہایت آسان اور سادہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنِّیْ اُرْسِلْتُ بِحَنِيْفِيَّةٍ سَمْحَةٍ)) [أحمد : ۱۱۶/۶، ح : ۲۴۹۰۸، عن عائشة رضی اللہ عنہا، قال شعيب الأرنؤوط وغيره حديث قوي، إسناده حسن] "مجھے حنیفی (ابراہیم حنیف والی) آسان شریعت دے کر بھیجا گیا ہے۔" اور فرمایا: ((اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ)) "یہ دین سراسر آسان ہے۔" [بخاری، الإيمان، باب الدين يسر : ۳۹، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ایسا مہربان نبی کہ طائف میں دس دن رہ کر مار کھا کر زخمی اور بے ہوش ہو کر نکلا اور ہوش آنے پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا کہ اگر کہو تو میں (دو پہاڑوں) اخشبین میں ان کفار کو پیس دوں؟ تو عرض کیا: "مجھے امید ہے کہ اللہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ نکالے گا جو ایک اللہ کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔" [بخاری، بدء الخلق، باب إذا قال إحدكم آمين...... : ۳۲۳۱، عن عائشة رضی اللہ عنہا]

پانچویں یہ کہ "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" رات دن اس کی یہی کوشش ہے اور اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے تم دوزخ سے بچ جاؤ اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر لو۔ شاہ عبد القادر رحمہ اللہ نے "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" کا ترجمہ کیا ہے "تلاش رکھتا ہے تمھاری۔" اس کی وضاحت میں فرمایا: "چاہتا ہے کہ میری امت زیادہ ہوتی رہے۔" (موضح) اس لیے زیادہ اولاد

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾ ع ١٦ ٥

پھر اگر وہ منہ موڑیں تو کہہ دے مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسا کیا اور وہی عرش عظیم کا رب ہے ﴿١٢٩﴾

دینے والے خاندانوں میں نکاح کرنے کی ترغیب دی، فرمایا: ((تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَإِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ)) ''ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو بہت بچے دینے والی، بہت محبت کرنے والی ہوں، کیونکہ میں دوسری امتوں کے سامنے تمھاری کثرت پر فخر کرنے والا ہوں۔'' [نسائي، النكاح، باب كراهية تزويج العقيم : ٣٢٢٩ ـ أبو داوٗد : ٢٠٥٠] چھٹی '' بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ '' نبی کریم ﷺ اپنے ساتھیوں کی عیادت کے لیے جاتے، ان کے جنازے میں پہنچتے، نماز میں بچے کے رونے کی آواز سن کر ماں کی تکلیف محسوس کرتے ہوئے نماز مختصر کر دیتے، خود بھوکے رہ کر انھیں کھلاتے پلاتے، نبوت سے پہلے آپ ﷺ کی تمام انسانوں کے ساتھ شفقت و ہمدردی کو دیکھیں جس کی شہادت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دی، تو مومنوں پر آپ کی نرمی اور رحمت کا خود بخود اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے، اللہ تعالیٰ نے جو ایک مقبول دعا ہر نبی کی طرح آپ کو عطا کی، سب نے کر لی، مگر آپ نے اپنی امت کی شفاعت کرنے کے لیے سنبھال کر رکھ لی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل سے جنت میں اپنے اس مہربان نبی کی رفاقت عطا فرمائے۔ (آمین)

آیت 129 ❶ فَإِنْ تَوَلَّوْا ...... : یعنی ایسے مہربان نبی، اس کی مومنوں پر شفقت و رحمت وحرص اور اس قدر سہل دین کے باوجود اگر وہ منہ موڑیں، تو آپ یہ کہیں: ﴿ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ﴾ صرف یہ عقیدہ ہی نہ رکھیں، بلکہ برملا اعلان کریں اور اللہ کے کافی ہونے پر اپنی خوشی اور فخر کا اظہار کریں ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

❷ حَسْبِيَ اللّٰهُ: '' حَسْبِيْ '' پہلے آنے کی وجہ سے معنی میں حصر پیدا ہو گیا، یعنی مجھے صرف اللہ کافی ہے، خواہ سب لوگ مجھے چھوڑ جائیں۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

بے شک اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسباب بنائے ہیں، ساتھیوں کی مدد سے قوت ملتی ہے اور ایک دوسرے کی مدد کا حکم بھی ہے: ﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ﴾ [المائدة : ٢] ''اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔'' مگر کافر اور مومن کا یہی فرق ہے کہ دنیاوی اسباب ختم ہونے پر کافر ناامید ہو جاتا ہے اور مشرک کو اپنے معبودوں پر اتنا اعتماد ہو ہی نہیں سکتا جتنا موحد کو ایک اللہ پر ہوتا ہے، اس لیے مومن کبھی ناامید ہو کر کفر کے مقابلے سے دستبردار نہیں ہوتا ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس لیے قرآن و حدیث کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اسباب و ضروریات مہیا کرنے کی پوری کوشش کرو، وہ جمع ہو جائیں تب بھی ان پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو اور ایک بھی سبب مہیا نہ ہو سکے تب بھی صرف اللہ پر بھروسا رکھو جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ کوئی عام بادشاہ نہیں، عرش عظیم کا رب ہے، کوئی چیز اس کی سلطنت اور دسترس سے باہر نہیں۔ تمام اسباب ختم ہونے پر ایک اللہ پر اسی اعتماد اور اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظاہرہ غار ثور میں ہوا، فرمایا: ﴿ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ...... ﴾ [التوبة : ٤٠] اسی کا مظاہرہ جنگ احد کے اختتام پر دشمن کے اجتماع کی خبر پر اہلِ ایمان کے قول کے وقت ہوا اور اسی کا مظاہرہ دنیا کا ہر سہارا ختم ہونے پر آگ میں پھینکے جانے کے وقت ابراہیم علیہ السلام کے قول ﴿ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴾ کہنے اور بلا اسباب آگ کو گلزار بنا کر اللہ تعالیٰ کی مدد کی صورت میں ہوا۔ دیکھیے سورۂ آل عمران (۱۷۳، ۱۷۴) اور سورۂ بروج میں مذکور اصحاب الاخدود والے لڑکے کے پاس جب تمام اسباب ختم ہو گئے تو اس نے انھی الفاظ کے ہم معنی الفاظ « اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ » (اے اللہ! مجھے ان سے کافی ہو جا جس چیز کے ساتھ تو چاہے) کے ساتھ دعا کی تو پہاڑ سے گرانے والے خود گر کر مر گئے اور سمندر میں ڈبونے والے خود ڈوب گئے، مگر اس کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ [دیکھیے مسلم، الزهد، باب قصة أصحاب الأخدود...... : ٣٠٠٥، عن صهيب رضی اللہ عنہ] اب بھی اگر کوئی یقین کے ساتھ اللہ پر اعتماد کرنے والا یہ دعائیں پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اسی طرح آئے گی، خواہ ساری دنیا اس سے منہ موڑ جائے۔ بندۂ عاجز عبد السلام عرض کرتا ہے کہ یہ ان مبارک دعاؤں میں سے ہے جن کے پڑھنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں "قُلْ" کے لفظ کے ساتھ حکم دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی اپنے صبح و شام کے اذکار میں اسے شامل کرنا چاہیے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "جو شخص یہ دعا ﴿ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴾ صبح و شام سات سات دفعہ پڑھے، اللہ تعالیٰ اسے تمام فکروں سے کافی ہو جاتا ہے۔" یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ثابت نہیں، ہاں ابو درداء رضی اللہ عنہ کے قول کی سند کے راوی اچھے ہیں، البتہ اس میں « صَادِقًا كَانَ بِهَا اَوْ كَاذِبًا » کے الفاظ صحیح نہیں، بلکہ منکر ہیں۔ [دیکھیے سلسلة الأحاديث الضعيفة و الموضوعة : ٥٢٨٦] بالفرض اگر صحابی کا قول بھی نہ ہو تو اس کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان "قُلْ" ہی کافی ہے۔

Dar-ul-Andlus

دارُالاندلُس

4-لیک روڈ چوبرجی لاہور
042-37230549

غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314

Head Off: +92-42-35062910 Cell: +92-322-4006412